سال نامہ ۱۹۴۹ء

آج کل

دہلی

ہر مہینے کی پہلی اور پندرھویں تاریخ کو شائع ہونے والا
مصوّر رسالہ

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹرز:- عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد
بلونت سنگھ

جلد ۸ ——— نمبر ۱
سالانہ چندہ ——— نو روپے
قیمت سال نامہ ——— ایک روپیہ

۱۵ اگست ۱۹۴۹ء

ترتیب

منظومات

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

مقالے

افسانے

تصاویر

اِداریہ

پندرھویں اگست کا دن ایک مبارک دن ہے۔ ہندوستان اسی دن غیر ملکی حکومت کے اقتدار سے آزاد ہوا۔ اس آزادی کی دوسری سالگرہ ملک کے طول و عرض میں منائی جا رہی ہے۔ "آج کل" کا نیا دَور پچھلے سال ۱۵ اگست کو شروع ہوا تھا۔ یُوں تو اس کے کئی سال نامے منظرِ عام پر آ چکے ہیں لیکن آزاد ہندوستان میں اس کے دَورِ جدید کا یہ پہلا سال نامہ ہے۔ اپنی تمام مجبوریوں کا ذکرِ خیر نہ کرتے ہوئے ہم اپنے ان قارئین کرام سے معذرت کے طالب ہیں جن کی امیدیں اس سال نامے سے پوری نہیں ہوئیں۔ اُن قارئین سے جو اسے پسند فرماتے ہیں ہم ضرور داد کے طالب ہیں اور سب سے بڑی داد یہی ہے کہ وہ اپنے محبوب جریدے کی توسیع اشاعت کا ہمیشہ خیال رکھیں۔ ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ کبھی کبھی پچھلے سال کے دوران میں "آج کل" صوری اور معنوی حیثیت سے اپنے معیار کو قائم نہیں رکھ سکا۔ اچھا کاغذ کم یاب تھا۔ رسالے میں سائنسی معاشی، اقتصادی، ثقافتی اور ادبی مضامین کی اشاعت، بازاری غزلوں اور افسانوں کے مقابلے میں ضروری خیال کی گئی۔ اس باب میں ہمارے کچھ کرم فرما برہم بھی ہوئے لیکن اردو میں ایک اچھے جریدے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ناظرین کے دل و دماغ کے لئے بہترین خوراک مہیا کرے۔

مستقبل میں کوشش کی جائیگی کہ آج کل کا ہر شمارہ صوری اور معنوی حیثیت سے اپنے قائم کردہ معیار سے بہتر نہیں تو کم سے کم کمتر بھی نہ ہو۔

آزادی کے دوسرے سال میں ہندوستان نے ہر شعبے میں ترقی کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ ہندوستان کے سیاسی نقشے کی تکمیل کے عنوان سے ایک مضمون سال نامے میں شامل ہے۔ اختصار کے ساتھ ہم دوسرے پہلوؤں پر بھی کچھ روشنی ڈالیں گے۔

ہندوستانی مزدور صنعتی جمہوریت کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اقتصادی اور سیاسی مشکلات کی وجہ سے جو ہڑتالیں ہوتی ہیں ان کو خلافِ قانون قرار دے کر روکنا مسئلے کا صحیح حل نہیں ہے۔ ایسا طریق کار صنعتی بے چینی کو بڑھانے کا باعث بنتا ہے۔ ہماری قومی حکومت مزدوروں کی مشکلات اور ان کے مصائب کی چھان بین کر رہی ہے، صنعتی مزدوروں، کان کنوں اور زرعی مزدوروں کی حالت کو بہتر بنانے کے لئے وسیع اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ منصفانہ اُجرتوں اور منافع میں مزدوروں کے حصے کا تعین ہو جانے کے بعد ہندوستانی مزدور دنیا کے دوسرے ملکوں کے مزدوروں کی بہ نسبت صنعتی جمہوریت اور کوآپریٹو کامن ویلتھ کے زیادہ قریب پہنچ جائیں گے۔ مرکزی مشاورتی کونسل کا تقرر۔ منصفانہ اجرتوں کے باب میں کمیٹی کی سفارشات پر عملی اقدام کلکتے اور دھن باد میں صنعتی عدالتوں کا قیام، صنعتی مزدوروں کے لئے مکانات کی تعمیر۔ کان کنوں کے لئے بونس، زراعتی ریسرچ اور آئندہ منصوبہ بندیوں کا معاملہ، یہ تمام باتیں اس امر پر دال ہیں کہ ہندوستانی مزدور کی حالت بہتر سے بہتر بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔

ملک کا سب سے بڑا مسئلہ خوراک ہے۔ ہماری قومی خوراک میں توازن کی ضرورت ہے۔ ہمارا بہت سا سرمایہ جسے صنعتی مشینیں اور دوسری ضروریات کے لئے استعمال ہونا چاہئے وہ غیر ممالک سے چاول، گیہوں وغیرہ خریدنے میں صرف ہو رہا ہے۔ قومی حکومت نے "زیادہ اناج پیدا کرو" کا نعرہ ہی نہیں لگایا ہے بلکہ اس باب میں عملی کام بھی پورے زور شور سے جاری ہے۔ ٹریکٹروں کو کھیتی باڑی کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ بنجر زمینیں قابل کاشت بنائی جا رہی

ہیں - نئے نئے پراجیکٹ زیر تجویز ہیں - اسی کے ساتھ ساتھ کھاد کو بہتر اور سادہ طریقے سے استعمال کرنے اور انسانی محنت کو بچانے والے مشینی طریقے استعمال کرنے کے باب میں زرعی تحقیقات کی درسگاہ میں تجربات کئے گئے ہیں -

حکومتِ ہند کے محکمۂ تعلیم کے ماہروں نے نہایت غور وخوض کے بعد اس سال تعلیم کے لئے ایک ایسے منصوبے کا خاکہ طیار کر لیا ہے جو آزاد اور جمہوری ہندوستان کی ضروریات کے مطابق ہو - ملک کی اقتصادی حالت کے پیشِ نظر ان سکیموں پر پورے طور پر عمل نہیں کیا جا سکا پھر بھی موجودہ حالت اس حالت سے بہت بہتر ہے جو آزادی سے پہلے تھی - آزادی سے قبل مرکزی حکومت تعلیم پر صرف دو کروڑ روپے خرچ کرتی تھی لیکن سنہ ۵۰-۱۹۴۹ء کا مرکزی تعلیم کا بجٹ پانچ کروڑ پندرہ لاکھ روپے کا ہے - صوبائی حکومتیں بھی ترقی تعلیم کے لئے کوشاں ہیں -

سنہ ۱۹۴۸ء میں ہندوستانی پارلیمنٹ نے معدنیات اور معدنی اشیاء کے ضابطے اور ترقی کے لئے ایک قانون منظور کیا جس سے ہندوستانی معدنیات میں ایک انقلاب رونما ہوا - معدنیات کے ہندوستانی جو روتے گذشتہ بے قاعدگیوں اور نقصان دہ برآمد کی اصلاح کی - ایٹمی طاقت کے لئے کام آنے والی معدنی اشیاء کی برآمد بند کر دی گئی اور معدنیات کے متعلق اعداد وشمار جمع کرنے کا کام شروع ہو گیا - اب ہندوستان اس قابل ہے کہ اپنے وسیع معدنی ذرائع سے ماضی کی بہ نسبت کہیں زیادہ فائدے حاصل کرے

کم یاب کرنسی کے علاقوں میں تجارت کو فروغ دینے کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اہم غیر ممالک میں مستقل شوروم کھولے جائیں

ہندوستان کے بحری جہاز کرۂ ارض کے دور دراز گوشوں میں پہنچ رہے ہیں - پچھلے دو سال میں ہندوستانی جہازوں کو پچاس لاکھ ڈالر سے بھی زیادہ آمدنی ہوئی - ساحلی تجارت کے لئے مزید جہاز حاصل کرنے کے باب میں تجاویز پر غور کیا جا رہا ہے -

"کچھ" اور "سوراشٹر" میں چارے کے قحط کے مقابلے کے لئے فوری تدابیر اختیار کی گئیں اور چار لاکھ مویشیوں کو موت کے منہ سے بچا لیا گیا ہے -

فضائی سروسوں اور راستوں کی اصلاح وترقی ہو رہی ہے اور فضائی سفر کو کم خرچ بنانے کی پوری کوشش ہو رہی ہے -

ہندوستان میں غیر ملکی مقبوضات کو ہند میں شامل کرنے کے لئے متعلقہ حکومتوں سے گفت وشنید ہو رہی ہے - فرانسیسی مقبوضات میں سے چندر نگر تو ہندوستان کے حق میں رائے بھی دے چکا ہے - جہاں تک پانچ فرانسیسی مقبوضات کا تعلق ہے حکومتِ ہندوستان نے شروع جون سنہ ۱۹۴۸ء میں فرانسیسی حکومت سے یہ اصول منوا لیا تھا کہ ہندوستان میں فرانسیسی مقبوضات کے لوگوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے آئندہ سیاسی الحاق کا فیصلہ خود کریں

۱۹ر جون کو چندر نگر میں جو ریفرنڈم ہوا تھا - اس میں ووٹروں کی بہت بڑی اکثریت نے ہندیونین میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا - اب باقی چاروں جنوبی مقبوضات میں ۱۱ر دسمبر سنہ ۱۹۴۹ء کو ریفرنڈم کرانے کے انتظامات کئے جا رہے ہیں - اور توقع ہے - کہ اس روز ان مقبوضات کے لوگ اس طرح ہندوستان میں شامل ہو جانے کی رائے دیں گے -

اس کے علاوہ صنعتی ترقی کی طرف ملک بڑی تیز رفتاری سے گامزن ہے - امید ہے کہ آزادی کا تیسرا سال بھی ہماری ترقی اور بہبود کا سال ہوگا - اور ہم دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے سامنے فخر سے سر اونچا کر سکیں گے -

سال نامے میں بہت سے منتدر مضمون نگاروں اور شعرا کے نتائج افکار محض سال نامے کی تنگ دامانی کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکے - ہم ان سب سے معذرت کے طالب ہیں - وہ مضامین "آج کل" کی آئندہ اشاعتوں میں شائع کر دئے جائیں گے -

آخر میں ایک گذارش محترم شعرا اور مضمون نگاروں سے بھی ہے کہ "آج کل" میں ہندوستان کے ہر ادیب کا مضمون اور شاعر کا کلام شائع کرنا قطعی ناممکن ہے - صرف وہی حضرات ہم پر کرم فرمائیں جن کی خدمت میں ہم گاہ گاہ گذارش کرتے ہیں - سال نامے کے متعلق اپنی رائے سے ہمیں مستفید فرمائیے -

(ادارہ)

۱۵ر اگست سنہ ۱۹۴۹ء

ساغر نظامی

آہنگِ تعمیر

(فن کاروں کا کورس)

(۱)

پھونک کر ہوش و خرد پیکرِ وجاں کو ہم نے
سو نئے روپ دئے کون و مکاں کو ہم نے
نکہت آمیز کیا بادِ خزاں کو ہم نے
رشکِ فردوس کیا بزمِ جہاں کو ہم نے
ہم نے اونچا کیا ہستی کے نشاں کو ہم نے

(۲)

فرش سے تا بہ فلک کس کا تخیل پہنچا
کس نے زخم خوردہ عناصر کا کلیجہ چیرا
کس نے اس سنگ کے ٹکڑے سے تراشا ہیرا
زندگی جنسِ گراں ہے مگر اتنا تو بتا
قیمتی کس نے کیا جنسِ گراں کو ہم نے

(۳)

لفظِ بے مطلب و مفہوم گراں ہی رہتی
ایک ژولیدہ سا اندازِ بیاں ہی رہتی
سوزِ تفسیر سے صد شعلہ بجاں ہی رہتی!
زندگی راز تھی اور رازِ نہاں ہی رہتی!
امرِ معروف کیا رازِ نہاں کو ہم نے

(۴)

جیسے یہ بھی ہو بہاروں کی ندیم تازہ
امینِ لالہ و سوسن کی کلیم تازہ
وجد کرنے لگی ہم دوشِ نسیم تازہ
رقص کرنے لگی مانندِ شمیم تازہ
جب کبھی حکم دیا بادِ خزاں کو ہم نے

(۵)

ذرہ کو ماہ کیا، ماہ کو مہرِ رخشاں
پھول کو باغ کیا باغ کو صد رشکِ جناں
ہم سے خلاقی و ایجاد ہے دنیا میں جواں
بحر کو جھیل کیا، جھیل کو دریائے رواں
بحرِ موّاج کیا موجِ رواں کو ہم نے

(۶)

زندگی خواب تھی اور خوابِ گراں ہی رہتی
زندگی راز تھی اور رازِ جہاں ہی رہتی
ایک ابہام تھی ابہام نشاں ہی رہتی
زندگی رمز تھی اور رمزِ نہاں ہی رہتی
منکشف تجھ پہ کیا رمزِ جہاں کو ہم نے

(۷)

حرمِ تاک میں محصور تھی یہ کیف نشاں
شفقِ رنگ میں ساقی کا تخیّل لرزاں
لاکھ مے خانے مچلتے تھے نظر سے پنہاں
بطنِ انگور میں تھی بنتِ عنب سرِّ نہاں
آشکارا کیا اس سرِّ نہاں کو ہم نے

(۸)

کبھی صحراؤں میں لرزاں کبھی گلزاروں میں
رقص کرتی ہوئی اک لہر تھی سیاروں میں
لکۂ ابر کے اڑتے ہوئے طیاروں میں
برق آوارہ تھی آکاش میں کہساروں میں
ہاں مقید کیا اس آفتِ جاں کو ہم نے

(۹)

خاک کے بطن میں تخلیق کی جودت ہم ہیں
سنگ کی روح میں سوزِ صنمیّت ہم ہیں
رازِ تعمیر ہیں اسرارِ صناعت ہم ہیں
تاج و اہرام و اجنٹا کی حقیقت ہم ہیں
ہم نے بیدار کیا روحِ جہاں کو ہم نے

(۱۰)

تیری ہمت نے نہیں تیری شجاعت نے نہیں
تیری محنت نے نہیں تیری مشقت نے نہیں
تیری قدرت نے نہیں تیری سیاست نے نہیں
تیری دولت نے نہیں تیری حکومت نے نہیں
ہم نے فردوس بنایا ہے جہاں کو ہم نے

حسرت موہانی

آج کی رات

بر سرِ لطف ہے وہ جانِ جہان آج کی رات
دیدنی ہے یہ مروت کا سماں آج کی رات

کھنچ کے آجائے خود آغوشِ تمنا میں جو حسن
پیریٔ عشق بھی ہو جائے جواں آج کی رات

بے کہے ان پہ ہے روشن مرے دل کی خواہش
بے زبانی ہوئی جاتی ہے زباں آج کی رات

شوق کا شکوۂ رنگیں بھی نہ ہوگا شاید
حسن کی خاطرِ نازک پہ گراں آج کی رات

شوق کی حد میں ہے، با وصفِ لقا، شوقِ لقا
غرضِ شوق ہے بے نام و نشاں آج کی رات

کیا عجب ہے کہ مریضانِ ہوس کے حق میں
خود وہ بن جائیں مسیحائے زماں آج کی رات

کیوں نہ ہوں اہلِ ریا سر بہ گریبانِ ملال
کامرانی ہے نصیبِ دگراں آج کی رات

التفات اُن کی نگاہوں کا ستم ہے حسرت
شکر بھی، دل کی زباں پہ ہے فغاں آج کی رات

فراق گورکھپوری

ترانہ

آنکھوں سے چھلکے شراب رے ساقی آنکھوں سے چھلکے شراب۔ آنکھوں سے چھلکے شراب۔ جادو کیفِ شباب
جادو کیفِ شباب رے ساقی جادو کیفِ شباب

جلوۂ شیشۂ و جام جھما جھم موجِ مئے گلفام چھما چھم قامتِ ساقی برقِ دمادم۔ ان کا کہاں جواب
ان کا کہاں جواب رے ساقی ان کا کہاں جواب

معجزہ زارِ رنگ و نکہت جلوہ دہِ گلزارِ جنت آئینہ دارِ حسنِ حقیقت۔ تیری جبیں کے گلاب
تیری جبیں کے گلاب رے ساقی تیری جبیں کے گلاب

دُنیا دُنیا عالم عالم چشمِ خماریں کا کیف و کم چشمِ خماریں کا کیف و کم۔ دھو کا عذاب و ثواب
دھو کا عذاب و ثواب رے ساقی دھو کا عذاب و ثواب

آنچ آنچ ہے تیری جوانی کنچن نیر انگور کا پانی اُف یہ تموّج اُف یہ روانی۔ پگھلی آگ شراب
پگھلا بلّورِ شباب رے ساقی پگھلی آگ شراب

ساقی سینوں میں آگ لگی ہے کیسے بجھے یہ آگ ساقی کیسے بجھے یہ آگ۔ بادہ بھی ہے کمیاب
بادہ بھی ہے کمیاب رے ساقی بادہ بھی ہے کمیاب

مٹ مٹ کر دل سنور گئے ہیں اُجڑ اُجڑ کر نگر بسے ہیں نام ہوئے ہیں کام بنے ہیں۔ کر دے جہاں کو خراب
کر دے جہاں کو خراب رے ساقی کر دے جہاں کو خراب

ہائے جوانی وائے جوانی کس برتے پر تتّا پانی کس برتے پر تتّا پانی۔ سب افسانہ و خواب
سب افسانہ و خواب رے ساقی سب افسانہ و خواب

لے نہ اُڑے میخانے کو دل کر ہوئے بادہ سے پا کے اشارہ بوئے بادہ سے پا کے اشارہ۔ نغمۂ چنگ و رباب
نغمۂ چنگ و رباب رے ساقی نغمۂ چنگ و رباب

دورِ تمدّن لاکھوں بیتے کب انسانوں کو آئے گی رندوں کی تہذیب —— پینے کے آداب
پینے کے ہیں آداب رے ساقی پینے کے ہیں آداب

تجھے یقین آئے کہ نہ آئے آنکھوں میں تیری آنکھیں ڈال کے دیکھا جاگتا خواب
دیکھا جاگتا خواب رے ساقی دیکھا جاگتا خواب

جگر مرادآبادی

جگر پارے

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ

یہ علیل سی فضائیں یہ مریض سا زمانہ
تری پاک تر جوانی ترا حُسنِ معجزانہ

کبھی حُسن کی طبیعت نہ بدل سکا زمانہ
وہی نازِ بے نیازی وہی شانِ خسروانہ

مرے عشق کی سکینت ترے حُسن کی بشارت
وہی آہِ صبح گاہی، وہی نالۂ شبانہ

مجھے چاکِ جیب و دامن سے مناسبت نہیں کچھ
یہ جنوں ہی کو مبارک وہ رسومِ عامیانہ

میں ہوں اُس مقام پر کہ فراق و وصل کیسے
مرا عشق بھی کہانی، ترا حُسن بھی فسانہ

یہ تمام رنگ و نکہت، یہ تمام نور و ظلمت
یہ ہیں سب کلیمِ فطرت، یہ سکوتِ شاعرانہ

تجھے حادثاتِ پیہم سے بھی کیا ملے گا ناداں
ترا دل اگر ہو زندہ، تو نفس بھی تازیانہ

ترے عشق کی کرامت یہ اگر نہیں تو کیا ہے
کبھی بے ادب نہ گزرا مرے پاس سے زمانہ

مرے ہمصفیر بُلبُل، مرا تیرا ساتھ ہی کیا
میں ضمیرِ دشت و دریا تو اسیرِ آشیانہ

میں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں
ترا درد، دردِ تنہا، مرا غم غمِ زمانہ

تجھے اے جگر ہوا کیا کہ بہت دنوں سے پیارے
نہ بیانِ عشق و مستی، نہ حدیثِ دلبرانہ

معین احسن جذبی

میری شاعری اور نقّاد

اے مرے شعر کے نقّاد تجھے ہے یہ گِلہ
کہ نہیں ہے مرے احساس میں سرمستی و کیف
کہ نہیں ہے مرے انفاس میں پوسیدہ مئے جام
چمنِ دہر کی تقدیر کہ میں ہوں وُہ گھٹا
جس نے سیکھا ہی نہیں ابرِ بہاری کا خرام
رات تاریک ہے اور میں ہوں وہ اک شمعِ حزیں
جس کے شعلے میں نہیں صبحِ درخشاں کا پیام

میرے پھولوں میں صباؤں نہ بہاروں کا گذر
میری راتوں میں ستاروں نہ شراروں کا گذر
میری محفل میں نہ مطرب نہ مُغنّی کا سرود
میرے میخانے میں موجِ مئے اُمید حرام

میں وُہ نقّاش ہوں، کھویا ہوا بھٹکا نقّاش
جس کے ہر نقش میں تخئیل کے ہر پیکر میں
مسکراتی ہے بڑے ناز سے رُوحِ آلام

اے مرے دوست! مرے غم کے پرکھنے والے
بس چلے میرا تو لا دوں تجھے روحِ گُلِ تر
بخش دوں اپنی تڑپ، اپنا جنوں، اپنی نظر
پھر تجھے اپنے شب و روز کا عالم دکھلاؤں
ہر تبسم میں تجھے شائبۂ غم دکھلاؤں
خونِ ناحق پہ جو ہوتا ہے وہ ماتم دکھلاؤں
پرتوِ خور سے جو بیجاں ہے وہ شبنم دکھلاؤں
تجھ کو دکھلاؤں کہ بے رنگ ہے کس درجہ سحر
تیرہ و تار سی یہ رات، بھیانک سی فضا
ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو مرے دوست بڑھا
اک ذرا اور بلندی پہ خدا را آ جا
دیکھ اس وسعتِ تاریک کے سنّاٹے کو
دیوتا موت کا کھولے ہوئے جیسے شہپر

اور اس وسعتِ تاریک کے سنّاٹے میں
کوئی چھینے لئے جاتا ہے ستاروں کی دمک
کوئی بے نور کئے دیتا ہے شعلوں کی لپک
کوئی کلیوں کو مسلتا ہے تو پھر کیا کیجے
زخمِ گل! تجھ کو مہکنا ہے تو ہنس ہنس کے مہک
کون صیّاد کی نظروں سے بھلا بچتا ہے
طائرِ گوشہ نشیں! خوب چہک خوب چہک
جاگتی زرد سی آنکھیں نہ کہیں لگ جائیں
دردِ افلاس! ذرا اور چمک اور چمک
لعل و گوہر کے خزانے بھی کہیں بھرتے ہیں
عرقِ محنتِ مجبور! ٹپک اور ٹپک
ہے ترے ضعف پہ کچھ مستیٔ صہبا کا گماں
اے قدم اور بہک اور بہک اور بہک
وہ چمکتی ہوئی آئی ترے سر پر شمشیر
مژۂ طفلکِ معصوم جھپک، جلد جھپک
سینۂ خاک میں بیکار ہوا جاتا ہے جذب
رُخِ بیداد پہ اے خون جھلک آہ جھلک
قطرہ قطرہ یونہیں ٹپکاتا رہے گا کوئی زہر
تو بھی اے صبر کے ساغر یونہیں تھم تھم کے چھلک

موت کا رقص بھی کیا چیز ہے اے شمع حیات
ہاں ذرا اور بھڑک اور بھڑک اور بھڑک

ہر طرف کارگہِ دہر میں اُٹھتا ہے دُھواں
ہر طرف موت کے آثار تباہی کے نشاں
سرد اجسام بتاتے نہیں منزل کا پتہ
راہیں ویران ہیں ملتے نہیں راہی کے نشاں

ظلمتِ غم ہے کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے
ہاں مگر کس نے جلائے ہیں یہ حکمت کے دیئے
آنکھیں چیخیں کہ نکل آیا وہ اُمید کا چاند
چونکا دیوانہ کہ دامانِ دریدہ کو سیئے
دوڑا میخوار کہ اک جامِ مئے تند پیئے
خواہشِ مرگ مرے سینے میں ہونے لگی ذبح
ڈوبتے دل نے دُعا مانگی کہ کچھ اور جیئے

یک بیک آندھیاں چلنے لگیں ہر جانب سے
آن کی آن میں گہنا گیا اُمید کا چاند
آن کی آن میں گُل ہو گئے حکمت کے دیئے
نہ تو دیوانے کا دامانِ دریدہ ہی سِلا
نہ تو میخوار کو اک قطرۂ صہبا ہی مِلا
بدلیاں چھٹنے نہ پائی تھیں کہ پھر چھانے لگیں
بجلیاں سر پہ اُسی طرح سے لہرانے لگیں

جس کے سینے میں ہوں اے دوست ہزاروں ناسُور
چین سے جی اُس نے بھلا چین کبھی پایا ہے
آہ آئی ہے مرے لب پہ تو کیونکر روکوں
کیا کروں اشک اگر پلکوں پہ ڈھل آیا ہے
لیکن اے دوست! مرے درد کے بے حس نقاد

میرے آنسو مری آہیں بھی تو کچھ کہتی ہیں
میری افسردہ نگاہیں بھی تو کچھ کہتی ہیں
اور داغِ دلِ ناکام دکھاؤں کیسے!
دلِ خوں گشتہ کا پیغام سُناؤں کیسے!

یوں تو کہنے کو یہ آنسو ہیں بس اک قطرۂ آب
جن میں سُرخیِ دلِ پُر خوں کی نہ سوز و تب و تاب
پر کوئی نرم سا جب راگ سُنا دیتے ہیں
یہی آنسو ہیں کہ اِک آگ لگا دیتے ہیں
چین کب دیتی ہیں افسردہ نگاہیں میری
آندھیاں سینوں میں بھر دیتی ہیں آہیں میری

صبر اے دوست! ابھی سرد کہاں غم کی آگ
لب تک آئے بھی تو جل جائیں گے سب عیش کے راگ
صبر اے دوست کہ اک ایسا بھی دن آئے گا
خاص اک حد سے گزر جائے گا پستی کا شعور
سینۂ خاک سے پھر اُٹھے گا وہ شورِ نشور
گنبدِ تیرۂ افلاک بھی تھرّائے گا
وہ اسیرانِ بلا کا درِ زنداں پہ ہجوم
کانپتی ٹوٹتی زنجیروں پہ رقصِ بے ربط
رقصِ بے ربط میں پھر ربط سا آجائے گا
خیر کے ساغرِ زر پاش کا پھر جو بھی ہو حشر
اپنا ہی جامِ سفالین کوئی چھلکائے گا
گیسوئے شاہدِ گیتی میں پرو کر موتی
کوئی دیوانہ بہت دادِ جنوں پائے گا
صبر اے دوست کہ اک ایسا بھی دن آئے گا
انجمن بدلے گی سب ساز بدل جائیں گے
گانے والوں کے بھی انداز بدل جائیں گے

روش صدیقی

نکہتوں کے آنچل میں

یاد ہے تجھے اے دوست!

نکہتوں کے آنچل میں، حسن چہرۂ آغاز
زندگی کے ہونٹوں پر، اک تبسم غمّاز
اجنبی فضاؤں میں حسن و عشق کی پرواز
راز اور شکستِ راز
یاد ہے تجھے اے دوست

ہجر کی حقیقت تھی، اک فسانۂ موہوم
ہر خلش تھی نامحرم، ہر الم تھا نامعلوم
ہو چکی تھی دنیا سے جیسے روحِ غم معدوم
وہ تصوّرِ معصوم!
یاد ہے تجھے اے دوست

اشتیاقِ پنہاں کی آگ کا دہک جانا
آرزو کے جھونکوں سے درد کا چمک جانا
کچھ مرا بہک جانا، کچھ ترا بہک جانا
روح کا مہک جانا
یاد ہے تجھے اے دوست

روز و شب سے چھپ چھپ کر وہ جواں ملاقاتیں
آنسوؤں کے جھولوں میں سرخوشی کی برساتیں
جن کا کچھ نہ ہو مفہوم، دیر تک وہی باتیں
کیا وہ دن تھے کیا راتیں
یاد ہے تجھے اے دوست

ہر خیال جنت تھا، خلد ہر تمنّا تھی
ہر مسرتِ امروز، بے نیازِ فردا تھی
کچھ عجیب عالم تھا، وقت تھا نہ دنیا تھی
زندگی نہ تھی کیا تھی
یاد ہے تجھے اے دوست

اک عجیب وادی میں گُل فشاں رہے صدیوں
نکہتِ محبّت کے راز داں رہے صدیوں
خود عیاں رہے صدیوں، خود نہاں رہے صدیوں
ہم کہاں رہے صدیوں؟
یاد ہے تجھے اے دوست

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

راہ و رسم

وفا و مہر و محبت میں نام کر گذرا
کسی سے جو نہ ہُوا تھا وُہ کام کر گذرا

نگاہِ میکدہ بر دوش کے اشارے پر
میں ترکِ شیشہ و صہبا و جام کر گذرا

سکوں مِلا نہ مجھے شیخ و برہمن کے طفیل
حرم میں دَیر میں سب میں قیام کر گذرا

گناہ وُہ کئے دُنیا میں ابنِ آدم نے
کہ تیری رحمت و بخشش کو عام کر گذرا

مجھے اب اُن سے فقط راہ و رسم اِتنی ہے
کہیں نظر جو وُہ آئے سلام کر گذرا

وُہ جس نے وہی تھی اناالحق کی دار پر سے صدا
مقامِ عشق کو عالی مقام کر گذرا

متاعِ اشکِ ندامت چھپا کے سینے میں
ترے کرم کا سحر انتظام کر گذرا

شمیم کرہانی

کشاکش

نظر فریب تو ہے گردِ راہ اے ساقی!
پر اس غبار میں کوئی سوار ہے کہ نہیں
فضا میں سُرمئی کُہرا نظر جو آتا ہے
کسے خبر کہ وُہ ابرِ بہار ہے کہ نہیں
شراب ہے تو نگاہوں کے سامنے لیکن
بقدرِ حوصلۂ بادہ خوار ہے کہ نہیں
یہ دامِ برگ و شگوفہ ہٹے تو ہم دیکھیں
کوئی ثمر بھی سرِ شاخسار ہے کہ نہیں
زباں تو کہتی ہے ہم توڑ لائیں گے تارے
دلوں میں ہمتِ انجم شکار ہے کہ نہیں
جسے کیا ہے شہیدوں کے عزم نے تعمیر
محل وہ محرمِ نقش و نگار ہے کہ نہیں
خبر نہیں کہ ہم آغوش ہے جو مینا سے
عروسِ کیف سے وہ ہمکنار ہے کہ نہیں
جہاں میں دُھوم ہے جس منتخب کہانی کی
مجھے یہ شک ہے کہ وہ شاہکار ہے کہ نہیں
ہر ایک چاند ستاروں کی بات کرتا ہے
زمین کا بھی کوئی غمگسار ہے کہ نہیں
بڑی حسین ہے جنت بڑی حسین، مگر
پناہ گاہِ غریب الدیار ہے کہ نہیں
بڑھا رہے ہو سفینے کو جس ہوا میں تم
خبر بھی ہے، وہ ہوا سازگار ہے کہ نہیں

تیغ الہ آبادی

جُستجو

وُہ مہر و ماہ و مُشتری کا ہم عناں کہاں گیا؟
وُہ اجنبی کہ تھا مکان و لامکاں کہاں گیا؟
وُہ جھُومتی ہوئی سحر کی خاوری کدھر گئی؟
وُہ ڈولتی ہوئی پَوَن کا بوستاں کہاں گیا؟
وُہ میزباں کہاں ہے جس کی دید بھی محال تھی؟
جو آج تک نہ آ سکا وہ میہماں کہاں گیا؟
بجھی پڑی ہے ماہتاب و کہکشاں کی انجمن
وہ صدرِ بزمِ ماہتاب و کہکشاں کہاں گیا؟
مری حیات کو فسردہ راستوں پہ چھوڑ کر
وُہ راہ بر، وہ راہزن، وہ رازداں کہاں گیا؟
ترس رہا ہے دل کسی کی داوری کے واسطے
پیمبرانِ نیم جاں! خدائے جاں کہاں گیا؟
چمک رہی ہیں دُور دُور تک اُداس پٹریاں
مسافرو بتاؤ میرِ کارواں کہاں گیا؟
فرازِ کوہِ طُور پر غضب کی پستیاں ہیں آج
زمین تو ہی بول دے کہ آسماں کہاں گیا؟
یہ کائناتِ آب و گِل ہے جس کے غم میں مضمحل
دیا ہے جس نے سوزِ دل، وہ مہرباں کہاں گیا؟
کہاں گیا وہ تاجدارِ مُفلسان و خسرواں؟
وُہ تاجدارِ مُفلسان و خسرواں کہاں گیا؟
مری تلاشِ نامُراد کے مآل کو سمجھ
نہ پوچھ مجھ سے ہم نشیں کہ میں کہاں کہاں گیا؟

جعفر علی خاں اثر لکھنوی

قسم پر قسم

غمِ حرماں کی قسم جانِ پُر ارماں کی قسم
دل سے نکلے ہُوئے نغماتِ پریشاں کی قسم

گو دلِ زار پہ ہر لحظہ قیامت گذری
مجھکو بھُولا نہیں طولِ شبِ ہجراں کی قسم

میرے ہر اشک میں تھی تیرے تبسّم کی جھلک
شبنم آلودگیٔ صبحِ گلستاں کی قسم

مجھکو ہر پھول سناتا تھا فسانہ تیرا
تیرے دامن کی قسم اپنے گریباں کی قسم

میری ہر سانس جراحت تھی جراحت میں مزا
خمِ ابرو کی قسم، جنبشِ مژگاں کی قسم

گونجتا رہتا تھا اک نغمہ مرے کانوں میں
تپشِ آہنگیٔ مضرابِ رگِ جاں کی قسم

التفاتِ نگہِ ناز کا سودا تھا کبھی
ختم وہ دَور ہُوا، گردشِ دوراں کی قسم

اب نہ وہ دل ہے نہ وہ حوصلۂ عرضِ نیاز
ہاتھ سے چھُوٹے ہُوئے گوشۂ داماں کی قسم

ذوقِ فریاد نہ اندوہِ گراں جانی ہے
خوش بہر حال ہُوں، محرومیٔ درماں کی قسم

مجھکو برباد ہی رہنے دے، تلافی سے گزر
عشق احساں ہے، گراں باریٔ احساں کی قسم

ادب آموزِ محبت ہے محبت میری
ورنہ کھاتا ترے توڑے ہُوئے پیماں کی قسم

دیکھئے لاتی ہے کیا رنگ اثر کی وحشت
آج کھاتا تھا تری زُلفِ پریشاں کی قسم

تلوک چند محروم

خواتینِ ہند

حق نے بخشا ہے عجب جوہرِ ایثار اِن کو
خود پرستی سے نہ شہرت سے سروکار اِن کو

چشمِ خورشید نے دیکھا نہیں بیکار اِن کو
کوکبِ صبح نے پایا ہے تو بیدار اِن کو

خوابِ غفلت سے تعلق نہیں زنہار اِن کو
خالقِ پاک نے دی فطرتِ ہشیار اِن کو

حُسن و دولت نہ کریں مائلِ پندار اِن کو
عار نخوت سے ہے خدمت سے نہیں عار اِن کو

جاں فدا آن پہ کرنا نہیں دُشوار اِن کو
آزمایا ہے زمانے نے کئی بار اِن کو

شمعیں ظاہر میں ہیں باطن میں یہ پروانے ہیں
اِن کی جُرأت کے جو قائل نہیں دیوانے ہیں

جوش ملیح آبادی

چلو، چل کے جنگل میں منگل منائیں

وہ گھرتی چلی آرہی ہیں گھٹائیں جوانی کی جیسے مسکتی قبائیں
نکیلے اشارے، کٹیلی ادائیں مزا جب ہے دریا کے اُس پار جائیں
حسینوں کو یہ کہہ کے پٹی پڑھائیں
چلو، چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں[1]

طاروں کی موجوں پہ رقصاں ہیں دھارے بیابان و گلزار جل تھل ہیں سارے
دوپٹوں کو ڈھلکائے، سینے اُبھارے حسیں آرہے ہیں کنارے کنارے
انھیں، آؤ بڑھ کر، گلے سے لگائیں
چلو، چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

خس و خار و ذرات و کوہ و کمر کو گل و برگ و الماس و شمس و قمر کو
پُر آشوب و ہمت شکن بحر و بر کو اُٹھو، اس نظام قضا و قدر کو
خرابات کو انگلیوں پہ نچائیں
چلو، چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

[1] یہ دونوں مصرعے میرے محبوب ترین دوست حضرتِ آزاد انصاری مرحوم کے ہیں، جنھیں میں نے اپنا لیا ہے۔

وہ گردوں پہ برنائیاں گن گنائیں — کھلی مستیاں، شوخیاں چہچہائیں
جوانی کی انگڑائیاں رنگ لائیں — وہ آئیں، فضا پر مچلتی وہ آئیں
گمکتی، گھمنڈتی، گرجتی گھٹائیں
چلو، چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

اٹھو، اس خروش و نوا و صدا میں — جوانی و مستی کی عشرت سرا میں
مہکتی ہوا میں، بہکتی فضا میں — امنڈتی، مچلتی، برستی گھٹا میں
حسینوں کو باغوں میں جھولا جھلائیں
چلو، چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

یہ گلیوں کی نہریں، یہ کوچوں کے ٹاپو — یہ بھیگے دوپٹے، یہ نم ناک گیسو
یہ موروں کی تانیں، یہ باغوں کی خوشبو — یہ پی ہو، یہ رم جھم، یہ پی پی، یہ کو کو
اٹھو، ہم بھی ساغر پہ ساغر لنڈھائیں
چلو، چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

رواں مغ بچے وہ بصد ناز آئے — خد و خال میں سرخ شمعیں جلائے
وہ بھیگی مسیں جن پہ دل لوٹ جائے — جھکی انکھڑیوں میں دھندلکے چھپائے
اٹھو، اس دھندلکے میں لے لیں بلائیں
چلو، چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

جو زنجیر تھی پائے رقص و غنا میں — شکن جس سے تھی ولولوں کی قبا میں
وہ عقل، اڑ رہی تھی جو اپنی ہوا میں — اسی عقل کو، آؤ بہکی فضا میں
پہاڑوں پہ لے جا کے نیچا دکھائیں
چلو، چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

لگائیں غم ہجر کے مُنھ کو لُوکا
یہ رُت وَصل کی ہے، یہ مَوسم نمُو کا
بسائیں زُخِ آرزو کو بھبُوکا
تمنّا کو پہنائیں دھانی شلُوکا
جواں بخت ارماں کو دُولھا بنائیں
چلو، چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

ہَوا کا ہے ارشاد ناچو پھُوارو
فضا کہہ رہی ہے کہ تھرکو بہارو
گھٹا نعرہ زن ہے اُٹھو بادہ خوارو
تلاطم کا فرمان ہے، آؤ یا رو
پئیں، گائیں، جھُومیں، گریں، لڑکھڑائیں
چلو، چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

ترانے ہیں نوخیز، ساقی جواں ہے
جنُوں رقص میں ہے، فسُوں پُرفشاں ہے
صراحی دھنک ہے، سبُو کہکشاں ہے
گلابی میں ہے آگ، سر پر دھواں ہے
اُٹھو، چھائیں، لہرائیں، دھومیں مچائیں
چلو، چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

تلاطم میں ہے قلزمِ شادمانی
صراحی کی آگ، اور ساون کا پانی
رَم و رقصِ باراں، مئے ارغوانی
شراب و رباب و جمال و جوانی
اُٹھو، چہچہائیں، ہنسیں، گنگنائیں
چلو، چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

چلو آسمانوں پہ گلزار بن کر
اُڑو رنگِ بالائے کہسار بن کر
ہواؤں پہ منڈلاؤ جھنکار بن کر
اُمنڈ آؤ ابرِ گہربار بن کر
اُٹھو، ہم بھی گرجیں، گھریں، گھڑگھڑائیں
چلو، چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

جواہر لال نہرو

کشمیر کی جھلکیاں

سرزمین کشمیر کی دلکشی نے مجھے اپنا گرویدہ کرلیا اور اس کا سحر آفریں حسن میرے تمام جذبات و احساسات پر چھا گیا۔ میں اس وادی میں اس طرح گھوما جیسے کوئی شراب سے سرشار ہو۔

کشمیر کے دریاؤں، وادیوں اور جھیلوں کا حسن رنگین اس حسینہ کے جمال کی طرح ہے جو انسانی خواہشات سے معرّا سرتاپا معصوم ہو وہاں کے سنگلاخ پہاڑوں بلند چٹانوں برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں، برفانی چشموں اور وادی میں زور شور سے بہنے والے آبشاروں کی داد نہیں دی جاسکتی۔

جھیل ڈل سے دزدیدہ کہرا اوپر اٹھتی ہے اور ایک جھلملاتے کھلونے کی طرح اپنے پس منظر کی جھلکیوں سے دعوتِ نظارہ کا ساماں بہم پہنچاتی ہے۔ اس حسین وادی کے بادلوں کو دیکھئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی پہاڑ کی چوٹی کو آغوش میں لینے کے لئے بیتاب ہیں یا ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ بادل کے ٹکڑے چوری چھپے بچوں کی طرح کھیلنے کے لئے پیچھے آ رہے ہیں میں نے ان لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے نظاروں کو دیکھا اور بعض اوقات تو ایسا محسوس کیا کہ ان کے حسن کی شدّت نے میرے ہوش و حواس پر قبضہ کرلیا ہے۔ جب میں نے ان نظاروں کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا گویا میں ایک ایسا خواب دیکھ رہا ہوں۔ جو حقیقت سے دور ان آرزوؤں اور تمناؤں کی طرح ہو جو ہمارے دل و دماغ پر چھائی رہتی ہیں لیکن کبھی پوری نہیں ہوتیں۔ کشمیر کا حسین رُخ محبوبہ کی طرح ہے جو صرف خواب کے دھندلکے میں نظر آتا ہے اور بیداری میں گُم ہو جاتا ہے۔

میں جب چین گیا تو وہاں مجھے چینی لوگوں کی صناعت و مشّاقی پر بڑی حیرانی ہوئی۔ ہندوستان مدّت دراز سے اپنے صنّاعوں اور کاریگروں کے لئے مشہور ہے لیکن مجھے چینی زیادہ اعلیٰ اور مشّاق نظر آئے کشمیر پہنچ کر مجھے یہ احساس ہوا کہ ہاں یہ ہے وہ جگہ جہاں کے لوگ چینی دماغوں کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ کشمیریوں کے منجھے ہوئے ہاتھوں کی بنی ہوئی اشیا نہایت حسین ہوتی ہیں۔ اس قدر حسین کہ انہیں دیکھ کر مسرت حاصل ہوتی ہے اور ہاتھ میں لینے سے لطف آتا ہے۔

سینکڑوں برس سے کشمیر شال بافی کے لئے مشہور ہے لیکن اس کے باوجود یہ صنعت معدوم ہوتی گئی۔ اور ان اعلےٰ درجہ کی شالوں کے عوض مغربی ممالک کے گھٹیا کپڑے رائج ہوگئے یہی حال کشمیر کی دوسری حسین دستکاریوں کا ہے۔ کشمیر آنے والے سیّاح تھوڑا بہت سامان خریدتے رہے لیکن عام طور پر ہندوستان کے امراء نے کشمیر کی حسین اور فنّی طور پر قابل قدر اشیا کے مقابلے میں بدیشی اشیاء کو ہمیشہ ترجیح دی۔

اس کے بعد ہندوستان میں اپنی صنعت کو ترقی دینے کی تحریک اٹھی اور اس نے کشمیر کی صنعت پر بھی بہت اچھا اثر ڈالا۔

چنانچہ کشمیری صنعت کے واسطے ہندوستان میں ایک نئی منڈی کھل گئی۔ اکھل بھارتیہ چرخہ سنگھ نے اس میں بڑا اہم حصّہ لیا اور اس کی کشمیر کی شاخ نے ہندوستان بھر کی سینکڑوں دکانوں کو کشمیری مال بہم پہنچانا شروع کر دیا۔ لیکن رفتار کم رہی حالانکہ اسے تیز کیا جاسکتا تھا۔ دستکاریوں کی ترقی کی وجہ سے بہت سے بے روزگار اور مشاق کاریگر برسرروزگار ہوگئے اور امید ہے کہ اس سے خوشحالی اور بڑھے گی۔

ہر بار کشمیر کی دلفریب مسرتوں کے تانے بانے نے مجھے کسا اور جب بھی میں ان رنگین تاروں کو توڑ کر باہر نکلا تو مجھے شدید

غربت کی تلخیوں سے واسطہ پڑا مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ جنہیں قدرت نے اس قدر نوازا اور مالا مال کیا ہے کیوں ایسے نادار ہیں۔

کشمیر کے وسائل بہت وسیع نہ سہی لیکن کشمیریوں کا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے کافی ہیں لیکن یہ شرط ہے کہ انہیں ایک مرتب تجویز کے مطابق استعمال میں لایا جائے اور ان میں صحیح تال میل پیدا کیا جائے سستی قوت موجود ہے جس سے بہت سی چھوٹی اور بڑی صنعتیں شروع کی جا سکتی ہیں اور گھریلو صنعتوں اور دستکاریوں کو بھی بہت فروغ دیا جا سکتا ہے۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کشمیر میں بیداری پیدا ہو چکی ہے اور عوام میں حرکت پائی جاتی ہے میں نے گزشتہ بیس سال میں ہندوستان کے بہت سے حصوں میں ان احساسات کا تجزیہ کیا ہے لیکن کسی ہندوستانی ریاست میں اتنے بڑے پیمانے پر میں نے ایسی حرکت نہیں دیکھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عوام میں بیداری پیدا ہو چکی ہے۔ اور ان میں خود اعتمادی اور طاقت کا بڑھتا ہوا احساس پایا جاتا ہے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ نو دریافت قوت کے ساتھ کس قدر ڈسپلن اور رضاکارانہ جذبہ کارفرما ہے۔

میرا خیال ہے کہ ڈسپلن کا بھی ایک حصہ موجود ہے یہ ہو سکتا ہے کہ یہ ڈسپلن اس قدر قوی نہ ہو جس قدر کہ ہندوستان کے سیاسی طور پر زیادہ ترقی یافتہ حصوں میں پائی جاتی ہے اس تحریک کی مختصر سی زندگی کے پیش نظر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ تحریک کتنی دور پھیل چکی ہے اور اس میں کس قدر جان ہے۔

یہ تحریک اپنی رہنمائی کے سلسلے میں بھی خوش قسمت ہے کیونکہ شیخ عبداللہ وہاں کے ایک عوامی لیڈر ہیں ان سے عوام محبت کرتے ہیں۔ انہیں وہ بصیرت حاصل ہے جو مستقبل کی طرف دیکھتی ہے اور وقت کے معمولی جھگڑوں میں نہیں پڑتی اس کے بعد سیاحوں کی آمد کا مسئلہ ہے کشمیر سیاحوں کی آمد کے سلسلے میں ایک مثالی علاقہ ہے۔ یہ ہندوستان میں نہیں بلکہ سارے ایشیا کی تفریح گاہ بن سکتا ہے۔

کشمیری نوجوانوں کے دارالاقامہ کے لئے بڑی مناسب جگہ ہے ایسے ہوسٹل سارے یورپ اور امریکہ میں بن چکے ہیں سارے کشمیر میں بھی ایسے ہوسٹل کھل جانا چاہئیں اور لڑکے لڑکیوں کی ہمت بڑھائی جائے تاکہ وہ پہاڑیوں اور وادیوں میں گھومیں پھریں اور اس ملک کی پوری پوری واقفیت حاصل کریں۔

دوسری صبح کو ہم سری نگر سے جموں روانہ ہوئے یہ سڑک جس سے ہم گزر رہے تھے وادی سے نکل کر پیر پنچال کی بلندی پر چڑھتی ہے جوں جوں ہم اوپر چڑھتے تھے نظارے وسیع ہوتے چلے جاتے تھے ہم نے سرنگ کے کنارے توقف کیا اور آخری بار وادی پر نگاہ ڈالی سامنے کشمیر کی یگانہ روزگار وادی تھی جو حسن میں بے مثل نغموں اور رنگینیوں کی جان اس کا کچھ حصہ پہلے کہرے سے گھرا ہوا تھا اور ملگجی روشنی کا دھندلکا ہر چیز کو نئی جوانیاں بخش رہا تھا۔ اور وادی سے آب رواں کی نغمہ بار اور شیریں آواز آ رہی تھی۔ ہم نے ان مناظر کو مایوسی و خاموشی سے الوداع کہا اور تاسف کے ساتھ تاریک سرنگ میں داخل ہو گئے۔

حسن گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد
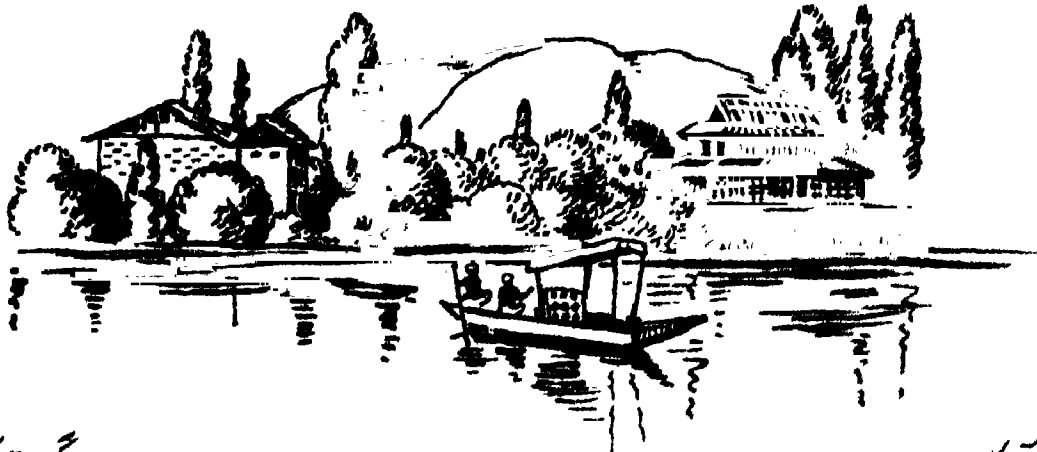
ہندوستان کے سیاسی نقشے کی تکمیل

آزادی کے دوسرے سال میں ۵۶۶ منتشر ریاستوں کو ایک متحد مضبوط اور جمہوری ہندوستان کے سلسلے میں مربوط کرنے کا کام تقریباً پورا ہو گیا۔

۴۹-۱۹۴۸ء میں وزارت ریاستہائے ہند کو جن مشکلات اور نازک معاملوں کو طے کرنا پڑا ان میں حسب ذیل معاملے خاص طور پر نمایاں تھے۔

(۱) حیدر آباد کو بدامنی۔ فرقہ وارانہ جذبے اور سامراجی ہوس کی دلدل سے نکالا گیا۔

(۲) بڑی بڑی ریاستوں مثلاً میور بھنج۔ کولہاپور اور بڑودہ کو صوبوں میں ملا دیا گیا اور بھوپال کا نظم و نسق سنبھال لیا گیا۔ اور

(۳) پٹیالہ اور ریاستہائے مشرقی پنجاب۔ راجستھان اور ٹراونکور کوچین کی تین بڑی ریاستی یونینیں قائم کی گئیں۔

ایک مضبوط پائیدار اور ثابت قدم ہندوستان کی تشکیل کے لئے یہ ضروری تھا کہ غیر منضبط ریاستوں کو اتحاد کے رشتے میں منسلک کرنے کے کام کو جلد از جلد مکمل کر لیا جائے۔ اس کے لئے ریاستوں میں اچھی حکومت۔ نظام مالیات اور نظم و نسق کے قابل اطمینان طریقوں کی بنیادیں رکھ دی گئیں۔ جاگیرداری کو ختم کرنے کے لئے مناسب اقدام کئے گئے اور اس طرح ریاستوں کے جمہوری آئین اور معاشی ترقی کی راہ میں آسانیاں پیدا کی گئیں۔

کام کے پہلے حصے یعنی ہندوستان کی سیاسی تنظیم تو قریب قریب مکمل ہو چکی ہے لیکن باقی حصے یعنی ریاستوں کو ہر لحاظ سے صوبوں کی سطح پر لانے کے کام کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

ہندوستان کی آزادی کے پہلے سال میں ریاستوں کی علاقائی یک جہتی کا جو کام شروع کیا گیا تھا وہ دوسرے سال میں پورا ہو گیا اس کام کو تین شکلوں میں سے کسی ایک شکل کے ذریعہ پایۂ تکمیل کو پہنچایا گیا۔ (۱) پڑوسی صوبے سے الحاق کیا گیا (۲) مرکزی حکومت کے ماتحت نظم و نسق کا علاقہ قرار دیا گیا یا (۳) دوسری ریاستوں سے ملا کر ایک خود مکتفی یونٹ بنایا گیا۔

۴۹-۱۹۴۸ء میں چھ ریاستیں صوبوں میں ضم کر دی گئیں ان کا کل رقبہ ۲۳۰۵۹ مربع میل اور کل آبادی ۵۵ لاکھ ہے۔ ان میں مہاراشٹر کی کولہاپور اور بڑودہ کو بمبئی میں ملا دیا گیا میور بھنج کو اڑیسہ میں اور ٹہری گڑھوال کو صوبجات متحدہ میں ملا دیا گیا۔ ۱۱ ریاستوں بھوپال اور بلاسپور کو جس کا کل رقبہ ۸۴۶۸ مربع میل اور آبادی ۱۴ لاکھ ہے مرکزی حکومت نے اپنے اختیار میں لے لیا اور انہیں چیف کمشنر کے صوبے بنا دیا گیا۔ اٹھائیس ریاستوں کی جن کا رقبہ ۱۴۷۷۳۴ مربع میل اور آبادی ۱۰۸ لاکھ ہے تین ریاستی یونینیں بنا دی گئیں ان کے نام پٹیالہ اور ریاستہائے مشرقی پنجاب کی یونین۔ مہاراجستھان اور ٹراونکور کوچین ہیں۔

ریاستوں کو علاقائی طور پر متحد کرنے کے سلسلہ میں جو ترقی ہوئی اس کی مختصر روداد حسب ذیل ہے۔

دو سو چودہ ریاستیں جن کا کل رقبہ ۱۰۶۰۸۵ مربع میل اور آبادی ایک کروڑ ۷۵ لاکھ ہے صوبوں میں مدغم کر دی گئی ہیں۔

پچیس ریاستوں کو جن کا کل علاقہ ۲۷۳۲۹ مربع میل اور آبادی ۲۸ لاکھ ہے مرکزی اختیار میں لے لیا گیا۔

تین سو چار ریاستوں کو جن کا کل علاقہ ۲۳۴۳۶۰ مربع میل اور آبادی تین کروڑ ۷۶ لاکھ ہے چھ ریاستی یونینوں کی شکل میں

بدل دیا گیا ہے۔

ہندوستان کا سیاسی نقشہ اب قریب قریب مکمل ہو چکا ہے آزادی سے پہلے ہندوستان میں ۵۶۲ ریاستیں تھیں جو ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ تھیں اور نقشے پر زرد پیوند کی صورت میں نظر آتی تھیں۔ اب اس نقشے پر خاص بڑی چھ ریاستی یونینیں ہیں۔ (ان کے نام ہیں پٹیالہ اور ریاستہائے مشرقی پنجاب کی یونین راجستھان۔ دندھیا پردیش مدھیہ بھارت۔ سوراشٹر اور ٹراونکور کوچین) پانچ علاقوں کا انتظام مرکز کے ماتحت ہے (ان کے نام ہماچل پردیش۔ کچھ۔ بلاسپور بھوپال اور رام پور ہیں) اور یہ دلی کی طرح چیف کمشنر کے صوبے بنا دئے گئے ہیں۔ اور آٹھ ریاستوں کا کسی صوبے سے الحاق نہیں ہوا نہ انہیں مرکزی اختیار میں لیا گیا ہے۔ ان کے نام کشمیر۔ حیدرآباد۔ میسور۔ بنارس۔ منی پور۔ تری پورا کوچ بہار اور گھاسی کی ریاستیں ہیں گھاسی کی یہ ساری ریاستیں سولہ یونٹوں پر مشتمل ہیں۔ بنارس کو مستقبل قریب میں صوبجات متحدہ میں مدغم کر دیا جائیگا۔ چار مشرقی ریاستوں کے بارے میں وزارت ریاستہائے ہند کا ارادہ یہ ہے کہ انہیں مناسب طور پر مدغم کر دیا جائے ان ریاستوں کو کبھی بھی خود مکتفی نہیں سمجھا گیا۔ اس کے بعد صرف میسور حیدرآباد اور کشمیر کی ریاستیں باقی رہ جائینگی۔

علاقائی یکجہتی کے ساتھ ساتھ ریاستوں میں جمہوری نظام کے قیام کا کام بھی ہوتا رہا۔ جن ریاستوں کو صوبوں میں مدغم کر دیا گیا ہے وہ ہندوستانی صوبوں کا اہم جزو بن گئی ہیں اور ان صوبوں میں جمہوری آئین رائج ہے۔ جو ریاستیں مرکزی اختیار میں آگئی ہیں ان کی ذمہ داری مرکزی حکومت اور ہندوستان کی پارلیمنٹ پر ہے۔ باقی رہیں ریاستی یونینیں اور میسور کی طرح وہ ریاستیں جو اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی ہیں ان کے بارے میں تجویز یہ ہے کہ ہندوستان کے دستور اساسی میں ہی ان کا آئین بیان کر دیا جائے۔ ہندوستان کا دستور بنانے والی اسمبلی کے سات ارکان کی ایک کمیٹی نے آئینی مشیر مسٹر بی۔ این راؤ کی زیر صدارت اس آئین کا ایک نمونہ پیش کیا ہے اور یہ ان دفعات پر مبنی ہے جو دستور ہند میں صوبوں کے لئے مرتب کی گئی ہیں۔ ہندوستان کا دستور منظور ہو جانے پر ریاستوں اور صوبوں کا درجہ ان کے حقوق اور فرائض ایک سے ہونگے اور ملک کی آئینی زندگی میں وہ برابر کے ساتھی ہونگے۔

ریاستوں کے وفاقی مالیات کے اتحاد کے لئے اکتوبر ۱۹۴۹ء میں مسٹر وی ٹی کرشنا چاری کی زیر صدارت تین آدمیوں کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ اس کمیٹی نے سب ریاستوں اور ریاستی یونینوں میں وفاقی مالیات کے لئے ایک سا طریقہ اختیار کرنے کا مناسب پروگرام تیار کر لیا ہے۔ اس پروگرام کے ماتحت یونٹوں اور مرکز کے تعلقات ایسے ہی ہوں گے جیسے صوبوں اور مرکز کے۔

نظم و نسق کے شعبے میں ترقی کا ایک قابل ذکر قدم یہ رہا ہے کہ میسور اور ریاستی یونینوں نے انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس اور دوسری مرکزی سروسوں میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔ مختلف ریاستی یونینوں کے انتظامی معاملوں کے لئے مرکز اور صوبوں کی طرف سے کئی افسر دئے بھی جا چکے ہیں ان یونٹوں میں پبلک سروس کمیشن قائم کر دئے گئے ہیں اور سروسوں کو کسی ایک طبقہ کے تسلط سے آزاد کرنے کے اقدام کئے جا رہے ہیں ہائیکورٹ قائم کر دئے گئے ہیں اور کچھ یونٹوں میں عاملہ اور محکمہ انصاف کو الگ الگ کر دیا گیا ہے۔ خزانہ عامرہ اور باقاعدہ حساب کتاب رکھنے کے اقدام کئے جا رہے ہیں۔

بہت سی ریاستی یونینوں میں تجربہ کار سیاسی رہنماؤں کی کمی کو دور کرنے کے لئے وزارت ریاستہائے ہند نے راج پرمکھوں کے لئے صلاح کار مقرر کرنے کا طریقہ اختیار کیا ہے۔

والیانِ ریاست کے ذاتی اخراجات کی رقوم کا تعین ایک نمایاں کارنامہ ہے۔ کیونکہ اس سے یہ فیصلہ ہو گیا ہے کہ ریاستوں کی آمدنی عوام کی بھلائی کے لئے خرچ کی جائے گی۔ اندازہ ہے کہ والیان ریاست اور ان کے خاندانوں کے اخراجات میں تین کروڑ روپیہ سالانہ سے کچھ زیادہ کی کفایت ہوگی۔ مہاراجوں کے ذاتی اخراجات کی رقوم کے متعلق جو معیار قائم کیا گیا ہے وہ عام طور پر حسب ذیل ہوگا۔ ریاست کی اوسط سالانہ آمدنی کے پہلے ایک لاکھ سے پندرہ فیصدی۔ اگلے چار لاکھ سے دس فیصدی۔ اور پانچ لاکھ تک ساڑھے سات فیصدی لیکن اہم یہ شرط ہوگی کہ رقم دس لاکھ سے نہ بڑھے۔ صرف خاص کے ساتھ والیانِ

ریاست کی ذاتی جائیداد کو عوامی وزیروں سے مشورہ کرنے کے بعد ریاست کی جائیداد سے الگ کر دیا گیا ہے۔

ریاستوں سے جاگیرداری کی دیگر صورتوں مثلاً بندوبست جاگیرداری بیگار وغیرہ کو دور کرنے کے اقدام کئے جا رہے ہیں۔

جن ریاستوں کا ادغام ہو چکا ہے ان کی مسلح افواج کو ہندوستانی فوج میں مدغم کرنے کے اقدام شروع کئے جا چکے ہیں۔ آجکل ریاستی یونینوں کے یونٹوں میں ریاستی افواج یونینوں کے راج پرمکھوں کے ماتحت ہیں اور راج پرمکھوں کا یہ اقتدار حکومت ہند کے ماتحت ہے۔ البتہ ٹراونکور کوچین میں فوج کی ذمہ داری وزارت پر ہے۔

سردار ولبھ بھائی پٹیل نے جس پرامن انقلاب کے ذریعہ ریاستوں کی تنظیم کی ریاست حیدرآباد اس سے مستثنےٰ رہی۔ وہاں ۱۳ سے ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ء تک پولیس کارروائی سے کام لیا گیا۔ وہاں تشدد اور بدامنی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی اور نظام اور اس کی حکومت کی ہٹ دھرمی نے معاملے کو اور بھی خراب کر دیا۔

اپنے مشیروں کے بہکاوے میں آکر نظام نے ریاست کے لئے ایک خود مختار اور مطلق العنان حکومت کا تصور باندھا۔ ان دنوں اتحاد المسلمین نامی جماعت قاسم رضوی کی متعصبانہ رہنمائی میں ریاست کے امن۔ لوگوں کی زندگی اور عزت کو خطرے میں ڈال رہی تھی۔ اس جماعت میں ڈیڑھ لاکھ رضاکار شامل تھے۔ ان رضاکاروں نے آئے دن اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا۔ انتقامی حملے کئے ٹرانسپورٹ اور رسل و رسائل کے سلسلوں میں مداخلت کی۔ عوامی تحریکوں سے متعلق لوگوں کو خوفزدہ کیا۔ سرحد پار کر کے ہندوستان کے علاقے میں منظم حملے کئے۔ ناجائز اسلحہ منگوایا اور ہندوستان کے مسلمانوں میں بے اطمینانی پیدا کی۔ جاسوسوں کا جال بچھایا اور پاکستان کے مسلمانوں میں ہندوستان کے خلاف نفرت پیدا کی۔

حکومت ہند کا نظریہ یہ تھا کہ وہ حیدرآباد میں اس گڑبڑ اور بدامنی کو ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں دیکھ سکتی۔ وہ نظام کا یہ دعویٰ بھی تسلیم نہیں کر سکتی تھی کہ تاج کی سرداری ختم ہو جانے سے وہ ایک مطلق العنان حکمران بن گیا۔ حکومت ہند کا یہ پختہ نظریہ تھا کہ تاج کی سرداری کے ختم ہونے سے ریاستوں کو خود مختیاری کے جو حقوق ملے ان کے مالک ریاستوں کے عوام ہیں۔

پولیس کارروائی مکمل ہو جانے کے دو دن بعد وزارت ریاستہائے ہند کے وزیر سردار ولبھ بھائی پٹیل نے اعلان کیا کہ حیدرآباد کے لوگ حیدرآباد کے مستقبل کا فیصلہ کرینگے۔ ۱۸ ستمبر کو نظام نے ریاست کا انتظام فوجی گورنر میجر جنرل چودھری کو سونپ دیا اور لوگوں سے اپیل کی کہ وہ فوجی گورنر کو پوری مدد دیں۔ ایک نشری تقریر میں نظام نے اس امر کا اعتراف کیا کہ رضاکاروں نے اس پر میر لائق علی کی وزارت مسلط کر دی۔

رضاکاروں نے حیدرآباد کے قانون اور امن کو درہم برہم کر دیا تھا۔ اور پولیس کارروائی سے پہلے ریاست میں بدامنی کا دور دورہ تھا۔ حکومت ہند نے پولیس کارروائی کی تکمیل کے بعد اکتوبر ۱۹۴۸ء تک ریاست میں امن بحال کر دیا۔ اس کام کے لئے فوجی گورنر کو ان بہت سی مشکلات کو عبور کرنا پڑا جو سرکش عناصر نے (جس میں کمیونسٹ بھی شامل ہیں) کی تھیں۔ علاوہ ازیں پولیس اور دیگر افسروں کے فرار سے بھی کئی مشکلات پیدا ہو گئی تھیں۔

وسط دسمبر ۱۹۴۸ء تک ریاست میں مکمل امن و امان ہو گیا تھا۔ فرقہ وارانہ رفاقت کا دور دورہ تھا۔ اور لوگ بے روک ٹوک کاروبار کرتے تھے۔ جو لوگ ریاست چھوڑ گئے تھے انہیں پھر سے آباد کر دیا گیا تھا۔ اور کمیونسٹوں کی سرگرمیوں پر قابو پا لیا گیا تھا۔ سروسوں کی پھر سے تنظیم کی جا چکی تھی اور حکومت کے مالیات کی جانچ پڑتال کی جا چکی تھی۔

حیدرآباد کی عبوری حکومت کی چند اصلاحات قابل ذکر ہیں۔ اس سال کے شروع میں نظام کی شاہی زمینیں جن کا کل رقبہ دس ہزار مربع میل اور آمدنی تین کروڑ روپیہ ہے ریاست کے سپرد کر دی گئیں۔ اس سے پہلے وہ نظام کی ذاتی جائیداد تھیں اور ان کا انتظام براہ راست نظام کے ماتحت تھا۔ یہ انقلابی قدم تھا اور شاید یہی قدم حیدرآباد میں جاگیرداری کو ختم کرنے کا ایک بڑا واقعہ ہے۔ ایک اور اصلاح کے ذریعہ حکومت حیدرآباد نے جاگیروں کو منسوخ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ جاگیریں ریاست کے کل علاقے کا ایک تہائی حصہ ہیں۔ ان جاگیروں کو سنبھالنے اور ان کا انتظام چلانے کا ضابطہ آجکل حکومت ہند اور حکومت حیدرآباد کے زیر غور ہے۔

عبوری حکومت نے ریاست کے رائے دہندگان کی فہرستیں قریب قریب مکمل کر لی ہیں۔ حکومت ہند اپنے اس اعلان کی پابند ہے کہ ریاست کا مستقبل اور ہندوستان سے اس کے تعلقات کا فیصلہ خود ریاست کے لوگ کرینگے۔ لہٰذا اس مقصد کے لئے ایک دستور ساز مجلس بنانے کے لئے بہت جلد انتخابات کرائے جائینگے۔ حیدرآباد کے لوگ اقتدار پرستوں کے غلبے سے رہائی حاصل کر چکے ہیں اور اب وہ اس دن کے منتظر ہیں جب وہ اپنے ووٹوں سے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرینگے۔
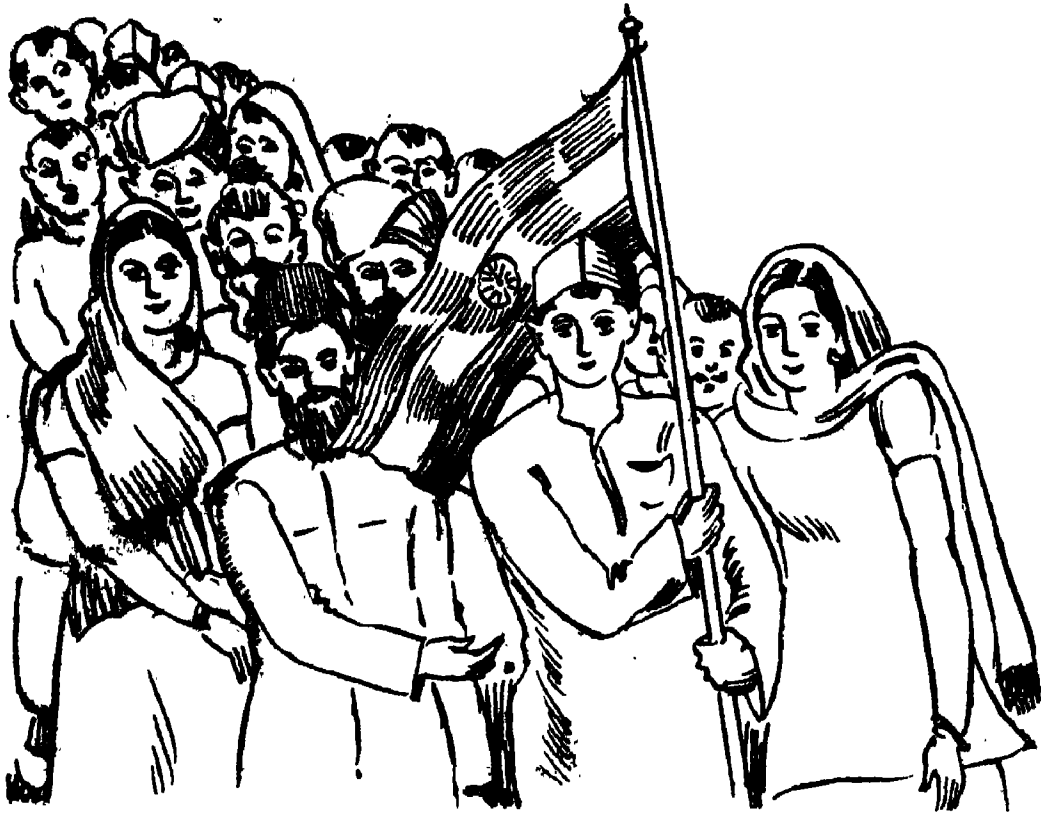
۱۵ اگست ۱۹۴۹ء

جب خورشیدِ آزادی کی پھوٹی تھی کرن وُہ دِن آیا

چمکے تھے ضیائے خاص سے جب کُہسار و دمن وہ دِن آیا

جب قیدِ قفس سے چھُوٹے تھے مُرغانِ چمن وُہ دِن آیا

بے تیغ وسناں جب بدلی تھی تقدیرِ وطن وُہ دِن آیا

ہنگامِ طرب ہے اہلِ وطن ہنگامِ طرب ہے غم نہ کرو

آہستہ روی ہی منزل ہے منزل کا یُونہی ماتم نہ کرو

(عرش ملسیانی)

خواجہ احمد عباس

شمال اور جنوب

شمال کدھر ہے؟ جنوب کدھر ہے؟

روایت کے مطابق شہنشاہ اکبر نے ایک بار بیربل سے پوچھا "مشرق اور مغرب کہاں ہیں؟" بیربل نے جواب دیا "جہاں پناہ بہت دور تک مشرق کی طرف چلے جائیں تو مغرب ہو جاتا ہے اور بہت دور تک مغرب کی طرف چلے جائیں تو مشرق آجاتا ہے"۔

اسی طرح شمال اور جنوب کی بھی اضافی تعریف کی جا سکتی ہے۔

میں ابھی حال ہی میں ہندوستان کے اس جنوبی علاقے کا سفر کر کے لوٹا ہوں جس کے جنوب میں سمندر کے سوا کچھ نہیں ہے یعنی راس کماری۔ جنوبی ہندوستان کی آخری نوک۔ جہاں وسیع ہندوستان تنگ ہوتا ہوتا ایک پتلی خاکنائے میں ختم ہو جاتا ہے۔ ختم ہو جاتا ہے؟ ہاں اگر آپ کا رخ سمندر کی طرف اور پشت ہندوستان کی طرف ہے ورنہ اس کی مخالف سمت میں رخ کریں تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہاں سے ہندوستان شروع ہوتا ہے۔ ابتدا یا انتہا؟ شروع یا ختم؟ اس کا انحصار دیکھنے والے کے رخ پر ہے محسوس کرنے والے کی نفسیاتی کیفیت پر ہے۔ یہاں ہر شام کو مغرب کی طرف منہ کیا جائے تو سورج کے آتشیں گیند کو بحیرۂ عرب میں ڈبکی لگاتے دیکھا جا سکتا ہے اور اگلے دن صبح سویرے مشرق کی طرف دیکھا جائے تو اسی آتشیں گیند کو خلیج بنگال میں سے ابھرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ غروب و طلوع موت اور پیدائش۔ نظامِ عالم کے ابدی ڈرامے کے دونوں رخ یہاں ایک ہی جگہ نظر آتے ہیں۔

یہ ہے جنوبی ہندوستان جہاں ہمارے دیش کی اولیں تہذیب نے جنم لیا۔ یہ ہے وہ سمندر جس کو پار کر کے جنوبی ہندوستان کے رہنے والے نے لنکا، جاوا، سماٹرا، بالی بلکہ میکسیکو اور امریکہ کے سے دور دراز ملکوں تک ہندوستانی تمدن کو پہنچایا اور پھیلایا۔ اس جنوبی ہندوستان میں عظیم سلطنتوں نے جنم لیا۔ یہاں انسان نے تہذیب و تمدن، فن اور ادب کے انمٹ نقوش چھوڑے۔ یہاں کے مندروں کے سنگین مجسموں میں، عوام کے تربیت یافتہ احساسِ فن میں، یہاں کے سنگیت اور رقص میں مصوری اور سنگ تراشی کے شاہکاروں میں، یہاں کی شاندار تمدنی روایات کا پتہ چلتا ہے۔

اس جنوبی اور شمالی ہندوستان کے درمیان ہزاروں برس سے پہاڑوں کا ایک سلسلہ حائل رہا ہے۔ وندھیاچل اونچی بنجر پتھریلی چٹانوں کی ایک دیوار کی طرح وندھیاچل شمال اور جنوب کے درمیان کھڑا ہے مگر اپنی جستجو اور صنعت سے مدت ہوئی انسان اس دیوار کو پھلانگ چکا ہے۔ ریلیں اور سڑکیں وندھیاچل کو چیرتی ہوئی دہلی سے مدراس بلکہ ٹراونکور اور راس کماری تک جا پہنچتی ہیں۔ تار اور ٹیلیفون اور اب ہوائی سفر نے وندھیاچل کی سنگین دیوار کو بے حقیقت بنا دیا ہے۔ آج دن میں کئی ہوائی جہاز صبح سویرے دہلی سے چلتے ہیں اور وندھیاچل پر سے اڑتے ہوئے چند گھنٹوں میں مدراس پہنچ جاتے ہیں۔ ہزاروں ہندوستانی روزانہ شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال آتے جاتے ہیں۔

مگر وندھیاچل کے علاوہ دوسری اس سے بھی اونچی اور مضبوط دیواریں ہیں جو ہندوستان کے شمال اور جنوب کے درمیان حائل ہیں۔ تمدنی ناواقفیت اور جہالت کی دیوار، نسلی تعصب کی دیوار، صوبائی خود غرضی اور خود پسندی کی دیوار۔ تعصب کا یہ عالم کہ شمالی ہندوستان کے ہزاروں بلکہ لاکھوں باشندے سمجھتے ہیں کہ تہذیب اور تمدن کی آخری حد یں وندھیاچل پر ختم ہو جاتی ہیں اور اس کے جنوب میں "غیر متمدن دراوڑ" بستے ہیں۔ غلط تاریخ پڑھائے جانے کی بدولت بہت سے دماغوں میں یہ خیال سمایا ہوا ہے کہ آریوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں تہذیب و تمدن

بکھرک کو اس مضمون کا خاکہ لکھا جا سکتا ہے اور اس طرح شمار

کی روشنی پھیلی نہیں تھی۔ حالانکہ آج سے پانچ ہزار برس پہلے بھی یہ دراوڑ دُنیا کی سب سے زیادہ تہذیب یافتہ قوم تھی جس کے تمدنی عروج کے نشانات موہنجو داڑو اور ہڑپا کے کھنڈروں میں آج تک پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح اکثر جنوبی، شمال کے تمدن کے بارے میں ایسی ہی غلط فہمی رکھتے ہیں۔ تعصب سے زیادہ قصور اپنے ملک کے تمدن سے ناواقفیت کا ہے جس کا تقریباً ہر ہندوستانی شکار ہے۔ شمالی ہندوستان میں کتنے ہیں جو کتھاکلی اور بھارت ناٹیم کے سے اعلیٰ فنونِ رقص سے واقف ہیں۔ جنہوں نے بھارتی [illegible] ولاتھول کے سے عظیم تامل اور تیلگو کے شاعروں کا نام سُنا ہے جو مدورا اور مہابلی پورم کے نادر سنگتراشی کے نمونوں کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟ اور جنوب میں کتنے ہیں جو کتھک رقص، غالب، اقبال اور جوش کی شاعری، سرشار اور پریم چند کے ناولوں اور مغل اور راجپوت مصوری کے بارے میں ذرا سی بھی واقفیت رکھتے ہیں۔

سامراجی ریشہ دوانیوں نے صدیوں تک شمال اور جنوب کے درمیان ہی نہیں بلکہ صوبے صوبے کے درمیان تعصب اور نفرت کی دیواریں حائل رکھیں۔

سامراجی طریقۂ تعلیم نے ہمیں یورپ کی تاریخ پڑھائی مگر اپنے ملک کی اصل تاریخ سے نابلد رکھا۔ انگریزی لٹریچر پڑھایا مگر اپنے ملک کے ادبی خزانوں سے محروم رکھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج لاکھوں پڑھے لکھے شکسپیر کے ڈراموں کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ مگر اُن میں سے اکثر نے کالیداس یا بھاؤبھوتی کا ایک ڈراما بھی نہیں پڑھا۔ ورڈز ورتھ اور بائرن کی نظمیں زبانی یاد ہیں مگر تلسی داس، غالب، سمترانندن پنت، نرالا، دیسی وناٹکم پلّے اور ولاتھول کے سے شاعروں کا اُنھوں نے نام بھی نہیں سُنا۔ بہت سے تو ایسے بھی ہیں جو ولایت میں تعلیم پا کر والٹز اور ٹینگو کے سے مغربی رقص کر سکتے ہیں مگر اُنھیں یہ نہیں معلوم کہ کتھاکلی ناچ کی ایک قسم ہے یا کالا آزار کی طرح کوئی بیماری ہے۔

شمالی ہندوستان میں اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سارے جنوبی ہندوستان میں "مدراسی" بستے ہیں اور وہ سب "مدراسی" زبان بولتے ہیں۔ حالانکہ مدراسی نہ کوئی نسل ہے نہ قومیت نہ زبان۔ جنوب میں چار بڑی زبانیں بولی، لکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔ یعنی تامل، تیلگو، ملیالم اور کنڑی ۔۔ علاوہ کورگی وغیرہ قسم کی چھوٹی بولیوں یا مقامی زبانوں کے۔ تامل میں کلاسیکی اور مذہبی ادب کا ایک شاندار ذخیرہ ہے۔ تیلگو میں ترقی پسند ادب نے بڑی مقبولیت حاصل کی ہے۔ ملیالم میں افسانے اور ناول نے بڑی ترقی کی ہے۔ تامل علاقے میں بھارت ناٹیم کے سے شائستہ اور "نازک ادا" رقص کے فن کو احیا کیا جا رہا ہے۔ اور ملیالی کتھاکلی کو زندہ رکھنے اور اُس کی قدیم روایات کو نئی زندگی کے سانچوں میں ڈھالنے میں مصروف ہیں۔

بعض خود پسند شمالی ہندوستانی یہ سمجھتے ہیں (اور حقارت آمیز انداز سے کبھی کبھی کہتے بھی ہیں)، کہ جنوبی ہندوستانی "مدراسی" تو سب کلرک یا ٹائپسٹ ہوتے ہیں اور اُنھیں یہ نہیں معلوم کہ جنوب نے گورنر جنرل شری راجگوپال آچاریہ ہی نہیں سیکڑوں ہزاروں ممتاز ہستیوں کو پیدا کیا ہے جن میں قانون دان اور قانون ساز، دیش بھگت اور سیاسی لیڈر، انقلابی، بڑے سے بڑے افسر، ادیب، شاعر، کلاکار، فنونِ لطیفہ کے ماہر، اخبار نویس سب ہی شامل ہیں۔ جنوب میں عوام کی ادبی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ تامل کے ایک نہیں دو ہفتہ وار ادبی رسالے ستر اسی ہزار کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ ٹراونکور کے گاؤں گاؤں میں لائبریریاں ہیں اور کسان اور مزدور بھی روزانہ اخبار خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ جنوب میں آرٹ کو سمجھنے اور پسند کرنے والوں کی تعداد شمال سے کہیں زیادہ ہے۔ مدراس میں "پکے" گانے اور کلاسیکی ناچ کی محفلوں میں بیس پچیس ہزار مرد عورت ٹکٹ خرید کر شریک ہوتے ہیں۔ برعکس ہمارے کہ اکثر پڑھے لکھے بھی گھٹیا فلمی گانوں کے علاوہ کسی قسم کا سنگیت سمجھنے سے قاصر ہیں۔

"جنوبی ہندوستان" کی کوئی منفرد ہستی نہیں ہے۔ اس کے سوا کہ شمالی ہندوستان کے علاوہ سارے علاقے کو آپ "جنوبی ہندوستان" کہہ سکتے ہیں "جنوبی ہندوستان" کم سے کم چار لسانی اور تمدنی علاقوں کا مجموعہ ہے۔ تامل دیش (تامل بولنے والوں کا علاقہ جس میں مدراس کے صوبے کا بڑا رقبہ اور ٹراونکور کا ایک ٹکڑا شامل ہے) آندھرا دیش (تیلگو بولنے والوں کا علاقہ جس میں مدراس کے صوبے کا کافی حصہ اور حیدرآباد ریاست کا بیشتر حصہ شامل ہے) کیرالا (ملیالم زبان

بولنے والوں کا علاقہ جس میں ٹراونکور اور کوچین کی ریاستیں اور مدراس صوبے کا مالابار ڈویژن شامل ہیں) اور کرناٹک (کنڑی) زبان بولنے والوں کا علاقہ جس میں میسور کی ریاست، بمبئی صوبے کے چند جنوبی ضلعے اور مدراس صوبے کے چند شمالی ضلعے شامل ہیں) ان میں ہر علاقے کی الگ زبان ہے، الگ معاشرت ہے اور الگ تاریخی روایات ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مدت تک خلط ملط رہنے کی وجہ سے اُن کے آپس میں بہت سی مشترکہ روایات بھی پائی جاتی ہیں مگر بنیادی اعتبار سے وہ ایسی ہی منفرد تمدنی ہستی رکھتے ہیں جیسے بنگال یا بہار یا اودھ۔

ان سب علاقوں میں جو زبانیں بولی جاتی ہیں وہ ہماری زبانوں سے مختلف ہیں۔ ان میں سے اکثر تو سنسکرت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔ رہنے سہنے کے بعض طریقوں میں بھی ان کی معاشرتیں شمالی صوبوں کی معاشرتوں سے الگ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک علاقے اور زبان کا اپنا ادب ہے۔ آرٹ کی اپنی مخصوص روایات ہیں لیکن ان منفرد خصوصیات کے باوجود میں جنوبی ہندوستان میں جہاں کہیں بھی گیا، (مدراس، مدورا، ٹراونکور اور راس کماری میں) میں نے اپنے آپ کو اجنبی محسوس نہیں کیا۔ جنوبی ہندوستان کے ملیالی، تامل اور تیلیگو بولنے والے بھی ایسے ہی ہندوستانی ہیں جیسے ہم لوگ، پنجابی، بنگالی بولنے والے شمالی ہندوستانی۔ یہ "ہندوستانیت" یا ہندوستانی ہونے کا احساس آپ کو کشمیر سے لے کر راس کماری تک ہر جگہ ملے گا۔ اس لئے زبان سے ناواقف ہونے کے باوجود مشرقی پنجاب کا رہنے والا بھی میسور، ٹراونکور یا کوچین میں اپنے آپ کو اجنبی نہیں محسوس کرتا۔ یہ "ہندوستانیت" یا "ہندوستانی پن" یا ہندوستانی ہونے کا احساس کیا ہے اور کن بنیادی مشترکہ قدروں پر مبنی ہے؟

یہ معلوم کرنے کے لئے میں نے یہ دریافت کرنے کی کوشش کی کہ وہ کون سے الفاظ ہیں جو ساری ہندوستانی زبانوں اور علاقوں میں مشترک ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے سیکڑوں الفاظ ہوں گے لیکن ہندوستانی کے تین لفظ جو میں نے جنوبی ہندوستان کی زبانوں میں عام طور سے سُنے وُہ ہیں۔ اَن۔ سُندر۔ اِنقلاب۔

اَن۔ یعنی خوراک یا اناج یا دھان۔ شمال اور جنوب کی ہر زبان میں اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ دہلی کے مغل درباروں میں بادشاہ کو "ان داتا" کہہ کر پکارا جاتا تھا اور آج بھی بنگال میں جایئے یا مالابار میں فقیر اور بھکاری "اَن" کی بھیک مانگتے ہُوئے ملیں گے۔

سُندر اور سُندرتا یعنی خوبصورت اور خوبصورتی۔ یہ الفاظ بھی ہر زبان میں پائے جاتے ہیں چاہے بنگال میں "شندر" کہیں اور تامل دیش میں "سوندریہ"

یہ دونوں لفظ سنسکرت کی جڑ سے نکلے ہیں لیکن "انقلاب" عربی کا لفظ ہے، پھر بھی آج ہندوستان کی کوئی زبان نہیں جس نے یہ لفظ نہ اپنا لیا ہو۔ مدراس کے ایک تیلیگو کے ادبی جلسے میں، ایک آندھرا شاعر کی نظم سُن کر حیران رہ گیا جس میں بار بار "انقلاب" کا لفظ دُہرایا جا رہا تھا۔ اُس کا قافیہ ہی انقلاب تھا۔ ٹراونکور کی راجدھانی ٹراونڈرم کے سٹیشن پر اُترنے کے چند منٹ بعد ہی میں نے دیکھا کہ سوشلسٹ پارٹی کے والنٹیر سائیکلوں پر "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ وسط ٹراونکور کے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں کسانوں کی زبانی اور مدراس، مدورا اور کوٹکوں کے صنعتی مرکزوں کے مزدوروں کی زبانی میں نے یہ نعرہ بار بار سُنا ہے۔ عربی کا "انقلاب" اور فارسی کا "زندہ باد" مل کر ہندوستانی بنا اور اب وہ ملیالم، تیلیگو، تامل، مرہٹی، گجراتی، بنگالی کا جُزو بن گیا ہے۔

اَن۔ سُندر۔ انقلاب۔

روٹی یا دال بھات کا سوال، احساس حُسن، آزادی کی طلب، اور انقلاب کی جدوجہد۔ یہ ہیں ہندوستان کے اتحاد کے تین ستون۔

اقتصادی اعتبار سے سارا ہندوستان ایک ہے۔ سب علاقے ایک دوسرے سے متعلق ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے "دست نگر" ہیں ہندوستان کے عوام کے طبقاتی اغراض ایک ہی ہیں۔ روٹی کپڑے کا سوال سب کے لئے ایک ہی ہے۔

تمدنی، ادبی، جمالیاتی اور فنی اعتبار سے ہندوستان ہزاروں برس سے یگانگی کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ سنسکرت زبان، قدیم آریوں کی روایات، ہندو دھرم اور بدھ مت کے ذہنی اور تمدنی اثرات، مصوری اور

سنگ تراشی کی مذہبی روایات، پٹھانوں اور مغلوں کے آنے کے بعد فارسی اور عربی کا اثر، تمدنی میل جول سے اُردو یا ہندوستانی زبان اور مغل اور راجپوت آرٹ کا ارتقاء، بنگال کے ادب اور آرٹ کا سارے ہندوستان پر اثر، کتھاکلی اور بھارت ناٹیم کی بڑھتی ہوئی مقبولیت شمالی ہندوستان میں۔ یہ تمدنی ملاپ کے وجوہ بھی ہیں اور اس کے علامات بھی کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ جنوبی ہندوستان کی زبانوں میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں الفاظ سنسکرت ہی کے نہیں بلکہ ہندی کے بھی پائے جاتے ہیں اور سیکڑوں ہزاروں فارسی عربی کے الفاظ صرف تامل زبان ہی میں موجود ہیں؛ ہندوستانی فلموں میں اور بہتیری خرابیاں ہوں مگر انھوں نے کم سے کم ہندوستانی زبان کو تو ملک کے کونے کونے میں پھیلا دیا ہے۔

سارا ہندوستان جب سامراج کے زیرِ نگیں آیا تو ہمارے مشترکہ "احساسِ غلامی" نے مشترک قومی احساس اور تحریکِ آزادی کو جنم دیا۔ آج جنوبی ہندوستان کے کونے کونے میں مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، سبھاش بوس، بھگت سنگھ، پنڈت جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، مولانا آزاد، خان عبدالغفار خاں وغیرہ کے نام سے ہر شخص واقف ہے جس طرح شمال میں بچہ بچہ جنوب کے راجگوپال آچاریہ کے نام کو جانتا ہے۔ تحریکِ آزادی کے دوران میں "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ ہر زبان اور ہر لہجے میں گونجا ہے۔ جب شیخ عبداللہ کی "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک ہندوستان کے انتہائی شمال میں چل رہی تھی تو انتہائی جنوب یعنی ٹراونکور کے عوام کشمیر کے بہادر عوام اور اُن کے لیڈروں کے بارے میں ملیالم زبان میں گیت گا رہے تھے۔

راس کماری جنوب میں ہے انتہائی جنوب میں جہاں ہندوستان ختم ہو جاتا ہے یا جہاں سے ہندوستان شروع ہوتا ہے۔ یہاں سے ہندوستان کا انتہائی شمالی کونہ ڈھائی ہزار میل پرے ہے کشمیر میں، جہاں ہندوستان ختم ہو جاتا ہے۔ یا جہاں سے ہندوستان شروع ہوتا ہے۔

سال بھر ہوا میں کشمیر کے شمالی کونے یعنی گریز کی وادی میں تھا اور ابھی میں راس کماری ہو کر آیا ہوں۔

جغرافیائی لحاظ سے یہ دونوں مقام کتنے دور ہیں۔ گریز کتنا سرد ہے اور راس کماری کتنا گرم۔ مگر دونوں ہندوستان میں ہیں دونوں جگہ چاول کھائے اور کھلائے جاتے ہیں۔ دونوں جگہ ہندوستانی مہمان نوازی کی روایات کو زندہ رکھا جاتا ہے۔ دونوں جگہ میرے سے اجنبی کو مقامی باشندوں نے کتنے خلوص سے اپنایا اور مہمان بنایا کیونکہ میں "ہندوستانی" ہوں! دونوں جگہ مذہبی رواداری ہے۔ گریز کے مقامی مسلمانوں کے درمیان چند سو ہندو سکھ اور مسلمان فوجی اور افسر بلا کھٹکے رہتے ہیں۔ راس کماری میں مسلمانوں کے صرف چالیس گھر ہیں مگر وہ ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد تعمیر کر رہے ہیں۔

ہری چند اختر

غزل

کوئی بجلی ادھر نہیں آتی
موت بھی راہ پر نہیں آتی

شبِ ہجراں کا ماجرا ہی کیا
شام آکر سحر نہیں آتی

عشق جی کا زیاں سہی، لیکن
موت کچھ پوچھ کر نہیں آتی

دردِ دل کا علاجِ ترکِ وفا
شرم اے چارہ گر نہیں آتی

شکر ایماں ہے شکوہ کفر، مگر
وجہ کوئی نظر نہیں آتی

مژدہ اے گمرہی کہ اب مجھ تک
نظرِ راہبر نہیں آتی

سید احتشام حسین

ادب میں طنز[1] کی جگہ

اگر یہ صحیح ہے کہ ادب زندگی کا ترجمان اور مصوّر ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا نقاد بھی ہے تو نقد و نظر کے تمام آلے، ادب کے ذریعے سے زندگی کی کشمکش کو سمجھنے سمجھانے اور اس کی ارتقا پذیری اور زوال آمادگی کا تجزیہ اور اظہار کرنے میں ادیب کے شعور کے مطابق کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ تنقید کے مواقع اسی وقت زیادہ حاصل ہوتے ہیں جب کسی واقعے یا تجربے سے خاص قسم کا اثر مترتب ہوا اور اُس اثر کو ظاہر کرنے میں ذہن و فکر کی تمام صلاحیتیں کام میں لگ جائیں۔ اگر یہ اظہار اختلاف یا ناپسندیدگی، حیرت یا نکتہ چینی کی شکل میں نمایاں ہو تو کبھی کبھی لکھنے والے کے مزاج اور اندازِ بیان کی مطابقت سے طنز کی شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ غیر متناسب یا بے محل عناصر کی تنقید میں سنجیدگی سے زیادہ طنز کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے مقلّاً تو ادب میں طنز کو کوئی معمولی جگہ نہیں ملنا چاہئے کیونکہ اس میں اثر انگیزی کی وہ صلاحیّت ہے جو شاعری کے سوا کسی اور صنفِ ادب میں اتنی مقدار میں نہیں پائی جاتی۔

دوسرے اصنافِ ادب کی طرح طنز کی تعریف اور تحدید بھی آسان نہیں۔ بعض لوگ طنز اور مزاح کو اس طرح اُلجھا دیتے ہیں کہ طنز کی حقیقت مزاح میں چھپ جاتی ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ مزاح کی مختلف شکلوں کے درمیان حدِ فاصل کھینچنا دشوار ہے۔ طنز مزاح کے سوا کچھ اور بھی ہے اور یہی "کچھ اور" گرفت میں نہیں آتا۔ یوں تو مزاح اور ظرافت کی فلسفیانہ توجیہہ میں بھی بہت سی موشگافیاں کی گئی ہیں ہنسی کے عضویاتی اور جسمانی عمل سے لے کر اس کی ذہنی اور روحانی کیفیت تک بہت سے اشارے کئے گئے ہیں لیکن طنز میں ایک تضادی کیفیت ہے جو "خوشگوار تکلیف" یا "ناگوار لطف" کے نام سے تعبیر کی جا سکتی ہے طنز میں ناگواری کی جو کیفیت ملتی ہے شاید اسی کی وجہ سے بہت سے لوگ اسے مزاح سے الگ کر کے دیکھتے ہیں چنانچہ تھیکرے اور میریڈتھ دونوں نے مزاح کی اہمیت تو تسلیم کی ہے لیکن طنز کی نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ طنز کا وجود مزاح کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے، ہاں مزاح طنز سے بالکل پاک بھی ہو سکتا ہے۔ خالص ظرافت میں ارسطو کے خیال کے مطابق بھدّاپن اور بدصورتی کا احساس تو ہو سکتا ہے لیکن اذیّت کا احساس نہیں ہونا چاہئے۔ اس طرح ایک بات تو طے ہو سکتی ہے کہ طنز مزاح کی ایک نوع ہے جس میں مقصد کے بدل جانے سے بعض ایسی خصوصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں ظرافت جن کی متحمّل نہیں ہو سکتی۔ طنز اور مزاح میں تفریق پیدا کرنا آسان نہ ہو لیکن معلوم یہی ہوتا ہے کہ ظرافت کا مقصد تفریح ہے اور طنز کا مقصد افراط و تفریط کی اصلاح۔

طنز نگاری کی حدیں ظرافت سے جس جگہ جدا ہوتی ہیں وہاں صرف مقصد اور اندازِ بیان کی دیواریں کھڑی کی جا سکتی ہیں لیکن جو چیز طنز کے سلسلے میں سب سے زیادہ غور طلب ہے وہ طنز اور حقیقت کا تعلق ہے حقیقت کا ادراک کئے بغیر طنز پیدا ہی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اگر کسی کے پاس حقیقت کا کوئی تصوّر نہیں ہے تو وہ کسی قسم کے توازن کی جستجو کر ہی نہیں سکتا طنز کے لئے حقیقت کے ایک ایسے مرکز کی ضرورت ہے جسے ادیب کی نظر میں عمومیت اور توازن حاصل ہو اور جس سے گھٹنا یا بڑھنا اس عمومیت اور توازن میں فرق ڈالتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص طنز کا حربہ استعمال نہیں کر سکتا۔ طنز نگار کے پیشِ نظر حقیقت کا ایک عقلی اور مادی تصوّر ضرور ہونا چاہئے ورنہ اس کا طنز مضحکہ خیز اور بے نتیجہ ہو کر رہ جائیگا اور جس جگہ طنز میں مضحکہ خیزی کا پہلو پیدا ہو وہاں طنز کامیاب نہیں کہا جا سکتا اور

[1] میں طنز کو مذکر استعمال کرتا ہوں۔ احتشام

لفظوں میں یہ کہ طنز محض تخیلی نہیں ہو سکتا اس کا نشانہ کسی مادی حقیقت کو ہونا چاہیئے۔ محض لفظی الٹ پھیر سے ضلع جگت بنتا ہے، معنویت طنز پیدا کرتی ہے اور معنویت کے لئے حقیقت کی اساس لازمی ہے -

زندگی کی مادی رفتار، خیالات پیدا کرتی، ان سے اثر لیتی، اپنی رَو میں فلسفے، مذہب، اخلاق اور تمدن کے دوسرے مظاہر کو جنم دیتی ہوئی چلتی ہے، انہیں نئے سانچوں میں ڈھالتی، نئی صورتوں میں نمایاں کرتی، نئی شکلوں میں تشکیل دیتی ہوئی آگے بڑھتی ہے لیکن دونوں کا تعلق کسی ایسی یکسانی اور ہم آہنگی پر مبنی نہیں ہوتا کہ کسی حکیمانہ اصول سے ان تغیرات کے تمام گوشوں کو بے نقاب کیا جا سکے یا ان کی توضیح و تشریح میں تمام تفصیلات کا جائزہ لیا جا سکے۔ تجزیہ بڑی حد تک دونوں کے تعلق کو واضح کر سکتا ہے لیکن اگر مطابقت ملے تو اس کے وجود اور اگر نہ ملے تو اس کے وجوہ کی جستجو سائنس، فلسفے اور منطق کا کام ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جہاں ادب اور زندگی میں مطابقت ملتی ہے وہاں بھی حکیمانہ نگاہ کی ضرورت ہے جو اس تعلق کی نوعیت معلوم کر سکے اور جہاں اختلاف نظر آتا ہے وہاں اختلاف کا سبب معلوم کر سکے - ادب میں حقیقت کی جستجو کا یہی مطلب ہے - ہوتا یہ ہے کہ انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر، طبقوں اور گروہوں میں بٹ کر، شعوری یا غیر شعوری طور پر بعض ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو کسی دوسرے شخص، طبقے، گروہ یا جماعت کی نظر میں کھٹکتی ہیں اور اختلاف یا تنقید کی صورت پیدا ہوتی ہے اور اسی اختلاف اور تنقید کا ذکر طنز نگار اپنے مخصوص طریقے اور انداز بیان کے ساتھ کرتا ہے -

عام طور سے متمدن اور نارمل زندگی میں چند اخلاقی، ادبی، سیاسی، مذہبی، تہذیبی اور سماجی معیار بن جاتے ہیں، اُن پر مسلسل عمل پیرا ہونے کی وجہ سے اُن میں ایک طرح کی روانی پیدا ہو جاتی ہے، ہر شخص یا اکثر اشخاص ان چیزوں کو اسی طرح دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں، رسم و رواج اور روایت بنا لیتے ہیں اور عادتاً اُسے درست تسلیم کرتے ہیں، جب اس مقررہ معیار سے کوئی آگے بڑھ جاتا ہے یا کوئی گروہ اس سے پیچھے چھوٹ جاتا ہے تو نکتہ چینی کے دروازے کھلتے ہیں اور اس تصادم میں طنز کے تیر و نشتر کام میں لائے جاتے ہیں - دونوں طرف اپنی بات کے صحیح ہونے کا خیال اس درجہ پختہ ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کا احترام بھی نہیں کرنا چاہتے - یہ فلسفۂ معاشرت کا ایک اہم مسئلہ ہے کہ انسانی رسم و رواج، روایت اور آداب زندگی میں جو تبدیلیاں ہوتی ہیں اُن کے قبول یا رد کرنے میں عام افراد کو کیا رویّہ اختیار کرنا چاہیئے جب ایک طریقہ بالکل بدل چکتا ہے اور کوئی شخص اُسے اپنے کلیجے سے لگائے رکھتا ہے تو بدل جانے والوں کے یہاں اس قدیم طریقے کا مذاق اُڑانے کا جذبہ ضرور پیدا ہوتا ہے کیونکہ سماجی زندگی میں جو تبدیلی ہوتی ہے اُس کا انکار کرنے والے غلط روی کے مجرم نظر آنے لگتے ہیں - یہ بحث الگ ہے کہ کس کا راستہ صحیح کس کا غلط ہے، کس کا نقطۂ نظر درست اور کس کا نادرست ہے، ہوتا یہی ہے کہ مقررہ معیار سے ادھر یا اُدھر ہونے والے طنز کے تیروں کا نشانہ بنتے ہیں - ہو سکتا ہے کہ طنز نگار کا نقطۂ نظر محض انفرادی ہو یا اُس کے مزاج میں کلبیت پائی جاتی ہو اور وہ خود سماج کے عام معیارِ ارتقا اور تغیر کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہو لیکن ہمیں طنز نگار کے نقطۂ نظر کا مطالعہ بھی سماجی نقطۂ نظر ہی سے کرنا چاہیئے کیونکہ ایک انفرادیت پرست اور رجعت پسند طنز نگار ہر اُس چیز کا مذاق اڑائے گا جو سماج میں تغیر اور ارتقا کا مطالبہ کرتی ہے اور ترقی پسند طنز نگار رجعت پرستی، قدامت پسندی اور انحطاط دوستی پر وار کرے گا۔ یعنی ادب کے دوسرے شعبوں کی طرح طنز نگاری کی بھی سماجی حقیقت پسندی ہی کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش مفید ہو سکتی ہے طنز نگاری کو محض ایک تفریحی مشغلہ سمجھ کر تنقیدی نقطۂ نظر سے نہ دیکھنا طنز نگار کے طبقاتی رجحان پر پردہ ڈالنے کے مترادف ہوگا -

فرد، سماج اور فطرت - ادب کے یہی موضوع ہیں - طنز نگار بھی مختلف شکلوں میں انہیں کو اپنا موضوع بناتا ہے - انفرادی کمزوریوں یا "شہزوریوں" کی بہت سی شکلیں ہو سکتی ہیں، ان کا انوکھا پن قابل تحسین بھی بن سکتا ہے اور قابلِ ملامت بھی - جہاں دوسرے اصناف ادب سے دلچسپی لینے والوں کو فرد کی اور باتیں متوجہ کرتی ہیں طنز [illegible] اُس انوکھے پن، عجب اور عدم اعتدال پر نگاہ رکھتا ہے جو اُس [illegible] حقیقت کے تصور سے مختلف ہے - جسمانی کمزوریوں یا فطرت کے [illegible] ہوئے نقائص کا مذاق اُڑانا اچھے طنز نگار کو زیب نہیں دیتا وہ [illegible]

انہیں نقائص اور زیادتیوں پر کرتا ہے جنہیں دور کرنے پر انسان قادر ہے۔ ایک اندھا اگر کسی چیز کو نہ دیکھے تو یہ طنز کا موضوع نہیں لیکن اگر آنکھوں والا نہ دیکھے تو طنز نگار کا قلم جنبش میں آسکتا ہے۔

بہرحال فرد بھی طنز کا موضوع بن سکتا ہے لیکن اگر اس میں کینہ پروری، طعن و تشنیع، غصہ اور دشنام طرازی کا رنگ پیدا ہو جائے گا تو طنز نگاری ہجو کی حد میں داخل ہو جائے گی۔ گو یہ ضروری نہیں کہ ہر ہجو محض انفرادی غصہ و غم کا اظہار ہوتا ہم ہجو میں بد نیتی اور ذاتی ناپسندیدگی کا جذبہ نمایاں ہوتا ہے۔ اردو میں سوداؔ کے یہاں دونوں طرح کی ہجویں ملتی ہیں۔ کسی سے ان کی ذاتی پرخاش ہے اور کسی سے اصولی، مذہبی، علمی یا معاشرتی۔ دونوں کے کالے مختلف رنگ رکھتے ہیں اور دونوں کے مقاصد مختلف ہوتے ہیں۔ ذاتی نقص جب سماج کے لئے نقصان رساں بن جاتا ہے اس وقت فرد پر طنز بھی اہمیت اختیار کر لیتا ہے چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سماجی یا اخلاقی اصلاح کی پشت پناہی کے بغیر طنز طنز نہیں بن سکتا۔ جہاں کوئی اعلےٰ اخلاقی یا اصلاحی مقصد مفقود ہوگا وہاں طنز کا دار نشانے پر ٹھیک نہیں بیٹھے گا۔

فرد کی سماجی حیثیت جب طنز کا موضوع بنتی ہے تو اس کا دائرہ وسیع ہو کر اُس شعبۂ زندگی کو پوری طرح گھیر لیتا ہے جس کی نمائندگی کوئی شخص فرد کی حیثیت سے کرتا ہے۔ یہاں سے سماجی اور سیاسی طنز نگاری شروع ہوتی ہے جس کی اہمیت صرف ایک صنفِ ادب کی حیثیت سے مسلّم نہیں ہے بلکہ احاطۂ اثر اور دائرہ عمل کے لحاظ سے بھی۔ اس بات پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں کہ ہر دور میں طنز نگاری کے انداز مختلف ہوں گے۔ جاگیردارانہ نظام میں انفرادی ہجو کے علاوہ اُن اخلاقی قدروں کا ذکر طنز کے لئے لازمی ہوگا جن کو اُس دور میں اہمیت حاصل تھی چنانچہ فردوسیؔ، انوریؔ، عبید زاکانی، سوداؔ اور انشاؔ کے ہجویات میں درباری زندگی۔ جاگیردارانہ نظام کے اخلاقیات اور ذاتی منافرت اور اختلاف کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ اُن کے سماجی پہلو واضح نہیں ہوتے۔ درباروں میں طعن و تعریض، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی سے کام بنتے تھے اور یہ کام اپنی ذات تک محدود ہوتے تھے اس لئے فارسی اور اردو میں سیاسی اور سماجی طنز جستہ جستہ قدیم شعرا کے یہاں ملتا ہے۔ دورِ جدید میں جو معاشی، معاشرتی اور سیاسی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ انھوں نے سودا کے ہجووں کی جگہ طنز نگاری پیدا کی جس کی تہہ میں موجودہ معاشی نظام کی کشمکش اور سیاسی تصادم کی کارفرمائی ہے۔ سوئفٹ کی بے پناہ طنز نگاری سرمایہ دارانہ سماج کی بدعنوانیوں کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ اکبر الہ آبادی اپنی قدامت پرستی اور مذہبیت کے باوجود موجودہ دور کے سوا اور کہیں کھپ نہیں سکتے تھے۔ آج سرمایہ داری اور سامراج کا بوسیدہ نظام سیاسی طنز کو نئی توانائی بخش رہا ہے اگر نگاہ اُردو ادب تک محدود رکھی جائے تو اس کا اظہار کبھی کبھی جوش کی شاعری میں اور اکثر و بیشتر کرشن چندر کے افسانوں میں ہوتا ہے۔ یہ اندازِ نظر کی تبدیلی بھی اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ اگر طنز کی تہہ میں سماجی حقیقت نہ ہو تو وہ ایک حربے کی حیثیت سے استعمال نہیں کیا جا سکتا حالانکہ طنز میں حقیقت کو اس طرح کام میں لایا جاتا ہے جس طرح کارٹون بنانے والا واقعات اور افراد کو اپنے کام میں لاتا ہے۔ کبھی کبھی حقیقت مبالغے میں چھپ جاتی ہے اور کبھی حقیقت کے اس پہلو پر زور ہوتا ہے جس کے نقش کو طنز نگار اپنے قلم اور پڑھنے والوں کے ذہن کا مرکز بنانا چاہتا ہے۔

طنز میں حقیقت کی جگہ کا سوال پھر آگیا تو فرائڈ کا خیال آیا جس نے ظرافت اور مذاح کا تجزیہ اپنے جنسی فلسفۂ نفس کی روشنی میں کیا ہے اور مزاح کی تخلیق کو بھی خواب کی تخلیق سے مشابہ ظاہر کیا ہے۔ دونوں میں حقیقتیں بھیس بدل کر ظاہر ہوتی ہیں اور ایسی نقاب چہرے پر ڈال لیتی ہیں جس سے پہچانی نہ جا سکیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ لاشعوری اندھیرے سے بھیس بدل کر نکلنے والی ظرافت خواب سے بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ یہاں فرائڈ کے خیال کی تنقید مقصود نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ اس نے بھی ایک حیثیت سے حقیقت کی بنیادی جگہ کو تسلیم کیا ہے حالانکہ اُس کے یہاں تقریباً ساری حقیقتیں لاشعور کی دنیا میں بستی ہیں۔ فرائڈ کے ان اشارات سے یہ بات ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ طنز میں حقیقت پیچیدہ ہو کر اندازِ بیان کے لوازم کے ساتھ رونما ہوتی ہے۔ اس میں تشبیہہ اور استعارے کے پیچ ہوتے ہیں، تمثیلوں کی طرف اشارے ہوتے ہیں اور علامات و تلمیحات کے پردے۔ طنز میں وار کبھی سیدھا نہیں ہوتا اور اگر سیدھا ہوا تو ہلکی سی خراش ڈال کر گزر جاتا ہے۔ طنز کی پیچیدہ اور چھپی ہوئی حقیقت کی نہیں

کچھ تو انداز بیان سے کھلتی ہیں اور کچھ پڑھنے والے کے تخلیقی ذہن کی شمولیت سے کیونکہ طنز نگار کا مقصد اگر محض انفرادی اور ذاتی غصہ و غم کا اظہار نہیں ہے تو اس کا تخاطب عقل اور عمومی تصورات سے ہوتا ہے۔ طنز اُن اصناف ادب میں ہوتا ہے جن میں موضوع کے ساتھ انداز بیان کا تعلق بہت گہرا ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات تو انداز بیان ہی پر طنز کی کامیابی کا انحصار ہوتا ہے۔ ایجاز اور اختصار، ذکاوت و ذہانت کے میل سے طنز کے تیر و نشتر تیار ہوتے ہیں۔ دشمن سے دشمنی کا اظہار اور پڑھنے والوں کی ہمدردی حاصل کرنا، زہر میں بجھے ہوئے جملے لکھنا اور پڑھنے والوں کو اپنے ساتھ رکھنا آسان نہیں لیکن طنز نگار کے انداز بیان کا یہ جادو ہے کہ پڑھنے والا نہ صرف اس سے متاثر ہوتا بلکہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر خود اپنی شخصیت کا جائزہ لینے لگتا ہے۔ جس جگہ یہ احساس ہو جائے کہ طنز کسی ذاتی کینے اور بغض کا نتیجہ ہے اس وقت دوسروں کی ہمدردیاں ساتھ نہیں ہو سکتیں لیکن اگر طنز میں فراخدلی، وسیع القلبی اور انسانی ہمدردی کے عناصر نظر آئیں تو طنز اعلیٰ ادب بنتا ہے۔ حالات کو بہتر بنانے کی خواہش، انسان دوستی کا جذبہ اور ذاتی غصے کو پی جانے کی طاقت کے بغیر کوئی اچھا طنز نگار نہیں بن سکتا۔ اس نکتہ پر اس قدر زور دینا اس لئے ضروری ہو گیا کہ بعض حضرات سوئفٹ اور دوسرے طنز نگاروں کو انسانی بہبود کے جذبے سے خالی پاتے ہیں۔ حالانکہ انہیں یہ نہیں معلوم کہ طنز منفی ہوتے ہوئے بھی مثبت اثر پیدا کرتا ہے۔

بہر حال طنز نگاری ہلکی پھلکی مزاح نگاری کی طرح بے مقصد نہیں ہوتی، وہ ہنسی کے سوا کچھ اور چاہتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ مزاح کے بغیر طنز گالی بن جاتا ہے اور وہ اثر پیدا نہیں کرتا جس کے لئے طنز کا حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ طنز میں مبالغے کا عنصر بعض اوقات اسے یک طرفہ بنا دیتا ہے اور حقیقت کے اچھے پہلوؤں کو نظر انداز کرتا معلوم ہوتا ہے لیکن اپنے مقصد اور اثر اندازی کے پیش نظر، اپنے اخلاقی اور اصلاحی مقصد کے لئے اس کے لئے صرف انہیں عناصر کو طنز کی روشنی میں لانا مناسب معلوم ہوتا ہے جو اصلاح چاہتے ہیں۔ طنز نگاری اپنی پوری قوت ایک خاص نقطے پر مرکوز کر دیتا ہے تاکہ وہ ضروری اثر پیدا کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جس پر طنز کا وار ہوتا ہے اگر وہ شگفتہ طبیعت اور وسیع القلب نہ ہو تو برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک مغربی شاعر نے طنز کو ساتی (سیہہ) سے تشبیہ دی ہے، خاص جذبات کے تحت جس کے جسم کے تمام کانٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ طنز نگار کبھی اپنی مدافعت کے لئے اور کبھی حملہ کرنے کے لئے اپنے زہر آلود تیروں اور نشتروں سے مسلح ہو جاتا ہے۔

سماجی اور سیاسی طنز کو ادبیاتِ عالم میں بہت اہم جگہ حاصل ہے کیونکہ اس سے نہ صرف مخالف طاقتوں کو پسپا کرنا مقصود ہوتا ہے بلکہ خود اپنی جماعتی اور قومی زندگی کی اصلاح بھی اسی کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ طنز نگار سے زیادہ اور کسی میں یہ جرأت نہیں ہوتی وہ "خود" اپنی حکومت اور "اپنی" قوم کی خامیوں کا مذاق اڑا سکے۔ غالباً چینی مصنف لن یوٹانگ نے لکھا ہے کہ اگر جنگ چھڑنے والی ہو تو آمادہ جنگ ملکوں کے طنز نگاروں اور مزاح نویسوں کو فیصلہ کرنے کے لئے اکٹھا کر دینا چاہئے اور جنگ کبھی نہ شروع ہو سکے گی۔ اس طرح طنز نگار انسان دوست بن کر ہمارے سامنے آتا ہے وہ معاشرت میں توازن اور انصاف قائم کرنے کی جد و جہد میں زبردست آلے کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔ طنز کا پودا معاشرتی ہیجان سیاسی کشمکش کی ہواؤں میں پنپتا ہے کیونکہ جب کچھ نئے خیالات قبول کرنے کچھ پرانی روایات کے چھوڑنے کا وقت آتا ہے تو سماج کا وہ روایتی توازن درہم برہم ہو جاتا ہے جس میں عمومیت اور مانوس انداز پیدا ہو چکا تھا۔ طنز نگار کی ظرافت اور خوشدلی میں درد و غم کی ایک ہلکی سی آمیزش بھی پائی جاتی ہے جو اس کی انسان دوستی اور بہتری کی زبردست خواہش کا نتیجہ ہوتی ہے اور اُس کے طنز کی تلخی گہرا درد کروٹیں لیتا معلوم ہوتا ہے۔

اس وقت اردو طنز نگاری کا تجزیہ یا اس پر تبصرہ پیش نظر نہیں ہے حالانکہ مذکورۂ بالا خیالات کے آئینے میں اردو طنز نگاری کی مختصر سی تاریخ کا جائزہ لینا کچھ ایسا مشکل نہیں رہ جاتا۔ تاہم یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ طنز کی سماجی اور سیاسی نوعیت پوری طرح

دور جدید ہی میں نمایاں ہوتی ہے کیونکہ موجودہ معاشرتی اور سیاسی ہلچل میں طنز نگار کے لئے موضوع اور مواد کی کمی نہیں۔ غلامی مغرب کی نقالی، اقتصادی زبوں حالی، بے روزگاری، جنسی بے راہ روی، غمِ دوراں اور غمِ جاناں، فرقہ پرستی، رجعت پرستی، ترقی پسندی، رشوت، چور بازاری، سرمایہ داری، جاگیرداری، اور صنعتی دور کی قدروں میں تصادم، فریبِ آزادی، جمہوریت، حقوقِ نسواں، انجمن سازی، موت کی سوداگری اور کفن فروشی — ان گنت موضوع ہیں جن کی کل کہیں نہ کہیں سے ٹیڑھی ہے اور طنز نگار کی حساس، ہمدرد اور دور رس نگاہ اس ٹیڑھے پن کا پتہ چلا لیتی ہے۔ یہ موضوعات اس شکل میں دور جدید سے پہلے اگر تھے بھی تو اس طرح بے ہنگم اور ٹیڑھے میڑھے نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے دورِ جدید نے ایسے طنز نگار پیدا کئے جو کشمکش، تصادم، اضطراب اور ہیجان کے سماجی اور سیاسی پس منظر میں اس طرح کے نقوش ابھار سکتے ہیں جن سے دورِ جدید کی سماجی اور سیاسی زندگی کا گھناؤنا پن اپنی [illegible] اور [illegible] کے ساتھ نمایاں ہو جائے۔ محفوظ علی، اکبر الٰہ آبادی، ظفر علی خاں، قاضی عبدالغفار، سندباد جہازی، رشید احمد صدیقی، [illegible]، جوش ملیح آبادی، کرشن چندر، کنہیا لال کپور، ابھی کوئی [illegible] [illegible] تک نہیں پہنچا ہے لیکن ان میں سے کسی کسی کے یہاں کبھی کبھی طنز کا وہ اعلیٰ معیار جھلک اٹھتا ہے جس میں بیک وقت ظرافت، تلخی، انداز بیان کی [illegible]، گرمی، انسانیت اور مقصد کی بلندی کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے [illegible] ہوئے کمانوں سے بھی کبھی کبھی ایسے تیر چھوٹتے ہیں جو فضا کے سناٹے کو چیر کر رکھ دیتے ہیں اور نشانے پر ٹھیک بیٹھ جاتے ہیں۔

حامد حسن قادری

تضمین غزل فانی بدایونی

دل میں تو ہے، تری خدائی ہے — کُل کی اک جزو میں سمائی ہے
ذرّے میں شانِ رونمائی ہے — قطرہ دریا سے آشنائی ہے
کیا تری شانِ کبریائی ہے

یہ جو رنگِ شبِ جدائی ہے — یہ جو نالوں کی نارسائی ہے
تیری مرضی یہ سب خدائی ہے — تیری مرضی جو دیکھ پائی ہے
خلش درد کی بن آئی ہے

نعمتیں داغِ دل کی کس کو نہ دیں — کس کو زخموں کی لذتیں نہ ملیں
غم سے محروم کوئی بھی ہے کہیں؟ — کون دل ہے جو درد مند نہیں
کیا ترے درد کی خدائی ہے

ہر کہیں تو ملا، کہاں نہ ملا — ذرّے ذرّے میں [illegible] ملا
ہاں پتے کی کہیں، تو ہاں نہ ملا — وہم کو بھی [illegible]، ملا
نارسائی سی نارسائی ہے

کیوں اسی جستجو میں جان نہ دوں — کہیں دیکھوں اسے، کہیں تو ملوں
میری آوارگی نہیں ہے جنوں — جلوۂ یار کا بھکاری ہوں
شش جہت کا [illegible] ہے

جاں نثاری کے جس کو ہوں دعوے — منزلِ عشق میں قدم رکھے
امتحاں ہو رہے ہیں ہمت کے — بچھ گئے [illegible] میں کانٹے
کس کو عذرِ برہنہ پائی ہے

یاس کی تھی جو پاؤں میں زنجیر — [illegible] عشق کا [illegible]
حسرتیں پھر ہوئیں گریباں گیر — آرزو [illegible]
سعیِ ناکام کی دہائی ہے

عزم حامد سے کام لے فانی — جائے جاں [illegible]
کہہ نہ ہو ارمان کے فانی — موت ہی ساتھ دے تو ہے [illegible]
عمر کو عذرِ بے وفائی ہے

اوپیندر ناتھ اشک

رس پان

بھاگ کر اپنے کمرے کی زنجیر لگاتے ہی نند کشور بستر میں دھنس گیا۔ یہ آخر اُسے کیا ہو گیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس کا دماغ تیزی سے چکر کھاتا ہوا سائیکل کے اُس پہیے کی مانند ہو رہا تھا جس کی ایک تیلی بھی نظر نہ آ رہی ہو۔

بار بار اسے یہی خیال آتا ——— اس ٹیوشن کو اس نے کیوں کر لیا؟ کیوں اُس نے بھائی کا مشورہ نہ مانا؟ اور جب ٹیوشن کی بابت تو جب پہلے پہل اُسے خطرے کا احساس ہوا تھا تو اسی وقت اُسے کیوں نہ چھوڑ دیا!

• • •

نند کشور میٹرک ہی میں تھا جب اس کے والدین انتقال کر گئے میٹرک کے بعد چار سال تک بڑے بھائی کی مدد سے وہ بی۔ اے تک پڑھا تھا۔ لیکن یہ چار سال کا زمانہ بھاوج کی تنگ دلی اور طعن و تشنیع کے باعث اس نے سخت ذہنی کرب میں گزارا تھا۔ اس لئے جب بی۔ اے کے امتحان کا نتیجہ نکلتے ہی اُسے لالہ شنکر دیال کی بیٹی رینو کو پڑھانے کی ٹیوشن ملی تو وہ بے حد خوش ہوا اور اُس نے فوراً اُسے منظور کر لیا تھا۔

لیکن اس کے بڑے بھائی اس ٹیوشن کے حق میں نہیں تھے۔ وہ کسی وقت لالہ جی کے دفتر میں کلرک تھے، اور اگرچہ کلرکی چھوڑ کر اب انھوں نے تجارت شروع کر دی تھی۔ پھر بھی چونکہ اب لالہ جی ان کے خاص گاہکوں میں سے تھے۔ اس لئے وہ اب بھی ان کا کافی لحاظ کرتے تھے اور ان کے غیظ و غضب سے بھی بخوبی آشنا تھے۔ پھر رینو کی عمر اگرچہ گیارہ بارہ سال ہی کی تھی لیکن اس کے شباب کی کلی وقت سے پہلے ہی کھل گئی تھی۔ اُمنڈنے کو بیتاب اس طوفان کے چرچے کالونی بھر میں تھے۔ اور نند کے بھائی کو اپنی عزت و غیرت ہی کی نہیں، نند کے مستقبل کی بھی فکر تھی۔

"لڑکی جوان ہے، خوبصورت ہے، اور رنگ ڈھنگ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُڑنے کو بیتاب ہے"۔ انھوں نے ٹیوشن کی بات سن کر نند سے کہا تھا "تم کتنے ہی پاکباز کیوں نہ بنو ہمارے رشیوں منیوں سے بڑے نہیں ہو۔ لالہ شنکر دیال بڑے سخت مزاج انسان ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ اس لڑکی کی وجہ سے کئی ٹیوٹر پٹ چکے ہیں۔ کیوں جان بوجھ کر مصیبت مول لیتے ہو۔ کچھ روز ٹھہر جاؤ۔ روٹی تو گھر میں روکھی سوکھی مل ہی جاتی ہے۔ آرام سے کوئی اچھی سی ملازمت دیکھو۔ کیوں عجلت کرتے ہو۔ آبرو کا محل عمر بھر کی محنت سے بنتا ہے لیکن اسے گرنے میں ایک پل بھی نہیں لگتا"۔

نند کشور آبرو کے محل کی بات سمجھتا تھا۔ لیکن گھر میں جو "روکھی سوکھی" ملتی تھی اُس کی حقیقت سے بھائی صاحب ناواقف تھے۔ بھابی کی زہر بھری طنز سے بھی وہ چپڑی روٹی جسے بھائی صاحب از راہِ انکسار روکھی سوکھی کہا تھا، اب نند کے لئے ایک دن کو بھی ناقابلِ برداشت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بھائی کے منع کرنے کے باوجود اس نے ٹیوشن منظور کر لی تھی۔

رشی منیوں سے اس کا مقابلہ کر کے بھائی صاحب نے جو طنز کیا تھا اُس کے پیشِ نظر نند نے ٹیوشن پر جانے سے قبل دل ہی دل میں اپنے طرزِ عمل کا خاکہ بنا لیا تھا ——— پڑھاتے وقت وہ کبھی اپنی شاگرد سے آنکھ نہیں ملائے گا۔ کبھی اِدھر اُدھر کی بات نہیں کرے گا۔ ہنسنا مسکرانا چھوڑ کر اُستادانہ سنجیدگی کو اپنا شعار بنائے گا۔ وقت سے ایک لمحہ زیادہ نہیں پڑھائے گا وغیرہ۔

اُس نے ایسا ہی کیا بھی۔ اپنے اس طرزِ عمل میں ذرّہ برابر بھی فرق نہ آنے دیا تھا۔ دھنکی ہوئی روئی کے سے اپنے ہلکے پھلکے دل کو اُس نے یخ بستہ چٹان سا بنا لیا تھا۔ چٹان کی یخ بستگی میں کسی طرح کی کمی نہیں

آ ئی تھی لیکن آگ پہلے دوسری طرف لگی تھی۔

• • •

پڑھاتے پڑھاتے ایک دن اُس نے اپنی استادانہ سنجیدگی اور درشتی کی جھونک میں ایک طمانچہ اپنی اس شاگرد کے منہ پر رسید کردیا۔ پانچوں انگلیوں کے نشان اُس کے گورے گال پر بن گئے۔ اور اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔

لیکن فوراً ہی نند کو اپنی اس غلطی کا احساس ہوگیا۔ کچھ ہی روز قبل لالہ جی نے اُسے ایک ٹیوٹر کا قصہ سنایا تھا جس نے رینو کو پیار سے ایک ہلکی سی چپت لگائی تھی۔ اور جواب میں نہ صرف اپنی نا اہل شاگرد بلکہ اس کے قابل والد بزرگوار سے بھی جوتے کھائے تھے۔

اس بات کا خیال آتے ہی نند نے مضطرب ہوکر کہا: "مجھے معاف کرنا رینو۔ غصے میں مجھ سے غلطی ہوگئی۔ لالہ جی نے مجھے جتا بھی دیا تھا۔ لیکن اتنی بار میں نے تمھیں یہ سوال سمجھایا ہے۔ پھر بھی تم نے غلط ہی جواب دیا۔ خیر اب ایسا نہیں ہوگا۔ مجھے معاف کردو"۔

"آپ سو طمانچے لگا دیجئے ماسٹر جی میں کیا کچھ کہتی ہوں"۔

اور نند نے دیکھا کہ اُن آنسوؤں کے باوجود رینو کے ہونٹوں پر ایک خفیف سے تبسم کی لکیر ہویدا ہوگئی۔

نند کا ماتھا اُسی دن ٹھنکا تھا۔ اور وہی پہلا دن تھا جب اُسے ٹیوشن چھوڑنے کا خیال آیا تھا۔ لیکن اس کی حالت اُس شخص کی سی تھی جس کے عقب میں خوفناک درندہ ہو۔ اور سامنے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔

سمندر کی طغیانی سے خود کو بچانے کے لئے اُس نے دل کی چٹان کو اور بھی مضبوط بنا لیا تھا۔ اپنی اس شاگرد سے، جسے اُس نے چھوٹی سی لڑکی سمجھا تھا، اُسے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ آنکھوں کو نیچے کئے (بغیر دیکھے کہ لڑکی پڑھنے کے عوض اس کے منہ کی طرف دیکھ کر اپنے ٹیوٹر کے شرمیلے پن پر مسکرایا کرتی ہے) اِدھر اُدھر کی کوئی بات کئے بغیر وہ وقت پر آتا مستعدی سے پڑھاتا اور وقت ختم ہونے پر اٹھ جاتا۔ وہ اس بات کا کوئی موقع ہی نہ آنے دیتا کہ گھریا باہر کی کوئی بات شروع ہو۔

اور پھر ایک دن جب بار بار سمجھانے پر (سوال کی طرف کوئی توجہ نہ ہونے کے باعث) لڑکی کی سمجھ میں سوال نہیں آیا۔ یا وہ جان بوجھ کر شرارت سے مسکراتے ہوئے ——— "جی میں سمجھی نہیں"۔ کہتی گئی تو مایوس ہوکر اپنے تمام ضبط کے باوجود آنکھیں اوپر اٹھا کر نند نے غصے میں کہا ——— "اتنا تنگ کرتی ہو تم کہ اگر لڑکیوں کو پیٹنا بُرا نہ ہوتا تو مار مار کر تمہارا منہ لال کردیتا"۔

"لال کردیجئے، اگر اس سے آپ کا غصہ اُتر جائے"۔ اپنے گال کو ذرا آگے بڑھا کر مسکراتے ہوئے اور اپنی آنکھوں کو نند کے دل کی گہرائیوں میں اُتارتے ہوئے رینو نے کہا۔

اس نگاہ میں، لہجے میں، مسکراہٹ میں نہ جانے کیا تھا کہ نند کی تمام جھنجھلاہٹ ایک پسپا مسکراہٹ میں تبدیل ہوگئی۔

یہ مسکراہٹ پہلی دراڑ تھی جو سمندر کے متواتر حملوں سے چٹان میں پیدا ہوگئی تھی۔ اس کے بعد وہ دراڑ بڑھی اور شگاف بن گئی اور وہ چٹان ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بہنے لگی۔

اور پھر بہت کوشش کرنے پر بھی اس بڑھتے ہوئے طوفان کا مقابلہ کرنا اس کے امکان سے باہر ہوگیا۔ کئی بار اس نے رُکنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی تمام کوششیں سمندر میں بہتے ہوئے ایک حقیر سنگریزے کی کوششیں بن کر رہ گئیں۔

• • •

لیکن جس طرح وہ تیزی سے بہے جا رہا تھا اسی طرح اُسے یکایک رُکنا بھی پڑا۔ رینو کے ساتھ اس کے اس عشق کا راز ایک روز افشا ہوگیا۔ وہ رینو کی آغوش میں تھا کہ اُنھیں دیکھ لیا گیا۔ رینو اُچھل کر پرے جا کھڑی ہوئی۔ اور نند بھاگ کر اپنے کمرے میں آ چھپا۔

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ماتھے پر پسینہ آگیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ دماغ کا پہیہ تھا کہ مسلسل گھومے جا رہا تھا۔ وہ کیوں ٹیوشن چھوڑ کر نہ چلا گیا ——— بار بار یہی خیال اس کے ذہن میں آتا۔ لیکن اپنے آپ کو کوسنے کا وقت باقی نہیں رہا تھا۔ آنے والی مصیبت کا خوف اُس کی رگ رگ میں سمایا جا رہا تھا۔ وہ لالہ جی کے غصے سے بخوبی واقف تھا۔ اُنھیں غصہ آتا تو نتیجے سے

تعلق بے پروا ہو جاتے تھے۔ ایک روز نند کے دیکھتے دیکھتے اُنھوں نے اپنی بیوی کا سر پھوڑ دیا تھا۔ رینو کو ذرا سی بات پر اتنا پیٹا تھا کہ وہ کئی روز تک پڑھنے کو نہیں آ سکی تھی۔ جو شخص اپنی بیوی اور لڑکی کے ساتھ سب کے سامنے اس قدر بے رحمانہ سلوک روا رکھ سکتا ہے وہ اُسے کب بخشتا چھوڑ دے گا۔ پھر بے عزتی، بدنامی اور زمانے بھر کی لعنت ملامت۔ وہ بھائی کے سامنے کیا منہ لے کر جائے گا؟ اس بے عزتی اور رُسوائی سے تو موت اچھی!

لیکن موت کیا اس کے ہاتھ میں ہے:

اُس نے سُنا ——— لالہ جی گرج رہے ہیں۔ اُسے گالیاں دے رہے ہیں۔ اس نے بدحواسی میں کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ پنجرے میں بند چوہے کی طرح وہ بلبلانے لگا۔

باہر شور ہر لحظہ بڑھتا جا رہا تھا۔ لالہ جی اس کے کمرے کی طرف آ رہے تھے۔ اس کے جی میں آیا کہ دروازہ کھول کر ان کے قدموں پر جا گرے۔ لیکن اس سے حاصل! کیا وہ مار سے، بے عزتی سے، رُسوائی سے بچ جائے گا! اپنے برباد کیریکٹر کے ساتھ وہ کیا کرے گا؟ اور اگر لالہ جی نے اُسے پولیس کے حوالے کر دیا تو ———

خوف سے گھبرا کر اُس نے پھر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ میز پر ایسڈ کی شیشی رکھی تھی۔ وہ خود اسے بی بی جی (لالہ جی کی شریکِ حیات) کے لئے بازار سے لایا تھا۔ وہ اسے کپڑے دھونے کے لئے استعمال میں لاتی تھیں۔ لالہ جی اُسے گالیاں دیتے ہوئے دروازہ توڑ رہے تھے۔ نند نے بڑھ کر شیشی اٹھائی اور آنکھیں بند کر کے پی گیا۔

• • •

پوسٹ مارٹم اور خودکشی کے فتوے کے بعد جب نند کی لاش کو لکڑیوں کے حوالے کر کے لوگ واپس ہو رہے تھے تو مختلف ٹولیوں میں اس کے تذکرے تھے۔ جب ایک گلی کے موڑ پر رام لال اور گوِند الگ ہونے سے پہلے چند لمحوں کو رُکے تو رام لال نے لمبی سانس لے کر کہا ———

کچھ بھی ہو یار تھا وہ خوش نصیب۔ جس پھول تک پہنچنے میں فرشتوں کے بھی پَر جلتے تھے وہ بھونرا بنا اُس کا رس پیتا رہا۔ مجھے تو یار ایک پل کو بھی ایسا موقع ملے تو اس کے بعد میں بڑے شوق سے مر جاؤں۔

"اس میں کیا شک ہے" گوِند نے سانس روک کر کہا۔

اور دونوں دوست ہاتھ ملا کر عالمِ تصوّر میں نند بنے، اس پھول کے حسن کا رس لیتے ہوئے اپنے گھروں کو چل دئے۔

اسد بھوپالی

کیفیتیں

نظر میں عالم دُھواں دُھواں ہے خیال میں انتشار سا ہے
چھُڑا کے دامن وہ جا رہے ہیں نفس نفس بے قرار سا ہے
ستارے خاموش، چاند حیراں، ہوائیں بے تاب، گُل پریشاں
مری طرح جانے کیوں تمہارا ہر ایک کو انتظار سا ہے
خوشی کی ہلکی جھلک بھی پیدا نہ کر سکے اُن کے عہد و پیماں
ہنوز آئینۂ یقیں پر گماں کا دُھندلا غبار سا ہے
ترا نظارہ ہے خاص نعمت، کسی کو میں کیوں شریک کر لوں
کسی کا کیا خود وجود اپنا مجھے یہاں ناگوار سا ہے

خواجہ احمد فاروقی

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط

مولانا آزاد کے خطوں کے دو مجموعے "غبارِ خاطر" اور "کاروانِ خیال" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ "غبارِ خاطر" کی شانِ نزول یہ ہے کہ قلعہ احمد نگر کی قید کے زمانے میں مولانا کو دوستوں سے خط و کتابت کی اجازت نہیں تھی لیکن ذوقِ مخاطبت کی طلبگاریاں کچھ اس طرح دامن گیر ہوتیں کہ وہ وقتاً فوقتاً "صدیقِ مکرم" کے نام خطوط لکھ کر جمع کرتے رہے اور رہائی کے بعد انھوں نے اس مجموعے کو چھپوا کر نواب صدر یار جنگ کے پاس بھیج دیا۔ مولانا نے ۱۰ اگست کے خط میں لکھا ہے۔

"یہ جو کچھ لکھ رہا ہوں گلپترہ گوئی اور لاطائل نویسی سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم بحالتِ موجودہ میری صدائیں آپ تک پہنچ بھی سکیں گی یا نہیں۔ تاہم کیا کروں، افسانہ سرائی سے اپنے آپ کو باز نہیں رکھ سکتا۔ یہ وہی حالت ہوئی جسے مرزا غالب نے ذوقِ خامہ فرسا کی ستم زدگی سے تعبیر کیا ہے"۔

ایک اور خط میں لکھا ہے۔

"وہی چار بجے صبح کا جاں فزا وقت ہے۔ چائے کا فنجان سامنے دھرا ہے، اور طبیعت درازنفسی کے لئے بہانے ڈھونڈ رہی ہے"۔

"کاروانِ خیال" میں بھی انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"جی چاہتا ہے صحبت ختم نہ ہو۔ ایک ذکر ختم ہو جائے تو دوسرا چھیڑ دوں۔

قدرے گرم دہم بر سرِ افسانہ روم"

ان خطوں میں الفاظ کی شوکت و حشمت ہے۔ فارسی ترکیبوں کی استخواں بندی ہے۔ علمی و ادبی مباحث کی فراوانی ہے۔ شاعرانہ باتیں ہیں۔ جن کا ایک ایک لفظ دامنِ دل کو کھینچتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان مجموعوں میں ایک عجیب لیکن دل کش قسم کی احتیاط۔ کم آمیزی، پوشیدگی اور نازک مذاقی بھی پائی جاتی ہے جس کا کوئی خارجی سرچشمہ ڈھونڈنا مشکل ہے۔

مولانا آزاد کے ان خطوں میں تمنا کی بے تابیوں اور دل کی حسرتوں کے بے تکلف اظہار کی تلاش عبث ہے۔ اس قسم کا غیر منصفانہ مطالبہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے ہی آئینے میں دوسروں کا عکس دیکھنے کے متمنی رہتے ہیں۔ وہ تصویر جو ان خطوں سے مرتب ہوتی ہے وہ باعظمت ضرور ہے لیکن بے ساختہ اور بے تکلف نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ بیساختہ اور بے تکلف ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ ہم اُن کے عادات و خصائل۔ اعمال و افعال کا پتہ لگانے کے لئے اگر کسی طرح تمام پردے اُٹھا دیں، تب بھی ایک ہی جھلک نظر آتی ہے۔ پورا چہرہ نظر نہیں آتا۔ اور ہماری تشنہ کامی اس سطح پر قائم رہتی ہے جس کا ذکر فارسی شاعر نے اس طرح کیا ہے۔

وہ بند شوق و لے فرصتِ نظر نہ دہند

لیکن کیا التفات و تغافل کی یہ عشوہ گری بذاتِ خود دلچسپ نہیں ہے؟ دانش آرائی اور مرصع کاری کا جو حسین اہتمام ان خطوں میں ہے وہ اردو لٹریچر میں دوسری جگہ مشکل سے ملے گا۔ علم کے جن خزانوں تک مولانا کی دسترس ہے اور تخیل کی جو دولت ان کو ملی ہے وہ سب کو حاصل نہیں ہوتی۔ خود ان کے الفاظ میں صورت و معنی کا شاید ہی گوشہ ہوگا جس سے ان کی طلب نے تغافل اور راہ نے پہلو تہی کی ہو۔ اور فکر و عمل کی شاید ہی کوئی بلندی و پستی ہوگی جس کی پیمائش میں ان کے قدم نے کوتاہی اور ہمت نے کم جوشی روا رکھی ہو۔ ان حالات میں اگر ان کے خطوں میں قلعہ احمد نگر کی تاریخ، فلسفہ و مذہب کے مباحث، مقادیر عنصری کے نظریے طلسم ہستی کے معمے، خدا کی وحدانیت، زندگی و حرکت کے مسائل، پانچویں صلیبی حملے کی سرگزشت، موسیقی کی داستان، یاسمن سفید کی کہانی،

انانیتی ادبیات کا خاکہ۔ یارانِ سقف و محاریب شیخ آلوسی زادہ اور مرزا کاظم رشتی کی محفلوں کا تذکرہ ملتا ہے تو ایسی حیرت کی بات نہیں، حیرت کی بات یہ ہے اور یہ حیرت بھی ایک عام آدمی کی حیرت ہے کہ انھوں نے زندگی کو جو مکمل اکائی ہے کس طرح خانوں پر بانٹ رکھا ہے۔ ان مختلف اور متضاد حیثیتوں میں بظاہر کوئی رشتۂ اشتراک نہیں ہے۔ حد یہ ہے کہ نواب صاحب کو جتنے خط لکھے گئے ہیں وہ سب احتیاط کی چھلنی میں چھانے گئے ہیں کہ اُن میں کسی قسم کی آمیزش باقی نہ رہے۔ ان سو ۲۴ صفحات میں صرف ایک جگہ یہ شرابِ پیمانے سے چھلک گئی ہے۔ چھبیس برس کی ازدواجی زندگی کے اختتام پر چند جملے اس درد اور سوز کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آبگینۂ تندیٔ صہبا سے پگھل جانے والا ہے۔

"مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔
میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ مگر میں محسوس کرتا ہوں
کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔

غافل نیم ز راہ ولے آہ چارہ نیست
زیں رہزناں کہ بر دلِ آگاہ می زنند

لیکن اس بحث کو اسی جگہ ختم نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ دشنہ و خنجر اور بادہ و ساغر کی زبان سمجھتے ہیں اور جو شعروں کے انتخاب سے دل کے معاملے تک پہنچ سکتے ہیں۔ اُن کو اِن خطوں میں بھی بہت سی داستانیں مل جائیں گی۔ کیا داستانِ بے ستون و کوہ کن۔ حکایتِ بادہ و تریاک اور افسانۂ زاغ و بلبل میں قید و بند کی پوری زندگی آشکارا نہیں ہے؟ کیا اس "حدیثِ دیگراں" سے "سرِ دلبراں" نہیں معلوم ہوتا؟ حقیقت یہ ہے کہ "ورائے شاعری چیزے دگر ہست"!

(Auguste Comte) نے صحیح لکھا ہے کہ قید خانے میں ماضی و مستقبل، حال میں اس طرح جذب ہو جاتے ہیں کہ حال کا تصور ہی مٹ جاتا ہے۔ وقت کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے۔ اور قید خانہ بُرا ہی سہی لیکن ماضی کا زنداں اور اس کی داستانیں بُری نہیں معلوم ہوتیں۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ مولانا واردات و سوانح کے ذکر کو پسند ہی نہیں کرتے۔ ایک مرتبہ نواب صاحب نے اس باب کا ایک ورق اُلٹ دیا تھا تو مولانا نے لکھا تھا "اس باب میں شکوہ و حکایت، اصحابِ درد و ذوق کا شیوہ نہیں"۔ لیکن باوجود "سرِ ایں شیشہ فرو بند" کے حکم کے، کہیں کہیں یہ مئے تند باہر آ ہی گئی ہے۔ ایک خط میں اپنی طبیعت کی بے میل اُفتاد کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ وہ فکر و عمل کے کسی گوشے میں بھی وقت اور موسم کے پیچھے نہ چل سکی۔ ایک اور جگہ تحریر فرمایا ہے۔

"جس راہ میں بھی قدم اُٹھایا، وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہوتا گیا کہ جب مُڑ کے دیکھا تو گردِ راہ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اُڑائی ہوئی تھی"۔

اپنی تعلیم کے سلسلے میں لکھا ہے: "مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا اور شک و شبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے۔ مبدا رِ فیاض کی یہ بخشش خاص بھی ملاحظہ ہو۔

"۴۲ برس کی عمر میں جب کہ لوگ عشرتِ شباب کی سرمستیوں کا سفر شروع کرتے ہیں، میں اپنی دشت نوردیاں طے کر کے تلوؤں کے کانٹے چُن رہا تھا"۔

مولانا، در اصل باغِ وجود کے ثمرِ پیش رس ہیں۔ اور اُن کی نمود میں ایک طرح کی غرابت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ جنس ارزاں نہیں ہو سکتی۔ مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، معاشرت میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں، کسی راہ میں بھی وہ وقت کے قافلوں کا ساتھ نہیں دے سکے۔

ایک ادنیٰ سی چیز چا ہی کو لیجئے۔ اس معاملے میں مولانا کا مذاق سب سے الگ ہے۔ اور سب سے پاکیزہ۔ مولانا نے ان خطوں میں چا کا ذکر اس طرح کیا ہے جیسے کوئی دل گرفتہ اپنے محبوب کا ذکر کرتا ہے یا کوئی رندِ مے آشام اپنے بادۂ گل رنگ کا۔ Su Tungp'o نے اسی لئے چا کو ایک حسین دوشیزہ سے تشبیہ دی ہے۔ اور ڈی کوئنسی (De Quineey) نے اسے اہلِ فکر کی شرابِ طہور کہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا کی یاسمینِ سفید میں مے و معشوق کا کیف اور حُسن پورے طور پر جلوہ گر ہے۔ وہ نہایت اعلیٰ قسم کی چینی چا پیتے ہیں۔ اور اُس کے تقریباً وہی آداب بھی برتتے ہیں جو اعلیٰ چینی سوسائٹی میں

مروّج ہیں۔اس جار کا ذکر بھی اتنا ہی دل کش ہے جتنا Lu Yu یا Lu Yu اور
Lin Yutang وغیرہ کے یہاں ہے۔ لیکن مولانا کی شخصیت اور
اُن کا ماحول، اِن سب سے مختلف، بالکل مختلف ہے۔ اس لئے اِن کے
بیان کی دل کشی بھی ان سب سے علیحدہ، بالکل علیحدہ ہے۔

یار بما ایں دارد وآں نیز ہم

بعض لوگوں کو اعتراض ہے کہ مولانا کے خطوں میں غزل کے مقطعوں
کی سی بلند آہنگی ہے۔ لیکن اگر یہ من کا سرجوش ہے تو ایسا ہی ہے جیسا غالب
کے جبہ میں ہے جس پر ہزار عجز نمائیاں قربان ہیں۔

خواہم از بند بہ زنداں سخن آغاز کنم
غم دل پردہ دری کرد فغاں ساز کنم

بہ نوائے کہ ز مضراب چکاند خوناب
خویشتن را بہ سخن زمزمہ پرداز کنم

در خرابی بہ جہاں مے کدہ بنیاد نہم
در اسیری بہ سخن دعویٔ اعجاز کنم

بے مشقت نہ بود قید بہ شعر آویزم
روزکے چند رسن تابیٔ آواز کنم

جو لوگ مولانا کے خطوں کا غالب کے مکتوبات سے مقابلہ کرتے
ہیں وہ اپنے ساتھ بھی بے انصافی کرتے ہیں، اور آزاد اور غالب کے
ساتھ بھی۔ رُخِ روشن کے آگے شمع رکھنا ممکن ہے محبوبانہ ادا ہو۔ لیکن
تنقید کی دنیا میں ظلم سے کم نہیں ہے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ غالب کے
خطوط مختلف لوگوں کے نام ہیں جن میں بہت سے موضوعات پر گفتگو ہے۔
اور مولانا کے خطوط صرف صدیق مکرم کے نام ہیں جن سے تعلقات کے
حدود متعین ہیں۔ اور جو ایک خاص مدت میں اور خاص حالات کے تحت
لکھے گئے ہیں۔

مولانا کے خطوں میں بائرن کی سی انانیت ہے۔ غالب کی سی سادگی
و پُرکاری نہیں ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو مولانا کے خطوں کا
امتیازی وصف یہی ہے کہ وہ غالب سے اس درجہ مختلف ہیں۔ کیٹس
Keats کی طرح انھوں نے دلِ صد پارہ کی قاش فروشی نہیں کی۔
یہ خطوط اُن کے ذہن کا دریچہ اور اُن کی فکر کی زبان تو ہیں۔ لیکن غالب
کی طرح بہ حیثیت مجموعی واردات و کیفیات کا آئینہ نہیں۔ بعض خطوط کے
متعلق اگر پہلے سے نہ معلوم ہو تو یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ وہ شبستان میں
لکھے گئے ہیں یا زندان میں۔ لیکن بقول چسٹرٹن جن لوگوں کو تخئیل کی دولت
دولت ملتی ہے، اُن کے لئے زندان و شبستان کے امتیازات اُٹھ جاتے
ہیں۔ مولانا تنہائی اور خود مشغولی کے قائل ہیں۔ اور زندگی کی رونق یکسوئی
خلوت سے سمجھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ انسان کا اصلی عیش، دماغ کا
عیش ہے۔ اِسی لئے مولانا نے دماغ کے گوشے تو دکھلائے ہیں۔ مگر
دل کے نہاں خانے کے بیشتر حصوں کو بند ہی رکھا ہے۔ اس معاملے
میں مولانا بڑی حد تک معذور ہیں۔ انھوں نے اپنے دماغ کو دل بنالیا
ہے۔ اِس کے علاوہ جس ماحول میں ان کی نشو و نما ہوئی اُس میں حزم
و احتیاط، کم سخنی اور کم آمیزی، شرافت اور عالی نسبی کی نشانی سمجھی جاتی
تھی۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یہ کم گوئی، شرفا کا طرۂ امتیاز
سمجھی جاتی تھی۔ غالب نے بھی خطوں کی اشاعت سے ابتدا میں اسی
وجہ سے پرہیز کیا تھا کہ آپس کے معاملات دوسروں پر کیوں ظاہر ہوں۔
(Hannah More) کو یہ ڈر تھا کہ کہیں باسول، جانسن کی سوانح
عمری کو زیادہ واقعاتی نہ بنا دے۔ ٹینی سن سوانح عمری کو اس وجہ سے
مہمل سمجھتا تھا کہ وہ حرم سرا میں ایک قسم کی دراندازی تھی۔ تھیکرے
نے اسی ڈر سے اپنی سوانح عمری کے لکھنے کی ممانعت کردی تھی۔ یہی حال
خطوں کا تھا (Buxton Forman) نے جب ۱۸۷۸ء میں کیٹس کے
خطوط شائع کرنے کا ارادہ کیا تو تمام اخبارات نے اس کو نامحمود جسارت
اور بے جا ظلم سمجھا اور وہ خطوط جو آج انگریزی ادب میں عدیم النظیر
حیثیت رکھتے ہیں۔ عزت، شرافت اور جوانمردی کے خلاف سمجھے گئے
تھے۔

مولانا آزاد کے خطوں میں کوپر (Cowper) کی سی
سنجیدگی۔ پختہ مزاجی اور گرے کی سی نازک مذاقی اور وسیع اختیار
ہے جس کو شاعرانہ اسلوبِ بیان "خمارِ چشمِ ساقی" کی آمیزش اور
قید و بند کے ماحول نے نہایت دل کش بنا دیا ہے۔

شمس بریلوی

مرزا غالب مرحوم
کا
ایک غیر مطبوعہ ادبی خط اور اصلاحِ غزل

مرزا غالب مرحوم کے غیر مطبوعہ خطوط نوادرِ ادبی میں شمار کئے جاتے ہیں اور اربابِ علم و ادب ان کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جس کا باعث مرزا مرحوم کا دلکش اور اچھوتا طرزِ بیان اور ان کے خطوط کی شوخی ہے۔

مرزا کے ایسے نجی خطوط بھی جن میں معمولی روزمرہ کی باتیں مکتوب الیہ کی خیریت و طلبِ خیریت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ اپنی لطافتِ بیان اور شوخیٔ ادا کے باعث ہر زمانہ میں بے انتہا جاذبِ توجہ رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔ چہ جائیکہ ایسے مکاتیب جن میں ادبی نکات اور فنی موشگافیاں ہیں ان کی افادی حیثیت تو ہر اعتبار سے مسلّم ہے اور اربابِ علم و ادب کی اب تک وہ بہت کچھ رہنمائی اور ہدایت کر چکے ہیں۔ چنانچہ مرزا محمد عسکری صاحب لکھنوی مترجم "تاریخ ادبِ اردو" نے جب "ادبی خطوطِ غالب" شائع کئے تو اردو دوست طبقے نے ان کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور مؤلف کو اپنی جانکاہی کا صلہ اس قبولیت کی صورت میں کما حقہٗ مل گیا۔

مرزا عسکری صاحب کی ان شبانہ روز مساعی کے باوجود جو انہوں نے "ادبی خطوط" کی ترتیب و تالیف میں صرف کیں اور اکثر ادبی خطوط جمع کرنے میں وہ کامیاب ہو گئے۔ بہت سے ادبی نوادر (خطوطِ غالب) ادب شناس نگاہوں اور قدرداں ہاتھوں تک نہ پہنچ سکے۔ آج میں انہیں ادبی نوادر میں سے ایک ارمغانِ ادب "آجکل" کے توسط سے قدر شناس اور ادب نواز نگاہوں کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اس ادبی مکتوب میں جہاں بعض علمی نکات ہیں وہاں ایک اور خاص مہتم بالشان چیز بھی ہے اور وہ یہ کہ مرزا مرحوم کا یہ مکتوب ایک غزل پر اصلاح کی صورت میں ہے۔

مرزا غالب مرحوم کی اصلاحیں ابتک بہت کم نگاہوں کے سامنے آئی ہیں اور اب تک مرزا کے جس قدر مجموعہ مکاتیب یعنی اردوئے معلیٰ، عودِ ہندی، ادبی خطوطِ غالب، مکتوباتِ غالب از عتیق پرشاد، مکاتیبِ غالب از حکیم عرشی رامپوری شائع ہوئے ہیں ان میں آپ کو اس قسم کے خطوط نہیں ملیں گے جو غزلوں کی اصلاح پر مشتمل ہوں۔ اس کا باعث یہ ہے کہ ایسے خطوط صرف ان قدر شناس اور ادب دوست خاندانوں کے سرمایہ افتخار بنے ہوئے گنجِ گرانمایہ کی طرح محفوظ ہیں۔ جن کے اسلاف میں کوئی فرد مرزا مرحوم کے سلکِ تلامذہ میں شامل تھا۔

بریلی جو روہیل کھنڈ کا صدر مقام اور روہیلہ سرداروں کا مستقرِ حکومت عرصہ تک رہ چکا ہے ایک زمانہ میں مغربی یو۔پی کے اضلاع میں اپنے علم و ادب اور علما و فضلا کے اعتبار سے بدایوں کے بعد دوسرے نمبر پر تھا۔

مولوی محمد عبدالجمیل صاحب جنونؔ انیسویں صدی عیسوی میں بریلی کے عمائد میں شمار کئے جاتے تھے اور حکومت کی طرف سے صدر الصدور کے مہتم بالشان عہدہ پر متمکن تھے۔ آپ مرزا غالب کے خاص شاگردوں میں سے تھے اور جب تک مرزا غالب بقید حیات رہے یہ مرزا اُن سے اصلاح لیتے رہے چنانچہ اسی تعلق کی بنا پر عودِ ہندی اور "ادبی خطوطِ غالب" میں بہت سے خطوط آپ کے نام پائے جاتے ہیں۔

ایک عقیدت مند شاگرد کی حیثیت سے جنونؔ صاحب مرزا غالبؔ کے اُن خطوط کو جو کہ زیادہ تر ان کی غزلوں پر اصلاح کی صورت میں ہیں حرزِ جان بنا کر رکھا مرزا کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ اصلاح علیحدہ نہیں لکھتے تھے بلکہ شاگردوں کی صاف اور روشن لکھی ہوئی غزلوں پر جس کی وہ اکثر اپنے خطوط میں تاکید کرتے رہتے تھے' اصلاح دے دیا کرتے تھے اور بعض مطالب ضروری بصورتِ متن جدا لکھ دیا کرتے تھے گویا ان کی یہ اصلاح ہی ہوتی اور مکتوب بھی۔ قاضی صاحب مرحوم کے اسی بیش بہا ذخیرہ سے یہ ایک مکتوب گرانمایہ پیش کر رہا ہوں جو غزل پر اصلاح بھی ہے اور قاضی صاحب کے بعض مستفسرہ نکاتِ ادبی کا تسلی بخش جواب بھی! اُمید کہ آپ بھی اس کے مطالعے سے محظوظ ہونگے۔

خواجہ غلام السیدین

تعلیم اور سیاست

ہمارے ملک میں اس وقت جو فکری مسائل بحث طلب ہیں ان میں ایک بہت اہم مسئلہ یہ ہے کہ تعلیم کا جو انسان کو بناتی ہے، سیاست کے ساتھ جو سماج کو بناتی ہے، صحیح رشتہ کیا ہے۔ اس کا ایک جواب تو وہ ہے جو انگریزی حکومت کے دور میں ہمیشہ دیا گیا ہے یعنی یہ کہ تعلیم کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے۔ تعلیم ذہنی اور پیشہ ورانہ تربیت کا ایک ذریعہ ہے اور سیاست عملی دنیا کی الجھنوں سے واسطہ رکھتی ہے جس سے مدرسے کو بالکل علٰحدہ رہنا چاہیئے۔ برخلاف اس کے بعض لوگ اور جماعتیں ایسی ہیں جو تعلیم اور مدرسے کو براہ راست سیاسی اغراض و مقاصد کے حل کرنے کا ذریعہ بنانا اور اس کے ذریعے سے نوجوانوں کے دل اور دماغ کو خاص سانچوں میں ڈھالنا چاہتی ہیں۔ میں ان دونوں فکری رجحانوں کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔

جو لوگ تعلیم کو سیاست سے بالکل علٰیحدہ رکھنا چاہتے ہیں انہیں اندیشہ ہے کہ اگر یہ احتیاط نہ کی گئی تو تعلیم اپنے پُر امن گوشۂ عافیت سے نکل کر میدان کارزار اور حلقۂ نزاع میں پہنچ جائے گی اور اس طرح اس کے خاموش اور سکون طلب تعمیری کام میں خلل پڑے گا۔ جو لوگ خلوص اور نیک نیتی سے یہ اعتراض کرتے ہیں وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ دنیا میں ہر وقت مختلف اصول اور قدریں، توہمات اور تعصبات انسانی زندگی پر تسلّط حاصل کرنے کے لئے برسرِ پیکار رہیں اور یہاں قدم قدم پر خوب و ناخوب کی تمیز ضروری ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں تعلیم کا غیر جانب دار رہنا یعنی اس کشمکش کو نظر انداز کر دینا غیر مفید ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ اس کے لئے موجودہ نظام کی ساخت کو قبول یا رد یا اس کی ترمیم کرنا بالکل ناگزیر ہو جاتا ہے اور نئی بنیادیں رکھنے کے لئے تو اکثر پُرانی بنیادوں کو کھودنا پڑتا ہے! بعض دوسرے معترضین ایسے بھی ہیں جو قصداً اور مصلحتاً یہ روش اختیار کرتے ہیں کیونکہ ان کے اغراض و مقاصد اور مصالح مروّجہ نظام معاشرت اور اس کے قیام کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس کی بدعنوانیوں اور بے انصافیوں کی بدولت انہیں اپنی ذات کے لئے جلب منفعت کا زیادہ سے زیادہ موقع ملتا ہے اس لئے وہ اس میں کسی تبدیلی کے خواہاں نہیں اور جب وہ تعلیم کو سیاست سے علٰیحدہ رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں تو ان کا دراصل یہ مطلب ہوتا ہے کہ تعلیم کو کسی قسم کی بنیادی تبدیلی یا انقلاب کا ساتھ نہیں دینا چاہئے۔ ورنہ مروّجہ اصول اور سماجی اداروں کی حمایت تو نظام تعلیم بلا ارادہ بھی کرتا ہے اور اکثر استادوں اور پبلک کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ ایسا ہو رہا ہے۔ مثلاً اگر کسی سرمایہ داری نظام میں تاریخ، جغرافیہ، اقتصادیات وغیرہ کی تعلیم میں ان مفروضات کو جگہ دی جائے جو اس نظام میں مسلمہ حیثیت رکھتے ہیں یا سوشلسٹ یا کمیونسٹ نظام میں ان طریقوں اور اصول کی تائید کی جائے جو اس میں رائج ہیں تو عرف عام میں کہا جاتا ہے کہ تعلیم سیاسی اعتبار سے غیر جانبدار ہے۔ برخلاف اس کے اگر تعلیم کے ذریعے سے ان اصول اور قدروں کی اشاعت کی جائے جن کو عام لوگ یا وہ ملوث افراد جن کو قوت و اختیار حاصل ہے اس وقت قبول نہیں کرتے تو فوراً تعلیم پر جنبہ داری اور غیر متعلق امور میں دخل اندازی کا الزام لگایا جاتا ہے لیکن میرا عقیدہ یہ ہے کہ معلّم کو عقل اور اخلاق کی رو سے یہ حق حاصل ہے کہ وہ مروّجہ نظام کی تنقید اور آزادی کے ساتھ اس امر کا فیصلہ کرے کہ خیالات کی جو جنگ اس کے چاروں طرف ہو رہی ہے اس میں وہ کس کا ساتھ دیگا۔ میں نے جان کر "کس فریق کا ساتھ دے گا" نہیں کہا کیونکہ تعلیم کا کام حق اور صداقت کی طرف داری ہے نہ کہ کسی سیاسی جماعت یا عقیدے کے ساتھ وابستہ ہو تا آنکہ کل کی بھیڑ

زندگی میں حق اور صداقت میں کسی خاص سیاسی جماعت کی مکمل اجارہ داری نہیں ہو سکتی - یہ ضرور ہے کہ بعض جماعتوں کی پالیسی دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ترقی پسند اور بحیثیت مجموعی انسانوں کے لئے زیادہ مفید ہے لیکن ہر سمجھ دار اور انصاف پسند شہری کو اور بالخصوص ہر معلم کو یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ اگر وہ چاہے تو سیاسی فرقہ بندیوں سے بلند ہو کر حق کا ساتھ دے خواہ وہ اسے کسی طرف لے جائے - یہ نقطۂ نظر ٹھیک ہے' لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ یہ قبول نہیں ہو سکتا کیونکہ اس پر وہ لوگ بھی نکتہ چینی کریں گے - جو انقلاب اور تبدیلی کے مخالف اور سماجی جمود کے حامی ہیں اور وہ بھی جو تعلیم کو اپنے خاص سیاسی اغراض و مقاصد کا مجہول آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں کیونکہ آزادیٔ رائے میں آزادیٔ تنقید بھی شامل ہے اور یہ لوگ تنقید کے عوض اندھی تعمیل کے طلبگار ہیں! مگر بہرحال جو لوگ تعلیم کا سخن گسترانہ فرض اپنے ذمے لیتے ہیں انہیں جان بوجھ کر یہ خطرہ مول لینا پڑے گا - کیونکہ معلم کی دولت ہر کس و ناکس کی رضامندی نہیں' سچ کا ساتھ دینا ہے!

اس ضمن میں ایک بات کا صاف کر دینا ضروری ہے - اس بحث سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ مدرسوں کا کام براہ راست کسی خاص سیاسی یا سماجی یا اقتصادی عقیدے کی تبلیغ کرنا ہے ایسا کرنے سے طلبہ کے ذہن میں ابتدا ہی سے بعض خاص قسم کے خیالات کا تسلط قائم ہو جائے گا اور ان کی آزادیٔ فکر کی صلاحیت نشوونما نہیں پا سکے گی جو ذہنی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد ہے - یہ بات کسی طرح جائز نہیں ہو سکتی کہ کسی نیت سے بھی تعلیم کے ذریعے سے طلبہ کے دماغی دریچوں کو بند کر دیا جائے - جب تک ان میں غور و فکر کے بعد زندگی کے اہم انفرادی اور اجتماعی مسائل کے متعلق صحیح اور بے لاگ رائے قائم کرنے کی صلاحیت نہ ہو گی اندیشہ یہ ہے کہ وہ ہر چالاک عقیدہ فروش اور سیاسی تاجر کے رحم و کرم کے پابند ہو کر رہ جائیں گے لہٰذا مدرسے کا کام تو یہ ہے کہ زندگی کے سفر کے لئے طلبہ کو صحیح معلومات اور صحیح قدروں کا سرمایہ اور تلاش حق کا جذبہ عطا کرے - اگر ان میں علم اور عقل کی کمی ہو گی' جس کے ذریعے سے صحیح معلومات حاصل کی جاتی ہیں' تو وہ سماجی صورت حال کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکیں گے

اور ان کی ذہنی کیفیت اور عمل دونوں ایسے ہونگے جیسے کوئی اندھیرے میں تیر چلائے - اگر ان کے دل میں صحیح قدروں کا احترام نہ ہوگا تو وہ اپنی دماغی قابلیت کا غلط اور نقصان دہ استعمال کریں گے اور اخلاقی کج روی میں مبتلا ہو جائیں گے - لہٰذا جب میں تعلیم سے معاشرتی رہبری کی توقع کرتا ہوں تو میرا مطلب یہ نہیں کہ وہ نوجوانوں پر کوئی بنا بنایا نظام فکر و عمل زبردستی عائد کر دے بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ ان کو ایسے ترقی پسند اور شریفانہ جذبات اور خیالات کی دولت سے مالامال کرے کہ وہ آگے چل کر ایک بہتر سماج کی تعمیر میں شریک ہو سکیں -

یہ تمہید کسی قدر طولانی ہو گئی لیکن میں چاہتا تھا کہ ابتدا ہی میں نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جائے - اب میں مختصر طور پر یہ بتانا چاہتا ہوں کہ موجودہ نظام معاشرت کی امتیازی خصوصیات کیا کیا ہیں اور اس میں کون سے خاص اثرات اور رجحانات کام کر رہے ہیں جو اس کو آئندہ شکل دینے میں کارگر ہونگے - معلم بھی بڑی حد تک اپنے گرد و پیش کے معاشرتی وسائل اور ذرائع اور محرکات سے کام لیتا ہے - کیونکہ ان سے قطع نظر کر کے تربیت ناممکن ہے - اور اگر ممکن ہوتی بھی تو بالکل ناقص یا بے اثر ہوتی - تعلیم دراصل انہیں تمام اجتماعی اثرات کا ایک حصہ ہے اور اس جزو کو کل کے پس منظر میں رکھ کر دیکھنے کی ضرورت ہے -

ہماری موجودہ سماج کی سب سے زیادہ اہم خصوصیت جو نظر پڑتی ہے یہ ہے اس میں تبدیلی کی رفتار بہت بڑھ گئی ہے اور زندگی جو سو سال پہلے تک بالعموم ساکن یا سست رفتار تھی - انقلاب کے بھنور میں آ پھنسی ہے - اب صدیوں کی تبدیلیاں چند سال کے اندر اندر ہو جاتی ہیں اور ان کی باگ اتفاق کے بجائے ارادے نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے - سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے انسان کو فطرت کی غلامی اور بے بسی کی منزل سے نکال کر مختار فطرت بنا دیا ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک ایسی بے اندازہ قوت دے دی ہے کہ وہ اس کی خوفناک طاقتوں کو تسخیر کر کے اپنے ماحول اور اپنی زندگی کو بالارادہ ایک نئے سانچے میں ڈھال سکتا ہے - وہی انسان جو چند صدی پیشتر فطرت کے حضور میں ایک خوف زدہ سائل کی طرح حاضر ہوتا

تھا اور اس کے رازوں کی دریافت کے لئے حسن اتفاق کا مرہون منت تھا اب خود اعتمادی کے ساتھ ان کی تلاش کرتا ہے - اور انہیں اپنے مقاصد کی تحصیل کے لئے بے دھڑک استعمال کرتا ہے - اس کے جو عجیب و غریب نتائج نکلے ہیں وہ ہر وقت ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں - لہذا ان کی تفصیل سے کیا حاصل ؟ اس کی بدولت انسان نے خشکی، ہوا اور پانی کو تسخیر کر کے دنیا کی طنابیں ملا دی ہیں اور مہینوں کے راستے پلوں میں کٹنے لگے ہیں - زراعت، صنعت و حرفت اور پیداوار کے ہر شعبے میں اس کی قوت سینکڑوں گنا بڑھ گئی ہے نئی ایجادوں اور دریافتوں نے خیال کے پر لگا دئے ہیں اور ہر نئی بات چشم زدن میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے پر پہنچ جاتی ہے - مگر یاد رہے کہ یہ تبدیلیاں محض زندگی کے خارجی اداروں تک محدود نہیں بلکہ انسان کی داخلی زندگی پر بھی ان کا اتنا ہی گہرا اثر پڑا ہے - اس اثر سے پرانے رسم و رواج اور پرانی قدریں ٹوٹ رہی ہیں، خاندانی اور جماعتی زندگی کے وہ ادارے "جن سے ماضی میں لوگ ایسے ہی اعتماد کے ساتھ واقف تھے جیسے کسی پہاڑ کے رہنے والے اس کے خد و خال سے واقف ہوتے ہیں" - اس قدر تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں کہ ذہن اس کے ساتھ نہیں چل سکتا زندگی کا دھارا جو صدیوں سے ایک خاص سکون اور وقار کے ساتھ بہتا تھا اب دکن کے دریاؤں کی طرح بہت تیز رفتار ہو گیا ہے اور کٹھن پہاڑی راستوں سے گزرنے لگا ہے - آیئے دیکھیں اس انقلاب کا اثر افراد پر کیا ہوا ہے ؟

زمانہ ماضی میں اکثر رسم و رواج، خیالات و عقائد، اصول اور قدریں کم و بیش غیر محسوس طریقے پر ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہو جاتی تھیں - ایک ایسے سماج میں جہاں بحیثیت مجموعی سکون ایک عمومی کیفیت ہو اور انقلاب ایک غیر معمولی بات ہو یا اس قدر آہستہ آہستہ ہوتا ہو کہ لوگوں کو اس کا احساس بھی نہ ہو تقلید کی رہبری شاید کام دے سکتی ہے - لیکن جب زندگی میں ہر طرف حرکت اور انقلاب کا قانون کارفرما ہو - جہاں سفر حقیقت ہو اور حضر مجاز ہو جہاں انسان کا ناخن عقدہ کشا اور اس کی عقل رسا آئے دن نت نئے مسائل پیدا کرتی رہے وہاں ہم تقلید اور عادت کے سہارے نہیں چل سکتے - وہاں تقلید کے بجائے اجتہاد اور عقیدے کے بجائے فکر کی روشنی درکار ہے اس جدید سماج میں ہمیں قدم قدم پر ایسے دوراہے ملتے ہیں جن میں سے ایک کو ہمیں اختیار کرنا ہے اور اگر ہم خود غور و فکر کے بعد سے اختیار کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تو کوئی اتفاقی ریلا ہمیں اٹھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے - لہذا زندگی کی اس یورش کا مقابلہ ہم محض مروجہ عقاید اور خیالات سے مسلح ہو کر نہیں کر سکتے، نہ اس بھول بھلیاں میں پرانے زمانے کے بہت سے بنے ہوئے نقشے کام دے سکتے ہیں - اس لئے فرد پر پہلے کی نسبت بہت زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے -

اس صورت حال کا تقاضا تعلیم کے لئے کیا ہے ؟ ظاہر ہے کہ ایک انقلاب پذیر معاشرے میں زندگی بسر کرنے کے لئے جو تعلیم دی جائیگی اس میں عقل اور فکر کی تربیت پر خاص زور دینا ہوگا کیونکہ اس کے بغیر فرد اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتا - نصاب اور طریقہ تعلیم کی تدوین میں بھی یہی خیال پیش نظر رکھنا ہوگا کہ ان کے ذریعے بچوں اور نوجوانوں کی فکری قوتوں کی نشو و نما ہو - ابتدائی مدارس سے لے کر یونیورسٹی تک اس بات کی کوشش ضرور ہوگی کہ طلبا کے سامنے علم کو ایک چبائے ہوئے لقمے کے طور پر نہ پیش کیا جائے بلکہ اس کو حاصل کرنے کے لئے انہیں خود ذہنی اور عملی جد و جہد کرنی پڑے - ان پر بہت سی معلومات کا بار ڈالنے کے بجائے ان کو علم حاصل کرنے کے طریقے اور اصول اور ضابطے سکھائے جائیں گے - مشاہدہ اور تجربہ سے کام لینا اور دوسروں کی رائے کو تولنے کی مشق کرائی جائے گی تاکہ وہ ذہنی حیثیت سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں اور ہمیشہ خارجی امداد اور سہارے کے محتاج نہ رہیں - اس امر پر زور دینا اس لئے ضروری ہے کہ باوجود کتابی تعلیم کے طلسم میں اسیر ہونے کے ہمارے کالجوں اور مدرسوں نے عقل کی تربیت پر کافی زور نہیں دیا بلکہ عقل اور اخلاق میں ایک قسم کی غلط نقیض قائم کر کے ہمیشہ اخلاق کو عقل پر ترجیح دی ہے گویا اپنی اور دنیا کی نجات کے لئے بے سوچے سمجھے بعض خاص اعمال کا یا اخلاقی فرائض کا بجا لانا کافی ہے اور اس میں عقل کو زیادہ دخل دینے کی ضرورت نہیں - لیکن یہ خیال غلط ہے اور مشرقی مذاہب اور فلسفے نے کبھی اس خیال کی تائید نہیں کی - بدھ مت نے "حماقت" کو جس کے لئے اس نے "ناواقفیت"

کا لفظ استعمال کیا ہے انسانی گناہوں کی فہرست میں بہت اونچا درجہ دیا ہے' اور قرآن شریف میں ان لوگوں کی صریح مذمت کی گئی ہے جو خدا کی دی ہوئی ذہنی قوتوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھاتے -

"ان کے دل ہیں لیکن وہ سمجھتے نہیں' آنکھیں ہیں لیکن وہ دیکھتے نہیں' کان ہیں لیکن وہ سنتے نہیں - وہ حیوانوں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ - وہ راستے سے بالکل بھٹکے ہوئے ہیں"۔

لہذا ہماری موجودہ معاشرتی صورت حال کا اور اخلاق و مذہب کا متفقہ مطالبہ یہی ہے کہ ہم تعلیم میں قوت فکر کی تربیت کو خاص اہمیت دیں اور نوجوانوں میں ایسی ذہنی صلاحیت پیدا کریں کہ وہ عصر حاضر کی دشوار گزار زندگی میں اپنا راستہ ڈھونڈ نکالیں -

سائنس کی ترقی کا ایک اور زبردست اثر ہماری زندگی پر پڑا ہے جس کی طرف سے تعلیم غافل نہیں رہ سکتی - بعض نئی ایجادوں کی وجہ سے اس زمانے میں لوگوں کے خیالات اور جذبات کو متاثر کرنے کے ذرائع بہت زیادہ وسیع اور دور رس ہو گئے ہیں اس صورت حال کی ستم ظریفی یہ ہے کہ ایک طرف تو جمہوری تحریک کا زور ہے جس کا اصلی مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ سیاسی قوت اور اختیار عوام کے ہاتھ میں آئے تاکہ وہ دنیا کے مادی اور تمدنی وسائل سے پورا فائدہ اٹھا سکیں اور دوسری طرف قیادت کے ہاتھ میں ایسے آلات آ گئے ہیں جن کی مدد سے وہ عوام کے ذہن کو ماؤف یا مسخر کر کے انہیں کٹ پتلیوں کی طرح نچا سکتے ہیں -- اس طرح گویا جو اختیارات انہیں ایک ہاتھ سے دئے جاتے ہیں وہ غیر محسوس طور پر دوسرے ہاتھ سے چھین لئے جاتے ہیں - رائے عامہ کو ڈھالنے کے ان طریقوں پر نظر ڈالئے کہ ان کے بے پناہ مجموعی اثر کے سامنے لوگ کس طرح بے بس ہو جاتے ہیں - ایک اخبار جو ہمارے ملک میں ہزاروں اور دوسرے ملکوں میں لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں چھپتا ہے محض اپنے جلی عنوانات اپنے اخفائے حق اور اعلان باطل' اپنے جھوٹے سچے اشاروں' اپنی خبروں کی ترتیب اور انتخاب سے اکثر لوگوں کے سیاسی خیالات کو اپنے سانچے میں ڈھال لیتا ہے - اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بیشتر ملکوں میں جہاں خواندگی عام ہو گئی ہے' لوگ سیاسی معاملات میں غور و فکر کرنے کے بجائے اخباروں کے سطحی اور یک طرفہ مضامین سے متاثر ہو کر بنی بنائی رائیں قبول کر لیتے ہیں - یہی حال کتابوں کا ہے جن کی اشاعت اس زمانے میں بہت بڑھ گئی ہے - ان کے ذریعے سے بھی مصنفین اور سرمایہ رکھنے والے لوگ عوام کے خیالات کو اپنے مفید مطلب بنا سکتے ہیں - یہی حال ریڈیو' سینما اور تھیٹر وغیرہ کا ہے جن کا اثر اس وجہ سے اور زیادہ مفید (یا خطرناک) ثابت ہوتا ہے کہ وہ بظاہر آلات تفریح ہیں لیکن دراصل غیر محسوس طور پر ہمارے خیالات' جذبات اور مذاق پر بہت گہرا اثر ڈالتے ہیں - اور کس قدر رسائی ہے ان کی - جس شخص یا جماعت کے پاس نشر کرنے کے آلات ہیں اس کی آواز لاسلکی کے پروں پر سوار ہو کر تمام کرہ زمین کا طواف کر سکتی ہے - ایک ڈائرکٹر جو اپنے اسٹوڈیو میں کوئی ڈراما یا فلم تیار کرتا ہے دور دور کے ملکوں میں لاکھوں تماشہ بینوں کو ایک خاص طریقے پر متاثر کر سکتا ہے - پراپگنڈہ کے ان تمام جدید ذرائع کا مجموعی اثر یہ ہے کہ فکر کی آزادی زائل ہوتی جاتی ہے اور اس کے بجائے یکسانیت خیال رواج پا رہی ہے جو ترقی کے راستے میں حارج ہوتی ہے - اس رجحان کا ازالہ اگر ہو سکتا ہے تو وہ تعلیم کے ذریعے -

لیکن عام طور پر تعلیم بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے - اکثر ملکوں میں عوام کو ایک ہی قسم کی ناقص اور ناکافی تعلیم دی جاتی ہے جس کو امریکہ کے مشہور مصنف اور مبصر اپٹن سنکلئر نے GOOSE-STEP کے نام سے موسوم کیا ہے یعنی ایسی تعلیم جس کا مقصد ہے کہ بچوں کو فوج کے سپاہیوں کی طرح قدم ملا کر چلنا سکھایا جائے - اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ اخبار اور کتابیں پڑھنا سیکھ لیتے ہیں لیکن خیالات کا تجزیہ اور تنقید نہیں کر سکتے - تقریریں سنتے ہیں لیکن دل خوش کن لفاظی اور تلخ حقیقت میں تمیز نہیں کر سکتے اور جذباتی اپیلوں کو عقلی دلائل سمجھنے لگتے ہیں - تھیٹر اور سینما میں کھیل دیکھتے ہیں لیکن اچھے اور گھٹیا کھیلوں اور اعلیٰ درجے کے ڈراما میں اور بدمذاق گیتوں اور عمدہ موسیقی میں فرق نہیں کر سکتے - یعنی ان کے ذوق و ذہانت کا معیار اس قدر گرا ہوا ہے کہ نہ وہ اپنی صلاحیتوں سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں نہ سائنس کے ان جدید آلات سے جن کا واقعی کام تہذیب کے خزانوں کو عام کرنا ہے -

لیکن یہ صورت حال ایک جمہوری سماج کے لئے سراسر خطرناک ہے کیونکہ اس کی کامیابی کے لئے شرط اول یہ ہے کہ رائے عامہ بیدار اور باخبر ہو تاکہ وہ اپنے مفاد کی نگرانی کر سکے اور اجتماعی پالیسی کے تعین میں حصہ لے سکے۔ شاید ایک مطلق العنان (**Authoritarian**) سوسائٹی میں عوام کی صحیح تعلیم اس قدر ضروری نہیں کیونکہ ان کا کام تو محض حکم کی پابندی ہے۔ وہاں تو چند با اختیار لوگوں کا قابل اور سمجھ دار ہونا کافی ہے۔ لیکن جہاں سماج کی تنظیم جمہوری اصولوں پر کی جائے اور فرد کی شخصیت کا احترام مد نظر ہو وہاں اسے اس طرح تعلیم دینا ضروری ہے کہ وہ ان وسیع تر امکانات سے فائدہ اٹھا سکے جو اس سماج میں موجود ہیں [آخر ایک جمہوری سماج کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں؟ یہی کہ وہ تمام افراد اور جماعتوں کی نشو و نما کے لئے ایک موزوں ماحول مہیا کرتی ہے' فرد کی تربیت آزادی کی فضا میں کرنا چاہتی ہے' انسانوں کو ایک سانچے میں ڈھال کر خیالات میں یکسانیت پیدا کرنا نہیں چاہتی بلکہ تنوع کا خیر مقدم کرتی ہے اور افراد کی امتیازی خصوصیات کی نشو و نما چاہتی ہے بلکہ اسی میں زندگی اور تہذیب کی دولت مندی کا راز پنہاں ہے۔ وہ ہر معاملے میں حکومت کی رائے کو منزّل من اللہ بنا کر پیش نہیں کرتی بلکہ بحث و مباحثہ اور نقد و تنقید کی قائل ہے تاکہ تبادلہ خیال کے ذریعے لوگ ظن و تخمین کی منزلوں سے گزر کر حق اور صداقت تک پہنچ سکیں۔ جس حد تک ایک جمہوری سوسائٹی واقعاً ان اصولوں کو پیش نظر رکھے گی تعلیم ان کا خیر مقدم کرے گی کیونکہ یہی چیزیں تو اس کے مقاصد میں بھی شامل ہیں' یعنی شخصیت کا احترام اور اس کے بے اندازہ امکانات کا احساس' تلاش حق کا جذبہ اور امتیازی صفات کی نشو و نما کے ذریعے تہذیب و تمدن کی رنگا رنگی]

یہ جمہوریت کی ایک مثالی تصویر ہے جس کو صرف وہی لوگ مسترد کر سکتے ہیں جو سرے سے ان قدروں کے قائل ہی نہیں۔ مگر اس پر جو تنقید اور اعتراض عام طور پر کئے جاتے ہیں ان میں جمہوریت کی وہ واقعی شکل پیش نظر ہوتی ہے جو آج کل دنیا میں موجود ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ابھی تک بیشتر قومیں صرف سیاسی جمہوریت کی منزل تک پہنچی ہیں جن کی بدولت ہر شخص کو انتخاب میں رائے دینے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔ لیکن یہ روکھا پھیکا حق انہیں کہاں تک لے جا سکتا ہے؟ اس کی وجہ سے محض اتنا ہوا ہے کہ انسانوں کی تو نہیں لیکن ان کے ووٹوں کی قدر ہونے لگی ہے جن کو حاصل کرنے کے لئے اہل غرض ہر طرح جائز اور ناجائز طریقے اختیار کرتے ہیں۔ سیاست کے خود غرض بازی گر' دولت کے بے درد پجاری' قوت و اختیار کے بے اصول طالب اور اخباروں کے ضمیر فروش مالک سب اپنے مطلب کے لئے عوام کو بیوقوف بنا کر انہیں ان کے حق سے محروم کرنا چاہتے ہیں اور اکثر اس کوشش میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان باتوں کو دیکھ کر بعض احساس مند لوگ سرے سے جمہوریت ہی کے مخالف ہو گئے ہیں۔ لیکن دراصل مخالفت ان اسباب کی کرنی چاہئے جن کی وجہ سے جمہوریت عوام کے حق میں کام نہیں کر پاتی بلکہ مخصوص مفاد اور اغراض کا آلہ کار بن کر رہ گئی ہے۔ جب تک یہ صورت حال قائم ہے واقعاً "جلال بادشاہی" اور "جمہوری تماشے" میں کوئی خاص فرق نہیں۔ لیکن یہ قصور جمہوریت کے حقیقی تصور کا نہیں بلکہ اس ناقص اور نامکمل جمہوریت کا ہے جس پر دنیا قانع ہو گئی ہے۔

مارکسسٹ نقطۂ نظر نے انسانی فکر میں جو خاص اضافہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں انسانی تہذیب اور عام معاشرتی اور اقتصادی حالات کے باہمی رشتے کو تسلیم کیا گیا ہے اور اس کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے موجودہ مغربی تہذیب کی' جس نے سرمایہ داری نظام کے بطن سے جنم لیا ہے' بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس نے سائنس اور صنعت و حرفت کے وسائل سے کام لے کر اقتصادی' سماجی اور تہذیبی جمہوریت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ صرج کے ایک جماعتی تصور سے مغلوب ہو کر اس کے مفکروں اور وکیلوں نے اس چیز کو غیر ضروری یا ناممکن قرار دے دیا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ایسا ہونا نہ غیر ممکن ہے نہ غیر ضروری اور ہمارے ہاتھ میں آج ایسے فکری اور مشینی آلات موجود ہیں جن سے صحیح طور پر کام لے کر ہم ایک انصاف پسند' خوشگوار' پرامن اور با فراغت سماج کو قائم کر سکتے ہیں اور تعلیم اس جہاد میں نمایاں حصہ لے سکتی ہے۔

کنہیا لال کپور

پروفیسر دانش

پروفیسر دانش اپنے کتب خانے میں جو بیک وقت اُن کا کتب خانہ اور غسل خانہ تھا۔ دیوان غالب کی ایک شرح کا مطالعہ کر رہے تھے۔ شارح نے ایک نہیں متعدد اشعار کا مطلب اس انداز میں بیان کیا تھا کہ پروفیسر دانش کے چہرے پر ایک رنگ آتا ایک رنگ جاتا تھا۔ دفعتاً اُن کی نظر اس شعر پر پڑی

سہ ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

شارح نے اس کی توضیح حسب ذیل الفاظ میں کی تھی "یہ ہیں اُن شارحین سے عقل و دانش کی توقع ہے۔ جو یہ بھی نہیں جانتے کہ عقل و دانش کس بلا کا نام ہے۔

(نوٹ: اس شعر میں مرزا غالب نے اُن شارحین پر چوٹ کی ہے جنھوں نے خاکسار سے پہلے دیوان غالب کی شرحیں لکھی ہیں"

شعر کی یہ تفسیر پڑھ کر پروفیسر ہونچکا سا رہ گئے۔ اپنی گنجی چاند پر دو ایک بار ہاتھ پھیرا۔ لاحول پڑھا اور کتاب بند کر کے دانت پیسنے لگے۔ دانت پیسنا پروفیسر صاحب کا محبوب مشغلہ تھا۔ انھیں جب کوئی اور کام نہ ہوتا۔ تو دانت پیسنا شروع کر دیتے۔ پروفیسر دانش کے کالج میں آج چھٹی تھی، اور وہ سوچ رہے تھے کہ گو انھیں غسل کئے تین ماہ کا زمانہ ہو چکا ہے۔ لیکن پھر بھی اُنھیں غسل کرنے کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ پروفیسر صاحب نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ ایک نہایت ذلیل قماش کا آدمی اندر داخل ہوا۔ پہلے تو پروفیسر صاحب نے سمجھا گداگر پیشہ ور کٹھ کٹرا ہے لیکن جب وہ جھک کر کورنش بجا لایا تو اُنھیں اپنی رائے میں ترمیم کرنا پڑی

"آداب عرض" پروفیسر دانش نے مصنوعی مسکراہٹ سے اُس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

"تشریف رکھیئے"

پروفیسر صاحب کے کتب خانے میں ایک ٹوٹی ہوئی کرسی کے علاوہ کہ جس پر وہ خود تشریف فرما تھے دوسری کوئی چیز نہیں تھی۔ اس لئے نووارد تشریف رکھنے سے معذور رہا۔ یہ دیکھ کر پروفیسر صاحب نے اپنے چہرے پر ایک اور مصنوعی مسکراہٹ کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "تشریف رکھنا بھی ایک تکلف ہے۔ کیوں نہ آپ کھڑے کھڑے مجھ سے گفتگو کریں۔ کہیئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"مَیں بہت دور سے آپ سے شرفِ نیاز حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں"

"شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں"

"زغنے سے"

"زغنہ؟ عجیب نام ہے۔ میرا مطلب ہے۔ میں نے آج تک ایسا بے ہودہ نام نہیں سنا۔"

"میرا نام وحشت ہے"

"یک نہ شُد۔ دو شُد۔ یقیناً آپ کے والدین نے نام انتخاب کرنے کے معاملے میں غلطی نہیں کی"

"میں آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا ہوں۔ کہ آپ سے التماس"

"قطع کلام معاف" پروفیسر صاحب نے بات کاٹتے ہوئے کہا "اگر آپ اس لئے تشریف لائے ہیں کہ میں آپ کے کسی عزیز کے جس نے یونیورسٹی کا امتحان دیا ہے۔ نمبر بڑھا دوں۔ تو میں صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کہ مجھ سے یہ اُمید ہرگز نہ رکھیئے گا"

آپ کو غلط فہمی ہوئی پروفیسر صاحب قبلہ۔ میں اس غرض سے حاضر نہیں ہوا ہوں"

"تو پھر" پروفیسر دانش نے دانت پیستے ہوئے کہا "تو پھر آپ....."

نو وارد نے معاملہ بگڑتے ہوئے دیکھ کر ڈرتے ڈرتے کہا "میں آپ سے یہ التجا کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں، کہ آپ اِس اتوار کو نرغنے تشریف لائیں اور اپنے دستِ مبارک سے ایک غیر سرکاری پاگل خانے کا سنگِ بنیاد رکھیں"

"پاگل خانے کا سنگِ بنیاد! لاحول ولا" پروفیسر دانش نے کرسی سے اُچھل کر کہا "حضرت آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے جو ایسی نامعقول درخواست میرے پاس لے کر آئے۔ اِس مطلب کے لئے تو آپ کو کسی قومی کارکن کے پاس جانا چاہیئے تھا۔ آپ شاید یہ سمجھتے ہیں، کہ میں پا....."

"گستاخی معاف" وحشت نے نہایت سنجیدگی سے کہا "میں متعدد قومی کارکنوں سے درخواست کر چکا ہوں۔ لیکن بدقسمتی سے وہ اتنے مصروف ہیں کہ اُنھیں ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں۔ ایک صاحب اِس ہفتے سات مقبروں کا سنگِ بنیاد رکھ رہے ہیں۔ دوسرے پانچ یتیم خانوں کا افتتاح فرما رہے ہیں۔ تیسرے رعشے کے مرض میں مبتلا ہیں۔ اور اُن کے ہاتھوں میں اتنی سکت نہیں کہ کسی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھ سکیں"

"کچھ بھی ہو۔ میں اس کام کے لئے ہرگز طیار نہیں"

"ضد نہ کیجئے۔ پروفیسر صاحب۔ قوم کو آپ سے بہت سی توقعات ہیں"

قوم کا نام سُن کر پروفیسر صاحب بھنا اُٹھے۔ اور اُنھوں نے چیخ کر کہا۔

"قوم جہنم میں جائے۔ قوم نے میرے لئے کیا کیا ہے کہ میں اس کی پروا کروں۔ جب ملک غلام تھا۔ تو میں ساٹھ روپے ماہوار پر اردو پڑھاتا تھا۔ اب آزاد ہے۔ تو میں اسی تنخواہ پر یہ مضمون پڑھا رہا ہوں۔ مجھے قوم سے کوئی ہمدردی نہیں ہے"

"مجھے یہ سب معلوم ہے۔ اِس کے باوجود آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ قوم کی رائے میں سنگِ بنیاد رکھنے کے لئے آپ موزوں ترین ہستی ہیں"

"میں نہیں ہوں"

"آپ ہیں"

"میں ہرگز نہیں"

"آپ بالکل ہیں"

یہ بحث بہت دیر تک جاری رہی، اور جب بکتے بکتے پروفیسر دانش کی سانس اُکھڑنے لگی۔ تو اُنھوں نے اور چارہ کار نہ دیکھتے ہوئے تسلیم کر لیا کہ وہ اس کام کے لئے موزوں ترین ہستی ہیں"

(۲)

اتوار کے دن نرغنے کے سے دور افتادہ قصبے میں خوب چہل پہل تھی لوگ جوق در جوق "مجنوں پارک" میں جہاں ملک کے پہلے غیر سرکاری پاگل خانے کا سنگِ بنیاد رکھا جانے والا تھا۔ اکٹھا ہو رہے تھے جب وعدہ پر پروفیسر دانش اپنی ٹوٹی پھوٹی سائیکل پر سوار ہو کر شام کے چھ بجے تشریف لے آئے۔ وحشت نے قصبے کے معززین کی معیت میں ان کا استقبال کیا۔ گڑ کی چائے پلائی۔ پھولوں کے ہار پہنائے۔ اور خواتین و حضرات سے اُن کا تعارف ان الفاظ میں کرایا۔

"پروفیسر دانش کی ذات تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کا شمار ملک کے اُن علماء میں سے ہوتا ہے۔ جن پر ہم سب کو ناز ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے۔ کہ اُنھوں نے اِس پاگل خانے کا سنگِ بنیاد رکھنا قبول کر لیا ہے۔ میں نہایت ادب سے اُن کی خدمت میں التماس کرتا ہوں۔ کہ وہ اس مبارک رسم کو ادا فرمائیں"

پروفیسر دانش نے جلدی جلدی پتھر کے چبوترے پر سیمنٹ لگائی، اور مزدوروں کو جو لمبے لمبے رسّوں سے ایک بھاری پتھر تھامے کھڑے تھے۔ اشارہ کیا۔ کہ سنگِ بنیاد کو نیچے آنے دیں۔ حاضرین نے تالیاں بجائیں، اور پروفیسر صاحب گھبرا کر ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگے۔ جب اُنھیں یقین ہو گیا کہ سنگِ بنیاد مطلوبہ جگہ پہ رکھا جا چکا ہے۔ تو اُنھوں نے دو ایک بار کھانسنے کے بعد حاضرین سے خطاب کیا۔

"خواتین و حضرات! میں آپ کا شکریہ ادا نہیں کروں گا کیونکہ مجھے آپ کے قصبے میں آکر مطلقاً خوشی نہیں ہوئی۔ اول تو آپ نے اپنا قصبہ دہلی سے اتنے فاصلے پر بسایا ہے۔ کہ سائیکل چلاتے چلاتے میری پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ دوسرے جو سڑک آپ کے قصبے کو دہلی سے ملاتی ہے۔ اتنی گرد آلود ہے کہ میری شیروانی کا ستیاناس ہو گیا۔ خواتین و حضرات! میرے بارے میں کہا گیا ہے۔ کہ میری ذات تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ مجھے کالج کی چار دیواری کے باہر کوئی شخص نہیں جانتا۔ اور بعض اشخاص مثلاً سینئر جماعتوں کے طلبا تو مجھے کالج کی چار دیواری میں بھی نہیں پہچانتے۔ میرا شمار یقیناً علماء میں نہیں ہوتا۔ کہ میں اُس حد تک جاہل نہیں جس حد تک ایک عالم کو ہونا چاہیئے۔ میں ایک نہایت گمنام شخص ہوں۔

یہ صحیح ہے کہ اگر میرا چہرہ قدرے اور کروہ اور جسم کافی منحنی ہوتا۔ تو میں پرنسپل یا کم از کم وائس پرنسپل ہوتا۔ لیکن افسوس خدا کو یہ منظور نہیں تھا میں ایک ادنیٰ پروفیسر ہوں، اور طلباء کے اغلاط سے بھری ہوئی کاپیاں دیکھتے دیکھتے عاجز ہو گیا ہوں جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے آج سے قبل کسی عمارت کا سنگ بنیاد نہیں رکھا۔ میں اس رسم کو ایک مذموم بدعت سمجھتا ہوں۔ گذشتہ زمانے میں کسی خوبصورت عمارت کا سنگ بنیاد نہیں رکھا گیا۔ آپ ہی بتایئے کہ لال قلعے یا قطب مینار کا سنگ بنیاد کس نے رکھا تھا۔ خیر چھوڑیئے اس بات کو۔ اب ذرا پاگل خانے کی طرف آیئے میں سمجھتا ہوں کہ غیر سرکاری پاگل خانوں کی تعمیر ایک نہایت مبارک فال ہے بدقسمتی سے ہمارے ملک میں پاگلوں کی تعداد اس سرعت سے بڑھ رہی ہے۔ کہ ہم سب پریشان ہیں۔ کہ انھیں کہاں رکھا جائے گا۔ زمانہ ماضی میں یہ سعادت صرف عشاق کو ہی حاصل تھی۔ لیکن عصر حاضر میں تقریباً ہر شخص پاگل ہے معاف کیجئے۔ بہت سے اشخاص پاگل ہیں۔ زمانۂ سلف کے دیوانے بے ضرر انسان ہوا کرتے تھے۔ ان کے مشاغل محدود تھے یعنی بیٹھے بیٹھے اگر ان کے دل میں درد اٹھتا تھا تو وہ زیادہ سے زیادہ اپنا گریبان پھاڑ ڈالتے تھے یا سنگ آستاں سے اپنا سر پھوڑ لیتے تھے۔ لیکن زمانۂ حال کے اہل جنون سخت خطرناک واقع ہوئے ہیں۔ کہ وہ بکار خویش ضرورت سے زیادہ ہوشیار ہیں۔ ان کا واحد مقصد عوام کو گمراہ کر کے اپنی دیوانگی کو چمکانا ہے۔ میرے خیال میں ان سب لوگوں کو اس پاگل خانے میں کہ جس کا سنگ بنیاد میں نے ابھی ابھی رکھا ہے سلانا پڑے گا۔ آپ کو اس پاگل خانے میں تین وارڈ بنانے ہوں گے پہلے وارڈ میں اُن تمام شریر سے لیڈروں کو رکھا جائے گا جن کا شغل لوگوں کو بہکانا ہے۔ دوسرے وارڈ میں وہ ذات شریف رکھے جائیں گے جن کے نزدیک مذہب کو ہر وقت خطرہ ہے۔ اس ضمن میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ ان لوگوں کو تا دم زیست پاگل خانے سے باہر آنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ تیسرے وارڈ میں اُن نیم خواندہ ایڈیٹروں کو رکھا جائے گا جو فرقہ وارانہ خیالات کا پرچار کر کے عوام کو آپس میں لڑاتے ہیں تو خواتین و حضرات۔ یہ ہے وہ بلند آدرش، جس کی تکمیل کے لئے اس پاگل خانے کا سنگ بنیاد رکھا گیا ہے۔ آخر میں آپ کی اجازت سے یہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کہ وحشت صاحب کو اس پاگل خانے میں ایک کوٹھڑی ضرور عطا کی جائے۔ کہ وہ میرے سے شریف انسانوں کو آئندہ دق نہ کر سکیں۔

پروفیسر دانش کے آخری فقرے پر وحشت بہت سیخ پا ہوا لیکن اس اثنا میں پروفیسر صاحب پلیٹ فارم سے اتر کر بائیسکل پر سوار ہو چکے تھے اور اس سے پیشتر کہ وحشت اُن سے اپنے الفاظ واپس لینے کو کہتا وہ تیزی سے دہلی جانیوالی سڑک پر سائیکل چلاتے ہوئے گنگنا رہے تھے ؂ زنداں میں بھی شورش نہ گئی اہل جنوں کی۔

نہال سیوہاروی

ثمرات

رابطہ ہے مجھے شیشے سے نہ پیمانے سے
پھر وہ کیا بات ہے منسوب ہوں میخانے سے

یہی خلوت گہ رنداں ہے یہی جائے نماز
دو جہاں کو ہے تعلق مرے کاشانے سے

اہل میخانہ سلیقے سے پئیں آب حیات
ورنہ پھر موت ہے چھلکے گی جو پیمانے سے

عبرت آثار جہاں آج ہے کانٹوں کا ہجوم
کبھی تخلیق چمن تھی اسی ویرانے سے

ساقیو! تذکرۂ صبح درخشاں چھیڑو
جی کچھ اُکتا سا گیا رات کے افسانے سے

ایک عالم سے جُدا مصلحتیں ہیں اس کی
کون ہر بات پہ اُلجھے ترے دیوانے سے

خرد آشوب ہے ہر نکتۂ عرفان حیات
اور بڑھتا ہے جنوں عقل کے بڑھ جانے سے

مسعود حسن رضوی

رائے ٹیکا رام تسلّیؔ

یاد ش بخیر ایک زمانہ تھا جب ہندو مسلمان شیر و شکر ہو کر ایک مشترک تہذیب کی تعمیر میں دوش بدوش کام کر رہے تھے۔ اسی مبارک عہد کے ایک معمار تہذیب رائے ٹیکا رام تسلّیؔ تھے۔ جو اس مختصر مقالے کا موضوع ہیں۔ انہوں نے فارسی غزلوں کے منتخب اشعار کا ایک گلدستہ مجموعۃ الشعراء کے نام سے تیار کیا تھا اس ضخیم کتاب کا ایک قلمی نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ جس کو پنڈت کنہیا لال نے نصف لکھنؤ اور نصف آگرے میں نقل کر کے ۱۵ ربیع الثانی ۱۲۲۵ھ کو ختم کیا تھا۔ یہ نسخہ بڑی تقطیع کے ساڑھے آٹھ سو صفحوں پر مشتمل ہے۔ اور اپنے مؤلف کی جانفشانی اور وسعت نظر کی شہادت دے رہا ہے۔ مؤلف کا دعویٰ ہے کہ اس کی تالیف کے لئے سات سو فارسی دیوانوں کی ورق گردانی کی گئی ہے۔ راقم سطور نے کتاب کا انڈکس بنانے کی کوشش کی تو ساڑھے پانسو شاعروں کے تخلص نکل آئے۔ اور سیکڑوں مقامات پر کاتب نے شاعروں کے تخلص کی جگہ سادی چھوڑ دی ہے۔ جسے وہ بعد کو سرخی سے پُر کرنا چاہتا تھا مگر کسی وجہ سے نہ کر سکا۔ یہ صورت حال یقین دلاتی ہے کہ مؤلف کا دعویٰ صحیح ہے۔

اس مجموعے میں ایران اور ہندوستان کے فارسی شاعروں کی صرف غزلوں کے انتخابات شامل کئے گئے ہیں۔ ہر غزل کا مطلع ضرور لے لیا گیا ہے۔ سیکڑوں غزلوں کے صرف مطلعے منتخب کئے گئے ہیں۔ مطلع کے علاوہ ہر غزل سے زیادہ تر ایک دو شعر اور کبھی کبھی چار پانچ شعر لے لئے گئے ہیں۔ انیس کی غزلوں سے اکثر زیادہ شعر منتخب کئے گئے ہیں۔ یہ انیسؔ غالباً لالہ موہن لال انیسؔ ہیں۔ جو مؤلف کے استاد بھائی تھے۔ مرزا فاخر مکینؔ کے مجموعہ میں ایک خط ان کے نام بھی ہے۔ اور مکینؔ نے اپنے شاگردوں کے زمرے میں ان کا نام بھی لیا ہے۔ جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا تسلّیؔ نے خود اپنے شعر بھی بہت سی غزلوں سے منتخب کئے ہیں، تمام منتخب اشعار ردیف وار دیوان کی صورت میں مرتب کئے گئے ہیں۔ ان کی ترتیب میں اس بات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ مختلف شاعروں کے ہم زمین اشعار یکجا ہو جائیں۔ اس طرح تقابلی مطالعے میں آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ اور کتاب کا مطالعہ زیادہ دلچسپ ہو گیا ہے۔

تسلّیؔ نے مجموعۃ الشعراء کے دیباچے میں اپنے جو حالات لکھے ہیں وہ میں اپنے لفظوں میں مختصراً بیان کرتا ہوں۔ تسلّیؔ کے والد رائے گوپال داس کے چار بیٹے تھے۔ بھولا ناتھ۔ چھوٹے لال۔ خوشحال رائے اور ٹیکا رام۔ ٹیکا رام سب سے چھوٹے اور باپ کے سب سے پیارے بیٹے تھے۔ اس لئے ہمیشہ خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ بھائیوں میں بھی آپس میں بڑا میل جول تھا۔ اور سب بھائی مل جل کر سرکاری کاموں کو بخوبی انجام دیتے تھے۔ سنہ ۱۱۹۹ھ میں جب تسلّیؔ کی عمر بارہ سال کی تھی۔ نواب آصف الدولہ کی سرکار سے راجہ خوشحال رائے ولد راجہ نول رائے کی نیابت میں بخشی گری کا محکمہ رائے گوپال رائے کو سپرد ہوا۔ ان کی خوش اخلاقی اور فیض بخشی نے ایک عالم کو ان کا گرویدہ اور احسان مند بنا دیا۔ ان کے چاروں بیٹے بھی اسی محکمے میں کام کرتے تھے۔ بخشیوں کے اس خاندان نے اپنی کارگذاری کی بدولت بڑی عزت اور شہرت حاصل کی۔ نواب آصف الدولہ ان کی خدمات سے اس قدر خوش تھے کہ ان کے یہاں بار بار بنفس نفیس تشریف لے گئے۔ اور ہر چھوٹے بڑے کو خلعت سے سرفراز کیا۔ ان کی عزت افزائی کا اس سے بہتر ذریعہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

تسلّیؔ کو ابتدائے سن تمیز سے استادوں کے اشعار سے دلچسپی اور عالموں اور شاعروں کی ہم نشینی کا بہت شوق تھا۔ اس لئے دنیاداری اور مشاغل کے باوجود اس شغل کے لئے وقت نکال لیتے تھے۔ اور اکثر تعطیل کے دن یعنی جمعہ کو اپنے مکان پر ایک ادبی صحبت منعقد کرتے تھے۔ جس میں اس زمانے کے نامور فارسی شاعر خصوصاً مرزا فاخر مکینؔ اور ان کے تمام ہندو مسلمان شاگرد میر قمر الدین منّتؔ۔ مرزا قتیلؔ۔ محمد وصل خاں واصلؔ۔ میر حسن میاں حسنی

انشاءاللہ خاں۔ میاں جرأت۔ میر تقی۔ میر محمد قائم۔ میر حسن اور ان کے بیٹے، میر فخرالدین ماہر شاگرد میرزا رفیع السودا۔ محمد بقا۔ ظہور اللہ خاں نوا۔ میر حیدر علی حیرانؔ اور ان سب کے شاگرد، یہ سب کوئی سو شاعر ان کے یہاں جمع ہوجاتے تھے۔ صبح سے شام تک شعر خوانی کی محفل اور شام سے صبح تک، رقص و سرود کا جلسہ ہوتا تھا۔

ان دنوں مرزا محمد فاخر مکینؔ فارسی شاعری میں شہرت رکھتے تھے۔ اور شہر کے ہزاروں امیر اور رئیس ان کی شاگردی کو اپنا فخر سمجھتے تھے۔ رائے ٹیکا رام بھی ان کے شاگرد ہو گئے، اور انھوں نے ان کو تسلیؔ تخلص عطا کیا۔ استاد نے اس نئے شاگرد کی طرف غیر معمولی توجہ کی۔ اکثر جمعے اور تیوہاروں کے دنوں میں جب تسلیؔ کو دربار سے فرصت رہتی تھی تو مرزا مکینؔ ان کے یہاں آجایا کرتے تھے۔ تھوڑے دنوں میں اپنی محنت اور استاد کی توجہ کی بدولت تسلیؔ نے فارسی شاعری میں ایک مدحیہ اور ایک دیوان مرتب کر لیا۔ اردو میں بھی اپنے طور پر شعر کہتے رہے۔ اسی زمانے میں فارسی کی مشہور مثنویوں کا ایک انتخاب بڑی محنت سے طیار کیا۔

جب تسلیؔ کے بزرگوں کا انتقال ہو گیا اور نواب آصف الدولہ بھی سنہ ۱۲۱۲ھ میں رحلت فرما گئے تو بخشی گری کا محکمہ ان کے گھرانے سے نکل گیا۔ اس بیکاری کے زمانے میں ان کو اپنی ایک پرانی خواہش کی تکمیل کا موقع مل گیا۔ اور وہ فارسی کے قدیم اور جدید شاعروں کی غزلوں کا انتخاب کرنے میں مصروف ہو گئے۔ یہ کام سترہ برس جاری رہا۔ اس دوران میں تسلیؔ نے سات سو فارسی دیوانوں کا مطالعہ کیا۔ اور اس غیر معمولی محنت کے نتیجے میں مجموعۃ الشعرا کے نام سے فارسی غزلوں کا ایک ایسا انتخاب طیار کیا جیسا اس کے پہلے کبھی وجود میں نہیں آیا تھا۔ جس سال نواب سعادت علی خاں کا انتقال ہوا اور غازی الدین حیدر تخت نشین ہوئے یعنی سنہ ۱۲۲۹ھ میں تسلیؔ کو اس کتاب کی تالیف و ترتیب سے فراغت ملی۔ انھوں نے اس ضخیم کتاب کی دو تین نقلیں کروا کے اپنے دوستوں کو دیں کہ صفحۂ ہستی پر ان کی یادگار باقی رہے۔

نواب آصف الدولہ کے انتقال اور نواب وزیر علی خاں کے بنارس چلے جانے کے بعد نواب یمین الدولہ سعادت علی خاں وزارت کی مسند پر بیٹھے تسلیؔ چند سال لکھنؤ کی حالت دیکھتے رہے۔ اور آخر یہاں کی فضا اپنے لئے ناساز گار پا کر بندیلکھنڈ کی طرف چلے گئے۔ دو سال کپتان جان بیلی کے ساتھ بسر کئے اس اثناء میں نواب سعادت علی خاں نے شقۂ خاص بھیج کر ان کو بلوایا۔

اور کل ممالک محروسہ کے اخبار کا محکمہ ان کے سپرد کر دیا۔ لیکن وہ اس عہدے پر ایک سال سے زیادہ قائم نہیں رہ سکے۔ بعض اہل کاروں نے لالچ میں پڑ کر ان کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ جن سے متأثر ہو کر شمس الدولہ بہادر وغیرہ نے ان کو موقوف کروا دیا۔ اس ایک سال کی ملازمت میں تسلیؔ کو تقریباً پچاس ہزار روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔

تسلیؔ نے فارسی مثنویوں کا جو انتخاب مرتب کیا تھا اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ مجموعۃ الشعرا، کی تکمیل سے پہلے وہ پانچ کتابیں اور تصنیف کر چکے تھے۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔ دو دیوان۔ ایک فارسی ایک اردو۔ انشا کی دو کتابیں فارسی نثر میں۔ اور ایک قصہ اردو نثر میں۔ اس طرح تسلیؔ کی سات کتابوں کا حال معلوم ہو گیا۔

تسلیؔ کے جو حالات اوپر لکھے گئے ہیں وہ مجموعۃ الشعرا کے دیباچے سے لئے گئے ہیں۔ اور وہ دیباچہ خود تسلیؔ کا لکھا ہوا ہے۔ ان کے حالات کے لئے دو ہم عصر ماخذ اور ہیں۔ ایک مصحفیؔ کا تذکرۂ ہندی۔ جو چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ اور دوسرا اردو شاعروں کا ایک غیر مطبوعہ تذکرہ جس کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ اس تذکرے کے صرف دس ورق باقی رہ گئے ہیں۔ اس کے مؤلف کا نام بھی معلوم نہیں۔ مگر اندرونی شہادتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لکھنؤ کے رہنے والے کوئی ذی علم ہندو بزرگ تھے۔ انھوں نے ہر شاعر کے لئے صرف ایک ورق دیا ہے۔ پہلے صفحے پر شاعر کا حال اور اس کے کلام کا انتخاب ہے اور دوسرے صفحے پر ان کی رنگین تصویر ہے۔ بالکل اسی طرح کے ایک تذکرے کا ذکر تزک جہانگیری میں ملتا ہے۔ جو شہنشاہ جہانگیر کے حکم سے طیار کیا گیا تھا۔ کچھ عجب نہیں کہ اس تذکرے کے مؤلف نے یہ خیال وہیں سے لیا ہو۔ مؤلف نے ہر شاعر کی تصویر کے نیچے فارسی کا ایک شعر لکھا ہے جس میں اس کا نام آگیا ہے۔ تسلیؔ کی تصویر کے نیچے یہ شعر درج ہے۔

تب غم چو در جان محزوں رود زشعر تسلیؔ تسلی شود

اس تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ تسلیؔ کا قدیم وطن اٹاوے کے قریب تھا۔ مگر ان کی نشو و نما لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ سن شعور کی ابتدا ہی سے شعر کہنے کا شوق تھا۔ فارسی میں مرزا فاخر مکینؔ سے اور اردو میں میاں مصحفیؔ سے اصلاح لیتے تھے خوش فکر شاعر تھے۔ بے مشق اشعار کہتے تھے اور شعر و سخن کی محفلوں میں شرکت واجب سمجھتے تھے۔ خوبصورت۔ نیک طینت۔ اور محبت والے آدمی تھے۔

ماہرین فن کے ساتھ حسن اخلاق کا تم جانتے تھے۔ اور اہل حاجت کی طرف آفتاب کی طرح نور افشاں گذرتے تھے۔ تذکرے کی تالیف کے وقت ان کی عمر پچیس سال کے قریب تھی ؛

مصحفی اپنے تذکرۂ ہندی میں لکھتے ہیں کہ لالہ ٹیکا رام تسلی خوش اخلاق جوان ہیں۔ ہر فن کے اہل کمال سے خصوصیت کے ساتھ بے حد تواضع اور تعظیم سے پیش آتے ہیں۔ اٹاوے کے قریب موضع کرہل ان کے بزرگوں کا وطن ہے۔ مگر خود ان کی پیدائش اور نشو و نما لکھنؤ میں ہوئی۔ ابتدائے عمر سے شعر موزوں کرنے کا شوق ہے۔ اب کہ ان کی عمر پچیس برس سے متجاوز ہوگی۔ اردو اور فارسی شعر بڑے سلیقے سے کہتے ہیں۔ مگر شہرت کی ہوس نہیں رکھتے۔ اُستادوں کی اکثر مثنویاں اور دیوان جمع کئے ہیں۔ اور اُن سے انتخابات لے کر لکھوائے ہیں۔ میں نے بھی ان کے ایماسے اپنا ایک فارسی دیوان، دو اردو دیوان اور تذکرۂ فارسی لکھ کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنی کمتب نشینی کے زمانے میں جب کہ میں اس شہر میں نو وارد تھا بڑے اشتیاق کے ساتھ اپنا آدمی بھیج کر میرا پہلا دیوان منگوا کر تھوڑی مدت میں اپنے ہاتھ سے نقل کر لیا تھا۔ اگرچہ ان کی فطری ذہانت مشورے کی محتاج نہیں ہے۔ لیکن احتیاطاً اپنا فارسی کلام مرزا محمد فاخر مکین کو دکھاتے ہیں۔ اور اُردو کی جو دس پندرہ غزلیں کہی ہیں اُن پر مجھ سے اصلاح لی ہے۔ تمام خوبیوں کے ساتھ ان کے اخلاق کا ذکر ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر ہے۔ میں بھی اس بلند اقبال کے حسن اخلاق کا احسان مند ہوں خدا ان کی ذات مبارک کو امارت کی مسند پر ہمیشہ قائم رکھے ؛

تسلی کے متعلق سر دست ہماری کل معلومات اتنی ہی ہے۔ اردو شاعروں کے اکثر تذکرے مثلاً مجموعۂ نغز، گلشن بے خار، گلستان بے خزاں، خوش معرکۂ زیبا طبقات شعرائے ہند، سراپا سخن، سخن شعرا، تسلی کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر ہماری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں کرتے۔ روز روشن، جو فارسی شاعروں کا تذکرہ ہے اس سے ایک نئی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سرفراز الدولہ میرزا حسن رضا خاں بہادر کے نائب راجہ خوشحال رائے تسلی کے دادا تھے۔ مگر خود تسلی نے راجہ خوشحال رائے کا ذکر جس انداز سے کیا ہے اس سے اس قول کی تصدیق نہیں ہوتی ان کے الفاظ یہ ہیں:-

"خلعت علاقۂ تحشیگیری کل ملازمان خرد و کلاں سرکار نواب آصف جاہ سلیمان فر فرید ملا سپر نواب آصف الدولہ بہادر بنام رائے گوپال رائے والد این ہیچ مدان مختاری تمام بہ نیابت راجہ خوشحال رائے پسر راجہ نول رائے بہادر عنایت شدہ ؛

اس عبارت سے یہ کسی طرح مترشح نہیں ہوتا کہ راجہ خوشحال رائے تسلی کے دادا تھے۔ اس کے علاوہ تسلی کے ایک بھائی کا نام بھی خوشحال رائے تھا۔ ہندوستان میں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ دادا کی زندگی میں پوتے کا نام وہی رکھا جائے جو دادا کا ہو۔

تسلی کے حالات میں ایک بات غور طلب یہ ہے کہ تمام تذکرے ان کو فارسی میں مکین کا اور اُردو میں مصحفی کا شاگرد بتاتے ہیں۔ مگر خود تسلی فارسی میں مکین کی شاگردی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں "و شعر ہندی بطور خود میگفت" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو میں کسی کے شاگرد نہیں تھے۔ اس تضاد کا حل مصحفی کے اس بیان میں موجود ہے جو اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں "اشعار فارسی ما از نظر مرزا محمد فاخر مکین می گذرانند۔ و دہ پانزدہ غزل ہندی کہ گفتہ مشاہگی آں موقوف بر رائے فقیر داشتہ" اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ تسلی نے اپنی چند اردو غزلوں پر مصحفی سے اصلاح ضرور لی تھی۔ مگر وہ ان کے باقاعدہ شاگرد نہیں تھے۔

مکین کی شاگردی کے سلسلے میں بھی ایسا ہی ظاہری تضاد ملتا ہے جس کا رفع کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ میرے کتب خانہ میں مرزا فاخر مکین کے خطوں کا ایک قدیم قلمی مجموعہ ہے۔ جو ان کے ایک شاگرد محمد جعفر خاں راغب نے گلزار جعفری کے نام سے ۱۱۹۹ھ میں مرتب کیا تھا۔ اس مجموعے میں ایک خط راغب کے نام ہے۔ جس کے آخر میں مکین نے اپنا ایک طولانی قصیدہ نقل کر دیا ہے۔ اور اس کے بارے میں لکھا ہے:۔

"قصیدہ متضمن احوال سیر دسفر الہ آباد دریں ایام موزوں شدہ ذکر اسامی اکثر یاران خود کہ مخصوص اند و مشورۂ کلام با فقیر تمام دارند بہ تقریبے در ابیات آمدہ، صاف نویسانیدہ یادگار گذارند؛"

اس قصیدے کا نام مکین نے سلسلۃ الاحباب رکھا ہے اور اس میں اپنے ان بائیس شاگردوں کا ذکر کیا ہے۔ رونق۔ راغب۔ برتر۔ ذہین۔ حشمت۔ ناطق۔ سالک۔ قرین۔ جلیس۔ انیس۔ ممکن۔ دلو آنہ۔ تابع۔ گداز۔ مفلس۔ حیران۔ بسمل۔ فائق۔ خلیق۔ تکلیع۔ محو نقی۔ عیاش۔ مکین کے شاگردوں کی اس فہرست میں

تسلیؔ کا نام نظر نہیں آتا۔ گر وہ لکھتے ہیں کہ "آنجناب (یعنی مکینؔ) را بنسبت دیگر شاگرداں بر حال ایں خاکسار توجہ بسیار (است)" یہ تضاد بھی ظاہری ہے۔ حقیقی نہیں۔ زیرِ نظر قصیدے کے دو شعر یہ ہیں:-

چو زد بمنزلِ چہلم قدم مسافرِ عمر — گذر بخاطرِ من کرد شوقِ سیر و سفر
گذشتہ بود ز سیتم ہجرتِ نبوی — ہزار و یکصد و ہشتاد و سالِ دگر

ان شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصیدہ مکینؔ نے اپنی عمر کے چالیسویں سال ۱۱۸۰ھ میں کہا تھا۔ خود تسلیؔ کے بیان کے مطابق ۱۱۹۹ھ میں ان کی عمر بیس سال کی تھی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس قصیدے کی تصنیف کے وقت تسلیؔ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ ان کا مکینؔ کی شاگردی اختیار کرنا اس سے پندرہ بیس برس بعد کا واقعہ ہے۔

اوپر تسلیؔ کی سات تصلیفوں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ گر مجموعۃ الشعراء کے سوا ان کی کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گذری۔ مجموعۃ الشعراء کی تصنیف سے پہلے تسلیؔ ایک دیوان فارسی میں اور ایک اردو میں مرتب کر چکے تھے۔ معلوم نہیں کہ ان دیوانوں کا کوئی نسخہ کہیں محفوظ ہے یا نہیں۔ بہر حال ان کے بہت سے فارسی اشعار مجموعۃ الشعراء کے صفحوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اردو کے صرف سینتالیس شعر مصحفیؔ نے تذکرۂ ہندی میں نقل کئے ہیں۔ اردو شاعروں کے جس قلمی تذکرے کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس میں بھی تسلیؔ کے بارہ شعر نقل کئے گئے ہیں۔ مگر ان میں صرف سات شعر ایسے ہیں جو تذکرۂ ہندی میں نہیں ہیں۔ باقی تمام تذکروں میں تسلیؔ کے جو شعر دیئے گئے ہیں وہ سب تذکرۂ ہندی میں موجود ہیں۔ اس طرح ان کے صرف چوّن اردو شعر اب تک ملے ہیں جو بلا انتخاب سب کے سب ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

دیکھے سماں جو اس مژۂ اشکبار کا — ہو جائے شق جگر رگِ ابرِ بہار کا
جس کے قدم تلے دلِ خوباں ملے گئے — مذکور کیا ہے اپنے دلِ خاکسار کا
فہمیدہ اے کرتے ہیں دولت پہ کب گھمنڈ — کیا اعتماد زندگیٔ مستعار کا
آنکھیں سحر تلک مری در سے لگی رہیں — کیا پوچھتے ہو حال شبِ انتظار کا

اب بھی اس نیم جان میں کچھ ہے — فائدہ امتحان میں کچھ ہے
کیوں ستاتا ہے دیکھ تو پیارے — اس دلِ ناتوان میں کچھ ہے
یہ غرور اور یہ اعتماد غلط — اس زمین آسمان میں کچھ ہے

تو جو درپے ہوا ہے اس کے تئیں — میری جاں میری جان میں کچھ ہے

جو چاہے سلطنت اُسے ظلِّ ہما ملے — مجھ کو یہی ہوس ہے کہ وہ مجھ سے آ ملے
دیتے اگر نہیں ہو تسلیؔ کو تم کچھ اور — بوسہ ہی ایک شعر کا اُس کے صلا ملے

تجھ سا جو بے وفا ہوا ہوگا — اس کا عاشق نہ کوئی جیا ہوگا
ہائے اس کا نصیب کیا ہوگا — جس کا تو نے کہا کیا ہوگا
کیوں تسلیؔ سے اب نہیں ملتے — غیر نے کچھ سکھا دیا ہوگا

(حاشیہ: بیت — تو نہیں ملتا)

گزر چمن میں اگر وقتِ صبح تو نہ کرے — نسیم پاس نہ جا گُل کے اس کو بُو نہ کرے
کوئی بشر نہ زمانے میں ہووے گا ایسا — کہ جس کے دل میں جگہ تیری آرزو نہ کرے
کوئی اڑانے سے باز آئے ہے صبا اُس کی — ہماری خاک کو جب تک کہ کو بکو نہ کرے
جہاں میں اور تسلیؔ کا کون پوچھے حال — جو اس کے حال پہ اے یار رحم تو نہ کرے

تو نہ میری ہی جان ہے کافر — تجھ پہ شیدا جہان ہے کافر
بھاگتا ہے مرے تصور سے — کس قدر بدگمان ہے کافر
حور میں ہے نہ وہ پری میں ہے — تجھ میں جو آن بان ہے کافر
دن پھرے پھر مگر تسلیؔ کے — ان دنوں مہربان ہے کافر

کیا پوچھتے ہو حال تم اس غم نصیب کا — میں تو یہی کہوں گا بُرا ہو رقیب کا

کب میں نے کہا ہائے تم مجھ سے جدا بیٹھو — پہلو سے مرے تکیہ پہلو کا لگا بیٹھو
آتے ہی کہا تم نے بس گھر کو میں جاؤں گا — آخر کو تو جاؤ گے اک دم تو بھلا بیٹھو
کیا جانے تمہیں کس نے یہ بات سکھائی ہے — جب پاس مرے آؤ تب منہ کو بنا بیٹھو
مانگا جو تسلیؔ نے اک بوسہ تو دو پیارے — منہ پھیر کے ظالم نے یوں ہنس کے کہا بیٹھو

(حاشیہ: جاتا ہوں)

جب مجھے دیکھنا ہے بیٹھنا گالی کیا خوب — ہائے اب آپ نے یہ وضع نکالی کیا خوب

بھلا اور تو مجھ کو دو چار کہہ جا — بُرا میں نہ مانوں گا کہہ یار کہہ جا

خفا کیوں ہو بے وفا کہنے سے تو جفاکار تو ہم کو سو بار کہہ جا
دھر کا لہ بھی کیوں کہ میں تجھکو چھوڑ دوں پھر آوے گا سچ مجھ سے عیار کہہ جا
کیا ترک ملنا مرا اس سبب سے وہ بات آ کے مجھ سے تو اک بار کہہ جا
تسلی سے کب ایسی باتیں تو کہتا کسی کے سکھانے سے دلدار کہہ جا

دکھاتا ہے مہ حسن کا اپنے جلوہ اگر تم بھی آؤ لب بام کیا ہو
ترے لب سے غنچہ کرے ہمسری کیا ترے رُخ سے آگے گل نازک اندام کیا ہو
تسلی عجب بے وفا کو دیا دل اس آغاز کا دیکھیں انجام کیا ہو

عالم اُس بت پہ مبتلا ہی رہا اُن میں فدوی بھی اک فدا ہی رہا
اُٹھ گئی دوستی زمانے سے آشنائی نہ آشنا ہی رہا
نہ سنی تو نے ایک بات کبھو ہم کو اس بات کا گلا ہی رہا
تم خفا ہی رہے تسلی سے اور وہ تم پہ نیت فدا ہی رہا

میاں جو کچھ تری سج دھج میں مرزائی نکلتی ہے
کہاں مرزا مزاجوں میں وہ رعنائی نکلتی ہے
ادا و ناز جو تجھ میں ہیں اوروں میں کہاں پیارے
کہ تیری وضع میں کچھ اور زیبائی نکلتی ہے
صبا مذکور جب کچھ لے چلی ہے تیری زلفوں کا
چمن سے بوئے سنبل ہو کے سودائی نکلتی ہے
خدا سے ڈر برابر کر نہ اوروں کے تسلی کو
کہ تیرے عاشقوں میں اس میں یکتائی نکلتی ہے

تجھ پہ آفت یہ نئی پھر دلِ زار آئی ہے لوگ کہتے ہیں کہ گلشن میں بہار آئی ہے
خوں ٹپکتا ہے تری تیغ نگہ سے ظالم کسی مظلوم کو شاید کہ یہ مار آئی ہے
دیکھیے حال تسلی کا ہو کیا اب کے سال لوگ کہتے ہیں کہ گلشن میں بہار آئی ہے

کیا منہ جو کوئی آوے ترے تیر کے منہ پر
یہ ہم تھے کہ منہ رکھ دیا شمشیر کے منہ پر

گو دل میں خفا ہو تو پہ اس بات کو ناداں
کہہ بیٹھیو مت عاشق دلگیر کے منہ پر
میرا ہی جگر ہے یہ کہ میں سینہ سپر ہوں
رستم تو چڑھے اس بت بے پیر کے منہ پر
جب سے تری تصویر لکھی کلک قضا نے
وہ حسن نہ دیکھا کسی تصویر کے منہ پر
جانے دے تسلی تو نہ کر فکر سخن کا
پھبتا ہے سخن مصحفی و میر کے منہ پر

ہزار طرح سے سمجھائے جاؤ اُس کے تئیں کوئی وہ میرے ستانے سے باز آتا ہے
نہ جانے کیوں مرا غمخوار ہو گیا ناصح یہ اور روز مری جان کھائے جاتا ہے
ہزار بار گئے اُس گلی میں پھر بھی ہمیں کسی نے آ کے نہ پوچھا کہ کون آتا ہے

تسلی نے اردو شاعری سے کہیں زیادہ فارسی شاعری کے مطالعے اور تصنیف میں اپنا وقت صرف کیا تھا۔ لہٰذا اُن کے فارسی کلام کا نمونہ دکھانے کیلئے اُن کے شعر اُن کی معرکہ آرا تصنیف مجموعۃ الشعراء سے یہاں نقل کئے جاتے ہیں:-

شدم زرنجش بیجا از آں یگانہ جدا سرم مباد از آں سنگ آستانہ جدا

چند روز سے شد کہ حیرانم نمی دانم چرا گاہ خنداں گاہ گریانم نمی دانم چرا

چہ غم غیر و چہ فکر دگران است او را حاضرم اندل اگر کار بجان است او را
گرچہ ظاہر بسوئے من نظرے کرد چہ شد نگہ مہر با غیار نہان است او را

بس کہ دیدم آزمودم اندریں عالم تمام بر نمی گیرد کسے دست ز کار افتادہ را

صد رنج کشیدم اے تسلی یکدم خوش اگر گذشت ما را

صد درد ز جان ریش ما را صد رنج ز دست خویش ما را

در خزاں کرد ز قیدِ قفس آزاد مرا   شکوہ ہست ز بے رحمیٔ صیاد مرا
کاروانِ دل بہ غارت رفت و گم شد قافلہ   بعد ازاں سر رشتۂ منزل بدست آمد مرا
در ہوش بے تو جام و نہ صہبا برد مرا   ساقی ہمیں نگاہِ تو از جا برد مرا

پوشیدہ ہمارے میں یک نظر از ما   تیر مژہ از تست و نشانِ جگر از ما

یکے جدائی آں گل بسینہ داغ نمود   دگر ترانۂ مرغانِ گلستانم سوخت

سزائے کردۂ خود منحصر بہ محشر نیست   یقین شناس کہ ہر کردہ را جزا اینجاست

بر دلِ جان و دل از نیشے چو ماہش پیداست   طرزِ عاشق کشی از چشم سیاہش پیداست
غمزہ خوں ریز و نگہ خوں کن و مژگاں خونخوار   وضعِ غارتگری از خیل و سپاہش پیداست
از غمِ ہجر چہ احوالِ تسلیؔ پرسی   اضطرابِ دلش از نالۂ و آہش پیداست

اگرچہ دل بہ خیالِ رخِ تو خورسنداست   ولیک دیدہ بدیدارت آرزومنداست

ہر چند بر وفائے توام اعتماد نیست   لیکن جزایں کہ روئے تو بینم مراد نیست

کس نیست در جہاں کہ بجاں مائلِ تو نیست   افسوس ایں کہ جائے کسے در دلِ تو نیست

بر دل از دستِ تو ہر چند کہ بیداد گذشت   چوں نظر رفت بہ رویت ہمہ از یاد گذشت

اضطرابِ دلِ ما را تو چہ دانی ناصح   صدمۂ عشق بجانت نرسیداست ہنوز

در چشم ماست صورتِ یارے کہ داشتم   در سینہ ہست نقش نگارے کہ داشتم

اے تسلیؔ ز غم و ہر چہ ازاں آسودم   کہ ز دل ترک ہمہ لذتِ دنیا کردم

عجب حالیۂ عشق دلبرے پارہ دارم   نہ تابِ دوریش نے طاقتِ نظارہ دارم

جز رخِ او نظرے سوئے گلستاں نکنم   غیرِ آں لب ہوسِ چشمۂ حیواں نکنم

بغیرِ خاطرِ خوشش مدعا نمی خواہم   خدا گواہ جزایں از خدا نمی خواہم

ما را کہ الفتے بدل از دیر و کعبہ بود   از طعنہ ہائے شیخ و برہمن بسوختیم

در کنجِ قفس نالۂ و فریاد نہ کردیم   آزردہ ز خود خاطرِ صیاد نہ کردیم

ندانم از چہ سبب رنجہ شد نگار از من   بہ ایں نیاز و بہ ایں عجز و انکسار از من

مرا از کینہ پابندِ غمِ خود ساختی رفتی   ز بے مہری نگاہے سوئے من انداختی رفتی

رائے ٹیکارام تسلیؔ جیسے ذی علم۔ خوش اخلاق متمول اور فیاض خاندان کے رکن تھے اس کی چند یادگاریں اب بھی لکھنؤ میں موجود ہیں۔ مثلاً بخشی بھولا ناتھ کا کنواں۔ ٹیکارام کا حاطہ۔ بھولا ناتھ کا باغ۔ لکھنؤ سے چند میل کے فاصلے پر ایک وسیع اور خوش نما پختہ تالاب ہے۔ جو بخشی کا تالاب کہلاتا ہے۔ غالباً وہ بھی اسی خاندان کے کسی فرد کی انسان دوستی اور فیض بخشی کی یادگار ہے ؛

تاراچند

یومِ برق

منشی مہاراج بہادر برق مرحوم کی یادگار یومِ برق کی صورت میں ہر سال دلّی میں منائی جاتی ہے۔ اس سال کے جلسے میں ڈاکٹر تاراچند صاحب خود تو شامل نہ ہو سکے، اُن کا ایک مختصر پیغام یا مقالہ جلسے میں پڑھا گیا تھا وہ نذرِ ناظرین کیا جاتا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں آج کے جلسے میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ خواہش ضرور تھی کہ یومِ برق منانے میں حصہ لیتا اور حاضر ہو کر ہدیۂ تحسین پیش کرتا لیکن کچھ وجہوں سے مجبور ہوں۔ مہاراج بہادر برق اردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ اُن کے کلام میں اعلیٰ درجہ کی شاعری کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ زبان صاف سلیس اور سنجیدہ لفظوں کا انتخاب نفیس اور ان کی بندشیں چست۔ شعر میں آمد ہے۔ نظموں میں تسلسل اور روانی ایسی جیسے برسات میں دریا اُمنڈتا چلا جائے۔ لیکن برق کی شاعری محض صوری خوبیوں ہی کی حامل نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شاعری ایک قسم کا ہنر ہے جس کے ذریعہ عمل لفظوں کا مسالہ ہے۔ اس لحاظ سے ایک حد تک شاعری مرصع کاری ہے۔ لیکن اس کا اصلی مرتبہ بہت بلند ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ ایک سطح پر پہونچ کر اس کے ڈانڈے پیمبری سے مل جاتے ہیں۔

مہاراج بہادر برق کی کوشش یہی تھی کہ شاعری کو معنوی خوبیوں کے اظہار کا آلہ بنائیں۔ اردو ادب میں غزل کی ایک خاص جگہ ہے۔ حسن و عشق کی مجازی اور حقیقی واردات کے بیان کے لئے اس سے بہتر شاید ہی کوئی صنفِ سخن ہو۔ برق نے اس میدان میں طبع آزمائی کی اور اربابِ نقد و بصر سے اپنی پختہ کلامی کی داد لی۔ لیکن ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیت ان کی نظمیں ہیں۔ اردو ادب سے ناواقف کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا کل سرمایہ غزلوں تک محدود ہے۔ اور غزلیں یا تو لفظوں کا گورکھ دھندا ہیں یا بے ربط شعروں کے ٹوٹے۔ جن میں فرسودہ اور پامال مضمونوں کو بار بار دوہرایا جاتا ہے اور جن کا زندگی کے جذباتی تنوع سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کے نزدیک اردو شاعری کے سب مضمون۔ استعارے، کنایہ، تشبیہیں، بدیسیوں سے مستعار ہیں۔ جو لوگ ان غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں انھیں چاہیئے کہ برق کے کلام کا مطالعہ کریں۔ انھیں معلوم ہوگا کہ اردو شاعری کا ہندوستانی تمدن، فلسفہ اور مذہب سے گہرا تعلق ہے۔ برق کے ہاں گیتا کا فلسفہ ہے۔ سری کرشن بھگوان کی بھگتی ہے۔ گرو نانک۔ ارجن۔ کرشن سدامائی کی جیتی جاگتی مستیاں ہیں۔ ان کی نظموں میں اصلاح کی دعوت اور عمل کی تلقین ہے۔ اچھوت۔ بیوہ۔ یتیم اور مفلسوں کی دردبھری کہانی پر ہندوستان کے تاریخی مشاہیر کے سوانح، دلآویز نظموں میں بیان کئے ہیں۔ اور وطن کی محبت کے بیسیوں راگ الاپے ہیں۔ برق کی شاعری کے ملاحظے سے اس غلطی کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے کہ اردو کسی خاص مذہب یا ملت کی زبان ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو بولنے والوں میں ہر مذہب و ملت اور فرقہ کے لوگ ہیں عیسائی، مسلمان، ہندو وغیرہ۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ اردو کسی خاص [illegible] یا تمدن کی علمبردار ہے۔ یا کسی تہذیب کے اونچے سے اونچے یا گہرے سے گہرے خیالات کی ترجمانی میں قاصر ہے۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ اردو زبان ہر طرح مکمل ہے۔ میں مانتا ہوں کہ گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے۔ اسے زمانے کے ساتھ بدلنا ہے۔ سماجی اور سیاسی انقلاب کے ساتھ نئے راستوں پر چلنا ہے۔ نئی منزلوں کی طرف تیزی کے ساتھ قدم بڑھانا ہے۔ پرانی سماج جس کی گود میں اردو پلی پھولی، فرقوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اونچ نیچ۔ شریف اور رذیل کی تقسیم پر قائم تھی۔ اب آزادی کا زمانہ ہے۔ برابری اور بھائی چارہ کے اصولوں پر نئی سماج کی تنظیم

کرنی ہے۔ ہمیں شہر اور گاؤں کی زندگی میں یکسانیت لانی ہے۔ ہماری قوم کی نوّے فی صدی آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے۔ ان کے خیالات اور جذبات کا پرتو ہمارے ادب پر اور اُن کی بولی کی چھاپ ہماری زبان پر لازمی ہے۔ اگر ہم ان کی طرف نہیں بڑھے تو قوم کے دو گروہوں کے درمیان ایک وسیع خلیج قائم ہو جائے گی۔ اور قومی دو رنگی فساد اور فتنہ کا باعث ہوگی۔ آزادی کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی۔

اردو کے ادیبوں کا قومی اور اخلاقی فرض ہے کہ آج کے دن جب برقؔ جس کی شاعری قومیت کے احساس سے لبریز ہے، ان مسئلوں پر غور کریں۔ برقؔ نے اردو کی خوبیوں کو اچھی طرح پہچانا تھا۔ یہ ایک منجھی ہوئی لچکدار زبان ہے، جو ہماری زمانۂ حال کی بولیوں کے نزدیک ہے لیکن اس کی آوازیں ہمارے کانوں پر گراں نہیں۔ اس زبان کی خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے اس کے لفظی خزانہ کو دیسی بولوں سے مالا مال کر دینا چاہیئے۔ برقؔ نے چیر۔ آنچل۔ کوپ۔ آدرش۔ دلاپ بیراں۔ بھارت کا لال۔ رس ساگر۔ دیپ مالا۔ مکٹ۔ جٹا وغیرہ بیسیوں ٹھیٹھ ہندوستانی شبدوں کا استعمال اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ جیسے نگینے جڑے ہوں۔ برقؔ کے دکھائے ہوئے راستے پر زبان کو لے چلنا چاہیئے۔ ادبی نقطۂ نظر سے برقؔ نے جو ہندوستانیت کی مثال پیش کی ہے وہ قابلِ ستائش اور تقلید ہے۔ ہندوستانی تہوار، ہندوستانی مشاہیر، ہندوستانی فلسفہ، ہندوستانی تلمیحیں اور اشارے غرض ان کی شاعری کا تمام تر مواد ہندوستانی ہے۔ یہی چیز ہے جو اردو کو دوامی زندگی عطا کر سکتی ہے۔

میری ناچیز رائے میں برقؔ نے ایسے احسان ہماری زبان پر کئے ہیں کہ ہمیں ہر سال اُن کی یاد میں جلسے کرنے چاہئیں۔ اور برقؔ کے کارناموں کو ملک میں زیادہ سے زیادہ دُور تک پھیلانا چاہیئے۔

مُسلسل فریب

گوپی ناتھ امن

ہَے منزل ایک دھوکا اور سفر بھی ایک دھوکا ہَے
نہ جانے ربط ہَے جذبات و احساسات میں کیسا
مناظر بھی ہیں دھوکے اور نظر بھی ایک دھوکا ہَے
محبّت اور محبّت کا اثر بھی ایک دھوکا ہَے

یہ جو انساں کی فطرت مائل عقدہ کشائی ہے
ازل سے تا ابد جاری ہے عنوانات ہوں کچھ بھی
یہ جتنی کشمکش ہے جس قدر زور آزمائی ہَے
فریبِ ارتقا ہمرنگ شوقِ خود نمائی ہَے

یہ جو نغمے کی کیفیّت مجھے مسرور کرتی ہے
مرے ہمسایہ پر اِن کا اثر ہوتا نہیں کچھ بھی
یہ جو اشعار کی خوبی مجھے مسحور کرتی ہَے
ہے میری خود فریبی جو مجھے مجبور کرتی ہَے

طبائع مختلف ٹھیریں تو پھر معیار کیا ٹھیرا
حوادث سے اگر افراد کی تعمیر ہوتی ہے
نگاہیں اپنی اپنی جلوۂ دیدار کیا ٹھیرا
تو کیا ہے انفرادیت تو پھر پندار کیا ٹھیرا

کوئی کہتا ہے پیہم کشمکش یہ زندگانی ہے
مسلسل ایک چکّر ہے کسی کا ہے یہ اندازہ
کوئی کہتا ہے باقی ہے کوئی کہتا ہے فانی ہَے
کوئی کہتا ہے بعد اِس کے حیاتِ جاودانی ہے

خزاں کو کچھ نہ سمجھو فصلِ گل کی آرزو سمجھو
ہیں جتنے فلسفے سب خود فریبی کے مظاہر ہیں
بہاروں میں گلستاں کو فریبِ رنگ و بو سمجھو
نظر میں ہو جو گہرائی فریبِ جستجو سمجھو

اگر یہ خود فریبی ہے فریبِ عیش ہی کھائیں
حقیقت آشنا ہوتا تو ہے کس کے مقدر میں
اگر دھوکا ہیں خار و گل تو دل پھولوں سے بہلائیں
فریبِ رنگ و بو کے دَور میں گلشن میں مرجائیں

ڈاکٹر عبادت بریلوی

اُردو تنقید پر چند خیالات

اُردو میں تنقید کا وجود محض فرضی ہے۔ وہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے یا معشوق کی موہوم کمر ——— اردو تنقید کے متعلق پہلی کتاب ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن اس کے لکھنے والے نے اس اقلیدس کے خیالی نقطے اور معشوق کی "موہوم کمر" کو ڈیڑھ دو سو صفحوں میں پیش کیا ہے۔ اس خیال پر حیرت اور افسوس کرنے کے بجائے ہمدردی کرنی چاہیئے۔ کیونکہ یہ خیال ہماری سماجی زندگی کے ایک مخصوص دور کی مخصوص ذہنیت کا آئینہ دار ہے جس کو سات سمندر پار سے آئے ہوئے آقاؤں کے اثرات نے پیدا کیا تھا۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اردو میں تنقید ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا ایک سلسلۂ ارتقا بھی ملتا ہے۔ ادب کی مختلف اصناف کی طرح وہ بھی ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی ہے۔ حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس نے نیا رنگ بھی اختیار کیا ہے۔ اس کا وجود فرضی نہیں ہے۔ وہ نہ اقلیدس کا خیالی نقطہ ہے، نہ معشوق کی موہوم کمر۔

ادب اور تنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کسی قوم کا ادب بغیر تنقید کے سہارے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اردو تنقید پر بھی یہ کلیہ صادق آتا ہے۔ جس وقت سے اردو ادب نے آنکھ کھولی اُسی وقت سے تنقید کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اردو ادب میں اس وقت تنقید کی کوئی مستقل حیثیت نہیں تھی۔ لیکن اس زمانے میں بھی شعر وادب کو جانچنے کے چند روایات کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ یہ روایات ہمیں اساتذہ کی اصلاحوں، شعراء کے تذکروں اور اعتراضات و مباحث وغیرہ میں مل جاتی ہیں۔ ان سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانے میں شعر وادب کے پرکھنے کے معیار کیا تھے۔

تنقید کسی قوم کی ادبی قوت نمو کی مظہر ہوتی ہے۔ اس کا عمل دوہرا ہوتا ہے یعنی وہ عام ادب سے متاثر بھی ہوتی ہے اور اُسے متاثر بھی کرتی ہے۔ اس کے معیار بھی حالات و واقعات اور افکار وخیالات کے مدوجزر کے نتیجے میں صورت پذیر ہوتے ہیں۔ اردو ادب نے جس وقت آنکھ کھولی ہر طرف فارسی کا دور دورہ تھا۔ اُس کے سامنے فارسی ادب ہی کے نمونے تھے۔ چنانچہ ابتدائی زمانے میں وہ فارسی ادب ہی سے متاثر ہوا۔ اور فارسی ادب کے تمام خصوصیات بھی اس میں آگئیں۔ صوری ومعنوی اعتبار سے وہ فارسی کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنے لگا۔ یہ راستے ظاہر ہے، ایک مخصوص قسم کے جاگیردارانہ نظام کی پیداوار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کو ان تمام خصوصیات سے دوچار ہونا پڑا۔ جو جاگیردارانہ دور کی بظاہر عیش پرستانہ لیکن بباطن انحطاط پذیر سماج کا منطقی نتیجہ ہوتی ہیں۔ جس میں حرکت پر جمود کو ترجیح دی جاتی ہے۔ عمل کی جگہ بے عملی کو اچھا سمجھا جاتا ہے۔ افادیت کی جگہ بیکار اور لامعنی افکار وخیالات زندگی کا طرۂ امتیاز خیال کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ انھیں حالات کا یہ نتیجہ ہوا کہ ابتدا میں اردو ادب کو جانچنے کے جو معیار قائم کئے گئے وہ وہی معیار تھے، جو فارسی میں رائج تھے۔ اور جن میں معانی سے زیادہ صورت، خیال سے زیادہ اسلوب، اور افادی پہلو سے زیادہ لسانی اور لفظی خوبیوں پر زور دیا جاتا تھا۔ ہندوستان کے سماجی حالات خود بھی اس بات کے متقاضی تھے کہ اس قسم کے معیار قائم ہوں۔ کیونکہ جاگیردارانہ دور نے ایک ایسی فضا پیدا کر دی تھی جس کی وجہ سے عمل کا فقدان تھا۔ زندگی ساکن اور غیر متحرک تھی۔ ایک مخصوص طبقے کی عیش پرستانہ زندگی نے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا جس کی وجہ سے سماج کے افراد زندگی کے اسی پہلو کو سب کچھ سمجھتے تھے۔ ان کو ہر چیز میں حسن کی تلاش تھی۔ خواہ اس کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ تنقید میں بھی جو معیار بنے ان میں شعر و ادب کے جمالیاتی پہلو۔ طرز ادا، اسلوب اور زبان وبیان کو خاص اہمیت

دی گئی۔ اس صورتِ حال کا پیدا کرنے والا ایک انحطاط پذیر جاگیردارانہ سماجی نظام تھا جس میں ایسی باتوں کو افرادِ زندگی کی معراج سمجھتے تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ معنوی پہلو کی طرف مطلق توجہ نہیں کی جاتی تھی۔ ایسا نہیں تھا معنوی پہلو بھی پیشِ نظر رکھا جاتا تھا۔ لیکن صوری پہلو کے مقابلے میں نسبتاً بہت کم۔

بہرحال یہ روایات صورت پذیر ہوئیں۔ ایک زمانے تک ان کا دور دورہ رہا۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ ایک زمانے تک ہندوستان میں سماجی زندگی کی مروجہ اقدار میں کوئی ایسی اہم تبدیلی نہیں ہوئی جس سے خیالات و نظریات بدل جاتے۔ زمانے نے زندگی کے ٹھہرے ہوئے سمندر میں حادثات کے کوئی ایسے پتھر نہیں پھینکے جن کی وجہ سے اس میں حرکت پیدا ہوتی۔ اور مروجہ خیالات و نظریات کی تبدیلی کے نتیجے میں تنقیدی معیاروں میں بھی انقلاب آجاتا۔ ایسا نہیں ہوا۔ زندگی میں خاموشی سکون اور جمود تھا چنانچہ ادب اور تنقید میں بھی یہی خصوصیت نظر آتی ہے۔

لیکن جب حالات بدلے۔ مروجہ نظام میں تبدیلیاں ہوئیں تو اس کے نتیجے میں تنقید نے بھی ایک مستقل صورت اختیار کی۔ اور مروجہ معیاروں میں بھی تغیر ہوا۔ کیونکہ بدلتے ہوئے ماحول میں مروجہ معیار کام نہیں دے سکتے تھے۔ اس تبدیلی کے اثرات ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد نظر آتے ہیں جس نے ہندوستان کی دنیا ہی بدل دی۔ اور اس کو بالکل ایک دوسرے راستے پر لا کر کھڑا کر دیا۔ اب مروجہ جاگیردارانہ نظام بڑی حد تک ختم ہو گیا۔ اور اس کی جگہ ایک نئی قسم کی جاگیرداری نے لے لی۔ اب طبقات کی وہ پرانی تقسیم باقی نہیں رہی۔ حالات نے متوسط طبقے کو پیدا کیا جس کے مسائل بالکل جداگانہ تھے جس کے سوچنے اور غور کرنے کا انداز مختلف تھا۔ اس کے پیشِ نظر اس وقت کا سب سے اہم مسئلہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بہتری تھی۔ گویا اس کی طبیعت کا رجحان افادیت کی طرف تھا۔

ان حالات کے اثرات ادب پر بھی پڑے۔ اور ساتھ ہی تنقید بھی ان سے متاثر ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مروجہ معیاروں کی عمارت بڑی حد تک ہل گئی۔ اب زندگی کے نئے رجحانات کے ساتھ ساتھ تنقید میں نئے معیار قائم ہوئے۔ اب ادب و شعر کو زندگی کا ترجمان سمجھا گیا۔ اس کی نوعیت سماجی اور عمرانی بنائی گئی۔ یہ خیال عام ہوا کہ سماجی زندگی شعر و ادب پر اثر کرتی ہے۔ اور ادب و شعر سماجی زندگی پر اثر کرتے ہیں۔

ادب و شعر کے لئے افادیت کو بھی ضروری قرار دیا گیا۔ اور صوری پہلو سے زیادہ اس طرف توجہ دلائی گئی۔ اب صرف حسن کاری اس کا مقصد نہیں رہ گیا۔ لفظی اور لسانی پہلوؤں کی طرف توجہ کم ہو گئی۔ اس کو اخلاق کا نائب اور قوموں میں ایک نئی روح پھونکنے کا آلہ تصور کیا گیا۔ اور ان تمام ضروری باتوں کو ذہن نشین کرانے کے لئے تنقید کے اصول پر تفصیل سے بحث کی گئی۔ اس طرح اردو میں نظریاتی تنقید کا چراغ روشن ہوا۔ اردو تنقید میں اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ حالی کی مقدمہ شعر و شاعری اور شبلی کی شعر العجم ان خیالات کی ترجمانی میں پیش پیش رہی ہیں۔ اور آزاد کے "لکچر" اور جگہ جگہ "آبحیات" میں بکھرے ہوئے خیالات بھی کچھ اسی طرح کے ہیں۔

یہ سب نتیجہ تھا ایک عام قومی احساس کا، ایک عام ادبی شعور کا۔ ایک عام عقل پرستی کا۔ ایک عام اصلاحی رجحان کا۔ جو اس عہد تغیر کی سب سے اہم خصوصیات ہیں۔ بغیر ان حالات کے اردو تنقید ان راہوں پر نہیں چل سکتی تھی۔

حالی، شبلی اور آزاد ———— اور خصوصاً حالی ان رجحانات تنقید کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ انھوں نے اصول کی بحث بھی کی۔ اور ان کی روشنی میں اپنے ادب و شعر اور شاعروں کا جائزہ بھی لیا۔ اور اس طرح مقدار اور خیالات یعنی کیفیت و کمیت دونوں حیثیتوں سے اردو تنقید میں اضافے کئے۔ انھوں نے اردو تنقید میں نئی روایات کی بنا ڈالی۔ نئے معیار قائم کئے۔ نئے خیالات و نظریات کو پیش کیا۔ ان کے ہاتھوں صحیح معنوں میں اردو تنقید کی ابتدا ہوئی۔ اور یہ سب کچھ حالات و واقعات کا تقاضا تھا۔

عہد تغیر کی تنقید نے نہ صرف نئے معیار پیش کئے اور نئے تنقیدی روایات کی داغ بیل ڈالی۔ بلکہ اردو میں تنقید کے لئے ایک فضا بھی پیدا کر دی جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ تنقید کا رجحان عام ہونے لگا۔ اخبارات و رسائل میں لکھنے والے تنقیدی مضامین لکھنے لگے۔ اور بعضوں نے تو تنقیدی کتابیں لکھیں۔ مثال کے طور پر خواجہ امداد امام اثر کی کتاب "کاشف الحقائق" ایک مستقل تنقیدی کتاب ہے۔ ہر چند یہ تنقیدی اعتبار سے بہت بلند پایہ نہ سہی۔ رسائل میں حالی اور شبلی

کے ساتھ ساتھ بہت سے لوگوں نے تنقیدیں لکھی ہیں جن میں وحید الدین سلیم اور مہاری افادی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ تھوڑے سے فرق کے ساتھ ان سب کے بنیادی خیالات ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ انہیں سے بعضوں نے شعوری طور پر اور بعضوں نے غیر شعوری طور پر عہدِ تغیر کی تنقید کے اثرات کو قبول کیا ہے۔ البتہ یہ ان سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔

ان لکھنے والوں کے ساتھ ہی ساتھ محققین ادب بھی تنقید کے میدان میں آ جاتے ہیں۔ اور اردو تنقید ڈاکٹر مولوی عبدالحق پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی۔ سید سلیمان ندوی۔ حامد حسن قادری۔ پروفیسر مسعود حسن ادیب۔ مولانا عبدالماجد وغیرہ کی تنقیدوں سے مالا مال ہوتی ہے۔ ان سب پر عہدِ تغیر کی تنقید کے اثرات بہت گہرے ہیں۔ ان میں سے بعضوں نے مغرب کے اثرات کو بھی قبول کیا ہے۔ لیکن ویسے ان سب کی تنقید کے انداز میں مشرقی طرزِ تنقید ہی کا رنگ غالب ہے۔

غدر کے بعد کی تنقید کے اثرات اردو تنقید پر بہت گہرے اور دیرپا ثابت ہوئے۔ ایک زمانے تک ان کا اردو تنقید پر غلبہ رہا۔ اگرچہ عہدِ تغیر کی تنقید میں بھی مغرب کے اثرات کو تھوڑا بہت دخل تھا۔ لیکن یہ اثرات ان پر پوری طرح نہیں پڑ سکے۔ اس لئے اس پر مشرقی تنقید کا غلبہ تھا۔ چنانچہ عہدِ تغیر کے نقادوں کے بعد جن لوگوں نے تنقید کی طرف توجہ کی۔ ان میں سے زیادہ اگرچہ مغربی تعلیم یافتہ اور مغربی ادبیات سے واقف تھے۔ لیکن انھوں نے مغرب کا کوئی ایسا اثر قبول نہیں کیا جس سے مشرقیت کو ٹھیس لگتی۔ اور عہدِ تغیر کے اندازِ تنقید سے رشتہ ٹوٹتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سب کے سب مشرقی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس وقت تک حالات میں ایسی زبردست تبدیلی نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ سے یہ مغربی رنگ میں رنگ جاتے۔ بہرحال ان کا اندازِ تنقید کچھ بھی ہو۔ ان کی تنقیدی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ بھی اپنے وقت کی فضا، ماحول اور حالات و واقعات کی پیداوار ہیں۔

اردو تنقید کے ارتقا کا یہ سلسلہ مغرب کے براہِ راست اثر پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ موجودہ اردو تنقید بڑی حد تک مغرب کے اثرات ہی کا نتیجہ ہے۔ اس میں جو نظریات بھی پیش کئے جا رہے ہیں جن خیالات کا اظہار بھی کیا جا رہا ہے۔ جو بحثیں بھی کی جا رہی ہیں ان سب کا چراغ مغرب کے اثرات ہی نے روشن کیا ہے۔

مغرب کے اثرات کا یہ سلسلہ یوں تو غدر کے بعد ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اور عہدِ تغیر کی تنقید پر بھی اس کا خاصا اثر ہے۔ لیکن حالی شبلی اور آزاد پر مغرب کے اثرات اوّل تو براہِ راست نہیں پڑے ہیں اور دوسرے یہ اثرات ان کی تنقید میں کسی مکمل صورت میں گہرائی کے ساتھ نظر نہیں آتے۔ صرف جگہ جگہ ان اثرات کی جھلکیاں نظر آ جاتی ہیں۔ ان سب نے اپنے تنقیدی نظریات کی تشکیل میں مشرقی تنقید اور اپنی ذاتی ذہانت اور شعور سے زیادہ کام لیا ہے۔ لیکن مغرب کے اثرات ان کی تنقید میں تھوڑے یا بہت، کم یا زیادہ، ہیں ضرور:

بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے سے اردو تنقید میں مغرب کے یہ اثرات پوری طرح بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور خصوصاً جنگِ عظیم کے بعد تو وہ بڑی حد تک مغربی رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ جب قریب قریب ہر نقاد اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ مغربی انداز کی تنقید لکھے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے ابتدا میں یہ اثرات اخذ کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی خاص گہرائی نظر نہیں آتی۔ مختلف لکھنے والے یا تو مغربی نقادوں کے خیالات کو بغیر اپنی طرف سے کچھ کہے ہوئے، اپنی زبان میں پیش کر دیتے ہیں۔ یا مغربی شاعروں اور انشا پردازوں کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ یا پھر ان کی مختلف تخلیقات سے اپنے شاعروں اور انشا پردازوں کی تخلیقات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ان کی نظریاتی تنقید اور عملی تنقید دونوں میں اس طرح کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری۔ حامد اللہ افسر۔ ڈاکٹر محی الدین زور۔ عبدالقادر سروری۔ اور اسی طرح کے دوسرے نقادوں کے یہاں یہ خصوصیات ملتی ہیں۔

اس قسم کے اثرات اگرچہ اردو تنقید میں کوئی بہت بڑا اضافہ نہیں کر سکے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کی یہی اہمیت کیا کم ہے کہ انھوں نے مغربی خیالات و تجربات اور نظریاتِ تنقید دونوں سے اردو کو روشناس کیا۔ اور مغرب کے اثرات کو گہرائی کے ساتھ قبول کرنے کی ایک فضا پیدا کر دی۔ چنانچہ ایک وقت ایسا آیا جب اس میں غور و فکر کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اور مغربی نظریاتِ تنقید خود اپنی فکر کا حصہ بنا کر گہرائی

کے ساتھ پیش کئے گئے۔ اس طرح صحیح معنوں میں سائنٹیفک تنقید کی ابتدا ہوئی جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ کیونکہ یہ اثرات اب اردو تنقید کا جزو بن چکے ہیں۔

مغرب کے یہ اثرات جو اردو تنقید نے مختلف اوقات میں مختلف صورتوں میں قبول کئے، حالات و واقعات کا تقاضا ہیں۔ ان سے اردو تنقید اپنا دامن نہیں بچا سکتی تھی۔ کیونکہ یہ مغرب کے اثرات خود ہندوستان کی زندگی پر پڑ رہے تھے۔ یہاں کے لکھنے والوں کے ذہن و شعور پر پڑ رہے تھے۔ اور آج بھی اس کا سلسلہ جاری ہے۔ چنانچہ جدید رجحانات بھی بعض مغرب کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ آج ان اثرات میں اور بھی زیادہ شدت نظر آتی ہے۔ کیونکہ آج اس میں مغربی حاکموں کی حکمرانی اور مغربی تعلیم ہی کو دخل نہیں رہا ہے۔ بلکہ ذرائع رسل و رسائل کی برق رفتاری نے مغرب کے دور دراز ممالک کو ہندوستان کا ہمسایہ بنا دیا ہے۔ جو تحریک وہاں شروع ہوتی ہے اس کے اثرات ہندوستان پر بھی کچھ نہ کچھ ضرور نظر آتے ہیں۔ اگر اس کو حالات سازگار مل جاتے ہیں تو وہ تحریک چل نکلتی ہے اور ایک مستقل حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ترقی پسند تنقید پر اس کے اثرات بڑے گہرے ہیں۔ نئے نقادوں میں سے رشید صدیقی۔ نیاز۔ فراق۔ مجنوں۔ ڈاکٹر اختر حسین۔ سجاد ظہیر۔ آل احمد سرور۔ عبدالعلیم۔ وقار عظیم۔ احتشام حسین۔ اور ان کے علاوہ تمام نقادوں پر مغرب کے ان اثرات کا کسی نہ کسی صورت میں ضرور پتہ چلتا ہے۔

عہد حاضر میں اردو تنقید مغرب کے اثرات کی وجہ سے متعدد رجحانات سے دوچار ہوتی ہے۔ لیکن ہندوستان کے سماجی اور اقتصادی حالات نے اس وقت حقیقت پسندی اور عینیت پرستی کے دو رجحانات کو بہت زیادہ نمایاں کر دیا ہے۔ اور وہی آج ہماری تنقید پر چھائے ہوئے ہیں۔

حقیقت پسندی اور عینیت پرستی کے رجحانات میں اس وقت ایک کشمکش جاری ہے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ اس وقت ہندوستان کی زندگی میں یہ کشمکش اپنے شباب پر ہے۔ چنانچہ ان کے علاوہ دوسرے رجحانات جو مختلف علوم اور مختلف تحریکوں کے اثرات کے نتیجے میں اردو تنقید میں پیدا ہو رہے ہیں، ان سب کو حقیقت و عینیت کے مباحث نے پس منظر میں ڈال دیا ہے۔ آجکل قدامت و جدت، رجعت اور ترقی پسندی کی جنگ سے لوگ زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ ابھی جاری رہے گا۔ کیونکہ اس وقت ان دونوں نظریات زندگی میں موت اور زیست کی کشمکش ہے۔

لیکن ان دونوں میں زیادہ اہمیت حقیقت پسندی کے رجحان کو حاصل ہے اور اس میں بھی اشتراکی حقیقت نگاری زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے موجودہ حالات نے سماج کے افراد کو اور خصوصاً ان افراد کو جو پڑھے لکھے ہیں بڑی حد تک مادیت پرست اور انتہا پسند بنا دیا ہے۔ چنانچہ زیادہ نقاد آج اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر تنقیدیں لکھ رہے ہیں۔ ان نقادوں میں سے جن کی تنقید میں جذباتیت نہیں، جنھوں نے اس نقطۂ نظر کو سوچ کر اپنایا ہے جنھوں نے اس کی اصل روح سے واقفیت حاصل کی ہے وہ اردو میں اونچ اور گہرائی کے ساتھ تنقیدیں لکھ رہے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ ان کی تنقید میں بڑی جان آگئی ہے۔ اس میں سائنٹیفک تجزیے کا رجحان عام ہو گیا ہے جس کے نتیجے میں اردو تنقید بالکل ایک نئی دنیا سے روشناس ہوئی ہے۔

حقیقت نگاری کے ان رجحانات کے علمبردار عہد تغیر کی تنقید سے کچھ آگے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان پر براہِ راست مغرب کا اثر پڑا ہے۔ چنانچہ وہ ادب کو نہ صرف سماجی زندگی کا ترجمان اور نقاد سمجھتے ہیں۔ بلکہ ان کے خیال میں اس کو سماجی زندگی کی ساری کشمکش کا آئینہ دار ہونا چاہیئے۔ وہ اپنے بنائے ہوئے اصول کو آفاقی اور عالمگیر سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں انھیں اصول سے دنیا کے ادبیات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ زبان و بیان کی طرف وہ بہت زیادہ توجہ نہیں کرتے۔ البتہ اظہار کے مجموعی تاثر اور جمالیاتی اثر کی طرف ان کی توجہ ضرور رہتی ہے۔ یہ اصول اردو میں بالکل نئے ہیں۔ اور ان کی تشکیل براہِ راست مغرب کے زیر اثر ہوئی ہے۔ حقیقت نگاری کے اس رجحان کے علمبرداروں میں ترقی پسند نقاد اس وقت پیش پیش نظر آتے ہیں جن میں سید سجاد ظہیر مجنوں گورکھپوری، سید احتشام حسین اور آل احمد سرور وغیرہ پیش پیش ہیں۔

عینیت پسندی کا رجحان جو اس وقت حقیقت نگاری کے ان رجحانات خصوصاً اشتراکی حقیقت نگاری کے رجحان کی مخالفت میں پیدا ہوا ہے اس کی نوعیت منفی ہے۔ ہندوستان اس وقت جس نازک دور سے

گزر رہا ہے۔ اس میں عینیت پسند اپنے نظریات کی نشر و اشاعت اور ترویج باقاعدہ مثبت انداز میں نہیں کر سکتے۔ کیونکہ آج اس قسم کی باتیں سننے کیلئے کوئی تیار نہیں کہ ادب کا زندگی، اور خصوصاً سماجی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ وہ صرف تفریح طبع کا باعث بنتا ہے۔ اور بس —— اس لئے عینیت پسند حقیقت نگاری کے مختلف رجحانات کی مخالفت کرتے ہیں۔ انھوں نے اس کو اپنا مقصد زندگی بنا لیا ہے۔ اور وہ ایسا کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ کیونکہ اُن کی افتادِ طبع، ذہنی رجحانات اور ایک خاص طرز پر سوچنے کا انداز، انھیں کسی ایسی چیز کے قبول کرنے سے باز رکھتا ہے، جو نئی اور انقلابی ہو۔ وہ اُن کے معیار پر پوری اتر ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ اُن کے معیار مخصوص ہیں جن کی تشکیل ایک خاص قسم کے ماحول اور ایک مخصوص فضا میں ہوئی ہے۔ وہ ایسا کرنے کے لئے بڑی حد تک مجبور ہیں لیکن اب بدلتے ہوئے حالات انھیں مشکل ہی زندہ رہنے دیں گے۔ کیونکہ اب نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں ادب برائے ادب کے نظریئے کا کوئی ایسا علمبردار نظر نہیں آتا۔ جو اس پر پوری طرح عمل بھی کرتا ہو۔

بہرحال حقیقت نگاری کا رجحان جس سے اس وقت اردو تنقید روشناس ہوئی ہے۔ بہت مضبوط اور جاندار ہے۔ اس کی ایک مستقل حیثیت ہے۔ اس نے اردو تنقید کو ایک نئے راستے پر ڈال دیا ہے۔

اردو تنقید کے سامنے ایک شاندار مستقبل ہے۔ جیسے جیسے حالات بدلتے جائیں گے۔ علوم کی ترقی ہوگی تحقیق و تفتیش کا رواج عام ہوگا۔ تجربات میں نئی نئی شاخیں پھوٹیں گی۔ نئے نئے نظریات عام ہوں گے۔ ان حالات سے اردو تنقید بھی بہت متاثر ہوگی۔ وہ بھی بیسیوں نئے نئے راستوں پر گامزن ہوگی —— اور اس وقت چونکہ حالات تیزی سے بدل رہے ہیں —— ہر لمحہ ایک نیا انقلاب آرہا ہے —— اس لئے وہ بھی تیزی سے بدلتی جا رہی ہے۔ نہ جانے اس کا قافلہ کس منزل پر جا کر رُکے گا۔

~~~~~~~~

نوحؔ ناروی

طوفانِ نوح

سوا اِس کے دُنیا میں کیا ہو رہا ہے ‌ ‌ ‌ ‌ کوئی ہنس رہا ہے کوئی رو رہا ہے
تمہاری گلی میں نہ ٹھہرے گا کوئی ‌ ‌ ‌ ‌ فقط وُہ رہے گا یہاں جو رہا ہے
ارے چونک یہ خوابِ غفلت کہاں تک ‌ ‌ ‌ ‌ سحر ہو گئی اور تُو سو رہا ہے
ستم اپنے ہی اہلِ عشق و وفا پر ‌ ‌ ‌ ‌ یہ کیا کر رہے ہو یہ کیا ہو رہا ہے
بہم ملنے جلنے میں کوئی تکلّف ‌ ‌ ‌ ‌ نہ اُن کو رہا ہے نہ مجھ کو رہا ہے
مجھی تک نہیں ظلم محدود تیرا ‌ ‌ ‌ ‌ مرے ساتھ سارا جہاں رو رہا ہے

اُٹھا تھا وُہ اے نوحؔ طوفان کیسا
زمانے میں ذکر آج تک ہو رہا ہے
~~~~~~~~

بلونت سنگھ

پھانس

رفعت ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی چہرے پر پوڈر کی ہلکی تہ جما رہی ہے معاً دروازہ بڑے دھماکے سے کھلتا ہے اور اُس کا شوہر شوکت خاں جسے وہ بہ باطن شامت خاں سمجھتی ہے داخل ہوتا ہے۔

رفعت (سینے پر ہاتھ رکھ کر دروازے کی جانب گھوم کر دیکھتے ہوئے) یا اللہ!

شوکت (چیں بہ جبیں ہو کر) یا اللہ کیا؟

رفعت (دھڑکتے ہوئے سینے کو تھامنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے) کمرے میں داخل ہونے کا انداز تو خوب ہے آپ کا۔

شوکت (منہ بنا کر لیکن سر تسلیم خم کرتے ہوئے) شکریہ۔

(قدرے سکوت)

شوکت (بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے) ذرا منہ ملاحظہ فرمائیے۔

رفعت۔ کس کا — آپ کا یا اپنا؟

شوکت۔ جی اپنا۔

رفعت۔ کیوں — کیا ہے؟

شوکت۔ کُپا ہو رہا ہے پھُول کر

رفعت۔ آپ کی بلا سے۔

شوکت۔ یہ بے رُخی ہے! جانے کس قدر منت و سماجت کر کے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے چھٹی لی اور پھر بھاگم بھاگ یہاں پہنچا ہوں، اللہ......

رفعت۔ احسان ہے آپ کا — لیکن احسان ایک ہو تو اس کا ذکر بھی کیجئے لیکن یہاں تو میں آپ کے احسانوں تلے دبی پڑی ہوں....

شوکت۔ آخر ان اُکھڑی اُکھڑی باتوں سے تمہارا مقصد کیا ہے؟

رفعت۔ بس رہنے دیجئے اب۔

شوکت (بھڑک کر) خدا کی قسم اپنا سر پھوڑ لوں گا کسی روز۔ آخر یہ بھی کوئی تُک ہے۔

رفعت (ناپسندیدہ نظروں سے شوہر کی جانب دیکھتی ہے لیکن چُپ رہتی ہے)

شوکت۔ یہ بلی کی سی پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری جانب کیا دیکھ رہی ہو۔ غضب خدا کا، صبح دو گھنٹے تک میرا مغز چاٹتی رہیں کہ شام کو پکچر دیکھنے چلیں گے اور جب میں کام کاج کا حرج کر کے آ پہنچا ہوں تو بی صاحبہ سیدھے منہ بات تک نہیں کرتیں............ کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ مجھ سے کون سا جرم سرزد ہو گیا ہے۔

رفعت (بگڑ کر) کیا میں دریافت کر سکتی ہوں کہ اس قدر دھماکے سے دروازہ کھولنے میں کیا مصلحت تھی آپ کی؟

شوکت۔ لیجئے صاحب! کھودا پہاڑ اور نکلی چوہیا۔ سنو بی بی اگر جھگڑا کرنا لازمی ہو تو اس کے لئے بھی بہانہ ذرا معقول ہونا چاہئے۔

رفعت۔ (ہاتھ کو جنبش دے کر) بس رہنے دیجئے صاحب آج آپ کی زبانی معقول اور نامعقول قسم کے الفاظ سن کر سخت تعجب ہو رہا ہے مجھے۔

شوکت۔ تم کہنا یہ چاہتی ہو کہ مجھے معقولیت سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے..... ایں؟

رفعت۔ (بے پروائی سے آئینے میں دیکھتے ہوئے) جو جی چاہے سو سمجھ لیجئے۔

شوکت۔ (بیوی کو گھورتے ہوئے) رفعت! کان دھر کے سُن لو، تمہارا میرے لئے اس قسم کے الفاظ استعمال کرنا گالی سے کم نہیں ہے۔

رفعت (معاً آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) تو آپ بھی کان دھر کے سُن لیجئے کہ میں کوئی گائے یا بھیڑ بکری نہیں ہوں کہ جس طرف چاہا ہانک دیا، میں پڑھی لکھی مہذب خاتون ہوں۔

شوکت۔ (طنز سے) پڑھائی لکھائی اور مہذب ہونے کے دعوے کرنے کی ضرورت آن پڑی۔ ارے یہ چیزیں آپ کے اندازِ گفتگو ہی سے ظاہر ہو جاتی ہیں۔

رفعت۔ چھ برس سے آپ ہی سے واسطہ پڑ رہا ہے۔ دن رات کا اُٹھنا بیٹھنا ہے—— ورنہ ہمارا خاندان تو......

شوکت۔ (معنی خیز قہقہہ اُٹھا کر) بس بس خاندان کا قصہ مت چھیڑو میں بھر پایا—— تمہارے خاندان کے ایک ہی فرد سے پالا پڑا ہے.... میری توبہ!

رفعت۔ (سچ مچ خفا ہو کر) بات کا بتنگڑ بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے......

شوکت۔ اچھا جی! آپ کی فرماں برداری کرنا، آپ کی ناز برداری کی خاطر کام کاج چھوڑ کر بھاگے بھاگے گھر آنا، آپ کی گھڑکیاں سہنا دوستوں سے زن مرید کا خطاب پانا یہ سب کچھ بات کا بتنگڑ بنانا ہے۔

رفعت۔ (دانت پیس کر) لیکن اس قدر دھماکے....

شوکت۔ میں بتاؤں؟ دروازے پر ایک چپڑاسی بٹھا دیجئے تاکہ جب میاں گھر پہنچیں تو اندر داخل ہونے سے پہلے ایک پُرزہ کاغذ پر نام لکھ کر آپ کی خدمت میں روانہ کریں۔ اور اس طرح اپنے ہی گھر میں داخل ہونے سے پہلے حضور کی اجازت کے طلبگار ہوں......

رفعت (بھرائی ہوئی آواز میں) ہائے اللہ....

شوکت (چڑ کر) کچھ تو پھوٹیے منہ سے۔

رفعت۔ (تقریباً روتے ہوئے بلند آواز میں) میں پوچھتی ہوں کہ اس طرح دروازہ توڑ کر اندر آنے کی ضرورت کیا تھی۔

شوکت۔ (اتنی ہی بلند آواز میں) میں پوچھتا ہوں کہ اگر میں نے دروازہ ذرا دھماکے سے کھول بھی دیا تو کون سی قیامت آگئی؟

رفعت۔ واہ! ہوا ہی کچھ نہیں، میرا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ شاید آپ کی دانست میں کچھ ہوا ہی نہیں—— ابھی تک میرا سینہ لرزاں ہے، دم میں دم نہیں سماتا۔

شوکت۔ یہ بھی ایک ہی کہی۔ پٹھان باپ کی بیٹی ہو۔ شرم کرو، ذرا سے دھماکے سے کلیجہ منہ کو آگیا، چھتیاں لرزنے لگیں، واہ! کیسی بنیا ٹائپ عورت سے واسطہ پڑا ہے۔

رفعت۔ دیکھئے آپ پھر تہذیب کی حد سے بڑھتے جا رہے ہیں۔ مگر میرے پھوٹے منہ سے جناب کی شان میں ایک آدھ کلمہ نکل گیا تو پھر مفت میں تلملائیں گے آپ۔

شوکت۔ تمہیں قرآن پاک کی قسم اب ہمارا لحاظ مت کرو۔ واہ! خدا کی شان..... تو سو چوہے کھا کے بی بلی حج کو چلیں..... مگر کوئی کسر رہ گئی ہو تو وہ بھی نکال لو۔ میری شان کی فکر مت کرو۔

رفعت۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ اب بھی بیوی کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں..... آپ چاہتے ہیں کہ آپ گرجا کریں بات میں بھی کوئی نہ ٹوکے۔

شوکت۔ اوہو! اچھا تو آپ کی ساری گفتگو میں کوئی جائز بات بھی تھی...

رفعت۔ (رومال سے آنکھوں کے گوشوں سے آنسو پونچھتے ہوئے) بڑھ بڑھ کے دعوے کرتے ہیں آپ، بس اتنی سی بات کہہ دی کہ گھر میں ذرا آہستہ سے داخل ہوا کریں تو جان کو آگئے آپ۔

شوکت۔ یہ تو بہت ہی بُرا مطالبہ ہے

رفعت۔ (پھر گرم ہو کر) مجھے لفظ "بُرا" پر سخت اعتراض ہے

شوکت۔ (نرم پڑ کر) خیر میں لفظ "بُرا" واپس لیتا ہوں، حقیقت یہ ہے کہ میں اس جھگڑے کو طول نہیں دینا چاہتا—— لیکن مجھے افسوس اس بات پر ہے کہ تم پٹھان زادی ہو کر بھی چڑیا کے مانند سہمی سہمی کیوں رہتی ہو، شاید تم اس حقیقت سے قطعاً بے خبر ہو کہ پٹھانوں کی قوم دنیا کی بہادر ترین قوموں میں سے ہے۔ چنانچہ تمہیں کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ تم پٹھان کی بیٹی ہو، پٹھان کی بیوی ہو..... اور.... اور.... پٹھان بچے کی ماں ہو.... ار میرا مطلب ہے..... ماں ہو گی.... کبھی نہ کبھی۔

(فخر سے ٹائی کی گرہ کو درست کرتا ہے)

رفعت۔ (بیزار ہو کر) پٹھان ٹھان کی رٹ سے میرے کان پک گئے ہیں۔ آخر اس واقعے کا پٹھان ولی سے کیا تعلق ہے۔ اگر کوئی بغیر اطلاع کئے معاً دھماکے سے دروازہ کھول کر کمرے میں گھس پڑے تو عورت کیا مرد کا لمحہ بھر کے لئے گھبرا جانا قدرتی امر ہے۔۔۔۔

شوکت۔ (اپنا پلڑا ہلکا پڑتا دیکھ کر) یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔

رفعت۔ آپ بھی تو حجت کر رہے ہیں جو بات سراسر عقل پہ مبنی ہے اسے آپ۔۔۔۔۔۔

شوکت۔ میں حجت کر رہا ہوں؟

رفعت۔ حجت نہیں تو اور کیا ہے؟

شوکت۔ اسی برتے پہ مہذب ہونے کا دعویٰ کرتی ہو۔۔۔۔۔

رفعت۔ جی میں نے ہی دُنیا بھر کی تہذیب اور اخلاق کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ ہائے کاش! میں پیدا ہوتے مر جاتی تو اچھا تھا۔ شادی ہوئے چھ برس گذر چکے ہیں لیکن ایک دن بھی سُکھ کا نہیں دیکھا۔

شوکت۔ سُکھ کا دن دیکھنا نصیب کیسے ہوتا۔ سارا دن کُڑھوں میں گھُٹتی رہتی ہو۔

رفعت۔ کسی سمجھدار عورت کے لئے تمہارے ہمراہ رہنا کُڑھوں میں گھُٹتے رہنے سے کم نہیں ہے۔۔۔۔۔

شوکت۔ نہ جانے تمہیں اپنی بابت اس قدر غلط فہمی کیوں پیدا ہو گئی ہے؟

رفعت۔ کیوں مجھ میں کمی کس شئے کی ہے؟

شوکت۔ کمی ہو یا نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر میرے والدین ذرا صبر سے کام لیتے تو تم سے کہیں بہتر بیوی مل سکتی تھی مجھے۔

رفعت۔ (تنگ آکر) خیر اتنا مجھ سے بھی سن لیجئے کہ اگر میرے والدین اپنی آنکھوں پہ پٹی باندھکر یونہی کسی راہگیر کو پکڑ کر مجھے بیاہ دیتے تو مجھے یقین ہے کہ وہ آپ سے کسی صورت میں بھی کم نہ ہوتا۔

شوکت۔ (آنکھیں دکھا کر) چپ رہو۔۔۔۔ منہ پھٹ کہیں کی۔

رفعت۔ بس اب گالیوں پر اُتر آئے۔

شوکت۔ تمہاری ایسی عورتیں بہت دیکھی ہیں میں نے۔۔۔۔۔

رفعت۔ (دل میں بُری طرح جل کر) بھینس کے آگے بین والی مثال صادق آتی ہے آپ پر۔ ورنہ میری سہیلیوں میں سے بیشتر کا خیال تھا کہ میں کیا بلحاظ صورت اور کیا بلحاظ سیرت ہزاروں میں ایک ہوں۔ وہ کہتی تھیں کہ اس قدر حسین لڑکی کا شریف اور پاکباز رہنا قریباً ناممکن ہے۔ لیکن یہاں جو میری قدر ہو رہی ہے اس پر فرشتے بھی آنسو بہاتے ہوں گے (ہلکی ہلکی سُبکیاں بھرنے لگتی ہے)

شوکت۔ (دل پہ جبر کر کے) یہ مفت کا رونا دھونا چھوڑو۔ میں تمہیں شریف اور پاکباز سمجھتا ہوں، لیکن تمہاری کھوپڑی میں بھیجا کم ہے۔

رفعت۔ (تکان زدہ ہو کر آرام کرسی پہ دھم سے گر پڑتی ہے اور بھرّائی ہوئی آواز میں) خدا کرے آپ کو اب بھی کوئی اپنی پسند کی بیوی مل جائے۔۔۔۔۔ کاش وہ حوریں جن کے نام کا آپ کلمہ پڑھتے ہیں اب بھی آئیں اور آپ کو رِجھا لیں۔۔۔۔۔۔۔

شوکت۔ طنز کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں تو محض تمہاری غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔

رفعت۔ غلط فہمی کیسی؟

شوکت۔ یہی کہ تم اپنے آپ کو نہ معلوم کیا سمجھتی ہو حالانکہ یہ قطعاً ایک حقیقت ہے کہ ہمیں بہت اچھے اچھے رشتے آئے تھے۔۔۔۔ رشتے تو الگ رہے، ان لڑکیوں کی بھی کچھ کمی نہیں تھی جو میرے نام کا۔۔۔۔۔۔۔

رفعت۔ (اس کا فقرہ مکمل کرتے ہوئے) کلمہ پڑھتی تھیں۔ (چند لمحوں کے لئے وہ شوہر کی جانب چپ چاپ دیکھتی رہتی ہے)

شوکت۔ کیا دیکھ رہی ہو؟

رفعت۔ یہی کہ آپ کیسے حسین ہیں۔ جس کوچے سے نکل جاتے ہوں گے کنواری لڑکیاں بال بکھرائے ننگے پاؤں آپ کے پیچھے پیچھے ہو لیتی ہوں گی۔۔۔۔۔

شوکت۔ (ہونٹ کاٹ کر) تم سچ مچ بڑی ڈھیٹ ہو۔۔۔۔۔

رفعت۔ ڈھیٹ ہی تو ہوں ورنہ اس گھر سے کبھی کا منہ کالا کر گئی ہوتی۔

شوکت۔ اب میں تم سے کیا کہوں؟

رفعت۔ (قدرے ہمت سے) کہیئے ضرور کہیئے کہیں موسم بہار کو

وہ شام کبھی نہیں بھول سکتا۔۔۔۔۔

شوکت۔ یہ ایک حقیقت ہے رفعت! یہ ایک حقیقت ہے۔

رفعت۔ (کرسی سے اُٹھ کر شوہر کے قریب جاتے ہوئے) حقیقت کیا ہے میں بھی تو سُنوں۔

شوکت۔ یہی کہ موسم بہار تو نہیں البتہ موسم برشگال کی ایک شام کا ذکر ہے کہ میں بائیسکوپ دیکھنے کے لئے گیا مجھ سے چند سیٹیں پرے ایک نہایت حسین لڑکی بیٹھی تھی وہ اس قدر حسین تھی کہ بس۔۔۔۔۔۔

رفعت۔ (ماتھے پر بل ڈال کر روٹھے ہوئے انداز سے پرے چلی جاتی ہے)

شوکت۔ (ایک پُرمعنی آہ بھر کر) یہ آج سے آٹھ نو برس پہلے کا واقعہ ہے۔ میری مسیں ابھی بھیگ ہی رہی تھیں اور وہ لڑکی بھی بند کلی کے مانند تھی۔۔۔۔۔ میں نے پہلے تو کاغذ کے دو چار ٹکڑے گول مول کر کے اس کی جانب پھینکے اور وہ جواب میں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مُسکرا دی۔۔۔۔

رفعت۔ (ناک سکوڑ کر) اوہ شرم بھی نہیں آتی۔

شوکت۔ (پُرسوز آواز میں) شرم۔ بہت شرم کی ہے میں نے، لیکن آج اپنا جگر چیر کر تمہارے سامنے رکھ رہا ہوں۔

رفعت۔ (شانوں کو حرکت دے کر) مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے

شوکت۔ دلچسپی کیسے ہو ظالم!۔۔۔۔ آہ کس محبت کے ساتھ اُس نے مجھے اپنے قریب بُلایا تھا۔ جتنی دیر تک تماشا ہوتا رہا وہ میرے ہاتھ میں ہاتھ دیئے بیٹھی رہی۔۔۔۔ اس کے بعد محبت ناموں کا سلسلہ مدت تک جاری رہا، یہاں تک کہ میری شادی تم سے ہو گئی اور وہ بے چاری۔۔۔

رفعت۔ (گھوم کر بدلی ہوئی آواز میں) کیا کہا؟ آپ کاغذ کے ٹکڑے گول مول کر کے اُس کی طرف پھینکتے رہے تھے۔۔۔۔

شوکت۔ (سلسلۂ کلام منقطع ہو جانے پر بیزار سا ہو کر) ہاں

رفعت۔ اچھا۔ وہ لڑکی سیاہ برقعہ پہنے ہوئے تھی لیکن نقاب اُلٹ دی تھی

شوکت۔ ہاں لیکن۔۔۔۔

رفعت۔ اور اُس نے آپکی جانب ایک نظر دیکھنا بھی پسند نہیں کیا تھا۔

شوکت۔ کیا بکتی ہو؟

رفعت۔ شو ختم ہونے پر آپ اُن لڑکیوں کے پیچھے اُن کے ہوسٹل تک گئے تھے۔۔۔ ہوسٹل کے چوکیدار کو رشوت دے کر آپ نے اُس سے کہا تھا کہ یہ رقعہ اُس لڑکی کو دو جو فلاں رنگ کا برقعہ پہنے ہوئے ہے۔

شوکت۔ ہاں۔۔۔۔ اُف۔۔۔ لیکن، لیکن ــــ

رفعت۔ (تیزی سے) آپ نے کیسی کیسی چٹھیاں لکھیں، منتیں کیں، خوشامدیں کیں، لیکن اس لڑکی کی صورت دوبارہ دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔

[شوکت ایک قدم آگے بڑھ کر رُک جاتا ہے اور رفعت کو عجیب نظروں سے دیکھنے لگتا ہے اُدھر رفعت بھی شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے قدم بہ قدم آگے بڑھتی ہے اور اُس کے قریب جھک کر سرِ تسلیم خم کرتی ہے]

رفعت۔ (زیرِ لب مُسکرا کر) بندی آداب عرض کرتی ہے۔

شوکت۔ (ہکّا بکّا) یعنی۔۔۔ ار۔۔۔ کیا معنی۔۔۔؟

رفعت۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لڑکی بندی آپ کی کنیز ہی تھی۔ خوب عاشق ہیں ہماری صورت تک نہیں پہچانتے، خیر میں نے تو آپ کو اچھی طرح دیکھا ہی نہیں تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی مجھے اچھی طرح دیکھ نہیں پائے۔۔۔۔ ورنہ چھ برس کی طویل مدت میں ضرور پہچان گئے ہوتے

شوکت۔ (دفعتاً رنگ بدل کر اور اُنگلی سے بیوی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پر زور قہقہہ لگاتا ہے تم تم۔۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔۔۔۔ ہا ہا ہا ہا۔۔۔۔۔۔۔۔

[رفعت فرش پر زور زور سے پاؤں مارتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے، کچھ وقفے کے بعد وہ کاغذوں کا پلندہ ہاتھ میں لئے واپس آتی ہے]

رفعت۔ (بُری طرح برہم ہو کر) یہ رہے آپ کے خطوط۔۔۔ میں بھی سوچا کرتی تھی کہ آخر یہ جو بات بات پر ترستے ہیں اس کی کچھ وجہ تو ضرور ہوگی۔۔۔۔

[شوکت کے قہقہے بند ہو جاتے ہیں ـــ اپنے ہاتھ کے خطوط پہچان کر وہ کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ برآمدے میں اُس کے بے چینی سے ٹہلنے کی آواز آتی ہے۔ دو چار مرتبہ وہ کھنکتا ہے پھر زور سے ناک صاف کرتا ہے اور بالآخر رومال سے منہ پونچھتا ہوا دروازے کے قریب آکر رُک جاتا ہے]

شوکت۔ (قطعاً غیر جذباتی آواز میں بیاکر) میں نے کہا دیر ہو رہی ہے شو شروع ہو جائے گا۔۔۔۔

رفعت۔ (جلدی جلدی دوبارہ میک اپ کرتے ہوئے) جی میں آئی۔۔۔

[چلتے چلتے رفعت نے دیکھا کہ بالوں کی ایک لٹ اس کے رخسار پر پریشان ہو رہی ہے وہ اس کو پاکیزگیٔ ذوق کی علامت نہیں سمجھتی تھی لیکن اس وقت اس نے بالوں کی لٹ کو جوں کا توں رہنے دیا۔]

جوش ملسیانی

اُردو میں عطف اور اضافت

اِس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اُردو زبان نے پچھلے سو سال میں جس قدر ترقی کی ہے وہ سرکاری سرپرستی ہی کی بدولت کی ہے۔ صرف اردو ہی پر کیا منحصر ہے ہر ایک زبان کی ترقی کے لئے سرکاری سرپرستی ہی اس کی زندگی کا بہت بڑا سہارا ہوتا ہے۔ یہ سہارا نہ ہو تو کوئی انفرادی یا اجتماعی کوشش کوئی کامیاب نتیجہ حاصل نہیں کر سکتی۔ خاص کر ایسے حالات میں جبکہ اس کی مخالفت بھی بڑی سرگرمی سے ہو رہی ہو اور اس مخالفت کی وجوہ بھی بہت معقول ہوں۔ آج انھیں حالات نے اردو کی زندگی اور موت کا سوال پیدا کر دیا ہے۔ مخالف طاقتیں پوری شدت سے اس کی ہستی کو مٹا دینے پر آمادہ نظر آتی ہیں۔ سرکاری سرپرستی کا جاری رہنا بھی موہوم ہو رہا ہے۔ اب اُن لوگوں کے لئے جو اس زبان کے سرگرم حامی اور سچے دل سے اس کے طرف دار ہیں، جنہوں نے اس کی خدمت اور اس کے بقا کے لئے عمریں ختم کر دی ہیں اور جو سینہ سپر ہو کر اِن مخالف حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں، اپنی کوششوں کو صرف بحث تک محدود رکھنا اور بار بار اُردو کی خوبیوں اور دوسری زبانوں کی خامیوں کو شمار کئے جانا کافی نہیں ہے۔ اُنہیں عملی طور پر بھی اس کو زندہ رکھنے کی تدبیروں پر غور کرنا ہوگا اور مخالفوں کا مُنہ بند کرنے کے لئے اُردو کو ایسے سانچے میں ڈھالنا ہوگا کہ اس کی نثر اور نظم کی سلاست کو دیکھ کر کوئی مخالف یہ نہ کہہ سکے کہ اسے تمام ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے۔ اُردو کے تمام اہلِ قلم کو یہ خیال چھوڑ دینا لازم ہوگا کہ ہم جو کچھ لکھتے ہیں خواص کے لئے لکھتے ہیں۔ بل کہ صرف اس خیال کو لے کر قلم اُٹھانا ہوگا کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اُسے عوام سمجھتے بھی ہیں یا نہیں۔ سچ پوچھو تو خواص پسندی ہی کی رَو میں بہنے والوں نے بڑے بڑے عربی اور فارسی الفاظ استعمال کر کے اور ایک مصرعے میں چار چار یا پانچ پانچ عطف یا اتنی ہی اضافتیں لا کر اردو کی یہ شکل بنا دی کہ وہ عام لوگوں کے فہم سے بالاتر ہو گئی اور ہندی والے اسے غیر ہندوستانی کہنے پر مجبور ہو گئے۔

پس اس مخالفت کے طوفان کو روکنے کے لئے جب تک مخالفت کی بنیادوں کو کم زور یا مسمار نہ کیا جائے گا اور جب تک اُردو کو ہندوستانی بنا کر اسے ہندی کے بہت ہی نزدیک لانے کی کوشش نہیں کی جائے گی صرف تقریر بازی سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جب تک ہم میونسپل کمیٹی کو بلدیہ، اُس کے ممبروں کو ارکانِ بلدیہ، والنٹیر کو مندوب اور اُس کی جمع مندوبین، بائیکاٹ کو مقاطعہ، غور کے مقام کو لمحۂ فکریہ، ابتدائی تقریر کو خطبۂ افتتاحیہ اور اسی طرح دوسرے عام فہم لفظوں کو چھوڑ کر اُن کی جگہ ثقیل اور مشکل الفاظ استعمال کرنے کے خوگر رہیں گے ہم کبھی اپنے مخالفوں کا مُنہ بند نہیں کر سکیں گے۔ حق یہ ہے کہ اس اُردو دشمنی کے لئے فرقہ وارانہ تعصب اتنا جواب دہ نہیں جتنی یہ لغت بازی اور خواص پسندی ہے۔ پس ہمیں اپنے مقصد میں آسانیاں پیدا کرنے کے لئے اس ان نیچرل لغت بازی کو چھوڑنا ہوگا۔ ادیبوں اور شاعروں کی خوش بیانی سے خوش وقت اور مستفید ہونے کے حق دار صرف خواص ہی نہیں ہیں عوام کا حق بھی فائق ہے۔ ہماری لغت بازی ہی اُردو کے لاکھوں دشمن پیدا کرنے کی مُوجب ہوئی ہے۔ یہ نہ ہوتی تو آج مخالفوں کی مخالفت کا مقابلہ کرنا ہمیں بہت آسان ہوتا۔ اس تقریر کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم اُردو کی صورت ہی کو مسخ کر دیں۔ فارسی اور عربی کے ہزاروں لفظ ایسے ہیں جو اُردو کی ملکیت ہو چکے ہیں اور معمولی شدبد رکھنے والا شخص بھی ان کا مفہوم سمجھتا ہے مثلاً علم، عمل، عقل، ہوش، دانا، نادان، صبح، شام، معدہ، ہضم، ہاضمہ، جگر، درد، عزیز، بزرگ، جسم، روح، جوانی، موت، زندگی، مہمان، آسمان، زمین، عبادت، نماز، سجدہ، مسجد، حکم، فرمان، ملک، صوبہ، تحصیل، پرگنہ، ضلع، رومال، لباس، صحت، علاج، خیریت، مزاج، خط، سوال، جواب، حاضر، غیر حاضر، جماعت، گروہ، لشکر، بازار، دکان، زراعت، تجارت وغیرہ

بحث تو ان الفاظ سے ہے اور لغت بازی سے بھی وہی اجنبی لفظ مُراد ہیں۔ جو عام فہم الفاظ کی موجودگی میں بلا وجہ اور بے ضرورت گھڑ لئے جاتے ہیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے معنی لغات میں بھی نہیں ملتے۔ اس قسم کا ایک ایک لفظ جو ہم اپنی جھوٹی زبان دانی کی نمائش کے لئے استعمال کرتے ہیں دراصل ایک پتھر ہے جو اُردو کے سر پر برسانے کے لئے ہم نے خود مہیا کیا ہے۔

دوسری عملی کوشش اس سلسلے میں یہ ہے کہ ہم نثر اور نظم میں عطف اور اضافت کو بھی آخری حد تک کم کر دیں۔ نثر میں تو یہ کوشش کچھ بھی مشکل نہیں ہم چند الفاظ کو چھوڑ کر بول چال میں کبھی عطف اور اضافت کا استعمال نہیں کرتے تقریر کے علاوہ تحریر میں بھی ہمارے بعض مصنف اس امتیازی وصف کے پابند نظر آتے ہیں اور اپنی تحریر کو عام بول چال کے مطابق رکھتے ہیں یعنی عطف اور اضافت سے بچتے ہیں۔ اس لئے نثر میں ہماری اس قسم کی کوشش بہت ہی تھوڑی توجہ سے کامیاب ہو سکتی ہے جب تک ہم عام گفتگو میں عطف اور اضافت استعمال کرنے کے محتاج نہیں ہیں تو کتابی نثر یا مضمون نگاری میں کیوں اپنے آپ کو ان کا محتاج بنا لیتے ہیں۔ صرف چند عطف ایسے ہیں جو ہماری بول چال میں ویسے ہی شامل ہیں جیسے دوسرے عام فہم الفاظ مثلاً آب و ہوا، آب و دانہ، رنگ و بو، رنگ و روغن، ردّ و بدل، سَیر و شکار وغیرہ۔ اسی طرح چند اضافتیں بھی ایسی ہیں جنہیں ہر شخص بخوبی سمجھتا ہے مثلاً اہلِ وطن، اہلِ قلم، اہلِ شہر، اہلِ ہند وغیرہ انہیں ترک کر دینے کا مشورہ سراسر غیر معقول ہے اور کوئی وجہ بھی ایسی نہیں کہ ہم انہیں ترک کر دیں۔ ہاں ان کے علاوہ دوسرے عطف اور اضافتیں جو ہماری بول چال میں شامل ہی نہیں ہیں ضرور ترک کر دینے کے قابل ہیں اور نثر میں اُن کا ترک کرنا مشکل بھی نہیں۔ ان میں بعض ایسی بھی ہیں جو صرف واو کے اڑا دینے سے بحال رہ جاتی ہیں مثلاً صبح و شام کی جگہ صبح شام، زمین و آسمان کی جگہ زمین آسمان اسی طرح بعض عطف ایسے ہیں کہ اُن کے بہترین بدل پہلے سے موجود ہیں مثلاً مہر و ماہ کی جگہ چاند سورج، شب و روز کی جگہ دن رات، خرد و کلاں کی جگہ چھوٹے بڑے اگر ہمارے ادیب اور تمام سخن ور ثقیل قسم کی لغت بازی اور اس عطف یا اضافت کے بغیر گزارہ کرنا گوارا کر سکیں تو ہمارا یہ دعویٰ کہ اردو تمام ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے کافی وزن دار اور بجا کہا جا سکتا ہے۔ ہماری یہ عملی کوشش ایسی کارگر ہو سکتی ہے کہ ہندی کے انصاف پسند طرفدار خود اردو کا خیر مقدم کرنے کو آمادہ نظر آئیں گے۔

سلمان تامنا بجل

باقی رہی نظم۔ اس میں ہماری کوشش اگرچہ نثر کی طرح سو فیصدی کامیاب نہیں ہو سکتی لیکن اس مشکل کے باوجود ہم اپنی نظم کو عطف اور اضافت سے بہت حد تک پاک کر سکتے ہیں اور اُردو کی زندگی کے لئے اس کی بہت سی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ جب ہر شاعر کے کلام میں سیکڑوں اشعار بطور نمونہ ہمارے سامنے ہیں۔ یہاں تک کہ مشکل پسندوں کے کلام میں بھی اس قسم کی صدہا مثالیں موجود ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم کو اس مشکل پر عبور نہ ہو سکے۔ چار عطف اور چار اضافتیں یا اس سے زیادہ تعداد کو تو فصحا پہلے ہی معیوب سمجھتے ہیں۔ اب تازہ کوشش کی بنیاد یہ ہونی چاہیئے کہ دو عطف اور دو اضافتوں سے زیادہ کو معیوب ہی کہ متروک سمجھ لیا جائے۔ اور اگر ہم صرف ایک عطف اور ایک اضافت کیلئے اپنے آپ کو نظم میں پابند بنا لیں تو اور بھی اچھا ہو۔ اس وقت بھی نظم میں ہمیں بعض چیزیں ایسی نظر آتی ہیں جن میں عطف اور اضافت سے بچنے کی پابندی اختیار کی گئی ہے اور اس پابندی کے باوجود وہ نظمیں کامیاب نظر آتی ہیں۔ ان چیزوں کو نمونے کے طور پر سامنے رکھ کر وہ شاعر جو قلم اور زبان پر پوری قدرت رکھتا ہو سب کچھ کر سکتا اور اپنے کمال کا سکہ بٹھا سکتا ہے۔ شعر کا یہ وصف بہت نمایاں حیثیت رکھتا ہے کہ وہ سہل ممتنع ہو اور اس کی نثر نہ بن سکے یعنی وہ بعینہٖ نثر ہو یا نثر کے قریب قریب ہو۔ یہ خوبی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب ہم عطف اور اضافت سے بچ کر شعر کہیں اور اگر مجبوری ہو تو ایک عطف یا ایک اضافت پر اکتفا کریں۔ اگر ہم عطف اور اضافت کی تکرار سے مصرع میں یہ صورت پیدا کریں۔ ع

۱۔ بخت و تخت و امر و نہی و گیر و دار

۲۔ بہ طوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی

تو اس قسم کی فارسیت سے ہم زبان کی کوئی خدمت نہیں کرتے ہیں پس جبتک ہم لغت بازی سے ہمیشہ کیلئے دست بردار نہیں ہوتے عطف اور اضافت کو آخری حد تک نہیں چھوڑ دیتے اُس وقت تک ہمارا یہ دعویٰ کہ اردو ملک کے ہر حصے میں سمجھی جاتی ہے نہ تو قابلِ تسلیم ہوگا اور نہ ہم اردو کی مخالفت کو روک سکیں گے۔ خرد ہی ایجاد کی ماں ہے۔ اگر ہم نے اس سے پہلے اس غفلت کا انجام نہیں سوچا تو اب جبکہ نتائج اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر اردو کو آتنا سلیس اور اتنا عام فہم بنا دینا چاہیئے کہ اس کی صورت بھی مسخ نہ ہو اور مخالفت کی کوئی حقیقی وجہ بھی قائم نہ رہے خدا کرے کہ اُردو کے تمام خیر خواہ کبھی ختم نہ ہونے والی بحث میں اُلجھنا چھوڑ کر لاحاصل تو تو میں میں چھوڑ در حقیقت اس مخالفت کا صحیح علاج ہی میں جلد تر متوجہ ہونا اپنا فرض خیال کریں ورنہ پانی سر سے گذر جائیگا تو اُس وقت ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش بالکل بے سود اور بے نتیجہ ہوگی

ل۔ احمد اکبرآبادی

اکبر الہ آبادی

اپنے خطوط کی روشنی میں

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب خط لکھتے وقت وہ آدمی بھی جو سراپا تصنع اور بناوٹ کی زندگی گزارتا ہو، اس غلاف کو اُتار دینے پر مجبور ہوتا اور فطری انسان بن جاتا ہے۔ خطوں میں ظاہر ہے کہ وہی حالات لکھے جاتے اور وہی کیفیات بیان کی جاتی ہیں جن کا تعلق کاتب و مکتوب الیہ کے نجی معاملات سے ہوتا اور بلاواسطہ ہوتا ہے۔ اپنے خطوں میں ہم اپنے ایسے خیال و احساس کو بھی بلا تکلف بیان کر دیتے ہیں جنھیں علی الاعلان نہیں کہہ سکتے یا کہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔

اکبر کے نجی خطوط کے متعلق کسی نے لکھا تھا کہ ان میں بیماری کے رونے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ رائے زیادہ غلط نہیں ہے۔ فی الواقع اکبر نے طبیعت و مزاج کی نادرستی کی شکایت اور زندگی سے بیزاری کے سوا دوسرے مسائل زندگی پر بہت کم اظہار خیال کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر مقصودی مطالعہ کیا جائے تو ان خطوں سے بعض ایسے دلچسپ اور اہم نفسیاتی پہلو سامنے آجاتے ہیں جن سے اکبر کے کردار کو متعین کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

اکبر کے خطوط پڑھنے کے بعد میرا تأثر یہ تھا کہ وہ مریض تو معمولی قسم کے تھے مگر خانگی زندگی میں سکون و اطمینان نصیب نہ ہونا اُن کا سب سے بڑا مرض تھا اسی لئے وہ بیماری کا دُکھڑا رو کر دوستوں کی ہمدردی حاصل کر کے اُس کمی کو پورا کرنا چاہتے تھے جو گھریلو زندگی میں نہیں مل سکی تھی۔ مولانا سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"غم نے میری جو حالت کر رکھی ہے اور جن آلام میں مبتلا ہوں، اگر آپ کو معلوم ہوں تو تعجب کیجئے گا کہ جتنے حواس باقی ہیں، کیوں باقی ہیں......"

انھیں کو ایک اور خط میں لکھا ہے کہ:۔

"دُنیا دار المحن ہے۔ میرے لئے تو ہے! میں ایسی حالت میں مبتلا ہو گیا ہوں کہ سکونت کے لئے مستقل ٹھکانا نہیں جہاں عزت آگیں زندگی بسر کر سکوں......"

سیّد افتخار حسین کے نام ایک خط کا مضمون ہے کہ:۔

"......اور سمجھتا ہوں کہ نزع قریب ہے۔ ہم نشینوں کو یہ حالت معلوم نہیں ہوتی...."

اُنھیں کو دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ:۔

"اب آپ کے سوا زیر فلک ایسا لائق اور عزیز اس تخصیص اور اس گداز دل کے ساتھ میرے لئے نہیں کہ دم آخر جس کے نظارے سے تسکین ہو۔ ہاں عشرت سلمۂ ہیں لیکن حالات اور ضرورت اور ناتجربہ کاری نے ابھی ان کو اس عالم سے دُور رکھا ہے...."

ایک موقعے پر منشی شمس الدین خاں کو لکھتے ہیں:۔

"......بجز اس کے کہ یہ لوگ مجھے جانتے ہیں اور کچھ نہیں۔ وہ زمانہ گزر گیا جب وہ مجھے ممنون کرنا سمجھتے تھے...."

ان چند اقتباسوں ہی سے پتا چل جاتا ہے کہ اپنے عزیز و اقربا سے اکبر کی توقعات اس سے زیادہ تھیں جتنی وہ پوری کر سکتے تھے اور یہ مایوسی اُن کا سب سے بڑا دُکھ تھی۔ اسی سبب سے آخر عمر کی گھڑیاں رنج و افسوس میں گزریں۔ ظاہر ہے کہ انسان جب اس قسم کی مایوسی کا شکار ہو تو معمولی مرض بھی بڑی تکلیف بن جاتا ہے۔

ہر خط میں بیماری کا شکوہ مخاطب کو گھبرا دے سکتا ہے اور اگر حسّاس آدمی اس نفسیاتی پہلو کو محسوس نہ کرے تو قیاس قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ امراض کی شکایت میرے نزدیک تو عدم اطمینان سے استعارہ تھی

جو دراصل ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ہوتی تھی۔ آخر عمر میں گھر کے اندر سکون و راحت میسر نہ ہو، ایک ایسی حالت ہے جسے شاید کوئی فلسفی انسان بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

طبع و مزاج کے اعتبار سے اکبر کی یاس پسندی مسلّم ہے، اور اس یاس پسندی کے وجوہ تلاش کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اکبر نے ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے ردِ عمل کا زمانہ پایا جبکہ ایک پوری قوم حوصلہ فرسائی کی حالت میں بے عمل ہو چکی تھی۔ ذی حس طبیعتیں اس قومی زوال کے احساس پر فطرتاً مجبور لیکن قانونِ ارتقاء کے تحت رہنمائی کرنے سے قاصر تھیں۔ اس کیفیت کا ثبوت اکبر کے ایک خط سے ملتا ہے جو انھوں نے سید افتخار حسین کو لکھا تھا۔

"...... خوب سمجھتا ہوں کہ اس وقت ہر وہ شخص جو بادۂ غفلت سے سرشار نہیں ہے، اپنے مستقبل کی تاریکی میں گم ہے......"

انھیں کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔

"جو مستقبل کے شائق ہیں، انھیں انھیں مبارک ہو! ہمیں تو اب فقط گزرا زمانہ یاد آتا ہے..."

ان اقتباسات سے یہ پہلو بھی روشن ہو جاتا ہے کہ اکبر حساس تو تھے ہی، اپنے حدود سے بھی باخبر تھے۔ مولانا سلیمان کو لکھتے ہیں:۔

"..... وجاہت حسین کا خط آیا ہے۔ آپ لکھ رہے ہیں ہم لوگوں پر کیا نازک وقت ہے؟..."

انھیں کو ایک اور خط میں لکھا ہے کہ:۔

"..... آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا صحیح ہے۔ میں خوب سمجھتا اور دیکھتا ہوں کہ اس وقت دُنیا کدھر جا رہی ہے۔ بہرحال تسلیم خم ہے جس بات کو اپنے حق میں بہتر سمجھیں بشرطِ امکان و بحدِ امکان اس کو کئے جائیں۔ اللہ کے فضل کے اُمیدوار رہیں۔ میں تو اب اُکتا گیا ہوں..."

اس سے بھی یہی پتا چلتا ہے کہ اکبر کا احساس تو کامل تھا مگر آگے اندھیرا دکھائی دیتا تھا۔ مسلم سماج کی اس وقت حالت ایسی تھی کہ حساس انسان بھی سعی و عمل کے میدان میں اُترنا نہ اپنے لئے ضروری سمجھتا تھا اور نہ اپنا منصب جانتا تھا۔

ادبی تنقید کے نئے زاویے یہ سکھاتے ہیں کہ ادب و صناعت کے لئے مستلزم ہے کہ صناع اپنے فن کے ذریعے سے سماج اور معاشرت کے تضاد و تخالف کا حل بھی پیش کرے! لیکن اکبر سے اس کی توقع کرنا میرے خیال کے مطابق تھوڑی سی ناانصافی ہوگی۔ وہ جاگیردارانہ سماج کی پیداوار اور درباری ادب و تہذیب کے پروردہ تھے، وہ اپنی ذکاوت حس کی بنا پر سماجی تضاد کا وجود بیان کر سکتے تھے۔ اُن کی شاعری و صناعت کو جو زمانہ ملا وہ قومی زوال کا دور تھا اس لئے اُن کی صناعت کا دوگونہ مقصد ہو بھی نہ سکتا تھا۔ ارتقاء کا قانون اٹل ہے۔ اکبر کو شدید احساس تھا کہ وہ انقلاب برپا کرنے نہیں آئے ہیں۔ مولانا سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں کہ:۔

"..... میں نے تہذیبِ نسواں کو لکھ دیا ہے کہ یہ نظمیں انقلاب کو روکنے کے لئے نہیں، یادگارِ انقلاب ہیں۔ حصہ دوئم میں یہ شعر پائیے گا ؎

نظمِ اکبر کو سمجھو یادگارِ انقلاب
یہ اُسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی!"

اکبر کے خطوں میں جو دوسری خاص بات نظر آتی ہے وہ اُن کا تصورِ باری تعالےٰ ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعے نے ہم سب کو یہ بات سمجھا دی ہے کہ وہ ایک مذہبی آدمی تھے، مگر یہ بات کہ اکبر مذہب کی تعریف کیا کرتے تھے اور اُن کی خداپرستی کس نوعیت کی تھی؟ اُن کے ایک خط سے واضح ہوتی ہے جو انہوں نے علامہ اقبال کے متعلق مولانا سلیمان ندوی کو لکھا تھا۔

"..... ملا و صوفی کی نظم کو آپ نے خوب زندگی بخشی۔ اقبال صاحب اس سے خوش نہ ہوئے۔ خط آیا لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ کس حق سے ملا بنتے ہیں؟ میں تو صوفی بنتا نہیں۔ شاعری کا کچھ مذاق ہے! اگرچہ بقول آپ کے شاعری اور تصوف اور فلسفہ سب ایک ہے۔ اقبال صاحب لکھتے ہیں کہ میں پرسنل خدا کو مانتا ہوں جس کے معنی ہیں شخصی! یہ لفظ متروکی مصنفین نے اختیار کیا ہے بمقابلہ فلسفے کے خدا کے جس کا وجود عالم ہی کے اندر ہے اور اسی میں طاری و ساری ہے۔ الگ نہیں..... مجھ کو معلوم نہیں کہ وہ کیا پوزیشن یا درجہ اپنا قائم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن نیک نیتی سے اقبال صاحب احتیاط کا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ یہ وفیہ بھی تو ہیں..... لیکن میں پرسنل خدا کو مانتا ہوں..... اس باب میں

آپ نے صحیح لکھا تھا کہ بحث ہی نہ کرنا چاہیئے۔ "پرسنل گاڈ" کہنا آسان ہی ہے جو حد ہے جس قدر ہمہ اوست کہنا۔ ۔ ۔ ۔"

اس اقتباس میں بڑی حد تک ابہام ہے مگر یہ بات واضح ہے کہ اکبر خدا کے کائناتی تصور کے مقابلے میں شخصی خیال کی طرف مائل تھے۔ یہ پہلو ان کی شاعری کو سمجھنے میں سب سے زیادہ مدد دے سکتا ہے۔ چنانچہ وہ علامہ اقبال کی تعلیمِ خودی کے مسئلہ سے بھی متفق نہ تھے۔ سر عبد القادر کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ:۔

"۔ ۔ ۔ ۔ میں نے ان دو چار لفظوں میں اپنا مطلب ادا کر دیا ہے ؎

عشق کو کیوں بے خودی مطلوب ہے

حُسن بے حد ہے خودی محدود ہے

میرا مطلع پیشِ نظر رکھیئے:

اور بھی دورِ فلک ہیں ابھی آنے والے۔ ۔ ۔ الخ

آپ اس کے اول داد دینے والے تھے۔ ۔ ۔ ۔"

اس سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ وہ مروجہ مذہبی تصورات کے قائل اور ان پر مائل تھے، مذہبی معاملات میں غور و فکر کو روا نہ رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے اسی عقیدے نے ہی ان کو اپنے ماحول اور زمانے سے خائف کر دیا تھا۔ سماج کے خلاف اگر کہنا بھی چاہتے تو صاف اور علانیہ کہنے کی ہمت مفقود تھی۔ ان کے کلام میں بلیغ استعاروں اور نازک کنایوں کا راز اسی حقیقت کے اندر ہے۔ سر عبد القادر کو ایک اور خط میں لکھا ہے کہ:۔

"۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اس کی اشاعت آپ نہ کیجئے گا۔ ہر ایک کی پسند جداگانہ ہے۔ زیادہ تر غرض ہے پولیٹیکل نزاکت کو دیکھ میں۔ در حقیقت میرا رُوئے سخن کبھی ایسا رہا ہی نہیں نہ مجھ کو قانون اور بحث سے اُلجھن رہی۔ طاقت پر بھی جھنجھلایا ہوں تو طاقت کی حمایت میں۔ لیکن جا بجا گورنمنٹ کی طرف داری ہے۔ ۔ ۔ ۔"

اکبر کا جو رویہ حکومت کے بارے میں تھا وہی احباب اور دوسرے لوگوں کے بارے میں بھی تھا۔ وہ بلا شبہ اخلاقی بزدل تھے۔ نہ کسی کی ناخوشی مول لینا چاہتے تھے اور نہ کسی نکتہ چینی کی برداشت رکھتے تھے۔ اس لئے یا تو بات کمل کر نہ کہتے تھے یا پھر تاویلوں سے کام لیتے تھے۔ لیکن دل کی اُپج سے مجبور بھی تھے۔ احساس زندہ تھا اور اس کا اظہار بھی کرنا چاہتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کے محرم نامے کے متعلق مولانا سلیمان ندوی نے لکھا تو جواب میں لکھتے ہیں کہ:۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خواجہ صاحب صوفی نہاد بزرگ ہیں۔ ان کے کاموں میں کچھ (؟) ہے۔ دُنیا کا تعلق ضرور تھا۔ مذہبی ہسٹری پہ جُھک پڑے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

محرم نامے پر مولانا سلیمان کو کچھ اعتراض تھا۔ اکبر نہ اس کی تائید کر سکے نہ مخالفت۔ سر عبد القادر کو لکھا:۔

"کیا پرچہ زمیندار آپ کی نظر سے گزرتا ہے؟ ایڈیٹوریل نظم (؟) کون لکھتا ہے؟ مجھ پر بھی کچھ ریمارک ہیں! جن سے تعجب ہوتا ہے۔ کیا لوگ ہیں؟ کیا زمانہ ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔"

اکبر کے خطوط میں میری نظر ان خصوصیات پر پڑی۔ وقت کافی ملتا تو شاید کچھ اضافہ کر سکتا۔

دیوندر ستیارتھی

لوک ناچ کی پرکھ

تُم کونسا ناچ ناچتے ہو؟

یہ سوال افریقہ کے ایک قبیلہ دار نے اپنے پڑوسی قبیلہ دار سے کیا تھا کیونکہ قبیلے کی سب سے بڑی پہچان اُس کا لوک ناچ ہے۔ ابتدائی عہد کا انسان زندگی کے قدرتی تقاضوں کے پیشِ نظر سُر تال سے روشناس ہُوا سنگیت اور نرت ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ اِنسانی فطرت میں اظہار کی طلب ہے (یہیں سے جمالی محویت پیدا ہوتی ہے)

مانا کہ عروج و ارتقا کی متعدد منزلیں طے کرتے ہوئے دیس دیس کا سنگیت اور نرت مستقل فن کی حیثیت پا چکا ہے لیکن یہ بات فلسفیوں اور نقادوں نے بارہا تسلیم کی ہے کہ ان کی بنیادیں لوک گیت اور لوک ناچ پر رکھی گئی تھیں۔ جبھی تو آج بھی ہندوستانی گاؤں میں پانچ ہزار برس سے چلے آنے والے چھکڑے کی ریں ریں کا منظر اور پس منظر کسی نہ کسی تیوہار یا پَرب سے وابستہ لوک ناچ کی بدولت زندگی کے تازہ خون کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔ اُمید و طلب کے پیشِ نظر جوش و سرمستی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ رنگ و بو اور نغمے کی گت میں معنی خیز توازن قائم ہوتا چلا جاتا ہے۔

"گربا"

مَیں نے ہندوستان کے ہر صوبے کے لوک ناچ دیکھے ہیں اور میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستانی لوک ناچ ہندوستانی تمدن کی یگانگی کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ کے۔ ایم منشی نے گجرات کے "گربا" ناچ کا ذکر کرتے ہوئے اس کے ہندوستان گیر فنی پہلوؤں کی طرف ایک اہم اِشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "ہم یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ گربا ناچ کا اجارہ گجرات کی عورتوں نے لے رکھا ہے۔ لیکن بات ایسی نہیں ہے۔ شارنگ دھر نے بیان دیا ہے کہ پاربتی نے شیو کے بھگت بانا سُر کی لڑکی اُشا کو لاسیہ نرت سکھایا تھا۔ اور اُس نے سوراشٹر یا گجرات کی عورتوں کو یہ نرت سکھایا۔ مگر ابھی ابھی جب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو معلوم ہُوا کہ اندھرا، تامل ناڈ اور کیرل میں بھی اسُر کنیائیں آگرہی تھیں اور وہاں کی عورتوں نے بھی ایسے ہی گربا ناچ ہمارے جانے بغیر سیکھ لئے تھے۔ ہمارا اجارہ اٹکل پچّو تھا۔ ہندوستانی تمدّن کا جو سمندر چاروں طرف اُچھلتا ہُوا لہرا رہا تھا۔ وہ جب ہمارے کنارے پر اُچھلا تو ہم اسے اپنا ہی تالاب مان بیٹھے"۔

گربا ناچ کا شجرہ راس لیلا سے جا ملتا ہے۔ اسوج مہینے کے نو دِن "آشون شُکلا پرتی پدا سے نومی تک" نوراتر کہلاتے ہیں۔ جبکہ امبا میّا کی پوجا کی جاتی ہے گربا ناچ اسی پوجا کا جزوِ خاص ہے۔ گلی محلّے کی عورتیں ایک جگہ جمع ہو کر گربا ناچتی ہیں ناچ کا ڈھنگ بھی ترتیب دیا جاتا ہے کہ مرکز میں ایک گھڑا رکھا جائے جس میں جگہ جگہ سوراخ کر دیئے جاتے ہیں اور اندر ایک دیا روشن رہتا ہے۔ سوراخوں سے دیئے کی روشنی امبا میّا کی علامت کے طور پر مسکراتی رہتی ہے۔ اس گھڑے کے گرد عورتیں گھیرے میں ناچتی ہیں عورتوں کی کسی خاص گنتی کی شرط نہیں۔ برابر عورتیں شامل ہوتی رہتی ہیں اور گھیرا بڑا ہوتا جاتا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی ہوشیار رقاصہ گھیرے کے اندر گھڑے کو سر پر رکھ کر امبا میّا کی پرارتھنا کا ناچ شروع کر دیتی ہے اور گھیرے کی عورتیں جھک جھک کر دونوں ہاتھوں سے زمین کے قریب ہاتھ پہنچے پر تالی بجاتے ہوئے برابر گھومتی رہتی ہیں۔ تھرکتے ہوئے پاؤں گت کو قائم رکھتے ہیں اور ہاتھوں کی تالی ٹھیک لمحے پر گت میں رنگ بھرتی ہے۔

شروع میں گربا ناچ کے گیتوں میں امبا میّا کے بکھان کرنے کا رواج رہا۔ لیکن جب نوراتروں کے علاوہ عیش و نشاط کی متعدد منزلوں کی رونق شامل ہوتی گئی۔ گربا گیتوں کے نقش بدلتے گئے۔ یہی کہ گربا کی گت گجراتی زندگی کی روایتی انفرادیت میں رچ گئی۔ آج بھی جبکہ گجراتی زندگی اسماجی شعور کی مدد سے فن کی نوک پلک سنوار چکی ہے گربا کے خد و خال پر قدامت کی مہریں دیکھ کر نہ صرف جدید انسان عوامی فن کا سکہ مانتا ہے۔ بلکہ اُسے جدید فن میں نئی زندگی کے جوہر پیدا کرنے کی تحریک ہوتی ہے۔

کیونکہ دیس کی خواہش اور پسند کسی بھی دیس کے فن کا خمیر قرار دی جاسکتی ہے۔

جن کے نزدیک روایت سے بال برابر بھی اِدھر اُدھر ہونا فنی کفر کا درجہ رکھتا ہے، اُن سے بھی پُرزور الفاظ میں یہی کہنا ہوگا۔ کہ جنتا کی رنگ بھومی پر تشریف لائیے۔ آسمان کی طرف دیکھتے رہنے کے عوض چند لمحوں کے لئے زمین کی طرف بھی دیکھئے۔ جمود سے بوجھل فن کبھی ترقی نہیں کرسکتا۔ ذرا ایک بار گرباکا جائزہ لیجئے:۔

مینڈی تو بادی مالوے
نے اینو رنگ گیو گجرات رے
مینڈی رنگ لاگیو رے
نانو دیری رُڈو لاڑکو
نے کائیں لادیو مینڈی نو چھوڑ رے
مینڈی رنگ لاگیو رے
باٹی گھونٹی نے بھر یا باٹکا
بھابھی رنگو تمارا ہاتھ رے
مینڈی رنگ لاگیو رے۔

اس گربا گیت کا مطلب کچھ یُوں ہوتا ہے کہ مہندی مالوہ میں پیدا ہوئی لیکن گجرات کو اُس نے اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ مہندی کا رنگ چڑھ گیا۔ میرا چھوٹا دیور بہت لاڈلا ہے۔ وہ مہندی کا پودا اُکھیڑ لایا۔ مہندی کا رنگ چڑھ گیا۔ مہندی پیس کر اُس نے پانی بھر دی اور بولا بھابھی، اپنے ہاتھ رنگ لو۔ مہندی کا رنگ چڑھ گیا ...... گیت بہت لمبا ہے۔ آگے چل کر بھابھی مہندی سے ہاتھ رنگنے سے انکار کردیتی ہے۔ کیونکہ بالم گھر پر موجود نہیں پھر بالم کو گھر بلانے کے لئے خط لکھا جاتا ہے۔ یہ لمبا قصّہ ہے کہ کس طرح بہانے کئے گئے اور آخر بالم کو یقین دلایا گیا۔ کہ سچ مچ مہندی کا رنگ چڑھ گیا۔

مہندی کا رنگ روایت اور حقیقت کے سنگم سے تعلق رکھتا ہے جب تک کھیتوں میں مہندی اُگتی رہے گی، گردشِ پر اس کا رنگ برابر چڑھتا چلا جائیگا مہندی کا رنگ عوامی فن کی بے نظیر قوت کی علامت ہے۔ جدید اِنسان کتنی ہی مخالفانہ نگاہوں سے مہندی کے رنگ سے حقارت کا سلوک کرے۔ یہ رنگ اپنی دائمی جگہ پر قائم رہے گا۔

جنتا کی آواز

پنجاب کا 'گدّھا' ناچ بھی گھیرے میں ناچا جاتا ہے مرد الگ ناچتے ہیں اور عورتیں الگ۔ شادی بیاہ میں کہیں کہیں مردوں اور عورتوں کا ملا جُلا ناچ بھی بہار چلا آتا ہے پنجاب کے سینکڑوں نہیں، ہزاروں لوک گیت گدّھا ناچ کے مرہُونِ منّت ہیں گھیرے کے اندر مردوں کے گدّھا میں دو مرد، عورتوں کے گدّھا' میں دو عورتیں اور ملے جُلے گدّھا' میں اکثر ایک عورت اور ایک مرد مل کر کوئی دلچسپ ناچ ناچتے ہیں جو دلاویزی اور نازکی رکھ رکھاؤ کی بنیادوں پر تعمیر کیا جاتا ہے اور گھیرے میں کھڑے ہوئے لوگ 'مرد' عورتیں یا ملے جُلے ناچ کی صورت میں نصف گھیرے میں عورتیں اور نصف میں مرد، ہاتھوں سے تالی بجاتے ہوئے ناچ اور گیت کا توازن قائم رکھتے ہیں آج بھی پنجاب کا گاؤں گاؤں زبانِ حال سے گدّھا ناچ کو پکار کر کہہ اُٹھتا ہے:۔

گِدّھیا پنڈ وڑ وے
لامہہ لاہہ نہ جائیں!
(ارے گدّھا ناچ، ہمارے گاؤں میں ضرور آئیو
ارے باہر باہر سے مت چلے جائیو)

ظاہر ہے کہ لوک ناچ کا یہ تصور کردہ گاؤں گاؤں کا کبھی نہ ختم ہونے والا سفر جاری رکھتا ہے، عوامی فن کی خود اعتمادی کا ثبوت ہے۔ لوک ناچ کی اصل روح جنتا کی آواز ہے۔ جو ہمارے معاشرتی علم میں اضافہ کرتی ہے۔

حالات کی چھاپ

کانے بھجنگ گونڈ، جو دراصل ہندوستان کے آدی باسی ہیں، کرما ناچ، ناچ کر اجتماعی سکھ دُکھ کے گیت گاتے ہیں۔ کرما میں کئی کئی ڈھول ایک ساتھ بجائے جاتے ہیں اور رات رات بھر یہ ناچ جاری رہتا ہے۔ اسے ہمیشہ مرد اور عورتیں مل کر ناچتے ہیں۔ چاندنی رات کا کرما گونڈوں کی زندگی میں نئی قوت بھر دیتا ہے معلوم ہوتا ہے تمام جنگل کرما کے نشے میں جھوم اُٹھتا ہے اور ناچنے والوں کے ہمراہ جنگل کے درخت بھی شامل ہو گئے ہیں۔

پُرب تیوہار پر لوک ناچ نہ بسر! جنتا کی جمالی صلاحیت کی علامت ہے۔ بنیادی قسم کا انسان اور سب کچھ بھُول سکتا ہے۔ لیکن وہ لوک ناچ، کو جو عوامی فن کا صحیح معیار قائم کرتا ہے۔ کبھی نہیں بھُول سکتا۔

لوک ناچ پر حالات کی چھاپ نمایاں ہے۔ میرے ذہن میں متعدد علاقوں کے لوک ناچ اکثر خلط ملط ہونے لگتے ہیں۔ انھیں الگ الگ رکھنے کے لئے ذہن پر زور ڈالنا ہوتا ہے بلکہ ان کی آمیزش کی اہمیت بھی میرے نزدیک کچھ

کم نہیں۔ کون سا لوک ناچ کب اور کیسے وجود میں آیا، یہ کہنا کٹھن ہے۔ باہر سے آئے ہوئے لوگ اپنا فن اپنے ساتھ لائے ہوں گے، اور اس باہر سے آئے ہوئے فن نے مقامی فن پر اثر ڈالا ہوگا۔ باہر سے آئے ہوئے لوگوں کے توہمات اور ممنوعات، پیدائش، شادی اور موت سے متعلقہ رسوم و روایات، کام کاج اور معاش کی کیفیتیں، ان سب کا میل مقامی زندگی سے ہونا قدرتی امر تھا۔ آس پاس کے میل جول نے بار بار لوک ناچ کی پوری فضا بدلنے کی کوشش کی ہوگی۔ اور اس سے نمایاں طور پر لوک ناچ کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا ہوگا۔

جب نرتکی پَر تولتی ہے

پورب کا جھومر ناچ بھی عورتیں گھیرے ہی میں ناچتی ہیں جھومر گیتوں کی بہت بڑی تعداد عشق و محبت اور حُسن کی پرچھائیوں سے تعلق رکھتی ہے۔ مثلاً ایک گیت، جو بھوجپوری بولی میں ہے، کچھ یُوں شروع ہوتا ہے:۔

کاہاں سے کوچ کیا
کاہاں پڑاؤ کیا
کاہاں ڈیرا ڈال دیا
ہائے رے سانولیا!

اس کا مفہوم صاف ہے۔ ایک عورت اپنے بالم سے پوچھ رہی ہے کہ تم نے کہاں سے کوچ کیا، اور کہاں تم نے ڈیرا ڈال دیا۔ ہائے رے سانولیا!۔۔۔۔۔۔ جھومر کے گیت بے اختیار ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایک عورت کی انفرادی آواز کے بدلے ہم پورے قبیلے کی آواز سن رہے ہیں، اور بالم سے نہیں پورے قبیلے سے یہ سوال کیا گیا ہے، کہ اُس نے کہاں سے کوچ کیا، کہاں پڑاؤ کیا، اور کہاں ڈیرا ڈالا۔ جیسے یہ کسی خانہ بدوش قبیلے کا گیت ہو۔ جسے ابھی تک اپنے آباؤ اجداد کی خانہ بدوشیوں کی یاد فراموش نہیں ہوئی۔ حالانکہ یہ قبیلہ آج ایک جگہ آباد ہے۔

لوک ناچ کے موقع پر معلوم ہوتا ہے کہ تمام گاؤں مل کر یہ کہہ رہا ہے، کہ ہماری ہر شے چھین لیجئے۔ لیکن ہمارا ناچ ہمارے پاس رہنے دیجئے۔ متعدد علاقوں میں ناچ کے موقع پر میں نے بے انتہا چمکدار گول گول دیدے گھومتے ہوئے دیکھے ہیں۔ جو دیکھنے کے علاوہ چھونے تک کی قوت رکھتے تھے۔ لہراتے ہوئے بازو اور تھرکتے ہوئے پاؤں۔ چہروں کا یہ حال کہ گاؤں کی تاریخ اپنے ہر دور کی آئینہ داری کرتی نظر آتی تھی۔ یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ زندگی سو معموں کا ایک معمّہ ہے۔ عشق و محبت کی چھاپ بھی پڑتی تھی۔ سیدھے سادے انداز میں سرگوشیوں کے انداز قائم کئے جاتے تھے۔ غم کی گرانباری کے اشارے بھی تھے جو تخلیق کی حُسن کاری کے کرشمے پیش کرتے تھے۔ صدیوں کی گرانباری کے باوجود بار بار یہ محسوس ہوتا کہ ناچ کے جادو کے زیرِ اثر ناچنے والوں کے چہروں پر نئی فصلوں کا آنچل لہرانے لگا ہے۔

زندگی کی وسعتیں لوک ناچ کو بڑھا دیتی ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ گاؤں کی نرتکی اُڑنے والی چڑیا ہے۔ جو ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پھر سے اُڑ جائے گی۔ ہر گت پر نرتکی پَر تولتی ہے۔ ناچ کے جادو سے ناچنے والوں میں خود شناسی کا جوہر پیدا ہوتا ہے۔

"سہرائی"

سنتھالوں کا "سہرائی" ناچ بھی گدھا، کرما اور جھومر کی برادری کا خاص رُکن ہے۔ سہرائی کے اختتام پر جو گیت گایا جاتا ہے اس میں کچھ اس طرح کا تصوّر پیش کیا گیا ہے۔ کہ گاؤں کی ہر لڑکی اپنے اپنے دروازے پر کھڑی ہے، اور سہرائی کو الوداع کہہ رہی ہے۔ اُس وقت گویا ہر لڑکی کا دِل اُداس ہو اُٹھتا ہے وہ چاہتی ہے، کہ سہرائی کو چند دن کے لئے اور روک لیا جائے لیکن وہ دیکھتی ہے۔ کہ ہاتھی کا سا عظیم المرتبت پرب بیتا جا رہا ہے۔ لیکن نہ اُس کے ہاتھ ہیں نہ پاؤں، نہ آنکھیں جسے تھام کر اُسے آگے بڑھنے سے روکا جا سکے۔ لوک ناچ کا یہ تصوّر، کہ آخر ایک دن اُسے الوداع کہنی ہوگی تاکہ وہ ہمیشہ تو ایک جگہ بند ہو کر نہیں رہ سکتا، جنتا کے فن کی ارتقائی کیفیتوں کا حامل ہے۔ اس سلسلے میں بے اختیار ہمیں پنجاب کے گدھا ناچ کا وہ تصوّر یاد آجاتا ہے جس میں دور دور کی منزلیں طے کر کے آتے ہوئے ناچ سے یہ کہا گیا ہے کہ ہمارے گاؤں میں بھی ضرور آئیو۔ دیکھو باہر باہر سے مت چلے جائیو۔ معلوم ہوتا ہے سہرائی کو بھی سنتھال لڑکیوں کا نغمہ ہمیشہ یاد رہتا ہے جبھی تو وہ ٹھیک وقت پر پھر واپس آجاتا ہے۔

"بِہُو" ناچ

آسام کا "بہو" ناچ بھی اس وقت میرے ذہن کے کل بھون میں نقش و نگار قائم کر رہا ہے۔ لڑکے ڈھول بجاتے ہیں۔ لڑکیاں ناچتی ہیں۔ نئی رُت کا یہ ناچ آسام کی فنی جدّت

کا امانت دار ہے۔ کہتے ہیں آسام میں ایک پرندہ ہوتا ہے جو بہو ناچ کے دن قریب آنے پر بہو بہو کی رٹ لگانا شروع کر دیتا ہے۔

ایک بہو گیت میں آسام کے غریب ترین طبقے کی آواز یوں گونج اٹھتی ہے کہ بہو پنچھی بہو بہو کی رٹ لگا رہا ہے۔ لیکن ہماری بہو کے پاس معقول کپڑے موجود نہیں۔ کوئی ہم سے پوچھے گا۔ کہ بہو ناچ میں شامل ہونے کا ارادہ کیوں چھوڑ دیا، تو ہم کہہ دیں گے، کہ ہماری ماں مر گئی ہے۔

بہو کے ڈھولوں کی آواز، ڈھولکیوں کے قہقہے اور بہو ناچنے والیوں کے پاؤں کی تھرکن آج نہ جانے کیسے جاگ اٹھی۔ آج برسوں پہلے دیکھے ہوئے چہرے میری آنکھوں کے سامنے آ رہے ہیں بے فصل کے میووں کی طرح آج میں بہو گیتوں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگانا چاہتا ہوں۔ آج میں انھیں اپنے ذہن کے کلا بھون میں بڑی حفاظت سے رکھوں گا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک ایک نغمہ ایک ایک تصویر میں بدل رہا ہے۔

آج آسام اپنی فنی وراثت سے بے خبر نہیں۔ آسامیوں کا ضمیر بہو ناچ کا محافظ رہے گا۔

"بندھن آپ ہی آپ کھل جائیں گے" کس کس ناچ کو الگ الگ پیش کیا جائے۔ سچ پوچھو، تو الفاظ میں صلاحیت نہیں کہ سُر تال اور ناچ کا منظر پیش کر سکیں۔ اس وقت ملک راج آنند کا لکھا ہوا مقالہ "رقصاں قدم" میرے سامنے پڑا ہے جس کا آغاز بچھروں ناچ کے ایک نغمے سے کیا گیا ہے

رقصاں قدم، گھنگھروؤں کی چھنن چھنن
گیت، جو قدموں کی بدلتی ہوئی گت پر گائے جاتے ہیں
ہمارے گرد پورا ناچ کا روپ۔
انھیں ذرا اپنی آتما میں ڈھونڈ دیکھو، تمہارے بندھن آپ ہی آپ کھل جائیں گے۔

جنتا کے دل بہلاوے دقیق بحث کے متحمل نہیں ہو سکتے بہت سی باتیں رہ گئی ہوں گی۔ بہت سے ناچوں کا ذکر نہیں کیا جا سکا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ مختصر سا جائزہ جس کی بنیاد لوک ناچ کی پرکھ کے عالمگیر اصول پر رکھی گئی ہے، بہت مددگار ثابت ہو سکتا ہے،

رقصاں قدم رقص کرتے رہیں۔ گھنگھروؤں کی چھنن چھنن بھی کبھی خاموش نہ ہونے پائے۔ قدموں کی بدلتی ہوئی گت پر گائے جانے والے گیت جنتا کا سُکھ دُکھ بیان کرتے چلے جائیں۔ ناچ کا روپ کبھی وقت کے ہاتھوں مٹنے نہ پائے۔ ناچ، جس کی بدولت صدیوں کے بار تلے دبی ہوئی جنتا دیکھتی ہے۔ کہ اُس کے بندھن کھل رہے ہیں، اور دیس میں آزادی کا جنم دن منایا جا رہا ہے۔

محمد احسن فاروقی

ادب اور صحافت

ادب اور صحافت کا فرق دنیا کے سب سے پہلے نقاد ارسطو ہی نے صاف طور سے واضح کر دیا تھا۔ مگر آج کل طباعت کی آسانی، اخبارات کی کثرت اور جمہوریت کی وجہ سے پست ذہن لوگوں کی ترقی نے اس فرق کو بالکل مبہم کر دیا ہے۔ پھر کچھ ایسی جماعتیں بھی قائم ہو گئی ہیں جو صحافت ہی کو ادب منوانے پر تلی ہوئی ہیں۔ اور ان کا اثر ان کچے ذہنوں پر بہت کافی ہوتا جا رہا ہے جو محض سستی سی ڈگری حاصل کر کے علما کی قطار میں آ گئے ہیں۔ اور جو اپنی محض سطحی تصنیفات کو اعلیٰ ادبی درجہ دلوا کر سستی شہرت کے خواہاں ہیں۔ صحافت کا یہ ازدہا اگر ادب کو ختم نہیں کر رہا ہے تو اس پر دھول ضرور جھونک رہا ہے۔ اس لئے اس وقت یہ ضروری ہے کہ ادب اور صحافت کے فرق کو صاف طور پر سمجھا جائے۔

ارسطو نے شاعری اور تاریخ کا فرق یہ بتایا تھا کہ شاعری کو دائمی حقیقتوں سے اور تاریخ کو وقتی حقیقتوں سے سروکار ہوتا ہے یہی فرق ادب اور صحافت میں ہے۔ ادب اور صحافت دونوں زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں کو ان واقعات سے غرض ہوتی ہے۔ جو روزمرہ زندگی میں پیش آتے ہیں۔ زندگی کے ہنگاموں سے بھی دونوں کو سروکار ہوتا ہے۔ مگر ایک ادیب اور ایک صحافت نگار کے نقطۂ نظر میں فرق ہوتا ہے صحافت نگار کسی ہنگامے کے اس پہلو پر نظر ڈالتا ہے۔ جو خبر کے لحاظ سے اہم ہو اور ادیب اس پہلو پر جو انسانی لحاظ سے معنی خیز ہو۔ مثلاً سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے موقع پر انگلستان کے لوگ جوق در جوق فوج میں بھرتی ہوتے ہوئے لڑائی پر چلے جا رہے تھے، اور فوجوں کا شہر کے اندر سے مارچ کرتے ہوئے گذرنا ایک عام بات تھی، اس کے بابت اس وقت کے اخباروں میں یہ معلومات بہم پہنچائی جاتی ہوں گی کہ کتنے لوگ کہاں کہاں سے بھرتی ہوئے کس کس وقت ان کے دستے شہر میں سے نکلے، اور کن کن جہازوں پر بٹھا کر ان کو کہاں کہاں بھیجا گیا۔ مگر ایک ادیب اور شاعر ٹامس ہارڈی اس فوجی سرگرمی کے بابت ایک نظم لکھتا ہے جس میں تمام تبیان اس جوش اور عقیدے کا ہے جو ہر سپاہی کے دل میں تھا۔ اس نظم کو پڑھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جنگِ عظیم کے سلسلے میں انگلستان کی سرگرمی کے ساتھ ساتھ یہ نظم اس دائمی کیفیت کی تصویر پیش کرتی ہے۔ جو ہر فرد کے دل کو ایسے وقت بڑھاتی ہے جب کہ اس کے لئے اپنی قوم کے واسطے یا اپنی ذات کے واسطے ایک راہ پر اس عقیدے کے ساتھ چلنا پڑتا ہے کہ وہ سچا ہے اور اس کی سچائی اسے آخر میں دشمنوں پر فتح دلائے گی۔ اس نظم کے اوزان اور بندوں کی ساخت دل بڑھانے والے فوجی باجے کے راگ کی نہایت عمدہ طریقے پر نقل کرتے ہیں۔ اور اس کا مکمل اثر ہم کو ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں جھوٹ، راہزنی، بے جا جبر، دھاندھلی ہم کو فضول چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔ ہم خود اس گہرے عقیدے کو اپنے دل میں لے کر کہ فتح سچائی ہی کی ہوتی ہے اس دنیا کے میدان میں ان سب دلچسپیوں کو چھوڑ کر جو صحیح راہ سے بھٹکا دیتی ہیں سپاہیوں کی طرح مارچ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں یہ نظم ایک ہنگامی واقعے کے بابت ایک دائمی قدر ہمارے سامنے لاتی ہے۔ اور اس لئے یہ ادب ہے۔ اس کی کیفیت زمان و مکان سے بالاتر ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت بھی اور ہر وقت اس کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آ سکتی۔

اب اگر ہمیں کسی تصنیف کے بابت یہ نتیجہ نکالنا ہو کہ وہ ادب ہے یا صحافت تو ہم کو محض یہ دیکھنا ہے کہ جو باتیں اس میں بیان ہوئی ہیں۔ وہ کسی خاص گروہ، کسی خاص وقت، کسی خاص نظریے ہی سے وابستہ ہو کر تو نہیں رہ جاتیں۔ اگر وہ تصنیف ہم کو زندگی کی کچھ ایسی سطحی حقیقتیں بتا کر رہ جاتی ہے جن کو معلوم کرنے کے بعد ہم کو یہ احساس ہو کہ یہ باتیں ہمیشہ صحیح نہیں ہیں بلکہ ایک خاص موقع اور وقت پر ہی کچھ معنی رکھتی ہیں تو وہ تصنیف ادب نہ ہوگی صحافت ہوگی۔ مثال کے طور پر علی سردار جعفری صاحب کی "نئی دنیا کو سلام" لے لیجئے۔ اس کا وہ حصہ جس میں ہندوستان کی جنتا کے لوگ انگریز سے اپنے جینے کا حق مانگتے ہیں، اور اپنا کھویا ہوا پھول واپس مانگتے ہیں، پڑھ کر یہی نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ یہ نظم اگر اس زمانے میں شائع ہوئی ہوتی

جب یہاں انگریز حکمران تھے تو یہ کوئی معنے رکھتی تھی مگر اب اسی طرح پرانی ہوگئی جیسے کہ دو یا تین روز کا روزنامہ اخبار پرانا ہو جاتا ہے۔ پھر اردو زبان کی اس شاید طویل ترین نظم کو پورا پڑھیئے تو یہی ملے گا کہ موجودہ دور کے وہ سیاسی نفسیاتی اور اخلاقی نظریے جو کچھ ہی عرصے میں خام ثابت ہو جائیں گے نہایت ہی سطحی نظر کے ساتھ بالکل بنیادی رنگ میں عروضی پابندیوں کے ساتھ نظم کر دیئے گئے ہیں یہ چیز تمام تر صحافت ہے اور اس قسم کی سب چیزیں چاہے وہ افسانے ہوں چاہے مضامین ناول، ڈرامے یا تنقید ہوں، محض صحافی درجے سے آگے بڑھتے ہوئے نہیں دکھائی دیتے

تاریخ اور صحافت کو حالات سے تعلق ہوتا ہے ادب کو حالات کے تاثراتی پہلو سے۔ تاریخ عموماً پرانے زمانے کے حالات کو بیان کرتی ہے اور صحافت روز مرّہ کے نت نئے حالات کو۔ سب سے بہتر اخبار وہ ہے جو سب سے زیادہ تازہ خبریں دے۔ یہ صحافت کی حد ہے۔ برخلاف اس کے ادب کی حد یہ ہے وہ ایسے تاثرات پیش کرے جو کبھی پرانے ہی نہ ہو سکیں۔ اور ایسے رنگ میں پیش کرے جو کبھی دھیما ہی نہ پڑے۔ ان دونوں حدوں کے درمیان ایک بہت ہی وسیع میدان ہے۔ اور دنیا کی چند تصانیف کو چھوڑ کر باقی سب تصانیف میں ادب اور صحافت کے عناصر ملے جلے ہوتے ہیں۔ لہٰذا کسی تصنیف کو ایک طرف یا دوسری طرف رکھنے کے لئے ہمیں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس میں ادب کا عنصر غالب ہے یا صحافت کا۔ اس وقت دنیا اس ہنگامہ خیزی کے ساتھ بدل رہی ہے کہ شاید ہی کوئی ادیب ایسا ہو جو اپنا توازن قائم رکھ کر ادب ہی کے عنصر کو اپنی تصنیفات میں غالب رکھ سکا ہو۔ ایچ۔ جی۔ ویلز کے بیشتر افسانے اور ناولیں محض صحافت ہی ہیں، برنارڈ شا کے کافی ڈرامے بالکل صحافت ہیں مگر ان دونوں نے صحافت نگاری سے ترقی کر کے ادیب کا درجہ حاصل کیا۔ برخلاف اس کے ہمارے بہت سے ادیب کہیں صحافت سے آگے نہیں بڑھتے، اور اس پر طرّہ یہ ہے کہ دھاندلی میں کہتے ہیں کہ ادب کو صحافت ہی ہونا چاہیئے۔ خیر یہ سوال اہم ہے کہ ادب اور صحافت کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ یہ کام مشکل ہے مگر ممکن ضرور ہے۔ اور اگر ہم ان دونوں کی کچھ متضاد صفات پر دھیان رکھیں تو ہم کو ان دونوں کے درمیان فرق کرنے میں زیادہ زحمت نہ ہو جائے۔ ان متضاد صفات کا خیال رکھتے ہوئے ہم آپ کے سامنے تین خاص رائیں پیش کرتے ہیں

پہلی یہ ہے کہ صحافت کی اہم صفت اخباریت ہے اور ادب کی آفاقیت۔ اخباروں میں وہی افسانے، نظمیں، مضامین وغیرہ چھپتے ہیں جن کو عام خبروں سے تعلق ہوتا ہے اور ادب پارے وہی دنیا کے ہر ادب میں مقبول ہیں جو زیادہ سے زیادہ زمانے تک اور زیادہ سے زیادہ مختلف مقامات کے انسانوں کیلئے دلچسپ ثابت ہوں

دوسری صحافت کسی پالیسی یا سیاسی نظریے کے تحت ظہور میں آتی ہے اور ادب کسی انفرادیت یا ادبی نظریے پر مبنی ہوتا ہے اس امر کو یوں نہ سمجھنا چاہیئے کہ ادیب بالکل خلا میں رہتا ہے اور اس کیلئے عام نظریات سے واقفیت ضروری نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بغیر فلسفہ وغیرہ سے گہری واقفیت ہوتے وہ زندگی کو گہری نظر سے نہیں دیکھ سکتا مگر پھر بھی ادیب کے لئے زندگی نظریات زندگی سے زیادہ اہم ہے۔ وہ اپنی جگہ پر خود اپنے خاص طریقے کا فلسفی ہوتا ہے اور اس کا جو کچھ بھی فلسفہ حیات ہوتا ہے وہ ذاتی اور انفرادی ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی مسئلے سے سیاسی نظریے کے ہاتھ اپنی انفرادیت بیچ ڈالے تو وہ انجیل کے اس شخص کے موافق ہوگا جس نے ایک برتن بھر کھانے کے لئے اپنے پیدائشی حق کو بیچ ڈالا تھا

تیسری صحافت میں اوپر ذکر کی ہوئی صفات کی بنا پر ہمیشہ سطحیت ہوتی ہے اور ادب میں گہرائی ہوتی ہے اس لئے صحافت کو ہلکا ادب بھی کہنے میں صحافت کی غرض یہی ہوتی ہے کہ وہ جلد سے جلد پڑھ لی جائے اور اس کی رسائی کند ذہن سے کند ذہن شخص تک ہو جائے۔ نفسیاتی تجربات نے یہ ظاہر کیا ہے، کہ غور و فکر کے قابل ایک فی صدی انسان ہی ہوتے ہیں باقی دوسروں کی رائے کو محض مان لینے کی ہی قابلیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا صحافت نگار کے لئے کوئی خاص قابلیت کی ضرورت نہیں، اور وہی اچھا صحافت نگار ہوگا، جو فکر کا نہ تو قائل ہو اور نہ اس کے قابل ہی ہو۔ اس لئے ہر صحافی چیز کا چاہے وہ نظم، افسانہ، ناول، مضمون ہو رنگ ہلکا ہی ہوتا ہے

میں نے آپ کے سامنے کچھ رائیں پیش کیں، اگر آپ ان پر غور فرمائیں گے، تو آپ اسی قسم کے اور فرق ادب اور صحافت کے درمیان اخذ کر سکیں گے۔ اس فرق پر دھیان رکھنا اس وقت بہت ضروری ہے کیونکہ ہمیں اپنے ادب کو اس رجعت کے دائرے سے نکالنا ہے، جو اس کو دیمک کی طرح سے کھائے جا رہی ہے، مگر ساتھ ساتھ ہم کو کسی پالیسی کے تحت آ کر اپنے ادب کو محض اس درجے پر نہیں چھوڑ دینا ہے، کہ وہ کسی خاص سیاسی پروپاگنڈے کا ذریعہ ہو کر ادب نہ رہے بلکہ صحافت ہو کر رہ جائے۔

گُل کدہ

ہندوستانی زبانوں کا ادب

آسامی :- میری محبوبہ

موتیوں کی مالا میں ابھی تک نہیں دیکھ سکی -
مَیں نے کئی بار اِس کا ذکر سُنا ہے -
میں نے اپنی محبوبہ کو بُلایا اور وہ مُسکرایا -
وُہ بھی مُسکرائی اور موتیوں کی مالا کا سُراغ مل گیا -
لال مُونگوں کی خُوبصُورتی -
ابھی تک تو مَیں دیکھ نہیں سکی -
مَیں نے مُونگوں کی طرف اشارہ کیا -
محبوبہ کے لال ہونٹوں کی طرف -
کہتے ہیں کہ کانٹوں کے بغیر گلاب نہیں ہوتا -
چُپ چاپ مَیں نے اپنی محبوبہ کے گانے سُن لئے
کہاں ہے وہ عجیب و غریب کنول
جو دن کو بھی کھلتا ہے اور رات کو بھی -
مَیں کچھ نہیں کہتا لیکن محبوبہ کی طرف اشارہ کرتا ہوں -
کون ہے وہ مُصوّر جس نے بنا دیا ہے -
محبّت کا خُوبصُورت مجسمہ -
مجھے پرواہ نہیں -
مَیں تو یہی جانتا ہوں کہ میری محبوبہ میرے دل کی زیبائش ہے -
(لکشمی ناتھ بیزبروا)

تلیگو :- شاعر کی دُعا

ماتا ! ہمیں پیٹ بھر روٹی تو کبھی ملی ہی نہیں -
چاہے ہم سُورج بھگوان کے طلُوع ہونے کے گیت گاتے ہیں -
ماتری سرپرستی کی نقل و حرکت تو ہمیں نظر نہیں آتی -
ہم ستار پہ میٹھی سُر سے جھنکار پیدا کرتے رہیں -
اُن پھُولوں کا حُسن ہی کیا -
جو شاخوں سے ٹُوٹ کر نیچے آگریں -
ماتا ! بھکشا دو
کرشنا ندی کے پانی میں غُسل کرتے ہوئے -
خوشی سے ناچتے ہوئے، پانی ہاتھ میں لیتے ہوئے -
ہمارے شاعر بھائی انتظار کئے جا رہے ہیں -
نئے میٹھے گانے گاتے ہوئے -
دیر نہ کرو - ماں کی محبت بخشو -
اُن بھٹکتے ہوئے لڑکوں کو جو جانا چاہتے ہیں -
ماتا ! بھکشا دو (ابدی رام کرشنا راؤ)

مراٹھی :- بہشت اور فانی دُنیا

سُورگ کے دیوتا دعا کرتے ہیں اے خُدا -
ہمیں اس دُنیا میں پیدا کر جو فانی ہے -
(سنت تُکا رام)

ہندی

پریشیش بہت ہے رات ابھی مت جاؤ
ادماتوں کی ایک نشا میں
ہوتی ہیں کئے گھڑیاں
آگ دبا رکھی ہے میں نے
جو چھوٹیں پھلجھڑیاں
پھر بھی یُگ سے تھوڑ سکے لے
تھوڑے سے شش میرے
پریشیش بہت ہے رات ابھی مت جاؤ

ادھر پُٹوں میں بند ابھی تک
تھی ادھروں کی وانی
ہاں نہ میں کھشرت ہو پائی
جس کی پڑھ لے کہانی
صرف بھومِکا تھی جو کچھ
سنکوچ بھرے پل بولے
پریشیش بہت ہے بات ابھی مت جاؤ
پریشیش بہت ہے رات ابھی مت جاؤ

(بچن)

مَیں اور تُو

وِینا کی جھنکار نہ ہوتی بھونروں کا گنجار نہ ہوتا
رُوپ جگت کے اُپدھانوں پر یدی میرا ادھیکار نہ ہوتا
تُونے تو اپنی اِچھا سے کیول پاشان بنائے
میری شردھا کے بھاؤ میں ہے اُن کا ساکار نہ ہوتا
جڑ ہو جاتی سدپ چیتنا تیری ماوس کے گھن تم میں
میرا مٹّی کا ننھا دیپک یدی اُس کا آدھار نہ ہوتا
تُونے کیول شبد دیئے تھے، مَیں نے گیتوں کی رچنا کی
کیسے تیرا نام چمکتا جو مجھ سا سنودن کار نہ ہوتا
تُونے آدم یُگ میں مجھ کو چھوڑ دیا تھا بیہڑ بن میں
میں یدی اپنا پتھ نہ بناتا، تیرا یہ سنسار نہ ہوتا
پرتھوی پر کس کا من ہرتے تیرے نیل گگن کے تارے
میری سہج کلپنا کا یدی جھنکرت اُر کا تار نہ ہوتا
تُونے اپنے من کی کر لی، مجھ کو سادھن ہین بنا کر
میں بھی یدی من کی کر پاتا، پھر کیا تُو کرتار نہ ہوتا

شمبھو ناتھ شیش

ترجمہ

اگر حُسن کی دُنیا پر میرا قبضہ نہ ہوتا تو نہ وِینا کی تاروں میں جھنکار ہوتی اور نہ بھونروں کے نغمے فضا میں گُونجتے۔
اے وہ! کہ تیری کوئی صورت نہیں۔ تُو نے اپنی خواہش سے فقط پتھر ہی بنائے تھے۔ اور اگر میری عقیدت کا فقدان ہوتا تو دُنیا کی نظروں میں تیری کوئی شکل نہ ہوتی تیری اماوس کے گہرے اندھیرے میں حُسن کا احساس جامد ہو کر رہ جاتا اگر میرا مٹی کا چھوٹا سا چراغ اُس میں اپنا نُور نہ بکھیرتا۔
تُو نے مجھے فقط لفظ دئے اور میں نے اُن سے نغموں کی تخلیق کی۔
مجھ ایسا نغمہ طراز نہ ہوتا تو تیرا نام کیسے چمکتا؟
تُو نے اِس دُنیا کے ابتدائی دَور میں مجھے ویران اور سنسان جنگل میں تنہا چھوڑ دیا۔ میں اگر اپنا راستہ آپ نہ بناتا تو تیرا یہ سنسار کہاں ہوتا؟
اگر میرے فطری تخیّل کا دل نہ دھڑکتا تو نیلے آسمان پر بکھرے ہوئے تیرے حسین تارے اہلِ زمین میں سے کِس کا دل لُبھاتے۔
تُو نے مجھے مجبور بنا کر جو چاہا سو کیا۔ اگر مَیں بھی اپنے دل کی کر لیتا تو پھر کیا تُو خالق نہ ہوتا۔

---

۱ باقی ۲ رات ۳ زمانے ۴ مقابلہ ۵ ملے ۶ ہوں ۷ کلام ۸ گونج ۹ پریم ۱۰ دیباچہ ۱۱ ہچکچاہٹ

پنجابی :-

اغوا شدہ عورت کی اپنے محبوب سے ملاقات

وفا دی داستان

لمبی ہے داستان اے
تے زخمی میری زبان .... وفا دی داستان

آج میں دل ہی صرف
قدماں دے وچ وچھاں دیاں
غربت دے گھر وچ اج ہے
محبت تیری مہمان .... وفا دی داستان

پکی ہے پیاراں دی وفا
پر حرف نے کچے جیہے
ڈردی ہاں رُٹھ جائے نہ
اے عشق مہربان .... وفا دی داستان

اج تاریاں دی لو نہیں
رات دی کالکھ دے وچوں
اج پھُٹدی پوہ نہیں
توں بھی ہیں اج، میں بھی ہاں اج
تو اوہ نہیں، میں اوہ نہیں
کیکن کراں گی میں ایہو
کیکن سُنیں گا توں ایہو
ثابت ثبوت روح دا
ہے جسم لہو لہان .... وفا دی داستان

لمبی ہے داستان اے
تے زخمی میری زبان
دسے گی دھرتی بول کے
دسے گا آسمان .... وفا دی داستان

(امرتیہ پریتم)

یہ ہے وفا کی داستاں

لمبی ادھر ہے داستاں
زخمی ادھر میری زباں .... یہ ہے وفا کی داستاں

دل ہی بچھاؤں آج میں
محبوب! تیری راہ میں
غربت کے گھر میں آج ہے
تیری محبت میہماں .... یہ ہے وفا کی داستاں

پکی ہے پیاروں کی وفا
الفاظ کچے ہیں مگر
ڈر ہے نہ مجھ سے ہو خفا
میرا یہ عشقِ مہرباں .... یہ ہے وفا کی داستاں

تاروں میں اب وہ لو نہیں
شب کی گھنی ظلمات سے
پھوٹی نہیں ہے پَو ابھی
تو بھی ہے اور میں بھی مگر
تو وہ نہیں میں وہ نہیں
کیونکر سناؤں میں اسے
کیونکر سنے گا تو اسے
ہے روح کی پاکیزگی
میرا یہ جسم خونچکاں .... یہ ہے وفا کی داستاں

لمبی ہے میری داستان
مجروح ہے مری زباں
تجھ کو بتائے گی زمیں
تجھ سے کہے گا آسماں ..... کیا ہے وفا کی داستاں

(ترجمہ از جگن ناتھ آزاد)

آرزو لکھنوی

غزل

محبت میں قدرِ دل و جاں نہیں ہے
کوئی مٹ بھی جائے تو احساں نہیں ہے

خدا جانے کیا کیا ستم اور ڈھائے
وہ قاتل نظر جو پشیماں نہیں ہے

جنوں کیا کرے کھیل کر دھجیوں سے
گریباں میں شانِ گریباں نہیں ہے

محبت وہیں تک ہے سچی محبت
جہاں تک کوئی عہد و پیماں نہیں ہے

ادا بکھرے بالوں میں الھڑپنے کی
پریشان کن ہے پریشاں نہیں ہے

تمنائیں لائی ہیں اس زندگی میں
جہاں کوئی جینے کا ساماں نہیں ہے

رضا جو ہوا آرزو جب سے تیرا
کسی حال میں بھی پریشاں نہیں ہے

بسمل سعیدی

یاد کرو

تم اپنے قول تم اپنے قرار یاد کرو
اور اُن پہ پھر وہ مرا اعتبار یاد کرو

جو مجھ پہ اب نہ رہیں اُن نوازشوں کی قسم
نوازشوں کے وہ لیل و نہار یاد کرو

تمام دن مری حسرت ہیں روزنِ در سے
نگاہِ شوق سوئے رہگزار یاد کرو

وہ شرم و شوق کے ہیجان ہیں شبِ مہتاب
تمام رات مرا انتظار یاد کرو

ذرا سکوت پہ میرے وہ ہو تو ہم تم سے
مری طرف نگہِ بیقرار یاد کرو

سنہری کرنوں سے جن میں بھرا تھا چاندنے رنگ
محبتوں کے وہ نقش و نگار یاد کرو

مری طرف سے بھی تسکین زہر تھی جس میں
وہ اضطرابِ دلِ بے قرار یاد کرو

جو میرے شانوں پہ گرتے تھے مست آنکھوں سے
شرابِ شوق کے وہ آبشار یاد کرو

وہ اِک ادا سے کبھی رُوٹھ کر کبھی مَن کر
بہ ہر بہانہ وہ ذوقِ کنار یاد کرو

مری خوشی سے نہ پی کر بھی پھر مری خاطر
ادا سے برلبِ پیمانہ پیار یاد کرو

بھلا چکے سو بھلا ہی چکے وہ اب بسمل
ہزار یاد دلاؤ ہزار یاد کرو

سرخوش عسکری طباطبائی

اعتراف

سانچے میں ظلم وجہل کے ڈھالے ہوئے ہیں ہم
مہمل تصورات کے پالے ہوئے ہیں ہم

مطلق لہو میں گرمیِ ذوقِ عمل نہیں
یوں بے حسی کی برف میں جھالے ہوئے ہیں ہم

ہر حسن کی طرف سے ہیں پھیرے ہوئے نگاہ
ڈورے ہر ایک عیب پہ ڈالے ہوئے ہیں ہم

مابینِ کائنات کفِ بحر کی طرح
ساحل پہ زندگی کے اچھالے ہوئے ہیں ہم

خونخوار دلوں کو چھپائے ہیں زیرِ پوست
سانپوں کو آستین میں پالے ہوئے ہیں ہم

عفریت ہوں درندے ہوں انسان تو نہیں
اس دائرے سے کب کے نکالے ہوئے ہیں ہم

ہر جوہرِ حیات پہ ڈالے ہوئے ہیں خاک
ہر داغِ زندگی کو اجالے ہوئے ہیں ہم

شامت سروں پہ آگئی اعمالِ زشت کی
گو اپنے وہم میں اسے ٹالے ہوئے ہیں ہم

تہذیب ایک کھوکھلی دیوار ہے جسے
کمزور بازوؤں پہ سنبھالے ہوئے ہیں ہم

جگن ناتھ آزاد

غزل

محبت پر کیا احساں کبھی تو نے کبھی میں نے
جفا کی داد دی تو نے وفا کی داد دی میں نے

کمالِ آرزو تو نے بھی جانِ آرزو دیکھا
تری ہر آرزو آخر تجھی کو سونپ دی میں نے

حرم والو! پرانے دوستو ایمان سے کہنا
بسر کی ہے تمہارے ساتھ کیسے زندگی میں نے

ہزاروں بار آیا ہے جنوں امداد کو لیکن
ہزاروں بار کھایا ہے فریبِ آگہی میں نے

خوشی پر مٹنے والو! پوچھنا مجھ سے کہ دیکھا ہے
کمالِ سرخوشی میں ہی مآلِ سرخوشی میں نے

بہارِ رنگ و بو نے ہر قدم پر دام پھیلایا
نہیں ہونے دیا دل کو اسیرِ دلکشی میں نے

منور کر لیا ہے داغِ دل سے راہِ منزل کو
کبھی مانگی نہیں شمس و قمر سے روشنی میں نے

یہی آنکھیں کہ ہیں دورِ خزاں کی اب تماشائی
انہیں آنکھوں سے دیکھی تھی بہارِ زندگی میں نے

فریبِ رنگ و بو کو بارہا نظروں نے ٹھکرایا
یہ مانا بارہا تیری کمی محسوس کی میں نے

عرش ملسیانی

یومِ غالب

لوگ کہتے ہیں کہ اجداد پرستی نہ کرو
یہ زمانہ نہیں اجداد پرستی کے لئے
کیف آور ہے ہر اک جرعۂ مے تازہ کا
مے کہنہ ہی تو لازم نہیں مستی کے لئے

صفحۂ دھر پہ چھوڑو نہ کوئی نامِ سلف
کارِ نیک اِس سے بڑا اور نہیں ہے کوئی
توڑ دو عظمتِ ماضی کے سبھی کہنہ صنم
نعرہ اب اِس کے سوا اور نہیں ہے کوئی

شور ہر سمت ہے اب وقت ٹھہرنے کا نہیں
نامِ اسلاف مٹاؤ تو بڑا کام کرو
کہنہ افکار کی تعمیر تو بوسیدہ ہے
اِس گھروندے میں نہ اب بیٹھ کے آرام کرو

لوگ کہتے ہیں کہ ناقص ہے ہر اک رسمِ کہن
سابق انداز سے تنظیمِ ریاست نہ رہے
لحظہ لحظہ متغیّر ہیں زمین اور زماں
کل جو تھا آج وہ آئینِ سیاست نہ رہے

ادبِ نَو کے تقاضے بھی کچھ ایسے ہیں کہ اب
کہنہ قدروں کے پرستار نہیں جی سکتے
ہنس کے کہتی ہے یہ برنائیِ افکارِ جدید
اے قدامت ترے بیمار نہیں جی سکتے

پھر بھی کچھ بات ہے یہ محض عقیدت ہی نہیں
لُطف دیتا ہے ہمیں عرفیؔ و طالبؔ کا کلام
مارکس کی مُہر نہیں اِس پہ، مگر اِس پر بھی
رُوح افزا و دِل افروز ہے غالبؔ کا کلام

سال نامہ آجکل

جدید اور لذیذ کھانے

ضمنی خوراک کا استعمال

مہنگائی اور راشن کے دنوں میں دسترخوان پر عام طور سے ہماری دل پسند غذائیں کم ہی ہوتی ہیں حالانکہ شکر قندی. دال اور مونگ پھلی کی کھلی جیسی سستی چیزوں سے بڑے مزے کے کھانے تیار ہوتے ہیں ذیل میں ایسی ترکیبیں دی گئی ہیں جن سے آسانی سے دسترخوان کی زینت اور لذت کام و دہن کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔

ست پڑا

اجزا

میدہ	ساڑھے چار چھٹانک
شکر قندی کا آٹا	سوا تولہ
مونگ پھلی کی کھلی کا آٹا	سوا تولہ
گھی	ڈھائی تولہ
نمک	حسب ذائقہ

پانی گھی اور چاشنی کے لئے آدھ پاؤ چینی

طریقہ - میدہ اور شکر قندی کے آٹے کو چھان کر ڈھائی تولہ گھی میں بھون لیں۔ ہلکا سا نمک ملا دیجئے۔ گھنٹہ بھر یہ گوندھا ہوا آٹا الگ رہنے دیجئے اور چکلے بیلن پر اس کی چھوٹی چھوٹی باریک پوریاں بنا لیں۔ اب پرت پرت کرکے اس کی دوبارہ پوری بنا کر گھی میں اتنا تل لیجئے۔ کہ ہلکی سی لال ہو جائیں اور اب انہیں ایک تار کی چاشنی میں ڈال دیجئے۔ نکال کر دسترخوان پر چن دیجئے۔

گلاب جامن

اجزا -

کھویا	آدھ سیر
میدہ	ڈیڑھ چھٹانک
شکر قندی کا آٹا	ڈیڑھ چھٹانک
چاشنی کے لئے چینی	آدھ سیر
گھی	

طریقہ - میدہ اور شکر قندی کا آٹا چھانئے اور کھوئے کے ساتھ گوندھ لیجئے۔ اب اس کی گلاب جامنیں بنا کر گھی میں تل لیجئے اور جب خوب سرخ رنگ کی ہو جائیں۔ تو نکال کر ایک تار کی چاشنی میں ڈال دیجئے۔ تین چار گھنٹے میں نکال لیجئے۔ گلاب جامن تیار ہیں۔

آئندہ اشاعت کے متوقع مضامین

پردیسی کے خطوط	پروفیسر مجنوں گورکھپوری

جناب مجنوں گورکھپوری کا یہ سلسلۂ مضامین 'آج کل' میں شائع ہوگا۔ ان خطوط میں آپ مشہور ادبی ہستیوں کا تنقیدی جائزہ لیں گے

اقتصادیات اور فنونِ لطیفہ	پروفیسر ہمایوں کبیر
قیصری فیروزپوری	نندکشور اختر
اچھی اور بری صورتیں (فیچر)	انتصار زیبتوی
دنیا کا شہری ٹیگور	پروفیسر دیوان چند شرما

ناشتہ ہو یا دعوت

ہر موقعہ پر پھلوں کے یہ لذیذ مربّے اور آچار آپکے کھانے کو لذیذ تر اور پُر لطف بنائیں گے اب یہ سائینٹفک طریقے پر بغیر ہاتھ لگائے ڈبوں میں بند کئے جاتے ہیں اِس لئے عرصہ دراز تک تر و تازہ رہتے ہیں +

ہر شہر میں دستیاب ہو سکتے ہیں

ہمیشہ شیر مارکہ لیبل دیکھ کر خریدیئے۔ جو بہترین کوالٹی کا ضامن ہے

HG
THE HALL MARK OF QUALITY

ہرنارائن گوپی ناتھ کھاری باؤلی دہلی [illegible]
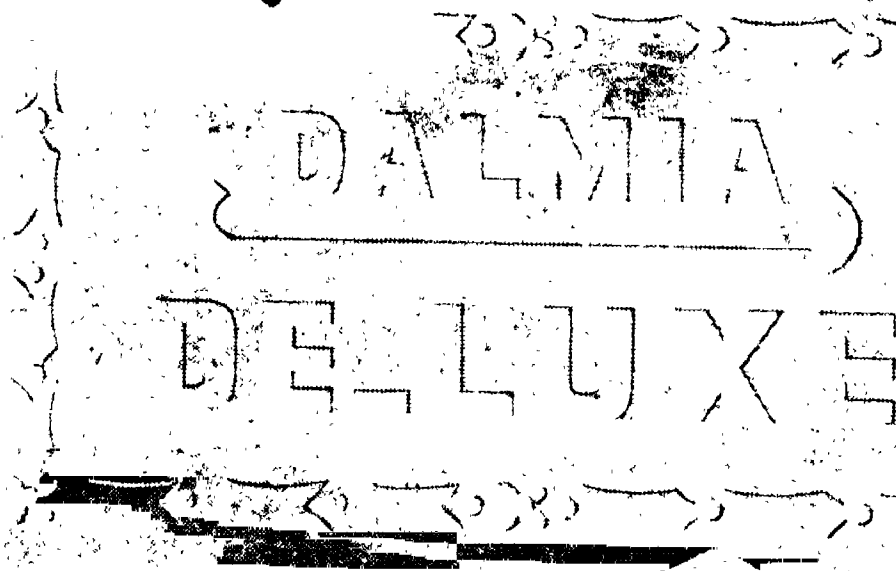
پیکنگ کے متعلق چند ضروری باتیں
(۱) مال کو مضبوط بکسوں میں بند کیجیے اور اگر ممکن ہو تو نئے بکس استعمال کیجیے۔ کیلیں ذرا احتیاط سے ٹھونکیے۔
(۲) مال کو صدمہ یا کسی قسم کے نقصان سے بچانے کے لیے بکس میں چاروں طرف لہریادار کارڈبورڈ۔ لکڑی کی چھیلن یا اسی قسم کی دوسری چیزیں ضرور پھیلا دیجیے
(۳) اگر پانی پہنچنے سے مال خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو بکس میں چاروں طرف واٹر پروف کاغذ وغیرہ لگا دیجیے۔
(۴) مال پانے والے کا نام اور پتہ ایک فاضل لیبل پر صاف تحریر میں لکھ کر بکس کے اندر رکھ دیجیے۔
(۵) بکس پر اگر پہلے کے نشانات یا لیبل وغیرہ موجود ہوں تو ان کو بالکل صاف کر دیجیے۔
(۶) بکس پر نئے لیبل لگائیے اور ان پر نام۔ نشان پتہ وغیرہ صاف۔ واضح اور نہ مٹنے والے حروف میں لکھیے۔
(۷) مال پانے والے کا پتہ اور اسٹیشن کا نام بکس پر چھاپ دیجیے۔
(۸) بکس جس حالت میں رکھا جانا مطلوب ہو اس کو ظاہر کرنے کیلئے بکس پر "ادھر کی طرف اوپر" رکھو وغیرہ کے الفاظ لکھ دیجیے
(۹) بکس میں جس قسم کا مال ہو اسے بکس پر لکھ کر ظاہر کر دیجیے مثلاً "شیشہ"۔ "آگ پکڑ لینے والا" یا "نازک شے"
آپ کا مال اور پی (پیک) ایل (لیبل) ایم (مارک) کی سنبھال
کے اصول کو نہ بھولیے
انڈین گورنمنٹ ریلویز نے شائع کیا

ہر مہینے کی پہلی اور پندرھویں تاریخ کو شائع ہونے والا

مصوّر رسالہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹرز:- عرش ملسیانی

جگن ناتھ آزاد

بلونت سنگھ

ترتیب

اِس شمارے کے لکھنے والے

میکش اکبرآبادی۔ اکبرآباد کے صوفی منش اور صاف باطن شاعر و ادیب

مجنوں گورکھپوری۔ اردو کے صفِ اوّل کے نقاد۔ بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر

غلام رسول نازکی۔ جنتِ کشمیر کے نازک خیال شاعر

ہمایوں کبیر۔ مرکزی وزارتِ تعلیم میں جائنٹ ایڈوائزر، مشہور قوم پرست مسلمان، قابل پروفیسر اور بلند مرتبہ ادیب۔

نند کشور اخگر فیروزپوری۔ وکیل، مجسٹریٹ، رئیس، شاعر، ادیب وغیرہ

صفی لکھنوی۔ لسان القوم، اردو کے شعرا میں سب سے معمر شاعر، بزم لکھنؤ کی آخری شمع، عزیز لکھنوی کے استاد، جوش ملیح آبادی کے دادا استاد۔

انتصار نیوتنوی۔ اصول پرست نوجوان افسانہ نگار، آپ کے مختصر ڈرامے اہلِ نظر سے دادِ تحسین حاصل کرتے رہے ہیں۔

باقر رضوی۔ ایک کامیاب ترقی پسند ادیب و شاعر

دیوان چند شرما۔ انگریزی علم و ادب کے مشہور پروفیسر، مشرقی پنجاب یونی ورسٹی کے ایک ممتاز رکن۔

بشن داس نادر کپور تھلے کی شاعر خیز سرزمین کے ایک نوجوان شاعر تخلص حسبِ حال ہی نہیں حسبِ صورت بھی ہے۔

جلد ۵ ——— نمبر ۲

سالانہ چندہ ——— نو روپے

فی پرچہ ——— چھ آنے

یکم ستمبر ۱۹۴۹ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس [illegible] دہلی

میکش اکبر آبادی

دل اور حُسن

(۱)

زمیں پر جس طرح اڑتا ہوا سایہ پرندوں کا / نظر کے ساتھ ہو جاتا ہے گم ساکن دھندلکوں میں
نگاہیں آخر آ جاتی ہیں واپس اپنے مرکز پر / پرندے تھک کے گر جاتے ہیں اپنے آشیانوں میں
تصور کی فضا میں عکس رہ جاتا ہے سایے کا / پرندے ہیں فضاؤں میں نہ سایہ ہے نگاہوں میں
مرے دل اور تمہارے حُسن کا ایسا ہی عالم ہے

(۲)

کرن سُورج کی جیسے صبحدم آتی ہے گلشن میں / گلوں پر گوہرِ شبنم کو پا کر مُسکراتی ہے
گلوں کے رُخ سے اُڑ جاتا ہے آب و رنگ شبنم کا / پشیمانی کی لہروں میں کرن بھی ڈوب جاتی ہے
تخیل کے چمن میں ذکر رہ جاتا ہے شبنم کا / کرن ہی مُسکراتی ہے نہ شبنم جگمگاتی ہے
مرے دل اور تمہارے حُسن کا ایسا ہی عالم ہے

(۳)

شفق کی دُھن میں مل جاتی ہے جب لَے کوہساروں کی / زمیں پر سنگ ریزے مور بن کر ناچ اُٹھتے ہیں
شفق کا خون کر دیتی ہے جب مضرابِ تاریکی / فضا کے سَم سے رقصاں سنگریزے چونک پڑتے ہیں
شفق کی یاد رہ جاتی ہے قلبِ لالہ و گل میں / نہ لَے ہے کوہساروں میں نہ رقصاں سنگریزے ہیں
مرے دل اور تمہارے حُسن کا ایسا ہی عالم ہے

(۴)

زمیں پر پھول برساتے ہیں جب برسات کے بادل / ہزاروں روپ لے کر زندگی سونا اُگلتی ہے
خزاں کا اشتراکی لال جھنڈا لے کے آتا ہے / چمن سے امتیازِ خار و گل کی دھوپ ڈھلتی ہے
گلوں کا دھیان رہ جاتا ہے دل میں خشک پتوں کے / بدل جاتا ہے عالم ہی ہوا جب رُخ بدلتی ہے
مرے دل اور تمہارے حُسن کا ایسا ہی عالم ہے

(۵)

بدل جاتا نہیں لیکن مزاجِ شاہدِ ہستی / زمیں کے سرد ہونے پر بھی لاوا دل میں بہتا ہے
ہزاروں نکہتیں رہتی ہیں غلطاں خاکِ گلشن میں / خزاں کے دور بھی گلشن کو صحرا کون کہتا ہے
ردائے شام میں ہوتا ہے روئے صبح پوشیدہ / شکستہ ساز میں بھی نغمہ برباد رہتا ہے
مرے دل اور تمہارے حُسن کا ایسا ہی عالم ہے

مجنوں گورکھپوری

"پردیسی کے خطوط"

جگر مرادآبادی

میری اچھی ناہید

تین چار روز ہوئے ایک خط روانہ کر چکا ہوں۔ خط کاہے کو تھا ایک پورا دفتر تھا۔ مگر شاید "بے معنی" نہ رہا ہو۔ آج تمہارا مختصر خط کئی جگہ مل کی سیر کرتا ہوا یہاں مجھے ملا۔ اس میں کوئی خاص بات تو نہیں تھی لیکن اس کو کیا کہئے کہ تمہارے مختصر سے مختصر خط سے مجھے زندگی کی پھر سے ڈھارس بندھ جاتی ہے۔ حالانکہ بہت جلد یہ بھی احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ سب میرا اپنا التباس ہے۔ جس کی بنیاد فرار اور پناہ گزینی کے انحطاطی اور مریضانہ میلان پر ہے۔ میرے قویٰ مائل بہ آرام ہیں اور میں تمہارے پہلو میں پناہ لے کر سونا چاہتا ہوں اور کچھ نہیں۔

تم مجھے بار بار اپنی محبت کا یقین کیوں دلاتی ہو؟ میں تمہاری محبت پر ایمان لا چکا ہوں۔ لیکن میں اس محبت سے ڈرتا ہوں۔ اپنے لئے نہیں تمہارے لئے۔ میں تو خیر برے بھلے اپنی زندگی کی میعاد کا کافی حصہ پورا کر چکا ہوں۔ اور تم ایک نورس پھول ہو۔ اور محبت ایسی دنیا میں جہاں ابھی اتنی گندگیاں پھیلی ہوئی ہوں ایک خطرہ ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ ہماری یہ والہانہ وابستگی تمہارے حق میں جھلسا دینے والی باد سموم نہ ثابت ہو۔ مجھے اگر جھلسا بھی دے تو کیا پروا۔ مجھے یوں بھی جھلسنا ہی رہ گیا ہے۔ کوئی اور جھونکا نہ سہی یہی جھونکا سہی۔

تم لکھتی ہو کہ تم نے مجھ کو اپنا تصور بنا لیا ہے اور میرے خیال میں زندگی گزار دینا اور زندگی بھر میرے اشاروں پر چلنا تمہاری زندگی کا ایک ایسا مقصد ہے جو اس کی اندرونی ترکیب میں داخل ہے۔ یہ سن کر مجھے اتنی مسرت نہیں ہوتی جتنی کہ ہونی چاہئے اس لئے کہ اندیشہ ہے کہ ایک بڑھتی اور پروان چڑھتی ہوئی زندگی کہیں گھٹ کر فنا نہ ہو جائے

تم نے جگر مرادآبادی کا جو شعر درج کیا ہے آج مجھے اس میں ایک تازہ لذت ملی ورنہ شعر بہت معمولی اور سستا تھا۔

> تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ملی
> وہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی

تم نے اپنی معصومیت کے باعث جو صداقت اور جو عنصری توانائی اس کے اندر بھر دی ہے، وہ شاعر بھی اپنی ساری تخلیقی قوت کے باوجود اس میں نہیں پیدا کر سکا تھا۔ لیکن یہ صداقت، یہ خلوص، یہ معصومیت یہ بےساختہ گرویدگی کہیں تم کو نہ مٹا دے۔ میں اس خیال سے اندیشہ ناک ہوں۔ مجھے جگر کی اسی غزل کا ایک دوسرا شعر یاد آ گیا۔

> ادھر سے بھی ہے سوا کچھ ادھر کی مجبوری
> کہ ہم نے آہ تو کی ان سے آہ بھی نہ ہوئی

تم مجھ سے کچھ زیادہ مجبور ہو۔ اسی لئے ڈر ہے کہ ہماری یہ تخیلی رفاقت کہیں مجھ سے زیادہ تم کو نہ خراب کر دے۔ جگر کے اس شعر میں آج بھی مجھے ایک ایسی خطرناک صداقت محسوس ہو رہی ہے جو ہر زمانہ میں نہ جانے کتنے سچے چاہنے والوں پر تباہیاں لا چکی ہے۔ تم نے جگر کی اس سلسلے میں بڑی تعریف کی ہے اور جو کچھ کہا ہے ایک طرح سے ٹھیک ہی ہے۔ لیکن میری رائے بھی پوچھتی ہو۔ میں کیا بتاؤں ناہید اوّل تو اس وقت میری تشفی اردو کے کسی غزل گو شاعر سے نہیں ہو رہی ہے۔ میں تغزل کو شاعری کا فطری جوہر سمجھتا ہوں۔ غزل کی گونج تربیت یافتہ انسانیت کی ایک بہت مبارک اپج ہے جو ساری انسانی دنیا کو سنوار سکتی ہے۔ لیکن ہمارا غزل گو چاہتا ہے کہ بغیر خلقت کو سنوارے اور بغیر دنیا کو زیادہ حسین اور نیک بنائے ہوئے افراد کی زندگی کو بامراد اور

شاد دیکھیے جو ایک استحالہ ہے۔ اور پھر بڑی قباحت یہ ہے کہ غزل کے معیار سے ساری شادی، اور ساری بامرادی ایک جذبۂ محبت کی آسودگی پر منحصر ہے جو زندگی کا نہایت کھوٹا تصور ہے۔

اور جگر کے اشعار تو ہم کو اور بھی ناآسودہ چھوڑ دیتے ہیں اس لئے کہ اُن سے ہماری جلد اور ہمارے اعصاب اور پٹھوں میں ایک بیچینی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بیچینی کچھ نیا انداز لئے ہوئے ہوتی ہے۔ مگر اس سے آگے کچھ نہیں ہوتا۔ جگر کی شاعری بہت سطحی شاعری ہے۔ نامرادی اور بیچارگی کے احساس نے ان کے وہاں کچھ نئے عنوان کی نرمیاں ضرور پیدا کر دی ہیں ورنہ وہی اوتلے درجے کا بوس و کنار وہی سستے قسم کی لذتوں کی ہوس جو حفیظ جونپوری وغیرہ کی شاعری میں عام ہے جگر کے وہاں بھی ملتی ہے۔ البتہ جگر کے کلام میں ایک تلملاہٹ بھی پائی جاتی ہے۔ جو ان لذتوں کے میسّر نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔ اس تلملاہٹ کو انہوں نے اپنے لئے لذّت بنا لیا ہے۔ اسی لئے اس پر سوز و گداز کا دھوکا ہوتا ہے۔ ناقد جگر کی شاعری میں جو نیا پن ہے اس کا تعلق دراصل انداز اور اسلوب سے زیادہ ہے فکر و احساس سے کم ہے۔ اور جدید اردو غزل میں یہی اسلوب جگر کا اضافہ ہے۔

بعض نقّادوں کا خیال ہے کہ جگر کی غزل سرائی قدیم تغزّل اور موجودہ رنگین نگاری کا مخلوط نمونہ ہے۔ یہ رائے بہت صحیح ہے۔ کلیم الدین نے ان کی شاعری کو قدیم و جدید رنگ تغزل کا ایک مضحک نمونہ بتایا ہے۔ میں کلیم الدین سے متفق نہیں۔ جگر کی شاعری جو کچھ بھی ہو وہ کبھی مضحک نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے دونوں رنگوں کو ملا کر ایک ایسا نمونہ طیار کر لیا ہے جو ایک انفرادی دلکشی اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ دلکشی سطحی اور عارضی ہے۔ لیکن ان کے کلام کا ایک اپنا قرینہ ہوتا ہے۔ جو ہم کو اپنی طرف تھوڑی ہی دیر کے لئے سہی مائل کر لیتا ہے۔ جگر کی شاعری کا شجرہ داغ سے ملتا ہے۔ داغ اور بعد مشؔ داغ کے دوسرے شاعروں کی طرح جگر کی شاعری بھی محض عاشقانہ ہے۔ اور عاشقانہ بھی کچھ جسمانی اور سطحی معنوں میں۔ انہوں نے وارداتِ عشق اور معاملاتِ حسن و عشق کے دائرے سے باہر قدم رکھنے کی کبھی جرأت نہیں کی۔ اُن کے کلام میں فانی کا حکیمانہ میلان یا اصغر کا تصوف نہیں ملتا اور نہ ان کے وہاں عزیز کی نوحہ گری سننے میں آتی۔ مگر اپنے محدود دائرے میں جگر کی شاعری ایک نئے انداز کی رومانیت لئے ہوئے ہوتی ہے۔ جگر کی شاعری کا انداز غزل کے دائرے میں یقیناً نرالا ہے۔ کچھ تو اس لئے مگر زیادہ تر اپنی والہانہ گم شدگی اور مدہوشانہ رِندگی کی وجہ سے جس دن اُن کی آواز بلند ہوئی۔ اس دن سے لے کر آج تک جگر اردو غزل کی نئی نسل پر خطرناک حد تک اثر ڈالتے رہے ہیں۔ آج ہر نوجوان غزل لکھنے والا ارادی یا غیر ارادی طور پر کوشش کرتا ہوا نظر آتا ہے کہ وہ ظاہری ہئیت، شعر کے لہجے اس کے موضوع اور اسلوب اور شعر پڑھنے کی دُھن کے لحاظ سے جگر سے قریب ترین مشابہت پیدا کرے۔ یہ جگر زدگی ہمارے لئے کچھ سزاوار نہیں ثابت ہوئی۔ اُردو غزل نظم کی طرح آگے بڑھنے کے عوض اپنی جگہ کچھ رکی رکی سی معلوم ہو رہی ہے۔ اس کے جہاں اور اسباب ہیں وہاں ایک سبب جگر بھی ہیں۔ جگر سے ہم کو اس کا مواخذہ کرنا ہے اور وہ اس کے جواب دہ ہیں۔ اردو غزل میں ابھی تک انقلاب اور ترقی کے عناصر اس طرح داخل نہیں ہو سکے ہیں جس طرح نثر و نظم کی اور صنفوں میں داخل ہو گئے ہیں۔ آج بڑے سے بڑا ترقی پسند غزل گو شاعر جگر سے کچھ ہی مختلف ہے۔ ہم اب تک شکست خوردگی اور پامالی کو اپنے لئے ایک لذت بنائے ہوئے ہیں۔ "رومانی سودائیت" غزل کے مزاج میں اب تک داخل ہے۔ غزل اب تک محرومی اور غمناکی کو ہمارے لئے نہ صرف گوارا بلکہ لذیذ بنا کر پیش کر رہی ہے۔ اس کی ذمہ دار اگر ایک طرف غزل کی فطری تقلید پسندی ہے تو دوسری طرف جگر کی شاعری بھی ہے۔ ذرا ان اشعار کو سنو

صبا یہ اُن سے ہمارا پیام کہہ دینا
گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی

ستم یار کی دہائی ہے۔ نگہ التفات نے مارا
الٰہی ترکِ محبت بھی کیا محبت ہے

بھلاتے ہیں انہیں وہ یاد آئے جاتے ہیں
ہائے یہ مجبوریاں محرومیاں ناکامیاں
عشق آخر عشق ہے تم کیا کرو ہم کیا کریں

دل گیا رونقِ حیات گئی　　　غم گیا ساری کائنات گئی

جب سے اس نے پھیری ہیں نظریں رنگِ تباہی آہ نہ پوچھ

سینہ خالی آنکھیں ویراں دل کی حالت کیا کہئے

دل کو برباد کرکے بیٹھا ہوں　کچھ خوشی بھی ہے کچھ ملال بھی ہے

بس ایک سمت اڑا جا رہا ہوں وحشت میں

خبر نہیں کہ خودی کیا ہے بیخودی کیا ہے

جس دل کو تم نے لطف سے اپنا بنا لیا

اس دل میں اک چھپا ہوا نشتر ضرور تھا

اور پھر یہ دوسروں کے اشعار پڑھو

یوں تو افسانۂ الفت تھا ازل سے رنگیں

میں نے کچھ اور بھی رنگین بنانا چاہا

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے

سب کے تو گریباں سی ڈالا اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے اب ان کی جفا کو کیا کہئے

اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیکِ رگِ جاں بھول گئے

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی

اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

ختم شورِ طوفاں تھا دور تھی سیاہی بھی - دم کے دم میں افسانہ تھی میری تباہی بھی

ہم سے زندہ تھی زندگی کل تک　　　آج ہم زندگی کے مارے ہیں

ہم سے پوچھو بہارِ جلوۂ دوست　　　ہم نے فرقت کے دن گزارے ہیں

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں　　　خیر تم نے تو بیوفائی کی

غرضکہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست

وہ تیری یاد میں ہو یا تیرے بھلانے میں

صاف محسوس ہوتا ہے کہ تانت وہی ہے راگ وہی ہے بعض انگلیوں کی حرکت کا انداز اور کسی قدر ساز کی جھنکار بدلی ہوئی ہے جس سے ہم کو کچھ دھوکا ہو جاتا ہے ۔ میں یہ تمام اشعار حافظے سے لکھ رہا ہوں اور یہ اشعار ایسے شاعروں کے ہیں جو شاعری کی دنیا میں اپنی جگہیں بنا چکے ہیں ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان اشعار کی کوئی قدر نہیں ۔ انسان کی انفرادی زندگی میں تخیل کی ناکامیاں اکثر رہیں گی اور ان کا اظہار بھی کیا جائے گا ۔ لیکن مجبوریوں اور ناکامیوں کو زندگی کا ایک مستقل راگ بنائے رہنا اور اسی کو برابر الاپتے رہنا یہ تو کوئی اچھی علامت نہیں ہے ۔ ان اشعار کو پڑھ کر میں بھی تڑپ اٹھتا ہوں ۔ مگر محض تڑپ اٹھنا اور تڑپ کر رہ جانا تو زندگی کا سب سے بڑا مقصد نہیں ہے ۔ میں غزل میں یہ بھی چاہتا ہوں اور اس کے علاوہ بہت کچھ اور بھی ۔

کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

بہرحال جگر خود اپنی شاعری کے ساتھ ایک دلچسپ ہستی ہیں اور ان کی شاعری اردو غزل میں نیا موضوع نہ سہی نیا عنوان ضرور ہے جس کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ وہ اگر اپنے زمانہ سے پہلے پیدا ہوتے تو شاید دوسرے داغ ہوتے ۔ اُن کے دیوان میں اکثر ایسے شعر نکل آتے ہیں ۔ جو جرأت سے لے کر داغ تک کوئی شاعر بھی کہہ سکتا تھا ۔ مثلاً ایک شعر سنو ۔

تو جہاں ناز سے قدم رکھ دے

وہ زمین آسمان ہے پیارے

بے اختیار منہ سے واہ نکل جاتی ہے ۔ لیکن یہ شعر کوئی بھی کہہ سکتا تھا ۔ لیکن اسی غزل کا یہ شعر جدید ذہن کی ذکاوت لئے ہوئے ہے ۔

جب سے تو مہرباں ہے پیارے

اور دل بدگماں ہے پیارے

جگر محض داغ ہو کر نہیں رہ سکتے تھے ۔ زمانہ بدل چکا تھا اور ہماری نفسیات زیادہ پیچیدہ ہو چکی تھی ۔ ہمارے اندر وہ نیا میلان عام ہو چکا تھا جس کو "آرزومندی" کہتے ہیں ۔ جس کے آثار غالبؔ اور مومنؔ کے کلام میں ملتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں ۔ کہ ہم اپنے دل اور دماغ کے حالات و واردات کے صرف تابع نہیں ہیں ۔ بلکہ ہمارے اندر یہ تحریک بھی کام کر رہی ہے ۔ کہ ہم ان حالات و واردات کو سمجھیں ۔ اور اشاروں میں اس آرزو کا بھی اظہار کریں کہ صورتِ حال اگر بدل جائے تو بہتر ہے ۔ موجودہ دور میں اس پُرتامل آرزومندی کی جھلک کم و بیش ہر اردو شاعر کے کلام میں ملتی ہے ۔ داغ سے جو ترکہ جگر نے پایا ہے ۔ وہ عشق کی آزمودہ کاری ہے ۔ عشق کے جذباتی آثار، چڑھاؤ اور حسن کی اداؤں

کے تلون اور تنوع اور معاملات حسن و عشق کے ناقابل تشریح رموز و نکات
کو جگر بھی اسی کا رنگ بانہ اعتماد کے ساتھ سمجھتے اور سمجھاتے ہیں۔ جو داغ
کا خاص اکتساب تھا۔ لیکن جگر کے لہجے یا انداز میں وہ عامیانہ پن یا
ابتذال نہیں آنے پاتا جو داغ کے مزاج اور ان کی شاعری کی ترکیب میں
داخل ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے۔ کہ جگر سے وہ نئی ذہنیت
شروع ہو جاتی ہے جو نئے دور کی اصل روح ہے۔ قدامت پرست
طبقہ اور اکثر وہ لوگ جو نہ قدامت پرست ہیں نہ ترقی پسند نوجوان
ادیبوں پر عریانی کا الزام لگاتے ہیں۔ ان کو ہر نئے ادیب کے وہاں اور
کوئی عیب نہ سہی عریانی ضرور نظر آتی ہے معلوم نہیں عریانی سے ان
کی اصل مراد کیا ہے۔ صحیح اور صالح نوجوانوں میں جذباتی آزادی ضرور
پائی جاتی ہے۔ ان کے کردار و گفتار میں وہ جنسی سچائی اور بے باکی
ضرور ہوتی ہے۔ جو فطرت کا ایک نہایت معصوم تقاضا ہے۔ اگر یہ
عریانی ہے۔ تو یہ عریانی اس رکاکت اور ابتذال۔ اس بازاری سستے پن
سے بہتر اور زیادہ قابل قبول ہے۔ جن سے قدما کے اقوال و افعال
پاک نہیں ہیں۔ بہرحال بحث جگر کی شاعری سے ہے۔ اور جگر کے
وہاں نہ عریانی ہے نہ ابتذال۔

جگر جس وقت حسن و عشق کے میل اور ایک دوسرے کے ساتھ
رفیقانہ اور ہمدردانہ برتاؤ کا ذکر کرتے ہیں۔ اس وقت بھی ان کے لہجے
میں جو خود باختگی اور تڑپ ہوتی ہے۔ اس کا داغ اور مدرسۂ داغ کی
شاعری میں کہیں پتہ نہیں ہے۔ اور نہ ہو سکتا تھا۔ جگر کی شاعری
میں جو روحانی دردمندی ہے۔ وہ کچھ ہمارے ہی دور کی چیز ہے۔
جگر کے لئے عشق کیا کامیاب کیا ناکامیاب مقصود بالذات ہے اور
عشق کا تجربہ ان کے تصور میں زندگی کا سب سے بڑا حاصل ہے۔ جگر کا
عقیدہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ عشق کی ناکامیوں میں دکھ تو ہوتا ہی ہے
مگر عشق کی کامیابیاں بھی صاحب عشق کے لئے ایک رسے ہوئے درد
کے احساس سے خالی نہیں ہوتیں۔ جگر کا پیغام یہ نہیں ہے۔ کہ ہم
اس درد کے احساس سے پناہ مانگنے لگیں۔ بلکہ ان کے تیور یہ
بتاتے ہیں۔ کہ ہم کو عشق کی الم ناکیوں اور تلخ کامیوں سے پوری
لذت حاصل کرنا چاہیئے۔ اور وصل ہو یا فراق دونوں کو اپنے حق میں
برکت سمجھنا چاہیئے۔

شکست میں فتح کے انداز پیدا کرنا غزل کا بہت پرانا دستور ہے۔
لیکن جگر کو اس معاملے میں امتیاز حاصل ہے۔ ان کی شاعری میں عشق کی
بندگی اور بیچارگی حسن کی تمام جابرانہ استبدادیت پر طنز کے ساتھ مسکراتی
نظر آتی ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ کہ جس وقت جگر وصل کے لمحوں یا
اس کی لذتوں کا بیان کرتے ہیں۔ اس وقت بھی ان کے لہجے میں ایک اندرونی
لہر کے طور پر دردمندی کا ایک شائبہ ہوتا ہے۔ اور جس وقت وہ محبت
کی ناکامیوں اور تلخیوں کا اظہار کرتے ہیں، تو ان کے لہجے میں ایک
محسوس بشاشت ہوتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنی نامرادی
سے بھی خوش ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جگر کا ایمان یہ ہے کہ اگر
عشق کی محرومیاں ہی میسر ہو جائیں۔ تو بھی بہت بڑی خوش قسمتی ہے۔

جگر کی شاعری میں فکر و تامل کا کوئی میلان نہیں ہوتا۔ وہ زندگی
کے عام انسانی اور کائناتی اسرار و رموز پر کوئی سوچی سمجھی رائے نہیں رکھتے
ان کی شاعری خالص جذباتی شاعری اور اس جذباتی شاعر کا دائرہ بھی
عشق کے موضوع تک محدود ہے۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے۔ کہ جگر داغ کی
ایک مہذب اور تربیت یافتہ صورت ہیں۔ تو شاید نامناسب نہ ہوگا۔ جگر
کو داغ کے ساتھ وہی نسبت ہے۔ جو فانی کو بیک وقت میر اور غالب
دونوں کے ساتھ تھی۔ داغ کی شاعری کی طرح جگر کی شاعری کی کائنات
بھی محدود ہے۔ مگر فرق یہ ہے۔ کہ جگر کی کائنات شعری داغ کی کائنات
شعری سے زیادہ مہذب اور شائستہ ہے۔ اور ان کے وہاں جو صحت
احساس اور نفاست بیان پائی جاتی ہے۔ وہ داغ کو کبھی خواب میں
بھی میسر نہیں ہو سکتی تھی۔ داغ کے شاگردوں اور مقلدوں کی تعداد بے
شمار ہے۔ لیکن ان کے کسی شاگرد نے نہ تو ان کے رنگ کو نکھارا اور نہ
اس رنگ میں اپنی کوئی انفرادی شان پیدا کی۔ جگر کی شاعری داغ کی
شاعری کا نیا نکھار ہے۔ اور پھر اس کے اندر ایسی سچی اور تیز رنگ کی
انفرادیت بھی موجود ہے جس کو ہم صرف جگر کے ساتھ منسوب کر سکتے
ہیں۔ اور جس کی بنا پر جگر کی شاعری ہم کو اردو غزل میں ایک بالکل نیا
باب معلوم ہوتی ہے۔

یوں تو جگر کا انداز بالکل ان کا اپنا ہے۔ اور اس کو کسی دوسرے شاعر

سے بہت زیادہ قریب کی نسبت نہیں ہے۔ لیکن جس طرح داغ کا اثر
ان کے کلام میں سمویا ہوا ملتا ہے۔ اسی طرح خیال کی نفاست احساس
کی نزاکت اور بیان کی صوفیانہ رنگینی میں وہ کبھی کبھی اصغر کی یاد دلاتے
ہیں۔ مگر چونکہ اصغر کے متصوفانہ مزاج سے جگر کو کوئی واسطہ نہیں ہے
اس لئے اصغر اور جگر کے درمیان جو کچھ بھی نسبت یا مشابہت ہے وہ
کھو کر رہ جاتی ہے۔ جگر کے اشعار میں کسی قسم کی گہرائیاں نہیں ہوتیں
ان کے وہاں ایک تھما ہوا جذباتی ہیجان ضرور ہوتا ہے۔ جس کو ہم اکثر
کیف سمجھ لیتے ہیں۔ یہ جذباتی ابھار اپنی نوعیت کی بالکل نئی چیز ہے۔ مگر
اس سے ہمارے دل کی گہرائیاں آسودہ نہیں ہوتیں جگر کے اشعار
سن کر ہم تلملا بھی اٹھتے۔ اور جھوم بھی جاتے ہیں۔ لیکن جب تامل
کے ساتھ اس اثر کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ سارا اثر بس
جلد تک محدود تھا۔ سوا ایک پھریری کے کچھ تھا ہی نہیں۔ جگر
زندگی وہ بھی عشقیہ زندگی کے عارضی لمحات کے شاعر ہیں۔ ان کے اشعار
ہمارے دل و دماغ یا ہماری روح کی اندرونی تہوں کو نہیں چھو پاتے
لیکن آخر جگر سے ہم نے کیا پایا؟ یہ تو میں کہہ چکا ہوں۔ کہ جگر کو حکمت و
اخلاق سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ کائنات اور انسانی زندگی کے
اسرار و رموز کو سوچنے سمجھنے کی نہ ان کے اندر تاب ہے۔ اور نہ ان کو
اس کی فکر کہ وہ زندگی کی ان گہرائیوں اور بلندیوں کا جائزہ لیں۔ ان
کی شاعری کوئی پیغام نہیں ہے۔ اور نہ ہو سکتی تھی۔ غزل کی شاعری
یوں بھی پیغام بننے کی صلاحیت کم رکھتی ہے۔ لیکن جگر کے مزاج میں
ایک معصوم بے باکی اور ایک فطری بے حجابی تھی اس لئے ان کی زندگی
اور شاعری دونوں ریا اور تصنع سے کافی حد تک پاک رہیں۔ میں اب
سے دس بارہ سال پہلے کے جگر کا ذکر کر رہا ہوں۔ بہر حال جگر کی شاعری
میں نفسیاتی مزاحم اور جذباتی رکاوٹوں کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ اس سے
در پردہ غیر شعوری طور پر جدید ذہن کی تخلیق و تربیت میں مدد ملی ہے۔
جگر نے بغیر ارادہ اور مقصد کے اخلاق و معاشرت کی پرانی قدروں
کو جو کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ کافی جھٹکے دیئے ہیں۔ انہوں نے ہماری سماجی
زندگی کے کذب و ریا اور اس کے جھوٹے معیار اور نمائشی دستور پر
شدید چوٹیں لگائی ہیں۔ شاعری کی نوجوان نسل نے جگر سے وہ بیباک

معصومیت اور وہ باغیانہ اور سرفروشانہ صداقت از سر نو پائی جس کی
کسی زمانہ میں سعدی کا سا معلم اخلاق قسم کھا چکا ہے۔ اور جو نوجوانوں
سے جا چکی تھی۔ غرضیکہ جگر کی شخصیت اور ان کی شاعری نے نئی نفسیات
کی طیاری میں کم مدد نہیں کی ہے۔ اگرچہ یہ مدد زیادہ تر سلبی قسم کی ہے۔
مجھے تو جگر کے مداحوں اور مقلدوں سے صرف یہ شکایت ہے۔ کہ وہ نہ
صرف انداز بیان میں بلکہ اکثر کردار و تعیت میں بھی جگر ہی کیوں بنے
رہنا چاہتے ہیں۔ اس سے اردو غزل کی بالیدگی رک گئی ہے۔ اور
اس میں کچھ چھچھورا پن آگیا ہے۔ اب آؤ کچھ جگر کے اشعار سنو۔

وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اس کا کیا علاج
دل مانتا نہیں کہ نظر کامیاب ہے
اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

شام سے آ گئے جو پینے پر - صبح تک آفتاب ہیں ہم لوگ
تو ہمارا جواب ہے تنہا - اور تیرا جواب ہیں ہم لوگ

ان کے بہلاتے بھی نہ بہلا دل
رائیگاں سعی التفات گئی
دن کا کیا ذکر تیرہ بختوں میں
ایک رات آئی ایک رات گئی

عشق سراپا نظر اور نظر معصیت — عشق تمنا نژاد اور تمنا گناہ

آ کے تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

وہ رند ہوں کہ الٹ دی جب آستیں میں نے
دکھائے حرم و دیر سب یہیں میں نے

ہم کہیں آتے ہیں زاہد تیرے بہکانے میں
اسی میخانہ کی مٹی اسی میخانے میں

حرم و دیر میں رندوں کو ٹھکانا ہی نہ تھا
وہ تو یہ کہئے اماں مل گئی میخانے میں

تیری آنکھوں کا کچھ قصور نہیں ۔ ہاں مجھی کو خراب ہونا تھا
ہائے وہ لمحۂ سکوں کہ جسے ۔ محشرِ اضطراب ہونا تھا

آج کچھ اپنا پتہ ملتا نہیں میں کہاں ہوں اے نگاہِ یار بتا
قدم ڈگمگاتے نظر بہکی بہکی جوانی کا عالم ہے سرشاریاں ہیں

رند جو مجھکو سمجھتے ہیں انہیں ہوش نہیں
میکدہ ساز ہوں میں میکدہ بردوش نہیں

کبھی ان مدھ بھری آنکھوں سے پیا تھا اک جام
آج تک ہوش نہیں ہوش نہیں ہوش نہیں

ہائے یہ مجبوریاں محرومیاں ناکامیاں
عشق آخر عشق ہے تم کیا کرو ہم کیا کریں

سینہ تلے پہ جو گذرتی ہے ۔ وہ لب نے نواز کیا جانے
نگہہ شوق کی ہے سب تحریک حسن تمہید ناز کیا جانے

عاشقوں کے دل مجروح سے کوئی پوچھے
وہ جو اک لطف نگاہِ غلط انداز میں ہے

حریم حسن کے پردے اُٹھے ہوئے ہیں جگر
یہی اگر ہے غم انتظار کیا کہنا

اُف وہ کہنا اس کا پھر باہوں میں باہیں ڈالکر
میں جگر کے واسطے ہوں اور جگر میرے لئے

یہ کیفی ہے تو پھر شان میکشی کیا ہے
بہک نہ جاتے جو پی کر وہ رند ہی کیا ہے

اس موقع پر جگر کی شاعری کا ایک خاص عنصر ذہن میں آگیا یعنی اُن کے خمریات ۔ خمریات سے کسی زبان کی شاعری خالی نہیں ہے ۔ اور اُردُو فارسی شاعری کی روایات میں شراب اور متعلقاتِ شراب داخل ہیں ۔ لیکن جس فطری معصومیت اور والہانہ بے ساختگی کے ساتھ جگر نے شراب پی اور شراب کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ۔ اس کی مثال دنیا کے بڑے سے بڑے شراب پینے والے شاعر کے وہاں نہیں ملتی ۔ جگر نے شراب کو ایک عنصری پاکیزگی عطا کی ہے ۔ جگر کا شراب پینا اور شراب کے مضامین باندھنا دونوں عشق اور عبادت کی قسم کی چیزیں رہی ہیں ۔ شراب اُن کے وہاں ایک جوہری قوت تھی جس سے بے تعلق ہوکر وہ کچھ بے جان سے ہوگئے ہیں ۔

لیکن اُردُو غزل کو جگر کی سب سے بڑی دین اُن کا اسلوب ہے وہ الفاظ اور فقروں اور بندشوں کو اس اچانک پن کے ساتھ استعمال کرتے ہیں ۔ کہ پرانی سے پرانی بات میں نئی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ اور پھر چونکہ اُن کے جذبات اور لبِ اظہار دونوں میں ایک محدود اور سطحی قسم کی ہیجانی ضرور ہوتی ہے ۔ اس لئے اُن کے لہجے میں وارفتگی آجاتی ہے وہ ہم کو مستقل طور پہ نہ سہی کچھ دیر کے لئے تو متاثر کئے ہوئے بغیر نہیں رہتی ۔ جگر کے اشعار میں جو مضامین ہوتے ہیں ، وہ عام طور سے وہی ہوتے ہیں ۔ جن کو ہر اُردُو شاعر ایک سے زاید مرتبہ قلمبند کر چکا ہے اور پھر چند اشعار چھوڑ کر جن میں معنوی ظرف پیدا کرنے کی ہلکی سی کوشش کی گئی ہے ۔ زیادہ تر اشعار ادنی اور سطحی باتوں پر مشتمل ہوتے ہیں ۔ لیکن جگر کی انفرادیت جو ایک ہیجانی شدت اپنے اندر رکھتی ہے ۔ اُن کے ہر مصرعے میں محسوس ہوتی ہے ۔ اور اس شدید انفرادیت کا تعلق الفاظ اور فقروں کے نئے انداز کے ساتھ استعمال اور اسلوب کی جدت سے زیادہ ہے ۔

جو کچھ میں نے جگر کی شاعری کے بارے میں کہا ہے ۔ اس سے ظاہر ہوگیا ہوگا ۔ کہ ان کی رسائی فکر و احساس کا دایرہ بہت تنگ ہے اور اُن کے وہاں موضوع کے اعتبار سے زیادہ تنوع بھی نہیں ۔ اس لحاظ سے وہ اپنے معاصرین مثلاً عزیز فانی اصغر وغیرہ کے مرتبے کو نہیں پہنچے مگر خود اپنی جگہ اپنے مخصوص دایرے میں ایک خاص کیفیت اور تاثیر کے اعتبار سے وہ اپنے اکثر ہمعصر شعرا سے ممتاز نظر آتے ہیں ۔

اُردُو غزل میں جگر کی شاعری یقیناً ایک نیا موڑ تھی لیکن یہ موڑ زیادہ دُور تک نہیں جا سکا ۔ جو لوگ اب تک جگر کے نکالے ہوئے راستے پر چلے جا رہے ہیں ۔ ان کو اس کا ہوش نہیں کہ شاعری کی یہ بہت تنگ اور محدود جولانگاہ تھی ۔ جس میں جو کچھ جولانیاں دکھائی جا سکتی تھیں ۔ خود جگر دکھا چکے ۔ اور اس میں اب کوئی نیا امکان باقی نہیں ہے ۔ جگر کی پیروی کئے جانا ایک ایسے راگ کو گائے جانا ہے جس کو سنتے سنتے ہم اکتا چکے ہیں ۔ اور اب اس میں کوئی کیف

باقی نہیں ہے۔ جگر جدید اُردو غزل میں ایک نیا مقدر تھے جس کی تکمیل ہو چکی۔ اور یہ مقدر کچھ بہت مہتم بالشان مقدر نہیں تھا۔ جگر کی شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ایک سے زائد مرتبہ اپنے شاگردوں سے کر چکا ہوں۔ آج تم نے پوچھا تو انہیں خیالات کو حذف و اضافہ کے ساتھ لکھ ڈالا۔ یہ اس موضوع پر میرے بہت دیر تک سوچے سمجھے خیالات ہیں۔

مگر تم کہتی ہو کہ اتنے صفحے رنگ گیا۔ لیکن یہ نہ بتایا کہ میں اس وقت کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں۔ مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اتنا کچھ جو میں بکتا رہا وہ محض ایک فراری حرکت تھی۔ یعنی میں اپنی نجی ہستی اور ذاتی زندگی کے خیال سے بھاگا رہنا چاہتا تھا۔ لیکن بہ قول بائرن "کون جلاوطن ایسا ہے جو اپنی ذات سے بھی بھاگ کر پناہ پا سکے"؟ شاید اسی احساس کا ایک اُردو شاعر نے، غالباً میر نے یوں اظہار کیا ہے۔

کیا ہے غربت میں جو وطن میں نہیں
عاشقوں کا بھلا وطن دیکھا

مجھے اپنی ذاتی زندگی کی طرف رجوع کرنے میں سوا کلفت کے کبھی کوئی لذت نہیں ملی۔ اور اب تو میری ذاتی زندگی ایک اذیت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن میں تم کو مایوس یا اداس نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس لئے جلد جلد کچھ سُن لو۔ میں اب اس خط کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ لکھتے لکھتے میری انگلیوں میں تشنج ہونے لگا ہے۔

میرا ارادہ تو یہ تھا کہ ایک ایک روز بغیر کسی خاص مقصد کے جابجا قیام کرتا ہُوا دو ہفتے تک سفر میں گذار دوں۔ لیکن ایک محبوب دوست کے خیال نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں کچھ دنوں تک اس کے ساتھ بسر لے لوں، یہ شخص میری زندگی کے اُن چند دوستوں میں سے ہے جس کی دوستی میں واقعی دور تک کسی غرض و غایت کو دخل نہیں ہے۔ اس شخص کے وہاں دوستی شاعری کے قسم کی ایک لطیف چیز ہے۔ یہ کون شخص ہے؟ تم سے اس کا ذکر بارہا آچکا ہے۔ اور شاید تم سمجھ گئی ہو۔ لیکن اگر تمہارا ذہن منتقل نہ ہُوا ہو تو پھر کبھی ملاقات ہونے پر بتاؤں گا۔

بہرحال میرا دوست مجھے جسمانی آرام اور ذہنی سکون پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ اس کو یہ کھٹکا لگا ہُوا ہے کہ کہیں مجھے وحشت نہ ہونے لگے۔ اور میں دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا نہ ہوں۔ لیکن آرام اور سکون کا تعلق دراصل اپنے دل و دماغ اور اپنے کردار سے ہے۔ راحت و سکون مقدر میں نہ ہو تو کہاں سے آئے۔ اور میرا تو خیال یہ ہے کہ راحت اور سکون زندگی کی غایت نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنے پچھلے خط میں جو تم کو مل چکا ہوگا۔ اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی تھی۔ کہ سفر زندگی کی تمثیل ہے۔ میں سفر کو اپنے مزاج سے مانوس پاتا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ اپنے دوست کے خلوص و محبت کے باوجود پرسوں یہاں سے بھی چل کھڑا ہوں۔ اس کے بعد کہاں ہوں گا؟ اس کا فیصلہ ابھی نہیں کیا ہے۔ ناہید آتش کا ایک مشہور شعر سنو۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

میں "شجر سایہ دار" کو گھر کی "خواب گاہ" سے بہتر ادارہ سمجھتا ہوں۔ اور جب ساری دنیا ایسا ہی سمجھنے لگے گی۔ اسی وقت دُنیا نئے انسانیت صحیح معنوں میں انسانی دُنیا ہوگی۔ ہمارا اصلی وطن سارا آفاق ہے۔ میں نے کسی زمانے میں ایک نظم "مسافر" کے عنوان سے لکھنا چاہی تھی۔ بہت سے اشعار لکھ جانے کے باوجود نظم مکمل نہ ہو سکی۔ آج کل میری زندگی کی سب سے بڑی شامت یہی ہے۔ کہ کام بہت ہیں۔ لیکن پورا ایک بھی نہیں ہو پاتا۔ بہرحال نظم کا ایک شعر اپنے پچھلے خط میں سُنا چکا ہوں دو چار اور سنو!

کوئی رفیق ہے اپنا نہ کوئی ہمدم ہے
نہ میل راہ نہ منزل عجیب عالم ہے
نہ ساتھ زادِ سفر ہے نہ ہم سفر کوئی
مسافرت پہ کمربستہ ہے مگر کوئی
یہ کیسے جادۂ بےحد پہ گامزن ہے کوئی
یہ کس سراغ پہ آوارۂ وطن ہے کوئی
بلند و پست سے دنیا کے دل اٹھائے ہوئے
نظر جھکائے ہوئے ہے قدم بڑھائے ہوئے

بدن سمیٹے ہُوئے ہوشیار دامن سے
کہیں اُلجھ نہ پڑے کوئی خارِ دامن سے

تو ناہید۔ زندگی ایک سفر ہے تم کہو گی کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، زمانہ قبل تاریخ سے ہمارے اخلاق و مذہب کے پیشوا یہی بتاتے رہے ہیں۔ اور دُنیا کے شاعروں کی بھی یہی تعلیم رہی ہے۔ کہ زندگی کو ایک سفر سمجھنا چاہیئے جس میں کسی مقام سے جی نہیں لگانا چاہیئے لیکن ہمارے ان بزرگوں نے جو ہم کو یہ تعلیم دی تو اس کا مقصد بہت خطرناک تھا۔ وہ دنیا سے ہمارا جی اُچاٹ کرنا چاہتے تھے۔ اور ایک خیالی اور بے اصل و بود دُنیا کے تصوّر میں ہم کو محو رکھنا چاہتے تھے۔ میں نے سفر کو جو زندگی کی تمثیل سمجھا ہے۔ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ زندگی مقام کرنے کا نہیں بلکہ آگے بڑھنے کا نام ہے۔ اور ہم کو اس دُنیا میں آگے بڑھنا ہے۔ ہماری یہ دُنیا یقیناً بہت حسین دُنیا ہے۔ لیکن اس کو حسین تر بناتے جانا انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ سفر محض زندگی کی تمثیل نہیں ہے۔ بلکہ انقلاب اور ترقی کی بھی تمثیل ہے۔ راستہ میں لاتعداد مقامات اور منازل آتے ہیں، ہم کو ہر منزل کا اشتیاق کے ساتھ انتظار کرنا اور اس کی طرف تپاک اور حوصلے کے ساتھ قدم بڑھانا ہے اور جب وُہ منزل آ جائے تو ایک نئے اکتساب کے احساس کے ساتھ کچھ دیر وہاں قیام کر کے اُس کا پورا جائزہ لینا اور جو کچھ وُہ ہم کو دے سکتی ہے، اس کو اپنا کر آگے کی منزل کی طرف بڑھنا ہے۔ ہر منزل پر مزاحم اور خطرات بھی ہوں گے۔ اُن سے ہم کو بچنا بھی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی منزل ہم کو لبھا لے۔ اور ہمارے بڑھتے ہوئے قدم وہیں رُک کر رہ جائیں یا اگر ہم آگے بڑھیں بھی تو اس منزل کی یاد ہمارے دل کا ایک ٹپکتا ہُوا زخم بن کر رہ جائے۔ ہم کو واقعی اپنے بدن کو سمیٹے رہنا ہے۔ کہ کہیں راستے کا کوئی کانٹا ہمارے دامن سے اُلجھ کر ہماری راہ نہ کھوٹی کر دے۔

تمثیل اور استعارے سے برطرف ہو کر جانتی ہو۔ یہ راہ کے کانٹے کیا ہیں؟ زندگی کی از کار رفتہ قوتوں اور معزول قدروں کے ساتھ ہمارا اُنس۔ ہماری یہ آرزو کہ اگر زندگی کی گذری ہوئی منزلیں واپس نہ آ سکیں۔ تو کم سے کم جس منزل پر اب ہم ہیں، وہیں مستقل قیام رہے۔ اور یہ دونوں خواہشیں زندگی کے فطری مطالبے کے منافی ہیں ہماری پرانی پاسداریاں ہمارے راستے کا سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ اس وقت دُنیا میں جتنی رجعتی اور اصلاحی کوششیں کی جا رہی ہیں، وُہ سب اسی منزل پرستی کی علامتیں ہیں۔ زندگی کی نئی اور پُرانی قدروں کے متعلق تم کو پھر کبھی لکھوں گا۔ اس وقت بالکل بے کار ہو چکا ہُوں۔ اور اب کسی طرح لکھا نہیں جاتا۔ اس لئے بہت بہت پیار کے ساتھ رخصت۔

تمہارا "پردیسی"

غلام رسول نازکی

قطعات

دہاں بھی فاقہ کش مزدور ہوں گے
وہاں بھی قیصر و فغفور ہوں گے؟
ترے فردوس میں بھی یا الٰہی
یہی رِستے ہُوئے ناسور ہوں گے؟

ترے دوزخ کی دہشت سے الٰہی
بہت مرعوب تھی اولادِ آدم
اِسی دہشت کو کم کرنے کی خاطر
بنایا مَیں نے دُنیا کو جہنّم

تلخیٔ فکرِ حصولِ نان و آتش
یہ کوئی جینا ہے جو ہم تم جئے
ہم نے اس دُنیا سے کیا چھینا ہے دوست
پرسشِ اعمال ہم سے، کِس لئے؟

ہمایوں کبیر

اقتصادیات اور فنونِ لطیفہ

ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ میں غالباً دوسرے ملکوں اور زمانوں کے مانند افراد اور جماعتوں کی باہمی نزاع و کشمکش کا سرچشمہ دنیوی وجوہ تھے۔ اگر اس عہد کی تاریخ کے ایک خاص تدریجی عمل پر غور کیا جائے تو اس نظریے کی صداقت قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ عام طور پر اس کشمکش کی ذمہ داری وسط ایشیا کے سماجی اور جغرافیائی حالات کے باہمی ربط اور ہندوستان پر بیرونی حملوں پر ڈال دی جاتی ہے۔ لیکن ایک تاریخی واقعے پر اب تک کسی نے خاص توجہ نہیں کی۔ اور وہ ہے ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ میں راجپوتی اقتدار کا ظہور اور اس کی مدتِ قیام۔ بحیثیت عمومی یہ کہنا درست ہوگا کہ آٹھویں صدی عیسوی سے پیشتر اور عہد اورنگ زیب کے بعد ہندوستان کی تاریخ میں راجپوتوں کو کوئی قابلِ ذکر اہمیت حاصل نہیں تھی۔ لیکن کم و بیش ایک ہزار سال کی اس مدت میں راجپوت ہندوستان کی تاریخ پر چھائے ہوتے معلوم ہوتے ہیں حالانکہ تعداد اور سیاسی اہمیت کے اعتبار سے ہندوستان کے کئی دوسرے گروہوں اور ریاستوں کو ان پر فوقیت حاصل تھی۔ آٹھویں صدی سے پہلے ہندوستان کی سیاسیات میں طاقت و اقتدار کا محور دریائے گنگا کے کناروں سے وابستہ رہا۔ اشوک کے عہد سے شروع ہو کر ہرش وردھن کے زمانے تک سیاسی ہنگامی کا سرچشمہ مشرق ہی تھا۔ لیکن آٹھویں صدی کے آغاز سے صورتِ حال میں ایک نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ اب اقتدار کا مرکز مشرق سے دہلی کی جانب منتقل ہو گیا اور قریباً ایک ہزار سال تک اس کا محور یہی مرکزی مقام رہا۔ راجپوتی عروج و اقتدار کا زمانہ بھی یہی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخی عمل کا اصل باعث ہندوستان کی تجارت کے رُخ اور تجارتی مرکز کا تغیر و تبدل تھا۔ آٹھویں صدی تک ہندوستان کی تجارتی شاہراہوں کا رُخ زیادہ تر مشرق کی جانب تھا۔ ہندوستانی نوآبادیاں اور سمندر پار کی بستیاں مشرق ہی میں واقع تھیں۔ چین اور جاپان کے سے دور دراز ملکوں کے ساتھ مسلسل اور وسیع تعلقات قائم تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں کہیں کہیں یورپ کے ساتھ تجارتی تعلقات کا ذکر بھی آتا ہے لیکن ان کا مشرقی ملکوں کی تجارت کے ساتھ کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سمندر پار کے ملکوں سے آنے والی دولت کے دھارے سے نشوونما حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کی سیاسی زندگی کا جھکاؤ بھی مشرق کی طرف ہو گیا۔ ساتویں صدی سے اس صورتِ حال میں تبدیلی رُونما ہوئی۔ عرب اقتدار کے ظہور کے ساتھ ہندوستان اور مغربی ممالک کے مابین ایک نئی بحری تجارت کا آغاز ہوا پیشتر ازیں ساتویں صدی سے جنوبی ہند کے ساتھ عربوں کے رابطے اور آٹھویں صدی میں تجارتی اغراض کے تحت سندھ پر عربوں کے حملوں کا ذکر آ چکا ہے۔ اس تجارت کا ایک مرکز گجرات بن گیا اور ہندوستان میں مغرب کی طرف سے زر و مال کے بہاؤ کا آغاز ہوا۔

راجپوتوں کی اہمیت کا آغاز بھی ہندوستان کی تجارتی صورتِ حال میں اس نئی تبدیلی کے ساتھ ہی ہوا۔ ان دونوں کے باہمی تعلق کے نظریے کو اس بات سے اور بھی تقویت ملتی ہے کہ راجپوتانہ' دہلی اور گجرات کے مابین تجارتی شاہراہ کے عین اوپر واقع ہے۔ جلد ہی اس شاہراہ پر تسلط تمام شمالی ہند پر اثر و اقتدار کی کلید بن گیا۔ داستان کا آغاز اس علاقے پر تسلط حاصل کرنے کے لئے راجپوت راجاؤں کی باہمی جنگ و جدل سے ہوتا ہے۔ پھر جلد ہی راجپوت حکمرانوں کے باہمی جھگڑوں کی جگہ دہلی اور میواڑ کی کشمکش نے لے لی۔ علاء الدین کے زمانے سے عہد اکبر تک ہندوستان کی تاریخ کی تشکیل کا مدار ہی اس کشمکش پر رہا۔ ان لڑائیوں میں جنگی نعرے تو اکثر و بیشتر مذہبی یا فرقہ وارانہ ہوتے تھے لیکن

اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ حقیقی وجہِ نزاع اس اہم تجارتی شاہراہ پر قبضہ کرکے ملک کی اقتصادی زندگی پر تسلط کی خواہش تھی۔

پھر یہ بات بھی خاص اہمیت رکھتی ہے کہ راجپوتی اقتدار زوال پذیر ہونے ہی یکایک ناپید ہوگیا۔ راج سنگھ کے خلاف اورنگ زیب کی مہمات کو اس کی وجہ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہ لڑائیاں دہلی اور میواڑ کی سابقہ جنگوں سے بھی کم فیصلہ کُن تھیں۔ علاء الدین اور بابر نے میواڑ کو اس سے بہت زیادہ زبردست شکستیں دی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ راجپوتوں کی طاقت اور اقتدار کا خاتمہ نہ کرسکے۔ اکبر نے راجپوتوں کو رام کرکے ان کی طاقت کو اپنی سلطنت کی توسیع اور ثبات کے لئے استعمال کرنے کی غرض سے فوجی دباؤ کے ساتھ دوستانہ طریقوں سے بھی کام لیا لیکن ان کی طاقت کو ملیا میٹ کرنے یا انہیں بار بار سر اٹھانے کے ناقابل بنا دینے میں وہ بھی کامیاب نہیں ہوسکا۔ پس حقیقی وجہ کی تلاش میں کسی اور طرف نظر دوڑانی چاہئے۔

یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ راجپوتی اقتدار کے آغاز کی طرح اس کا فوری زوال بھی ہندوستان کی اندرونی اور بیرونی تجارت کے مرکزوں میں ایک نئی تبدیلی کا نتیجہ تھا۔ جب جزائر شرق الہند اور ملایا کے مقابلے میں عرب ممالک کے ساتھ ہندوستان کی تجارت کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی تو گجرات ہندوستان کا تجارتی مرکز بن گیا اور راجپوتانہ کو فوجی اعتبار سے اہمیت مل گئی۔ پھر جب راسِ امید کے گرد بحری راستہ دریافت ہوگیا اور تجارتی مرکز کالی کٹ اور ہندوستان کے مشرقی ساحل پر قائم ہوگئے تو گجرات کی اہمیت گھٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی تاریخ میں راجپوتوں کی اہمیت کو زوال آگیا۔ مرہٹوں کے عروج کا آغاز بھی اس نئی تبدیلی کے ساتھ ہی ہوا۔ پرتگیزوں ولندیزوں اور دوسری یورپی اقوام سے تجارتی تعلقات قائم ہوجانے سے مغربی گھاٹ پر اقتدار و تسلط کو ہندوستان کی اقتصادی زندگی پر غلبہ حاصل کرنے کے ذرائع میں بہت بڑی اہمیت حاصل ہوگئی۔

یورپی ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات بڑھ جانے سے ملک کی اقتصادی زندگی کا رُخ نئی شاہراہوں کی طرف پلٹ گیا۔ سیاسی زندگی کے مرکز کلکتہ اور مدراس بن گئے۔ جلد ہی راجپوت اور مرہٹے دونوں کی سیاسی اہمیت جاتی رہی۔ مرہٹوں نے ایک صدی تک جد و جہد جاری رکھی۔ لیکن جب ہندوستان کے ساتھ یورپی تجارت کے میدان میں پرتگیزوں اور ولندیزوں کی جگہ فرانسیسیوں اور انگریزوں نے لے لی تو مرہٹوں کی اہمیت بھی رفتہ رفتہ ختم ہوگئی۔ البتہ بمبئی میں بندرگاہ کے قیام نے انہیں یکسر نیست و نابود ہوجانے سے بچا لیا۔ شاہانِ دہلی کے خلاف راجپوتوں اور مرہٹوں کی لڑائیوں کو اکثر اوقات ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہبی اور فرقہ وارانہ جنگوں کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن مندرجۂ بالا تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے برعکس یہ تاریخی واقعات اس حقیقت کا بدیہی ثبوت ہیں کہ جنگ و جدل کا اصل باعث دنیاوی اغراض و مقاصد تھے اور مذہبی یا ثقافتی عناصر کی موجودگی محض ایک اتفاقی امر تھا۔

وحدت و تسلسل کی تمنا ہندوستانی فنونِ لطیفہ کی جملہ اقسام کی تدریجی تشکیل اور ترقی میں بھی کارفرما نظر آتی ہے۔ ہندوستانی ثقافت کی تعمیر کثرت میں وحدت کے اصول پر ہوئی۔ مذہبی دائرے میں اس تمنا نے خارجی مظاہر سے قطع تعلق اور عرفان و وجدان کی دنیا میں فنا فی الذات ہوجانے کا میلان پیدا کیا۔ باطنی وحدت کے خواب کی تکمیل ہوجانے پر پھر دنیا کی طرف مراجعت ہوتی ہے۔ اس وقت مختلف مظاہر کا تنوع صاف طور پر ایک اساسی وحدت کا اظہار و اعلان کرتا معلوم ہوتا ہے۔ فنِ تعمیر نے اس شعور و عرفان کو ٹھوس مادے کے ذریعے سے مجسم صورت میں پیش کیا۔ مندر کے باہر کی طرف مختلف اشکال و مظاہر کی افراط پائی جاتی ہے۔ کہیں ایک انچ جگہ بھی خالی نظر نہیں آتی۔ جزئیات اور نقش و نگار کی بے پایاں فراوانی اُس حقیقت کو نمایاں کرتی ہے جو تمام اشکال و ظواہر کی ماورائی کُلّیت ہے۔ بخلاف اس کے مندر کا اندرونی حصہ محض ایک تنگ و تاریک حجرہ ہوتا ہے جس میں روشنی کی ایک کرن بھی نظر نہیں آتی۔ یہاں روحِ انسانی بالکل مجرد اور تنہا سرِ حقیقی کی حضوری حاصل کرتی ہے۔

خالص ہندوانی طرزِ تعمیر کی مثالیں زیادہ تر جنوبی ہند میں ملتی ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ کوئی ایسا طرزِ تعمیر موجود ہے جسے جنوبی ہند سے مخصوص قرار دیا جاسکے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ اختلافات اور تنوع کے باوجود جنوبی ہند کی تعمیرات میں ذہنی تشکل اور عملی صورت کے اعتبار سے یکسانی پائی جاتی ہیں۔ یہی بات شمالی ہند کی تعمیرات پر بھی

صادق آتی ہے اور انہیں دنیا کے دوسرے ملکوں کے تعمیراتی تجربوں سے ممیّز کرتی ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں شمالی ہند کے شاہی محلوں، قلعوں اور مقبروں کی تعمیر میں ایرانی اثر کے نشانات پائے جاتے ہیں۔ لیکن ایرانی نمونوں سے مطابقت کے باوجود ان میں بعض ایسی خصوصیات نظر آتی ہیں جن کا ایران کے تعمیراتی معیاروں سے کوئی تعلق نہیں۔ اگرچہ ایرانی رجحانات کا ان پر بہت گہرا اثر پڑا لیکن ان کی بنیادیں ہندِ قدیم کی روایات پر استوار ہیں۔

جنوبی ہند کے مندروں میں خطِ مستقیم کا غلبہ پایا جاتا ہے۔ جزئیات کی تکمیل اور آراستگی میں کلیتاً سیدھے خطوں اور زاویوں کے اختلاط و ترکیب سے کام لیا گیا ہے۔ ان مذہبی تعمیرات کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں منبت کارانہ تزئین و آرائش کی افراط پائی جاتی ہے۔ ہر ستون ٹھوس چٹان سے تراشا گیا ہے اور سینکڑوں شکلوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ تنوع کی وہ افراط ہے کہ شاید ہی کہیں کسی موضوع کو دہرایا گیا ہو۔ کانجی ورم کے مشہور و معروف مندر میں ایک ہزار کے قریب ستون ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی کسی دوسرے ستون کا چربہ نہیں۔ سہاچالم کے مندر میں بھی جو اس سے چھوٹا ہے تمام ستون اشکال اور بنیادی موضوعات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اس فنِ تعمیر کا مطمحِ نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشکال اور شکوہ و تجمل کی فراوانی سے دیکھنے والے کے دل و دماغ کو مبہوت کر دیا جائے۔

شمالی ہند کا فنِ تعمیر اس سے اتنا مختلف ہے کہ ایک عامی کو بھی اس اختلاف کا احساس ہو جاتا ہے۔ شمالی ہند کے مندروں کی تعمیر میں بھی خطِ مستقیم کا غلبہ ختم کر دیا گیا ہے۔ ان مندروں میں قوس اور دائرے کی ترکیب و ترتیب سے کام لیا گیا ہے جس سے فضا میں پُر اسرار طور پر ایک لطیف تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان مندروں میں گنبد یا قبے شاذ و نادر ہی کہیں پائے جاتے ہیں لیکن ان کے بُرج بھی جنوبی ہند کے مندروں سے مختلف ہیں۔ جن لوگوں کی واقفیت صرف شمالی ہند کے مندروں تک محدود ہے انہیں اس فرق کا پورا احساس نہیں ہو سکتا۔ انہیں مندر اور مسجد کا ظاہری فرق ان کی اساسی مشابہت کے مقابلے میں بہت نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے صرف جنوبی ہند کے مندر دیکھے ہیں انہیں شمالی ہند کی تمام تعمیرات میں مسجد کی تعمیراتی خصوصیات ایک غیر محسوس انداز میں کارفرما نظر آتی ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ شمالی ہند کی تمام بہترین عمارتیں ہم آہنگی کے جذبے اور دونوں تعمیراتی طرزوں کے حسین امتزاج کی حامل ہیں۔

شمالی ہند میں منبت کاری اور دیگر تزئین و آرائش میں جس سلیقے اور جزرسی سے کام لیا گیا ہے وہ محض اتفاقی نہیں یہاں خطوط کے توازن و یکسانی اور مادی اجزا کے توازن پر زور دیا گیا ہے۔ اجزائے ترکیبی کے تودوں کی ترتیب ایسے انداز میں کی گئی ہے جس سے ہم آہنگی و یک جہتی کا احساس ہوتا ہے۔ شمالی ہند کے فنِ تعمیر کا مرکز و محور ایک اساسی تصوّر ہے اس کی قدر و قیمت کا انحصار اجزائے ترکیبی کے تنوع اور آب و تاب پر نہیں بلکہ تعمیراتی شاہکاروں کے حسنِ ترتیب اور ہم آہنگی پر ہے۔ یہ بات بے حد حیرت انگیز اور قابلِ ستائش ہے کہ مندروں کی تعمیر میں بھی اس ملاپ اور امتزاج کا امکان پیدا کر لیا گیا۔ غیر ملکی اثر کو زندگی کے دیگر شعبوں میں تو قبول کر لیا جاتا ہے لیکن مذہب کی دنیا میں عام طور پر اسے دخل یابی کا موقع نہیں دیا جاتا۔ یہ بات ہندوؤں کی تعمیراتی فراست و طباعی کی استواری اور قوت پر دال ہے کہ انہوں نے مذہبی میدان میں بھی اسلامی تصوّرات کو حسبِ ضرورت ڈھال کر اپنا لیا۔

یہ اثر اندازی یا اثر پذیری یک طرفہ نہیں تھی اور درحقیقت اس کا یک طرفہ ہونا ممکن بھی نہ تھا۔ جہاں ایک طرف اسلامی طرز قدیم ہندوستانی روایات پر اثر انداز ہوا وہاں ان روایات نے بھی ہندوستان میں مسلم فنِ تعمیر کی خصوصیات پر گہرا اثر ڈالا۔ مسلم فنِ تعمیر کی ایک بڑی خصوصیت اس کی انتہائی سادگی اور زینت و تصنّع سے کلیتاً علیحدگی تھی۔ خطوط ایک دلربا سادگی سے باہم ملتے ہیں جس میں بیکار آرائش اور نقش و نگار کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اگر کہیں تھوڑی بہت آرائش سے کام لیا گیا ہے تو وہ بھی ہندسی اشکال یا خطاطی کے حسین اور دلکش نمونوں کی صورت میں۔ شمالی ہند کے فنِ تعمیر میں ایک انقلابی تغیر و تبدل پیدا ہوتا ہے۔ ہندو اور مسلم تعمیرات کی مختلف خصوصیات کے میل جول سے ایک نئی طرزِ تعمیر وجود میں آتی ہے۔ مسلم فنِ تعمیر کی شدید سادگی میں ذرا لچک پیدا کی گئی اور ہندو طرزِ تعمیر کی فراوانیٔ آرائش میں کمی کر دی گئی۔ اسلامی طرزِ تعمیر کی ہم آہنگی اور حسینِ اشکال ہندوستانی تعمیرات کی آب و تاب اور زینت و آرائش گھل مل کر یکجا ہو گئے۔ جہاں کہیں یہ امتزاج مکمل صورت میں جلوہ گر ہوا وہاں تاج محل کے

سے تعمیر (؟) معرضِ وجود میں آئے ۔ اکثر صورتوں میں دونوں طرزوں کا امتزاج مکمل نہیں اور کوئی ایک طرز دوسری پر غالب نظر آتی ہے ۔ اس مقدار میں مسلّم تعمیرات میں ہندوانی شکلوں اور نمونوں کے شمول و اختلاط کی مخصوص مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ۔ ہندوؤں کے زمانے کی عمارتوں میں کنول اور صراحی سے قریباً ہر جگہ نقّاشی کے لئے تصورِ اساسی سے کام لیا گیا ہے لیکن مسلمان بادشاہوں کے مقبروں میں بھی نقش و نگار کے لئے انہیں دلفریب فنکاری سے استعمال کیا گیا ہے ۔

ہر قوم کو اس کے فنونِ لطیفہ سے دوام حاصل ہوتا ہے ۔ سیاسی منظر میں آئے دن تغیر و تبدل کا امکان ہوتا ہے اور اس پردے پر نظر آنے والے نظاروں کا دنیا کے ذہن پر کوئی مستقل نقش باقی نہیں رہتا ۔ فلسفے میں بھی اکثر اوقات کل کا خاکہ جزئیات کے ازدحام میں چھپ چھپا جاتا ہے حتیٰ کہ روح قوتِ متخیّلہ کی پیچیدگیوں میں گم ہو کے رہ جاتی ہے ۔ لیکن فنونِ لطیفہ میں صرف سادہ غیر مرکب اور بسیط عناصر کو قیام و دوام حاصل ہوتا ہے اور وہ قومی احساس و شعور پر ہمیشہ کے لئے اپنا نقش ثبت کر دیتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کسی قوم کے فنونِ لطیفہ اس کے پوشیدہ سے پوشیدہ اور اساسی خصائص کو اُجاگر کر کے انہیں آیندہ نسلوں اور زمانوں کے لئے مستقل طور پر متشکل و معین کر دیتے ہیں ۔

تمام فنونِ لطیفہ میں سے نقاشی غالباً سب سے زیادہ بسیط اور مستقل ہے ۔ الفاظ انسان کے سماجی اختلاط اور لیتے بدلتے مہروں کا کام دیتے ہیں ۔ سماجی رسوم و آداب میں تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ یہ بھی بدلتے رہتے ہیں ۔ موسیقی ایک بسیط اور غیر مرکب فن تو ہے لیکن اسے مستقل و متعین نہیں کہا جا سکتا ۔ اس سے جن جذبات و احساسات کو تحریک ہوتی ہے وہ اس قدر عارضی اور غیر واضح ہوتے ہیں کہ اس کا اثر روح میں ایک مبہم سے ہیجان سے بیشتر کچھ نہیں ہوتا ۔ قطعیت و وضاحت سے عاری ہونے کے باعث یہ فن کسی قوم کی مخصوص نسلی فراست اور طباعی کو پوری طرح اُجاگر نہیں کر سکتا ۔

نقاشی میں اگرچہ اساسی عنصر و تصور سے گہرا ربط قائم رکھا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ مخصوص نسلی یا زمانی خد و خال کو بھی اجاگر کرتی ہے ۔ قدیم ایرانی نقاشی میں جزئیات کی صحت و درستی کا خیال اور اہتمام چینی آرٹ کی اساسی ترتیب و کفایت کی طرح نسلی خصوصیات و رجحانات کا آئینہ دار ہے ۔ ٹیوڈر بورژوائی تہذیب کے قرار و استحکام اور زمانۂ حال کے یورپ کی مضطرب اور مبتلا روح کا فرق اور تقابل جس صحت اور وضاحت سے دونوں زمانوں کی نقاشی سے نمایاں ہوتا ہے شاید کسی اور آرٹ سے نہیں ہوتا ۔ اور جو کچھ دوسرے ملکوں کی نقاشی پر صادق آتا ہے وہی ہندوستان کی نقاشی کے بارے میں بھی اُتنے ہی وثوق سے کہا جا سکتا ہے ۔

ہند قدیم کی نقاشی کی بھُولی بسری تاریخ کے متعلق کسی طویل و بسیط بحث کی ضرورت نہیں ۔ جو کچھ یکے بعد دیگرے آنے والے حملہ آوروں کی تاخت و تاراج سے بچ گیا تھا اُسے آب و ہوا کی شدت اور امتدادِ زمانہ کی دستبرد نے مٹا ڈالا ۔ اجنٹا کے غاروں میں گرانقدر شاہکار محروم توجہ پڑے ہیں جن میں دوام و لامتناہیت کی نقاشی کی سعی و کوشش کی یاد محفوظ ہے ۔ اشکال کی ایک حیرت انگیز نرمی اور لچک جوش و حرکت کو ٹھوس اور محسوس مادے سے چھپائے ہوئے ہے ۔ ہندوستان میں گرمی کا موسم روشنی اور حرارت کو جلا بخشتا ہے لیکن یہی تجلی اشیا کی انفرادیت کو تحلیل کر کے اسے مبہم خاکے کی دھندلی سی ہم آہنگی میں بدل دیتی ہے ۔ گیلی استرکاری پر آبی رنگوں سے بنائی ہوئی یہ تصویریں ایک ایسی ثقافت کا جمالیاتی مظہر ہیں جو کئی قوموں کے تجربوں کے اختلاط و امتزاج کا نتیجہ تھی ۔ نیز ان سے مخالف رجحانات میں توازن و تناسب کا اظہار ہوتا ہے ۔

اجنٹا میں اندرونی چھتوں اور دیواروں پر جن مناظر کی تصویریں بنائی گئی ہیں ان میں عامۃ الناس اور تارک الدنیا زاہدوں کی زندگیوں سے یکساں کام لیا گیا ہے ۔ پہلی قسم کی تصویروں میں زندگی کے لطف و عیش کی بھرمار ہے اور ان سے عروج و اقتدار اور عشق و شباب کی نمایندگی ہوتی ہے ۔ تصویروں کی دوسری قسم میں گیان دھیان کی بے خروش اور پُر سکون زندگی کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور یہ ترکِ تعلقات ریاضت پاکیزگی اور خلوص عقیدت کی مظہر ہیں ۔ لیکن دنیا دار اور تارکِ دنیا کی دنیا کو پیش کرنے کا انداز ایک دوسرے سے الگ تھلگ یا مختلف نہیں ۔ ان میں زندگی کے بہاؤ اور ہنگامہ آرائی کے شعور و احساس

کا وہی اظہار پایا جاتا ہے جو ہم اسلام سے پہلے کی ہندوستانی تعمیرات
میں دیکھ چکے ہیں ۔ اشکال ایک دوسرے پر ہجوم کئے ہوئے ہیں ۔ وہ قدیں
اور بچے ہر وضع اور ہر انداز میں ایک مبہوت کن فراوانی سے یکجا کر دئے
گئے ہیں ۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا نقاش زندگی کی بے حد و کنار سے
پریشان و آزردہ تھا اور اس نے اس کا مکمل ادراک حاصل کر کے
اپنی ہمہ گیر فنکاری کی مدد سے اس کا اظہار کرنا چاہا ۔ تمام ظواہر و
مظاہر کی حرمت کا اظہار اس قابل تعریف ربط و قرب کی مدد سے کیا
گیا ہے جو فنکار نے اپنی انسانی اور غیر انسانی اشکال کے مابین قائم
کر دیا ہے ۔ اجنٹا کے شاہکار اس لحاظ سے اور بھی حیرت انگیز ہیں
کہ زندگی کے اس ازدحام اور اتحاد کی شدت کا ذریعۂ اظہار خطوط
ہیں ۔ اس میں اُس وحدت و اتحاد کے وجدان و ادراک کو متشکل
صورت میں پیش کیا ہے جو تمام مظاہر کی تہ میں کارفرما ہے ۔
مغلوں اور راجپوتوں کے زمانے میں واقعیت اور صحت نقاشی
کی نمایاں خصوصیت بن گئی ۔ یہ تبدیلی قریب قریب منطقی حیثیت رکھتی
ہے ۔ تاہم اس تبدیلی کو نہ تو بے قاعدہ اور مستبدانہ کہا جا سکتا ہے نہ
بے ربط اور غیر تدریجی ۔ بابر اور اس کی اولاد کے ساتھ جو آرٹ ہندوستان
میں آیا وہ شدید انفرادیت پر مبنی تھا ۔ اسے عامۃ الناس اور ہجوم و
ازدحام سے کوئی لگاؤ نہ تھا اور ترکیب و امتزاج سے بھی بلاواسطہ
طور پر کوئی قابلِ ذکر ربط نہ تھا ۔ اس کی نظر اشیاء و مظاہر کے غیر مبہم
انداز اور واضح خاکے پر پڑتی تھی ۔ یہ انفرادی شکل کی تمام جزئیات کو
بنظرِ غائر دیکھتا تھا اور ان کے ادراک و اظہار میں انتہائی انہماک اور
چابک دستی سے کام لیتا تھا ۔ اس آرٹ کی پیدائش اور نشو و نما چنگیز
اور تیمور کے درباروں میں ہوئی تھی اس لئے یہ کومل یا جذباتی ہرگز نہیں
ہو سکتا تھا ۔ یہ آرٹ زندگی کی تحریک اور تقاضوں کو انتہائی شدت
سے محسوس کرتا تھا اور ان کی پُرجوش قوت اپنی تصویروں میں منتقل کر
دیتا تھا ۔ اس قسم کی تصویروں میں مبالغہ بہت حد تک ہو گیا ۔ نقاشی
محض شبیہ نگاری بن کے رہ گئی لیکن یہ شبیہ نگاری بھی حیرت انگیز
چابک دستی اور فنکاری کی حامل تھی ۔ جب اس پُرجوش اور انفرادیت
پر مبنی طرزِ نقاشی کا ہندوستان کی قدیم روایاتی نقاشی سے میل ہوا

تو ایک نئی طرز معرضِ وجود میں آئی جس میں دونوں طرزوں کے عناصر مربوط
مخلوط تھے ۔ اجنٹا کی صورت پذیر نرمی پر توازن، تناسب اور حسن فصل و
وقفہ کے نئے خطوط ثبت کئے گئے ۔ قدیم ہندوستانی نقاشی کی شدت جوش
اشتیاق سے خالی دیری یہ درباری آداب و اخلاق کی دنیا ایک عنایت
کی آئینہ دار ہے جس کی نظر ہر لحظہ شائستگی اور سلیقے پر رہتی ہے ۔
قدیم ہندوستانی آرٹ کی محویت و استغراق جذبات و احساسات پر
انسانی صلاحیت و استعداد سے زیادہ زور ڈالنے کا نتیجہ ہے ۔ مغلوں
اور راجپوتوں کی نقاشی میں تلخیص و انتخاب کا باعث سادہ کاری اور
ضبط و قدرت ہے ۔ ایک وجدانی و استغراقی ہے اور دوسری سکونیاتی
لیکن اس کی سکونیت میں بھی سابقہ وجد و استغراق کارفرما نظر آتا ہے ۔
ہندوستان کی کلاسیکل موسیقی ہر مرحلے پر جنوبی ہند کے مندروں
کی یاد دلاتی ہے ۔ دونوں کی ٹھوس ساخت اور جزئیات کی فراوانی ان کے
ربط و اتحاد کے بارے میں شک کی ذرا بھی گنجائش نہیں رہنے دیتی ۔
شمالی ہندوستان کی موسیقی اس سے بالکل مختلف ہے ۔ اس میں ٹھوس
استواری کی جگہ ایک نازک اور خوش آئند لطافت پائی جاتی ہے اور
جزئیات کی فراوانی کی جگہ فصل و وقفہ اور ہم آہنگی کو مل جاتی ہے ۔ آرٹ
کی جملہ اقسام میں دو مختلف اور مخالف رجحان کارفرما ہوتے ہیں ۔ ایک
کا مطمحِ نظر تزئین و آرائش، فراوانی اور شکوہ و تجمل ہے ۔ دوسرے کا
مقصد غالب سادگی، ترتیب و کفایت اور اعتدال و متانت ہے ۔
ایک ہمیں ظواہر و اشکال کی کثرت اور اپنی مادی شان و شکوہ سے مبہوت
کرنا چاہتا ہے اور دوسرا مادی جزئیات کی کفایت اور انداز اظہار کے
اعتدال و متانت سے متاثر کرنے کا آرزومند ہے ۔ پہلا جمالیاتی
تجربے کو اس کی آخری حد تک لے جاتا ہے اور ہر چیز کے اظہار و وضاحت
کی کوشش کرتا ہے ۔ دوسرا جزئیات کے ایک بڑے حصے کو بلا اظہار و
وضاحت چھوڑ دیتا ہے اور اپنا پیغام محض اشاروں کنایوں سے
پہنچاتا ہے ۔ پہلا اپنے شاہکاروں کی شوکت اور فراوانی کو ذریعۂ
اظہار بناتا ہے اور دوسرا ایک ایسے پس منظر کی تخلیق کو جس میں تخیل
کے لئے کھلا میدان چھوڑ دیا جاتا ہے ۔
یہ دو انداز زندگی کے دو تکمیل اور لازم و ملزوم مطمح ہائے نظر کے

آئینہ دار ہیں - جہاں کہیں رومانی اور کلاسیکل رجحانات کے مخالف حریف دھاروں کو مکمل اور یکساں تناسب میں یکجا کر دیا جائے - آرٹ معراجِ کمال کو پہنچ جاتا ہے - ان مطمح ہائے نظر سے جن ذہنیتوں کا اظہار ہوتا ہے جہاں کہیں ان کے امتزاج سے ایک نئے فلسفے اور ثقافت کی تخلیق کی جائے زندگی میں ایک نیا حُسن اور کمالِ لطافت نمودار ہو جاتا ہے - ہندوستانی اور اسلامی طرز و انداز دو تکمیلی عناصر ہیں جن کے امتزاج سے نہ صرف ایک شاندار آرٹ بلکہ ایک مستحکم اور پائیدار ثقافت کی تخلیق ہوئی -

---

مسئلۂ کشمیر

آج کل ہر شخص کی زبان پر یہی سوال ہے کہ کشمیر میں رائے شماری کب ہوگی؟ حق یہ ہے کہ یہ مسئلہ آسان نہیں - رائے شماری سے قبل بہت سے مراحل کو طے کرنا ہوگا - ان میں بہت سے امور ایسے ہیں کہ انہیں کسی حالت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - مثلاً سب سے پہلے تو یہ ہونا چاہئے کشمیر سے تمام پاکستانی چلے جائیں اور نام نہاد آزاد کشمیر کی افواج کو توڑ کر ان سے ہتھیار لے لئے جائیں اور ایسے حالات پیدا کئے جائیں اور ذمہ داری لی جائے کہ نام نہاد آزاد حکومت کے علاقے سے مہاجرین اپنے اپنے اصلی مسکن کو واپس ہو سکیں -

اس امر کا پورا پورا اطمینان دلانا چاہئے کہ صرف حقیقی مہاجرین کو واپسی کی اجازت ہوگی - اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ سرکاری دستاویزوں اور دیگر کاغذات کو جانچا جائے - چونکہ مہاجرین کی تعداد بہت زیادہ ہے - اس لئے ظاہر ہے کہ جانچ پڑتال میں کئی ماہ صرف ہو جائیں گے - پھر مہاجرین کے داخلے کے باب میں بھی باقاعدگی اور ضبط کا خاص لحاظ رکھنا ہوگا تاکہ ریاست کی اقتصادی حالت زیادہ اثر پذیر نہ ہو -

مہاجرین کو دوبارہ بسانے کا مسئلہ نہایت نازک اور پیچیدہ ہے - بہت سی انتظامی دشواریوں سے دوچار ہونا ہوگا تاکہ مہاجرین کو اسی علاقے میں بسایا جائے جہاں سے وہ گئے ہیں - ریاست کے بعض حصوں میں بہت سے قصبے اور دیہات حملہ آوروں نے بالکل تباہ کر دئے ہیں - اب وہ پناہ گزین کہاں قیام کریں گے؟ اس کے لئے کافی مقدار میں سامانِ تعمیر کی ضرورت ہوگی جس کی بہم رسانی ان دنوں آسان نہیں - پھر امداد و اعانت کے لئے بہت کچھ کرنا ہوگا - کپڑے، شکر، سامانِ خوراک اور ضروریات کی دیگر اشیاء کا کافی ذخیرہ درکار ہوگا - بعض مقامات میں مکانات پر ریاست کے دوسرے لوگوں نے قبضہ کر رکھا ہے - کیا اُن لوگوں کو گھروں سے نکال دیا جائے گا کہ اصل مالکوں کو گھر دئے جائیں - اگر اس کا جواب ہاں ہے تو ان کو بسانے کے لئے کیا انتظام ہوگا - پناہ گزینوں کو دوبارہ بسانا' اُن کی آؤ بھگت کرنا' ایک مقام سے دوسرے مقام کو منتقل کرنا' مالی امداد دینا گھریلو صنعتوں کے لئے ان کو تربیت دینا وغیرہ ایسے امور ہیں جو وقت چاہتے ہیں - پھر دوبارہ آبادکاری میں کسانوں کے لئے بیل اور آلاتِ کشاورزی وغیرہ مہیا کرنا ہوگا - ان امور سے ظاہر ہے کہ رائے شماری اُس وقت تک ہرگز نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ پناہ گزینوں کو دوبارہ نہ بسا دیا جائے -

رائے شماری سے پہلے امن و امان کے قیام کی سب سے زیادہ ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر نہ پناہ گزینوں کو بسایا جا سکتا ہے نہ رائے شماری ممکن ہے -

رائے دہندگان کی فہرست کی تیاری بھی یقیناً وقت چاہتی ہے - ان تمام مشکلات کے باوجود حکومتِ ہند جوناگڑھ اور حیدرآباد میں رائے شماری کے اصول کو تسلیم کرنے کے بعد کشمیر میں رائے شماری کے اصول کو پورے طور پر تسلیم کرتی ہے - حالانکہ خود پاکستان کے اربابِ حل و عقد کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کے بعد رائے شماری کا مذاق اُڑاتے رہے اور بہ بانگِ دہل کہتے رہے کہ وہ رائے شماری کے اصول کو تسلیم نہیں کرتے - کشمیر کو ہندوستان کے ساتھ ملحق رہنے میں بہت سے معاشی' اقتصادی اور سیاسی فائدے حاصل ہیں - اس لئے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اہلِ کشمیر ہمیشہ ہندوستان کے ساتھ رہیں گے -

نند کشور اخگر فیروزپوری

قیصری فیروزپوری

گردابِ درد ، موجِ بلا ، شورِ مفلسی
ڈوبی ہے جا کے کشتیِ بحرِ ہنر کہاں؟ (قیصری)

فیروزپور کے بخۃ گو اور بالغ نظر شاعر (جناب مرحوم ہیں) چودھری بدرالدین قیصری ایڈوکیٹ کی ولادت تقریباً ۱۸۸۶ء میں موضع فیروزوال تحصیل زیرہ ضلع فیروزپور میں ایک جاٹ مسلمان خاندان میں ہوئی۔ آپ کے والد ماجد چودھری جمال دین ایک باصفا اور پاک باطن بزرگ تھے جو فارسی اور اُردو ادب کے بہت دلدادہ تھے۔ چوں کہ وہ فیروزپور میں عرائض نویس تھے اس لئے قیصری صاحب کی پرورش اور تربیت زیادہ تر اسی شہر میں ہوئی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم ڈی بی سکول دھرم کوٹ میں حاصل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول فیروزپور میں داخل ہو گئے۔ مڈل کی جماعتوں میں اردو مضمون نویسی کرتے وقت اپنے اشعار استعمال کیا کرتے تھے۔ اُن دنوں فیروزپور میں اُردو اور فارسی کے معلم مرزا ارشد گورگانی تھے جن کا اسم گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مرزا صاحب آپ کا مضمون دیکھتے اور اس میں آپ کے اشعار کا استعمال پاتے تو انگشت بدنداں رہ جاتے۔ مگر اپنے ہونہار اور ذہین شاگرد کی بہتری کے لئے ہمیشہ آپ کو شاعری سے احتراز کرنے کی تلقین فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ

عزیزِ من تم ابھی سے اس لاعلاج مرض میں کیوں مُبتلا ہو رہے ہو۔ یہ منحوس شاعری تمہاری تعلیمی ترقی میں سدِّراہ ثابت ہوگی۔

قبلہ ارشد کی بار بار کی فہمائش کا یہ اثر ہوا کہ آپ نے اپنے مضامین میں اپنے اشعار کا استعمال ترک کر دیا تاکہ وہ آپ سے بدظن نہ ہو جائیں مگر مشقِ سخن جاری رکھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی عمر ہی میں بغیر کسی کی اصلاح کے بہت اچھا کہنے لگے۔

جب دسویں جماعت کو اسکول کی طرف سے الوداعی پارٹی دی گئی۔ تو آپ نے اپنی جماعت کی طرف سے ایک نظم پڑھی جسے سُن کر اساتذہ بہت خوش ہوئے۔ مرزا ارشد تو نظم کے چند اشعار سُن کر بے اختیار اپنی کرسی سے اُٹھے اور سعادت مند شاگرد کے قریب جا کر اُسے آغوش میں لے لیا۔

میٹرک کے امتحان میں امتیازی حیثیت سے کامیابی حاصل کر کے آپ نے ایف۔ اے کی تعلیم اسلامیہ کالج اور بی اے کی تعلیم فارمن کرسچن کالج لاہور سے حاصل کی۔ لاہور کے کالجوں میں شعر و شاعری کے لئے ادبی فضا بہت سازگار تھی۔ چناں چہ قلیل مدت ہی میں آپ نے کالج اور لاہور کی دیگر انجمنوں میں خوش گوئی کی وجہ سے نام پیدا کر لیا۔ سر عبدالقادر، خواجہ دل محمد، مولانا ظفر علی خاں اور علامہ سر اقبال مرحوم آپ کے معتقد اور قدرشناس ہو گئے۔ وقتاً فوقتاً آپ کا کلام رسالہ مخزن اور اخبار زمیندار کے اوراق کی زینت ہوتا رہا۔ اسی زمانے میں آپ کی ایک نظم زمیندار میں شائع ہوئی جس کا ایک شعر یہ تھا

جو دولت تھی وہ سب اشیائے مغرب پر لٹا بیٹھے
رہا کھٹکا نہ چوری کا دُعا دیتے ہیں رہزن کو

باوجود اس امر کے کہ آپ کی شاعری کا آغاز بچپن سے ہوا یہ ایک عجیب بات ہے کہ آپ نے تمام عمر اس فن میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔ شروع میں ایک دو غزلیات مرزا ارشد گورگانی کو دکھائی تھیں مگر آپ کو اُن کی اصلاح سے اتفاق اور اطمینان نہیں ہوا۔ تاہم آپ مرزا صاحب کی مسلّمہ قابلیت اور سخن گوئی کے مداح تھے اور ہمیشہ انھیں عزت سے

احترام سے یاد کیا کرتے تھے۔

غالباً ۱۹۳۱ء کے قریب آپ نے علامہ اقبال مرحوم کی ایک دو نظمیں سُن کر ایک قطعہ فارسی اور ایک نظم اُردو علامہ موصوف کی خدمت میں ارسال کی تھی۔ قطعے کے دو اشعار یہ ہیں ؎

پیش آہوئے خطۂ تاتار | نافۂ مشک ارمغاں فرستادم
جا ہلم غنچہ ہائے معنی را | سوئے آں گلستاں فرستادم

اُردو نظم کا بھی ایک شعر یاد ہے جو قابلِ ملاحظہ ہے ؎

تو پسندِ خاطرِ خورد و کلاں ہونے کو ہے
یعنی اب یوسف عزیزِ کارواں ہونے کو ہے

غور فرمایئے۔ علامہ اقبال کی نسبت آپ کی یہ پیش گوئی کس قدر درست ثابت ہوئی۔

آپ کی حیات کے آخری ایام میں کئی دلچسپ اور کامیاب مشاعرے آپ ہی کے مکان کے وسیع صحن میں منعقد ہوتے تھے۔ مقامی شعراء میں سے راقم الحروف کے علاوہ چودھری غلام محمد شاغل، چودھری محمد اسمٰعیل شہیدی اور حکیم رستم علی آپ کے خاص مصاحبین میں سے تھے۔ راقم الحروف پر تو آپ سب سے زیادہ مہربان تھے۔ مجھے بھی آپ کی صحبت سے جو فیض حاصل ہوا۔ میں اُسے تازیست فراموش نہیں کر سکتا۔ میرے ساتھ آپ عزیز بھائیوں سے بھی زیادہ ہمدردی رکھتے تھے اور فنِ شعر گوئی میں ہم بے تکلف ایک دوسرے سے مشورہ لیتے تھے۔

عادات و خصائل

آپ کی طبیعت کی سادگی، خوش اخلاقی اور ملنساری ہر پہلو سے قابلِ تقلید اور بے شبہ ایک نمونہ تھی۔ زندگی کا ایک معقول حصہ آپ کی صحبت میں گزارنے کے باعث میں وثوق سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے دل میں مذہبی تعصب کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ آپ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ ہندوؤں اور سکھوں کے مذہبی مشاعروں اور دیگر تقاریب میں بھی اسی عقیدت اور اسی اشتیاق سے شرکت فرماتے رہے جیسے اسلامی تقاریب میں۔

آہ! ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کا وہ منحوس دن جبکہ صوبۂ پنجاب دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی ایک طرف تو ہندوؤں کا اور دوسری طرف مسلمانوں کا اپنے آبائی مسکن میں رہنا ناممکن ہوگیا صدیوں سے بھائیوں کی طرح ایک جگہ رہنے والے افراد ایک دم ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے پر مجبور ہوگئے اور اس افراتفری میں لاکھوں بے گناہ لوٹے اور مارے گئے۔ اس جبری تبادلۂ آبادی نے جناب قیصری کے سے نیک اور بے ضرر انسان کو بھی اپنا آبائی وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور آپ بالکل بے سروسامانی کی حالت میں اپنی بیوی کے ہمراہ فیروز پور سے ہمیشہ کے لئے رُخصت ہوگئے اور بہ مشکل تمام منٹگمری پہونچ کر قیام پذیر ہوئے۔ ایک مُدّت کے بعد راقم الحروف اور چند ہندو دوستوں کو آپ کے خطوط موصول ہوئے۔ ان خطوط سے آپ کے دردناک حالات کا علم ہوا۔ افسوس کہ آپ اپنی بیاض بھی دیگر سامان کے ساتھ گھر پر چھوڑ گئے اور وہ بھی زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکی۔ باوجود تلاش کے کہیں سے دستیاب نہیں ہوئی۔ آپ کا یہ شعر شاید انہیں حالات کی پیش گوئی ہے ؎

قیصری لوٹنے والے نے چمن لوٹ لیا
اور یہ بھی نہیں پوچھا کہ چمن کس کا ہے

جناب قیصری کو اپنی بیاض اور اپنے قیمتی کتب خانے کے ضائع ہونے کی اطلاع ملی تو آپ کو سخت صدمہ پہنچا۔ آپ کی صحت بہت خراب ہوگئی اور آخر مرض نمونیا میں مبتلا ہو کر ۲۴ر مارچ ۱۹۴۹ء کو بمقام منٹگمری اس جہانِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ افسوس کہ آپ کی بیوی کے سوا آپ کے متعلقین یا دوستوں میں سے کوئی بھی اس وقت آپ کے پاس موجود نہیں تھا۔

آپ کی بیاض کے گم ہو جانے کے باعث آپ کا بہت سا بیش قیمت کلام ضائع ہوگیا۔ عمر بھر میں آپ نے جس قدر کہا تھا اُس سے کئی دیوان مرتب ہو سکتے تھے مگر اب انتہائی کوشش کے باوجود مختلف ذرائع اور مختلف رسالوں کی صبر آزما ورق گردانی سے نہایت مختصر کلام جمع ہو سکا ہے۔ خوش قسمتی سے آپ کے ہونہار شاگرد پنڈت کرشن بلدیو شرما نے آپ کے کلام کا کچھ انتخاب قلم بند کر رکھا تھا۔ جس سے اس ناکام سی کوشش میں کافی امداد ملی۔ اندریں حالات آپ کی شاعری پر ایک سیر حاصل تبصرہ کرنا ناممکن ہے۔ مضمون ہذا کو سپردِ قلم کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ مرحوم کی ایک نامکمل سی یادگار صفحۂ قرطاس پر رہ جائے۔

غزل، تاریخ، قصیدہ، سلام، رُباعی، مثنوی، مستزاد، مسدس
مخمس، ترکیب بند غرض جملہ اصنافِ سخن میں آپ نے طبع آزمائی کی تھی۔
مطالعۂ کتب کا آپ کو بے حد شوق تھا۔ آخر عمر تک اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے
روزانہ مطالعے میں مصروف رہتے تھے۔ تقریباً ہر روز کسی نہ کسی مشہور
فارسی یا اُردو شاعر کا کلام زیرِ مطالعہ رہتا تھا۔ فارسی اور اُردو کا کوئی ایسا
قابلِ ذکر شاعر نہیں تھا جس کے کلام کا آپ نے مطالعہ نہ کیا ہو اور اس کے
اچھے اچھے اشعار آپ کے دماغ میں محفوظ نہ ہوں۔

محترمی قیصری صاحب صرف عروض ہی کے فاضل نہیں بلکہ فصاحت
سادگیٔ بیان اور خیالات کی شستگی کے بھی دل دادہ تھے۔ زبان اور عروض
کی خامیوں سے آپ کو سخت نفرت تھی۔ ذوقِ سخن ایسا صحیح اور سلیم تھا کہ
شعر سنتے ہی اُس کے ادبی اور فنی عیوب و محاسن پر آپ کی نظر پہنچ
جاتی تھی۔ اچھے شعر کی جو آپ کے معیار پر پُورا اُترتا ہو نہایت فراخدلی
سے داد دیتے تھے خواہ شاعر نوجوان اور نو آموز ہی کیوں نہ ہو۔ اور
اس کے برعکس اگر کسی شعر میں زبان یا فن کی خامی دیکھتے تو خواہ وہ کسی
کہنہ مشق اور مشہور سے مشہور شاعر کا نتیجۂ فکر کیوں نہ ہوتا کبھی خاطر
میں نہ لاتے۔ مثلاً اقبالؔ کے اس مصرعے کو

کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

وہ ہمیشہ مبتدیانہ بلکہ ظاہر و باطن دونوں پہلوؤں سے سقیم الحال بتایا
کرتے تھے۔ شعر کی سب سے بڑی خوبی یہ سمجھتے تھے کہ سننے والا فوراً
سمجھ جائے نہ یہ کہ گورکھ دھندا سا معلوم ہو۔ آپ متروکاتِ زبان کے
بھی نہایت سختی سے پابند تھے یہاں تک کہ "پر" کو "پہ" کہنا بھی معیوب اور رکیک
سمجھتے تھے۔ طبیعت بہت حاضر نازُک تھی۔ بدیہہ گوئی میں بھی خاص
شہرت رکھتے تھے۔ مشکل سے مشکل اور سنگ لاخ زمینوں میں بھی
بے توقف شعر کہہ دیتے تھے۔ آپ کی بدیہہ گوئی کا ایک خاص واقعہ
مشہور ہے کہ حضرت طالبؔ میرٹھی فیروز پور کے ایک کالج میں پروفیسر
تھے۔ اچھے سخن ور اور بڑے سخن شناس تھے۔ آپ سے ملاقات ہوتے
ہی آپ کے گرویدہ ہو گئے۔ ایک رات کا ذکر ہے ساون کا مہینہ تھا
ہر دو احباب سیر کے لئے مال روڈ پر تشریف لے گئے۔ کسی نشیب میں
پانی بھرا ہوا تھا اور اس میں چاند کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ پروفیسر
صاحب نے فرمایا "آسمان پانی میں ہے" اور ساتھ ہی کہنے لگے۔ اس
ردیف اور قافیے میں کچھ فی البدیہہ ارشاد فرمائیے۔ اتنا کہنا تھا کہ جناب
قیصری نے اُسی جگہ یہ مطلع موزوں کر دیا

میرے رونے سے زمیں کیا آسماں پانی میں ہے
ماہ تو بھی صورتِ کشتی رواں پانی میں ہے

پھر سیر ہی سیر میں دس شعر کی غزل مکمل کر دی جو طالبؔ صاحب کو بہت
پسند آئی۔ افسوس کہ مکمل غزل دستیاب نہیں ہو سکی۔ البتہ مقطع یاد
ہے۔

تُو دکھا دے قیصری بحرِ سخن میں تیر کر
آج تیری شاعری کا امتحاں پانی میں ہے

اولاد

آپ کا چھوٹا لڑکا چودھری ابوالحسن جو فوج میں
بعہدہ جمعدار ملازم تھا۔ گذشتہ جنگِ عظیم میں
مارا گیا۔ اب آپ کا ایک لڑکا اور ایک لڑکی موجود ہے۔ صاحب زادہ
چودھری خادم محی الدین ایڈوکیٹ لائل پور میں پریکٹس کرتے ہیں
آپ کو والد مرحوم کے کلام کی بے حد تلاش ہے۔ اگرچہ آپ شعر نہیں
کہتے مگر بڑے سخن فہم اور سخن شناس ہیں اور مطالعۂ سخن کا کافی
شوق رکھتے ہیں۔

جناب قیصری نے اپنی صاحب زادی عزیزہ سکینہ کو بھی اعلیٰ تعلیم
سے بہرہ یاب کیا۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۳۹ء میں ایم اے
کا امتحان پاس کیا اور پھر ۱۹۴۳ء میں ایم۔ او۔ ایل کی ڈگری حاصل کی۔
اب آپ بھی اپنے بھائی کے پاس رہتی ہیں اور ان دنوں گورنمنٹ زنانہ
کالج لائل پور میں وائس پرنسپل ہیں۔ دورانِ تعلیم میں بھی آپ لاہور
کے کالجوں کے کئی مشاعروں میں شریک ہوتی رہیں اور آپ کا پاکیزہ
کلام بہت مقبول ہوتا رہا۔

یہ مختصر سی داستانِ حیات گذارش کر دینے کے بعد ضروری
معلوم ہوتا ہے کہ دست یاب شدہ کلام میں سے کچھ انتخاب بھی پیش
کیا جائے۔

فلک نے خوب خدمت کی ہمارے مضطرب دل سے
اسے جھولا بنایا شاہدِ تہذیبِ انساں کا

جہاں کی شادمانی ہم کو خوش دل کر نہیں سکتی
مہِ نو نے نشاطِ عید میں چھوڑا نہ غم اپنا
بیابانِ طلب میں گرم رَو ہم سا نہیں کوئی
تڑپتا ہے زمیں پر آج تک نقشِ قدم اپنا

اسیرِ دامِ ہوس ہیں قومیں عیش و عشرت سے۔ کہ ہے اک حلقۂ طوقِ غلامی دورِ پیمانہ

جو محوِ عیش ہو کر لطفِ آزادی کو کھو بیٹھے
کوئی دم کی ہنسی ان کو رُلائے گی لہو برسوں
عفونت ان گلی کوچوں میں پھیلی خونِ انساں کی
جہاں اُڑتی رہی بوئے شرابِ مشکبو برسوں
ہجومِ آرزو سے دل پریشاں حال رہتا تھا
خبر کیا تھی رہے گی آرزو کی آرزو برسوں
ہماری سادہ لوحی پر زمانہ مُسکراتا ہے
گلوں کو ڈھونڈتے ہیں ہم جہنم کے شراروں میں
پتا اتنا چلا گلشن میں بلبل کے نشیمن کا
نظر آئے جلے سے چار تنکے شاخساروں میں
نئی تہذیب شعلہ تھی شرر تھی برق تھی کیا تھی
لگا کر آگ شہروں میں یہ پہنچی کوہساروں میں
مزاج ہے مہِ نو کو مہِ کامل بنائیں ہم
ہر اک منزل سے آگے اور اک منزل بنائیں ہم
سمندر میں عجب طوفانِ پُر آشوب برپا ہے
اسی طوفانِ پُر آشوب سے ساحل بنائیں ہم
فلک سے بھی زمیں سے بھی سرِ عرشِ بریں سے بھی
یہی آواز آتی ہے کہ دل کو دل بنائیں ہم
خرد کی صوفشانی سے ارادوں کی بلندی ہے
برابر محفلِ انجم کے اک محفل بنائیں ہم

آرزوئے گل کے عنوان سے آپ کی ایک مختصر نظم اس قدر مقبول ہوئی کہ آپ سے متعدد مشاعروں میں پڑھوائی گئی ہے۔

شاہوں کے تاج و تخت سے الفت نہیں مجھے۔ مسجد سے بتکدے سے بھی رغبت نہیں مجھے
ہمیں تو کے ساجد سمیں نہیں پسند۔ گردشِ صبح و گیسوئے مشکیں نہیں پسند

شادی کی محفلوں میں بھی جایا نہ جائیگا۔ میرا تو ذکر کیا مرا سایہ نہ جائیگا
ہے عرض آستانۂ پروردگار پر
پہونچوں کسی شہیدِ وطن کے مزار پر

یہ مختصر چار شعر کی نظم اس امر کا ثبوت ہے کہ آپ کے دل میں جذبۂ حُبِّ وطن کس حد تک موج زن تھا۔

نظم میں سوز و گداز کا رنگ دکھانے کے لئے آپ کی نظم شہیدانِ کربلا کے یہ اشعار ملحوظ ہوں ؎

اللہ یہ شانِ شہیدانِ کربلا۔ ہے عرش آستانِ شہیدانِ کربلا
اندوہ و غم کی جنس فراواں لئے ہوئے۔ جاتا ہے کاروانِ شہیدانِ کربلا
اک حشر ہوگا حشر میں دیکھینگے جب سول۔ سوکھی ہوئی زبانِ شہیدانِ کربلا

اب غزلیات کا کچھ انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔ یہ صنف قیصری صاحب کی سخن گوئی کا جزوِ اعظم ہے ؎

یہ جی میں آتا ہے اک رات شمع سے پوچھوں
زیادہ لطف ہے جلنے میں یا جلانے میں
نہیں جہانِ محبت میں اشک بھی بے کار
یہ کام آتے ہیں دل کی لگی بجھانے میں

بہت کلام کے مشتاق ہیں کیا سند ہے۔ کہ جز کلیم کوئی قابلِ خطاب نہیں
نہ بھول حسنِ مجازی پہ اے دلِ ناداں۔ یہ آفتاب کی کرنیں ہیں آفتاب نہیں
نہ گھبرا اے بلبل ٹھکانے بہت ہیں۔ قفس ہیں بہت آشیانے بہت ہیں
محبت میں ہیں دُرفشاں میری آنکھیں۔ یہی موتیوں کے خزانے بہت ہیں
نہ آئے نہ آئیں گے اے قیصری وہ۔ بہانے بہت تھے بہانے بہت ہیں

فصلِ گل سمجھی مجھے دیوانۂ نازک مزاج
موج بوئے گل کی لائی بیڑیاں میرے لئے

میری وحشت نہ ہوئی ایک تماشا ٹھہری۔ دل ہے صحرا میں کبھی ہے کبھی صحرا دل میں
عشق پر حسن کا احسان بڑا ہوتا ہے۔ کاش رہ جائے مرے دل کی تمنا دل میں

میری یہ التجا ہے نسیمِ بہار سے
اٹکھیلیاں کرے نہ چراغِ مزار سے
باغِ جہاں میں غنچۂ تصویر کی طرح
شرمندہ ہوں میں آمدِ فصلِ بہار سے

سو گئی مرے عروج کی اُن کو یہ بعد مرگ
تھوڑی سی خاک رہ کے اُڑا دی مزار سے

میں مر مٹا مگر ابھی وحشت نہیں گئی
اٹھتی ہیں آندھیاں مرے مشتِ غبار سے

جناب قیصری اردو کی طرح فارسی کے بھی فاضل تھے۔ فارسی میں شعر بھی کہا کرتے تھے۔ فارسی میں ان کا ایک قطعہ اور ایک مکمل غزل مل گئی ہے۔ یہ دونوں چیزیں آپ نے بزمِ گرامی ہوشیار پور کے ایک سالانہ مشاعرہ میں ارشاد فرمائیں۔ قطعہ یہ ہے ؎

شعر در بزمِ گرامی من ز دور آوردہ ام
کرمکِ شب تاب پیشِ شمعِ طور آوردہ ام

شعر ہا نے اشک و آہے چند در دامانِ شوق
قیصری ایں تحفہ از فیروز پور آوردہ ام

اس قطعہ کی نسبت جناب جوش ملسیانی فرماتے ہیں یہ قطعہ نہیں ہے۔ بلکہ جناب قیصری کے انکسارِ طبع اور اوجِ سخن کا دل کش مجموعہ ہے۔ اب اس فارسی غزل کے چند اشعار ملحوظ ہوں ؎

گلگونیٔ اشکے بیں در دیدۂ خوں بارے
ایں لالہ نے روید در دامنِ کہسارے

ہم بزمیِ او ہا من از حیرت و از تمکیں
دیوار بہ تصویرے تصویر بہ دیوارے

ایں فیضِ بہارستے یا لطفِ نگارستے
ہر قطرۂ خونم شد یک قلزمِ زنگارے

یا محوِ مجازم کن یا درسِ حقیقت دہ
یا لعلِ لبِ یارے یا دیدۂ بیدارے

ہا ہم نتواں گشتن زرداری و خوش گوئی
یا دستِ گہر پاشے یا طبعِ گہر بارے

اتفاق سے راقم الحروف بھی اس مشاعرہ میں شریک تھا۔ آخری شعر پڑھتے وقت موصوف نے مجھ سے معذرت فرمائی۔ اور مجھے اس کلیہ سے مستثنےٰ قرار دیا۔ مجھے بخوبی یاد ہے۔ کہ فارسی دان حضرات نے اس غزل کی بے حد داد دی۔ اور ہر شعر کو کئی کئی بار پڑھوایا۔

تمام عمر زمانہ کی ناقدر شناسی اور تقدیر کی ستم ظریفی کے شاکی رہے۔ اس سلسلہ میں ذیل کے اشعار قابلِ توجہ ہیں۔ ہر شعر سے بے زاری کا اظہار ہوتا ہے ؎

قیصری کوئی نہیں قدر شناس، جو ہر
آپ کی طبعِ رسا پھول ہے ویرانے کا

دیکھا ہزار بار کہ عقلِ فلک خرام
پامال ہو گئی ہے غمِ روزگار سے

کہاں ہے میرے مقدر میں عشرتِ کامل
اگر شراب میسر ہوئی کباب نہیں

کسبِ ہنر کیا بھی تو قدرِ ہنر کہاں
ملتا ہے کوئی تشنۂ آبِ گہر کہاں

ایں طرفہ تماشہ ہیں۔ ناقدری دنیا ہیں
منصور سرِ دارے یوسف سرِ بازارے

گردابِ درد۔ موجِ بلا۔ شورِ مفلسی
ڈوبی ہے جا کے کشتیٔ بحرِ ہنر کہاں

ان میں سے ہر ایک شعر گویا جناب قیصری کی آپ بیتی کہانی ہے۔ زندگی کا بیش تر حصہ آپ نے ویرانے کا پھول بن کر بسر کیا۔ باوجود اتنی علمیت اور قابلیت کے اپنی ہنر مندی کا مظاہرہ نہ کر سکا۔ حالانکہ حق یہ تھا کہ آپ کی زندگی ہی میں آپ کا شمار ملک کے قابل شعرا میں ہوتا۔ افسوس کہ آپ کی عقلِ فلک خرام غمِ روزگار کے ہاتھوں بری طرح پامال ہوئی۔ اور یہ جوہرِ کامل ناقدری دنیا کا شکار رہ کر پیوندِ خاک ہو گیا۔ کسے خبر تھی کہ آپ کی تقدیر آپ کو جبری جلا وطنی کے لئے مجبور کر دے گی اور یہ بلند پایہ سخن ور غریب الوطنی کی ٹھوکریں کھاتا ہوا بے یار و مددگار بے کسی اور مفلسی کے مصائب میں پھنس کر مرقعِ عبرت بن جائے گا۔ آپ کی مفارقت سے فیروز پور کے ادبی اور شاعرانہ حلقوں میں جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ کبھی پُر نہیں ہو سکے گی۔ آپ کے قول ؎

تھی قیصری سے گرمیٔ ہنگامۂ جنوں
زنداں میں اب وہ شورِ سلاسل نہیں رہا

صفی لکھنوی

دودھیل مویشیوں کے تحفّظ کی تحریک

عام ہیں یہ نعمتیں سارے زمانے کے لئے
دودھ، گھی، کس کو نہیں درکار کھانے کے لئے

گائے بھینسیں، قدرتی چشمے ہیں، خالص شیر کے
بستیوں میں دودھ کی گنگا بہانے کے لئے

یہ بہائم ہیں، مگر کیسے جفاکش، بُردبار
حضرتِ انساں فقط باتیں بنانے کے لئے

نطق سے اِن پر فضیلت ہم کو حاصل ہے تو کیا
اِن جفاکش بے زبانوں کو ستانے کے لئے؟

خود غرض انسان اس مخلوقِ بے آزار کو
پالتا ہے صرف پیاس اپنی بجھانے کے لئے

دودھ جو بچّوں کا ان کے حق ہے، وہ پیتا ہے خود
رزق کی یہ کنجیاں ہیں ہر گھرانے کے لئے

جیتے جی تو خدمتیں کرتے ہی رہتے ہیں غریب
مر کے بھی تیّار سب کے کام آنے کے لئے

اُف نہیں کرتے زباں سے جھیلتے ہیں سختیاں
وقف، پیٹھ اِن کی ہمارے تازیانے کے لئے

اِن کی محنت سے جو غلّہ ہو، وہ سب نذرِ آپ کی
مستعد بے عذر خود بھوسا چبانے کے لئے

کارآمد یہ مویشی ہیں رہے اتنا خیال
خاص کر اس ملک میں دولت بڑھانے کیلئے

کھیتیاں ان کی عرق ریزی سے گر ہوتیں نہ سبز
آدمی محتاج پھرتے دانے دانے کے لئے

پالنا بھی ان کے بچّوں کو اُنہیں کا فرض ہے
ہیں جو حاضر دودھ میں ساجھا لگانے کیلئے

یا تو ان پاکیزہ نسلوں کی حفاظت کیجئے
یا تو خود طیّار رہئے ہل چلانے کے لئے

ڈیریاں ہندوستاں میں جا بہ جا کھُلوائیے
ہوں چراگاہیں بھی کچھ ان کے چرانے کیلئے

کیجئے باہم ذرا شیر و شکر ہو کر، یہ کام
آئیے میداں میں قسمت آزمانے کے لئے

رکھئے ایمانِ تجارت میں قدم رکھئے، حضور!
کیجئے کوشش کچھ اپنا گھر بنانے کے لئے

اختلافِ مذہب و ملّت کو رہنے دیجئے
کیا ضرورت اس کی ایسے کارخانے کے لئے

اتّفاقِ باہمی سے کیجئے ہر کار و بار
یہ شگون اچّھا ہے آیندہ زمانے کے لئے

آ گئے ہیں جب، صفیؔ! کچھ کام بھی کرتے چلیں
یوں تو دنیا میں سبھی آتے ہیں جانے کے لئے

انتصار نیوتنوی

اچھی بُری صُورتیں

اعلان زندگی کی بے شمار واقعاتی صورتیں ہیں جن کے دیکھنے اور سُننے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بذات خود اِس قدر گہری اور اعلیٰ ہیں کہ اُن کے لئے کسی اظہار یا واقعے کی ضرورت نہیں۔ عام طور پر ان صورتوں میں کوئی نفسیاتی نقطہ ایسا ضرور ملتا ہے جو ہمارے دل و دماغ کو صحیح آسودگی اور سکون دے سکے اور ہم یہ محسوس کر سکیں کہ یہ صورت ہمارے لاشعور میں پہلے سے موجود تھی۔ زندگی کی ایسی کوئی صورت دیکھنے کے بعد ہمارے احساس کی تمام قوتیں جاگ اٹھتی ہیں اور دل پر ایک خوش گوار آسودگی کے ساتھ ایک چوٹ سی لگتی ہے۔

ان اچھی بُری صورتوں میں پہلی شکل شوہر کا پیار ہے۔

شوہر کا پیار

بیگم۔ بس اب بند کیجئے کتاب۔ میرا دل گھبرانے لگا

شوہر۔ کیوں؟ دل کیوں گھبرانے لگا۔ گھما لاؤں چل کے تمہیں (پریشان ہوکر) کچھ طبیعت تو خراب نہیں ہے؟ تمہارا دل گھبراتا ہے تو میں ڈر جاتا ہوں۔

بیگم (ہنس کر) نہیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اب وہ صورت نہیں پیدا ہوگی مجھے شرمندگی ہے۔ میں اب انور کے خیال کو دل سے نکال دینا چاہتی ہوں۔ تم میرے شوہر ہو مجھے تمہارا سجدہ واجب ہے تمہاری موجودگی میں کسی غیر کا خیال —؟

شوہر۔ مگر یہ تمہارا قصور نہیں ہے ہماری یہ زندگی بہت سی صُورتوں سے عبارت ہے۔ ان میں ایک صورت یہ تھی کہ انور وقتی طور پر تمہارے ساتھ رہے اور تمہارے دل و دماغ پر چھا گئے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ تمہاری شادی اُن کے عوض میرے ساتھ ہوگئی اور تیسری انتہائی بھیانک اور خطرناک صورت یہ ہے کہ تم انھیں بھول نہ سکیں اور اب تک تمہارا دل گھبرایا کرتا ہے۔

بیگم۔ مگر اب میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ ایسی کوئی صورت پیدا نہ ہونے دوں گی۔ میں شرمندہ ہوں۔ بے حد شرمندہ۔ وہ کل مجھے مال روڈ پر نظر آئے تھے اس وقت سے دل گھبرا رہا ہے۔ آپ چھ ماہ سے برابر میری دلجوئی کر رہے ہیں۔ آپ کی محبت پچھلے واقعات بھول جانے پر مجبور کر رہی ہے۔ شاید کچھ دنوں کے بعد میں سب کچھ بھول جاؤں گی۔ سب کچھ، ہر بات میں خوش ہوں، مطمئن ہوں۔ میں بے حد خوش ہوں۔ ریڈیو پہ اس وقت ریکارڈنگ رہے ہوں گے، کوئی اسٹیشن لگائیے۔ (نغمہ)

یاد نہ کر دلِ حزیں بھولی ہوئی کہانیاں

(ہلکی سی دستک کے بعد)

انور۔ کیا میں آسکتا ہوں؟

شوہر۔ اوہو، انور صاحب۔ آئیے آئیے۔ ابھی آپ ہی کا ذکر تھا۔ ان کا دل گھبرا رہا ہے اور میں سوچ ہی رہا تھا (ہنس کر) "وہ جو آجائیں تو اس درد کا درماں ہوجائے"۔ کیوں بیگم ہے نہ بہت بڑی عمر ان کی؟

بیگم۔ کل آپ مال روڈ پر نظر آئے تھے۔

انور۔ میں پکچر جا رہا تھا۔ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟

بیگم۔ (اوبھی ہوئی سانس لےکر) ٹھیک ہوں۔ وقت کا صحیح مصرف ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ طبیعت گھبرایا کرتی ہے۔

شوہر۔ اچھا تو تم دونوں باتیں کرو۔ میں ذرا دفتر کے کمرے میں کچھ کام کر ڈالوں۔ ہے اجازت؟

انور۔ لیجئے۔ ہم آئے اور آپ چل دئے۔ یہ بھی کوئی اخلاق ہے۔

شوہر۔ (خندہ پیشانی سے) بھائی اخلاق اگر اپنوں میں اس طرح خرچ کیا جائے تو وہ دنیا میں کب تک زندہ رہے گا۔ بیچارے کی ننھی سی جان۔ اچھا میں چلا۔ (ہنستا ہوا چلا جاتا ہے)

بیگم۔ میں کہتی ہوں بلا کی شرافت ہے ان میں۔ اور کوئی ہوتا تو کیا تم اس بنگلے میں قدم رکھ سکتے تھے؟

انور۔ کیوں؟ کیا تم نے سارے پچھلے واقعات اُن سے بیان کر دئے

بیگم۔ میں نے محض واقعات ہی بیان نہیں کئے ان میں رنگ بھی بھرا ہے۔ باقاعدہ شاعری کی ہے۔

انور۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟

بیگم۔ میں اُن سے چھٹکارا چاہتی ہوں۔ مجھے اُن سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ وہ بے حد شریف ہیں اور سعدل۔ میری ذرا سی پریشانی پر اُن کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔ بے حد چاہتے ہیں مجھے مگر میں غیریت محسوس کرتی ہوں۔ البتہ تمہارا دل بہل گیا ہے شاید؟

انور۔ (طنزاً) جی ہاں خیال اچھا ہے۔ مجھے تو ساری زندگی اسی طرح رہنا ہے۔ آپ کے تصور سے کھیلنا ہے۔ آپ نے پہلے جو کچھ سمجھا تھا وہ بھی ٹھیک تھا اب جو کچھ سمجھیں گی وہ بھی ٹھیک ہوگا۔

بیگم۔ پھر آخر کیا کیا جائے۔ مجبوراً ہمیں ایک دوسرے کو بھول جانا پڑے گا۔ میں جس قدر تمہارا ذکر، تمہاری محبت کی تشریح اُن سے کرتی ہوں اُن کی وارفتگی بڑھتی جاتی ہے۔ اُن کو میری ہر خاطر منظور ہے۔ اسی لئے وہ مجھے اور تمہیں تنہا چھوڑ کر دفتر کے کمرے میں چلے گئے۔ مجھے بے حد چاہتے ہیں۔ اُنھیں میرا ہر انداز مرغوب ہے۔ حالانکہ میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے نفرت کریں۔ مجھے چھوڑ دیں۔

انور۔ اُنھیں یہاں بلاؤ تو۔ ظاہر ہے کہ وہ بلا ضرورت دفتر کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے ہیں اور اب اس تنہائی کا کوئی مقصد نہیں۔ پھر محبت اور اخلاق تو ہر انسان کا فرض ہے تمہیں بہرحال اب اُن کا خیال رکھنا چاہئے۔

بیگم۔ ابھی بلاتی ہوں (پکارتی ہے) فاروقی صاحب۔ فاروقی ابھی کہاں گئے آپ فاروقی صاحب۔

(پکارتی ہوئی کمرے سے باہر نکل جاتی ہے)

(وقفہ)

(واپس آکر) سُنا آپ نے وہ تو موٹر پر بیٹھ کر کہیں باہر نکل گئے۔ ملازم نے بتلایا کہ اب وہ کھانے کے وقت آئیں گے۔

انور۔ حد کر دی اُنھوں نے۔ میرا خیال ہے کہ اُنھیں میرے آنے سے تکلیف ہوئی۔ اب میں نہ آیا کروں گا۔

بیگم۔ تم نہیں آؤ گے تو وہ خود مجھے لے کر تمہارے بنگلے پر جائیں گے۔ مجھے یہ اُمید ہے۔

انور۔ تم اگر اُن سے اس قسم کا کوئی تقاضا کرو گی تو یہ تمہاری انتہائی زیادتی ہوگی۔

بیگم۔ میں مجبور ہوں۔ انور! اپنے دل سے مجبور ہوں۔ اُن کو مجھ سے کسی طرح نفرت نہیں ہوتی۔ وہ مجھے کسی طرح نہیں بھولتے۔ وہ میرے عاشق ہیں، میرے پروانے۔

(موٹر آتی ہے)

انور۔ فاروقی آگئے شاید۔ میں جاتا ہوں۔ ادھر سائیڈ سے نکل جاؤں گا۔

(انور چلا جاتا ہے اور فاروقی دوسرے دروازے سے داخل ہوتا ہے)

بیگم۔ (بگڑ کر) کہاں گئے تھے آپ؟

شوہر۔ (خندہ پیشانی سے) معاف کرنا بیگم۔ میں ایک بہت ضروری کام سے باہر چلا گیا تھا (اِدھر اُدھر دیکھ کر) کیا انور چلے گئے؟ اور تم نے اُنھیں روکا بھی نہیں۔ میں نے اسی لئے آنے میں جلدی کی۔ سوچا تھا کہ سب بیٹھ کر آپس میں کھانا کھائیں گے۔ چلو موٹر پر اُنھیں لے آئیں۔

بیگم۔ اب وہ نہیں آئیں گے۔ کیا تک ہے کہ ایک شریف آدمی آپ کے گھر آئے اور آپ باہر چلے جائیں۔

شوہر۔ (شرمندہ ہو کر) بیشک مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔ مگر میرے اُن کے تعلقات برائے نام تھے۔ تمہیں نے ایک دن ملوایا تھا پھر بعد کے حالات سے پتہ چلا جو تم نے مجھ سے بیان کئے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہو۔ وہ درجہ تو دراصل میں بھی حاصل نہیں کر سکا۔ اسی لئے میں نے تم دونوں کی تنہائی میں مخل ہونا مناسب نہیں

سبھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میری اس صاف گوئی پر تمہیں غصہ آئے گا۔ دراصل میں بے حد شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دو بیگم۔

بیگم۔ (متاثر ہو کر) معافی کی خواستگار تو میں ہوں۔ اس لئے کہ مجھے تعجب ہے آپ ان باتوں کو برداشت کس طرح کرتے ہیں۔ انور سے آج اسی مسئلے پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر مجھے کیا حق ہے کہ آپ کو اس طرح کی تکلیفیں دوں۔

شوہر۔ کیا خوب۔ محبت کرنا گناہ نہیں ہے۔ میں تم دونوں کی محبت سے محبت کرنے لگا ہوں۔ یہ سب زندگی کے اتفاقات ہیں اور ان کی تم تنہا ذمہ دار نہیں ہو۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ میں تمہارے دل میں اپنی محبت کا کوئی گوشہ پیدا نہیں کر سکا اور اپنے دل میں تمہاری حکومت کی سرحدیں دیکھ رہا ہوں۔ مجھے دُنیا میں اتفاقات سے کبھی شکایت نہیں ہوئی۔ تمہیں پُوری آزادی ہے کہ تم انور کے ساتھ شادی کر لو۔ یہ دُنیا، یہ سماج اور یہ خاندان کے لوگ کسی کی روح کو چھین کر کسی غیر کے سپرد نہیں کر سکتے۔ تم شوق سے جا سکتی ہو۔ میں تمہارے اس طریقے کو دُنیا، سماج اور خاندان سے منوالوں گا۔ تم اور انور خوش رہو گے اور دو انسانوں کی دِلی مسرّتیں صرف میری تنہا خوشی سے بہت زیادہ نہیں۔ تم جاؤ۔ میں سچّے دل سے تمہیں اجازت دے رہا ہوں۔

بیگم۔ اب میں نہیں جاؤں گی۔ آج سے انور کا خیال آپ نے ہمیشہ کے لئے مجھ سے چھین لیا۔

ہندوستان

ہمارا ملک جو اب آزاد ہے پہلے ایک نابینا مریض تھا۔ اُس کی بینائی اُسے کس طرح واپس ملی اُسے کن کن صورتوں سے دوچار ہونا پڑا، کیسے کیسے اتفاقات اُس کی زندگی میں درپیش ہوئے ایک مختصر سے خاکے میں دیکھئے۔

بیگم۔ میں کہتی ہوں تمہیں اپنی آنکھوں کا اپریشن ضرور کرانا چاہیئے تمہاری بینائی واپس آ جائے گی۔

شوہر۔ کس قدر ناسمجھی کی باتیں کرتی ہو۔ میں پیدائشی اندھا ہوں مجھے بینائی قدرت کی طرف سے نہیں ملی۔ یہ اپریشن قدرت کے خلاف ایک جنگ ہے۔

بیگم۔ اپریشن بھی قدرت ہی کا ایک کرشمہ ہے اُس کے خلاف جنگ نہیں۔ سائنس کی ترقیاں اس وقت اپنے عروج پر ہیں۔ کم از کم مجھے پورا بھروسہ ہے کہ اپریشن کامیاب ہوگا۔ مجھے ڈاکٹر احمد نے پورا یقین دلایا ہے اور میں نے اُن سے وعدہ کر لیا ہے کہ آپ کی آنکھوں کا اپریشن ضرور ہوگا۔

شوہر۔ تمہاری مرضی ورنہ میرے نزدیک تو میری بینائی ایک ایسا معجزہ ہے جیسے دن کے بعد رات نہ ہو۔

بیگم۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ اپریشن بہت کامیاب ہوا ہے کل تمہاری پٹی کھُلے گی اور اس دُنیا کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ روشنی کا احساس زندگی میں تمہیں پہلی بار ہوگا۔ مجھے دیکھو گے۔ خاندان کے اور لوگوں کو دیکھو گے۔

شوہر۔ ہاں اب تو مجھے بھی یہ احساس ہو چلا ہے کہ شاید میری روشنی مجھے مل جائے۔ پٹی کے اندر سے مجھے کچھ کرنیں نظر آنے لگی ہیں۔ دیکھو کل پٹی کھلنے پر کیا نتیجہ نکلے؟

(دوسرے دن)

شوہر۔ (انتہائی خوشی کے عالم میں) روشنی۔ روشنی۔ روشنی۔ میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ درخت، زمین، آسمان۔ میری آنکھیں مجھے پھر سے واپس مل گئیں۔ میں کس قدر خوش قسمت ہوں۔ بیگم آج میں نے پہلی مرتبہ تمہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تم کس قدر خوب صورت ہو۔ یہ درخت، یہ جھاڑیاں، یہ پھل پھول کس قدر حسین نعمتیں ہیں۔ بیگم میرے ساتھ آؤ میں تمہیں دکھاؤں (عالم دیوانگی) یہ دیکھو درخت اسے چھو کر دیکھو۔ یہ دیوار، یہ میری میز، یہ میرا پلنگ۔ مگر تم تو آنکھیں رو ڈالنے دیکھتی رہی ہو۔ معاف کرنا میں بھول گیا کہ تم ازل سے آنکھیں لے کر پیدا ہوئیں (ہنستا ہے اور متواتر ہنسے جاتا ہے)

(تھوڑی دیر کے بعد)

شوہر۔ (پریشان ہو کر) بیگم۔ بیگم۔ یہ کیا؟ اب تو ہر چیز میری آنکھوں کے سامنے دُھندلی ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہ تبدیلی کیوں ہو رہی ہے۔ کیا میں پھر اندھا ہو رہا ہوں (اور زیادہ پریشان ہو کر) یا خدا مجھے اپنے غضب سے بچا۔

آنکھیں دینے کے بعد مجھے پھر اندھا کر۔ یہ کیا؟ ۔ یہ کیا؟ چیزیں اور زیادہ دھندلی ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ کیا میری آنکھوں کی عمر اس قدر کم تھی (غصے میں) ڈاکٹر، اپریشن، بینائی یہ سب فریب تھا۔ پھر ڈاکٹر کو بلاؤ بیگم۔ ڈاکٹر۔ ڈاکٹر۔ میں پھر اندھا ہو رہا ہوں۔ بیگم۔ تم چپ کیوں کھڑی ہو۔ مجھے اندھا ہوتا ہوا دیکھ رہی ہو۔ بیگم۔ بیگم۔ بیگم

بیگم۔ (ہنس کر) آخر اس قدر شور کیوں مچا دیا۔ دراصل رات ہو گئی اور تم نے بجلی نہیں جلائی۔

کوئی نہ جانے

وہ فریب آرزو ہی کیوں نہ ہو
زندگی کو اک بہانہ چاہیئے

بہانہ زندگی کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے اور اُس کی صورت بعض حالتوں میں انتہائی تشویش ناک بن جاتی ہے۔ یہ بہانہ حقیقت سے ایک گریز کی صورت ہے۔ سنیئے۔

بیگم (اطمینان سے) تمہارا کشور آ جائے گا۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ جس طرح اور ملکوں سے واپس آ گیا اُسی طرح ایران سے اُس کی واپسی ساتھ خیریت کے ہوگی۔ میں نے اُس کی قدِ آدم تصویر تمہاری نگاہوں کے سامنے لگا دی۔ وہ دیکھو وہ کیا ہے تمہارا کشور۔ ہم دونوں کی نامستقل مزاج طبیعتوں پر کھڑا مُسکرا رہا ہے۔ ذرا اپنی طبیعت کو سنبھالو آج ڈاکٹر انور تمہیں آ کر دیکھیں گے اور اُن کا دل ٹوٹ جائے گا۔ وہ بہت دل لگا کر تمہارا علاج کر رہے ہیں اور تم روز بروز مضمحل ہوتے جا رہے ہو۔

شوہر۔ کس وقت آئیں گے انور

بیگم۔ بس اب آتے ہی ہوں گے۔ اور سُنا تم نے کشور کی شادی زلیخا کے ساتھ طے ہو گئی۔

شوہر۔ کیسی شادی؟

بیگم۔ واہ بھول گئے تم۔ کشور کے جانے کے ایک ہفتے بعد میں نے اس کا پیغام زلیخا کے ساتھ بھیج دیا تھا جسے ڈاکٹر انور نے منظور کر لیا۔ وہ اُنھیں کی لڑکی ہے نا؟

شوہر۔ مگر تم نے کشور کی رضامندی لے لی ہے؟

بیگم۔ وہ آئے گا تو پوچھ لوں گی۔ مجھے اس پر بھروسہ ہے۔ (موٹر آ کر رُکتا ہے) وہ ڈاکٹر انور آ گئے شاید۔

شوہر۔ شکر ہے خدا کا۔ آپ کی دوا سے کھانسی بہت کم ہو گئی۔ مجھے کوئی مرض نہیں ہے۔ میری بیوی کو صرف وہم سا گیا ہے (مسکرا کر) بجائے میرے آپ اُن کے وہم کا علاج کریں۔

ڈاکٹر۔ یہ صحت کی بہت بڑی دلیل ہے کہ مریض اپنے کو تندرست سمجھے۔

بیگم۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ آپ نے کشور کی یہ تصویر دیکھی ڈاکٹر صاحب۔ یہ اُس نے جرمنی میں بنوائی تھی (ٹھنڈی سانس) نہ جانے ہمارے گھر میں یہ سیّاح کیوں پیدا ہوا۔ جرمنی، انگلینڈ، امریکہ، فرانس گھومنے کے بعد اب عراق گئے ہیں۔

ڈاکٹر۔ حق تلفی تھی اگر نہ جاتے۔ مشرقی ممالک بُرا مان جاتے۔ (سب ہنستے ہیں) ہاں تو آپ اپنا حال بتائیے سلیم صاحب۔ آپ لیٹ جائیے تو میں آلے سے آپ کا سینہ دیکھوں۔ میرا تو خیال ہے آپ کو کوئی خاص مرض نہیں ہے۔

شوہر۔ زاہدہ! تم ڈاکٹر صاحب کے لئے چائے کا انتظام کرو۔ میں نے تو آپ سے ہمیشہ یہی کہا کہ مجھے کوئی مرض نہیں ہے البتہ ایک فکر ہے آپ سے بیان کر دینے میں کوئی حرج نہیں مگر ڈرتا ہوں۔

ڈاکٹر۔ اگر آپ مجھے بتا دیں تو مجھے آپ کے علاج میں بہت مدد ملے گی۔ کیا کوئی ایسی بات ہے جس کو آپ چھپانا چاہتے ہیں

شوہر۔ ہاں پھر سوچتا ہوں کہ شاید کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ میں آج آپ سے ایک خفیہ بیماری کا اظہار کروں گا۔ مگر وعدہ کیجئے کہ اس راز کو آپ کبھی اپنی زبان پر نہیں لائیں گے۔

ڈاکٹر۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ یقین کیجئے۔

شوہر۔ (مضمحل آواز) کشور کی اس تصویر کو دیکھا آپ نے۔ میری بیگم ابھی آپ سے بتلا رہی تھیں کہ اُنھیں کشور کا بے چینی سے انتظار ہے۔ مگر ——

ڈاکٹر۔ ہاں، ہاں کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟

شوہر۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ میرے دل سے نہیں نکلتا منھ سے ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کشور اس دنیا میں زندہ نہیں ہے، وہ مر چکا ہے۔

ڈاکٹر۔ (گھبرا کر) ہیں۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ، سلیم صاحب۔

شوہر۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں ڈاکٹر صاحب (آواز تھرتھرا جاتی ہے) وہ جہاز سمندر میں ڈوب گیا جس پہ کشور سفر کر رہا تھا۔ بعد میں مرنے والوں کی ایک لسٹ شائع ہوئی جس میں کشور کا نام بھی تھا۔ حقیقت ہے کہ وہ مر گیا۔ مگر میں نے بیوی کو نہیں بتایا۔ مجھ سے بتایا نہیں گیا۔ وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکتی۔ بس یہی میرا مرض ہے، کس قدر مہلک اور جان لیوا ہے۔ وعدہ کیجئے کہ میری بیوی کو اس کا علم نہیں ہوگا۔ ذرا میرے ساتھ اس تصویر کے قریب چلئے۔ میرے اس مرض کو قریب سے چل کر دیکھئے۔ کس قدر خوش رو جوان ہے۔ وکالت اس نے انگلینڈ ہی میں رہ کر پڑھی۔ وہ اس پیشے کو پسند بھی کرتا تھا۔

بیگم۔ اچھا آپ لوگ میرے کشور کا فوٹو پھر دیکھ رہے ہیں۔ یہی دکھا رہے ہوں گے۔ ہر ایک کو فوٹو دکھایا کرتے ہیں۔ بہت یاد کرتے ہیں یہ، ڈاکٹر صاحب! کشور کو۔

ڈاکٹر۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجئے بہت کام ہے۔

شوہر۔ ڈاکٹر صاحب — ؟

ڈاکٹر۔ آپ اطمینان رکھئے آپ کو کوئی مرض نہیں ہے خوش رہنے کی کوشش کیجئے۔ سکون و آرام کی ضرورت ہے۔

بیگم۔ یہی تو میں کہا کرتی ہوں ڈاکٹر صاحب۔ اب آپ اپنے بستر پر جایئے ورنہ طبیعت بھاری ہو جائے گی۔ چلئے ڈاکٹر صاحب میں آپ کو پھاٹک تک پہونچا آؤں۔ (وقفہ)

دیکھا آپ نے ڈاکٹر صاحب سلیم صاحب کی بے قراری۔ ایک منٹ کے لئے بھی اس کے خیال سے غافل نہیں رہتے۔ مگر آپ کو نہیں معلوم کہ کشور مر گیا ہے۔ وہ جہاز ہی ڈوب گیا جس پہ وہ سفر کر رہا تھا۔ میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھ کر ان سے چھپا ڈالی۔ اگر وہ سنتے تو ان کے دل کی حرکت بند ہو جاتی میں عمداً ایک خود فریبی میں مبتلا ہوں کہ شاید یہ خبر غلط ہو۔ اس کے آنے کی دعائیں مانگا کرتی ہوں۔ ہماری زندگی کا یہ ایک بہانہ ہے۔

باقر رضوی

نہ سہی

نوحۂ غم ہی سہی کان میں کچھ تو گونجے
شادیانے نہ سہی نغمۂ شادی نہ سہی
گر نہیں پھول تو کانٹوں ہی سے دامن الجھے
قلب میں ایک خلش سی ہو تسلی نہ سہی
کسی عنواں بنوں محرمِ رازِ گیتی
نہ سہی تا بہ سرِ عرش رسائی نہ سہی
کسی اسلوب مجھے غم ہی گوارا ہو جائے
عیش کی آب و ہوا راس نہ آئی نہ سہی
خاک مجنوں کے ہر اک سمت بگولے اٹھیں
نجد کے دشت میں نظارۂ لیلیٰ نہ سہی
کچھ نہیں اور تو پینے کو ہلاہل مل جائے
مے و مینا نہ سہی جام و گلابی نہ سہی
وہم کی بھول بھلیاں میں بھٹک کر رہ جاؤں
سامنے طورِ حقیقت کی تجلی نہ سہی
کفر کی چھاؤں میں آرام کے دم تو لے لوں
نہ سہی جادۂ ایمان کا راہی نہ سہی

اور یہ کچھ نہیں منظور تمہیں تو شب و روز
مجھ کو چھوڑ دو نہیں یہ بھی نہیں وہ بھی نہ سہی

دیوان چند شرما

دُنیا کے شہری - رابندر ناتھ ٹیگور

ایک اچھا شہری بننا کوئی آسان کام نہیں - ایک ایسا وقت بھی تھا جب لوگ شہریت کی طرف بالکل توجہ نہیں کرتے تھے - اُن کا خیال تھا کہ شہریت ہر ایک انسان خود بخود اپنے ماحول سے سیکھ لیتا ہے - اُنہیں یہ بتلانا کہ ایک اچھے شہری میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں اُن کی ہتک کرنا تھا - ہر ایک مُلک میں متعدد قانون رائج ہوتے ہیں اور جب تک اُس دیش کے رہنے والے اُن قانونوں کو مانتے اور اُن پہ عمل کرتے ہیں - تب تک وہ اچھے شہری ہیں - وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ جو لوگ اُن قانونوں کے خلاف چلتے ہیں - اُن کو کیا سزا ملتی ہے - اس لئے بھی وہ قانونوں کی حد میں ہی رہتے ہیں - ایک شہری کے کیا فرائض ہیں اور کون سی اُس کو اپنے مُلک میں سہولتیں ملتی ہیں ہر بالغ انسان جانتا ہے - اس لئے لوگوں کو شہریت سکھلانا اُن کے وقت کو ضائع کرنا ہے - یہ تھا خیال جو تقریباً اُنیسویں صدی کے خاتمے تک یورپ میں رائج تھا - لیکن جُوں جُوں یورپ میں جمہوریت زور پکڑاتی گئی - لوگوں میں یہ یقین بڑھتا گیا کہ بچوں کو اور جوانوں کو ، بوڑھوں کو اور عمر رسیدہ لوگوں کو شہریت کی تعلیم دی جانی چاہیئے - یہ تعلیم سکولوں اور کالجوں، یونیورسٹیوں اور دوسرے تعلیم کے مرکزوں میں رائج ہونی چاہیئے - اخبار اور سبھائیں ایسی ہونی چاہئیں جو اِس تعلیم کو پھیلائیں - یہی سبب ہے کہ آجکل دُنیا کے ہر ایک مُلک میں اسکولوں میں شہریت کی تعلیم دی جاتی ہے - انگلستان میں تو چند ماہر تعلیم ایسے موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اسکولوں میں تو ہر ایک مضمون اس طریقے سے پڑھایا جانا چاہیئے جس سے لڑکے اور لڑکیوں میں شہریت کا احساس بڑھے - یہی نہیں یونیورسٹیوں میں بھی ایسی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے۔

جس وقت رابندر ناتھ ٹیگور طالب علم تھے ۔ اُس وقت لوگ شہریت کو ہندوستان میں سمجھتے ہی تھے - اُس وقت شہریت کا مضمون نہ ہی تو کہیں ہمارے مُلک میں پڑھایا جاتا تھا اور نہ اِس کا لوگ چرچا کرتے تھے - لیکن رابندر ناتھ کو یہ سبق قدرت نے ایسا پڑھایا کہ وہ نہ صرف اپنے دیش کے ہی بلند ترین شہری بنے بلکہ اُنھوں نے لوگوں کے منہ سے کہلوایا کہ وہ برّاعظم ایشیا کے ممتاز شہری ہیں یہی نہیں آج سارے دُنیا کے لوگ مانتے ہیں کہ وہ ساری دُنیا کے شہری تھے - یہ اعلےٰ رتبہ موجودہ ہندوستان میں صرف دو ہستیوں کو نصیب ہُوا ہے اور وہ ہیں مہاتما گاندھی اور رابندر ناتھ - آج دنیا کے ہر ایک کونے سے یہ آواز آرہی ہے کہ ہندوستان کے اِن دو سپوتوں نے دُنیا کے رہنے والوں کو وہ راستہ دکھلایا ہے جس پر چل کر انسان ساری دُنیا کو ہی اپنا وطن سمجھ سکتا ہے - دراصل ہندوستان میں یہ خیال کوئی نیا نہیں - سنسکرت کے ایک شلوک میں جس کو عام پڑھے لکھے بھی جانتے ہیں کہا گیا ہے کہ یہ میرا ہے اور وہ پرایا ہے - ایسا خیال چھوٹے دل والوں کا ہوتا ہے جو لوگ فراخ دِل رکھتے ہیں - اُن کے لئے سارا سنسار ہی اُن کا کٹمب ہے - یہ خیال تو پُرانا ہے لیکن بیسویں صدی میں رابندر ناتھ اور مہاتما گاندھی نے اس کو عملی شکل دے کر ساری دنیا کو حیران کر دیا - لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے - کہ اُنھوں نے اس خیال کو صرف لفظوں میں ہی پیش نہیں کیا - اب تو کئی کر چکے ہیں اور کئی ادا کر سکتے ہیں - اُن کی بڑائی اس بات میں تھی کہ اُنھوں نے اپنے کام سے اس خیال کو مضبوط کیا -

دراصل دُنیا کا شہری ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم انسانیت کے مذہب کے پیرو ہوں - یہ کام کوئی آسان نہیں - ایک انسان کو لیجئے جس کو میں شہری ایکس کا خیالی نام دیتا ہُوں - یہ صاحب ایک گاؤں میں پیدا ہوتے ہیں اور بہت سا وقت اُن کی دُنیا اُن کے گاؤں

تک ہی محدود رہتی ہے۔ جب یہ فرا بڑے ہوتے ہیں تو انھیں پتہ چلتا ہے کہ یہ گاؤں ایک ضلعے کا چھوٹا سا حصّہ ہے۔ پھر وہ کبھی کبھی اپنے ضلعے کا بھی خیال کرتے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد انھیں یہ احساس ہوتا ہے کہ اُن کا ضلع تو ایک صوبے کا چھوٹا سا حصّہ ہے۔ پھر اُن میں اپنے صُوبے کے سمبندھ میں ایک نئی حِس پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہم یہ سمجھیں کہ اُن کی روحانی اور دماغی حالت ترقی کرتی جاتی ہے تو ایک دن ایسا بھی آسکتا ہے جب اُن کو یہ خیال آئے کہ ہمارا صوبہ تو ہمارے مُلک کا ایک چھوٹا سا کونا ہے۔ غرضیکہ اُن کے دِل میں وطن پرستی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ تو یہاں تک ہی اپنے نظریے کو محدود رکھتے ہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ ہمارے شہری ایکس کو یہ خیال بھی آئے، کہ ہمارا ملک تو ایک برِّاعظم کا حِصّہ ہے۔ جب اُن پر یہ خیال حاوی ہو، تو اُس کا مطلب یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے نظریئے کو وسعت دے دی ہے۔ اگر اُن کا دماغی اور روحانی وِکاس یہاں تک ہو جائے کہ وہ اپنے برِّاعظم کو بھی دُنیا کا حِصّہ سمجھنا شروع کر دیں اور انھیں ہر ایک بات اسی ہی روشنی میں دیکھنے کی عادت پڑ جائے، تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ صاحب تو اب دنیا کے شہری بن گئے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اب اُن کو اپنے گاؤں، ضلع، صوبہ، مُلک اور برِّاعظم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ایسے اِنسان تو اُس درخت کی طرح ہیں جس کی جڑیں اُکھڑ چکی ہیں، اور جو صرف ہوا میں ہی اُڑ رہا ہے۔ دُنیا کا شہری بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہماری جڑیں تو ہمارے مُلک میں ہوں، لیکن ہماری نشو نما کا دائرہ سب دُنیا پر ہو۔ اگر ہم نے یہ سمجھنا ہو کہ اِس خیال کو رابندر ناتھ نے کِس طرح عملی جامہ پہنایا، تو ہمیں وِشو بھارتی جانا چاہیئے جس کو اُنھوں نے اِس لئے قائم کیا کہ وہ ایک بین الاقوامی مرکز بنے۔ وہاں اُنھوں نے سب سے پہلے یہ کوشش کی کہ لوگوں کو ہندوستان کی ایکتا کا احساس ہو۔ یہ ایکتا اُن کے لئے چیزوں، اگر نقوں، راگ وِدیا اور دوسری ایسی چیزوں میں موجود تھی، جس میں اِنسان اپنی اصلی رُوح کو بند کرتا ہے۔ وِشو بھارتی میں جہاں اُنھوں نے بنگال کے ساتھ آرٹ اور راگ کے نمونوں کو جمع کیا، وہاں اُنھوں نے دوسرے صُوبوں کے بھی بہترین نمونوں کو اکٹھا کیا۔ اُنھوں نے اسبات میں نہ ہی صوبجاتی

امتیاز اور نہ ہی مذہبی اختلافوں کا خیال کیا۔ پنجاب سے لے کر بنگال تک اور آسام سے لے کر بمبئی تک، اِن تمام صوبوں کے بہترین کام کو انھوں نے لوگوں کے سامنے رکھا۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ ایک عجائب گھر بنانا چاہتے تھے بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ لوگ دیکھیں کہ منی پوری کے ناچ میں اور ٹراونکور کے ناچ میں کیا مطابقت ہے جہاں ان میں کئی اختلافات بھی ہیں وہاں ان میں ایک بنیادی ایکتا بھی ہے۔ یہی نہیں انھوں نے وہاں مختلف صوبوں کے رہنے والوں کو اکٹھا کیا تاکہ وہ ایک دوسرے سے مل کر اور تبادلہ خیالات کر کے اپنی اصلی ایکتا کو سمجھیں۔ لیکن اگر وہ اپنے کام کو یہاں تک ہی رہنے دیتے تو ہم اُن کو ہندوستان کا ایک اعلےٰ شہری سمجھتے یا اُن کو ایک بڑے دیش بھگت مان کر اُن کے سامنے اپنا سر جھکاتے۔ مگر اُنھوں نے اس سے آگے بھی ایک قدم بڑھایا جو خاص خاص انسانوں کا ہی کام ہے۔ انھوں نے وہاں ایشیا کی ایکتا کو بھی دِکھانے کا انتظام کیا۔ وِشو بھارتی کے اِس حصّے میں اُنھوں نے برما، ملایا، تبت، چین اور جاپان اور دوسرے مُلکوں کی ایسی تصویر پیش کی، جس سے لوگوں کو یہ پتہ لگے کہ اِن مُلکوں کا ہندوستان کے ساتھ، اور دوسرے مُلکوں کے ساتھ گہرا رشتہ ہے۔ یہ سب ایک ہی جسم کے مختلف انگ ہیں۔ یعنی انھوں نے ان دلیلوں سے مختلف چیزیں اکٹھی کر کے لوگوں کو ایشیا کی ایکتا کا احساس کرا دیا۔ لیکن یہ احساس انھوں نے صرف بے جان چیزوں کے ذریعے سے ہی نہ کرایا بلکہ وہاں اِن مُلکوں کے عالموں کو اکٹھا کر کے لوگوں کو یہ ظاہر کر دیا، کہ بنیادی طور سے ایشیا کے مختلف مُلکوں کے رہنے والے ایک ہی ہیں۔ اُن کے رواج اور اُن کی پوشاک، اُن کی گفتگو اور اُن کے رہنے سہنے کے طریقے ایک دوسرے سے مختلف کیوں نہ ہوں۔ لیکن اُن کے دل اور اُن کی روح میں یگانگت ہے۔ یہ کام ایک بڑا اعلےٰ تھا، لیکن اُنھوں نے اس پر ہی تسلی نہ کی اُنھوں نے آگے چل کر دُنیا کی ایکتا کا لوگوں کو اُپدیش دیا۔ یوروپ اور امریکہ کے آرٹ کے ذریعے سے اُنھوں نے آگے چل کر دُنیا کی ایکتا کا لوگوں کو اُپدیش دیا۔ یوروپ اور امریکہ کے آرٹ کے ذریعے سے اُنھوں نے یہ بتلایا کہ اس میں اور ہندوستان اور ایشیا کے آرٹ میں ایک ہی سچائی کا اظہار ہے۔ دراصل یہ مُلک ایک دوسرے سے مختلف نہیں بلکہ یہ ایک

ہی دنیا کے مختلف حصے ہیں، اور ان میں بنیادی اصول یکساں ہیں۔
یہ بنیادی اصول اِنسان کی رُوح سے سمبندھ رکھتے ہیں اور اگر ہم ان روحانی
سچائیوں کی طرف توجہ کریں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان میں
سب سے اعلیٰ خوبی اُس کی انسانیت ہے۔ اس کو ہی وہ اِنسان
کا دھرم سمجھتے تھے اور اس کو ہی وہ بڑھانا چاہتے تھے۔ اِسی
اِنسانیت کے دھرم کا اُپدیش وہ دُنیا کے بڑے بڑے شاستروں میں
دیکھتے تھے اور اُن کا خیال تھا، کہ اِس کی ہی تلقین دنیا کے بڑے
بڑے پیغمبروں نے کی ہے۔

اُن کا خیال تھا کہ چونکہ لوگ ایشور کو بھول گئے ہیں، اور
رُوح کی اصلیت کو نہیں جانتے۔ اِس لئے ہی دنیا میں آج کل اشانتی
اور فساد ہیں۔ جب وہ ایک دفعہ جرمنی میں گئے۔ تو اُنھیں جرمنی
کے کچھ بچوں نے پھول پیش کئے۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے اُنھوں
نے کہا۔ کہ ہم آپ کی عزت اِس لئے کرتے ہیں۔ کہ آپ ایک ایسے
مُلک سے آئے ہیں۔ جس سے ہم پریم کرتے ہیں۔ چونکہ ہم آپ کے
مُلک سے پریم کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے
ہیں۔ پھر جب اُنھوں نے پوچھا، کہ آپ میری عزت کیوں کرتے
ہیں، تو اُن بھولے بچوں نے کہا، کہ اِس لئے کہ آپ ایشور سے پریم
کرتے ہیں۔

یہ سُن کر اُنھوں نے فرمایا کہ یہ بچے میری حد سے زیادہ تعریف
کر رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں۔ سچ ہو۔
دُنیا اس وقت ایسے مُلک کے انتظار میں ہے، جو پرماتما سے اپنے
آپ سے بڑھ کر پریم کرتا ہے۔ یہ تھا اُن کا دُنیا کے شہری ہونے
کا بنیادی اصول۔ یعنی وہ اِس ایکتا کی بنیاد پرماتما پر رکھنا چاہتے
تھے یا اُن اصولوں پر جن کا تعلق اِنسان کی رُوح کے ساتھ ہے یعنی
وہ قوموں کی روحانی کامن ویلتھ چاہتے تھے جو دوستی ایک ملک کی دوسرے
ملک کے ساتھ اس لئے ہوتی ہے، کہ انھیں ایک دوسرے کے ساتھ
تجارت کر کے فائدہ ہوتا ہے۔ اس کو وہ دیرپا نہیں سمجھتے تھے
اگر دوستی اس بنا پر ہے۔ کہ وہاں ایک ہی نسل کے لوگ رہتے
ہیں، تو بھی یہ گہری نہیں۔ اگر ملکوں کو اُن کے فوجی مفاد اِکٹھا
کرتے ہیں، تو بھی یہ بات بہت دیر تک نہیں چل سکتی۔ دوستی کی
یہ بنیادیں اُن کی نظروں میں کمزور تھیں۔ طاقت جو بیرونی اور
جسمانی ہے، اُن کو پسند نہ بھاتی تھی۔ وہ دُنیا کے شہری اس لئے
تھے، کہ انھیں ہر ایک اِنسان کے اندر خواہ وہ کسی ہی
مُلک کا رہنے والا کیوں نہ ہو، ایک ہی رُوح نظر آتی تھی۔ یہی سبب
تھا، کہ اُنھیں دوسروں کو دُکھ یا مصیبت میں دیکھ کر نہایت رنج
ہوتا تھا جب وہ رُوس میں گئے، تو انھیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ
وہاں تعلیم کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن انھیں یہ
دیکھ کر رنج ہُوا کہ وہاں لوگوں کو اس بات کی آزادی نہیں، کہ وہ اپنے
خیالات کو کھلے طور پر ظاہر کر سکیں۔ چنانچہ اُنھوں نے لکھا۔ میں آپ
کو بتلانا چاہتا ہوں، کہ میں آپ کی اُس ہمت کا مداح ہوں جس کی
بدولت آپ نے عام لوگوں میں وِدیا کا پرچار کیا ہے۔ آپ نے
اس سچائی کو مان لیا ہے۔ کہ سماجک بُرائیوں کو دور کرنے کے لئے
انسان کو ان کی جڑوں تک پہنچنا چاہیئے اور وہ تب ہی ہو سکتا ہے
جب ہم تعلیم کو پھیلائیں۔ اس لئے میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں،
اور وہ یہ کہ کیا آپ اپنے آدرش کی سیوا کر رہے ہیں جب آپ اُن لوگوں کے
خلاف جن کے خیالات آپ سے مختلف ہیں غصہ اور سماجک نفرت پھیلاتے
ہیں۔ آپ ایک جہانی کام کے لئے قربانی کر رہے ہیں۔ اس لئے آپ کے من بھی
جہان ہونے چاہئیں۔ آپ کی دیا جہانی، آپ کی بُدھی جہان اور آپ کا صبر جہان
ہونا چاہیئے۔ اُن کے ان خیالات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ کونسی خوبیاں دنیا
کے انسانوں کے اندر دیکھنا چاہتے تھے۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ دنیا کے لوگ
ایک دوسرے سے نہ ہی غصہ کریں اور نہ ہی نفرت۔ غصہ اور نفرت اُن کی
نگاہ میں انسانیت کے دھرم کے لئے زہر قاتل تھے۔ اُن کی بجائے وہ یہ
چاہتے تھے کہ دنیا میں دیا بڑھے۔ ہماری عقل اتنی روشن ہو کہ ہم ایک دوسرے
کو ٹھیک طرح سمجھ سکیں ہم میں ایک دوسرے کے لئے اتنی بُردباری ہو کہ
ایک دوسرے سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر نہ اُلجھ پڑیں۔ یہ تھے بنیادی اصول
اُن کی نظر میں انسانیت کے دھرم کے۔ اِنہی اصولوں کا انھوں نے اپنی
کویتا، ڈراموں، گیتوں اور کتابوں میں پرچار کیا۔ اِنہی اصول کی کسوٹی
پر انھوں نے ہر ایک ملک اور ہر ایک تحریک کو پرکھا۔

یہ کہنا کہ انہوں نے صرف دُنیا کی شہریت کے اصولوں کو واضح کیا، ٹھیک نہیں۔ وہ ایک ایسے انسان تھے جنہیں سفر کرنے کا بڑا شوق تھا۔ جب سے انہوں نے ہوش سنبھالا۔ انہیں سیاحت کا شوق صرف ہندوستان کے کونے کونے میں ہی نہ لے گیا۔ بلکہ انہوں نے دُنیا کا کونہ کونہ چھان مارا۔ چین اور جاپان، جنوبی امریکہ۔ اٹلی۔ سوئٹزرلینڈ۔ ناروے۔ ڈنمارک۔ جرمنی چیکوسلاویکیہ۔ بلقان۔ یونان، مصر۔ ملایا۔ سیام۔ انڈونیشیا۔ سیلون، کینیڈا ویٹ نام۔ فرانس۔ انگلینڈ۔ رُوس۔ پرشیا۔ عراق۔ یونائیٹڈ سٹیٹس۔ ان سب ملکوں کی انہوں نے سَیر کی۔ کئی ملکوں میں تو وُہ ایک بار سے زیادہ بھی گئے۔ جہاں جہاں وُہ گئے، ان کی شخصیت اور ان کے خیالات نے وہاں کے رہنے والوں کے دلوں کو مُٹھی میں کر لیا۔ جب وُہ پہلی جنگ کے بعد جرمنی میں گئے۔ تو انہیں وہاں کے لوگوں کی حالت کو دیکھکر بہُت ترس آیا۔ اور انہوں نے دُنیا کے فاتح ملکوں کو کہا کہ جرمنی کے لوگوں کے ساتھ ہمدردی کریں، اُن میں کچھ ایسی طاقت تھی کہ جہاں کہیں بھی وُہ جاتے تھے وہاں کے لوگ ان کو اپنا ہی سمجھنا شروع کر دیتے تھے۔ چاہے اُس مُلک کے سارے پڑھے لکھے لوگ اُن سے پریم کریں یا نہ کریں۔ لیکن اُن ملکوں کے بچّے تو اُن کے بڑے ہی دلدادہ ہو جاتے تھے۔ جو پریم وُہ اُن سے ظاہر کرتے تھے۔ وُہ لاثانی ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے دل اور رُوح میں ایک کشش ہے۔ جو اِن بچّوں کو ان کی طرف مقناطیس کی طرح کھینچتی ہے۔ یہ اُن کے عالمگیر دل کی سب سے بڑی نشانی تھی۔

دُنیا میں ایک اچھا شہری بننا مشکل کام ہے، لیکن ایک ایسا شہری بن کے دکھانا۔ جو ساری دُنیا کو ہی اپنا وطن سمجھے ایک معجزہ ہے۔ یہ معجزہ رابندرناتھ نے اور مہاتما گاندھی نے کر کے دکھایا۔ اس وجہ سے ان کا نام صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ دُنیا کے کونے کونے میں مشہور ہے۔ دُنیا میں اس وقت بہُت کش مکش ہے۔ اور بے چینی ہے۔ مشرق اور مغرب کے جھگڑے زوروں پر ہیں۔ اور خیالات کی لڑائی تیزی سے جاری ہے۔ صرف یہی نہیں۔ کہ ایک ملک کے لوگ دوسرے ملکوں کے لوگوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک مُلک کے اپنے باشندے ہی ایکدوسرے کے ساتھ دوستی کے تعلّقات نہیں رکھتے۔ ایسے سب لوگوں کیلئے رابندرناتھ کی مثال روشنی کا مینار ہے۔

بشن داس زار

فسانہ ہمارا

وُہ سنتے ہیں سب سے فسانہ ہمارا — بدلنے کو ہے اب زمانہ ہمارا
ہوئے آبدیدہ وہ شرحِ وفا سے — تُلا موتیوں میں فسانا ہمارا
قیامت بھی سر پر جو گزرے تو گزرے — چمن میں رہے آشیانا ہمارا
کُچھ اپنی وفائیں کُچھ اُن کی جفائیں — ہُوا یوں مُرتّب فسانا ہمارا
کہیں توڑ کے گا حوادث کا طوفاں — کہیں تو بنے گا ٹھکانا ہمارا

نہیں زارؔ تاب سماعت کسی میں
خُدارا نہ چھیڑو فسانا ہمارا

رفتارِ زمانہ

صنعت و حرفت کی سنٹرل ایڈوائزری کونسل میں وزیر صنعت و حرفت ڈاکٹر شیام پرشاد مکرجی نے ہندوستانی کارخانہ داروں کو یقین دلایا ہے کہ اگر غیر ملکی سرمایہ داروں کو اس ملک میں کارخانے کھولنے کی اجازت دی گئی تو پہلے ان سے ضرور مشورہ کیا جائیگا۔ لیکن جب غیر ملکی صنعتیں یہاں قائم ہو جائیں گی تو ان کا درجہ بھی وہی ہوگا جو دیسی صنعتوں کا ہے۔ وزیر صنعت و حرفت نے فرمایا کہ حکومت اس بات پر غور کر رہی ہے کہ چند غیر ملکی کمپنیوں کو ہندوستان میں موٹر سازی کی اجازت دے دی جائے۔

ریاستوں کی یونینوں کے راج پرمکھوں نے اس امر پر آمادگی ظاہر کی ہے کہ ان کی فوجی جمعیت کو ہندوستانی فوج میں مدغم کر لیا جائے۔ ان افواج کی تعداد اور ان کو ہندوستانی فوج کے معیار پر پہنچانے کے طریق کار کا بھی تصفیہ ہو چکا ہے۔ حکومت ہند کو پیشکش کی گئی ہے کہ اگر وہاں کے باشندگان ہندوستان کے ساتھ مدغم ہونے کے حق میں رائے دیں، تو انڈین یونین میں فرانسیسی آبادیوں کو بھی بطور "خود مختار ریاست" شامل کر لیا جائے۔

شری جے رام داس دولت رام وزیر خوراک نے صوبائی اور ریاستی وزرائے خوراک کی کانفرنس (منعقدہ نئی دہلی) میں فرمایا کہ مرکزی حکومت نے جو اسکیم سنہ ۱۹۵۱ء تک کے لئے مرتب کی ہے اس میں ہر ایک یونٹ کو اپنی پیداوار میں کم از کم پندرہ فیصدی اضافہ کرنا چاہیئے۔ مرکزی حکومت کی تجویز یہ ہے کہ سنہ ۱۹۵۱ء کے بعد ممالک غیر سے غلہ بالکل نہ منگایا جائے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کہیں فصل ہی تباہ ہو جائے یا غلّے کا ذخیرہ فراہم کرنا ضروری تصوّر کیا جائے۔ کمشنر برائے پیداوار خوراک شری آر کے پاٹل نے ایک پریس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے حکومت ہند کی اس چار نکاتی اسکیم کی وضاحت کی جس کے ذریعہ سنہ ۱۹۵۱ء کے آخر تک ہندوستان کی پیداوار اناج میں چالیس لاکھ ٹن کا اضافہ ہو جائے گا۔ شری آر کے پاٹل نے کہا کہ زیادہ اناج اگاؤ مہم جو پچھلے چار سال سے جاری ہے اپنے نتائج کے لحاظ سے وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکی جس کی امید تھی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس ناکامی کی ذمہ داری ایک حد تک مرکزی اور صوبائی حکومتوں پر ہے پچھلے چند برسوں میں اناج کی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے لیکن وہ ملک کی عام ترقی کے پروگرام کی وجہ سے ہوا ہے اب تک وہ عزم خاص پیدا نہیں ہوا جس سے خوراک کے محاذ پر جنگ جیتی جا سکے یہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ ایک خاص مقصد اور ایک واضح پروگرام سامنے ہو۔ اگر موجودہ خوراک کی قلت کا مقابلہ اس انداز پر کیا جائے گویا کہ جنگ لڑی جا رہی ہے تو کامیابی یقینی ہے۔

صوبائی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے شری پاٹل نے بتایا کہ سارے صوبوں میں کیبنٹ کی ایک ایک سب کمیٹی قائم کی جائے گی اور زیادہ اناج اگاؤ کی مہم کو کامیابی سے چلانے کی ذمہ داری اس سب کمیٹی پر ہوگی۔ اس سب کمیٹی میں صوبے کے وزیر اعظم اور صوبائی وزرائے مالیات و زراعت و آبپاشی شامل ہوں گے۔

ڈچ اور انڈونیشین جمہوری حکومت نے انڈونیشیا میں التوائے جنگ کے احکام جاری کئے ہیں۔ ڈچ حکومت کے احکام ہالینڈ کی افواج کے نام اور جمہوری حکومت کے احکام جمہوریت کی باقاعدہ فوج اور دیگر ہتھیار بند ساتھیوں کے نام تھے۔ ایک مشترکہ اعلان میں درخواست کی گئی ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈا کرنے، نقصان رسی اور تباہی پھیلانے سے محترز رہیں۔ سیاسی قیدی رہا کر دئے جائیں گے یا آپس میں تبدیل ہوں گے۔ انڈونیشی وزیر اعظم ڈاکٹر عطا ہیگ کو تشریف لے جاتے ہوئے ۸ اگست کو دہلی میں ٹھہرے تاکہ پنڈت نہرو سے ملاقات کریں۔ انڈونیشی سفراء مصر، پاکستان، افغانستان، برہما اور تھائی لینڈ بھی نئی دہلی بلائے گئے تھے تاکہ ان سے بھی قیام دہلی کے زمانے میں تبادلۂ خیالات کیا جائے۔ ڈاکٹر عطا ہیگ پہنچ گئے ہیں۔ ہالینڈ کی حکومت کے وزیر نو آبادیات نے بندرگاہ پر آپ کا استقبال کیا۔ امید رکھنی چاہئے کہ آپس کی گفت و شنید سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں گے۔ انڈونیشیا میں مستقل امن کا قیام مشرق بعید کے لئے فال نیک ہوگا۔

یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء

چھ آنے

8(۴)

آجکل

ہمارا سالنامہ

چند خطوط میں سے اقتباسات

رضا علی وحشت

آجکل کے سال نامے میں بلند پایہ نظموں کی کمی نہیں ہے۔ اکثر مقالات دلکش ہیں لیکن خاص طور پر پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کا مضمون بعنوان "رائے ٹیکا رام تسلی" ایک نہایت قیمتی اور نادر اضافہ ہے۔ ایک اور مضمون جو نہایت قابل قدر ہے وہ حضرت شمس بریلوی کا لکھا ہوا ہے جس کا عنوان "مرزا غالب مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ ادبی خط اور اصلاح غزل" ہے۔

علی عباس حسینی

سال نامہ خوب نکلا۔ مضامین افسانے نظمیں ساری چیزیں معیاری ہیں۔ تصویریں بھی اچھی ہیں۔ غرض صوری اور معنوی ہر حیثیت سے اچھا ہے۔ میری طرف سے ہدیۂ تبریک قبول کیجئے۔

کنہیا لال کپور

سال نامے میں ویسے تو ہر چیز جاذب نظر ہے لیکن داد کا مستحق حصۂ نثر ہے۔ بالخصوص مقالے۔ جناب احتشام حسین کا مقالہ "طنز کا ادب میں درجہ" معرکے کا مضمون ہے اور یقیناً اس قابل ہے کہ اسے اردو ادب کی انسائیکلوپیڈیا میں طنز کے بیان میں بعینہ شائع کیا جائے۔ خواجہ غلام السیدین، جناب جوش ملسیانی اور جناب محمد احسن فاروقی کے مضامین بھی نہایت دلچسپ اور پر مغز ہیں۔

ہر مہینے کی پہلی اور پندرھویں تاریخ کو شائع ہونے والا

مصوّر رسالہ

ایڈیٹر:-

جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹرز:-

عرش ملسیانی

جگن ناتھ آزاد

بلونت سنگھ

ترتیب

یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء

جلد ۸ —————— نمبر ۴

سالانہ چندہ —————— نو روپے

فی پرچہ —————— چھ آنے

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

تلوک چند محروم

اہنسا کا پیغمبر

تجھے پیدا کیا دورِ زوالِ آدمیّت میں — کہ تجھ کو دیکھ کر انسان پہچانے مقام اپنا
عمل کی زندگی کو جب نہ دیکھا اہلِ غفلت نے — دیا اُن کو متاعِ زندگی دے کر پیام اپنا

ترا پیغام، پیغامِ ازل تھا یعنی انساں کو — کدُورت اور نفرت ناروا ہے نوعِ انساں سے
یہی پیغام عیسےٰ اور گوتم لے کے آئے تھے — لیا اقرار نانک نے اسی کا اہلِ ایماں سے

اہنسا مسلکِ اہلِ صفا ہے روزِ اوّل سے — رہا ہے مشرق و مغرب کو دائم اتّفاق اِس پر
دِکھائی راہ سیدھی کجروانِ دہر کو تُو نے — ہُوئے لیکن نہ مائل عاشقانِ افتراق اِس پر

بھٹکتا پھر رہا ہے دشتِ آتشناک میں انساں — لپک کر ہر طرف شعلوں سے شعلے آن مِلتے ہیں
جہاں تُو لے کے جانا چاہتا تھا آدمیّت کو — وہاں صدق و صفا مہر و وفا کے پھُول کھلتے ہیں

ترے خونیں فسانے کو ہُوا رنگِ بقا حاصل — رہے گا رہتی دُنیا تک ترے ایثار کا چرچا
صفا کیشانِ عالم کے لئے تسکیں فزا ہوگا — تری جانِ وفا پرور ترے ایثار کا چرچا

کملا دیوی چٹو پادھیائے

ادب اور فلم

ہر ملک کا ادب اور اسٹیج اس کی سماجی ترقیوں کے مظہر ہوتے ہیں اور اس ملک کے سماجی حالات کا اندازہ لگانے کے بیرومیٹر کا کام دیتے ہیں۔ ان سے یہ پتہ چل سکتا ہے کہ اس وقت سماج میں کون سے محرکات مصروف کار ہیں اور ان کا رُخ کس طرف ہے۔ ایک ایسا ادارہ جو صرف ادب اور فن کی دنیا پر ہی نہیں بلکہ سماج کے ہر شعبے پر حاوی ہو۔ ملک کے سماجی ضمیر کو زیادہ پُر زور طریقے پر اُجاگر کرتا ہے۔ جب تمدنی سرگرمیوں کا مقصد صرف یہ ہو کہ پبلک کی دلچسپی اور تفریح کے اسباب مہیا کئے جائیں تو عوامی جذبوں کا صحیح اظہار گدلا ہو کر کج روی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ موجودہ تمدن اور اس کی گہما گہمیوں نے اس قسم کی تفریح کی ضرورت میں اضافہ کر دیا ہے۔

صنعت کی ترقی اور مشینری کے استعمال میں اضافے کی وجہ سے ہیجان میں لانے والی ارزاں تفریح کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے۔ اس کی ذمہ داری زیادہ تر سائنسی مشینری کے فروغ پر نہیں بلکہ اس بات پر ہے کہ مشینری سے کام لینے کے جو اصول اور ضابطے وضع کئے گئے ہیں۔ وہ غیر سائنسی ہیں۔ کام کے اوقات میں کمی، کارخانے اور گھر کے ماحول کی خوشگواری، معاشی اطمینان کا زیادہ احساس، اور ترقی کے لئے تمدنی سہولتوں میں اضافہ، یہ تمام باتیں ایک اچھے سماج میں مشینری کے استعمال کے خطرناک ردِ عمل میں بہت بڑی حد تک کمی کر دیتی ہیں لیکن بدقسمتی سے دُنیا اب بھی اپنے سماجی اور سیاسی ڈھانچے کو غیر سائنسی بنیادوں پر کھڑا کرنا بہتر خیال کرتی ہے۔ لہٰذا سائنس کی وسیع اور شاندار فتوحات کے باوجود انسان مالی اور جسمانی مصائب کا شکار ہو رہا ہے اور سائنس کے لطیف کارناموں کو آزادانہ طور پر تاجرانہ مفاد کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ آج کل پردۂ فلم پر ڈاکوؤں کی ہیجانی کہانیوں اور گوالوں کے جرأت مندانہ کارناموں کو جس کثرت سے فلمایا جا رہا ہے وہ مشینی دور کا قدرتی نتیجہ نہیں بلکہ یہ ارباب غرض کے کارنامے ہیں جو ان انسانوں کے دلوں اور جسموں کو جنھیں انہوں نے سماجی طور پر پامال کر رکھا ہے گرمانا چاہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر سماجی جمہوریت اور معاشرت کے کسی جدید نظام کے قیام کا تجربہ کیا گیا تو اس کام کی تکمیل کے لئے تمدنی سرگرمیوں کو بھی اسی سانچے میں ڈھالنا پڑے گا۔ ان حالات میں یہ بات قدرتی ہے کہ فلموں کا انداز بدلے اور وہ عمدگی کا نیا معیار قائم کریں۔

لیکن ہیجانی قصوں کا صرف پردۂ فلم سے ہی تعلق نہیں ہندوستان کا اسٹیج بھی اس وقت تک ناکارہ اور بے جان ہے جس میں صحت اور توانائی بالکل مفقود ہے اور زندگی سے قریب ہونے کی کوشش میں یہ ابتذال کا شکار ہو گیا ہے۔ اصلاح کی طرف قدم بڑھانے کی کوشش ازراں قسم کے اپلیش پر منتج ہوتی ہے۔ قدامت پسندی کی اصل بنیادیں ابھی تک غیر متزلزل ہیں اور کسی نے ان کو چھوا تک نہیں۔

فلم ان دنوں ہر ملک میں سب سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ادارہ بن گئی ہے۔ غریب سے غریب آدمی بھی اتنا غریب نہیں ہوتا کہ شام کی تفریح کے لئے چند سکے صرف نہ کر سکے۔ حلقۂ اثر کی اس وسعت نے فلم کی ذمہ داریوں میں بھی بہت اضافہ کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ لوگ اس بات پر کڑی نظر رکھتے ہیں کہ فلموں کا ردِ عمل کیا ہو رہا ہے۔

ہندوستانی فلموں کو کافی حد تک دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پورانک یا دیومالائی اور سماجی۔ ہندوستان میں پہلے پہل دیومالائی فلمیں مقبول ہوئیں۔ عوام کو تفریح کے نئے شعبے کی طرف راغب کرنے کے لئے شروع شروع میں ان کے مذہبی جوش سے فائدہ

اٹھایا گیا۔ اس قسم کی فلمیں آج کل بھی بنتی ہیں۔ لیکن اب انھیں پہلی سی ہر دلعزیزی حاصل نہیں رہی جس طرح تھکے ہوئے اور مشتعل اعصاب کی راحت کے لئے جاسوسی اور ڈکیتی کی فلمیں کارگر ثابت ہوئی ہیں اسی طرح ایک ایسی قوم کے لئے جو ایک طویل مدت سے غلامی کی مصیبتوں سے دوچار ہو رہی ہو دیو مالائی فلمیں ایک پرکشش تشیلی دوائی کا کام دیتی ہیں لیکن تلخ حقائق کو بھی اپنا سر اٹھا کر دنیا کو اپنی موجودگی کا احساس کرانے کا انداز آتا ہے۔ اس وقت دلکش تصورات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ رنگین پردے چاک چاک ہو جاتے ہیں اور انسان ڈر اور شک سے نڈھال ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کی دلچسپی کو قائم رکھنے کے لئے کوئی ایسی چیز پیش کرنا ضروری ہے جو اس کے دل کے زیادہ قریب ہو جو اس کی روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتی ہو اور حقائق سے بھی دور نہ ہو۔ کرشن جی کی لیلا دلکش ہو سکتی ہے، دوسری دنیا کے متعلق سنت تکارام کی دانش روح میں بالیدگی پیدا کرنے کا موجب بھی بن سکتی ہے لیکن جب انسان کو مسلسل بے کاری کا سامنا ہو، جب اس کے دل سے معاشی اطمینان کا احساس تک مٹ چکا ہو، جب والدین کو اپنے بچوں سے اجنبیت کی بو آتی ہو، جب خاوندوں کو یہ احساس ستانے لگا ہو کہ پنجرے کا پنچھی اپنے پروں کو پھڑپھڑا رہا ہے، اور صدیوں پرانے حقوق کو معرض بحث میں لایا جانے لگا ہے، تو الف لیلے کے قصوں کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑتا ہے اور ان کی جگہ زندہ فلمیں لے لیتی ہیں۔ ہندوستان میں آج یہی ہو رہا ہے اور سماجی مسائل پہلی صف کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔

سینما کی صنعت ایک تجارتی ادارہ ہے اور اسے اس بات پر نظر رکھنا پڑتی ہے کہ وہ اپنے حصہ داروں کو کس قدر منافع دے سکتا ہے۔ اس کی کامیابی کا سارا مدار ٹکٹ گھروں پر ہے۔ لہٰذا اس کی فنی اور سماجی اقدار کو مالی مفاد کا غلام بنا دیا گیا ہے۔ کیونکہ ایک ایسی دنیا میں جہاں منافع بازی اور اس سے متعلق برائیوں کا دور دورہ ہو، مالی مفاد ہی پردھان ہوتا ہے۔ لیکن فلمیں عام اشیائے تجارت سے مختلف ہوتی ہیں وہ نمایاں سماجی قدر و قیمت کی حامل ہیں جہاں وہ سماج اور اس کے محرکات کا نقشہ کھینچتی ہیں وہاں وہ ان تمام نفسیاتی اثرات کو بھی بروئے کار لاتی ہیں جو سماج کی تشکیل کا باعث ہوتے ہیں۔ ان حالات میں ان کی طرف کم توجہی کا رویہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستانی ادب ابھی تک رسمیت اور قدامت پسندانہ فرسودگی کی گرفت سے پوری طرح آزاد نہیں ہوا ہے۔ ہر کہانی کے لئے اخلاقی سبق ضروری ہے۔ بدکاروں کو سزا ملتی ہے اور نیکوں کو جزا۔ توبہ کرنے والوں کو معاف کر دیا جاتا ہے اور اس کے بعد سبھی مل کر مسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن زندگی کی گاڑی اس قسم کے معین اصول پر نہیں چلتی اور نہ حقیقی واقعات ہمیشہ اس قسم کے نتائج پر ختم ہوتے ہیں۔ زندگی غیر متوقع دکھ درد سے بھری ہوئی ہے۔ انسان بڑی تیزی سے نیچے گر پڑتا ہے۔ لیکن اسے اوپر اٹھنے کے لئے بڑی سخت محنت کرنا پڑتی ہے۔ لیکن ہندوستانی ذہن ابھی تک جمود کا شکار ہے اس کا نتیجہ یہ ہے وہ پرانے تنگ دائرے سے نکل کر تخلیق اور حقیقت کے راستے پر گامزن ہونے کا اہل نہیں۔ یہ جذباتیت کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے اور غیر حقیقی صحراؤں میں گم ہے۔ اس قسم کے ماحول سے باہر نکلنے کیلئے ہندوستانی ذہن کو بہت سی قدیم دیواروں کو گرانا پڑے گا اور فرسودہ رکاوٹوں کو دور کرنا ہوگا۔ حقیقت اور روشنی تک رسائی حاصل کرنے کے لئے اسے تاریکی کی کئی صدیوں کو پھلانگنا ہوگا۔ لیکن ہم ان تمام قوموں کی طرح جو مدتوں سے غلام ہیں خوف اور شکوک کا شکار ہیں ہم اطمینان سے فرسودہ اور پامال راستوں پر چل رہے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ راستے زوال اور انحاط کی موہوم منزل کی طرف جاتے ہیں۔ ہم جرأت مندی اور پیش قدمی کا ثبوت دے کر شاداب وادیوں کی طرف بڑھنے کے لئے نئے راستوں کی تلاش نہیں کرتے۔

ان حالات میں یہ دیکھنا موجب حیرت نہیں کہ مردہ توہمات کو اب بھی قابل احترام سمجھا جاتا ہے اور فرسودہ عقائد اب بھی اپنی زندگی کے بجھتے ہوئے شرر کو برقرار رکھنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری سماجی زندگی کی رفتار سست اور مدھم ہے۔ نئے خیالات کو شکوک کی نظر سے دیکھا اور نئے راستوں کو خطرناک سمجھا جاتا ہے جدت کی ہر کوشش غیر مقدس اور قابل مذمت خیال کی جاتی ہے۔

قدامت پسندی کا سب سے زیادہ مظاہرہ سماجی مراسم کے سلسلے میں ہوتا ہے مثلاً خاوند اور بیوی کے تعلقات اور سماج کے مختلف طبقوں کے باہمی مراسم۔ سماج کی ساری زندگی انہیں مراسم کے محور کے گرد گھومتی ہے۔ ان مراسم کی لطافتوں اور باریکیوں اور انسانی زندگی میں ان کے عمل و دخل کا نقشہ کھینچنے کے عوض ہر چیز کو بے ڈھنگے پن سے نیکی اور بدی، بھیڑ اور بھیڑیا اور خدا اور شیطان کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ فلم، ادب اور ڈراما ان تمام شعبوں میں ہمارے قدیم تمدن کی تصویر کشی پرانے خیالات، غلط اندازوں اور مرحوم ماضی کے تصورات کو مزید طاقت اور توانائی بخشنے کا موجب بنتی ہے۔

لیکن جاگیرداری کا رخانہ ختم ہو رہا ہے اور پرانا نظام رو بہ تنزل ہے۔ اقتصادیات کی نئی زندگی کی بہت سی طاقتوں کو بلکہ نئی قدروں نئے زاویوں اور نئے معیاروں کو عالم وجود میں لا رہی ہے۔ ہندوستان تبدیل ہو رہا ہے لیکن اس کے اندر بعض ایسے عناصر ہیں جو قدامت سے چمٹے رہنے کی کوشش کر رہے ہیں موجودہ نظام کو جوں کا توں برقرار رکھنے کے لئے فلم اور ادب دونوں کو استعمال کیا جا رہا ہے۔

اسٹیج اور پردۂ فلم پر ایک ایسی عورت کو بطور آدرش پیش کیا جاتا ہے۔ جو ایک مدت سے بڑے صبر کے ساتھ تمام تکلیفیں برداشت کر رہی ہو، اپنے سرتاج کا ہر حکم ماننے کے لئے تیار رہو، اس کی ٹھوکروں کو بھی مسکرا کر برداشت کر لیتی ہو اور اگر اس کے رخسار پر طمانچہ پڑے تو ایک نیک عورت کی طرح اپنا دوسرا رخسار پیش کر دیتی ہو۔ نقطۂ عروج تب آتا ہے جب گنہگار اپنے گناہوں سے توبہ کر لیتا ہے اور دم توڑتی ہوئی بیوی اسے معاف کر دیتی ہے اس کے بعد نیکی کی جزا ملنا شروع ہوتی ہے اور بعد میں وہ دونوں خوشی کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ اس فلسفے کے ساتھ جو دولت اور پستی وابستہ ہے پبلک کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ پبلک بیوی کی مصیبتوں پر آنسو بہاتی ہے اور اس کی فتح پر خوش ہوتی ہے۔ وہ اس بات کو آسانی سے فراموش کر دیتی ہے کہ حقیقی زندگی میں اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ یہ فلسفہ خاوند کو زیادہ ظالم بنا دیتا ہے اور بیوی کو زیادہ مظلوم۔ ناواقف لوگ کہتے ہیں کہ اگر تفریح کا مقصد حقائق کو چھپا کر خوش آئند تصورات قائم کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟ جہاں تک تجارتی پہلو کا تعلق ہے اخلاقی درس والی کہانیاں آمدنی کے اعتبار سے زیادہ کامیاب ہوتی ہیں، اور پروڈیوسر کیلئے صرف یہی چیز اہمیت رکھتی ہے

اس کے ساتھ ہی یہ رجحان بھی موجود ہے کہ تعلیم یافتہ عورت کو ایک انتہائی غلط کار مخلوق کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ جو قدیم شرم و حیا اور حسن اخلاق سے محروم ہے۔ وہ بعض اوقات بریچس بھی پہنتی ہے، اپنی پیٹی میں پستول بھی لگاتی ہے، اپنی ٹوپی ہاتھ میں رکھتی ہے۔ اور مردوں کی قوت برداشت کا مذاق اڑانے کے لئے سگریٹ کا دھواں اڑاتی بھی نظر آتی ہے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ حقیقی ہندوستانی سماج میں پردۂ فلم کی اس عورت کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ ہندوستان کی عورتوں میں خواندگی بہت کم ہے، لیکن اس کے باوجود تعلیم یافتہ عورتوں کی کافی تعداد اس ملک میں موجود ہے۔ آپ کو ان میں ایسی کوئی عورت نہیں ملے گی جس نے اپنی شائستگی کو بالکل فیشن کی نذر کر دیا ہو جیسا کہ پردۂ فلم پر ہمیں یقین دلایا جا رہا ہے۔ تعلیم یافتہ عورت کو اس طرح پیش کرنا تعلیم کی بدترین توہین ہے۔

اس سے ایک چیز واضح طور پر ظاہر کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ تعلیم عورت کے کیریکٹر کو برباد کر دیتی ہے۔ یہ عورت اپنی تہذیب دشمنی کی وجہ سے غلط راستے پر چل نکلتی ہے لیکن آخرکار قدیم سماجی دائرے میں واپس آجاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے صبح کا بھولا شام کو واپس چلا آتا ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ سماج اس پروپیگنڈے پر نظر رکھے جو فلموں کے ذریعے سے کیا جا رہا ہے۔ زندگی کی تمام نئی باتوں کی طرح جدید عورت بھی چند مسائل کو سامنے لاتی ہے۔ اس امر سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ لیکن فلمیں صرف اتنا کر سکتی ہیں کہ مختلف مسائل کی باریکیوں کی نقاب کشائی کریں اور ان کے اہم اہم نکات کو منظر عام پر لائیں۔ ان مسائل کا حل پیش کرنا فلموں کے بس میں نہیں زندگی بڑی ہی پیچیدہ ہے اور اس کے ہر مسئلے کے کئی پہلو ہوتے ہیں۔ دردِ سر کی طرح ان کا پیٹنٹ دواؤں سے علاج نہیں کیا جا سکتا۔ ادب اور فن میں تکمیل کے احساس کی تسکین کسی مسئلے کی گہرائیوں میں ڈوب کر اسے سمجھنے کی کوشش سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ کوشش ہر پابندی اور تعصب کو بالائے طاق رکھ کر ہونی چاہیئے۔ تجربے ہی سے تھوڑا بہت علم حاصل ہوتا ہے اس کے لئے قدامت پسندی کے شکنجے سے رہائی حاصل کرنا ضروری ہے۔ ہر کتاب، ہر کہانی اور ہر فلم کو نئی تخلیق کا ہتھیار ہونا چاہیئے رجعت کا آلۂ کار نہیں۔

حامد اللہ افسر

سروجنی نائڈو

۲ مارچ کی صبح کو دو بجکر سینتالیس منٹ پر سروجنی نائڈو "بلبلِ ہند" رنگیں بیاں خطیبہ، سنجیدہ اور پختہ خیال مدبّرہ، جوشیلی قوم پرست، بے مثل شاعرہ راہیِ ملکِ عدم ہوئیں، بھارت کا درخشاں ستارہ غروب ہوگیا۔

ابھی پُورے چودہ مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ ہندوستان کا نمبر ا شہری ہم سے چھین گیا تھا، اب ہندوستان کی خاتون نمبر ا رخصت ہوگئیں ملک میں شاعر بھی پیدا ہوں گے، خطیب بھی آئیں گے، مدبّروں کی بھی کمی نہ ہوگی، گورنر بھی رُونما ہوتے رہیں گے مگر سروجنی دیوی کو ہم کہاں سے لائیں گے۔ اب ان کا نعم البدل میسّر نہیں آسکتا۔

وُہ پندرہ بیس روز سے بیمار ضرور تھیں لیکن یہ گمان بھی نہ تھا کہ وہ اتنی جلد ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوجائیں گی، وہ ہمارے صوبے کی صرف آئینی گورنر ہی نہیں تھیں بلکہ اُن کی حکومت دلوں پر بھی تھی۔ یہ بات اب سے پہلے کسی گورنر کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ وہ بے حد ہر دل عزیز تھیں، وہ "غریبوں کی ماں" کہلاتی تھیں اور اُنھوں نے گورنمنٹ ہاؤس کے سے "امیروں کے گھر" کو جہاں اب سے کُچھ ہی مدّت پہلے خواص کا بھی گزر نہیں ہوتا تھا ایسا بنا دیا تھا کہ ہر شخص (خاص طور پر غریب) وہاں جاسکتا اور اپنے دل کا حال سُنا سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک گورنر کی حیثیت سے اُن کا کامیاب رہنا کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہے، وُہ گورنروں سے بہت زیادہ بلند شخصیت کی مالک تھیں۔

سروجنی دیوی حیرت انگیز خدا داد اوصاف کی مالک تھیں۔ اُن کی زندگی جوش سے لبریز تھی، جس چیز کو ہاتھ لگایا زندگی اور جوش سے بھر دیا۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے آپ کے سانحۂ ارتحال پر اظہارِ خیال فرماتے ہُوئے کہا:۔

"حقیقت میں وہ حرارت و ہیجان کا ایک منارہ تھیں اور پھر اسی کے ساتھ ساتھ وُہ ایک ایسی رواں دواں اور خنک ندّی کی طرح بھی تھیں جو مصیبت کے ماروں کے دلوں کو ٹھنڈا رکھتی ہے، گاندھی جی نے ہماری سیاست کو اخلاق کے فلک الافلاک تک پہنچا دیا۔ سروجنی نے اس کو صنعت گری اور جمالیاتی رفعتیں بخشیں۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عظمت و جلالت و تزک و احتشام سے بھرپور ایک رُوحانی جوہر تھا جواب موجود نہیں ہے۔ ہر حسّاس شخص کی طرح ان کی روح کو بھی اذیتیں پہنچیں لیکن اُنھوں نے کچھ ایسے دلفریب طریقے پر انہیں برداشت کیا کہ وہ اذیتیں بھی ان کے لئے کمیل سا معلوم ہونے لگیں۔ اُنھوں نے ہماری جنگِ آزادی کو ایک بلند سطح تک اُبھار دیا اور اس پر کچھ ایسا اثر ڈالا اور کچھ ایسا رنگ چڑھایا جو اب آنے والے زمانے میں کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ان کی ذات ایک ایسے لطیف کلچر کی نمائندگی کر رہی تھی جن میں وہ مختلف دھارے سموئے ہُوئے تھے جن سب نے مل جل کر ہمارے کلچر کو اس قدر پُرعظمت اور حسین بنا دیا ہے۔ وہ خود مشرقی اور مغربی کلچر کا نہایت لطیف مجموعہ تھیں اسی لئے جہاں وہ ایک اہم قومی شخصیت کی مالک تھیں وہاں وہ ایک عظیم المرتبت بین الاقوامی حیثیت بھی رکھتی تھیں اور اس وسیع دُنیا میں جہاں کہیں وہ گئیں اُن کا خیر مقدم اسی طرح کیا گیا جس طرح دُنیا کے کسی بڑے سے بڑے آدمی کا کیا جانا چاہئیے۔

وہ انسان اور انسان میں فرق کرنا نہیں جانتی تھیں۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی اُن کی نظر میں سب ایک تھے۔ جب ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ غیظ و غضب نے قریب قریب ہر شخص کو دیوانہ بنا دیا تھا اُس وقت بھی وہ اُن گنے چنے نفوس میں سے تھیں جنہوں نے کبھی

تنگ نظری کا مظاہرہ نہیں کیا، وہ ہمیشہ ہندو مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔

وہ ہمارا ایک قومی سرمایہ تھیں اور ہم میں سے بہت سے لوگوں کی زندگی کا جزو ہو گئی تھیں۔ وہ بے حد ذکی و ذہین تھیں اور بے حد وسیع النظر اور بہ کثرت اہلیتوں کی مالک، جن میں سے بعض کی موجودگی سے ان میں ایک نرالی شان آگئی تھی۔"

سردار پٹیل نے فرمایا :-

"جب وہ کسی کمرے میں داخل ہوتیں یا کسی مجمع میں تشریف لاتیں تو ایسا معلوم ہوتا جیسے متعدد شمعیں ایک ساتھ روشن ہو گئی ہوں اور ان کا نور تاریک ترین گوشوں تک پہنچ کر اُن کو منوّر کر رہا ہو۔ ان کی شخصیت کی دلعزیزی اور ان کے الفاظ کے جادو نے کروڑوں انسانوں کے دلوں میں اپنا گھر بنا لیا تھا جو انھیں "بلبلِ ہند" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ ان کی تقریریں حسن کا مجسمہ ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ دلوں کو مسرت بخشتی رہیں گی لیکن افسوس کہ اب اس نقرئی آواز کی جھنکار سے کان محروم رہیں گے۔"

سروجنی دیوی ہمارے ملک کی پہلی خاتون گورنر تھیں۔ ان میں ایک ملکہ، ایک رانی کی شان تو ہمیشہ سے تھی لیکن اسی کے ساتھ وہ بہت سادگی پسند تھیں اور تزک و احتشام اور شان و شکوہ کا اُن کے یہاں گذر نہیں تھا۔

جب اس ایک لاکھ مربع میل میں بسنے والے چھ کروڑ انسانوں کی حاکمِ اعلیٰ یا خادمِ اعلیٰ بنائے جانے کا مژدہ اُنھیں سُنایا گیا تو اُنھوں نے فرمایا کہ "ایک مضطرب طائر کو قفس میں بند کیا جا رہا ہے"۔

اس میں شبہ نہیں کہ گورنر بن جانے سے اُن کا دائرۂ عمل محدود ہو گیا اور گورنمنٹ ہاؤس کی قید اُن کو کبھی کبھی بے چین کر دیتی تھی لیکن اس کے باوجود اُن کو جھونپڑیوں میں جانے سے کوئی روک نہ سکا اور عوام سے اپنا ناطہ اُنھوں نے برابر قائم رکھا۔

سروجنی چٹوپادھیائے (چیٹرجی) ۱۳ فروری ۱۸۷۹ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے پدرِ نامدار ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادھیائے برہمن نگرم کے ایک قدیم خاندان چیٹرجی کے ایک معزز رکن تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ۱۸۷۷ء میں اڈنبرا یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری حاصل کی۔ ہندوستان واپس آکر آپ نے حیدرآباد میں نظام کالج کی بنیاد رکھی اور اس کے بعد سے اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک تشنہ کامانِ علوم و معارف کی پیاس بجھاتے رہے۔

سروجنی دیوی نے خود اپنے مقتدر باپ کی نگرانی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ظاہر ہے کہ جس ہونہار پودے نے ایک کاملِ فن باغبان کی محبت آمیز توجہ سے فائدہ اُٹھایا ہو وہ کیا کچھ نہ پھلے پھولے گا۔

آپ اپنے پدرِ نامدار کی نسبت ایک جگہ تحریر فرماتی ہیں :-

"میرے آباواجداد ہزار سال سے جنگلوں اور پہاڑوں کے شیدائی رہے ہیں۔ وہ بڑے تخیّل پرست عالم اور زاہد لوگ تھے، خود میرے والد تخیّل کے بندے ہیں اور متواتر خیالات کی گہرائیوں میں غرق رہتے ہیں اور یہ اُن مقتدر لوگوں میں سے ہیں جن کی زندگی شاندار ناکامیابی کا مکمّل نمونہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمام ہندوستان میں بہت ہی کم لوگ ایسے ملیں گے جن کا علمی ذوق اُن سے بڑھا ہوا ہو اور پھر ایسے لوگ بھی زیادہ نہیں ملیں گے جو اُن کی طرح ہر دل عزیز رہے ہوں۔ اُن کے چہرے پر ایک سفید لانبی داڑھی ہے، ہومر نما صورت ہے اور ایسی بلند آواز کہ جب ہنستے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب چھت نیچے آ رہے گی۔ اُنھوں نے اپنا تمام مال و زر دو اہم مقاصد کی بجا آوری میں صرف کیا۔ خلقِ خُدا کی امداد اور کیمیا۔ ہر روز اُن کے باغ میں تمام مذاہب کے مقتدر علماء کا مجمع رہتا ہے۔ امیر، فقیر، درویش اور چھٹے ہوئے بدمعاش سب کے سب ایک دوسرے کی صحبت سے لُطف اندوز ہوتے ہیں اور یہاں سب کے ساتھ ایک سا برتاؤ کیا جاتا ہے اور پھر کیمیا! اللہ اکبر! رات اور دن نئے نئے تجربے کئے جا رہے ہیں۔ جو شخص نیا نسخہ لاتا ہے اُسے اپنے بھائی کی طرح صحبت میں شریک کیا جاتا ہے۔ لیکن تم جانتے ہو یہ کیمیا کیا ہے یہ حُسنِ ازلی کی شاعرانہ تلاش نے صورت اختیار کر لی ہے۔ سونا بنانے والے اور شعر کہنے والے یہ دونوں اُس چیز کو پیدا کرنے والے ہیں جو اسرار کا علم حاصل کرنے کے لئے دُنیا کی مخفی آرزو پر قدرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ میرے پدرِ نامدار کا وہ ادراک تجسّس جسے روحِ روانِ طبعیات کہہ سکتے ہیں میرے اندر آرزوئے تلاشِ حُسن ہے۔"

ایک اور جگہ خود اپنی بابت فرماتی ہیں:۔

"جہاں تک مجھے یاد ہے بچپن میں مجھے شعر کہنے کا کچھ زیادہ شوق نہیں تھا۔ اس میں شک نہیں کہ میں اوّل ہی سے فطرتاً بہت ہی تخیل پرست واقع ہوئی تھی۔ میری تعلیم و تربیت میرے والد کی نگرانی میں نہایت با اصول طریقے پر ہوئی۔ اُن کا پختہ ارادہ تھا کہ مجھے ایک زبردست ریاضی داں یا سائنس داں بنائیں گے لیکن فطری شعریت جو مجھے اُن سے اور اپنی ماں سے ورثے میں ملی تھی غالب رہی۔ جب میں گیارہ برس کی تھی تو میں الجبرے کے ایک سوال پر سر کھپا رہی تھی۔ بہتیرا کوشش کی مگر وہ حل نہیں ہُوا لیکن ایک پوری نظم فی البدیہہ موزوں ہو گئی میں نے اُسے لکھ لیا۔ بس اُسی دن سے میری شاعری کا دَور شروع ہُوا۔ میں نے تیرہ برس کی عمر میں ایک بڑی نظم لکھی، ۱۳۰۰ شعر چھ دن میں کہے، اس کے بعد ہی دو ہزار شعر کا ایک ڈرامہ لکھا۔ اس زمانے میں میری صحت بہت خراب ہو گئی تھی۔ باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا اور کافی فرصت تھی۔ میں ہمہ تن کتب بینی میں مصروف ہو گئی۔ میرے نزدیک جس قدر بھی میں نے پڑھا ہے اُس کا زیادہ حصّہ میری چودہ اور سولہ سال کی عمر کا سرمایہ ہے"۔

سروجنی دیوی نے مدراس یونیورسٹی سے بارہ سال کی عمر میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۹۵ء میں انگلستان بھیجی گئیں اور وہاں ۱۸۹۸ء تک قیام پذیر رہیں۔ کنگس کالج لندن میں تعلیم حاصل کی۔ پھر گرٹن کالج کیمبرج میں رہیں یہاں تک کہ آپ کی صحت نے جواب دے دیا۔ ۱۸۹۸ء سے پہلے کچھ مدّت تک اٹلی کا سفر کیا۔ اٹلی ایسی سرزمین نہ تھی جو اپنی فطری خوبیوں اور قدیم صنّاعوں کا سروجنی کے دل پر گہرا اثر نہ ڈالتی، آپ فرماتی ہیں:۔

"یہ اٹلی تو تمام تر سونے کی بنی ہُوئی ہے۔ صبح کی روشنی میں سونے کی چمک، ستاروں کے حسن میں سونے کی جھلک، مئی کے مہینے کی بھینی بھینی خوشبوؤں سے بسی ہُوئی راتوں والی جگنو کی متوّہستی میں سونے کا رنگ، ہائے یہ سونے کے ہوائی تارے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ان کے رقص مستانہ کی موسیقیت پر قابو حاصل کروں اور ایک نظم کہوں جس کی بحران کی بیتابی سے ہم آہنگ ہو اور جس کے ارکان ان کی بے ترتیب

پرواز کی طرح ہمہ لرزش"۔

ستمبر ۱۸۹۸ء میں سروجنی حیدرآباد واپس آئیں اور دسمبر ۱۸۹۸ء میں ڈاکٹر نائیڈو سے شادی کی جو آپ کے ہم ذات نہیں تھے، اس لئے یہ مناکحت بھی سروجنی کی آزاد طبعی، کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی کی دلیل ہے۔

سروجنی دیوی نے اپنے بچّوں کے بہت معنی خیز اور شاعرانہ نام رکھے ہیں مثلاً "جے سوریہ" یعنی خورشید فتح، "رندھیر" مولائے جنگ اور "لیلا منی" یعنی جوہر نشاط۔

آپ ایک اعلیٰ پائے کی خطیب تھیں، آپ کی تقریروں میں ایسا اثر اور ایسا جادو ہوتا تھا کہ سننے والے محوِ حیرت رہ جاتے تھے، بلند اور پُر ترنّم آواز اس پر لفظوں کی ترکیبیں ایسی پاکیزہ گویا واضعانِ زبان نے یہ الفاظ محض اسی لئے بنائے تھے کہ سروجنی کے جوش سے بھرے ہُوئے اور شعریت کے رس میں ڈوبے ہُوئے خیالات کو ادا کرنے کا فرض انجام دیں۔ جب وہ کسی مجمع میں تقریر کرنے کھڑی ہو جاتی تھیں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود "بھارت ماتا" سروجنی کے روپ میں ایک مہارانی کی شان اور ایک نیک دل استری کی آن بان لئے ہمارے سامنے ہے۔ ایک پہاڑی ندّی تھی کہ اُچھلتی، کودتی نغمے بکھیرتی، پتھروں کو دھکیلتی، پودوں اور پھولوں سے کھیلتی ہُوئی بے تحاشا بڑھی چلی جاتی تھی۔ ہر لفظ کانوں سے گزر کر دل میں اُترتا چلا جاتا تھا۔ ایسے مقرّر کہیں صدیوں کے اُلٹ پھیر میں پیدا ہُوا کرتے ہیں۔

سروجنی دیوی کی نظموں کے انگریزی زبان میں تین مجموعے شائع ہُوئے "آستانہ زرّین" "طائر ایام" اور "شکستہ پر"۔

"طائر ایام" کے دیباچے میں انگلستان کے مشہور ادیب اور شاعر مسٹر اڈمنڈ گاس فرماتے ہیں:۔

"سروجنی نائڈو اپنی ابتدائی نظموں میں جذبات اور تخیل کے لحاظ سے مطلقاً مغرب کا تتبع کرتی تھیں اور ان کے کلام میں شیلی اور کیٹس کا رنگ بہت نمایاں تھا"

آخر مسٹر گاس نے اُنھیں مشورہ دیا کہ انگریزی زبان مشرقی

تخیل اور مشرقی زندگی سے متعلق نظموں سے محروم ہے آپ اپنے گیتوں
سے اس کمی کو پورا کیجئے۔ آپ نے ان کی ہدایت پر اسی وقت سے
عمل شروع کر دیا، فرماتی ہیں :۔
"مسٹر گاس ہی نے سب سے پہلے مجھے شاعری کے آستانۂ زریں
کا پتہ دیا۔"

سروجنی دیوی کی نظمیں حسن کی تلاش اور امن و راحت کے تجسس
کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ اُن پر موسم بہار کی کیفیتیں طاری ہیں،
اُن سے روح القدس کا فیض نمایاں ہے، وہ روحانی جوش و خروش
کا آئینہ ہیں اور ان میں حقیقی محبت کی آگ بھڑک رہی ہے۔
بعض نظموں کے اقتباسات سنئے :۔

اُٹھ! مادرِ وطن اُٹھ!
تو کہ ایک غیر محدود زمانے تک شباب سے ہم آغوش رہی ہے
اُٹھ!
تو میں جو ظلمت کی گہرائیوں میں بھٹک رہی ہیں
ان کی رہنمائی کر اُٹھ!
اُس مقام تک لے چل جہاں نورانی صبح جلوہ افروز ہے
ماں! تو ابھی تک کیوں سو رہی ہے
اُٹھ کہ تیرے بچے تجھے پکارتے ہیں۔"

موسم بہار سے خطاب کر کے فرماتی ہیں :۔
بہار! اے خوش فضا بہار!
تیرا جوہر کیا ہے ؟
ایک بلبل کا نغمہ،
ایک پھول کا تبسم،
چاند کی کرنوں پر شبنم کا رقص،
نسیم کی آواز جو چلتی جاتی اور گاتی جاتی ہے۔
ایک دلہن کی اُمید،
ایک دوشیزہ کا خواب،
بہار! اے خوش اثر بہار!
تیرا راز کیا ہے ؟
تیرے سحر آلود سرود کی پیدا کی ہوئی فرحت
جو صبح کے وقت کو دُنیا کے عجائب کا مجموعہ بنا دیتی ہے۔
ہر چیز میں حسن کے وجود پذیر ہونے کا باعث ہوتی ہے۔
آسمانوں پر قبضہ حاصل کر لیتی ہے
غنچوں پر فتحیاب ہوتی ہے جو دُنیا کے دل کی مسرت کا ذریعہ ہیں۔"

ایک لوری کا پہلا بند کس قدر دل فریب ہے :۔
"رنگ اور الائچی کے ہرے بھرے پودوں سے،
چاولوں کے کھیت سے
کنول کے پھولوں سے پار ہو کر
میں تیرے لئے ایک شبنم میں سرشار خواب لاتی ہوں"

ایک نظم میں جس کا عنوان "ستی" ہے فرماتی ہیں :۔
"میری زندگی کے چراغ!
موت کے لبوں نے اپنی سانس سے تجھے یکایک گل کر دیا۔
تیرے بجھے ہوئے شعلے کو کوئی چیز پھر زندہ نہیں کر سکتی
اے میری زندگی کے پودے!
ظالم موت نے تجھے پامال کر دیا۔
تیرے برباد شدہ حسن اور تیری خوش نمائی کو اب کوئی چیز پھر
واپس نہیں لا سکتی۔
جب پودا ہی نہیں تو کلیاں کہاں سے قائم رہ سکیں گی۔"

محبت کے پُر اسرار جوش کا اظہار ذیل کی نظم میں کس خوبصورتی سے
کیا گیا ہے۔ نظم کا عنوان ہے "ہمایوں کا خطاب زیب النساء سے"۔
تو بیداری میں خواب کی طرح مجھ پر تسلط کئے ہوئے ہے۔
تو خواب میں چاندنی کی طرح نظر آتی ہے۔
مُشک کی تیز خوشبو کی طرح میری رگ رگ میں بس رہی ہے۔
راگ کی رسیلی آواز کی طرح مجھ پر قابو پانا چاہتی ہے
کیا کوئی نقاب میری محبت کو ڈھانک سکتی ہے
کیا کوئی پردہ تیرے حسن کو چھپا سکتا ہے ؟
دوئی باقی نہ رہے۔
من و تو کا قصہ مٹا دے تاکہ میں بے باکانہ کہہ سکوں

"من تو شدم تو من شدی"۔

آپ نے دیکھا، ترجمے تک میں انتہائی اثر موجود ہے، اصل نظموں کی کیفیت کچھ وہی جانتے ہیں جو ان سے محظوظ ہوتے رہے ہیں۔

رولٹ ایکٹ کا پاس ہونا، جلیانوالہ باغ کا ظلم و تشدد اور کشت و خون اور مہاتما گاندھی کا ہندوستان کے سیاسی منظر پر رونق افروز ہونا سروجنی دیوی کو بھی ہمارے ملک کی جنگِ آزادی میں کھینچ لایا مگر اُن کی خوش طبعی اور شاعرانہ بذلہ سنجیوں نے اس راہ کی صعوبتوں کو بھی ہلکا کر دیا نہ صرف اُن کے لئے بلکہ دوسروں کے لئے بھی، اپنی زندگی کے اس انقلاب کے متعلق وہ فرماتی ہیں :۔

"لوگ مجھ سے اکثر پوچھا کرتے ہیں کہ تم خواب کے محلوں سے نکل کر بازار کی سڑک پر کیونکر آ گئیں، شاعری کی مُرلی اور بانسری کو چھوڑ کر جنگ کا بگل کیوں بجانے لگیں ؟ اس لئے کہ شاعر کا کام ان خواب کے محلوں میں بیٹھنا نہیں ہے جو گلاب کے باغوں میں بنے ہوئے ہوں بلکہ اس کی جگہ قوم کے لوگوں میں ہے اور جنگ کے مصائب میں شاہراہوں کی خاک چھاننا اس کا مقصد ہے"۔

۱۹۱۹ء میں آپ ہوم رول لیگ کے ایک نمائندے کی حیثیت سے انگلستان تشریف لے گئیں۔ آپ اصل میں ایک وفد کی سرکردگی فرما رہی تھیں جو مسٹر مانٹیگو سیکریٹری آف اسٹیٹ سے ملنے گیا تھا، اس وفد کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی خواتین کو رائے کا حق حاصل ہونا چاہئے۔ انھیں اپنے مقصد میں ایک حد تک کامیابی حاصل ہوئی۔ اس لئے کہ مانٹیگو ریفارم اسکیم میں خواتین کے لئے آئینی اسمبلیوں کے دروازے بند نہیں۔

جب ۱۸ مارچ ۱۹۲۲ء کو مہاتما جی گرفتار کئے گئے تو سروجنی دیوی نے فرمایا :۔

"وہ چاہے مہاتما جی کو زمین کے بعید ترین حصوں میں بھی لے جائیں تو کیا ہوتا ہے۔ ان کی جگہ لوگوں کے دلوں میں بدستور رہے جو اُن کے بے نظیر خوابوں اور عدیم المثال کاموں کے وارث بھی ہیں اور کار پرداز بھی"۔

جب اس مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا تو اس پر اظہارِ خیال فرماتے ہوئے آپ نے کہا :۔

"قانون کی نظر میں ایک مجرم! اس کے باوجود جب مہاتما گاندھی عدالت میں آئے تو وہاں جتنے آدمی موجود تھے وہ سب اس دُبلے پتلے پُرسکون اور نڈر انسان کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے جو ایک کھدر کی لنگوٹی باندھے ہوئے تھا"

سروجنی دیوی کانگریس کی ہدایت کے مطابق مشرقی افریقہ اور جنوبی افریقہ بھی تشریف لے گئی تھیں وہاں وہ جنرل سمٹس اور جنرل ہارٹوگ اور دوسرے یونین لیڈروں سے ملیں۔ جوہانسبرگ میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے وہاں کے ہندوستانی باشندوں کو مخاطب فرما کر کہا :۔

"میں تمہارے لئے ہندوستانی قوم کا ایک پیام لائی ہوں، اس قوم کا پیام جو اب مصروفِ خواب نہیں ہے اور جس کو اپنے شاندار مستقبل کے متعلق کوئی شبہ نہیں ہے۔ میں اپنی قوم کی طرف سے تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ دُنیا کی کوئی قوم کوئی حکومت تمہارے اس پیدائشی حق کو کہ تم بھی اُن کے برابر درجہ رکھتے ہو پامال کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گی"۔

وہاں سے واپس آ کر بلگاؤں کانگریس (۱۹۲۴ء) میں اس مسئلے پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا :۔

"کینیا، جنوبی افریقہ، ماریشس یا فجی اور ملایا سب جگہ مسئلے کی صورت ایک ہی ہے یعنی تیز رنگ اور اقتصادی کشمکش اور سب سے بڑی دقت وہاں کسی سیاسی رہنما کا نہ ہونا ہے۔ جب سے مہاتما جی جنوبی افریقہ سے آئے ہیں وہاں کے بچے بے باپ کے رہ گئے اور وہاں کے لوگ بے رہنما کے، کیا آپ لوگ ایسے وطن دُشمن ہو گئے ہیں کہ غیر ملکوں میں آپ کے بھائی ذلیل کئے جائیں، ستائے جائیں اور غلامی کی روٹی کمائیں اور آپ مُنہ دیکھتے رہیں

جب ہم اپنی متفقہ قوت سے سوراج حاصل کریں گے تو ہم ایسے قوانین بنائیں گے جو نو آبادیوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے کسی بھائی کو ہاتھ بھی لگایا تو تمہیں خطروں کا مقابلہ کرنا ہوگا"۔

سروجنی دیوی ۱۹۲۵ء والے کانگریس کے اجلاس کی صدر

منتخب ہوئیں، یہ اجلاس کانپور میں منعقد ہوا تھا۔ آپ کا خطبہ مختصر مگر جامع تھا اور تاثیر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اِس خطبہ کے صرف ایک چھوٹے سے جملے سے آپ اس کی شان کا اندازہ لگا سکتے ہیں، آپ نے فرمایا:۔

"آزادی کی جنگ میں خوف ناقابلِ فراموش غداری ہے اور ناامیدی ناقابلِ معافی گناہ"۔

اس کے بعد سے برابر آپ کانگریس کی مجلس عاملہ کی رکن رہیں اور آزادی کی جنگ میں پورے انہماک اور جوش کے ساتھ شریک رہیں اور متعدد بار قید و بند کی مشقتیں برداشت کیں۔ ۱۹۲۸ء میں آپ امریکہ تشریف لے گئیں اور ہندوستان کے خلاف مس میو نے اپنی کتاب "مدر انڈیا" میں جو زہر اُگلا تھا اپنی تقریروں کے ذریعے اُس کے اثر کو دُور کرنے کی کوشش کی ۱۹۳۱ء میں آپ نے لندن کی گول میز کانفرنس میں شرکت فرمائی۔

پچھلے سال جب دہلی میں ایشیائی تعلقات کی کانفرنس منعقد ہوئی تو کانفرنس میں شرکت کرنے والے تمام ملکوں نے متفقہ طور پر آپ کو کانفرنس کا صدر منتخب کیا اور اس منصب کے فرائض آپ نے بڑی دلکشی اور بڑی شان کے ساتھ انجام دئے۔

سروجنی دیوی متعدد حیثیتوں سے منظرِ عام پر جلوہ افروز رہیں کبھی شاعر کی حیثیت سے، کبھی سپاہی کی صورت میں، کبھی ایک باغی کے رنگ میں اور کبھی ایک گورنر کے روپ میں لیکن آپ ہر حیثیت میں نمایاں رہیں اور آپ کی شخصیت ہر جگہ اپنا نقش ثبت کر گئی۔

وہ بے چین روح جو سروجنی دیوی کے فانی جسم میں برسرِ عمل تھی آج ابدی سکون و آرام کے ساتھ آسودۂ خواب ہے، آج وہ امن و آشتی کی پیامی، وہ اچھوتی نازک تخیل کی حور، وہ سدابہار خوش گفتار بلبل بہشت میں ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہاں بھی بہشت کے بسنے والوں کو سکھ پہنچانے اور راحت و مسرت کے گیت سنانے کی خدمت اُن کے سپرد ہوگی۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو مصائب و آلام کے دشوار گذار راستوں سے بھی ہنستے کھیلتے گذر جاتے ہیں اور جب دُنیا سے رُخصت ہوتے ہیں تو اپنی خوش گوار اور پائیدار یاد کے ساتھ اپنی خدمات کا شاندار اور غیر فانی ترکہ چھوڑ جاتے ہیں جو اُنھیں امر بنا دیتا ہے۔

سی۔ پی اور برار میں زیادہ غلّہ اُگانے کی مہم

سی پی اور برار میں غذائی پیداوار بڑھانے کے سلسلے میں اب تک جو کامیابی ہوئی ہے اُس کا مختصر سا خاکہ درج ذیل ہے۔

چار ہزار پانچسو ایکڑ کے قریب بنجر زمین کو قابلِ کاشت بنالیا گیا۔ یہ سلسلہ یکم اپریل ۱۹۴۹ء سے جاری تھا۔ اپریل میں ہی تین ہزار تین سو بانوے ایکڑ زمین کھیتی باڑی کے کام کی بنالی گئی۔

کھرئی اور بیتھارئی ضلع ساگر میں اور پپاری اور دولاریا ضلع ہوشنگ آباد میں واقع ہیں۔ یہاں زمینوں کی واپسی کی اسکیم کے تحت ٹریکٹروں کے ذریعے سے کھیتی باڑی کی جاری ہے۔ جب سے اس اسکیم پر عمل درآمد ہوا ہے ۱۴ مئی ۱۹۴۹ء تک چھتیس ہزار آٹھ سو اسٹھ ایکڑ زمین بوئی جوتی جاچکی ہے۔ اس میں تیرہ ہزار چار سو اٹھانوے ایکڑ زمین کا وہ ٹکڑا شامل ہے۔ جو یکم اپریل ۱۹۴۹ء سے اب تک قابلِ کاشت بنایا جاچکا ہے۔

دوسری اسکیم کے تحت جس میں ٹریکٹروں کے لئے اسٹیشن بھی قائم کئے گئے ہیں۔ ۱۴ مئی ۱۹۴۹ء تک آٹھ ہزار تین سو تین ایکڑ زمین میں ہل چلایا جاچکا ہے۔ اس میں چار ہزار چوراسی ایکڑ زمین کا وہ قطعہ بھی شامل ہے۔ جو یکم اپریل ۱۹۴۹ء سے اب تک بونے جوتنے کے مطلب کا بنایا جاچکا ہے۔

کاشتکاروں کو تقریباً چوہتر پونڈ بیج جس کی مالیت چار سو تنتیس روپیہ ہے۔ تقسیم کیا جاچکا ہے۔ اس سے سبزی وغیرہ پیدا کی جائے گی۔ اس سلسلے میں یکم اپریل ۱۹۴۹ء سے ماہرین کے زیرِ ہدایت ایک سو سنتالیس باغات کا معائنہ کیا جاچکا ہے۔ جہاں غذائی اجناس طیار کی جاتی ہیں۔

ہری چند اختر

تغزّل

جہاں تجھ کو بٹھا کر پُوجتے ہیں پُوجنے والے — وُہ مندر اَور ہوتے ہیں شوالے اَور ہوتے ہیں
دہانِ زخم سے کہتے ہیں جن کو مرحبا بسمل — وُہ خنجر اَور ہوتے ہیں وُہ بھالے اَور ہوتے ہیں
جنہیں محرومیِ تاثیر ہی اصلِ تمنّا ہے — وُہ آہیں اَور ہوتی ہیں وُہ نالے اَور ہوتے ہیں
جنہیں حاصل ہے تیرا قُرب خوش قسمت سہی، لیکن — تری حسرت لیئے مر جانے والے اَور ہوتے ہیں
جو ٹھوکر ہی نہیں کھاتے، وُہ سب کچھ ہیں، مگر واعظ — وہ جن کو دستِ رحمت خود سنبھالے اَور ہوتے ہیں

تلاشِ شمع سے پیدا ہے سوزِ ناتمام اختر
خود اپنی آگ میں جل جانے والے اَور ہوتے ہیں

تمہارے اِک تبسّم سے جو بن جاتی تھی نُورانی — وہی غم کی گھٹا پھر چھا گئی، کیا تم نہ آؤ گے؟
تمہاری دید ہی مقصد رہا جس کی بصارت کا — وُہ چشمِ منتظر پتھرا گئی، کیا تم نہ آؤ گے؟
وفا کی سِسکیاں، اُس پر ہوس کے قہقہے، توبہ! — محبّت کی فضا تھرّا گئی، کیا تم نہ آؤ گے؟
بہارِ جاں فزا، بلبل کے نغمے، چاندنی راتیں — ہر اک شئے آنے والی آ گئی، کیا تم نہ آؤ گے؟
غرورِ ضبط کی رُسوائیاں کیا تم نہ دیکھو گے؟ — مری فریاد لب تک آ گئی، کیا تم نہ آؤ گے؟

مرے پندار کا اب ذکر کیا؟ مَیں خود جو کہتا ہُوں
طبیعت ہجر میں گھبرا گئی، کیا تم نہ آؤ گے

رتن لال کھنہ

مہاتما گاندھی اور آرٹ

پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم انڈیا نے دہلی میں گاندھی منڈپ نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے حیرت ظاہر کی کہ گاندھی جی نے ہندوستان کی زندگی کے کتنے پہلوؤں کو مس کیا اور کہا کہ جو کچھ بھی گاندھی جی نے مس کیا اُسے بیش بہا بنا دیا۔ گاندھی جی بڑے جید اور گمبھیر صاحبِ فکر تھے۔ وہ ہر بات کی عمیق ترین گہرائی تک پہنچتے تھے۔ جس موضوع پر فکر کرتے تھے اُس کے ہر پہلو پر بصیرت افروز روشنی ڈالتے تھے۔ وہ موضوعِ فکر کا عطر بلکہ اس کی روح صاف و صریح اور سلیس نثر میں سامنے رکھ دیتے تھے جو ہر شناس اسے موتیوں میں تولتے ہیں، ان کے اسلوبِ بیان میں اعجازِ لفظ اور اعجازِ معنیٰ کا نادر اتحاد ہے۔

ظاہرا طور پر گاندھی جی کا آرٹ سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اصطلاحی معنوں میں وہ آرٹسٹ نہیں تھے مگر دراصل وہ عظیم آرٹسٹ تھے۔ اگرچہ گاندھی جی نے نقاشی اور مصوّری نہیں کی لیکن اپنے قول، فعل اور تحریر میں وہ آرٹسٹ تھے۔ پھر آرٹ کے مقصد اور فلسفے پر اظہارِ رائے کرنے کے لئے خود آرٹسٹ ہونا لازم نہیں یہی صلاحیت کافی ہے کہ صاحبِ فکر بصیرت، فراست اور تخیّل کی صفات رکھتا ہو اور آرٹسٹ کی روح اور دل اُس کے پیکرِ خاکی میں دھڑکتا ہو۔ گاندھی جی میں یہ تمام اوصاف موجود تھے اس لئے آرٹ پر اِن کے خیالات مُستند ہیں۔

آرٹ کے مقصد پر مختلف نظریے ہیں۔ آرٹ مفکّروں کے ایک اسکول کی رائے میں آرٹ کا اساسی مقصد آرٹ ہے یعنی آرٹ محض آرٹ کی خاطر ہے۔ آرٹ کا کام کسی ایسی غرض کا پورا کرنا نہیں جس کا آرٹ سے بنیادی واسطہ نہ ہو۔ اس اسکول کے خیال کے مطابق آرٹ کی دُنیا ہی نرالی ہے جس کا ہماری دُنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ مختصراً آرٹ بذاتِ خود اصلی مقصد ہے کسی بیرونی مقصد کو حاصل کرنے کا وسیلہ نہیں۔

دوسرے مفکّروں کا خیال ہے کہ آرٹ کی علّتِ غائی آرٹ نہیں۔ آرٹ بذاتِ خود اپنا مقصدِ اصلی نہیں بلکہ کسی مقصود تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ یہاں تک تو مفکّر متفق الرائے ہیں، مقصود کی نوعیّت پر ان کی راؤں میں فرق پایا جاتا ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ آرٹ خدا کے لئے ہے اور آرٹسٹ کا فرض ہے کہ آرٹ کو وقفِ خدا کر دے اور دوسرے گروہ کے نظریئے کے مطابق آرٹ سیاسیات کی باندی ہے۔ یعنی آرٹ ریاست کے تابع ہے اور حکومت کی پالیسی (طریقِ عمل) کا پراپگنڈا کا آلہ۔ حکومتیں آرٹ کا اصلی مقصد یہی خیال کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر سویٹ روس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہاں آرٹ مارکس کے لئے ہے مطلب یہ ہے کہ سویٹ آرٹ کا مقصد کارل مارکس کے اصول کو پھیلانا ہے اور بس۔ تیسرے گروہ کا خیال یہ ہے آرٹ نوعِ انسان کے لئے ہے اس کا مذہب انسانیت ہے اور اس کی غرض انسانوں کی خدمت کرنا ہے ان کا عقیدہ ہے کہ آرٹ فی نفسہٖ مقصد نہیں بلکہ انسانیت کو مخاطب کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس ضمن میں ایک مشہور جرمن مفکّر کا قول ہے کہ "آرٹ کا کام ہے انسانی قدروں کی نقاشی کرنا ورنہ آرٹ نکمّا ہے اور انسانیت کے بغیر اصلی فن کاری ناممکن ہے۔

مہاتما گاندھی بھی اس مسئلے کے معتقد تھے کہ آرٹ انسانیت کے لئے ہے۔ اُنھوں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ آرٹ اور ادب کا رُوئے سخن عوام کی طرف ہو" اُن کے خیال کے مطابق آرٹ خاص حلقوں اور جماعتوں کے لئے مخصوص نہیں بلکہ جمہور کے لئے ہے۔ اس لحاظ سے وہ لینن کے اصولاً ہم خیال تھے۔ لینن کا مقولہ ہے کہ "آرٹ عوام کی ملکیت ہے اس کی جڑوں کو عوام کی انتہائی تہ تک پہنچنا چاہیئے اُسے عوام کی فہم و سمجھ سے بالاتر نہیں ہونا چاہیئے بلکہ مقبولِ عوام ہونا چاہیئے۔

اس کا کام عوام کے خیالات، احساسات اور ارادوں کو متحد کرنا اور اُن کو اُبھارنا ہے"۔

عوام سے مراد گاندھی جی کی بالخصوص دیہاتی لوگوں سے تھی۔ ہندوستان کے اَن گنت گاؤں ہمیشہ اُن کی توجّہ کا مرکز بنے رہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے آرٹ ان گم سم لوگوں کے دل و روح کی ترجمانی کرے، ان کی زندگی میں رنگ و نُور لائے اور ان میں حُسن شناسی کے احساس کو اُبھارے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ آرٹ عوام کی زندگی کے لئے لازمی چیز ہے جس طرح ہر انسان کا جسم خوراک طلب کرتا ہے اُسی طرح ہر انسان کا تخیّل خوراک کا طالب ہے اور آرٹ اس کی نہایت ضروری خوراک ہے، آرٹ زندگی کی ضروریات میں سے ہے تعیشات میں سے نہیں۔ قدیم ہندوستانی آرٹ اور عوام میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ رفتارِ زمانہ کے ساتھ یہ آرٹ عوام سے پرے ہی پرے ہٹتا گیا۔ گاندھی جی کی خواہش تھی اُسی آرٹ کا احیاء کیا جائے اور آرٹسٹ سے عوام کی زندگی فیضان حاصل کرے اور اُسی سے تخلیقی تحریک پیدا ہو۔

گاندھی جی کا دوسرا اہم مقولہ یہ ہے کہ "اصل آرٹ مظہر روح ہے۔ اس قسم کے آرٹ میں میرے لئے سب سے زیادہ اپیل ہے"۔ اُنھوں نے کہا کہ "کئی اپنے آپ کو آرٹسٹ کہتے ہیں اور وہ آرٹسٹ مانے بھی جاتے ہیں مگر ان کے آرٹ کے نمونوں میں روح کی بلند پروازی کی لگن اور اس کی بے کلی کا نام نشان تک نہیں"۔ اُن کی رائے میں "انسانی آرٹ کے نمونوں کی قیمت اُسی قدر ہے جس قدر وہ روح کی اُس کی منزلِ مقصود یعنی تزکیۂ نفس میں مدد کرے"۔ ایک مستند یورپین نقّاد نے گاندھی جی کے اس خیال کی تائید کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "آرٹ مادّے کے وسیلے سے روح کا اظہار ہے"۔

مہاتما گاندھی کا یہ قول ہمارے آرٹ کی قدیم روایات کے ہم آہنگ ہے کیونکہ یہ آرٹ اساسی طور پر روح کے گوناگوں مظاہر کی مصوّری کرتا ہے اور روحانیت کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

آرٹ اور حُسن و صداقت

انگریزی کے مشہور شاعر کیٹس نے اپنی ایک نظم میں کہا کہ "حسن صداقت ہے اور صداقت حسن"۔ کیٹس کا خیال تھا کہ حُسن کا اصول شاعری کا سنگِ بنیاد ہے اُس کی رائے میں سچ اور حُسن مترادف ہیں۔ اس شاعر نے اپنے ایک دوست بیلی کو ایک خط میں لکھا: "تخیّل جو کچھ بطور حُسن اپنے تصرّف میں لاتا ہے وہ لازمی طور پر سچ ہوتا ہے باوجودیکہ وہ پہلے موجود تھا یا نہیں" گاندھی جی صداقت کے پُجاری تھے اُن کے خیال میں بھی آرٹ کی قلمرو میں حسن اور صداقت لازم و ملزوم ہیں۔ گاندھی جی کا سنہری قول ہے کہ "جب لوگ سچ میں حسن پانا شروع کر دیتے ہیں تب حقیقی آرٹ جنم لیتا ہے"۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ "تمام سچائیاں نہ صرف سچے خیالات بلکہ سچے چہرے، سچی تصویریں یا گانے بڑے حسین ہوتے ہیں۔ عام طور پر لوگوں کو سچ میں حسن نظر نہیں آتا، عام انسان اس سے گریز کرتا اور اس سے آنکھیں مُوند لیتا ہے"۔ اُنھوں نے مزید توضیح کی کہ "اصلی خوبصورت تخلیقات کو وجود میں لانے کے لئے درست تصوّر اور ادراک کی ضرورت ہے۔ اگر ایسے لمحات زندگی میں نادر ہیں تو یہ آرٹ میں بھی نادر ہیں"۔ ان خیالات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ گاندھی جی فی الواقعی صداقت کے آرٹسٹ تھے۔

گاندھی جی کے اخلاق کے اصول میں پاکیزگی حیات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ "زندگی کی پاکیزگی اعلیٰ ترین اور سب سے سچّا آرٹ ہے"۔ وہ اس عام خیال سے متفق نہیں تھے کہ آرٹ ذاتی زندگی کی پاکیزگی سے آزاد ہے۔

ان کی رائے میں "سچّا آرٹ آرٹسٹوں کی پاکیزگی، شانتی اور خوشی کا شاہد ہے"۔ ایک مفکّر کا خیال ہے کہ آرٹسٹ کوئی ایسی تخلیق نہیں کرسکتا جو اس کی ذات انسانی میں نہ ہو۔ ہیولک ایلیس نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ہر آرٹسٹ اپنی سوانحمری لکھتا ہے۔ آرٹ کوئی غیر شخصی نہیں۔ دراصل آرٹ کا ہر نمونہ اپنے مخترع کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے یعنی آرٹ آرٹسٹ کی پرائیویٹ زندگی سے جُداگانہ تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ گاندھی جی کے خیالات کے مطابق آرٹسٹ کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی پرائیویٹ زندگی کو پاکیزہ رکھے تاکہ اس کا آرٹ اس پاکیزگی کا عکّاس ہو کر اپنا مشن پورا کر سکے۔

موسیقی پر مہاتما گاندھی کے خیالات

موسیقی کا حیرت انگیز

اثر روحانی جسمانی اور نفسیاتی مسلمہ امر ہے۔ گاندھی جی نے فرمایا۔ "موسیقی سے مراد ترنم اور حسن ترتیب ہے، یہ راحت پہنچاتا ہے" گاندھی جی نے دیکھا کہ آرٹ ہمارے شاستروں کی طرح صرف چند لوگوں کا حق مخصوص بنا ہوا تھا، وہ چاہتے تھے کہ موسیقی لوک آرٹ ہو اور عوام اس سے بہرہ ور ہوسکیں۔ وہ عوام میں اس آرٹ کی تعلیم و تربیت کو پھیلانا چاہتے تھے۔ وہ حقیقی معنوں میں اس آرٹ کو قومی مسلک بنانا چاہتے تھے۔ یہ خیال مہاتما گاندھی کی آرٹ اشتراکیت کا شاہد ہے۔

ایک امریکن شاعر کا قول ہے کہ موسیقی پیغمبر کا آرٹ ہے۔ گاندھی جی زمانۂ حال کے بہت بڑے رشی تھے۔ انھیں موسیقی سے خاص لگاؤ تھا۔ اُن کی ساری روحانی زندگی موسیقی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ ہماری لوک موسیقی میں بھجن بہت مقبول ہیں اور گاندھی جی کو اعلیٰ پایے کے بھجنوں سے خاص رغبت تھی۔ موسیقی کی تخلیق پر گاندھی جی کی ایک کہانی نہایت دلچسپ ہے وہ یوں ہے کہ:۔

"جب میں چھوٹا سا بچہ تھا تو میں نے راجکوٹ میں دو گانے بجانے والے دیکھے۔ وہ دونوں اندھے تھے ان میں ایک گویا تھا جب وہ ساز کو بجاتا تو اُس کی انگلیاں تاروں پر بے خطا فطری اور وجدانی مہارت سے چلتی تھیں۔ ہر ایک آدمی اُسے ہمہ تن گوش ہو کر سنتا تھا۔ اسی طرح ہر انسانی دل کے تار ہیں۔ جب ہم یہ جان لیں کہ درست تار کو کس طرح چھیڑا جاتا ہے تو اُس وقت ہم موسیقی کی تخلیق کرتے ہیں"۔

آزاد ہندوستان اپنے پراچین آرٹ کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور آرٹ کو عوامی زندگی کیلئے خوشگوار بنانے اور اس میں وجد لانے کے لئے گوناگوں تجاویز کی جا رہی ہیں۔

اگر آرٹ سے متعلق گاندھی جی کے مذکورۂ بالا سنہری اصول کو مدِنظر رکھا جائے تو فلاحِ عام کے لئے رحمت سے کم نہ ہوگا۔ ہمارے افلاس زدہ عوام کی زندگی محض زیست ہے اس میں رنگ و بو نہیں یہ بے رنگ اور بے تنوع ہے۔ اس میں لمحات وجد نادر ہیں۔ گاندھی جی کے اصول پر عمل کرکے ہمارے فن کار اس میں رنگ و بو لا سکتے ہیں اور اس کو بیتے آنند کی گھڑیاں بخش سکتے ہیں اور بے خودی کے چند لمحات ان کو مہیا کر سکتے ہیں جن میں تلخیٔ دوراں کو بھول سکیں۔

آرام زندگی کے لئے بے خودی ہے شرط
سو آفتیں ہیں ایک خبر اپنے حال کی

صرف ان اصول پر عمل کرنے سے ہی وہ آرٹ کا مشن پورا کر سکتے ہیں اور حبِّ وطن کا ثبوت دے سکتے ہیں۔ اگر وہ ہندوستان میں آرٹ کی جمہوریت قائم کر دیں تو وہ جنتا کی ایک سب سے اہم اور عظیم خدمت سرانجام دیں گے۔ گاندھی جی آرٹ کی قلمرو میں سوشلزم کے علمبردار تھے۔ ہمارے آرٹسٹوں کا فرض ہے کہ وہ اُن کے اصول کی پیروی کریں اور جب تک وہ گاندھی جی کی فنی اشتراکیت کو سرزمین ہند پر قائم نہ کر لیں تب تک ہمہ تن و ہمہ دل کوشاں رہیں۔ اُن کے لئے دلیش سیوا کا یہ سنہری موقع ہے اور دیش بھگتی کا بہترین وسیلہ۔ اگر آرٹسٹ مصمم ارادہ کر لیں تو ہمارے ملک میں آرٹ کا رام راج جلد ہی قائم ہو جائے گا۔

میرے ہاتھ سلجھا ہی لیں گے کسی دن
اگر زلفِ ہستی میں خم ہے تو کیا غم

جوش ملیح آبادی

درسِ محبّت

عزیزو! یہ جوشِ رواں بخشِ ہند — یہ مے خوار زاہد، یہ درویش رند

یہ دُنیا کا حق کیش باطل نواز — یہ خاور شکن شاعرِ ذرّہ ساز

یہ طاعت پرست و بغاوت پناہ — بہ فطرت سفید و بہ نامہ سیاہ

بخلوت سرود و بجلوت خروش — یہ تعمیر آمادہ تخریب کوش

یہ صورت گرِ نور و معمارِ نار — یہ آئینۂ اولیائے کبار

یہ جوئندۂ ہر خفی و جلی — گنہگار معصوم، کافر ولی

کبھی شادماں و کبھی مضمحل — جہنّم در آغوش و جنّت بدل

بہ ہستی مکدّر، بہ مستی نقی — یہ اِس دَور کا فاسقِ مُتقی

یہ تاریک دُنیا کا روشن ضمیر — سیہ کار قُدسی، قدح خوار پیر

یہ جھوٹی عدالت کا سچّا گواہ — یہ سرتاقدم اک مُقدّس گُناہ

خطاؤں کے ہوتے سزاؤں سے دُور — یہ قانون داں مُجرم بے قصُور

یہ دانا و عادل ظلوم و جہول — یہ بے دین مومن، یہ مُنکر رسُول

ندا دے رہا ہے تمہیں صبح و شام — عزیزو یہ رندِ علیہ السّلام

ندا دے رہا ہے سُوئے منزلت — یہ پیغمبرِ دینِ انسانیت

محبّت کا اِس پیر سے درس لو — خس و خار سے بھی محبّت کرو

محبّت کے دُنیا میں غنچے کھلاؤ — شرارے بجھا دو، ستارے اُگاؤ

ہر اک حلقہ پابندِ زنجیر ہو — ہنسو، مسکراؤ، بغلگیر ہو

نہ رندی، نہ مستی، نہ عشرت حرام — اگر ہے تو میلِ عداوت حرام

نہ ہندو نہ گبر و مسلماں بنو — اگر آدمی ہو تو انساں بنو

نہیں تو ہلاکت میں ڈھل جاؤ گے
خود اپنے جہنّم میں جل جاؤ گے

۱۰ ستمبر کو لیڈی ہارڈنگ ہسپتال میں ڈاکٹر سی مانی ریجنل ڈائریکٹر ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (جنوب مشرقی ایشیا) نے آنریبل راجکماری امرت کور کو ہندوستان کے لئے دو لوہے کے پھیپھڑے پیش کئے۔ یہ پھیپھڑے حال ہی میں ڈبلیو۔ ایچ۔ او۔ کے زیر اہتمام امریکہ سے ہندوستان کے لئے منگوائے گئے ہیں۔

تصویر میں:۔ راجکماری امرت کور لوہے کے پھیپھڑے کا استعمال دیکھ رہی ہیں۔ دائیں طرف۔ ڈاکٹر کے۔ سی۔ کے۔ ای۔ راجا ڈائریکٹر جنرل آف ہیلتھ سروسز کھڑے ہیں۔ وزیر صحت کے دائیں طرف شری مینن جائنٹ سیکرٹری منسٹری آف ہیلتھ اور ڈاکٹر سی مانی (سیاہ ٹائی پہنے) کھڑے ہیں۔

کابل میں ہندوستـ

ہندوستان اور افغانستان کے

بودھی ستّارا
ـ گندھارا
تیسری ــ
پانچویں صدی
←

ایک نوجوان
کے بت کا سر ـ
گندھارا ـ
تیسری صدی
↓

بـ ـ ایک سوالی بت کا سر ـ گندھارا (چوتھی صدی)

جـ ـ بدھ کے بت کا سر ـ گندھارا (پانچویں صدی)

آرٹ کی نمائش

ن قدیم دوستی کا نیا باب

ایک فلسفی کے بت کا سر — گندھارا۔
تیسری یا چوتھی صدی

بودھی سٹارا تیربا —
گندھارا ۔ بائیں ہاتھ
میں صراحی لئے
ہوئے۔ غالباً دوسری
صدی

افغانستان اور ہندوستان دونوں اس وقت سے ایک دوسرے کے رفیق ہیں جب کہ آریاؤں نے افغانستان اور پنجاب کی وادیوں میں اپنی آبادیاں قائم کی تھیں۔ یہ بات بڑی پرانی اور قدیمی ہے۔ افغانستان کے بہت سے جغرافیائی نام اس تاریخی دور کی یادگار ہیں

پنڈت جواہرلال نہرو اور شری گووند بلبھ پنت نے ۱۱ ستمبر کو اروِن ہسپتال میں پری فیبریکیٹڈ مکانوں کا معائینہ کیا۔ اس قسم کے مکانات گورنمنٹ ہاؤسنگ فیکٹری میں تیار ہونگے۔ ہندوستان کی وزیر صحت شریمتی امرت کور نے پنڈت جی اور پنت جی کو ان مکانوں کے متعلق تفصیلی واقفیت بہم پہنچائی۔

اس مکان کا رقبہ ۵۰۰ مربع فٹ ہے اور اس میں دو کمرے، دو برآمدے (ایک آگے ایک پیچھے) ایک کچن، ایک غسل خانہ اور ایک پاخانہ ہے۔ ماہرین کے اندازے کے مطابق اس مکان کی عمر ساٹھ سال بیان کی گئی ہے۔

صدیقہ بیگم سیوہاروی

دولھا بھائی

(ریڈیائی فیچر)

تعارف :۔ رشید .... دولھا بھائی   امّاں .... رشید کی ساس

رضیہ .... سعیدہ .... ذکیہ .... سالیاں

منظر۔ امّاں پاندان کے سامنے بیٹھی ہوئی ڈلی کاٹ رہی ہیں اُن کے پاس ہی پڑوسن بیٹھی ہے ۔

امّاں ۔ ہاں بہن تم نے کیا پوچھا تھا' ارے ہاں لڑکیاں' وہ تو تینوں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی ہیں ۔ صبح سے وہ شور مچا رکھا ہے کہ توبہ بھلی ——

پڑوسن ۔ اِن کی بیاہ شادی کی بھی کچھ فکر ہے بُوا ——

امّاں ۔ جب اللہ کرے گا تو سب کی شادی ہو ہی جائے گی' بہن بیٹی تو فقیر کی بھی نہیں بیٹھی رہتی ۔

پڑوسن ۔ سچ ہے بوا بیٹا تو راجہ کا بھی رہ جاتا ہے مگر بیٹی کسی کی نہیں رہتی ۔

امّاں ۔ پیغام تو بہت آ رہے ہیں مگر ابھی تک جواب کسی کو نہیں دیا ۔

پڑوسن ۔ بوا جس گھر میں بیری ہوتی ہے ڈھیلے آتے ہی ہیں

امّاں ۔ مگر پیغام کوئی ڈھنگ کا نہیں آتا' کوئی قاضی ہے تو کوئی مولوی' کوئی پیر جی —— دراصل ایک بھی تو ٹھکانے کا نہیں ۔ اب وہ مولوی ہی کو لو ——

پڑوسن ۔ اے لو بُوا کہیں وہ مولوی ایسا ویسا ہے ۔ خدا تمہارا بھلا کرے کہاں کہاں سے امتحان پاس کر کے آیا ہے اور صورت ایسی کہ بس دیکھتے ہی رہو —— اور بُوا وہ پیر جی کا لڑکا' حکیم ہے نا —— تو بوا خدا تمہارا بھلا کرے پیر جی کی بیوی اس روز مجھ سے ذکر کر رہی تھیں کہ سعیدہ سے بات چیت لگائیں ۔ میں نے کہا ہماری بچّی لاکھ میں ایک ہے' صورت شکل کی ایسی کہ چراغ لے کر ڈھونڈو تو بھی دکھائی نہ دے' میں نے کہا کہ پیر جن گھر چمک جائے گا جس دن سعیدہ نے تمہاری مسہری پر پاؤں رکھ دئے بس یوں سمجھو کہ بتّیاں جل گئیں ——

امّاں ۔ نا بہن مجھے تو وہ لونڈا پسند نہیں چاہے حکیم ہو یا ڈاکٹر

پڑوسن ۔ مگر بُوا اس کی حکمت تو خوب چلتی ہے صبح سے شام تک اس گھر میں بیمار بھرے رہتے ہیں اور اللہ نے اپنے حبیب کے صدقے میں اس کے ہاتھ میں شفا بھی تو دی ہے پھر لڑکا بھی سیدھا ہے —— اور نہیں سُنا تم نے میری سلمیٰ تین دن سے بے سُدھ پڑی تھی پر اُس کا نبض پر ہات رکھنا تھا کہ اے لو وہ تو تین دن میں گھوڑا ہی ہو گئی —— بس یوں سمجھو کہ ہات میں وہ شفا ہے کوئی مریض نا امید ہو کر نہیں گیا ۔ اور پھر اپنے گھر کا علاج تو بے پیسے کرتا ہے ہماری سعیدہ چلی گئی تو پھر اپنا ہی بچہ ہے ۔

امّاں ۔ نا بہن —— میں دوسروں کے بھلے کے لئے اپنی بچی کو یوں نا ڈبو دُوں گی ۔ بخشو بی بلّی' چوہا لنڈورا ہی بھلا ۔

پڑوسن ۔ اے بوا تم دیکھو تو کہو' تمہاری قسم لڑکا دیکھنے کے لائق ہے ۔

امّاں ۔ پر بہن' میں اس موئے مولوی سے تو کرنے سے رہی جھاڑو پھرا کیا میری بچی کو ایسا بھی نہ جُڑے گا ۔

پڑوسن ۔ خیر چھوڑو' ویسے بھی تمہاری لڑکیوں کی عمر بھی ایسی

کون سی ہے ——

آماں - عمر کو تو مت کہو، سیانی لڑکی کو بٹھلائے رکھنا بھی تو گناہ ہے - روحوں کا آنا رمارا جاتا ہے اس کا سارا عذاب ماں باوا ہی کے سر تو ہوتا ہے جس گھر میں سیانی لڑکی ہو، سچ پوچھو تو اس گھر کا کھانا پینا بھی حرام ہے، اپنے یہاں تین ہتھنیاں بیٹھی ہیں جس دن یہ کھونٹے سے کھلیں گی اس دن پیٹ بھر کے روٹی کھاؤں گی -

پڑوسن - سچ ہے بوا سچ ہے - اب مجھے اپنی ہی منّی کی فکر کھائے جا رہی ہے کہیں بات چیت آئے تو ہیں کر کرا کے الگ ہوں —— اور ہاں بوا تمہاری صفی نہیں آئی بہت دنوں سے ——

آماں - سُنا ہے اُس کے کچھ ہے - اب دیکھو رضیہ کے ابا کو بھیجوں گی آنے لائق ہوگی تو لے آئیں گے، نہیں تو ابھی ایسی کوئی ضرورت نہیں، اپنے ہی گھر اچھی ہے خیر سلا سے ہو، ہوائے تو چلّا نہلا کے لے آؤنگی، اللہ اللہ خیر سلا -

(دروازہ کُھلنے کی آواز)

پڑوسن - کون ہے ؟

آماں - لڑکیاں ہوں گی اور کون ہوگا ؟

رضیہ - سلام خالہ -

ذکیہ - ارے خالہ کب آئیں سلام ——

پڑوسن - جیتی رہو بیٹی

سعیدہ - تسلیم —— خالہ ایک ہفتہ سے کہاں غائب رہیں آنکھیں ترس گئیں عید کا چاند ہوگئی -

پڑوسن - خدا تمہیں نیک گھر نیک بَر دے —— بیٹی کہاں جاتی مُنّی کا جی اچھا نہیں تھا بس اسی کی دوا دارو میں لگی تھی -

رضیہ - اماں تمہیں نصیبن بلا رہی تھی -

آماں - اچھا جاتی ہوں -

پڑوسن - اب بُوا میں بھی چلتی ہوں، روٹی ڈالنی ہے، دال تو مُنّی نے پکالی ہوگی -

(دروازہ کھلتا ہے پیروں کی آواز سنائی دیتی ہے)

رضیہ - دولھا بھائی ہیں کیا

ذکیہ - ہاں ہاں دولھا بھائی ہیں -

سعیدہ - اے لو دولھا بھائی آگئے ہیں -

رضیہ - کہاں سے آٹپکے دولھا بھائی -

سعیدہ - مگر بیگم کو کہاں چھوڑ آئے، بولئے تو کیا چُپ کا روزہ رکھ چھوڑا ہے -

ذکیہ - گونگے بہرے بن کے یوں سسرال میں مت بیٹھئے
بھولے بھالے دولھا بھائی کچھ تو غوں غاں کیجئے

سعیدہ - ارے کچھ بولئے گا بھی - جواب تو دیجئے

رضیہ - واہ بولیں گے کیوں نہیں، وہ دیکھو
وہ ہونٹ ہلتے ہیں وہ ناک پر ہنسی آئی
یہی تو خیر سے تیور ہیں مُسکرانے کے

سعیدہ - اری اللہ —— یہ تمہاری مونچھوں کو کیا ہوگیا "-

ذکیہ - داڑھی مونچھیں تو کب کی دیمک چاٹ گئیں -

رضیہ - اور بیگم نے بتایا بھی نہیں -

سعیدہ - لو اب اور مت بولو —— وہ دیکھو اماں آگئیں -

رشید - امّاں سلام

اماں - جیتے رہو بیٹا خدا تم کو اولاد دے —— دن عید ہو رات شب برات —— کب آئے بیٹا -

رشید - ابھی ابھی آرہا ہوں سامان تو باہر ہی رکھا ہے، اماں ان لونڈیوں کو دیکھو نہ پیام نہ سلام، بس لٹھ کی طرح آکر کھڑی ہو گئیں اور لگیں اُلٹی سیدھی ہانکنے -

رضیہ - اچھا (منہ بنا کر) لگیں اُلٹی سیدھی ہانکنے - ٹھیک سے بات کرو دولھا بھائی، ہمارے گھر آکر اور ہمیں پر رعب، بھلا ہم لٹھ کی طرح کھڑے ہوئے یا تم جو آگئے یوں ہی ہات ہلاتے ہوئے یہ نہیں کہ چار پیسے کی مٹھائی لے کر چلتے -

اماں - ارے لگائے جا رہی ہے زبان ہے کہ کترنی - میں کہتی ہوں رضیہ یہ میری دونوں لڑکیاں تیری ہی بگاڑی ہوئی ہیں - کیا زبان چلتی ہے قینچی کی طرح -

رضیہ - نہیں اماں، میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا بس یہی تو سعیدہ

نے پوچھا تھا کہ ہماری آپا کو نہیں لائے، بس پھر کیا تھا لگ گئیں ان کے مرچیں۔

رشید۔ یہ کہا تھا اور خود تم کچھ نہیں بولیں — چھوٹی لپاٹن اچھا سعیدہ سے پوچھو —

سعیدہ۔ ہاں اماں یہی تو کہا تھا — بس اسی پر ان کا دماغ عرش معلیٰ پر پہنچ گیا۔

اماں۔ اچھا چلو اپنے کمرے میں — لونڈے کے پیچھے کتوں کی طرح پڑ گئیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کیوں بیٹا — صفی کا کیا حال ہے۔ اسے کیوں نہیں لیتے آئے۔ اور تم نے اپنے آنے کی بھنک تک نہیں دی۔

رشید۔ اچھی ہے ذرا کچھ طبیعت مکدر تھی، سفر کے لائق نہیں تھی اس لئے چھوڑ آیا۔

رضیہ۔ ذرا طبیعت خراب ہے بس جھوٹ بولنا تو کوئی رشی بھائی سے سیکھے۔ سیدھے سادے یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ مزاج دوسرا ہو رہا تھا۔

اماں۔ چل دور ہو بدبخت — تیری اس زبان سے تو میں عاجز آگئی کسی روز گدی سے کھینچ لوں گی — جا دولھا بھائی کے لئے کچھ ناشتہ لا۔

رضیہ۔ ہاں دولھا بھائی وہ آپ کے امتحان کا کیا ہوا۔

رشید۔ ہونا کیا ختم ہو گیا —

رضیہ۔ (قہقہہ لگاتی ہے) ہمیں چلاتے ہو دولھا بھائی۔ یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ امتحان میں فیل ہونے کی طیاری کر رہے ہو۔ ابھی بتاتی ہوں ذرا ناشتہ تیار کر لاؤں۔

اماں۔ او سعیدہ — تو لوٹے میں پانی تو لا، رشید کے لئے۔ چٹر چٹر کرتی ہوتی آجاتی ہے لونڈا تھکا تھکا یا آیا ہے۔

سعیدہ۔ اونہوں —

رشید۔ یہ اونہوں کیا، جاتی ہے کہ —

سعیدہ۔ کہ کیا — کیسے ناس ٹر گئے

رشید۔ اب تمہارے بھی پر نکل آئے۔

اماں۔ کیوں دماغ چاٹ رہی ہے جا پانی لا —

رشید۔ اماں یہ کھیر کیوں جمع کر رکھی ہے ان سب کا شادی بیاہ کر کے باپ بھی کاٹو — گھورتی کیوں ہے، سعیدہ کی بچی جا جا اپنا کام کر (سعیدہ ماتھے پر شکنیں ڈالے ہوئے چلی جاتی ہے۔ ذکیہ، اماں اور رشید بیٹھے رہ جاتے ہیں)

اماں۔ بیٹا پیغام تو دس جگہ کے ہیں پر ابھی طے کہیں نہیں ہوا۔

سعیدہ۔ لو دھو منہ — پانی رکھا ہے دیکھو لو ٹھیک سے۔

ذکیہ۔ ہاں ذرا ٹھیک سے دکھا دو پانی دولھا بھائی کو سعیدہ آپا۔

رشید۔ تمیز سے بات کرو، پانی ڈلواؤ، دیکھو تمہارے بھلے کی بات ہو رہی ہے۔ ہاں اماں وہ مولوی صاحب کا پیغام بھی تو تھا۔

اماں۔ ہاں سعیدہ سے، وہ بھی ہے ابھی جواب نہیں دیا۔ اس کے ابا کہتے ہیں کہ موا مولوی کس کام کا مسجد کے ٹکڑے لا کر رکھ دیا کرے گا۔

سعیدہ۔ دھوتے بھی ہو یا بات ہی لے چلے جاؤ گے۔

رشید۔ چل کیوں رہی ہے (آہستہ سے) اب پھنسی ہے آخر ہم بھی کچھ ہیں۔ ہاں اماں مولوی ہو یا ملا مگر لڑکا اچھا ہے، صورت شکل دیکھنے کے لائق ہے، کیسا نورانی چہرہ ہے چھاج سی داڑھی ہے مجھے تو بہت پسند ہے

(سعیدہ لوٹا پٹختی ہے)

اماں۔ چھوڑ دے لوٹا —

رشید۔ دیکھو اماں یہ پانی نہیں ڈلواتی۔

سعیدہ۔ ڈلوا تو رہی ہوں۔

اماں۔ ایک وہ قاضی جمیل کے لونڈے کا پیغام ہے پر ایسی غریب جگہ تو میں دینے سے۔ یہی جس کے گھڑے پر پیالہ بھی نہیں۔

رشید۔ لڑکا کیا کرتا ہے۔

اماں۔ کانجی ہوز میں ہے۔

رشید۔ کانجی ہوز میں! ارے گھوڑا ہے کیا۔

اماں۔ ارے نہیں نوکر ہے وہاں، کس کام کا پڑھا نہ لکھا۔

اور کہاں نوکری ملتی -

رشید - بس بس اماں وہی ٹھیک ہے چار روز جہاں اس کو کانجی ہوز میں جانوروں کے ساتھ بند رکھا آپ ٹھیک ہو جائے گی -

سعیدہ - ٹھیک سے منہ دھوتے بھی ہو کوئی نوکر ہوں جو اس طرح پانی انڈیلے جاؤں -

رشید - (آہستہ سے) آج ہی تو بات لگی ہے - دانت کیوں پیستی ہے -

اماں - سعیدہ بیٹی — ٹھیک سے پانی ڈلوا دے، کتنے دنوں میں آیا ہے آنکھیں ترس گئیں -

سعیدہ - (آہستہ سے) تمہاری ترسی ہونگی آنکھیں -

رشید - مت گھبرا — مولوی کے گئی تو میں مسجد میں جانے سے رہا اور قاضی جی کے لونڈے سے ہوا تو کانجی ہوز میں کون جانے گا وہاں تو گھوڑے اور گدھے ہی رہتے ہیں —

(سعیدہ پورا لوٹا رشید کے اوپر الٹ دیتی ہے)

رشید - یہ دیکھو اماں اس سعیدہ کی حرکت —

سعیدہ - اماں کہاں ہیں، وہ تو گئیں باورچی خانے میں

(سعیدہ قہقہہ لگاتی ہے) سب آجاتے ہیں -

رضیہ - یہ لو دولھا بھائی ناشتہ — ارے واہ کیا کپڑے پہنے پہنے نہا رہے ہو -

(سب مل کر قہقہہ لگاتے ہیں)

ذکیہ - دولھا بھائی پانی کم پڑ گیا ہو تو اور لاؤں -

سعیدہ - گھڑا اُٹھا لا ایک لوٹا پانی سے کیا ہوتا -

رضیہ - ارے دولھا بھائی کے لئے تو چلّو بھر پانی ہی کافی ہے

سعیدہ - مگر عزت والے ہی کے لئے تو — دولھا بھائی کے لئے تھوڑا ہی -

ذکیہ - ایک سال کے بعد نہائے ہیں دولھا بھائی اب مٹھائی کھلانا ہے دولھا بھائی -

رشید - کیسی مٹھائی بدتمیز کہیں کی، دیکھو آنے دو اماں کو کہتا ہوں -

سعیدہ - اس میں بدتمیزی کی کیا بات ہے - سال بھر کے بعد نہائے ہو تو کھلاؤ گے کیسے نہیں مٹھائی -

رشید - لاحول ولا — میں سمجھا تھا —

سعیدہ - اچھا آپ کا دھیان وہاں پہنچ گیا ہم بھی تو کہیں واہ بھئی رشی بھائی خوب ہی تو رہی چوبیس گھنٹے اُسی خیال میں غرق رہتے ہو -

رشید - تم سب پاگل ہو، پاگل —

ذکیہ - دولھا بھائی آپ تو شاعری بھی کر سکتے ہیں -

اماں - (خدا تمہیں غارت کرے کمبختو! یہ کیا کر رہی ہو)

رشید - اماں! یہ سب کانجی ہوز میں ڈالنے کے لائق ہیں -

رضیہ - ہم کیا کر رہے ہیں، گھورتے کیوں ہیں آپ جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائیں گے - بیگم یاد آ رہی ہیں -

سعیدہ - آہ بیگم کتنا اچھا ناشتہ رکھا ہوا ہے مگر میں اس کو اکیلا ہی کھاؤں گا -

رضیہ - کاش بیگم تم پرندہ ہو کر اُڑی چلی آؤ -

ذکیہ - ایک گھڑی تمہارے بغیر مشکل ہے -

سعیدہ ارے دولھا بھائی بولتے کیوں نہیں -

ذکیہ - ہائے اللہ بھول گئے یہ تو

رضیہ - اچھا ہے کہ اسی طرح گال تو پھولیں -

سعیدہ - بڑا غصہ آتا ہے دولھا بھائی آپ کو -

رضیہ - اچھا خیر ناشتہ تو کر لو -

سعیدہ - بس چائے مت پینا گرمی کرے گی، یوں ہی مزاج گرم ہے -

ذکیہ - شربت لاؤ شربت -

سعیدہ - نہلانے کے لئے

رضیہ - اے لو شکر تو ملتی نہیں اور یہ شربت سے نہائیں گے

دولھا بھائی - تم سب پاگل ہو، اماں سچ کہتی ہیں تم سب مولوی، قاضی اور پیر جی کے لائق ہو -

رضیہ - چلو خدا خدا کر کے بولے تو، اچھا آئیے آپ کو ایک

شعر سنائیں بڑا مزے کا ہے سنئے گا ۔

زبان کھولی ہے مشکل سے دولھا بھائی نے
خدا بچائے یہ گونگا تو بولتا بھی ہے

سعیدہ ۔ بس ذرا زبان کچھ موٹی ہے ۔

رضیہ ۔ ارے بھئی بڑھانے سے سب ٹھیک ہو جائے گی۔ دیکھا نہیں کہ اتنی دیر میں کتنی کھل گئی ہے ۔

دولھا بھائی ۔ بھر پایا میں تمہارے آنے سے ۔ پاگل بنا لیا پاگل، دماغ چاٹ گئیں، پھر ایک ہو تو بات بھی ہے ۔

رضیہ ۔ (قہقہہ لگاتی ہے) ارے باپ رے ۔

دولھا بھائی ۔ (سُو سُو کرتے ہوئے) یا خدا

رضیہ ۔ کیا ہوا دولھا بھائی ؟

رشید ۔ سوئی چبھو دی پھر کہتی ہو ۔ کیا ہوا دولھا بھائی قسم خدا کی اگر تم میں سے ایک بھی مل جاتی تو تگنی کا ناچ نچوا دیتا چار دن میں سیدھا کر دیتا ۔ بھلا لڑکیاں ہیں کہ پٹاخہ ۔

رضیہ ۔ ہاں ہم تو بُرے ہیں اچھی تو ہیں بس آپ کی صفی ۔

رشید ۔ اور نہیں کیا ۔

سعیدہ ۔ میں تو جب سے کہہ رہی ہوں کہ بیگم کی وجہ سے پریشان ہیں ۔

رشید ۔ لاحول ولاقوۃ ۔

رضیہ ۔ شیطان آ گیا کیا جو اس طرح لاحول پڑھی جا رہی ہے

ذکیہ ۔ ہاں ہاں شیطان سے تو ان کی بڑی گہری دوستی ہے۔

سعیدہ ۔ ان کا تو بچپن کا ساتھی ہے ۔

رضیہ ۔ اور پھر کالج میں بھی تو ساتھ ہی رہا ہے ۔

اماں ۔ (آ جاتی ہیں) کمبختو! اس کو کھانے پینے بھی دوگی ارے بیٹا ناشتہ کر لو، ٹھنڈا ہو رہا ہے ۔ باتیں پھر کرنا ۔۔۔

رشید ۔ ان سے باتیں کرتا ہی کون ہے یہ تو سب کی سب پاگل ہو گئی ہیں، بات کرنے کا ذرا سلیقہ نہیں بیل ہیں بیل ۔۔ جس روز یہ گھر سے نکالی جائیں گی میں دو رکعت نماز شکریے کی ادا کروں گا۔

(اماں ہنستی ہیں)

امّاں ۔ یہ رشتہ ہی ایسا ہی بیٹا ۔۔۔ اللہ بخشے ہمارے بڑے بہنوئی کو بڑے اچھے آدمی تھے اُن کی کروٹ کروٹ بہشت ہو، حوریں پنکھا جھلیں ۔۔۔ او نصیبن ذرا یہاں بھی جھاڑو دے لے۔ دو ہاتھ ہلکے ہلکے لگا دے اور ہاں دیکھ وہ میرا پاندان رکھا ہے اٹھا دیجو تو بیٹا جب ہماری بہن کی شادی ہوئی تو ہم بھی اپنے بہنوئی کو پریشان کرتے تھے سونے جاگنے کسی وقت بھی چین نہ دیتے تھے ۔ ہم سات بہنیں تھے بس یہ سمجھو کہ جب وہ آ جاتے تھے تو سارا گھر سر پر اُٹھا لیتے تھے اور ہماری بُوا خدا بخشے جھاڑو لئے ہمارے پیچھے پیچھے ۔۔۔ کھا بیٹا کھا ۔

رضیہ ۔ اوئی اللہ ۔۔ کہیں توس اُٹھانے سے کلائی نہ مڑ جائے ۔

ذکیہ ۔ سنبھل کے کھاؤ دولھا بھائی ۔

سعیدہ ۔ کھانا دوسرے کا ہے تو کیا پیٹ تو تمہارا اپنا ہے ۔

رضیہ ۔ رات کی گاڑی سے جانا ہے راستے میں دست آ جائیں گے۔

سعیدہ ۔ بڑے پیٹو ہو، کھاتے جا رہے ہو ہم لوگوں کو پوچھتے بھی نہیں ۔

رضیہ ۔ اے لو انگوٹھا دکھایا جا رہا ہے ۔ ہم نے ہی ناشتہ پکایا ہے اور ہم کو ہی انگوٹھا دکھایا جا رہا ہے ۔

سعیدہ ۔ یہ انگوٹھا دکھاؤ اپنی بیگم کو ۔۔۔

رضیہ ۔ ہاں تو گونڈا چھوائی کا انتظام کب تک ہو رہا ہے دولھا بھائی ۔

رشید ۔ جب چاہو پکا کے کھا لو ۔

سعیدہ ۔ اونہوں ۔۔ بڑے بنتے ہیں جیسے کچھ جانتے تھوڑا ہی ہیں ۔

رضیہ ۔ اور اماں سے کیا کہا جا رہا تھا کہ سفر کے لائق نہیں تھی اس لئے چھوڑ آیا ۔

رشید ۔ اور میں کہتا ہوں جس گھر میں جاؤگی آگ لگاؤگی ۔

رضیہ ۔ جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے سے کیا ہوتا ہے ۔

رشید ۔ ایک اک یہاں سے چل تو دو نہیں تو دیتا ہوں اماں کو آواز ۔

سعیدہ ۔ ارے باپ رے باپ ایسا غضب نہ کرنا ۔

ذکیہ - ارے بس کھا بھی چکو ایک پیالی اور پی لو -

رشید - نہ جانے یہ سب چیزیں مجھے ہضم بھی ہوں گی یا نہیں تم لوگوں کی آنکھیں اس پر لگی ہوئی ہیں —

سعیدہ - ہضم کہاں سے ہوں گی جو اس طرح تہ پر تہ جما رہے ہو، اور تندرستی دیکھو نہ جانے کس چکی کا پسا کھاتے ہیں -

تم کہو گی ہنستی ہے دولھا بھائی کو موئی
اے بہن کھاتے ہیں کس چکی کا یہ پیسا ہوا

(دروازہ کھلتا ہے)

رضیہ - کون نصیبن ہے، اور نصیبن دولھا بھائی کے لئے دو چار چنے کی روٹی ڈال لا راشن کا زمانہ ہے اور پھر گیہوں کا کال ارے آنا تھا تو اپنا راشن لے کر آتے -

نصیبن - چھوٹے میاں مولوی صاحب اور قاضی جی آپ کا انتظار کر رہے ہیں

رشید - مولوی اور قاضی جی، اور حکیم جی بھی تو ہوں گے (بڑے زور کا قہقہہ لگاتا ہے) آتا ہوں آتا ہوں وہی سعیدہ اور رضیہ والے ارے واہ آج پھنسی ہیں یہ لڑکیاں آج پاپ کاٹتا ہوں -

رضیہ - دولھا بھائی -

سعیدہ - دولھا بھائی -

رشید - جی اس وقت دولھا بھائی نہیں ہیں وہ دن گئے کہ خلیل خاں فاختہ اڑاتے تھے — ابھی بتاتا ہوں - (منہ میں پان دبائے ہوئے جلدی سے) ابھی ٹھہرو -

ذکیہ - ذرا دولھا بھائی ٹھیک سے چبائیے پان تب کہیں منہ لال ہوگا --

(اماں آجاتی ہیں)

اماں - ارے رشید یہ منہ میں کیا بھرا ہے ہونٹوں پر کالک سی لگی ہے -

(لڑکیاں ہنستی ہیں)

رضیہ - دولھا بھائی دانتوں کی وجہ سے پان نہیں کھاتے آج کل مسّی کھانے لگے ہیں -

(رشید تھو تھو کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

(با اجازت آل انڈیا ریڈیو بمبئی)

عبدالمجید حیرت

آئینۂ حیرت

بڑا فرق ہے دوستی، دشمنی میں
اندھیرے سے آجائیے روشنی میں

نہیں تھا، یہ ہاتھوں کا مقصد نہیں تھا
کہ مصروف ہو جائیں نشتر زنی میں

نمعلوم مشغول کب تک رہیں گی
زبانیں سخن ہائے ناگفتنی میں

کسی کا نہیں کچھ، مگر اے عزیزو
تمہارا ہی نقصان ہے بدظنی میں

جو چکھو گے اس کو تو معلوم ہوگا
مزہ ہے محبّت ہی کی چاشنی میں

ہماری نظر میں تو کچھ بھی نہیں ہے
نہیں ہے اگر دل نوازی غنی میں

ہوا آخرکار، کیا حشر، دیکھا
اُٹھایا تھا ہٹلر نے سر جرمنی میں

کہیں تم بھی، اے دوستو، آ نہ جانا
کسی گرگ کے پنجۂ آہنی میں

اگر تیر اُلٹے چلاؤ گے حیرت
تو کیا نام پاؤ گے تیر افگنی میں

محمود لکھنوی

طب یونانی کی تدوین میں ہندوؤں کی شرکت

علوم وفنون کی ترتیب وتدوین کبھی دس پانچ آدمیوں کی کوششوں کی مرہونِ منت نہیں رہی بلکہ مختلف عہدوں اور متعدد دَوروں کی سعی پیہم کی مرہونِ احسان ہوتی رہی ہے۔ نیز یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علوم و فنون کسی خطۂ ملک یا قوم ونسل کی میراث نہیں رہے ہیں چنانچہ طب یونانی ہی کی تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو مشرقی اور مغربی قوموں کے دماغی اور ذہنی اتحاد وعمل کا صاف صاف پتہ چل جاتا ہے۔ طب یونانی کی تاریخ دو عہدوں پر منقسم ہے۔ ایک قبل اسلام دوسرا بعد اسلام قبل اسلام والے دور کا پہلا طبیب اسقلیبوس اوّل ہے۔ اُس کی وفات کے بعد اُسی کی نسل میں سینہ بہ سینہ یہ فن منتقل ہوتا چلا آیا یہاں تک کہ بقراط کا زمانہ آیا۔ اسقلیبوس کی نسل میں بقراط ہی وہ پہلا طبیب ہے جس نے نسلی امتیاز کو بالائے طاق رکھ کر اس فن کی تعلیم کو عام کر دیا اور سب پر اس کے دروازے کھول دیئے۔ بقراط کے تقریباً ساڑھے چھ سو سال بعد جالینوس کا دور آیا۔ جالینوس نے طب کو مکمل کرنے اور اُس کو سائنٹیفک بنانے میں جس جانفشانی سے کام لیا وہ قبل اسلام والے طبی عہد میں کسی سے نہ ہو سکا اور ماننا پڑے گا کہ اس عہد میں اگرچہ صدہا طبیب گزرے مگر جالینوس کے پائے اور اُس کی منزلت ومرتبت تک کوئی نہ پہنچ سکا۔

جب اسلام کا زمانہ آیا یہ وقت علوم وفنون کی کس مپرسی کا تھا۔ مگر پھر بھی بعض اس وقت کے متمدن ممالک میں ماہرین طب موجود تھے اور وہاں اسی طب کا رواج اور چرچا تھا۔ علوم وفنون کی ترقی و اشاعت کے لحاظ سے اسلام میں خلافت بغداد کا ابتدائی زمانہ عہدِ زریں ہے۔ یہی وہ وقت تھا کہ لوگ علوم وفنون کی طرف پورے طور سے منہمک تھے اور یہی اُن کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ تھا منطق وفلسفہ اُن کے مذاق کی خاص چیزیں تھیں۔ خود خلفائے بغداد صاحب علم تھے۔ اسی لئے اُن کے حکم سے یونان وروم کے کتب خانے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر جمع کئے جا رہے تھے۔ پھر ترجمے کر کے عربی زبان میں منتقل کرائے جا رہے تھے۔ دنیا کے کسی حصے کا صاحبِ علم وفضل باشندہ اگر بغداد آ نکلتا تو اُس کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا اور جس قدر وہ منزلت کا مستحق ہوتا اس سے زیادہ اُس کی قدر کی جاتی —— یوں تو تمام علوم و فنون کی قدر دانی ہو رہی تھی مگر فن طب کے کاملین وماہرین کی جتنی قدر و منزلت خلفائے بغداد کے زمانے میں ہوئی کسی سلطنت میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہی وجہ تھی کہ دنیا کے ہر حصے کے فاضل وکامل اطباء نے بغداد کا رُخ کر دیا تھا اور وہ رشک یونان ہو رہا تھا۔ اگر ایک طرف "دارالتراجم" میں ترجمے ہو رہے تھے تو دوسری طرف "بیت الحکمت" میں کتابوں کی شرح لکھی جا رہی تھی۔ مختلف فیہ مسائل پر مناظرے ہوتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا۔ کسی طبیب کو اگر کسی معرکتہ الآرا علاج میں کامیابی ہوتی تو وہ مالا مال کر دیا جاتا۔ یہی اسباب تھے جن کی وجہ سے اس مردہ فن نے دوبارہ کروٹ بدلی اور اس میں ازسرِ نو تازہ روح پیدا ہو کر نظر وتحقیق کا دور شروع ہو گیا۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کے بڑے بڑے قابل وید بھی بغداد میں موجود تھے۔ بعض تو قدردانی کا شہرہ سن کر وہاں پہنچ گئے تھے اور بعض دربار کی طرف سے بلائے گئے تھے۔ ان ہندوستانی اطباء کو بغداد نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایسی قدر ومنزلت کی کہ وہ ہندوستان کو بھول کر وہیں کے ہو رہے۔

ان ہندوستانی اطباء کے مختصر سے حالات کتابوں میں ملتے ہیں مگر ناموں میں دقت یہ ہو گئی ہے کہ وہ عربی تلفظ اور زبان میں آکر اتنے

بدل گئے ہیں کہ اصلیت کا پتہ نہیں چلتا مثلاً باکہر، راحہ، مسکہ، واہر، انحو، زنکل، جبھر، اندی، جارتی، یہ تمام اطباء صاحب تصانیف ہیں اور ان کی کتابوں کے اکثر ترجمے عربی میں کئے گئے۔ رازی کی مشہور کتاب "حاوی" (جو فن طب کی مشہور مستند کتاب ہے) میں جا بجا اطبا ہند کے اقوال نقل کئے گئے ہیں نیز پوری پوری کتابوں کے ترجمے فارسی عربی میں کئے گئے۔ جن ہندی اطبا کی کتابوں سے رازی نے اقوال نقل کئے ہیں حسب ذیل ہیں:-

کتاب تفسیر اسماء العقاقیر، اسانکر، علاج حبالی، عقاقیر ہند، نوشل، علاج النساء، کتاب السکر، حیات وسموم، توہم فی الامراض۔ اطبائے ہند کے اس میل جول اور اُن کے تصانیف کے عربی میں ترجمہ ہونے سے یونانی طب میں بہت کچھ اضافہ اور ترقی ہوئی چنانچہ اطبائے یونانی نے بہت سی مشہور ہندی دوائیں اخذ کر لیں مثلاً الوشدارو، معجون ہندی، زاعفران کبیر، زاعفران صغیر، تفطرغان الاکبر، تفطرغان الاصغر، جوارش ہندی، حب ہندی، دہن بابکر، دہن ہندی، شیاف ہندی، جوارش ہندی للباہ، طلائے ہندی للبرص، معجون سلاخہ، احراق فولاد و نقرہ و مس و طلا، وغیرہ وغیرہ۔ ان دواؤں کے متعلق شیخ بوعلی سینا نے قرابادین قانون میں صراحت کر دی ہے کہ یہ اطبائے ہند کی ایجاد کردہ ہیں۔

ہارون رشید اور منکہ وید کی طلبی

خلیفہ ہارون رشید ایک مرتبہ سخت بیمار ہوا، درباری طبیبوں کے علاج سے جب افاقہ نہ ہو سکا، تو ابوعمر عجمی کی تحریک سے ہندوستان کا مشہور طبیب اور فلاسفر علاج کی غرض سے بلایا گیا۔ ہارون رشید منکہ کے علاج سے صحیح اور تندرست ہوا اور "منکہ" کو بغداد میں علمی خدمات پر مامور کیا۔ منکہ کے متعلق ایک قصہ کتابوں میں لکھا ہے۔ ایک مرتبہ منکہ اپنے مترجم کے ساتھ ایک سڑک سے گزرا تو اُس نے دیکھا کہ ایک شخص چادر پھیلائے اور بہت سی دواؤں کا اُس پر انبار لگائے بیٹھا ہے اور کسی ایک دوا کے متعلق جو غالباً معجون تھی سر سے پیر تک کے جملہ امراض کے لئے اکسیر ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ کوئی بیماری ایسی نہ چھوڑی جس کے لئے یہ معجون اکسیر نہ ہو۔ منکہ نے مترجم سے پوچھا یہ کیا کہہ رہا ہے مترجم نے جو وہ کہہ رہا تھا بتایا۔ منکہ ہنسا اور بولا کہ خلیفہ بھی عجب شخص ہے اگر یہ دوا ایسے ہی خواص رکھتی ہے تو فضول اتنا روپیہ خرچ کر کے مجھے ہندوستان سے بلوایا اور اگر یہ جھوٹا ہے تو کیوں اسے قتل نہیں کرا دیا جاتا ہے۔ اس کی ایک جان جانے کی وجہ سے بہتیروں کی جانیں ہلاکت سے بچ جائیں گی۔

منکہ کے تراجم

منکہ کا غالباً اصلی نام مانک ہوگا جو عربی میں منکہ بن گیا۔ اس فاضل نے شاناق وید کی ہندی کتاب "سامیکا" (جو زہروں کے متعلق لکھی گئی تھی) کا ترجمہ ابوحاتم بلخی کی مدد سے فارسی میں کیا پھر عباس بن سعید نے فارسی سے عربی میں ترجمہ کر کے کتاب السموم اس کا نام رکھا۔ دوسری کتاب تفسیر اسماء العقاقیر اس کا بھی منکہ ہی نے اسحٰق بن سلیمان کے لئے ترجمہ کیا تھا۔ اس میں ہر ہر دوا کی تفسیر دس دس ناموں سے کی گئی ہے تیسرا ترجمہ "چرک سنگھتا" کتاب کا فارسی میں منکہ نے کیا۔ پھر فارسی سے عبداللہ بن علی نے عربی میں ترجمہ کیا۔ علی ابن طبری نے اپنی کتاب فردوس الحکمۃ میں اس کتاب کا تذکرہ "جرک" کے نام سے کیا ہے پھر زکریا رازی نے اپنی کتاب "حاوی" میں اسی کتاب کو "شرک الہندی" کہہ کر یاد کیا ہے۔ چرک سنگھتا کا مصنف ہندوستان کا مشہور رشی "چرکا" ہے اس کے زمانے کے متعلق اختلاف ہے۔ ہندو مورخین آغاز دنیا میں بحیثیت رشی اس کی پیدائش مانتے ہیں محققین یورپ دو سو سال قبل مسیح اس کی پیدائش بیان کرتے ہیں۔ چوتھا ترجمہ منکہ نے سشرت کی کتاب کا یحییٰ بن خالد کی فرمائش سے کیا اس ترجمہ کا نام ششرون الہندی رکھا گیا۔ ابن ابی اصیبعہ نے اپنی کتاب "عیون الانبار فی طبقات الاطبا" میں اس کتاب کا ذکر "سوشرود" کے نام سے کیا ہے۔ "سشرت" "سرجری" (علم الجراحتہ) کا پہلا قائد ہے اور اس کی کتاب جس کا ترجمہ منکا نے کیا دنیائے سرجری میں قمر اولین کی حیثیت رکھتی ہے اس کتاب میں تقریباً ایک سو آلات جراحیہ کا ذکر ہے نیز اعمال جراحیہ مثلاً اعضاء کو بالکل کاٹ کر جدا کر دینا، ہرنیا کا آپریشن، پیٹ چیر کر آنتیں نکالنا اور پھر پیٹ میں رکھ دینا، مصنوعی اعضا مثلاً کٹی ہوئی

ناک، ہونٹ وغیرہ از سرِ نو بنانا، سر پر بی آپریشن (پیٹ چاک کر کے بچّہ نکالنا) بتائے گئے ہیں۔ "سُشرت" کے متعلق عام مورّخین کا خیال ہے کہ اُس کا زمانہ "چرک" کے بعد ہے لیکن محققین اُس کو چرک سے بہت پہلے مانتے ہیں کیونکہ "سُشرت" کے باپ "وشوامتر" کا نام مہابھارت میں موجود ہے اور مہابھارت کا زمانہ حضرت مسیح سے ایک ہزار برس پیشتر ہے اور چرک کا زمانہ یقیناً مہابھارت کے بعد ہے۔

دوسرے ہندی حکماء کی کتابوں کے عربی ترجمے:-

"منکہ" ہندو حکیم کی کتاب کا ترجمہ عربی میں کیا گیا اور اُس کا نام "المواليد الكبير" رکھا گیا۔ "منکہ" طب کے علاوہ علم نجوم کا بھی بہت بڑا ماہر تھا اور بہت سی کتابوں کا مصنف ہے۔ "شاناق" وید کی سامیکا کے علاوہ "کتاب النجوم" "کتاب البیطرہ" "منتحل الجواہر" کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ "روسی الہندیہ" ہندو طبیبہ کی کتاب جو عورتوں کے مخصوص امراض پر لکھی گئی تھی، عربی میں ترجمہ ہوا۔ اس کتاب کا حوالہ بلکہ ایک مستقل باب اسی کتاب سے "فردوس الحکمۃ" میں موجود ہے نیز زکریا رازی نے "حاوی" میں بھی اس کتاب کا حوالہ دیا ہے۔ "ابوقبیل ہندی" اس کا نام علامہ شبلی نے ابن ندیم کے تاشّل لکھا ہے اس کی کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا اور "کتاب التوہم فی الامراض" نام رکھا گیا۔ "توقشتل ہندی" کی دو کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا ایک میں سو بیماریوں کے علاج کا بیان ہے اور دوسری میں حاملہ عورتوں کے تدابیر و احتیاط و علاج کا بیان ہے۔ آخر الذکر کا عربی نام "علاجات الحبالی" ہے۔ پہلی کتاب کا نام نہ معلوم ہو سکا۔ "سکر" کی ہندی کتاب کا ترجمہ عربی میں کیا گیا اور "کتاب السکر" نام رکھا گیا۔ حاوی میں اس کا بھی تذکرہ موجود ہے۔ غرضیکہ یہ اور بہت سی کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں۔

ایک ہندی حکیم کی حذاقت

"صالح بن بہلہ (غالباً اصلی نام سالک بن بالا ہوگا) کا مشہور واقعہ جو ہارون رشید کے چچازاد بھائی ابراہیم بن صالح کے علاج سے متعلق ہے۔ کتابوں میں یوں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ ابراہیم بہت سخت بیمار ہوا جبریل بن بختیشوع کو ہارون نے علاج کے لئے طلب کیا۔ اثناء علاج میں ایک دن ہارون رشید کے کھانے کے وقت دسترخوان پر جبریل موجود نہ تھا۔ ہارون کو بہت ناگوار ہوا۔ اتنے میں جبریل آگیا، اور ہارون اُس سے کچھ کہنے سُننے لگا۔ جبریل نے کہا امیر المومنین مجھے کچھ کہنے کے عوض ابراہیم بن صالح پر روئیے تو زیادہ اچھا ہو وہ کچھ دیر کا اور مہمان ہے۔ ہارون رشید نے کھانا اٹھوا دیا اور رونے لگا۔ یہ حال دیکھ کر جعفر بن یحییٰ بولا امیر المومنین جبریل کی طب اور ہے اور صالح بن بہلہ کی اور لہٰذا کیا اچھا ہو اگر صالح کو ابراہیم کے دیکھنے کو بھیجا جائے ایسا ہی کیا گیا۔ جب صالح واپس ہوا تو ابراہیم کا حال ہارون رشید نے پوچھا۔ صالح نے انکار کیا اور کہا امیر المومنین ابراہیم اگر اس مرض میں مر جائے تو میرے سب غلام آزاد ہیں۔ میرا تمام مال مسکینوں کا صدقہ ہے۔ میری ہر بیوی پر تین طلاقیں ہیں۔ ہارون رشید نے کہا تو غیب کی باتوں پر حلف اُٹھاتا ہے۔ صالح نے جواب دیا ہرگز نہیں میں تو کھلی ہوئی دلیلوں کی بناء پر عرض کر رہا ہوں، صالح یہ کہہ کر چلا گیا۔ رات کو ابراہیم کے مرنے کی خبر آئی۔ ہارون رشید جعفر بن یحییٰ کی طرف متوجہ ہو کر ہندی طب کی برائی کرنے لگا اور ابراہیم کے گھر تجہیز و تکفین کے لئے پہنچ گیا۔ اتنے میں "صالح بن بہلہ" ہارون رشید کے سامنے آکھڑا ہُوا لیکن کسی نے اُس سے بات نہ کی جب میّت کے قریب جو خوشبوئیں جلائی جاتی ہیں وہ پھیلیں تو "صالح بن بہلہ" چیخا "اے امیر المومنین کیا میری بیوی کو طلاق دلوا کر دوسرا نکاح کرائے گا۔ حالانکہ میں مستحق ہوں اور کیا مجھے تمام نعمتوں سے محروم کیجئے گا اور کیا اپنے چچازاد بھائی کو دفن کیجئے گا۔ خدا کی قسم آپ کا بھائی مرا نہیں ہے مجھے اُس کو دیکھنے کی اجازت دیجئے۔ ہارون رشید نے اجازت دی۔ اُس نے کفن پہنی ہوئی میّت پر ہتھیلیاں ماریں اور واپس آکر ہارون رشید کو اپنے ساتھ میّت کے پاس لے گیا، اور سوئی نکال کر اُس کے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں ناخن اور گوشت کے درمیان چبھو دی، مُردے نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ صالح نے کہا اے امیر المومنین کیا مُردے کو بھی درد کا احساس ہوتا ہے؟ پھر صالح نے کہا اگر امیر المومنین بات کرنا چاہیں تو وہ بات کرے گا۔ ہارون رشید نے کہا ضرور ایسا کرو۔ صالح نے

جواب دیا مجھ کو اس بات کا ڈر ہے کہ اگر میں علاج کروں اور وہ ایسی حالت میں ہوش میں آئے کہ وہ کفن میں لپٹا ہوا ہے اور مُردے کی خاص خوشبو "حنوط" لگائے ہوئے ہے تو وہ واقعی مر جائے گا۔ لہٰذا سب سے پہلے امیر المومنین اُس کا کفن اُتروائیں اور اُس کو غسل دلوائیں اور کپڑے پہنا کر اصلی فرش پر لٹائیں۔ ہارون رشید نے ایسا ہی کیا۔ اب صالح نے "نکچھکنی" اُس کی ناک میں پھونک دی۔ دس منٹ بعد ابراہیم پھڑکنے لگا اور چھینک لے کر بیٹھ گیا۔ ہارون رشید نے ابراہیم سے حال پوچھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ ایسی نیند سو گیا تھا کہ کبھی ایسا نہ سویا تھا اور اُس نے خواب میں کُتے کو جھپٹتے ہوئے دیکھا اُس نے اپنے ہاتھ سے بچاؤ کیا کُتے نے اُس کے ہاتھ کے انگوٹھے میں کاٹ لیا۔ یہ انگوٹھا وہی تھا جس میں صالح نے سوئی چبھوئی تھی۔ اس واقعہ کے بعد ابراہیم مدتوں زندہ رہا۔

عربی طب میں ہندی طب کا خلاصہ

علی بن ابن الطبری نے اپنی کتاب فردوس الحکمۃ میں ایک خاص مقالہ ہندی طب پر لکھا ہے۔ جو چار ہندی کتابوں سے ماخوذ ہے "کتابِ چرک" "کتابِ سسرو" "ندان" چوتھی کتاب کا نام ذہن میں نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ طب یونانی جس کو محض اس لئے یونانی کہا جانا صحیح ہے کہ اس کی خشتِ اول یونان میں رکھی گئی۔ اس کی ترتیب و تدوین میں اور اس کو سائنٹیفک بنانے میں ہندی طبیبوں کی تقریباً آدھی شرکت ہے۔ اور صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ عرب اور ایران نے بھی اس کی خدمت بڑی تن دہی سے کی۔ یہ ہندوستان کی انتہائی بے تعصبی اور رواداری تھی کہ اُنھوں نے طب یونانی کی اتنی خدمت کے باوجود اس کے نام کو طب یونانی ہی رکھا علمی ترقیوں کی حد وہاں ختم ہو جاتی ہے۔ جہاں سے ملکی یا فرقہ وارانہ جھگڑے اُٹھنا شروع ہوتے ہیں۔ علمی بلندیاں ان پستیوں اور گندگیوں کو برداشت نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ تیسری صدی ہجری تک جو خلیفہ مقتدر باللہ کا زمانہ ہے کوئی مسلمان طبیب تاریخی حیثیت سے نمایاں نظر نہیں آتا۔ حارث بن کلدہ، اصطفن، عبد الملک، بلیطیان، جورجیس (طبیب خاص خلیفہ منصور) جبریل بن بختیشوع سنان بن ثابت (طبیب خاص خلیفہ مقتدر باللہ) ثابت بن ابراہیم، (جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ یہ نباض نہیں ہے نبوت ہے) منکا (ہندو طبیب) سہالے (ہندو طبیب) ابن دھن (ہندو طبیب افسر اعلیٰ شفاخانہ برامکہ) ابوالفرج عیسائی (معاصر شیخ الرئیس پروفیسر عضدیہ طبیہ کالج) یہ اور اس دور کے دوسرے ممتاز اطباء میں کوئی مسلمان نہ تھا۔ سوائے یعقوب کندی اور رازی کے لیکن ان دونوں کی فلسفیانہ حیثیت طبی حیثیت سے زیادہ نمایاں تھی اس لئے ان کا شمار اطباء کے عوض فلسفیوں میں کیا جاتا تھا۔

رازِ حُسن

حامد حسن قادری

عالم کی رگوں میں حُسن پیوستہ ہے
عاشق روزِ ازل سے دل خستہ ہے
دیوانِ کمالِ حُسنِ قدرت کے لئے
ہر برقِ تپاں مصرعِ برجستہ ہے

گلزارِ جہاں حُسن کا گلدستہ ہے
اس دامِ حسیں سے کون وارستہ ہے
کھلتا ہے زبانِ برگِ گُل سے یہ راز
جو غنچہ ہے ایک رازِ سربستہ ہے

جب حُسنِ ازل نظر میں تُل جاتا ہے
دل سے سب فرقِ خار و گُل جاتا ہے
گلزارِ جہاں میں جو کلی کھلتی ہے
اس راز کا ایک عقدہ کھل جاتا ہے

جلیل احمد صدیقی

دیہات کے لئے برقی قوت

ہندوستان کی آزادی نے اس کے نئے حکمرانوں پر بڑے فرض عائد کر دئیے ہیں جن کو اگر اچھی طرح سمجھا اور محسوس نہ کیا گیا تو آزادی محض ایک بے معنی خواب ہو کر رہ جائے گی۔ ان تمام ذمہ داریوں میں سے سب سے بڑی اور اہم ذمہ داری ہندوستان کی دیہاتی زندگی کی ازسر نو تعمیر ہے۔ قدرتی طور پر ہندوستان کی عوامی حکومت کی نظر میں ترقیات کا پہلا مرکز ملک کی دیہاتی زندگی کو ہونا چاہیئے۔ درحقیقت ہمارا بڑا ملک ایک زراعتی ملک ہے جہاں تقریباً ۸۷ فیصدی انسان چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں میں رہتے ہیں۔ ہندوستان کی صنعتی ترقی اور خوشحالی بڑی حد تک دیہاتوں کی ترقی سے وابستہ ہے۔ ملک کی اقتصادی ترقی کا عالی شان محل دیہاتوں کی کمزور بنیادوں پر کیونکر پائدار ہو سکتا ہے۔

موجودہ دور میں صنعتی ترقی کے لئے سب سے ضروری اور اہم چیز برقی قوت ہے۔ جس کو ہمیں جسم کی رگوں کی طرح ہر گاؤں اور ہر قصبہ میں پھیلانا ہے۔ ملک کو آزادی ملتے ہی دیہاتوں کو بجلی پہنچانے کا مسئلہ ایک نئی شدّت کے ساتھ اپنا حل تلاش کر رہا ہے۔ قومی زندگی کی نئی صورت حال میں دیہاتوں کو برقی قوّت سے محروم رکھنا تمام ملک کی صنعتی ترقی میں سدِّ راہ بن سکتا ہے۔ آج جبکہ برقی قوت کے کرشموں نے یورپی ممالک کو شاہراہ ترقی پر بہت دور جا پہنچایا ہے، اس سے ہماری سرزمین کے وسیع حصے کی محرومی ہماری بدحالی کا روشن ثبوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی زرعی، صنعتی اور اقتصادی برتری کا مدار دیہاتوں ہی پر ہے۔

دیہاتوں کی اقتصادی مشکلات پر عبور حاصل کرنے کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ ان کو سستی بجلی فراہم کی جائے تاکہ ملک کی زرعی پیداوار اور اس کی بنیادی صنعتوں میں ترقی ہو۔ خانگی ضرورتوں کے لئے، کھیتوں کی آبپاشی کے لئے، فرٹیلائزر کی طیاری کے لئے اور سب سے بڑھ کر گھریلو صنعتوں کے قیام کے لئے بجلی درکار ہے۔ ہندوستان کی پوری پوری صنعتی ترقی بغیر گھریلو دستکاروں کے اشتراک کے نہیں حاصل ہو سکتی۔ گھریلو دستکاریوں کو ہندوستان کی صنعت سازی کے ڈرامے میں ایک بڑا اہم پارٹ ادا کرنا ہے۔ وہ پارٹ اسی وقت خوش اسلوبی سے ادا ہو سکتا ہے جب کہ ہمارے دستکار بجلی کی قوت سے حرکت کرنے والے اوزار استعمال کر سکیں۔ اگر ہمارے دیہاتوں میں بجلی فراہم ہو تو چھوٹے چھوٹے دستکار آسانی سے مشینری کے استعمال سے مستفید ہو سکتے ہیں اور اس طرح اپنا سامان مقابلتہً کم قیمت پر دیسی اور بدیسی بازاروں کے لئے مہیا کر سکتے ہیں۔ آج نہ صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ اعلےٰ صنعتوں کو ترقی دی جائے بلکہ ساتھ ساتھ گھریلو صنعتوں کو بھی عروج دیا جائے تاکہ ہماری نئی نئی آزادی ایک مضبوط اقتصادی بنیاد پر قائم رہ سکے۔ ملک کی رفتار ترقی اسی وقت تیز تر کی جا سکتی ہے جبکہ دیہاتی اور شہری آبادی کا پورا پورا تعاون حاصل ہو۔ دیہات میں برق رسانی سے چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعت سازیوں کو ترقی ہو گی اور اس طرح ہمارا ملک بہت جلد صنعتی اعتبار سے خود کفیل ہو جائے گا۔

دیہاتوں کے رہن سہن کی زبوں حالی ہندوستان کے روشن مستقبل کے لئے ایک زبردست چیلنج ہے۔ ہمیں اس چیلنج کو قبول کر کے ملک کی صنعتی اور اقتصادی حالت کو درست کرنا ہے۔ لاکھوں اور غریب انسانوں کو محض آزاد کہہ دینے سے کیا حاصل جب تک کہ ان کی آزادی مادی ترقی کے میدان میں جلوہ گر نہ ہو۔ آزادی کا صحیح مقصد حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ لوگ اچھا رہن سہن قائم کر سکیں۔ اسی وقت وہ جام آزادی کے صحیح

کیف و سرور سے سرشار ہو سکتے ہیں ۔ دیہاتی زندگی میں ایک اقتصادی اور معاشیاتی انقلاب کی ضرورت ہے تاکہ دیہات کے رہنے والے بھی آزاد ہندوستان میں آزاد شہری کی طرح حصہ لے سکیں ۔

ہندوستان میں گو کوئلے کی کانوں اور پٹرول کے چشموں کی کمی ہے مگر یہ امر خوش قسمتی کا باعث ہے کہ ملک کے دریاؤں اور آبشاروں سے لاکھوں کیلو واٹ سستی بجلی پیدا ہو سکتی ہے ۔ ہندوستان کے دریاؤں میں پانی کی مقدار ۳۰۴ لاکھ مکعب فیٹ ہے لیکن فی الحال صرف ۲ فیصدی برقی قوت پیدا کرنے کے کام میں لایا جاتا ہے ۔ حکومت کے زیر غور ایسی بہت سی اسکیمیں ہیں جن کی وجہ سے اس قدرتی دولت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ۔ بہت سی ایسی نفع بخش اسکیموں پر تعمیری کام شروع ہو گیا ہے جن کے بروئے کار آجانے سے کروڑوں یونٹ بجلی دستیاب ہو سکے گی ۔ دیہات میں برقی قوت رسانی کی اسکیم ان ہی منصوبوں میں سے ہے جو اس بڑھتی ہوئی قوت برقی کو صحیح استعمال میں لانے کے لئے بنائی گئی ہیں ۔

دوسرے ممالک کے مقابلے میں ہندوستان کے دیہاتوں میں برقی رسانی کا مسئلہ کہیں زیادہ اہم اور شدید ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی دیہاتی اور شہری آبادی کے تناسب میں ایک بنیادی فرق ہے ۔ صنعت یافتہ ملکوں میں دیہاتی آبادی کا تناسب بہت کم ہے اور اسی لئے وہاں اس مسئلہ کا حل مقابلتاً آسان ہے ۔ مثال کے طور پر فرانس، امریکہ اور مملکت متحدہ میں دیہاتی برقی رسانی صرف علی الترتیب ۵۰ فیصدی، ۴۰ فیصدی اور ۲۰ فیصدی آبادی تک محدود ہے برخلاف اس کے ہندوستان میں یہ ۸۷ فیصدی ہے ۔ اس مسئلہ کی شدت کا مزید احساس ہم کو اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس وقت ہندوستان میں صرف ۴۴، ۵ فیصدی شہروں اور قصبوں میں بجلی استعمال میں لائی جا رہی ہے اور دیہاتوں کا فی کس خرچ قریب قریب صفر کے برابر ہے ۔ انڈین ڈومینین میں بجلی کی کل طاقت (۲۲۴۰۰۰ کلوواٹ) ملک کی آبادی کے صرف ۱۱ فیصدی انسانوں کو میسر ہے ۔ قوت برقی کا تمام تر استعمال شہری آبادی تک ہی محدود رہا ہے جہاں بڑی بڑی صنعتیں قائم ہیں ۔ مثال کے طور پر ۴۰ ۳۱ فیصدی برقی قوت جو مفاد عامہ کے پاور اسٹیشن (بجلی گھر) میں پیدا ہوتی ہے صرف کانپور، دہلی، کلکتہ اور احمد آباد کے شہروں ہی میں صرف ہو جاتی ہے ۔ ان سب شہروں کی مجموعی آبادی ہندوستان کی آبادی کی صرف ۳ء۱ فیصدی ہے ۔

شہروں میں جو بجلی صنعتی استعمال کے لئے دی جاتی ہے وہ تجارتی اصول کے تحت میں دی جاتی ہے یعنی اس کے پیدا کرنے اور تقسیم کرنے کا خرچ نکال لینے کے بعد بھی حکومت یا پرائیویٹ کمپنیوں کو فائدہ ہو جاتا ہے لیکن یہ بات شروع شروع میں دیہاتوں میں نہیں ہو سکتی ہے ۔ دیہاتی برق رسانی کے دور طفلی میں تجارتی نقطۂ نظر کو بالائے طاق رکھنا پڑیگا لیکن اس کی قطعی امید ہے کہ آئندہ وہاں بھی اس طرح تجارتی اصول کے ماتحت کم قیمت پر بجلی استعمال میں لائی جا سکے گی اور دیہات کی معاشی اور اقتصادی مشکلات کو حل کر سکے گی ۔ موجودہ صورت میں دیہاتوں کی غریبی اور زراعتی زبوں حالی کی وجہ سے ان کا اور بڑی بڑی صنعتوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ۔ مزید یہ کہ دیہاتوں میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ وہاں کافی تعداد میں برقی قوت صنعتی استعمال میں نہیں لائی جا سکتی ۔ ظاہر ہے کہ شروع شروع میں دیہاتوں کو کم قیمت پر بجلی صرف گھریلو استعمال اور معمولی صنعتوں کے لئے تجارتی اصول پر نہیں دی جا سکتی ۔ یہ بات اسی وقت میسر ہو گی جبکہ دیہاتوں میں برقی قوت کا ایک بڑا حصہ زرعی آبپاشی اور بڑی دیہاتی قسم کی صنعتوں کو چلانے کے لئے استعمال کیا جائیگا ۔

انہیں تمام مشکلات کے پیش نظر برق رسانی کی شروعات ان علاقوں میں کی گئی ہے جہاں برقی قوت ایک بڑی تعداد میں صنعتی اور زراعتی کاموں میں خرچ ہو سکے اور اس طرح پیدا کرنے اور منتقل کرنے کے لئے خرچ کا کم از کم ایک حصہ ہی وصول ہو جائے ۔ چنانچہ بمبئی، مدراس، یو۔پی، پنجاب، میسور، بڑودہ اور ٹراونکور میں اس قسم کی اسکیموں پر عمل درآمد ہو رہا ہے ۔ پنجاب اور یو۔پی کے صوبوں میں دیہاتی بجلی کا کافی بڑا حصہ آبپاشی کے لئے پانی نکالنے میں صرف ہوتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حصوں میں سطح آب کافی بلند ہے اور کنوئیں آسانی سے کھودے جا سکتے ہیں ۔ کچھ مقامات پر مثلاً میسور میں معتدل سائز کی صنعتوں کے قیام نے تجارتی اصول پر بجلی پہنچانے میں بڑی مدد دی ہے ۔

نیچے دئے ہوئے نقشے میں ۱۹۴۷ء کے آخر تک ہندوستان (معہ ریاست حیدرآباد) کے ان دیہاتوں، قصبوں اور شہروں کا خلاصہ درج ہے جہاں برقی قوت مہیا ہے - یہ خاکہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری پر منحصر ہے

آبادی کی مد	قصبوں اور دیہاتوں کی کل تعداد	کل تعداد ان قصبوں اور دیہاتوں کی جہاں بجلی پہنچائی جاتی ہے -	تعداد فیصدی قصبوں اور دیہاتوں کی جہاں بجلی پہنچائی جاتی ہے
ایک لاکھ سے زاید	۴۹	۴۹	۱۰۰ فیصدی
پچاس ہزار سے ایک لاکھ تک	۸۷	۸۶	۹۸ فیصدی
بیس ہزار سے پچاس ہزار تک	۲۲۷	۲۱۳	۹۳ء۸۳ فیصدی
دس ہزار سے بیس ہزار تک	۶۰۷	۲۲۵	۱۰ء۳۷ فیصدی
پانچ ہزار سے دس ہزار تک	۲۳۶۷	۲۱۱	۹۰ء۸ فیصدی
پانچ ہزار سے کم	۵۵۹۷۴۶	۱۲۹۳	۲۳ء۵ فیصدی
کل میزان	۵۶۳۱۳۳	۲۰۹۵	۳۷ء۵ فیصدی

مدراس، بمبئی اور یو-پی کے صوبے دیہاتی برق رسانی کے میدان میں پیش پیش ہیں - صوبائی حکومتوں نے برقابی کی نئی اسکیموں میں مفصلات کے لئے آزادانہ گنجائش رکھی ہے - بہت سے منصوبے تعمیر ہو چکے ہیں جن کی برقی قوت سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے اور کچھ منصوبے ابھی ابتدائی منازل میں ہیں جن کی تکمیل کے بعد کافی بجلی پیدا ہونے کی امید ہے مدراس کے صوبہ میں دیہاتی برق رسانی کی اسکیم کو اعلیٰ پیمانہ پر چلانے کے لئے ۳۲۸۰۰ کلوواٹ کا لوڈ صرف کیا جا رہا ہے - کل صوبہ میں ۴۹۰۰ سے کچھ زاید بجلی کے پمپ ہیں جن سے آبپاشی ہوتی ہے اور ۸۲۵ دیہاتی کارخانے ہیں جن میں روئی اوٹنے، سوت کاتنے، چاول پھٹکنے، خشک پھلوں پر سے چھلکا اتارنے، آٹا پیسنے اور تیل اور رس نکالنے کے لئے بجلی استعمال کی جاتی ہے ۔

حکومت بمبئی نے اپنی جدید اسکیم کے ماتحت ستارا اور بلسار علاقہ کے دیہاتوں کو برقانے کا فیصلہ کیا ہے - ان اسکیموں کے لئے برقی قوت موجودہ بلسار الیکٹرک کمپنی اور ستارا کے پاور ہاؤس سے حاصل کی جائیگی - کچھ دیگر علاقوں مثلاً رتناگری، ملوان، اسلام پور اور بیٹھے وغیرہ میں بھی بجلی پہونچانے کا منصوبہ ہے - حکومت بمبئی ایسی اسکیموں کو اور دوسرے علاقوں میں چلانے کے لئے بھی غور کر رہی ہے - اسی سلسلہ میں ایک نئی اسکیم بھی قابل ذکر ہے - اس اسکیم کے مطابق صوبہ بمبئی میں پانچ سال کے اندر اندر کچھ ڈیزل پاور اسٹیشن ایسے ۱۹ دیہاتوں اور قصبوں میں قائم کئے جائیں گے جہاں ۲۰۰۰ سے اوپر مکانات ہوں اور ایسی صنعتیں ہوں جن کی پیداوار بجلی کے استعمال سے کافی بڑھائی جا سکتی ہے - اس کے علاوہ کاشتکاروں اور گھریلو صنعت سازوں کو برقی قوت سے مانوس کرنے کے لئے یہ تجویز ہے کہ ان کو حکومت کی جانب سے مالی امداد دی جائے تاکہ بجلی سے چلنے والی مشینیں اور اوزار ماہ بماہ قسط وار ادائیگی پر خرید کر سکیں - ان تمام اسکیموں کا مقصد دیہاتیوں کو برقی قوت سے بہرہ مند کرنا ہے -

صوبہ متحدہ کے دیہاتوں میں برقی قوت کا بیشتر حصہ پانی کھینچنے کے کام میں لایا جاتا ہے - گنگا کینال ہائیڈرو الیکٹرک گرڈ ۹۲ قصبوں کو بجلی مہیا کرنے کے علاوہ ٹیوب ویلوں سے آبپاشی کے لئے کافی بجلی فراہم کرتی ہے - وادیٔ گنگا کی ٹیوب ویل اسکیم تقریباً دو ہزار ٹیوب ویلوں پر مشتمل ہے جن سے دس لاکھ ایکڑ زراعتی زمین سیراب ہوتی ہے صوبے کے ۲۳۰۰ سب اسٹیشنوں سے سستی بجلی کی فراہمی فصلوں کی بکفایت پیداوار اور معمولی صنعتوں کے قیام میں بڑی معاون ثابت ہوئی ہے حال ہی میں حکومت نے برقابی ترقی کا ایک وسیع پروگرام بنایا ہے جس کی تکمیل کے بعد نہ صرف شہروں کو بجلی دی جا سکے گی بلکہ ان کے گرد و نواح کے قصبوں اور دیہاتوں کو بھی - اس طرح مفصلات کو بھی ترقی ہوگی جہاں زرعی اور صنعتی ترقی دوش بدوش ہو سکے - بہت سے دیہاتوں کو بجلی پہنچائی جا چکی ہے اور گنجائش بڑھنے کے بعد دوسرے علاقوں کو بھی برقی قوت سے قوی کیا جائے گا -

پنجاب کے صوبے میں بھی بہت سے پاور اسٹیشن مختلف دیہاتوں اور قصبوں کو سستی بجلی بہم پہنچاتے ہیں۔ پنجاب کے علاقے میں ٹیوب ویلوں سے آبپاشی کے ذریعے سے صوبے کی زراعتی ترقی کی رفتار تیز تر ہو سکتی ہے۔ ان اسکیموں کے بروئے کار آجانے سے ہزاروں ایکڑ بیکار زمینوں کو کارآمد بنایا جا سکتا ہے جس سے خوراک بڑھے گی اور پانی جمع ہو جانے کی وجہ سے جو طغیانی ہوتی ہے اس کو ایک حد تک کم کیا جا سکتا ہے

ریاست میسور میں قوت برقی ۲۲۶ چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں میں پھیلی ہوئی ہے جس کی وجہ سے ریاست میں اقتصادی ترقی بڑی تیزی سے ہو رہی ہے۔ اس علاقے میں دیہاتی برقی رسانی کی اسکیموں پر مقابلتہً جلد عمل درآمد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں پہلے سے اچھی گھریلو صنعتوں کے قیام نے سستی بجلی پہونچانے میں بڑی مدد دی ہے میسور کی گھریلو صنعتوں کا زیادہ تر مدار سستی بجلی کے استعمال پر ہے جس کی وجہ سے اشیا مضبوط بھی بن سکتی ہیں اور کم قیمت پر۔

ہندوستان کی مرکزی حکومت کا ٹیکنیکل پاور بورڈ بھی دیہاتی برقی رسانی کو ترقی دینے کے لئے مختلف اسکیمیں بناتا ہے تاکہ صوبائی حکومتیں ان پر صحیح طور سے عمل درآمد کر سکیں۔ لیکن یہ بورڈ فی الحال دیہات کی اسکیموں پر بہت کم توجہ کرتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ بورڈ اسکیموں پر زیادہ توجہ کرے اور فنی باتوں کے علاوہ ہر منصوبے کے اقتصادی پہلو پر بھی نظر رکھے۔

موجودہ حالات کے پیش نظر دیہاتوں میں بجلی کی سروس سے منافع حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ لیکن یہ قطعاً ممکن ہے کہ فنی اور مالی اعتبار سے مطمئن گھریلو صنعتیں قائم ہونے کی وجہ سے منافع کی صورت ہو سکے یا کم از کم بجلی فراہم کرنے کا خرچ نکل آئے۔ ان اقدامات سے دیہاتوں میں تجارتی اصول کے تحت بجلی فراہم کی جا سکے گی۔ مقامی خام پیداوار، ہنر اور سرمایے کی مدد سے چھوٹی چھوٹی صنعتوں کا قیام ضروری ہے تاکہ وہ علاقہ کی زرعی پیداوار کو کھپا کر دیرپا چیزوں میں تبدیل کر سکیں اور بڑی بڑی صنعتوں کا ہاتھ بٹا سکیں۔ اسی طرح سے زراعت میں مشینری کا استعمال رائج کیا جائے جس سے بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لئے کافی مقدار میں برقی قوت کی ضرورت پڑے گی اور یوں کم قیمت پر بجلی تجارتی نقطہ نظر کے تحت تقسیم کی جا سکے گی۔ مزید براں زراعت میں بجلی اور مشینری کے استعمال سے بہت کافی بنجر زمینیں کارآمد بنائی جا سکتی ہیں اور ہندوستان کی خوراک کا مسئلہ ایک حد تک سلجھایا جا سکتا ہے۔

اگر دیہاتوں میں بجلی سستے اور معقول داموں پر فراہم کرنا ہے تو اس بات کی ضرورت ہوگی کہ پاور اسٹیشنوں کی تعمیر اور قیام میں کفایت شعاری اور جزرسی سے کام لیا جائے۔ صحیح چھان بین کے ذریعے سے اور بجلی تقسیم کرنے کے لوازم کے انتخاب میں ہر امکانی کفایت کو عمل میں لانا پڑے گا۔ ابتدائی دور میں وقتی انتظامات سے بھی کام چلایا جا سکتا ہے چونکہ ہندوستان میں برقی منصوبوں کے لئے لوہے اور فولاد کی نمایاں کمی ہے اس لئے ٹرانسمشن اور ڈسٹری بیوشن لائنوں میں لوہے کے کھمبوں کے بدلے لکڑی وغیرہ کے کھمبے وغیرہ بآسانی استعمال ہو سکتے ہیں۔ حتی الامکان کوشش اس بات کی کرنا چاہئے کہ حاصل شدہ برقی قوت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے اور اس کو کسی صورت میں بھی ضائع نہ ہونے دیا جائے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ مختلف استعمالوں کے درمیان برقی قوت کو ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے مختصراً یہ ہے کہ ہر ممکن صورت سے دیہاتوں کی بجلی کے غیر اقتصادی پہلو کو دور کرنے کے لئے کوشاں رہنا چاہئے۔ یہ امر بھی ضروری ہے کہ دیہات کے پاور اسٹیشنوں میں زیادہ گنجائش یا تو بالکل ختم کر دی جائے یا بہت کم رکھی جائے جب تک کہ کافی لوڈ خرچ ہو جانے کی امید نہ ہو۔ برقی قوت محض مقررہ تعداد میں پیدا ہونا چاہئے۔ اسی سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ بمبئی، مغربی بنگال، سی پی و برار اور آسام کی حکومتوں نے لوڈ بنانے کی غرض سے نرسری پاور اسکیموں کی تجویزیں بنائی ہیں۔ ان اسکیموں کے لئے ابتدائی دور میں بجلی مہیا کرنے کے واسطے چھوٹے چھوٹے ڈیزل پاور اسٹیشنوں کے قیام کا ارادہ ہے جن کی گنجائش ۲۰۰ کلوواٹ ہوگی۔

اس وقت چونکہ ہمیں صرف شہری علاقوں کا تجربہ ہے اس لئے یہ صحیح طور سے نہیں بتایا جا سکتا کہ دیہاتوں میں برقی قوت کی توسیع کس قیمت پر ہوگی۔ بہرحال اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ۲۰۰۰۰۰۰ (دو کروڑ) کلوواٹ برقی قوت میں سے جو کہ اندازاً ۳۰ سال کے اندر اندر تقسیم کے لئے حاصل ہوگی صرف ۱۰ فیصدی دیہاتوں میں خرچ کی جائے تو مختلف صوبائی حکومتوں کو تمام اسکیموں پر ۴۰ کروڑ روپیہ خرچ کرنا پڑیگا

نقد و نظر

تصویرِ کشمیر

مصنف:- شری پرتھوی ناتھ کول۔ ناشر زینت کتاب گھر کوچہ چیلاں دہلی۔ قیمت:- تین روپے آٹھ آنے

اس کتاب میں جو "داستانِ کشمیر" اور "سانحہ کشمیر" کے عنوانات سے دو حصوں پر مشتمل ہے مصنف نے مسائل کشمیر پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ مصنف خود کشمیر نژاد ہیں اور تاریخ و سیاست سے انہیں خاص دلچسپی ہے چنانچہ انہوں نے نہایت خود اعتمادی سے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور سیاسیاتِ کشمیر کے موضوع پر لکھی ہوئی اچھی کتابوں میں ایک قابلِ قدر کتاب کا اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب میں کشمیر کے جغرافیائی سماجی اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ کاک شاہی کے تاریک ترین دور کو حقائق کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ قبائل کا حملہ اور اس کے نتائج بڑی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں آخر میں موجودہ کشمیر کی تصویر کھینچی گئی ہے اور واقعات کی روشنی میں کشمیر کے مستقبل پر بحث کی گئی ہے۔

تصویرِ کشمیر کا شروع سے آخر تک مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سیاسی اعتبار سے اس کتاب کی افادیت مسلمہ ہے اور ہر اس شخص کو جو سیاسیاتِ کشمیر سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اسکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں کے لئے ہم خاص طور پر اس کتاب کی سفارش کرتے ہیں۔ اس کتاب کا تعارف شاعرِ انقلاب جناب جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے۔

نیا ہند کا گاندھی سندیش انک

ایڈیٹر:- تارا چند
بھگوان دین مظفر حسن

شمبھوناتھ، سندر لال ملنے کا پتہ:- ۸۴ باؤ کا باغ الہ آباد۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

"نیا ہند" ہندوستانی زبان کا ایک مشہور رسالہ ہے جو ایک مدت سے اہلِ وطن کی ٹھوس خدمات انجام دے رہا ہے۔ یہ رسالہ فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں شائع ہوتا ہے۔ اور ہندی اور اردو جاننے والے دونوں اس سے مستفید ہوتے ہیں زیرِ نظر شمارہ جو اس ماہنامے کا خاص نمبر ہے گاندھی جی کے جنم دن پر شائع ہوا ہے "نیا ہند" کے اجراء کا مقصد ہی گاندھی جی کے زرّیں اصول کی اشاعت ہے اور یہ نمبر تو خاص کر گاندھی جی کی تعلیم کی اشاعت کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔

اس دور میں جب کہ گاندھی جی کی تعلیم کی دنیا کو بہت ضرورت ہے ہم "نیا ہند" کی ان تھک کوششوں کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے ہماری رائے یہ ہے کہ اس رسالے کو ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی دیگر زبانوں میں بھی شائع کیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ اس سے مستفید ہوسکیں۔ (ح - ن - ا)

سالنامہ "پارس"

اردو کے مشہور ہفتہ وار اخبار "پارس" کا سالنامہ (۱۹۴۹ء) اردو صحافت میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پارس اردو کے ان اخبارات سے ہے جنہوں نے ہمیشہ مہاتما گاندھی کے آدرش کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

زیرِ نظر سالنامہ ہر اعتبار سے پارس کی گذشتہ اتحاد پرور روایات کا حامل ہے۔ اردو کے مستند ادبا و شعراء کے مقالات اور منظومات اس بات کی دلیل ہیں کہ فلمی حلقوں کے ساتھ ساتھ پارس کو علمی اور ادبی حلقوں میں بہت مقبولیت حاصل ہے۔ اس شمارے کے بعض مضامین نظم و نثر سے اگر کسی کو اختلاف ہو تو وہ بھی ان کی ادبی حیثیت سے انکار نہیں کرسکتا۔ سالنامہ تمام صوری و معنوی خوبیوں کا حامل ہے۔ قیمت فی پرچہ دو روپے آٹھ آنے ملنے کا پتہ:- دفتر پارس اردو بازار۔ دہلی (ع - ق - ا)

رفتارِ زمانہ

جولائی ۱۹۴۹ء سے جون ۱۹۵۰ء تک ہندوستان کے غیر ملکی تبادلے کا بجٹ طیار کیا جا چکا ہے۔ کہا جاتا ہے بجٹ میں درآمد کی مدوں میں خاصی کمی کر دی گئی خصوصاً ایسے مال کے متعلق جو ضروریات زندگی میں شامل نہیں ہیں۔ اندازہ ہے کہ گزشتہ سال کے مقابل اس سال برآمد میں کم سے کم ۱۰ فی صدی تخفیف ہو جائیگی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ برآمد ۴۲۰ کروڑ روپے سے گھٹ کر ۳۸۰ کروڑ روپے رہ جائے گی۔

ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اعلان کیا ہے کہ اسوقت تک حکومت غذائی اجناس پر سے راشن نہیں اٹھائے گی۔ جب تک اسے یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ قیمتوں کو ایک معقول معیار پر قائم رکھ سکتی ہے۔ حکومت گیہوں کی قیمتوں میں اضافے کی اجازت نہیں دیگی غذا کی زیادہ پیداوار ضروری ہے۔ بین الاقوامی حالات چشم زدن میں بدل سکتے ہیں۔ جو ملک ہندوستان کو غذائی سامان بھیج رہے ہیں وہ کسی وقت بھی انکار کر سکتے ہیں۔ اس لئے بہتر ہے ہندوستان اپنے پیروں پر کھڑا ہو

الہ آباد یونیورسٹی کے طلبا کے سامنے تقریر کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے کہا ہے "ہندو راشٹریہ" کا چرچا محض گپ اور جنون ہے "ہمیں تنگ دلی و تنگ نظری سے گریز کرنا ہے اگر ہم ایک آزاد قوم کی صورت میں زندہ رہنا چاہتے ہیں" "ہندوستان ایک غیر مذہبی جمہوری ریاست ہے اور ہر آزاد ملک کی طرح اس ملک کے ہر باشندے کو پوری آزادی ملنا چاہیئے"

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جموں و کشمیر کی نئی حد بندی کے متعلق جو معاہدہ ہوا ہے اس کے مطابق اگر بعض دیہات کے عوام چاہتے تو پاکستان میں شامل ہو سکتے تھے لیکن انھوں نے ہند یونین کو پاکستان پر ترجیح دی بکلشائی کے ۲۲۱ باشندگان میں سے ۲۱۹ نے ۲۵ اگست کو یو۔ این کے فوجی مشاہدین اور ہند اور پاکستان کے کمانڈروں کے روبرو ہند یونین میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی چک سجان میرا چک، سکندر میر کی کل آبادی جو ۱۵۰ افراد پر مشتمل تھی ہندوستان چلی آئی اسی طرح پلہرس اور عیدانی کے علاقوں سے ۴ سو افراد پاکستانی افسروں کی کوششوں کے باوجود یہاں چلے آئے۔ ان لوگوں کی تعداد اب ۱۳ سو سے بھی زیادہ ہو گئی حکومت کشمیر نے گبرانی عیدانی کے ایک ہزار آدمیوں کے لئے ۴ سو من غلہ، نمک، اور کپڑا وغیرہ بھیجا ہے۔

یوروپین اسمبلی نے سٹرسبرگ میں فیصلہ کیا ہے کہ یوروپ کو سیاسی طور پر متحد کرنے کے لئے ایک پلان بنایا جائے اور اسے آئندہ اپریل تک صدر اور کیبنٹ کے وزرائے خارجہ کے ملاحظہ کے لئے پیش کر دیا جائے۔

یوروپین کونسل میں بارہ قومیں شامل ہیں۔ یہ کمیٹی اُن کی موجودہ سیاسی زندگی کا جائزہ لے گی۔ ان قوموں نے چند انسانی حقوق کو تسلیم کیا تھا اور طے پایا تھا کہ ایک معاہدہ کیا جائے جس کے مطابق ان حقوق کو ہر ایک سے منوایا جائے۔

برطانیہ، کینیڈا اور امریکہ کے درمیان مالی معاملات کے سلسلے میں بات چیت ہوئی تھی۔ اس گفتگو سے پہلے ایک میمورنڈم کے ذریعے امریکی افسران نے برطانیہ کی کوششوں کو سراہتے ہوئے اس حقیقت پر سے پردہ اٹھایا کہ آئندہ سال وہ ۳۰ فی صدی کے ڈالر دے سکے گا۔ اس نے اُن وجوہات پر بھی روشنی ڈالی جس کے باعث اسے اپنے سونے کے ذخیرے اور ڈالر باہر بھیجنے پڑے۔

اس دوران میں واشنگٹن میں تین ملکوں کے درمیان بات چیت ہو رہی ہے۔ ڈالر کی کمی نے سب کو پریشان کر رکھا ہے پریذیڈنٹ ٹرومین نے امریکن لیجین کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے درج ذیل باتوں پر زور دیا۔

(۱) امن عالم کی بقا کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہماری اقتصادی پالیسی ہمہ گیر بھی ہو اور صحت مند بھی (۲) باہمی تعلقات کی خوشگواری اور استواری کے لئے یہ ضروری ہے کہ مختلف ممالک اور مختلف اقوام کے درمیان برابر لین دین ہوتا رہے (۳) آزاد قوموں کے لئے لازمی ہے کہ ایک دوسرے سے تعاون کریں اور ہمہ گیر مراعات دیں (۴) جمہوری اقوام ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں دخل انداز نہ ہوں۔

بساطِ عالم

جو ہر ماہ کی ساتویں تاریخ کو ہندوستان کی راجدھانی سے **جوش ملیح آبادی** کی زیرِ ادارت شائع ہوتا ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر جاری کیا گیا ہے کہ اردو جاننے والے عوام کو غیر ملکی اقتصادیات، معاشیات، ادبیات، علوم و فنون، اور تہذیب و تمدن کے متعلق نئے نظریات اور لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے رجحانات سے کماحقہٗ آشنا کیا جائے۔

• • •

"ظاہر ہے کہ جو رسالہ جوش صاحب نکال رہے ہیں وہ دلچسپ ہوگا اور شاعرانہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بہت لوگوں کو نئی دنیا کے خیالات پہنچائے گا۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس کام میں جوش صاحب کو کامیابی ہوگی۔"

نئی دہلی

۲۰ / جون ۱۹۴۸ء

جواہر لال نہرو

"میں نے 'بساطِ عالم' کے پانچ نمبر دیکھے۔ ہر نمبر کے ساتھ اس کی صوری اور معنوی حیثیت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ آپ اور آپ کے ساتھی جوش صاحب کی سرکردگی میں نہایت انہماک اور لگن سے کام کر رہے ہیں۔ ملک کو وسیع النظر بنانے کے لئے ایسے ہی معلومات افزا مضامین کی ضرورت ہے۔ اُن ملکوں کے متعلق تو خصوصیت کے ساتھ مضامین شائع کیجئے جو ہمارے پڑوسی ہیں لیکن اُن ملکوں کو بھی نظر انداز نہ کیا جا سکے گا۔ جن کی ترقّی انسانی تہذیب کی ترقی کا جزو ہے۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ 'بساطِ عالم' کے سامنے بھی یہی پروگرام ہے۔

یقین کیجئے میں 'بساطِ عالم' کو نہ صرف شوق سے پڑھتا ہوں بلکہ جس طرح آج کل کا منتظر رہتا ہوں اسی طرح 'بساطِ عالم' کا بھی۔ جلد ہی اس کے لئے کوئی مضمون بھیجوں گا۔"

احقر

سیّد احتشام حسین

۰ / دسمبر ۱۹۴۸ء

• • •

فی پرچہ آٹھ آنے۔ سالانہ چندہ چھ روپے

اپنے شہر کے نیوز ایجنٹ یا براہ راست مندرجہ ذیل پتے سے طلب کیجئے

ڈسٹری بیوشن آفیسر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi

Regd. No. D—21
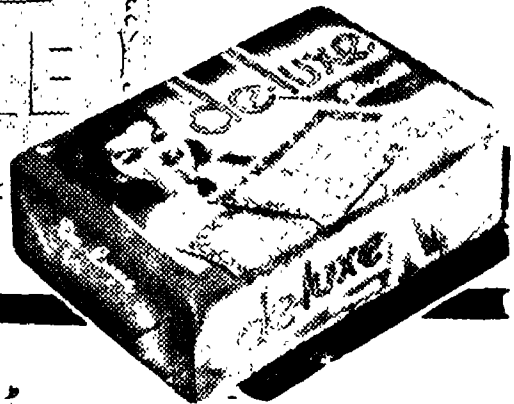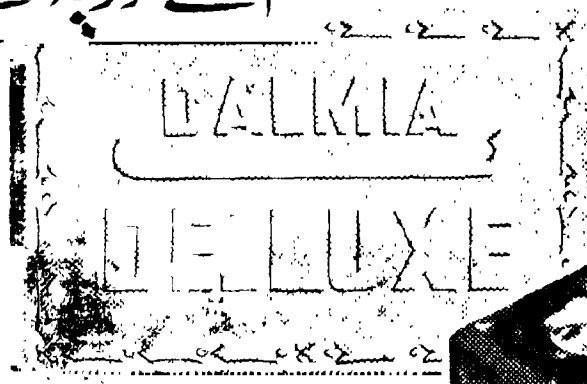
۱۵ ستمبر ۱۹۴۹ء

چھ آنے

آجکل
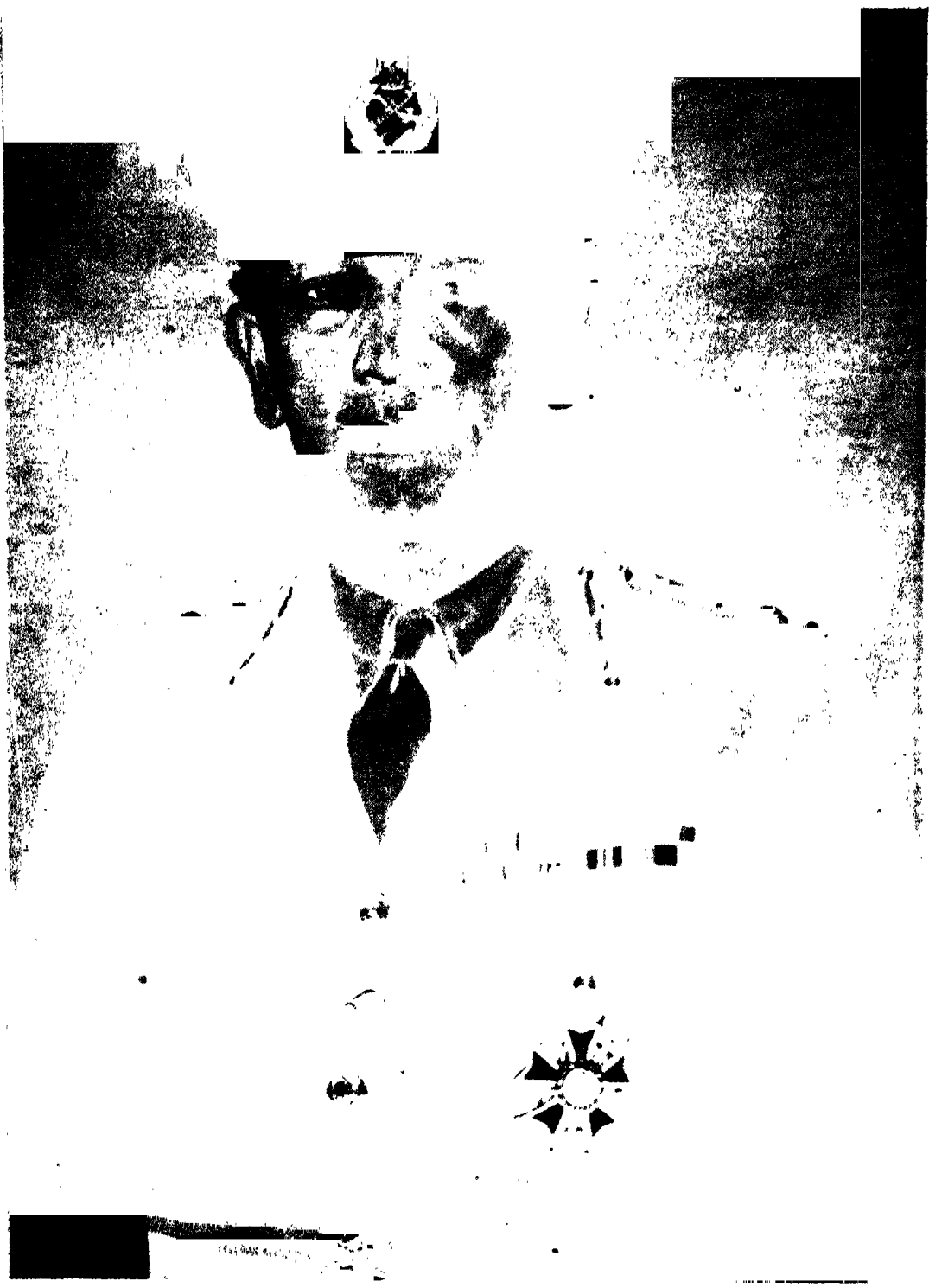
ہندوستان میں امریکہ کے سفیر ہزایکسیلینسی مسٹر لائے ہنڈرسن نے ۳۱ اگست ۱۹۴۹ء کو اروِن سٹڈیم میں ہندوستانی فوجوں کے کمانڈر انچیف جنرل کے۔ ایم کریاپا کو امریکہ کے سب سے بڑے فوجی اعزاز ' لیجاؤن آف میرٹ ' کا تمغہ دینے کی رسم ادا کی۔ تصویر میں موصوف جنرل کریاپا کے تمغہ لگا رہے ہیں۔

سرورق کی تصویر میں جنرل کریاپا یہ تمغہ پہنے ہوئے ہیں۔

ہر مہینے کی پہلی اور پندرھویں تاریخ کو شائع ہونے والا

مصوّر رسالہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:۔ جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹرز:۔ عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد
بلونت سنگھ

اس شمارے کے لکھنے والے

فراق گورکھپوری۔ جنہیں عروسِ ادب سے وصالِ دائمی کا شرف حاصل ہے۔

بشن نرائن حامی بریلوی۔ قدیم وضع کے صاحبِ علم و شریف النفس بزرگ۔

سید شمشاد احمد۔ ڈپٹی کلکٹر ہونے کے باوجود ذوقِ ادب رکھنے والے فن کار۔

ڈاکٹر سید اعجاز حسین۔ ایک اچھے ادیب اور ایک بہت اچھے معصوم انسان جن کا لب و لہجہ نسیمِ سحری کو جھولا جھلاتا ہے۔

اظہار ملیح آبادی۔ میٹھے آموں والے ملیح آباد کے شیریں کلام شاعر۔

پرکاش پنڈت۔ عوامی ادب کے دل دادہ، پنڈت برائے نام، ہونہار ادیب اور افسانہ نگار۔

جمیلہ خاتون تسنیم۔ ایک خوش کلام شاعرہ

پریم ناتھ پردیسی۔ سرزمینِ کشمیر کے نامور ادیب، مشہور افسانہ نگار۔

جلد ۸ ——— نمبر ۳

۱۵ ستمبر ۱۹۴۹ء

ترتیب

سالانہ چندہ ——— نو روپے

فی پرچہ ——— چھ آنے

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

فراق گورکھپوری

اکبر الہ آبادی

ترے کلام میں تھی گدگدی بھی آنسو بھی
سخن کے ساز میں وہ درد بھر دیا تو نے
کبھی وطن کو ہنسایا کبھی اُداس کیا
وطن کو اپنے ترانوں سے خود شناس کیا

———

چراغِ راہ نہ کوئی؛ نہ کوئی بانگِ جرس
نچا رہا تھا کوئی چلتے پھرتے مُردوں کو
ہمیں خبر ہی نہ تھی ہم کہاں تھے اے اکبر
ہم آدمی نہ تھے کٹھ پتلیاں تھے اے اکبرؔ

———

ہزاروں عالمِ دیں تھے، بہت سے مصلحِ قوم
خدا کے بندوں کے تھے سب دکھاوے کے چھل بل
نہ ان کی چرب زبانی نہ چٹکیاں تیری
ترے مذاق نے ہم کو دیا پیامِ عمل

———

کچھ ایسا وقت پڑا تھا کہ چند اکابرِ ہند
وطن کو بیچ دیں حُبِّ وطن کے پردے میں
تمام ہی کام تھا افشائے راز کر دینا
دلوں کا درد نکالا سخن کے پردے میں

———

ادھر تھے وعدہ و پیماں وفا کی سوگندیں
ادھر بھی جبر سے حاکم کا فیض تھا جاری
اچانک ایسے میں بے لاگ بات تو نے کہی
خطاب و جاہ و مراتب نثارِ خودداری

———

ہزاروں انجمن آرائیوں کی ہلچل میں
ہنوز کانوں میں گونجی ہوئی ہے تیری پُکار
کہ جلسوں اور ڈپوٹیشنوں کے دھوکے نہ کھاؤ
یہ طمطراق ہے بیداریِ غلط، ہشیار!

———

وہ اینڈ اینڈ کے چلنا وہ پاؤں میں بیڑی
نثارِ قوم کے اندازِ خوش خرامی کے
بس ایک تو تھا کہ جس نے یہ کہہ کے ٹوک دیا
نہ کھا فریب ترقی نما غلامی کے

———

کہا کہ لاٹ کے دربار میں ملی کرسی
کہا کہ دوستو اس جھوٹی شد و مد سے بچو
کہا کہ ان کی اعانت سے ہم کو ہوگا فروغ
کہا کہ بھائیو انگریز کی مدد سے بچو

———

بہت سے کھونٹے کے بل پر اچھلتے تھے بچھڑے
کہے یہ کون مآل اس کا نامرادی ہے
رہا نہ تجھ سے گیا اور تو پکار اُٹھا
جہاں میں رازِ ترقی خود اعتمادی ہے

———

سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی مصیبت کو
وطن کی عام مصیبت سے کر سکیں گے الگ
یہ سوچتے تھے مسلمان اس زمانے میں
ہر اک سے توڑ کے رشتہ اُبھر سکیں گے الگ

———

ہر اک کو عظمتِ پارینہ یاد آنے لگی
گزشتہ صدیوں کی باسی کڑھی میں آیا اُبال
دیارِ ہند بنا محضرِ رجز خوانی
پڑی وہ پھوٹ لگی جوتیوں میں بٹنے دال

———

یہ تیری رفعتِ پنہاں کا اک کرشمہ تھا
نظر میں ابتریِ ہند تھی نمی ہو کر
پر اس کے ساتھ ہی کیا تیرا ظرف تھا اکبرؔ
کہ دل کا درد لبوں پر رہا ہنسی ہو کر

———

ہر اک حریفِ چمن سے یہ قول تھا تیرا
الجھ کے کانٹوں سے تم بوستاں بھلا دو گے

سبق پڑھو گے اگر ہندو و مسلمان کا
تو یاد رکھو کہ ہندوستاں بھلا دو گے

عجیب لوگ تھے ہندو ہوں یا مسلماں ہوں
کہ بات بات میں بھائی سے لپٹتے تھے ٹکر

ترے سوال پہ ہر اک طرف تھا سناٹا
ہمارے دیس میں ہیں آدمی کہ گھن چکر

لٹے چمن میں بھی وہ راگ و رنگ کا عالم
تھے عندلیب کے نغمے، صدائے طوطی تھی

تھے رنگ رنگ ترانے مگر تری آواز
حیاتِ ہند کی دکھتی رگوں کو چھوتی تھی

اک آدھ ایسے بھی گزرے ہیں شاعرِ ملت
وہ ان کی شعلہ نوائی وہ طنطنہ وہ ابھار

دلِ وجود کو جن کی نگاہ چیر گئی
مگر جو ہند کی وحدت سے ہو سکے نہ دوچار

صدائے زہرہ گدازاں کی واہ وا لیکن
زمینِ پاک کی اشعار میں نہیں بو باس

علو و فکر میں ان کے نہیں کلام مگر
ذرا بھی ہند کی توہین کا نہیں احساس

یہ سوچتے تھے عجب کیا کہ قوم پستی سے
چھلانگ مار کے طوبیٰ کی شاخ سے لٹکے

یہ رنگ دیکھ کے تو بول اٹھا کہ قوم کہیں
نہ آسماں سے گر کر کھجور میں اٹکے

جہاں فرازِ مہ و مشتری کا ذکر نہیں
ترے خیال میں وہ رفعتیں تھیں اے اکبر

جہاں مجاز و عجم ہیں نہیں حدِ فاصل
تری نگاہ میں وہ وسعتیں تھیں اے اکبر

تری نوا سے حکومت کو خوف تھا نہ کہیں
دلوں میں آگ لگا دے یہ شعلۂ عفنی

ہوا نہ وقت کے دامن نے کھل کے دی اس کو
کہ انقلاب کی چنگاریاں تھیں اس میں دبی

میں سوچتا ہوں کہاں وہ سیاسی نعروں میں
جو تازیانۂ ہمت تری لتاڑ میں ہے

کہاں وہ تلخ کلامی میں شیخ و واعظ کی
جو تیز نشتریت تری چھیڑ چھاڑ میں ہے

میں سوچتا ہوں کہاں بجلیوں کی چشمک میں
جو ایک راز تری شوخیِ نگاہ میں ہے

میں پوچھتا ہوں کہاں منطقی دلائل میں
جو ایک بات ترے طنزِ بے پناہ میں ہے

تری شگفتہ نوائی کی وہ بہارِ سخن
کہ مصرعے مصرعے میں کھلتا ہوا گلستاں تھا

کچھ آنکھ والے ہی اس کو پرکھ سکے لیکن
پسِ مزاح جو اشکوں کا شبنمستاں تھا

بہت سے خطبۂ سنجیدہ ہم نے دیکھے ہیں
ہزار فکر و نظر تیرے قہقہوں پہ نثار

چمن میں منہ بندھی کلیوں نے خون تھوک دیا
جو گلستاں پہ پڑی تیرے چھینٹوں کی سنوار

ہماری نیند نے مُردوں سے شرط باندھی تھی
حیاتِ ہند کے ماتھے پہ موت کا تھا کلنک

وہ تیز ٹیس اٹھی آنکھ کھل گئی جو لگا
ترے تبسمِ زیرِ لبی کا تیکھا ڈنک

نئی زمین نیا آسماں نئی دنیا
نئی ہے محفلِ ساقی نئے ہیں جام و سبو

یہ سب سہی مگر اے جرعہ نوشِ بادۂ ہند
ہنسا رلا کے ہمیں دے گیا بہت کچھ تو

بشن نرائن حامی بریلوی

مُنیر شکوہ آبادی

"عمریست کہ افسانۂ منصور کہن شد
من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را"

لیاقت اور شہرت لازم و ملزوم نہیں۔ کیا ضرور ہے کہ جو شخص زیادہ قابل ہو زیادہ مشہور بھی ہو۔ اکثر دیکھتے ہیں کہ یہ چرخِ سفلہ پرور کبھی تو نااہلوں کو بامِ شہرت پر اچھالتا ہے کبھی جوہرِ قابل کے سر پر گمنامی کی خاک ڈالتا ہے۔ چنانچہ کیا عبرت و افسوس کا مقام ہے کہ وہ مُنیر جو علم و فضل کا سمندر تھا اور جس کی نوکِ قلم سے شاعری کے دریا بہہ گئے آج کس مپرسی کے دریا میں غرق پڑا ہے۔ کس کو غرض ہے۔ کہ اس ناخدائے سخن کو قعرِ گمنامی سے نکالے۔ عوام تو عوام حیرت یہ ہے کہ آجکل بعض اربابِ فن کو بھی معلوم نہیں کہ اس نام کا بھی کوئی شاعر تھا۔ میں نے کئی بار شاعرانہ مجمعوں میں دیکھا کہ جب بر سبیلِ تذکرہ آپ کا کلام پڑھا گیا تو لوگوں نے حیرت ظاہر کی اور اشعار کے مشتاق ہو کر حالات کے جویا ہوئے۔ راقم کے والد[1] پنڈت ربی پرشاد عرف ربی سہائے صاحب صادق مرحوم کو آپ کی شاگردی کا فخر حاصل تھا، چنانچہ مناسب معلوم ہوا کہ جو حالات آپ کے والد صاحب قبلہ سے سنے یا اور ذرائع سے معلوم ہوئے یکجا قلمبند کئے جائیں۔

مُنیر تخلص سید اسمٰعیل حسین نام، مذہب شیعہ، ۱۲۲۹ھ ہجری میں بمقام شکوہ آباد پیدا ہوئے کہ وہی بزرگوں کا وطن تھا۔ بائیس سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ علم و فضل، زہد و تقویٰ اس گھرانے کی قدیم میراث تھی۔ والد سید احمد حسین ثنا داعلےٰ پائے کے فقیہ و محدث اور والدہ بڑی بانماز اور خدا پرست بی بی تھیں۔ حضرت ثنا ولعت میں غزلیں کہتے تھے اور دینداری کے تقاضے سے ہر سال ماہ صیام میں فرائض پنجگانہ کے علاوہ تہجد و اشراق بھی ادا کرتے تھے۔ بڑے بھائی سید امداد حسین عالم باعمل تھے اور چھوٹے بھائی سید حسین متکبر خود حضرت منیر کی شاگردی میں مرثیہ کہتے تھے۔ متکبر سے بڑی ایک بہن بھی تھیں۔ ماں نے ۱۲۴۰ھ باپ نے ۱۲۵۰ھ اور بڑے بھائی نے ۱۲۵۶ھ میں قضا کی۔ متکبر نے ۱۲۶۶ھ میں بعمر ۲۰ سال جواں مرگی کا داغ دیا۔ اہلیہ اور ہمشیرہ دونوں نے اس وقت وفات پائی جب آپ جزیرہ غربت میں قید تھے۔ سید ابو محمد بدر آپ کے فرزند رشید تھے جو لاولد فوت ہوئے اور ایک دختر تھیں جن کی یادگار مرزا عاشق حسین صاحب بزم سید صاحب کے نواسے اور شاگرد اکبر آباد میں موجود ہیں اور درجۂ استادی کا رکھتے ہیں۔ بجز بدر کے سب کی تاریخ وفات دیوان میں موجود ہے۔

اکثر اربابِ کمال کی طرح سید صاحب کی زندگی بھی گوناگوں آلام و مصائب میں گزری۔ گیارہ برس کے تھے کہ ماں نے داغِ جدائی دیا، اکیس

---

[1] والد مرحوم کے حالات بجائے خود ایک کتاب کے محتاج ہیں جو زیرِ تالیف ہے۔ ۱۸۲۴ء کے لگ بھگ بریلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۳ر دسمبر ۱۹۲۱ء کو وہیں وفات پائی۔ ایک مدت تک فرخ آباد میں محاسب اعلےٰ رہے۔ بیالیس سال کامل سرکار انگریزی سے پنشن لی۔ تقریباً ایک صدی کی عمر میں بڑے بڑے استادوں کے معرکے دیکھے۔ نامی نامی شاعروں کے ہمعصر اور دوست رہے۔ ایک دیوان اردو اور کچھ کلام فارسی یادگار چھوڑا جس میں جابجا مُنیر مرحوم کی اصلاحیں موجود ہیں۔ جنابِ مُنیر نے بہت سی غزلیں آپ کی فرمائش سے کہی ہیں چنانچہ ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں۔ ؎

ان تنگ قافیوں میں نہ کہتا غزل مُنیر
مجبور ہے کہ خاطرِ ربی سہائے ہے

کے ہوئے تو باپ کی موت نے یتیم کیا اور ستائیسویں سال میں بڑے بھائی کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ ایامِ جوانی میں فکرِ معاش کے لیئے شہر در شہر تباہ و برباد پھرتے رہے۔ چھیالیس سال کی عمر میں کالا پانی ہو گیا۔ پانچ برس بعد واپس آئے تو پھر کچھ سال تک پریشانی و سرگردانی رفیقِ حال رہی۔ آخری عمر میں زندگی کے دس برس سرکار رامپور کے سایۂ عاطفت میں کچھ آرام سے گزارے بے سروسامانی اور بدحالی ہمیشہ ہمزاد کی طرح ساتھ رہتی تھی رئیسان وقت کی شان میں قصیدے کہہ کہہ کر کسبِ معاش کرتے تھے۔

آپ کا زمانۂ شاعری شیخ ناسخ لکھنوی کے عہد سے شروع ہو کر متاخرین میں داغ دہلوی پر ختم ہوتا ہے پہلے شیخ موصوف سے مشورہ سخن کرتے تھے پھر جناب رشک کو کلام دکھلانے لگے۔ دونوں اوستادوں سے برابر عقیدت و ارادت تھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

جناب رشک و ناسخ کے تلمذ سے بڑھا رتبہ
منیر اوستاد کہلایا عنایاتِ الٰہی سے

پہلے دیوان کے فارسی دیباچے سے کہ خود آپ ہی کے قلم کا رہینِ منت ہے جوانی کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ میں کہیں کہیں سے اس کا خلاصہ اردو میں لکھتا ہوں۔ فرماتے ہیں "ابتدائے شباب سے لیلائے سخن کا مجنوں ہوں۔ پہلے مجتہد الشعرا شیخ امام بخش ناسخ سے بذریعہ مراسلت اصلاح لیتا رہا۔ پھر جب نواب نظام الدولہ کا ملازم و مصاحب ہو کر کانپور آیا تو اتفاق سے شیخ موصوف بھی وہیں کسی تقریب سے نواب امین الدولہ کے مہمان تھے۔ بذاتِ خود حاضر ہو کر اپنی جیب تمنا کو جواہر استفادہ سے مالامال کیا۔ جب نواب نظام الدولہ کے ساتھ لکھنؤ واپس گیا تو شیخ کے ایما سے اپنی ہرزہ گوئی میر علی اوسط صاحب رشک کو دکھلانے لگا کہ شیخ کے شاگرد رشید ہیں۔ مدت تک اُن کے خرمنِ فیض سے خوشہ چینی کی۔ کانپور، مرشدآباد اور نزدیک و دور کے مشاعروں میں شریک ہوا۔ آخر گردشِ بخت گوناگوں حوادث میں مبتلا کر کے پھر لکھنؤ لے آئی۔ یہاں برسوں نقش بوریائے فقر رہا۔ بعد چندے نواب اصغر علی خاں نے مرہمِ اطمینانِ معاش دلِ زخم خوردہ پر رکھا۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ظفر جنگ سید باقر علی خاں اپنے ساتھ لکھنؤ سے کانپور بلا لائے۔ بعد چند روز کے وہ صحبت بھی برہم ہوئی اور تباہی کے جھونکے پھر برباد کرنے لگے۔ اگر اُس زمانۂ صبر آزما اور عہدِ پُر آشوب میں مولانا احمد حسین خاں عروج کی شفقت شاملِ حال نہ ہوتی تو میرا غبارِ وجود اب تک کبھی کا صحرائے عدم کے اس پار پہنچا ہوتا۔ بارے تھوڑے دن بعد نواب سید محمد ذکی خاں نے مہربانی کی اور دامنِ دولت سے وابستہ کر کے پھر لکھنؤ لے آئے۔ دو سال ان کے کلام کو اصلاح دیتا رہا۔ بعد ازاں مسند نشین ریاست فرخ آباد نواب تجمل حسین خاں نے فقیر کی بے کمالی کا شہرہ سُن کر اپنے پاس بلا لیا اور وہ نوازشیں فرمائیں کہ باید و شاید۔ اس قدر دان[1] کے انتقال کے بعد پھر فکرِ معاش نے آگھیرا۔ اُسی بیکاری کے عالم میں راجہ الور اور رئیس دھول پور نے شقہ ہائے طلب مع زادِ راہ بھیج کر بلانا چاہا۔ مگر فقیر اپنے تکیے سے نہ اُٹھا اول تو دل نے گوارا نہ کیا کہ بقیہ عمر ان بلادِ عجیبہ میں سپردِ انحطاط کر دوں، دوم لالہ مادھو رام[2] جوہر کی محبت دامنگیر رہی کہ میرے شفیق بھی ہیں اور شاگرد صاحبِ دیوان بھی"۔

غرض باہر نہ گئے اور چار پانچ برس (غالباً سنہ ۱۲۶۰ھ سے ۶۴ھ تک) فرخ آباد ہی میں گزارے۔ اس مدت میں جن مقامی شعرا نے اس دریائے فیض سے پیاس بجھائی ان میں والد مرحوم[3] بھی شامل تھے۔ علاوہ جوہر کے اور بھی کئی رئیسانِ فرخ آباد آپ سے مشورہ سخن فرماتے تھے اور

---

[1] یہ رُباعی اسی ماتم کی یادگار ہے ؎
اپنے آقا کی ہر گھڑی یاد میں ہوں
ہر وقت منیر آہ و فریاد میں ہوں
اس شہر کے نام میں ہے تشدید بلا
آرے کے تلے میں فرخ آباد میں ہوں

[2] لالہ صاحب فرخ آباد کے ایک عالی ہمت اور دریا دل رئیس تھے والد صاحب قبلہ سے ربط روحانی تھا۔ والد صاحب فرماتے تھے کہ جب میں رخصت لے کر دہلی جاتا تو براہ مہر و محبت دور تک پہنچانے آتے اور میووں سے لدی ہوئی بہنگیوں کی بہنگیاں ساتھ کر دیتے تھے۔ اللہ اللہ کیا زمانہ کیا لوگ اور کیا اخلاق تھے۔ اب تو جدھر دیکھو محبت کے نام سے خاک اڑ رہی ہے۔ داغ نے سچ کہا ہے ؎ ہم مٹ گئے تو پرسشِ نام و نشاں ہے اب۔ اس کی تلاش کر کہ محبت کہاں ہے اب

[3] والد صاحب فرماتے تھے کہ "اس زمانے میں لالہ صاحب کی کوٹھی پہلوانانِ سخن کا اکھاڑا تھی اور حضرت منیر اس اکھاڑے کے خلیفہ۔ اکثر فرخ آبادی پٹھے فہیم

سب کی داد و دہش پر آپ کی معاش کا مدار تھا۔

چند سال اسی حال میں گزارے۔ لیکن ان غیر یقینی اور اتفاقیہ فتوح سے آخر کب تک کام چل سکتا تھا۔ ناچار اواسط ۱۲۶۴ھ میں نواب علی بہادر (والیٔ باندا) کو ملازمت کی عرضی دی، اور اواخر ۱۲۶۴ھ میں نواب موصوف کی کمند قدر دانی میں بندھ کر باندا پہنچے اور اصلاح کلام کی خدمت آپ کو سپرد ہوئی، نواب صاحب کی تعریف میں آپ کے لب خشک ہیں۔ ہمہ تن شکر ہو کر فرماتے ہیں "در تسلیح وابستگان خود انتظام رادہ از ہمہ بیش گرا دیدہ جملہ مطالب دلی این ستہام را زیادہ از انکہ بحوصلہ گنجید روا فرمود.... الحمد للّٰہ کہ ہنوز م ایں بادہ در جام و ایں ہما در دام است"۔ اسی سال اپنا دیوان اول ترتیب دے کر نواب صاحب کو پیشکش گزرانا۔ اس وقت آپ کی عمر ۲۵ سال کی تھی اور باوجود اس کے کہ دیوان میں تخمیناً چھ ہزار شعر ہیں فرماتے ہیں "اگر جملہ مزخرفات من از صدمات تلف محفوظ می ماند ہر آئینہ شش ہفت مجلد دیوان پیرایہ سرانجام می پذیرفت، گو ایں دعوٰی من نزدیک یاراں شبنم نوک خار ماند مگر جملہ دوستان آگاہ و جناب احدیت گواہ کہ اغراق و کذب دریں معنی چوں خزاں بہ جنت راہے ندارد"۔

غرض ۱۲۶۴ھ سے سرکار باندا سے تعلق شروع ہوا مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کب منقطع ہوا۔ بظاہر ۱۲۶۹ھ تک سلسلہ ملازمت جاری تھا۔ کیونکہ دیوان دوم کی بعض تاریخوں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے ۱۲۶۷ھ میں خلعت استادی ملا تو فرماتے ہیں :-

میرے شاگرد اگرچہ تھے نواب   لطف توقیر لیکن آج ملا
خلعت آبروئے استادی   سرِ عزّت کو مثلِ تاج ملا
میں نے تاریخ نظم کی یہ منیر   خلعت عز و جاہ آج ملا

اسی طرح تہنیتِ غسلِ صحت میں ایک قطعہ ہے جس کا مادہ تاریخ ہے۔ ع۔ امروز جشنِ صحت نواب ما بہ بیں (۱۲۶۹)

۱۲۶۹ھ اور ۱۲۷۰ھ کے درمیاں قیاس غالب ہے کہ تعلق ٹوٹ گیا کیونکہ انہیں دو تین برس میں کسی وقت رام پور میں طلبی ہوئی تھی۔ فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں صاحب اُس وقت ولیعہد تھے، اُن کے شقۂ طلب کے جواب میں ایک قطعہ لکھا ہے کہ دیوان اوّل میں موجود ہے۔ چند شعر اس کے ساتھ لکھتا ہوں جن میں حاضر نہ ہو سکنے کی معذرت کی ہے :-

شقہ بھی زادِ راہ بھی بھیجا حضور نے - حکم طلب سے باغ تمنّا ہرا ہوا

تھا۔ جوہر، پروین وغیرہ وہیں شاعری کے داؤ پیچ سیکھا کرتے تھے۔ میرا بھی شباب تھا اور شاعری کا شوق نیا نیا۔ ایک دفعہ طرح ہوئی۔ ماقی سے۔ فانی سے۔ میں نے بھی لڑکپن کی ترنگ میں غزل کہی، فخر تخلص رکھا اور فخریہ یہی مقطع لکھا ؎

گرچہ شاعر ہوں نیا فخر سے یہ کہتا ہوں   بڑھ کے ہے میری غزل سعدی و خاقانی سے

غزل تو کہہ لی مگر بے اصلاح پڑھتے ہوئے ڈرتا تھا، خلوت میں جوہر کو دکھائی اتفاق سے اسی وقت حضرت منیرؔ بھی تشریف لے آئے۔ میں ذرا شرمایا اور جوہر کے ہاتھ سے کاغذ لینا چاہا مگر جوہر نے مسکرا کر وہ غزل استاد کو دے دی اور میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے یار صادق ہیں اور آپ کی شاگردی کے آرزو مند۔ منیرؔ نے جوہر کے پاس خاطر سے غزل بنائی۔ مقطع پر پہنچے تو بہت ہنسے اور کہا اللہ اللہ ابھی سے یہ اُبکچ۔ پھر میری طرف دیکھ کر فرمایا کہ صاحبزادے ہر چند کلام فخر سنت شعرا ہے مگر تم نوآموز کے لئے یہ تعلی بیجا ہے بلکہ تمہاری آئندہ شاعری کے لئے فال بد ہے۔ اس مقطع کو نکال ڈالو اور تخلص بھی بدل دو کہ اس سے فخر کی بو آتی ہے۔ میں نے عرض کیا۔ پھر جو آپ تجویز فرمائیں۔ کہا ہمارے دوست جوہر شناس تم کو صادق کہتے ہیں۔ یہ تخلص کیا بُرا ہے۔ اس وقت کی یادگار یہی رکھ لو۔ پھر دم بھر کے بعد کہا۔ اچھا اب اس مقطع کو دعائیہ کرکے یوں کر دو تمہاری بات بھی رہ جائے گی ؎

کیا عجب ہے جو عنایت سے خدا کی صادقؔ   بڑھ کے ہو میری غزل سعدی و خاقانی سے

غرض اس تقریب میں جوہر نے میری طرف سے شیرینی منگائی، منیرؔ نے فاتحہ پڑھا اور یاروں میں تقسیم ہوئی۔ بس اُسی دن سے نسبت شاگردی قائم ہوئی اور برسوں سلسلہ اصلاح جاری رہا"۔ قصد تھا کہ غزل مذکور مع اصلاح درج کروں مگر زمانہ نکتہ چین ہے لوگ کہیں گے منیرؔ کا حال لکھتے لکھتے اپنے باپ کا تذکرہ لکھنے لگا۔

معذور طوافِ کعبۂ مقصد سے ہوں مگر۔ ان روزوں سنگِ راہ بڑا حادثہ ہوا
ناچار پھیرتا ہوں عطیہ حضور کا۔ عرضی میں حال ہے یہ مفصل لکھا ہوا
ہو میری یاد بعد محرم تو خوب ہے۔ اس وقت مرحمت ہو جو کچھ اب عطا ہوا
دربار میں منیرؔ غزل خوانیاں کرے
طوطی حضور مول لیں یہ بولتا ہوا

راقم نے چاہا تھا کہ کتب خانہ رام پور سے عرضی محوّلہ قطعۂ مذکورہ ہاتھ لگ جائے تو سال طلب اور حادثے کا حال کھلے مگر افسوس کہ سعی نامشکور رہی۔ بہرحال جناب مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتب خانہ سرکار عالیہ کا ممنون ہوں کہ نہ صرف کاغذات کی جستجو و تلاش میں محنت شاقہ اٹھائی بلکہ دیگر ذرائع سے بھی کمترین کی امداد فرمائی۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں "نواب سید یوسف علی خاں بہادر نے جو شقہ طلبی روانہ کیا تھا اور جس کا ذکر منیرؔ کے ایک قطعۂ دیوان میں کیا گیا ہے وہ نواب صاحب کی ولیعہدی کا زمانہ تھا اُس زمانے کے کاغذات سرکاری دفتر میں موجود نہیں۔ نواب سید یوسف علی خاں بہادر ۱۳ر رجب ۱۲۷۱ھ مطابق یکم اپریل ۱۸۵۵ء کو تخت نشین ہوئے تھے لہذا اس شقے کو مذکورہ سنہ سے پہلے کا ہونا چاہئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس حادثے کا اس قطعہ میں ذکر ہے۔ وہ نواب جان کے قتل کے علاوہ کوئی معاملہ تھا۔

غرض کہ ۱۲۶۹ھ سے آگے چھ برس تک کا حال پردۂ راز میں ہے معلوم نہیں اس عرصے میں کہاں رہے اور کیونکر گزری۔ اب ۱۲۷۶ھ سے سلسلہ پھر شروع ہوتا ہے کہ اُسی سال باندے کی ایک حسین اور مشہور طوائف نواب جان قتل ہوئی اور کوئی سُنّی مسلمان مرزا مصطفےٰ بیگ اپنے رفیقوں کے ساتھ الزام قتل میں ماخوذ ہوئے۔ سید صاحب اس وقت فرخ آباد میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک مدت تک تفتیش جاری رہی۔ دوران تحقیقات میں مرزا صاحب نے بیان کیا کہ سید صاحب بھی قتل کی سازش میں شریک ہیں اور کچھ ایسی نشان دہی کی کہ پولیس کو آپ کی شرکت کا یقین ہو گیا چنانچہ باندا سے گرفتاری کا وارنٹ نکلا دوستان فرخ آباد نے کوشش کی کہ ضمانت پر رہا کرالیں مگر بے سود ہوئی۔
آخر گرفتار ہوئے اور بڑی سختی اور ایذا کے ساتھ باندے کی حوالات میں محبوس ہوئے۔ یہاں بول و براز کی جگہ بھی بستر کے پاس تھی۔ گوبر جیسی روٹیاں ملتی تھیں اور افیون مطلق نہیں تھی۔ خدا کی قدرت دیکھو یہی شہر جو کل تک آپ کے لئے نواب صاحب کے اوستاد ہونے کی حیثیت سے نمونۂ جنّت تھا آج دوزخ بن گیا۔ طرح طرح کے عذاب نازل ہوئے۔ صحیح سبب اس انقلاب کا خدا کو معلوم ہے مگر واقف کاروں سے اتنا سُنا کہ مقتولہ نواب صاحب کی محبوبہ بھی تھی۔ اس لئے اوستاد کی تکالیف میں شاگرد کے جذبۂ رشک و انتقام کو بھی بہت کچھ دخل تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ غرض قاتل کی طرح رکھے گئے اور طوق و سلاسل سے پالا پڑا۔ مدت تک مقدمہ چلا کیا۔ مریدانِ عقیدت مند نے شاگردی کا پسینہ بہا بہا کر بہت کچھ امداد و پیروی کی مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا، سات سال کے لئے عبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ اپیل کی اس میں صاف جواب ملا۔ آخر ۱۲۷۷ھ میں دریائے شور کی طرف لے جائے گئے۔ باندہ سے الٰہ آباد اور الٰہ آباد سے کلکتے تک کا سفر ننگی تلواروں کے پہرے میں پیادہ پا طے کرنا پڑا۔ پاؤں بیڑیوں سے فگار اور ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخمدار ہو گئے۔ آخر کالے پانی پہنچ کر طوق و سلاسل کی بندش ٹوٹی۔ ان تمام مصائب کا حال دیوان سوم کے قطعے میں مصنف نے اس درد سے بیان کیا ہے کہ پتھر کا دل پانی ہوتا ہے۔

غرض ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء میں کالے پانی پہنچے حُسن اتفاق سے میجر جان ہاٹن بہادر اُس زمانے میں جزائر دریائے شور کے کمشنر تھے وہ اردو فارسی کے ماہر اور اہل علم و فضل کے قدردان تھے۔ پہنچتے ہی آپ کی قابلیت کا نقش میجر صاحب موصوف کے دل پر بیٹھا۔ انہوں نے مشقت معاف کر کے بطور منشی اپنے دفتر میں نوکر رکھ لیا۔ پہلے چھ، پھر آٹھ، پھر دس روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی رہی۔ آنے جانے والے قیدیوں کی اسیری و رہائی کی کیفیت لکھ کر سہ ماہی نقشہ حضور گورنر جنرل کے دفتر میں بھیجنا پڑتا تھا۔ پانچ برس اسی حال میں گزرے۔ اس مدت میں آپ نے کمشنر صاحب کی فرمائش سے اور بھی علمی خدمات انجام دیں جو مزید خوشنودی کا باعث ہوئیں۔ ۲۳ر مارچ ۱۸۶۴ء کو جب پندرہ مہینے چھوٹنے میں باقی تھے ایک دوست کو لکھتے ہیں "بعد یک سال و سہ ماہ

ایں بلیّہ رہائی یافتہ سرخود میگیرم زیرا کہ حسب قاعدہ مستمرہ ایں جا بعض اقسام اسرار ارلع میعاد قید معاف مے گردد"۔ جو پابندیاں دوسرے قیدیوں پر عاید تھیں آپ اُن سے قطعاً مستثنےٰ اور مبرّا تھے۔ بلکہ ایک تحریر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے قیدیوں پر بھی چنداں پابندیاں نہیں تھیں۔ بجز رہائی کے اور ہر امر میں آزاد تھے۔ بے تکلف ہندوستان والوں سے مراسلت کر سکتے تھے۔ چنانچہ ایک دوست کو لکھتے ہیں۔ "باید دانست کہ از تحریر جواب ایں نگاشتہ نیاز انباشتہ بتوہم کذائی از جا نرود کہ منیر اسیر است وکتابت با اسیران ممنوع وحاشا کہ چنیں بودہ باشد چہ از مختصات اسیران ایں جزیرہ است کہ در جملہ امور مساہم و مضاہی آزاداں مے باشند الا رہائی وہموارہ خطوط زندانیاں بنام ہندوستانیاں وکذا بالعکس وادی آمد وشد در ڈاک سرکاری می پیماید از انجملہ پیوستہ مکاتبات اکثرے از تلامذہ ایں کس مہرس مع بضاعت مرجاتیکہ دریں جا بکار معاش آید بوساطت اہل ڈاک بحمد اللہ پرسد"۔

غرض حسب قاعدہ دو سال انعام میں معاف ہوگئے اور جون ۱۸۶۵ء میں چھوٹ کر ہندوستان واپس آگئے۔ صوری ومعنوی تاریخ کہی۔ اس رہائی کی ہے یہ تاریخ صوری معنوی۔ روز شنبہ پنجم ماہ صفر مسعود ہو ۱۲۸۲ھ

ایام غربت میں بھی مشق سخن برابر جاری تھی۔ ایک بڑا دفتر اس زمانے کی تصنیف سے یادگار ہے مگر چونکہ ممتاز شخصیتوں کی قوت دماغی بھی ممتاز ہوتی ہے دیکھو تو اس سختی وشوربختی میں بھی لطافت طبع اور شیریں بیانی بدستور برقرار رہے۔

غربت میں وطن خانہ بدوشوں کو ملا   زہر غربت شکر فروشوں کو ملا
جب لخت جگر کھاکے لگی پیاس منیر   کالا پانی سفید پوشوں کو ملا

دیگر

ہر چند محاسبوں میں کم وقعت ہیں   پر قیدیوں کے کفیل کیفیت ہیں
لکھتے ہیں رہائی و اسیری سب کی   ہم نقل نویس دفتر قسمت ہیں

خارش ہوئی تو پائے قلم کو یوں کھجلایا:۔

پوچھے جو کوئی اسیر و بندہ کہنا   بار غربت سے سر فگندہ کہنا
احوال منیر کہہ کے مجمل قاصد   خارش کا حال پوست کندہ کہنا

حقہ قرق ہوا تو فرماتے ہیں:۔

رباعی

حقہ اوروں کو تو میسّر ہے یہاں   ہر دو دجگر کا م زباں پر ہے یہاں
دیکھو یہ غضب ایک چلم تمباکو   اک نافۂ مشک کے برابر ہے یہاں

ایضاً

تمباکو بھی کچھ ہوا ہے کڑوا ہم سے   رُک رُک کے جو بولتا ہے حقہ ہم سے
برسات میں کس غضب کی گرمی ہے منیر   جھلوانے لگی آگ بھی پنکھا ہم سے

غرض جب ۱۲۸۲ھ ہجری میں چھوٹ کر گھر آئے تو فرخ آباد لکھنؤ کانپور اور باندے وغیرہ کے قدردان مر چکے تھے۔ ناچار تلاش معاش میں پھر چار پانچ برس ہرزہ گردی رہی۔ زیادہ حصہ اس زمانے کا بھی فرخ آباد میں گزرا۔ آخر الہ آباد پہنچ کر ۹ شعبان ۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء) کو خلد آشیاں والئی رامپور کو ملازمت کی عرضی بھیجی جو منظور ہوئی اور آپ اسی سال ماہ رمضان المبارک میں رامپور پہنچ گئے۔ بس پھر اس آستان کو نہ چھوڑا اور سرزمین رامپور نے ایسا دامن پکڑا کہ یہیں خاک کا پیوند ہوئے۔ جلال الدین کے کٹڑے میں رہتے اور نواب صاحب کی دربارداری کرتے تھے۔ آخر رمضان ۱۲۹۷ھ ہجری کی آٹھویں تھی کہ فضل وکمال کے گھر سے نالۂ ماتم کا شور اٹھا۔ شعر وسخن نے نوحہ خوانی کی کہ ہم یتیم ہوگئے یعنی ۱۶ اگست ۱۸۸۰ء کو ہیضے کی بیماری میں مبتلا ہوکر ۶۸ سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور نواب مہدی علی خاں کے مقبرے میں دفن ہوئے۔[۱]

اپنی زندگی میں پچاس ساٹھ ہزار شعر تو کہا ہوگا مگر تبرکات کا بیشتر حصہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء اور دیگر مصائب میں تلف ہوگیا تاہم جو کلام یادگار باقی ہے اس کی مجموعی تعداد بھی ۲۳ ہزار شعر سے کم نہیں تین دیوان منتخب العالم، تنویر الاشعار اور نظم منیر جملہ اقسام سخن پر

[۱] یہ معلومات بھی جناب عرشی صاحب کی مرہون منت ہیں کہ آپ کے معزز دوست محمد علی خاں اثر رامپوری نے جان صاحب کے نواسے میر محمد حسین صاحب سے دریافت کرکے مدفن کا پتہ دیا اور تاریخ وفات بھی اثر صاحب سے تحقیق ہوئی۔

مشتمل ۱۲۶۴ھ تا ۱۲۶۹ھ اور ۱۲۹۰ھ ہجری میں علی الترتیب شائع ہوئے تینوں میں ملا کر تخمیناً ۲۴ ہزار ابیات ہیں۔ دیوان سوم کے آخر میں ایک مثنوی حجاب زناں آٹھ سو شعر کی شامل ہے۔ دوسری مثنوی معراج المضامین بارہ ہزار شعر کی مطبوعہ ۱۲۹۲ھ جس میں ائمہ اثنا عشر کے حالات و معجزات منظوم ہیں کتب خانہ رامپور میں خود مصنف کے قلم کی لکھی ہوئی موجود ہے۔ اس کی نسبت خود کہتے ہیں کہ ؎

خدا کے فضل سے اردو زباں میں جواب اس کا نہیں ہندوستان میں

جناب عرشی صاحب فرماتے ہیں "یہ مثنوی ربیع الاول ۱۲۸۵ھ کو الہ آباد میں شروع کی تھی اور سات مہینے کی مدت میں پوری کی۔ اس مثنوی کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے دو دیوان اس سے پہلے ضائع ہو چکے تھے ان میں سے ایک چوری گیا اور ایک دیوان تنگیٔ معاش کے پیش نظر کسی مفت خور شاعر کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اسی طرح دس جزو کی ایک مثنوی بھی فروخت کی تھی۔ معراج المضامین کا دوسرا حصہ بھی طیار کیا تھا جس میں ۲۵۰۰ شعر تھے۔ یہ حصہ خدا جانے کیا ہوا"۔

نثر میں بھی کئی رسالے اعلان الحق، سراج المنیر، تنبیہ الغافلین وغیرہ یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ طلسم گوہر بار (اردو) داستان امیر حمزہ کی ایک کڑی موسومہ بہ بالا باختر کا تکملہ ہے جسے نواب خلد آشیاں کی فرمائش پر ۱۲۹۴ھ میں لکھا تھا۔ اس کا مقدمہ بھی معہ دیوان اول و دوم کے مسودے کے مصنف کا قلمی کتب خانہ رامپور میں موجود ہے۔

والد صاحب فرماتے تھے کہ جوانی کا حلیہ یہ تھا۔ کشیدہ قامت، چھریرا بدن، کتابی چہرہ، گندمی رنگ، باریک کتری مونچھیں۔ داڑھی ندارد سر پر پٹے۔ اس پر لکھنؤ کے وضع کی دو پلی ٹوپی اور پاؤں میں سلیم شاہی جوتی، گرمیوں میں چوڑی دار پاجامہ ململ کے کرتے پر انگرکھا اور سردی میں روئی دار بنڈی پر شیروانی پہن لیتے تھے۔ گاہ گاہ چھپکے کا رومال بھی زیب دوش ہوتا تھا۔ بدن میں خارش کی شکایت اکثر رہتی تھی۔ افیون کے شیدا تھے۔ دونوں وقت گھلتی تھی۔ تولہ بھر ماہانہ کا خرچ تھا۔ کبھی کبھی قلت فرصت سے گولی بھی کھا لیتے تھے۔ کلام میں تیرینی اسی تلخی کا نتیجہ ہے۔ حقے کا بھی شوق تھا۔ مشک یا پیچواں ہمیشہ ساتھ رہتا۔ جوہر کی کوٹھی پر آپ کی فرشی مستقل طور پر الگ رکھی رہتی تھی۔ لکھنؤ سے خمیرہ فرمائشیں کر کر کے منگایا کرتے تھے۔ فکر سخن کے وقت ہمدم سامنے ہوتا۔ ایک ایک نشست میں کئی کئی غزلیں پوری کر کے اٹھتے۔ پھر فرصت کے وقت نظر ثانی کر کے داخل بیاض کر لیتے تھے۔ جوہر کے پاس آپ کی اکثر غزلوں کے مسودے تھے۔ عرشی صاحب سے معلوم ہوا کہ پان کا بھی شوق تھا چھالیا کے عوض چکنی ڈلی پسند تھی اور سر کے بالوں کو کھلی سے دھویا کرتے تھے۔ رنگین طبعی اور عاشق مزاجی اس درجے کی تھی کہ ارباب نشاط سے بھی اختلاط میں پرہیز نہیں تھا۔ بے تکلف کوٹھوں پر چلے جاتے تھے۔

لکھنؤ، کانپور، باندے، رامپور وغیرہ میں آپ کے شاگرد موجود ہیں، مگر تلامذہ فرخ آباد کی تعداد زیادہ ہے۔ کیونکہ زیادہ تر آپ کا قیام وہیں رہا۔ رؤسا میں نواب تجمل حسین خاں والئی فرخ آباد، علی بہادر علی نواب باندا اور واجد علی خاں رضواں رئیس اودھ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مگر افسوس کہ شہرت کے لحاظ سے اوستاد کی طرح سب شاگرد بھی بدنصیب ہیں۔ لیاقت اور شے ہے۔ شہرت دوسری چیز ہے۔ قبول عام پر کسی کا زور نہیں کہ یہ نعمت خدا داد ہے۔

قبولِ خاطر و حسنِ سخن خدا داد است

مرزا غالب مرحوم کے معتقد تھے، جہاں کہیں مرزا صاحب کے شعر اپنے مکتوبات میں لکھے ہیں۔ فخر المتاخرین مرزا یا مولانا غالب دہلوی کے لقب سے یاد کیا ہے۔ خود بھی فارسی نظم و نثر پر خاصی قدرت رکھتے تھے۔ دونوں شعبوں میں کلام موجود ہے۔ مگر فارسی گوئی کا دعویٰ نہ تھا چنانچہ خود فرماتے ہیں "مخفی مباد کہ ہیچمدان کج مج زبان ہندی نثر اور گاہ گاہ بزبان فارسی حرف زدن بماں ماند کہ طائرے بہ تسلیم و تکرار کسے کلمہ چند با وجود عدم فہم حرام بیاموزد ایں امر در خود اعتماد نیست۔ ؎

جائے کہ عقاب پر بریزد از پشۂ لاغرے چہ خیزد

اما از چندے ایں کالائے رسوائی وسرمایہ تفضیح کہ باوجود کمال

اجتناب و احتیاط و ہم قضا یائے اوستاذین مکرمین جناب شیخ صاحب مرحوم و حضرت سیدی کربلائی خود بخود دا ہم آمدہ محمول بر بیوست دماغ و خشک مغز بیاست، اما ہنوز محض بالغ بتلاش استاذی از اہل زبان دارم کہ دستم بدامن صاحب کمالے برسد چنانچہ در بعض ابیات بطریق تنبیہ علی البدیہیات قرع عصا کردہ ام ؎

تا بلبلے زباغِ عجم خضر رہ شود بشکن منیر سازِ مخالف نوائے را

ایضاً

منیر ما چساں در فارسی حرفے تواند زند ۔ بہندی ہم کلامش یاوہ و بیہودہ را ماند

لیکن یہ سب سید صاحب کی کسر نفسی اور انکسار ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ فارسی پر بھی آپ کو اہل زبان کی طرح تحکم و قدرت حاصل ہے اور درجہ اوستادی کا رکھتے ہیں ۔ چنانچہ مکتوبات اور فارسی غزلیں اس دعویٰ پر شاہد ہیں، ہاں نثر کی نسبت اتنی بات ضرور کہنی پڑیگی کہ ابتداً انداز صاف، سلیس اور سہل تھا ۔ اگر وہی طرز قائم رہتا تو فائدہ عام تھا، لیکن آخر آخر میں عبارت لغات مشکلہ اور ترکیبوں کے ایچ پیچ سے اُلجھ کر ریشم کا لچھا بن گئی جس کو ہر فارسی دان نہیں سلجھا سکتا، صرف عالموں کے مطلب کی چیز ہے ۔ چنانچہ دیوان سوم کا دیباچہ اس پر گواہ ہے ۔ عرشی صاحب فرماتے ہیں کہ منیر کے دیوان سوم کا دیباچہ مرزا غالب کے کلیات فارسی کے دیباچے کا جواب ہے ۔ اس لئے اس میں اغلاق لفظی و معنوی دونوں پائے جاتے ہیں ۔ مرزا غالب نے جو کچھ کہا وہ انوکھے انداز میں تھا اگر اس کا جواب اس سے زیادہ انوکھا نہ ہوتا تو مقابلے میں سبکی ثابت ہوتی ۔ لہذا منیر نے مرزا کی ترکیبوں سے بچ بچ کر آگے بڑھنے کی جتنی کوشش کی اتنا ہی لطف کم ہوتا گیا ۔

فن تاریخ گوئی میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا ۔ سینکڑوں تاریخیں صوری اور معنوی دیوانوں میں موجود ہیں اور سب تصنع سے بری، مطلب پر حاوی ۔ حد ہے کہ تاریخ بے نقط تک میں تعمیے یا تخرجے کا عیب نہیں ۔ بالکل پاک ہیں ۔ اس سے بڑھ کر کمال یہ ہے کہ بعض بعض قطعات تاریخ کئی کئی بحروں میں بغیر ایک نقطے کی کمی بیشی کے الفاظ تقرہ کے اُلٹ پلٹ سے پڑھے جا سکتے ہیں جن کا پورا لطف عروض داں شاعر اٹھا سکتا ہے ۔ میں نمونۃً ایک تاریخ لکھتا ہوں کہ اپنی محبوبہ کے مرنے پر ۱۲۶۴ عدد نکالے ہیں ۔

بحر ہزج مسدس سالم ۔ مفاعلین شش بار

غضب سن وہ پری یوں مرگئی ہے ہے ہوا یہ غم عجب دل کو مرے حاصل
کہا یوں سال رحلت کا منیر اسدم نیا یہ اب مجھے غم ہو گیا ایدل

بحر رجز مسدس سالم ۔ مستفعلن شش بار

سن وہ پری یوں مرگئی ہے ہے غضب یہ غم عجب دل کو مرے حاصل ہوا
یوں سال رحلت کا منیر اسدم کہا یہ اب مجھے غم ہو گیا اے دل نیا

بحر رمل مسدس سالم ۔ فاعلاتن شش بار

وہ پری یوں مرگئی ہے ہے غضب سن غم عجب دل کو مرے حاصل ہوا یہ
سال رحلت کا منیر اسدم کہا یوں اب مجھے غم ہو گیا اے دل نیا یہ

جامعیت اور ہمہ دانی کی یہ کیفیت ہے کہ جب تک تمام علوم و فنون مروجہ پر عبور نہ ہو کوئی شخص کما حقہٗ آپ کے کلام کو نہیں سمجھ سکتا ۔ ہر فن کی اصطلاحات ہوتی ہیں ۔ تینوں دیوان گویا تین شیشیاں ہیں جن میں شاعری کا عطر نچوڑا ہوا رکھا ہے ۔ حق یہ ہے کہ جس طرح انیس و دبیر نے مرثیے کو معراج کمال پر پہنچایا آپ نے غزل گوئی کا خاتمہ کر دیا ۔ اب آگے کو رستہ بند ہے ۔ دوسروں کے ساتھ آپ کا مقابلہ کرنے سے صاف نظر آتا ہے کہ نہ صرف وسعت خیال اور قوت ایجاد، بلکہ علم و استعداد میں بھی اپنے اکثر معاصرین سے کوسوں آگے ہیں ۔ طبیعت اس قدر رسا ہے کہ جو باتیں اور لوگ غور و فکر سے پیدا کرتے ہیں یہاں پیش پا افتادہ ہیں ۔ جن رستوں میں دوسرے شہسوارِ سخن ٹھوکریں کھاتے ہیں، آپ اُن میں دوڑتے ہوئے جاتے ہیں ۔ قادر الکلامی کی بدولت زمین کی دشواری یا قافیوں کی ناکاری سدِّ راہ نہیں ہوتی ۔ اُستاد ذوق کے بعد یہ بات صرف آپ ہی کو نصیب ہوئی کہ بے ڈھنگے سے بے ڈھنگے قافیے کو اس پہلو اور لطف سے بٹھلاتے ہیں کہ شعر غزلیت کے رتبے سے نہیں گرنے پاتا ۔ طبیعت کی تیزی مضامین کی تخم ریزی سے پتھر سی پتھر زمین کو گلزار بنا دیتی ہے ۔ باریک بینی اور مضمون آفرینی کی شریعت کے تو گویا پیغمبر ہیں وہ وہ باتیں پیدا کرتے ہیں جہاں کسی کا خیال نہیں پہنچتا ۔ مضامین کی

بہتات اور تازگی خیالات سے کلام طلسمات نظر آتا ہے۔ جتنے نئے مضمون ان کے یہاں ہیں کہیں نہیں ملتے۔ معنوی خوبیوں کے ساتھ لفظی صنائع و بدائع بھی دست و گریباں ہیں۔ ایہام، صباق، لف و نشر مرتب و غیر مرتب، مراعاۃ النظیر، تجنیس، تعلیل غرض جتنی صنعتیں شاعری میں عام ہیں سب برتی ہیں اور بڑی بے ساختہ برتی ہیں۔ کہیں تکلف و تصنع کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ ہر چند کلام میں کہیں کہیں آورد بھی ہے کہ لازمہ معنی آفرینی کا ہے، مگر زبان پر قدرت اس قدر ہے کہ اکثر جگہ آورد پر آمد کا دھوکہ ہوتا ہے۔ ایک مدت سے شاعری کی وہی فرسودہ روش چلی آتی تھی۔ آپ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے نئی نئی تشبیہوں اور تازہ تازہ استعاروں سے اہلِ سخن کو روشناس کرایا۔ پرگوئی کا یہ عالم ہے کہ جن طرحوں میں دس شعر کی غزل مشکل ہے بیس بیس چالیس چالیس شعر نکالے ہیں۔ ایک ایک قافیے کو الگ رنگ سے باندھتے اور ہر دفعہ کوئی نیا مضمون پیدا کر لیتے ہیں۔ متفرق غزلوں میں صدہا شعر حاصل زمین ہیں کہ اس سے بہتر وہ قافیے نہیں بندھ سکتے۔ ایک دفعہ نواب خلد آشیاں نے فرمائش کی کہ سب درباری شعرا گریباں کا قافیہ بقید عطف و اضافت باندھیں، اور صاحبوں نے جو طبع آزمائی کی ہے ان کے دیوانوں سے ظاہر ہے۔ اس طباع نے بہتّر گریباں نکالے پھر بھی حسرت نہ نکلی تو فرماتے ہیں ؎

منیرؔ افسردہ ہوں پابندیٔ عطف و اضافت سے

دگرنہ لطف دکھلاتا مضامینِ گریباں کا

جاننے والے جانتے ہیں کہ خلد آشیاں کا دربار واجد علی شاہ کے دربار کا ہلکے رنگ کا خاکہ تھا۔ اسیرؔ، امیرؔ، داغؔ، جلالؔ، شاغلؔ، حیاؔ، تسلیمؔ وغیرہ سبھی باکمال موجود تھے اور ان کی متحد القافیہ و الردیف غزلیں بھی حاضر ہیں۔ سب کا مقابلہ کرو اور دیکھو کہ ہر استاد نے ہر زمین میں کتنے کتنے اور کیسے کیسے شعر نکالے ہیں۔ اسیرؔ مرحوم کو چھوڑ کر کہ ان کا کلام زیادہ تر دعویٰ بادلیل ہے پاؤ گے کہ مضامین عالی اور بلند خیالی میں میر صاحب سب سے آگے ہیں۔ داغؔ کی ایک مشہور غزل ہے، 'سر رکھ دیا'، 'پتھر رکھ دیا'۔ جس مجمع میں داغؔ نے یہ غزل پڑھی منیرؔ صاحب بھی موجود تھے۔ جس وقت آپ نے اپنا یہ شعر پڑھا ؎

دھڑ ھکی پہنا دی اُس خوش قد کو کس استاد نے

بہ مرصّع لفظ اس مصرعے میں کیونکر رکھ دیا

لوگوں نے ہاتھ سے غزلیں رکھ دیں اور کہا کہ اس شعر کے بعد اب اس زمین میں کچھ پڑھنا بیکار ہے۔ دو شعر اسی غزل کے اور یاد آ گئے ہیں، اگر یہیں لکھ دوں تو بیجا نہ ہوگا ؎

نشّے کے حیلے سے اس نے نامہ بر کی جان لی

اے بطِ مے تیرے سر خونِ کبوتر رکھ دیا

موت نے خود بیں جو دیکھا خسروانِ عہد کو

سامنے آئینۂ حالِ سکندر رکھ دیا

داغ کی دیگر تصانیف کے مقابلے میں گلزارِ داغ جو زیادہ شاداب ہے اُس کا بھی یہی سبب ہے کہ سرزمین رامپور کی پیداوار ہے۔ اس زمانے میں جناب داغؔ سید صاحب کے مقابلے میں طبیعت پر زور دے کر غزلیں کہتے تھے۔ حیدرآباد پہنچ کر وہ قید ٹوٹ گئی اور داغ کے کلام کا رتبہ نسبتاً پست ہو گیا۔

سید صاحب کے کمال کا اندازہ کرنا ہو تو اس کی ایک آسان ترکیب یہ ہے کہ کوئی سا دیوان اُٹھا کر غزلوں کے دوسرے مصرعے سراسر پڑھتے چلے جاؤ اور بطور خود ان پر پہلا مصرعہ لگانے کی کوشش کرو۔ دس بیس نہیں صدہا مصرعے ایسے ملیں گے کہ کہہ دو گے مہمل ہیں، ان پر مصرعہ اولیٰ پہنچ بھی نہیں سکتا۔ جب طبع نارسا جواب دے تو پورے شعر پڑھو، بیساختہ بول اٹھو گے کہ ہاں استادی اسے کہتے ہیں، اور کمال شاعری اس کا نام ہے۔ فقیر نے بارہا اسی طرح اپنے عجز طبع کا امتحان کیا ہے۔ چند مصرعے اسی قبیل کے ملاحظہ ہوں، پورے شعر نمونۂ کلام میں مل جائیں گے کہ مضمون کے آخر میں درج ہے:- ؏

(۱) قرطاسِ صبح قابلِ مشقِ خرام ہو۔

(۲) آپ کے مصحف سے چوری ایک سودا ہو گیا

(۳) دلیا ہے چین توڑ کے پتا نکل آیا۔

(۴) لب مسیح بھی ٹکڑا ہے مری جھولی کا۔
(۵) مصرع تو طرح ہو کبھی قد بلند کا۔
(۶) مہتاب کی بھی چاندنی میں ایک بات ہے
(۷) سب کہیں قہقہہ دیوار کا پشتا باندھا۔
(۸) اب کے یہ سردی پڑی قرآن ٹھنڈا ہو گیا
(۹) توروں میں سیر ہو گئے مہمان آپ کے
(۱۰) فتنہ سوار لئے خلعتِ وصال آیا
(۱۱) بانغ کنارِ ریختہ میں طفل شیر رہوا۔
(۱۲) اژدرِ وحشت کے منہ میں اونٹ زیرا ہو گیا۔
(۱۳) اسی مزدور کے سر پر رہے اسباب اپنا۔
(۱۴) بالی میں تیرے گونج ہو آواز چاہ کی وغیرہ کہاں تک
مثالیں دی جائیں۔ مختصر یہ ہے کہ غالب کی باریک بینی' دبیر کی مضمون آفرینی اور ذوق کی قافیہ نشینی تینوں صفتیں آپ میں یکجا موجود ہیں ؎

حسنِ یوسف ید بیضا دم عیسیٰ داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

مگر افسوس کہ زمانے نے ویسی قدر نہ کی جو آپ کے کمال کے شایانِ شان تھی۔ ہاں اکثر رئیس اور بالخصوص نواب خلد آشیاں آپ کے کمال کے گرویدہ تھے۔ دستور کے موافق آپ بھی ابنائے زماں کی کم نظری اور ناقدردانی کے شاکی نظر آتے ہیں۔ کلام میں جابجا اس کے اشارے پائے جاتے ہیں۔ دیوان اول کے دیباچے سے ظاہر ہے کہ پہلے بڑے بلند شعر کہا کرتے تھے' جب دیکھا کہ لوگ دقائق و غوامض فن کو نہیں سمجھ سکتے۔ ناچار دوسرے دیوان کا رنگ بدل کر سادہ کر دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"مستتر مباد کہ باعث ترک طریقہ استعارات و ایہامات جز ایں نیست کہ اکثر ابنائے زمان ما بالخصوص شعرا از حلیہ علم و فضل عاری ہستند بجدیکہ تحریر خطوط مرسوم ہم از قوۃ شاں برامل بعید عروض و قافیہ را اسم بے مسمی دانند تا بدیگر نکات چہ رسد معہذا صاحب دیوان و استاد جمع شیرا ز شاگرداں اند و بعضے کہ چند نشانات اسمیہ در طفولیت خواندہ اند بلاف و بالا خوانی معلومات خود بوفراس را از طفل کمتر دانند و محض بقوۃ مشق کوس لمن الملکی نوازند و مستعمان شریک غالب ایں حضرات دریں زماں اند۔ چہ استعداد علمی و قوۃ فہم اشعار سہل ہم ندارند تا بدیگر دقائق ایں فن چہ رسد۔ ناچار اشعار ایشاں را موافق فہم خود یافتہ بمدح ایہام و ذم اہل معانی نغمہ زنبوری سرایند۔ نظر بایں وجوہات شہبازِ طبیعت را از اوج مضامین بلند فرد آوردہ ہمراہ طیور طبائع ایں حضرات سر سید ہذا تا بکجا برند۔

اصناف شاعری میں قصیدہ سب سے مشکل چیز ہے' دوسری راہیں تو مشق کے زور سے بھی طے ہو جاتی ہیں۔ مگر اس کوچے میں کم استعداد شاعر کامیابی سے قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اردو میں سودا اور ذوق نے اس صنف خاص کو آسمان پر پہنچا دیا۔ فارسی سے قطع نظر اردو میں مرزا غالب ہی ان دونوں سے پیچھے ہیں۔ سید صاحب کا بھی اصلی جوہر یہیں آ کر کھلتا ہے۔ رئیسانِ وقت کی مدح میں بڑے بڑے بلند قصیدے ہیں' مگر جو منقبت اور بزرگانِ دین کی شان میں ہے ان میں زور اور تاثیر زیادہ ہے کیونکہ زمانہ مصیبت کی پیداوار ہیں اور سچے دل سے نکلے ہیں۔ تشبیب میں آندھی کی طرح اٹھتے اور بادل کی طرح گرجتے ہیں۔ جتنا معانی کا ہجوم ہے اس سے زیادہ الفاظ کی دھوم ہے۔ خصوصاً جب تشبیب کے بعد مطلب کی طرف گریز کرتے ہیں تو وہ موقع قابل دید ہوتا ہے۔ اقبون کی مدح کرتے کرتے ممدوح کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں اور اس لطف سے پہلو بدلتے ہیں کہ ذرا جوڑ نہیں معلوم ہوتا۔ اس مختصر سے مضمون میں وہ پہلو دکھانے کی گنجائش نہیں۔ واجد علی شاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ ہے' گوہر آب میں' نشتر آب میں' خیال کرو کیسی سنگلاخ زمین ہے۔ مگر اس غواص سخن نے اسی پانی میں سے ۶۶ موتی نکالے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ مشکل زمینوں میں دو دو سو شعر کے قصیدے ہیں اور ایک ایک دن میں کہے ہیں۔ ایک زمانے میں جیل یا پھانسی کے ڈر سے خانہ بخانہ بعہلوش ہوتے

ہوتے تھے۔ اُس وقت ایک قصیدہ ڈیڑھ سو شعر کا کہا ہے۔ آخر میں انوری، عرفی، محتشم، ثنائی، وحشی، سودا کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ

ان سب اوستادوں کے اسی زمین میں قصیدے ہیں ؎
نوبت اس ہیچمدان کی ہوئی ان سب کے بعد
اب سنیں اہل سخن ملتمس عبد اقل
اس کو ان سب کے قصائد سے مقابل کر لیں
نہیں کمتر بھی اگر اُن سے نہ نکلے افضل
دورہ آخر مرے حصے میں دیا ساقی نے
پی گیا اس مئے نایاب کی ساری بوتل
التزام ایسے قواعد کے کئے ہیں میں نے
جن شرائط میں حریفوں سے بمشکل ہو غزل
اس زمانے میں قصیدہ یہ کہا ہے میں نے
کہ مصائب میں گرفتار رہیں اعلےٰ اسفل
روز ہوتا ہوں نئے شخص کے گھر میں روپوش
آج پھانسی کی خبر ہے تو اسیری کی کل
لنگ ہے ستر بدن خرقش ہے اک کہنہ حقیر
جان و عزت کے تردد کی مصیبت پر بل
مال و سرمایہ و اسباب ہوا سب برباد
پر کتابوں کے تلف ہونے سے ہے کرب اجل

اسی طرح ایک دوسرا معرکہ آرا قصیدہ نواب خلد آشیاں کی مدح میں کچھ اوپر سو شعر کا ہے ؎

مجھے یہ فکر ہے اے چرخ کچھ تو منہ سے بول
کہ پھر رہا ہے زمانے میں کیوں تو ڈانوا ڈول

تمام لوازم قصائد ممدوح کے ہاتھی، گھوڑے، تلوار، سخاوت وغیرہ کی تعریف جب انہیں قافیوں میں نظم کر چکے تو ممدوح نے فرمایا کہ اب قافیوں کو مفتوح کر دو، چنانچہ کہتے ہیں ؎

کہوں قوافی مفتوحہ میں جدا قطعہ ۔ ہوا ہے حکم کہ ان موتیوں کو بھی اب رول

غرض قول، ہول، بول قافیے رکھ کر پھر ۴۲ شعر کہے۔ کس کی زبان ہے جو اس قادر الکلامی کی داد دے۔ آخر میں کہتے ہیں ؎

جو ایسے قافیوں میں کوئی ایسے شعر کہے
تو دوں میں حلقہ بگوشی کا اُس کی طبع کو قول
یہ شعر دیکھ کے یا سن کے جو کرے منظوم
تو اس کو اپنی ہی تقلید کا میں سمجھوں ڈول
منیر ہاتھ اُٹھا ایسی خودستائی سے
خدا کے واسطے پڑھ نام کبر پہ لاحول
کلام فخر ہے ہر چند سنت شعرا
مگر منافی طبع سلیم ہے یہ قول

منقبت میں ایک قصیدہ بعالم اسیری دو سو شعر کا ایک دن میں کہا تھا ؎

جب افیون شب سے ہوا چرخ تائب
ہوئے تخم خشخاش انجم بھی غائب

آخر میں کہتے ہیں۔

قصیدہ کہا ایک دن میں یہ میں نے	عجب کیا جو ہوں اہل معنی معاتب
مگر قید و امراض غربت سمجھ کر	کریں عفو ارباب افکار صائب
دلے عیب ایطا سے معذور رکھیں	قوافی میں اس کے فرد تا ہے غالب
کہاں ہیں جو فرماتے تھے طعن سے یہ	کہ اردو زباں ہے کثیر المعائب
نہیں شوکت لہجہ و لفظ اس میں	نہ گنجائش نکتہ ہائے غرائب
ذرا دیکھیں انصاف سے یہ قصیدہ	کہیں پھر جو کچھ حکم دے رائے صائب

زیادہ طول کلام کی گنجائش نہیں۔ اگر در خانہ کس است حرفے بس است۔ دیوان موجود ہیں اہل نظر پورے قصیدے پڑھ کر خود انصاف فرمائیں گے کہ سودا و ذوق کے بعد میر صاحب کا قصیدہ گوئی میں درجہ کیا ہے۔

اب اس شہنشاہ معانی کی دارالضرب سے کچھ نمونے پیش کرتا ہوں نقادان فن محک انصاف سے پرکھ کر معلوم کریں آیا بازار سخن میں کبھی پہلے بھی ایسے کھرے سکوں کا چلن ہوا تھا۔

شوق ہے اے شاہد مضموں اگر تجھ کا	تشانہ کر زلفوں میں بسم اللہ کی تشدید کا
پیری میں کھائیے بت نوخط کی ٹھوکریں	کر طاس صبح قابل مشق خرام ہو

گھونگھٹ سے ترے کان کی بالی نظر آئی ______ دیوارِ چمن توڑ کے پتا نکل آیا
تنتے ہوئے مشاعرہ میں آؤ ایک دن ______ مصرع تو طرح ہو کبھی قد بلند کا
دیکھ کر کشتوں کے انبار لبِ بام ہنسو ______ سب کہیں قہقہہ دیوار کا پشتا باندھا
نفسِ شریر نرم دلی سے ہوا قوی ______ بالغ کنارِ بنبیہ میں طفلِ شریر ہوا
لے چلے نفسِ دنی بار گنہ سوئے عدم ______ اسی مزدور کے سر پہ رہے اسباب اپنا
فریادِ عاشقاں ذقن کان میں پڑے ______ بالی میں تیرے گونج ہو آوازِ چاہ کی
فراقِ یار میں ہر طرح دن گزر جاتا ______ قضا جو رحم نہ کھاتی تو کیا میں مر جاتا
کچھ جوانی ہے ابھی کچھ ہے لڑکپن اُن کا ______ دو دغا بازوں کے قبضے میں ہے جوبن اُن کا
دل بھر گئے بدن میں ترازو ہوئے جو تیر ______ تو لوں میں سیر ہو گئے مہمان آپ کے،
جان لی رحم جو اُن کو دمِ بیداد آیا ______ یہ خوش اخلاق تو غصّے کا بھی احسان لیا
ہیں بحرِ غم میں شعر سفینے بچاؤ کے ______ ہم لوگ چڑھنے والے ہیں کاغذ کی ناؤ کے
جانِ شیریں ہجر میں ہونٹوں تک آئی پھر گئی ______ ناپسندِ مرگ ہو کر یہ مٹھائی پھر گئی
حیرت ہے جسمِ زار کو تشبیہ کس سے دوں ______ موٹے کمر بتاؤں تو موٹی سی بات ہے
کفن مجھے بتِ محمل نشیں نے بھجوایا ______ شتر سوار لئے خلعتِ وصال آیا
شادی کروں عروسِ مضامین نور سے ______ نکلے برات کوچۂ بین السطور سے
لے گئے تصویرِ صاد چشم کی چھپ کر رقیب ______ آپ کے مصحف سے چوری ایک سورہ ہو گیا
فقیر ہوں میں کسی بت کی بولی ٹھولی کا ______ لبِ مسیح بھی ٹکڑا ہے میری جھولی کا
گردوں کی بے بساطیوں سے دل اُچاٹ ہے ______ مہتاب کی بھی چاندنی میں ایک پاٹ ہے
ہاتھ کانپے سرد مہری سے گری تصویرِ یار ______ اب کے یہ سردی پڑی قرآن ٹھنڈا ہو گیا
ناقۂ لیلیٰ کی کیا صحرائے مجنوں میں بساط ______ اژدرِ وحشت کے مُنہ میں اونٹ زیرا ہو گیا
رہنے دو باتیں نہ دالِ حسن پورا ہو گیا ______ آیتوں کو کیا کریں منسوخ سو لہہ ہو گیا
گو چل کے ہوا خاک بھی ہمسر تو نہ ٹھہرا ______ سیماب بھی ٹھہرا دلِ مضطر تو نہ ٹھہرا
شادی ہے دخترِ رز سے کسی دین پرست کی ______ توبہ کے در پہ بجتی ہے نوبت شکست کی
طوفانِ گریہ سے نہ گئی میری آبرو ______ کیا سوکھے گھاٹ اُترے ہیں طوفان آپ کے
کوئی جیتی نہیں بازی ترے دندان کے حضور ______ ہار میں گوہرِ غلطاں کی لڑی رہتی ہے
یک ہفتہ دوست کی ہے شکایت حضور سے ______ سن لیجئے یہ مرثیہ ہے سات بند کا
یادِ خط غدار میں آتی نہیں ہے نیند ______ چبھتا ہے پلنگ خواب میں کانٹا گلاب کا
دل تو پژمردہ ہے داغِ غم گلستاں ہو تو کیا ______ آنکھیں روتی ہیں دہانِ زخم خنداں ہو تو کیا
کلامِ عاشق و معشوق کا ہے رتبہ اور ______ مرا جواب حدیث آپ کا سوال آیا

سید شمشاد احمد

عہدِ گپتا کی نقاشی

ہندوستان کی تاریخ میں گپتا بادشاہوں کا زمانہ ہمیشہ یادگار رہے گا نہ صرف اس لئے کہ انھوں نے ایک واقعی قومی حکومت کی بنیاد ڈالی بلکہ اس وجہ سے بھی کہ انھوں نے اپنی ادب نوازی اور فنون پروری سے سنسکرت ادب اور ہندوستان کے فنون لطیفہ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ویسے تو اس عہد میں ہر فن نے بہت ترقی کی۔ لیکن نقاشی تو پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تھی۔

عہدِ گپتا میں نقاشی ہر ایک مہذب آدمی کی تعلیم و تربیت کا ایک ضروری جزو سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے کے سنسکرت ناٹکوں اور افسانوں میں اس کا اکثر و بیشتر ذکر آیا ہے۔ گپتا زمانے کا ہجراں نصیب عاشق خواہ مرد ہو یا عورت، اپنا غم غلط کرنے کے لئے اپنے محبوب کی تصویر بنایا کرتا تھا۔ عوام میں اس ہر دل عزیزی کے بغیر شاید مصوری کو ایسا فروغ حاصل نہ ہوتا۔

عہدِ گپتا کی نقاشی کے بہترین نمونے اجنٹا غاروں کی دیواروں پر، ریاست پڈوکوٹی کے سیتنواسل مندر میں، گوالیار میں باگھ غاروں پر اور سگریا (لنکا) کے چٹانی حجروں میں پائے جاتے ہیں۔ اجنٹا کے تقریباً سب غار خوبصورت تصاویر سے مزین تھے۔ لیکن اب یہ نقوش صرف غار ۱، ۲، ۹، ۱۰، ۱۶ اور ۱۷ کی دیواروں پر رہ گئے ہیں۔ ان میں سے غار ۹ اور ۱۰ کی تصاویر غالباً اول صدی قبل مسیح کی ہیں۔ اس کے بعد ۳۰۰ برس تک ہندوستانی مصوری کا کوئی نمونہ نہیں ملتا۔ عہدِ گپتا میں نقاشی کو پھر فروغ حاصل ہوا، اور غار ۱، ۲، ۱۶ و ۱۷ کی زیادہ تر تصاویر اسی زمانے کی ہیں۔

ان تصاویر کے لئے پہلے بہت سادہ طریقے سے طیار کی جاتی تھی۔ گوبر، بجری، اور بھوسے کو ملا کر ایک طرح کا پلاسٹر طیار کر لیا جاتا تھا، اور جس دیوار پر تصویر بنانا مقصود ہوتا تھا وہاں اس پلاسٹر کی ایک موٹی تہ جمادی جاتی تھی۔ کسی چکنی لکڑی یا پتھر کی مدد سے اس کو ہموار کر لیتے تھے اور جب یہ پلاسٹر خشک ہو جاتا تھا تو فن کار تصویر بنانا شروع کر دیتا تھا۔ رنگ بھرنے کے لئے سفید کھریا، چراغ کی کالک، گیرو، نیل وغیرہ استعمال کئے جاتے تھے۔ بادی النظر میں یہ چیزیں کتنی ادنیٰ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن انھیں کی مدد سے گپتا فن کاروں نے نقاشی کے وہ لازوال شاہکار پیدا کئے جن پر ہندوستان اور ایشیا کو آج بجا طور پر ناز ہے۔

گپتا زمانے کے فن کاروں نے مناظرِ قدرت کی کائنات کی رنگا رنگ دلاویزی، اور جنگل کے بسنے والے پنچھی پکھیروں کو اپنی تصاویر میں جتنی خوبی اور دلکشی سے پیش کیا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ہاتھی کی اس تصویر سے ہو سکتا ہے۔ جو ہند سرکار نے سہ پائی کے نئے ٹکٹوں پر شائع کی ہے۔ زندگی کی مسرت اور وہ جذبۂ انبساط جو صرف قدرت کے کرشموں میں کھو جانے سے پیدا ہو سکتا ہے اُن کے نقوش میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔

انسانی شبیہ نگاری میں بھی یہ مصور نہایت ہی ماہر تھے۔ اجنٹا غاروں کی دیواروں پر زیادہ تر مہاتما بدھ کی زندگی کے حالات اور بودھ ستوؤں کی تصاویر ملیں گی۔ غار ۱ میں بودھ ستو پدم پنی اولوکیتیشورا کی تصویر اس زمانے کی شبیہ نگاری کی بہترین مثال ہے۔ وہ روحانی تبسم جو اسی زمانے کے مہاتما بدھ کے سارناتھ والے پتھر کے مجسمے پر پایا جاتا ہے، مصور نے اولوکیتیشورا کے چہرے پر بہت نمایاں طور پر پیدا کر دیا ہے۔ مغربی فن کے دلدادہ جو لیونارڈو ڈا ونچی کی مونا لیزا پر سر دھنتے ہیں۔ ذرا اس تصویر کو دیکھیں، اور پانچویں اور چھٹی صدی

عیسوی کے ہندوستانی مصوروں کی قدر کرنا سیکھیں۔

انسانی جذبات کی ترجمانی کرنے میں بھی گپتا زمانے کے مصوروں کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ غار نمبر ۱۷ کا وہ منظر جس کو "لبِ گور شاہزادی" کا نام دیا گیا ہے۔ واقعی ایک لازوال شاہکار ہے۔ گریفتھس، برجس اور فرگوسن کے سے ناقدین فن نے بھی اس کی تعریف میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ ایک مصنف کی رائے ہے کہ فلورنس کا مصور شاید اس تصویر کو زیادہ خوبی سے بنا سکتا اور ایک وینس کا مصور اس میں زیادہ رنگ آمیزی کر سکتا۔ لیکن کوئی بھی شاہزادی کے حزن و یاس کی اس سے بہتر ترجمانی نہیں کر سکتا تھا۔

عہد گپتا کے فن کاروں کا تخیل حسن — جس کو کالیداس نے سنسکرت میں لفظ "روپم" سے ادا کیا ہے — اتنا ارفع تھا۔ کہ وہ کبھی بھولے سے بھی عریانیت یا شہوانیت کی طرف مائل نہیں ہوتے تھے۔ وہ حسن کے پجاری ضرور تھے۔ لیکن اس لئے کہ وہ اس میں الوہیت کی جھلک پاتے تھے۔ اور خواہ وہ بت تراش ہو یا مصور اس کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ اپنے شاہکار میں ظاہری خوبصورتی اور باطنی جمال — روحانی کشش کو مجتمع کر دے۔ اس زمانے کا نصب العین کالیداس نے اپنے ایک جملے میں بہت خوبی سے ادا کیا ہے۔ اس کے ایک ناٹک میں شیواجی پاربتی سے کہتے ہیں — "اے دلکش حسینہ یہ کہاوت کہ حسن کا گناہ سے کوئی تعلق نہیں۔ بالکل سچ ہے۔" عہد گپتا کی نقاشی آجکل فنی نظریے سے بھی بہت اونچی حیثیت رکھتی ہے۔ اور جب اس بات کو مد نظر رکھا جائے کہ یہ مصوری کے شاہکار آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پہلے طیار ہوئے تھے۔ تو قدیم ہند کی اونچی تہذیب کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ مسز ہیرنگھم کا خیال ہے۔ کہ جو روشنی اور عکس کی ہم آہنگی کا عمل اجنٹا غاروں کی تصاویر میں پایا جاتا ہے۔ وہ اٹلی کے مصور سولہویں صدی عیسوی تک میں نہیں پیدا کر سکے تھے۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ گپتا زمانے کی مصوری ہندوستان کے فنونِ لطیفہ کی تاریخ میں ایک سنہری باب ہے۔

خوراک کا محاذ

بمبئی خوراک کی پیداوار بڑھانے کی مہم کے نتیجے کے طور پر توقع کی جاتی ہے کہ ۱۹۵۱ء تک اس صوبے میں تین لاکھ ٹن زائد خوراک پیدا کر لی جائے گی۔

ہماچل پردیش چیف کمشنر نے آلوؤں کی برآمد پر عائد شدہ محصول ہٹانے سے انکار کر دیا اور کہا ہے کہ یہ محصول کاشتکاروں کے فائدے کیلئے لگایا گیا ہے کسان سبھا کے صدر نے ایک ملاقات میں بتایا کہ انھیں اس محصول پر دو وجوہ سے اعتراض ہے۔ اول یہ کہ جلد اترآنے والی فصل زیادہ تر سبزی کے طور پر استعمال ہوتی ہے اور جلد خراب ہو جاتی ہے اس لئے اس فصل پر محصول نہ لگایا جائے۔ دوئم یہ کہ محصول آلوؤں کے وزن کے حساب سے نہیں لگنا چاہیئے بلکہ قیمت کے لحاظ سے لگنا چاہیئے۔ یعنی ایک آنہ فی روپیہ کے حساب سے لگایا جائے اور سرکاری شرح ایک روپیہ چار آنے فی من کے حساب سے نہ لگایا جائے۔

حیدرآباد - تمام ریاست کے دس ہزار اور اس سے زائد آبادی والے قصبوں میں راشن بندی کر لی گئی ہے۔ اب راشن بندی کے ماتحت آبادی کی گنتی سترہ لاکھ سے بڑھ کر پچیس لاکھ ہو گئی ہے۔

کشمیر پاکستان کے اخبارات میں کشمیر میں "فرضی قحط" کی تمام خبریں بالکل من گھڑت اور جھوٹی ہیں کشمیریوں کو حکومت کی طرف سے خوراک چودہ روپے فی من کے حساب سے مہیا کی جا رہی ہے حالانکہ مغربی پنجاب اور سرحد کے نواحی علاقوں میں اس کے بھاؤ انیس روپے فی من ہیں، سوائے اس علاقے کے جس پر پاکستانی حملہ آوروں کا قبضہ ہے کشمیر کے کسی علاقے میں خوراک کی قلت نہیں ہے۔

یوپی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ مختلف قصبوں کے ۵ منتخبہ علاقوں میں راشن بندی کے انتظام کو اپریٹو سوسائیٹیوں کے سپرد کر دیا جائے۔ حکومت یوپی نے کھانڈ کے بڑھتے ہوئے نرخوں کو روکنے کا فیصلہ کیا اور طے کیا ہے کہ کھانڈ ۲۹ روپے ایک آنہ فی من کے حساب سے فروخت ہوا کرے، اس نرخ میں محصول آبکاری شامل ہے۔

فتح گڑھ (فتح کا مینار)

مینار شہرت

(اوپر) — رانی پدمنی کا محل اور جھیل میں اس کی آرام گاہ۔ (نیچے) — پنادائی کا محل جس نے رانا اودے سنگھ کی جان بچائی تھی

(اوپر) – راجپوتانہ کے سب سے قدیم حکمران باپا راول کا محل۔ (نیچے) – رانا کمبھ کا محل
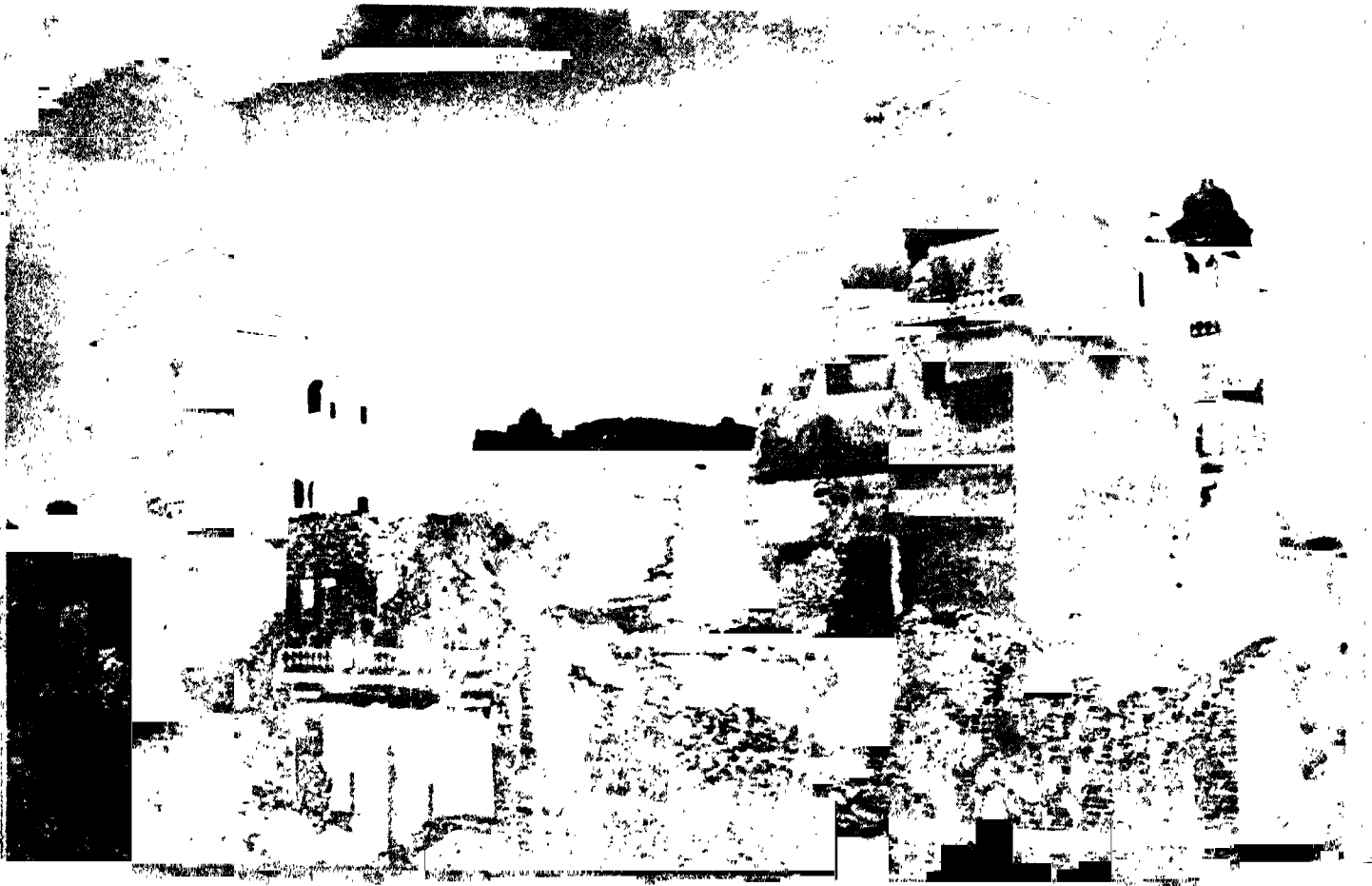
چتوڑ گڑھ

راجپوتوں کی بہادری کی تاریخ چتوڑ گڑھ سے وابستہ ہے۔ ان چار صفحوں پر اسی قلعے سے متعلق تصویریں ملاحظہ فرمائیے۔ یہ تصویریں ہمارے اسٹاف فوٹوگرافر مسٹر موتی رام جین نے کمال محنت سے راجپوتانے کے حال ہی کے دورے میں لی ہیں۔

(نیچے) – قلعے کے اندر یہ چھتری اس مقام پر تعمیر ہوئی ہے جہاں مشہور راٹھور سپہ سالار ٹھاکر جیمل اکبر کی گولی کا نشانہ بنا تھا۔
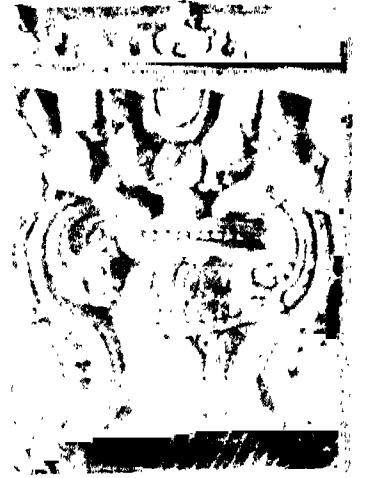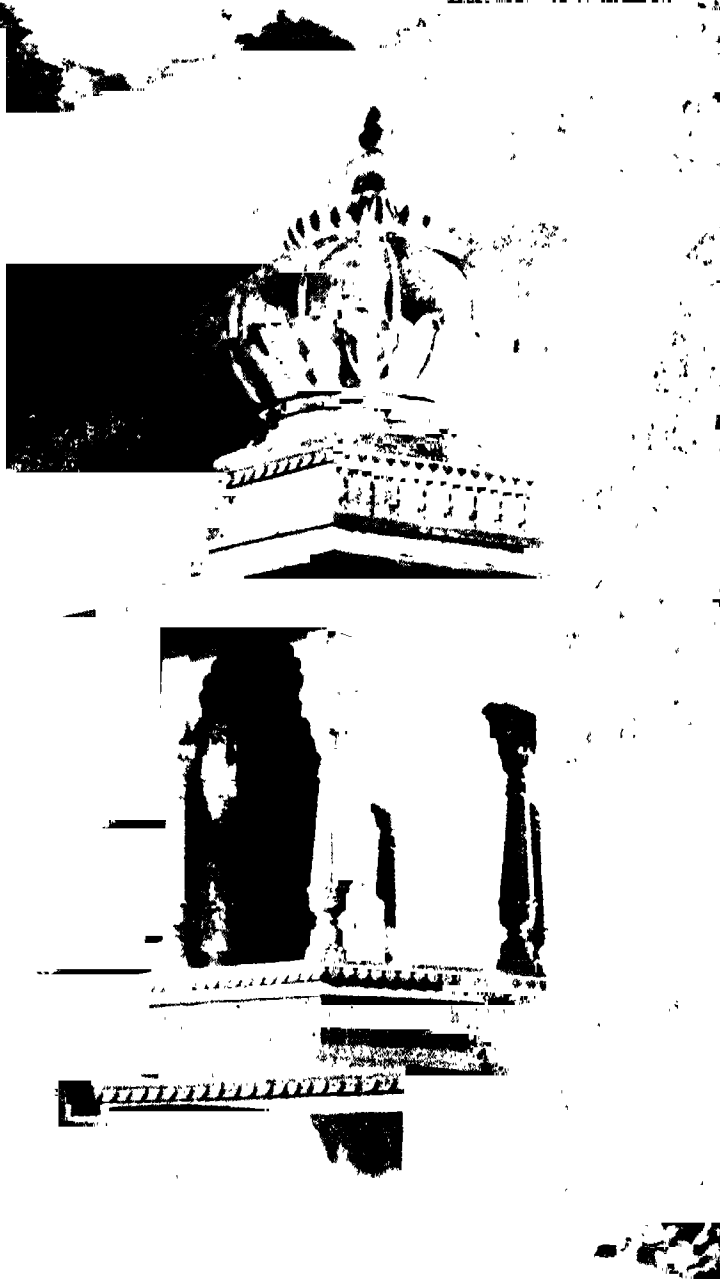
کار چوڑی مندر کے ایک
ن پر سنگ تراشی کا کمال

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

نئے ادبی رجحانات

اس عنوان سے میرا مقصد اپنی کتاب 'نئے ادبی رجحانات' پر تبصرہ کرنا نہیں بلکہ موجودہ دور کے ادبی کارناموں پر نئے حالات اور نئے رجحانات کے لحاظ سے ایک ہلکی سی تنقید پیش کرنا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ اس کتاب کو لکھے ہوئے آٹھ نو سال ہو گئے۔ اس مدت میں ادبی زاویہ نگاہ میں کچھ اور بھی تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ حالات اس تیزی سے بدل گئے کہ ادیبوں کو منزل مقام نظر آنے لگی۔ نئے نظام اور بدلے ہوئے حالات میں اردو کے شعراء و نثر نگار اس جگہ سے بھی آگے بڑھنے لگے جہاں ابھی ابھی قدم رکھ کر کھڑے ہوئے تھے وہ زمین بھی آتش زیر پا معلوم ہوئی وہاں سے ادب کے قافلے کو تیزی سے کوچ کا اشارہ کر دیا گیا۔ یہ قافلہ بانگِ درا سے بے نیاز تھا۔ خیالات کی پختگی اور مخصوص متعین نظریوں نے نہایت واضح طور پر بے باکی کے ساتھ قدم بڑھوا دیئے۔

جس طرح درخت کی جڑیں زمین میں پیوست ہوتی ہیں اسی طرح ادب کی بیخ و بن بھی زندگی کی تہوں میں جاگزیں ہوتی ہے اسی سے اس کی آبیاری و نشو و نما ہوتی ہے اس کی تبدیلی کے ساتھ ادب کو خود بخود تبدیل ہونا پڑتا ہے۔ اردو ادب کی بھی یہ نمایاں خصوصیت رہی ہے کہ وہ اپنے ہر دور و ماحول کے ساتھ بدلتا رہا ہے۔ ادیبوں نے اپنے عہد کی ترجمانی کی ہے چنانچہ زمانۂ قدیم کے ادب کو آپ چاہے جو کچھ کہیں مگر یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ بھی اپنے عہد کا ترجمان ہے یہ اور بات ہے کہ ترجمانی میں نقص نظر آئے بے قاعدگی دکھائی پڑے۔ تنقید نہ ہو صرف ترجمانی ہو مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس زوال پذیر زمانے کی عکاسی نہیں کی گئی۔ ولی، میر، سودا، نظیر، غالب، داغ سبھوں نے بقدر استعداد اپنے اپنے زمانوں کی اپنے اپنے طور پر ترجمانی کی، ان کی شاعری میں آپ کو اس زمانے کی جھلک ضرور نظر آئے گی۔

اسے اتفاق کہئے یا تاریخی مطالبہ سمجھئے کہ دورِ قدیم یعنی ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک کا زمانہ (جب سے ہماری زبان ادب کا درجہ حاصل کرتی ہے) زندگی کی دشوار گذار وادی بن گیا تھا کوئی خاص ادبی تغیر، نظریے اور سیاست کے لحاظ سے ہمارا ادب پیش نہیں کر سکا۔ قدیم روایات اور طرزِ تخیل کا ایک لامتناہی سلسلہ یہاں سے وہاں تک نظر آتا ہے۔ بیکار رسوم، عقائد کی غلط ترجمانیاں کسی نئے زاویۂ نگاہ کو پیدا ہی نہیں ہونے دیتیں۔ ہر دور میں خیالات کی یکسانی بے کیف فرسودگی سے ہم دوش نظر آتی ہے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد جب ہندوستان کی زندگی پر انقلاب کی بھرپور چوٹ پڑی تو گوشہ گوشہ متاثر ہوا۔ نظام و سیاست کی تبدیلی نے ہر شخص، ہر ملت، ہر شعبۂ زندگی کو بیدار کر دیا۔ اردو ادیب و ادب نے بھی کروٹیں لیں ایک نئی دنیا سامنے نظر آئی جس میں ہر چیز اجنبی دکھائی دی۔ اس ماحول میں پرانا ادب بہت پرانا معلوم ہونے لگا۔ طرزِ تخیل و طرزِ نگارش بے وقت کی شہنائی محسوس ہوئیں۔ آزاد و حالی نے زمانے کی نبّاضی کی۔ بروقت تبدیلی کے لئے آزاد نے ۱۸۶۷ء میں مردانہ وار قدم اٹھایا۔ نثر و نظم دونوں کو بیک وقت و بیک جنبش قلم زمانے سے ہم آہنگ کر دیا۔ آزاد نے ادب کا ایک خاص مقصد بنایا اور ایک خاص منزل کی طرف نثر و نظم دونوں کی باگیں موڑ دیں۔ حالی نے راستے کو اور زیادہ واضح کر دیا، فضا سازگار تھی۔ مخالفت کے باوجود جدید اردو ادب منزل کی طرف بڑھتا ہی گیا۔ اس قافلے میں آزاد و حالی کے علاوہ اسمٰعیل، اکبر، نظم طباطبائی، چکبست اور اقبال خاص طور پر قافلہ سالاری کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

جدید ادب کا رجحان کئی حیثیتوں سے قدیم رجحان سے ممتاز تھا۔ قریب قریب کل نظریوں میں نمایاں فرق تھا۔ تخیل میں بلند پروازی، طرزِ نگارش میں تازگی، لہجے میں تیقن اور بے باکی پہلے سے کہیں زیادہ

تھی۔ عہدِ جدید سے پہلے ادب کا نظریہ تمثیلی تھا اب عملی اور افادی ہوگیا۔ اس مرکزی تبدیلی نے ہر شعبۂ حیات اور ہر طرزِ تخیّل میں ایک خاص فرق پیدا کر دیا۔ ابتداء ہی سے عہدِ جدید نے "عینیت" کا فلسفہ چھوڑ کر حقیقت کو اپنانا شروع کیا، اس بنیادی تبدیلی کی وجہ سے جمالیاتی ذوق، معیارِ عشق، فلسفۂ حیات یہاں تک کہ اسلوبِ بیان میں بھی عہدِ قدیم سے علیحدگی پیدا ہوگئی۔ پہلے پہل یہ نظریات اتنے واضح اور متعین نہیں تھے جتنے اب ہوگئے ہیں۔ لیکن غیر شعوری طور پر احساسات و طرزِ فکر نے وہی راستہ ابتدا کے ادیبوں سے اختیار کرایا جو دورِ حاضر میں زیادہ سے زیادہ واضح اور متعین ہوگئے ہیں۔ دورِ جدید کی ابتدا میں تو سیاسی شعور کی بیداری بھی آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔ اس لئے ادب کا کارواں بھی احتیاط و تکلف سے کام لے کر قدم اُٹھاتا تھا۔ چنانچہ اس دور میں شروعات اصلاحی رُجحان اور عام اخلاقی مضامین سے ہوئی اُس سے الگ ہوکر مناظرِ فطرت اور کبھی کبھی حُبِّ وطن اور نظامِ سلطنت پر خاص خاص اہلِ قلم کچھ لکھتے رہے لیکن جیسے جیسے سیاسی شعور و احساس بیدار ہوتے گئے ویسے ہی رفتارِ ادب بھی تیز تر ہوتی گئی۔

اقبال کے زمانے میں نئے ادبی رجحانات و طرزِ فکر نے پختگی حاصل کر لی۔ ادیبوں کو بات کہنے کا بہتر سلیقہ حاصل ہوگیا۔ اب باتیں بھی پہلے سے زیادہ گہرائی کے ساتھ آنے لگیں، طرزِ بیان میں بھی ادبیت و لطافت ابتدائی دور سے کہیں زیادہ پیدا ہوگئی۔ اقبال کے تبحّرِ علمی و جدّتِ فکر نے عہدِ جدید کو تخیّل و ادبیت دونوں لحاظ سے آشنا بلند کر دیا، عہدِ جدید کو اپنے پر اعتماد ہوگیا، فلسفۂ حیات کے اہم مسائل پر گفتگو اردو میں بھی اِس دل کش انداز و عمیق خیالات کے ساتھ کہ نظامِ نو میں زندگی تلاش کرنے والوں کو محسوس ہوا کہ

تمنّا آب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہُوا

نئے رُجحانات ایک صحت مند اور مؤثر انداز میں جدید ادب سے ہم آہنگ ہوتے چلے گئے، زمانے کی ضرورتیں اور دلوں کی پکار دونوں ہمارے ادب میں آسودگی حاصل کرتی رہیں۔ اس کی کامیابی کا راز صرف یہ نہیں تھا کہ نئے موضوعات پر گفتگو ہو رہی تھی بلکہ زیادہ تر اس وجہ سے کہ رفتارِ زمانہ سے جدید ادب ہم آہنگ تھا۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنے دامن میں جگہ دے رہا تھا۔ صرف حسن و عشق کو اپنا مرکزِ خیال بنا کر زندگی کے اور شعبہ جات کو نظر انداز نہیں کر رہا تھا بلکہ فرد کے علاوہ قوموں کے مطالبات و تشنگی کو ادب سے سیراب کرنے کی مسلسل فکر کرتا رہا۔ ۱۸۵۷ء سے اب تک کا زمانہ ادب کے لحاظ سے ایسی بڑی مدّت نہیں کہ اس کو ادوار میں تقسیم کیا جائے لیکن یہ "زمانہ رفتار" کا زمانہ کہلاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے جدید ادب میں بھی اس تیزی سے تبدیلیاں ہوگئی ہیں کہ اس دورِ جدید کو ادبی لحاظ سے دو حصّوں میں تقسیم کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ پہلا دور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک اور دوسرا دور ۱۹۱۴ء سے اب تک کا زمانہ سمجھنا چاہیئے۔

ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ زندگی کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ادب کو خود بخود تبدیل ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ جب پہلی جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۱۸ء میں نظامِ عالم بدلتا ہُوا نظر آیا، زندگی کی قدروں کے ساتھ فلسفۂ حیات بھی نئے ماحول کے سانچے میں ڈھالا جانے لگا تو ہندوستان پر بھی کافی اثر پڑا اور ایسا معلوم ہُوا کہ سیاسی زندگی کے ساتھ سب کچھ بدل جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا بھی، جلیاں والے باغ کا دردناک قتلِ عام، خلافت کا مطالبہ، ترکِ موالات کی تحریک، گرانی، سرمایہ داروں کی بے رحمیاں، مزدور کسان کی ہڑتال نے ہندوستان کے سیاسی شعور میں ہل چل پیدا کر دی۔ خودداری و آزادی کی لہر طوفان بن کر پورے ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک چھا گئی۔ اقتصادیات و سیاست کے اہم مسائل کو لوگ سمجھنے کی کوشش کرنے لگے نتیجہ یہ ہُوا کہ زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے فرسودہ نظام سے ہٹ کر نیا راستہ ڈھونڈا جانے لگا۔ روحانی زندگی کے بتائے ہوئے راستے تنگ و تاریک ثابت ہُوئے۔ مذہب کو مذہب کی جگہ چھوڑ کر لوگ مادّی دُنیا میں ترقی و بہبود کے ذرائع سوچنے لگے۔ زمین کو آسمان بنانے کی فکر کرنے لگے۔ اب اپنی قسمت کو تاروں کے عوض زمین کے ذرّوں سے وابستہ سمجھنے لگے۔ فرش کو عرش کے مرتبے پر دیکھنے کی فکر و خواہش پیدا ہوئی۔ ان تبدیلیوں کا اثر اردو ادب پر براہِ راست پڑ رہا تھا۔ نثر و نظم دونوں میں مختلف تحریکات کی ترجمانی ہو رہی تھی۔ مگر خیالات میں تذبذب تھا اس لئے کہ زمانہ ہر قدم پر ایک نیا موڑ پاتا تھا اور یہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ آگے کیا ہوگا۔ قافلے کی

آخری منزل کون سی ہوگی - اس انقلاب اور ہل چل میں ہندوستان کی بھی نظر کارل مارکس کے نظریئے پر پڑی - بعض طبقے کے نزدیک اقتصادی سیاسی کرب کا یہی ایک حل معلوم ہوا - اشتراکی نظام کی طرف تیزی سے نظر جانے لگی، اس کے اکثر پہلو دل کش اور قابل قبول نظر آئے - سیاسی فضا سازگار ہوتی چلی گئی - اُردو ادب نے بھی اپنی ذہنیت اسی نظام و اصول کی طرف پھیر دی - ہر پڑھا لکھا نوجوان اشتراکی خیالات و اصول پر اُلٹے سیدھے طبع آزمائی کرنے لگا - نتیجہ یہ ہوا کہ چند دنوں میں اُردو ادب پر اشتراکی خیالات و نظریات کی فضا چھا گئی - دورِ جدید کے قابلِ ذکر نوجوان ادیب اسی مسلک پر طبع آزمائی کرنے لگے، گویا شاعری محل سے نکل کر جھونپڑوں میں آ گئی، خواص کے تذکرے کے بجائے عوام کا ذکر آنے لگا -

۱۹۳۵ء میں ترقی پسند انجمن ہندوستان میں ظہور پذیر ہوئی، اس انجمن نے نئے ادب کی ذہنیت بالکل اپنی طرف پھیر لی - پہلی بار ایک منظم انجمن کے تحت اُردو ادب نے اپنا راستہ تلاش کرنا شروع کیا - عہدِ قدیم میں لکھنؤ اسکول اور دہلی اسکول ادب کے لئے محکمۂ احتساب کا کام کر چکے تھے لیکن ان اسکولوں کا تمام تر زور زبان و بیان پر تھا - مواد کے لحاظ سے کوئی نئی چیز پیش کرنے کی کوشش ملحوظ نہیں تھی برخلاف اس کے ترقی پسند انجمن نے زبان و بیان پر کم، بہت کم زور دیا موضوع پر زیادہ زور دیا - اس تحریک کا منشاء یہی تھا اور ہے کہ ادب زندگی کا ترجمان ہو - ملک و قوم کی رہنمائی کرے - ادیب صرف اپنا ہی درد بیان کرکے نہ رہ جائے، اپنے ہی رنج کو رنج نہ سمجھے بلکہ دُنیا کے غم کو اپنا غم سمجھے - ادیب کا وسیع النظر ہونا ضروری ہے اس کے احساس و تصوّر کا آئینہ اتنا وسیع و کشادہ ہو کہ ہر قابلِ احترام جذبے کی تصویر اس میں اُبھر آئے - زندگی کو حقیقت کی عینک سے دیکھے - مرنے سے نہ ڈرے مگر جدو جہد کے بغیر مرنا بھی حرام سمجھے -

اس دور کی خصوصیات میں اور دوسرے ادوار کی خصوصیات میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ موجودہ دور میں نفسیاتی پہلو پر زیادہ سے زیادہ توجہ کی گئی ہے - افسانہ اور نظم دونوں میں اسباب و علل کے علاوہ انسان کے تحت الشعور کا مطالعہ عمیق نظروں سے کیا جانے لگا - اس معنوی پہلو پر خاص طور سے زور دیا جا رہا ہے کہ کردار کے افعال کردار کی ذہنی کیفیات کا عکس ہیں اور وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے ماحول سے متاثر ہو کر کرتا ہے - اس کی حرکات و سکنات آنے والے واقعات کا پیش خیمہ ہیں - چہرے کا تغیّر اُس کی افتادِ طبیعت اور تأثر کا پتہ دیتا ہے - اس کی نفسیات کی تشریح پر جتنا زور اس وقت دیا جا رہا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں دیا گیا تھا - اس اندازِ فکر نے ادب میں گہرائی ادیب میں غور و فکر کا مادہ قابلِ قدر حد تک پیدا کر دیا ہے -

جنسیات کا مسئلہ اُردو ادب میں کیا دُنیا کے ہر بڑے ادب میں جزو لاینفک رہا ہے - بغیر جنسی کوائف کے شاید ہی کوئی ادب، ادب بن سکا ہو - اُردو میں ابتداء ہی سے حسن و عشق جزو غالب کا کام کر رہا تھا لیکن دورِ جدید میں جنسیات پر بالکل نئے زاویۂ نگاہ سے نظر ڈالی گئی - اب سے پہلے زیادہ تر تعیش و تعشق کے تقاضے کے تحت یہ عنصر پیش کیا جاتا تھا اب اس کا تذکرہ یا تخیل جنسی بھوک کی پکار بن گیا - اس کا پیش کرنا اس لحاظ سے نہیں ہے کہ تفریحی زندگی کو آسودگی حاصل ہو بلکہ زیادہ تر اس خیال سے کہ آب و دانے کی طرح زندگی کی یہ ضرورت بھی ہماری رسائی کے باہر ہے - یہ ایک فطری جذبہ و ضرورت ہے ہم اس سے محروم رکھے گئے ہیں، اس کمی کو ضرورت کے لحاظ سے پورا ہونا چاہیئے جو سماج اس ضرورت کو پورا نہیں ہونے دیتا، ہم اس کے ظلم سے بے چین ہو کر چیخ اُٹھتے ہیں - نظریہ حسن و عشق بھی مثالی نہیں رہ گیا محبت کسی سے بھی ہو سکتی ہے - ممکن ہے دل ایک ایسے فرد پر آ جائے جس کو دُنیا اب تک ایک نیچ قوم کا فرد سمجھتی تھی - اگر آسودگی کے بعد ترک محبت بھی ناگزیر نہ ہو - زندگی کا سب سے بڑا مقصد عشق و عاشقی نہیں رہ گیا - بلکہ جیسا ہم نے عرض کیا ضروریاتِ زندگی کا ایک پہلو رہ گیا - مثالیت ایک جنون سمجھی گئی - چنانچہ کافی تعداد میں ایسی نظمیں ملیں گی جن میں معشوق سے کہا گیا ہے کہ باوجود التفات کے فی الحال اہم مقاصد کی طلب محبت میں منہمک نہیں ہونے دیتی - محبت کی قدر کرتے ہوئے بھی حب الوطن اور آزادی کی پکار محبت سے الگ کر کے میدانِ جنگ میں بلا رہی ہے - انسانیت کو سماجی اور سیاسی بندھنوں سے

آزاد کرانے کے لئے معشوق کو چھوڑ دینے کا اظہار کیا گیا ہے۔ غرض کہ اس دور میں جنسی محبت کو زندگی کا اتنا بڑا اور اتنا اہم بالشان جذبہ نہیں سمجھا گیا کہ ملک کی آزادی پر اس کو ترجیح دی جائے۔ مثالی و تخیلی نظریۂ عشق اپنی اصل قدروں کے ساتھ سوچا اور سمجھا گیا۔

اس زمانے میں فرائڈ کا جنسی نظریہ ایک سیلاب بن کر دنیا کی متمدن قوموں کی ذہنیت پر چھا گیا۔ اردو ادب پر بھی اس کا اثر کچھ دن تک بہت رہا۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ نوجوانوں اور ادیبوں نے اس سے بھی اثر لیا۔ لیکن یہ رجحان زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہا۔ کارل مارکس کا نظریہ کہ زندگی کی مشکلات اقتصادی الجھنوں میں مضمر ہیں فرائڈ کے اس نظریے کے بالکل برعکس تھا۔ کہ دنیا کی جملہ پریشانیاں جنسی الجھنوں کے باعث ہیں۔ دونوں نظریوں میں تصادم ہوا تو کارل مارکس کا نظریہ دیرپا اور صحیح ثابت ہوا۔ کارل مارکس کے نظریے نے ہر جذبے کو افادی پہلو سے جانچنے پر ادب کو مائل کیا۔ زیادہ سے زیادہ جذبات کو زندگی کے عملی پہلو سے ہم آہنگ کر دیا۔ سیاسی و اقتصادی مصلحتوں کی کسوٹی پر خیالات و حالات کو جانچنے کی فکر ہر قابل ذکر ادیب کو ہو گئی۔ چنانچہ دورِ حاضر کا ادب زیادہ سے زیادہ سیاسی و اقتصادی الجھنوں کا نتیجہ ہے۔ یوں تو عام طور پر دنیا کا سیاسی شعور زیادہ بیدار ہو گیا ہے۔ لیکن ہمارے ادیبوں کا احساس ہمیشہ سے زیادہ سیاسی و اقتصادی مسائل کی طرف مڑ گیا ہے۔ عشق، مذہبی تاثرات اخلاقیات غرض کہ جملہ احساسات کا رخ عملی زندگی اور سیاسی مسائل کی طرف ہو گیا ہے۔ یہ رویہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ اس لئے کہ ادب وابستہ ہے زندگی سے اور زندگی کی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ اگر ساتھ ہی ساتھ ادب میں جذبات و خیالات بدلتے نہ رہیں تو ادب جامد و ساکت ہو کر زندگی کے تیز رو دھارے سے کوسوں دور ہو جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ادب کی کشتی دھارے کے ساتھ بہنے کے عوض ساحل ہی سے الگ کھائی پڑے گی۔

جوش کے زمانے سے اردو ادب میں بے باکی اور صاف گوئی کا رجحان شروع ہوا۔ اس سے پہلے زیادہ تر شعراء سیاسی مفہوم کو رمز و کنایات کے پردے میں پیش کرتے تھے لیکن حالات کچھ ایسے بدلے کہ حکومت سے کھلم کھلا گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی لارڈ کرزن کے وقت سے اکبر و چکبست نے یہ پیرایہ بدلنے کی کوشش کی صاف صاف باتیں بھی کبھی کبھی ہونے لگیں۔ لیکن اس وقت تک یہ طرزِ کلام رجحان کی صورت نہ اختیار کر سکا تھا۔ جوش نے اپنی گوناگوں صلاحیتوں کی وجہ سے یہ طرز گفتار عام کر دیا۔ پریس ایکٹ کی تبدیلی اور زمانے کی ہم آہنگی نے اس صاف گوئی کو قبول عام کا شرف بخش دیا۔ ابہام و رمز و کنایہ موجودہ دور میں بجائے حسن کلام کے قباحت سے تعبیر کئے جانے لگے ہیں یہاں تک کہ اب وہ بھی انداز بیان پسند نہیں کیا جاتا جو اتنا واضح نہ ہو کہ روئے سخن کس کی طرف ہے جس کے متعلق بات کہی جائے۔ اتنی واضح ہو کہ دوسرے پر اس بات کے چسپاں ہونے کا امکان ہی نہ رہ جائے۔ یہ پہلو سیاسی نظموں کے لئے زیادہ سے زیادہ ضروری سمجھا گیا ہے۔ کیونکہ اشعار میں اگر اتنی وضاحت نہ ہوئی کہ یہ اشارہ مسلم لیگ کانگرس، اشتمالیت، مہاسبھا کسی ایک مخصوص جماعت کی طرف ہے تو نہ شاعر صحیح رہنمائی کر رہا ہے اور نہ اس کا شعر مخصوص نظریے اور مخصوص طبقے کی ترجمانی کامیاب طریقے سے کر سکتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تشبیہ و استعارہ، صنائع و بدائع کے لطیف پہلو سے گریز کیا جائے بلکہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ باوجود حسن کاری کے اشارے اتنے واضح ہوں کہ زیر بحث فرد یا انجمن صاف صاف نظر کے سامنے آ جائے۔

سیاسی شعور اور زندگی کی کشمکش نے اس وقت دنیا کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اردو کے ادیب بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ہیں، ایک اپنے کو ترقی پسند کہتا ہے۔ اور دوسرے کو رجعت پسند سمجھتا ہے۔ اول الذکر کے خلاف ادبی لحاظ سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے۔ کہ زبان و بیان کو خراب کر رہا ہے۔ شاعری نہیں پروپیگنڈا لکھتا ہے۔ موخر الذکر کے خلاف ترقی پسندوں کا یہ اعتراض ہے۔ کہ زندگی سے الگ ہو کر اپنے حسن و عشق کی داستان قصۂ پارینہ کی طرح سنا کر یہ ادب کو زندگی سے دور کرتے چلے جاتے ہیں۔ اپنے ہی غم کو غم سمجھ رہے ہیں۔ قوم و ملک کے مفاد پر نظر نہیں موجودہ حالات و انقلابات سے بے خبر ہو کر ادب کو قنوطیت کا مظہر بناتے جا رہے ہیں۔ اس طبقے کے پاس نہ دل ہے نہ دماغ اس طرح کے سینکڑوں اعتراضات ایک دوسرے

پر کرتا رہتا ہے۔ بحث طولانی ہے۔ اس پر دونوں طرف سے کافی بحثیں ہو چکی ہیں۔ اس مضمون میں اس پر کوئی خاص بحث نہ تو مفید مطلب ہوگی نہ اتنی گنجائش ہے کہ سیر حاصل بحث کی جائے۔ مختصر یہ ہے کہ ترقی پسند ادیب، ادب برائے زندگی کے قائل ہیں اور رجعت پسند ادب برائے ادب کے نظریے کے پابند ہیں۔ جو موجودہ دور کے لئے نہ تو سازگار ہے اور نہ صحت مند۔ ادب کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔ ادب برائے ادب کے اصول پر چلنے والے غم عشق و غم روزگار میں مشکل سے امتیاز کر سکتے ہیں۔ نظام عالم و سیاسی مسائل جو زندگی کے لئے جزو لاینفک ہیں۔ ان کو چھوڑ کر تفریحی و خیالی دنیا میں اپنے کو کھو دینے کی سعی کرتے ہیں۔ جو ہر بڑے ادیب پر فراریت کا داغ لگا دینے کے لئے کافی ہے۔

ہمارے نزدیک اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہر ادیب کو یا تو ترقی پسند بننا پڑے گا یا رجعت پسند۔ بین بین چلنے کا کوئی راستہ نہیں رہ گیا۔ صاف اور واضح طور پر ایک متعین نظریئے کے تحت ہیں ادب کو آگے بڑھانا پڑے گا۔ ادھر اُدھر بہکنے سے نقصان کے سوا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔

اظہار ملیح آبادی

انتظار

ہاں اس کی اک ادا پر یہ دونوں جہاں نثار
بوئے گل و نسیم سحر گلستان نثار
زہد ہزار سالہ و باغ جناں نثار
ہر حرف و ہر حکایت و ہر داستان نثار
جس کی نگاہ ناز میں آب حیات ہے
جو میری زندگی ہے مری کائنات ہے

جس کا ہر اک نفس ہے مری زندگی کا راز
پڑھتا ہوں جس کے دامن الفت پہ میں نماز
چھیڑا ہے جس نے دل میں مرے حسرتوں کا ساز
غصہ بھی جس کا میرے لئے ہے طرب نواز
بزم جہاں میں آپ جو اپنی نظیر ہے
جس کی نگاہ گرم مجھے زمہریر ہے

رفتار میں بہار ہے گفتار میں بہار
عارض میں اور گیسوئے خمدار میں بہار
صحن چمن میں دشت میں کہسار میں بہار
یوں آئی جیسے آگئی گلزار میں بہار
آئی تو خار زار کو جنت بنا دیا
ہر پھول کو کتاب محبت بنا دیا

چہرے پہ جس کے صبح ازل کا ظہور ہے
آنکھوں میں جس کی مشعل فطرت کا نور ہے
مجھ سے زیادہ جس کی محبت غیور ہے
میرے قریب رہ کے بھی جو مجھ سے دور ہے
کیا ہوش میں وہ خواب میں آتی نہیں کبھی
اپنا جمال مجھ کو دکھاتی نہیں کبھی

پرکاش پنڈت

ترنجن

ترنجن بن بیاہی مٹیاروں، سہاگنوں اور بوڑھی عورتوں کی ایک ایسی محفل کا نام ہے جہاں وہ رات بھر مِل کر بیٹھ کر چرخہ کاتتی ہیں ترنجن کا رواج یوں تو کسی نہ کسی رُوپ میں ہندوستان کے بہت سے حصّوں میں رائج ہے لیکن جو اہمیت اسے پنجاب میں حاصل ہے وہ کچھ اسی صوبے کا حصّہ ہے۔ ان محفلوں میں عورتیں کچھ اسی لئے حصّہ نہیں لیتیں کہ اس طرح وہ زیادہ مقدار میں سوت کات سکیں گی بلکہ اکٹھا مل بیٹھنے، ایک دوسری کے دُکھ درد سننے اور تفریح کرنے کا مقصد بھی ان کے پیش نظر ہوتا ہے۔

ایک عورت، عموماً وہ عورت جس کے وہاں محفل جمتی ہے "پڑ" باندھتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ہر عورت سے چار چار، آٹھ آٹھ یا سولہ سولہ پونیاں لیتی جاتی ہے اور بالترتیب اوپر تلے ایک پٹاری میں جمع کرتی جاتی ہے۔ ان پونیوں کو ترنجن کی سہیلیاں "چھوپا" کہتی ہیں پھر ہر سہیلی کو باری باری اس کا چھوپا بانٹ دیا جاتا ہے اور اس طرح چرخے چلنے لگتے ہیں۔ اسی طرح دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ پھر تیسرا یہاں تک کہ ساری کی ساری پونیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ قاعدے کے مطابق پڑ باندھنے والی عورت اپنا چھوپا ختم کرنے کے بعد ہی دوسرا دور شروع کرتی ہے۔ چنانچہ تیز کاتنے والیوں کو درمیان میں تھوڑی تھوڑی فرصت بھی مل جاتی ہے اور وہ اس وقت کو ایک دوسرے کی رام کہانی سننے میں صرف کرتی ہیں۔ لیکن سُست کاتنے والی لڑکی یا عورت کی پونیاں بچی ہی رہ جاتی ہیں۔ ترنجن کی سہیلیاں اتنا انتظار نہیں کر سکتیں کہ ان کا چھوپا ختم ہو تو دوسرا دور شروع کیا جائے۔

یوں تو ہر موسم میں ترنجن کی محفلیں جمتی ہیں، لیکن سردیوں میں وہ بڑے پورے جوبن پر ہوتی ہیں۔ ہر گاؤں میں، ہر رات، یکے بعد دیگرے ہر گھر میں باری باری یہ محفلیں رات کے نو دس بجے کے قریب شروع ہوتی ہیں اور صبح پو پھٹنے تک جمی رہتی ہیں۔ لیکن کیا مجال جو کسی کی آنکھ جھپک جائے کوئی جماہی تک لے لے۔ نیند کے غلبے کو روکنے کے لئے وہ کھانے کی کوئی نہ کوئی شے مثلاً بُھنی ہوئی مکی اور گڑ، ترچولی، گنڈیریاں، مونگ پھلی وغیرہ اپنی جھولیوں میں بھر لاتی ہیں اور کاتنے کے ساتھ ساتھ انھیں پھانکتی، کھاتی جاتی ہیں۔ وہاں آپس میں وہ ان کا تبادلہ کرتی ہیں اور اس طرح ایک برادری میں بھی منسلک ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ گھر کی مالکن بھی موسم کے مطابق ان کے لئے لسی، شربت یا چائے مہیا کرتی ہے۔

چرخوں کی گھوں گھوں کاتنے والیوں کے دل و دماغ میں گونجنے لگتی ہے اور اُس وقت صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلے آنے والے گیت ان کے ہونٹوں پر تھرک اُٹھتے ہیں۔ یہ گیت ترنجن کا ایک اہم ترین جزو ہیں۔ کچھ گیت تو چرخے کے گرد گھومتے ہیں لیکن بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا چرخے کے ساتھ براہ راست تو کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن جن کے سُر تال چرخے کی گھوں گھوں کے مرہون منت ضرور ہوتے ہیں۔ چرخوں کی گھوں گھوں، ہتھیوں پر ہاتھوں کی تھپک اور کلائیوں کی سونے، چاندی اور بلور کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ ہم آہنگ ہو کر ایک ایسی وجد آور موسیقی کو جنم دیتی ہیں کہ سہیلیوں کے ہونٹوں میں از خود جنبش پیدا ہو جاتی ہے جو گیت بھی چرخے کے تال پر اُتارا جا سکے۔ ترنجن کے گیتوں کی برادری میں شامل کر لیا جاتا ہے

نوجوان لڑکیوں اور سہاگنوں کے مُنھ سے نکلا ہُوا ہر بول ان کے دلی جذبات کی پوری ترجمانی کرتا ہے۔ پریتم دور جا بسا، اس کے ہجر کی تلخیاں ناقابلِ برداشت ہو گئیں۔ برہن اپنے دِل کی آگ اپنے گیتوں میں لپیٹ لپیٹ کر بیان کرتی ہے۔ دنیا کی شاعری میں ہر جگہ بہا کے

گیتوں کا ایک بلند مقام ہے۔ ترنجن کے گیت بھی اپنے جذبات کی عالمگیر
اثر انگیزی کے پیشِ نظر ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ کوئی برہن یوں گاتی ہے۔

گڈّی ادھ سمان چڑھاکے ڈوراں کٹیاں ماہی وے

یعنی اے میرے محبوب، تم نے پتنگ کو آدھے آسمان تک پہنچا کر اس
کی ڈور کاٹ ڈالی۔

لوک گیتوں میں پتنگ محبّت کی علامت ہے۔ اس کا لطف کچھ
وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں جنھوں نے کبھی یہ پتنگ اُڑایا ہو۔ سیدھے
سادے الفاظ میں ترنجن کی سہیلی کچھ اس خوبصورتی اور گہرائی سے
اپنے جذبات بیان کرگئی ہے کہ بڑے سے بڑا شاعر بھی اس کی داد دیئے
بغیر نہیں رہ سکتا۔

پھر ایک کونے سے ایک نغمہ پھوٹ نکلتا ہے اور سب کی سب سہیلیاں
ہم آواز ہوکر اُسے اٹھا لیتی ہیں۔

چھّی کریلے ماہی وے، رب وچھڑے میلے
چھّی وچ مرچاں ماہی وے ملنے دیاں ہرساں

کریلوں سے ٹوکری بھری پڑی ہے، اے خدا میرے بچھڑے محبوب
کو ملادے۔

ٹوکری میں مرچیں پڑی ہیں۔ بالم تم سے ملنے کو دل بے قرار ہے۔
ظاہر ہے کہ زندگی کی تلخیوں اور ناکامیوں کے پیشِ نظر برہن کا
دھیان کسیلے کریلوں اور کڑوی مرچوں کی طرف ہی جاسکتا ہے۔ یہ دیہاتی
شاعری کا خاصہ ہے۔ کبھی ساجن سے یوں اِلتجا کی جاتی ہے۔

آکِکّراں دے اوہلے سُناواں تینوں گل جانی
اِک چھّی والا چھلّہ وے دے جا نشانی

ذرا ان کیکروں کی اوٹ میں مجھ سے ملنے کے لئے آؤ ساجن، میں
تم سے اپنے دل کا راز کہوں، اپنی چھنگلیا کا چھلّہ بطور نشانی مجھے
دیتے جاؤ۔

معلوم ہوتا ہے ساجن جاتے وقت چھنگلیا کا چھلّہ تو دیتا گیا
لیکن واپس آنے کا خیال دل سے بھلا بیٹھا

مُڑ نہ آئیوں میرے ماہی، رو رو بیتے جوانی
ہائے چھّی والا چھلّہ ....

تم پلٹ کر نہیں آئے، رو رو کر جوانی بیت رہی ہے۔ ہائے رے
چھنگلیا کا چھلّہ!

بہو کو اپنی ساس سے ہمیشہ شکایت رہی ہے، اور
ترنجن میں جہاں ساس ایک سہیلی سے بڑھ کر کوئی رتبہ
نہیں رکھتی، وہ بڑی آزادی سے اپنے جذبات بیان
کرتی ہے۔

آپ سسّو پلنگ لیٹ دی، ہائے پلنگ لیٹ دی
سانوں ماردی، ہائے نی سانوں ماردی چکّی وَل سینتاں

یعنی میری ساس خود تو پلنگ پر دراز ہے لیکن مجھے چکّی کی طرف اشارے
کر رہی ہے۔

دُلھن بھلا چکّی کیوں پیسے؟

ساتھوں چکّی نہیوں پیسدی، ہائے نہیوں پیسدی
آپے پِین گیّاں، ہائے نی آپے پین گیّاں سسّو دیاں جائیاں

ہم سے چکّی نہیں پستی۔ ساس کی بیٹیاں خود ہی پیسیں گی۔
لیکن وہ جانتی ہے، کہ بالآخر اسے ساس کا حکم ماننا ہی ہوگا۔ رو
کر یا ہنس کر اسے چکّی پیسنا ہی ہوگی، اور وہ اپنی ساس کی نقل
اُتارتی ہے۔

آپے چکّی پِس جاوے گی، ہائے پِس جاوے گی
جد دں کھڑکی ہائے نی جدوں کھڑکی ہتّاں والی ڈانگ نی

یعنی چکّی خود بخود پِسنے لگے گی، جب تیرے شوہر کی پیتل کے
مٹھے والی لاٹھی تجھ پر برسے گی۔

پنجاب کی دُلھن صدیوں سے اپنے خاوند کے ہاتھوں پٹتی آئی
ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ اس کا دھرم ہے، شاید! لیکن ترنجن کے
گیتوں میں وہ اس دھرم کے خلاف احتجاج کرتی نظر آتی ہے۔

ادھی راتیں ماریّی، ہائے ماریّی
بَن چھڈّیاں ہائے نی بَن چھڈّیاں ملوک جئیاں ہڈّیاں

آدھی رات کے وقت مجھے پیٹا گیا، اس نے میری نرم و نازک
ہڈیاں توڑ کر رکھ دیں۔

چرخہ زندگی کی علامت ہے۔ تکلی سے سوت کے تاروں کے

ساتھ ساتھ زندگی کے بھی تار نکلتے ہیں جس طرح پنجابی شاعری پر صوفیانہ جذبات کا رنگ غالب ہے، یہاں کے لوک گیت بھی اس کے اثر سے بے نیاز نہیں ہو سکے۔ ترنجن پر بیٹھے بیٹھے کوئی بڑھیا یوں اپنی زندگی کا جائزہ لیتی ہے۔

واہ واہ، چرخے نے چیں چیں لائی
پچھلا کتیا لڈ ہنڈایا، مڑ کتن نوں ہتھ نہ لایا
میں میں موُل نہ کتیا ....

پچھلا کاتا ہوا تو نکال کر پہن لیا لیکن آیندہ کے لئے میں نے چرخے کو چھوا تک نہیں۔ ہائے ری میں نے بالکل نہ کاتا۔ یعنی پچھلے جنم کے کرموں کا پھل تو میں نے اس جنم میں بھوگ لیا۔ لیکن اگلے جنم کے لئے میں نے کوئی اچھا کرم نہیں کیا۔

اگرچہ یہ خیال خالص ہندو نقطۂ نگاہ سے تعلق رکھتا ہے لیکن ہم اسے صوفی مت کے اثر سے بے نیاز نہیں کہہ سکتے۔ بلّے شاہ اور دیگر صوفی شاعروں کے کلام میں اکثر مقامات پر ہو بہو یہی جھلک ملتی ہے۔

ترنجن پنجاب کے گاؤں کی زندگی کا آئینہ دار ہے اور ترنجن کے گیت پنجابی عورتوں کے دل کی دھڑکنیں۔ اس مشینی دور میں جب کہ ملیں اچھے سے اچھا کپڑا مقابلتاً سستے داموں دیہات کے کونے کونے میں پہنچا رہی ہیں ترنجن کی محفلیں روز بروز کم ہوتی جا رہی ہیں لیکن جب بھی کچھ عورتیں ترنجن میں جمع ہوتی ہیں یوں معلوم ہوتا ہے ملیں چرخے کی گھوں گھوں کو کبھی کچل نہیں سکیں گی

جب تک پنجاب کے کھیتوں میں کپاس اُگے گی، پنجاب کے دیہات میں ترنجن کی محفلیں جمیں گی اور ترنجن کی سہیلیوں کے سینے سے گیتوں کے سوتے پھوٹتے رہیں گے۔

جمیلہ خاتون تسنیم

غزل

کیسے یہ کہوں یاد تری آ نہ سکے گی
لیکن دلِ برباد کو بہلا نہ سکے گی

پھر سیرِ گلستاں کا اُنھیں شوق ہُوا ہے
گلشن میں کلی اب کوئی مُرجھا نہ سکے گی

کیوں آئی ہے ساون کی گھٹا ساز بجاتی
اب میرے گلستاں میں بہار آ نہ سکے گی

جو آنکھ نہ شرمائی کبھی ظلم و جفا پر
وُہ میری تباہی پہ بھی شرما نہ سکے گی

کرتے ہیں کبھی یاد وُہ بھولے سے ہمیں بھی
اے بادِ صبا تو یہ خبر لا نہ سکے گی

وُہ کاکُلِ پیچاں کو بہر طور سنوارے
اُلجھی ہُوئی تقدیر کو سُلجھا نہ سکے گی

بیدرد نے وُہ درد دیا قلبِ حزیں کو
اب میری طبیعت کبھی گھبرا نہ سکے گی

اے شمعِ تمنّا مری ہستی کو جلا دے
ڈوبے ہُوئے سُورج کا پتہ پا نہ سکے گی

بخشے نہ اگر پھول تو کانٹے ہی عطا کر
اُن کو بھی محبّت مری ٹھکرا نہ سکے گی

تسنیم کہا مجھ سے گلے مِل کے اجل نے
اب کوئی تمنّا تجھے رُلوا نہ سکے گی

پریم ناتھ پردیسی

سوالی

وقت۔ رات کے دس بجے۔ دسمبر کا مہینہ۔

منظر [اسٹیج پر چار مکانوں کے دروازے نظر آتے ہیں۔ چاروں بند ہیں۔ ایک نوجوان، اُس کی بیوی اور اُن کا بچّہ داخل ہوتے ہیں۔ نوجوان کے بدن پر ایک پھٹا ہُوا کُرتہ اور پاجامہ ہے۔ اس کی بیوی ایک میلا پیرہن اور شلوار پہنے ہوئی ہے۔ بچّے کے جسم پر ایک قمیض ہے۔ بچّے کا چہرہ سُرخ ہے۔ وہ تھر تھرا رہا ہے۔ غالباً اُسے بخار ہے۔ عورت اپنے آپ کو گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہی ہے۔ اُس کے سر کے بال پریشانی میں بکھرے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تینوں بہت دُور سے چل کر آئے ہیں۔ ہر طرف خاموشی ہے۔ آسمان پر تارے جھلملا رہے ہیں پہلے دروازے سے کچھ دُور مرد ٹھٹک کر اپنی بیوی اور بچّے کی طرف دیکھتا ہے۔ پس منظر میں ایک گیت سنائی دیتا ہے جسے وہ سننے کی کوشش کرتا ہے۔ گیت ہر لمحہ آہستہ آہستہ دُور چلا جاتا ہے۔ گانے والے کی دردناک تانیں ہر طرف پھیلتی ہیں]

بیوی۔ اب اور کہاں لئے لئے پھرو گے اس گھپ اندھیرے میں؟

مرد۔ جہاں زمانہ لے چلے۔ جہاں یہ خاموش دُنیا لے چلے (آہ بھر کر) جہاں ہمارا سوال ہمیں لے چلے۔ آؤ گھبراؤ نہیں۔ اس کا نام بھی دنیا ہے ـــــ وہ دیکھو سامنے دروازہ نظر آ رہا ہے۔

بیوی۔ دروازہ ـ؟ ـــ وہ ہاں۔ مگر وہ تو بند ہے؟

مرد۔ بند دروازے بھی کبھی کبھی کھلا کرتے ہیں۔ ایک دستک سے ایک سوال سے۔ آؤ ہم بھی دستک دیں۔ سوال کریں۔

بیوی۔ دستک دوگے؟ ـــ تم ـ؟

مرد۔ ہاں۔ نہ دوں؟

بیوی۔ مگر آج تک تم نے کسی دروازے پر دستک نہیں دی ہے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا ہے۔

مرد۔ اسی لئے تو آج دستک بھی دوں گا اور ہاتھ بھی پھیلاؤں گا کہ آج میں وہ نہیں جو کل تھا۔

بیوی۔ جو دیکھے گا کیا کہے گا ـ؟

مرد۔ (بے بسی میں) دیکھے، کہے۔ دُنیا نے کسے کیا نہیں دیکھا اور کیا نہیں کہا ہے۔

بیوی۔ کاش یہ دروازہ کھُل جائے۔ اور ہمیں کچھ ملے۔ ہمارے بچّے کو کچھ ملے۔

مرد۔ (اعتماد کے ساتھ) مل جائے گا۔ ضرور مل جائے گا۔ تمہیں بھی، مجھے بھی اور ہمارے بچّے کو بھی۔ ابھی انسان زندہ ہے، وہ بے پرواہ ضرور ہے مگر بے حِس نہیں۔ آؤ ہم اُسی انسان کے دروازے پر دستک دیں۔

[نوجوان مرد آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دیتا ہے۔ بیوی اور بچّہ پُر اُمید نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتے ہیں تیسری دستک پر اندر سے ایک آواز آتی ہے]

آواز۔ کون ہے ـ؟

[نوجوان اس سوال پر گھبرا اٹھتا ہے وہ اپنے آپ کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھتا ہے]

مرد۔ (گھبرا گھبرا کر) میں ہوں ـــ میں، مصیبت کا مارا ایک پناہ گزیں۔

آواز۔ پناہ گزین ـ؟ کیا چاہتے ہو؟

مرد۔ (دامن پھیلا کر) مدد ـ روٹی، کپڑا ـ پیسہ!

آواز۔ معاف کرو بابا ـ!

[مرد کے ہاتھ سے کرتے کا دامن خود بخود چھوٹ جاتا ہے۔ بیوی اور بچّے کے چہرے پر نااُمیدی چھا جاتی ہے]

مرد۔ (ان کی طرف دیکھ کر) نہیں کھُلا ـ بے پروا انسان نے اور نہیں

ہنسی (آہ کھینچ کر) اچھا ــ!

بیوی۔ اب ــ؟

مرد۔ اب کیا ــ ملک خدا تنگ نیست۔ چلو اور کہیں دیکھیں۔ سب ایک سے نہیں ہوتے۔

بچہ (تھرتھراتی آواز میں) ماں ــ بھوک ــ!

بیوی (بچے کو تھپکاتے ہوئے) میرے بچے ــ میرے لال ــ!

(تینوں آگے چلتے ہیں)

مرد (اپنے آپ سے) بھوک ــ بھوک ــ! انسان کی سب سے بڑی سیاست، سب سے بڑا ادب، جس کے لئے وہ زمین کھودتا ہے، آسمان کریدتا ہے، جنگ کرتا ہے۔ دروازے کھٹکھٹاتا ہے (ہلکا سا قہقہہ) (اپنی بیوی سے) چلتی ہو ــ؟

بیوی۔ (بچے کی طرف اشارہ کرکے) میں تو چلتی ہوں۔ مگر اس سے اب نہیں چلا جاتا۔

مرد۔ تو لاؤ میں اٹھا لوں اسے۔ (بچے کو گود میں اٹھانے کے بعد) ارے یہ تو جل رہا ہے۔ اسے بخار ہے۔

بچہ۔ پانی ــ آبا پانی ــ!

مرد۔ نا بیٹا نا۔ بخار میں پانی نہیں پیا کرتے ــ اچھا ــ؟

[بچہ چپ ہو جاتا ہے۔ مرد اسے اٹھا کر چلنے لگتا ہے۔ بیوی اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے]

بیوی۔ (دوسرے دروازے کی طرف اشارہ کرکے) دوسرا دروازہ ــ دیکھتے ہو؟

مرد۔ ہاں دوسرا دروازہ ــ مگر بند۔ شائد یہ کھل جائے۔

بیوی۔ کاش یہ کھل جائے۔

مرد۔ کھل جائے گا اگر تم دستک دو۔

بیوی۔ (گھبرا کر) میں دوں ــ یعنی میں ــ؟

مرد۔ ہاں ہاں ــ تم

بیوی۔ مگر کیوں؟

مرد۔ وہ اس لئے کہ عورت کی آواز میں سحر ہوتا ہے۔ جو دروازے تو کیا آسمانوں میں بھی سوراخ کر سکتا ہے۔

بیوی۔ مگر آج تک میں نے ......

مرد۔ تم پھر اپنے ماضی کے بھنور میں بھٹکنے لگیں جواب تمہارا نہیں۔ میرا نہیں۔ ہم میں سے کسی کا نہیں کبھی تھا مگر اب نہیں۔

بیوی۔ پھر بھی مجھے شرم آئے گی۔

مرد۔ کا ہے کی شرم ــ؟ شرم کے لائق جو کچھ ہمارے پاس تھا وہ گیا۔ اب کس بات کی شرم ــ! جاؤ ڈرو نہیں۔ کھٹکھٹاؤ دروازہ۔

بیوی۔ کیا کہوں ــ؟

مرد۔ وہی جو میں نے کہا تھا

[بیوی آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دیتی ہے۔ کوئی آواز نہیں آتی]

بیوی۔ (مڑ کر) کوئی نہیں سنتا۔

مرد۔ ایک بار اور کھٹکھٹاؤ۔

(بیوی دوسری بار دروازہ کھٹکھٹاتی ہے۔ اندر سے ایک آواز آتی ہے!

آواز۔ کون ہے ــ؟

[عورت اس سوال پر گھبرا اٹھتی ہے۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر خاوند کی طرف دیکھتی ہے۔

مرد۔ (جلد جلد) جواب دو اسے۔

بیوی (دروازے کے قریب جاکر) میں ہوں مصیبت کی ماری۔ ایک پناہ گزین۔

آواز۔ پناہ گزین ــ؟ کیا چاہتی ہے؟

بیوی۔ (گھبرا کر) روٹی۔ کپڑا۔ بیمار بچے کے لئے دوا دارو ــ!

آواز۔ معاف کرو مائی ــ!

[عورت کے چہرے کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ وہ نا امید ہو کر خاوند کی طرف دیکھتی ہے]

مرد۔ (آہ کھینچ کر) وہی ایک سا جواب ــ معاف کرو بابا۔ معاف کرو مائی (ہنستا ہے) معاف کرو (بیوی سے) آؤ ہم نے معاف کیا۔ جب انسان ہم سے معافی مانگے، تو ہمیں تنگ ظرف نہیں ہونا چاہیئے۔ آؤ آگے چلیں۔

بیوی۔ (چونک کر) آگے چلیں ــ؟

مرد۔ اور کیا کریں۔ (دونوں چلتے گئے ہیں)

بیوی۔ یہ سڑک کتنی خاموش ہے آج ــ؟ اور یہ بھائیں بھائیں کرتی

ہوئی رات جیسے سب کو نگلنے پر تلی بیٹھی ہے۔

مرد۔ شاعری کرنے لگی ہو۔؟ (زہرخند) غم انسان کو ہمیشہ بلند پائے کا فنکار بنا دیتا ہے۔ مگر جانتی ہو، غم اصل میں کیا ہے۔؟ اعتبار کی کمزوری!

بیوی۔ نہیں مجھے اب کسی پہ اعتبار نہیں رہا۔ (شدت سے) کسی پر نہیں، کسی پہ نہیں۔

مرد۔ (ہنس کر) شاید اس لئے کہ ہمارے کھٹکھٹائے ہوئے دروازے نہیں کھلے۔ مگر یقین رکھو۔ بند دروازے کھلیں گے۔ ضرور کھلیں گے۔ انہیں کھلنا ہوگا۔ آج نہیں تو کل۔ کل نہیں تو پرسوں۔ انسان اب بند دروازوں کو برداشت نہیں کرسکتا۔ وہ دیکھو تیسرا دروازہ۔ دیکھتی ہو!

بیوی۔ دیکھتی ہوں۔ مگر یہ بھی بند ہے۔ خدا جانے لوگ سرِ شام ہی سے دروازے کیوں بند کر دیتے ہیں۔؟

مرد۔ اس لئے کہ انسان ہمیشہ دوسروں سے خوف کھاتا ہے۔ جب وہ درختوں پر بسا کرتا تھا تب بھی۔ اور آج جب وہ محلوں میں رہتا ہے۔ (ہنس کر) خوف کھانا انسان کی فطرت ہے۔!

بیوی۔ مگر ہم سے کاہے کا خوف۔؟

مرد۔ اس لئے کہ ہمیں کچھ دینا نہ پڑے، اور اس کے سرمائے میں کمی نہ ہو۔

(تیسرے دروازے کے آگے رک جاتے ہیں۔ مرد بچے کو آہستہ سے زمین پر رکھتا ہے)

بیوی۔ اب کون اس دروازے پر دستک دے۔؟ تمہاری مردانگی بھی گئی، میرا سوز بھی گیا۔ اب کیا ہے جسے ہم اس دروازے کے تختوں پر آزمائیں۔

مرد۔ ایک بچہ۔ معصوم اور بیمار بچہ۔!

بیوی۔ (حیرت سے) بچہ۔؟ نہیں نہیں۔ (بچے کے اوپر اپنی باہیں پھیلا کر) ابھی اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ ابھی یہ پھول کی طرح نیا ہے۔ اسے اس بھٹی میں نہ جھونکو۔

مرد۔ ابھی اس نے کچھ نہیں دیکھا ہے مگر اب اسے بہت کچھ دیکھنا ہے۔ یہ کشمیر اب اسی کا ہے۔ اسی کا۔ اسے کودنے دو اس بھٹی میں، شاید یہی اسے کندن بنا کر اگل دے۔ (بچے سے) جاؤ بیٹا۔ اب تمہاری باری ہے۔ دیکھو زور سے نہیں کھٹکھٹانا۔ آہستہ سے۔

[بچہ بخار کی وجہ سے گر پڑتا ہے۔ ماں اسے فوراً اٹھاتی ہے]

بیوی۔ ہائے میرے خدا۔ یہ کیسے دن آگئے۔ میں کہتی ہوں اس سے دستک نہ دلاؤ۔ یہ کمزور ہے۔

مرد۔ شاید اس کی کمزوری پر کسی کو رحم آجائے (بچے سے) جاؤ بیٹا۔

[بچہ دستک دیتا ہے۔ کوئی آواز نہیں آتی۔ مڑ کر باپ کی طرف دیکھتا ہے]

مرد۔ ایک بار اور دو۔

[بچہ دوسری بار دستک دیتا ہے۔ اندر سے آواز آتی ہے]

آواز۔ کون ہے؟

بچہ (ماں کی طرف گھبرا کر دیکھتے ہوئے) کیا کہوں ماں۔؟ اپنا نام بتاؤں کیا؟

بیوی۔ (اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر) ہاہا۔ نام نہیں۔ کہہ دے ایک شرنارتھی بچہ۔!

بچہ۔ (اونچی آواز میں) ایک شرنارتھی بچہ۔!

آواز۔ کیا چاہتے ہو۔؟

بچہ (ماں کی طرف دیکھ کر) اب کیا کہوں ماں؟

بیوی۔ (خوش ہو کر) کہہ دے۔ روٹی، کپڑا، پیسے۔

آواز۔ معاف کرو بھائی۔

بچہ۔ (ماں سے) کہتے ہیں معاف کرو بھائی۔ اب کیا کہوں؟

مرد۔ آؤ میرے بچے۔ اب کچھ نہ کہو۔

[مرد تھوڑی دیر کے لئے گم صم ہو کر سوچنے لگتا ہے]

بیوی۔ کیا سوچ رہے ہو۔؟

مرد۔ کچھ بھی نہیں۔ بھٹکی ہوئی سوچوں کو سمیٹنا چاہتا ہوں مگر سمیٹ نہیں سکتا۔ (آہ بھر کر) کاش یہ سمٹ جائیں ایک تارے کے برابر اور پھر میری ویرانیوں کو روشنی بخشیں۔

بیوی۔ اب کہاں جائیں۔ کوئی ٹھور ٹھکانہ نظر نہیں آتا۔ خدا جانے یہ لوگ ہمیں روٹی کیوں نہیں دیتے، کپڑا کیوں نہیں دیتے۔؟

مرد۔ کیوں دیں؟ دینا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے۔

بیوی۔ ہمیں بھوک جو لگی ہے۔ ہم ننگے جو ہیں۔ ہمارا بچہ جو بیمار ہے

مرد۔ (ہنس کر) دینے کے لئے یہ کوئی معقول عذر نہیں۔ دیا جاتا ہے نام کے لئے، شہرت کے لئے۔ ہمارے پاس نہ نام ہے نہ شہرت۔ اب اگر کوئی

ہمیں دے تو کیوں؟ ہم اُسے بدلے میں کیا دے سکتے ہیں۔

بیوی۔ دعائیں —!

مرد۔ دُنیا اب دعاؤں کی بھوکی نہیں۔ نام کی بھوکی ہے۔ شہرت کی بھوکی ہے۔ آؤ چلیں —!

بیوی۔ اب میں چل بھی نہیں سکتی۔ میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔

مرد۔ (بے بسی میں) نہ چل سکنے کے باوجود ہمیں چلنا ہوگا۔ باقی رہے چھالے ان کا کیا ہے۔ یہ یونہی پڑتے رہتے ہیں، پھوٹتے رہتے ہیں۔ اور پھر وقت خود بخود ان پر پھاہا رکھ دیتا ہے۔ آؤ چلیں۔ (بچے سے) آؤ بیٹا میں تمہیں اٹھاؤں —!

[بادلِ ناخواستہ عورت چلنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ مرد بچے کو اٹھا کے چلتا ہے۔ آگے چل کر ایک دروازہ نظر آتا ہے۔ اندر سے گانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ مرد اور بیوی بند دروازے کے آگے رک جاتے ہیں اور ایک دُوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔]

بیوی۔ کسی امیر کا گھر ہے۔

مرد۔ لینڈ لارڈ کا گھر ہے۔ وہ تختی نہیں دیکھی۔

بیوی۔ یہاں نہ آزمائیں اپنی قسمت؟

مرد۔ (گھبرا کر) یہاں —؟ —

بیوی۔ ہاں۔ شائد یہاں سے کچھ مل جائے۔ یہی وہ گھر ہے۔ جہاں زندگی کے کچھ آثار دکھائی دے رہے ہیں۔

مرد۔ کہہ سکتے ہیں یہ زندگی ہے۔ مگر اس کے ساتھ کچھ اور بھی ہے۔ اور بہت ہے۔

بیوی۔ وہ کیا —؟

مرد۔ بے مروّتی، خود غرضی — اور انسان کا خون۔

بیوی۔ (چونک کر) انسان کا خون —؟

مرد۔ نام کی تختی پڑھ کر تمہیں کبھی نہیں آئی —؟ تعجب ہے۔ خیر چلو یونہی سہی۔

بیوی۔ مگر یہاں دستک کون دے —؟

[مرد تھوڑی دیر سوچنے کے بعد یکایک کہتا ہے۔]

مرد۔ میں بتاؤں کون دستک دے —؟ ہم تینوں۔ ایک مرد، ایک عورت اور ایک بچہ —!

بیوی۔ وہ کیوں؟

مرد۔ اس لئے کہ ایک سے تین زیادہ بھی ہوتے ہیں اور طاقت ور بھی۔ یہ اس دُنیا کا قانون ہے۔ ایک اپنی جگہ پر کچھ بھی نہیں محض ایک۔ مگر جب اس کے ساتھ اور ملتے ہیں تو ایک طاقت بن جاتے ہیں۔ چاہے وہ دو صفر ہی کیوں نہ ہوں۔ مگر ایک کو سو بنا دیتے ہیں۔ سمجھی۔

بیوی۔ تو آؤ دستک دیں۔

مرد۔ دستک تو دیں گے مگر — میرا جی نہیں چاہتا۔ دوسروں کے خون پر پلنے والے کے دل میں نہ ہمدردی ہوتی ہے نہ خیرات کا جذبہ۔ وہ صرف پردہ نشین خدا سے ڈرتے ہیں۔ مصائب میں پسے ہوئے بندوں سے نہیں۔ ان کی آنکھوں میں نشتر ہوتے ہیں۔ باتوں میں زہر اور عمل میں خون ہی خون۔ وہ تمہیں کیا دیں گے۔ مجھے کیا دیں گے۔ اس بچے کو کیا دیں گے؟

بیوی۔ ہائے تمہیں تو ساری دُنیا زہریلی نظر آتی ہے۔ مگر تم نہیں دیکھتے۔ ہمارا بچہ بخار سے پھنک رہا ہے۔ ہمیں ان کے قول و عمل سے کیا۔ ہمیں بچے کی زندگی کے لئے مدد چاہیئے۔ چاہے کوئی دے۔ خون پینے والا یا پلانے والا۔

مرد۔ (چونک کر) بچے کی زندگی کے لئے —؟ ہاں ہمیں اسے بچانا ہے۔ یہ ہمارے پاس قوم کی امانت ہے۔ ملک کی امانت ہے۔ ہم اسے بچائیں گے۔ ضرور بچائیں گے۔

[تینوں دروازے کے آگے کھڑے ہو کر دستک دیتے ہیں۔ اندر سے آواز آتی ہے۔]

آواز۔ کون ہے؟

تینوں۔ تین تباہ حال انسان۔ تین لٹے ہوئے پناہ گزین۔

آواز۔ کیا چاہتے ہو؟

تینوں۔ مدد۔ ہمدردی۔ روٹی۔ کپڑا۔ پیسہ۔

(اندر سے ایک قہقہہ سنائی دیتا ہے)

آواز۔ بڑے ظریف معلوم ہوتے ہو۔

(یک لخت دروازہ کھلتا ہے۔ ایک نوجوان سر برہنہ۔ رات کا لباس پہنے۔ منہ میں سگار دبائے باہر نکلتا ہے)

نوجوان۔ (چونک کر) اوہ — ونڈر فل۔ ایک مرد، ایک عورت ایک بچہ۔ ری الی۔ ونڈر فل — کون ہو تم؟

مرد۔ ایک انسان جو لُٹ چکا ہے۔

نوجوان (ہنس کر عورت کی طرف اشارہ کرکے) اور یہ کون ہے

مرد۔ ایک عورت ۔ جو اپنا سب کچھ کھو چکی ہے۔

نوجوان۔ خوب، خوب۔ لُٹ چکا ہے، کھو چکی ہے۔ اور پھر بھی دونوں (اچھے بھلے ہیں۔ ہنستا ہے) اور (بچے کی طرف اشارہ کرکے) یہ کون ہے؟

مرد۔ ہم دونوں کی زندگی کا حسین پھول جو بخار کی آگ میں مرجھا رہا ہے ۔ ملک اور قوم کی مقدس امانت جس کی حفاظت ہم سب کا فرض ہے۔

نوجوان (سنجیدگی سے) دیکھو میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ تمہارے ساتھ شاعری کرسکوں۔ خدا نے تمہیں بے اندازہ وقت دیا ہے۔ فرصت دی ہے مگر تمہیں دوسروں کے وقت کی قدر کرنی چاہیئے۔

مرد۔ میں نے کوئی شاعری نہیں کی، حقیقت بیان کی۔

نوجوان۔ مگر یہ کوئی حقیقت نہیں کہ تم لُٹ چکے۔ یہ سب کچھ کھو چکی اور یہ مرجھا رہا ہے۔ یہ تو پاکھنڈ ہے۔

مرد۔ (چونک کر) پاکھنڈ — ؟

نوجوان۔ بالکل۔ پیسہ بٹورنے کا نیا ڈھنگ۔

مرد۔ نہیں میں پاکھنڈ نہیں جانتا۔ ہاں زمانے نے مجھے ایک ہی ٹھوکر سے نیچے گرا دیا۔ ورنہ ہم بھی۔

نوجوان۔ ورنہ کیا — ؟ پدرم سلطان بود — (قہقہہ)

(ساہوکار کے نوکر کا داخلہ)

نوکر۔ سرکار۔ آج کُتیا دودھ نہیں پیتی۔

نوجوان۔ (حیرت زدہ ہوکر) دودھ نہیں پیتی — ؟ کیا تم اُسے انڈے بگھول دیتے تھے ساتھ میں — ؟

نوکر۔ نہیں تو سرکار — !

نوجوان۔ تو پھر کیا پیئے گی وہ بے زبان — تمہارا سر — ؟

نوکر۔ ابھی گھول کر دیتا ہوں حضور — (چلا جاتا ہے)

نوجوان۔ کم بخت کہیں کا — مذاق سمجھ رکھا ہے کُتیا کو — ! اُدھر سے ہاں تو — تمہیں چاہیئے کیا — ؟

مرد۔ جب دروازہ بند تھا ہم نے کہہ دیا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ اب کہ دروازہ کھلا ہے غالباً ہمارے کہنے کی ضرورت نہیں ہم تینوں آنکھ سوالی کی صورت میں آپ کے سامنے کھڑے ہیں۔

نوجوان۔ (تنگ آکر) پھر وہی شاعری — ؟ میں کہتا ہوں تمہیں شاعری میں باتیں کرنے کا مرض کب سے ہو گیا ہے۔ ایک تو بھیک مانگتے ہو۔ اور ادھر فلسفے چھانٹتے ہو۔

مرد۔ (گھبرا کر) بھیک — آپ ہمیں بھکاری کہتے ہیں؟ نہیں نہیں ہم بھکاری نہیں۔

نوجوان۔ بھکاری نہیں تو کیا نواب ہیں — ؟ اتنی خود داری تھی تو یہ دروازہ ہی کیوں کھٹکھٹایا تھا؛ کیوں ہم لوگوں کے چین میں خلل ڈالتے ہو — ؟ شرم بھی نہیں آتی تمہیں۔ ایک عورت اور ایک ننھے بچے کو اندھیری راتوں میں لئے لئے پھر کر ذلیل کر رہے ہو؟ خیر میں نے شرنارتھیوں کی مدد میں ایک بیان پریس کو دیا ہے۔ اس کے ساتھ میرا فوٹو بھی چھپ رہا ہے۔ جاؤ مجھے تنگ نہ کرو مجھے رفاہِ عام کے اور بھی کئی کام کرنے ہیں۔

مرد۔ (سنجیدگی سے) اس تختی کو دیکھ کر ہی میں نے عورت کی طرف اشارہ کرکے) اس سے کہا تھا کہ میرا جی یہاں دستک دینے کو نہیں چاہتا مگر بچے کی مامتا کے سبب یہ نہ مانی۔

نوجوان۔ وہ کیوں؟

مرد۔ یہ اپنے آپ سے پوچھو۔ اس تختی سے پوچھو۔ ان حرفوں سے پوچھو۔ جن کی سفیدی سے خون کی بُو آرہی ہے۔ انسان کے خون کی بُو بیگناہوں کے خون کی بُو۔ میں نے اس سے کہا تھا۔ یہ لوگ خدا سے ڈرتے ہیں مگر بندوں سے نہیں ڈرتے۔ ان کے نزدیک کُتیا انسان سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ شاید اب اپنی ضد پہ ندامت محسوس کر رہی ہے

[نوجوان ساہوکار غصّے سے لال ہو کر آگے بڑھتا ہے۔ اور مرد کے منہ پر تھپڑ مارتا ہے]

نوجوان۔ ذلیل کتّے — ! ہا تھی پہ چڑھ کر آنکھ مارتا ہے؛ تجھے کیا معلوم میری کُتیا کیا ہے۔ تجھ میں ہیں وہ گُن جو اس میں ہیں — ؟

بیوی۔ (بیچ بچاؤ کرکے) چلو ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہم بھوکا مرنا قبول کریں گے مگر کسی کے دروازے پر دستک نہیں دیں گے۔

مرد۔ (غصّے میں) کیوں؟ کیوں بھوکوں مریں گے؟ ہم زندہ رہیں گے زندہ رہنا ہمارا حق ہے۔

نوجوان۔ اب بھی چپ نہیں رہوگے۔

مرد۔ اور مارو مجھے۔ اور مارو۔ تمہاری ٹھوکریں جو زمانہ ہے مگر یاد رکھو ہمارے دن بھی آرہے ہیں، جب نہ یہ تختیاں ہونگی۔ نہ تم سے آدم خور انسان۔ اب تم آج اس لئے ہم پر قہقہے لگا رہے ہو۔ کہ کل ہم تمہارے حصے کا روز دے چکے۔ تمہارا حال اس لئے آسودہ ہے کہ ہم نے تمہارے لئے اپنا ماضی قربان کر دیا۔

نوجوان۔ (حقارت سے دروازہ بند کرتے ہوئے) جا جا، بڑا آیا ہے تیس مار خاں۔ ہمارے لئے قربان کر چکا۔ ہمارے لئے روچکا — احمق کہیں کا —!

(دروازہ بند ہو چکا ہے)

مرد۔ (بیوی سے) دیکھ لئے زندگی کے آثار اس دروازے کے اندر؟

بیوی۔ کتنا ظالم اور سنگدل تھا۔ ذرا بھی ہم پر ترس نہ آیا۔

مرد۔ کیسے ترس آتا۔ کبھی چیتے کو بھی بھیڑ پر ترس آتا ہے۔

بیوی۔ مگر اب میں اور نہ چل سکوں گی۔

مرد۔ بچہ سو گیا —؟

بیوی۔ سو گیا۔ اور شاید بخار بھی اتر گیا۔

مرد۔ تو آؤ کہاں بیٹھیں اس درخت کے نیچے۔ مگر اس کا بخار اترا کیسے؟ ذرا دیکھوں تو۔ (بچے کے بدن پر ہاتھ پھیر کر) ارے اس کا جسم بے حد ٹھنڈا ہے۔

بیوی۔ سردی لگی ہوگی —؟ مگر اب کیا ڈالیں اس کے اوپر —؟

مرد۔ (اپنا کرتہ اتارتے ہوئے) یہ لو میرا کرتہ۔ ڈال دو اس کے اوپر۔ ابھی بدن میں گرمی ہوگی۔

[درخت کے نیچے پہنچ کر دونوں زمین پر بیٹھ جاتے ہیں]

مرد۔ اسے اپنے زانو پر لٹا دو۔ اور خود بھی سو جاؤ۔

بیوی۔ کیسے سو جاؤں۔ نیند نہیں آتی۔

مرد۔ بھوکوں کو نیند نہیں آتی۔ انہیں لانی پڑتی ہے۔

بیوی۔ مگر کیسے؟

مرد۔ اپنے ماضی کا کوئی رنگین سا دن یاد کر کے۔ مثلاً جب ہمارا بھی گھر تھا۔ ساز و سامان تھا۔ باغ اور کھیت تھے۔ کپڑے لتے تھے۔ اور ہم تم عزت والے کہلاتے تھے۔ اور پھر ہماری زندگی میں ننھا سا بچہ آیا۔ جس کے ساتھ ہم صبح و شام کھیلا کرتے تھے۔ گایا بجایا کرتے تھے۔ اور ....

بیوی۔ (پھوٹ کر رو پڑتی ہے) بس، بس، اب نہیں سن سکتی۔ خدا کے لئے مجھے سب کچھ یاد نہ دلاؤ۔ میرے زخموں سے خون بہنے لگا ہے۔

مرد۔ ارے۔ میں تمہیں نیند لانے کی ترکیب بتا رہا تھا اور تم رو دیں۔ اچھا وہ دیکھو۔ وہ چاند، سفید اور نرمل — جس کی کرنیں ہر چیز پر پڑ رہی ہیں۔ اونچے محلات پر بھی اور فقیروں کی جھونپڑیوں پر بھی — چاند آہستہ آہستہ ابھرتا جا رہا ہے۔ کرنیں مسکراتی جا رہی ہیں۔ اور رات اپنی بے زبانی میں ایک میٹھا گیت گاتی ہوئی چلی جاتی ہے۔

بیوی۔ (تنگ آکر) بس، بس، میں یہ بھی نہیں دیکھ سکتی۔ جس ماں کا بچہ بھوکا سو جائے، اُسے چاند بھی میلا نظر آتا ہے۔

مرد۔ چلو ایک اور ترکیب بتاتا ہوں۔

بیوی۔ نہیں، کچھ بھی نہیں۔

مرد۔ ارے نیند آئے گی۔ اور جب جاگیں گے تو ہر طرف روشنی ہوگی — نئی روشنی —!

بیوی۔ مجھے جب بھی نیند نہیں آئے گی۔

مرد۔ تو لوری سناؤں۔

بیوی۔ نہیں۔

مرد۔ اچھا ایک کہانی سنو۔ بڑی میٹھی کہانی ہے۔ تو دیکھو وہ سامنے کیا ہے — وہ — دریا کے اُس پار —

بیوی۔ ایک محل۔

مرد۔ اور اس کے روشن دانوں سے باہر کیا آرہا ہے؟

بیوی۔ رنگا رنگ کی روشنیاں۔

مرد۔ اور کہاں پڑتی ہیں یہ —؟

بیوی۔ دریا کے پانی پر۔

مرد۔ اور دریا کیا کر رہا ہے؟

بیوی۔ بہتا چلا جا رہا ہے۔

مرد۔ شاباش۔ تو فرض کرو۔ یہ روشنی یہ رنگا رنگ کی روشنی ایک زہر ہے۔

بیوی۔ (چونک کر) زہر —؟

مرد۔ ہاں ہاں زہر ــــ جو دریا کے شفاف پانی کو زہریلا بناتی ہے۔
اور اسے دیکھکر کوئی چیختا نہیں۔ کوئی احتجاج نہیں کرتا۔ اوپر خدا بھی دیکھ رہا
ہے۔ اور نیچے انسان بھی۔ اور دونوں خاموش ہیں۔ صرف ایک آواز دریا کے
بہاؤ سے پوچھتی ہے۔ انسانیت کے شفاف پانی کو زہر آلود بنانے کا حق ان
امیروں کو کس نے دیا ۔ کیوں دیا ــ کب دیا ؟

بیوی ۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے ؟

مرد ۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ آواز گونجتی ہے جنتا بیدار ہوتی ہے۔
اُسے سنگینوں سے دبایا جاتا ہے۔ مگر جنتا نہیں دبتی۔ سنگینوں کی نوکیں
ٹوٹ جاتی ہیں۔ جنتا کی فتح ہوتی ہے۔ غلامی کی زنجیریں کٹ جاتی ہیں۔
لوٹ کھسوٹ کرنے والے دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہ جاتے ہیں۔ انسانیت
کی پیشانی کا داغ مٹ جاتا ہے۔ اور پھر نیا کشمیر پیدا ہوتا ہے۔ انسانوں کا
نیا کشمیر۔ تمہارا اور میرا کشمیر نہرو اور شیخ عبداللہ کا کشمیر!

بیوی ۔ خدا کے لئے چپ ہو جاؤ ۔ ورنہ میں مر جاؤنگی۔

مرد ۔ مرنا اتنا آسان نہیں جتنا ہم سمجھ رہے ہیں۔

بیوی (اچانک چونککر) اسے کیا ہو گیا۔ ارے یہ سانس کیوں
نہیں لیتا۔ یہ حرکت کیوں نہیں کرتا۔

[مرد لپک کر بچے کے نزدیک آجاتا ہے]

مرد ۔ کیا ہوا ــ کیا ہوا اسے (آواز دیتے ہوئے) میرے بچے
میرے لال ــــ میرے جگر کے ٹکڑے ــــ (بچے کو ہاتھوں میں اٹھاکر)
یہ حرکت بھی نہیں کرتا۔ یہ چپ ہے ــ یہ ٹھنڈا ہے۔ یہ مر گیا ــ یہ مر
گیا۔ میرا بچہ مر گیا۔

بیوی (روتی ہوئی) میرا بچہ ــ میرا لال۔ (بال نوچنے لگتی ہے)

مرد ۔ (غصے میں بچے سے) تم ــ تم مر گئے ؟ مر گئے ؟ نہیں۔ میرا
بچہ نہیں مر سکتا ــ انسان نہیں مر سکتا ــ تم روٹھ گئے ہو (عورت
کو دکھاتے ہوئے) دیکھو تو یہ مرا نہیں ــ روٹھ گیا ہے مجھ سے۔ سارے
کشمیر سے۔ مگر ہم اسے منائیں گے۔ کشمیر اسے منائے گا۔ تم دوست بنو تو ــ

(عورت بے ہوش ہو جاتی ہے)

مرد ــ بے ہوش ہو گئی۔ تاب نہیں تم میں بچے کی باتیں سُننے
کی ــ (آسمان کی طرف) دیکھو، آسمان کے ستارو ــ دیکھو
میرا بچہ مجھ سے روٹھ گیا ہے ــ میں بے گناہ ہوں۔ میں نے کسی کا دل
نہیں دکھایا (لاش اٹھا کر اُٹھتے ہوئے) دیکھو، دنیا کے امیرو دیکھو
میرے بچے کو دیکھو۔ اس کی معصوم اور ننگی لاش کو دیکھو ــ بچے
تمہارے بند دروازے کھا گئے۔ تمہاری معافیاں کھا گئیں۔
تمہارے بیانات کھا گئے ــــ دیکھو ــــ دیکھو ــــ
دُنیا کے انسانو ــــ دیکھو ــــ

(زینہ ناؤث)

کشمیر اور ہندوستان

کشمیر اور ہندوستان کا تعلق بہت قدیم ہے۔ اس تعلق میں ثقافتی یکسانیت اور معاشی اشتراک بھی شامل ہیں۔ کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور بعض معترض یہ سوال بھی کرتے ہیں کہ مسلم اکثریت والی ریاست کو پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا چاہئے اس کا صاف اور برحق جواب تو یہ ہے کہ مذہبی تعصب اور فرقہ پرستی ایسے تنگ نظریے ہیں کہ آج کی دنیا میں ان کی گنجائش ہی نہیں۔ مغربی پاکستان کی آبادی ڈھائی کروڑ ہے اور ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد چار کروڑ ہے۔ مشرقی پاکستان کا تو اس مسئلے سے تعلق ہی نہیں۔ کیوں نہ کشمیر کے ڈھائی کروڑ مسلمان ہندوستان کے مسلمانوں سے رشتہ جوڑیں۔ مسلمانوں کے مقدس مقامات ہندوستان میں ہیں۔ دہلی اور آگرہ ہندوستانی مسلم کلچر کے بہت بڑے مرکز ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان بزرگانِ دین۔ علماء اور مشائخ مشرق وسطیٰ کے ممالک میں عظمت و توقیر کے ساتھ دیکھے جاتے ہیں۔ ہم مذہب قبائلیوں نے خود کشمیری مسلمانوں پر ظلم کئے۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ایسے ہی مظالم بعد میں روا نہیں رکھے جائیں گے۔ تاریخ نے کبھی اس بات کی شہادت نہیں دی کہ ہم مذہبوں میں اختلاف اور جنگ نہیں ہو سکتی۔ کشمیر کے ہندو مسلمان روایاتی طور پر ایک دوسرے سے قریب ہیں اور مذہب کے نام پر پھیلائے جانے والے جالوں میں نہیں پھنس سکتے ۔

آجکل دہلی

رفتارِ زمانہ

کانگرس ورکنگ کمیٹی نے زبان کے مسئلے کے متعلق ریزولیوشن پاس کردیا ہے ۔ تمام ہندوستانی مسائل کے لئے ایک قومی زبان ہوگی ۔ عبوری دور کے لئے جس کی مدت پندرہ برس متعین کی گئی ہے مرکز میں بین الصوبجاتی معاملات کے لئے انگریزی زبان کا استعمال جاری رہے گا ۔ اس دوران میں قومی زبان کو اس معیار پر لے آیا جائے گا کہ وہ انگریزی کی جگہ لے لے ۔ پرائمری سکولوں میں ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہوگی ۔ بالعموم علاقے یا صوبے کی زبان کو مادری زبان سمجھا جائے گا ۔ مڈل کے درجے میں صوبائی زبان رائج کی جائیگی یونیورسٹی میں صوبائی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے گا ۔ سیکنڈری اسٹیج میں ہندوستان کی قومی زبان کو دوسری زبان کا درجہ دیا جائے گا ۔ انتظامی امور کے لئے صوبائی زبان کو استعمال میں لایا جائے گا ۔

یونائیٹڈ نیشنز کے کمیشن نے کشمیر میں عارضی صلح کے معاہدے کو عملی صورت دینے کے متعلق مجوزہ کانفرنس کے انعقاد کا خیال ترک کردیا ہے ۔ یہ کانفرنس بائیسویں اگست کو ہونا قرار پائی تھی حکومت ہند اور حکومت پاکستان نے سمجھوتے کے متعلق اپنے اپنے زاویہ ہائے نگاہ پر زور دیا ہے جس سے عملی طور پر بات چیت میں ایک ڈیڈلاک پیدا ہوگیا ہے ۔

یہ صورت حالات دیکھ کر امریکہ کے پردھان مسٹر ٹرومین اور ان کے بعد برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر ایٹلی نے پنڈت جواہر لال نہرو اور خان لیاقت علی خاں سے اپیل کی ہے کہ وہ کشمیر کے مسئلے کو جلد از جلد سلجھانے کی کوشش کریں کیونکہ انہیں اندیشہ ہے کہ کشمیر میں بدامنی کے نتائج نہایت دور رس ہونگے ۔

حکومت ہند نے حکومت بھوٹان کے ساتھ دائمی امن اور مستقل دوستی کا ایک نیا معاہدہ کرلیا ہے ۔ اس معاہدے پر سکم کے پولیٹیکل آفیسر اور بھوٹان ڈیلیگیشن نے دستخط کر دئے ہیں ۔

شری آر ۔ کے پاٹل کمشنر برائے افزائش خوراک نے ناگپور میں کانگریس کارکنوں کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے ان سے اپیل کی کہ وہ خوراک کی پیداوار بڑھانے کی تجویز کو عملی شکل دینے میں حکومت سے تعاون کریں ۔ تاکہ کاشتکاری کو وسیع پیمانہ پر بڑھایا جائے ۔ گھاس پات سے اٹی ہوئی زمینوں کو ٹریکٹروں کے ذریعہ پھر سے زیر کاشت لایا جائے ۔ آبپاشی کو بڑھا کر اور نقد روپیہ دینے والی فصلوں کے رقبوں کو خوراک کی فصلیں پیدا کرنے والے رقبوں میں تبدیل کر دیا جائے ۔ زاید پیداوار والے علاقوں پر بڑی ذمہ داری ہے ۔ انہیں اپنی پیداوار کو اور زیادہ بڑھانا چاہئے کیونکہ ان کی پیداوار میں اضافہ پر ہی قلت خوراک والے صوبوں کی قسمت کا انحصار ہے ۔ کانگریس کارکنوں کو چاہئے ۔ کہ وہ دور دراز دیہات میں چلے جائیں اور وہاں کے لوگوں کو خوراک کے مسئلہ سے خبردار کرکے ملک کی اس مشکل کو دور کرنے کے لئے ان میں جوش پیدا کریں ۔

چین کے ایک قوم پرست فوجی ترجمان نے اس افواہ کی تصدیق کر دی ہے کہ صوبہ ہونن کی راجدھانی چنگشا پر کمیونسٹوں نے قبضہ کر لیا ہے ۔

مارشل ٹیٹو نے ایک بیان میں کہا ہے کہ اگرچہ یوگوسلاویہ مضبوطی سے سوشلزم کے عقیدوں پر قائم ہے لیکن اس کے اشتراکی پروگرام کی تکمیل میں اگر کوئی باہر سے دخل دے گا تو یوگوسلاویہ اسے اپنا دشمن سمجھے گا خواہ وہ کوئی ہی کیوں نہ ہو ۔ اس افواہ پر تبصرہ کرتے ہوئے سرخ فوج یوگوسلاویہ پر حملہ کرنے کے لئے تیار کھڑی ہے ۔ آپ نے کہا کہ یہ ایک ناممکن بات ہے کیونکہ اس کا نتیجہ فقط یہی ہوگا کہ دنیا میں سوشلزم کا خاتمہ ہو جائے ۔

میجر جنرل انیس احمد خان پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جو
ہندوستانی فوج میں میجر جنرل مقرر ہوئے ہیں۔

Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D.—21.
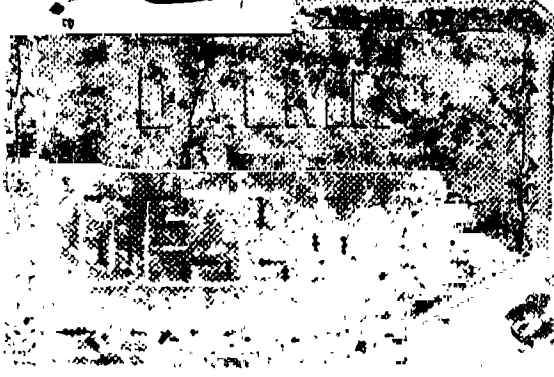
۲۵ سے ۲۸ ستمبر تک سری نگر میں جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ہندوستان کے پردھان منتری پنڈت جواہر لال نہرو اجلاس کا افتتاح فرما رہے ہیں۔

ہر مہینے کی پہلی اور پندرھویں تاریخ کو شائع ہونے والا

مصوّر رسالہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:-

جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:-

عرش ملسیانی

جگن ناتھ آزاد

بلونت سنگھ

جلد ۸ ———— نمبر ۸

سالانہ چندہ ———— نو روپے

فی پرچہ ———— چھ آنے

ترتیب

۱۵ اکتوبر ۱۹۴۹ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

احمد ندیم

غزل

بن ہو، ابر ہو، تیز ہوا ہو
تیرے حُسن کا دیا جلا ہو

پَو بھی پھٹی، طوفان بھی اُٹھا
اب کوئی کیا جانے کیا ہو

آج کی کلیاں کب چٹکیں گی
شاید مستقبل کو پتا ہو

چاند بھی ساکن، وقت بھی ساکن
شاید تُو کچھ سوچ رہا ہو

پت جھڑ میں کیوں پھول نہ ڈھونڈے
جس نے تجھے کھو کر پایا ہو

جگ کو سپنا کہنے والو!
اس سپنے میں کیا اپنا ہو

بیلیں سی بل کھاتی ہیں — جب
کوئی سہارا ٹوٹ چلا ہو

تو نے یوں شرما کر دیکھا
جیسے تھک کر دیا بجھا ہو

وقتِ سحر یُوں کلیاں چٹکیں
جیسے تیرا نام لیا ہو

انساں کا معیار یہی ہے
خوب دُکھی ہو، خوب اچّھا ہو

تُو کہتا ہے تارا ٹوٹا
اور اگر آنسو ٹپکا ہوا

دِئے بجھے ہیں، پھول کھلے ہیں
شاید یہ شہراہِ صبا ہو

(غیر مطبوعہ)

مجنوں گورکھپوری

پردیسی کے خطوط

پیاری ناہید

غالب کا ایک شعر ہے

اگر بہ دل نہ خلد انچہ از نظر گذرد
زہے روانی عمرے کہ در سفر گذرد

لیکن غالب سے بہت پہلے ایک پرانی کہاوت سفر کو سقر بتاتی ہے۔ کہاوت بھی صحیح ہے اور غالب کا خیال بھی غلط نہیں۔ مواقع اور طبائع پر سب کچھ منحصر ہے۔ میں مسافر کا مزاج لے کر پیدا ہوا تھا اور مجھے جو سفر میں لذت ملی وہ حضر میں کبھی نہیں ملی۔ یہاں لذت سے مراد آرام یا راحت نہیں ہے کسی زمانے میں میرے احباب مجھے "نظیر اکبرآبادی کا بنجارہ" کہا کرتے تھے جو گھریلو زندگی کے لئے نہ بنا ہو بلکہ جس کا مقدر خانہ بدوشی ہو۔ اور میں نے کبھی اپنے احباب کی رائے سے اختلاف نہیں کیا مجھے یقیناً مسافرت سے زیادہ موانست تھی۔ سفر کو میں نے ہمیشہ زندگی کی تمثیل سمجھا۔ اقبال کا ایک شعر ہے

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

خود میرا ایک شعر تھا

سکوں سے کام نہیں ماندگی کا نام نہیں
مرے سفر میں کہیں منزل و مقام نہیں

یہ محض شعر نہیں ہے بلکہ اپنا اصلی مزاج ہے "ذوق سفر" میرے خمیر میں ہے۔ اقبال ہی کا ایک شعر اکثر میری زبان پر رہتا ہے جو نہ صرف میری طبیعت کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ انسانی فطرت کا بہت صحیح اظہار ہے:۔

چہ کنم کہ فطرت من بہ مقام در نہ سازد
دل ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے

میری عمر عزیز کا کافی حصہ سفر میں بسر ہوا لیکن جہاں کہیں جو کچھ میری نظر سے گذرا میں نے اس کو اپنے دل کی خلش نہیں ہونے دیا۔ میں نے کبھی کسی چیز یا کسی شخص کو بھر نظر نہیں دیکھا مگر واہ ری قسمت نگاہ جمی بھی تو کب اور کس پہ! تم پر اور وہ بھی اس وقت جبکہ میری زندگی کا سفر ختم ہونے والا ہے۔ ناہید یہ خیال میرے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہا ہے کہ تم نے میری راہ کھوٹی کی اور مجھے اس قابل نہیں رکھا کہ میں آگے بڑھ کر اپنی آخری منزل پر پہنچتا اور اپنے کاندھے سے بار سفر اتار کر اطمینان کا سانس لیتا۔ میں اس "حرف نازک" کی زیادہ تشریح کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن اتنا مجھے کہہ لینے ہی دو کہ تم نے اچانک راستے میں ڈاکہ ڈالا اور مجھے بری طرح غارت کیا اور مجھے زخموں سے چور کر کے چھوڑ دیا۔ خیر!

لیکن سفر کو جو سقر بتایا گیا ہے وہ بھی صحیح ہے مثل نہ جانے کتنی پرانی ہے مگر جس طرح وہ آج سچ ہے شاید اس زمانے میں بھی نہ سچ رہی ہو جبکہ وہ پہلے پہل کہی گئی تھی۔ گذشتہ آٹھ نو سال کے اندر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ساری دنیا نے اپنے اندر یہ ذوق سفر پیدا کر لیا ہے۔ اب جس کو دیکھو گھر سے زیادہ سفر میں گزار رہا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان سے سستی اور کاہلی دور ہو رہی ہے اور وہ زندگی کو دوا دوش سمجھنے لگا ہے۔ یہ اچھی علامت ہے حرکت و عمل اور سعی و محنت کا یہ ذوق انسانی زندگی کی بہت سی عفونتوں کو دور کر دے گا۔ یہ سچ ہے کہ اس وقت یہ ساری سعی و محنت اور سارا ولولۂ سفر طبقاتی پیکار میں اور ذاتی اغراض و مقاصد کے لئے صرف ہو رہا ہے اور ہر طرف نفسی نفسی کا عالم ہے۔

لیکن میں اس کو ایک قسم کی حرکت مذبوحی سمجھتا ہوں زندگی

کا ایک نظام مٹا چاہتا ہے اور اس سے بہتر اور اس سے زیادہ توانا نظام اس کی جگہ لینا چاہتا ہے ۔ دم توڑتی ہوئی پرانی معاشرت اپنے کو باقی رکھنے کی آخری سکراتی کوششیں کر رہی ہے ۔ اس سے ساری زندگی میں ایک تشنج پیدا ہو گیا ہے ۔ مگر یہ حالت عبوری اور عارضی ہے جس سے ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں ہے ۔ ممکن ہے کچھ دنوں تک یہ تشنجی حالت بد سے بدتر ہوتی جائے ۔ یہ تو ہونا ہے ۔ اس کا رونا عبث ہے ۔ میں تو قریب یا دور کے اس مستقبل کا تصور کرنا چاہتا ہوں جس کی طرف انسانی تواریخ کو بڑھنا ہے ۔ اور جس کی طرف وہ بڑھتی نظر آ رہی ہے جبکہ مفلس اور منعم کا یہ اختلاف اور تصادم باقی نہیں رہیگا جبکہ مفلس اور منعم دونوں الفاظ لغت میں باقی ہونگے جس طرح کہ سمندر راور موسیقا یا میمتھ اور ماستوروں کے الفاظ باقی ہیں ۔ اس وقت کیا ہو گا ؟

اس وقت انسان کی لطیف ترین تخلیقی قوتیں آزاد ہو جائیں گی اور اس کی اعلےٰ جسمانی اور ذہنی توانائیاں صحیح اور خاطر خواہ تربیت پا کر عام انسانی فلاح و بہبود اور ہمہ گیر آزادی اور ترقی میں کام آئیں گی ۔ اس وقت انسان کو فرد اور جماعت دونوں حیثیتوں سے زندگی کی تربیت اور ترقی کے بہترین مواقع مہیا ہونگے اور وہ اس قابل ہو گا کہ احساس و فکر ، ذوق و نظر اور سعی و عمل کی بالغ اور رچی ہوئی قوتوں کو عام انسانی اور اس سے بھی بڑھ کر آفاقی زندگی کی تہذیب و ترقی میں صرف کرے اور اس طرح اس کے اصلی مقدر کی تکمیل ہو ۔ لیکن یہ کب ہو گا ؟ جبکہ پھر پیٹ روٹی کا سب کے لئے انتظام ہو جائے گا ۔ اور کسی کو کل کی روٹی کپڑے کے لئے آج تردد نہیں کرنا پڑے گا ۔ ناہید پیٹ کی مار زندگی کی سب سے زیادہ گندی مار ہے ۔ ہم کو اپنی زندگی سے اس گندگی کو دور کرنا ہے ۔ پھر ہماری یہی دنیا سب سے زیادہ پاک اور مقدس دنیا ہوگی ۔ میرا ایک شعر سنو

فطرت انساں کو ہو لینے تو دو آزاد ابھی
پھر یہ دنیا مرکز مہر و وفا ہو جائے گی

بہرحال میں اس خیال سے خوش ہوں کہ اب قیام سے زیادہ حرکت حضر سے زیادہ سفر کے امکانات زندگی میں پیدا ہو رہے ہیں ۔ اس وقت یہ صورت حال کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو مگر میں اس کو ایک خوش آیند پیش خیمہ سمجھتا ہوں ۔ اب دیس پردیس کا جھگڑا ختم ہونے والا ہے ۔ اب ہم پر یہ حقیقت روشن ہو رہی ہے کہ آدمی کو صرف یا آرام اقامتگاہوں کی ضرورت ہے ، مستقل گھر اور اثاثے کی ضرورت نہیں ہے ۔ زندگی سکونت کا نام نہیں ہے ۔ زندگی تو مسلسل سفر ہے جس میں ہم کو جا بجا بسیرا لیتے رہنا ہے ۔ ایک بہت پرانا شعر ہے :-

آج دنیا میں ہیں کل روح کرے گی پرواز
یہ سکونت تو نہ ٹھہری یہ بسیرا ٹھہرا

جسم اور روح کے دقیانوسی تصور سے بر طرف ہو کر شعر ہمارے بڑے کام کا ہے ۔ شاعر ہمارے اندر عبرت پیدا کر کے دنیا سے ہمارا دل اچاٹ کرنا چاہتا ہے ۔ لیکن ہم اس سے بالکل دوسرا اثر بھی قبول کر سکتے ہیں " یہ سکونت تو نہ ٹھہری یہ بسیرا ٹھہرا " تو کیا برا ہوا ؟ ہم کو بسیرے ہی کی تو ضرورت ہے ۔ سکونت کی آرزو تو املاک پرستی کا ایک بدلا ہوا روپ ہے ۔ گھر کا ارمان اور اپنے گھر کے ساتھ وہ غلامانہ انس جو ہم ہندوستانیوں کو عام طور سے ہوا کرتا ہے ، سامنتی تہذیب کی ایک نہایت ادنےٰ یادگار ہے ۔ ایک چوتھائی صدی سے کچھ اوپر ہوئے کہ اقبال نے اس کو کچھ محسوس کیا تھا ، اور شاعرانہ اشاروں میں ہم کو سمجھانا چاہا تھا ۔ یہ دو شعر شاید تم کو بھی یاد ہوں :-

اے رہین خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگ رحیل
تازہ ویرانے کی سودائے محبت کو تلاش
اور آبادی میں تو زنجیری کشت و نخیل

یہ یقیناً ترقی پسند تصورات ہیں یہ ملکیت کے خلاف پہلا نعرہ ہے ۔ اقبال کا خیال آتے ہی میری طبیعت کچھ افسردہ ہو جاتی ہے ۔ ایسی کائناتی بصیرت اور ایسی آفاقی فکر رکھنے والی شخصیت اس قدر کم نظر اور تنگ خیال ہو کر رہ گئی ۔ مگر اس پر پھر کبھی تم سے باتیں کرونگا اگر فرصت ملی اور دماغ نے کام کیا ۔

بات میں بات نکلتی آئی اور سلسلہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا ۔ کہہ یہ رہا تھا کہ آج کل سفر اور سقر کی صورت واقعی ایک ہے ۔ خاص کر ہمارے ملک میں ۔ اس لئے کہ سفر کے لئے جن سہولتوں

اور راحتوں کی ضرورت ہے اور جو آزاد اور مہذب ملکوں میں عام طور سے مہیا ہیں وہ ہمارا ملک باوجود ادعائے آزادی نہیں پیدا کر سکا ہے خیال کرو۔ میں سہ پہر کو پانچ بجے گھر سے روانہ ہوا۔ حسب دستور مارے ڈر کے اوّل درجے کا ٹکٹ خریدا اور گاڑی میں بیٹھا۔ تم جانتی ہو کہ میں اکثر اول درجے کا ٹکٹ خریدتا ہوں اس لئے کہ مجھے اپنی مٹھی بھر ہڈی اور چمڑے کی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔ ورنہ کہاں اول درجے کا تصور اور کہاں وہ شخص جس کی زندگی اپنی تمام شہرت اور ساکھ کے باوجود ایک مستقل نقادی ہو۔ یہ محنت اور دولت کی اس غلط تنظیم کا نتیجہ ہے، جس کی ساری دنیا شکار ہے۔ بہرحال اتنی احتیاط اور اتنے صرفے کے باوجود ساری رات مجھے بیٹھا ہی رہنا پڑا۔ نہ گاڑی میں پاؤں پھیلا کر بیٹھنے کی نوبت آئی اور نہ مسافر خانے ہی میں کمر سیدھی کرنے کا موقع ملا۔

رات اب ختم ہو رہی ہے۔ صبح کے تین بجا چاہتے ہیں۔ میں پھر ٹرین میں ہوں، ایکے ڈبہ بالکل خالی ہے۔ پولیس والا ابھی آگاہ کر گیا ہے کہ ذرا ہوشیار سوئیے گا اس جوار میں اکثر ٹرینوں میں چوریاں ہو جاتی ہیں۔ میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ اب میں کیا سوؤں گا۔ دو ڈھائی گھنٹے سفر کے اور ہیں۔ دماغ کی ساری رگیں تنی ہوئی ہیں۔ سر میں ایسا درد ہو رہا ہے جیسے درد سر ہی میری ساری ہستی ہو گئی ہو۔ ایسے وقت اور ایسی حالت میں تم نہ یاد آؤ تو کیا ہو۔ ناامیدی میں غور کرتا ہوں تو تمہارے ساتھ میری یہ نرالے انداز کی شیفتگی ایک قسم کی رمزیت معلوم ہوتی ہے۔ تم میری زندگی میں ایک استعارہ یا تمثیل ہو۔ تم میرے لئے اس راحت اور آرام، اس آزادی اور فراغت اس سکون اور اطمینان مختصر یہ کہ دنیا کی اُن تمام نعمتوں اور زندگی کی تمام برکتوں کی علامت ہو جن سے میں محروم رہ گیا۔ اس لئے اندیشہ ہے کہ تمہارے ساتھ میری یہ تخیلی وابستگی میرے حق میں زیادہ خطرناک ثابت ہوگی۔

غرضیکہ تم مجھے اس وقت بری طرح یاد آ رہی ہو۔ اور آج میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ تم سے ملنا تو جیسا ہوتا ہے معلوم ہے۔ البتہ خط لکھ لکھ کر دل کو تسکین دیا کرتا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ مدت سے میرا پڑھنا لکھنا جو میری زندگی کا واحد مقصد اور مشغلہ تھا بہت کم ہو گیا ہے۔ لوگ مجھ سے توقع لگائے اور مجھ سے فرمائشیں کرتے رہتے ہیں کہ میں کچھ کہوں۔ لیکن میں عموماً سب کے جواب میں خاموش رہتا ہوں۔ میری تخلیقی قوت مری تو نہیں ہے لیکن خواب کی طرف ضرور مائل ہے۔ جب سے ملک کو آزادی ملی ہے میں نے صرف ایک مضمون لکھا ہے اور اس کو بھی ڈیڑھ سال ہو گئے۔ یہ بھی اپنی جگہ پر ایک اشارہ ہے۔ ادبی دنیا اب یہ فیصلہ کرنے والی ہے کہ یا تو مجھے مجبور کر کے لکھنے پر آمادہ کرے یا مجھے عاق کر دے۔ مجھے اس کی کچھ زیادہ پروا نہیں۔ میں ذہنی بیماری کی اس منزل پر پہنچ گیا ہوں جس کو قدما کی اصطلاح اور لغت میں بے نیازی کہتے ہیں۔ لیکن جس شخص نے زندگی اور ادب کی نئی نسل کو نئے اشارے دئے ہوں جس نے نئی قدروں اور نئے امکانات کا احساس عام کیا ہو۔ جس نے زندگی کی بڑھتی ہوئی رو کو نئی سمتوں سے مانوس کرنے میں کبھی اس ولولے کے ساتھ حصہ لیا ہو وہ اس طرح مجہول ہو کر رہ جائے کہ اس پر مردے کا گمان ہونے لگے یہ عبرت کی بات ضرور ہے۔ اس لئے اب میں نے یہ طے کیا ہے کہ اپنی ساری تخلیقی آنچ تمہاری نذر کر دونگا اور ہر خط میں کچھ ایسی باتیں لکھوں گا جن کا تعلق عام انسانی زندگی سے ہو۔ تم اکثر مجھ سے سوالات کرتی بھی رہتی ہو اور زندگی کے پیچ در پیچ مسائل پر میرے خیالات دریافت کرنا چاہتی ہو۔ میں نے تمہارے سوالات کے جواب اکثر دینا چاہے لیکن برا ہو اس نیستی کا جو آج کل مجھ پر چھائی رہتی ہے۔ مگر اب میرا یہ فیصلہ ہے کہ تم کو جو خط لکھوں گا اس میں ذاتی المناکیوں کی داستان کم ہوگی۔ اس کی ابتدا آج ہی سے کر رہا ہوں۔ اور آج میں تمہارے سامنے ایک ایسے شخص کی سیرت اور زندگی کی داستان پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جس کو میں انسانی محبت اور حریت کی تمثیلوں میں شمار کرتا ہوں۔ تم نے فرانس کے مشہور ادیب وکٹر ہیوگو کا نام تو سنا ہوگا۔ بہت ممکن ہے اس کے بعض ادبی کارناموں سے بھی واقف ہو کم سے کم "مصیبت زدوں کی داستان" اس نے لکھی ہے اس سے تو واقف ہی ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ انیسویں صدی کے دل اور دماغ ابراہیم لنکن اور وکٹر ہیوگو ہوئے تھے۔ ڈکنس کی طرح ہیوگو کی آواز بھی براہ راست دل ہی پر اثر کرتی ہے مصیبت اور غم کے ساتھ احساس یگانگی اور ہمدردی ہیوگو کے خمیر

میں تھی۔ اس کی تحریریں اور ملفوظات پڑھ کر ہمارے اندر بھی ہی انسانی احساس پیدا ہوتا ہے۔ جو ڈکنس کے ناول پڑھنے سے ہوتا ہے۔ وکٹر ہیوگو ہمارے دلوں میں اُن بدنصیبوں کے ساتھ ایک شدید جذبۂ الفت پیدا کر دیتا ہے، جو موجودہ اجتماعی نظام کی غلطیوں کی وجہ سے زندگی کے حقوق سے محروم رہ گئے اور جو اس برکتوں سے معمور دنیا کو "دار المحن" سمجھنے کے لئے مجبور ہو گئے۔

وکٹر ہیوگو محض شاعر اور ناول نگار نہیں تھا وہ انسانیت کے سورماؤں میں سے تھا اور عام بنی نوع انسان کے لئے اپنے دل میں ایک سرفروشانہ خروش محبت رکھتا تھا۔ اسی آفاقی جذبے اسی انسانی ولولے کے لئے تریسٹھ سال کی عمر میں اس کو جلا وطن ہونا پڑا۔ نپولین ادلیٰ نے اس کو پیرس سے نکال دیا۔ لیکن یہ مرد آفاقی دنیا کو اپنا وطن اور دنیا کے باشندوں کو اپنا ہموطن سمجھتا رہا ابراہیم لنکن کے قتل پر اس نے جو خط لکھا ہے وہ "میرے ہموطن دنیا" ہی کے نام ہے اور خط کے آخر میں دستخط کی جگہ "انسانی جمہوریت کا ایک فدائی باشندہ" ہی درج ہے۔

ہیوگو کی زندگی ہمارے لئے بڑی سبق آموز ہے۔ اس کا مطالعہ ہمارے لئے ایک نئی بصیرت ہے۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ جمہوریت کے اس جانباز شیدائی کی تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی اس میں شاہنشاہی کا احترام ایمان کی طرح فرض سمجھا جاتا تھا۔ اور سن شعور کو پہنچنے کے بعد کافی مدت تک ہیوگو فرانس کے شاہنشاہوں کے مقدس جلال کا قائل رہا۔ شاہنشاہی کا یہ احترام اس کو ماں کی طرف سے ملا تھا۔

ذہنی آشفتگی اور جسمانی آوارگی بچپن سے ہیوگو کے مقدر میں تھی۔ ماں باپ کی بے عنوان اور ناہموار زندگی بچے پر کہاں تک اثر ڈال سکتی ہے؟ اس کی ایک مثال ہیوگو ہے۔ ہیوگو کا باپ نپولین کی فوج میں ایک جنرل تھا۔ اور اس کی زندگی کچھ بے آہنگ تھی۔ ہیوگو نے آنکھ کھولتے ہی اپنے گھر میں تصادم اور پیکار کو منڈلاتے دیکھا۔ ماں اور باپ دونوں ایک دوسرے سے بدگمان رہا کرتے تھے۔ روٹھنا اور میل کرنا میل کرنا اور پھر لڑنا گھر کا روزانہ نصاب تھا جنرل ہیوگو کے پاس اجنبی عورتیں اور مادام ہیوگو کے پاس اجنبی مرد۔ یہ روز کا تماشہ تھا۔

وکٹر ہیوگو ماں اور باپ دونوں سے شدید محبت رکھتا تھا۔ اور اس کی سب سے بڑی مشکل یہی تھی کہ وہ ان میں کسی ایک سے بھی بے تعلق نہیں رہ سکتا تھا۔ جنرل ہیوگو اور مادام ہیوگو کے اس خانگی نفاق کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بچے کی تعلیم و تربیت کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جا سکی۔ تعلیم کے لئے وکٹر ہیوگو خانہ بدوش کی طرح مارا مارا پھرا کیا اور اس کی تعلیم ادھوری اور بے ضابطہ رہ گئی۔ وہ ہر مسئلے اور ہر موضوع کے متعلق کچھ نہ کچھ جانتا تھا لیکن کافی علم کسی ایک موضوع کے بارے میں بھی نہیں تھا۔

علم کی جستجو میں تیرہ[13] سال کی عمر تک وہ مدرسے مدرسے مارا مارا پھرتا رہا۔ تیرہ سال کی عمر میں اس کو ایک نئی دنیا ملی یہ ورجل کی شاعری تھی۔ اس نے اس عمر میں ورجل کی کئی مرغزاری نظموں کے ترجمے کر ڈالے۔ جس کے صلے میں اس کو اپنے اُستاد کے بید کھانا پڑے۔ اُستاد نے بھی ان نظموں کے ترجمے کئے تھے۔ شاگرد کی یہ گستاخی وہ کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ ہیوگو نے آنسو پونچھ ڈالے لیکن اس کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ کچھ ہی دن کے بعد اسکول کے ایک مقابلے میں اس نے ایک نظم لکھ کر پیش کی اور اول انعام حاصل کیا۔ پھر تو پے بہ پے ایک رزمیہ۔ ایک ناٹک اور ایک ناول لکھ ڈالا۔ اس کے استاد اس کو "سنجیدہ بچّہ" کہا کرتے تھے۔

اور یہ "سنجیدہ بچہ" وقت سے پہلے بالغ ہو رہا تھا۔ صرف ادبی ذوق میں نہیں بلکہ محبت میں بھی مشکل سے جنسی بلوغ کو پہنچا تھا کہ وہ آدیل کو دیوانوں کی طرح چاہنے لگا۔ آدیل اس سے عمر میں ایک سال چھوٹی تھی۔ سترہ سال کی عمر میں وہ آدیل سے منسوب ہو گیا۔ ایک دن اس نے آدیل کو اپنی محبت کے ابتدائی دور کی یاد ان الفاظ میں دلائی تھی "آدیل کچھ تم کو بھی یاد ہے۔ اپریل ۱۸۱۹ء کی چھبیسویں[۲۶] تاریخ تھی جبکہ میں شام کو تمہارے قدموں سے لگا بیٹھا تھا۔ اور تم نے مجھ سے کہا تھا کہ آج اپنی زندگی کا سب سے بڑا راز مجھ سے بتا دو اور تب میں نے کانپتے ہوئے اقرار کیا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور

میری آدیل تمہارا جواب پاکر میرے اندر ضمیر کی سی ہمت پیدا ہو گئی تھی"۔

دو سال بعد دونوں کی شادی ہو گئی۔ کیسی حسین تخیل تھی احساس کی تکمیل کس خوش آہنگی کے ساتھ ہوئی! کیسا دلکش خواب تھا اور کیسی بامراد تعبیر! حصول آرزو کی اس سے زیادہ کامیاب مثال اور دو چاہنے والوں کا اس سے زیادہ پیارا جوڑا مشکل ہی سے تصور میں آسکتا ہے۔ لیکن ناہید امرت بغیر زہر کے دنیا میں نہیں پیدا ہوا اس کو بڈھوں کی بڈھی زبان میں سننا ہو تو یوں سنو:-

"ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثل قلقل مینا"

لیکن ہم کو اپنی جگہ یہ سمجھ لینا ہے کہ ہنسنا اور رونا دونوں زندگی کی صحت اور ترقی کے لازمی عناصر ہیں تم یہ سمجھتی ہو گی کہ ہیوگو کی آیندہ زندگی یکسر عیش و وصال تھی۔ نہیں۔ اس کی زندگی میں ہجر سے بھی زیادہ اذیت تھی۔ عین شادی کی دعوت کے دن اس کا المیہ شروع ہو جاتا ہے اسی لئے میرا خیال ہے کہ محبت اپنی فطرت ہی کے اعتبار سے المیہ ہے اور شادی اس کو المیہ ہونے سے نہیں بچا سکتی بلکہ جو محبت المیہ نہ ہوتی ہو اس کو شادی المیہ بنا دیتی ہے۔ ذرا سوچو شادی کا گھر ہے تقریب کا ہنگامہ اپنے عروج پر ہے مہمان کھچا کھچ بھرے ہیں۔ دولھا شاد دلہن بامراد۔ یکایک مجمع کو چیرتا ہوا ایک شخص ہاتھ میں تبر لئے ہوئے دولھا کی طرف لپکتا ہے اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں اور اس کی نگاہ دولھا پر جمی ہوئی ہے۔ بڑی مشکل سے لوگ اس پاگل پر قابو پاتے ہیں۔ اور دولھا شہید ہونے سے بال بال بچ جاتا ہے۔ یہ پاگل کون ہے؟ یہ وکٹر ہیوگو کا بڑا بھائی یوزین ہے۔ مدت سے وہ بھی آدیل کی محبت میں دیوانہ ہو رہا تھا اور آدیل کے ساتھ شادی کی آرزو کو وہ اپنے دل کے خون سے پرورش کر رہا تھا۔ آج رقابت کے جذبے نے اس کو واقعی پاگل کر دیا۔ اور وہ آدیل کے پیچھے بھائی کا خون بہانے پر آمادہ ہو گیا۔ یہ وکٹر ہیوگو کے لئے کامیاب محبت کی تلخی کا پہلا احساس تھا جو کبھی اس کے دل سے پھر گیا نہیں۔

یہ طوفانی منظر ہیوگو کی آئندہ طوفانی زندگی کا پیش خیمہ تھا۔ اس کے بعد ہیوگو کی دنیا میں مختلف سمتوں سے ہوا کے جھونکے آتے رہے اور ہر جھونکا اپنے ساتھ تازہ حادثہ لایا۔ ہیوگو کی زندگی میں یہاں سے غم اور خوشی کے پیمانے کچھ برابر رہے۔ ایک بچے کا پیدا ہونا پھر اس کا مرجانا۔ نظموں کی ایک جلد کی عام مقبولیت اور خواص و عوام دونوں کی طرف سے تعریف کی بوچھاڑ (لیجن آف آنر)۔ اعزازی تمغہ۔ ماں کی موت اور پھر سب سے زیادہ محبوب دوست کی طرف سے دھوکا۔ یہ ہیں وہ سانحات جس نے ہیوگو کی زندگی کو ایک مسلسل آشوب بنا دیا۔ اس کے سب سے زیادہ عزیز دوست اور فرانس کے ممتاز ادیب اور نقاد سانت بیرو نے اس کے ساتھ دغا کی۔ اس نے اس کی معصوم اور چہیتی بیوی کو بہکانے کی کوشش کی اگرچہ کامیاب نہیں ہوا۔

اپنے دل میں یہ تلخ احساس لئے ہوئے اس نے اپنی مشہور تمثیل "ہیرنانی" کو پہلی مرتبہ پیش ہوتے ہوئے دیکھا۔ یہ ایک نہایت اہم اور فیصلہ کن موقع تھا۔ ہیوگو کا یہ غیر روایتی ڈرامہ رومانیوں اور کلاسیکیوں کے درمیان لڑائی کا آغاز تھا۔ ہیوگو نے مخالف کو بڑی بیباکی کے ساتھ کھلم کھلا دعوت نبرد دی تھی۔ اب نئی زندگی کے شعلوں اور پرانی زندگی کی خاکستر کا مقابلہ تھا۔ خود اس کا کہنا ہے کہ اس تمثیل میں میں نے تمام نظریوں تمام عروضی بندشوں اور تمام مروجہ آئین کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دئے ہیں۔ حسن کے چہرے پر قدامت کا جو غازہ لگا ہوا ہے میں اس کو نوچ کے پھینک رہا ہوں۔ آج سے نہ قواعد و ضوابط ہونگے۔ نہ نمونے .....

ہیوگو رومانی تحریک کا جو مردہ روایت پرستی کے خلاف پہلی بغاوت تھی۔ صدر۔ اس کا آمر۔ اس کا شاہنشاہ۔ اس کا کاہن اعلیٰ۔ اس کا الہامی شاعر۔ اس کا پیغمبر۔ اس کا خدا غرضکہ اس کا سب کچھ تھا۔ اس کا ڈرامہ "ہرنانی" گویا رومانیت کا پہلا صحیفہ آسمانی تھا رومانیت کی فتح کا یہ پہلا اعلان تھا۔ ہر طرف سے واہ واہ ہو رہی تھی۔ ہال میں حاضرین کی نگاہیں رومان کے اس نئے حکمران پر جمی ہوئی تھیں لیکن خود ہیوگو کو اپنی تعریف کے اس ہنگامے کا مطلق ہوش نہیں تھا۔ اس کی نگاہیں اس نشست پر جمی ہوئی تھیں جہاں سانت بیرو بیٹھا تھا اور ٹکٹکی باندھے آدیل کو دیکھ رہا تھا۔

ہیوگو نے بڑی منت کے ساتھ سانت بیرو کو اس پر راضی کیا کہ

وہ اب آدیل سے کبھی ملنے کی کوشش نہیں کریگا۔ لیکن سانت بیرو اپنے وعدے پر قائم نہیں رہا۔ وہ آدیل سے چھپ کر ملتا رہا۔ اور پوشیدہ طور پر اس کو خط لکھتا رہا۔ یہ راز ہیوگو سے چھپا نہیں رہ سکا۔

ہیوگو نے اپنا غم اپنی ادبی مصروفیت میں بھولے رہنے کی کوشش کی۔ اسی زمانے میں اس نے اپنا مشہور ناول "نا تر دام" لکھا۔ یہ ایک مقدس عبادت گاہ کی داستان ہے۔ ہیوگو نے پتھر کی ایک عمارت میں انسان کی روح پھونک دی ہے۔ ایک مشہور فرانسیسی مورخ کا قول ہے کہ ناتردام کے کلیسا کے پہلو بہ پہلو ہیوگو نے شاعری کا ایک کلیسا تعمیر کر کے کھڑا کر دیا ہے۔ جس کی بنیادیں اتنی ہی مضبوط اور منارے اتنے ہی بلند ہیں جتنے کہ اصلی عمارت کے۔

تعریف اور شہرت کا سلسلہ بڑھتا رہا۔ لوگوں کے دلوں میں ہیوگو کا خیال جڑ پکڑنے لگا۔ اور پھر محبت کی ایک نئی روداد شروع ہوئی۔ پہلی محبت کی طرف سے وہ کافی تلخ ہو چکا تھا۔ لیکن اصلیت یہ ہے کہ ہیوگو کا سا آزادی اور محبت کا سودائی شادی کے اندر محبوس محبت سے آسودہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ژولیت ایک حسین اداکارہ تھی جو ایک "آگ کی چڑیا" تھی۔ اس کا جسم نہ جانے کتنوں کا کھلونا رہ چکا تھا۔ مگر اب اُس نے اپنے دل کا ہدیہ ایک شخص کی نذر کر دیا۔ پچاس سال تک وہ ہیوگو کو انتہائی انہماک کے ساتھ پوجتی رہی۔ اور ہیوگو بھی اسی شدت کے ساتھ اس کو چاہتا رہا۔ تم پوچھو گی اور آدیل کا کیا حشر ہوا۔ ہیوگو نے آدیل کی محبت ترک نہیں کی بلکہ اس کے ساتھ اس کی محبت برقرار رہی۔ لیکن اب یہ محبت کچھ آفاقی قسم کی ہو گئی تھی۔ اور آدیل اس سے آسودہ اور خوش تھی۔ آدیل بھی اپنی جگہ ایک کردار ہے۔ اس کو ہیوگو یا بعد کو سانت بیرو کے ساتھ جو تعلق خاطر تھا وہ شروع ہی سے کچھ افلاطونی انداز کا تھا۔ جس میں ملکیت کی آرزو کو بہت کم دخل تھا۔ وہ محبت کو ایک سورج سمجھتی تھی۔ جس تک نہ کوئی پہنچ سکتا ہے۔ اور نہ پہنچنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اس کو سورج کی ترچھی کرنوں کی نرم حرارت زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ اور اس کی عمودی تمازت سے اپنے کو بچائے رہنا اس کے خیال میں بہتر تھا۔ لیکن ژولیت کے ساتھ ہیوگو کی محبت ایک ایسا شعلہ تھی جو کبھی فرو ہونا نہ جانتا ہو۔ محبت کی المناک یا افسردہ کن آسودگی کا ان دونوں کو کوئی تجربہ نہیں ہوا۔ "پہلی رات" کے پچاس سال بعد بھی جب کبھی ژولیت ہیوگو کا منہ چومتی تھی تو وہ اس کا جواب ایسی سرشاری کے ساتھ دیتا تھا اور کہتا تھا "میں تمہارے جسم تمہاری روح دونوں کو چومتا ہوں۔ تم حسن ہو۔ تم روشنی ہو۔ میں تم کو پوجتا ہوں۔"

ژولیت ادنیٰ طبقہ کی ایک بے نام و نشان بچی تھی۔ اس کے ماں باپ کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ اس کو دوسرے بے نام و نشاں لوگوں نے پالا اور پال کر جوان کیا۔ یہ ژولیت ہیوگو کے جذبۂ پرستش کا مرکز بنی۔ ژولیت اس کے لئے ایک رمز یا استعارہ بن گئی۔ وہ گویا دنیا کی تمام ادنیٰ اور بے نام و نشاں ہستیوں کا خلاصہ تھی۔ ژولیت کی محبت اس کے حق میں ایک پاک کرنے والی آگ ثابت ہوئی۔ جس نے اس کو اشتراکی اور جمہوری بنا دیا۔ اب اس نے بالاعلان یہ فیصلہ کر لیا کہ دنیا کی افتادہ اور پامال ہستیوں کی محبت کو اپنی باقی زندگی کا رہنما بنائے گا اب اس کے اندر جتنی طاقت ہے۔ وہ سب کمزوروں کی حمایت میں صرف ہوگی۔

اور آخر دم تک وہ اپنے اس ارادے اور زندگی کے اس اصول پر قائم رہا۔ دو مرتبہ وہ "عوام کی شورش" میں دل و جان سے شریک رہا۔ اور دونوں مرتبہ نہ صرف اس کی شہرت کو صدمہ پہنچا۔ بلکہ اس کی جان خطرے میں پڑ گئی۔ ۱۸۴۸ء کی ایک انقلابی شورش میں وہ میدان جنگ میں کھڑا لڑتا رہا۔ ژولیت کو ایک خط میں لکھتا ہے۔

"ماندگی اور تھکن نے مجھے مردہ کر رکھا ہے۔ تین دن اور تین راتیں جاگتے اور مقابلہ کرتے گزر گئیں۔ نہ سونے کے لئے بستر ہے۔ نہ کھانے پینے کا کوئی سامان ہے۔ صرف کبھی کبھی کوئی لمحہ ایسا مل جاتا ہے کہ سستانے کے بہانے تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ رہو"۔ ناہید اس وقت ہیوگو کی عمر چھیالیس۴۶ سال کی تھی اور ولولے اور نشاط کا یہ عالم تھا۔

یہاں ہیوگو جابرانہ قوتوں سے لڑ رہا ہے وہاں اس کے گھر میں لوٹ مار مچی ہے۔ یہی انقلابی جماعت کی ایک ٹولی جن کی حمایت میں وہاں وہ جان پر کھیلے ہوئے تھا، یہاں اس کے گھر میں گھس آئی اور گھر کا سامان

اسباب توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ۔ جب لوگ اس کے دارالمطالعہ میں پہنچے
تو کھڑکی کے قریب ایک اونچی میز پر کچھ لکھے ہوئے کاغذ کے اوراق بکھرے
ہے ۔ باغیوں کا سرگروہ گوبیئر تھا جو کسی زمانے میں ایک مدرس تھا اس نے
ان اوراق کو پڑھا اور اس کو معلوم ہوا کہ کوئی طویل افسانہ لکھا جا رہا
تھا ۔ پھر اس نے سرورق پر نظر ڈالی اور کہا ” ایک ناول کے لیئے یہ سرخی
بُری نہیں ہے ۔ اس کے ایک ساتھی نے پوچھا ” کیا نام ہے“ جواب ملا
”مصیبت زدوں کی داستان“ ۔ Lesmiserables

یہی ہیوگو کا شاہکار ہے ۔ ہیوگو نے اس کو لکھنا اس وقت
شروع کیا تھا جبکہ وہ پیرس میں تھا ۔ مگر اس کو ختم کیا گیا گیرنزی
میں جہاں نپولین سوم کے جبر و تشدد کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند
کرنے کی سزا میں ہیوگو کو جلاوطن کر کے بھیج دیا گیا تھا ۔

مقدر کا تلاطم ابھی ہیوگو کا پیچھا کر رہا تھا ۔ زندگی اور موت
کامیابی اور ناکامی ، خوشی اور رنج ، راحت اور مصیبت کا ایک سلسلہ
تھا کہ کہیں ختم ہوتا ہی نظر نہیں آتا تھا ۔ اکادمی کا رکن منتخب ہونا
اور ایک لڑکی کا دریا میں ڈوب کر مرجانا ۔ فرانس کا سب سے بڑا
شاعر مان لیا جانا اور پھر دوسری لڑکی کی قبل از وقت موت ۔ ایک
طرف اس کے ساتھ عوام کی بڑھی ہوئی عقیدت کہ جس جزیرے
میں وہ جلاوطن کر کے بھیجا گیا تھا اس کو لوگ ایک مقدس خانقاہ
سمجھنے لگے تھے اور اس رشی کی زیارت کرنے کی غرض سے وہاں جاتے
تھے ۔ دوسری طرف ناکام محبت کی تلخیاں اور پھر اسی کے بعد تیسری
لڑکی کا پاگل ہوجانا ۔ ایسے حالات و حادثات کے درمیان
(Lesmiserables) کی تخلیق ہوتی ہے ۔ جب وہ انسانی آلام
کا یہ رزم نامہ لکھ رہا تھا تو کسی کا کہنا ہے کہ خدا نے شانہ پر ہاتھ رکھ کر
اس کی آنکھوں کو زمین سے آسمان کی طرف پھیر دیا ۔ خود اس کا قول ہے
کہ ”زمین نے مجھے شاعر کہہ کر پکارا اور آسمان سے آواز بازگشت آئی
”پیغمبر“ اور ہیوگو تھا بھی پیغمبر ۔ اس کے اپنے آلام و مصائب نے اس
کو یہ درجہ کا پیغمبر بنا دیا تھا ۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے ” میں نے موت کی
حیثیت کا مقابلہ کیا ہے اور آگے بڑھ کر میں نے زندگی کا پھول پایا ہے“ ۔
” زندگی کا پھول“ ناامیدوں کی امید ۔ عاجزوں اور مجبوروں کے
لیئے بشارت ۔ تمام مصیبت زدہ اور دردمند مخلوقات کے ساتھ خدا کی
شفقت ہی ہے (Lesmiserables) کا مرکزی تصور جس
نے احساس کو ترس اور ترس کو محبت میں تبدیل کر دیا ہے ۔

ایسی شور انگیز اور بیدار بلیغ دستاویز جو انسانی احساس کی تمام
نرمیاں اور لطافتیں اپنے اندر طوفان کی شکل میں لیئے ہوئے ہو دنیا کے
ادب میں مشکل ہی سے نکل سکتی ہے ۔ یہ پاک آگ کے پاک شعلے ہیں ۔
جس نے کچھ دنوں کے لیئے دنیا کی گندگیوں کو جلا کر رکھ دیا تھا ۔ کتاب کی
اشاعت کی دوسری ہی صبح کو چند گھنٹوں کے اندر پچاس ہزار جلدیں بک
گئیں ۔ وکٹر ہیوگو کتاب کا مصنف گیرنزی کا تنہا قیدی آفاقی جمہوریت کا
پہلا باشندہ قرار پایا ۔ اور اس پہلے باشندہ کو اپنے انتساب پر کافی ناز
رہا ۔ اور جوں جوں سال پر سال گزرتے گئے وہ کامرانی کے اس احساس
کے اثر سے جواں ہوتا گیا ” میرے سفید بالوں میں موسم بہار کی بجت چھپی
ہوئی ہے ۔ روشنی کبھی بوڑھی نہیں ہوتی ۔ یہ اسی کے الفاظ ہیں جہاں
تک جسمانی تخیل اور ذہنی ضبط کا تعلق ہے ہیوگو ایک دیو تھا ۔ اس کی
روزانہ مصروفیتیں قابل توجہ ہیں پو پھٹنے سے پہلے اٹھ جانا سمندر میں
جا کر نہانا اور سورج نکلنے سے پہلے اپنی اونچی میز کے سامنے کھڑے کھڑے
لکھتے رہنا ۔ سہ پہر کو سامان نقاشی کے ساتھ تھوڑی سی تفریح کر لینا
اس لیئے اس کو نقاشی کا بھی شوق تھا ۔ اور سمندر کے کنارے کنارے
ایک لمبی سیر اور سورج کی کرنوں اور سمندر کے چھینٹوں سے تازگی حاصل
کرنا ۔ چٹانوں پر اگر چڑھنا ہوا تو کبھی چھڑی کا سہارا نہ لیتا اور نہ
بارش سے بچنے کے لیئے کبھی چھاتا استعمال کرتا ۔ اس کو نہ گرمی کی پروا
تھی اس کا قول تھا ” میں غیر فانی ہوں اور کوئی چیز مجھے نقصان نہیں پہنچا
سکتی“ ۔ بھوک کا یہ عالم تھا کہ ایک نشست میں گوشت کی کئی رکابیاں
کھا کر ہضم کر لیتا تھا ۔ ایسی صالح بھوک اور ایسا جیّد ہاضمہ ہر آدمی کو نصیب ہو
جی بھر کے کھانا جی بھر کے سوچنا ۔ جی بھر کے زندگی کی راحتوں اور کلفتوں دونوں
کو قبول کر لینا ۔ یہ تھا اس کی زندگی کا دستور ” غم محض خوشی کی تمہید ہے“ زندگی
کا راگ بالآخر کامرانی اور مسرت کا راگ بن جاتا ہے ۔ بشرطیکہ آدمی کو اس کے
ساتھ سر ملا لینے کا فن معلوم ہو ۔ یہ ہیوگو کا ایمان تھا ۔ اسی ایمان نے اس
کو اس قابل رکھا کہ وہ اپنے دو بیٹوں اور اپنی بیوی آدیل کی موت کا غم

برداشت کرلے گیا۔ اور اسی ایمان نے اس کے اندر اتنی تاب و توانائی پیدا کردی تھی کہ جب ۱۸۷۰ء میں جرمنوں نے فرانس پر حملہ کیا تو وہ ہراساں نہیں ہوا اس وقت وہ جلاوطنی سے واپس آچکا تھا۔ اُس نے اپنے ملک کو جو پیغام دیا وہ یہ تھا: "میرے ہموطنو! تم میں سے ہر ایک میدان کارزار میں پہنچ جائے شہر اور قصبے اُٹھ کھڑے ہوں۔ کھیتوں میں آگ لگ جانے دو۔ فرانس کے شہریو! شہریو! برچھوں اور بھالوں کے جنگل کھڑے کردو سنگینوں کی تعداد بڑھاتے جاؤ۔ توپوں کو طیار کرو۔ اور اے دیہاتیو اپنی مشعلیں لے کر نکل پڑو۔ کیا امیر کیا مفلس۔ کیا مزدور کیا کسان کیا دفتر کا منشی۔ ہر شخص کو اس وقت چاہئے کہ وہ زمین سے ہر وہ چیز اٹھا لے جس سے کسی ہتھیار کا کام لیا جاسکتا ہو۔ یا جس کو پھینک کر مارا جاسکتا ہو۔ چٹانوں کو سمیٹ لو۔ سڑک سے کنکر پتھر اکٹھا کرلو۔ کھیت کی نالیوں کو جنگی خندقوں میں تبدیل کردو۔ مقدس زمین سے پتھر نوچ کر نکال لو۔ حملہ کرنے والوں کو اپنی ماتا فرانس کی ہڈیوں سے مار مار کر چور کردو ..... اور پھر آنکھوں میں ایک پیغمبرانہ چمک کے ساتھ کہتا ہے "آج کی شکست سے ہنسو نہیں۔ ایک واحد مقصد کے لئے اپنے دلوں اور اپنے ہاتھوں کی قوت کو وقف کردو۔ آخر میں فتح یقینی ہے"۔ انسانی آلام کی صحت بخش توانائی اور انسانی محنت کی آخری برکت پر اس کو پورا بھروسا تھا۔ یہی اعتقاد اور یہی اعتماد لے کر اس نے اپنا دوسرا ناول "سمندر کے مزدور" لکھا جو پڑھنے کے لائق ہے اور جس کی ایک جلد میں تم کو بھیج رہا ہوں۔ ناہید جب میں یہ سوچتا ہوں کہ زندگی کے اس ولولے اور توانائی کا اظہار ایک اَسی سال کا شخص کر رہا ہے۔ تو مجھے اپنی ذات سے شرم آنے لگتی ہے۔ تم نے دیکھا ادیب کیا ہوتا ہے اور وہ کیا کرسکتا ہے۔ ہم ادیب کو جوگی بیراگی کے قسم کی مخلوق سمجھتے ہیں۔ ہم کو یہ احساس نہیں کہ ادیب سب سے بڑا سورما اور سب سے زبردست مجاہد ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو ادیب آپ اپنے لئے ننگ ہے اور دنیا کے لئے بھی اس کا وجود شرم و عار کا سبب ہے ....

ہیوگو اپنی زندگی کے ۸۰ سال پورے کرچکا ہے۔ سال گرہ کا دن ہے۔ احباب پھول جمع کر رہے ہیں۔ ہیوگو کا مکان چھت سے لے کر فرش تک پھولوں سے ڈھک گیا ہے۔ پچاس ہزار معصوم اور پیارے بچے "دادا ہیوگو" کے اعزاز میں ناچ گا رہے ہیں اور پیرس کی سڑکوں اور راستوں پر لاکھوں کی تعداد میں مزدور ہیوگو کا لکھا ہوا مشہور قومی ترانہ (Marseillaise) گاتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔

کامیابی اور شہرت اپنے آخری نقطۂ کمال تک پہنچ چکی ہے۔ لیکن یہیں غم بھی اپنی انتہائی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے۔ اسّی برس کی عمر کی خوشیاں مشکل سے ختم ہوئی تھیں کہ ہیوگو کی سب سے زیادہ محبوب ہستی اس کی سب سے زیادہ پیاری دوست ژولیٹ دُنیا سے رخصت ہوگئی۔ کچھ دن پہلے ہیوگو نے ژولیٹ کو لکھا تھا۔ "اگر تم مر جاؤ تب بھی میں تم کو چاہتا رہونگا اور اگر میں مر جاؤں اس وقت بھی میں تم کو چاہتا رہوں گا۔ تمہارا مرنا میری موت ہوگی" ـــ اور ژولیٹ کی موت کے ساتھ ہیوگو کی ارضی زندگی ختم ہوگئی اس کے بعد وہ جتنے دنوں زندہ رہا اس دنیا سے آگے کی زیادہ اہم اور جلیل القدر زندگی کا انتظار کرتا رہا۔ اس کو حیات مابعد الممات کا یقین تھا۔

ژولیٹ مر چکی تھی۔ اولاد سوا ایک کے سب ضائع ہوچکی تھیں۔ آدیل ابھی زندہ تھی مگر خطرناک حد تک پاگل ہوچکی تھی۔ لیکن ہیوگو اکیلا نہیں تھا۔ اس کے بچوں کی اولاد اس کو گھیرے ہوئے تھیں جب اس کا وقت قریب آیا تو اس نے ان بچوں کو جمع کیا اور کہا "میرے پیارے فرشتو۔ میں اب تم کو چھوڑنا چاہتا ہوں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خدا مجھ کو پکار رہا ہے۔ اب پھر تم مجھے نہ دیکھ سکو گے۔ لیکن میں ہمیشہ تمہارے ساتھ۔ تم سے قریب بلکہ پہلے سے زیادہ قریب ہوں گا۔ اور میں تم کو اسی طرح دعائیں دیتا رہوں گا جس طرح کہ اس وقت دے رہا ہوں ...

ہیوگو ۲۲ مئی کو مرا جو کہ سانت ژولیا کا دن تھا یہ بھی بڑا حسین اور مبارک اتفاق ہے کہ اس دن کو ژولیت کے نام سے ایسی قریب کی نسبت تھی۔ اس کے احباب نے چاہا کہ اس کے جنازہ کا شاہانہ جلوس نکالیں لیکن ہیوگو کی آخری وصیت یہ تھی

"میری خواہش ہے کہ پچاس ہزار فرانک غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کردئے جائیں۔ اور میری خواہش ہے کہ مجھے قبرستان تک اس گاڑی میں لے جایا جائے جس میں غریبوں کی لاشیں جاتی ہیں" خود اس وصیت کے آخر میں یہ سیدھے سادے الفاظ تھے "میں تمام کلیساؤں کے اسالیب عبادت سے انکار کرتا ہوں۔ میں صرف خدا کا قائل ہوں"۔

ناہید! یہ کیسی مکمل۔ کیسی بھرپور۔ کیسی پُراعتماد۔ کیسی آسودہ غرضیکہ کیسی قابلِ رشک زندگی تھی !!

تمہارا "پردیسی"

صالحہ عابد حسین

حالی کی سیرت کی ایک اہم خصوصیّت

(زیرِ تصنیف کتاب "حالی" کا ایک باب)

مولانا حالی کی سیرت کی ایک اہم خصوصیت اُن کی بے تعصبی ہے۔ وُہ ہر قوم اور ہر فرقے کے لوگوں سے ایک سی محبّت اور سلوک سے پیش آتے تھے۔ اُس زمانے میں مسلمانوں میں انگریزوں سے بہت تعصّب اور چھوت چھات برتی جاتی تھی لیکن مولانا حالی کے بعض انگریزوں سے بھی بہت خوشگوار تعلقات تھے اور ہندوؤں میں تو ان کے بیسیوں دوست تھے۔ محبّت میں، ہمدردی میں، سفارش میں، سلوک میں کبھی اُنھوں نے یہ امتیاز نہیں کیا کہ یہ سلوک وہ جس کے ساتھ کر رہے ہیں وہ کس مذہب اور فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اُن کے اپنے ہندو دوستوں کے ساتھ ایسے ہی خلوص اور محبّت کے تعلقات تھے جیسے مسلمان دوستوں سے۔

اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین کو جو انسپکٹر مدارس تھے ایک خط میں لکھتے ہیں "وہ ہمارے شفیق دوست لالہ تلسی رام صاحب ساہوکار کے نہایت قریب کے رشتہ دار ہیں۔ اُمیّد ہے کہ عنقریب معائنے کے موقع پر وُہ تم سے ملیں گے۔ چونکہ تم اُن سے واقف نہیں ہو اس لئے تلسی رام صاحب کی یہ خواہش ہے کہ لالہ بنارسی داس کے حال سے تم کو مطلع کر دیا جائے تاکہ تم اُن سے اپنے عزیز ہم وطنوں کی طرح ملو۔۔۔۔"

لالہ چندو لال کو اُن کے والد کی وفات پر تعزیت کے خط میں لکھا ہے:۔

"عزیزی و شفیقی سلمہٗ اللہ۔ آپ کی تحریر سے اپنے دلی دوست بہاری لال مشتاق کی وفات کا حال معلوم ہوا جس کا صدمہ کبھی دل سے فراموش نہیں ہو سکتا۔ میرے دہلوی دوستوں میں سے افسوس ہے کہ ایک خالص اور مخلص دوست کم ہو گیا جس کا بدل ملنا مشکل ہے ایسے وضعدار، محبّت کے پُتلے حاضر و غائب یکساں اور اپنے اسکول کے فدائی کم ہوتے ہیں۔۔۔۔۔"

وہ ہندو مسلم اتحاد کے دل سے خواہاں تھے اور جو لوگ آپس میں مخالفت اور منافرت پھیلانا چاہتے تھے اُنھیں ملک و قوم کا سخت دشمن سمجھتے تھے۔ ایک جگہ لکھا ہے "جو لوگ ہندو مسلمانوں میں تفرقہ اور پھوٹ ڈلوانے والی کتابیں لکھتے ہیں وہ ہندوستان کے سخت دشمن ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، برہمو ہوں یا آریا۔۔۔۔"

رسالۂ اتحاد لکھنؤ کے ایک مضمون میں لکھا ہے:۔

"درحقیقت اس سے زیادہ کوئی غلط خیال نہیں ہو سکتا کہ ہندو مسلمانوں میں دوستی اور یک جہتی کے روابط مستحکم نہیں ہو سکتے۔ بدقسمتی سے ایسے چند ناشدنی اسباب پیدا ہو گئے ہیں جن سے بالفعل دونوں قوموں کی ایک محدود جماعت کے دل ایک دوسرے سے پھٹ گئے ہیں بغیر اتفاق اور یک جہتی کے دونوں قوموں کا ملک میں رہنا اور گورنمنٹ کی نظر میں عزت و توقیر پیدا کرنا غیر ممکن ہے۔۔۔۔"

برادرانِ وطن کے کارناموں کی تعریف کس کشادہ دلی سے کرتے ہیں:۔

یہاں اور ہیں جتنی قومیں گرامی | خود اقبال ہے آج اُن کا سلامی
تجارت میں ممتاز دولت میں نامی | زمانے کی ساعی ترقی کی حامی

نہ فارغ ہیں اولاد کی تربیت سے
نہ بے فکر ہیں قوم کی تربیت سے

دکاں اُن کی ہے اور بازار اُن کا | بنج اُن کا ہے اور بیوپار اُن کا

زمانے میں پھیلا ہے بیوپار اُن کا   ہے پیدو جواں بر سرِ کار اُن کا
مدار اہلکاری کا ہے اب انھیں پر
انھیں کے ہیں آفس انھیں کے ہیں دفتر
معزز ہیں ہر ایک دربار میں وہ   گرامی ہیں ہر ایک سرکار میں وہ
نہ رسوا ہیں عادات و اطوار میں وہ   نہ بدنام گفتار و کردار میں وہ
نہ پیشے سے حرفت سے انکار اُن کو
نہ محنت مشقت سے کچھ عار اُن کو

اور تعصب کو حالی کس نظر سے دیکھتے ہیں :۔

تعصب کہ ہے دشمنِ نوعِ انساں   بھرے گھر کئے سینکڑوں جس نے ویراں
ہوئی بزمِ نمرود جس سے پریشاں   کیا جس نے فرعون کو نذرِ طوفاں
گیا جوش میں بولہب جس کے کھویا
ابوجہل کا جس نے بیڑا ڈبویا

کبھی کلامِ الٰہی کا یہ سبق سُناتے ہیں :۔

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا   کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا   خلائق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا
یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دُنیا میں انساں کے انساں

اور یہی مسلک عمر بھر حالی کا رہا۔ ایک جگہ فرماتے ہیں "میں تو فرائض کے بعد کوئی عبادت اور کوئی بھلائی اس کے برابر نہیں سمجھتا کہ اولاً اپنے عزیزوں اور دوستوں پھر تمام ابنائے جنس کے ساتھ جہاں تک ہو سکے سلوک اور بھلائی کی جائے ....."

اتحاد کی برکت سنیئے :۔

ملک ہیں اتحاد سے آزاد   شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا اگر   کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی   اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی   جو نہ آنی تھی وہ بلا آئی
پاؤں اقبال کے اکھڑنے لگے   ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے

اُردو ہندی کا قضیہ مولانا حالی کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔ حالی اُردو کے ادیب، اُردو کے شاعر اور اُردو کے خادم تھے لیکن جس طرح وہ اور ہر قسم کے تعصب سے پاک تھے ویسے ہی لسانی تعصب سے بھی کوسوں دُور تھے۔ خمخانۂ جاوید کے تبصرے میں لکھتے ہیں :۔

"آج کل اہلِ ملک کی بدقسمتی سے جو اختلافات ہندو مسلمانوں میں اُردو زبان کی مخالفت یا اُس کی حمایت کی وجہ سے برپا ہیں اُس کی رفع داد اگر ہوسکتی ہے تو اس طریقے سے ہوسکتی ہے کہ ہندو تعلیم یافتہ اصحاب کشادہ دلی اور فیاضی کے ساتھ اُردو زبان میں جو درحقیقت برج بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت اور اُس کی ایک پروان چڑھی ہوئی اولاد ہے، اس طرح تصنیف و تالیف کریں جس طرح ہمارے ہردل عزیز ہیرو (لالہ سری رام صاحب) نے اس طولانی تذکرے کو ختم کرنے کا ارادہ کیا ہے اور مسلمان مصنفین بے ضرورت اُردو میں عربی، فارسی کے غیر مانوس الفاظ استعمال کرنے سے جہاں تک ہو سکے پرہیز کریں اور ان کی جگہ برج بھاشا کے مانوس اور عام فہم الفاظ سے اُردو کو مالا مال کرنے کی کوشش کریں اور اس طرح دونوں قوموں میں آشتی اور صلح کی بنیاد ڈالیں اور ایک متنازعہ فیہ زبان کو مقبولۂ فریقین بنائیں ..... مذکورہ بالا اختلافات کے متعلق جو تعصب اور ناگواری کا الزام ہندوؤں پر لگایا جاتا ہے۔ اس قسم کا بلکہ اس سے زیادہ سخت الزام مسلمانوں پر لگایا جا سکتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مسلمان باوجودیکہ تقریباً ایک ہزار سال سے ہندوستان میں آباد ہیں مگر اُس طویل مدت میں اُنھوں نے چند مستثنیات کو چھوڑ کر کبھی سنسکرت یا برج بھاشا کی طرف باوجود سخت ضرورت کے آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا ..... اگر یہ کہا جائے کہ سنسکرت کا سیکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے تو برج بھاشا جو بمقابلے سنسکرت کے نہایت سہل الحصول ہے اور جس کی شاعری نہایت لطیف، شگفتہ اور فصاحت و بلاغت سے لبریز ہے، اُس کو بھی عموماً بیگانہ وار نظروں سے دیکھتے رہے۔ حالانکہ جو اُردو اُن کو اس قدر عزیز ہے اُس کی گریمر کا دار و مدار بالکل برج بھاشا یا سنسکرت کی گریمر پر ہے۔ عربی فارسی سے اُس کو صرف اس قدر تعلق ہے کہ دونوں زبانوں کے اسماء اس میں کثرت سے شامل ہو گئے ہیں۔ باقی تمام اجزائے کلام جن کے بغیر کسی زبان کی نظم و نثر مفید معنی نہیں ہوسکتی بھاشا یا سنسکرت کی گریمر سے ماخوذ ہیں۔ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کا

ہندوستان میں رہنا اور سنسکرت یا کم سے کم بھاشا سے بے پڑا یا متنفر ہونا بالکل اپنے تئیں اس مثل کا مصداق بنانا ہے کہ دریا میں رہنا اور مگر مچھ سے بیر...."

ایسی سچی اور کھری باتیں وہی شخص کہہ سکتا ہے جسے تعصب اور ناانصافی چھو کر بھی نہ گئے ہوں اور جس کے خمیر میں انصاف اور رواداری بسی ہوئی ہو۔ یہ باتیں اکثر لوگوں کو ناگوار گزریں اور اُنھوں نے اس کی مخالفت میں آواز اُٹھائی مگر حالی نے ہمیشہ سچ کی تلخی کو برداشت کیا۔ اس معاملے میں وہ سچی بات کہنے سے کیوں دریغ کرتے۔

مقدمۂ شعر و شاعری میں بھی اُنھوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اُردو کے ادیب اور محقق کو سنسکرت یا کم سے کم ہندی بھاشا ضرور جاننا چاہیئے:۔

"اُردو پر قدرت حاصل کرنے کے لئے صرف دِلّی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ عربی اور فارسی میں کم سے کم متوسط درجے کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جائے۔ اردو زبان کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے اس کے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصّہ اسما کا ہندی سے ماخوذ ہے ..... پس اردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا مطلق نہیں جانتا اور محض عربی فارسی کے تان گاڑی چلاتا ہے وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیّوں کے منزلِ مقصود تک پہنچانی چاہتا ہے اور جو عربی فارسی سے نابلد ہے اور صرف ہندی بھاشا یا محض مادری زبان کے بھروسے پر اس بوجھ کا متحمل ہوتا ہے ایک ایسی گاڑی ڈھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے گئے...."

حالی کا خیال تھا کہ ہندی کے آسان اور شیریں الفاظ زیادہ سے زیادہ اُردو میں داخل کرنے چاہئیں اس سے زبان کو وسعت اور لوچ دونوں حاصل ہوں گے۔ اُنھوں نے خود اپنی نظم و نثر میں بڑی خوبی کے ساتھ ہندی کے سیکڑوں الفاظ بے تکلّف استعمال کئے ہیں۔ اگر حالی کے مشورے پر عمل کیا جاتا اور اُردو زبان کے حامی ادیب اور شاعر ان کی تقلید کرتے اور ان کا رویہ ہندی سے ایسا ہی بے تعصّبانہ ہوتا جیسا حالی کا تھا تو شاید ہندی اُردو کا جھگڑا اتنا نہ بڑھنے پایا۔ اگر مسلمان ہندی سے بے اعتنائی (جو حالی کے زمانے میں کم اور بعد میں بہت زیادہ برتی گئی) نہ برتتے تو آج اُردو کو ہندوستان میں یہ روزِ بد نہ دیکھنا پڑتا۔ اُردو سے جو تعصّب آج پھیلا ہوا ہے اُس میں بچاری اُردو کا کوئی قصور نہیں وُہ تو سیکڑوں برس سے سب اہلِ وطن کے دلوں میں گھر کر چکی تھی اور اب بھی کروڑوں کے دل میں اس کی محبّت موجود ہے۔ اس مخالفت کی ذمّے داری ایک حد تک اُس کے اُن نادان دوستوں پر ہے۔ جنہوں نے اُس کی حمایت کا ایسا طریقہ اختیار کیا جس سے اُسے فائدے کے عوض نقصان پہنچا یا اُن سیاسی حالات کی بدولت اُسے یہ دشمنی سہنی پڑ رہی ہے جنہوں نے ملک کو تقسیم کرکے تہذیب، تمدّن زبان سب کو تقسیم کرانے کی بنا ڈال دی۔

اشعار

بسمل شاہجہانپوری

حضورِ داورِ محشر خراب ہو نہ سکا — گناہ وہ کئے مَیں نے حساب ہو نہ سکا

علاجِ حیرتِ چشمِ پُرآب ہو نہ سکا — نقاب اُٹھا کے بھی وہ بے نقاب ہو نہ سکا

ہزار بار تمنّا کو شکست دی میں نے — تری نظر کا مگر سدِ باب ہو نہ سکا

اشارہ جس میں نہ ہو اُس نگاہِ برہم کا — وہ انقلاب کبھی انقلاب ہو نہ سکا

تھا ہر سوال دلِ نکتہ چیں کا دادطلب — یہ اور بات ہے تو لاجواب ہو نہ سکا

چراغِ طور ہو بسمل کہ ہو یدِ بیضا
جواب شعلۂ جامِ شراب ہو نہ سکا

غلام احمد فرقت

اورنگ زیب کی زندگی کے چند رنگین لمحات

تاریخِ عالم میں صدہا واقعات ایسے گذرے ہیں جن کے ضبطِ تحریر میں نہ آنے سے دنیا ان سے محروم رہی۔ اکثر ایسا بھی ہوا، وہ واقعات لکھے بھی گئے مگر انقلابِ زمانہ کے ہاتھوں یا تو وہ تہس نہس ہو گئے یا زمانۂ دراز تک وہ بڑے بڑے کتب خانوں میں قلمی نسخوں کی زینت بنے رہے اور ہم آپ تک اُن کی رسائی نہ ہو سکی۔ چنانچہ مغل بادشاہوں کی زندگی کے بیشتر نجی واقعات اب بھی ایسے ہیں جو اگر آج منظرِ عام پر آجائیں تو دنیا حیران اور ششدر ہو کر رہ جائے۔ انھیں واقعات میں شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب کی داستانِ عشق بھی ہے جس کے حوالے اُس کے یا اُس کے بعد کے بعض مورخین کے پرانے نسخوں میں ملتے ہیں۔ مگر چونکہ وہ ابھی تک قلمی نسخوں کے کلیجوں سے چٹے رہے اس لئے اورنگ زیب کے بارے میں عام لوگوں کا یہی خیال ہے کہ وہ ایک خشک فطرت اور خدا پرست انسان تھا اور بس — حسن و عشق سے اس کی زہد نواز فطرت کو دور کا بھی واسطہ نہیں تھا مگر

عشق ازیں بسیار کرد است و کند

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اورنگ زیب کا سا متقی اور پرہیزگار انسان بھی اپنی زمانۂ شہزادگی میں کیوپڈ کی نگاہِ عشق نواز سے نہیں بچ سکا اور اُس کے ساغرِ زہد و تقویٰ کو مغل دربار کی ایک ادنےٰ کنیز نے پاش پاش کر دیا۔

کفرِ عشق است بناموسِ سلام است اینجا
جلوۂ مردمِ آزاد حرام است اینجا

ذیل کا واقعہ ایک ایرانی نسخے کے صفحہ ۲۰ اور ۲۱ پر ملتا ہے جادوناتھ سرکار نے بھی اپنی کتاب Anecdotes of Aurang Zeb میں اسے درج کیا ہے۔

شاہجہان نے شہزادۂ اورنگ زیب کو جب دوسری بار دکن کا صوبہ دار بنا کر بھیجا تو وہ اپنے صدر مقام اورنگ آباد جاتے ہوئے برہان پور اتر پڑا۔ برہان پور کا گورنر اُن دنوں سیف خاں تھا۔ سیف خاں کی شادی شہزادے کی خالہ صالحہ بانو بنتِ آصف خاں سے ہوئی تھی جو شہزادے کو متعدد بار اپنے گھر بلا چکی تھی اس لئے شہزادے نے یہ موقع غنیمت جانا اور خالہ سے ملنے کے لئے اتر پڑا۔ خالہ اور بھانجے کا قریبی رشتہ اس کا متقاضی نہ تھا کہ گھر میں پردہ کرایا جائے اور محل کی عورتوں کو اِدھر سے اُدھر ہٹایا جائے لہٰذا شہزادہ بلا تکلف اندر چلا گیا۔ جس وقت شہزادہ محل میں داخل ہو رہا تھا محل میں بڑی چہل پہل تھی۔ زین آبادی جس کا اصلی نام ہیرا بائی تھا اور جو سیف خاں کی کنیزِ خاص میں سے تھی اُس وقت ایک درخت کے نیچے کھڑی اپنے داہنے ہاتھ سے درخت کی ایک ڈال پکڑے مدھم سُروں میں گا رہی تھی اور وہ گانے میں کچھ اس درجہ محو تھی کہ شہزادے کی آمد کی اُس کو مطلق خبر نہیں ہوئی چنانچہ محل میں جاتے ہوئے اچانک شہزادے کی پہلی نظر جس پر پڑی وہ زین آبادی تھی جسے دیکھ کر شہزادے پر بالکل ایک غشی کا سا عالم طاری ہو گیا۔ اور وہ بالکل بے خود ہو کر وہیں زمین پر گر پڑا۔ شہزادے کا اس طرح گر پڑنا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا، چنانچہ صالحہ بانو کو جیسے ہی اس کی خبر پہنچی وہ بدحواس ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی اُس کے پاس آئی اور اس کی یہ حالت دیکھ کر بلائیں لے لے کر زار و قطار رونے لگی۔ تین چار گھڑی بعد جب شہزادہ قدرے ہوش میں آیا۔ تو اُس نے اُس کا حال پوچھا اور دریافت کیا کہ کیا اس سے پہلے بھی اُسے کبھی اس قسم کا دورہ پڑا تھا۔ مگر شہزادہ گم سم اور خاموش رہا البتہ نصف شب کے بعد جب شہزادے میں اتنی توانائی پیدا ہوئی کہ وہ بول سکے تو اُس نے خالہ سے آہستہ سے کہا کہ اگر میں اپنی بیماری آپ کو بتا بھی دوں تو کیا آپ اس کی دوا کر سکیں گی صالحہ بانو

یہ سُن کر خوش ہوگئی اور اُس نے جوشِ محبت میں کہا کہ تمہارے اچھا کرنے میں اگر میری جان بھی کام آجائے تو شاید میں اُس سے بھی دریغ نہ کروں گی۔ یہ سُن کر شہزادے نے اپنی عشق کی پوری روداد صالحہ سے بیان کر دی جسے سُن کر صالحہ بدحواس سی ہوگئی اور شہزادے کو جواب دینے کے عوض اُس کی زبان پر مہرِ خاموشی لگ گئی۔ اس پر شہزادے نے کہا تو پھر آپ نے بے کار ہی تو میری صحت کی طرف سے اِس درجہ تشویش کا اظہار کیا اور اتنی محبت اور شفقت ظاہر کی۔ اس پر صالحہ نے کہا کہ میں تم پر اپنی جان نچھاور کر سکتی ہوں مگر اُس ظالم سے ڈرتی ہوں (اس کا اشارہ سیف خاں کی طرف تھا) وہ بڑا ظالم اِنسان ہے۔ اگر اُس نے اِس واقعے کو سُن پایا تو وہ نہ تو شہنشاہِ عالم کا خیال کرے گا نہ تمہارا، بلکہ ہیرا بائی کا نام سنتے ہی سب سے پہلے وہ اُس کی گردن مار دے گا اور اُس کے بعد مجھے قتل کر دے گا۔ مگر مجھے اپنی جان کی چنداں پروا نہیں۔ البتہ اگر فکر ہے تو اُس بے چاری لڑکی کی جو بالکل بے گناہ ہے۔ اس پر شہزادے نے کہا کہ خالہ آپ نے صحیح فرمایا۔ بہرحال اب میں اس کے لئے دوسری سبیل نکالوں گا، اور دوسرے روز بعد مغرب شہزادہ اپنے گھر آیا۔ اور اس روز کھانا بھی نہیں کھایا اور اپنے دیوان مرشد قلی خاں کو جو نہ صرف اُس کا دیوان اور ماتحت ہی تھا بلکہ رازداں بھی، بُلا کر اس واقعے کی پوری تفصیل بیان کر دی۔ خان نے کہا تو لاؤ پہلے سیف خاں ہی کو کیوں نہ چلتا کیا جائے۔ پھر اس کے بعد اگر کوئی مجھے مار دے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ اگر میرے خون سے میرے ہادی اور مرشد کا کام بنتا ہے تو اس کام کو ہو جانا چاہیئے۔ اس پر شہزادے نے کہا کہ بہرحال مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے اور تم میری خاطر اپنی جان تک ہلاکت میں ڈال سکتے ہو البتہ میرا ضمیر اس کی اجازت نہیں دیتا کہ محض اپنی خاطر میں اپنی خالہ کو بیوہ کرا دوں، دوسرے شرعاً اور مذہباً بھی یہ چیز ٹھیک نہیں۔ بہرحال خدا پر بھروسہ کر کے تم سیف خاں کے پاس جاؤ اور اُس سے کہہ کر دیکھو۔ مرشد قلی خاں یہ سن کر بلا کسی پس و پیش کے سیدھا سیف خاں کے پاس گیا اور اُس نے خان سے ساری باتیں کہہ سنائیں۔ خاں نے پورے حالات سننے کے بعد کہا کہ شہزادہ عالم کو میری جانب سے سلام عرض کرو اور کہو کہ اس کا جواب اس کی خالہ کے ذریعے سے انھیں پہنچ جائے گا اور اس کے بعد وہ سیدھا حرم سرا میں چلا گیا اور بیوی کو مخاطب کر کے بولا کہ اگر شہزادے کی یہ خواہش ہے تو اس میں حرج کی کونسی بات ہے البتہ اگر وہ اپنی کنیزوں میں سے چتر بائی کو میرے حوالے کر دے اور ہیرا بائی کو اُس کے بدلے میں مجھ سے لے لے۔ اس کے بعد اُس نے بیوی سے اصرار کیا کہ وہ اسی وقت پالکی پر بیٹھ کر شہزادے کے پاس چلی جائے۔ صالحہ نے پہلے تو جانے میں کچھ پس و پیش کی۔ مگر جب سیف خاں نے دھمکی دی کہ اگر تم نہ گئیں تو میں تمھیں قتل کر دوں گا۔ تو چار و ناچار اُسے جانا پڑا۔ صالحہ نے شہزادے سے ساری باتیں کہہ دیں جس پر شہزادہ بیحد خوش ہوا اور زور سے بولا مجھے اپنی محل سرا کی ایک کنیز بھیج دینے میں عذر ہی کیا ہو سکتا ہے اس کے بعد اُس نے صالحہ سے درخواست کی کہ وہ جلد ہی مطلوبہ کنیز کو اپنے ہمراہ لیتی جائے۔ صالحہ نے اس کی اطلاع ایک خواجہ سرا کے ذریعے سے اپنے شوہر کو کر دی جس کے بعد سیف خاں نے ہیرا بائی کو پالکی پر سوار کرا کے شہزادے کے پاس بھیج دیا۔

اسی واقعہ کو مآثر الامراء کے مصنّف نے مندرجہ ذیل انداز میں لکھا ہے:-

"میر خلیل جس کا نام تاریخ میں مفتخر خاں، صوبیدار خاں اور خان زمان کے نام سے بھی آیا ہے آصف خان کا داماد تھا اُسے شاہجہان بادشاہ کی تخت نشینی کی تیئیسویں سالگرہ کے موقع پر ۵۰-۱۶۴۹ء کے درمیان دکن میں توپ خانے کا افسرِ اعلیٰ بنا کر بھیجا گیا تھا۔ ۱۶۵۳ء میں اُسے دہرور کا کمانڈر مقرر کیا گیا اور اورنگ زیب کے برسرِ اقتدار ہونے کے بعد جولائی ۱۶۸۱ء میں اُسے خاندیش کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ جولائی ۱۶۸۴ء میں اُس کی وفات ہوگئی۔ زین آبادی جس سے اورنگ زیب کی حسن و عشق کی داستان منسوب ہے اورنگ زیب کی تخت نشینی سے قبل خان مذکور کی حرم سرا میں ایک کنیز تھی۔ ایک دن جبکہ شہزادہ اورنگ زیب اپنے حرم کی عورتوں کے ہمراہ زین آباد کے ایک باغ میں جو آہو خانے کے نام سے موسوم تھا گیا ہوا تھا اور اُس کے ہمراہ اُس کی منتخب کنیزیں بھی تھیں کہا جاتا ہے کہ صالحہ بانو جو خاں زماں کی بیوی اور شہزادے کی خالہ تھی وہاں پہنچ گئی۔ زین آبادی اُس کے ہمراہ تھی۔ یہ کنیز علم موسیقی اور ناز و غمزے میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھی چنانچہ باغ میں پہنچتے ہی وہ ایک آم کے درخت کی طرف جو پھلوں سے لدا کھڑا تھا خوش خوش بڑھے اَلھڑپن کے ساتھ لپکی اور اُچک کر اس کا ایک آم توڑنے لگی۔ اُسے شہزادے کی موجودگی کا بھی لحاظ نہیں رہا جو اُس وقت باغ میں ٹہل رہا تھا۔ زین آبادی

کی اس ادا نے شہزادے کو کچھ ایسا موہ لیا کہ وہ بالکل بے خود ہو گیا اور اس کو اپنے مرتبے کا بھی لحاظ نہ رہا اور اُس نے اپنے مرتبے سے گر کر خالہ سے اُس کنیز کو مانگ لیا۔ زہد و تقویٰ اور مذہبی تعلیم کے باوجود اُس پر زین آبادی کا جادو اس درجہ کارگر ہوا کہ وہ دنیا و مافیہا کو بھی بھلا بیٹھا۔ اسی سلسلے میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ایک روز زین آبادی نے شہزادے کو شراب پیش کی اور اس سے درخواست کی کہ وہ اسے پئے لیکن جب شہزادے کی انتہائی خوشامد کا زین آبادی پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اپنی ضد پر اڑی رہی تو بیچارے شہزادے نے پیالہ اُس کے ہاتھ سے لے لیا اور اُسے پینے والا ہی تھا کہ اُس جادوگرنی نے اُس کے ہاتھ سے پیالہ چھین لیا اور کہا کہ اس سے میرا مطلب آپ کی محبت کا امتحان تھا نہ کہ آپ کے لب مبارک کو شراب کی سی ناپاک اور ناہنجار چیز سے آلودہ کرنا تھا۔ اس داستانِ محبت نے اتنا طول کھینچا کہ بات شاہجہان کے کانوں تک جا پہنچی۔ دارا شکوہ اورنگ زیب سے یونہی ناخوش تھا۔ اس لئے اس نے اس واقعے سے فائدہ اُٹھا کر شہنشاہ کی نظروں سے بھائی کو خوب گرا دیا اور کہا کہ کہاں یہ زہد و تقویٰ اور کہاں یہ مکاری اور پھر خالہ کے گھر کی ایک ادنیٰ کنیز کے ساتھ یہ مذاق سے اُس کی زندگی کا پھول موسم بہار ہی میں کمہلا گیا اور شہزادے کو اس کی دائمی جدائی پیش آئی اور وہ اورنگ آباد میں ایک بڑے تالاب کے پاس دفن ہے جس دن اُس کا انتقال ہوا اُس دن شہزادہ بہت مغموم اور بدحواس تھا چنانچہ انتہائی اضطراب اور بےچینی میں وہ گھوڑے پر سوار ہو کر شکار کو چل دیا میر عسکری (عاقل خاں) جو اس شکار میں شہزادے کا ہمرکاب تھا اُس نے شہزادے کو علیحدہ بلا کر کہا کہ اس اضطراب اور بےچینی میں شکار کا کون سا تک تھا اس کے جواب میں شہزادے نے فارسی کا ایک دردانگیز شعر پڑھا جس کا مفہوم تھا کہ گھر میں رونے سے دل کی بھڑاس نہیں نکلا کرتی صرف تنہائی میں ہی طبیعت بھر کر رویا جا سکتا ہے۔ اس کے جواب میں عاقل خاں نے فی البدیہہ اپنا ایک شعر پڑھا جو اسی موقع کی مناسبت سے اُس نے کہا تھا اور جس کا مفہوم یہ تھا۔

"عشق بظاہر کتنا آسان معلوم ہوتا ہے لیکن اُف کتنا دشوار ہوتا ہے
جُدائی کس درجہ تکلیف دہ چیز ہے لیکن اُس سے محبوب کو کیسا سکون ملتا ہے"

عاقل خاں کا شعر سن کر شہزادہ ضبط نہ کر سکا اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے وہ شعر پڑھ پڑھ کر پوچھتا رہا کہ یہ کس کا شعر ہے مگر عاقل خاں نے اسکو نہیں بتایا اس واقعے کو منوچی نے بھی لکھا ہے مگر اُس نے اس کی تفصیل ذرا دوسرے طریقے پر بتائی ہے۔

ابتدائی عہد کی رقص کرنے والی عورتوں میں ایک کنیز سے اورنگ زیب کو بہت اُنس تھا اور اُس سے محبت اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ کچھ مدت تک اعتدال روزہ بھی چھوٹ گیا اور اُس کی جگہ رقص و سرود نے لے لی بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ شراب نوشی پر اتر آیا اس کی شراب پینے کی عادت اس رقاصہ لڑکی کی ڈالی ہوئی تھی یہ رقاصہ مر گئی اور شہزادے نے اس روز سے عہد کر لیا کہ وہ نہ کبھی شراب پیئے گا اور نہ گانا سُنے گا اسی پر بعد میں وہ کہنے لگا تھا کہ خدا نے مجھ پر بڑا رحم کیا کہ اُس رقاصہ کو اُٹھا لیا جس کے سبب اس کو کتنی بداعمالیوں میں مبتلا ہونا پڑا۔"

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ عشق اُسے کس زمانے میں ہوا تھا اورنگ زیب دکن میں دو مرتبہ بحیثیت صوبہ دار رہا ہے پہلی بار ۱۶۳۶ء سے ۱۶۴۴ء تک اور دوسری بار ۱۶۵۳ء سے ۱۶۵۸ء تک۔ بظاہر یہ واقعہ دوسری مرتبہ کا معلوم ہوتا ہے جبکہ اُس کو دوسری بار دکن کا صوبہ دار بنا کر بھیجا گیا تھا کیونکہ خان زمان، مرشد قلی خاں خراسانی اور میر عسکری (عاقل خاں) اسی زمانے میں اُس کی ماتحتی میں تھے اس لئے بظاہر یہ واقعہ زیادہ سے زیادہ ۱۶۵۳ء کا معلوم ہوتا ہے جس وقت کہ اُس کی عمر ۳۵ سال کی تھی اور وہ چھ بچوں کا باپ ہو چکا تھا۔ وہ درحقیقت عاشق مزاج نہ تھا مگر ممکن ہے کہ جوانی نے اُس کی آنکھوں پر محبت کے پردے ڈال دیئے ہوں۔

اکبر کے زمانے میں دستور تھا کہ مغل بادشاہوں میں کنیزوں کے نام اُن کی جائے پیدائش کی مناسبت سے رکھے جاتے تھے چنانچہ اسی وزن پر اکبرآبادی، فتح پوری، اورنگ آبادی، زین آبادی اور اودے پوری کے نام پر عورتیں اور کنیزیں اُس کے حرم میں داخل تھیں۔ زین آباد ایک مقام ہے جو تاپتی ندی کے مقابل نواح برہان پور میں واقع ہے۔ اس رقاصہ کے مقبرے کا ذکر احکام عنایت اللہ میں ملتا ہے مگر اس نے غلطی سے اُسے زین پوری لکھا ہے۔

۱؎ مگر اس نسخے میں بہت سی غلطیاں ہیں کیونکہ سیف خاں کی شادی ملکہ بانو سے ہوئی تھی جو ممتاز محل کی بڑی بہن تھی نہ کہ صالحہ سے اور سیف خاں کو ۱۶۲۸ء میں شاہجہاں کی تخت نشینی کے وقت خاندیش کی گورنری سے علیحدہ کر دیا گیا تھا جس کے بعد پھر وہ کبھی وہاں نہیں بھیجا گیا۔ ملکہ کا انتقال ۲۵ اگست ۱۶۴۱ء کو ہوا ہے۔ اس کا شوہر سیف خاں بھی ۱۶۳۹ء میں بنگال میں فوت ہوا

۲؎ بادشاہ نامہ وارثی باب ۵۴

۳؎ بادشاہ نامہ مصنفہ عبدالحمید جلد دوم صفحہ ۲۴۱

۴؎ بادشاہ نامہ مصنفہ عبدالحمید جلد دوم صفحہ ۱۹۸

میجر جنرل آتما سنگھ جنرل آفیسر کمانڈنگ جموں ایریا

جو کشمیر کے محاذ پر موٹر کے حادثے میں هلاک هو گئیے۔ آپ کی نعش فوجی احترام
کے ساتھ دهلی لائی گئی جہاں وزرا اور اعلیٰ حکام کی موجودگی میں آخری رسوم ادا کی گئیں

چند غیرؤ
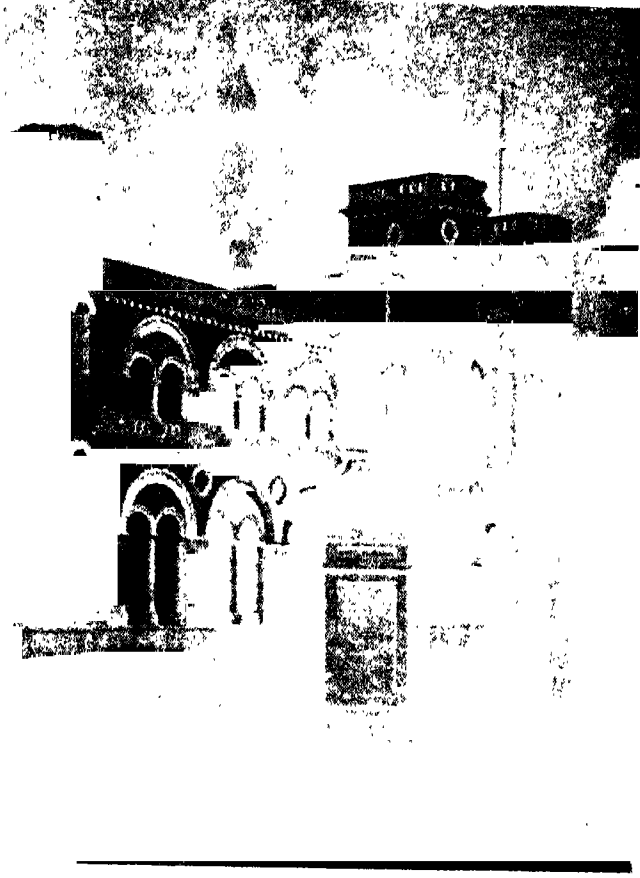
وہ مقام جہاں گاندھی جی پیدا ہوئے۔

اس مکان کا بڑا دروازہ جس میں گاندھی جی نے جنم لیا
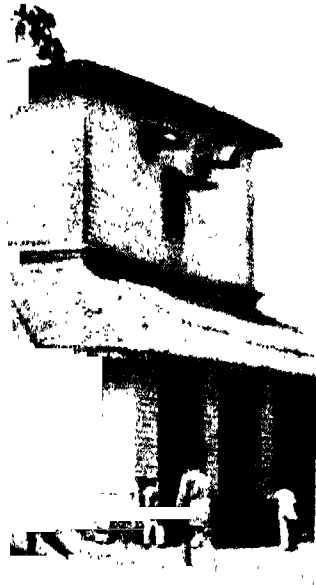
راجکوٹ کا پرائمری
اسکول جہاں مہاتماجی
نے تعلیم حاصل کی۔

یادگاریں

الگریڈ ھائی اسکول کا
ایک منظر۔
یہ وہ اسکول ھے جہاں
مہاتماجی نے میٹریکویشن
کا امتحان پاس کیا۔

شری کابا گاندھی کے مکان کا وہ کمرہ جہاں گاندھی جی مطالعہ کیا کرتے تھے۔

مہاتماجی کے پتا شری کابا گاندھی کے سکونتی مکان (واقع راجکوٹ) میں داخل ھونے کا راستہ۔ یہ وہ مکان ھے جہاں مہاتما گاندھی نے اپنے بچپن کے ایام گزارے۔
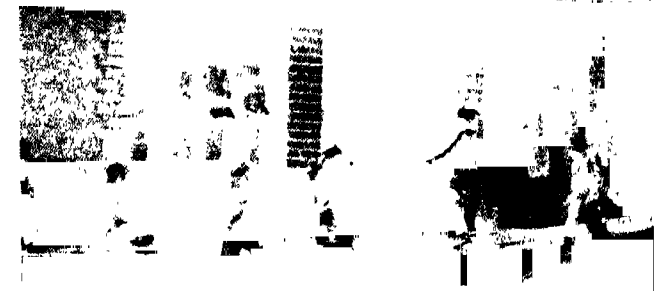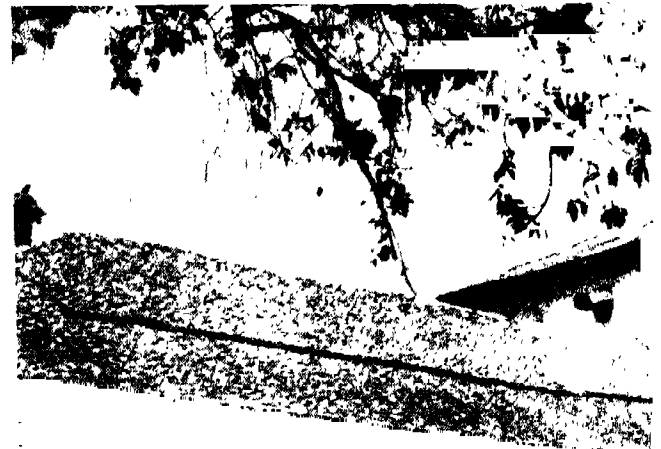
پنڈت نہرو

مشرقی پنجاب میں

پنڈت جواہر لال نہرو نے ستمبر میں مشرقی پنجاب کا دورہ کیا۔ اوپر کی تصویر میں آپ فیروز پور میں ایک لانس نائک کو تمغہ لگا رہے ہیں۔ نیچے کی تصویر لدھیانے کے ایک پبلک جلسے کا منظر پیش کرتی ہے جس میں پنڈت نہرو ایک جمِ غفیر سے خطاب کر رہے ہیں۔

مانی جائسی

نقوشِ مانی

لب پہ عیشِ عہدِ ماضی کا ہے افسانا ہنوز
جا چکی ہے فصلِ گل اور میں ہوں دیوانا ہنوز

چین کیسا قبر میں، سر پہ ہے روزِ باز پرس
داستانِ دردِ ہستی کو ہے دوہرانا ہنوز

اب بھی شرحِ سوزِ دل کرتی ہے پروانے کی خاک
سُن رہی ہے شمع خاموشی سے افسانا ہنوز

کیا مٹے اُمیدِ تاثیرِ دُعا کا اضطراب
دِل ہے شانِ رحمتِ باری کا دیوانا ہنوز

عمر بھر کھایا فریبِ دوستی لیکن یہ دِل
رسم و راہِ اہلِ عالم سے ہے بیگانا ہنوز

نا اُمیدی بھی مداوائے بے قراری کا نہیں
مشغلہ دل کا ہے تم کو یاد فرمانا ہنوز

زندگی آخر ہوئی لیکن ہوس کی حد نہیں
قبر بننے کو ہے اور بنتا ہے کاشانا ہنوز

پھینک دی ساقی شراب اے وائے بے صبریٔ شوق
لب تک آنے بھی نہیں پایا تھا پیمانا ہنوز

زیست کی ہر سانس ہوتی ہے ہم آغوشِ فنا
ہر نفس ہے مَوت اور باقی ہے مرجانا ہنوز

کہتے کہتے عرصۂ محشر تک آیا ہوں مگر
نا مکمل ہے غمِ دُنیا کا افسانا ہنوز

پیہم آنکھوں کا جھپکنا کیا جُز ایمائے سجود
اِن اشاروں سے مگر مانیؔ ہے بیگانا ہنوز

نریش کمار شاد

غزل

ہونٹوں کی مسکان میں ڈھل کے
غم آیا ہے بھیس بدل کے

دیکھ کے تجھ کو سوئی آشا
جاگ اُٹھی ہے آنکھیں مل کے

تیرے پیار بھرے نینوں میں
آنسو ہیں یا شعر غزل کے

من میں تیرے پریم کی یادیں
آگ میں چھینٹے امرت جل کے

غمِ دُنیا کے ہم دونوں کو
انگاروں میں پھول کنول کے

نکھرا ہے جیون کا چہرہ
ارمانوں کی آگ میں جل کے

آج کے پچھلے اندھیارے میں
دیکھ رہا ہوں سپنے کل کے

دِل کی آہیں گیت بنی ہیں
شادؔ مرے شعروں میں ڈھل کے

گوپال متل

شوپنہار

انیسویں صدی کا ابتدائی نصف حصہ مایوسی اور نراشا کا زمانہ تھا، اور اس دور کے سارے ادب اور فلسفے پر یاسیت کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ اس دور نے برطانیہ میں بائرن، فرانس میں ڈے میوزٹ، جرمنی میں ہائنے، اٹلی میں لیوپارڈی اور روس میں پشکن کو جنم دیا، اور ان سب کے نغمے انسانی قلب کی شکست کی آواز ہیں۔ اس دور کے بہترین مغنی شوپن اور بیتھوون بھی غمناک ترانے ہی الاپتے رہے، اور اس دور کا بہترین فلاسفر شوپنہار قنوطیت اور نامرادی کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

اس کی کتاب "دنیا بطور عزم و خیال" اس زمانے کی شکست خوردہ ذہنیت کی منہ بولتی تصویر ہے، یہ کتاب ۱۸۱۸ء میں شائع ہوئی۔ یہ "مقدس اتحاد" کا زمانہ تھا۔ واٹرلو کی جنگ جاری تھی، اور انقلاب مر چکا تھا، سارا یورپ سرنگندہ تھا، ہزاروں لوگ جو عزم اور جرأت کے دھنی تھے، وقت کی تلوار کا شکار ہو چکے تھے اور لاکھوں ایکڑ زمین بنجر ہو چکی تھی۔ یورپ کی وہ خوشحالی جو اس کی تمدنی ترقیوں کا سرچشمہ تھی، انقلاب اور ردِ انقلاب کی بھینٹ چڑھ چکی تھی، اور ہر طرف نکبت اور ادبار کا دور دورہ تھا۔ ۱۸۰۴ء میں شوپنہار نے فرانس اور آسٹریا کا سفر کیا تو دیہات کی پامالی اور کسانوں کے افلاس نے اس کے دل پر گہرا اثر کیا۔ شہروں کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی اور جہاں تک صنعتی مزدوروں کا تعلق ہے ان کا اخلاقی زوال اس حد تک پہنچ چکا تھا، کہ وہ اپنی قلیل آمدنیوں کو اپنی اور اپنے بچوں کی خوراک پر صرف کرنے کے عوض اسے شراب نوشی پر ضائع کر دیتے تھے۔

یہ تاریخی ماحول ہی ایک ذی حس آدمی کو قنوطی بنا دینے کے لئے کافی تھا، لیکن فطرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ اس کے ذاتی حالات اس سے بھی زیادہ ناسازگار ثابت ہوئے۔ اس کی صحت خراب تھی، ماں بے مہر تھی، اور باپ نے اس کے بچپن میں ہی خودکشی کر لی تھی۔ اس صورت میں رجائیت اس کی زندگی میں کس طرح بار پا سکتی تھی۔

شوپنہار کے نزدیک باقی تمام فلاسفر اس بنیادی غلطی کا شکار تھے ان کے نزدیک انسانی ذہن کی نمایاں ترین خصوصیت اس کا شعور ہے۔ شوپنہار کے نزدیک شعور صرف انسانی ذہن کی سطح ہے۔ اس سطح کے نیچے شعوری یا غیر شعوری طور پر انسان کا عزم کارفرما ہے۔ بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعور انسانی عزائم کی راہ نمائی کر رہا ہے۔ لیکن یہ ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی خادم اپنے آقا کی راہ نمائی کرے۔ عزم کی حیثیت ایک اندھے توانا شخص کی ہے جو اپنے کاندھوں پر ایک ایسے اپاہج شخص کو بٹھا لیتا ہے جو دیکھ تو سکتا ہے لیکن چل نہیں سکتا۔ ہم اگر کسی چیز کی تمنا کرتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ ہمارے پاس ایسا کرنے کے دلائل موجود ہیں بلکہ ہم ہر اس چیز کے حصول کے لئے دلائل پیدا کر لیتے ہیں جس کی ہمیں تمنا ہو۔ ایسا بارہا ہوتا ہے کہ ہم دلائل سے کسی انسان کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس پر دلائل کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ اپنی ہٹ پر قائم رہتا ہے۔ شوپنہار کے نزدیک یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عزم اور تمنا کے مقابلے میں دلائل کی کوئی حیثیت نہیں۔ لہٰذا وہ منطق کو سرے سے ہی بے سود چیز قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک منطق کی اس سے زیادہ اور کوئی اہمیت نہیں کہ وہ اس فن کے ماہرین کی معاش کا وسیلہ ہے۔ اگر کسی شخص کو قائل کرنا ہو تو اس کے مفاد اور اس کے عزائم کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ منطق سے کسی شخص کو قائل کرنا ناممکن ہے۔ دلائل ہمارے عزائم اور ہماری تمناؤں کے غلام ہیں اور اگر ان کا راستہ ہماری تمناؤں کے راستے سے مختلف ہو تو ہم ان

کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔

انسان کا شعور تھک جاتا ہے۔ لیکن عزم کبھی نہیں تھکتا عزم اور تمنا ہمیشہ جوان رہنے والی چیزیں ہیں۔ دنیا کی تمام سرگرمیوں کا مرکز انسان کا یہ عزم ہے کہ وہ زندہ رہے اور بھرپور زندگی بسر کرے۔

لیکن دنیا کا انحصار اگر عزم اور تمنا پر ہے تو یہ ہمیشہ دار المحن بنی رہے گی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے انسانی عزم کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے۔ اگر اسے دس باتوں میں کامیابی ہو، تو پچاس باتوں میں ناکامی بھی ہوگی۔ انسانی تمناؤں کی تکمیل بھوکے بھکاری کو روٹی کا ٹکڑا دینے کے مترادف ہے۔ اس سے اس کا وقتی طور پر پیٹ ضرور بھر جائے گا، لیکن کل اسے بھوک پھر ستائے گی اور اس کی مصیبت میں مزید اضافہ ہوگا۔ شوپنہار کے نزدیک انسانی زندگی کی مکمل تصویر اتنی دردناک ہے کہ انسان اسے دیکھنا تک گوارا نہیں کر سکتا۔ ہمارے زندہ رہنے کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں زندگی کے متعلق بہت کم علم ہوتا ہے

زندگی کے غموں سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ شوپنہار کے نزدیک عزم اور تمنا سے نجات حاصل کرنا ہے یہ وہی چیز ہے جسے بھگوان بدھ نے نروان کہا ہے شوپنہار بھی نروان کے فلسفے کا قائل تھا وہ بدھ دھرم کا بڑا مداح تھا اور اسے یورپ کے فلسفوں سے بہتر خیال کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مشرق میں عیسائیت بدھ دھرم پر کبھی غالب نہ آسکے گی "یہ ایک چٹان پر گولی چلانے کے مترادف ہے" شوپنہار کا یہ خیال بھی تھا کہ ہندوستان کا فلسفہ اور سنسکرت ادب یورپ کے افکار پر گہرا اثر ڈالیں گے۔ ایک مقام پر وہ لکھتا ہے "سنسکرت ادب کا اثر اس اثر سے کم گہرا نہ ہوگا۔ جو پندرھویں صدی میں یونانی علوم کے احیا سے پیدا ہوا"۔

شوپنہار ۲۲ فروری ۱۷۸۸ء کو ڈینزگ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ تجارت پیشہ تھا، ذہین، سریع الاشتعال اور آزاد منش ۱۷۹۳ء میں ڈینزگ پر پولینڈ کا قبضہ ہو گیا۔ اور شوپنہار کا باپ اس شہر کو چھوڑ کر ہمبرگ چلا گیا۔ اس وقت ننھے شوپنہار (آرتھر) کی عمر صرف پانچ سال تھی شوپنہار کا باپ اسے بھی تاجر بنانا چاہتا تھا اور اس کی ابتدائی تربیت اسی پیشے میں ہوئی تھی بعد میں شوپنہار نے اس پیشے کو کچھ خیر باد کہہ دیا

لیکن اس ابتدائی تربیت کا اس کی فطرت پر تھوڑا بہت اثر ضرور باقی رہا۔ اس کی طبیعت کا کھردرا پن، اس کی حقائق پسندی اور معاملہ فہمی اسی تربیت کا نتیجہ تھی

شوپنہار کے باپ نے ۱۸۰۵ء میں خودکشی کر لی۔ اس کی دادی پہلے ہی دیوانگی کی وجہ سے مر گئی تھی۔ شوپنہار کا کہنا ہے کہ "انسان کو کردار اور عزم اپنے باپ سے ورثے میں ملتے ہیں اور ذہانت ماں سے" اس کی ماں ذہین ضرور تھی اور اپنے وقت کے مشہور ناول نگاروں میں شمار ہوتی تھی، لیکن ذہانت کے علاوہ وہ کردار اور عزم کی مالک بھی تھی۔ وہ اپنے تاجر پیشہ اور غیر دلچسپ خاوند کو پسند نہیں کرتی تھی۔ لہٰذا اس کے مرتے ہی اس نے جنسی بے راہ روی کی زندگی شروع کر دی۔ وہ ہمبرگ کو چھوڑ کر ویمر چلی گئی کیونکہ یہ شہر اس قسم کی زندگی کے لئے بہت سازگار تھا شوپنہار پر اس صورت حال کا وہی اثر ہوا جو ہملٹ پر اس کی ماں کی دوسری شادی کا ہوا تھا۔ اپنی ماں کے ساتھ تعلقات کی کشیدگی نے اسے عورتوں سے ہی متنفر کر دیا اور اس کے فلسفے میں عورتوں کی بار بار مذمت کا باعث اس کی والدہ ہی کی ذات ہے ماں بیٹے کے تعلقات کا اندازہ شوپنہار کی والدہ کے اس خط سے لگایا جا سکتا ہے: "تم ناقابل برداشت اور تکلیف دہ ہو، تمہارے ساتھ زندگی بسر کرنا بڑا ہی مشکل ہے۔ تمہارے غرور نے تمہاری تمام اچھائیوں پر پردہ ڈال رکھا ہے اور تمہاری اس عادت نے کہ تم دوسرے لوگوں میں کیڑے ڈالنے سے باز ہی نہیں رہ سکتے تمہیں دنیا کے لئے بالکل بے مصرف بنا دیا ہے" ان حالات میں ان کا نباہ مشکل تھا۔ لہٰذا ماں بیٹے الگ ہو گئے اس کے بعد بھی شوپنہار کبھی کبھی ایک مہمان کی حیثیت سے اپنی والدہ کی دعوتوں میں شرکت کرتا رہا۔ اب جب رشتہ داروں کی طرح جھگڑنے کے امکانات ختم ہو گئے تھے وہ شریف اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے کا احترام کر سکتے تھے لیکن گوئٹے کی وجہ سے یہ رسمی تعلقات بھی ختم ہو گئے۔ یہ عظیم شاعر شوپنہار کی والدہ کا بڑا مداح تھا کیونکہ وہ اسے اس کی محبوبہ کے ہمراہ اپنے گھر بلا لیا کرتی تھی۔ ایک دن ترنگ میں آکر گوئٹے نے شوپنہار کی والدہ پر یہ حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی کہ اس کا بیٹا لازوال شہرت حاصل کرے گا شوپنہار کی ماں یہ بات سن کر آگ بگولا ہو گئی اور اس نے شوپنہار اور اس کے مداح دونوں کو ہی دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ گوئٹے نے صرف یہیں پر اکتفا نہیں کی بلکہ چلتے چلتے یہ بھی بتا دیا کہ آنے والی نسلیں اسے

اس کے ناولوں کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے بیٹے کی وجہ سے یاد رکھیں گے

شوپنہار نے اس واقعہ کے تھوڑے ہی دن بعد ویمر کو خیرباد کہہ دیا، اور اس کے بعد اس کی ماں اگرچہ ۲۴ سال تک زندہ رہی، لیکن شوپنہار اس کی شکل دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں یہ بات دلچسپی کا باعث ہوگی کہ شوپنہار کی طرح ہائنن بھی ۱۷۹۸ء میں ہی پیدا ہوا تھا اور اپنی ماں کے ساتھ اس کے تعلقات بھی اسی طرح خراب تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت اس وقت کے تمام دانشوروں کے ساتھ ایک ظالمانہ کھیل کھیل رہی تھی بھلا جن لوگوں کو ماں کی محبت کے عوض اس کی نفرت سے پالا پڑے وہ دنیا کے متعلق کوئی خوشگوار رائے کس طرح قائم کرسکتے ہیں۔

شوپنہار یاس پسند ہونے کے علاوہ بلا کا شکی مزاج بھی تھا۔ اسے یہ غلط فہمی تھی کہ ساری دنیا اس کے خلاف مصروفِ سازش ہے اور ہر ذی روح اسے آزار پہنچانے کے درپے ہے اس کی طبیعت کا اندازہ ان امور سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے تمباکو پینے کے پائپ تالا لگا کر رکھتا تھا، کسی حجام سے حجامت نہیں بنواتا تھا کہ وہ کہیں اس کی گردن نہ کاٹ دے اور سوتے وقت اپنے دونوں پہلوؤں میں بھرے ہوئے پستول رکھ لیتا تھا۔ شوروشر سے تو اسے بے اندازہ نفرت تھی۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے "میری ہمیشہ یہ رائے رہی ہے کہ آدمی جتنا زیادہ شور برداشت کرسکے اسی تناسب سے وہ کم عقل ہوگا۔ یہ بات اتنی سچی ہے کہ شوروشر برداشت کرنے کی قوت کو کم عقلی کا پیمانہ قرار دیا جاسکتا ہے...... شور ذہین آدمیوں کے لئے سب سے بڑا عذاب ہے۔ بے جا قوت کے اظہار کے لئے لوگ طرح طرح سے جو شور مچاتے ہیں۔ اس سے مجھے زندگی بھر تکلیف پہنچتی رہی ہے۔"

اسے نفرت کی حد تک اس بات کا احساس تھا کہ دنیا اس کی عظمت کو تسلیم نہیں کرتی اور اسے دانستہ طور پر شہرت اور کامیابی سے محروم رکھا گیا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے قلب کی گہرائیوں میں الجھتا گیا اور اس کی روح پیچ و تاب کھاتی رہی۔

وہ ماں، بیوی، بچے، خاندان اور ملک، ہر چیز سے محروم تھا۔ اس سلسلے میں نٹشے رقمطراز ہے "وہ بالکل تنہا تھا اور کسی ایک شخص کو بھی اپنا دوست نہیں کہہ سکتا تھا"۔ وہ اپنے زمانے کی وطن پرستانہ سرگرمیوں سے اتنا ہی بے پروا تھا جتنا گوئٹے۔ ۱۸۱۳ء میں ایک بار اس کے دل میں یہ اُمنگ ضرور پیدا ہوئی تھی کہ وہ نپولین کے خلاف جنگِ آزادی میں شریک ہوجائے، اور اس مقصد کے لئے اس نے ہتھیار بھی خرید لئے تھے۔ لیکن اس کی معاملہ فہمی اس کے جوش پر غالب آگئی اور اُس نے یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لی کہ "آخر نپولین نے انتہا اور بھرپور زندگی کی اُسی تمنا کا اظہار کیا ہے جو تقریباً سبھی انسانوں میں موجود ہوتی ہے لیکن وہ اسے مجبوراً دبا لیتے ہیں۔" چنانچہ وہ میدانِ جنگ میں جانے کے عوض ایک گاؤں میں چلا گیا اور منطق کے متعلق ایک کتاب لکھنے میں مصروف ہوگیا۔

اس کتاب کے بعد اس نے اپنی ساری کوششوں کو اپنی مشہور و معروف تصنیف "دنیا، بطور عزم و خیال" پر مرکوز کردیا۔ اس کتاب کا مسودہ پبلشر کو بھیجتے وقت اس نے لکھا تھا "یہ صرف پرانے خیالات کا اعادہ نہیں۔ بلکہ نئے خیالات پر مشتمل ایک جامع اور منضبط نظامِ فکر ہے۔ یہ ایک قابلِ فہم، پُر جوش اور حسین کتاب ہے۔ جو اپنے بعد اسی نوعیت کی سینکڑوں تصانیف کا باعث ہوگی۔" ظاہر ہے کہ یہ الفاظ اشتعال انگیز حد تک خود پسندانہ ہیں لیکن کتاب کے مطالعے کے بعد ان کی صحت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

شوپنہار کی کتاب لاکھ اچھی سہی لیکن اسے مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ دنیا اس قدر افسردہ اور تھکی ہوئی تھی کہ اسے اپنی تھکن اور افسردگی کے اسباب جاننے کی مہلت نہ تھی۔ کتاب کی اشاعت کے سولہ سال بعد شوپنہار کو اپنے پبلشر کی طرف سے یہ اطلاع ملی کہ کتاب کا بیشتر حصہ ردی میں فروخت کر دیا گیا ہے۔ اس ناکامی سے دل برداشتہ ہوکر اس نے "شہرت" کے نام سے جو مقالہ لکھا ہے اس میں ایک اور مصنف کے الفاظ کا حوالہ دے کر اپنی کتاب کی اشارتاً اس طرح تعریف کی ہے "اس قسم کی کتابیں آئینے کی طرح ہیں، اگر دیکھنے والا گدھا ہو تو اسے وہاں فرشتہ نظر نہیں آسکتا۔" اسی مجروح غرور کے ساتھ شوپنہار ایک اور جگہ رقمطراز ہے "جو شخص مستقبل اور عام انسانیت سے

جتنا قریب ہوگا اپنے ہمعصروں کے نزدیک وہ اتنا ہی اجنبی ہوگا۔ آگے چل کر تو وہ بالکل ہی جامے سے باہر ہو جاتا ہے "کیا کوئی مغنی ان لوگوں کی ستائش پر خوش ہو سکتا ہے جن کے متعلق اسے یقین ہو کہ وہ کانوں سے بہرے ہیں۔ اور صرف اپنے محروم سماعت ہونے کے عیب کو چھپانے کے لئے زور زور سے تالیاں پیٹ رہے ہیں"

ویمر چھوڑنے کے بعد اس نے تنہائی کی زندگی شروع کر دی تھی۔ اس تنہائی میں صرف ایک بات مخل ہوئی۔ اس کی یہ زبردست تمنا تھی۔ کہ وہ اپنے "عظیم فلسفے" کو کسی یونیورسٹی میں پیش کر سکے۔ اس مقصد میں اسے ۱۸۲۲ء میں کامیابی ہوئی۔ جب اسے برلن آنے کی دعوت دی گئی۔ لیکن یہاں آ کر اس نے اپنے لیکچروں کے لئے وہی وقت منتخب کیا جب اس دور کا مقبول ترین فلسفی ہیگل درس دیا کرتا تھا۔ شوپنہار کا خیال تھا۔ کہ طلبا اس کے اور ہیگل کے درمیان موازنہ کرتے وقت "مستقبل کی نگاہ" سے کام لیں گے لیکن بے چارے طلبا اس کی "آئندہ عظمتوں" کا اندازہ لگانے میں ناکام رہے۔ اور شوپنہار کو خالی کرسیوں کے سامنے لیکچر دینا پڑا۔ شوپنہار نے فوراً استعفیٰ دے دیا۔ اور اپنی ناکامی کا انتقام لینے کے لئے ہیگل کے خلاف انتہائی زہرناک مضمون لکھے۔ ۱۸۳۱ء میں برلن میں ہیضہ پھیل گیا۔ تو ہیگل اور شوپنہار دونوں وہاں سے بھاگ گئے۔ ہیگل جلد ہی واپس آ گیا۔ اور ہیضے کا شکار ہوا۔ لیکن شوپنہار نے اس وقت تک دم نہیں لیا۔ جب تک فرینکفورٹ نہ پہنچ لیا۔ اس کے بعد وہ جیتے جی وہیں رہا۔

ایک ذہین قنوطی کی طرح اس نے قلم کے زور سے زندہ رہنے کی کوشش کبھی نہیں کی۔ اپنے والد کی فرم میں اس کا جو حصہ تھا اس کی آمدنی سے وہ بآسانی گزراوقات کرتا رہا۔ روپے پیسے کے معاملے میں وہ اتنی ذہانت کا ثبوت دیتا تھا۔ جو ایک فلسفی کے کسی طرح بھی شایان شان نہیں۔ ایک کمپنی جس کے اس نے حصے خرید رکھے تھے فیل ہو گئی۔ باقی قرض خواہ ستر فیصدی پر رضامند ہو گئے لیکن شوپنہار سو فیصدی پر بضد رہا اور بالآخر اس نے مقدمہ دائر کر کے یہ رقم وصول کر لی۔ اس نے اپنی زندگی کے آخری تیس سال ایک بورڈنگ ہاؤس میں بسر کئے۔ جہاں اس نے دو کمرے کرایہ پر لے رکھے تھے ایک کتے کے علاوہ اس کا کوئی ہم نفس نہیں تھا۔ اس کتے کا نام اس نے "روح العصر" رکھا تھا۔ لیکن شریر لوگ اسے "ننھا شوپنہار" کہہ کر پکارتے تھے۔ شام کا کھانا وہ ایک ایسے ہوٹل میں کھایا کرتا تھا جو برطانوی افسروں کی آماجگاہ تھا۔ وہ جب بھی کھانے پر بیٹھتا ایک طلائی سکہ نکال کر میز پر رکھ دیتا اور کھانے کے بعد اسے پھر جیب میں ڈال لیتا۔ آخر ایک دن ہوٹل کے ایک ملازم نے برہم ہو کر اس رسم کی وجہ پوچھی۔ شوپنہار نے جواب دیا۔ کہ یہ ایک غائبانہ شرط ہے جس روز کسی برطانوی افسر نے اس ہوٹل میں گھوڑوں، عورتوں یا کتوں کے علاوہ کسی اور موضوع پر گفتگو کی۔ میں یہ سکہ بطور خیرات دے دوں گا۔

جرمنی کی یونیورسٹیوں نے شوپنہار کی کتابوں کو یکسر نظرانداز کئے رکھا غالباً وہ اس کے اس دعوے کی تائید کرنا چاہتی تھیں۔ کہ فلسفے نے اس وقت تک جتنی ترقی بھی کی ہے، وہ درسی اداروں سے باہر ہوئی ہے۔ نٹشے کے الفاظ میں "جرمن پروفیسر کی برہمی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ شوپنہار ان سے ہر بات میں مختلف تھا" لیکن شوپنہار صبر اور ضبط کا قائل تھا اسے یقین تھا۔ کہ خواہ کتنی ہی دیر ہو جائے۔ اس کی عظمت کو تسلیم ضرور کیا جائے گا۔ بالآخر اس کا اعتماد درست ثابت ہوا۔ طبقۂ متوسط کے لوگ ڈاکٹر، وکیل اور تاجر۔ یہ محسوس کرنے لگے کہ یہ فلسفی فوق الطبیعاتی نظریے پیش کرنے کے بدلے زندگی کی حقیقتوں کو قابل فہم انداز میں پیش کرتا ہے۔ آدرشوں کی شکست نے یورپ کے دل میں اس فلسفے کی عزت بڑھا دی۔ جو ۱۸۱۵ء کی شکست کا ترجمان تھا۔ سائنس کے ہاتھوں مذہب کی شکست اور جہد البقا کے نظریے نے اس کی مقبولیت میں مزید اضافہ کیا۔ اس طرح بڑھاپے میں اسے وہ شہرت مل گئی۔ جس کا وہ زندگی بھر طلب گار رہا تھا۔

اس کے متعلق جتنے مضمون بھی شائع ہوتے وہ ان کو دلچسپی اور شوق سے پڑھتا تھا۔ اس نے اپنے تمام واقفکاروں سے کہہ رکھا تھا۔ کہ اس کے متعلق جہاں کہیں کوئی چیز شائع ہو وہ اسے

فوراً بھیج دیں۔ ڈاک کے مصارف شوپنہار خود ادا کیا کرتا تھا۔ اپنی شہرت سے وہ اس درجہ مطمئن تھا۔ کہ کھانے کے بعد باقاعدہ ستار بجایا کرتا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ اس بوڑھے قنوطی کی زندگی میں آشا کی لہر داخل ہو گئی ہے۔ دور دراز کے لوگ اس کی زیارت کو آنے لگے۔ اور ۱۸۵۸ء میں اس کی سترہویں سالگرہ پر یورپ کے مشہور ترین لوگوں نے مبارکباد کے تار بھیجے۔ اس کے بعد وہ صرف دو سال زندہ رہا۔ ۲۱ ستمبر ۱۸۶۰ء کو وہ بظاہر تندرست ناشتے کی میز پر بیٹھا ایک گھنٹے کے بعد اس کی میزبان نے اُسے جوں کا توں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ لیکن قریب جاکر معلوم ہوا۔ کہ اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔

قتیل شفائی

پچھتاوا

آڑی ترچھی راہوں والی رنگ رنگیلی دھرتی
اُونچے پربت سے مل کر آکاش سے باتیں کرتی

چھوٹے چھوٹے ندی نالے جس نے پالے پوسے
جس کا اُجلا پانی لیتا ہے کھیتوں کے بوسے

جس نے کالے بادل پی پی کر اُگلی ہریالی
جس نے ٹھنڈے جھونکوں سے لہکائی ڈالی ڈالی

جس نے سونے شہتوتوں کو گہرے گہرے سائے
جس نے اپنے آنگن میں خوابوں کے جال بچھائے

اُس دھرتی پر چھائے ہوئے وہ البیلے باغیچے
جیسے اِک چھوٹی سی جنت ہو آکاش کے نیچے

اس چھوٹی سی جنت میں برسوں آباد رہا ہوں
کہتے ہیں اِک حور کو مدت تک میں یاد رہا ہوں

میری حور وہی البیلی، لانبی پلکوں والی
جس نے برسوں کی ہے میرے خوابوں کی رکھوالی

جس نے چلتے وقت کہا تھا جا کر بھول نہ جانا"
لیکن مجھ کو بھول گیا وہ پیار بھرا افسانہ

میں ایسا پردیس میں کھویا یاد نہ کی وہ دھرتی
کب تک میری یاد میں وہ البیلی آہیں بھرتی

میں نے اس کو بسرایا تو وہ بھی مجھ کو بھولی
سنتا ہوں اِک شہری سے وہ مل کر جھولا جھولی

آخر وہ کرتی بھی کیا کچھ اور نہیں تھا چارا
تڑپ تڑپ کر ٹوٹا ہوگا اُمیدوں کا پارا

وہ بے چاری پہروں میٹھی نیند نہ سوئی ہوگی
جب تھک ہار گئی ہوگی جی کھول کے روئی ہوگی

سینے میں بھڑکی ہوں گی صحرا کی سی دوپہریں
چپکے چپکے آنکھوں سے نکلی ہوں گی نہریں

آنسو پونچھ کے جانے اس نے پھر کیا سوچا ہوگا
سوگ منا کر قسمت کا بالوں کو نوچا ہوگا

جیسے میں نے ٹھکرا دی اس کی بھرپور جوانی
ایسے ہی وہ بن بیٹھی ایک اور محل کی رانی

سوچ رہا ہوں اب بھی روتا روتا دیس کو جاؤں
اپنی پریم سمادھی پر اشکوں کے پھول چڑھاؤں

شمیم کرہانی

بہار آرہی ہے

گاڑی چلی جا رہی تھی، ہواؤں میں سینہ تانے، اندھیرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، چاند تاروں سے بازی لگائے، چھوٹے بڑے کثیر قصبوں سے گھنے جنگلوں میں اُجالا پھینکتی، جھاڑیوں کے گرد خوردہ جالوں میں روشنی بھرتی، ندی میں تیرتی ہوئی چھوٹی بڑی بیشمار مچھلیوں کی آنکھوں کو چکاچوند کرتی، مچان پر لیٹے ہوئے کسان کو للکارتی کہ اٹھ رے کسان! سویرا قریب ہے، بہار آرہی ہے، اٹھ اور اس ہمہ گیر آرائش کے کام میں تو بھی ہاتھ بٹا۔

اچانک انجن نے سیٹی دی اور زینت نے چونک کر باپ کو دیکھا۔ انجینئر ابھی سو رہا تھا اور اس کے خراٹے گاڑی کے پُرشور ترنم سے لڑ رہے تھے۔ وہ اٹھ کر برتھ پر بیٹھ گئی۔ اس کا سفر سرمئی شام سے شروع ہوا تھا اور اب کاجل سی کالی رات ڈھلی جا رہی تھی۔ وہ بی۔ اے کے امتحان سے فارغ ہو چکی تھی اور اب وہ اپنے باپ کے ساتھ اپنے وطن جا رہی تھی، خوابوں کی سنہری دنیا سے نکل کر زندگی کی جلتی چٹان پر قدم رکھنے۔ کیسی دلکش ہے یہ چٹان، جس پر سہانے خوابوں کے بے شمار شیش محل گرے اور گر گر کر چور چور ہو گئے۔ لیکن اس جلتی چٹان کو چھاتی سے لگائے بغیر ٹھنڈک بھی تو نہیں پڑتی۔

زینت کے رخسار گلابی ہو گئے اور اسے امجد بھائی کا خیال آگیا جو یونیورسٹی میں پروفیسر تھے اور جن کے وہاں اسے چند گھنٹوں کے لئے سفر کو ملتوی کر کے رکنا تھا کہ انجینئر کو شہر میں کئی ضروری کام تھے اور بہت سے پرانے ساتھیوں سے ملنا تھا۔ اُس نے ذہن میں پروفیسر کے مکان کا خاکہ بنایا اور سوچنے لگی "امجد بھائی نے شادی کیوں نہیں کی بھابی بغیر تو گھر سُونا سُونا ہوگا" اور معاً اس کے بوڑھے باپ نے کروٹ لی اور وہ سنبھل گئی۔

گاڑی چلی جا رہی تھی اور وہ کھڑکی سے گزرنے والے مناظر کو دیکھ رہی تھی لیکن سب سے پہلے بیدار ہونے والی مخلوق ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔ ننھے منے بے شمار پرندے غذا اور تنکوں کی تلاش میں سرگرداں تھے، بھوک مٹانے، پیاس بجھانے اور چار تنکے چُن کر رین بسیرا بنانے کے لئے کہ لو دھوپ اور آندھی پانی میں وہ اپنی اور اپنے انڈوں کی حفاظت کر سکیں کہ انڈے فطرت کے اصول رنگین اور تخلیق کی بیش بہا پونجی ہیں۔

زینت نے کھڑکی سے سر باہر نکالا۔ ستارے جھلملا رہے تھے دھندلا دھندلا سا سویرا ہو رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گاڑی رات کو پیچھے چھوڑتی صبح کی طرف تیزی سے بھاگی جا رہی ہے

دفعتہً گاڑی نے ایک ہلکے جھٹکے کے ساتھ پٹری بدل دی۔ سرات بھر کی جاگی زینت جھکولے کے ساتھ سنبھل گئی، اور انجینئر آخری خراٹا لے کر جاگ پڑا۔

"تم جاگ رہی ہو زینو!" انجینئر نے زینت سے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"اسٹیشن آگیا ابا۔ اُٹھئے" زینت نے برتھ سے اترتے ہوئے کہا۔ اور تھوڑی دیر میں اسٹیشن آگیا اور وہ اُتر پڑے۔

تانگے میں بیٹھتے ہوئے زینت نے باپ سے پوچھا "امجد بھائی آئے نہیں ہمیں لینے؟"

بوڑھے نے جماہی لیتے ہوئے کہا "نوجوان ہی تو ٹھہرا، لگ گئی آنکھ!" اور زینت کو محسوس ہوا جیسے باپ نے اس پر طنز کر دیا ہو کہ نوجوان سوتا رہا اور تو رات بھر جاگی۔ وہ جھینپ سی گئی۔ سچ مچ اسے سونا چاہیئے تھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

پروفیسر کے مکان پر تانگہ رکا تو زینت گرتے گرتے بچی۔ ایک لمحے کے لئے اُس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ مگر اس ایک لمحے کی نیند نے اُس کے بازو تھام لئے اور وہ لڑکھڑا کر گرنے سے بچ گئی۔

باپ نے کہا "سو گئی تھیں"؟ اور وہ جواب میں مسکرا کر اتر پڑی۔

تانگے والے نے سامان برآمدے میں رکھ دیا اور کرایہ لے کر آگے بڑھا۔ وہ دونوں دھیرے دھیرے چل کر برآمدے میں آکھڑے ہوئے۔ مکان نیا تھا۔ ہال، دو بغلی کمرے۔ برآمدہ برساتی اور اس کے آگے چھوٹا سا خوشنما لان۔

ہم کب تک کھڑے رہیں گے؟ زینت نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا اور پروفیسر کمرے سے برآمد ہوا۔ ملگجی سی قمیص۔ ملگجا سا پاجامہ، اُلجھے بکھرے بال، آنکھوں میں تفکّر اور ہونٹوں پر کھوئی کھوئی سی مسکراہٹ پروفیسر نے پاس آکر سلام کیا اور وہ معذرت کے لہجے میں بولا۔

"معاف کیجئے گا چچا صاحب! میں اسٹیشن نہ پہنچ سکا۔ یونیورسٹی کی سلور جبلی ہے۔ بارہ بارہ بجے رات تک دوڑتا رہتا ہوں۔ رات ایک بجے کے قریب پلٹا، دو بجے تک نیند نہیں آئی، پانچ بجے آپ کی گاڑی آتی ہے انجینئر نے پروفیسر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو کوئی بات نہیں بیٹے کوئی بات نہیں، تم اچھے تو رہے؟ پروفیسر نے بوڑھے چچا کے سینے پر سر رکھ دیا اور زینت نے محسوس کیا جیسے اُس کے دل سے گرم گرم بھاپ اُٹھ کر آنکھوں میں بھری جا رہی ہے اور وہ سر جھکا کر مسکرانے لگی۔

پروفیسر دنیا میں اکیلا تھا! بالکل اکیلا، بس دور کے عزیزوں میں ایک یہی بوڑھے چچا تھے، جو اُس کے خون اور رشتے کے اُجاڑ صحرا میں سوکھے درخت کی طرح نازک سی ایک پنکھڑی "زینت" کو لئے کھڑے تھے۔ پروفیسر نے سر کو چچا کے سینے سے ہٹاتے ہوئے عبدل کو آواز دی، اور مہمانوں کو لئے ہال میں داخل ہوا، انجینئر ایک کوچ پر بیٹھ گیا، زینت ذرا ہچکچائی، اس کے سفری میلے کپڑے اس کوچ سے کہیں زیادہ صاف تھے جس پر گرد کی ایک موٹی سی تہہ جم گئی تھی، پروفیسر نے بے تکلفی سے کہا۔ بیٹھ جایئے" اور وہ جلدی سے کوچ پر بیٹھ گئی مگر اُسے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اچانک اس نے بہت سی بالو چبالی ہے۔ اور اسے جھرجھری سی آگئی۔

بیٹھتے بیٹھتے پروفیسر نے کہا۔ آج میں دن بھر غیر حاضر رہوں گا۔ سلور جبلی کا افتتاح آج ہی ہے مجھے سارے دن کام کرنا ہے۔ لیکن میں کوشش کر کے سات ساڑھے سات تک آجاؤں گا"۔ انجینئر بولا۔ تو مجھے بھی اس سے پہلے فرصت ملنا مشکل ہے بہت سے کام ہیں اور کئی پرانے ساتھیوں سے ملنا ہے.... مگر...... زینت کی طرف مخاطب ہو کر اُس نے کہا..... مگر تم کیا کرو گی؟

"میں سوؤں گی" زینت نے بد دلی کے ساتھ جواب کو پھینکا اور منھ لٹکا کے مسکرانے لگی۔ پروفیسر نے سنجیدگی سے کہا "آرام کیجئے ضرور آرام کیجئے" اور عبدل سے مخاطب ہو کر اُس نے کہا "چائے ناشتہ" اور پھر وہ مہمانوں سے بولا۔ تو جب تک ہم نہا دھو کر طیار ہو جائیں۔

نہا دھو کر انھوں نے ناشتہ کیا اور چائے پی تب انجینئر اور پروفیسر اپنے اپنے کاموں پر چل دیئے" اور اکیلی زینت مکان میں رہ گئی۔ بوڑھا عبدل باورچی خانے میں کچھ کھٹ پٹ کر رہا تھا، زینت ہال میں بیٹھی سوچ رہی تھی "عجیب سا آدمی ہے" بالکل خشک، بالکل اُجاڑ، بالکل سنسان، آخر یہ اپنی زندگی کو کہاں رکھ کے بھول گیا" معاً اُسے اس خیال نے چونکایا کہ وہ کسی کے بالکل نجی مسئلے پر کیوں غور کر رہی ہے، جلدی جلدی اس نے اپنی آنکھیں نچائیں اور گھبرا کے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

اب سوال یہ تھا کہ وہ لیٹے کہاں، اس نے سارے ہال پر ایک سرسری نظر دوڑائی، ہر چیز ناصاف تھی، بے ترتیب تھی، غمزدہ تھی، اُداس تھی، اور کسی متوقع سلیقے کے انتظار میں کھوئی کھوئی سی۔ گرد آلود کوچ کونے میں پڑا تھا، کرسیوں پر کپڑے بکھرے پڑے تھے، چھوٹے کوچ پر ریڈیو سیٹ جھکا جھکا سا رکھا تھا، میز کے گلدان اُلٹے گئے تھے اور ان کے پھول سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے، قدِ آدم آئینہ اُلٹا لٹکا ہوا تھا جسے دیکھ کر وہ ہنس پڑی اور ڈر گئی کہ تنہائی میں وہ کیوں ہنس رہی ہے، اُس نے سوچا اب اس کو سو جانا چاہیئے مگر ہال میں تو بڑی گندگی تھی وہ بغلی کمرے میں گئی کہ وہاں کوئی صاف پلنگ ہو تو سو رہے اور وہاں پلنگ تھا مگر پلنگ پر کپڑوں کا ٹرنک اور دو گاؤ تکئے رکھے تھے، بجلی کا چولھا زمین پر پڑے ہوئے لحاف کے اوپر رکھا تھا اور لحاف گرد کی موٹی سی چادر اوڑھے زمین پر ڈھیر تھا۔ وہ گھبرا کر

دوسرے کمرے میں گئی۔ چھوٹی بڑی چھ الماریوں میں کتابیں بھری پڑی تھیں الماریوں کے اوپر کتابیں، الماریوں کے نیچے کتابیں، میز پر کتابیں، کرسیوں پر کتابیں، پلنگ پر کتابیں، سرھانے کتابیں، پائنتی کتابیں، سیدھی کتابیں بندکتابیں کھلی کتابیں، ادھ کھلی کتابیں غرض زمین کتابیں، آسمان کتابیں کمرہ کیا تھا کتابوں کا گودام تھا، اُس نے سوچا۔ یہ شخص کتابیں پڑھتا ہے اور کتابیں چھاپتا ہے۔ اچانک اس کی نظر دیوار کی طرف اُٹھ گئی۔ مہاتما گاندھی کی تصویر آویزاں تھی، گرد آلود تصویر۔ اُس نے جلدی سے ہاتھ بڑھاکر تصویر اُتارلی اور ریشمی دوپٹے کے صاف اور ملائم آنچل سے صاف کرنے لگی یہاں تک کہ تصویر چمک اُٹھی اور مہاتما کی مفکر آنکھوں کا ابدی تبسم ایک بار پھر اُجاگر ہو کر سامنے آگیا۔ اور...... اور زینت نے محسوس کیا جیسے باپو کے متبسم ہونٹ کہہ رہے ہیں "بیٹی! تیرا کام گھر کو بنانا ہے گھر کو سنوارنا ہے۔ بنا سنوار کے اس ٹوٹے پھوٹے سماج کو جگمگاتے ہوئے شیش محل میں تبدیل کر دینا ہے کہ تو عورت ہے، اور عورت ہی گھر کی زینت ہے۔"

زینت نے تصویر کو احترام کے ساتھ آویزاں کیا اور سوچنے لگی کہ یہ سماجی انقلاب سب سے پہلے کس کمرے سے شروع کیا جانے پھر یہ عظیم الشان انقلاب اُس تنہا سے کیونکر ممکن ہے، وہ رات بھر کی جاگی بھی تو ہے اُسے کسی مدد کی ضرورت ہے اُس نے ایک لمحہ سوچا اور عبدل کو آواز دی۔

اور تھوڑی سی ردوقدح کے بعد عبدل اس کی مدد کے لئے تیار ہو گیا۔

سب سے پہلے ہال کی میزیں، کرسیاں اور صوفے باہر نکالے گئے، دیواریں جھاڑی گئیں اور فرش پر جھاڑو دی گئی۔ سامان صاف کئے گئے پھر ہر چیز سلیقے سے ہال میں سجادی گئی، زینت نے گلدانوں کے سوکھے پھول پھینک دیئے اور تازہ پھول لگاکر انھیں میز پر رکھ دیا! ہال میں رنگ و خوشبو نے قدم رکھے، سوئی ہوئی زندگی جاگ اُٹھی، جیسے ہر چیز گنگنانے لگی، کوئی گلابی سا گیت، کوئی ایسا گیت جسے کوئی دوشیزہ تنہائی میں گاتی ہے۔

اور زینت عبدل کو لئے سامان والے کمرے میں پہنچی، ایک ایک چیز صاف کی گئی، پلنگ قاعدے سے لگایا گیا، بکس ٹھیک کئے گئے اور زینت نے زمین پر پڑے ہوئے لحاف کو اُٹھاکر تہ کیا اور تہ کرتے کرتے اس نے محسوس کیا کہ وہ بہت تھک گئی ہے۔ اس کی کلائیاں دُکھنے لگی ہیں اور نیند سے وہ نڈھال ہوئی جارہی ہے۔ وہ پلنگ پر لحاف رکھ کر بیٹھ گئی اُس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں اور اس کا جی چاہا کہ اب وہ سو جائے کہ بوڑھے عبدل نے پاس آکر کہا "تھک گئیں بیٹیا!" زینت نے آنکھیں کھول دیں اور تھکے ہوئے لہجے میں گرد آلود ہونٹوں پر تبسم پھیلاتے ہوئے کہا "یہ سب کیسے ٹھیک ہوگا بابا، یہ میں نے کیا کر ڈالا، یہ تجربہ مجھے نہیں کرنا چاہیئے تھی، میں مسافر ٹھہری، مجھے ڈگر ڈگر کی صفائی سے کیا کام تھا۔ بوڑھے نے پیار بھرے لہجے میں ڈھارس بندھائی "تم سورہو بیٹیا، بس ایک ہی کمرہ تو رہ گیا ہے، میں اسے ٹھیک کرلوں گا، تم سورہو اور اچانک اسے کچھ خیال آیا اور اس نے کہا۔ "اور بیٹیا تم نے کچھ کھایا نہ پیا، بس کام میں لگی ہو، ٹھہرو میں تمہارے لئے کچھ کھانے کو لاؤں،" زینت نے کہا "نہیں" میں رات بھر جاگی ہوں، جب تک اچھی طرح سو نہ لوں، کچھ کھا پی نہیں سکتی تو چلو آرام کمرے کو بھی ٹھیک کردیں۔

اور وہ دونوں آرام کمرے میں پہنچے۔ دیوار اور فرش کی صفائی کی گئی، بکھری ہوئی کتابیں سمیٹی گئیں اور انھیں الماریوں میں لگادیا گیا۔ زینت نے پلنگ کی چادر بدلی، تکیوں کے غلاف بدلے اور سرھانے رکھی ہوئی میز کو صاف کیا، بجلی کے لیمپ کو اس نے دھویا، بلب پر سیاہ سیاہ چتیاں پڑ گئی تھیں، انھیں بھی اس نے دھو کے چمکا دیا اور تب عبدل نے کہا "بیٹیا سارے کمرے سج گئے۔ اب مجھے باورچی خانے کی خبر لینے دو۔" یہ کہہ کے وہ چلا گیا، اور زینت نے بتی دبا کے روشنی کی اور سارا گھر جگمگا اُٹھا نئے رنگ سے، نئے روپ سے، جیسے زینت نے سارے سماج کو بدل ہی ڈالا، جیسے وہ سچ مچ کسی عظیم الشان انقلاب کی ہیروئن ہے۔ مضبوط عزائم اور فولادی ارادوں والی ملائم، دلکش اور حسین ہیروئن جس کی انفرادی فتح پارٹی کی فتح تھی، قوم کی فتح تھی، ملک کی فتح تھی، ایشیا کی فتح تھی، ساری دُنیا کی فتح تھی۔

اور وہ نیند اور تھکن سے چور چور ہو کر جلد از جلد دوسرے کے پلنگ

پر بیٹھی تھی، اس کی کلائیاں دُکھ رہی تھیں، اس کی ریشمی شلوار گھٹنوں سے سرک گئی تھی، جمپر سے گریبان کھل گیا تھا، دوپٹے کا آنچل کندھے سے سرک کر زمین پر آ رہا تھا۔ اور اس کے گورے گورے شانوں پر گھنی گھنی پلکوں پر کالے کالے بالوں پر تھوڑی تھوڑی گرد جم گئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے بال سفید ہو گئے ہیں اور وہ بوڑھی ہو گئی ہے۔

اور زینت اور تھکن نے اسے پلنگ پر ڈھکیل دیا، وہ گرتے ہی سو گئی اور عبدل کشتی میں چائے اور بسکٹ لئے جلدی جلدی برآمدے میں داخل ہوا اور اس نے دیکھا، اس کے مالک کا کھنڈر شیش محل کی طرح جگمگ جگمگ کر رہا ہے اور پروفیسر برآمدے میں حیرت زدہ کھڑا ہے۔ عبدل نے جلدی سے کشتی برآمدے کی میز پر رکھی اور بولا۔

بھیا دیکھو تو کیسی رُت پلٹ گئی، جیسے بہار آ گئی ہو اور وہ پروفیسر کے بالکل پاس جا کر ترنم کے بولا جیسے آج میرے بھیا کا بیاہ ہوا ہے جیسے آج گھر میں دلہن آ گئی ہے۔

آں۔ پروفیسر نے چونک کر کہا اور آہستہ آہستہ چل کے ہال میں جا کھڑا ہوا۔ سارا ہال صفائی، صحت، رنگ، خوشبو اور روشنی سے معمور تھا۔ اس نے بڑھ کے ایک گلدستہ اٹھایا اور منھ کے پاس لا کر ایک لمبی سانس کھینچی اور اسے محسوس ہوا جیسے وہ ٹھنڈی ٹھنڈی خوشبو پی گیا۔ اس کے دل میں کوئی منھ بند سی کلی کھلنے لگی اور اس کے دماغ میں کوئی نہ کیا ہوا رنگین و معطر ریشمی رومال کھلنے لگا۔

عبدل نے آواز دی۔ بھیا چا ... اور وہ "ابھی نہیں" کہتا ہوا آرام کمرے میں گھس گیا۔ لیکن وہ دروازے پر ٹھٹھک رہا۔ زینت تکیوں پر سر رکھے بے خبر سو رہی تھی، اس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا، ایک پاؤں پٹی کے نیچے اور خود سرپٹی پر تھا، وہ داہنے ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی کلائی تھامے سو رہی تھی، اس کی کھسکی ہوئی شلوار سے اس کے گھٹنوں کی گلابی گلابی جلد جھلک رہی تھی، دوپٹہ پیٹھ کے نیچے دب گیا تھا اور گریبان نقرئی گداز تک چاک ہو گیا تھا۔

پروفیسر دھیرے دھیرے آگے بڑھا اور پلنگ کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ لمحہ بھر بعد اس نے پھر ہمت کی اور اب کی اس کے ہاتھ زینت کی ایڑیوں سے مس ہوئے، لیکن اس نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا جیسے اس نے انگارا چھو لیا، وہ اپنی انگلیوں کو مٹھی میں دبائے دیر تک کھڑا رہا اور پسینے میں نہاتا رہا نہ جانے اسے اتنا پسینہ کیوں آ رہا تھا، وہ گھبرا کے پیچھے ہٹا اور الماری کھول کر کوئی کتاب ڈھونڈنے لگا نہ جانے کون سی کتاب تھی جسے وہ فوراً پڑھنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ کتاب ملتی نہیں تھی۔ اس نے ساری الماریاں دیکھ ڈالیں اور بالآخر تھک کے وہ کرسی پر بیٹھ گیا، اور بیٹھتے ہی پھر اٹھ کھڑا ہوا، اور کمرے میں ٹہلنے لگا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ اچانک موسم اتنا گرم کیوں ہو گیا کہ اس کے ماتھے سے چنگاریاں برس رہی ہیں، اس کے سینے میں آگ امڈ رہی ہے اور اس کی رگوں میں شعلے بہ رہے ہیں، اس نے ہاتھ بڑھا کے پنکھا پوری طاقت سے کھول دیا۔

پنکھا آندھی کی طرح چلا، اور تھکی ماندی زینت کی نیند کو لے اڑا، اس نے ناگہانی ٹھنڈک اور ہوا کے دباؤ سے آنکھیں کھول دیں۔ پروفیسر سامنے کھڑا تھا، وہ گھبرائی ہوئی اٹھی اور دوپٹہ کندھے پر کھینچتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔

سوری Sorry میں نے آپ کو جگا دیا۔ پروفیسر نے سراسیمہ لہجے میں کہا۔ اور زینت نے نظریں جھکا کر جواب دیا "معاف کیجئے گا۔ میں ذرا تھک کے لیٹ گئی تھی"

پروفیسر نے متشکر لہجے میں کہا ——— "آپ نے بڑی تکلیف کی، میں آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا..... آج مجھے محسوس ہوا ...... محسوس ہوا ...... اور ہاں آپ نے وہ کتاب کہاں رکھ دی۔

"کون سی کتاب" زینت نے میٹھے لہجے میں پوچھا۔

وہ ——— وہی جو میرے سرہانے ادھ کھلی رکھی تھی — جسے رات میں پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا۔ پروفیسر نے گھبراہٹ کے ساتھ کہا۔

زینت مسکراتی ہوئی آگے بڑھی اور الماری کھول کر بولی — سرہانے کی کچھ کتابیں میں نے یہاں رکھ دی تھیں، اور اس نے ایک کتاب نکالتے ہوئے کہا — دیکھئے یہ تو نہیں۔

پروفیسر نے جلدی سے کتاب تھام لی اور کہا ——— جی ہی

"اُفوہ، میں تو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا۔ بہت بہت شکریہ آپ نے میری بڑی مدد کی لیکن...... لیکن...... پروفیسر نے کتاب کو سینے پر رکھ کر باہوں میں دباتے ہوئے کہا ـــــ آپ..... آپ تو آج چلی جائیں گی..... کل..... کل مجھے کسی کتاب کی ضرورت ہوئی، تو میں کیا کروں گا۔

زینت کے گالوں کی سرخی تیز ہوئی اور اُس کے ہونٹوں پر کرنوں کی سی مسکراہٹ جھلک اُٹھی، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ...... "زینو، زینو" کہتا ہوا انجینئر کمرے میں داخل ہوا اور پاس آکر بولا ـــ "۹ بج گئے بیٹا، دس پر ہماری ٹرین چھوٹ جاتی ہے"

پروفیسر نے جیسے نڈھال لہجے میں کہا ـــ "تو آج آپ لوگ چلے ہی جائیں گے چچا صاحب؟"

انجینئر نے جواب دیا ـــ "ضرور بیٹے ضرور ــ بڑے اہم کام ہیں بڑے اہم ـــ اور عبدل نے کمرے میں داخل ہو کر کہا ـــ "کھانا میز پر لگ گیا ہے بھیا ـــ زینت بولی ـــ آپ لوگ چلیں، میں چند منٹ میں نہا کے آئی اور تب انجینئر نے زینت کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا "ضرور۔ ضرور۔ تم تو گرد میں نہائی ہوئی ہو۔ زینت مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی

وہ کھانا کھا کے اُٹھے تو تانگہ تیار کھڑا تھا، عبدل نے سامان رکھ دیا، انجینئر اور پروفیسر تانگے میں جا بیٹھے، زینت نے جگمگاتے ہوئے گھر پر نگاہ ڈالی، آخری، بھرپور نگاہ اور عبدل کے ہاتھ پر پانچ کے نوٹ رکھتے ہوئے اُس نے کہا "تم نے میری بڑی مدد کی بابا" عبدل کی آنکھیں بھر آئیں، اور اُس نے گلوگیر لہجے میں کہا "بھول نہ جانا بیٹا، پھر آنا" زینت نے مسکرا کر کہا "یہ دلچسپیوں سے دل نہیں لگاتے بابا، بڑا اچھا ہوتا ہے" اور وہ تیز تیز قدم رکھتی ہوئی تانگے پر جا بیٹھی۔

اور ـــــــ اور یہ تانگہ جب گاڑی میں تبدیل ہو گیا، اور گاڑی سیٹی دے کر جب رینگنے لگی تو پروفیسر نے بوڑھے چچا سے پوچھا "اب آپ لوگ کب تک آئیں گے چچا؟" انجینئر نے کہا "جب خدا لائے بیٹے جب خدا لائے" لیکن زینت نے شرمائی ہوئی آنکھیں جھکا لیں اور داہنے ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی کلائی آہستہ آہستہ دبانے لگی۔

مہر چند کھنہ

شرنارتھیوں کا مسئلہ

آزادی ملتے ہی ہندوستان کو تباہ حال لوگوں کی امداد و بحالی کا جو سانحہ درپیش آیا۔ دنیا کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ لیکن نوزائیدہ حکومت نے مستقل مزاجی اور مضبوطی سے اس الجھن کو سلجھایا۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں شرنارتھیوں کی مردم شماری کی گئی۔ جس سے معلوم ہوا کہ مغربی پاکستان سے ۴۲۲۴۰۰۰ لوگ ہندوستان میں آئے۔ نیم مستقل الاٹمنٹ سے قبل مشرقی پنجاب میں ۲۷۲۶ کنبوں کو نکاسیوں کی اراضی پر بسایا گیا۔ ان کنبوں کو ۲۳۸۶۷۰۰ روپے کے قرضے دیئے گئے۔ اب پانچ لاکھ اشخاص کے لئے ضلع وار نیم مستقل الاٹمنٹ ہو رہی ہے۔ دہلی اور اجمیر مارواڑ میں دو لاکھ شرنارتھیوں کو نکاسیوں کے مکان الاٹ کئے گئے۔ آٹھ لاکھ لوگ تعمیر ہونے والے مکانوں میں بسائے گئے۔ سرکاری کوششوں سے ایک لاکھ علاوہ شرنارتھیوں کو روزگار دلایا گیا۔ جن میں ۵۰۰۰۰ عورتیں تھیں۔

حکومت ہند تباہ حال اور بے خانماں لوگوں کی امداد و بحالی کے مسئلے سے جس قدر بے چین رہی ہے اتنی کسی اور مسئلے سے نہیں ہوئی۔ اپریل میں لندن روانہ ہونے سے پیشتر ہندوستان کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ شرنارتھیوں کو بسانے کا معاملہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ دنیا کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اگر حکومت ہند اسے تیزی سے حل نہیں کر سکی۔ تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ حکومت نے کوشش نہیں کی یا اپنی کوشش کو جاری نہیں رکھا۔

پاکستان سے تقسیم کے بعد جو لوگ ہندوستان آئے اُن کی تعداد ڈنمارک یا فن لینڈ یا سوئیٹزرلینڈ یا آئرلینڈ کی کل آبادی سے بھی زیادہ تھی۔ اتنے لوگوں کے لئے رہن سہن، خوراک، طبی امداد اور زندگی کی دیگر ضروریات مہیا کرنا ایک ایسی الجھن تھی جسے سلجھانے کے لئے کوئی بھی تجربہ کار حکومت کانپ اٹھتی۔ لیکن ہندوستان کی نوزائیدہ حکومت نے مستقل مزاجی اور مضبوطی سے اس کام کو پورا کیا۔

پاکستان سے لوگوں کو نکالنے کا کام جب ختم ہو گیا تو حکومت ہند نے بے خانماں لوگوں کی گنتی کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ صحیح اعداد و شمار کی بنا پر بحالی کی پالیسی مرتب کی جا سکے چنانچہ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں مغربی پاکستان سے آنے والے شرنارتھیوں کی مردم شماری کی گئی جس سے معلوم ہوا کہ مغربی پاکستان سے قریباً ۴۲۲۴۰۰۰ لوگ ہندوستان آئے۔ یہ شمار چار صوبوں تیرہ ریاستوں یا ریاستی یونینوں اور مرکزی نظم و نسق کے ماتحت علاقوں میں ہوا۔ اس مردم شماری سے پیشتر دلی میں مختلف صوبوں اور ریاستوں کے وزراء اعظم کی ایک کانفرنس ہوئی۔ جس میں ہر صوبے اور ریاست میں شرنارتھیوں کی خاص خاص تعداد کو بسانے کا فیصلہ کیا گیا۔ صوبوں اور ریاستوں کے بحالی کے منصوبوں کو جلد از جلد مرتب کرنے کے لئے دسمبر ۱۹۴۸ء میں وزارت امداد و بحالی میں ایک شعبہ بحالی کھول دیا گیا۔ اس شعبے کی بدولت حکومت ہند کی طرف سے بحالی کے ہر منصوبے کو بہت جلد مالی منظوری مل گئی۔

مردم شماری کے نتائج

مردم شماری سے معلوم ہوا کہ پاکستان سے آنے والے لوگوں کے کل ۸۵۸۰۰۰ کنبے ہیں۔ ان میں سے ۲۴۳۹۰۰ کنبے کیمپوں میں تھے۔ ۴۷۸۰۰ دھرم شالاؤں یا عارضی جگہوں میں۔ ۱۹۵۴۰۰ کنبوں نے مکان خرید لئے تھے یا کرائے پر حاصل کئے تھے۔ اور باقی ۲۴۴۷۰۰ کنبے ایسے مکانوں میں تھے جو عارضی طور پر ان کے قبضہ میں تھے ان میں نکاسیوں کے مکان بھی شامل تھے۔

اس مردم شماری کے مطابق پاکستان میں جو لوگ اپنی روزی کما لیتے تھے، ان کی تعداد ۷۴۸۸۰۰۰ تھی۔ ان میں سے ۴۴۵۱۰۰ زرعی کام کرتے تھے۔ اور ۱۲۰۵۰۰ دیہاتی پیشوں سے متعلق تھے۔ مردم شماری کے وقت ہندوستان میں ۴۴۲۰۰۰ لوگ زراعت اور ۱۵۶۹۰۰ دیہاتی پیشوں سے روزی کما رہے تھے۔

پاکستان میں شہری پیشوں سے روزی کمانے والوں کی تعداد ۴۸۲۳۰۰ تھی۔ اس کے مقابلہ میں مردم شماری کے وقت ہندوستان میں ان لوگوں کی تعداد ۲۴۲۳۸۰۰ معلوم ہوئی۔

مردم شماری کے وقت کیمپوں میں ۴۳۹۰۰ کنبوں کو خوراک اور دیگر ضروریات مفت ملتی تھیں۔ اس تعداد کو چھوڑ کر اور مذکورہ بالا اعداد و شمار کو سامنے رکھتے ہوئے اندازہ لگایا گیا کہ مردم شماری کے وقت ہندوستان میں ۱۰۲۵۰۰ شرنارتھی بے روزگار تھے۔

دیہاتی بحالی

دیہاتی شرنارتھیوں کی بحالی شہری شرنارتھیوں کی نسبت آسان تھی۔ کیونکہ مشرقی پنجاب اور کچھ ریاستوں میں نکاسیوں کی اراضی دستیاب تھی۔ مشرقی پنجاب میں نیم مستقل الاٹ منٹ سے قبل الگ بھگ ۲۷۶۰۰۰ کنبوں کو قریباً تیس لاکھ ایکڑ زمین پر بسایا گیا۔ ان کنبوں کو خوراک۔ چارہ بیل کنوؤں اور مکانوں کی مرمت اور زرعی آلوں کے لئے ۲۲۸۰۷۷۰۰ روپیہ سے زائد کے قرضے دیئے گئے۔

آج کل نیم مستقل الاٹ منٹ کا کام ہو رہا ہے۔ اس کے مطابق قریباً پانچ لاکھ لوگوں کو اراضی ملے گی۔ یہ بھی کوشش کی جا رہی ہے، کہ مغربی پنجاب کی ضلع وار آبادی کو برقرار رکھا جائے۔

الور۔ بھرت پور کے لئے گیارہ ہزار کنبے بسانے کا کوٹا مقرر ہوا تھا۔ ان میں سے ۵ ہزار کنبے وہاں پہنچ چکے ہیں۔ اور خریف کے لئے بیج بو رہے ہیں۔ دس ہزار سے زائد کنبوں کو بیکانیر میں اراضی الاٹ کی گئی ہے۔ میرٹھ گنگا کھادر کی اسکیم میں ۱۷۵۰ کنبے۔ نینی تال ترائی میں ۵۷۵۰ کنبے اور راجستھان۔ بمبئی و اجمیر مارواڑہ میں ۳۰۰ کنبے بسانے کی اسکیمیں منظور ہو چکی ہیں۔ حکومت ہند نے الور اور بھرت پور میں ستّر ہزار میوؤں کو بحال کرنا بھی منظور کیا ہے۔

شہری بحالی

اندازہ ہے کہ آج کل مشرقی پنجاب اور پٹیالہ ریاست ہائے مشرقی پنجاب کی یونین میں گیارہ لاکھ لوگ دلی اور اجمیر مارواڑ میں قریباً دو لاکھ لوگ اور چند دوسری جگہوں پر قریباً ایک لاکھ لوگ نکاسیوں کے مکانوں میں رہ رہے ہیں۔ قیاس ہے کہ تعمیر کی نئی اسکیموں سے آٹھ لاکھ لوگوں کو مکانات مہیا کئے جائیں گے۔

حکومت ہند نے پچھلے سال اعلان کیا تھا کہ ہر شرنارتھی کنبے کو ایک مکان یا مکان بنانے کے لئے ایک قطعہ اراضی ملے گا۔ بہت سے صوبوں اور ریاستوں میں مکانات بنانے کی اسکیمیں مکمل ہو چکی ہیں۔ اور جگہوں پر ان اسکیموں کو عملی شکل دی جا رہی ہے۔ کلیان۔ گاندھی دھام۔ شاہجہان پور۔ مودی نگر۔ راجپورہ۔ فریدآباد۔ کانکاجی۔ بہار۔ بمبئی۔ صوبجات متوسط و برار۔ دہلی۔ پٹیالہ و ریاست ہائے مشرقی پنجاب کی یونین۔ مشرقی پنجاب۔ مدھیہ بھارت۔ میسور۔ مہاراجستھان۔ سوراشٹرا اور صوبجات متحدہ میں نئی بستیاں تعمیر کی جائیں گی۔

روزگار دلانے کا کام

حکومت نے شرنارتھیوں کو اپنی روزی خود کمانے کے قابل بنانے کے لئے تین طرح سے امداد کی۔ (۱) افراد گروہوں اور کوآپریٹو سوسائٹیوں کو قرضے دیئے گئے۔ ۳۱ جولائی ۱۹۴۹ء تک صوبائی و ریاستی حکومتوں اور بحالی کے مالیاتی ادارے کی طرف سے ان سب کو کل چار کروڑ پچاس لاکھ روپے دیئے جا چکے تھے۔ اس میں مالیاتی ادارے کی دو کروڑ پچھتر لاکھ روپے کی رقم شامل ہے۔ مالی سال رواں میں یہ ادارہ چار کروڑ پچیس لاکھ روپے مزید قرض دے گا۔

(۲) شرنارتھیوں کو ہنر مند بنانے کے لئے ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ تربیت کی سہولتیں مہیا کی گئیں اور (۳) سابقہ فوجیوں اور دیگر بیروزگاروں کے لئے ملازمت دلانے والی ایجنسیوں سے کام لیا گیا۔

شرنارتھی بیوپاریوں کو دہلی میں نکاسیوں کی پانچ ہزار اور مشرقی پنجاب میں سترہ ہزار دکانیں الاٹ کی گئیں۔ بتّی لاکھ روپیہ کا ٹیکسٹائل کا سامان شرنارتھیوں اور ان کی سوسائٹیوں کو دیا گیا۔

میکینکل اور پیشہ ورانہ تربیت

آج کل چودہ ہزار شاگرد پیشے یا دستکاری کی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ حال ہی میں کام سیکھنے والوں کی تعداد بیس ہزار تک بڑھا دینے کی منظوری ملی۔ عورتیں بھی کافی تعداد میں کوئی ہنر یا دستکاری سیکھ رہی ہیں۔ اپریل ۱۹۴۹ء کے آخر تک ۴۳ مختلف کیمپوں میں ۱۱۲۵۰ شرنارتھی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ ان میں ۵۷۰۰ عورتیں تھیں۔ حکومت ہند مختلف دستکاریوں کے لئے جاپان سے پچاس قسموں کی چھوٹی مشینیں بھی منگوا رہی ہے۔

ایک لاکھ اشخاص کے لئے روزگار

جون ۱۹۴۹ء کے آخر تک روزگار کی تبادلہ گاہوں۔ ٹرانسفر بیورو اور روزگار کے خاص دفتر کی وساطت سے ۱۰۰۰۰۰ شرنارتھیوں کو روزگار دلایا جا چکا تھا۔ ان میں ۴۵۰۰ عورتیں تھیں۔ ریلوے بورڈ نے ہندوستانی ریلوں میں شرنارتھیوں کے لئے پندرہ ہزار اسامیاں مخصوص کرنا منظور کیا ہے۔

بے سہارا عورتیں اور بچے

اپریل ۱۹۴۹ء کے آخیر تک دہلی، مشرقی پنجاب — صوبجات متحدہ۔ بمبئی اور بہار اجستھان کے بیس کیمپوں میں نو ہزار سے زائد بے سہارا عورتوں و بچوں کی دیکھ بھال کی جا رہی تھی۔ ان بے کسوں کو وہاں ایک نہ ایک دستکاری سکھائی جاتی ہے۔

طلبا کو امداد

حکومت مشرقی پنجاب نے صرف ۵۰-۱۹۴۹ء میں شرنارتھی طلبا پر ۵، لاکھ روپے خرچ کرنے کی منظوری دی ہے۔ اپریل ۱۹۴۹ء کے آخیر تک امریکہ میں اعلے تعلیم پانے والے ہندوستانی طلبا کو ۸۴۰۰۰ ڈالر کی مدد دی جا چکی تھی۔ برطانیہ میں تعلیم پانے والے ۴۳ طلبا پر پورے سال کی فیس اور گذارے کے لئے بارہ ہزار پونڈ خرچ کئے جا چکے ہیں۔

ہریجنوں کی بحالی

یکم جون ۱۹۴۹ء کو مرکزی وزارت بحالی کے ہریجن سیکشن کا کام آل انڈیا ہریجن سیوک سنگھ کو سونپ دیا گیا۔ اس سنگھ کو ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی مدد دی گئی ہے۔ دہلی میں ہریجنوں کے لئے پانچ سو مکانات بنائے گئے

اور سات صنعتی کوآپریٹو سوسائٹیاں کام کر رہی ہیں۔

شرنارتھی فوجی عملہ

اکتوبر ۱۹۴۸ء میں وزارت دفاع کے ماتحت فوجیوں کی بحالی کا ایک ادارہ قائم کیا گیا۔ اس ادارے کے ماتحت لائزن افسر مختلف مقاموں پر فوجیوں کی بحالی کا معاینہ کرتے ہیں۔ مشرقی پنجاب اور دہلی میں فوجیوں کے لئے مکانوں اور قطعات اراضی کا تعین کیا گیا ہے۔

وزارت کے نام میں تبدیلی

۲۵ اپریل ۱۹۴۹ء کو وزارت امداد و بحالی کا نام وزارت بحالی میں بدل دیا گیا۔ ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۹ء کے بعد شرنارتھیوں کو کیمپوں میں مفت راشن ملنا بند ہو جائے گا۔ جون ۱۹۴۹ء کے آخیر تک ملک بھر کے ۱۰۵ کیمپوں میں قریباً آٹھ لاکھ شرنارتھی مقیم تھے۔ اس میں مغربی بنگال کے کیمپ شامل نہیں۔ مغربی بنگال کے کیمپوں میں آج کل قریباً ۱۰۰۰۰۵ لوگ ہیں۔

ملک میں صنعت و دستکاری کے بہت سے مرکز کھولے جا رہے ہیں تاکہ جب مفت راشن ملنا بند ہو جائے تو کام کرنے کے قابل لوگ خود اپنی روزی کمائیں۔

مغربی بنگال

جون ۱۹۴۹ء کے آخیر تک مغربی بنگال میں اندازاً ۱۱۲۵۰۰۰ شرنارتھی تھے ان میں سے ۹۷۰۰۰۰ صرف کلکتہ میں ہی تھے۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان سے کوئی ڈھائی لاکھ شرنارتھی سیدھے آسام۔ تری پورہ۔ اور قریباً دس ہزار بہار میں جا چکے ہیں۔ مشرقی پاکستان سے آنے والے لوگوں کا مسئلہ قدرے مختلف اور مشکل ہے۔ کیونکہ اس صورت میں آبادی کا کوئی تبادلہ نہیں ہوا۔ شرنارتھیوں کی بحالی کے لئے حکومت ہند مغربی بنگال کی حکومت کو پانچ کروڑ روپیہ کے پہلے قرضے کی منظوری دے چکی ہے۔ حکومت مغربی بنگال شرنارتھیوں کی بحالی کے لئے متعدد منصوبوں سے کام لے رہی ہے۔

ستمبر ۱۹۴۷ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۴۹ء تک حکومت ہند شرنارتھیوں کو پاکستان سے لانے، ہندوستان میں ان کی مدد کرنے اور انہیں بحال کرنے کے انتظامات پر پچیس کروڑ سے کچھ کم روپیہ خرچ کر چکی تھی۔ اس کے علاوہ دیہاتی بحالی کے لئے قرضوں، شہری لوگوں کی بحالی اور مکانات کی تعمیر کے لئے اب تک ۱۲ کروڑ روپیہ قرض دیا جا چکا ہے۔

ہری چند اختر

نئے مطبوعات

گاندھی جی مرتبہ اسرار احمد آزاد۔ عہد حاضرہ کے رہنمائے اعظم مہاتما گاندھی کی زندگی اور گوناگوں سرگرمیوں کے متعلق اُردو زبان میں بہت سی کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور بہت سی لکھی جائیں گی۔ ان کتابوں میں عام طور پر مصنف کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ مہاتماجی کی زندگی یا مشاغل کا کوئی نیا پہلو پیش کرے یا کسی پہلو کو نئے اور اچھوتے انداز میں نمایاں کیا جائے۔ لیکن اسرار احمد صاحب کا دامن اس قسم کی منصفانہ خود نمائی سے پاک ہے۔ اُنھوں نے مہاتماجی پر اعتبار کیا ہے اور ان کے ارشادات کی صحت پر اعتقاد رکھتے ہُوئے ان کی کسی بات یا سرگرمی کو انوکھی اور مافوق الفطرت قرار دینے کی کوشش نہیں کی بلکہ اُن کے تمام مشاغل کو گرد و پیش کے حالات کا قدرتی و منطقی نتیجہ اور پے درپے پیش آنے والے مسائل کا ردِعمل سمجھ کر واقعات و حقائق اور اسباب و نتائج کو حقیقی ربط و تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اسرار احمد کے نزدیک گاندھی جی کی عظمت کا سب سے بڑا راز یہ تھا کہ وہ پیش آنے والے واقعات اور مسائل کا صحیح تجزیہ کر کے درست قدم اُٹھانے اور اپنے ساتھیوں کو سیدھا رستہ دکھانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ اُن کی تحریکیں اور اقدامات فلسفیانہ موشگافیوں اور منصفانہ توجیہات سے بے نیاز تھے، کیونکہ وہ "مدبرانہ" چالوں اور سیاسی شعبدہ بازیوں سے متنفر تھے۔ جو کچھ کہتے تھے لگی لپٹی رکھے بغیر، اور جو کچھ کرتے تھے کھلے خزانے۔ یہ اور بات ہے کہ اُن کے ساتھیوں، اُن کی قوم اور اہل عالم کو اُن کے بعض اقوال و افعال بعید از عقل معلوم ہوتے تھے یا اُن میں خامیاں نظر آتی تھیں۔ واقعات نے ہمیشہ یہی ثابت کیا کہ خامی کہیں اور ہی تھی —— اسی لئے اسرار احمد نے زیر نظر کتاب میں مہاتماجی کی زندگی کے مکمل حالات پیش کرتے ہوئے حاشیہ آرائی پر واقع نگاری کو ترجیح دی ہے۔

۱۳۵ صفحوں کی اس کتاب میں مہاتماجی کی زندگی کے تمام چھوٹے بڑے واقعات ضروری سیاق و سباق کے ساتھ اس طرح جمع کئے گئے ہیں کہ ان کی کڑیاں ملانے کے لئے نہ تو حافظہ پر زور ڈالنا پڑتا ہے نہ کسی اور کتاب سے مدد لینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ زبان کی شستگی اور انداز بیان کی دلچسپی قابل داد ہے۔ کتاب مجلد ہے گردپوش بھی موجود ہے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت پسندیدہ۔

قیمت ساڑھے پانچ روپے۔

ملنے کا پتہ:—— نیا کتاب گھر۔ اُردو بازار۔ جامع مسجد دہلی۔

آبگینۂ شعر بشیر النسا، بیگم صاحبہ بشیر کے اس مجموعہ کلام میں حمد۔ نعت۔ منقبت۔ قصیدہ۔ غزل مرثیہ سب کچھ موجود ہے۔ حتیٰ کہ وزن کے نقائص اور فنی اسقام بھی۔ ایک خاتون کا کلام ہے۔ اس لئے شاید غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ جلد، کاغذ، کتابت، طباعت کئی مصنفوں اور ناشروں کو بطور نمونہ پیش کی جاسکتی ہے، اور بہت سی اچھی اچھی کتابوں کے لئے باعث رشک ہوگی۔ مطلب یہ کہ آبگینۂ شعر میں آبگینہ بہت ہی اچھا ہے، اور شعر خیر صلاح

قیمت چھ روپے۔ ملنے کا پتہ: سب رس کتاب گھر خیریت آباد (حیدرآباد دکن)

رفتارِ زمانہ

ہندوستان نے متحدہ اقوام کے کشمیر کمیشن کی تازہ ترین تجاویز کا جواب دے دیا ہے۔ اور اس امر پر اعتراض کیا ہے کہ جب عارضی صلح کی شرائط پر سمجھوتہ ہو چکا ہے اور کامن ویلتھ کے ریزولیوشن کی بنا پر ہندوستان اور پاکستان دونوں اسے منظور کر چکے ہیں تو اس سوال کو از سر نو کیوں اُٹھایا جائے۔ پریذیڈنٹ ٹرومین اور مسٹر اٹیلی نے کمیشن کی تازہ تجاویز منظور کر لینے کے جو پیغام بھیجے ہیں، اُن کے متعلق ہندوستان کا ردِّ عمل بھی واشنگٹن اور لندن کو بھجوا دیا گیا ہے۔

ایک پریس کانفرنس میں بحالیات کے وزیر نے بتایا کہ ہندوستان نکاسی جائدادوں کا مسئلہ ایک غیر جانبدار ٹریبونل کے سامنے پیش کرنے کو ملتا رہے۔ وزیر معدنیات شری گیڈگل نے مشرقی اور مغربی پنجاب کے نہری پانی کے جھگڑے کے متعلق ہندوستان کی پالیسی واضح کی۔ اُنھوں نے کہا کہ پاکستان کے پاس اس مسئلے کو بین الاقوامی کورٹ آف جسٹس کے سامنے پیش کرنے کے لئے کوئی جواز نہیں ہے۔

ہند کی آئین ساز اسمبلی نے ملک کے نئے آئین میں ہندی کو دیوناگری رسم الخط میں ہندوستان کی قومی زبان قرار دے دیا ہے۔ اور ہندسے بین الاقوامی رکھے گئے ہیں۔

برطانیہ کے اس فیصلے کے پیش نظر کہ اس نے سٹرلنگ کی شرح ۴.۰۳ سے گھٹا کر ۲.۸۰ ڈالر کر دی ہے۔ حکومت ہند نے بھی بین الاقوامی مالی فنڈ سے مشورہ کرنے کے بعد اسی تناسب سے روپے کی شرح میں کمی کر دی ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۴۹ء کی دوسری ششماہی کے لئے درآمد برآمد کی پالیسی میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔ جس کی رُو سے غیر ممالک سے ہند میں آنے والی اشیا میں نمایاں کمی ہو جائے گی۔ ڈالر والے ممالک سے مشینری اور خاص ضروری اشیا ہی منگوائی جائیں گی۔ آرائشی اور غیر ضروری چیزوں کے لائسنس دئے جانے کی قطعاً ممانعت کر دی گئی ہے۔

خوراک کی پیداوار بڑھانے کے مسئلے کی فوری اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ریلوے کی مملوکہ آراضی کے بڑے قطعات جن پر آجکل صرف گھاس ہی پیدا ہوتی ہے اناج کی فصلیں پیدا کرنے کے لئے استعمال کئے جائیں گے۔ معلوم ہوا ہے کہ ریلوے حکام بعض شرائط کے ماتحت یہ زمینیں یک مشت رقوم کی ادائیگی کے عوض صوبائی حکومتوں کو پٹہ پر دینے کو تیار ہیں۔ مرکزی وزارت زراعت نے ریلوے بورڈ سے درخواست کی ہے کہ وہ ایسی اراضیات کی فہرست تیار کرے۔ اور اسکی نقول متعلقہ علاقوں کی حکومتوں کو مہیا کی جائیں۔

صوبائی اور ریاستی حکومتوں سے بھی یہ کہا گیا ہے۔ کہ وہ اس قسم کے موزوں قطعات آراضی کا سروے کرائیں۔ اور ان کو ایک معقول عرصے کے لئے پٹہ پر لینے کی گفت و شنید شروع کریں۔ بعض صوبوں میں یہ رواج رہا ہے کہ محکمۂ ریلوے ان زمینوں کو اپنے چند ٹھیکیداروں کو نیلام کروا دیتا ہے۔ اور وہ ٹھیکیدار ان زمینوں کو ملحقہ دیہات کے کاشتکاروں کو پٹہ پر دے دیتے ہیں۔

پاکستان نے متحدہ اقوام کی سیکیورٹی کونسل کی اس تجویز کو منظور کر لیا ہے کہ کشمیر کے جھگڑے میں ہندوستان کے ساتھ فیصلہ کرنے کیلئے ایڈمیرل نمٹز کو بطور ثالث مان لیا جائے۔

شمالی اٹلانٹک پیکٹ پر عملدرآمد کرنے کے لئے بارہ اصحاب کی کونسل نے ایک ڈیفنس کمیٹی قائم کی ہے۔ ڈیفنس کمیٹی کی میٹنگ ۱۵۔ اکتوبر کو ہوگی۔ اور اس میں یورپی اقوام کے گروپ میں باہمی تعاون کے سوال پر غور کیا جائے گا۔

آج کل کا سالنامہ ۱۹۴۹ء

چند خطوط کے اقتباسات

جوش ملسیانی

پڑھ رہے شوق سے اہل نظر "آج کل" کا خاص نمبر آج کل
نظم دلکش ہے مضامین دلکشا شاد ہوجاتا ہوں پڑھ کر "آج کل"
اس کی تصویریں ہیں اتنی دلفریب سامنے رہتا ہے اکثر "آج کل"
منظر امروز و فردا ہیچ ہے دیکھئے فردوس منظر آج کل

عبدالشکور

اس سالنامہ کو دیکھ کر بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ مضامین نظم و نثر بڑے سلیقہ اور خوبصورتی کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں اور یہ بات اور بھی موجب مسرت ہے کہ اردو کے موجودہ دور کے بہترین ادیبوں اور شاعروں نے آپ کا ہاتھ بٹایا ہے۔

Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D.—21.
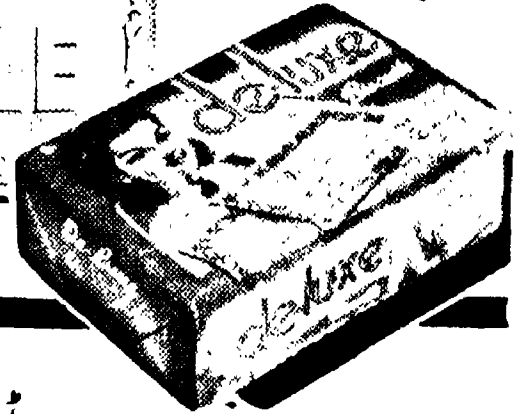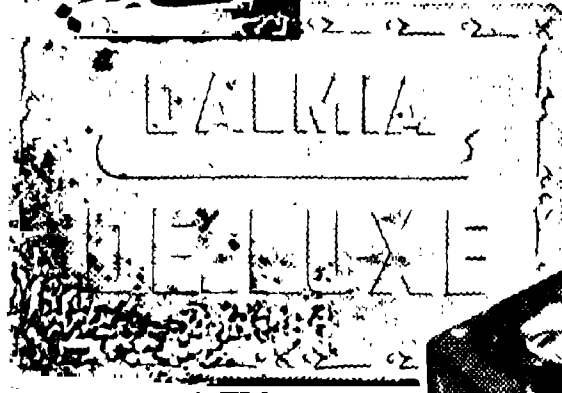
آج کل

یکم نومبر ۱۹۴۹ء

چھ آنے

(اوپر) بخشی غلام محمد، محمد سعید مسعودی، مرزا افضل بیگ اور جناب غلام محمد صادق عید کے دن جامع مسجد دہلی میں نماز پڑھنے کے بعد مسجد سے تشریف لا رہے ہیں۔

(دائیں) کیپٹن بی۔ ایس۔ سوہن آر۔ آئی۔ این۔، جنہیں آئی۔ اس۔ دجمنا، کا کمانڈنگ آفیسر مقرر کیا گیا ہے۔

جنرل کے۔ ایم۔ کیرآپا امرتسر میں۔
جنرل موصوف ایک ہجوم کے ہمراہ دربار صاحب سے باہر آرہے ہیں

(نیچے) واشنگٹن روانہ ہونے سے پہلے پنڈت نہرو کو پالم کے اڈے پر آر۔ آئی۔ اے۔ ایف کی طرف سے ایک گارڈ آف آنر پیش کیا گیا۔ آپ اس تصویر میں گارڈ آف آنر کا معائنہ فرما رہے ہیں۔

ہر مہینے کی پہلی اور پندرھویں تاریخ کو شائع ہونے والا

مصوّر رسالہ

آجکل

دہلی

ایڈیٹر — جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر — عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد
بلونت سنگھ

ترتیب

جلد ۸ — نمبر ۶
سالانہ چندہ — نو روپے
فی پرچہ — چھ آنے

یکم نومبر ۱۹۴۹ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

فراق گورکھپوری

غزل

تھیں جانِ محبت جس کی ضدیں اس دل نے مچلنا چھوڑ دیا
جس شمع سے روشن تھیں بزمیں اُس شمع نے جلنا چھوڑ دیا

پتّا پتّا بُوٹا بُوٹا گلزار میں خاک اُڑاتا ہے
چشموں نے اُبلنا چھوڑ دیا فوّاروں نے چلنا چھوڑ دیا

سوز و سازِ محفل نہ رہا وہ کیف میں ڈوبے دل نہ رہے
جس بادہ سے روشن تھے ساغر اس بادہ نے ڈھلنا چھوڑ دیا

کیا پوچھتے ہو جینے والے جیتے ہیں کیسی مصیبت سے
قسمت نے چمکنا چھوڑ دیا حالت نے سنبھلنا چھوڑ دیا

خطرے سے نہیں خالی ہمدم یوں خوگرِ جور و ستم ہونا
جو بات دلوں کو کھلتی تھی اس بات نے کھلنا چھوڑ دیا

قاتل بھی ہے کچھ حیراں حیراں مقتل بھی ہے کچھ ویراں ویراں
کُشتوں کا لہو پی پی کے زمیں نے لعل اُگلنا چھوڑ دیا

کیا کہہ گئی اہلِ چمن سے صبا کیا پھونک دیا کانوں میں نسیم
کلیوں نے چٹکنا چھوڑ دیا ہر پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا

ایامِ محبت میں وہ دن کاش آ جائے جب کہہ سکئے
باتیں بھی اپنی جگہ پر ہیں وعدوں نے بھی ٹلنا چھوڑ دیا

تقدیریں بدلی جا سکتی تھیں ہُو کے نعروں سے ہمدم
مدّت سے جنوں کی رگ میں لہو نے حیف اُچھلنا چھوڑ دیا

گردوں کا آج کے انساں سے گرمیِ عمل کا تقاضہ ہے
اب سوزِ نوائے شبِ غم سے تاروں نے پگھلنا چھوڑ دیا

جگ بیتی تلخ حقیقت ہے سُن لینے کی لیکن چیز بھی ہے
حق تو یہ ہے باطل قصّوں سے دل نے بھی بہلنا چھوڑ دیا

لائے ہو فراق ایمان اُس پر، میں کہتا ہوں اُس کافر نے
یا بات بنانا چھوڑ دیا یا رنگ بدلنا چھوڑ دیا

برجموہن دتاتریہ کیفی

غالب کے پانچ شعر

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

مختصر معنی اس شعر کے یہ ہوئے اے انسان کائنات کا راز جس کے معلوم کرنے کی تجھے لگن لگی ہوئی ہے - اور جس کو نہ پاکر تو پریشان ہے- اس راز کے حل ہونے کے اشارات یہیں تیرے اردگرد موجود ہیں - مگر تو ان اشارات اُن شبدوں کو نہیں سمجھتا - جن چیزوں کو تو راز کے پردے سمجھتا ہے - وہی تو راز کو افشا اور اُجاگر کرنے والے ہیں -

یہ تو ہوئے اس شعر کے معنی بیکن اسے تفسیر نہیں کہہ سکتے - غالب کے بہت سے شعر ایسے ہیں - جو شرح نہیں تفسیر چاہتے ہیں - اس شعر کی مجمل تفسیر یہ ہے -

دنیا میں جتنی دریافتیں ہوئی ہیں وہ سب عام خلقت کو حیران اور متعجب کرنے والی تھیں - اور وہ تھیں فرداً فرداً ایک ایک آدمی کا کام - میں نے کہا آدمی کا کام - کوئی فرشتہ کسی ایجاد کے لئے کبھی اوپر سے وحی نہیں لایا - نہ کسی رشی کو آکاش بانی سے کوئی ہدایت ہوئی - پھر کیوں کر موجدوں اور محققوں نے اتنی بڑی اور عجائب چیزیں بنائیں - ایک پہیے یا پُلی یعنی گھرنی سے لے کر جوہری بم تک جو یہ چیزیں آپ کے سامنے ہیں، ان کو بنانے والے تھے تو ہمارے سے دو ہاتھ اور ایک دماغ والے انسان - لیکن دُھن اور خیال کے پکّے تھے - ان کی نگاہ دور تک پہنچنے والی تھی - ان کو یقین تھا - کہ مٹّی کے ذرّے اور پانی کی ایک بُوند کی بھی قدریں ہیں - جو قانون قدرت ان کے ہاتھ لگ جاتا - اسے خدا کی دین سمجھ کر چپ چاپ نہیں بیٹھ جاتے تھے - دیکھئے - انجن بن چکا تھا - اس سے کاغذ بن رہا تھا - کپڑا بُن رہا - لوہے اور شیشے کا بھی کام وہ کر رہا تھا لیکن وہ ٹکاؤ تھا یعنی ایک جگہ قائم تھا - اب دیکھئے - جارج سٹیفنسن جو کوئلے کی کانوں میں کام کرتا تھا - اس نے دیکھا - کہ کوئلے کی اِدھر سے اُدھر ڈھلائی میں بہت دقّت ہوتی - اور دیر لگتی ہے - کیوں نہ اس ٹکاؤ انجن کو چالو انجن بنالیا جائے - اس نے سوچا اور ٹکاؤ انجن کو جانچا - اور چالو انجن بنالیا - وہ یہی انجن ہے - جو آپ کی ریل گاڑیوں کو کھینچتا ہے - آپ نے دیکھا کہ دنیا میں جو چیزیں جو حقیقتیں ہمیں چھپا راز یا طلسمات نظر آتی ہیں اُن کے افشا کرنے کا گُر اُن کے حل کرنے کا طریق بھی ہم سے دُور نہیں - کائنات عالم کا ہر منظر جسے دیکھ کر ہم متحیر ہو جاتے ہیں - اور ہکّے بکّے رہ جاتے ہیں پُکار کر کہہ رہا ہے - کہ آنکھوں سے کام لو - یہ ہے میرے راز کی کنجی -

شاعر نے کہا آفاق کا ہر راز اپنے مُنہ سے اپنا گُر اپنی بھید پکار پکار کر بتا رہا ہے - مگر تو اُس آواز پر کان ہی نہیں دھرتا - شاعر نے عام لوگوں کو یہی بات سمجھانے کے لئے موسیقی کا تلازمہ استعمال کیا ہے - کہا ہے جسے تو راز یعنی چھپی ہوئی حقیقت سمجھ رہا ہے - وہ راز تو بولتا چالتا راگ ہے - مگر تو نے اُس راگ کے سُروں کی جان پہچان کی طرف توجہ نہیں کی - اگر تجھ کو اُن نواہائے یعنی اس راز یا راگ کے بادی سموادی اور بیادی سُروں کا علم ہوتا - تو فوراً اس کی حقیقت تجھ پر کھل جاتی - سنسکرت میں موسیقی کو ناد ودّیا کہتے ہیں یعنی آواز کا علم - غالب کی زبان میں کہئے علم نوا - سنگیت کی ابتدا ہی سُر اور تھیا یعنی باب نوا سے ہوتی ہے - اسی سے مرزا غالب کہتے ہیں - کہ اگر آواز کے علم کا ماہر ہو - تو راگ کا راز تیری سمجھ میں آئے - جس طرح ذرّے اور قطرے کی قدریں جاننے والوں نے نظریۂ اضافت اور نظریہ مقادیر جوہری کے راز معلوم کر لئے، اور ریڈیو ٹیلی وژن اور ایٹم بم کی سی چیزیں بنا ڈالیں - اسی طرح اگر انسان اشیا اور عناصر کی ماہیت کا علم حاصل کرلے - تو کوئی راز اس کے لئے راز نہیں رہتا - ہاں تو تلازمہ تھا موسیقی کا - نواہائے راز کا مطلب تو صاف ہوگیا - اب شعر کا دوسرا مصرع لیجئے - شاگرد نے کہا - کہ حضرت یہ تو درست فرمایا گیا مگر

وہ پردے جو نوا ہائے راز پر پڑے ہوئے ہیں۔ اس کی دریافت میں حائل ہوتے ہیں۔ مرزا فرماتے ہیں۔ اگر سُر کا گیان پُورا پُورا ہو جائے تو سمجھو کہ وہ پردے ہی راگ کو کھولنے اور اُجاگر کرنے والے ہیں۔ جیسے ستار اور بین کے پردے۔

اتنی دقیق حقائق کو ایسے دلچسپ پیرائے میں بیان کرنا مرزا ہی کا کام ہے۔ اعلیٰ تخیل کے ساتھ انہیں محاکات اور تشبیہ استعارے کے استعمال میں بھی کمال حاصل تھا۔

مرزا غالب کا شعر ہے۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود دار ہیں ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہُوا

مطلب یہ ہے۔ کہ اخلاقی جرأت اور خیال و عمل کی آزادی کے لئے آقائیت اور سروری کی ضرورت نہیں۔ اکثر لوگوں کا یہ فراری پینترا ہوتا ہے کہ صاحب ہم کیا کر سکتے ہیں۔ نوکری اور غلامی میں فرق کیا ہے؟ اسی طرح لوگ اور مجبوریوں کی فہرست کا وظیفہ کرتے کرتے واقعی پست ہمت، بُزدل اور بے غیرت ہو جاتے ہیں۔ خود اعتمادی اور خود داری اُن کے نزدیک ایک مہمل کلمہ ٹھہرتا ہے۔ ایسا انسان ادائے فرض میں ہمیشہ قاصر رہے گا۔ مرزا فرماتے ہیں۔ اے بے غیرت بُزدلو ہم کو دیکھو خدا کو آقا اور قادرِ مطلق مانتے ہیں۔ ہمارا اعتقاد ہے۔ کہ اس کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ لیکن اس کے باوجود انسانیت جو خدا نے ہم کو دی ہے۔ اُس کا ہمیں پاس ہے۔ ہمارے دل میں اُس کی عزت ہے۔ جب ہم اللہ تعالےٰ کی کسی مخلوق کو حقیر نہیں سمجھتے تو اپنے تئیں کیوں حقیر سمجھیں۔ چنانچہ اگر ہم بیت اللہ میں حاضری دینے جائیں۔ اور اس کا دروازہ بند ہو۔ تو ہم واپس چلے آئینگے۔ باہر ٹھہر کر انتظار نہیں کریں گے۔ کیونکہ یہ ہماری شخصیت اور عقیدت کی توہین ہے۔ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ شاعر نے کس عظیم الشان آدرش سے اپنا تعارف کرایا ہے۔

ایسے ہی گرم مزاج اور غیور شعور کا انسان اصولی اور آفاقی معاشرت کا وہ فارمولا پیش کر سکتا ہے۔ جس کا حامل یہ شعر ہے۔

ہم موحّد ہیں۔ ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یعنی ہم صرف ایک خدا کو ماننے والے ہیں۔ ہمارے مذہب میں رسوں کو دخل نہیں۔ فرقہ بندیوں سے مذہب میں خلل واقع ہوتا ہے۔ جب وہ فنا ہو جاتی ہیں۔ تو ایمان کا جُزو بن جاتی ہیں۔

شیخ ابراہیم ذوق نے تو کہا تھا کہ

ہفتاد و دو فریق حسد کے عدد سے ہیں
اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں

پُرانے حساب سے مختلف فروعات کی رو سے مسلمانوں میں بہتر فرقے مانے جاتے تھے۔ اور جُمل کے حساب سے لفظ حسد کے عدد بھی بہتر ہیں۔ حسد کے عدد اتفاقیہ شیخ صاحب کے ذہن میں آتے تھے۔ کہ انہوں نے اپنے طرز میں ایک شعر کہہ ڈالا۔ مرزا غالب استدلال اور توجیہہ کے بغیر بات نہیں کرتے۔ کہتے ہیں لوگ رسم و رواج اور توہمات میں اُلجھے ہوتے ہیں۔ اور خدا کو جو کل کائنات کا کرتا دھرتا ہے بھُولے ہوتے ہیں۔ وہ تو رسم پرست ہیں۔ خدا پرست نہیں۔ اور ہر جگہ عام کیفیت بھی یہی ہے۔ پھر کہا ہے۔ کہ ہم موحّد ہیں صرف ایک خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور رسم و رواج کی بدعتوں کو ہم نے ترک کر دیا ہے۔ پھر کہا ہے۔ کہ جب تک باہمی تفرقین قائم رہتی ہیں۔ ایک جماعت کا ایمان راسخ اور پختہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جب سوچ سمجھ کر خدا کو ایک اور لاشریک مان لیا۔ تو رسم و رواج کا اختلاف اور تفرقے کا کیا معنی۔ اگلا شعر اسی راسخ الاعتقادی کی تاویل ہے۔ فرمایا:۔

وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

کہتے ہیں اصلی ایمان یہی ہے۔ کہ انسان مداومت کے ساتھ اپنے عقیدے پر عمل کرے۔ چاہے وہ نماز پڑھے۔ یا سندھیا کرے یا گرجا جائے مگر یہ دل سے کرے اور ہمیشہ کرے۔ نباہ کے ساتھ۔ یہ نہیں کہ کبھی ٹھاکر جی کو پھول چڑھا آئے۔ اور کبھی کسی قبر پر ماتھا رگڑ آئے پھر کہتے ہیں۔ اگرچہ بت پرستی اسلام میں متروک اور ممنوع ہے۔ مگر وہ برہمن جو بت پرستی پر اعتقاد رکھتا تھا۔ عمر بھر دل سے اور بلا ناغہ بتوں کو پوجتا رہا۔ یہاں تک کہ بُت خانے ہی میں وہ مر بھی گیا۔ تو اے مسلمانو وہ برہمن اس امر کا مستحق ہے۔ کہ کعبے میں اس کی قبر بنائی جائے۔ یہ ہے اصل تنقید ایمان کی۔ یہ ہے مرزا کے اعتقاد کی آفاقیت کی شان۔

ایک شعر اور سناؤنگا اس سے پہلے کہ ختم کروں - وہ شعر فارسی کا ہے - گھبرائیے نہیں، اس خیال سے کہ جب اُردو کا یہ حال ہے - کہ ایک درجن سے زیادہ شرحوں کے باوجود مرزا کے بہت سے اردو شعر اب تک حل طلب ہیں - پھر فارسی تو اور بھی مشکل ہوگی - اصل واقعہ اس کے خلاف ہے - مرزا کا فارسی کلام وہ معنوی دقتیں اور معمے ہرگز پیش نہیں کرتا، جن سے اردو دیوان کا کوئی صفحہ خالی نہیں - خیر سنیئے وہ شعر یہ ہے

موجیم کہ آسودگی ما عدم ماست
ما زندہ ازانیم کہ آرام نہ گیریم

ہم لہر کی مانند ہیں - ہمارا آرام ہی ہماری موت ہے - ہم اسی وجہ سے زندہ ہیں کہ آرام نہیں کرتے - حیات کی تعریف جو مرزا غالب ان دو چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں بتا گئے - حقیقت میں اتنی جامع اور مانع ہے کہ حیاتیات کے سائنس کا بڑے سے بڑا ماہر بھی اس سے اتفاق کئے بغیر نہیں رہ سکتا -

حرکت زندگی کی اولین شرط ہے - دنیا میں ہر جاندار چیز جب تک حرکت کرتی رہتی ہے، زندہ رہتی ہے - جب حرکت بند ہو جاتی ہے تو اس کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے - فطری قوت کا تفاعل حیات کے قیام کے لئے حرکت کو لازم و لابد کرنا ہے - کوئی کہے گا - کہ شاعر نے یہ بھی تو کہا ہے - کہ اگر ہم آرام کریں تو مر جائیں گے - تو کیا ہم دن رات رائٹ لفٹ یا جو ہمارا پیشہ اور کام ہے، اسی میں مصروف رہیں - یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ کہنے والے کا محض بھولا پن ہے - وہ سمجھتا ہے کہ جب انسان سویا ہوتا ہے - تو حرکت نہیں کرتا - اور صبح خوب تر و تازہ ہو کر اٹھتا ہے - مگر یہ بھی تو دیکھو کہ حرکت کا فعل نیند میں بھی جاری رہتا ہے - کیا نیند میں تم سانس نہیں لیا کرتے - کیا تنفس کی وجہ سے تمہارا سینہ اوپر نیچے نہیں ہوتا - کیا تمہاری وہ رگیں جو جاگتے میں پھولا کرتی ہیں سوتے میں نہیں پھڑکتیں - اور تمہارا دل اسی طرح حرکت کرتا رہتا ہے جس طرح جاگتے میں - پس حرکت کا فعل کسی نہ کسی شکل میں جاری رہتا ہے

اس شعر میں آسودگی اور آرام سے مطلب ہے - فقدان حرکت یعنی حرکت کا نہ ہونا - افراد کی طرح جن قوموں نے اس نکتہ کو سمجھا ہے - وہ کبھی آرام سے پاؤں توڑ کر اور لمبی تان کر نہیں بیٹھ رہتیں - کسی نے کہا زندگی ایک جدلیاتی حقیقت ہے - اگر تم آج وہیں ہو جہاں کل تھے - تو سمجھو کہ تنزل کی طرف جا رہے ہو - تنازع للبقا میں آسودگی کیسی اور آرام کہاں - زندگی کی دوڑ کبھی ختم نہیں ہوا کرتی - ارتقا منتہا کو نہیں جانتا - اس کا قانون ہے دائمی اور مستقل حرکت - جن قوموں نے فلسفۂ حیات کے اس رمز کو نہیں سمجھا اور اجتہاد و عمل سے کام نہ لیا وہ سکون پسند اور آرام طلب ہو گئیں - سکون نے جمود کی شکل پکڑی اور ان کی معاشرتی موت واقع ہو گئی - ظاہر میں جو کبھی ہم حرکت کو سست اور مختصر کر دیتے ہیں تو اس غرض سے کہ آیندہ اس سے زیادہ کام لینا ہے - سوتے ہم اس مقصد سے ہیں - کہ صبح اُٹھ کر زیادہ کام کر سکیں - یہ آرام آرام نہیں یہ آسودگی آسودگی نہیں - بلکہ محرکہ کو زیادہ تیزی اور کارپردازی کے قابل بنانا ہے -

پھر اصل شعر کی طرف آیئے - شاعر نے کہا - ہم اس لئے زندہ ہیں، کہ حرکت سے ہاتھ نہیں اٹھایا - لہر لہر ہے جب تک سمندر کی سطح سے اوپر اُٹھی رہے جہاں لیٹ گئی، لہر نہیں رہتی - چاہے فرد پر عائد کیجئے چاہے قوموں پر فلسفۂ حیات کا یہ نکتہ شعر میں بیان کرنا اور اس خوبی سے بیان کرنا مرزا ہی کا کام ہے -

---

اظہر علی فاروقی

اُردُو شاعری میں مُلکی اساطیری روایات

کسی قوم کی شاعری اور ادبی سرمایہ نہ صرف اس کے ذہنی نشوو نما کی ارتقائی منزلوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ بلکہ اس کے ادنیٰ سے ادنیٰ رجحان، افتادِ طبع، خیالات، عادات اور اطوار کی ایسی جیتی جاگتی تصویریں شاعری میں نمایاں ہوتی ہیں، جو ادبیات کے کسی دوسرے شعبے میں اس خوبی سے نہیں مل سکتیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسانی زندگی میں کچھ ایسے طور طریقے، کچھ ایسی مخصوص باتیں، کچھ ایسی قدریں، کچھ ایسے تصوّرات نظر آتے ہیں جن پر سب لوگ بنیادی طور پر اتفاق کر لیتے ہیں۔ اور اس قوم کے افراد اُن کو اپنا نصب العین اور آدرش بنا لیتے ہیں۔ یہی تصوّرات اور قدریں روایات کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں۔ انھیں روایات کے مجموعے کو تہذیب، تمدّن اور ثقافت کا نام دیا جاتا ہے اور یہ سب کسی قوم کے جغرافیائی حالات، افتادِ طبع فطری میلان اور ذہنی رجحان اور اس کے جذباتی اثرات کے نتائج سے صورت پذیر ہوتی ہیں۔ ان میں وہ ہمہ گیری اور صحت پائی جاتی ہے جو ریاضی کے اصول موضوعہ سے کسی طرح کم نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ شاعر میں ایک قسم کی خلاقی صفت ضرور پائی جاتی ہے لیکن اس کے یہ معنی کبھی نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی خلاقیت ایک قادرِ مطلق کی طرح ہے جو صرف ایک "کُن" سے جو چاہتا ہے اور جس وقت چاہتا ہے پیدا کر سکتا ہے۔ وہ ایک فطری اُپج سے مجبور ہو کر جو کہتا ہے۔ اس میں بظاہر ایک قسم کی انفرادیت معلوم ہوتی ہے، لیکن دراصل یہ اُپج ان تمام خارجی حالات، کیفیات اور اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جس کو مجموعی طور پر تمدّن یا ہیئت اجتماعی کہتے ہیں۔ شاعر بھی براہِ راست ہماری معاشرتی اور سماجی زندگی سے اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح ہمارے دوسرے حرکات و سکنات جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاعری اور ادب بھی ایک ایسی تاریخ کا مرقع بن جاتا ہے جس میں کسی ملک یا قوم کے دَور بدور بدلتے ہوئے تمدّن اور کلچر کی مسلسل تصویریں نظر آتی ہیں۔ ان تصویروں میں ہمارے جذبات اور خیالات کا وہ گہرا رنگ ہوتا ہے جو زمانے اور ماحول کے ہاتھوں سے طیّار کیا جاتا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ کسی قوم کے تمدّن میں روایاتی عناصر کی نہ صرف جھلک پائی جاتی ہے، بلکہ اس کے ڈھانچے پر روایات وہ کام کرتی ہیں جو ہمارے استخوانی کالبد پر گوشت اور پوست۔

یہ روایات کسی ایک مخصوص وقت میں تعمیر نہیں ہوتیں۔ بلکہ وہ زمانے کے ہاتھوں جنم لیتی ہیں، اور وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھ کر ایک مستقل ہیئت اختیار کر تی جاتی ہیں۔ شاعر اور ادیب انھیں روایات کے سہارے اپنے خیالات زیادہ تفصیل سے سمجھاتے ہیں اور ان کی وہی حیثیت ہو جاتی ہے جو کسی عمارت میں اُن ستونوں کی ہوتی ہے جن کے سہارے اس عمارت کی بنیاد کھڑی ہوتی ہے۔

چونکہ روایات کا وجود وقت اور زمانے کی رفتار کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے روایات کی بہت سی قسمیں ہو جاتی ہیں۔ انسانی عمرانیت کا قدیم ترین دور وہ ہے جب کہ انسان پر صرف دہشت اور استعجاب کا ایک ڈراؤنا کیف طاری رہتا تھا۔ جب نظام کائنات کی ہر وہ چیز دیوی یا دیوتا سمجھی جاتی تھی، جو دلوں میں خوف، حیرت یا ہراس پیدا کر دے۔ یہ دور " دورِ کہانت " کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے قدرت کے بے شمار عناصر دیوتاؤں اور دیویوں کے نام سے تعبیر ہوتے اور اُن کی شان میں جو بھجن اور گیت بنائے جاتے تھے وہ سینہ بہ سینہ چلتے تھے۔ اس دور کی روایات اساطیری روایات کے نام سے موسوم ہیں۔ اس قسم

کی روایات غیر شعوری طور پر پُشت ہا پُشت سے انسان کے رگ اور ریشے میں جاری و ساری چلی آ رہی ہیں۔ اساطیری روایات کی تشکیل اور تعمیر میں مذہب کو بہت بڑا دخل رہا ہے بخصوصاً ایشیائی ممالک میں۔

اُردو شاعری نے فقرا اور مشائخ کے زیرِ سایہ پرورش اور شاہی درباروں اور اُمراء کی محفلوں میں پروان بڑھ کر نشو و نما پائی اس لئے اس میں اساطیری روایات کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ مصری، یونانی، اسرائیلی، نصرانی اور اسلامی روایات کے علاوہ ہندو روایات کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ پایا جاتا ہے جسے اردو شاعروں نے اپنایا اور جس کے سہارے اپنے تخیئل اور شعور کی بنیادیں قائم کیں۔ آئیے اس وقت اُن مذہبی روایات کی وہ تصویریں دیکھیں جن کا تعلق ویدک دھرم سے ہے تفصیل میں جانے سے پیشتر اس بات کو نہ بھولنا چاہیئے کہ ادیب اور شاعر روایات جوں کی توں نہیں رکھتے بلکہ تصوّرات، تلمیحات، ضرب الامثال، محاورات یا الفاظ میں اُن کی روح کو جاری و ساری رکھتے ہیں۔

ویدک دیوتاؤں میں برہما، اندر، وشنو اور مہیش ایک امتیازی خصوصیت رکھتے ہیں اردو میں ان سے وابستہ روایات کی روح کہاں تک حلول کر چکی ہے اس کا اندازہ آپ ان فقرات سے لگا سکتے ہیں۔ اندر کا اکھاڑا، اندر سبھا۔ راجا اندر سورگ پتی مانے ہیں، اور ان کی ہندوؤں میں وہی حیثیت ہے جو مسلمانوں میں رضوان کی۔ اندر کی پریاں، اِندر کا اکھاڑا ہمارے یہاں کہاوت کے طور پر مستعمل ہیں۔

'بھیروں ناچنا' اردو میں ایک محاورہ ہے جس کے معنی غصہ ہونا، آپے سے باہر ہونا' کے ہیں۔ اس محاورے میں ویدک اساطیری روایت کی جو روح پائی جاتی ہے، وہ صاف ظاہر ہے۔ شیو جی جب غصّے ہوتے تھے تو 'بھیروں ناچ' ناچتے تھے جس سے زمین پر زلزلہ آ جاتا تھا۔ اس ناچ کے وقت ان کا حلیہ کیا ہوتا تھا اور اس کی کیا نوعیت ہے اس کا جواب نظیر اکبرآبادی کے یہ شعر دیں گے۔

آنکھوں میں چھا رہا ہے تیرا سروپ کالا
تن میں بھبھوت مل کر گل بیچ سندوڈالا
ماتھے پہ تیرے ٹیکا سیندور کا براجے
ترشول کاندھے اوپر دُھروکی گت بھی باجے

غُصّے میں تو جو آ کر اپنی جٹا ہلاوے
دھرتی، اکاس، پربت، پاتال دہل جاوے

اسی ناچ کی بدولت شیو جی نے دکچھ راکشش کو بھی مار ڈالا تھا۔

ایزد اور اہرمن میں اس دور کی تاریخ پنہاں ہے جب ایرین ایران سے بڑھ کر ہندوستان آئے۔ قصہ یوں ہے کہ اگست مُنی ایک بہت بڑے رشی دیوتا تھے۔ ان کی دو بیویاں تھیں۔ ایک کا نام تھا دِتی اور دوسری کا اَدِتی۔ دِتی کی اولاد دیتیہ اور اَدِتی کی آدتیہ کہلائی۔ یہ دونوں اولادیں آپس میں لڑا جھگڑا کرتی تھیں اور ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھتی تھیں، ادتیہ نیکوکار اور پارسا تھے، اور ان کی قریب قریب وہی صورت تھی جو ایزد کی اور دیتیہ جفاکار اور بدکار یہ اہرمن سے ملتے جُلتے تصوّراتی دیوتا ہیں۔ اَدِتی اگست مُنی کی بہت محبوب بیوی تھیں اور وہ اُن سے بڑے ناز و انداز سے پیش آتی تھیں اور انھیں اپنی شوخی و شرارت سے بہت پریشان کرتی تھیں ہزارہا سال کی قدیم روایت کی مردہ روح دیہاتی عورتوں اور مردوں میں اب تک زندہ ہے ہمارے یہاں اودھ میں عام طور پر اَتی کرنا اور اَتی جتھا ظلم کرنے اور ستانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے

اوتاروں میں سری کرشن اور ان کی محبوبہ رادھا کا ذکر بڑے شد و مد سے ہوتا ہے۔ کرشن جی سانولے اور ملیح تھے مگر بلا کی جاذبیت اور کشش رکھتے تھے۔ اس مذہبی عقیدے کی مدد سے سودا اپنے تخیّل کی بنیاد اساطیری روایاتی عقیدے پر اس طرح قائم کرتے ہیں۔

ہو دھوپ میں بھی نہ کم حسنِ یار کنھیا بنا وہ جو سوندا گیا

شری کرشن جی بچپن ہی سے ترکال درشی مانے جاتے ہیں اس مذہبی روایت کی ترجمانی نظیر اکبرآبادی نے اس طرح کی ہے ؎

اِک روز منھ میں کانّھا[1] نے ماکھن چھپا دیا
پوچھا جسودا[2] نے تو وہیں منھ بنا دیا
منھ کھول تین لوک کا عالم دکھا دیا
اِک آن میں دکھا دیا اور پھر بھلا دیا

رادھا کی یاد کرو، نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچیں گی، کنھیا بننا

---

(۱) کنھیا کا مخفف شری کرشن (۲) شری کرشن جی کی ماں

اسی سے محاورے اور کہاوتیں بن گئی ہیں۔

شعرا نے نہ صرف رام اور سیتا کے واقعات اور حالات پر نظمیں لکھیں، بلکہ ان کی مدد سے یہ کہاوتیں اور محاورے بنائے۔ رام کہانی سنانا۔ رام راج ہونا۔ لنکا میں جو ہے وہ باون گز کا۔ لنکا میں آگ لگنا، گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔ بھبیھن ہونا۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ جب راون کے بھائی بھبھیشن نے راون کا ساتھ چھوڑ کر رام کو سارے راز بتا دیئے۔ اور لنکا کی تباہی کا باعث بنا۔

ستی ہونا۔ ستی دیوی کے پتا جی نے ان کے پتی (شوہر) کی توہین کی، اور انہیں ایک تقریب میں مدعو نہ کیا، جس کے صدمے سے وہ جان بر نہ ہو سکے۔ اور ستی ان کی لاش کے ساتھ جل گئیں۔ یہ روایت ہے یا عام طور پر کسی عورت کا اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ جل جانا، لیکن اردو میں ستی ہونا ایک محاورہ بن گیا جس کے معنی پریشانیوں اور تکلیفوں میں محبوس ہو جانا۔ اودھ کے قصبات میں مسلمان عورتیں اس طرح بولتی ہیں "کیا کروں بہن! ہنے کی بیماری سے کہیں نکلنے کو رہی اس نے تو مجھے ستی بنا دیا۔"

گوبر گنیش ہونا۔ بھدی شکل صورت والے انسان یا سست اور کاہل الوجود شخص کے لئے بولتے ہیں۔ وہ تو پورا گوبر گنیش ہے۔ اب ذرا اس کی اصلیت پر غور فرمایئے اور دیکھئے کہ اس میں ایک مکمل روایت پنہاں ہے۔

ایک دن پاربتی جی نہا رہی تھیں۔ اور انہوں نے اپنے بیٹے گنیش کو تاکید کر دی تھی کہ دیکھتے رہنا کوئی آنے نہ پائے۔ شیو جی پاربتی جی کے شوہر آ گئے۔ اور گنیش نے انہیں سختی سے روکا مگر شیو جی غصے میں آپے سے باہر ہو گئے۔ اور انہیں کچلتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ جہاں پاربتی جی نہا رہی تھیں شیو جی نے اس بری طرح انہیں کچلا کہ گنیش جی جان بر نہ ہو سکے۔ پاربتی جی کو اس کا بڑا صدمہ ہوا اور شیو جی سے کہا جس طرح ہو سکے ان کے بیٹے کو دوبارہ زندہ کریں۔ شیو جی نے اپنے دوت کو حکم دیا کہ جو جانور سب سے پہلے مل جائے۔ اس کا سر کاٹ لاؤ۔ دوت نے حکم کی تعمیل کی۔ اور ہاتھی کے بچے کا سر کاٹ کر حاضر کر دیا جو اسے پہلے پہل ملا۔ شیو جی نے وہی سر گنیش جی کے لگا دیا اور دوبارہ زندہ کر دیا۔ بیچارے گنیش جی کو یہ ہیئت کذائی ماں کی فرمانبرداری اور باپ کی نافرمانی کی بدولت نصیب ہوئی اس سے زبان دانوں نے فائدہ اٹھا کر گوبر گنیش ایک محاورہ بنا لیا۔

پاتال یا نپال کی خبر لانا۔ یہ محاورہ بھی ایک اساطیری روایتی داستان کا ترجمان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی دیت (راکشش) وید چرا لے گیا۔ اور اسے زمین کے اندرونی طبق میں چھپا دیا۔ وشنو بھگوان نے وید واپس لانے اور دیت مارنے کے لئے کچھوے کا جنم لیا، اور پھر مچھلی کا۔ اس طرح زہریلا کانٹا مار کر اسے ختم کر دیا۔ اور پاتال (تحت الثریٰ) سے وید واپس لائے۔ اس محاورے کے علاوہ نظیر اکبرآبادی نے وشنو کے بارہ اوتاروں کو اس طرح نظم کیا ہے ؎

ہیں کہیں رام اور کہیں لچھمن　　کہیں کچھ مچھ اور کہیں راون
کہیں بارہ کہیں مدن موہن　　کہیں بلدیو اور کہیں سری کشن
سب روپوں میں ہیں اسی کے مگن　　کہیں نرسنگھ ہے وہ نارائن!

یہ ہے ایک مختصر خاکہ ان اساطیری روایات کا جن کا تعلق مذہبی روایات سے ہے۔ اردو میں ان ملکی روایات کا بھی کافی اثر ہے جن کا مذہب سے دراصل کوئی واسطہ نہیں۔ مگر اوہام پرستی کی بنا پر مذہب کا جزو بن گئی ہیں۔ مثال کے طور پر حسب ذیل باتیں لیجئے۔ "چلتے وقت رونا نہیں چاہیئے" کہاوت کے طور پر استعمال کیا جانے لگا ؎

جگ میں روتا ہوا قاصد جو کہیں جاتا ہے
پھر مقرر وہ موئے کی ہی خبر لاتا ہے　　(سکندر)

(۲) زمین گائے کے ایک سینگ پر رکی ہے ؎

ساتوں طبق جو ملتے تھے خون و دہشت سے
گاؤ زمین لپٹی تھی ماہی کی پشت سے　　(انیس)

(۳) سانپ کے سر میں ایک چیز ہوتی ہے، جو سونے سے زیادہ چمکتی ہے جسے "روغن" کہتے ہیں۔ اردو شعرا اسے "گنجینۂ مار" سے تعبیر کرتے ہیں ؎

کام ہمت سے جواں مرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے　　(آتش)

(۴) پری - لال پری، سبز پری۔ عام طور پر پریوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے۔ کہ وہ بڑی شوخ، گھاتک، چنچل، باد پرواز ہوتی ہیں گھوڑے کی شوخی کا مقابلہ پری کی ان خصوصیات سے کیا گیا ہے ع

یہ گھات، یہ چنچل پن، کب باد، پری کو ہو
؎ پریاں اڑا سکیں نہ روش ان کی چال کی

بالکل مزاج شیر کا، آنکھیں غزال کی

(۵) ہَوا لگنا۔ توہم پرست عوام خیال کرتے ہیں کہ بیر اور پَون دو خبیث روحیں ہیں۔ جن کو جادوگر کسی شخص کو نقصان پہنچانے کے لئے کام میں لاتے ہیں۔ پَون ہَوا کو کہتے ہیں۔ اور اسی سے ہَوا لگنا، پَون بٹھانا، بیر بٹھانا۔ بیر وڑانا۔ کلوا بیر بننا محاورے بنائے گئے۔

(۶) چھل پائی۔ پری کی ضد چڑیل۔ اس لفظ کا استعمال بھی اسی روایت کی یادگار ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چڑیلوں کے پیر پیچھے کی طرف اُلٹے مڑے ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ چھل پائی کا لفظ توسن توہم پرستی سے ادھر آیا ہو جو یہ خیال کرتے تھے کہ چڑیلوں کے پیر پیچھے اور بکری کے مثل ہوتے ہیں۔

(۷) شیشے میں پری اتارنا ؎

عجب نہیں ہے گل رنگ کی ہوس سے اگر
خود آپ کے شیشہ خالی میں ہو پری محبوس (مومن)

جس طرح ان ملکی روایات کی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں جو اوہام پرستی نے پیدا کیں۔ اور جو غیر شعوری طور پر ادبیات کا جزو بن گئیں۔ اسی طرح ان مذہبی روایات میں وہ خیالات بڑے دلچسپ ہیں جن میں شاعر مذہبی معتقدات پر طنز ملیح کرتا ہے۔ مگر اپنے خیال کی بنیاد کسی نہ کسی مذہبی روایت پر قائم کرتا ہے ؎

گو وصف ہے یومنون بالغیب
پر بندہ تو اس سے باز آیا (مومن)

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا (میر)

تھا دھیان میں عذر لاتحیطوں۔ جب بیٹھے ہیں دم ذرا سمایا (مومن)

ترے دعدہ کی خرابی کا کچھ علاج نہیں[1]
نہ ہو قبول دعا سے بھی رفعت تبسوس

(۱) بنی اسرائیل کی ایک مشہور عورت کا نام تھا جس کے شوہر سے تین دعائیں مقبول ہونے کا وعدہ کیا گیا۔ اس نے تینوں دعائیں عورت کے حق میں کیں اور قبول ہوئیں مگر وہ اپنی بدطینتی اور شامت اعمال کی وجہ سے جیسی بدطینت تھی ویسی ہی رہی۔

مذہبیات میں تیوہاروں کو جو اہمیت حاصل ہے۔ وہ صاف ظاہر ہے۔ دسہرا، ہولی، بسنت، دیوالی، رکشا بندھن، سلونو وغیرہ، ہندوؤں کے مشہور تیوہار ہیں۔ یوں تو ان سب پر منظوم بیانات اُردو میں ملتے ہیں، لیکن تعجب تو یہ ہے کہ ان سب سے وابستہ جزوی باتیں بھی واضح طور پر ملتی ہیں۔ جو کسی نہ کسی مذہبی یا عمرانی روایت پر مبنی ہیں ؎

ہجوم رکھتے ہیں جاں بازیوں ترے آگے
جواریوں کا دوالی میں جیسے جمگھٹ ہو (ناسخ)

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ دیوالی میں چراغاں ہوتا ہے۔ جوا کھیلا جاتا ہے مگر یہ چیز بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ جس کو نظیر اکبرآبادی نے اس طرح نظم کیا ہے۔ جو ایک مذہبی روایت پر مبنی ہے ؎

مکان لیپ کے ٹھلیا جو کوری رکھوائی
جلا چراغ کو کوڑی وہ جلد جھنکائی

دیوالی میں لکشمی جی کی پوجا ہوتی ہے۔ جو دولت ثروت کی دیوی ہیں۔ اور یہ پوجا جسے گھڑا اور سانجھی کے نام سے مشہور ہے۔ زمین لیپ کر کوری ٹھلیا میں پانی بھرا جاتا ہے۔ اس پر ایک چھوٹا سا برتن رکھ کر دیا جلایا جاتا ہے۔

شام کے وقت یہ پوجا ہوتی۔ کوری ٹھلیا کو گوبر اور کھیلوں سے مزین اور آراستہ کرکے اس پر ایک چھوٹا سا برتن رکھ کر ایک دیا جلایا جاتا ہے۔ اعتقاد یہ ہے کہ ایسا کرنے سے لکشمی جی خوش ہوتی ہیں۔ اور مال دولت میں برکت ہوتی ہے۔

یہ ہے بہت ہلکا سا خاکہ اُن ملکی مذہبی روایات کا جو اُردو میں نظر آتا ہے۔

اس طرح رزمیاتی، تاریخی، عمرانی، رومانی، عشقیہ، روایات کا بہت کافی ذخیرہ اُردو شاعروں اور ادیبوں نے پیش کیا ہے۔ اس قسم کی روایات سکندر، سودا، انشا، میر، ناسخ، آتش، اور سب سے زیادہ تفصیلی طور پر نظیر اکبرآبادی کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

جوشؔ ملیح آبادی

شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ

کشورِ ہند میں بحمد اللہ — مَیں ہوں جوشؔ ایک رندِ نامہ سیاہ

لعل و الماس سے دمکتی ہے — فقر کے باوجود میری کُلاہ

میرے آگے وُہ بحر ہے پایاب — نہیں ملتی خضر کو جس کی تھاہ

سرکشی کے طفیل وُہ "لا" ہُوں — نہیں بڑھتا جو سُوئے اِلّا اللہ

طرحدارانِ شہر کا خادِم — تاجدارانِ دہر کا بدخواہ

کام ہے شیخ سے نہ پنڈت سے — دَیر ہی پر ہے نے حرم پہ نگاہ

رِند ہوں رِند نبھ نہیں سکتی — شیخ صاحب سے میری رسم و راہ

اُن کی محفل میں ہے چراغ ثواب	میری محفل میں آفتاب گُناہ

اُن کی لوحِ جبیں پہ داغِ سجُود	میرے آئینے میں تجلّیٔ ماہ

ہاں مگر ایک شیخ ہے ایسا	جس پہ ٹھہری ہے مدّتوں میں نِگاہ

جس کی ہر اک روش ہے حسبِ مُراد	جس کا ہر اک اُصُول ہے دلخواہ

تخت کو توڑتا ہے جس کا نفس	تاج کو روندتی ہے جس کی نِگاہ

جو ہے اِس تیرہ دَورِ باطل میں	حق نگہ، حق شناس، حق آگاہ

نام اُس شیخ کا بتاؤں تمہیں	دلِ رنداں میں بھی ہے جسکی چاہ

چارہ گر، رہنما، غریب نواز	شیرِ کشمیر شیخ عبداللہ

صرف اِسی شیخ سے محبّت ہے
ورنہ ہر شیخ سے خُدا کی پناہ

سرینگر ۲۰ ستمبر ۱۹۴۹ء

سہیل بخاری

خواب قدیم زمانے میں

آج کل کے غیر متمدّن باشندوں کی طرح قدیم زمانے میں بھی لوگوں کا یہ خیال تھا کہ خواب روح کا ہی ایک فعل ہے۔ سوتے میں یہ اپنے کالبد کو چھوڑ کر گشت کرنے کے لئے نکل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواب میں بھی انسان کو ویسے ہی واقعات پیش آتے ہیں جیسے جاگتے میں۔ تقریباً پانسو سال قبل مسیح میں یونانی فلسفی دیمقراطیس کا خیال تھا کہ ہر مادّی شے کی طرح انسانی جسم بھی باریک باریک ذرّات کے ہجوم سے مرکب ہوتا ہے۔ ان ذرّات میں شبانہ روز ہیجان برپا رہتا ہے اور ان کا عکس یا سایہ ان سے بھی زیادہ باریک ذرّات سے ترکیب پاتا ہے۔ غیر معمولی حالات مثلاً نیند وغیرہ میں یہ زیادہ باریک ذرّات سایے سے نظر آنے لگتے ہیں اور اس شخص کی روح کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔

قدما کا یہ بھی خیال تھا کہ خواب کسی غیبی قوت کے زیر اثر ظہور میں آتے ہیں۔ ان کا یہ مفروضہ اس وجہ سے تھا کہ بیداری میں انسان کو اپنے خیالات پر قابو ہوتا ہے۔ ان کو ذہن میں لانے، چھانٹنے اور ذہن سے خارج کرنے وغیرہ کا اسے پورا پورا اختیار رہتا ہے۔ وہ جو بات چاہے اور جس طرح چاہے سوچ سمجھ سکتا ہے۔ اس میں کوئی دقت یا مزاحمت اسے پیش نہیں آتی۔ لیکن نیند میں یہ اختیار جاتا رہتا ہے اس وقت کے خیالات ہی کچھ اور ہو جاتے ہیں اور خواب اور بیداری کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہو جاتا ہے۔ بیداری میں خیالات معقول، مسلسل، مربوط اور منضبط ہوتے ہیں لیکن خواب میں غیر معقول، غیر مسلسل، بے ربط اور غیر منضبط۔ اس وقت تخیل بالکل آزاد ہوتا ہے۔ اس پر کوئی پابندی ہی نہیں رہتی یعنی وہ انسان کے قابو سے نکل جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی اور ایسی قوت اس وقت برسر عمل ہوتی ہے جو انسان سے بالاتر ہے اور جو خواب کے خیالات کو حسب منشا رواں دواں کرتی، روکتی اور جدھر چاہتی ہے موڑ دیتی ہے۔ اگرچہ خیالات خواب قدما کے لئے ایک لامعلوم شے تھے لیکن ان کی تشریح کے لئے بھی انہوں نے ایک لامعلوم میدان تلاش کیا اور خواب کو کسی مافوق الفطرت قوت کے زیر اقتدار تسلیم کر لیا۔ یہی نہیں بلکہ ان دو لامعلوم باتوں میں جو تعلق انہوں نے قائم کیا تھا اس کا سلسلہ اور بھی آگے بڑھایا اور ان دونوں کا ایک تیسری لامعلوم شے یعنی مستقبل سے رشتہ جوڑ دیا۔ چنانچہ اب خواب مافوق الفطرت ہونے کے ساتھ ساتھ پیش گو بھی متصور ہونے لگے اور ان سے مستقبل کے اشارات اخذ کئے جانے لگے۔

اس قسم کے کتنے ہی خواب جن میں خدا نے براہ راست پیغام بھیجا ہے عہد نامہ عتیق و جدید میں پائے جاتے ہیں۔ حضرت یعقوب، حضرت سلیمان، حضرت دانیال، اور حضرت یوسف وغیرہ پیغمبروں کو اکثر خوابوں میں کسی اشد ضرورت کے وقت بشارتیں دی گئی ہیں۔ یہ خواب صاف اور رمزی دو طرح قسم کے ہیں اور ہمارے معمولی خوابوں کی طرح پارہ پارہ اور بے ربط بھی نہیں ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک مکمل داستان ہے اور اس کو اس وقت کی کسی نہ کسی سیاسی یا سماجی صورت حالات سے متعلق کیا جا سکتا ہے۔ ان خوابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی خواب پر بہت زیادہ توجّہ صرف کرتے تھے اور اسے خدا کی پیغام رسانی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ وہ بالکل معمولی خوابوں کی تاویل بھی نہایت احتیاط کے ساتھ کرتے تھے اور تمام قدیم باشندوں کی طرح ان کے یہاں بھی معبّر پائے جاتے تھے۔

قدما کا یہ بھی خیال تھا کہ خواب شیطانی کارگزاری ہے۔ تیسری صدی عیسوی میں رومنہ الکبریٰ کا باشندہ ٹرٹولین اس خیال کا علمبردار تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ ناپاک اور ہیجانی قسم کے خواب شیطانی تخلیق ہوتے ہیں لیکن پیش گو اور الہامی خواب مقدس فرشتوں اور خدا کے

بھیجے ہوئے ہوتے ہیں۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ کچھ خواب تو صرف بیداری کے خیالات کا سلسلہ ہوتے ہیں اور اس لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتے لیکن بعض زیوس یا اور کسی دیوتا کے بھیجے ہوئے ہوتے ہیں۔ موخر الذکر خوابوں میں اگرچہ آدمی اپنی اصلی شکل میں نظر آتے ہیں لیکن اصل میں وہ مردوں کے متحرک سائے ہوتے ہیں۔ ان کے پیغامات بھی بعض اوقات غلط اور فریب دہ ہوتے ہیں۔ ٹیوٹونک اقوام کا خیال تھا کہ خواب مُردوں کی نیک و بد روحوں کے زیر اثر نظر آتا ہے۔ مردے کی روح اپنے گھر والوں کی محافظ ہوتی ہے لہذا خواب میں وہ ان کو ناگہانی حادثات زلزلے اور آتش زدگی وغیرہ کے خطرات سے آگاہ کرتی اور بُری روحوں کی بُرائی اور لائی ہوئی تباہی سے ان کی محافظت کرتی ہے۔ کابوس اور بھیانک خوابوں میں بد روحوں کا ہاتھ ہوتا ہے اور وہ خواب بین پر اپنا بُرا اثر ڈال کر اسے طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کرنا چاہتی ہیں۔

بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ جسمانی ہیجانات خواب کے محرک ہوتے ہیں۔ مثلاً جسم کے کسی عضو کو جب غیر معمولی گرمی پہنچتی ہے تو خواب میں یہ نظر آتا ہے کہ ہم آگ میں ہو کر گذر رہے ہیں۔ چنانچہ ارسطو کا قول ہے کہ بعض خواب معالج کو آنے والی بیماری کا پتہ دیتے ہیں۔ اکثر یونانی مفکروں کا خیال تھا کہ شام کو ثقیل غذا کھانے سے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ ہپوکریٹس کے نزدیک خواب روح کی پریشانی ظاہر کرتے ہیں۔ رومتہ الکبریٰ کا باشندہ پلانی ثقیل غذا کھانے کے بعد خواب دیکھنے کو جسم کے وظائف معمولہ میں شمار کرتا ہے۔ عضوی تاثرات خواہ وہ داخلی ہوں خواہ خارجی محرک خواب ہوتے ہیں۔ خواب میں سینے پر ایک ہلکا سا بوجھ معانقہ ہو جاتا ہے۔ بستر کے سرک جانے پر عریانی تن کا احساس ہونے لگتا ہے کسی کپڑے سے منہ یا ناک ڈھک جانے پر زندہ مدفون ہونے کا واقعہ نظر آتا ہے۔ کھانے کا بھی خواب پر بہت اثر پڑتا ہے۔ انگریز شاعر ڈرائیڈن شاندار خواب دیکھنے کی غرض سے کچا گوشت کھاتا تھا لیکن وہ خواب جو سوء ہضم کے باعث نظر آتے ہیں جھوٹے سمجھے جاتے ہیں اور نصف شب کے بعد اور پچھلے پہر کے خواب اسی لئے سچے ہوتے ہیں کہ اس وقت تک کھانا ہضم ہو جاتا ہے۔ افیون کھا لینے سے نہایت شاندار خواب نظر آتے ہیں۔ ان میں مکان و زمان کی وسعت بہت بڑھ جاتی ہے۔

خواب میں جو واقعات نظر آتے ہیں آخر ان کے معنی کیا ہیں؟ یہ سوال قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں خواب کی تعبیر معلوم کرنا اس قدر ضروری تھا کہ معبری ایک مستقل پیشہ ہو گیا تھا۔ لوگ ان معبروں کے پاس جاتے اور ان سے اپنے اپنے خواب بیان کر کے تعبیر لیتے۔ خواب کی غیب گوئی کے خیال سے اس کی تعبیر معلوم کرنا نہایت اہم تھا۔ مصر قدیم میں اس کام کے لئے سرکاری عہدہ دار مقرر تھے۔ معابد کے پجاری بھی یہ خدمت انجام دیتے تھے لیکن عوام کی بڑھتی ہوئی مانگ کو دیکھتے ہوئے معبروں کی اتنی تھوڑی سی تعداد کفایت نہیں کر سکتی تھی لہذا پیشہ ور جادوگر بھی وجود میں آئے اور عوام کی امداد کرنے لگے۔ یونان کے عہد ترقی میں ایتھنس کے باشندے معبر کے پاس اسی طرح جاتے تھے جس طرح ہم لوگ ڈاکٹروں کے پاس جاتے ہیں۔ اس پیشے میں آمدنی کافی تھی اور چونکہ موکلین کو خاطر خواہ تعبیر مل جایا کرتی تھی اس لئے وہ بھی خوش خوش جاتے تھے لیکن یہ معبر بھی غلطی کرتے تھے چنانچہ دو معبروں کی رایوں میں ہمیشہ اختلاف ہو جایا کرتا تھا۔ مقدونیہ کے بادشاہ فلپ نے خواب میں دیکھا کہ اس نے اپنی ملکہ اولمپیاس کے رحم پر شیر کی تصویر بنی ہوئی مہر سے مہر لگا دی ہے۔ چند معبروں نے ملکہ کے چال چلن پر شک ظاہر کیا اور فلپ سے کہا کہ وہ اس کی زیادہ نگرانی کرے لیکن ایک دوسرے معبر سے فلپ بہت خوش ہوا کیونکہ اس نے بتایا کہ ملکہ حاملہ ہے اور شیر صفت لڑکا جنے گی۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ خالی چیز پر مہر نہیں لگائی جاتی۔

آجکل کے ماہرین تحلیل نفسی کی طرح پیشہ ور معبر بھی خواب بین سے بہت سے سوالات کرتا تھا اور خواب کے جملہ واقعات پوچھ لینے کے بعد اس کی نجی زندگی کے متعلق بھی کچھ باتیں دریافت کرتا تھا۔ یہ ترکیب رموز خواب کے معانی کا تعین کرنے میں بڑی مدد دیتی تھی کیونکہ ایک ہی شے کے کئی کئی معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً گردن زدنی عام طور پر ایک شگون بد تھا لیکن قاتل قیدی کے لئے فال نیک کیونکہ کسی آدمی کا سر دو بار نہیں اڑایا جا سکتا۔ ناک کا کٹنا جان یا عزت کے نقصان کا اشارہ تھا لیکن ایک گندھی کے لئے تجارتی دیوالہ سمجھا جاتا تھا۔ مصیبت میں گرفتار شخص اگر قوس قزح دیکھے تو اچھا لیکن اچھے حالات میں اس کا دیکھنا بُرا تھا۔ ان سوالات سے ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ خواب بین کا

نفسیاتی تجزیہ ہو جاتا تھا اور اس کو تعبیر لینے کے بعد طبیعت میں کچھ سکون اور ہلکاپن محسوس ہونے لگتا تھا جیسے دل پر سے کوئی بوجھ ہٹ گیا ہو۔

انسان میں بڑی حد تک معنی آفرینی کی صلاحیت پائی جاتی ہے چنانچہ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں لوگوں نے خوابوں کی تعبیر معلوم کرنے کی نہایت قدیم زمانے ہی سے کوشش شروع کر دی تھی اور اس کے لئے دنیا کے غیر متمدن قبائل میں تاویل خواب کے دو طریقے اسی وقت سے رائج ہو گئے تھے۔ ایک بلا واسطہ جس سے خواب کے معانی اس کی تصویروں کے عین مطابق بتلائے جائیں اور دوسرا بالواسطہ جس میں خواب کے رمزی تسلسل سے ان خیالات کا اظہار کر دیا جائے جو ان تصاویر کی تہ میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ان دونوں طریقوں کو علی الترتیب طریق صغرا اور طریق رمزی کہا جاتا ہے۔ آگے چل کر چونکہ عبرا ہم خواب سے کر غیب گو خواب تک کتنی ہی قسمیں کر دی گئیں لہذا عام خوابوں کی تعبیر معلوم کرنے کے لئے تعبیر نامے وجود میں آ گئے۔ یہ انقلاب تاویل خواب کے تنزل و انحطاط کا باعث ہوا کیونکہ معبر خواب بین کی عمر پیشہ، خیالات و رجحانات اور افتاد طبیعت کو بھی ملحوظ رکھتے تھے لیکن تعبیر ناموں میں ہر خواب کا ایک مقررہ جواب ملتا تھا۔ پھر یہ کہ معبر تو پورے خواب کی مجموعی ہیئت پر غور کرتے تھے لیکن تعبیر نامے خواب کے صرف ایک جزو پر زور دیتے تھے۔

تعبیر ناموں کا آغاز غالباً ملک مصر سے ہوا کیونکہ دنیا کا قدیم ترین تعبیر نامہ تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح میں فراعنۂ مصر کے بارھویں خاندان کے عہد حکومت میں یہیں طیار رہوا۔ آگے چل کر تعبیر ناموں میں باقاعدگی آ گئی اور دوسری صدی عیسوی میں ارتمیداروس نے خواب کے معانی کو باضابطہ طور پر مدون کیا۔ اس کی تعبیریں آج بھی عوام میں بکثرت رائج ہیں مثلاً دانت کا گرنا کسی گھر والے کی موت ظاہر کرتا ہے۔ آسمان پر آگ دیکھنا قحط یا جنگ کی علامت ہے۔ زینے پر سے اترنا تنزل کی نشانی ہے۔ اڑنا خوش قسمتی کی نشان دہی کرتا ہے لیکن خواہش کے باوجود نہ اڑ سکنا بد قسمتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ خواب کے معنی اکثر الٹے بھی ہوتے ہیں اس لئے ان سے تردد کی کوئی وجہ نہیں مثلاً بیماری کا دیکھنا صحت کی ضمانت ہے، غلاظت دولت ظاہر کرتی ہے، دوست دشمن کا اور شیطان نیک بختی کا پتہ دیتا ہے۔

تعبیر نامے آج بکثرت پائے جاتے ہیں اور عوام ان کی تعبیروں پر اتنا ہی اعتقاد رکھتے ہیں جتنا مقدس اور الہامی کتابوں پر اور اگرچہ اس کی وجہ جہالت اور نادانی ہے لیکن یہ کتابیں اس وقت تک فروغ پاتی رہیں گی جب تک کہ ذمہ دار اور مذہبی ہستیاں عوام کے مطالبے کو نظر انداز کرتی رہیں گی۔ بیسویں صدی عیسوی سے البتہ نفسیات کی روز افزوں ترقی نے قابل دماغوں کو خواب کے حقیقی معنی سمجھنے اور سمجھانے کی طرف کافی مائل کر دیا ہے اس لئے امید ہے کہ ان تحقیقی کوششوں کی اشاعت سے جلد ہی دقیانوسی خیالات عوام کی بہت بڑی تعداد کے دماغوں سے نکل جائیں گے۔

قدما کے یہاں خواب کا ایک دیوتا بھی ہوتا تھا۔ اس سے متعلق انہیں کچھ مذہبی رسوم بھی ادا کرنا پڑتی تھیں۔ کچھ رسمیں برے خوابوں کے اثرات دور کرنے کے لئے بھی عمل میں لائی جاتی تھیں۔ چونکہ خواب میں فوق فطری عنصر پایا جاتا تھا اس لئے ایسی کوششیں ہونے لگیں کہ جب کبھی کوئی ضرورت پڑے اس کے متعلق خواب دیکھا جا سکے اور پیش آنے والی مشکل یا دقت کا حل تلاش کرنے کے لئے اس سے روشنی حاصل کی جا سکے۔ چند رسوم اس طریق خواب طلبی سے بھی مخصوص تھیں جن سے دیوتا خوش ہو جائیں اور صحت یابی کی درخواست کا کوئی جواب دیں یا آیندہ کے کسی واقعے کے متعلق آگاہی بخشیں۔

مصر میں اس موقع پر کتنی ہی رسمیں جاری تھیں مثلاً خواب طلب کسی ہیکل میں جاتا اور مخصوص دیوتا کے سامنے اپنی درخواست پیش کر کے خواب کے ذریعے سے جواب کا طالب ہوتا۔ قربان گاہ پر نذریں چڑھاتا۔ مقررہ وقت تک روزے رکھتا اور آخر میں ایک مقدس چارپائی پر خواب دیکھنے کے لئے سو جاتا۔ خواب میں دیوتا اس کو درشن دیتا اور اس کی مقصد براری کے لئے تدابیر بتاتا۔ ایسی طویل رسموں کے علاوہ معمولی، آسان اور سادہ رسمیں بھی تھیں مثلاً خواب طلبی یا خاطر خواہ تعبیر حاصل کرنے کے لئے چند الفاظ دہرائے جاتے تھے۔

نیک دیوتاؤں کے علاوہ خودکشی کرنے والوں، پھانسی پائے ہوئے مجرموں کی روحوں، اور بدمزاج دیوتاؤں کو بھی کچھ بھینٹ چڑھا کر

خوش کیا جاتا تھا اور ان سے بھی لوگ خواب کے خواستگار ہوتے تھے۔ غرض کہ مصر میں ہر قسم کے توہمات پر عمل کیا جاتا تھا اور منتوں کی اہمیت روز افزوں ترقی برابر جاری رہتی تھی۔

یونان میں بھی خواب طلبی کی کوششیں ہوتی تھیں۔ مذہبی ضابطے میں ان رسموں کا بھی اختیار دے دیا گیا تھا۔ اس غرض کے لئے کتنے ہی ہیکل مخصوص تھے جو عام طور پر پہاڑوں کی گھاٹیوں میں واقع ہوتے تھے۔ حاجت مند وہاں جاتے، دیوتاؤں کو بھینٹ چڑھاتے، اور منتوں کے حسب ہدایت عمل کرتے، روزے رکھتے اور کچھ بوٹیوں کے استعمال کرنے سے مناسب قسم کا خواب دیکھ لیتے تھے۔ کلدانی اور بابلی معابد کی طرح بہت سے ہیکلوں میں دیوتا اہل غرض کو کوئی جواب نہیں دیتے تھے بلکہ وہاں کی رہنے والی مقدس خادمات کو ہدایات جاری کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ حاجت مند بیدار ہونے پر اپنا خواب ہیکل کے پجاریوں سے بیان کرتا اور وہ اس کی تعبیر بتاتے لیکن یہ تعبیر اس قدر مہمل اور پیچیدہ ہوتی تھی کہ تمام تر ذمہ داری اسی کے سر رہتی اور اس طرح غیبی باتیں ہمیشہ صحیح اور سچی ہی ثابت ہوتیں۔

خواب طلبی کی کوششیں کچھ قدیم زمانے ہی سے مخصوص نہیں تھیں بلکہ اس سے متعلق رسمیں آج بھی عوام میں پائی جاتی ہیں۔ لوگ قبروں پر سو کر، روزے رکھ کر، اور کچھ دعائیں پڑھ کر یا چند کلمات زبان پر جاری کر کے سو جاتے ہیں لیکن ان کو بھی وہی دقتیں پیش آتی ہیں جو قدما کو پیش آیا کرتی تھیں۔ کبھی تو کوئی مقدس اور پابند شرع بزرگ جن کی داڑھی عموماً سفید ہوا کرتی ہے خواب میں اس حاجت مند کے حسب مراد اس کی دقت کا حل تجویز کر دیتے ہیں یا حل کرنے کی تدبیریں بتا دیتے ہیں لیکن کبھی کبھی ان بزرگ کا رویہ یا ان کا کلام اور کبھی کوئی خواب ہی ایسا ہوتا ہے جس کی تشریح کے لئے کسی ذی علم مذہبی شخصیت کے پاس جانا پڑتا ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام طریقے اسلاف ہی سے میراث میں ملے ہیں۔

شفق جوالاپوری

احساسِ گراں

بچھڑ کے رہ گئے ہم تم اگر تو کیا ہوگا
جو ہو کے رہ گیا خونِ جگر تو کیا ہوگا

ابھی تو آہِ شرربار پر بھروسہ ہے
کہیں جو یہ بھی ہوئی بے اثر تو کیا ہوگا

ابھی تو لذتِ سعیِ تلاش حاصل ہے
رہی نہ اپنی بھی مجھ کو خبر تو کیا ہوگا

ابھی تو دستِ طلب میں ہے دامنِ امید
خدا نہ کردہ چھٹا یہ اگر تو کیا ہوگا

ابھی تو فرشِ رہِ انتظار ہیں آنکھیں
ادھر ہوا نہ تمہارا گزر تو کیا ہوگا

یہ گلستانِ محبت، یہ صرصرِ فرقت
نہ آئی موجِ نسیمِ سحر تو کیا ہوگا

جبینِ شوق میں سجدے تڑپ رہے ہیں مگر
کہیں ملا نہ ترا سنگِ در تو کیا ہوگا

ابھی سے داغِ جگر ہے حریفِ رنگِ شفق
ہوا جو اور بھی رخشندہ تر تو کیا ہوگا

ہندوستانی ادیب کے مسائل

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

(۱) میرے خیال میں ہندوستانی ادیب کے تین بنیادی مسائل ہیں، ان میں سے دو اُس کے حقوق سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک فرض سے۔ اپنے دماغ اور قلم کی محنت سے خوش حالی کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہونا اور اظہارِ خیال کی آزادی؛ یہ دو اُس کے حقوق ہیں اور اپنی ذہنی کاوشوں سے انسانی مسرت میں اضافہ کرنا، حق اور صداقت، آزادی اور انصاف کے لئے لڑنا، امن کی طاقتوں کا ساتھ دے کر جنگ جو قوتوں کی ناپاک خواہشوں اور سازشوں کا پردہ چاک کرنا اور دنیا کی ترقی پسند طاقتوں سے تعاون کر کے انسانیت کو آگے بڑھنے سے روکنے والی قوتوں کو (چاہے وہ اپنے ملک کی ہوں یا باہر کی) شکست دینا یہ اُس کے فرائض ہیں۔

ملک میں تعلیم عام کر کے (تاکہ کتابیں زیادہ تعداد میں پڑھی جائیں)، کتب خانے کھول کر، انھیں ناشروں کے ظلم سے بچا کر، وظائف اور انعامات دے کر، ایک بڑا اسٹیٹ پبلشنگ ہاؤس قائم کر کے، اظہارِ خیال کی آزادی دے کر، بیمار اور مجبور ادیبوں کی تنخواہیں مقرر کر کے حکومت کو ادیبوں کے حقوق کی نگہداشت کرنا چاہیئے کیونکہ اسی طرح شاعر اور ادیب اپنے فرائض ادا کر سکتے ہیں۔ (سید احتشام حسین)

(۲) ہندوستانی ادیب کے مسائل میرے خیال میں مختصراً حسبِ ذیل ہیں

گرانی کے اس زمانے میں ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالنا۔

اس کوشش میں اپنی خودداری کو قائم رکھنا، سمجھوتوں سے بچنا اور فرمی یا اخباری ادب کے عوض اعلےٰ ادب کی تخلیق کرنا۔

ایک طرف سرمایہ داری کی اس یورش سے بچنا، جس کی لپیٹ میں ہندوستان کی صحافت اور ادب آہستہ آہستہ آ رہا ہے، دوسری طرف ان لوگوں کے حملوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا جن کے پاس نقاد کا کوڑا تو ہے لیکن خالق کی ذمہ داری نہیں۔

ان دونوں حملوں میں اپنے دماغی توازن کو قائم رکھتے ہوئے اپنے تجربات اور احساسات کی بنا پر ایسے ادب کی تخلیق کرنا جو وقت کا ساتھ دیتے ہوئے بھی وقتی نہ ہو، عوام کے بارے میں ہوتے ہوئے بھی ان کی جد و جہد کو آگے بڑھائے پیچھے نہ ہٹائے۔

جھوٹ، ریاکاری، بد دیانتی، سمجھوتے بازی، ابن الوقتی، اور گٹ بندی سے نہ صرف اپنے آپ کو بچانا، بلکہ اس کے خلاف جد و جہد کرنا۔ یہ وقتی طور پر خام انسان خواہ کتنا بھی اُوپر کیوں نہ اُٹھ جائے لیکن اعلےٰ ادب کی تخلیق اعلےٰ انسان ہی کر سکتا ہے۔

دوسروں کی تعریف و توصیف و تبصرہ و تنقید کے مطابق اپنے ادب کو ڈھالتے رہنے کے عوض اپنی چیزوں کا تجزیہ خود کرنے کی استعداد پیدا کرنا۔

ادیبوں کی کوئی ایسی انجمن بنانا جو نہ صرف سرمایہ داروں کے ذریعے سے ادیبوں کی ایکسپلائمنٹ رد کرے بلکہ ادیبوں کے ذریعے سے ادیبوں کی ایکسپلائمنٹ کے خلاف بھی احتجاج بلند کرے۔

ہندوستان میں سنڈیکیٹ سسٹم کے قیام کی کوشش کرنا۔

(اوپندر ناتھ اشک)

(۳) ہندوستانی ادیب کا سب سے بڑا مسئلہ اس کا پیٹ ہے۔ محفل کی تحسین و آفریں سے ضروریاتِ زندگی پوری نہیں ہوتیں۔ لکھنے کیلئے فراغت چاہیئے وہ اُسے نصیب نہیں اگر کچھ لکھے تو اشاعت کی توفیق نہیں اگر پبلشر پر اعتماد کرے تو کام نہیں بنتا اور اگر نہ کرے تو کیا کرے اگر کبھی رئیس کا سہارا لے تو خودداری میں فرق آتا ہے۔ اگر خوددار ہو کر بیٹھے تو بھوکا مرتا ہے۔ اگر عوامی مذاق کا لحاظ رکھے تو انفرادیت فنا ہوتی ہے اور اگر معیار قائم رکھے تو خود فنا ہوتا ہے۔ خدا اس کے حال پر رحم کرے (امن لکھنوی)۔

جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس

جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس چار سال کے بعد ۲۵-۲۸ ستمبر کو سری نگر میں منعقد ہوا۔ اجلاس کی صدارت شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ نے کی اور افتتاح کی رسم ہند کے پردھان منتری پنڈت جواہرلال نہرو نے ادا کی۔ اس تصویر میں پنڈت جواہرلال نہرو اجلاس کا افتتاح کر رہے ہیں۔

سامنے کی تصویر:- بخشی غلام محمد صدر استقبالیہ کمیٹی خطبۂ صدارت پڑھ رہے ہیں۔

نیچے بائیں طرف:- شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ ڈیلیگیٹوں سے خطاب کر رہے ہیں۔

نیچے دائیں طرف:- جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کے روح رواں مولانا محمد سعید مسعودی جن کی شبانہ روز کوششوں نے اجلاس کو کامیاب بنایا۔
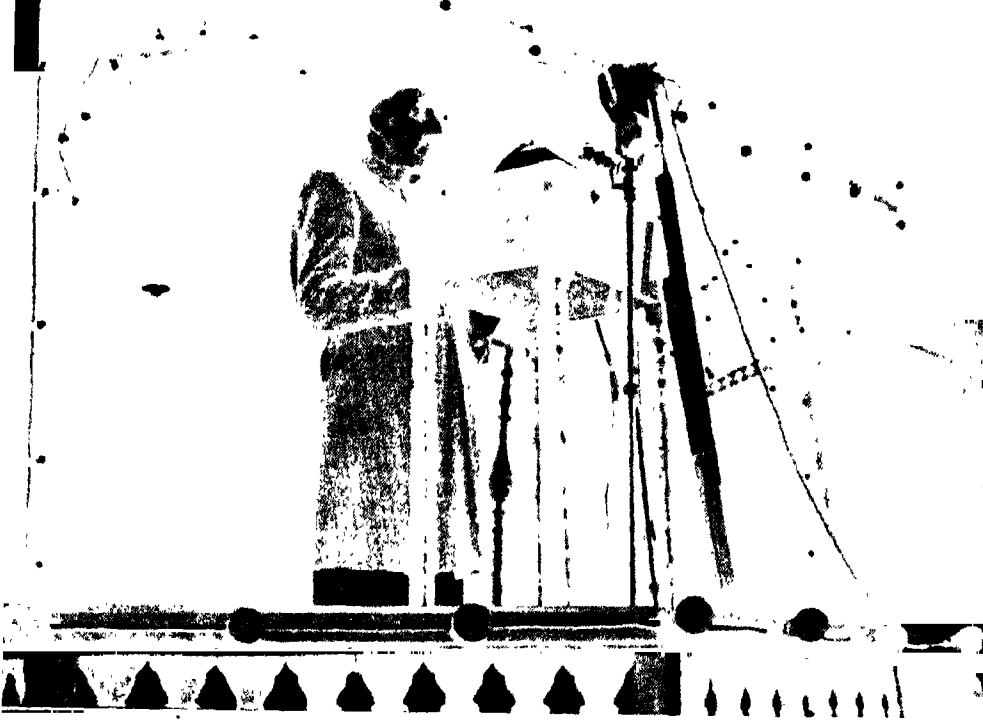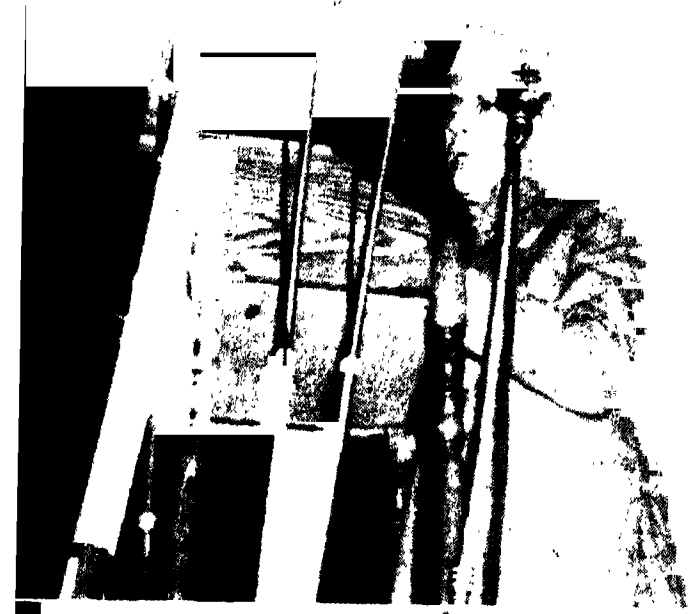
مشاعرہ نیشنل کانفرنس کا ایک خاص جزو تھا۔ اس مشاعرے میں جو پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا نیشنل کانفرنس کی دعوت پر جناب ساغر نظامی، جناب فراق گورکھپوری، جناب روش صدیقی، جناب معین احسن جذبی، جوش ملیح آبادی، جگن ناتھ آزاد اور دیگر مقامی اور غیر مقامی شعرا نے شرکت کی۔ پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنی تقریر میں بتایا کہ وہ زندگی میں پہلی بار کسی مشاعرے کی صدارت کر رہے ہیں۔ اوپر کی تصویر میں جناب فراق گورکھپوری اپنا کلام نشر کر رہے ہیں۔

اہل سری نگر نے مشاعرے کے ساتھ حیرت انگیز حد تک دلچسپی اور وابستگی کا ثبوت دیا اس مشاعرے میں جو صبح کے دو بجے تک جاری رہا عورتوں اور مردوں کے ایک جم غفیر نے شرکت کی۔

مسٹر علی محمد طارق
جن کی ان تھک کوششوں کی بدولت اہل سری نگر ایک معیاری مشاعرے سے محظوظ اور مستفید ہوئے۔

رنگِ تغزّل

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

کرنے والے حجاب کرتے ہیں
ہم نظر کامیاب کرتے ہیں

فکرِ عقبیٰ کو ہم بصد اخلاص
غرقِ جامِ شراب کرتے ہیں

جو ملی تھیں دعائیں جینے کی
وہ بھی نذرِ شراب کرتے ہیں

ہر جفا کا وفا سے دے کے جواب
ہم اُنہیں لاجواب کرتے ہیں

اُن کی نظریں اگر پھریں ہم سے
ہم بھی ترکِ شراب کرتے ہیں

انتظارِ درازِ حُور و طہُور
ہم نہیں شیخ و شاب کرتے ہیں

مُحتسب کیا کہا؟ حسابِ گناہ
ہم گنہ بے حساب کرتے ہیں

شیخ جی کا گنہ گناہ نہیں
وہ تو کارِ ثواب کرتے ہیں

ساحر ہوشیارپوری

دیکھی ہے جب سے مست اشاروں کی روشنی
جچتی نہیں ہے چاند ستاروں کی روشنی

طوفاں میں ہے حیات کی انگڑائیوں کا رقص
تمثیلِ مَوت کی ہے کناروں کی روشنی

آفات سے نکھرتا ہے انسان کا شعور
پھُولوں میں حسن بھرتی ہے خاروں کی روشنی

اے ہوش مند اور ابھی اور ایک جام
کس کام لڑکھڑاتے سہاروں کی روشنی

اب گُم ہے کس خیال میں اے چشمِ آرزو
کس درجہ پُرکشش تھی نظاروں کی روشنی

قلب و نظر میں چُبھ گئے کانٹے فریب کے
کتنی الم فزا ہے بہاروں کی روشنی

صہبائے سُرخ پی کے تو خود آفتاب بن
بجھ جائے گی تمام شراروں کی روشنی

ساحر مری نظر میں ہیں منزل کے پیچ و خم
مجھ کو نہیں قبول ستاروں کی روشنی

قدوس ندیم

میرابائی

مختصر حالاتِ زندگی جودھپور کے راٹھور خاندان کے راجہ رتن سین بن جودھا جی کی تنہا بیٹی اور اودے پور سیسودیہ خاندان کے مہارانا سانگا جی کے لڑکے راجہ بھوج راج کی بیوی تھیں۔

کڑکی نامی دیہات میں تقریباً ۱۴۹۸ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کی کمسنی ہی میں والدہ کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔ سانگا جی نے پرورش اور آرام کے خیال سے اپنے پاس بلا لیا۔ جب میرابائی سنِ بلوغت کو پہنچیں تو راجہ رتن سین کی حسب خواہش ۱۵۱۶ء میں ان کی شادی راجہ سانگا جی کے بڑے فرزند بھوج راج سے کر دی گئی اور میرابائی اسی سال اپنے شوہر کے ساتھ چتوڑ چلی گئیں۔

میرابائی کی نگاہ میں شادی اور اس کی گوناگوں مسرتیں بے کیف ثابت ہوئیں۔ کیونکہ شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد ان کے شوہر راجہ بھوج راج نے ہمیشہ کے لئے میرابائی اور شفیق والدین کو داغِ مفارقت دے دیا۔ راجہ بھوج راج کی تاریخ وفات کا پتہ نہیں چلتا تاہم اس قدر ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۱۸ء اور ۱۵۲۳ء عیسوی کے درمیان یہ امر ناگوار واقع ہوا۔ لیکن اس درمیان میں صرف شوہر ہی نے جدائی اختیار نہ کی بلکہ میرابائی کے تمام سرپرست بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ چنانچہ مہارانا سانگا جی نے ۱۵۲۷ء عیسوی میں بابر بادشاہ کے مقابلے میں پانی پت کے میدان میں شکست کھائی۔ میرابائی کے والد راجہ رتن سین اور چچا راجہ رائے مل جی جو رانا سانگا کی مدد کے لئے جودھپور کے راجہ گانگا جی کی طرف سے گئے تھے اس جنگ میں کام آئے اور دو تین برس بعد رانا سانگا کی فوج نے کرشن کے لئے روانہ ہوئے لیکن ایسی خلل بندیل کھنڈ کے مقام پر بابر بادشاہ کی عملداری میں بیمار ہو کر مر گئے ——— اور اس طرح رانی میرابائی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے مشفقین کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئیں۔ میرابائی کے سنِ وفات کا پتہ نہیں۔

رانی میرابائی نے ان تمام مصائب و آلام کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا اور دنیاوی عیش و آرام کو تج کر صورتِ موجودہ پہ صبر و شکر ادا کرتے ہوئے کسی قسم کے غم کا اظہار نہ کیا۔ اور اب میرابائی کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ یہی وہ دور ہے جس میں غم و الم کی دیوی میرابائی نے اپنے جذبات پاکیزہ اور روحانی اضطراب کا تقدس گیتوں کی صورت میں لوحِ عالم پہ نقش کیا ہے۔

عالمِ جوانی میں بیوہ ہو جانا، لاتعداد آلام و مصائب سے بھرے ہوئے کارزارِ جہاں میں خویش و اقارب کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ جانا کوئی معمولی بات نہیں۔ اس حالت کا صحیح معنوں میں اندازہ صرف میرابائی کا دل ہی کر سکتا تھا لیکن ان کے پائے استقلال میں ذرہ بھر لغزش نہ ہوئی کیونکہ ان کا روحانی رشتہ اس ہستی سے ہو گیا تھا جسے ہندو مت سری کرشن کے نام سے یاد کرتی ہے۔

بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ میرابائی کو بچپن ہی سے گردھر لال جی سے والہانہ عشق تھا جس کی تشریح یوں ہے کہ ایک مرتبہ میرابائی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل میں مشغول تھیں اور گردھر لال جی (کرشن جی) کی مورت ان کے ہاتھ میں تھی۔ میرابائی کو اس وقت کھیل کے علاوہ مورت سے اور کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسی دوران میں ان کی سہیلیوں نے ان کی ماں سے سوال کیا کہ "اے ماں میرابائی کی شادی کہاں ہوگی؟" ان کی ماں نے جواب دیا کہ ان کی شادی اس مورت کے ساتھ کی جائے گی۔ لیکن ماں کے اس بظاہر مذاق کا میرابائی کے دل پر اثر ہوا ——

یہ اتفاقی واقعہ میرا بائی کے لئے خصوصیت کے ساتھ دلچسپی کا سبب بن گیا — یہ واقعہ بچپن کا تھا اور بچپن کے بہت سے اہم واقعات چند روزہ اثرات کے بعد محو ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ برسوں بعد اہم واقعات میں سے یہ اہم واقعہ بھی دوبارہ میرا بائی کے ذہن میں اُبھر آیا اور میرا بائی گردھر لال جی کے عشق میں اس درجہ کھو گئیں کہ دنیا کے تمام رنج و آلام اور دنیاوی لذتوں سے بے نیاز ہو کر سری کرشن جی کے در پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سرِ نیاز جھکا دیا۔

رنج و آلام کی زندگی میں سری کرشن جی کا پاک تصور میرا بائی کے حقیقی سکون اور راحت کا موجب تھا۔ وہ ہر وقت گردھر لال جی کے مجسمے کو اپنے ساتھ رکھتیں۔ اکثر بے خودی میں اس طرح مخاطب ہوتیں جیسے کسی ذی روح سے باتیں کر رہی ہیں۔ ان کی اس قسم کی زندگی میں اگر کوئی واحد چیز ان کی دلچسپی کا باعث تھی تو وہ صرف گردھر لال جی کا مجسمہ تھا اور بس۔

ان کا روز و شب کا یہی شغل تھا کہ گردھر لال جی کے مجسمہ کی پوجا کرتیں اور بس ان اُنھیں کی تعریف میں گیت گایا کرتیں۔ پوجا کے وقت ہرن کی کھال پر بیٹھتیں اور نہایت سادہ زندگی بسر کرتیں حتیٰ کہ ایک روز ایسا بھی آیا جبکہ میرا بائی کی زندگی پوری طرح سے گردھر لال جی کے عشق کا جزو ہو کر رہ گئی۔ ایسی صورت میں گردھر لال جی کے مجسمے سے جدا ہونا اُنھیں ایک لمحہ کے لئے بھی شاق گزرتا تھا۔ وہ شب و روز اُنہی کی پوجا میں مصروف رہتی اور بیشتر اوقات بے خود ہو کر مجسمے کے سامنے ناچا بھی کرتیں۔

دنیاوی باتوں سے علاحدگی اور گردھر لال جی کے مقدس تصور میں شب و روز محو رہنے کی وجہ سے اُن کی سیرت بہت بلند ہو گئی۔ ساری عمر مصیبت و تکلیف میں بسر کرنے کی وجہ سے طبیعت میں سنجیدگی اور ناصحانہ انداز داخل ہو گئے، ان کی نگاہیں گرد و پیش کو نہایت عمق سے دیکھتیں، زندگی کے ہر موڑ کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے پرکھتیں اور اس راہ کے نشیب و فراز کو گردھر لال جی کے روحانی چراغ کی روشنی میں جانچ و ہموار کرتیں۔ زندگی کے ہر مرحلے پر غلط اور بُری باتوں سے بچنے کی تلقین کرتیں، اہلِ جہاں کی پُر فریب رنگینیوں سے کنارہ کرنے اور معرفتِ خدا اختیار کرنے کا درس دیتیں، اپنے عرفانی گیتوں کے ذریعے جہاں گردھر لال جی کا وصف بیان کرتیں وہاں اُن کے نام لیواؤں کی غلط کاریوں پر بھی ٹوکتیں اور حق و صداقت کا راستہ دکھاتیں۔ جہاں اُن کی نگاہیں مغرور انسانوں اور لالچ و ہوس کے بندوں کو دنیاوی محبت میں خدا سے قطع تعلق کرتے ہوئے پاتیں فوراً اُن کا درد مند دل پکار اُٹھتا ؎

राम नाम रस पीजे मनवा राम नाम रस पीजे
तज के संग बैठ नित हर चर्चा सुन लीजे
काम क्रोध मद लोभ मोह को चित से बहाए दीजे
मीरा के प्रभु गिरधर नागर ताहि के रंग में भीजे
राम नाम रस पीजे मनवा राम नाम रस पीजे

یعنی "اے خاکی انسان! اپنے دل کو حرص و ہوس، غصہ و کپٹ سے پاک کر اور دُنیا کی مشغولیت میں اس قدر محو نہ ہو جا کہ روحانیت مجروح ہو۔ بُری صحبت اور خراب باتوں سے احتراز کر کے نیک اور پاکیزہ لوگوں کی صحبت اختیار کر تاکہ ان کی زبان سے خدائے پاک کا ذکر سن سکے۔ اے خاک کے پُتلے، عشرتِ دنیا کی رنگین قدح ترک کر اور خدا کی محبت کی شراب پی تاکہ اس کی معرفت سے عقل و دل منور ہوں"

گردھر لال جی کے عشق میں اُن کا دل ہر آن محو رہتا اور جب جذباتِ محبت حد سے متجاوز ہو جاتے تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلتے اور وہ پکار اُٹھتیں ؎

मीरा के प्रभु कबरे मिलोगे तुम मिलियां सुख होय
घड़ी एक नहीं आवड़े तुम दरसण बिन मोय
तुम ही मेरे प्राण जी कासूं जीवण होय

یعنی "اے میرے مالک، کرشن جی، تمہاری روح افزا دید سے محروم ہو کر مجھے میری زندگی کا کوئی لمحہ بھی خوش گوار نہیں معلوم ہوتا۔ تم ہی میری روح اور سرمایۂ راحت ہو تو کس طرح تیرے ہجر و فراق میں زندہ رہ سکوں۔"

اور جب اُنھیں اس بات کا احساس ہوتا کہ وہ اپنے محبوب (گردھر لال جی) کی یاد میں ایک عمر بسر کر چکیں اور حیات کی رفتار نہایت تیزی کے ساتھ منزل موت سے قریب ہوتی جا رہی ہے اور اب تک اُن کے محبوب نے درشن نہیں دیئے ہیں تو اُن کے دل پر حزن و ملال کے تاریک سائے پڑنے لگتے۔ ان کو دُکھ ہوتا کہ غیروں سے اُن کا برتاؤ اُن سے بھی زیادہ اچھا ہے حالانکہ میرا بائی جو صرف اُنہی (کرشن جی) کی ہو کر رہ گئی تھیں اب تک دیدار سے محروم تھیں۔ اُنھیں اس بات کا رنج ہوتا کہ پربھو ملنے کا وعدہ کرکے گئے اور اب تک نہ آئے۔ وہ بے اختیار مجسمے کے سامنے گر پڑتیں اور دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر پکار اٹھتیں ؎

म्हारो जनम मरन के साथी
थाने नाहीं बिसरूं दिन राती
तुम देखयं बिन कल न पड़त है — जानत मेरी छाती
ऊंची चढ़ चढ़ पंथ निहारूं — रोय रोय अंखयां राती
यो संसार जगत है झूठो — झूठा कुल रांनाती
दोऊ कर जोड़िया अरज करत हूं — सुन लीजे मेरी बाती
सत गुरु दस्त धर माथों ऊपर — आंकुश दे समझाती
मीरा के प्रभु गिरधर नागर — हरि चरणा चित राती
पल पल तेरा रूप निहारूं — निरख निरख सुख पाती
म्हारो जनम मरन के साथी
थानें नाहीं बिसरूं दिन राती

یعنی "اے سری کرشن جی آپ میری حیات و موت کے ہمراہی ہیں۔ میں آپ کو کسی وقت نہیں بھولتی۔ آپ کی دید کے بغیر مجھے ایک گھڑی چین نصیب نہیں ہوتا۔ میں اونچے اونچے مقامات پر چڑھ کر بہت دور آپ کی راہ دیکھتی ہوں۔ آپ کی جدائی میں رو رو کر میری آنکھیں لال ہو جایا کرتی ہیں۔ یہ دُنیا اور اُس کے تمام کاروبار باطل ہیں اور فنا ہو جانے والے ہیں۔ میں ہاتھ جوڑ کر آپ سے پرارتھنا کرتی ہوں کہ اب زیادہ دیر مفقود نہ رہو۔"

میرا بائی اپنے خاکی وجود پر غور کرتیں۔ اُنھیں دھوکے اور فریب کا بچھا ہوا ایک جال نظر آتا۔ اپنے گرد و پیش کا مشاہدہ کرتیں۔ ہر طرف مکر، جہل اور بدکاریوں کا بے پناہ سیلاب انسانوں کو خس و خاشاک کی طرح بہاتے گزرتا دکھائی دیتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اُن کا شریر نفس اُنھیں بھی ورغلانا شروع کرتا اور اُنھیں کرشن جی کی پاک محبت سے کنارہ کر لینے کا مشورہ دیتا۔ کبھی کبھی اُن کے خیالات بہک جاتے اور اپنے زندگی کے نصب العین سے ہٹ کر دنیادی عشرتوں اور سرمستیوں کی طرف مُڑ جاتے۔ لیکن — خیالات باطل کا طلسم اچانک ٹوٹ جاتا۔ اور وہ بیدار ہو جاتیں۔ اپنا سراپا گردھر لال جی کے چرنوں میں ڈال کر یوں ملتجی ہوتیں ؎

मीरा के प्रभु सांची दासी बनाव
झूठे धंदों से मेरा फंदा छुड़ाओ
हाय राम नहीं कुछ बस मेरा
मरत हूं बेबस प्रभु धाओ सवेरा
धर्म उपदेश नित प्रति सुनती हूं
मन कुचाल से भी डरती हूं
सदा साधु सेवा करती हूं
सुमिरन ध्यान चित धरती हूं
भगत मार्ग दासी को दिखाओ
मीरा के प्रभु साची दासी बनाओ

یعنی "اے میرے معبود، مجھ کو حق و صداقت کا پیکر بنا اور مجھے باطل پرستی سے نجات بخش۔ میں اپنی بساط کے موافق پوری سعی کرتی ہوں لیکن پھر بھی اوہام اور باطل خیالات مجھے گھیر لیتے ہیں۔ اے میرے محبوب، مجھے باطل پرستی سے بچا۔ نجات دے۔ میں ہر لحظہ نیک باتیں سنتی ہوں اور اپنے نفس سرکش کے غلبے سے ڈرتی اور نیک لوگوں کی خدمت کرنے پر مستعد رہتی ہوں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آپ کی مقدس یاد میں اپنے قیمتی لمحات صرف کرتی ہوں۔ اے میرے مالک تو مجھے اپنی سچی خادمہ بننے کی توفیق دے اور اپنی راست راہ پر مجھے چلا۔"

رتن لال کھنہ

صحافت نگاری میں انٹرویو کا آرٹ

صحافت نگاری میں انٹرویو سب سے نازک اور استادانہ آرٹ ہے۔ اس میں انتہا چابک دستی، شعور، سلیقہ۔ سبک دستی اور مہارت درکار ہیں۔ انٹرویو کرنے والے کے لئے لازم ہے کہ اس نے انسانی فطرت کا خوب مطالعہ کیا ہو اور انسانی نفسیات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو۔ یہ بھی لازم ہے کہ وہ محل شناس، اہم اشخاص اور حالات سے صحیح کام لینے کی کامل صلاحیت رکھتا ہو۔ اس فن کے باکمال ماہر میں سادگی اور چالاکی ضروری خوبیاں ہیں۔ ان کے علاوہ خداداد قابلیت اور ملکہ۔ سچ تو یہ ہے، یہ فن بھی ایک وہبی کمال ہے، اکتسابی نہیں امریکہ اور ہنگری کے صحافت نگاروں نے باقی سب کو مات کر دیا ہے۔ امریکہ کے ماہروں کی امتیازی صفت 'سادگی' ہے اور ہنگری کے جرنلسٹوں کا طرۂ امتیاز چالاکی ہے۔ ہمارے ملک میں سادگی اور پُرکاری کا مجموعہ صفات اہل صحافت میں نادر ہے۔

اس فن کی حکمت عملی شاطرانہ سلسلۂ گفتگو شروع کرنا ہے۔ اس فن کا ماہر مخاطب سے سلسلۂ گفتگو کا آغاز ایسے سوالوں سے نہیں کرتا جو اس کے خیال و عمل کے میدان سے براہِ راست متعلق ہوں۔ ایسا کرنا پھوہڑپن اور بے شعوری کی انتہا ہے۔ اس عملی حکمت کا تقاضا ہے کہ سیٹھ دلیا کے ساتھ مال و زر کی بات چیت نہ کی جائے بلکہ ان سے آغازِ سخن اس طرح ہو کہ صاحب! خدا سے متعلق آپ کے کیا احساسات ہیں! جنرل کری آپا سے معافیات کے ساتھ سلسلۂ گفتگو شروع کرنا عین حماقت ہے۔ ان کے ساتھ فنون لطیفہ سے آغاز گفتگو کر کے ان کا سرور کیا جا سکتا ہے اور موہ بھی لیا جا سکتا ہے۔

انٹرویو کرنے والے کے لئے پہلے چند ملاقاتی لمحات بڑے نازک اور فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ ماہر فن ان لمحات میں مخاطب شخصیت کے ساتھ تاثیر پذیر ہمدردانہ رابطہ قائم کر لیتا ہے۔ گرمی اور تپاک کو ابھار کر شخصیت کو مائل بہ گفتگو کر لیتا ہے۔ یہ اس کی ساحری کا آغاز ہے۔

انٹرویو کرنے سے پہلے شخصیت متعلقہ کی سیرت کا گہرا مطالعہ از بس لازم ہے۔ اس ضمن میں فوٹوگراف (عکسی تصویر) کے بغیر چارہ نہیں۔ انسان کا چہرہ اس کی خصائل کا آئینہ ہوتا ہے۔ انٹرویو آرٹسٹ قیافہ شناسی سے کردار کا پتا لگا لیتا ہے۔ قیافہ شناسی اس کے فن کا ضروری عنصر ہے۔ ایک خوشگوار ماحول پیدا کرنا اس کے فرائض اولین میں سے ہے۔ شخصیت کی شہری دلچسپیوں کو ابھارنا اس کی اصلی صلاحیت ہے۔ آرٹسٹ کا اصلی مطمح نظر شخصیت کو اظہارِ خیالات پر آمادہ کرنا ہی نہیں بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ اظہارِ خیالات کرتے وقت اس کی ذہنی کیفیت کیا ہے۔ دورانِ اظہارِ خیالات میں شخصیت کے دل و دماغ کی مخصوص حالت کی عکاسی کرنا اس طرزِ اظہار کی منہ بولتی تصویر کھینچنا اس کی کاریگری کے جوہر اور گوہر ہیں۔ جوہر شناس لوگ ایسے انٹرویو کو موتیوں میں تولتے ہیں!

موضوعِ سخن کا انتخاب بھی نہایت اہم ہے۔ دولت مند شخصیت کے ساتھ قیمت زر پر براہِ راست بحث کرنا محض حماقت ہے۔ مکالم بحر الکلام کا اصول برتنا چاہیئے۔ مثلاً نظام سے یہ چھٹتے ہی پوچھنا کہ آپ دنیا کے مالدار ترین لوگوں میں کیسے شمار ہونے لگے "پھوہڑپن" کی علامت ہے۔ ہاں باتوں باتوں میں انہیں بدگمان کئے بغیر اگلوا لینا آرٹ کا تقاضا ہے۔ مثلاً ایک ماہر فن ایک دفعہ راک فیلر کو انٹرویو کرنے کے لئے گیا۔ اس نے اسے بتایا کہ کس طرح ایک اطالوی کروڑ پتی نے ایک ویٹرس کو انعام دیا۔ بس پھر کیا تھا راک فیلر نے موجود کے متعلق اپنے عمیق ترین قلبی خیالات اور احساسات [illegible] کے

مکہ دیا! ایسے راز معلوم کرنا بڑا کٹھن اور نازک کام ہے۔ اکثر کنایہ اور تمثیل سے کام لیا جاتا ہے۔ ایک ماہرِ فن نے ایک دفعہ امریکہ کے کچھ مال دار ترین اور طاقت ور ترین لوگوں کے ساتھ کھانا کھایا وہ ان کی ترقی کا راز معلوم کرنا چاہتا تھا۔ معاً اس نے یہ قصہ گھڑ کر سنایا۔ کہ ایامِ شباب میں مجھے پہاڑوں پر چڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ میں مونٹ بلانک پر چڑھا۔ اس کی چوٹی پر طوفان اتنا تند تھا اور سردی اتنی شدید تھی۔ کہ میں نے دہشت زدہ ہوکر فوراً اترنا چاہا۔ کیا آپ کا بھی اپنے متعلق ایسا ہی احساس ہے؟ انہوں نے اس کی طرف ایسے دیکھا گویا وہ کوئی سراسر حواس باختہ دیوانہ تھا۔ مگر ماہرِ فن کی حکمتِ عملی کا جادو چل چکا تھا یکے بعد دیگرے ہر ایک شخصیت نے اپنی اپنی ترقی کا قصہ پوری پوری تفاصیل کے ساتھ کہہ سنایا۔

شخصیت پر بے جوڑ براہِ راست سوالوں کی بوچھاڑ کر دینا آرٹ کے اصول اور سلیقہ کے سراسر منافی ہے۔ سلسلہ سوالات میں ہم آہنگی اور ربط لازم ہے ظاہر ہے کہ ماہرِ فن کے لئے ضروری ہے وہ ڈرامائی طریق کار اور اصولِ فن سے کماحقہ واقف ہو۔ سوالات اس سلیقہ اور ہنرمندی سے پوچھنے چاہئیں کہ شخصیت اعلیٰ کی زندگی اور سیرت کے تمام مخصوص خصائل اور واقعات ان کا ذکر کئے بغیر معلوم ہوجائیں

انٹرویو کے آرٹ کا ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ ماہرِ فن اپنے سوالات کے منصوبہ کو دل و دماغ میں محفوظ رکھے۔ سوال نامہ ہاتھ میں لئے شخصیت اعلیٰ کے کمرے میں داخل ہونا مصلحت اور اصولِ فن کے سراسر منافی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے وہ اپنی پُر احتیاط طیاری کو بڑی ہوشیاری سے پوشیدہ رکھے۔ آرٹ کا کمال بھی آرٹ کو چھپانا ہے۔ انٹرویو کے دوران میں نوٹ لینا بھی اس آرٹ کے اصولوں کے خلاف ہے۔ ایسا کرنا خیر پختگی اور پھوہڑ پن کی علامات ہیں۔ کئی اعلیٰ شخصیتیں ایسی ہیں کہ وہ انٹرویو دیتے ہی نہیں۔ ایسے لوگوں سے انٹرویو کا محض جزیہ حاصل کر لینا بھی صحافت میں کارنمایاں ہے۔ اس کے لئے بڑی سوجھ بوجھ اور پرواز فکر اور کمال سلیقہ درکار ہیں۔ جارج برنارڈ شا انٹرویو کے لئے کبھی صحافی کو نزدیک نہیں پھٹکنے دیتا تاہم کبھی کبھی کوئی کوئی صحافی چالاکی سے تھوڑی سی گفتگو شا سے کر لینے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ دو سال کا ذکر ہے کہ ایک یورپین صحافی نے شا کی ۹۰ ویں سالگرہ کے سلسلے میں ڈرامہ نگار سے کچھ گفتگو کی اور اسے شائع کیا وہ اپنے مشکل مقصد میں اس طرح کامیاب ہوا۔

معاملہ ایک سال پہلے شروع ہوا صحافی نے ایک ایت وار صبح کے وقت شا کو ایک تار بھیجا:۔ ”آج دوپہر آرہا ہوں۔ آپ سے ملاقات کے لئے ممنون ہوں گا۔“ وہ آیا۔ ڈرامانگار اس سے ملا اور شکایت کی وہ (صحافی) صرف حیوان کو ملنے کے لئے آیا صحافی نے اسے یقین دلایا کہ حال این کہ ایک من چلا جوان ایک باکمال عمر رسیدہ شخصیت کو ملنے آیا ہے۔ اس حاضر جوابی نے جادو کا سا اثر کیا اور دونوں کے مابین ایک گھنٹہ گفتگو ہوتی رہی صحافی جب رخصت ہونے لگا تو شا نے کہا۔ ”پھر تشریف لائیے گا“ ایک سال بعد صحافی نے پھر یہ تار بھیجا:۔ ”کیا میں آپ کی پچھلے سال کی ملاقات کی پیش کش کا فائدہ اٹھا سکتا ہوں۔ شام آرہا ہوں“ اس دفعہ شا بہت کم خوش تھا۔ تاہم دونوں کی گفتگو ہوئی۔ جاتی دفعہ شا نے کہا: ”اگر آپ پھر ملنا چاہیں تو مجھے انکار کرنے کے لئے وقت دیجئے“!

انٹرویو لکھنا بھی آسان کام نہیں۔ یہ بھی صحافتی انشاپردازی میں ایک نفیس اور مشکل آرٹ ہے جس میں تخلیقی قوت اور قوتِ تخیل درکار ہیں۔ طرزِ انشا میں ڈرامائی جوش، قلمی شوخی اور رنگ کے علاوہ صحافتی اسٹائل کی تمام خصوصیات بھی ضروری ہیں۔ صحافت نگار کو چاہیئے کہ وہ اپنی شخصیت کو بیان میں مخل نہ ہونے دے سوالات کو رسمی طور پر قلمبند کرنا بھی انٹرویو نگاری کے اصول کے منافی ہے۔ جوابات اس طرح لکھے جائیں کہ ان سے سوالات خود بخود منظر ہوں۔ صرف دلکش پیرایہ میں بڑے آدمی کے خیالات اور احساسات کی تصویر کھینچ دینا ہی کافی نہیں۔ یہ بھی لازم ہے یہ تصویر ذہنی اور طبعی ماحول بھی دلاویز طرز میں پیش کرے۔ گفتگو کے دوران میں تاثیر و تاثر۔ بڑے آدمی کی مخصوص جسمانی حرکات۔ طبیعت کا خاکہ۔ مخصوص جذبات کا تعامل یہ سب

عناصر انٹرویو کی منہ بولتی تصویر کی روح ہیں۔ صلاحیت سے لکھا ہوا انٹرویو ایک ناطق فلم کی طرح جگہ، وقت، شخصیت، ماحول بات چیت وغیرہ کی ساحرانہ ڈرامائی طرز میں عکاسی کر دیتا ہے

ظاہر ہے، کہ انٹرویو کرنا اور انٹرویو نگاری بازیچۂ اطفال نہیں یہی وجہ ہے اس فن کے ماہر کسی ملک میں بھی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس آرٹ کے لازمی خاصہ کو اچھی طرح سمجھا نہیں گیا۔ یہاں انٹرویو نگاری میں اس سادگی اور پرکاری کا جو اس کا جوہر ہیں، شائبہ تک نہیں ملتا۔ انگریزی انٹرویو میں بھی یہ اجزا ضرورت کے لحاظ سے کافی نہیں۔ امریکن صحافت نگاروں نے اس آرٹ کو نہایت لطیف بنا دیا ہے۔ ان کے انٹرویو فنی شاہکار ہوتے ہیں۔ ان فن کاروں پر غالب کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

غیر ممالک سے اناج کی درآمد

۱۷ ستمبر ۱۹۴۹ء کو ختم ہونے والے ہفتہ کے دوران میں اناج کی حسب ذیل تعداد غیر ممالک سے ہند میں درآمد کی گئی۔ گندم اکتالیس ہزار چار سو ٹن آٹا نو ہزار تین سو ٹن۔ چاول سولہ ہزار ڈیڑھ سو ٹن۔ اور جو تین سو ٹن۔ یکم جنوری ۱۹۴۹ء سے لے کر اس ہفتہ تک کل اکتیس لاکھ بہتر ہزار آٹھ سو پچاس ٹن اناج باہر سے ہند میں درآمد کیا جا چکا ہے۔

صوبے اور ریاستیں

بہار خوراک کی پیداوار بڑھانے کے لئے زیادہ سے زیادہ زمینوں کو زیر کاشت لانے کے لئے حکومت نے تجویز کیا ہے کہ۔۔ متقابل حرکت پمپنگ سیٹ یعنی پانی کو مشینوں کے ذریعہ اوپر اٹھانے والی کلیں مہیا کی جائیں۔ جو حسب ضرورت ایک سے دوسرے گاؤں میں لے جائی جا سکیں۔ ان کے ذریعہ دریاؤں سے پانی کھینچ کر کھیتوں کو سیراب کیا جائے گا۔ نیز یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔ کہ کسانوں کو پانی نکالنے والے پمپ نصف قیمت پر مہیا کئے جائیں۔ غیر آباد زمینوں کو پھر سے آباد کرنے کی ایک جامع سکیم بنائی گئی ہے جس کے ذریعہ مزید پندرہ ہزار ٹن پیداوار حاصل ہوگی۔

بمبئی صوبہ کے وزیر زراعت نے شہری لوگوں سے اپیل کی ہے، کہ خوراک کی پیداوار بڑھانے کی مہم میں وہ بھی حکومت کی مدد کریں۔ اور ہفتہ میں کم از کم ایک دن عملی طور پر کھیتوں میں کام کرنے کے لئے اپنے آپ کو پیش کریں۔ جو لوگ رضاکارانہ طور پر اس کام میں شامل ہونا چاہیں۔ انہیں اپنے نام متعلقہ حکام کے پاس درج کرانے چاہئیں۔

کشمیر سردار بدھ سنگھ وزیر اطلاعات اور بحالی کاشتکار نے پچھلے دنوں ایک بیان میں بتایا ہے۔ کہ حکومت نے لوگوں کو خوراک کی امداد مہیا کرنے پر ڈیڑھ کروڑ روپیہ خرچ کیا ہے۔ اس کے علاوہ پناہ گزینوں کو مفت راشن مہیا کرنے پر ایک کروڑ روپیہ خرچ کیا گیا ہے۔

ٹراونکور اور کوچین ایک سرکاری اعلان مظہر ہے کہ ریاست میں تیس ہزار ایکڑ نئی زمینوں کو جوتا گیا ہے۔ اور چھہتر ہزار ایکڑ دھان کے کھیتوں کو خشک سالی سے محفوظ بنا دیا گیا ہے۔ آئندہ دو برسوں میں گھاس پات سے اٹی ہوئی پچاس ہزار ایکڑ اراضی اور سولہ ہزار ایکڑ بے کار پڑی اراضی کو زیر کاشت لایا جائیگا۔

ناہید ہاشمی

گریز پا

"بھئی واہ کس قدر خوش قسمت ہوا کرتے تھے پچھلے زمانے کے عاشق بھی"۔

"کیوں" میں حیرت سے بولی ۔

"اب دیکھو نا" احمد بھائی اس طرح بولے جیسے کلاس روم میں لیکچر دے رہے ہوں "ان دنوں محبت کتنے ہی کنوئیں جھنکوایا کرتی تھی مگر جانباز عاشق بھی بس سر ہتھیلی پر لئے رہا کرتے تھے ۔جنہیں دنیا میں کوئی کام نہیں ہوتا تھا بس سوائے اس کے ۔محبوبہ کی صرف ایک جھلک ہی انہیں اتنا بیقرار کر دیتی تھی کہ دودھ کی نہریں نکال رہے ہیں ۔کہیں دریا پھاند رہے ہیں تو کہیں رقیبوں کی ایک پوری ٹولی کے ساتھ تن تنہا معروف بہ جنگ ہیں ۔ اور پھر ان تمام مصائب کے بعد جب کبھی محبوبہ صاحبہ کے درشن ہوئے تو انہیں دیکھ بھی نہیں سکے اور بقول

میں کامیاب دید بھی محروم دید بھی

میں خاموشی کے ساتھ ان کا لیکچر سنتی رہی ۔ یہ احمد بھائی بھی عجیب چیز تھے ۔ امّی کی دور پرے کے رشتے کی کسی بہن کے صاحبزادے تھے اور علی گڈھ ایم ۔ اے کرنے آئے تھے ۔ پڑھتے لکھتے تو کچھ تھے نہیں ۔ بس دن بھر ادھر ادھر گھومنا، شام کو ہمارے یہاں آجانا اور اپنے عجیب و غریب فلسفے سے سب کو متحیر کرنا ۔

امّی ان سے بہت خوش تھیں ۔ ان کی ہر بات پر آمنّا و صدقنا کہتی تھیں ۔ مجھے شروع شروع میں تو ان کی ہر بات بری لگتی تھی مگر اب کچھ عرصے سے نہ جانے کیوں اس قدر متاثر ہو گئی تھی ۔ جی چاہتا تھا کہ یہ سارے دن یونہی اوٹ پٹانگ ۔ اڑاتے رہیں اور میں سنتی رہوں ۔ جس قدر میں ان کے قریب ہو رہی تھی اتنا ہی انہوں نے اپنا طریقہ دلکش بنا لیا تھا ۔ روزانہ کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ جاتے کہ بعد میں میں گھنٹوں روتی ۔

اب اس وقت دیکھئے ۔کہاں تو اچھے خاصے "مرقع چغتائی" دیکھ رہے تھے ۔ اور کہاں چھانٹنے لگے ایسا خشک فلسفہ ۔ آخر تنگ آکر میں نے کہا ۔

یہ تو خیر بیکار کی بات ہے ۔محبت جیسی اس وقت ہوا کرتی تھی ویسی ہی آجکل بھی ہے ۔ اس میں فرق تھوڑی ہو گیا ۔کرنے والا ہونا چاہئے"۔

"لیجئے بھلا فرق کیوں نہیں ہوا ؟ اب آجکل تو محبت کرنے میں کوئی لطف ہی نہیں آتا ۔ آج کل کی لڑکیاں تو پکے ہوئے آم ہیں ۔ ہاتھ بڑھانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی ۔جس درخت کے نیچے دم بھر کو رکو قدموں میں ڈھیر لگ جاتا ہے ۔ پھر بتاؤ کون کھائے اتنے ڈھیر سے آم یونہی بیٹھے بیٹھے اور جو کہیں دور ڈٹے ۔دھوپ 'پٹنے کٹنے' اور انتہائی مشکلات کے بعد ایک آم محض دور سے دیکھنے کو ملے تو کیسے جی نہ چاہے اسے کلیجے میں رکھ لینے کو ۔ اب مجھے ہی دیکھئے ۔ اب تک چھ لڑکیوں سے ——— ہوں ! کیا سمجھتی ہیں آپ مجھے کنزیہ" اور میرے دل پر جیسے چوٹ لگ گئی ۔

نومبر کا مہینہ تھا ۔خاصی سردی شروع ہو گئی تھی ۔سب لوگ برآمدے میں بیٹھے دھوپ کا لطف اٹھا رہے تھے ۔میں کبھی دھوپ میں نہیں بیٹھتی اس لئے اپنے کمرے میں چلی آئی ۔ اور باغیچے کی طرف والی دونوں کھڑکیاں کھول کر قریب ہی فرش پر برش ۔ رنگ لے کر بیٹھ گئی ۔کئی دن سے سوچ رہی تھی کہ جذبی کے شعر ۔

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

کو تصویر کے سانچے میں ڈھالوں ۔ مگر موڈ ہی نہیں آ رہا تھا ۔ اس وقت بے اختیار . . . جی تصویر کشی کو چاہنے لگا تو فوراً کام شروع کر دیا ختم ہوتے ہوتے میری تصویر مکمل ہونے کے قریب پہنچ گئی ۔ میرا برش تیزی سے

ساتھ شفق میں سرخی بھر رہا تھا کہ اچانک آواز آئی -

"آداب عرض ہے چغتائی صاحبہ"

میں نے چونک کر اوپر دیکھا اور گھبرا کر دوپٹہ اوڑھ لیا - یہ احمد بھائی تھے - پھر ہنس کر بولے -

واقعی یہ سرپرائز Surprise ہی تو تھی کیونکہ میرے کمرے میں کبھی میرے ابا بھی بغیر پکارے ہوئے نہیں آتے تھے اصل میں میری عادت تھی کہ کوئی بھی کام انہماک کے ساتھ کرنا ہوتا تو دوپٹہ اتار کر اطمینان سے کیا کرتی تھی — مگر اب ان سے کون کہے — ان کے حقوق کا دائرہ تو بہت وسیع تھا - ایسی سردی میں بھی میری پیشانی پر پسینہ پھوٹ نکلا -

"یہ کیا بن رہا ہے" انہوں نے میری گھبراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا - اور وہیں فرش پر میرے قریب بیٹھ کر تصویر دیکھنے لگے - عجیب مزاحیہ انداز میں اوپر لکھا ہوا شعر پڑھا اور بجائے تصویر کی تعریف کے بولے -

"یہ نہ جانے تم لڑکیوں کی کیا خراب عادت ہے کہ ہمیشہ قنوطی بنی رہتی ہو معلوم نہیں یہ تم لوگوں کی فطرت ہی ہوتی ہے یا یونہی فیشن کے طور پر بننے لگتی ہو - میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم لوگوں کا نظریہ زندگی کیا ہے - خواہ مخواہ فانی یا یاس بننے سے کیا فائدہ - یہ زندگی بار بار تو ملتی نہیں - انسان کو وقت سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے - میں تو ہمیشہ حال کو دیکھتا ہوں اور یہ بھول جاتا ہوں کہ ماضی میں کیا ہوا تھا - نہ کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا کرتا ہوں کہ مستقبل میں کیا ہوگا - تم نے Browning کی Last Ride together تو پڑھی ہی ہوگی - میرا تو بھئی اس پر ایمان ہے - ہماری ہر خواہش تو پوری ہو نہیں سکتی پھر کیوں نہ ہم جو کچھ مل جائے اس پر خوش رہنے کی عادت ڈالیں - ہاشمی صاحب کا وہ شعر تو تمہیں یاد ہوگا -

ہاشمی ہجر میں خوش رہنے کی عادت ڈالیں
وصل کی بات جو بنتی نہیں اچھا نہ بنے

مگر نہیں تمہیں تو اسی غزل کا یہ شعر پسند ہوگا ؎

ہم کو پامال ہی کرتی رہی دنیا لیکن
سیر دیکھا کیئے ہم سبزۂ بیگانہ بنے

ان کی اس بے سر و پا اور طویل تقریر سے اکتا کر میں نے پوچھا -

"آخر آپ کا مقصد کیا ہے! وہ بتائیے - ان بیکار کی باتوں سے کیا حاصل" - وہ بولے "ہو کافی ذہین - واقعی اس وقت میں ایک خاص مقصد کو لے کر تمہارے پاس آیا تھا - اور گو تمنا مختصر سی ہے مگر تمہید طولانی - اصل میں میں چاہتا ہوں کہ تم آج شام کو میرے ساتھ چلنے [illegible]"

میں نے کہا "مگر یہ بات تو آپ کو بی اماں سے کہنی چاہیئے - ویسے میرے خیال میں تو یہ بالکل بیکار سی بات ہے - آپ کے گھر جا کر میں کیا کروں - بس آپ اور تمہارا رشید - کوئی اور ہوتا تو اس سے ملنے آ بھی جاتی -

"تو گویا ہماری کوئی اہمیت ہی نہیں ہے - اور ہم اس قابل بھی نہیں ہیں کہ کوئی ہم سے ملنے آئے -

نہیں یہ بات نہیں ہے مگر آپ خود سوچیئے کہ جب آپ سے یہیں ملاقات ہو جاتی ہے تو پھر وہاں آ کر کیا کروں - اگر آپ کی بہنیں یا ہماری بھابی ہوتیں تو ان سے ملنے آ بھی جاتی -

"خیر رہنے دو" وہ بے رخی سے بولے "کوئی زور تو ہے نہیں - ظاہر ہے کہ بہنیں آ نہیں سکتیں - وہ اپنے اپنے شوہروں کے ساتھ ہیں - اور وہ دوسری جن کو تم نے کہا ان کا ابھی کوئی امکان ہی نہیں ہے - معلوم نہیں اللہ میاں نے انہیں بنایا بھی یا نہیں - اس لئے تم تو کبھی میرے گھر آ نہیں سکو گی - میں جانتا تھا کہ تم یہی عذر پیش کرو گی - جس آدمی کے گھر جانے میں تمہیں بدنامی کا ڈر ہو اس سے اپنے گھر مل کر بھی تو تم بدنامی سے نہیں بچ سکتیں - میری حماقت تھی جو میں نے بات بھی کھو دی اچھا کہ آئندہ ایسی غلطی نہ ہوگی - اب مجھے اجازت دو - انشاء اللہ اب کبھی تم سے ملنے کی کوشش نہ کروں گا" - یہ کہتے کہتے وہ کھڑے ہو گئے اور باہر جانے لگے - میں بھی گھبرا کر کھڑی ہو گئی - چاہا کہ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روک لوں مگر پھر رک گئی - اور بمشکل تمام انہیں رکنے کے لئے کہہ سکی - وہ مڑ گئے اور رکنے لگے -

"دیکھو کل بارہ بجے دن کو میں تمہارے کالج کے پچھلے دروازے پر تمہارا انتظار کروں گا - اس وقت تمہاری کھانے کی چھٹی ہوتی ہے نا

جانتا ہوں کہ تم وہاں کھانا نہیں کھاتیں - گویا وہ وقت تمہارا خالی ہوتا ہے - میرا گھر تو کالج کے پاس ہی ہے - دو منٹ میں ہم وہاں پہنچ جائینگے اور آدھ گھنٹے بعد میں تمہیں واپس چھوڑ آؤنگا - خالہ جی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے - وہ شاید منظور نہ کریں" -

اور میں نے سر جھکا کر ان کی تجویز مان لی - اس کے بعد وہ جانے لگے اور جاتے جاتے چرکا لگا گئے -

" میں جانتا تھا کہ تم راضی ہو جاؤ گی - وہ تو میں نے یونہیں ایکٹنگ کی تھی ورنہ مجھے یقین کامل ہے کہ جو بات میں کہوں وہ تمہیں ماننا پڑیگی" -

اور میں سوچتی ہی رہ گئی کہ بس انہیں ہی سارے حقوق حاصل ہیں جو چاہیں مجھ سے منوا لیں - جو چاہیں مجھ سے کہہ لیں - کس قدر میری توہین کرتے ہیں یہ - کاش میں کبھی ان سے اپنی ذلت کا بدلہ لے سکتی - پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ کبھی ان کے ساتھ نہیں جاؤ نگی -

صبح ہوئی - میں کالج گئی پورے اطمینان کے ساتھ کہ اب ہمیشہ اپنے فیصلہ پر قائم رہوں گی - اور کبھی ان کے سامنے نہیں جھکوں گی - مگر بارہ بجے بالکل غیر محسوس طور پر میں پچھلے پھاٹک تک پہنچ گئی - جہاں وہ منتظر کھڑے تھے - اور بالکل ایک سحر زدہ انسان کی طرح ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگی - راستے بھر ہم سے کوئی بات نہیں کی - گھر پہنچ کر وہ بولے -

" اور یہ ہے خاکسار کا غریب خانہ" - مگر میں کچھ نہ بول سکی - خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گئی - پھر وہ دو سنترے لے کر آئے - میں کبھی سنترہ نہیں کھاتی - مگر اس وقت کھانے لگی - اور اسی طرح آدھا گھنٹہ بیت گیا میں تو خاموش تھی ہی - وہ بھی کچھ بول نہ سکے - اس کے بعد میں نے واپسی کی خواہش کی - اور وہ بغیر کسی پس و پیش کے تیار ہو گئے -

اس واقعہ کو تین روز ہو گئے - اس درمیان میں وہ ہمارے یہاں بالکل نہ آئے - مجھے بے انتہا تکلیف ہوئی ان کی اس لاپرواہی سے - یہ میری حماقتوں کا نتیجہ ہے جو وہ مجھ پر اس طرح حکومت کرتے ہیں - اور ہر وقت ذلیل کرتے رہتے ہیں اگر میں اپنے کو یوں ان کے سامنے نہ گراتی تو بھلا ان کی ہمت ہو سکتی تھی اس طرح مجھے ذلیل کرنے کی - نہ جانے کتنی لڑکیوں کو تو وہ بیوقوف بنا چکے ہیں - اور خود ہی فخریہ اپنے قصے سناتے رہتے ہیں - ایک دفعہ خود ہی تو بتا رہے تھے کہ پچھلے سال گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ اسی وجہ سے پہاڑ پر نہیں گئے تھے کہ صوفی اپنا ٹیمس

پورا کرنے کے لئے یہاں رک گئی تھی - اور حالانکہ اس نے کبھی ان سے بات بھی نہیں کی تھی - مگر بعض اسے دیکھنے کے لئے گھنٹوں سڑک پر کھڑے رہتے اور آج بھی اس کی خاموش یاد ان کے سینے میں موجود ہے -

ان تمام باتوں کے باوجود ان کے قدموں پر کھچی جا رہی ہوں - یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے لئے گرد راہ کی بھی حیثیت نہیں رکھوں گی - ادھر بی اماں اپنی اکلوتی بچی کی پژمردگی سے پریشان تھیں جنہیں میں نے معمولی حرارت کا بہانہ کر کے بہلا دیا تھا - چوتھے روز شام کو وہ آئے - سر پر رومال بندھا ہوا تھا کہنے لگے بیمار تھا - مگر مجھے یقین نہ ہوا اور میں نے کہہ بھی دیا تو بولے -

" ہاں ٹھیک ہے - اصل میں اسی روز شام کو میں آیا تھا مگر باہر سے خالہ جی کے زور زور سے بولنے کی آواز سنی - تو میں ڈرا کہ انہیں کہیں تمہارے آنے کا حال تو نہیں معلوم ہو گیا - چنانچہ تین منٹ تک دروازہ پر کھڑا گفتگو سننے کی کوشش کرتا رہا - مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا - تو گھر لوٹ گیا - آج بہت غور و خوض کے بعد رشید کو بھیجا حالات کا جائزہ لینے کے لئے - حضرت بڑی مشکل سے اپنی کتابیں چھوڑ کر آئے" -

میں نے کہا "اول تو بی اماں کو معلوم نہیں ہوا اور اگر معلوم بھی ہو جاتا تو کیا آپ کا یہی فرض تھا ؟ آپ خود سوچئے اگر یہ بات ان لوگوں کو معلوم ہو جاتی تو میری کیا گت بنتی" اور یہ کہتے کہتے میرا گلا رندھ گیا - کس قدر خود غرض ہیں یہ جب تک آسانی سے کھیلا جائے کھیلتے رہیں گے اور ذرا بھی شبہ ہونے پر ہاتھ سے کھلونا پھینک کر بھاگ جائینگے خواہ پھر اس کے پرزے پرزے ہی کیوں نہ ہو جائیں انتہائی معصومیت کے ساتھ وہ بولے " تو پھر میں اور کیا کر سکتا تھا" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے - اور میں نے منہ پھیر لیا - جی چاہتا تھا ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بتا دوں کہ اس وقت آپ کا کیا فرض تھا - اسی پر آپ فرماتے تھے کہ آجکل محبت کچھ مشکل نہیں - مگر پھر میں نے جلد ہی اپنے کو نفرین کیا - اس بیہودہ خیال پر .... خدا نہ کرے کہ ہمارے درمیان محبت کا لفظ آئے - اور پھر انہیں لڑکیوں کی کیا کمی جو وہ مجھے — اُفوہ میں کس قدر بدتمیز ہوں ایسی بیکار کی باتوں سے کیا حاصل - وہ میرے کون ہوتے ہیں - جو ان کے لئے میں ایسی باتیں سوچوں - اور میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں آنسو جذب کر کے ان کی طرف دیکھا جو نہایت اطمینان کے ساتھ مقابل میں لٹکی ہوئی تصویر کو دیکھ کر آہستہ آہستہ گنگنا رہے تھے - ع

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو

سیتا رام باہری

پرندے اور انسان

دنیا کی کوئی شے بیکار اور بے مطلب نہیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ وہ کائنات کے ہر عنصر سے مستفید ہوتا ہے۔ انسان کے ظہور سے پہلے چرند پرند موجود تھے۔ کہتے ہیں۔ بہت قدیم زمانے میں ایسے پرندے بھی تھے۔ جن کے منہ میں انسان کے سے دانت ہوتے تھے۔ اب بھی ایسے پرندے موجود ہیں جن کے جذبات۔ عادات اور حرکات و سکنات آدمی کے سے ہیں۔ اُلّو کی آنکھ آدمی کی آنکھ سے ملتی جلتی ہے۔ ہوئزین نامی امریکن پرندے کے پنجے آدمی کے پنجوں کی طرح ہوتے ہیں۔ طوطا اور مینا انسان کی طرح بولنے والے پرندے ہیں۔ ایرانی کبک چینی سارکا اور آسٹریلیا کا 'کوکا بورا' انسان کی طرح قہقہہ لگا کر ہنستے ہیں۔ انہی مناسبات کی وجہ سے کئی پرندے انسان سے مانوس ہو کر اس کی زندگی کے زیادہ قریب ہو گئے ہیں۔ اور کئی اس کے ماحول کو سنوارنے کے لئے اِدھر اُدھر جنگلوں اور پہاڑوں میں بسیرا کرنے لگے۔ کہ ؏

نہیں مصلحت سے خالی یہ جہانِ مُرغ و ماہی (اقبال)

انسان نے نہ صرف پرندوں کی زندگی سے عبرت خیز باتیں چُن چُن کر اپنے آپ کو سُدھارا بلکہ ان کے استعاروں سے عالمِ بالا کے راز بیان کرنے کی کوشش بھی کی۔ ہماری ادبیات میں سے اگر پرندوں کے ناموں اور اُن کے متعلق خیالات کو نکال دیا جائے تو وہ رنگینی اور دلچسپی قائم نہیں رہ سکتی جو آج ہم دیکھتے ہیں۔ دنیا کی تمام مذہبی اور روحانی کتابوں میں پرندوں کے حوالے موجود ہیں۔ ویدوں میں ہنس، مور، چڑیا' اور گرڑ (نیل کنٹھ) کا ذکر آیا ہے۔ ہندو دیومالا میں سرسوتی (علم کی دیوی) کی سواری ہنس ہے۔ لکشمی (دولت کی دیوی) کی سواری مور ہے۔ اور وشنو دیوتا کی سواری گرڑ ہے — پرانے یونان میں اُلّو کو ایتھنا دیوی کا متبرک پرندہ مانا جاتا تھا۔ اور ققنس کو سورج دیوتا کا خاص پرندہ سمجھا جاتا تھا۔ قدیم رومن لوگ مُرغی کے چوزوں کے سامنے دانے ڈال کر فال دیکھا کرتے تھے۔ اگر چوزے دانہ چُگ لیتے تو شگون اچھا سمجھتے تھے۔ پارسیوں کی پُرانی کتابوں میں ہُما، عقاب اور باز کے نام آتے ہیں۔ سن ستره سو (۱۷۰۰) قبل مسیح کی پارسی روایات میں بھی شہباز کا ذکر آیا ہے۔ اسی زمانے میں چین والے بھی شہباز کی اہمیت جانتے تھے۔ عیسائیوں، یہودیوں اور مسلمانوں کے یہاں عنقا، کبوتر، ہُد ہُد اور فاختہ بہت پرانے پرندے ہیں — کالی داس کے ہندوستانی پرندوں نے اس کی شاعری کو زیادہ جاندار بنایا ہے۔ شیکسپیئر کے کلام میں انگلستان کے سبھی پالتو اور جنگلی پرندوں کے حوالے موجود ہیں۔ نظیر اکبرآبادی کے کلام میں بھی بہت سے ہندوستانی پرندوں کے نام آتے ہیں۔ ہمارے اپنے دور کے بہترین شاعروں نے بھی پرندوں کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ ٹیگور کے کلام میں جا بجا پرندوں کے نام دکھائی دیتے ہیں۔ اس روحانی شاعر کو پرندوں سے اتنا اُنس تھا کہ اپنی کتاب کا نام بھی 'طیور آوارہ' رکھا۔ ٹیگور کے بھائی دویجیندر ناتھ ٹیگور جو اعلےٰ پایہ کے فلسفی تھے، پرندوں کو اشارہ کر کے اپنی طرف بلا لیتے تھے اور وہ اُن کے ہاتھ پر بیٹھ کر ناچتے گاتے تھے۔ اقبال نے بھی اپنے کلام کو موثر بنانے کے لئے پرندوں کی تلمیحات استعمال کی ہیں۔ مثلاً

زندگی انسان کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا، اڑ گیا

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر
یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

کر بُلبُل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بُلبُل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

ایک دو جگہ اقبال اپنے آپ کو شاہیں سمجھتے ہیں -

اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں
بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا
فقیرانِ حرم کے ہاتھ اقبال آ گیا کیوں کر
میسّر میر و سلطان کو نہیں شاہینِ کافوری

(بالِ جبریل)

پرانے زمانے میں امیر خسرو کو طوطیِ ہند کا خطاب ملا تھا اور ہمارے اپنے زمانہ میں شریمتی سروجنی نائیڈو "بلبلِ ہند" کے نام سے مشہور تھیں ان کے ایک مجموعۂ کلام کا نام ہے "طیورِ زماں" -

انسان کی جذباتی دنیا میں کئی پرندوں کو خاص اہمیت حاصل ہے - چنانچہ طوطا، مینا، کوئل اور مور کو ایذا پہنچانا بہت معیوب سمجھا گیا ہے - مکۂ معظمہ کے قرب و جوار میں پرندوں کو ذبح کرنا سخت ممنوع ہے - امرناتھ سوامی اور اجمیر ریاست میں کبوتروں کو مارنا جرم قرار دیا گیا ہے - مور کو ستانا ہر جگہ معیوب گنا گیا ہے - ہُدہُد کو سامی قوموں نے "مرغِ سلیمان" کا لقب دیا ہے - ایرانیوں نے باز کو پرندوں کا راجا سمجھ کر اس کا احترام واجبی ٹھہرایا ہے - چنانچہ یہ کہانی مشہور ہے - کہ ایک دن ابنِ ماہان کا باندار بائیں ہاتھ سے پانی پی رہا تھا - اتفاق سے ابنِ ماہان نے دیکھ لیا حکم دیا کہ اس کے سو بید لگائے جائیں اور کہا تو نہیں جانتا کہ باز پرندوں کا بادشاہ ہے - اور باوجود اس کے بذاتِ خود بڑی عزت رکھتا ہے - بادشاہوں کا غمگسار اور مصاحب بننا گوارا کرتا ہے - ایسا معزز پرندہ تیرے ہاتھ میں ہو اور تو اتنی بے ادبی کرے کہ اس کے سامنے بائیں ہاتھ سے پانی پیئے - باز کسی اور کے حوالے کر دیتا اور خود پانی پینے جا سکتا تھا -

اسی طرح شہزادہ ابوالعباس کو اس کے اُستاد ابوعبداللہ خطیب نے ایک باشے کے سامنے تھوکنے پر بہت ڈانٹا تھا کہ تم شہزادہ ہو کر باشے کا ادب نہ کرو اور اس کے سامنے تھوکنے کی حرکت کرو - کتنی بُری بات ہے - باشہ تو پرندوں کا بادشاہ ہے اور بادشاہوں کا ندیم -

قدرتی حسن یا خوش الحانی کی وجہ سے پالتو پرندوں کا رواج ہو گیا - یہ رواج بہت پرانا ہے - ارسطو سے ایک صدی پہلے یونانی مورخ ٹیسیاس نے اپنی کتابوں میں طوطے کا ذکر کیا ہے کہ وہ آدمی کی بولی بولتا ہے اور کئی لوگ اسے پنجرے میں رکھتے ہیں - رومن امرا بھی آج سے دو ہزار برس پہلے طوطوں کو چاندی، سیپ اور ہاتھی دانت کے پنجروں میں رکھتے تھے -

عشقیہ جذبات کا اظہار بہت مدت سے گل و بلبل، سرو و قمری چاند چکورے اور چکوا چکوی وغیرہ کی زبانی ہوتا رہا ہے - ہماری شاعری پرندوں کے استعاروں اور تشبیہوں سے مزین ہے - مثلاً

کبک رفتار - بلبل نفس - شاہیں نگہ - طاؤس رنگ - طوطا چشم - ہنس کی سی چال - طوطے کی سی ناک - کوئل کا سا کنٹھ - پپیہا کا پیا وغیرہ وغیرہ -

بلبل کے متعلق ایک یونانی روایت ہے - کہ وہ اصل میں ایک شہزادی تھی جس کا نام فلو ملا تھا - اس کی بہن پروکنے، یونان کے بادشاہ کی بیگم تھی - یہ بادشاہ فلو ملا کو بھی اپنے حرم میں لانا چاہتا تھا - چنانچہ اس نے پروکنے کی زبان کاٹ ڈالی اور مشہور کر دیا کہ وہ مر گئی ہے - اس طرح وہ فلو ملا سے شادی کا منصوبہ باندھ رہا تھا کہ پروکنے جو کوئی زبانی پیغام تو اپنی بہن کو پہنچا نہیں سکتی تھی - اس نے رومال پر چند الفاظ کاڑھ کر اپنا پیغام بھجوا دیا - اس انوکھے ڈھنگ سے فلو ملا کو سب راز معلوم ہو گیا - وہ اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لئے بادشاہ کے وہاں چلی آئی - اس نے ایک شام بادشاہ کے بیٹے کو قتل کر دیا اور اس کا گوشت بھون کر بادشاہ کو کھلا دیا، پھر اپنی بے زبان بہن کو ساتھ لے کر بھاگ نکلی - تھوڑی دیر کے بادشاہ کلہاڑا ہاتھ میں لئے ان کے پیچھے پیچھے دوڑا آیا اور بہت دوڑ دھوپ کے بعد اُن دونوں بہنوں کو گھیر لیا - اس وقت انہوں نے دیوتاؤں سے دعا کی کہ ہمیں پرندہ بنا دیں تاکہ اس ظالم بادشاہ کے ہاتھ نہ لگ جائیں چنانچہ پروکنے ابابیل بن گئی اور فلو ملا بلبل ـــــ

سقراط نے اپنے قتل کے موقعہ پر "فنا فی اللہ" کے سلسلے کو ققنس کے استعارے سے سمجھانے کی کوشش کی اور کہا ـــــ

"میرا مرتبہ تم میں سے کسی کے نزدیک ققنس کے مرتبے سے کم نہیں ہونا چاہیئے جس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ سورج دیوتا (APPOLO) کا ایک پرندہ ہے اور یہ کہ اسی وجہ سے وہ غیب دان ہے اور یہ کہ جب

اس کو اپنی موت کا احساس ہوتا ہے تو اپنے مخدوم کے پاس جانے کی خوشی اور اشتیاق میں بہت زیادہ دل سوز ترانے گانے لگتا ہے - اپنے معبود کے پاس پہنچنے کی میری خوشی اس پرندے کی خوشی سے تو کم نہیں ہونی چاہیئے"۔

دنیا میں تقریباً ساڑھے ہزار قسم کے پرندے موجود ہیں - ان کی کل تعداد کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے - البتہ امریکہ میں ایک دفعہ پرند شماری کی گئی تھی - ایک میل میں اوسطاً چھ سو جوڑے موجود تھے - یہ تعداد بہت زیادہ دکھائی دیتی ہے - لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ قدرت نے ہمیشہ توازن اور اعتدال کو قائم رکھا ہے - گوریا کے بچے اکثر مر جایا کرتے ہیں ورنہ دس برس میں اگر اس کے بچے سبھی زندہ رہیں تو ان کی تعداد ۶۹۸،۹۸۳،۱۶،۲۷۵ (پونے تین کھرب) تک جا پہنچے - پرندوں کی تعداد ضرورت سے زیادہ بڑھ جائے تو وہ کبھی کبھی نقل مکانی کر بیٹھتے ہیں - اور جب دوسری جگہ بھی موافق نہیں آتی تو آہستہ آہستہ اُن کی تعداد گھٹتی رہتی ہے - سخت گرمی یا سخت سردی کے سبب پرندے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں - روس میں بھی کئی پرندے دیکھے گئے ہیں جو جرمنی سے ہجرت کر کے آ گئے ہیں - کابل کی کونجوں کے قافلے تو موسم بدلنے میں عموماً ہندوستان میں دیکھے جاتے ہیں - کئی پرندے اتنی تیزی سے اُڑتے ہیں کہ وہ راتوں رات انگلینڈ سے جنوبی امریکہ تک جا پہنچتے ہیں - ماحول کے بدل جانے سے پرندوں کی حرکات و سکنات میں بھی تبدیلی آ جاتی ہے - آسٹریلیا کا 'ایمو' افریقہ کا شتر مرغ 'نیوگنی کا کیسوویری اور نیوزی لینڈ کا 'کی' اب اُڑنے سے قاصر ہیں -

نئی آبادیوں' صنعتی کارخانوں اور زرعی ترقیوں نے کئی قسم کے پرندوں کے لئے ماحول کو ناسازگار بنا دیا ہے - شکار کے جدید ہتھیار زیادہ کارگر ہوتے ہیں - اس لئے پرندے اب زیادہ تعداد میں مارے جاتے ہیں - تار برقی اور روشنی کے مینار بھی سینکڑوں پرندوں کی موت کا باعث ہوتے ہیں - وہ بے چارے اپنا راستہ بھول کر ادھر آن نکلتے ہیں اور مرگ ناگہانی میں گرفتار ہو جاتے ہیں - سمندری جہازوں سے نکلا ہوا تیل سمندری مرغابیوں کی زندگی کو دوبھر کر دیتا ہے - اس طرح کئی مرغابیاں جلدی مر جاتی ہیں - زراعت کے جدید طریقے فصلوں کو کیڑے مکوڑوں سے صاف رکھتے ہیں - نیز فصل کاٹنے کے بعد اناج کے دانے بھی زمین پر گرنے نہیں پاتے - اس طرح کئی قسم کے جانور اپنی قدرتی غذا حاصل نہیں کر سکتے - انسانی تہذیب اور سائنس کی ترقی آہستہ آہستہ پرندوں کی زندگی کو تنگ و تاریک بنا رہی ہے -

مغل بادشاہوں نے ہندوستان کے بہت سے جنگل کٹوا ڈالے تھے - تلئیر وغیرہ کئی قسم کے پرندے افزائش نسل کے ماحول سے محروم ہو گئے - اسی طرح سکاٹ لینڈ کے جنگلوں میں آٹھویں صدی کے انسانوں نے کیپرکیلی (پرندے) کو وہاں بالکل نایاب کر دیا لیکن تمام باتوں کے باوجود یہ کہنا بہت حد تک غلط ہے کہ فلاں نسل کا پرندہ اب دنیا بھر میں نہیں مل سکتا - اصل میں کئی پرندے انسان سے روٹھ کر یا حالات سے مجبور ہو کر کسی اور مناسب جگہ چلے جاتے ہیں اور انسانی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں - کچھ پرندے انسان کی زندگی سے شرماتے اور گھبراتے ہیں پھر وہ انسانی آبادیوں میں کیسے رہ سکتے ہیں - ان کے برعکس ایسے ڈھیٹھ پرندے بھی موجود ہیں' جو مشینوں کے شور اور گنجان آبادیوں کے غل غپاڑے میں بھی رہ سکتے ہیں - جیسے چڑیا' کوا' کبوتر وغیرہ - عام طور پر جو پرندے بہت اونچا اڑنے والے نہیں وہ انسان کی موجودگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں - اور انسان بھی ان کی موجودگی میں خوش ہوتے ہیں - اُلو جو تنہائی پسند ہے اُسے "بُوم شوم" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے -

ہاں یہ ٹھیک ہے کہ جو پرندے قدرتی ماحول سے دور ہونے کے باعث کم یاب ہو جاتے ہیں ان کو پرندہ فروش نایاب بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں تاکہ اُن کی قدر و قیمت بڑھتی رہے - اٹھارہ سو اُنہتر ۱۸۶۹ء میں جب انگلستان میں سمندری پرندوں کی حفاظت کا قانون پاس ہو رہا تھا' امریکہ کے ایک شہر سے گیارہ کروڑ قاصد کبوتر منڈیوں میں بیچے گئے - اس تجارتی منافع نے ۱۹۰۰ء تک سب کبوتر ختم کر دئے - اور اس سال صرف ایک کبوتر رہ گیا جو بہت بھاری رقم کے عوض بیچا گیا - پرندوں کی تجارت پر کنٹرول رکھنے کے لئے یورپ نے مفید کوششیں کی ہیں پھر بھی ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۲ء تک کے زمانے میں انگلستان اور جرمنی سے امریکہ کو ساڑھے تیس لاکھ زرد رنگ کی بلبلیں Canary بھیجی گئیں - لوگ کئی دفعہ نادانستہ طور پر مفید پرندوں کو مار ڈالتے ہیں یا انہیں

جلاوطن ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ چند سال ہوئے کہ آسٹریلیا کے مُرّے دریا کے ڈیلٹوں میں (Cormorant) جو اصل لوگوں کے عام خیال میں مچھلیوں کو کھا جاتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس پرندے کی نسل کو تباہ کر ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھوے اور دوسرے جانور جو مچھلیوں کے انڈوں اور بچوں کو کھا جاتے ہیں کثرت سے پیدا ہو گئے جو اصل در اصل کچھوؤں کا شکار کرتے تھے اور کبھی کبھی مچھلیاں بھی ماری جاتی تھیں۔ آخر ماہرین نے بھی کہا کہ یہ پرندے اگرچہ کچھ نقصان کرتے ہیں مگر قدرت نے ایک اہم کام ان کے سپرد کر رکھا ہے۔ انہوں نے تحقیق سے یہ بھی ثابت کیا۔ کہ جہاں جو اصل زیادہ رہتے ہیں وہاں مچھلیاں زیادہ لذیذ اور باکثرت ہوتی ہیں۔

دنیا کے ہر حصے میں خاص خاص قسم کے پرندے انسانی خوراک کے کام آتے ہیں۔ ہندوستان میں دراوڑی قومیں آریوں سے پہلے بھی پرندوں کا شکار کرتی تھیں اور آج بھی کرتی ہیں۔ تلیئر اور مرغابیوں کا شکار ہر ملک میں عام ہے۔ ان کے علاوہ بطخ، مرغی، تیتر، بٹیر وغیرہ پالتو رکھے جاتے ہیں۔ ان کے انڈے بھی کھائے جاتے ہیں۔ امریکہ میں تقریباً ایک کروڑ بطخیں ہر سال ذبح کی جاتی ہیں۔ کہتے ہیں ہنری ہفتم شکار کے معاملے میں بہت سخت تھا۔ اس نے شکار کے کئی قوانین بنا رکھے تھے۔ اگر کوئی شخص شاہی شکار کے علاقے میں داخل ہو جاتا تو اس کی آنکھیں نکلوا دی جاتی تھیں۔ مغلوں نے پرندوں کی لڑائی، مرغ بازی، بٹیر بازی کا رواج عام کر دیا تھا۔ اکبر اعظم نے شکار کے متعلق خاص قسم کے احکام جاری کر رکھے تھے مگر ابوالفضل لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ اکبر نے بہت چرند پرند شکار کئے تو ان کی زندگی کی اہمیت پر غور کر کے بہت پشیمان ہوئے اور کہا۔ "کاش کہ میں ایک بہت بڑا پرندہ ہوتا جسے سب شکاری کھا کر ہمیشہ کے لئے سیر ہو جاتے"۔

فلیمنگو پرندے کی چونچ بہت لمبی ہوتی ہے۔ اس کی چونچ کی چھڑیاں بھی بنائی جاتی ہیں۔ پرندوں کے پر بناوٹی کلغیوں اور زیبائشی سامان کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ مورچھل۔ پنکھے۔ ٹوپیاں وغیرہ بنائی جاتی ہیں۔ ہالی وڈ کی رقاصاؤں نے کئی قسم کی بانکی ٹوپیاں پروں سے مزین کر کے مقبول عام کر دی ہیں۔ لیکن اس قسم کی تجارت نے کئی قسم کے پرندوں کا نام و نشان مٹا دیا ہے۔ امریکہ نے ۱۹۱۳ء میں اور برطانیہ نے ۱۹۲۱ء میں (پلومیج ایکٹ) پنکھ ودھان بنایا کہ پرندوں کو اس بے ہنگام تباہی سے بچایا جائے۔

حکمت یونانی کے مطابق کئی پرندوں کا گوشت خاص خاص بیماریوں کے لئے مفید ہے مثلاً کبوتر لقوہ کے لئے، گدھ کا جگر تپ دق کے لئے۔ چین اور ملایا میں (پام سوفٹ) چڑیا اپنا تھوک سکھا کر اپنے بچوں کے لئے گھونسلا بناتی ہے اس گھونسلے کو چین والے بڑے چاؤ سے سالن کے طور پر کھاتے ہیں اور اس کو صحت بخش غذا مانتے ہیں۔

ہماری زراعت کے لئے بھی پرندے بہت ضروری ہیں۔ وہ بیج بونے سے فصل کاٹنے تک دیمک۔ ٹڈی وغیرہ کیڑے مکوڑوں کو کھاتے رہتے ہیں۔ اس طرح فصل تباہ ہونے سے بچ جاتی ہے۔ سارس نقصان دہ کیڑوں کو کھا جاتا ہے۔ اس لئے اس پرندے کی افزائش نسل کے لئے یورپ والے بہت کوشش کر رہے ہیں۔ افریقہ کے سبزہ زاروں میں (سیکٹری) نامی پرندہ پایا جاتا ہے جو سانپ پکڑ پکڑ کر کھا جاتا ہے۔ اس کے پنجے بہت لمبے لمبے ہوتے ہیں۔ تاکہ اپنا بچاؤ بخوبی کر سکے مکھی مار پرندہ کی چونچ پر ایک گچھا سا بنا ہوتا ہے جس سے وہ مکھیاں بخوبی پکڑ سکتا ہے۔ (کنگ فشر) لم ڈھینگ مچھلیوں کے علاوہ چوہوں کو بھی کھاتا ہے۔

اکثر پرندے ناقابل استعمال بوٹیوں کو کھا جاتے ہیں مگر کچھ پرندے پودوں کی کونپلوں، شگوفوں، پھولوں اور بیجوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ کسان کی تھوڑی سی احتیاط انہیں ایسی لوٹ مار سے روک سکتی ہے۔ بہت سے پرندوں کی خوراک ملی جلی ہے۔ کئی پرندے جو فصل پر گذارہ کرتے ہیں۔ گرمیوں میں عام طور پر کیڑے مکوڑوں سے اپنے ننھے ننھے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں، یہ بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ پھلوں کو تباہ کرنے والے پرندے دوسرے کھیتوں کے لئے کافی مفید ہوتے ہیں اگر فصلوں میں کوئی بیماری کیڑوں کی وجہ سے پھیل جائے تو اس کا انسداد انسان کے ہاتھوں ہونا مشکل ہے۔ مگر ایسے پرندے جو فصلی کیڑوں کو ہی کھایا کرتے ہیں بہت مدد دے سکتے ہیں۔ ایک سائنس دان نے ایک پرندہ "تر" (سانگ تھرس) کی زندگی کا مطالعہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا

ہے کہ یہ پرندہ اپنے بچوں کی پرورش کے زمانے میں دس ہزار مکھیاں اور کیڑے مکوڑے ہر مہینے مار ڈالتا ہے۔

قدرت نے انسانی زندگی کے لئے پرندوں کو خاص خاص فرائض سونپے ہیں جتنے کہ شکاری پرندے اُلّو۔ باز۔ شاہین۔ چرخ، جرہ وغیرہ جو کبھی کبھی پالتو پرندوں کو بھی مار ڈالتے ہیں۔ زیادہ تر نقصان دہ پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔ گدھ اور چیل مردار جانور کھا جاتی ہیں۔ اس طرح آبادیوں میں بدبو اور تعفن کا امکان نہیں ہوتا۔

جو پرندے شکاری نہیں ہوتے وہ خوش الحان ہوتے ہیں اور سبزی خور جانوروں کے دوست ہوتے ہیں۔ کئی دفعہ دیکھا گیا ہے کہ پرندے زخمی جانوروں کے کیڑوں کو چٹ کر جاتے ہیں اور ان کے جسم پر سے غلاظت دور کر دیتے ہیں۔ خرگوش اور چکوے کی دوستی کا علم سب کو ہے۔ ساون کے دنوں میں جب ہری ہری گھاس کے میدانوں میں جانور چر رہے ہوتے ہیں تو سارسوں، چڑیوں وغیرہ کے گروہ کس بے باکی کے ساتھ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

جدید سائنس نے پرندوں کی اہمیت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ پرانے اور کمیاب پرندوں کی افزائش نسل کا بڑا انتظام کیا جا رہا ہے سترھویں صدی میں بگلا، سارس اور لم ڈھینگ انگلستان میں قریباً معدوم ہو گئے تھے۔ ان کی نسل کو پھر بڑھایا گیا۔ سائنس دانوں نے یہ بھی معلوم کیا ہے کہ لومڑی کو جب خرگوش نہیں ملتے تو وہ تیتروں کا شکار کرتی ہے۔ گلہریوں کی موت جنگلی کبوتروں کی افزائش کا باعث ہوتی ہے۔ پرندوں کی حفاظت کے لئے ۱۸۸۹ء میں انگریزوں نے ایک انجمن پرندوں کی حفاظت کے لئے بنائی اس کا نام ہے (آر۔ ایس۔ پی۔ بی) امریکہ والوں نے ۱۹۰۲ء میں (این۔ اے۔ اے۔ ایس) کا افتتاح کیا۔ حکومت ہند نے بھی پرندوں کی حفاظت کے لئے کئی قانون بنا رکھے ہیں۔ اور ہر صوبے کے محکمۂ شکار کے افسر پرندوں کے بچاؤ کی تدابیر سوچتے رہتے ہیں۔ دلّی میں جینیوں نے بیمار پرندوں کے لئے الگ ہسپتال کھولا ہوا ہے۔ یہ ہسپتال شمالی ہند میں اپنی مثال آپ ہے۔

پرانے زمانے میں انسان نے اپنی سماجی اور معاشی زندگی کے کئی مفید نکات پرندوں کی زندگی سے اخذ کئے۔ اور ہمارے اپنے زمانے میں انسان نے پرندوں کی تقلید میں اڑنے کے خواب دیکھ دیکھ کر طیارے کی ایجاد کی۔ طیارہ، لفظ طیور یا طائر سے ہی نکلا ہے۔ آج بلند ہمتی اور تیز پروازی میں ہمارے ہوا باز پرندوں سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات جو ہوا —

مشیر جھنجھانوی

اشعار

فطرت کا حُسنِ عام بھی ندرت سے کم نہیں
رعنائی مجاز حقیقت سے کم نہیں

دنیائے اضطراب ہے میرا نفس نفس
یعنی تری نگاہ قیامت سے کم نہیں

وہ کیا اُداس ہیں کہ زمانہ اُداس ہے
افسردگی حُسن قیامت سے کم نہیں

کچھ اور بڑھ گئی ہے اداؤں کی دلکشی
اندازِ برہمی بھی عنایت سے کم نہیں

کب تک مشیر کاوشِ پیہم کا تذکرہ
یہ جوشِ اضطراب شکایت سے کم نہیں

رفتارِ زمانہ

ہند کے پردھان منتری پنڈت جواہر لال نہرو امریکہ جاتے ہوئے لندن میں اُترے۔ جہاں اُن کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اپنے قیام لندن کے دوران میں اُنھوں نے برطانیہ کے وزیرِ اعظم مسٹر اٹیلی سے بھی ملاقات کی۔

دہلی میں وزرائے خوراک کی جو دو روزہ کانفرنس منعقد ہوئی تھی اُس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ تمام صوبوں و ریاستی یونینوں میں اناج کی قیمتوں میں ۱۰ فی صدی کمی کی جائے اور اس کے ساتھ ہی اُن ضروری اشیا کے نرخوں میں بھی کمی کر دی جائے جو کاشتکاروں کے کام آتی ہیں۔

سری نگر میں آل جموں کشمیر کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے یہ امر واضح کیا کہ کشمیر کو ہند کی طرف سے استصواب رائے کی جو پیش کش کی گئی تھی وہ صرف کشمیر کی جنتا کو تھی نہ کہ پاکستان یا کسی دوسرے کو۔

متحدہ اقوام کا کشمیر کمیشن ہندوستان سے روانہ ہو گیا ہے۔ اب وہ اپنی رپورٹ تیار کر کے سیکورٹی کونسل کو پیش کرے گا۔

خیال کیا جاتا ہے کہ ہند، کشمیر کمیشن کے فوجی مشیر جنرل ڈولائے کو واپس بلائے جانے کی تحریک کرے گا۔ کیونکہ اُنھوں نے ڈپلومیٹک مراعات کا ناجائز استعمال کیا ہے۔ یاد رہے کہ جنرل ڈولائے مقامی حکام کی اجازت کے بغیر سری نگر سے ایک مسلم مہاجر مسٹر آفندی کے دیگر رات پاکستان لے گئے تھے۔

ورلڈ بینک نے بھارت کو ایک کروڑ ڈالر کا ایک دوسرا قرضہ زراعتی پیداوار کو ترقی دینے کے لئے منظور کیا ہے۔ پہلا قرضہ ریلوے کی توسیع اور اس کی ازسر نو تعمیر کے لئے دیا گیا تھا۔ نیا قرضہ اناج کی پیداوار بڑھانے اور اس طرح ملک میں خوراک کی کمی دور کرنے کے لئے دیا گیا ہے جو کہ اس وقت دیش کے نازک ترین مسائل میں ایک ہے۔

مدراس میں جوڈیشل معاملات کو اگزیکٹو سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ یہ اصلاحی قدم دو اضلاع چنگلے پٹ اور شمالی ارکاٹ میں اُٹھایا گیا ہے۔ چند ماہ تک اس کی توسیع کم از کم بارہ اضلاع میں کر دی جائیگی۔ اور اگلے سال اس کا نفاذ سارے صوبے میں ہو جائے گا۔

مدراس سرکار نے کیمونسٹ پارٹی کو صوبہ بھر میں خلاف قانون جماعت قرار دے دیا ہے۔ جو کیمونسٹ جماعتیں اس حکم کی زد میں آئی ہیں وہ تامل، ناڈ۔ اندھرا۔ کرناٹک اور کرالا کے اضلاع کی ہیں۔

روس نے یوگوسلاویہ سے ۱۹۴۵ء کے دوستانہ معاہدے کو ختم کر دیا ہے۔ کیونکہ روس کی رائے میں یوگوسلاویہ نے اس معاہدے کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہی نہیں کی بلکہ اسکی دھجیاں اُڑا کر رکھ دی ہیں۔

پیکنگ ریڈیو نے اعلان کیا ہے کہ چین کی کیمونسٹ پارٹی کے لیڈر ماؤ سے تنگ کو چین کی جمہوری گورنمنٹ کا صدر منتخب کیا گیا ہے میڈیم سن یت سین اور کیمونسٹ فوج کے کمانڈر انچیف جنرل چو نے اُن چھ اشخاص میں سے ہیں جنھیں نائب صدر چُنا گیا ہے۔

متحدہ اقوام کی جنرل اسمبلی نے چین کی قوم پرست حکومت کی طرف سے روس کے خلاف شکایت کو اپنے ایجنڈے میں رکھنا منظور کر لیا ہے۔

سٹرلنگ کی قیمت کو کم کرنے کے متعلق حکومت برطانیہ نے دارالعوام میں اعتماد کا ووٹ حاصل کر لیا ہے۔ حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد ۳۵۰ کے مقابلے میں ۲۱۲ ووٹوں سے گر گئی۔ اور گورنمنٹ کی طرف سے اس کی پالیسی کو منظور کرنے کی تحریک ۵ کے مقابلے میں ۳۴۲ ووٹوں سے پاس ہو گئی۔

Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi

Regd No D.—21.

آج کل

۱۵ نومبر ۱۹۴۹ء

چھ آنے

جموں و کشمیر نیشنل کانفرنس کے مشاعرے کا ایک رخ۔ جوش ملیح آبادی اپنی نظم "اے جوانان کشمیر"
پڑھ رہے ہیں۔ یہ نظم زیر نظر اشاعت میں شائع ہو رہی ہے۔

ہر مہینے کی پہلی اور پندرھویں تاریخ کو شائع ہونے والا

مصوّر رسالہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد
بلونت سنگھ

ترتیب

۱۵ نومبر ۱۹۴۹ء

جلد ۸ ——— نمبر ۷

سالانہ چندہ ——— نو روپے

فی پرچہ ——— چھ آنے

سرورق - نیویارک میں پنڈت نہرو اور ایڈمرل چیسٹر ڈبلیو نمٹز کی ملاقات درمیان میں سر بی این راؤ کھڑے ہیں جو حال ہی میں اتحادِ اسمبلی کی سیکورٹی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے ہیں۔

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

جوش ملیح آبادی

اے جوانانِ کشمیر

اے جنّتِ کشمیر کے بیدار جوانو　　اے ہمّتِ مردانہ کے ذی روح نشانو
سو بات کی یہ بات ہے اِس بات کو مانو　　جینے کا جو ارمان ہے تو موت کی ٹھانو

بے غرق ہُوئے کوئی اُبھرتا ہی نہیں ہے
جو قوم پہ مرتا ہے وہ مرتا ہی نہیں ہے

بے ذوقِ وغا کوئی تہمتن نہیں بنتا　　بے سلسلۂ برق، نشیمن نہیں بنتا
سونا نہیں تپتا ہے تو کندن نہیں بنتا　　جو گھن نہیں کھاتا ہے وہ آہن نہیں بنتا

جنگل میں جو لذّتِ کشِ پیکاں نہیں ہوتا
وُہ شیر کبھی شیرِ نیستاں نہیں ہوتا

سوتے ہوئے دھارے کبھی طوفاں نہیں بنتے　　جو قید نہ ہوں یُوسفِ کنعاں نہیں بنتے
مرتے جو نہیں عیسیٔ دَوراں نہیں بنتے　　جو مَوت سے ڈرتے ہیں وُہ انساں نہیں بنتے

بے سوز، نمِ اشک فشانی نہیں مِلتا
بے آگ میں کُودے ہُوئے پانی نہیں مِلتا

کمزور کو آسودگیٔ دل نہیں ملتی — جب تک نہ جلے، شمع کو محفل نہیں ملتی
کانٹوں سے جسے لذّتِ کامل نہیں ملتی — اِس رہروِ نا اہل کو منزل نہیں ملتی

گرداب میں جس شخص کو جینا نہیں آتا
اُس شخص کا ساحل پہ سفینا نہیں آتا

جب تک کہ ہر اک ذرّہ پر افشاں نہیں ہوتا — اِک پھول بھی گلزار میں خنداں نہیں ہوتا
گلشن میں کبھی رقصِ بہاراں نہیں ہوتا — جب تک کہ ہواؤں پہ گریباں نہیں ہوتا

جب تک دلِ یوسف پہ گرانی نہیں آتی
رُخسارِ زلیخا پہ جوانی نہیں آتی

ہوتا ہے تلاطم کا اب آغاز جوانو — سیلاب میں در آؤ بصد ناز جوانو
یہ مَوج، یہ گرداب ہے جانباز جوانو — دو وقت کی آواز پہ آواز جوانو

دُنیا میں کسی خوف کے قائل نہیں ہوتے
جو شیر کے بچّے ہیں وُہ بُزدِل نہیں ہوتے

طُوفان کو ٹھکراؤ، ہواؤں کو بدل دو — دریاؤں کو رَوند دو تو پہاڑوں کو کُچل دو
مردانہ بڑھو، مَوت کو پیغامِ اجل دو — پھُولوں کی تمنّا ہے تو کانٹوں کو مَسل دو

تخریب کا جب تک کہ تلاطم نہیں آتا
تعمیر کے ہونٹوں پہ تبسّم نہیں آتا

سینوں کو، چلو، عرصۂ ہمّت میں اُبھاریں — ہاں آؤ طمانچہ رُخِ سیلاب پہ ماریں
شیروں کی طرح آؤ کچھاروں میں ڈکاریں — ملتی ہیں سدا خون کے دھاروں میں بہاریں

عزّت کے خرابات میں پینے نہیں دیتی
دُنیا کبھی نامرد کو جینے نہیں دیتی

مرزا محمد عسکری

ریاض خیرآبادی کی ایک ہلکی سی جھلک

(اُردو کا ایک مشہور خمریاتی شاعر جو زندگی میں ایک بار بھی بادۂ و جام سے دوچار نہیں ہوا)

یکم ہوتا ہے کہ مضمون نگار صاحب مضمون سے بخوبی واقف ہو۔ اس کی جوانی، اُس کا ادھیڑ پن، اُس کا بڑھاپا سب اس کی نظر سے گزرا ہو مختصر یہ کہ ایک مدت دراز تک اس کا دوست اور بے تکلف دوست رہا ہو۔ یہی حالت میری اور ریاض خیرآبادی کی ہے۔ میں اُن کو اُس وقت سے جانتا ہوں جب میرا بچپن تھا اور وہ بیس بائیس برس کے نوجوان تھے۔ میں ایک صاحب سے جن کا نام خواجہ محی الدین تھا ابتدائی انگریزی کے سبق لیتا تھا۔ ان سے اور ریاض سے ہم عمر و ہم مذاق ہونے کے باعث بے حد یارانہ تھا۔ میرے اُستاد ایک ذہین آدمی تھے تھوڑا بہت انگریزی سے واقف تھے۔ مگر ایک خصوصیت اُن کی یہ تھی کہ ہزل گوئی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ریاض بھی اُس زمانے میں انھیں چیزوں کے اُستاد تھے چنانچہ یہ دونوں حضرات اور ایک تیسرے صاحب اَحسن لکھنوی آپس میں پرائیویٹ صحبتیں اور جلسے منعقد کرتے تھے جس میں سوائے فحاشی ہزل گوئی اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ واضح رہے کہ یہ سب کارروائی غزل کی صورت میں عمل میں آتی تھی جس کی طرحیں قاعدے کے مطابق کئی دن پیشتر سے دی جاتی تھیں۔ مشاعرے کے دن (جس کو مہازلہ و مفاحشہ کہنا زیادہ مناسب ہے) خاص خاص احباب جمع ہوتے تھے جن کو اس صنف خاص کا خاص شوق تھا۔ کبھی کبھی میرے شفیق استاد اُن جلسوں میں مجھ کو بھی لے جاتے تھے۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اُن جلسوں میں کیا ہنگامہ اور ہڑ ذنگا مچتا تھا۔ اُن جلسوں کے بعض اشعار اس وقت تک یاد ہیں مگر تہذیب اُن کو دہرانے سے روکتی ہے۔

کبھی کبھی ان جلسوں میں گانا بجانا اور بھانڈوں کی نقلیں بھی ہوتی تھیں جن میں ایک بڑا حصہ لینے والے ریاض بھی تھے۔ یہ اور اسی طرح کی اور بھی باتیں اس زمانے کی یاد ہیں مگر زیادہ سمع خراشی کیا کی جائے۔

دوسرا دور وہ تھا جب ریاض ادھیڑ ہو گئے اور میں جوان تھا۔ بی۔ اے پاس کر چکا تھا۔ اس زمانے میں ریاض جب لکھنؤ آتے تو نثار حسین نثار مہتمم "پیام یار" سے روز ملنے آتے اور ان کی دوکان پر بیٹھتے۔ میں بھی تقریباً ہر روز وہاں جاتا اور گھنٹوں نشست رہتی۔ اُس زمانے کے مشہور نوجوان شعرائے لکھنؤ کا یہ ایک کلب تھا مثلاً آلو صاحب جلیس (نبیرہ میر انیس مرحوم) لڈن صاحب اصطفےٰ، منشی احمد علی شوق وغیرہ۔ ان کے علاوہ مولانا شرر کبھی مولانا شبلی نعمانی، پنڈت رتن ناتھ سرشار، سید شہنشاہ حسین وکیل، یہ لوگ بھی اسی چوک والی دوکان پر بیٹھتے اور گھنٹوں خوش گپیاں کرتے۔ بھلا ریاض ایسا زندہ دل رنگین مزاج ایسی بے تکلف صحبت میں کیونکر شریک نہ ہوتا۔ جب وہ آتے تو اُن کی بڑی آؤ بھگت کی جاتی اور ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے۔ چونکہ یہ نشست سرِراہ اور سیر و تفریح کی جگہ پر تھی معمر لوگوں کا بھی کبھی کبھی دل للچاتا کہ ہم بھی تھوڑی دیر کے لئے ان نوجوانوں میں بیٹھ کر دل بہلائیں چنانچہ امیر مینائی، جلال لکھنوی، میر خورشید علی نفیس (صاحبزادہ میر انیس) مولانا شبلی نعمانی کے سے باکمال بزرگ بھی تشریف لاتے اور نوجوانوں کی پُرلطف باتیں سُن کر خود بھی تھوڑی دیر کے لئے جوان بن جاتے۔ ایک دن سرشار نے ریاض سے کہا کہ تم تو بڑے دعوے کرتے ہو۔ آج آٹھ آنے پیسے بھیک مانگ کر لاؤ تو جانیں۔ ریاض نے کہا یہ کون بڑی بات ہے ابھی لاتا ہوں مگر کیا دلواؤ گے؟ انھوں نے کہا میں بھی ایک روپیہ دے دوں گا۔ ریاض نے شرط منظور کر لی، اور

نثار حسین سے ایک میلی کچیلی چادر لے کر اُس سے مُنہ چھپائے اور ایک لکڑی ہاتھ میں لے کے ذرا جھکے ہوئے آہستہ آہستہ چلے۔ سرشار نے مجھ کو اور شہنشاہ حسین کو بھیجا کہ ذرا جاؤ ریاض کے پیچھے پیچھے رہو دیکھو یہ واقعی بھیک مانگتا ہے کہ نہیں۔ ہم دونوں دور تک گئے اور ہنستے ہوئے پلٹ آئے۔ اور کہا کہ وہ چھانٹ چھانٹ کے لوگوں سے بھیک مانگ رہے ہیں اور عجیب عجیب رحم افزا جملے کہہ رہے ہیں جن کو سن کر لوگ کچھ دے دیتے ہیں تھوڑی دیر میں ریاض خود آ گئے اور چادر اُتار کر دس بارہ آنے سرشار کے سامنے رکھ دیئے اور سارا واقعہ بیان کیا کہ یہ کہہ کہہ کر اینٹھے ہیں۔ سرشار نے حسب قرارداد ایک روپیہ اضافہ کیا۔ جس کی مٹھائی سب دوستوں نے کھائی۔ یہ تھے ریاض جن کی عمر اُس وقت پینتیس چھتیس۳۶ سال کی ہوگی۔ اُس وقت ان کی شاعری جوان تھی مگر مجھے تعجب ہے اور افسوس بھی ہے کہ خود ان کی زبان سے کوئی سنجیدہ شعر اُس صحبت میں نہیں سُنا گیا۔

تیسرا دور وہ ہے جب وہ بوڑھے ہو گئے تھے۔ یہ ذکر ۱۹۲۰ء کا ہے جب میں مہاراجہ صاحب محمود آباد مرحوم کا پرائیویٹ سیکرٹری تھا۔ ریاض اکثر مہاراجہ صاحب سے ملنے آتے اور وہیں اکثر مجھ سے بھی ملاقات ہوتی۔ اب وہ مجھ کو نہایت مؤدبانہ سلام کرتے۔ اللہ اکبر جس شخص سے کبھی ایسی بے تکلفی ہو جو اوپر بیان کی گئی ہے وہ اس قدر متین و مہذب ہو جائے! بات یہ ہے کہ ریاض اب بالکل بدل گئے تھے وہ ریاض ہی نہ تھے۔ جن کو میں نے بیس برس پیشتر دیکھا تھا۔ اب ہر چیز بدلی ہوئی تھی۔ مزاج میں شوخی کے عوض متانت' باتوں میں ظرافت کے بدلے تہذیب' سفید نورانی ڈاڑھی' ہر بات میں آہستگی و بُرد باری میں کبھی کبھی چپکے سے چھیڑ تا کہ کچھ مزے کی باتیں کیجئے، وہ مُسکرا کر اشارے سے منع کرتے کہ مہاراجہ صاحب کے سامنے موقع نہیں ہے۔ شعر اس وقت بھی ان کی زبان سے نہیں سُنے مگر اب یقیناً وہ زمانہ تھا کہ وہ ایک پختہ کار شاعر ہو گئے تھے۔ دیوان بھی طیار تھا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ جیسا دستور ہے افکار دنیوی بھی ان کو ستاتے تھے۔

یہ ہیں وہ ریاض جن کو میں جانتا ہوں حق یہ ہے کہ میں نے ایسا زندہ دل بڈھا پارسا کہیں نہیں دیکھا۔ پابند صوم و صلوٰۃ مگر کسی طرح کا تقشف مزاج میں نہیں۔ نماز گزار مگر ریاکار نہ تھے۔ ماتھے پر بجائے شاعر پرہیزگار لکھا ہوا تھا

آجکل دہلی

تعجب ہوتا ہے کہ جس نے عمر بھر ایک قطرہ شراب نہ پی ہو وہ ہی شراب کو اپنا خاص رنگ اور مستقل طرز قرار دے۔ اُن کے سات سو صفحات کے دیوان میں مشکل سے کوئی غزل ایسی نکلے گی جس میں دو چار شعر شراب کے متعلق نہ ہوں۔ اختر مینائی نے سچ کہا ہے وہ جو رنگ تال میں دیکھا وہ اُن کا حال نہ تھا!

میرے محترم دوست مولانا سید سجاد اللہ مرحوم رئیس گورکھپور نے دیوان ریاض پر اپنے فاضلانہ مقدمے میں ریاض کے اشعار گن کر حساب لگایا کہ تیرہ سو چھیاسٹھ شعر شراب کے مختلف اثرات و کیفیات پر لکھے ہیں اور ایک چیلنج دیا ہے کہ دُنیا کے کسی شاعر نے اتنے اشعار شراب کے متعلق نہ لکھے ہوں گے میری رائے میں اس میں ایک لطیفہ بھی ہے وہ یہ کہ تعداد اشعار تیرہ سو چھیاسٹھ ہے اور یہ ۱۳۶۶ھ ہجری ہے پس کیا تعجب ہے کہ ریاض نے سنہ ۱۳۰۱ ہجری سے ۱۳۶۶ھ تک اپنے اشعار پھیلا دیئے ہیں اور ہر سال کے لئے کم سے کم ایک شعر کہا ہو۔ سات آٹھ سو صفحات کے دیوان میں سے چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

کیسے یہ بادہ خوار ہیں سُن سُن کے پی گئے — واعظ کو کچھ مزہ نہ کسی نے چکھا دیا

مُنہ پر تاک کھولا واعظ بہت ہی چوکا — بیلوں نے ڈاڑھی پکڑی خوشوں نے منہ میں ٹھونسا

نام سا تنا ہے میکدے میں — بگڑی ہی اُچھلی ہے شیخ جی کی

نہ تجھ سے واعظ مجھے تکلف نہ مجھ سے واعظ تجھے تکلف — ہر ایک گھونٹ میں بے تکلف شراب میری کباب تیرا

منہ میں ٹپکائی تھی مینا سے کہ ہچکی آئی — شیخ میخانے میں کچھ دیر کا مہمان نکلا

آج ممبر سے جو واعظ کو اُتارا سر بزم — بعد مُدت کے ذرا نشہ صہبا اُترا

چُن چُن کے آج شیخ نے انگور کھا لئے — اب کیا کھنچے گی تاک کا حاصل نکل گیا

سایہ تاک میں واعظ کو جگہ دی ہم نے — آج شیشے میں اُسے ہم نے اُتارا کیا

خم سے نہ ہو وہ ساغر پُر جب تلک سے سیر ہوں — یہ ظرف شیخ کا ہے یہ مجھ خاکسار کا

پی پی کے اس نے سجدے کئے رات تمام رات — اللہ رے شغل زاہد شب زندہ دار کا

واعظ نہ آپ بزم میں چھلکائیں جام جلد — کھلوائیں منہ جناب نہ اس بادہ خوار کا

یہ یا اسی قسم کے اور اشعار پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ریاض ایک کہنہ مشق شاعر تھے' زبان پر عبور حاصل تھا۔ محاورات بہت بجا اور بے تکلف لکھتے تھے مگر کوئی گہری بات جو دوسرے خمریاتی شعرا مثلاً غالب' خیام' حافظ وغیرہ کے یہاں ہے ان کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ ریاض نے شراب نوشی کا خاکہ اڑایا ہے اور اس فعل کو بُرا سمجھ کر میخواروں کے ساتھ عجیب عجیب مذاق کیا ہے جس کو پڑھ کر ہنسی آتی ہے مگر شراب کی اچھائی یا بُرائی کے متعلق کوئی خاص بات دل نشین نہیں ہوتی۔

۵ نومبر ۱۹۲۹ء

عطاءاللہ پالوی

منوّر لکھنوی

بیشۂ شاعری کے شیر ببر میر ببر علی انیسؔ سے بڑا شاعر لکھنؤ“ نے پیدا نہیں کیا۔ مگر اس عظیم المرتبت خاندانی شاعر کو بھی یہ مجبوری ہوئی کہ خود نہیں بلکہ اپنے مفلوج بیٹے اور دائم المرض لختِ جگر میر عسکری کی زبان سے یہ دعویٰ کرائے کہ :-

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مدّاحی میں

لیکن نصف صدی کے بعد ہی لوگوں نے دیکھا کہ اسی لکھنؤ کے مطلع[1] شاعری پر پہلے ایک شعاعی[2] جھلک نمودار ہوئی اور پھر ذرہ[3] کے بعد افق[4] کی گود سے ایک ماہ منوّر[5] نے طلوع ہو کر بجا طور سے خود یہ ناز کیا کہ

شاعری سے نہ منوّر کو ہو کیوں کر رغبت
پانچ پشتوں سے یہی شوق چلا آتا ہے

یہ وہ زندہ انسان ہے جسے اس کے رشتہ مند منشی دوارکا پرشاد افقؔ لکھنوی کا بیٹا منشی رام سہائے تمنّا لکھنوی اور منشی ماتا پرشاد نیساں لکھنوی کا بھتیجا، منشی جگدمبا پرشاد قیصرؔ لکھنوی کا بھانجا اور منشی لچھمن پرشاد ضیدرؔ لکھنوی کا داماد کہہ کر پکارتے ہیں یہ وہ شخص ہے جو منشی نوبت رائے نظرؔ لکھنوی کا شاگرد رشید کہلاتا ہے اور ادبی دنیا والے اس کو

” منشی بشیشور پرشاد منوّرؔ لکھنوی“

کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ آج اسی کی نظموں کا مجموعہ ” کائنات دل“ کے نام سے اس وقت میرے پیش نظر ہے۔

انسانی اور لسانی حیثیت سے منوّرؔ لکھنوی کی ذاتیات و خصوصیات سے بحث کرنا میرے نزدیک مشکل بھی ہے اور مہمل بھی مشکل اس لئے کہ بقول خود منوّرؔ

یکساں ہر اک کی چال کیسے ہو جائے
تیرا جو ہے سب کا حال کیسے ہو جائے
ہے تیری پسند کچھ تو اس کی کچھ اور
دنیا تری ہم خیال کیسے ہو جائے

اور مہمل اس لئے کہ مجھے اس کا بھی علم نہیں کہ ان کے ذہنی رجحانات کیا ہیں، مذہبی معتقدات کیا ہیں، سماجی تاثرات کیا ہیں، سیاسی خیالات کیا ہیں۔ کیونکہ وہ اپنا نظریہ یہ پیش کرتے ہیں کہ

دیکھنا ٹھیس نہ لگ جائے ان آئینوں کو
موت سے بڑھ کے ہے جذبات کی تحقیر مجھے

اور اپنا ”منتہائے نظر“ وہ یوں ظاہر فرماتے ہیں :

کوئی اندازہ کر سکتا نہیں میری بلندی کا
کھنچ آیا ہے میری مستی میں عالم ہوشمندی کا
کوئی مسلک نہیں رہتا کوئی مشرب نہیں رہتا
نظر کے سامنے پردہ کوئی باقی نہیں رہتا
مجھے رازِ بقا سرِّ فنا معلوم ہوتا ہے
ہر اک آئینہ جوہر آشنا معلوم ہوتا ہے

---

[1] منشی اودے راج مطلعؔ لکھنوی (منشی ایشور پرشاد شعاعیؔ کے والد)
[2] منشی ایشور پرشاد شعاعیؔ لکھنوی (منشی پورن چند ذرہ لکھنوی کے والد)
[3] منشی پورن چند ذرہؔ لکھنوی (منشی دوارکا پرشاد افقؔ لکھنوی کے والد)
[4] منشی دوارکا پرشاد افقؔ لکھنوی (منوّرؔ کے والد)
[5] منشی بشیشور پرشاد منوّرؔ لکھنوی

بھٹک سکتا نہیں پھر منزلوں میں شوق و نفرت کی
مجھے ملتی ہے فرصت کشمکش سے رنج و راحت کی
نگاہ دو جہاں ہوتی ہے خورشید میری نگہ بن کر
فراق و وصل ہٹ جاتے ہیں پیچھے گرد رہ بن کر
وجود مدعا و مدعی باقی نہیں رہتا
نظر کے سامنے پردہ کوئی باقی نہیں رہتا

اور نہ مجھے اس کی خبر ہے کہ واقعی منوّر ہندو ہیں یا مسلمان کیونکہ انہیں علی کی بہادری کی تعریف کرتے بھی دیکھا جاتا ہے اور ارجن کی بھی وہ اقبال کے بھی مدّاح نظر آتے ہیں اور کالیداس کے بھی - ان کو محمد علی پر بھی آنسو بہاتے ہوئے پایا جاتا ہے اور موتی لال پر بھی - اور آخر میں انہیں یہ بھی دعا کرتے ہوئے دیکھا جاتا ہے کہ :

زبان و دل میں نہ یا رب مطابقت ہو اگر
نہ قول و فعل میں باہم موافقت ہو اگر
کبھی جو کام میں جذب وفا سے لے نہ سکوں
جو اپنی جان مفاد دگر پہ دے نہ سکوں
اگر نہ ہو دلِ وحدت شناس سینے میں
جو نورِ حق کا نہ ہو انعکاس سینے میں
متاع جلد ہو برباد میری ہستی کی
گھٹا دے شوق سے میعاد میری ہستی کی

چنانچہ اسی لئے میں نے سب سے قطع نظر صرف شاعر کی حیثیت سے منوّر کا مطالعہ کیا ہے اور اس وقت جبکہ "کائنات دل" کے چند ورق ادھر اُدھر سے اُلٹ پلٹ کے دیکھے ہیں، بے چین ہو رہا ہوں کہ جتنا پھر پڑھ چکا ہوں اس کی ترجمانی تو کر لوں - جو کچھ دیکھ چکا ہوں اس میں تو لوگوں کو دکھا لوں - اس لئے کہ اس رنگا رنگ گلستان ادب سے تنہا گل چینی میرے لئے وبال دوش ہو رہی ہے - خود سوچئے کہ جہاں حنا کی حجابِ رنگینی مطربہ کی نواسنجی، بسنت کی محشر بدامانی، نزول حیا کی جمال آرائی، طاؤس رقصاں کی گوناگوں رنگینی اور ابر و باراں کی گہرباری اپنی پوری ساحرانہ طاقت کے ساتھ ناز و ادا دکھا دکھا کے مجھے اپنی اپنی رنگینی میں کھو جانے کی دعوت دے رہی ہو، میں یہ کیسے گوارا کروں کہ خود تو اس میں گم ہو جاؤں اور لوگوں کو اس میں نہ لے ڈوبوں ؟

آپ نے ہنگام سیر باغوں میں شگفتہ و شاداب حنا کو بھی دیکھا ہوگا اور گھروں میں دلہن کے ہاتھوں میں رچائی ہوئی مہندی کا لالہ زار بھی - آپ نے زمرّدیں تختۂ فردوس بھی ملاحظہ فرمایا ہوگا اور احمریں کف عروس بھی لیکن علیحدہ علیحدہ، جدا جدا - مگر منوّر کی کائناتِ دل کے مرغزار میں اس ظالم حنا کی سبزی و سرخی یکجا ہی نہیں بلکہ ساغر بکف نظر آتی ہے :

رہا نہ راز جو تھا راز سبز باغ حنا	مشام جاں میں ہوا منتقل دماغ حنا
نظر نواز ہے خود ہے رنگ داغ حنا	بساطِ حسن میں لو دے اٹھا چراغ حنا

ریاض دوست کھلا دعوتِ نظر کے لئے
پیام عشق ملا فرحت جگر کے لئے

ترا سا آتش گل دست نازنیں میں نہیں	شکار مرغ حنا پنجۂ حسیں میں نہیں
یہ رنگ خون وفا دیدۂ یقیں میں نہیں	جگہ کہیں بھی اسے چشم عیب بیں میں نہیں

چڑھا ہے رنگ عمل اشتیاق تزئیں پر
مہک رہا ہے گلستاں کف نگاریں پر

چراغ بن کے یہ روشن ہے دست رعنا میں	تجلی مہ نو اس سے ہے کف پا میں
عجیب چیز حنا بھی ہے باغ دنیا میں	طراوت اسی سے ہے پیدا دلِ مسیحا میں

وفا کا رنگ نقوش جفا میں بھرتی ہے
یہ روح اپنی حسینوں کو نذر کرتی ہے

کیسے باکیف بند ہیں یہ ! ہر بند، ہر شعر اور ہر مصرع برگِ حنا کی طرح زمردیں، رنگِ حنا کی طرح احمریں اور روحِ حنا کی طرح عنبریں نظر آتا ہے - حنا کی سبزی و سُرخی حروف کی سیاہی کے ساتھ مل کر تو یہاں قوس قزح کا سماں پیش کر رہی ہے -

ساز و آواز دل بہلانے والی چیزیں ہیں، نغمہ و سرود سے غم غلط اور رنج دُور ہو جاتا ہے - گیت اور رنگ سے دماغ کو سکون، دل کو فرحت اور روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے - لہٰذا بالعموم تمام شاعروں کے یہاں مطرب سے نغمہ چھیڑنے کی بڑی بڑی حسین التجائیں اور اچھی اچھی خواہشیں نظر آتی ہیں مگر منوّر کے یہاں ایسا نہیں پایا جاتا ہے - نفسیات

کے ماہرین کا مقولہ ہے کہ جب دل بھرا ہوا ہو تو یہ آبگینۂ نازک ساز کی حسین آواز سے بھی چُور چُور اور ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے لہٰذا جب منوّر کو ایسا موقع آتا ہے تو وہ ایک طرف تو بڑی لجاجت سے بارگاہِ مطربہ میں سازنہ چھیڑنے کی استدعا کرتے ہیں اور دوسری جانب باتوں ہی باتوں میں اس کی قیامت زائیوں کے سارے اعجازی پہلو بھی اُجاگر کر دیتے ہیں

مطربہ اردو کے ہاتھ اسازنہ چھیڑ　　نغمہ ہائے جگر گداز نہ چھیڑ!
میں ہوں شاعر میری حریف نہ بن　　رہ زنِ جذبۂ لطیف نہ بن
ساز چھیڑتے ہی دل بھر آئیگا　　ذرّہ ذرّہ بیسیج جائے گا
تند گھولے گی جب زبان تری　　کھینچ لے گی جگر کو تان تری
ہے قیامت الاپنا تیرا　　اُف وہ گردوں کو ناپنا تیرا
چھین لیگی میری متاعِ سکوں　　آہ وہ منظرِ وداعِ سکوں
ایک پردہ بھی تو جو چھیڑے گی　　بخیہ ہائے جگر اُدھیڑے گی
مرتعش ہر رگِ جنوں ہو گی　　شامل سازِ ارغنوں ہو گی
جدھر اپنے گلے کو موڑے گی　　تو جہاں اپنی تان توڑے گی

نہ پتہ پائے گی کہیں میرا
خون ہو جائے گا نہیں میرا

کون اس حقیقت کو جھٹلا سکتا ہے؟ کون اس صداقت سے انکار کر سکتا ہے؟

بسنت رُت جتنی مست و بے خود، جیسی حشر انگیز اور جس قدر کیف آگیں ہوتی ہے، موسمِ بہار جتنا ولولہ انگیز، جیسا حشر زا اور جتنا ہیجان آفریں ہوتا ہے، اُس کا اندازہ کچھ اِس موسمی کیفیت میں بیتے ہوئے لمحاتِ زندگی ہی کر سکتے ہیں۔ لہٰذا بسنت رُت کا لطف تو بقول جوش ملیح آبادی ع

آدمی محسوس کر سکتا ہے، کہہ سکتا نہیں

مگر آیئے۔ دیکھئے منوّر نے "بسنت" کی لطیف کیفیات کو سنسکرت شاعری کے اس حسین و پاکیزہ تخیّل کی ساری نزاکتوں کو چند شعروں میں اس ساحری کے ساتھ مسطور کیا ہے کہ آپ کو اس "مسطور" میں "محسوس" کا لطف آجائے گا۔

یہ کون ہاتھوں میں آج اپنے کماں گُلوں کی لئے ہوئے ہے
یہ کس پہ تیر افگنی کا یا رب کوئی ارادہ کئے ہوئے ہے
تبسّم افشاں، نظر جھکائے لبوں کو اپنے سئے ہوئے ہے
ہیں مست و مخمور ایسی آنکھیں، شراب گویا پئے ہوئے ہے
غضب کی طِفلانہ شوخیاں ہیں لئے ہے ساتھ اپنے بانکپن کو
کیا ہے جائے لباس کس نے قبول عریانیٔ بدن کو
زنانِ بنتِ بہشت بھر ہیں یہ ضیا مبتسم نہ یہ قمر کو
چڑھا کے زاغ کمان ابرو، بدن کا ارشاد ہے نظر کو
جُدا کیا ایک شعبدے سے ہیں یہ کس نے فریاد سے اثر کو
چھپائے کیا دل کا حال کوئی، بچائے کیسے کوئی جگر کو
حجاب کی خیر اب نہیں ہے، نقاب اُتری ہوئی ہے سر سے
چلے ہی آتے ہیں تیر و خنجر، کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے
حجاب بے بس، شباب عاجز، خراب حالت کباب ہے دل
اسیر صد پیچ و تاب ہے دل، مرقعِ اضطراب ہے دل
سوال در پیش ہے کچھ ایسا، کہ یک قلم لاجواب ہے دل
کسی کی مشقِ ستمگری کو نشانہ انتخاب ہے دل
یہ کون آخر پکارتا ہے؟ یہ کون آخر ابھارتا ہے؟
سدھے ہوئے ہاتھ ہیں یہ کس کے کہ تیر پر تیر مارتا ہے؟

بسنت پر آپ نے جو کچھ ادب و شعر میں دیکھا ہوگا۔ اُس میں آپ کو صرف نظری مشاہدے ملے ہونگے مگر منوّر نے بسنت صرف تخیلی حیثیت سے پیش کیا ہے اور شائد اس اعتبار سے یہ نظم بسنت کے موضوع میں اردو میں پہلی نظم ہے جب ہی تو منوّر کا دعویٰ ہے کہ ؎

وہ میکش ہوں مئے کوثر گری ہے جس کی نظروں سے
وہ زاہد ہوں نگہ رکھتا ہے جو صہبائے عرفاں پر

قدرت کو جب اپنی صنّاعانہ عظمت اور اپنے فنکارانہ جلال کا اظہار مقصود ہُوا تو اُس نے کائنات کی تمام لطیف کیفیات، سارے حسین اجزا اور کل جمیل عناصر کو سمیٹا اور جوڑ کر ایک پیکر میں مجتمع کر کے اُس کا نام "حسن" رکھ دیا۔ اُس کے بعد کیا ہُوا اُس کی نہ مجھے خبر تھی نہ آپ جانتے ہوں گے۔ مگر آیئے۔ دیکھئے منوّر کے قلبِ منوّر پر یہ راز یوں منکشف ہوا ہے ؎

آب و گل سے جب نمایاں ہو گئے آثارِ حُسن
دستِ قدرت نے دیا ترتیب جب گلزارِ حُسن
اور سب اجزائے گوناگوں بہم ملتے رہے
اس چمن میں پھول گو یہ مدتوں کھلتے رہے
عشوۂ دمساز بھی تھا، غمزۂ غماز بھی
ناز بھی پیدا تھا اس میں جلوہ گر انداز بھی
تاہم اِن پھولوں میں شانِ دل ربائی ہی نہ تھی
کافر اندازی میں شامل پارسائی ہی نہ تھی
رہ گیا کچھ نامکمل سازو سامانِ کشش
دل رُبا رنگینیوں سے تھا نہ دامانِ کشش
پھول یہ اک جوہرِ نایاب سے محروم تھے
گوہرِ غلطاں تھے لیکن آب سے محروم تھے
ان گلوں سے قطرہ زن عطرِ جوانی ہی نہ تھا
تیرتیں یہ کشتیاں جس میں وہ پانی ہی نہ تھا
لاجونتی کا تبسم اس پہ لایعنی نہ تھا
نرگسِ شہلا کا خندہ اس پہ بے معنی ہی نہ تھا
چونک اُٹھی قدرت یکایک یہ نظارہ دیکھ کر
اک نظر ڈالی پھر اس نے حُسن کی تصویر پر
جامۂ نسوانیت سے دے کے اس قالب کو زیب
ایک جوہر اس میں ڈالا آبدار و دلفریب
جنبشیں پلکوں کی تہذیب و حیا سے رُک گئیں
حُسن جاذب بن گیا جس وقت آنکھیں جھک گئیں

شاید یہی وجہ ہے کہ لڑکیوں میں حسن پہلے آتا ہے اور جب وہ جوان ہو کر عورت بن جاتی ہیں تب اُن کا شباب حیاداری کا نقاب منہ پر ڈالتا ہے۔ شاعر کی نگاہیں بھی واقعی قدرت کے کیسے کیسے راز دریافت کر لیتی ہیں ؟

فارسی اور اردو شاعری پُشتہا پُشت سے گھر کی لونڈی تھی۔ سیلانی ہوئے تو اس کا ایک دفترِ بے پایاں باہر پڑا پایا اور جب اس پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ بلبلِ شیریں نوا کی حمد و ثنا سب سے زیادہ شدّ و مد کے ساتھ کی گئی ہے۔ اشتیاق ہوا کہ ذرا اس پاکیزہ ممدوح چڑیا کو دیکھیں تو کہ آخر اس میں کیا جاذبیت اور کشش پنہاں ہے۔ نکل کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ ہرا بھرا چمن ہے، لدی پھندی حسین ڈالیاں ہیں اور نیلے پیلے شگفتہ پھول ہر طرف دعوتِ نظر بازی دے رہے ہیں شاعر یہاں وہاں، اُدھر اُدھر آباؤ اجداد سے سنتے ہوئے ہزار داستان کی تلاش و جستجو میں سرگرداں ہے مگر پتہ بھی ہو۔ یکایک اس کی نظر ایک رقصاں طاؤس پر پڑ جاتی ہے وہ سنی سنائی شے کو بھول کر دیکھی دکھائی چیز کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اس حسین و جمیل پرندے کے جسم پر قدرت کی لا انتہا صناعیوں کی بے پناہ جلوہ باریاں دیکھ کے جھوم جاتا ہے اور پھر ایک وجد ایک عالمِ سرشاری ایک جوشِ سرمستی میں اس کے منہ سے پھولوں کی جھڑی یوں لگ جاتی ہے

ہے شہنشاہِ طیورِ عالمِ اسباب تو
اک پرندہ ہے ریاضِ دہر میں نایاب تو
تیرا ہمتا کوئی تیری شان و شوکت میں نہیں
یہ لباسِ فاخرہ شاہوں کی قسمت میں نہیں
شوکت و جبروت کا آئینہ ہے ہستی تیری
طرّۂ فائق ہے اس پر شانِ خود مستی تیری
رشک تجھ سے ہے جہاں میں کلاہِ شہباز کو
فخر ہے ہستی پہ تیری عالمِ پرواز کو
زینتِ صحرا بھی ہے تو رونقِ گلزار بھی
طائروں کا بادشاہ سجا ہے کلغی دھار بھی
عالمِ پرواز میں جاری ترا فرمان ہے
شوکتِ پرویز تیری شان پر قربان ہے
کیسی کیسی جدتیں اک مشتِ پر میں ہیں عیاں
پیکرِ خاکی میں پیدا کی ہیں کیا رنگینیاں
تیرے گوناگوں پروں کو دیکھ کر حیران ہوں
دلفریبی پر تصدق، حُسن پر قربان ہوں
ہے نزاکت کچھ ترے بالوں میں ریشم سے سوا
رنگ ہے تیرے پروں کا شوخ نیلم سے سوا

تیرے دلکش پر قبول بزمِ سلطانی ہوئے
مور چھل بن کر جو مصروف مگس رانی ہوئے
پنکھیاں تیرے پروں کی نازنینوں کو پسند
کلغیاں تیری ہیں چنچل مہ جبینوں کو پسند
کس قدر عزت تری کا شانۂ ایماں میں ہے
منزلت حاصل پرِ منقوش کو قرآں[1] میں ہے
ہے ترا مسعود منظر اک شگون اچھا ہے تو
دیدۂ ہندو میں باہن[2] سرسوتی جی کا ہے تو
تجھ کو حاصل انبساطِ زندگی کا لطف ہے
رقص میں تیرے نشاطِ زندگی کا لطف ہے
دھوم ہر اک گوشۂ عالم میں ہے اس رقص کی
رقصِ فطرت نام ہے جس کا وہ شاید ہے یہی
مست مثلِ رندِ صہبا نوش یوں جنگل میں ہے
"جانِ عالم" جلوہ گر گویا "رہس منڈل" میں ہے
تو ہے دارا منزلت، طالع ہے اسکندر ترا
مائلِ تسخیر ہے حسنِ جہاں پرور ترا

خوبصورت طاؤس جیسا شاندار پرندہ ہے ویسی ہی یہ نظم پُر جلال ہے جسین مور کے جیسے پُر شکوہ پر ہیں ویسے ہی اس نظم کے باجبروت الفاظ ہیں۔ اب میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آیا قدرت کو اس حسین تخلیق پر پہلے سجدہ کیا جائے یا منوّر کو اس لطیف نظم کی داد پہلے دی جائے ٹھیک کہا ہے جناب کالی چرن اختر دہلوی نے

کی ہے پیدا معنویت دل ربا ہر لفظ میں
بندشیں حرفوں کی ہے رشکِ جواہر لفظ میں
یہ بلندیٔ تخیل اور اس کے ساتھ ساتھ
مجھ کو ملتا ہے زباں کا بھی مزہ ہر لفظ میں

مثنوی شیریں خسرو میں ایک جگہ شیریں کی زبان سے امیر خسرو نے شبِ ہجر کو قسم دی ہے اور انہوں نے اس مقام پر اپنا کمالِ شاعری یوں دکھایا ہے کہ ظلمت کا کوئی نکتہ، تاریکی کا کوئی پہلو اور سیاہی کا کوئی عنوان دوسروں کے بیان کرنے کو نہیں چھوڑا ہے۔ بالکل اسی طرح منوّر نے جس کمال کے ساتھ نظم "ابر و باراں" میں ابرِ سیہ کو پیش کیا ہے اور اسود کی تشبیہات و استعارات کا جو دریا بہایا ہے اس کے آگے حقیقت یہ ہے کہ بحرِ ظلمات بھی پانی پانی ہے چند بند سنیئے اور جھوم جائیے

جامنی رنگ کا مشرق سے اٹھا ہے بادل
دیدۂ چرخ میں یا پھیل گیا ہے کاجل
مست ہاتھی چلے آتے ہیں یہ باندھے ہوئے دل
آبنوسی یہ بنا ہے کوئی گردوں پہ محل
مُرغِ آبی کہیں کس طرح کہ بے پر ہے یہ
ایک اڑتا ہوا پانی کا سمندر ہے یہ
کوہ سُرمہ کا ہے یہ اوجِ ہوا پر کوئی
یا ہے بھیگے ہوئے کاغذ پہ سیاہی پھیلی
انجن ایک یہ گویا ہے رواں بھونروں کی
یا ہے اک دیو صفت ریچھ کی تصویر بنی
اہلِ دنیا کی جہالت کا سویدا ہے یہ
یا کسی دیدۂ پُر آب کا چربا ہے یہ
بھر گیا ہو جو دھوئیں سے وہ غبارہ ہے یہ - راکھ بن کر جو اڑا ہو وہ شرارہ ہے یہ
مضطرب طشتریٔ چرخ میں پارہ ہے یہ - یا گنہگار کوئی محوِ کفارہ ہے یہ
صبح کاذب کا اسے آپ سپیدہ کہئے
یا سیہ فام اک آہوئے رمیدہ کہئے

کہاں تک لکھا جائے بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک پریشاں مُو حسینہ نظروں کے آگے رقص کر رہی ہے یا بحرِ اسود سامنے موجیں مار رہا ہے -
یہاں تک پہنچ کے میں نے "کائنات دل" ہاتھ سے رکھ دی اس لئے کہ جتنا بھر پڑھ چکا ہوں وہی تو لوگوں کو سنا لوں۔ حقیقت یہ ہے کہ بقول حضرت اقبال درما سحر ہنگامی

گلہائے مضامین کی فراوانی ہے — گلدستہ کی جو نظم ہے لاثانی ہے
ساحر اعجاز ہے منوّر کا کلام — یہ حسن کی کائنات لافانی ہے

پھر ایک لافانی کی داد ایک فانی انسان کیا دے سکتا ہے -

---

[1] مور کا پر قرآن میں رکھنا جائز سمجھا جاتا ہے اور رکھا جاتا ہے۔ [2] ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ مور سرسوتی جی کی سواری میں رہتا تھا -

شمیم کرہانی

اور بڑھو

ساتھیو! اور بڑھو اور بڑھو اور بڑھو!
تم نے سمجھا ہے جسے منزلِ مقصودِ حیات
وُہ تو اُڑتے ہوئے بادل کا تُنک سایا ہے
ذرّے ذرّے کا تقاضا ہے کہ بتلاؤ ہمیں
تم نے اِس راہ میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے
قصرِ محکم کوئی تعمیر کیا ہے تم نے
یا تمنّاؤں کا رنگین محل ڈھایا ہے
خاک پر توڑ کے رکھّا ہے بھرے پیالوں کو
یلمئے تُند سے پیمانوں کو چھلکایا ہے
پرفشاں صُبح کا غازہ ہے کہ اُڑتا ہے غبار
ابر رنگیں ہے کہ آنکھوں میں دُھواں چھایا ہے
آنکھ ذرّوں کی طرف ہے کہ ستاروں کی طرف
تم نے پرچم کو جُھکایا ہے کہ لہرایا ہے
کھول دی ہے کوئی دشوارہ گرہ - یا تم نے
اور سُلجھائی ہوئی ڈور کو اُلجھایا ہے؟
تم نے لکھی ہے نئے دَور کی روشن تاریخ
یا کسی قصّۂ پارینہ کو دُہرایا ہے
کوئی "وقفہ" ہے کہ آغازِ سفر کا انجام
رُک کے چلنا ہے کہ ہنگامِ سکوں آیا ہے
کِھل کے مہکا ہے کوئی غنچۂ ارمانِ شباب
یا تمنّا کا شگوفہ کوئی کمھلایا ہے
تم نے تہذیب کی لیلاؤں کا لُوٹا ہے سُہاگ
یا تمدّن کو "شہانا" کوئی پہنایا ہے
زندگی صبحِ تبسّم کی فضا ہے کہ ابھی
رُخِ گیتی پہ شبِ غم کا گھنا سایا ہے
جس کو اُگلا ہے زمیں نے وُہ سنہری دولت
"قوم" کا مال ہے یا "فرد" کا سرمایا ہے
آؤ مہر و مہ و انجم کے جہاں میں آؤ
خاک والو! یہ فضاؤں سے پیام آیا ہے
تم نے سمجھا ہے جسے منزلِ مقصودِ حیات
وُہ تو اُڑتے ہُوئے بادل کا تنک سایا ہے
ساتھیو! اور بڑھو اور بڑھو اور بڑھو!

سید منظور الحسن برکاتی

مومن اور ٹونک

سرگذشتِ عہدِ گل را ہم ز شبلی میشنود
عندلیب آشفتہ تر گفتست ایں افسانہ را

"مشاہیر شعرا اور ٹونک" کے زیرِ عنوان جو تذکرہ راقم کے زیرِ تحریر ہے، یہ اسی کا ایک باب ہے" اس سے پہلے اس تذکرہ کے مختلف ابواب' اسد لکھنوی' بسمل خیرآبادی' مرزا غالب دہلوی' مضطر خیرآبادی' کے عنوانات سے دوسرے رسائل میں شائع ہو چکے ہیں:

"مومن اور ٹونک" باعتبار ترتیب اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے' کیونکہ مشاہیر شعرا میں حکیم مومن خاں مومن ہی پہلے وہ شاعر ہیں' جن کے لئے ٹونک کی ادب نواز سرزمین نے سب سے پہلے اپنا آغوش وا کیا'

ٹونک' راجپوتانہ کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے' جو یکم مئی ۱۹۴۹ء سے راجستھان یونین میں ضم ہو کر اپنے مستقل وجود کو ختم کر چکی ہے

یہ ریاست ۱۸۱۷ء میں نواب امیر خاں بہادر' اور جاں باز پٹھانوں کی مردانہ کارگذاریوں کی بدولت قائم ہوئی تھی' ابتداً یہاں صرف ایک ٹھاکروں کا "کوٹ" اور ہندوؤں کی بہت تھوڑی سی آبادی تھی'

نواب امیر الدولہ نے زمامِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی' پرانے قصبے کے باہر ایک اور نیا قصبہ آباد کیا' اور اپنی ہمت و کوشش سے ریاست کی ترقی' و آبادی' اور جنگلات کی صفائی و زراعت کی توسیع فرمائی'

امیر الدولہ نے سترہ برس تک حکومت کی' ان کا سب سے نمایاں وصف' ان کی مذہبی بے تعصبی اور رواداری ہے' وہ ہندو اور مسلمانوں میں یکساں طور پر ہر دلعزیز تھے'

ان کے مفصل حالات زندگی" امیر نامہ" میں بزبانِ فارسی منشی بساون لال سکسینہ نے لکھے ہیں' جو پہلے بخشی فوج اور بعد میں نواب امیر الدولہ کے میر منشی تھے۔

نواب امیر الدولہ کے انتقال کے بعد ۱۸۳۴ء (۱۲۵۰ھ) میں ان کے بڑے صاحبزادے وزیر الدولہ نواب محمد وزیر خاں بہادر نصرت جنگ' مسندِ ریاست پر جلوہ افروز ہوئے'

ٹونک کا علمی' ادبی' اور تاریخی دور' انھیں وزیر الدولہ کے عہد سے شروع ہوتا ہے' امیر الدولہ کا زمانہ چونکہ ریاست کی نیو کو مستحکم' اور اس کی بنیاد کو مضبوط کرنے میں گذرا' اس لئے فطرتاً اس وقت علوم و فنون کی پیداوار اور ترقی کی جانب توجہ منعطف نہیں ہو سکتی تھی'

وزیر الدولہ بہادر' فطرتاً دلیر و شجاع واقع ہوئے تھے' اور فدائی بہادری و سپہ گری کے ساتھ ساتھ ان کو علم و ادب کا بھی خاصہ ذوق تھا' زمانے کے مشاہیر علماء' اور کامل الفن اساتذہ سے عربی' فارسی کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی' اور مختلف کتابیں تصنیف فرمائی تھیں' جن میں "وصایائے وزیری" فارسی زبان میں سیاستِ مدن' اور اخلاق کی ایک بہترین کتاب ہے' یہ ۱۲۸۵ھ میں نواب یمین الدولہ محمد علیخاں کے عہد میں طبع ہوئی تھی'

قدرت نے وزیر الدولہ کو ایک خاص قسم کا دل و دماغ عطا فرمایا تھا' ان کی ذات مختلف قسم کی قابلیتوں کا ایک حیرت انگیز مجموعہ تھی' جن لوگوں کو راجپوتانہ کے گزرے ہوئے رئیسوں کے تاریخی حالات سے تھوڑی بہت بھی واقفیت حاصل ہے' وہ اچھی طرح جانتے ہیں' کہ وزیر الدولہ پچھلی صدی عیسوی میں انسانی اوصاف اور روحانی صفات کے اعتبار سے راجپوتانہ کے رئیسوں میں پہلے مثالی آدمی تھے' مذہبی لحاظ سے آپ کا طرزِ زندگی' اسلام کی اصلی صورت کا ایک صاف آئینہ تھا'

آپ متشرع' متبع سنت' پابندِ صوم و صلوٰۃ' متواضع مسلمان

تھے، اسی وجہ سے آپ کا دورِ حکومت خاص طور پر علم و عمل اور تعلیم شریعت کے لحاظ سے تمام ہندوستان میں اچھا مانا جاتا ہے۔

آپ کے دورِ حکومت میں شرک و بدعات کی تاریکی کا نام و نشان تک نہیں تھا، اور یہی وہ افضل ترین صفت تھی، جس کی طرف مرزا اسد اللہ خاں غالب نے اپنے مدحیہ قصیدے میں آپ کو اس طرح مخاطب کیا ہے:

حقا کہ زنام تو عیان است کہ در شرع
فرزانہ وزیرے شہِ بطحا و حرم را

وزیر الدولہ کی اس دینداری، اور تشرع سے "الناس علی دین ملوکہم" کے مطابق ریاست میں دینداری و اتقا کی ہوا چل گئی تھی، دربار اہلِ کمال سے بھرا رہتا تھا۔

مولف آثار مالوہ کا بیان ہے، آپ کا دربار مہذب و عالمانہ دربار تھا، جس کی شان یہ تھی کہ ایک طرف ناظمان و مدبرانِ ملک آپ سے آئینِ جہانبانی حاصل کرنے میں مصروف ہیں، تو دوسری طرف افسرانِ عساکر جنگی سبق لے رہے ہیں، کبھی فقہی مسائل میں فقہا سے سرگرم مباحثہ ہیں، اور کبھی محدثین و مفسرین سے اصول و روایت پر گفتگو ہے۔

وصایائے وزیری کے خاتمۂ طبع میں مولانا سید احمد علی سیماب، نواب صاحب کے مختصر حالات کے ذیل میں لکھتے ہیں،

"چوں از نماز عشا فراغت میشد، طعام خاصہ تناول فرمودہ بمحفل طلبائے علوم، و فضلائے شہر، انعقاد می پذیرفت، واکثر علوم دینی را تعلیم می فرمودند، و بعد یک پاسِ شب، شاعرانِ بذلہ سنج و مصاحبان بے رنج حاضر شدہ، تذکرۂ تواریخ، و حالاتِ اطراف، و انشاد اشعار درمیاں می ماند" تا آنکہ نصف شب سپرے میشد، صفحہ ۲۱۲

وزیر الدولہ نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لے کر ریاست کی تنظیم جدید کی طرف توجہ مبذول فرمائی، اور پٹھانوں کے غیر منظم جرگے کو آئینی ریاست کے قالب میں ڈھال دیا، آپ نے دیکھا کہ وہ ریاست جس کو والد بزرگوار نے بزورِ شمشیر حاصل کیا ہے، ابھی تک زیادہ تر فوجی طاقت کے بل بوتے پر قائم ہے، ہمراہیانِ نواب امیر الدولہ بہادر، جن میں کوئی رسالدار، کوئی کپتان، کوئی صوبیدار، اور کوئی میجر تھا، اپنی اپنی ماتحت فوج اور سواروں کے جھرمٹ میں ہر دلعزیز اور طاقت ور ہیں، ریاست کے نظم و نسق میں صرف نائب الریاست کی ایک کچہری ہے، مال کے محکمے میں، پرگنات میں صرف ایک ایک ناظم مقرر کیا گیا ہے، تمام خصومتیں اور مقدمات براہِ راست نواب صاحب کے پاس آتے ہیں، علیحدہ علیحدہ دفاتر اور کچہریوں کا ہنوز قیام نہیں ہوا ہے اور امورِ ریاست میں زیادہ تر فوج اور اس کے افسروں کا اثر ہے۔

آپ نے اپنی دوربین نگاہوں سے ریاست کے حالات کا جائزہ لیا، تو سب سے بڑی کمی یہ محسوس کی، کہ اس نو قائم شدہ ریاست میں اہلِ سیف تو بہت زیادہ جمع ہو گئے ہیں، لیکن اہلِ قلم، اور اہلِ علم کی بڑی کمی ہے، اس کمی کو پورا کرنے کے لئے آپ نے تہیہ کیا، کہ جہاں تک ممکن ہو، باکمالوں کو ریاست ٹونک میں جمع کیا جائے۔ ٹونک کے نظم و نسق اور کاروبارِ حکومت کو باضابطہ ترتیب دے کر اچھے اور اہل ہاتھوں میں سونپا جائے۔

جب وزیر الدولہ نے یہ ارادہ کیا، اور ہندوستان کے وسیع و عریض ملک پر نظر دوڑائی، تو طبعاً دانا آدمیوں، اور قابل انسانوں کے انتخاب میں آپ اس جماعت کے افراد کی طرف مائل ہوئے جس کی اس وقت تمام ہندوستان میں دھاک تھی، دینداری، شمشیر زنی، اور قابلیت علمی میں اس وقت، سب سے بڑی جماعت سید احمد شہید رحمتہ اللہ علیہ کے خلفاء اور پسماندہ رفقا کی مشہور تھی، جس کا اثر نہ صرف مسلمانانِ ہند پر تھا، بلکہ انگریز سلطنت بھی اس جماعت کے افراد سے چوکنا رہتی تھی۔

نواب وزیر الدولہ چونکہ سید صاحبؒ کے مرید تھے۔ جب سید صاحب آپ کے پدر بزرگوار نواب امیر الدولہ کے لشکر میں مقیم تھے، اس زمانے میں ایک مدت تک وزیر الدولہ ان کی صحبت میں رہ کر اکتسابِ فیض کر چکے تھے۔

سید صاحب کی شہادت کے بعد آپ کی عقل رسا، اور مدبر طبیعت نے یہ چاہا کہ سید صاحب کے خلفا اور قافلہ کے رفقاء کو ٹونک میں بلا لیا جائے، ایک طرف یہ ان تلک زدہ، اور ہزیمت خوردہ غازیوں کے

ساتھ ہمدردی بھی تھی، اور دوسری طرف اپنی ریاست میں قابل افراد کا جمع کرنا بھی مدِّنظر تھا،

"قاصد دوڑائے گئے، خطوط لکھے گئے، اور اہل فضل و کمال کو ٹونک میں سکونت اختیار کرنے کی دعوتیں دی گئیں، کون، کون لوگ آئے؟ اور انہوں نے یہاں آکر کیا کیا خدمات انجام دیں؟ اس کا ذکر دوسرے عنوان کا محتاج ہے۔ یہ چونکہ 'تذکرۂ شعرا ہے' اس لئے ہم اس کی تفصیل کو نظر انداز کرتے ہیں۔

یہاں ہمیں صرف یہ تبانا ہے، کہ ہند کے باکمال اردو شعراء سے ٹونک کا کہاں تک تعلق رہا،

ٹونک کی تاریخ میں اس صف میں سب سے پہلے تاجدار سخن حکیم مومن خاں مومن دہلوی آتے ہیں، وہ نواب وزیرالدولہ کے پیر بھائی تھے اور عالم نوجوانی ہی میں سید احمد صاحب کے ہات پر بیعت کر چکے تھے،

۱۸۱۷ء کے معاہدے کے بعد جب وزیرالدولہ بہادر زمانۂ ولیعہدی میں دہلی میں سکونت پذیر تھے، تو وہاں کے شاہی مشاعروں میں شرکت کرتے رہتے تھے، دوسرے شعرا کے ساتھ ساتھ حکیم مومن خاں اور مرزا غالب سے بھی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، جو بعد میں دوستی کی صورت اختیار کر گئی تھیں؛

نواب صاحب نے اسی روحانی رشتے کی بنا پر "مومن" کو ٹونک آنے کی دعوت دی، اور یہ چاہا کہ وہ ان کے پاس رہ کر اپنی زندگی کا بقیہ حصہ آرام و اطمینان کے ساتھ گزار دیں،

ارباب تذکرہ میں مومن کے ٹونک آنے کی بابت اختلاف ہے بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے، کہ مومن ٹونک گئے، اور کچھ دن رہ کر واپس چلے آئے، اور بعض نے اس کی مخالفت کی ہے۔

حیاتِ مومن، مولفہ ضمیرالدین عرش گیاوی مرحوم، میں ہے کہ "دوسرا قصیدہ نواب وزیر خاں والی ٹونک کے نام کا ہے جو انھیں بُلاکر اپنے یہاں لے گئے تھے" صفحہ ۱۰۵

مولانا عبدالقدوس ہاشمی "جائزہ زبان اردو" میں لکھتے ہیں، کہ حکیم صاحب، نواب صاحب کے بلاوے پر دوبار ٹونک بھی گئے تھے، جو لوگ حکیم مومن خاں کے مزاج سے واقف ہیں، جانتے ہیں، کہ حکیم مومن خاں، خواجہ خضر کے بلاوے پر تا بہ چشمۂ حیواں جانا بھی گوارا نہ کرتے، مگر نواب وزیرالدولہ سے کچھ ایسا ہی قلبی تعلق تھا، جس کی وجہ سے صدہا میل کی مسافت طے کر کے حکیم صاحب ٹونک گئے؛

لیکن مصنف تاریخ ادب اردو ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کا بیان ہے، کہ نواب وزیرالدولہ بہادر والی ٹونک نے ایک مرتبہ ان کو بُلا بھیجا، اور اپنے پاس رکھنا چاہا۔

مگر انھوں نے اس بناء پر انکار کر دیا، کہ ٹونک میں دِلّی کی پُرلطف صحبتیں کہاں میسر ہوں گی، اسی طرح قصیدے کی تاریخ کی بابت بھی اختلاف ہے، مولانا عبدالقدوس کا بیان ہے۔

"مومن نے یہ قصیدہ اس وقت لکھا تھا جب کہ نواب وزیرالدولہ بہادر مسند نشین ہوئے تھے"

اور دوسرے تذکرہ نویسوں کا کہنا ہے کہ جب وزیرالدولہ نے مومن کو ٹونک آنے کی دعوت دی، "مومن" نے بطور معذرت جواب میں قصیدہ لکھ بھیجا۔

ان بیانات میں تطبیق یوں دی جا سکتی ہے، کہ یہ مان لیا جائے، کہ مومن نے یہ قصیدہ نواب وزیرالدولہ کی مسند نشینی کے وقت ان کی دعوت پر دہلی ہی سے لکھ کر بھیج دیا، اور اس وقت ٹونک نہیں آئے۔ بلکہ پھر آنے کا وعدہ کر لیا، جیسا کہ خود قصیدے کے اشعار سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

ہے مجھے اشتیاق طوفِ حرم   خضر رہ گر ہو فضل رحمانی
تاکہ صحن منا میں کر ڈالوں   نفس امارہ کی بھی قربانی
اس سے افزوں ہے شوق اس کا   جس سے حاصل ہو یہ آسانی
کہ محرک ہے التفات نہاں   تاب فرسا ہے رنج ریانی
بعد یک چند گر خدا چاہے   میں ہوں اور تیرے در کی دربانی
آکے اس بزم میں دکھاؤں گا   شعلہ ہائے خرد کی تیرانی

اور بعد میں جب نواب صاحب نے اصرار کیا ہو تو مومن اپنے مذکورۂ بالا وعدہ کو پورا کرنے کے لئے ٹونک تشریف لے آئے ہوں،

قصیدے میں مومن نے وزیرالدولہ کی بہادری، فیاضی، عدل پروری کا ذکر جس والہانہ انداز سے کیا ہے، وہ وزیرالدولہ کی ذات سے مومن کی شیفتگی و محبت اور خود نواب صاحب کی علم پروری کی دلیل ہے۔

اے فلک دل کو داغ کرتی ہے / زر خورشید کی درخشانی
بے نیازی سے مری تجھے حاصل / کچھ نہ ہوگا بجز پشیمانی
جانِ مومن پہ گونہ گونہ ستم / کافر آتی بھی نامسلمانی
تا کجا اے یزید شمر خصال / فتنہ ہائے فریب مردانی
اس سے کاوش نہ کر نہ ہو ظالم / آپ اپنا تو دشمنِ جانی
تجھے معلوم ہے کہ ہے وہ کون / کھول دوں میں یہ رازِ پنہانی
مدح خوانِ شہ وزیر لقب / ختم جس پر ہوئی سخندانی
پایہ سنج کمال اہل کمال / فارقِ طرزِ می و عمانی
کیا کہوں اُسکے دستِ ہمت کی / میں گہر باری و زر افشانی
ہر گدا کی ہے زینتِ کشکول / رشک ترصیع تاج سلطانی
کہیں نیرنگیِ زماں سے فرزیں / خوانِ نعمت کی اس کے الوانی
کردے سارے جہان کو سیراب / بحرِ ہمت کی اُس کے طغیانی
بخششِ بے شمار سے مشکل / ہے دبیر فلک کو دیوانی
اُس کے عہدِ کرم کی نسبت سے / بڑھ گئی عمر عالمِ فانی
لے سخاوت اُسے قرار کہاں / کہ ہے عادت طبیعتِ ثانی
اس کے ہے روزگار میں یکساں / ابر کو بہمنی و نیسانی
دوری اپنی نہیں ہے مانع فیض / مہر کو کیا حجاب ظلمانی

گرگ نے دورِ عدل میں اسکے / سیکھ لی راہ و رسم چوپانی
آشیانِ عقاب و شاہیں میں / روز کنجشک کی ہے مہمانی
حملۂ شیر گیر سے اُس کے / نعرہ زن ضیغم نیستانی
خنجر جاں شگاف میں اسکے / ابروے یار کی سی برانی

قصیدے کی آخری منزل اس کا خاتمہ ہے جس پر اس کی کامیابی کا بہت کچھ مدار ہے۔ غالباً اکثر ممدوح کے لئے دعا کی جاتی ہے مومن نے بھی اپنے قصیدے کو دعا پر ختم کیا ہے۔ دعائیہ اشعار کا انداز بہت اچھوتا اور دلکش ہے۔

مومن اب ختم کر دعا پہ سخن / تا کجا لا فہائے طولانی
جب فلک باعثِ نشاط و ملال / ہے وصال و فراق جانانی
تیرا اقبال روز افزوں ہو / جیسے مومن پہ لطف رحمانی

مولانا عیاض خاں صاحب جو ٹونک کے قدیم واقف الحال لوگوں میں سے ہیں وہ اپنے بزرگوں کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ نواب وزیر الدولہ بہادر نے مومن کو اس قصیدے کے صلے میں ایک بیش بہا خلعت اور گراں قدر نقد انعام عطا فرمایا تھا اور اس کے علاوہ بھی نواب صاحب مومن کو وقتاً فوقتاً ہدایہ اور تحائف بھیجتے رہتے تھے۔ اور حکیم مومن خاں کی وزیر الدولہ سے مراسلت جاری رہی اس مراسلت کا معتدبہ حصہ محکمہ دار الانشا حضوری میں محفوظ ہے جس کا حصول ہماری دسترس سے باہر ہے

کرشن مومن

قطعات

روشنی چھپتی ہے مرگھٹ میں / سائے لرزتے ہوئے گذرتے ہیں
لوگ کہتے ہیں چاندنی شب میں / ایک جوگن پہ بھوت مرتے ہیں

تیری آنکھوں میں مسکراہٹ ہے / مسکراہٹ میں جگمگاہٹ ہے
جگمگاہٹ کی اوٹ میں رقصاں / میرے آوارہ غم کی آہٹ ہے

برج لال رعنا

رباعیات

غربت میں کہاں لعل و گہر کا سایہ / صحرا میں کہاں سنبل تر کا سایہ
دم بھر بھی میرے پاس کوئی ٹھہرا / میں دہر میں ہوں خشک شجر کا سایہ

شعلہ ہوں کہ دنیا کی روانی ہوں میں / جو کچھ بھی ہوں اس بزم میں فانی ہوں میں
دیکھو تو میں شبنم کی طرح موتی ہوں / سمجھو تو سمن زار میں پانی ہوں میں

محمد مقبول شیروانی

قصبہ بارہ مولا سرینگر سے ۴۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس قصبے کے ایک غریب مسلم گھرانے میں محمد مقبول شیروانی نے جنم لیا تھا۔ لڑکپن ہی سے اس نے کشمیر کی تحریک آزادی میں سرگرم حصّہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اور کئی مرتبہ گرفتار ہُوا۔

۱۹۴۴ء میں مقبول شیروانی کو نمایاں شہرت حاصل ہُوئی۔ ان دنوں مسٹر جناح مرحوم نے بارہ مُولا کے ایک عام جلسے میں تقریر کرنے کی کوشش کی۔ لیکن شیروانی کی زیر قیادت بارہ مولا کے مسلمانوں نے مسلم لیگ کی فرقہ دارانہ سیاسیات کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

اس جلسے کے واقعات کی خبریں سارے ہندوستان کے اخبارات میں جلی سُرخیوں سے شایع کی گئیں۔ مسلم لیگ کے حمایتی اخبارات اور اس کے پیرو کاروں کو بہُت خفت ہُوئی۔ اور انہوں نے شیروانی کے خلاف شدید غم و غصّہ کا اظہار کیا۔ تھوڑے ہی دن بعد ایک گروہ نے رات کے وقت شیروانی پر حملہ کر دیا۔ آپ نے ایک دریا میں چھلانگ لگا دی۔ اور جان بچانے کے لئے تیر کر پار کر کے چلے گئے۔

بھوک ہڑتال

۱۹۴۶ء میں نیشنل کانفرنس نے "کشمیر چھوڑ دو" مہم جاری کی۔ قریباً دو ماہ تک آپ خُفیہ کام کرتے رہے۔ آپ کی باغیانہ فطرت نے جیل میں بھی چین لینے نہیں دیا اور آپ نے بھوک ہڑتال کر دی جیل سے رہا ہو کر آپ بمشکل آرام سے بیٹھنے ہی پائے تھے۔ کہ پاکستان سے قبائلی حملہ آوروں نے کشمیر پر دھاوا بول دیا۔ شیروانی نے اپنے ان بدنصیب بھائیوں کی جنہیں پاکستانی حملہ آوروں کے ہاتھوں بہت زیادہ مصیبتیں اُٹھانی پڑی تھیں، اس آڑے وقت میں دلجوئی کی اور ان کو ہر قسم کی امداد بہم پہنچائی۔ اس اثنا میں شیخ عبداللہ نے عوام کو اپنے ملک کی حفاظت کے لئے صف آرا ہونے کو للکارا۔ ایک عوامی رضاکار فوج منظّم کی گئی ہندوستانی فوج کشمیر کی امداد کے لئے آ پہنچی۔

گرفتاری اور شہادت

ایک روز آپ سرینگر سے سولہ میل کے فاصلے پر سنبھل نامی گاؤں کا دورہ کر رہے تھے کہ آپ حملہ آوروں کے ہاتھ پڑ گئے۔ وہ ان کو گھسیٹتے ہُوئے بارہ مولا لے گئے۔ وہاں آپ سے ہندوستانی فوج اور قومی رضاکاروں کی فوج کی مورچہ بندیوں کا پتہ بتلانے کے لئے کہا گیا۔ لیکن آپ نے بتانے سے انکار کر دیا۔ حملہ آوروں نے انہیں اپنے ہی شہر کے مرکزی چوک میں ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا۔ آپ اس وقت بُری طرح زخمی تھے اور اس کے باوجود آپ نے ملک کے ساتھ غداری کرنے کے عوض اپنی جان قربان کرنا بہتر خیال کیا۔ ایک بار پھر آپ سے کہا گیا کہ "اگر تم اب بھی شیخ عبداللہ مُردہ باد کا نعرہ لگا دو تو تم کو مُعاف کر دیا جائے گا اور تمہاری جان بخشی کر دی جائے گی۔" آپ نے یہ نعرہ لگانے کے عوض اس شخص کے مُنہ پر تھوک دیا جو آپ کے رُوبرو کھڑا تھا۔ اور زور سے نعرہ لگایا "ہندو مسلم سکھ اتحاد زندہ باد" "آزاد ہندوستان زندہ باد" اس پر حملہ آور آگ بگولا ہو گئے۔ گولیوں سے ان کا سینہ چھید دیا گیا۔ وحشی حملہ آوروں کو اس پر بھی تسکین نہیں ہُوئی۔ شیروانی کے مُردہ جسم پر ۱۴ مرتبہ گولی چلائی گئی۔ اور پھر اس کی لاش کو ایک دروازے میں لٹکا دیا گیا۔ شیروانی آج زندہ نہیں۔ لیکن اُن کا نام سارے کشمیر میں امر ہو چکا ہے۔ اپنے ملک سے ان کی غیر متزلزل اور انمٹ وفاداری اور ان کی بہادری کے کارنامے ان لاکھوں کشمیری جوانوں اور بوڑھوں کو جوش اور حوصلہ دلاتے ہیں جو کشمیر کی سرحدوں کی حفاظت کے لئے قومی رضاکار فوج میں شامل ہو چکے ہیں۔ وہ مر چکے ہیں۔ لیکن ان کی رُوح کشمیر کے لکھو کھا لوگ کے دلوں میں زندہ ہے۔

پنڈت نہرو کی امریکہ یاترا

ہمارے پردھان منتری پریذیڈنٹ ٹرومین کی دعوت پر اکتوبر کے دوسرے ہفتے پہلی بار امریکہ تشریف لے گئے۔ امریکن گورنمنٹ اور اہل امریکہ نے پنڈت نہرو کا ان کی شان کے شایاں استقبال کیا اور ہندوستان کے تئیں اپنی نیک خواہشات اور دوستی کا ثبوت دیا۔ پردھان منتری کا یہ سفر یقیناً ہندوستان اور امریکہ کے تعلقات میں ایک نئے باب کا اضافہ کریگا۔

اوپر – واشنگٹن کے نیشنل ہوائی اڈے پر پریذیڈنٹ ٹرومین پنڈت نہرو کا استقبال کر رہے ہیں۔

نیچے – پنڈت نہرو اپنے اعزاز میں دئیے ہوئے گارڈ آف آنر کا
[illegible]

هوائی اڈے سے پنڈت نہرو پریذیڈنٹ ٹرومین
کی ذاتی کار میں روانہ ہو رہے ہیں۔

گارڈ آف

راستے میں پبلک کی طرف سے پنڈت نہرو کی کار کا شاندار استقبال

پنڈت نہرو اور پریس
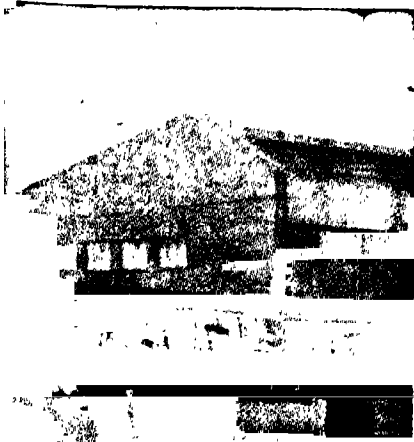
پنڈت نہرو کے امریکہ پہنچنے پر پریذیڈنٹ ٹرومین نے انکا پرتپاک استقبال کیا (تصویر میں دائیں طرف) شریمتی اندرا گاندھی کھڑی ہیں۔

د اور منظر۔

پنڈت نہرو اور پریذیڈنٹ ٹرومین پبلک کے استقبال کا جواب دے رہے ہیں۔
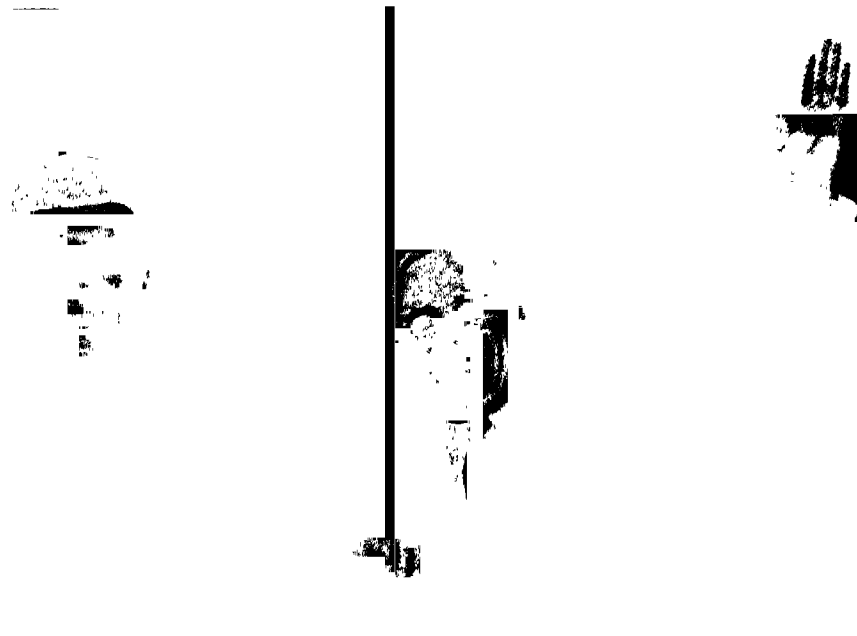
ں گارڈ آف آنر کے وقت

(دائیں) بلئیرھاؤس کی سیڑھیوں پر
پنڈت نہرو، شریمتی وجے لکشمی
اور پریذیڈنٹ ٹرومین۔

(نیچے) پردھان ٹرومین کی قیام گاہ
میں پنڈت نہرو کی آمد۔

پنڈت نہرو بلیئر ہاؤس میں داخل ہو رہے ہیں۔

جوش ملیح آبادی

روئیں یا ہنسیں

یہ کتنی سچّی بات ہے کہ حقیقت افسانے سے ہمیشہ بڑی ہوتی ہے
—— جہاں انسانی تخیّل اپنی انتہا پر ہوتی ہے، بسا اوقات قدرت اپنے کرشموں کی وہاں سے ابتدا کرتی ہے —————— شاعری ہی کو لے لیجیے، ہمارے ہندوستان نے کتنے بڑے بڑے سنجیدہ اور مزاح پسند شاعر پیدا کئے ہیں۔ لیکن سوامی پارس ناتھ کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ دُنیا بھر کے شاعر اگر مل کر سوامی جی کا مقابلہ کریں، تو مجھے یقین ہے کہ وہ سب ہار جائیں گے۔ اگر کسی شاعر صاحب کو دعویٰ ہو تو وہ میدان میں آئیں اور ایسے شعر کہہ کر دکھا دیں۔

سوامی جی بھپھوند ضلع اٹاوہ کے باشندے ہیں۔ آپ کے مجموعۂ کلام پر حضرت احمق نے مقدّمہ تحریر فرمایا ہے جس کے چند فقرے ملاحظہ ہوں:-

"سوامی پارس ناتھ بیسویں صدی کے ہیرو ہیں۔ اب وہ وقت دُور نہیں کہ پہچانے جائیں اور دُنیا اِن کی پوری قدر کرے۔ ایک بات سوامی جی میں عجیب و غریب ہے جو آج تک کسی شاعر کے کلام میں دیکھنے میں نہیں آئی، یعنی سوامی جی کے ہر شعر میں ایک لفظ ہوتا ہے جو اُس شعر کا "راجہ" ہوتا ہے۔ بعض مخلصین کے اصرار پر سوامی جی کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی میں جانے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ اور اس مقصد سے آپ گاندھی جی اور پنڈت جی وغیرہ سے مل چکے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نے آپ کی درخواست لے لی ہے اور اُمید ہے کہ وہ سوامی جی کی قدر کریں گے۔"

یہ عبارت تو تھی احمق صاحب کے عالمانہ مقدمے کی۔ اب خود سوامی جی کے خط سے دو فقرے نقل کئے جاتے ہیں جو اُنھوں نے ایڈیٹر "آج کل" کو تحریر فرمائے ہیں۔

(۱) "اس کتاب نے شاعری کا ریکارڈ توڑ دیا ہے" (۲) "امریکہ کا نوبل پرائز یہ کتاب ضرور فتح کرے گی۔"

اپنے مجموعۂ اشعار کے سرورق پر سوامی جی نے یہ نوٹ دیا ہے "جس لفظ کے نیچے لائن ہو، اُسے اُس شعر کا راجہ خیال فرمائیں۔"

"شعر کا راجہ" آیا خیال شریف میں؟

اب آپ سوامی جی کے "بلاغت نظام" کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں اور سر دُھنیں۔

(صنم کی آنکھ)

نہ کعبے میں، نہ گرجے میں نہیں بُت خانے میں دیکھا
اگر کچھ نُور دیکھا تو —— صنم کی آنکھ میں دیکھا

(اس میں لفظ "نُور" شعر کا راجہ ہے)

(صنم کی زلف)

زُلف کالی براجی ہے صنم کا چاند چہرہ ہے
حُسن کے اُس دفینے پر ناگ کالے کا پہرہ ہے

(اس میں "دفینے" شعر کا راجہ ہے)

(صنم کے گال)

صنم کے گال جو دیکھے تو جی خوش ہو گیا میرا
شہد میں دودھ منجلا سمندر سا اُمڑتا تھا

("منجلا" شعر کا راجہ ہے)

(صنم کی گلی)

صنم کی گلی سے ہو کر سبھی پبلک نکلتی ہے
فقط میری مناہی ہے کہ جس کی دَم نکلتی ہے

("دَم" شعر کا راجہ ہے)

(صنم کا صحن)

ارے بادل ہمیشہ کام کرتے تم غریبوں کے
ہمارے پریم کے آنسو صنم کے صحن میں برسو

("برسو" شعر کا راجہ ہے)

(صنم کا تل)

بہت چھوٹی میری ہستی ایک سرسوں کے قابل ہوں
ترخ رُخسارِ جاناں پر بنا چھوٹا سا اِک تِل ہوں

("ترخِ رخسار" اور "تِل" اس شعر کے دو راجہ ہیں) "رُخِ رخسار"
اے سبحان اللہ!

(صنم کا چہرہ)

ہوئے بے ہوش جب موسیٰ تو ہنس کر طور یوں بولا
چمن کا ناحق دیکھا تھا صنم کا منھ کب دیکھا تھا

("ناحق" راجہ ہے)

(صنم کی مار)

کماں سی کھینچ ابرو کی صنم مسکاتے جاتے ہیں
ایک گولی ہی کافی تھی دو نالی کیوں چلاتے ہیں

("دو نالی" راجہ ہے)

(صنم کے تلوے)

کسی پوشاک میں آؤ تمہیں پہچان لوں گا میں
صنم تم وہ ہمارے ہو کہ جس کے تلوے جانے ہیں

("تلوے" راجہ ہے)

(صنم کی موجودگی)

درختِ اعظم جو جنت میں نہ اُس کا سایہ میں چاہوں
اگر محبوب گل بانہیں تو نیم ہی ہے درختِ اعظم

(اس شعر میں دو راجہ ہیں "گل بانہیں" اور "نیم")

(صنم کی عاجزی)

صنم کو باغ میں لے جا کیا سنگار پھولوں سے
قدم جب پکڑے عاشق نے صنم بولے "ارے توبہ"

(ارے توبہ" اس شعر کا راجہ ہے)

(صنم کا بلانا)

نہ وے گھنٹی بجاتے ہیں نہ وے گھنٹہ بجاتے ہیں
صنم ابروئے جُنبش سے مجھے اندر بلاتے ہیں

("ابروئے جنبش !" اور "اندر" اس شعر کے دو راجہ ہیں)

(صنم میں عطر)

رقیب نے آسرے مجلس صنم میں عطر مَل ڈالا
لکیریں دونوں ہاتوں کی میں نے مَل مَل کے مَل ڈالیں

("مل مل کے" اس شعر کا راجہ ہے)

"سرِ مجلس" کے عوض "سرے مجلس" "صنم کے عطر مل ڈالا" کے عوض "صنم میں عطر مَل ڈالا" اور پھر دونوں ہاتوں کی لکیریں "مَل مَل کے مَل ڈالیں" ان چیزوں کا جواب ہو ہی نہیں سکتا۔

اب "صنم" سے ہٹ کر دیگر اشعار ملاحظہ ہوں:-

محبّت کے مقام (مقامات)

چوٹی، گال، آنکھیں انگوٹھا پیر دائیں کا
زبان کی نوک یہ پانچوں مقام ہیں پریم امرت کے

(ان پانچوں "محبت کے مقام" میں، حرف پانچواں مقام "زبان کی نوک" راجہ ہے)

اب "ننگا لڑکا" ملاحظہ فرمائیے ـــ یہ ہے "ادب برائے زندگی"!

(ننگا لڑکا)

ارے ننگے، ارے لڑکے رہو ننگے، رہو لڑکے
نہ تیرے پہننے قابل ریشمی قیمتی کپڑے

(اس میں "قابل" شعر کا راجہ ہے ـــ "ارے ننگے" "ارے لڑکے" اور پھر "رہو ننگے" اور اُس پر طرّہ "رہو لڑکے" کس کی مجال ہے کہ اس شعر کا جواب دے سکے۔ واللہ یہ کلامِ بشر نہیں ہے)

(خالق باری)

ایک دن دیکھی جھلک اپنے اُس محبوب کی
سر سے لے کر پیر تک خالق باری تھی چھپی

("خالق باری" راجہ ہے)

(چہرہ صاف رکھو)

خدا نے چہرہ نورانی ہمیں اس کو بنایا ہے
کہ اس پر آپ کر دیویں محکمۂ جنگلات قائم
("جنگلات" راجہ ہے)

(جغرافیہ)

ایک عورت کی چادر پر چھپیں "ہ" تصویریں تاریخی
اور پلنگے پہ نقشے تھے گویا جغرافیہ پھیلا

ہائے رے "گویا جغرافیہ پھیلا" یہ راجہ ہے، قربان اس راجہ کے۔ "گویا جغرافیہ" اور "پھیلا" اور کہاں "پلنگے پر" سبحان اللہ سبحان اللہ شعر کہے تو یوں کہے۔

"آپ کی عورت"

آپ کی سیرت سی سیرت آپ کی صورت سی صورت
آپ کی روح آدھی وہ کہاں ہے آپ کی عورت

"کہاں ہے آپ کی عورت" اتنا بڑا راجہ ہے اس کا۔ ہائے کیا استفسار ہے "کہاں ہے آپ کی عورت"

(اسکول کا معائنہ)

کتابیں صاف مردہ ہیں ماسٹر ہاف مردہ ہیں

اور جو دیکھا طالب علموں کو کہ مردے چیں چیں کرتے تھے
("چیں چیں" راجہ ہے اس لاجواب شعر کا)

محبت اس کو کہتے ہیں

ہرن کی محبت

ترنم بین کا سن کر ہرن خود جال میں آیا
رات میں رو ہرن بولا محبت اس کو کہتے ہیں
("رو" راجہ ہے)

بادشاہ کی محبت

شاہ ایڈورڈ ہشتم نے تاج کو کر دیا فٹ بال
تان کر مار دی ٹھوکر محبت اس کو کہتے ہیں

ملاحظہ فرمائی آپ نے یہ شاعری، کہاں ہیں ہندوستان کے شعرائے کرام، جنہیں اپنے اپنے "بلاغت نظام" پہ ناز ہے، وہ دیکھیں سوامی جی کے ان گوہر ہائے آبدار کو جن میں ایک ایک "راجہ" بیٹھا ہوا ہے۔ کوئی ایک مصرع کہہ دے ایسا تو ایمان لے آؤں اس کی شاعری پہ۔ سوامی پارس ناتھ جی کی جے۔ سوامی پارس ناتھ جی کی شاعری کی جے اور سوامی پارس ناتھ جی کے اشعار کے راجاؤں کی جے۔

اشیاء کی تھوک قیمتوں میں اضافہ

آٹھ اکتوبر کو ختم ہونے والے ہفتہ میں ہندوستان میں تھوک قیمتیں ایک فیصدی بڑھ گئیں۔ جو انڈکس پہلے ۳۹۴ اعشاریہ ۸ تھا۔ (بنیاد۔ اگست ۱۹۳۹ء کو ختم ہونے والے سال تک ــ ۱۰۰) وہ پہلے ماہ کے اس ہفتہ سے اعشاریہ پانچ فیصدی اور پچھلے سال کے اس ہفتہ سے تین اعشاریہ پانچ فیصدی زیادہ تھا۔

غذائی اجناس زیر جائزہ ہفتہ میں گڑ کا بھاؤ ۵۳ فیصدی بڑھ جانے سے انڈکس تین اعشاریہ چار فیصدی مزید بڑھ کر ۴۱۲ اعشاریہ ۹ ہو گیا۔ گندم کا بھاؤ دو فیصدی بڑھا لیکن ارہر کا بھاؤ چار فیصدی گر گیا۔

صنعتی خام مال خام اون کا بھاؤ سات فیصدی اور بیج سرسوں کا بھاؤ تین فیصدی بڑھا لیکن کپاس کا بھاؤ نو فیصدی اور السی کا بھاؤ دو فیصدی گر گیا۔ نتیجتہً مجموعی انڈکس اعشاریہ پانچ فیصدی کم ہو کر ۴۷ اعشاریہ ۸ ہو گیا۔

نیم مصنوعہ اشیا بھیڑ کی کھالوں کا بھاؤ چھ فیصدی، بکری کی کھالوں اور تیل مونگ پھلی کے بھاؤ تین تین فیصدی۔ تیل ناریل اور تیل السی کے بھاؤ دو دو فیصدی گر جانے سے مجموعی انڈکس اعشاریہ دو فیصدی کم ہو کر ۳۳۰ اعشاریہ ۸ ہو گیا۔ تاہم تانبے اور ناریل کی رسیوں کے بھاؤ تین تین فیصدی بڑھے۔

خوراک کا مسئلہ

وزیر اعظم کے ارشادات

امریکہ روانہ ہونے سے قبل وزیر اعظم نے قوم کے نام جو پیغام نشر کیا تھا۔

اس میں آپ نے فرمایا تھا "خوراک کا مسئلہ ملک کے سامنے بنیادی مسئلہ ہے۔ ہمیں خوراک کو بچانا چاہیئے۔ دعوتوں سے احتراز کرنا ہوگا۔ جو شخص بھی خوراک کو ضائع کر رہا ہے۔ وُہ ایک جُرم کا مرتکب ہو رہا ہے"۔ پنڈت نہرو نے آسام میں ہندوستانی فوج کے اس حیرت انگیز کارنامے کا ذکر کیا جو اس نے خوراک کی پیداوار بڑھانے میں حکومت کی مدد کے لئے کیا ہے۔ توقع کی جاتی ہے۔ کہ نومبر کے آخر تک ہندوستانی فوج آسام میں بیس ہزار ایکڑ زمین میں کاشت کاری کرے گی۔ اور پھر خاص بات یہ ہے کہ فوجی اتنا بڑا کام اپنے فالتو وقت میں سرانجام دے رہے ہیں۔

قبل ازیں ہندوستانی پارلیمنٹ میں روپے کی قیمت میں کمی کے بارے میں شکوک و شبہات رفع کرنے کے لئے وزیر اعظم نے جو تقریر کی تھی۔ اس میں آپ نے فرمایا تھا کہ مجھے پختہ یقین ہے۔ کہ چاول کی درآمد بند ہونی چاہیئے۔ اور اگر ہم کچھ چاول درآمد کریں بھی تو وُہ صرف ہنگامی حالات کے لئے ذخیرہ جمع کرنے کے لئے محفوظ رکھے جائیں۔

پونا کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہُوئے وزیر اعظم نے کہا کہ میں توقع رکھتا ہُوں کہ ہر ایک ہندوستانی ملک کی خوراک کی پیداوار بڑھانے میں پورا حصہ لے گا۔ شہروں میں رہنے والے لوگ خوراک کی تقسیم سے گریز کر کے اس کام میں امداد دے سکتے ہیں۔ سکولوں اور کالجوں کے طلبا دیہات میں کاشتکاروں کو خوراک کی پیداوار بڑھانے کی تعلیم و ترغیب دے کر اس مہم میں ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔

برطانیہ ہندوستان کو فنی امداد دینے کا خواہاں ہے۔ وزیر اعظم انگلستان مسٹر کلیمنٹ ایٹلی نے پارلیمنٹ کی ۱۹۴۹ء کی رپورٹ کے متعلق اپنے مراسلے میں لکھا ہے کہ برطانیہ ہندوستان کو خوراک کی پیداوار بڑھانے کے لئے فنی امداد بہم پہنچانے کی بہت خواہشمند ہے۔ ہندوستان کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وُہ خوراک کی درآمد بند کرے۔ اس مقصد کے حصُول کے لئے اسے اپنی پیداوار تیس لاکھ ٹن سالانہ بڑھانی ہوگی۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اسے اپنی بڑھتی ہُوئی آبادی کو خوراک مہیا کرنے کے لئے مزید ساڑھے تین لاکھ ٹن سالانہ خوراک پیدا کرنی چاہیئے۔ برطانیہ کو چاہیئے کہ وُہ ہندوستان کو بدستور فنی امداد بہم پہنچاتی رہے تاکہ وُہ اپنے مقصد کے حصُول میں کامیاب ہو سکے۔

اناج کے نرخ گھٹانے کیلئے اجتماعی منصوبہ

صُوبوں اور ریاستوں کے وزرائے خوراک کی دو روزہ کانفرنس کا اجلاس ۹ اکتوبر کو ختم ہو گیا اس اجلاس میں یہ قرارداد پاس کی گئی۔ کہ ضروریات زندگی کی قیمتوں کا گھٹانا نہائیت ہی ضروری ہے۔ صُوبائی حکومتوں کو تمام ایسے اقدامات فوراً کرنے چاہئیں جن کے ذریعے سے سارے ملک میں مجمُوعی طور پر راشن میں دیئے جانے والے اناج کے نرخوں میں کم از کم دس فی صدی کی تخفیف عمل میں لائی جا سکے۔

ڈاکٹر جان متھائی نے کانفرنس کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا۔ "کہ ملک میں تشویش اور بے چینی پیدا کرنے والے تمام مسائل کی جڑ موجودہ بڑھی ہُوئی قیمتیں ہیں۔ جب تک سب سے پہلے خوراک کے استعمال ہونے والے اناج کے نرخ نہ گھٹائے جائیں گے۔ بڑھی ہُوئی قیمتوں کے گورکھ دھندے کو توڑنا ناممکن ہوگا۔ خوش قسمتی سے قدرت اس سال پچھلے تین برس کی بہ نسبت زیادہ مہربان ہے۔ اور بہت اچھی فصل کی توقع ہے۔ اس لئے نرخوں کو گھٹانے کے اس وقت حالات زیادہ سازگار ہیں۔ شری جیرام داس دولت رام وزیر خوراک نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا تھا۔

کانفرنس میں ایک منصوبہ پیش کیا گیا۔ کہ اگر چاول کے کارخانوں میں

بہت سی ایسی معمولی تبدیلیاں کردی جائیں جن کے لئے مشینری مقامی طور پر دستیاب ہوسکتی ہے۔ تو وہاں سے چاول نکالنے میں ساڑھے چھ فی صدی زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے۔ اگر ملک بھر کے چاول کے بارہ سو کارخانے اس سکیم پر عمل کریں تو ہندوستان کو کئی کروڑ روپیہ کی بچت ہوسکتی ہے۔

خوراک کے محاذ پر حالات کی رفتار

۲۴ ستمبر ۱۹۴۹ء کو ختم ہونے والے ہفتے کے دوران میں غیر ممالک سے ۱۸ ہزار ٹن گندم اور ۱۰ ہزار آٹھ سو ٹن چاول ہند میں درآمد کیا گیا۔ ۱ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو ختم ہونے والے ہفتے کے دوران میں غیر ممالک سے ہندوستان میں اٹھارہ ہزار ٹن گندم دس ہزار ایک سو ٹن آٹا اور گیارہ ہزار تین سو ٹن چاول درآمد کئے گئے۔

صوبے اور ریاستیں

سی پی۔ صوبجات متوسط کے انسپکٹر جنرل پولیس نے ہدایات جاری کی ہیں۔ کہ صوبے بھر میں جتنے بھی پولیس کے دفاتر اور مکانات وغیرہ ہیں۔ ان کے صحن خوراک کی فصلیں پیدا کرنے کے لیے استعمال کئے جائیں خوراک کی بچت کے لئے ایک یا دو وقت کی خوراک رضاکارانہ طور پر ترک کر دی جائے۔ اور چاول یا گندم کے بدلے میں اپنی روزمرہ کی خوراک میں سبزیاں یا دیگر قسم کی خوراک استعمال کی جائے۔

شری گوپال رام کالئے وزیر خوراک نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا ہے کہ صوبائی حکومت نے ۵۰-۱۹۴۹ کے دوران میں دو لاکھ ٹن چاول اپنے صوبے سے باہر بھیجنے کا ذمہ لیا ہے۔ توقع ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری کو نبھا سکے گی حکومت نے اس وقت تک دو لاکھ بائیس ہزار پانچ سو ٹن اناج فراہم کرلیا ہے۔ توقع ہے کہ اکتوبر کے آخر تک دو لاکھ چالیس ہزار ٹن اناج فراہم کرلیا جائے گا۔

یوپی - شری سی۔ بی گپتا وزیر خوراک نے لکھنؤ سے ایک پیغام نشر کرتے ہوئے بتایا ہے۔ کہ صوبے بھر میں دو لاکھ ۸۰ ہزار ایکڑ اراضی کو پھر سے زیر کاشت لایا جارہا ہے۔ جس سے صوبے کی خوراک کی پیداوار میں ایک لاکھ ٹن کا اضافہ ہوگا۔ خوراک کی پیداوار بڑھانے کے لئے وسیع پیمانے پر کاشتکاری کی جارہی ہے۔ نئے نئے کنوئیں کھود کر آبپاشی کو بہتر بنایا جارہا ہے۔

پورلی پنجاب - چوہدری لہری سنگھ وزیر تعمیرات عامہ نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا ہے۔ کہ آئندہ دو برس کے اندر اندر اس صوبے میں آبپاشی کی فوری فیض پہنچانے والی آٹھ اسکیمیں پایہ تکمیل کو پہنچ جائیں گی۔ سال رواں کے دوران میں تقریباً ایک لاکھ ایکڑ اراضی میں ان اسکیموں کے ذریعے سے آبپاشی کی گئی ہے جو پچھلے برس جاری کی گئی تھیں۔ گزشتہ برس بیس لاکھ ایکڑ اراضی کی آبپاشی کی گئی تھی۔ اور اس سال اکیس لاکھ ایکڑ اراضی کی آبپاشی کی گئی ہے۔

بمبئی - حکومت بمبئی نے ایک اسکیم منظور کی ہے جس کی رو سے اب سے لے کر ۱۹۵۲ء تک ۲۵ لاکھ روپیہ کے صرف سے کاشتکاروں کی امداد اور حوصلہ افزائی کی جائے گی کہ وہ تمام کوڑے۔ کرکٹ۔ مویشیوں کے گوبر، پیشاب اور پتے کو کھاد طیار کرنے کے گڑھوں میں ڈال کر سائنسی طریقوں سے کھاد طیار کریں۔

مدراس - حکومت نے ایک حکم جاری کیا ہے کہ کھانڈ کا ہر ایک کارخانہ ۲۹ ستمبر سے اپنا تمام اسٹاک خواہ وہ اس کے اپنے قبضے میں ہو یا اس کے کسی کارندے یا گماشتے کے۔ خواہ وہ اس کے کارخانے کے اندر پڑا ہو یا باہر مقررہ نرخوں پر حکومت کے ہاتھ فروخت کردے گا۔

میسور - حکومت میسور نے ایک سہ سالہ اسکیم طیار کی ہے جس پر [illegible] کروڑ روپیہ خرچ کرکے تین برس کے اندر اندر ریاست کو خوراک کے بارے میں خود مکتفی بنا دیا جائے گا۔

پٹیالہ اور مشرقی پنجاب کی ریاستی یونین نے اپنی حدود کے اندر اور باہر [illegible] کی برآمد اور نقل و حرکت ممنوع قرار دے دی ہے۔

شہروش عسکری طباطبائی

ہم تم

کسی حسین فسانے کا باب ہیں، ہم تم!؟
کہ حسن و عشق کا رنگین خواب ہیں، ہم تم!؟

بکارِ عشق و محبت خراب ہیں، ہم تم
ہزار شکر، کہ یوں کامیاب ہیں، ہم تم

وفا و حسن میں اپنا جواب ہیں، ہم تم
دُرِ یگانہ و لعلِ خوش آب ہیں، ہم تم

ضیاء سے جن کی سہلنے ہیں صبح و شامِ حیات
وہ نَو فروزمہ و آفتاب ہیں، ہم تم

تمام نزہت و رنگینی و شمیم و شگفت
بہارِ لالۂ و گُل کا شباب ہیں، ہم تم

خلوصِ عشق کے ترسے ہوئے زمانے میں
وفا سرشت، محبّت مآب ہیں، ہم تم

اگرچہ جذبۂ بیتاب و شوقِ بے حد سے
جنوں پناہ ہیں، طوفاں حباب ہیں، ہم تم

ق

ہزار شکر، ہوس پیشگی کی دُنیا میں
امینِ عصمتِ عہدِ شباب ہیں، ہم تم

لڑی ہوئی ہیں نگاہیں، نگاہ والوں کی
ہزار ہا کھُلی آنکھوں کا خواب ہیں، ہم تم

نفس نفس کو سنوارا ہے حسن و اُلفت سے
نظر نظر میں جبھی انتخاب ہیں، ہم تم

ہمیں میں رُوح کھنچ آئی ہے عصرِ حاضر کی
نگاہِ اہلِ نظر کا شباب ہیں، ہم تم

ہزار جنسِ گرانمایہ دید کے قابل
مگر، خُدا کی قسم، لاجواب ہیں، ہم تم

ہمارے نغموں سے ہے نغمگی ستاروں میں
عجب مُغنّیِ آتش رباب ہیں، ہم تم

ہماری سانسوں سے ہے جزر و مد زمانے میں
نقیبِ ہمہمۂ انقلاب ہیں، ہم تم

"بہارِ خونِ شہیداں"، "فروغِ صبحِ وطن"
کوئی نقاب ہو زیرِ نقاب ہیں، ہم تم

ستارے رُک گئے، پَر جل گئے فرشتوں کے
ہنوز گرمِ سفر، ہمرکاب ہیں، ہم تم

بشن داس جگی

گوند کے لڈو

بابو مانک چند ہماری پارٹی میں شامل ہوئے تو چند روزہ عارضی بے کیفی اور جمود و سکوت کا دَور دَورہ ختم سا ہوتا نظر آیا کام سے فراغت پاتے ہی سرِ شام مجلسِ احباب میں وہی پہلی سی چہل پہل اور رونق کے اسباب پیدا ہوتے گئے۔ اس کا سبب مانک بابو کی زندہ دلی۔ ظرافت طبعی یا بذلہ سنجی نہ تھی بلکہ خود ستائی اور معمولی معمولی باتوں میں مبالغہ آمیزی کی فطرت تھی۔ اور یہاں تو ایک نہ ایک ایسی نادر الوجود ہستی کی ضرورت ہمیشہ رہا کرتی تھی گنگا رام گئے تو مانک چند آ گئے ... اکثر ایسا ہوتا کسی نے کوئی بات شروع کی اور بابو مانک چند نے قطع کلام کر کے اُسی سلسلے کے چند در چند واقعات آپ بیتی کے سنا ڈالے۔ بس پھر کیا یار لوگوں نے بنانا شروع کیا۔ تعریف کے پُل باندھ دئے۔ بابوجی کے سمندِ شوق کے لئے یہ تعریفی کلمات گویا تازیانہ ثابت ہوتے۔ وہ جوش میں آپے سے باہر۔ سننے والوں کے قہقہوں اور طنزوں سے بے نیاز اپنی ہی کہتے چلے جاتے۔ حُسنِ اتفاق سے اپنے کاروباری سلسلے میں آپ کو کچھ عرصہ کے لئے ایران کی سیر و سیاحت کا موقع بھی مل چکا تھا اس لئے ہم لوگ آپ کی زبان سے اہلِ فارس کے رسم و رواج اور وہاں کے سیاسی حالات سے روشناس ہونے کے لئے انہیں ذرا چھیڑ دیا کرتے۔ کہنے کو تو وہ اس ضمن میں بہت کچھ کہہ جاتے مگر اکثر گفتگو کا موضوع ہر پھر کر اپنی ذات سے ہی متعلق ہوتا۔ یہ ذاتی افسانے وہ خوب چٹخارے لے لے کر بیان کرتے تھے۔

ایک بار کہیں اپنے ایک "تکیہ" کی تعریف میں کہہ بیٹھے۔ جانتے ہو یہ "تکیہ" اور ایک بڑھیا سا قالین میرے ایک ایرانی دوست کا خاص عطیہ ہیں۔ اور پھر "امین جان" سے اپنے گہرے دوستانہ مراسم بیان کرنے میں فصیح بیانی کا حق ادا کر دیتے۔ کبھی کہتے صاحب ذرا اس تکیے کو چھو کر تو دیکھو کتنا نرم اور گُدگُدا سا ہے اس میں دھنی ہوئی روئی نہیں ہے۔ "پشم" ہے "پشم"۔ کسی نے کہہ دیا۔ بجا فرماتے ہیں آپ ایرانی پشم ... نے تو اسے نایاب چیز بنا دیا کسی پرانے "امیر" نے تحفہ کے طور پر پیش کیا ہوگا .... اس پر ایک فرمائشی قہقہہ بلند ہوا اور پھر مدت تک "یہ تکیہ" سب کا تکیہ کلام بنا رہا ....

باتونی اور خود ستا ہوتے ہوئے بھی بابو مانک چند میں یہ خاص وصف تھا کہ وہ اپنے فرائض کو نہایت خوش اسلوبی سے سر انجام دیتے دیوان محکم چند ٹھیکہ دار کے ہاں ان کا تقرر ایک سپیشل ڈیوٹی پر ہوا تھا۔ محکمہ انکم ٹیکس کے کارپردازوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے اور بلیک مارکیٹ میں کمائے ہوئے لاکھوں روپوں کو گورنمنٹ اور عامتہ الناس کی نظر سے بچانے کے لئے ایک ایسے حساب دان چلتے پُرزے کارندے کی ضرورت تھی جو اس منزل کی رسم و راہ اور نشیب و فراز سے خوب آگاہ ہو اور حساب کتاب میں کامل دسترس رکھتا ہو تاکہ ان کی بے پناہ اور ان گنت آمدن کے مقابل بڑھے چڑھے اخراجات دکھا کر آمدن و خرچ کی دونوں مدیں برابر کرتا جائے اور اس طرح سے تیار کئے ہوئے رجسٹروں کو اصل ظاہر کر کے وہ انکم ٹیکس سے بچنے کی سعی کرنا چاہتے تھے۔

لالہ محکم چند خود پہلے ایک معمولی مدرس تھے اور اپنے علاقے کے معدودے چند انگریزی خوانوں میں سے ایک تھے قسمت نے یاوری کی اور اُن کے گاؤں کے قریب تیل کے چشمے نمودار ہوئے ایک [illegible]

نے کروڑوں روپے کا سرمایہ لگا کر تیل نکالنے کا جتن کیا مگر ناکام اور نامراد واپس چلی گئی۔ تیل کی ایک سطحی دھارا نمودار ہوئی جس کی سعیِ حصول اتنے بھاری اخراجات کی متحمل نہ ہو سکتی تھی اس واسطے بڑے بڑے انجن اور بھاری بھرکم آہنی سامان نل مشینری وغیرہ جوں کے توں چھوڑ کر کمپنی کو وہاں سے بے نیل و مرام واپس جانا پڑا۔ آخر وہ سارا سامان ایک اور آئل کمپنی نے جو نزدیک ہی اسی علاقہ میں نہایت کامیابی سے اپنا کاروبار کر رہی تھی خرید لیا۔ باربرداری کا ٹھیکہ محکم چند کو ملا۔ اونٹوں پر لاد کر بے ڈھب اور دشوار گزار راستوں سے جب وہ انجن وغیرہ منزل مقصود پر پہنچتے تو لدے لدائے اونٹ فرشی کانٹے کی پلیٹ پر کھڑے کھڑے تول لئے جاتے اور اونٹوں کا وزن کم کر کے بقیہ سامان کی ڈھلائی مقررہ شرح باربرداری کے حساب ٹھیکہ دار کو دے دی جاتی۔ اس طرح کے چند کھیپ ہی آئے تھے کہ منشی محکم دیوان محکم چند بن گئے سال بھر کی تنخواہ چند دنوں میں مل گئی تو آپ نے نوکری سے استعفٰے دے دیا۔ اس کام میں تین چار ماہ لگ گئے اس دوران میں "آئل کمپنی" کے افسران سے ٹھیکہ کا تال میل بڑھ گیا اور اس کے حسنِ انتظام اور مستعدی سے خوش ہو کر اس کمپنی کی مستقل اجارہ داری ان کے سپرد کر دی گئی۔ لالہ محکم چند کو ہزارہا من وزن کا سامان کو تکہ نل مشینوں وغیرہ کی ڈھلائی کا ٹھیکہ کیا مل گیا گویا قارون کا خزانہ ہاتھ آ گیا۔ یہ سامان ان کو ریلوے اسٹیشن سے پچیس میل دور آئیل فیلڈ تک لانا پڑتا تھا۔ سینکڑوں بیل گاڑیاں اور موٹر ٹرک دن رات کام میں مشغول رہتے ان دنوں لالہ جی کی آمدنی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ ایک سال میں کایا پلٹ گئی اب انہوں نے ٹھیکہ داری کے تمام ضروری ہتھکنڈے سیکھ لئے متعلقہ افسران کو دعوتیں دینا، ڈالیاں پہنچانا اور حصول مقصد کے لئے نئی نئی اسکیمیں تیار کرنا ان کا معمول ہو گیا۔

دولت اور ثروت کے ساتھ ساتھ اُن میں زندہ دلی اور ظرافت بھی آ گئی تھی۔ کبھو کبھار شام کو فارغ وقت میں جب ہم لوگ مل کر بیٹھتے اور بابو مانک چند کی نہ ختم ہونے والی گفتگو اور خودستائی کی باتیں شروع ہوتیں تو دیوان محکم چند کافی دلچسپی لیتے اور اپنی نکتہ فرینی اور سلیقہ گوئی سے مجلس میں خوب گرمی پیدا کرتے اور دیر تک ہنستے ہنساتے رہتے۔ بابو مانک چند چونکہ قریب ہی ایک گاؤں کے رہنے والے تھے وہ ہر مہینہ دو تین بار ضرور گھر جاتے اور ایک دن رہ کر سوموار صبح سویرے واپس لوٹ آتے یہ ایک روزہ سفر بھی ان کی گفتگو کے لئے نئے نئے موضوع فراہم کرتا تھا۔ کبھی تو گھر والی کے سلیقے خاطر داری آؤ بھگت کی تعریف ہوتی۔ کبھی والدین کی بے لوث محبت یا گھر پر ان کے لئے پکائے گئے خالص مرغن اور لذیذ کھانوں کا تذکرہ ہوتا جو دوستوں کی طنز آمیز چوٹوں اور فقرہ بازی سے کافی دلچسپی پیدا کرتے۔

سردیوں کے دن تھے مانک بابو گھر سے لوٹے اور اپنے ساتھ "گوند کے لڈو" لائے جیسا کہ ان کا معمول تھا لگے ان کی نفاست اور عمدگی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے۔ بڑھیا قسم کا گائے کا دانے دار خالص گھی اور اس کے حاصل کرنے کے لئے ان کے والد مکرم کی انتہائی کوششیں "پھلاہی" کی گوند اور دیگر مقوی اور ممسک اجزا مغزیات وغیرہ کی فراہمی کے لئے دوڑ دھوپ سب کا ذکر ہوا .... پھر فخریہ طور سے بتایا کہ پانسو لڈوؤں میں سے ان کو اپنا من مانتا حصّہ دو سو لڈو مل گئے جس میں سے وہ ایک سو کے قریب لے آئے ہیں اور باقی ماندہ ایک سو ان کے اپنے چوبی صندوق میں محفوظ پڑے ہیں۔ اور صندوق کے متعلق یہ کہ وہ شیشم کی لکڑی کا بنا ہوا نہایت مکلّف دیہاتی کاریگر کی صناعیوں کا ایک نمونہ ہے جو ان کی بیوی اپنے جہیز میں لائی تھی۔ غرضیکہ اُن کی ہر بات میں ایک بات ملفوف ہوتی جس کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شاید کسی اجنبی کے لئے پریشانی کا باعث ہو تو ہو مگر ہماری تفریح کا موجب ہوتا۔

پارٹی کے ہر ممبر کو ایک ایک لڈو پیش کیا گیا جو واقعی بہت لذیذ اور عمدہ تھے اور نہ ہوتے تو بھی آخر بابو مانک چند کے لڈو تھے ہر ایک کی زبان پر اُن کی لذّت اور عمدگی کے تعریفی کلمات تھے۔ دو ایک مسخروں نے تو اپنا معمول بنا لیا صبح چائے پر بابو مانک چند کے پاس پہنچے اور مختلف طریقوں سے لڈوؤں کے لاجواب اور بے مثال ہونے کا ذکر چھیڑا اس طرح گویا وہ ان کی ستائش پسند طبیعت اور جود و سخا کی فطرت کو بھانپنے کا جتن کرتے .... خالص گھی کے بنے ہوئے "یہ گوند کے لڈو"... اجی کون

تیار کر سکتا ہے .... بڑے بڑے امیروں کو دیکھا ہے۔ بازاری چیزیں کھاتے پیتے ہیں اور صحت کا کوئی خیال نہیں رکھتے ایک آدھ بات انہوں نے کی اور ادھر بابوجی نے دفتر کھول دئے پھر سخاوت جوش میں آئی اُن کو بھی ایک ایک لڈو اور چائے کی پیالی مل گئی ..... ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا .... زیرِ لب مسکرائے اور چلتے بنے ..... اور تو اور دیوان محکم چند کی مبارک زبان بھی ان تاریخی لڈوؤں سے لذت آشنا ہو چکی تھی ....

انکم ٹیکس کے سالانہ حسابات کی تکمیل میں بابو مانک چند بے طرح مشغول تھے ان کی شبانہ روز کی مصروفیت نے چند دنوں کے لئے ہماری مجلسوں کے رنگ پھیکے کر دئے۔ اُن کی عدم موجودگی خاص طور پر محسوس کی جاتی تھی۔ ایک دن دیوان صاحب تشریف لائے اور لڈوؤں کا تذکرہ چھیڑا باتوں باتوں میں ان کو بتایا گیا کہ بابو مانک چند اپنے حصّے کے آدھے لڈو یہاں لائے ہیں اور باقی ایک سَو کے قریب جہیز میں آئے ہوئے چوبی صندوق میں گھر پر رکھے ہیں تجویز ہوئی وہ منگوا لئے جائیں لیکن سوائے حاضر ممبران کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو ایک رقعہ بابو مانک چند کی طرف سے ان کے والد کے نام بدیں مضمون تحریر کیا گیا ... مکرم و محترم والد صاحب! کام کاج کی زیادتی کی وجہ سے میں غالباً دو تین ہفتوں تک گھر نہ آسکوں گا میرے دُھلے ہوئے کپڑے حامل رقعہ ہذا کے ہاتھ بھیج دیں۔ دیگر جہیز میں آئے ہوئے چوبی صندوق میں ایک سَو لڈو پڑے ہیں وہ بھی ارسال کر دیں۔ خالص گھی کے ان لڈوؤں کو یہاں بہت پسند کیا گیا ہے پہلے ختم ہو چکے ہیں میں بالکل خوش و خرم ہوں فکر نہ کریں کسی چیز کی ضرورت ہو تو اطلاع دیں .... آپ کا فرمانبردار بیٹا

"مانک چند"

رقعہ تیار ہو گیا اور مزید سوچ بچار یا ترمیم کے لئے دیوان صاحب کے پیش کیا گیا جنہوں نے کمال دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے راز کی پردہ داری اور ہم لوگوں کو کسی گرفت سے بچانے کے لئے تجویز کیا کہ رقعہ محررہ کی دوسری طرف "ہرڑ۔ بہیڑا۔ آملہ۔ سناکی۔ قلفل دراز" وغیرہ ادویہ لکھ دی جائیں۔ ہم حیران ہو کر ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے دیوان صاحب نے مُسکراتے ہوئے کہا بھائی جب رقعہ پڑھ لیا جائے گا تو قاصد کو اس کے واپس لینے میں مرقومہ ادویات سہولت بہم پہنچائیں گی وہ کہہ سکے گا کہ یہ دوائیاں مجھے بازار سے خرید کر ساتھ لے جانی ہیں رقعہ دے دیجئے ہم ہیں احتیاط اور حفظ ماتقدم پر عش عش کر اُٹھے۔ فی الواقع یہ بے خطا نسخہ لاحق ہو سکنے والی بیماری کے لئے تیر بہدف ثابت ہوا۔ اب مشکل مرحلہ یہ درپیش تھا کہ قاصد کون ہو۔ یہ تو ظاہر تھا کہ کوئی غیر معروف اور اجنبی شخصیت ہی اس اہم ڈیوٹی کو اچھی طرح نبھا سکتی ہے۔ آخر آئیل کمپنی کے ٹائم کیپر نے جو ہماری پارٹی کے ایک سرگرم اور معزز رکن تھے اس مشکل کا حل اپنے ذمہ لیا۔ انہوں نے ایک قابل اعتماد قلی "گنڈو" کو حکم دیا کہ کام پر جانے کے بجائے وہ فلاں گاؤں میں جا کر بابو مانک چند کے گھر رقعہ پہنچا دے اور کپڑے لتّے جو وہ دیں لے آئے اور اس معاملہ کو جہاں تک ہو سکے صیغۂ راز میں رکھے۔ رقعہ واپس لینے کا ڈھنگ بھی اسے بتا دیا گیا۔

پلان کے مطابق "گنڈو" سورج غروب ہوتے ہوتے منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ دروازے پر دستک دی۔ بابوجی کے والد بزرگوار باہر تشریف لائے۔ رقعہ ایک راہ گیر سے پڑھوایا گیا۔ قاصد نے کہا مجھے چند ایک ضروری ادویات خریدنا ہیں جو اس کاغذ کی پشت پر لکھی ہیں۔ کاغذ دے دیجئے اور آپ کو جو کچھ بھیجنا ہو تیار رکھیے میں کل صبح آکر لیتا جاؤں گا ....

مانک کی ماں! بڈّھے لالہ جی نے اندر آکر کھانستے ہوئے کہا۔ تمہارا لاڈلا بڑا فضول خرچ ہو گیا ہے۔ دیکھو لکھتا ہے یہاں لڈو سب نے پسند کئے ہیں۔ بھلے مانس خالص گھی کے لڈو تمہارے کھانے کے لئے بنائے ہیں یا لوگوں میں بانٹنے کے لئے۔ ہفتہ دس دن میں سَو کے سَو برابر کئے اب باقی منگوا بھیجے ہیں۔ میرے خیال میں پچاس بھیج دوں۔ کیوں! کیا کہتی ہو؟ .... مانک کے ابا! بھیج دو سارے اس کے اپنے حصے کے ہیں۔ کھائے چاہے بانٹے۔ لونڈا ایسا سادہ لوح نہیں جیسا تم سمجھتے ہو بانٹے ہونگے تو اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔ تھوڑی سی ردّ و قدح کے بعد دُھلے ہوئے کپڑے اور ایک سَو لڈو ایک گٹھڑی میں باندھ کر رکھ دئے گئے۔

"گنڈو" صبح لڈوؤں اور کپڑوں کی گٹھڑی لے کر چلا تو منزل کے

کارخانے تک پہنچتے پہنچتے اسے شام ہوگئی چھٹی کا وسل بج چکا تھا۔ دس بارہ میل کا فاصلہ طے کرنے میں اُسے عمداً اتنا وقت لگا یا خیال کیا ہوگا پہلے پہنچ گیا تو کہیں پھر کام پہ نہ بھیج دیا جاؤں۔ ٹائم کیپر صاحب حاضری تو لگا ہی دیں گے تھوڑی دیر آزادی سے گھوم پھر لوں گا۔

بابو مانک چند کے سوائے تقریباً تمام دوست بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے کہ اتنے میں "گنڈو" پہنچ گیا لڈوؤں کے بغیر کسی دقت یوں آسانی سے ہاتھ آجانے پر لوگ بہت خوش خوش نظر آتے تھے۔ سب سے پہلے تو یہ مسئلہ در پیش ہوا کہ دُھلے ہوئے کپڑے جو یوں بے طلب آگئے ہیں کیسے پہنچائے جائیں۔ آخر ٹھیکہ دار صاحب کے ایک چوکیدار کو گانٹھا گیا اور اُس نے چپکے سے جا کر بابو جی سے یوں کہا "آپ کی جان پہچان کا ایک آدمی قریب کے کسی گاؤں میں جاتے ہوئے یہاں رکا آپ کا پتہ پوچھا صبح کا وقت تھا آپ موجود نہ تھے وہ زیادہ انتظار کئے بغیر یہ کپڑے اور گھر میں خیر و عافیت کی اطلاع دے کر چلا گیا" روزمرہ کا ایک معمولی سا واقعہ سمجھ کر بابو جی نے اسے زیادہ اہمیت نہ دی کپڑے جب سوٹ کیس میں رکھے گئے تو ان میں لگی ہوئی لڈوؤں کی بھینی بھینی خوشبو نے ان کے مشام جان کو تازہ کر دیا گویا یہ جمال ہمنشیں کا اثر تھا مگر بابو جی اس خفیہ پیغام کے سمجھنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے۔

متفقہ فیصلے کے مطابق مال غنیمت کی بانٹ میں چند ایک دیگر معززین کو بھی شریک کیا گیا۔ مثلاً کمپنی کے ہیڈ کلرک صاحب خزانچی صاحب۔ ڈاکٹر صاحب وغیرہ۔ اس میں جہاں ایک طرف مدعا یہ تھا کہ ہر لڈو کھانے والا اس خاص تقریب کے بارے میں پوچھے جس پر یہ نفیس اور انمول تحفہ پیش کیا جا رہا ہے اور پھر ما وقعہ سُن کر کھلکھلا کر ہنس دے وہاں ساتھ ہی مقصد اعلےٰ یہ بھی تھا کہ بابو جی کی والدہ مکرمہ حقیقت حال سے واقف ہونے پر جو بے نقط سُنائیں گی۔ اس میں زیادہ سے زیادہ حصہ دار بنا کر اُن بد دعاؤں کے اثرات کو منقسم اور منتشر کیا جائے۔

لڈوؤں کا تذکرہ کچھ دنوں سے پھر زیادہ ہونے لگا اب ان کے کھانے میں اتنا لطف نہیں رہا تھا جتنا ان کے بیان میں تھا۔ بابو مانک چند کے پاس جا جا کر لوگ مسکراتے ہوئے لڈوؤں کی تعریف کے پُل باندھ دیتے۔ بابو جی ہنس دیتے اور کبھی کبھی ہنسنے والوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھ کر چُپ ہو جاتے مگر باوجود اس غیر معمولی چھیڑ چھاڑ اور بات چیت کے اُن کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔

کئی ہفتوں کی مسلسل اور شاقہ محنت کے بعد انکم ٹیکس کے حسابات مکمل کر دئے گئے۔ ہر ہفتہ باقاعدہ گھر جانے کے عادی مانک بابو یوں محسوس کر رہے تھے گویا انہیں اہلیہ محترمہ سے ملے اور والدین کو دیکھے برسوں ہو گئے ہیں۔ اب وہ کام سے فارغ ہو چکے تھے ٹھیکہ دار صاحب سے دو تین دن کی رخصت لے کر گھر پہنچے۔ مصروفیت اور کام کاج کی زیادتی کی وجہ سے ان کا چہرہ قدرے اترا ہوا تھا اور کمزوری کے آثار نمایاں تھے خیر و عافیت پوچھنے اور کھانا وغیرہ کھا چکنے کے بعد اطمینان سے بیٹھے تو والدہ نے پوچھا کہو بیٹا! لڈو مل گئے۔ اب کے بھی لوگوں ہی میں بانٹ دئے یا خود بھی کچھ کھائے۔ مانک نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا کیسے لڈو؟ باپ کہنے لگے کیسے لڈو؟ .... تم نے رقعہ دے کر آدمی جو بھیجا تھا کہ کپڑے اور ایک سَو لڈو بھیج دو .... رقعہ کیسا؟ آدمی کون؟ میں نے کب کس کو بھیجا؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ باپ نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا کیسا نادان بنا ہوا ہے۔ صاف کیوں نہیں کہتے لڈو اِدھر اُدھر بانٹ دئے کیا تم کو دُھلے ہوئے کپڑے اور لڈو نہیں ملے؟ کپڑے .... کپڑے تو مل گئے تھے مگر وہ تو کوئی مسافر راہ جاتے ہوئے چوکیدار کو دے گیا تھا۔ اور میں حیران تھا کہ بغیر طلب کئے یہ کیونکر بھیج دئے گئے مگر لڈو تو ان میں تھے نہیں۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ آپ صاف صاف کہئے۔ اب سب لوگ کچھ سنجیدہ ہو گئے باپ نے بتایا کہ کس طرح ایک اجنبی نوجوان ایک رقعہ لئے ہوئے آیا جس میں لکھا تھا کپڑے اور چوبی صندوق میں رکھے ہوئے سَو لڈو بھیج دو اور کاغذ اس نے یہ کہہ کر واپس مانگ لیا کہ اس پر کچھ دوائیاں لکھی ہیں جو بازار سے لینی ہیں۔ وہ دوسرے دن صبح کے وقت آیا اور ہم نے مطلوبہ چیزیں گٹھڑی میں باندھ کر اس کے حوالے کر دیں .... مانک بابو کی آنکھیں کھل گئیں ہم لوگوں کی بے موقعہ ہنسی اور لڈوؤں کا بار بار ذکر کا مطلب اب اس کی سمجھ میں آیا۔ مُنہ سے بے اختیار دو چار صلواتیں نکل گئیں۔ یہ سب بدمعاش ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں دیوان صاحب کیا اور اُن کا چوکیدار کیا اور کمپنی کے یہ

نفکے کلرک جن کا ہر شام وہاں جمگھٹا رہتا ہے ....

میں سوچتا تھا یہ ہر وقت لڈوؤں کا ذکر کرکے کیوں بے اختیار قہقہے لگاتے جاتے ہیں اب معلوم ہوا - اچھا سمجھوں گا ایک ایک سے اور اس کے بعد اُن کی والدہ محترمہ نے حقیقتِ حال معلوم ہونے پر جس فصاحت اور بلاغت سے بے نقط صلواتیں سُنائیں اس کی داد دینا ناممکن ہے اور اگر اُن بددعاؤں میں سے ایک بھی مقبول ہو جاتی تو نا معلوم لڈو کھانے والوں کا کیا حشر ہوتا - مروڑ، پیچش اور قولنج وغیرہ کیسی کیسی مہلک بیماریاں وبائی عوارض بن کر ہماری پارٹی کے لئے مخصوص ہو جاتیں بابو مانک چند نے بہت پیچ و تاب کھایا مگر سوائے اپنی طبیعت پر جبر کرکے غصّہ پی جانے کے کوئی اور چارۂ کار نظر نہ آیا - گھر سے لوٹے تو اب ان کی طبیعت میں ایک بھاری انقلاب نظر آتا تھا - ماتھے پر تیوری - جھلائے ہوئے لڑنے کے لئے بہانے کی تلاش میں - جب دیکھو بھرے بیٹھے ہیں - شام کے اجتماع میں ان کی شرکت موقوف ہوگئی - فرداً فرداً سب سے کہہ چکے تھے میں سب کچھ جانتا ہوں ایک ایک سے بدلہ نہ لوں تو مانک نام نہیں -

لڈو کا لفظ سُن کر کچھ روز پہلے وہ خوش ہوتے بلکہ پھولے نہ سماتے آج حالت دگرگوں تھی اب کسی کو جرأت نہ تھی کہ یہ منحوس لفظ اپنی زبان پر لائے میٹھا لڈو ان کی ایسی کڑوی چڑ بن کر رہ گیا جس کے سُننے کی وہ تاب نہ لا سکتے تھے مزہ یہ کہ ان کی یہ مضحکہ خیز حالتِ جنوں واقعہ مذکور کی زیادہ سے زیادہ تشہیر کا باعث بنی اب تیل کے کارخانے کی مختصر سی آبادی کے ہر فرد کی زبان پر ان کے گوند کے لڈوؤں کا قصہ تھا - ہیڈ کلرک، خزانچی ڈاکٹر وغیرہ بے تعلق مہمانوں نے لڈو کھا چکنے کے بعد اپنے حصے میں آئی ہوئی بے پناہ صلواتوں اور گالیوں کے طومار کا حال سُنا تو قہقہے مار کر اُن کی تلخی کو لڈوؤں کی مٹھاس سے خلط ملط کرنے کی کوشش کرنے لگے ....

نازش پرتاب گڑھی

سناٹا

اور اب مجھ کو نہیں اے دوست تیرا انتظار
ہو چکا پانی ستاروں کا لہو
ڈھل چکی ساری شرابِ رنگ و بُو
ہو گیا مہتاب آخر زرد رُو
شوق مُردہ، آرزو غمگین، محبت شرمسار
ختم سینے کی تپش، اور بے دم ہے دل کی جلن
بے سکونِ مضمحل یہ کائنات
تیرگی، افسردگی، بے جان رات
اب نہ اُٹھے گا کبھی دردِ حیات
ولولوں پر چھا چکیں درماندگی، سونی تھکن
راہگذاروں پر کہیں نقشِ کفِ پا بھی نہیں
تجھ سے ملنے کی تمنا سو گئی
سو گئی روحِ تقاضا سو گئی
درد ہی کیا ساری دنیا سو گئی
بزم میں اب تیری یاد دل کا اُجالا بھی نہیں
سُونا سُونا ہو چکا ہے زیست کا ہنگامہ زار
دھندلی دھندلی سی نظر کھوئی فضا
ٹوٹ کر وہ آخری تارا گرا
لے شبِ غم کا سویرا ہو گیا
اور اب مجھ کو نہیں اے دوست تیرا انتظار

اعظم حسین اعظم

نیا گاؤں

بارہ بجے رات کو جب موٹروں کی چیخ پکار کم ہوتی اور شہر کی ہلچل گھٹی تو گھورے سڑک کے کنارے لیٹے لیٹے سوچنے لگا — کلکتہ آئے تین برس ہو رہے ہیں۔ دن بھر کارخانے میں مٹیا لا دنا رات کو "فٹ پاتھ" پر پڑے رہنا۔ یہ کون سی ایسی زندگی ہے جس کے لئے میں نے اپنا دیس چھوڑا۔ اس سے اچھا تو میرا کھیتی کا کام تھا پر — پر ایک بات ہے کہاری بیگاری سے چھٹکارا مل گیا۔ محنت یہاں بھی کرنا پڑتی ہے۔ پر اس محنت کا پھل بھی ملتا ہے۔ ڈھائی تین روپے روز ہی مل جاتے ہیں۔ اپنے گاؤں میں یہ کہاں۔ وہاں تو بس زمیندار کی بیگار کرنا پڑتی۔ ہر گھڑی پکڑ دھکڑ۔ گالی گلوچ کا سامنا رہتا۔ کہاری کرنا کہاروں کا پیشہ ہے۔ پر وہاں یہ کام بھی چماروں سے ہی لیا جاتا ہے۔ زمیندار کو روز ہی کہار پالکی کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ اپنے کارندوں سے گرج کر کہتے ہیں "پکڑ لاؤ گھوروا کو دھابوا کو۔ آج ان کو اسٹیشن ڈولی پہنچانا ہے"۔ اتنا سوچتے سوچتے گھورے کے چہرے پر رنگ آ گیا اور اس نے جی ہی جی میں زور سے کہا "پر اب ٹھاکر صاحب گھوروا کو کہاں پاتے ہوں گے۔ اب تو گھوروا کلکتے میں بیٹھا مزے سے محنت مزدوری کرتا ہے۔ اب تو ٹھاکر صاحب اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہوں گے۔ نہ وہ اتنا پیچھے پڑتے نہ ہم گاؤں چھوڑ کر کلکتہ آتے اب ہم کلکتہ میں ٹھاٹھ سے رہتے ہیں جہاں کسی زمیندار کی دھونس ہے نہ کارندے کی ڈانٹ پھٹکار — پر — پر اسے اپنا گاؤں دیکھے کتنے دن بیت گئے۔ تین سال۔ ہندوستان جب غلام تھا تو وہ اپنے گاؤں سے گھائل چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا کر نکلا تھا۔ پر اب غلامی کا پنجرا تو ٹوٹ گیا اور ہندوستان آزاد ہو گیا اور وہ اپنے رین بسیرے کی طرف نہیں پلٹا۔ کتنا مورکھ اور کتنا نردے پنچھی ہے وہ کہ اسے اپنے "رین بسیرے"، اپنے جھونپڑے اور اپنے جھنڈ کی یاد تک نہ آئی"۔ گھورے کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس کی نظروں کے سامنے ہرے بھرے باغوں میں گھرا ہوا اس کا اپنا گاؤں گھومنے لگا۔ وہ پھاگن کا "امنگوں بھرا سیوان" وہ ساون کا "ترنگوں بھرا تلاؤ"۔ وہ لہراتے ہوئے دھان کے کھیت۔ وہ چرواہوں کے ریلے اور مدھر برہوں کی تانیں وہ "گودھولی کی بیلا" میں گئوؤں کا سیوان سے پلٹنا وہ جاڑوں میں چھپر کے آس پاس دہکتا ہوا الاؤ۔ وہ گڑ کی سوندھی سوندھی سوگندھ، وہ گرمیوں کی سانجھ کو میدان میں کبڈی۔ وہ گاؤں کی گلیاں وہ اپنا ٹوٹا پھوٹا مٹی اور چھپروں والا گھر اور گھر میں بیٹھی بوڑھی پیاری ماں۔

"ماں — ماں" — دھیرے دھیرے وہ پکارنے لگا۔ — اور اس کا ساتھی سکھو بول اٹھا "کیا بک جھک کر رہے ہو یار"۔

گھورے کچھ نہ بولا، وہ چپکا لیٹا رہا اور صبح سویرے اٹھ کر سیدھے اسٹیشن روانہ ہوا اور ٹکٹ لے کر اپنے دیس، اپنے گاؤں، اپنے رین بسیرے کی طرف چل پڑا۔

دو دن اور ایک رات کے لمبے سفر کے بعد وہ اپنے گاؤں کے اسٹیشن پر اترا اور سیدھے گاؤں کی طرف چل دیا۔ راستے میں شام ہو گئی مگر اس کے پاؤں میں تو پر لگے تھے وہ اڑا چلا جا رہا تھا — وہ اڑا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ٹھیک گودھولی کی بیلا "رین بسیرے کے سمے" وہ بھولا ہوا پنچھی اپنے گاؤں اپنے جھنڈ اپنی جھونپڑی میں پہنچ گیا۔ بوڑھی ماں لپٹ کر رونے لگی — "بیٹا ہمیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے تم۔ ہم تمہیں یاد کر کے رات دن رویا کرتے تھے۔ تمہارا بڈھا دادا تمہاری یاد میں کراہ کراہ کر مر گیا۔ تم نے کوئی خبر نہ لی"۔

گھورے کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے گلوگیر آواز میں بولا "کیا کروں ماں" ٹھاکر کی گالی مار سہی نہیں جاتی۔ نیا خون ہے گالی مار پر کھول جاتا ہے یہاں سے بھاگ نہ جاتا تو بشواش کر ماں نہ جانے میں

کیا کر بیٹھتا - خیریت ہی ہوگئی کہ میں یہاں سے ٹل گیا"- اور تھوڑی دیر ٹھہر کے وہ بولا" ماں! میرے جانے کے بعد تو ٹھاکر نے تم پر اور ظلم ڈھائے ہوں گے اور اب تو ٹھاکر کا دماغ اور خراب ہوگا"- ماں بولی" نہیں بیٹا- اب گاؤں کی کایا پلٹ ہوگئی ہے' اب ایشور ہم پر دیالو ہوگئے ہیں- وہ کہاوت تو نے سُنی ہوگی - گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں - تو بیٹا گھورے ہمارے بھی دن پھرے ہیں - زمینداروں کی وہ اکڑ تکڑ نکل گئی ہے - اور اب ہم نیچ جاتیوں کا مان سمان بڑھ گیا ہے"-

گھورے خوش ہوکر بولا-" یہ کیسے ماں"؟ ماں نے کہا-" پہلے ہاتھ منہ دھو کر کچھ کھا پی لے تب پوری کہانی سُن"-

گھورے جب کھا پی کر کھاٹ پر لیٹا تو ماں بیٹے کے پاس چٹائی بچھا کے بیٹھ گئی اور کہنے لگی -

"بیٹا تیرے جانے کے کچھ ہی مہینے بعد سورج پور کے ٹھاکروں کے خلاف چماروں کی بہت بڑی پنچائت ہوئی جس میں پنچوں نے یہ طے کیا کہ گاؤں کے بڑے ٹھاکر سے صاف صاف کہہ دیا جائے کہ اب ہم دو پیسے پر دن بھر کام نہیں کر سکتے - مہنگی بہت بڑھ گئی ہے - دو چار پیسوں سے کچھ نہ ہوگا - ہم پیٹ پر پتھر باندھ کر بہت دنوں بیگار کر چکے - اب ہم سے بیگار نہیں کی جاتی - مزدوری بڑھاؤ - پیٹ بھر کھانے کو دو تو کام کریں - کھیت جوتیں - کھیت بوئیں - کھیت سینچیں اور کاٹیں - نہیں تو ہم تمہارے کھیت کے پاس نہ جائیں گے - تمہاری کھیتی اجڑ جائے گی - تم اُجڑ جاؤ گے - پر بیٹا ٹھاکر جی اکڑ گئے - ہم نے کام کاج چھوڑ دیا - ٹھاکر کے کھیت سوکھنے لگے - ٹھاکر کی دوری اوسونی بند ہوگئی - ہلواہی سرواہی رُک گئی - اور ٹھاکر کو سانس لینا دوبھر ہوگیا - انہوں نے پہلے تو گھُر کی دھمکی سے کام نکالنا چاہا - پر جنتا کا سنگھٹن بڑھتا گیا - سورج پور کے آس پاس کی ساری جاتی کے بھائی ایک ہوگئے - چماروں - لونیوں پاسیوں اور اہیروں نے مل کر ٹھاکر کا مقابلہ کیا - شہر سے نیتا لوگ موٹروں پر آئے - تنبو تانا گیا - زور زور سے باجے بجائے گئے - لمبا سا باجا تھا بیٹا - اُس کے آگے مُنہ کر کے نیتا بولتے تھے اور بڑے بڑے بیاکھیان دیتے تھے - کہتے تھے" انیائے کے خلاف دلیری سے ڈٹے رہو - ایک دن ایسی گھڑی آئے گی جب ٹھاکر تمہارے آگے سر جُھکا دیں گے"-

اور بیٹا نیتاؤں کے اس بیاکھیان پر خوب تالیاں بجائی گئیں - ایسا جوش ایسا ولولہ ہوا کہ لوگ دیکھ کر دنگ رہ گئے ...... اور بھگوان کا کیا ایسا کہ دیس آزاد ہوگیا تھا - بیٹا جب تو ہمارا یہ سنگھٹن یہ زور بندھا تھا - نہیں تو بدیسی راج میں بھلا کون آنکھ اُٹھا کر دیکھ سکتا تھا بڑے لوگوں کی طرف' بدیسیوں کے جانے ہی سے تو یہ انیائے کرنے والے جیسے بے باپ کے ہوگئے - بالکل اناتھ ــــ"

بوڑھیا نے اک ذرا دم لے کر کہا" ہاں تو ٹھاکر دوڑ کر تحصیلدار' تھانیدار' ڈپٹی اور کلکٹر کے پاس گئے پر کسی نے ان کی نہیں سنی اور سب نے یہی کہا کہ جنتا کا راج ہے - اب بیگار اور سختی نہیں چل سکتی - جنتا سے سمجھوتا کرو - جنتا کی مانگیں پوری کرو - جنتا کو سکھی کئے بغیر تمہارا کام نہیں چل سکتا - سنا تھا کہ ٹھاکر گھبراہٹ اور غصے میں لکھنؤ اور پہاڑ پر دوڑے گئے - پر وہاں سے بھی پلٹائے گئے - تب ٹھاکر نے ہار کر ہم سے سمجھوتا کیا - ہر مزدور کو روزانہ ایک سیر اناج اور پاؤ بھر گُڑ دینے کا بچن دیا تو ان کا کام پھر چل نکلا"-

گھورے نے کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا - تو اب بیگار بالکل نہیں کرنا پڑتی ہے ماں"- ماں نے جواب دیا ــ" ہاں بیٹا اب بیگار ختم ہوگئی - اب ٹھاکر پوری مزدوری دے کر کام لیتے ہیں - وہ بھی ہماری اچھا پر ہے کہ ہم چاہیں تو جائیں چاہیں تو نہ جائیں - اور .... اور .... بھگوان کی کرپا سے چمار ٹولی میں پچھلی سی اداسی اب دکھائی نہیں دیتی - تو خود گھوم پھر کر دیکھنا کہ چاروں طرف کیسی چہل پہل اور سُکھ آنند کا رنگ ہے - اب تو دھا بیر - دسیا - رام دلارے - ماسو اُن کے کاکا' کاکی' بہوئیں' بیٹیاں سبھی لمبی لمبی دھوتی اور ساڑھی پہنے ہوتے ہیں - جسم پر پھٹے پُرانے کپڑے دکھائی نہیں دیتے - لڑکے سر پر سفید لد شیندار ٹوپی پہنتے ہیں - اور سب کے گھر صاف سُتھرے اچھی حالت میں ہیں - ان میں اندھیرا نہیں رہتا - نیم یا سرسوں کے تیل کا دیا نہیں جلتا - اب تو گھر گھر لالٹین جلتی ہے - پڑھائی لکھائی کے لئے اسکول کھل رہا ہے - گاؤں میں آتے وقت تو نے ایک نیا مکان بنتے دیکھا ہوگا ــــ ؟

گھورے بولا" ہاں ماں دیکھا تو ہے وہ ہے کیا"؟

ماں بولی۔ بیٹا وہ اسپتال ہے۔ سرکاری ڈاکٹر آگئے ہیں۔ ٹھاکر کی خالی کوٹھی میں ابھی رہتے ہیں۔ جب اسپتال بن جائے گا تو وہ اسپتال میں چلے جائیں گے"۔

گھورے بولا۔ "یہ تو گاؤں کی کایا پلٹ گئی ماں! زمیندار کی ساری دھونس ختم ہو گئی"۔ ماں نے کہا۔ "سنے جا بیٹے۔ زمیندار کی دھونس ابھی کچھ باقی تھی کہ گاؤں پنچایت کا الکشن ہو گیا۔ اس کے بعد رہی سہی دھونس ختم ہو گئی۔ میں تو بیٹا زیادہ نہیں جانتی پر سنتی ہوں کہ جنتا سرکار نے ایسا قانون بنایا ہے کہ اب گاؤں کے سارے جھگڑے گاؤں والے ہی چکا لیا کریں گے۔ شہر کی کچہری میں جانا نہیں پڑیگا۔ تو اس پنچائت راج کے لئے بہت بڑا الکشن ہوا بیٹا۔ اس الکشن میں پردھان کی جگہ کے لئے ایک ٹھاکر کھڑے ہوئے اور اُپ پردھان کے لئے ایک میاں۔ ان لوگوں نے بڑا زور لگایا اور ٹھاکر اور زمیندار ہوتے ہوئے ایک ایک اہیر، چمار، کوٹری، پاسی، جولاہے۔ دھنیے۔ دفالی کے گھر ووٹ مانگنے گئے۔ انہوں نے بڑی بڑی سبھائیں بلائیں۔ جلسے کئے اور ان میں جنتا سے یہاں تک کہا کہ وہ اُن سے ووٹ کی بھیک مانگتے ہیں وہ ان کی خدمت کے لئے تیار ہیں۔ وہ اُن سے کبھی آنکھیں نہ پھرائیں گے۔ پر ان گنت دلوں کی دبی کچلی، ستائی جنتا نے مل کر کہہ دیا کہ ہم اب ان باتوں میں نہیں آئیں گے۔ ہم کو ابھرنے کی جو یہ سنہری گھڑی ہاتھ آئی ہے اُس سے ضرور فائدہ اُٹھائیں گے۔ سو ہماری چمار ٹولی سے پردھان کے لئے منگل کو اور اُپ پردھان کے لئے جولاہوں کے چودھری عبداللہ کو الکشن میں کھڑا کیا گیا۔ گاؤں کے کل اُونچے ذات کے ہندو اور مسلمان ایک ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنے سارے ووٹ راجپوت اور میاں کو دئے۔ مگر کل اچھوت، اہیر، جولاہے دوسری طرف ہو گئے اور انہوں نے ایکا کر کے اپنے منگل اور اپنے عبداللہ کو ووٹ دئے۔ بیٹا وہ الکشن کا دن بھی کبھی نہ بھولیگا۔ میں بھی ووٹ دینے گئی تھی۔ بس بیٹا ایسی لاگ تھی کہ ہم چماروں نے دن بھر جولاہنیوں کو ڈولی میں بٹھا بٹھا کر ووٹ کے لئے گاؤں کے اسکول میں پہنچایا۔ اور ووٹ دلا کر پھر انہیں گھر پہنچایا۔ دن بھر کسی کو نہ روٹی کا دھیان تھا نہ گھر کا۔ بس دھن تھی تو یہی کہ آج ہمارا برکھوں سے جھکا ہوا سر ایک بار پھر اونچا ہو جائے اور ہم اپنے دیس اپنے گاؤں اور اپنے گھر میں آزادی اور سکھ کی سانس لیں"۔

"پھر نتیجہ کیا ہوا ماں"! گھورے نے کھاٹ سے پاؤں نیچے رکھتے ہوئے پوچھا۔ ماں نے شانتی سے کہا۔

"صبر کر بیٹا بتاتی ہوں۔ الکشن کے دن سانجھ ہوتے ہوتے اسکول کے میدان میں سینکڑوں آدمی اکٹھے ہو گئے۔ میں بھی ایک کنارے کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔ چاروں طرف ترنگی جھنڈیاں لگی تھیں۔ چبوترے پر اُجلا اُجلا فرش بچھا تھا۔ فرش پر تین کرسیاں رکھی تھیں کنارے والی کرسی پر شہر کے کوئی بڑے سرکاری افسر بیٹھے تھے اور سب کی آنکھیں انہیں پر لگی تھیں۔ وہ جب کھڑے ہوئے تو ساری سبھا پر سناٹا چھا گیا۔ کسی کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی جیسے سب نے سانسیں روک لی تھیں۔ افسر نے کھڑے ہو کر مشین کے پاس منہ لے جا کے کہا:۔

"ٹھاکر اور میاں کو منگل چمار اور عبداللہ جولاہے نے سات سو ووٹ سے ہرا دیا۔

"ٹھاکر اور میاں کو ہم نے ہرا دیا ماں"؟ گھورے اُچھل کر ماں کے گلے سے لپٹ گیا۔ مارے خوشی کے اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ ماں نے دھیرے دھیرے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہا:۔

"ہاں بیٹا! اور پھر وہ افسر اونچی آواز میں پکارا:۔

"منگل چودھری اور عبداللہ چودھری ادھر آئیں"۔ اور بیٹا جب وہ دونوں افسر کے پاس پہنچے تو اُس نے بڑے "آدر" سے منگل کو پردھان کی کُرسی پر اور عبداللہ کو اُپ پردھان کی کرسی پر بٹھا دیا۔ بیٹا گاؤں کے اتہاس میں وہ پہلا دن تھا جب ایک چمار کرسی پر بیٹھا اور اتنی بڑی سبھا کے سامنے گاؤں کے سب سے بڑے افسر کے روپ میں بیٹھا ٹھاکر کا سر چکرانے لگا۔ اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ ساری سبھا نے دانتوں میں انگلی دبا لی ــــ سچ پوچھ بیٹا تو ہم سب کا دل بھی دھک دھک کر رہا تھا۔ اتنے میں لاجونتی گیندے کے تین موٹے موٹے ہار لے کر بڑھی اور اپنے منگل اور اپنے عبداللہ اور اپنے سرکاری افسر کے گلے میں اس نے مسکرا کر وہ ہار ڈال دئے تب ساری سبھا نے انقلاب زندہ باد ــــ پنچائت زندہ باد کے نعرے لگائے اور خوب زور زور سے تالیاں پیٹیں اور تالیوں کا شور ایسا ہوا کہ مجھے جان پڑا بیٹا کہ جیسے کہیں بہت بڑی بجلی بن رہی ہے اور اس کی چھت کی گٹی کوٹی جا رہی ہے!!"

رفتارِ زمانہ

کولمبیا یونیورسٹی کی طرف سے پیش کئے ہوئے سب سے بڑے اعزاز کو قبول کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے اپنی تقریر میں دنیا کی سب قوموں سے اپیل کی کہ وہ طاقت کے استعمال سے اجتناب کریں، اور امن کے راستے کو اپنائیں۔ اُنھوں نے کہا کہ بیسویں صدی کی مہذب دنیا کو ابتدائی جنگلی زمانے کے سے طریقے اختیار نہیں کرنے چاہئیں اُنھوں نے اس امر پر تعجب کا اظہار کیا کہ دنیا کی اقوام نے ابھی تک پچھلی دو بڑی جنگوں سے سبق نہیں سیکھا اور تنبیہ کی کہ دنیا کو دو بڑے کیمپوں میں بانٹ کر ہتھیار بند کر دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کشمکش ناگزیر ہو جائے گی۔

اس موقعے پر پنڈت نہرو نے ہندوستان کی خارجی پالیسی کا بھی ذکر کیا اور صاف الفاظ میں یہ بات واضح کر دی کہ ہندوستان کی طرف سے غیر جانبدار رہنے کی پالیسی کے اعلان کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ جب بنی نوع انسان کی آزادی کو چیلنج کیا جائے یا ملک کے امن کے لئے خطرہ پیدا ہو جائے تو اس وقت بھی ہم غیر جانبدار ہی رہیں گے۔ پنڈت جی کی تقریر کا سامعین پر گہرا اثر پڑا۔ اس موقع پر نیویارک کے حکام۔ ماہرین تعلیم اور دیگر یونیورسٹیوں کے کئی برگزیدہ اصحاب کے علاوہ کولمبیا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے والے سو کے لگ بھگ ہندوستانی طالب علم بھی موجود تھے۔

۱۴ اکتوبر کو نیشنل پریس کلب نیویارک کو خطاب کرتے ہوئے ہندوستان کے وزیر اعظم نے کہا کہ "میں یہاں کسی قسم کی سودا بازی کرنے نہیں آیا بلکہ میرے یہاں آنے کا مقصد امریکہ اور اُس کے لوگوں سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔" پنڈت جی نے اخبار نویسوں کو یہ بتایا کہ "میری آمد کا مقصد کسی خاص مسئلے پر بات چیت کرنا نہیں۔ بلکہ میں اپنی خواہش کے مطابق اِس ملک کو دیکھنے آیا ہوں میری یہ رائے ہے کہ پبلک معاملات میں اُلجھا ہُوا ایک انسان تب تک موجودہ دنیا سے صحیح معنوں میں واقفیت حاصل نہیں کر سکتا جب تک وہ امریکہ کو نہ سمجھ لے جو کہ موجودہ دُنیا میں ایک اہم پارٹ ادا کر رہا ہے" تاہم اگر میں یہاں آیا ہوں تو قدرتی طور پر میں سیاسی لیڈروں۔ صنعتی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اور ماہرین سائنس سے ملوں گا۔ یہاں کے سرکردہ اصحاب سے مختلف مسائل پر گفتگو کرنے سے مجھے خوشی ہوگی۔ میری اس بات چیت کا مقصد محض اُن کے نقطۂ نگاہ سے واقفیت حاصل کرنا ہوگا اور اگر ممکن ہُوا تو میں بھی اپنا نقطہ نظر اُن کے سامنے رکھوں گا۔ پنڈت جی نے کہا کہ اگر ہندوستان اور امریکہ میں باہمی تعاون کے لئے وسائل ہیں تو میں اس کے متعلق تحقیق کروں گا اور میری رائے تو یہ ہے کہ باہمی تعاون میں ہی دونوں ممالک کا فائدہ ہے۔

پنڈت نہرو نے کہا کہ آج کل کی دنیا پر امریکہ اور یورپ کا خاص اثر ہے۔ دنیا کے لئے نہ تو یہ ممکن ہے اور نہ اُس کے لئے یہ امر پسندیدہ ہی ہے کہ وہ ایک ہی بات سوچے ایک ہی قسم کا کھانا کھائے اور ایک ہی قسم کی پوشاک پہننے کا پابند ہو کر رہ جائے لیکن غلط یا درست طور پر یہ ضروری ہے کہ دوسرے ممالک کے لوگوں کے متعلق سمجھنے کے لئے وہاں کے حالات سے واقفیت حاصل کی جائے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے پنڈت جی نے ایشیا میں ہندوستان کی فوجی اور صنعتی ہر طرح کی اہمیت واضح کی لیکن اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ انگریزوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد ہندوستان کے دوسرے ممالک سے تعلقات منقطع ہو گئے سو سال سے زیادہ مدت تک ہم اپنے ایشیائی ہمسایہ ممالک سے علیحدہ رہے اور ہمارے اُن کے معاملات لنڈن اور پیرس سے طے کئے جاتے تھے۔ اب سیاسی حالات کی تبدیلی اور ہوائی راستوں کی ترقی سے ہمارے اور دوسرے ایشیائی ممالک کے درمیان جو دیوارتیں وہ قطعی منہدم ہو گئی ہے۔ اب ہندوستان ایشیائی ممالک سے اپنے پرانے دوستانہ تعلقات از سرِ نو بحال کرنا چاہتا ہے

مشہور ماہر خوراک لارڈ بائڈ اور نے اس سوال کے جواب میں کہ کیا
۱۹۵۱ء تک ہندوستان خوراک کے متعلق اپنی ضروریات خود پوری
کر لیگا بتایا کہ اس مدت میں ہندوستان اس حد تک تو خوراک کی کمی کو پورا
کر لیگا کہ باہر سے خوراک کی برآمد میں کمی ہو جائیگی لیکن جس کمی کو پنڈت نہرو
اور میں دونوں پورا کرنا چاہتے ہیں اس میں ابھی خاصہ وقت درکار ہے
اور وہ بھی اس صورت میں جبکہ اُسے اپنی ضرورت کے مطابق مشینری
دستیاب ہو جائے۔ مجھے یقین ہے کہ پنڈت نہرو مشینری کے مہیا کئے
جانے کے متعلق پریذیڈنٹ ٹرومین سے بات چیت کرینگے ہمیں اس
امر کے متعلق پُرامید رہنا چاہئے کہ پنڈت نہرو اپنے مشن میں کامیاب
ہوں گے۔

۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو انڈین نیشنل کانگریس کی ہدایت کے مطابق
ہندوستانیوں نے اپنے دیش کو آزاد کرانے کا حلف لیا تھا۔ اس کے
ٹھیک بیس سال بعد ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء میں ہندوستان آزاد
جمہوری ریپبلک قرار دے دیا جائے گا۔ یہ فیصلہ ہندوستان کی
آئین ساز اسمبلی نے کیا ہے جس کے مطابق اُس دن سے ۱۹۳۵ء
کا انڈیا ایکٹ اور ۱۹۴۷ء کا آزادی ایکٹ ختم سمجھا جائے گا۔
آئین ساز اسمبلی نے آئین کی دوسری خواندگی مکمل کر لی ہے اور
تیسری خواندگی کے لئے اگلے ماہ تک کے لئے اجلاس ملتوی کر دیا
گیا ہے۔

۱۷ اکتوبر کو کانگریس پارٹی کے اجلاس میں بھیم سین سچر وزارت
کے وزیر مالیات ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کو پوربی پنجاب اسمبلی کی کانگریس
پارٹی کا لیڈر منتخب کر لیا گیا۔ اجلاس کے شروع ہونے سے پیشتر
ہی شری سچر نے کانگریس پارٹی کی لیڈرشپ سے اپنا استعفےٰ دے دیا
جو اجلاس میں منظور کر لیا گیا۔ یہ اجلاس سابق وزیر مالیات
چودھری کرشن گوپال دت کی صدارت میں منعقد ہوا اور ۷۹ ممبران
میں ۵۰ نے اس میں شرکت کی۔

ہند اور جاپان میں ایک معاہدے کی رُو سے ہندوستان کی
گھریلو صنعتوں کو فروغ دینے کے لئے جن جاپانی ماہرین کا تقرر کیا گیا
ہے وہ اس ماہ میں بمبئی کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ جاپانی ماہرین
کی یہ پہلی پارٹی سات اشخاص پر مشتمل ہے اور یہ کھلونے بنانے۔ گھر
میں سُوت بُننے اور بانس کی اشیا تیار کرنے کے کام میں ہندوستان
کے صنعت سازوں کی امداد کریں گے۔ ہندوستان کی گھریلو صنعتوں
کے لئے جاپان سے پانچ لاکھ ڈالر کی مشینری خریدنے کا معاہدہ بھی
مکمل ہو گیا ہے۔

۱۴ اکتوبر کو فرانس کی نیشنل اسمبلی نے لگاتار ۱۵ گھنٹے کی
بحث کے بعد ۵۶ سال کے سوشلسٹ لیڈر موسیو جولیس موچ
کو فرانس کا وزیر اعظم مقرر کر دیا ہے۔ موسیو موچ کو ۳۱۱ ووٹ
حاصل ہوئے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وزیر اعظم منتخب
ہونے کے لئے کم سے کم جتنے ووٹوں کی ضرورت ہوتی ہے موسیو موچ
کو اس سے صرف ایک ووٹ زیادہ ملا۔ اُن کے وزیر اعظم منتخب ہو
جانے سے فرانس میں اس وزارتی ڈیڈلاک کا خاتمہ ہو گیا جو ریڈیکل
وزیر اعظم ہنری کیولی کے مستعفی ہو جانے پر ۴ اکتوبر ۱۹۴۹ء سے
چلا آ رہا تھا۔ یاد رہے کہ ہنری کیولی نے مزدوروں اور قیمتوں کے جھگڑے
پر وزارت عظمیٰ سے استعفےٰ دیا تھا۔ موسیو موچ کو جو اتنے کم ووٹ ملے
اُس کی وجہ کمیونسٹوں کی طرف سے اُن کی مخالفت ہے۔

یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو نے امریکن ریڈیو کے مُبصّر کو ایک
انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ یوگوسلاویہ پر کسی فوجی حملے کا نتیجہ دنیا کی تیسری
بڑی جنگ کی صورت میں رونما ہوگا۔ اسی انٹرویو کے دوران میں مارشل
ٹیٹو نے روس اور یوگوسلاویہ کے جھگڑے کی تمام تر ذمہ داری مارشل
اسٹالن پر عاید کی اور کہا کہ ہم ہر حملے کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

ریاست حیدرآباد کے مستقبل اور اُس کے ہندوستان کے
ساتھ تعلقات کا فیصلہ کرنے کے لئے ماہ جنوری میں ریاستی آئین
ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوگا۔ مسلمانوں۔ اچھوتوں اور قبائلی
جماعتوں کی نشستوں کا تعین اُن کی آبادی کے لحاظ سے کیا جائے گا۔
جنوری میں جو انتخابات کرائے جائیں گے اُن کے ابتدائی مراحل بڑی
تیزی سے طے کئے جا رہے ہیں۔ فہرست ہائے رائے دہندگان ہندوستان
کے بڑے بڑے پریسوں میں چھپوائی جا رہی ہیں اور چھپی ہوئی فہرستوں کو
الیکشن کمشنر کے دفتر میں اکٹھا کیا جا رہا ہے۔

اعلان

۱

یکم دسمبر ۱۹۴۹ء سے «آجکل» نیم ماہی کی جگہ پھر ماہانہ کر دیا گیا ہے۔ یعنی یکم دسمبر کے بعد آئندہ پرچہ یکم جنوری ۱۹۵۰ء کو شائع ہو گا۔

«آجکل» کے ماہانہ ہو جانے سے اسکی قیمت میں بھی کچھ تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ ناظرین نوٹ فرما لیں۔ جن خریدار حضرات کا ششماہی یا سالانہ چندہ دفتر میں موجود ہے ان کا چندہ اب نئے حساب سے شمار ہو گا۔

ماہانہ کر دئے جانے کے بعد آجکل کے ایک پرچے کی قیمت آٹھ آنے ہو گی۔ اسی طرح سالانہ قیمت چھ روپے اور ششماہی قیمت تین روپے کر دی گئی ہے۔

۲

دسمبر ۱۹۴۹ء سے پبلیکیشنز ڈویژن کے زیر اہتمام شائع ہونے والے دو ماہانہ جرائد «بساط عالم» اور «وبہار» کی اشاعت منسوخ کر دی گئی ہے۔ جن خریدار حضرات کی چندے کی رقوم ان دو رسائل کی خریداری کے سلسلے میں دفتر کے پاس جمع ہیں ان کی بقایا رقوم «آجکل» کے چندے کے طور پر شمار کر لی جائیں گی اور جنوری ۱۹۵۰ء سے «آجکل» ان کے نام جاری کر دیا جائے گا۔

بزنس مینیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd No. D.—21.
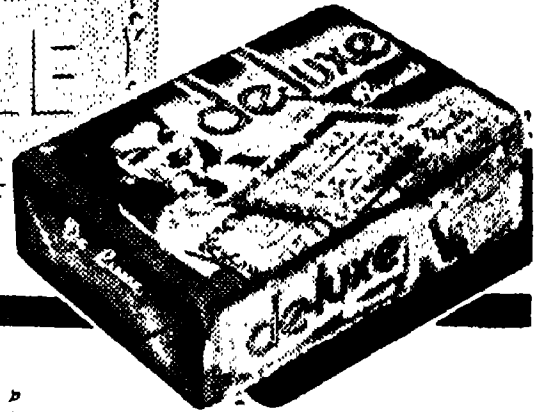
دسمبر ۱۹۴۹ء

آٹھ آنے

سردار پٹیل براڈ کاسٹنگ ھاؤس میں

۱۴ نومبر کو سردار ولبھ بھائی پٹیل نے قوم کے نام ایک بھاشن براڈ کاسٹ کرتے ہوئے یہ اپیل کی کہ ہر شخص کو سرکار کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔ آپ نے کارخانہ داروں اور مزدوروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ خاص طور پر سرکار سے تعاون کریں اور ہر کام قومی خدمت کے نقطۂ نگاہ سے کریں۔

تصویر میں (بائیں سے دائیں) شری بی۔ پی۔ بھٹ سٹیشن ڈائریکٹر دہلی، سردار پٹیل، مہاراج نکندر سنگھ ڈپٹی سیکرٹری منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ اور شری این۔ اے۔ ایس۔ لکشمن ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو۔

اُردو کا مقبولِ عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد
بلونت سنگھ

جلد ۸ ـــــــــ نمبر ۸

سالانہ چندہ ـــــــــ چھ روپے
فی پرچہ ـــــــــ آٹھ آنے

دسمبر ۱۹۴۹ء

ترتیب

سرورق - کرگل اور لداخ کی وادی کو لٹیروں سے آزاد ہوئے ایک سال ہو گیا- ۱۱ نومبر ۱۹۴۹ء کو اس آزادی کی سالگرہ منائی گئی- تصویر میں لداخی سازندے فوجی جوانوں اور وادی کی سول آبادی کے سامنے اپنا کمال دکھا رہے ہیں-

پبلکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ڈاکٹر ذاکر حسین

ہند اور کشمیر کا ناتا

کشمیر سے ہمارے تمدنی رشتے کوئی کیسے گنوائے، جس ساتھ پر صدیوں پر صدیاں گذر گئی ہوں، جو ساتھ خالی جغرافیائی ساتھ نہ ہو خالی حکومت کا ساتھ نہ ہو۔ بلکہ جس میں ہم دونوں کی، ہندوستان اور کشمیر کی تمدنی زندگی کا رواں رواں بندھا ہوا ہو، جو خوشی اور رنج، آلام اور مصیبت سکھ دکھ کا ساتھ رہا ہو۔ اس کی تفصیل چند منٹ میں کیسے بیان ہو جائے؟

میں نے ابھی کہا کہ یہ رشتہ خالی جغرافیائی رشتہ نہیں ہے جغرافی رشتے قدرتی تو ہوتے ہیں مگر اتفاقی بھی ہوتے ہیں۔ آدمی کے ارادے کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا۔ قدرت شیر اور بکری کو ایک ہی جنگل میں پیدا کر دیتی ہے۔ اور زور اور کمزوری کا تماشا دیکھتی ہے۔ اور اس تماشے میں اخلاقی اصول کی پابندی کا بھی خیال نہیں کرتی۔ آدمی کا خاصہ ہے کہ اپنی سوجھ بوجھ سے ایسے مسئلوں کا حل نکالتا ہے۔ ناکام ہوتا ہے تو پھر کوشش کرتا ہے۔ ایک ڈھنگ سے یہ حل نہیں ہوتے تو دوسرے ڈھنگ سے آزماتا ہے۔ اور اسی اُدھیڑ بن میں تمدنی زندگی کی بنیادیں ڈال لیتا ہے۔ تمدنی رشتوں میں بندھے ہوئے آدمی آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ریشمی دھاگوں سے جڑے ہوتے ہیں۔

پھر حکومت کا رشتہ بھی زیادہ توجہ کے قابل رشتہ نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ حکومت انسانی، تمدنی جز ہے۔ مگر اس کا کام کبھی کبھی خالی زور پر چلتا ہے۔ اچھے آدمیوں میں تو حکومت ضرور اچھے تمدن کی ضمانت ہوتی ہے مگر آدمی کا حال تو آپ جانتے ہی ہیں۔ اچھا ہے تو فرشتوں سے اونچا ہے جہاں گرا تو جانوروں سے نیچے جا پہنچا۔ چنانچہ کبھی حکومت کے رشتے غلامی کے رشتے بھی بن جاتے ہیں۔ آقا اور غلام کو ایک دوسرے جوڑنے والے رشتے یعنی ایسے رشتے جو انسان کی شرافت، انسان کی خودداری۔ انسان کی آزادی روح کی نظر میں بس توڑ پھینکنے ہی کے رشتے ہوتے ہیں۔ ہاں جو رشتے آپس کے رہن سہن، میل جول، مل کر کچھ بنانے، مل کر کچھ بگاڑنے، مل کر سوچنے، مل کر کام کرنے، مل کر سیکھنے اور سکھانے سے پیدا ہوتے ہیں وہ سچے رشتے ہوتے ہیں، پائیدار رشتے ہوتے ہیں۔ اور جب صدیوں تک یہ رشتے بنتے اور بڑھتے رہتے ہیں تو پھر یوں جڑ جاتے ہیں جیسے گوشت سے ناخن جڑا ہوتا ہے۔ کشمیر اور ہندوستان کے رشتے ایسے ہی رشتے ہیں۔

اس کا تو وقت نہیں کہ کشمیر اور ہندوستان کے ان رشتوں کی فہرست بیان کروں، مگر یہ بات ظاہر ہے کہ تاریخ کے دھندلکے سے لے کر حال کے روز روشن تک جہاں نظر ڈالئے یہ رشتے موجود ملتے ہیں۔ ویدک عہد میں دیکھئے، جو تصور کائنات، جو فلسفۂ حیات ہندوستان کے اچھوں اور نیکوں میں رائج تھا، اس میں کشمیر کے اچھے بھی ہمارے شریک تھے۔ اللہ واحد، ایکم پُرش وشواکرمن۔ پرجاپتی، تد کے سامنے اس کی اور ہندوستان کی گردن ساتھ ساتھ جھکی ہے۔ نظام عالم میں قانونِ اخلاق کے کامل تسلط پر یہ دونوں ہم نوا ہیں۔ اس دنیا کو دونوں مرضی الٰہی کا ظہور مانتے ہیں۔ اور اس قانون کلم میں ساری کائنات کو جکڑا ہوا جانتے ہیں۔ قدرت کے کرشموں، دیوتاؤں کی ہستیوں، رسموں اور عبادتوں سب کو دونوں اس عالمگیر قانون کا پابند سمجھتے ہیں۔ جیسے ہم ویسے وہ۔ جب ہم ہندوستان والوں نے اس قانون کے تقاضوں کو اپنی سمجھ کے مطابق سماج کی زندگی پر نافذ کیا۔ اور سماج کی چہار گانہ تقسیم کی تو یہ ورن آشرم دھرم ہندوستان کی طرح کشمیر کا بھی امتیازی نشان بن گیا۔ ہم نے بے لاگ عمل اور نتیجوں سے نظر ہٹا کر فرض کو انجام دینے کا مسلک اختیار کیا۔ تو کشمیر نے بھی اسی کو اپنایا جب ہم نے ایک زندہ عقیدے کو رسم و رواج کی پست سطح پر پہنچا دیا۔ اور اپنی ذمہ داریوں کا جوا پجاریوں کی گردن پر رکھ دیا تو اس روگ میں بھی کشمیر ہمارا ساتھی رہا۔ جب ہمارے اس روگ کو دور کرنے کے لئے گوتم بدھ

نے اپنا پیام دیا۔ تو کشمیر نے بھی جوش کے ساتھ اس کو لبیک کہا۔ کشمیر صدیوں
ہندوستان کی طرح گوتم بدھ کا حلقہ بگوش رہا۔ چین سے جو بدھ سیاح ہندوستان
کی زیارت کو آتے تو وہ بھی شی می اور کیا چی می لو یعنی کشمیر کو نہیں
بھولتے۔ اور پھر اس یکدل غریبی کو کیا کہیے کہ یہاں برسوں کو رہ پڑتے ہیں۔
اور ایک صاحب تو مصداق آتے ہیں۔ ہر بھجن بیتن کیا سس راجہ کے
ہاتھی سدھانے کا کار کرنے لگتے ہیں۔ ہم بدھ مت کو بدلتے ہیں تو یہ بھی اس
کی شکل بگاڑ لیتا ہے۔ اس کی اصل روح کو مسخ کرتا ہے۔ مغز کو چھوڑ کر چھلکے کے
پیچھے پڑتا ہے۔ اس کے صاف و شفاف پانی میں توہم پرستی کا میل ملاتا
ہے۔ اور پھر اصلاح شدہ ہندومت کا زور شروع ہوتا ہے۔ یہاں
بھی۔ وہاں بھی پریاگ کے میدان میں ہرش وردھن بدھ سوریہ اور مہیشور
کی پوجا ساتھ ساتھ کرتا ہے۔ اور کشمیر کی وادی میں بھی بدھ سنگھ آراموں
کے پہلو بہ پہلو ہندو دیوتاؤں کے مندر بھی بنتے ہیں۔ ہندومت پھر ابھرتا
ہے۔ یہاں بھی۔ وہاں بھی۔ شری شنکر اچاریہ نے سارے ہندوستان کو
اپنے گیان کی گہرائی اور اپنے ویدانتک فلسفے کے پھیلاؤ سے فیض پہنچایا
تو کشمیر کی فضا میں بھی ان کی آواز گونجی۔ شری رامانج نے جب ویدانت
میں بھگتی کا پیام سمویا۔ ویدک ادب میں غیر ویدک پنچ راتر کو ملایا۔ اچاریہ
ابھیمان نے اطاعت شیخ کا رستہ دکھایا تو وہ بھی اپنا تحفہ ہندوستان کو
دے کر یہیں رک گئے۔ کشمیر کی یاترا انھوں نے بھی کی۔ جنوبی ہند میں
شیوائی مسلک پھیلا تو اس کے رشتے بھی صاف کشمیر سے جڑے
دکھائی دیتے ہیں۔

تمدن ہندوستانی کے جمود کو حرکت دینے۔ اس کو سیاسی اور تمدنی
وحدت بخشنے کے لئے جب قدرت نے اسلامی عنصر کو ہندوستانی زندگی کا
جز بنایا تو کشمیر بھی اس کے اثر میں آگیا۔ اور اثر پذیری اور اثر اندازی کا
لین دین علم و عمل میں، فن و ہنر میں سیکھنے سکھانے کا بیوپار صدیوں جاری
رہا۔ ہم نے ابھی کہا تھا کہ حکومت کا رشتہ کبھی کبھی خالی زور کا رشتہ
بھی ہوتا ہے اور اس حالت میں تمدنی اعتبار سے بنجر کی سی حیثیت رکھتا
ہے۔ لیکن جب یہ اونچی قدروں کا حامل اور محرک ہوتا ہے تو ساری تمدنی
کوششوں کو اس سے چار چاند لگ جاتے ہیں۔

تاریخ پر نظر ڈالیے تو پندرھویں صدی میں ایک شخصیت کشمیر میں
دکھائی دیتی ہے۔ جو ہندوستان کے مستقبل کے لئے مشعل راہ کی حیثیت
رکھتی ہے۔ جس نے پانسو برس پہلے وہ کرنا چاہا جو کشمیر کے دو سپوت جواہر لال
نہرو اور شیخ عبداللہ آج کرنا چاہ رہے ہیں۔ یہ شخصیت ہے سلطان
زین العابدین کی جس کو کشمیر کا بچہ بچہ آج بھی بادشاہ کی حیثیت سے نہیں
فقیر و ولی کی حیثیت سے یاد کرتا ہے۔ اور سلطان زین العابدین کہہ کر نہیں
بڈشاہ کہہ کر پکارتا ہے۔

ہندو مسلم کو ایک ریاست میں ایک سیاسی زندگی دینے کا کام اس
فقیر سلطان نے شروع کیا تھا۔ اور بڑی خوبی اور کامیابی سے انجام دیا تھا
ابھی کشمیر پر دہلی کا اثر نہ ہوا تھا۔ دہلی خود اس اہم مسئلے کے حل کی تلاش میں
تھی۔ حکومت کی ہندو کو اور کسی جگہ عوام کی مرضی پر چھا جانے کا مسئلہ۔ ہندو مسلم
کی تفریق مٹا کر باہمی یک جہتی پیدا کرنے کا مسئلہ، ہماری سیاست کا سب
سے اہم مسئلہ تھا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم کارنامہ اسی سلطان زین العابدین
کا ہے۔ یوں تو وہ ہر لحاظ سے بڑا بادشاہ تھا۔ اس نے کشمیر کے مادی وسائل
منظم طور پر بڑھائے۔ کاغذ بنانے کی صنعت شروع کی۔ ہندوستان کے
قلمی کتابوں کے ذخیرے اس فیض کو ظاہر کرتے ہیں۔ جو اس صنعت نے علم کو
پہنچایا۔ ریشم کی صنعت کو فروغ دیا۔ شال بافی کی بنیاد ڈالی۔ ہندوستان
کے ہر خوشحال گھر میں کشمیری شالوں کا کوئی نہ کوئی نمونہ اس فقیر بادشاہ کی
یاد آج تک تازہ کرتا ہے۔ طرح طرح کے میوے دار درخت باہر سے منگا
منگا کر اس نے کشمیر میں لگوائے۔ نہریں کھدوائیں۔ اور ان مادی برکتوں
کے ساتھ ساتھ اس نے مذہبی بے تعصبی اور رواداری کی وہ روایتیں قائم کیں
جو آج بھی ہندوستانی سیاسی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔ جب یہ تخت پر بیٹھا
تھا تو اس کے پیش رو سکندر کے ظلم و ستم سے زچ ہو کر برہمنوں کی ایک بڑی
تعداد کشمیر چھوڑ کر باہر جا چکی تھی۔ اس نے ان سب کو واپس بلایا۔ ان کے ساتھ
محبت کا سلوک کر کے ان کے دلوں کو موہ لیا۔ سرکاری عہدوں اور کاموں
میں اس نے دین و مذہب کا فرق بالکل مٹا دیا۔ پھر تو پنڈتوں نے فارسی اس
توجہ سے سیکھی کہ شاعری، انشا پردازی، لغت نویسی میں آج تک فارسی پڑھنے
والے ان کے زیر بار احسان ہیں۔ فارسی ایسی عام ہوئی کہ سارے ملک کی
تہذیبی زبان بن گئی۔ ذہنی طور پر ہندو مسلمانوں کو قریب لانے کے لئے اس
نے بہت سی سنسکرت کتابوں کے ترجمے فارسی میں کرائے۔ موسیقی کے بڑے

بڑے ماہر ہندو اور مسلمان دور دور سے آکر اس کے دربار میں جمع ہو گئے۔ اور سچ یہ ہے کہ اسی نے اس کام کا آغاز کیا جو بعد کو زیادہ بڑے پیمانہ پر اکبر اعظم نے کرنا چاہا۔ اور جو آج بھی ہندوستانی سیاست کا مرکزی اور بنیادی تصور ہے۔

جب کشمیر مغلوں کو ملا تو اس کے ساتھ رواداری اور بے تعصبی، ہنر پروری اور علم دوستی کی یہ روایتیں بھی انھیں ورثہ میں ملیں کیونکہ مغلوں کے زمانے میں بھی ہندوستان سے بہت کچھ پایا اور ہندوستان کو بہت کچھ دیا۔ مادی وسائل کو ترقی دینے کا کام برابر جاری رہا۔ پھل کے درخت خوشنما اور خوشبودار پھل جگہ جگہ سے لائے گئے۔ جگہ جگہ سے کاریگر لاکر بسائے گئے۔ علم و ہنر کی ہمت افزائی دل کھول کر کی گئی۔ آئینِ اکبری میں اکبری دربار کے مصوروں کے نام پڑھو۔ تیموری نام کے باقی رہنے والے نمونہ میں مصوری کے شاہکاروں پر مصوروں کے نام تلاش کرو تو ایک دو نہیں بہتیرے کشمیری نام پاؤ گے۔ اس کے بعد جہانگیر تو کشمیر پر عاشق تھا۔ اس سرزمین کا چپہ چپہ اس کا ایک ایک درخت، ایک ایک پھول، ایک ایک چڑیا اس کا ایک ایک دل کش منظر اس کے قلب حسن شناس پر نقش سا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کس جگہ کا منظر کس وقت بہترین ہوتا ہے۔ ویری ناگ، اچھہ بل، نسیم باغ، شالامار آج بھی اس کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مرتے وقت بھی ویری ناگ کو یاد کرتے ہوئے جان دی۔ اس شاہی توجہ، محنت اور انہماک نے کشمیر کے علم و فن کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ اور شاعری، نقاشی، خطاطی، گلکاری اور سونے چاندی کے کام میں، کپڑے اور لباس کے معاملے میں کشمیر سارے ہندوستان کے لئے معیار بن گیا تھا۔

اپنی بدکرداریوں، غفلتوں، تن آسانیوں اور بد دیانتیوں سے جب آزادی کی دولت ہماری قوم نے کھودی اور ہمارا عزیز دیس غلامی کی مصیبت میں مبتلا ہوا تو اس ذلت کی تلخی بھی ہم دونوں نے، ہندوستان اور کشمیر نے، ایک سی چکھی۔ شمع آزادی کے گل ہونے کے بعد کیسی بھیانک رات تھی۔ وہ غلامی کی رات اور کیسی لمبی رات تھی۔ وہ منافق پستیوں کی کیسی گھٹا جھکی ہوئی تھی۔ سروں پر اس رات میں وطن فروشی کے عفریتوں، خود غرضی کے ہنگاموں سے کیسی بھری ہوئی تھی۔ وہ گھٹا ٹوپ رات۔ جھوٹ فریب، نفاق کی کیسی زہریلی ہوائیں پھیلی ہوئی تھیں اس رات میں۔ اُف کیسے وہ رات گھٹ دم کی اولاد پر راتیں بھی آتی ہیں اور وہ ایسے جیسے تیسے سحر کرتی ہے۔ لیکن اس رات کی سحر آپ سے آپ نہیں آتی۔ اس کے سوتوں کو سوتے میں آکر خود نہیں جگاتا۔ جاگ جاگ کر اسے سحر کرنا ہوتا ہے۔ بہت تو سوتے ہیں پر کچھ جاگتے بھی رہتے ہیں۔ احساس کو اپنے دل کے ٹمٹماتے چراغوں سے اس کی اندھیاری میں روشنی پیدا کرنی ہوتی ہے۔ اور اس دھیمی روشنی کی لو کو طوفان سے بچانے کے لئے جان جوکھوں میں ڈال کر جتن کرنے ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے سپوتوں نے اپنے دیس کی اس رات کو اپنا تن من دھن سب کچھ تج کر سحر کیا۔ تو کشمیر والوں نے بھی اس میں کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بلکہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں جو کام کانگریس نے کیا اور سچ تو یہ ہے کہ سب کچھ اس نے کیا۔ اس میں بھی کشمیر کا حصہ حصہ رسدی سے زیادہ ہی ہے۔ کانگریس کی صدارت کی کرسی پر جو لوگ رونق افروز ہوئے یعنی جن بزرگوں کے سر پر یہ کانٹوں کا تاج رکھا گیا ان میں ہر آٹھ میں سے ایک کشمیری ہوا ہے۔ کشمیر اور ہندوستان دونوں جگہ سیاسی قیادت کا فرض کشمیر ہی کے دو سپوت انجام دے رہے ہیں۔ اور اس طرح انجام دے رہے ہیں کہ ان پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ ایک کشمیری ہی آج ہندوستان کا وزیر اعظم ہے۔ ہندوستان میں سب کی آنکھوں کا تارا۔ ایک نئی ابھرتی جمہوریت میں سچی اور اچھی بات کا سہارا۔ سچ کی کڑواہٹ سے نہ گھبرانے والا، مصیبت اور رہنمائی میں سب کے کام آنے والا۔ وہ جس کی بے لاگ صفائی، جس کی بے باک سچائی، اچھائیوں کے لئے جس کی بے صبری، برائیوں سے جس کی بیزاری، جس کی دیانت، جس کی دلیری ہمارے دیس کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ اور کشمیر نے خود اپنے لئے پیدا کیا۔ ایک قافلہ سالار۔ خدمت گذار شیخ محمد عبداللہ۔ جس نے کشمیریوں کو ایک امید بخشی۔ ان میں خود اعتمادی پیدا کی۔ اُن کے دلوں کو گرمایا۔ اور اپنے خلوص اور اپنی قربانی اور اپنی محنت سے خدمت گذاروں کا ایک گروہ، اپنی قوم میں طیار کر دیا۔ جس نے اپنی سعی پیہم سے قوم کو اُس آئیڈیل کے حصول کے در پر لا کھڑا کیا۔ ان دونوں جواں ہمت شخصیتوں کا باہمی ربط و اتحاد۔ ان کا اشتراک عمل اس وقت کشمیر اور ہندوستان کا سب سے بڑا قومی رشتہ ہے۔ جس کا پرتو ہر ہندوستانی اور ہر کشمیری کے دل و دماغ پر پڑ رہا ہے۔ یہ دونوں اپنی جگہ ہماری سیاسی زندگی کے بنیادی مسئلے کو حل کر رہے ہیں یعنی ایک عمومی جمہوریت کے قیام کے لئے جس میں مذہب کا فرق حقوق شہریت پر اثر انداز نہ ہو۔ یہ دونوں وہ کر رہے ہیں جو قوموں کے بڑے بڑے معمار کیا کرتے ہیں۔

ان کی کامیابی ہماری قومی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی ہوگی۔ ہر ہندوستانی اور ہر کشمیری اس مقصد کے حصول میں اُن کا ساتھی ہے۔

محمد حبیب اللہ رشدی

وحید الدین سلیم پانی پتی

پروفیسر سید وحید الدین سلیم پانی پتی مرحوم عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے اردو ادب کے اوّلین پروفیسر تھے - اور شاید وہ سارے ہندوستان میں اردو کے اوّلین پروفیسر ہوں۔ کیونکہ عثمانیہ یونیورسٹی کے عالم وجود میں آنے تک ہندوستان کی کسی یونیورسٹی میں دیسی زبانوں کی تعلیم کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی جو اس زمانے میں اسے حاصل ہے اکثر بڑے بڑے کالجوں میں اردو پڑھانے والے کم تنخواہ یاب مولوی صاحب ہوتے تھے جن کی ان تعلیمی اداروں میں کوئی اہمیت نہیں تھی - عثمانیہ یونیورسٹی ہندوستان میں ایک نیا تعلیمی تجربہ تھا جس میں تمام علوم کی تعلیم بجائے انگریزی دیسی زبان میں دی جاتی تھی -

اردو میں علوم و فنون پر کوئی سنجیدہ کتاب موجود نہیں تھی - اس لئے اس یونیورسٹی کی تعلیم کا آغاز ہونے سے پہلے نصاب کی کتابیں تیار کرنے کے لئے ایک دارالترجمہ قائم کیا گیا تھا جس کے ناظم بابائے اردو' مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو بنائے گئے تھے - نصاب کی کتابوں کی طیاری کے سلسلے میں وضع اصطلاحات کے مشکل مسئلے سے دوچار ہونا لازمی امر تھا - اردو میں تو علمی ذخیرہ موجود ہی نہیں تھا' اصطلاحات کہاں سے آتیں ؟ نصاب کی کتابیں انگریزی سے ترجمہ کی جانے لگیں - مگر اس سے پہلے اصطلاحات کا طے کر لینا ضروری تھا - اس لئے وضع اصطلاحات کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی - اصطلاحات بنانے کے اصول کے متعلق دو فریق تھے جن کی رائیں مختلف تھیں - قدیم طرز کے عربی فارسی کے اساتذہ یہ چاہتے تھے کہ اصطلاحات کا بڑا ذخیرہ عربی اور فارسی میں موجود ہے' وہ لے لیا جائے - اور نئی اصطلاحیں قدیم اصطلاحوں کے نمونے پر عربی اور فارسی سے وضع کی جائیں - دوسرا گروہ انگریزی داں پروفیسروں کا تھا جو عموماً عربی اور فارسی پر عبور نہیں رکھتے تھے - وہ کچھ تو اپنی ناواقفیت اور کچھ سہل انگاری کی بنا پر یہ کہتے تھے کہ انگریزی اصطلاحیں جوں کی توں لے لی جائیں - اس سے وہ یہ فائدہ بتاتے تھے کہ ایک تو طلبہ کو ان فنون کی انگریزی کتابوں کے پڑھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے میں آسانی ہوگی دوسرے یہ کہ علمی اصطلاحوں کے باب میں اردو بھی یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں کے مماثل ہو جائیگی - یعنی اصطلاحیں سب کی مشترک رہینگی -

ان دونوں گروہوں میں سخت اختلاف تھا - ایسے موقع پر مولوی وحید الدین سلیم کی سال ہا سال کی غور کردہ رائے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا - مولوی عبدالحق صاحب کو اس کا علم تھا کہ اس باب میں مولوی سلیم صاحب ایک خاص رائے رکھتے ہیں - اگر وہ رائے تسلیم کر لی گئی تو اصطلاحات کا مسئلہ نہ صرف آسان ہو جائیگا بلکہ اردو زبان و ادب میں ایک نیا عنصر دلیرانہ داخل کیا جا سکے گا - چنانچہ مولوی عبدالحق نے مولوی سلیم کو اس کام کے لئے انجمن ترقی اردو کی طرف سے حیدرآباد بلایا اور انہیں ترغیب دی کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کو کتابی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کریں - چنانچہ وہ کتاب "وضع اصطلاحات" کے نام سے انجمن ترقی اردو سے شائع ہوئی -

مولوی سلیم صاحب کی اس باب میں خاص رائے یہ تھی کہ اردو بنیادی طور پر آریائی زبان ہے اس لئے اس میں سامی زبانوں کی طرح ایسے سانچے موجود نہیں ہیں کہ کسی لفظ کے مادے کو ان سانچوں میں ڈھال کر نئے خیال کے لئے نیا لفظ بنایا جا سکے' جیسا کہ عربی زبان کا خاصہ ہے - اس لئے ہمیں چاہئے کہ ہم اردو زبان کے آریائی اصول پر نظر ڈالیں اور ان کے مطابق نئے الفاظ اور اصطلاحیں بنائیں مثلاً اردو میں شرم سے شرمانا' گرم سے گرمانا' نرم سے نرمانا وغیرہ بیسیوں مصادر اور الفاظ رائج ہیں جن کا اصول یہ ہے کہ کسی اسم

یا صفت پر علامت مصدر "نا" یا "انا" لگا کر مصدر بنا لیا جاتا ہے اور پھر اس مصدر سے مختلف اسما یا صفات بنائے جاتے ہیں مثلاً نرمانا سے نرماؤ۔ نرماہٹ وغیرہ۔

اس اصول کو اختیار کر کے ہم سینکڑوں ہزاروں نئے مصادر بنا سکتے ہیں۔ مثلاً ELECTRIFY کے لئے لفظ برق سے برقانا یا MAGNATISE کے لئے لفظ مقناطیس سے مقنانا وغیرہ وغیرہ۔ پھر ان مصادر سے حسب ضرورت اصطلاحی الفاظ وضع کئے جا سکتے ہیں مثلاً برقانا سے برقاؤ وغیرہ

دوسرا خیال مولوی سلیم صاحب کا یہ تھا کہ آریائی زبانوں میں دو مختلف الفاظ کو فارسی اضافت کے بغیر ترکیب دے کر ایک اصطلاح بنا لی جاتی ہے۔ ایسی اصطلاحیں اردو میں بہت عام ہیں مثلاً پن چکی۔ گھنٹہ گھر وغیرہ وغیرہ۔ یہی اصول علمی اصطلاحات کے لئے بھی اختیار کر لیا جائے تو ہزاروں نئے الفاظ اور اصطلاحیں بہ آسانی بنا لی جا سکتی ہیں۔ البتہ جس طرح بعض مروجہ اصطلاحوں میں الفاظ کے ٹکراؤ سے بعض حروف گر جاتے ہیں اسی طرح ہم بھی ضرورت ہو تو ایک دو حرف گرا کر مرکب لفظ سے نئی اصطلاح بنا لیں۔ مثلاً

کے لئے عربی اصطلاح "علم قوت ما" (یا نی کی قوت کا علم) ہے۔ مولوی سلیم کے لحاظ سے اس اصطلاح کی پہلی منزل "قوت ما" (بغیر اضافت) ہو گی پھر قوت کی ت حذف کر کے علم کا مفہوم ادا کرنے کے لئے "یات" کا لاحقہ لگا یا جائے تو لفظ "قوماثیات" بنا جو ایک خوشنما اور آسان اصطلاح ہو گی۔ اس اصول پر انہوں نے سینکڑوں ہزاروں اصطلاحیں بنائی ہیں جو وقتاً فوقتاً رسالہ اردو میں شائع ہوتی رہیں۔

مولوی سلیم صاحب کی یہ رائے اٹل تھی۔ وہ بڑے شد و مد سے اپنی اس رائے کی صحت منوانے کی کوشش کرتے تھے۔ پہلے کے دونوں گروہ مولوی سلیم کی اس رائے کی شدید مخالفت کرنے لگے مگر اس کی تردید میں منطقی دلائل پیش نہیں کر سکتے تھے

اس طرح پروفیسر سلیم نے اپنے مدۃ العمر کے تجربے اور غور و فکر کے نتیجے سے اصطلاحات کے باب میں نہ صرف اردو ادب کو ایک نیا راستہ دکھایا بلکہ عجب نہیں کہ مستقبل قریب میں ان کا یہ نقطہ نظر ہندوستان کی دوسری دیسی زبانوں کے لئے بھی اختیار کر لیا جائے عثمانیہ یونیورسٹی میں اگرچہ اس رائے پر کلیتہً عمل نہیں کیا گیا پھر بھی ان کی بہت سی اصطلاحیں قبول کر لی گئیں۔

مولوی سلیم کو نئی اصطلاحیں اور نئے الفاظ بنانے کا خاص شوق اور ملکہ تھا۔ وہ خود ایک موقعہ فرماتے تھے کہ "والنٹیئر" اور "سب میرین" کے لئے اردو میں الفاظ موجود نہیں تھے انہوں نے اخبار کی ایڈیٹری کے زمانہ میں ان کے لئے "رضاکار" اور "آبدوز کشتی" کی اصطلاح وضع کی جن کا آج اردو میں عام رواج ہو چکا ہے۔ یہی دو نہیں انہوں نے ایسی بیسیوں اصطلاحیں رائج کیں جن کے واضع کا کسی کو پتہ نہیں۔ اصطلاحوں کے علاوہ وہ اپنے زمانے کے مروجہ عام ناموں سے بھی اکتائے ہوئے تھے۔ وہ مردوں اور عورتوں کے نئے نام رکھنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ اسمائے اشخاص کے لئے بھی وہ بلا اضافت دو لفظی مرکبات کا اصول تجویز کرتے تھے مثلاً نسیم صبحی۔ شمیم زہری وغیرہ وغیرہ۔ وہ اپنے دوستوں کے بچوں کے نام اسی نمونے پر رکھتے تھے۔ آج بیس پچیس سال کے بعد ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ مولوی سلیم کی تجویز کے مطابق سیکڑوں نام رائج ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اس قسم کے مردانہ اور زنانہ ناموں کی دو طویل فہرستیں بنا رکھی تھیں۔ اگر ان سے کسی نئے نام کی فرمائش کی جاتی تو ان فہرستوں میں سے چن کر نام تجویز کر دیتے تھے۔ ممکن ہے وہ فہرستیں بھی کہیں شائع ہو چکی ہوں مگر میری نظر سے نہیں گزریں۔

پروفیسر سلیم کی زندگی کے حالات کسی نے جمع اور شائع نہیں کئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے ایک شاگرد نے ایک چھوٹا سا رسالہ ان کے حالات پر لکھا جس میں مروجہ پامال طریقے پر مدح سرائی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ اپنے باکمالوں کے متعلق ہمارے اہل ملک کی ذہنیت کچھ عجیب سی ہے جب تک کوئی باکمال بقید حیات رہتا ہے طرح طرح سے اس کی عیب جوئی کی جاتی ہے ممکنہ حد تک اس کے کمال میں نقص نکالے جاتے ہیں اس کی انسانی کمزوریوں کا ڈھول بجایا جاتا ہے۔ اور جونہیں وہ مر جاتا ہے ہم یکایک اس کے حق میں فیاض ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ اس کے مخالف تھے وہ تو اس کے بارے میں کچھ لکھتے ہی نہیں گویا اس کی ساری کمزوریوں اور گناہوں کو معاف کر دیا گیا ہو اور جو لوگ اس کے کمال کے معترف تھے وہ اس کی ایسی مدح سرائی شروع کر دیتے

ہیں کہ گویا اس میں کوئی نقص ہی نہیں تھا۔ اس کے عیوب کو بھی ایسے دل پذیر انداز میں بیان کرتے ہیں کہ عیب بجائے عیب ہنر معلوم ہوتا ہے۔ اور ایسا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ایک فرشتہ تھا جو ہم گنہگاروں میں چند روز بسر کر کے عرش معلےٰ کی طرف پرواز کر گیا۔ اس قسم کے سوانح کا یہ حال ہے کہ آپ کسی ایک باکمال کے سوانح پر کسی دوسرے باکمال کا نام لکھ دیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑیگا۔ سوانح لکھنے کا یہ رنگ غالباً مولانا حالی اور مولانا شبلی کی مشہور تصنیفوں سے قائم ہوا۔ ان بزرگوں کے اس طرزِ عمل کے اسباب بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ بہرحال ان کی تقلید میں مدح سرائی کا جتنا رنگ بڑھتا گیا اتنی ہی واقفیت سے دوری ہوتی گئی زمانے کے اس رنگ کے لحاظ سے یہ ایک ناخوشگوار فرض ہے" تاہم میں یہی کوشش کرونگا کہ پروفیسر سلیم کو میں نے جیسا کچھ دیکھا اور جو کچھ اُن سے سنا ہے اس کو ممکنہ دیانت داری کے ساتھ پیش کردوں۔

راقم الحروف کو تقریباً سات برس پروفیسر سلیم سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ جب میں کالج کے سال اول میں داخل ہوا، پروفیسر سلیم کے متعلق طلبہ کی برادری میں عجیب رعب آفرین خیالات پھیلے ہوئے تھے۔ کہا جاتا تھا "جناب سلیم صاحب کوئی معمولی پروفیسر نہیں ہیں۔ وہ نہ صرف سرسید کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں بلکہ اُن کے علمی مددگار (لٹریری اسسٹنٹ) بھی رہ چکے ہیں۔ وہ لکھنؤ کے مشہور اخبار مسلم گزٹ کے ایڈیٹر تھے۔ ان کا رسالہ "معارف" سلیمان ندوی کے "معارف" سے برسوں پہلے نکلتا تھا اور بڑا خاص پرچہ تھا" وغیرہ مجھے یاد ہے کہ میرا اصلی ذوق سائنس کا تھا۔ لیکن شعبہ فنون (آرٹس) میں اقتصادیات اور نفسیات کے مضامین کی جاذبیت اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس پر پروفیسر سلیم کی ایسی باکمال ہستی کا کالج میں موجود ہونا عجب مغتنمات سے تھا۔ غرض بڑی کشمکش کے بعد میں نے اور چند دوسرے ہم خیال ساتھیوں نے پروفیسر سلیم کے کمالات اد... سے مستفید ہونے کی نیت سے شعبہ سائنس کا خیال ترک کر کے شعبۂ فنون میں داخلہ حاصل کیا۔ دوران تعلیم میں ہم نے محسوس کیا کہ ہم نے غلطی نہیں کی۔

اس زمانے میں جیسا کہ اوپر اشارہ کرچکا ہوں عام طور پر کالجوں میں عربی، فارسی، اردو وغیرہ دیسی زبانوں کی تعلیم میں کتاب کے متن کا مفہوم سمجھا دینا ہی بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ ان مضامین کے پڑھانے والے مولوی صاحبان اسی پر ناز کرتے تھے اور شاید اس سے بڑھ کر پرواز کرنا خود ایسے مولویوں کی طاقت سے باہر تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کی تعلیم محض متن کے مفہوم تک کیسے محدود رہ سکتی تھی جبکہ یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ یونیورسٹی کے اس ابتدائی دور میں یونیورسٹی کے عہدہ داروں پروفیسروں اور طلبہ تک کے پیش نظر یہ نصب العین تھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو ادبیات کی تعلیم کا معیار اسی انداز کا ہونا چاہیئے جیسا کہ لندن یونیورسٹی میں انگریزی کا یا پیرس میں فرنچ کا یا برلن میں جرمن زبان کا ہے۔

اردو ادب کی تعلیم کے اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیئے شاید سارے ہندوستان میں پروفیسر سلیم سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا تھا۔ پروفیسر سلیم کی بنیادی تعلیم فارسی اور عربی کی تھی۔ وہ انگریزی نہیں جانتے تھے لیکن سرسید کے حلقے میں رہنے اور اخبار نویسی کے سلسلے میں انہیں انگریزی کے ترجموں اور انگریزی خیالات سے برسوں واسطہ پڑتا رہا۔ اردو زبان تو اُن کا اوڑھنا بچھونا بنی رہی۔ مسلم گزٹ سے پہلے انہوں نے ایک ادبی رسالہ "معارف" نکالا تھا جو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ وہ بہت اچھی اردو بولتے اور لکھتے تھے۔ ملک ان کو ایک بلند پایہ ادیب تسلیم کرتا تھا مجھے یاد ہے کہ ایف اے میں ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب توبۃ النصوح کے پڑھانے پر ایک مرتبہ انہوں نے استفساراً کہا تھا کہ "ہمیں کیا معلوم تھا کہ ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب کا پڑھانا بھی ہماری قسمت میں لکھا تھا۔"

پروفیسر بننے کے بعد ان کی غیر معمولی ذہانت نے عجب کام کیا۔ اردو ادب پر اب ان کی تحقیقاتی نظر پڑنے لگی۔ وہ اردو کو ایک علمی زبان دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس دُھن میں لگے رہتے تھے کہ اردو ادب کی تعلیم کے لیئے بی اے اور ایم اے کے ترقی پذیر مدارج قائم کریں۔ اپنے اکثر ہم عمروں کی طرح اُن کا دماغ منجمد نہیں تھا۔ وہ ہر نئی بات کو سُننے اور غور کرنے کے لیئے تیار رہتے تھے۔ اگر وہ بات انہیں پسند آجاتی تو فوراً اس پر عمل کرتے تھے۔ یہ ان کی بڑی ممتاز صفت تھی۔ باوجود اس کے کہ ان کی عمر تقریباً ساٹھ برس کی ہوگی، اُن کے دل کا دروازہ نئے خیالات کے لئے ایسا ہی کھلا ہوا تھا۔ جیسا کہ نوجوانوں کا ہوتا ہے۔ دماغی اعتبار سے وہ کبھی

بڑھے نہیں ہوئے۔ یورپی ڈگریاں رکھنے والے پروفیسروں کی محفل میں ان کی دماغی سطح کا اندازہ ہوتا تھا کہ نہ صرف وہ ان جدید تعلیم کے علم بردادوں کے ہم ردیف ہیں بلکہ اکثروں سے بلند تر ہیں۔ غرض وہ اردو ادب کی تعلیم کا معیار قائم کرنے کے سلسلے میں ہر پروفیسر اور ادیب سے تبادلۂ خیال اور اچھی باتیں اخذ کرنے میں کبھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ اسی زمانے میں انجمن ترقی اردو بھی بہار پر آ رہی تھی۔ انجمن کا ادبی رسالہ "اردو" شائع ہونا شروع ہوا تھا جو ادبی مسائل اور مضامین کا ایک حوصلہ افزا مجموعہ تھا۔ انجمن سے اردو ادب پر کتابیں بھی زیادہ شائع ہونے لگی تھیں۔ ان تمام مساعی کے عمل اور ردِ عمل سے اردو ادبیات اور اس کے طریقۂ تعلیم کی عمارت طیار ہو رہی تھی جس کا سب سے بڑا معمار پروفیسر سلیم کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر سلیم کا یہ وہ خاص کارنامہ تھا جس کی کوئی تحریری یادگار موجود نہیں۔ اب پچیس تیس سال کی مدت کے بعد ہم اردو ادب کے طرزِ تعلیم پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک عظیم فرق نظر آتا ہے اور بقول پروفیسر معین الدین قریشی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا پانی میں ایک کنکر ڈالا گیا کنکر تو نظروں سے غائب ہو کر تہ میں بیٹھ گیا لیکن اس کی پیدا کی ہوئی لہروں کا سلسلہ برابر جاری ہے

اردو کے بعد پروفیسر سلیم کو فارسی زبان اور ادب پر بڑا قابو حاصل تھا۔ ہم چند طلبا تقریباً روزانہ شام کو ان کے مکان پر ضرور حاضری دیا کرتے تھے کالج کے چند پروفیسروں کے علاوہ ان کے دوسرے مدّاح بھی استفادہً آیا کرتے تھے شام کی چائے بڑی مقدار میں بنائی جاتی تھی۔ پروفیسر سلیم خود چائے بناتے اور ہر پیالی میں لاہوری نمک کی ڈلی گھول دیا کرتے تھے۔ اس چائے کے نمکین ذائقے پر اکثر رنگ آنکھ بچا کر منہ بناتے تھے لیکن اس برکت سے محروم کوئی نہیں رہتا تھا۔ ان کی شام کی محفل میں ایسی شگفتہ باتیں ہوا کرتی تھیں کہ وہاں سے اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ ایک دن میں اتفاقاً شام کے مقررہ وقت سے کچھ پہلے پہنچ گیا۔ دیکھا کہ پروفیسر سلیم ایک کھرّی چارپائی پر لیٹے ہیں اور لیٹے ہی لیٹے کچھ لکھ رہے ہیں۔ میرے سلام کے جواب میں انہوں نے خشک انداز میں "سلام علیکم" کہا اور لکھنے میں مشغول رہے۔ میں سمجھا کہ میں غلط وقت پر آ گیا ہوں اس لئے ان کے انقباض کا باعث ہوں یہ شاید کوئی ضروری خط لکھ رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میں کچھ دیر کے بعد پھر حاضر ہونگا۔ انہوں نے لکھتے ہوئے "ہوں ہوں" اس انداز میں کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ میں بیٹھا رہوں جاؤں نہیں۔ میں بیٹھا رہا۔ وہ لکھتے رہے مگر وہ طویل خط ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ میں بیٹھے بیٹھے اُکتا گیا۔ اور جانے کی پھر اجازت مانگی۔ جواب ملا "بیٹھے رہو"۔ مجبوراً بیٹھ رہا گھنٹہ سوا گھنٹہ کے بعد اُن کا قلم رُکا۔ فرمانے لگے "بھئی ہمارے ایک دوست ایک ریاست میں رہتے ہیں۔ وہ وہاں کے مہاراجہ صاحب کو ایک قصیدہ سنانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے فرمائش کی ہے وقت نہیں ہے مجھے آج ہی یہ قصیدہ بھیجنا ہے۔ اچھا تم بھی سُن لو۔ اب جو انہوں نے سُنانا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ وہ خط نہیں قصیدہ ہے اور وہ بھی فارسی میں ہے۔ فارسی اتنی اچھی ہے کہ اساتذہ کا کلام معلوم ہوتا تھا۔ شعر ایک سے ایک بلند تھا۔ داد دیتے دیتے میں عاجز آ گیا میں تو یہ دیکھ کر حیران تھا کہ اتنا اعلےٰ درجہ کا قصیدہ، وہ قلم برداشتہ اس طرح لکھ رہے تھے جیسے کوئی خط لکھتا ہے۔ پروفیسر سلیم کی اس غیر معمولی قابلیت کا میرے دل پر عجب اثر ہوا۔

اس نوع کا میں نے یہی ایک واقعہ نہیں دیکھا۔ رفتہ رفتہ کئی ایسے شعرا سے واقف ہوتا گیا جن کی متاعِ سخن پروفیسر سلیم کے کارخانہ میں تیار ہوتی تھی اور وہ حضرات بڑی شان سے شاعر بنے پھرتے تھے۔ کبھی کبھی تو یہ ستم بھی اُٹھانا پڑتا تھا کہ ایسے متشاعر صاحب پروفیسر سلیم کی کہہ کر دی ہوئی نظم ہمیں کو سنانے بیٹھ جاتے تھے۔ ہمیں داد دینی پڑتی تھی اور ان کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کرنا پڑتا تھا۔ اور تو اور خود راقم الحروف پر بھی ایک مرتبہ پروفیسر سلیم کو اس قسم کا احسان فرمانے کی زحمت اٹھانی پڑی۔ میں بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ اتفاق سے یونیورسٹی ہوسٹل کی یونین کا صدر منتخب ہو گیا۔ کرسی نشینی کا جلسہ ہونے والا تھا جس میں مجھے خطبہ صدارت سنانا تھا مگر اس زمانے میں طالب علمانہ مصروفیتوں اور حماقتوں میں اس قدر مبتلا تھا کہ خطبہ صدارت لکھنے کی نہ فرصت تھی نہ دماغی سکون۔ اس پر مشکل یہ کہ خطبہ صدارت لکھنے کا کوئی تجربہ بھی نہ تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ جلسہ کا دن آ پہنچا۔ دل پر جبر کر کے خطبہ صدارت لکھنے بیٹھا تو قلم چند سطروں سے

سکے نہ بڑھ سکا۔ شام کے ۴ بجے تک دماغ کو طرح طرح سے مناتا رہا مگر وہ اڑیل گھوڑے کی طرح جگہ سے نہ ہلا۔ بس اس کے سوا اور کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ سیدھا پروفیسر سلیم کے ہاں پہنچا اور اپنی حالت زار بیان کی۔ وہ کچھ علیل سے تھے انہوں نے میری مصیبت کی کچھ پرواہ نہ کی۔ فرمایا "پہلے پی لو" چائے پی لی۔ فرمایا "لکھو" میں نے لکھنا شروع کیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد ایک نہایت عمدہ خطبہ صدارت جیب میں ڈال کر ہوسٹل واپس آیا۔ میرے خاص احباب جو یہ جانتے تھے کہ میں نے خطبۂ صدارت نہیں لکھا، بڑی تشویش سے پوچھتے اور اصرار کرتے کہ "بھئی کہیں بیٹھ جاؤ خطبہ صدارت تیار کر کے ذرا ہمیں سنا دو۔ کہیں کوئی قابل اعتراض بات نہ آ جائے"۔ ہم نے انہیں بڑی شان استغنا سے جواب دیا کہ "تم لوگ اس کی پرواہ نہ کرو خطبۂ صدارت کا کیا ہے چٹکی بجاتے طیار ہو سکتا ہے۔ جلسہ تو رات کے دس بجے ہوگا"۔ اس سے انہیں کچھ ایسی غلط فہمی ہونے لگی کہ شاید میں نے اُن سے چھپا کر دنوں پہلے خطبہ صدارت لکھ رکھا ہے۔ غرض جلسہ ہوا۔ میں نے وہ خطبۂ صدارت سُنا دیا طلبہ نے بہت پسندیدگی سے سُنا ۔۔ مگر ایک جگہ ۔۔۔ پروفیسر سلیم نے معلوم نہیں کیا لفظ لکھوایا تھا۔ اور گھبراہٹ میں میں نے کیا لکھ لیا تھا۔ وہاں پہنچ کر میں چکرا گیا۔ غلط سلط کچھ پڑھ کر لڑکھڑاتا ہوا آگے نکل گیا۔ حاضرین جلسہ نے اس پر کوئی گرفت تو نہ کی۔ البتہ دوسرے دن صرف ایک دوست نے اس مقام کے متعلق مجھ سے دریافت کیا۔ میں انہیں قریب کے ریسٹورنٹ میں لے گیا پیسٹری کھلائی چائے پلائی اور بتایا کہ کئی راتوں سے جاگتے رہنے کی وجہ سے مجھے کچھ کا کچھ نظر آ رہا تھا۔ پڑھتے ہوئے اصلاح کی کوشش کی تو سارا جملہ ہی غلط ہو گیا وہ میری اس توجیہ کو مان گئے۔ میری اس ذہنی کیفیت پر اظہار ہمدردی کرتے ہوئے خطبہ صدارت کی بڑی داد دی۔

حیدرآباد میں استاد داغ کے ایک شاگرد جناب باغ صاحب تھے، جنہیں شعر سے زیادہ مشاعرے کا شوق تھا۔ انہوں نے ۲۵ء یا ۲۶ء میں اپنے گھر ایک ماہانہ مشاعرے کی طرح ڈالی۔ یہ مشاعرہ عام نہیں تھا۔ اس میں وہی شعرا کلام سناتے تھے جنہیں شعر سنانے کی دعوت دی جاتی تھی۔ اور سامعین میں بھی وہی لوگ شریک جلسہ ہوتے تھے جنہیں بطور خاص مدعو کیا جاتا تھا۔ مجھے کبھی اس مشاعرے میں شریک ہونے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن سُنا تھا کہ یہ مشاعرہ بہت سنجیدہ اور ستھرے مذاق سخن کی جلوہ گاہ تھا۔ اس مشاعرہ میں سنایا ہوا کلام ایک مقامی ادبی رسالے میں شائع ہوتا تھا۔ مجھے ہر مشاعرے سے دو ایک روز قبل جناب سلیم کی غزل سننے کا شرف ضرور حاصل ہو جاتا تھا۔ اس نوبت پر میں اردو کا ایک اچھا طالب علم سمجھا جاتا تھا امتحانوں میں اوّل آتا تھا۔ میری نظمیں اور مضامین رسالوں میں شائع ہوا کرتے تھے۔ پروفیسر سلیم کے وہاں میری خاص قدر تھی۔ جب کبھی جناب سلیم اپنی عنایت سے مجھے کوئی نظم یا غزل سناتے تھے، میرا طریقہ یہ تھا کہ معمولی اشعار پر دھیمے لہجہ اور دبی زبان سے "واہ واہ" کر دیتا۔ عمدہ اشعار پر پُرجوش "سبحان اللہ" کہتا۔ اور اپنی دانست میں کوئی قابل اعتراض شعر ہوتا تو چپکا بیٹھا رہتا میرے چُپکے رہنے پر وہ کچھ کھٹک جاتے اور تیکھے انداز میں پوچھتے "تمہیں اس شعر پر کوئی اعتراض ہے؟" میں رُکتے رُکتے دبی زبان سے اپنا شک و شبہ ظاہر کر دیتا۔ وہ استادانہ شان سے اس کا جواب اس انداز سے دیتے کہ گویا مجھے مطمئن کر دیا۔ لیکن عموماً، ایسے اشعار یا تو کاٹ دیتے یا اُن میں کوئی تبدیلی کر دیتے۔ اور کبھی کبھی ضد پر بھی آ جاتے تھے۔ چنانچہ اسی قبیل کا ایک واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک شعر سنایا جس کا ایک مصرعہ یہ تھا۔

وہ گل چیں ہوں مسل دوں چٹکیوں میں سارے گلشن کو

حسب عادت چپکا بیٹھنے پر انہوں نے آنکھوں پر سے عینک ہٹا کر مجھے گھورا اور کہا "کیوں؟" میں نے ڈرتے ڈرتے جواب میں جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ "فن گل چینی میں تعلّی کرنا بے مزہ بھی ہے اور مسلمات تغزل سے متغائر بھی"۔ ایک ناپسندیدگی کی "ہوں" ہوئی اور دوسرے اشعار سُنانے شروع کر دئے۔ اسی طرح ایک مرتبہ یہ شعر سُنایا۔

اس قدر تُندی بھری ہے مرے پیمانے میں ‌ ‌ ‌ کہ چھڑک دوں تو لگے آگ ابھی مےخانے میں

اس پر میں نے جو عرض کیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ صرف تُندیٔ مے کے مبالغہ ہی پر شعر ختم ہو گیا اس اِدّعا میں کوئی لطف پیدا نہ ہوا۔ اس پر بھی وہی "ہوں" ہوئی اور اشعار کی ریل چل پڑی۔ اس وقت مجھے یہ یاد نہیں کہ اس شعر پر یا اوپر کے مصرعہ کے متعلق مشاعرہ کے بعد مشاعرہ کی

موعاد منانے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ "اس پر مشاعرہ میں بڑی داد ملی" — بین السطور یہ کہ تم نے جو اعتراض کیا تھا لغو تھا!

ہاں تو میں باغ صاحب کے مشاعرہ کا ذکر کر رہا تھا - کہ اس دور میں ہر ماہ مشاعرے سے دو ایک روز قبل مجھے مولانا کی غزل سننے کے لیئے حاضر ہونا پڑتا تھا - پہلے دو ایک مشاعروں کے لیئے جو غزلیں طیار ہوتی تھیں وہ بیس بیس پچیس پچیس اشعار کی تھیں - یہ مشاعرہ ہر ماہ ہوتا تھا - ہر بعد کے مشاعرے پر مولانا کی غزل کے اشعار کی تعداد سرکاری ملازموں کے تنخواہ کے گریڈ کی طرح بڑھتی چلی گئی - آخری سے پہلے مشاعرے میں (۰۰) اشعار کی غزل سنائی تھی - اور آخری غزل جو اس مشاعرے کے سلسلے میں مجھ نے سُنی تھی اس کے اشعار کی تعداد (۸۰) سے زیادہ تھی - داد دیتے دیتے میرا گلا سوکھ رہا تھا - درمیان میں میں نے موقع پاکر عرض کیا "آپ اتنی سیر حاصل غزلیں فرماتے ہیں، مشاعرہ کا کیا حال ہوتا ہوگا؟

یا تو میرے لہجے کی مسکینی سے دھوکا کھا گئے یا اپنے اشعار کے ذوق میں ایسے محو تھے کہ اس فقرے کے طنزیہ پہلو پر غور نہیں فرمایا - رُعب آفرین لہجے میں جواب دیا کہ "اہل مشاعرہ دس پندرہ اشعار تک میرے تخیل کا ساتھ دیتے ہیں - اس کے بعد کسی میں داد دینے کی تاب نہیں رہتی حیرت سے میرا منہ تکتے رہتے ہیں" -

مولوی سلیم کا ابتدائی زمانہ، جیسا کہ وہ خود کبھی کبھی اظہار فرماتے تھے، بہت عسرت اور تنگ دستی میں گزرا تھا - اس دور نے ان پر ایک دیرپا اثر چھوڑا تھا - کالج میں ان کا تقرر (۲۵۰ - ۴۰۰) کے لکچرر کے گریڈ پر ہوا تھا - چار پانچ سال میں انہیں ریڈر کا گریڈ بھی مل گیا اور پروفیسر کا بھی، جس کی انتہائی تنخواہ ہزار روپیہ تھی - اس کے علاوہ انہیں دارالترجمہ سے اور امتحانات کی فیس سے بھی کافی روپیہ مل جاتا تھا لیکن کفایت شعاری کا یہ عالم تھا کہ ابتدا میں اُن کے گھر کا کل خرچ (۵۰) روپیہ سے زیادہ نہیں تھا - اُن کے ہم چشموں میں اُن کے بخل کا چرچا ہوتا رہتا تھا - تنخواہ کے بڑھ جانے کے بعد اُن کا خرچ سو ڈیڑھ سو ماہوار تک بڑھ گیا تھا - پہلے دو سال تک وہ پنجہ ایک دوست کی عنایت سے، بلکہ شاید ان کو اشعار کہہ کر دینے کے معاوضے میں، ایک سرکاری دفتر کے آؤٹ ہاؤس میں بلا کرایہ ایک کمرہ میں رہتے تھے جس کو اُن کے مخالف اُس کوٹھی کا اصطبل بتاتے تھے - اس کے بعد دو تین سال تک وہ (۵۰) روپیہ کرایہ کے ایک چھوٹے سے مکان میں بسر کرتے رہے، شاید پروفیسری کا پورا گریڈ مل جانے کے بعد ایک بڑا سا مکان لے لیا تھا جس کا کرایہ ستر اسی روپے کے قریب تھا - یہ مکان حیدرآباد کے ایک رئیس راجہ صاحب دوم کنڈہ کا تھا، ممکن ہے مولانا کے ساتھ کرایے میں کوئی رعایت کی گئی ہو - کھانا وہ معمولی کھاتے تھے - دو تین چپاتیاں، ایک سالن، ایک دال — جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مجھے کبھی اس خاص کھانے میں ہم طعامی کا شرف حاصل نہیں ہوا البتہ باہر کی آئی ہوئی سوغات میں، مَیں ہی کیا، تمام حاضرین محفل بہ اصرار شریک کر لیئے جاتے تھے -

لباس بہت سادہ ہوتا تھا مل کی بنی ہوئی کھدر کا پائجامہ اور اسی کپڑے کی قمیص، اور کسی سستے کپڑے کی شیروانی — ترکی ٹوپی، جو میرے دور تلمذ یعنی سات سال میں شاید ایک مرتبہ بدلی گئی تھی - جُوتا، ابتدائی زمانے میں فیتہ، تنہائی بھگتا کرتا تھا - مگر بعد کے دور میں اُسے دو تین ساتھی میسر آگئے تھے، لیکن بوٹ پالش کا ممنون احسان کوئی بھی نہیں ہوتا تھا -

ابتدائی دور میں جبکہ مولانا کی تنخواہ ڈھائی سو روپیہ تھی، پان کھاتے تھے پانوں کے آدھے آدھے ٹکڑے لگا کر، ڈبیہ میں رکھ کر کالج تشریف لاتے تھے جوں جوں تنخواہ بڑھتی گئی، پان کی جسامت میں کمی آتی گئی - نصف سے ربع ہوا - ربع سے ثمن، یعنی ایک پان کے آٹھ ٹکڑے کیئے جاتے تھے اور اُن سے چونا اور کتھا مَس کرایا جاتا تھا - غالباً ہزار روپیہ کا گریڈ ملنے کے بعد وہ بیچارا، پان کا آٹھواں حصہ بھی برطرف کر دیا گیا - اب ترکیب یہ تھی کہ پہلے تھوڑی سی چھالیہ پھانک لیا کرتے اس پر چونا اور کتھا چمچیوں سے لے کر چاٹ لیتے تھے -

جس زمانے میں پانوں کی فضول خرچی جاری تھی، ایک مرتبہ بڑی عمدہ علمی ادبی گفتگو کے دوران میں مجھ سے اچانک دریافت فرمایا "آج کل پانوں کا بھاؤ کیا ہے" میں نے اپنی لاعلمی ظاہر کی - فرمایا "تمہیں یہ معلوم ہے پانوں کے تھوک بیوپاری کس بازار میں ہیں؟" میں نے سرسری طور پر دو ایک محلوں کا نام لیا - ایک مقام کی تصدیق فرمائی کہ "ہاں وہاں بہت سے بیوپاری ہیں" اس کے بعد پانچ چھ آنے مجھے دیئے اور محبت بھرے لہجے میں کہا "تم ذرا جلدی سے اپنی بائیسکل پر وہاں

تک جاؤ۔ پہلے پانوں کی ڈھولی کا بھاؤ ٹھیرا لو۔ پھر ان پیسوں میں اگر پوری ڈھولی مل جائے تو پوری ورنہ آدھی ڈھولی لے آنا" معلوم ہوتا تھا کہ اُن کا وہ خاص شاگرد جسے بازار سے پان چھالیا وغیرہ خرید لانے کی سعادت حاصل تھی کسی وجہ سے حاضر نہیں ہو سکا تھا۔ مجھے اُس وقت تک پانوں کی اس طرح کی خرید و فروخت کا تجربہ نہ تھا۔ میں بائیسکل لے کر چلا۔ اور بڑی نیک نیتی سے اُستاد کی اس خدمت کی سعادت حاصل کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ شیطان نے میرے کان میں کہا "ابے احمق کہاں پان بینے چلا ہے۔ کچھ مستقبل کے خطرات کا بھی تو نے اندازہ کیا۔ اگر اس مرتبہ تو مولانا کی ہدایت کے مطابق پان لے گیا تو یاد رکھ تجھے کتنے ہی چکر سکندر آباد اور بیگم بازار کے کرنے پڑینگے بس میں شیطان کے جھانسے میں آگیا اور بنواڑی کی جو پہلی دوکان نظر آئی بائیسکل پر سے اُتر پڑا۔ سارے پیسے اس کے ہاتھ میں دھر دئے اور کہا "ان کے جتنے پان آسکتے ہوں دے دو"۔ وہ پان لے کر میں مولانا کی خدمت میں پہنچا۔ مجھے اتنی جلد پان لاتے دیکھ کر خوش ہوئے۔ کہا "تم بہت تیز بائیسکل چلاتے ہو بہت جلد آگئے" میں نے کہا "جی ہاں — پان لیجیئے" پانوں کو دیکھ کر اور خوش ہوئے کہا بہت اچھے پان لائے ہو۔ میں نے کہا "جی — اچھے ہیں؟" پھر انہوں نے ایک ایک کرکے پان گن لئے اور مجھ سے بھاؤ پوچھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "بھاؤ تو مجھے معلوم نہیں"۔ پوچھا "یہ کتنے کے ہیں"؟ میں نے کہا "آپ نے جتنے پیسے دئے تھے" اتنا سننا تھا کہ ان کے چہرے سے اطمینان کے آثار کافور ہوگئے اور ایک کرب کی کیفیت طاری ہوگئی — ڈوبی ہوئی آواز میں فرمایا "بڑے احمق ہو۔ بڑے احمق ہو — آیندہ سے تم سے کوئی چیز نہیں منگواؤنگا۔ اُن کے اتنا فرماتے ہی شیطان نے ایک قہقہہ لگایا اور مجھ سے شکریے کا مطالبہ کیا۔ کہا "دیکھ احمق میں نے تجھے کتنی مصیبتوں سے بچا لیا ہے"

کالج کی ملازمت کے بعد دو تین سال تک ان کو کسی بینک پر اعتماد نہ تھا۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کے قریب رگھوناتھ مل بینک بہت ترقی کر رہا تھا کالج کے اکثر پروفیسروں نے اس بینک میں اپنا کھاتہ کھول رکھا تھا کبھی کبھی کوئی صاحب پروفیسر سلیم کو بھی یہ مشورہ دیتے تھے کہ وہ رگھوناتھ مل بینک میں اپنا کھاتہ کھول لیں۔ ایسی تجویز پر مولانا ترفروئی سے بینکوں کو بُرا بھلا کہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ نئے بینک ناقابل اعتبار ہیں شروع شروع میں تو کام اچھا چلاتے ہیں گاہکوں کو سبز باغ دکھاتے ہیں۔ پھر دیوالہ نکال کر لوٹ لیتے ہیں

اسی دور میں ایک سال گرما کی چھٹیاں آئیں۔ طویل تعطیلات میں ہر سال مولانا شمالی ہند چلے جاتے تھے۔ اس سال چھٹیوں سے چند مہینے پہلے انہوں نے بلا کرایہ کا کمرہ چھوڑ کر (۵۰) روپیہ کرایہ والا ایک چھوٹا سا مکان لے لیا تھا۔ اور غالباً اس مکان کو غیر محفوظ سمجھتے تھے۔ میں ہوسٹل میں رہتا تھا چھٹیوں میں ہوسٹل بھی بند ہو جاتے تھے۔ مولانا نے مجھ سے پوچھا "تم چھٹیوں میں کہاں جاؤگے"؟ میں نے عرض کیا کہ ابھی تک میرا ارادہ تو کہیں جانے کا نہیں ہے۔ مگر جب ہوسٹل بند ہو جائیگا تو کہیں جانا ہی پڑے گا" ہاں اس گفتگو سے چند ہفتے پہلے وہ مجھ سے یہ اصرار فرما رہے تھے کہ میں انگریزی کے ایک لغاتِ تشبیہات کا اردو میں ترجمہ کر دوں۔ شاید میں نے اس لغت کے دو ایک صفحے کا ترجمہ انہیں دکھایا بھی تھا۔ مولانا کو وہ لغت بہت پسند تھا۔ وہ یہ فرماتے تھے کہ میں اس کا ترجمہ کر دوں تو وہ اس کو انجمن ترقی اردو سے چھپوا دینگے۔ مجھے یقین تھا کہ مولانا اگر چاہیں تو انجمن سے چھپوا سکتے ہیں — غرض اب تعطیلات کے موقع پر یہ فرمایا کہ "کیوں نہ تم میرے مکان میں آ رہو۔ یہاں سے سرکاری کتب خانہ قریب ہے تم روز وہاں جا کر اس لغت کا ترجمہ کر لایا کرو"۔ اس سے پہلے بمبئی کے ایک کتب فروش سے پوچھا گیا تھا' وہ کتاب اس کے وہاں موجود نہ تھی۔ اور یہ طے ہوا تھا کہ تعطیلات کے بعد ایک اور بڑے کتب فروش کو لکھ کر کتاب منگوالی جائے — چونکہ اس وقت کتاب پاس نہ تھی اس لئے تعطیلات میں سرکاری کتب خانے کی کتاب سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا تھا۔ میں نے مولانا کی اس تجویز پر رضامندی ظاہر کردی۔ حالانکہ مجھے یقین تھا کہ تعطیلات میں یہ کھکھیڑ کس سے اٹھے گی۔ مجھے تو صرف یہ لالچ کافی تھا کہ تعطیلات میں مولانا کے مکان میں آرام سے رہوں گا اور جو جی چاہے گا کروں گا۔

غرض تعطیلیں شروع ہوئیں۔ میں مولانا کے مکان میں اٹھ آیا۔ وہ شمالی ہند کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ شاید پہلے وہ اورنگ آباد پہنچے۔ جہاں مولوی عبدالحق صاحب اور انجمن ترقی اردو کا دفتر تھا۔ وہاں سے مجھے خط لکھا کہ مولوی صاحب انجمن کی طرف سے تشبیہات کا لغت شائع کرنے کے لئے طیار ہیں۔ بشرطیکہ اُس انگریزی لغت کے ترجمے کے ساتھ اردو کی تشبیہات بھی شامل کردی جائیں۔ بی اے کے طالب علم کے لئے اپنے امتحان کی طیاری ہی

کیا کم تھی کہ اس پر ایک ضخیم کتاب کے ترجمہ کا بوجھ لاد اجائے۔ اس پر طرفہ یہ کہ اردو ادب کی تشبیہات بھی اس میں جمع کی جائیں۔ مگر اردو کی تشبیہات جمع کس طرح ہوں گی جب تک کہ تمام اردو ادب کا مطالعہ نہ کر لیا جائے اس کے علاوہ انگریزی ادب کی تشبیہات سے اردو ادب کی تشبیہات کا کیا میل تھا۔ یہ البتہ ہو سکتا تھا کہ انگریزی تشبیہات کی کتاب الگ شائع ہو اور اردو تشبیہات کی الگ۔ بہرحال مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہ آتی تھی۔ دن گزرتے چلے گئے۔ مولانا کا ایک آدھ خط شمالی ہند سے بھی شاید وصول ہوا۔ پھر محسوس ہوا کہ تعطیلات ختم ہونے کو ہیں۔ مولانا کا آخری خط شاید اورنگ آباد ہی سے آیا کہ میں فلاں تاریخ کو صبح کی ریل سے حیدر آباد پہنچونگا۔ چائے کے لئے دودھ وغیرہ کا انتظام کر رکھو۔ وہ دن بھی آگیا اور میں دودھ وغیرہ کا انتظام کر کے صبح آنے والی ٹرین پر مولانا کے استقبال کے لئے اسٹیشن پر پہنچا۔ بہت خوش خوش ملے۔ تانگہ پر سوار ہوئے سامان لدا گیا، مکان پر پہنچے۔ میں بجلی کی چاء دانی میں چائے کا پانی گرم کرنے کی فکر میں تھا کہ مولانا نے فرمایا "اماں تم نے اُس کتاب کے لئے بمبئی کو خط لکھ دیا" میں نے کہا "نہیں لکھا" فرمایا "بڑے کاہل ہو۔ اتنی چھٹیاں گزر گئیں تم سے ایک کارڈ نہیں لکھا گیا" میں نے انجمن کی اُس شرط کی طرف اشارہ کیا کہ کتاب آ بھی جائے اور ترجمہ ہو بھی جائے تو کیا ہوگا۔ جب تک اردو کی تشبیہات جمع نہ کی جائیں گی، کتاب کیسے چھپے گی۔ مولانا نے میری یہ بات ان سُنی کر دی۔ اور شفقت آمیز غصے سے کہا "نہیں جاؤ ابھی جاؤ ڈاک خانہ سے ایک پوسٹ کارڈ لاؤ اور ابھی آرڈر لکھو"۔ میں نے عرض کیا کہ آپ منہ ہاتھ دھو ڈالیں میں آپ کو چائے تو پلا دوں۔ پوسٹ کارڈ کی اتنی کیا جلدی ہے"۔ فرمایا نہیں۔ چائے کا پانی طیار ہونے میں ابھی دیر ہے۔ تم ابھی جاؤ اور کارڈ لے آؤ۔ تم بہت کاہل ہو۔ تمہارے واپس آنے تک میں ہاتھ منہ دھو لونگا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ مولانا کے سفری بکس میں پوسٹ کارڈوں کا بنڈل پڑا رہا کرتا تھا مگر اب معلوم نہیں ڈاک خانہ کے "تازہ بہ تازہ" گرما گرم پوسٹ کارڈ کی انہیں کیوں اتنی خواہش پیدا ہوئی ہے۔ بہرحال مولانا کے لہجے میں اس قدر تاکید اور قطعیت تھی کہ مجھ سے کوئی جواب بن نہ پڑا چپکے سے سیکل سنبھالی اور — بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید گنگناتا ہوا ڈاک خانہ روانہ ہو گیا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد میں پوسٹ کارڈ لے آیا۔ تھکے ہوئے انداز میں میں نے کہا "لیجئے مولانا میں یہ کارڈ لے آیا"۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور کہا "لے آئے" اور آگے بڑھ کر گلے لگا لیا فرمایا "شاباش۔ شاباش۔ میں جانتا تھا کہ تم بڑے سعادت مند ہو۔ میں نے چائے بنا دی ہے — آؤ چائے پیو"۔ پوسٹ کارڈ کے لاتے ہی مولانا کا طرز بدل گیا۔ معلوم نہیں اس پوسٹ کارڈ پر کونسی نقش سلیمانی چھپا ہوا تھا بات یہ ہے کہ اس پوسٹ کارڈ کو ہاتھ تک نہ لگایا اور نہ فوراً آرڈر لکھنے پر اصرار فرمایا۔ غرض اب مولانا بہت بشاش تھے۔ بار بار میرے محاسن بیان فرماتے تھے۔ ڈاک خانہ سے تازہ پوسٹ کارڈ لانے میں کتنی سعادت مندی تھی!

اُس وقت بلکہ اس کے بعد دو تین سال تک مجھے مولانا کے اس عجیب طرز عمل کا سبب سمجھ ہی میں نہ آیا۔ بعد میں یکایک یہ بات روشن ہوئی۔ مجھے تو یقین ہے کہ یہی صحیح ہے۔ ممکن ہے فی الحقیقت صحیح ہو۔ مگر اب کون اس کی تصدیق کرے گا۔ وہ یہ کہ اُس وقت تک انہوں نے اپنا اندوختہ کسی بینک میں جمع نہیں کیا تھا۔ سفر میں اس جوکھم کو ساتھ رکھنا عقل اور تجربے کے خلاف تھا۔ اس مکان میں ایک دیواری الماری تھی جس میں ایک مضبوط بڑا سا قفل پڑا رہتا تھا کوئی عجب نہیں کہ مولانا کی ساری گاڑھے پسینے کی کمائی اسی کے اندر مقفل ہو۔ مجھے ڈاک خانہ دوڑانے کے بعد انہوں نے جب اپنی امانت کو زندہ سلامت دیکھ لیا ہوگا تو میرے متعلق شفقت کا جذبہ پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ اس واقعے کے سال دو سال کے بعد مجھے معلوم ہوا تھا کہ مولانا نے رگھوناتھ مل بینک میں اپنا کھاتہ کھول لیا ہے اور مولانا کے انتقال کے چند ماہ بعد صداقت نامۂ وراثت کے سلسلے میں ایک عدالتی اشتہار دیکھ کر تو یقین ہو گیا کہ رگھوناتھ مل بینک میں ان کی پچیس تیس ہزار کی رقم جمع ہو چکی تھی۔

مولانا سلیم میں اس شہرت یافتہ بخل کے علاوہ ایک اور کمزوری بھی تھی — وہ رشک و حسد کا بھتنا تھا جو کبھی کبھی ان کے وسیع سینے کی چار دیواری کے اوپر چڑھ کر جھانکا کرتا تھا! وہ اپنے رفقائے کار دوسرے واجب التعظیم پروفیسروں پر پھبتیاں اڑانے میں کبھی بخل نہیں کرتے تھے۔ یونیورسٹی میں شعبۂ فنون کے علاوہ ایک شعبہ دینیات بھی تھا جس کے پروفیسروں میں مولانا عبدالقدیر صدیقی، مولانا مناظر احسن گیلانی

مولوی عبدالوسع مرحوم - علامہ شبیر علی مرحوم ایسے فرشتہ خصلت اساتذہ تھے - مگر ان میں سے جو کوئی زد پر آتا تھا وہ پروفیسر سلیم کے تیر سے بچ نہیں سکتا تھا۔ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ کسی محفل میں کسی صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ یونیورسٹی میں کتنے شعبے اب تک قائم ہو چکے ہیں" جواب میں فرمایا "ہمارے وہاں دو شعبے ہیں - ایک شعبۂ فنون، دوسرا شعبۂ جنون"۔ اس لطیفے کے بعد وہ اکثر شعبۂ دینیات کو شعبۂ جنون ہی کہا کرتے تھے۔

صرف اہل علم ہی ان کے رشک و حسد کا نشانہ نہ تھے - ریاست کے دوسرے محکموں کے اونچی تنخواہ پانے والے عہدہ دار بھی انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے - تقریباً سب لوگ یہ جانتے تھے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے کرتا دھرتا سر اکبر حیدری مرحوم تھے - اس لئے یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے خواہ وہ پروفیسر ہوں یا طلبہ، سب کو سر اکبر حیدری کے ساتھ ایک احسان مندانہ عقیدت تھی - جو لوگ اور اعتبارات سے سر اکبر سے ناخوش تھے، وہ بھی یونیورسٹی کے سلسلے میں انہیں سراہے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کہ کن کن مشکلوں سے مقابلہ کر کے انہوں نے اس یونیورسٹی کو قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی — ایک مرتبہ پروفیسر سلیم کی محفل میں سر اکبر حیدری کا تذکرہ ہوا - کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ - ان کے متعلق کچھ لطیفے بھی بیان کئے گئے - مولانا سلیم چپکے بیٹھے سب کی سنتے رہے - اور آخر میں ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "ایک ہم ہیں کہ جوتیاں چٹخارتے رہتے ہیں اور ایک یہ (ہلکی گالی) حیدری ہیں کہ موٹر اڑاتے پھرتے ہیں"۔

سر راس مسعود اسی یونیورسٹی کے قیام میں سر اکبر حیدری کے دست راست تھے - انھوں نے بھی اس کے راستے سے بڑے بڑے پتھر ہٹائے تھے سید مسعود، سر سید مرحوم کے پوتے سید محمود کے بیٹے تھے - حیدرآباد میں سررشتہ تعلیمات کے ڈائرکٹر تھے اور عثمانیہ یونیورسٹی کے منصرم پرنسپل بھی رہ چکے تھے - وہ مولانا سلیم کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے - مگر ایسے بھی اوقات آئے ہیں کہ پروفیسر سلیم کے حسد کے چھرّوں سے نہ سر سید اپنے پوتے کو بچا سکے اور نہ سید محمود اپنے بیٹے کو!

وہ کسی اہل علم کی تعریف کرنا تو کجا سن تک نہیں سکتے تھے، برداشت نہیں کر سکتے تھے خواہ ممدوح ریاضی کا پروفیسر ہو یا فلسفہ کا۔ اپنے سلسلے اس آتش فشاں پہاڑ کے پہلی مرتبہ پھٹنے کا باعث میں خود ہی تھا - فلسفے کے پروفیسر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے حیدرآباد کے برہمو سماج کے سالانہ جلسے میں ایک نہایت شاندار تقریر کی تھی - میرے ایک ہم جماعت جو جلسے میں میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، بیحد متاثر ہوئے، لکچر کے ختم ہونے پر کہا "میں اب وہ فیاض علی نہیں رہا جو ایک گھنٹہ پہلے تھا"۔ خیر دوسرے دن شام کو حسب معمول ہم چند طلبہ پروفیسر سلیم کے دربار میں پہنچے - اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد ڈاکٹر خلیفہ کے لکچر کا ذکر آگیا - میں نے اپنی حد تک جتنی تعریف کرنی تھی کی، اور آخر میں اپنے دوست کا مقولہ سُنا دیا - بس کچھ نہ پوچھئے کہ کیا ہوا - چہرے کے اعصاب کی طنابیں کھنچ گئیں - صورت بدل سی گئی - بڑے تلخ لہجے میں فرمایا "بتاؤ خلیفہ نے اپنے لکچر میں کیا کیا کہا؟" میں نے عرض کیا کہ وہ لکچر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے ہوتا رہا مجھے یاد کیسے رہتا" کہنے لگے لکچر اگر اچھا تھا تو ضرور اس کی اہم باتیں یاد رہتیں"۔ میں نے حافظہ پر زور ڈال کر ایک آدھ بات پیش کی - فوراً اس کی تردید کر دی گئی - میں نے دوسرا خیال بیان کیا - اس پر کہا گیا کہ یہ خیال تو فلاں کا ہے - خلیفہ نے اڑا لیا - غرض ہر بات جو پروفیسر خلیفہ نے اپنے لکچر میں کہی تھی غلط تھی، لغو تھی، لچر تھی - گھنٹے دو گھنٹے تک اس کوہ آتش فشاں سے گرم گرم لاوا نکلتا رہا اور ہمارے لہلہاتے شاداب ذہنوں کو جھلساتا رہا - خلیفہ عبدالحکیم اس زمانے میں مولانا کے تقریباً روز کے ملاقاتی تھے - اور مولانا متعدد بار ان کی قابلیت اور ذہانت کا اعتراف کر چکے تھے - مجھے اس وقت یہ خیال ہوا کہ شاید خلیفہ صاحب سے کوئی تازہ رنجش ہو گئی ہو - مگر نہیں ایسی کوئی بات نہیں تھی - اس واقعہ کے بعد خلیفہ صاحب حسب معمول پروفیسر سلیم کے گھر تشریف لاتے رہے اور اپنی شگفتہ گفتگو سے محفل کو گرماتے رہے - مگر انہیں کیا خبر کہ اسی مقالے پر اُن کے برہمو سماج والے لکچر نے کیا آگ لگائی تھی!!

یہ تو رہی دوسرے شعبوں کے پروفیسروں کی بپتا - اگر اردو ادب کا کوئی دعوے دار یا اس کا کوئی طرفدار سامنے آجاتا تو اس کی کیا درگت بنتی، قیاس کیا جا سکتا ہے - مولانا سلیم کی پروفیسری کے زمانے میں حیدرآباد میں چند ایسے ادیب بقید حیات تھے جن پر اردو ادب کو ناز تھا -

حکیم امتیاز الدین مرحوم عربی فارسی کے عالم تھے، طب میں حکیم اجمل خاں مرحوم کے ہم جماعت ہونے کے علاوہ وہ بڑے زبردست سخن فہم اسلامی تھے

خصوصاً غالب کے کلام سے اتنا شغف رکھنے اور اس کا سمجھنے والا شاید ہی ہندستان میں کوئی دوسرا پیدا ہوا ہو۔ حکیم ضیاءالدین حیدرآباد میں بذات خود ایک ادارہ تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے مستقل پرنسپل ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ شاید تعلق تلمذ بھی تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کو بھی ان سے نیازمندانہ خلوص تھا۔ اس کے علاوہ حکیم صاحب کا سرکاری حلقوں میں عجیب اثر تھا۔ غالباً مولوی عبدالحق کے تعلق سے پروفیسر سلیم بھی ان سے متعارف ہوئے۔ وہ ایک مرتبہ ان کا ذکر آ گیا جس میں بھنچے ہوئے پھیکے انداز میں مولانا سلیم نے ان کا ذکر کیا ہے اس کو میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے برقی مشین کے کسی پرزے کی غلط بندش سے بجلی کی رَو الٹی چل رہی ہو۔

دوسرے مرزا ہادی رسوا مرحوم تھے۔ جو دارالترجمہ کے رکن تھے۔ غالباً مرزا صاحب سے مولانا سلیم لکھنؤ سے واقف تھے۔ وضع اصطلاحات کی کمیٹی میں دونوں کو ہمنشینی کا موقع ملتا تھا۔ وہاں مرزا صاحب کی توضیح میں پروفیسر سلیم اپنے کسی حربے سے دریغ نہیں فرماتے تھے۔

تیسرے علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی (حیدر یار جنگ) مرحوم تھے۔ جو عربی کے جید عالم، فارسی کے فاضل کامل، اور اردو کے بے مثال ادیب اور شاعر تھے۔ وہ عمر میں پروفیسر سلیم سے بہت بڑے تھے۔ مٹیا برج کلکتے میں آخری شاہ اودھ، واجد علی شاہ کے شہزادوں کے اتالیق رہ چکے تھے۔ عبدالحلیم شرر مرحوم ان کے شاگرد ہونے کا فخریہ انداز میں اعتراف کرتے تھے۔ طباطبائی مرحوم کی شرح دیوان غالب وہ چیز تھی جس نے غالب کے گنج ہائے معانی کا دروازہ کھول دیا تھا۔ مرحوم دارالترجمہ میں ناظر ادبی تھے۔ اور اصطلاحات کی کمیٹی کے بھی رکن تھے۔ طباطبائی مرحوم سے مولانا سلیم جتنا جلتے تھے۔ شاید دنیا بھر میں کسی اور سے اتنا نہ جلتے ہوں۔ میں بدقسمتی سے فن شعر میں طباطبائی مرحوم کو اپنا استاد سمجھتا تھا۔ اور جو کچھ میری تک بندی ہوتی تھی انہیں کو دکھا کر اصلاح لیتا تھا مگر میری کیا مجال تھی کسی دن پروفیسر سلیم کے روبرو اس کا ذکر کرسکتا کہ میں علامہ طباطبائی کی خدمت میں بھی حاضری دیا کرتا ہوں۔ اور جو کہیں انہیں یہ معلوم ہو جاتا کہ میں علامہ موصوف کو اپنا کلام بھی دکھاتا ہوں تو خدا ہی جانے کیا قیامت آ جاتی۔ لطف یہ کہ بی اے

کے نصاب میں دیوان غالب بھی شامل تھا۔ مولانا سلیم، طباطبائی مرحوم کی شرح ہمیشہ پیش نظر رکھا کرتے تھے، مگر کبھی کسی مقام پر طباطبائی مرحوم کی شرح کی تعریف نہیں فرمائی بلکہ جہاں موقع مل جاتا اس شرح پر اعتراض کرتے، پھبتی اڑاتے بلکہ گالی تک سے سرفراز کر دیتے۔ ابتدائی زمانے میں جبکہ مجھے مولانا سلیم کی اس افتاد طبیعت کا علم نہیں تھا، میں نے اور چند دوسرے طلبہ نے علامہ طباطبائی کی شرح دیوان غالب اور ان کے "گریز ایلجی" کے ترجمہ "گور غریباں" کی تعریف کر دی تھی۔ شاید اس کا اثر تھا یا ویسے ہی بمقتضائے عادت وہ میرے مواجہ میں علامہ طباطبائی کو صلواتیں سنائے بغیر نہیں رہ سکتے تھے یہ وظیفہ شاید ہی کسی ہفتہ ناغہ ہوا ہو۔

تین چار برس کے تجربے کے بعد اس کا یقین ہو چلا تھا کہ جس کسی ادیب یا شاعر کو صلواتیں سننا منظور ہو، مولانا کے سامنے اس کی تعریف کر دینی کافی تھی۔ پھر بھی مجھے خوب یاد ہے کہ صرف دو ہستیاں ایسی تھیں جن کو مولانا نے ہماری کوششوں کے باوجود کبھی برا نہیں کہا۔ ایک تو مولانا حالی اور دوسرے مولوی عبدالحق۔ مولانا حالی کے متعلق تو میں نے طرح طرح کے جتن کئے، اس لئے نہیں کہ مجھے مولانا حالی سے کسی قسم کی کد تھی بلکہ محض اس لئے کہ دیکھیں مولانا حالی پر کس سمت سے گولہ باری ہوتی ہے اور کس قسم کی ہوتی ہے۔ کبھی تو ہم نے مولانا سلیم کو مخاطب کر کے مولانا حالی کی غیر معمولی تعریف کر دیکھی اور کبھی ان پر جا و بیجا تنقید کی مگر معلوم نہیں کہ مولانا حالی کا کتنا زبردست اخلاقی اثر تھا کہ کبھی مولانا سلیم کے توپ خانے میں فتیلہ نہیں لگا۔ مولانا حالی ہمیشہ بے گزند بچ نکلے بلکہ کبھی کبھی ہماری ہی زجر و توبیخ ہوتی۔ مگر کبھی اس کا اعتراف بھی نہ فرمایا کہ مولانا حالی کے ان پر کیا احسانات ہیں۔ میں نے از خود یہ قیاس قائم کر لیا تھا انہیں سرسید کے حلقہ تک پہنچانے والے مولانا حالی ہی ہوں گے۔ اس لئے ایک مرتبہ موقع پا کر نہایت ادب سے ایسے سوالات کئے جن سے اس نظریے کی تائید میں جواب حاصل ہوتے۔ لیکن کھلے الفاظ میں ان کے کسی احسان کا تذکرہ نہیں فرمایا۔

البتہ مولوی عبدالحق کے متعلق بعضوں سے سنا کہ تیغ لسان کے زخم کھا چکے ہیں مگر میں شہادت دیتا ہوں کہ میرے سامنے کبھی ان پر وار نہیں کیا گیا۔ حالانکہ خدائے قدوس کی ذات بھی اس سے بچی نہ تھی۔

اس سلسلے میں مولانا سلیم کے مذہب کی طرف بھی خیال کی رَو بہہ نکلتی ہے وہ عام طور پر دہریہ مشہور تھے۔ اور سرسید کے تعلق سے اُن کے "نیچری" ہونے کا قطعی امکان تھا۔ سرسید اور اُن کے حلقے کو اُس زمانے کے مُلّا قسم کے لوگ "نیچری" کہا کرتے تھے۔ اگر مولانا سلیم سے مجھے شرف تلمّذ حاصل نہ ہوتا تو شاید کبھی اس اصطلاح کے نہ انگریزی معنے سمجھ میں آتے نہ اُردو کا مفہوم ہی واضح ہوتا۔ مولانا سلیم نہ صرف تصوّرِ خدا کے منکر تھے بلکہ طرح طرح سے اس کا مضحکہ اُڑایا کرتے تھے۔ ابتدائی دو تین سال تک مَیں اُن کے اس انکارِ خدا سے بڑا مرعوب ہوا کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ باوجود مشرقی تعلیم کے مولانا سلیم تصوّرِ خدا کے متعلق اُسی نتیجے پر پہنچے ہیں جس پر یورپ کے مشہورِ عالم فلسفی پہنچ چکے تھے۔ مجھ میں اپنی علمی بے بضاعتی اور ذہن کی ناپختگی کی وجہ سے اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس مسئلے پر مولانا سے کسی قسم کی بحث کر سکوں پانچ چھ سال کے بعد جب راقم الحروف بھی مغربی فلسفے سے کچھ آشنا ہو چلا اور خصوصاً نظریہ مادیت کا اپنی بساط کی حد تک غائر مطالعہ کیا تب اپنے کو اس قابل سمجھا کہ مولانا کی نبض پر ہاتھ رکھوں۔ اس کے لئے میں نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو بہت طیار کر لیا تھا۔ اور موقع کی تلاش میں تھا۔ خدا خدا کر کے وہ موقع آیا۔ میں یہ سمجھا ہوا تھا کہ وہ انیسویں صدی عیسوی کے یورپی فلسفیوں کے دلائل اپنے انداز میں پیش فرمائیں گے اور میں اُن کے جواب میں ابتدائی بیسویں صدی کے مُفکّروں کے اُن اعتراضوں کو پیش کروں گا جن سے وہ دلائل ردّ ہو چکی ہیں۔ مگر مجھے کتنی مایوسی ہوئی کہ تھوڑی سی بحث کے بعد معلوم ہوا کہ مولانا کو نہ اُنیسویں صدی کے فلسفیوں کے استدلالات کی ہوا لگی ہے نہ بیسویں صدی کے مُفکّروں کے اعتراضات کی۔ جو کچھ دلائل اُنہوں نے پیش کئے وہ بہت پیش پا افتادہ عامیانہ قسم کے تھے جن کی نہ کوئی منطقی بنیاد تھی نہ علمی بس ایسا معلوم ہوا کہ جس طرح کوئی مسلمان لڑکا مُسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے کم از کم زبانی حد تک 'خدائے واحد' پر ایمان رکھتا ہے، اُسی طرح مولانا سلیم بھی خدا کے نہ ہونے پر ایمان رکھتے تھے۔ اس کے بعد میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوا کہ تمام "نیچریوں" کا یہی حال ہوگا۔ بیچارے "نیچری" سب کے سب مشرقی تعلیم یافتہ تھے۔ یورپی فلسفیوں کے نظریہ ملحدیت کی ہوا کا گزار کھائیں پہ سے گزرنا اُن کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان کے اندر اصلاح اور ترقی کا جوش تھا۔ واقعہ ۱۸۵۷ء کے مسلمانوں کی سیاسی شکست کے ساتھ ساتھ ہر شعبۂ زندگی پر شکست کی مہر لگا دی تھی۔ ہندوستان میں انگریزوں کے سیاسی اقتدار کے ساتھ ہر شعبۂ حیات میں ان کی برتری نمایاں ہوتی جاتی تھی۔ عوام میں اس سیاسی انقلاب سے کوئی خاص بے چینی پیدا نہیں ہوئی کیونکہ ان میں نہ سیاسی شعور تھا اور نہ انہیں سیاسیات سے کوئی واسطہ۔ البتہ تعلیم یافتہ طبقوں میں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، انگریزوں کی اس سیاسی فتح اور کامرانی کا راز معلوم کرنے کا اضطراب پیدا ہو چلا تھا۔ ان کو راہ نجات اس میں نظر آئی کہ انگریزی تعلیم کو رواج دیا جائے۔ انگریزوں کی چال ڈھال اور خو بو اختیار کی جائے اور چونکہ یورپ اور انگلستان کے تعلیم یافتہ طبقے منکرِ خدا ہیں، دہریہ ہیں اس لئے انکارِ خدا سے ہماری بھی دماغی بلندی ثابت ہو جائے گی۔ سرسید اور اُن کے ہم نواؤں کو مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی کی لگن لگی ہوئی تھی۔ اس لئے ان لوگوں نے اپنے دہریہ ہونے کا اعلان نہیں کیا۔ ان لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بھی موجود تھا کہ اسلام کی طاقت دنیا سے اپنا لوہا منوا چکی ہے۔ لیکن اُس اسلام کو ملاؤں نے اتنا مسخ کر دیا ہے کہ صورت پہچانی نہیں جاتی۔ اس لئے اصلی اسلام کو تلاش کرنا چاہئے اور اس کو نئی زندگی کے مطابق بنانا چاہئے۔ قرآن کی ایسی نئی تفسیر کی جائے کہ وہ موجودہ سائنس کے مطابق اور تعلیم یافتہ عقلوں کے لئے قابلِ قبول ہو۔ اور ملاؤں کے اسلام سے بیزاری کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ خانگی صحبتوں میں شخصی خدا کے تصوّر سے انکار بلکہ اس کا مضحکہ اُڑانے لگے۔ اس سے ایک طرف تو اپنی علمیت اور فلسفیت کا سکّہ بیٹھتا ہے اور دوسری طرف جاہل قسم کے سامع کی وحشت کا نظّارہ ایک خاص ذہنی لذت بخشتا ہے۔ مولانا سلیم کی نیچریت یا دہریت یا انکارِ خدا میں یہ سب پہلو جھلکتے تھے۔ گویا اُن کی عقیدت کی ولادت ہی ایسے خاندان میں ہوئی تھی جس میں "انکارِ خدا" ایک عقیدے کی حیثیت رکھتا تھا نہ کہ ایک فلسفے کی !! مولانا سلیم کے علاوہ مجھے اس گروہ کے دو چار تابعین اور تبع تابعین سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا جس سے میرے مذکورۂ بالا خیال کی اور تصدیق ہوتی گئی۔

انکارِ خدا کے عقیدے کی طرح ایک اور عقیدہ بھی سرسید کے حلقے سے وراثت میں ملا تھا۔ اور وہ غزل کی مخالفت تھی۔ غزل کو مجرا ٹھیرانے

میں ان کی ساری دماغی قوتیں صرف ہوجاتی تھیں۔ اپنی طاقت لسانی سے وہ طلبہ کی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنا لینے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔ طرح طرح سے وہ غزل گوئی کا مضحکہ اُڑاتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں راقم الحروف بھی اُن چند بدنصیبوں میں تھا جو غزل گوئی کی مخالفت میں اُن کے ہم خیال نہ ہو سکے۔ ورنہ اکثریت تو فوراً اُن پر ایمان لے آتی تھی خواہ بعد کو بہت سے مرتد ہوجائیں۔ غزل کی تائید میں کوئی دلیل اُن پر اثر نہیں کرسکتی تھی۔ بس ایک عقیدہ تھا جس کو منوانے پر وہ ہمیشہ مستعد رہتے تھے۔ اُن کے وہاں تضحیک اور استہزاء کا ایسا خوف ناک حربہ تھا کہ بہت سے طالب علم اس حربے کے خوف سے اپنے ہتھیار ڈال دیتے تھے اور اُن کی پناہ میں چلے جاتے تھے۔ باوجود غزل گوئی کی اتنی مخالفت کے، پانچ چھ سال کے بعد ہم نے دیکھا کہ مولانا خود بچاس بچاس، ساٹھ ساٹھ اشعار کی غزلیں کہہ کر مشاعروں میں پڑھتے تھے اور داد پا کر مسرور ہوتے تھے۔

پروفیسر سلیم کے متعلق ایک بات اور عرض کردوں۔ باوجود مشرقی تہذیب میں پرورش پانے کے، ان میں فرض شناسی کا غیر معمولی جوہر تھا۔ وہ کالج میں کبھی ایک منٹ دیر سے نہیں آئے۔ اور پڑھانے کے معاملے میں کبھی سہل انکاری یا بے پروائی نہیں کی۔ جماعت میں آنے سے پہلے سبق کی پوری طیاری کرکے آتے تھے۔ اور سبق میں کوئی چیز تشنہ نہیں چھوڑتے تھے۔ قصائد ذوق میں ایک جگہ راگنیوں کے نام آگئے ہیں۔ اس کے لئے وہ فن موسیقی کی کتابیں تلاش کرتے رہے۔ سرکاری کتب خانۂ آصفیہ میں ایک عمدہ کتاب موجود تھی۔ انہوں نے کتب خانہ میں جاکر پوری کتاب کا مطالعہ کیا۔ اور نوٹ لکھ لائے تب کہیں ذوق کے اُن اشعار کو سمجھانے کا حق ادا کیا۔ اسی طرح اگر کہیں انگریزی خیالات سے واسطہ پڑجاتا تو وہ اصل مصنف کی کتاب سے اس کا مفہوم سمجھ لیتے تب اس خیال کو سمجھاتے تھے۔ لکچروں کی تمام طیاری وہ قبل از وقت کر رکھتے تھے تاکہ طلبہ کا وقت ضائع نہ ہو اور نصاب کی تکمیل میں کوئی حرج واقع نہ ہو۔

مذہب پر چوٹیں کرنے، اور وجود خدا کے متعلق شک و شبہ ظاہر کرنے کی وجہ سے بعض مذہبی خیالات رکھنے والے طلبہ مولانا سلیم سے نفرت کرتے تھے۔ اور انہیں بُرا بھلا کہتے پھرتے تھے۔ مولانا کے دہریہ ہونے کی اطلاع یونیورسٹی سے باہر کے حلقوں تک پہنچ گئی تھی۔ جب کبھی کسی بیرونی حلقے کی صدائے بازگشت مولانا کے کانوں تک پہنچتی تھی تو ان میں ایک اطمینان اور تفاخر کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ مجھے تو کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گویا ان کی عین خواہش یہی ہے کہ دنیا میں ان کی دہریت کے چرچے ہوتے رہیں۔ افسوس کہ دنیا کو اتنی فرصت نہ تھی۔ مولانا سے دہریت پر بحث کا واقعہ میں لکھ چکا ہوں۔ اس واقعے کے بہت بعد ایک مرتبہ معلوم نہیں کس وجہ سے میں نے مولانا سے عرض کیا کہ "مولانا مجھے یقین ہوچکا ہے کہ آپ دہریہ وہریہ کچھ نہیں ہیں" اس پر کچھ جز بز ہوئے ان کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ اس فقرے سے وہ اپنی ہتک سی محسوس فرما رہے ہیں۔ میں نے گرتی دیوار کو تھامنے کی کوشش کرتے ہوئے دوسرا فقرہ عرض کیا "مجھے تو آپ کی دہریت صوفیانہ قسم کی معلوم ہوتی ہے" دیوار سنبھل گئی۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ میں نے تصوف کے مسئلے "ہمہ اوست" کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور ایسے سوالات شروع کئے جن سے استفاضہ کا مقصد ثابت ہو۔ حالانکہ وہ اس مسئلے کو بہت خوبی اور تفصیل سے بی اے کی جماعت میں سمجھا چکے تھے۔ اب وہ اس انہماک سے اس مسئلے پر تقریر کرنے لگے جیسے کہ وہ اس مسئلے پر دل سے عقیدت رکھتے ہیں۔ مجھے اس صحبت سے اتنا حاصل ہوا کہ مولانا کی دہریت کو تسلیم نہ کرنا بھی خطرناک ہے!

میں عرض کررہا تھا کہ مذہبی تصورات اور عقائد کا کالج کی جماعتوں میں مضحکہ اُڑانے پر بعض طلبہ اُن سے ناخوش ہوجاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم اُن سے اُلجھ گیا۔ مولانا کو بھی غصہ آگیا اور سخت الفاظ زبان سے نکل گئے۔ طالب علم تاؤ کھا کر مولانا کو گستاخی سے سخت سست کہہ بیٹھا۔ بڑا ناگوار منظر پیدا ہوگیا۔ دوسرے طلبہ نے بیچ بچاؤ کرکے اس لڑکے کو ٹھنڈا کیا۔ اور شاید جماعت سے باہر لے گئے۔ اس کے بعد وہ لڑکا جماعت میں آتا رہا۔ مگر مولانا اس سے ناراض اور وہ مولانا سے سخت ناخوش۔ یہ واقعہ امتحان سے چند ہفتے پہلے ہوا۔ اب ہم سب کو یقین تھا کہ امتحان میں اس طالب علم کے پرچے کی خیر نہیں۔ وہ خود بھی یہی سمجھتا تھا اور اردو کے دوسرے

پرچے پر اپنی کامیابی کی آس لگا رکھی تھی - جب نتیجہ نکلا تو وہ دوسرے پرچے میں تقریباً ناکامیاب تھا - اور مولانا سلیم کے پرچے میں اس کے نمبر کامیابی کی حد سے بہت زیادہ آئے تھے - اس کے دل پر مولانا کی انصاف پسندی کا بڑا اثر ہوا - جب مولانا کالج میں ملے تو اس نے احسان مندی کے جذبے میں آبدیدہ ہو کر مولانا کے سامنے سر جھکا دیا - مولانا نے اسے سینے سے چمٹا لیا اور فرمایا "بیٹے کیا تم مجھے اتنا ذلیل سمجھتے ہو کہ میں اپنی ناخوشی کا بدلہ تمہیں امتحان میں فیل کر کے لونگا - میں تم لوگوں کو اپنی اولاد سمجھتا ہوں - بچے کبھی کبھی باپ کے ساتھ شوخیاں کر بیٹھتے ہیں - میں نے تمہیں اسی وقت دل سے معاف کر دیا تھا" مولانا کے یہ الفاظ سُن کر وہ تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا - ہم سب طلبہ پر جو اس وقت حاضر تھے عجب تاثر کا عالم طاری تھا - اس کے بعد ہم نے تجسّس کیا تو واقعی یہ بات ثابت ہوئی کہ انہوں نے اپنے چاہیتے شاگردوں کے ساتھ بھی یہ رعایت نہیں کی کہ اُن کے حق سے زیادہ ایک نمبر بھی زیادہ دیا ہو - اس معاملے میں ہم نے انہیں سخت دیانت دار پایا - اس یقین سے ہمیں بڑا اطمینان حاصل ہوا کہ امتحان کے باب میں مولانا کی خوشی ناخوشی کوئی چیز نہیں - جو جتنی محنت کریگا، اس کا صلہ مولانا سے ضرور مل جائیگا - بہت سے پروفیسروں میں اس صفت کی کمی نظر آتی تھی -

عثمانیہ یونیورسٹی کو وہ آٹھ نو سال سے زیادہ فیض نہیں پہنچا سکے - ایم اے کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد ہم نے حیدرآباد سے ایک ہفتہ وار اخبار نظام گزٹ جاری کیا - مولانا ابوالکلام آزاد کا رسالہ "الہلال" ہمیں دل سے پسند تھا اس لئے الہلال ہی کے نمونے پر نظام گزٹ کی داغ بیل ڈالی گئی مطمح نظر یہ تھا کہ الہلال کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، ریاست حیدرآباد کے عوام میں سیاسی شعور بیدار کیا جائے کچھ اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے اور کچھ اخبار کا اونچا معیار قائم کرنے کے اشتیاق میں، ہمیں کام بے حد کرنا پڑتا تھا - اس انہماک کی وجہ سے کسی اور طرف توجہ کرنے کی مہلت ہی نہیں ملتی تھی - چنانچہ کئی مہینے تک

مولانا سلیم کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع نہیں ملا - ایک روز اخبار کے دفتر میں مولانا کا ایک کارڈ ملا جو سکندرآباد کے سول ہسپتال سے لکھا گیا تھا - مولانا نے لکھا تھا کہ انہوں نے ریل میں کسی مسافر کے یہاں نظام گزٹ کے کچھ پرچے دیکھے - پرچے کی تعریف فرما کر ہماری حوصلہ افزائی فرمائی تھی - اور اپنی بیماری کا حال بھی لکھا تھا - اس کارڈ کو دیکھ کر مجھ پر بڑی ندامت طاری ہوئی - ضمیر نے ملامت کی کہ اخبار چھپا اور تو اخبار لے کر خود مولانا کی خدمت میں کیوں حاضر نہ ہوا اور یہ غفلت کہ ان کے بیمار ہونے تک سے مطلع نہیں ہوا - غرض تہیّہ کر لیا کہ فوراً مولانا کی خدمت میں حاضر ہونگا - مگر اس وقت کچھ فوری اور مؤقّت کام سر پر تھا - اس کو نمٹاتے نمٹاتے دو تین روز اور گزر گئے - اس کے بعد جب ان کی خدمت میں حاضر ہونے چلا تو معلوم ہوا کہ بیماری کی وجہ سے وہ ملیح آباد تشریف لے جا چکے ہیں - مجھے معلوم تھا کہ ملیح آباد میں ایک ڈاکٹر صاحب مولانا کے جگری دوست رہتے تھے - جن سے ملنے کے لئے مولانا گرما کی تعطیلات میں ملیح آباد ضرور جاتے تھے - غرض اس وقت تو مولانا سے ہمیشہ کے لئے جدائی ہونے کا خیال تک نہیں آیا مولانا کی عام صحت اچھی تھی یہی خیال تھا کہ مہینے پندرہ دن کے بعد وہ صحت یاب ہو کر حیدرآباد واپس آجائیں گے - مگر افسوس کہ تھوڑے ہی دن کے بعد اطلاع آئی کہ مولانا سلیم ملیح آباد ہی میں انتقال فرما گئے -

انتقال کی خبر سُن کر بڑی شدّت کے ساتھ یہ ارادہ کیا تھا کہ مولانا کے حالات جو کچھ میں نے ان سے سُنے تھے - اور جو کچھ لوگوں نے بیان کئے تھے - اور جو کچھ خود میں نے دیکھے تھے ان سب کو تفصیل کے ساتھ مرتّب کر کے کتابی صورت میں شائع کروں گا - مگر اخبار نویسی کا بُرا ہو کہ دو تین سال تک تو اس ارادے کا پہلا قدم اٹھانے کا بھی موقع نہیں ملا - اس کے بعد زندگی نے ایسے ایسے پہلو بدلے کہ آج تک وہ ارادہ شرمندۂ عمل نہیں ہو سکا -

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

تعلیم بالغاں کی اہمیّت

دیہات میں تعلیم بالغاں کے متعلق میسور میں ۲ نومبر ۱۹۴۹ء کو یونیسکو سیمنار کے افتتاح کے موقعہ پر آنریبل مولانا ابوالکلام آزاد نے جو تقریر کی اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

مولانا ابوالکلام آزاد نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے یونیسکو کا شکریہ ادا کیا۔ کہ اس نے اس اجتماع کے لئے اس ملک کی دعوت قبول کی۔ انہوں نے ایشیا کے لئے کانفرنس کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ایشیا صدیوں کی نیند کے بعد بیدار ہو رہا ہے۔ ایشیا کی گزشتہ شاندار روایات کا تقاضا ہے۔ کہ اب اس نئی بیداری کے بعد یہ براعظم پھر دنیا کو اس طرح ایک نیا پیغام دے جس طرح اس کی قدیم تہذیب نے ماضی میں دیا۔ ایشیا ہی وہ براعظم ہے جس نے دنیا کو مذہب، فلسفے، تمدن اور تہذیبیں عطا کی ہیں۔

یہ زمانہ جمہوریت کا ہے۔ جس میں مساوات اخوت اور آزادی کا دور دورہ ہے۔ ایشیا کو بھی اس نئے دور کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا چاہیئے۔

یہ ایک متفقہ امر ہے۔ کہ آنے والی نسلوں کی تعلیم کی ذمہ داری حکومت کی بنیادی ذمہ داریوں میں سے ہے۔ لیکن بالغوں کو پڑھانا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ حال جو مستقبل کا ساتھ ہے۔ اس تعلیم پر منحصر ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے تقریر جاری رکھتے ہوئے ایشیا کے مختلف ممالک اور ہندوستان میں خواندہ لوگوں کے اعداد و شمار بتاتے ہوئے کہا۔ یہ صورت حال نہ صرف غیر اطمینان بخش ہے۔ بلکہ از حد پریشان کن ہے۔ چنانچہ حکومت ہند نے اپنی تعلیمی منصوبہ بندی میں تعلیم بالغان کو سرفہرست رکھا ہے۔

سائنس کی فتوحات ہمیں اس مقام پر لے آئی ہیں کہ اگر ہم نے نفرت شک، و شبہ اور عدم اعتماد کو دور نہ کیا تو انسانیت تباہ ہو جائے گی۔ اس کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ اور وہ یہ کہ عوام اپنی طاقت منوائیں۔ انہوں نے کوئی ذمہ داری قبول نہیں کی ہے۔ اور حکومتوں کے طرز عمل کا نے بھی انہیں پابند نہیں کیا ہے اگر وہ حالات حاضرہ میں دلچسپی لینے لگیں۔ اور مطالبہ کریں کہ حکومت امن کی خاطر کی جائے تو صرف اس وقت مختلف حکومتیں امن کی راہ پر چلیں گی۔

یہ مقصد تعلیم بالغان کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتا ہے یہ تعلیم اسے معاشی حالات کو سدھارنا ہی نہیں سکھائے گی۔ بلکہ اسے شہریت کی تربیت بھی دے گی۔ تاکہ وہ اپنی حکومت کو ایسے فیصلے کرنے میں مدد دے جو امن اور ترقی کے ممد و معاون ہوں۔

سماجی تعلیم کے سلسلے میں سب سے پہلا مسئلہ ان پڑھ بالغوں میں تعلیم کے لئے دلچسپی پیدا کرنا ہے۔ اور پھر اس دلچسپی کو قائم رکھنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ان پڑھ بالغ کی ذہنیت ایک بچے سے بالکل مختلف ہے۔ ان پڑھ ہوتے ہوئے بھی وہ ذہنی بلوغت کا مالک ہوتا ہے اس لئے اسے پڑھانے کا ڈھنگ بچوں کے ڈھنگ سے مختلف ہوگا مجھے یقین ہے کہ یہ سیمنار موجودہ ذہنی اور بصری طریقوں کی پوری چھان بین کرنے کے بعد موزوں طریقے پیش کرے گا۔

میرے خیال میں ہمیں زبانی پڑھائی پر زیادہ زور دینا چاہیئے۔ اگرچہ زبانی پڑھائی کے طریقے سے سب کچھ حاصل نہیں ہو سکتا مجھے امید ہے کہ اس سیمنار میں جمع ہونے والے ماہر زبانی پڑھائی۔ کتابوں کے استعمال تعلیم بذریعہ مثال و تجربہ تعلیم بذریعہ سلائیڈ و فلم۔

حفظانِ صحت۔ ابتدائی ریاضی۔ شہریت کی ابتدائی تعلیم یا تجارت و بیوپار کے عام اصولوں کے متعلق تفصیلات بتائیں گے۔

سماجی تعلیم کے پروگرام کے لئے ایشیائی ممالک کا ایک دوسرا مسئلہ اُستادوں کی فراہمی ہے۔ اس باب میں ہندوستان کی ضرورت بہت نمایاں ہے۔ ہمارے ملک میں قریباً پچاس فی صدی بالغ اَن پڑھ ہیں۔ یہاں سکول میں جانے والے بچوں کی تعداد کل آبادی کا آٹھواں حصہ ہے اور اُن کے لئے ہمیں دس لاکھ اُستادوں کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اَن پڑھ لوگوں کے لئے ہمیں چالیس لاکھ اُستادوں کی ضرورت ہوگی۔ بلکہ اس سے زیادہ کی بھی ضرورت ہو سکتی ہے۔ اگر ہم یہ دیکھیں کہ تعلیم بالغان کے پروگرام کے لئے پہلی منزل کے لئے صرف تین مہینے کا کورس درکار ہے تو بھی اس مہم کے لئے ہمیں مسلسل طور پر دس لاکھ سے زیادہ اُستادوں کی ضرورت ہے۔

اُستادوں کی ضرورت کو پُورا کرنے کے لئے ہم قومی خدمت کے تعلیم یافتہ لوگوں کی جبری بھرتی پر غور کر رہے ہیں۔ اگر میٹرک پاس کرنے کے بعد تمام طلبا پر یہ لازم کر دیا جائے کہ چھ ماہ کے لئے اَن پڑھ لوگوں کو پڑھائیں۔ تو اس سے مشکل بہت حد تک حل ہو سکتی ہے لیکن یہ ابھی دیکھنا ہے کہ قومی تعلیم کے پروگرام کے لئے سکول کے اُستادوں یا کالج میں پڑھنے والے نوجوانوں سے کام لینا کہاں تک سُود مند ہو گا۔ لہٰذا آپ اِس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد ہندوستان اور ایشیا سے سفارشیں کریں۔

اور بھی بہت سے مسائل ہیں۔ لیکن میں یہاں صرف ایک اور مسئلہ کا ذکر کروں گا۔ ممکن ہے۔ دُوسرے ملکوں کو بھی اس مسئلے کا سامنا ہو۔ وُہ مسئلہ یہ ہے۔ کہ اکثر لوگ پڑھنا لکھنا سیکھ لینے کے بعد پھر اس میں دلچسپی نہیں لیتے اور ایک طرح سے پھر اَن پڑھوں میں شامل ہو جاتے ہیں آپ کو اس رجحان کی روک تھام کے وسائل پر غور کرنا ہوگا۔ اس سلسلہ میں پڑھنا لکھنا سیکھ جانے والوں کے لئے موزوں کتابیں چھاپنے تعلیمی جماعتوں کو جاری رکھنے۔ لیکچروں میں توسیع۔ سلائیڈ اور فلم کی نمائش کرنے اور دیگر طریقے ہیں۔ آپ کو یہ بتانا ہوگا کہ موجودہ مالی مشکلات کے پیشِ نظر کن طریقوں کو ترجیح دی جانی چاہیئے۔

مجھے خوشی ہے کہ مختلف ملکوں کے ماہروں کا یہ سیمنار تعلیم کے مذکورہ بالا تمام پہلوؤں پر غور و فکر کر رہا ہے۔ بلاشبہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ سیمنار اپنی تحقیقات سے جو نتائج اخذ کرے گا۔ وُہ ہمارے مقاصد کی تکمیل کے لئے بہت مُفید ہوں گے۔

ہندوستان کے دروازے ہمیشہ غیر ملکی مدبروں اور دانشمندوں کے لئے کھلے رہے ہیں۔ سالہا سال سے یہ ملک کئی نظریوں کا سنگم رہا ہے۔ کشادہ دلی اور رواداری اس کے بنیادی اصُول ہیں۔ مہاتما گاندھی نے موجودہ تقاضوں کی روشنی میں دُنیا کو پھر سے وہی پیغام سُنایا۔ وُہ ایک ایسی نئی تعلیم کے حامی تھے۔ جو انسان کے کیرکٹر کی از سرِ نو تشکیل کرے۔ اگر ہم اُن کے رواداری اور فراخدلی کے جذبے کو اپنے نجی اور عوامی چلن میں جذب کر لیں تو اپنے اختلافات کے باوجود ہم باہمی جھگڑوں کو دُور کر سکتے ہیں۔

مجھے اُمید ہے کہ ۱۴ دسمبر کو جب میں آپ سے پھر ملوں گا۔ تو آپ بہت سے مسائل کو سُلجھا چکے ہوں گے۔ اِس دَوران میں ہمارا باہمی رابطہ قایم رہے گا۔

ان الفاظ کے ساتھ میں دیہاتی تعلیم بالغان کے اِس ایشیائی سیمنار کا افتتاح کرتا ہوں۔

گذارش

براہِ کرم مضمون خوشخط اور صفحے کے ایک طرف لکھئے صفحے کے دائیں طرف حاشیہ سادہ دیجئے۔ پوسٹ کارڈ پر لکھے ہوئے کسی نظم یا مضمون پر غور نہیں کیا جائے گا۔
مضامین نظم و نثر کے باب میں تمام مراسلت ادارے کے کسی رُکن کے نام کے عوض مدیر آجکل کے پتے پر ہونی چاہیئے۔ (ادارہ)

شمشاد احمد

قدیم ہند کی نوآبادیات

قدیم ہند کی نوآبادیات کا ذکر ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جس کے متعلق اب تک بہت کم مواد دستیاب ہو سکا ہے۔ چین کی تاریخی کتب، سیاحوں کے قلمبند کئے ہوئے حالات، پرانی عمارتیں یا اُن کے کھنڈر، کہنہ آثار اور کتبوں پر ہی ہمارے تمام منابع مبنی ہیں۔ لیکن معلومات کے اتنے محدود ذرائع کے باوجود جو حالات یقینی طور پر بیان کئے جا سکے ہیں اُن سے قدیم ہندوستان کے تمدن کی عظمت، وسعت اور ہمہ گیری کا بہت کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

قبل مسیح کی اوائل صدیوں میں اور اُس کے بعد ہندوستانی تہذیب اور تمدن کی جو متعدد چوکیاں وسط اور جنوبی مشرقی ایشیا میں قائم ہوئیں۔ ان کو اپنے ملک کی نوآبادیات کہنا ہرگز غلط نہ ہوگا۔ یہ نوآبادیات یورپین اقوام کی نوآبادیات سے جن کی تشکیل اور تعمیر سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ طبعاً مختلف تھیں۔ برطانیہ، ہالینڈ، اسپین، پرتگال اور فرانس کی نوآبادیات کی نشو و نما ایک گہرے سیاسی اور تجارتی ماحول میں ہوئی۔ ہندوستانی نوآبادیات کی ابتداء اور ارتقاء میں مادری ملک کے خود غرضانہ مقاصد بالکل مفقود تھے۔ ہماری ہر نوآبادی کی سیاسی تاریخ جُدا ہے، ان میں سے کوئی بھی ہندوستان کے تحت نہیں تھی، زمانے کے ساتھ ساتھ ان میں سے ہر جگہ حکومتیں بنیں اور بگڑیں اور سلطنتوں کے عروج و زوال ہوئے۔ دنیا کی نوآبادیات کی تاریخ میں ہماری قدیم نوآبادیوں کو ایک انفرادی جگہ حاصل ہے، اُن کا ایک خاص اور بالکل انوکھا نمونہ تھا۔ وہ خالص طور پر تمدنی معاشری اور مذہبی نوآبادیات تھیں۔

آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل وسط ایشیا کا وہ علاقہ جو آجکل صحرائے گوبی کی ریت کے نیچے دفن ہے۔ ہندوستان کا ایک گوشہ معلوم ہوتا تھا۔ سر آرل اسٹائن کی کاوشوں کے بدولت وہاں پر متعدد بُدھ استوپ اور خانقاہوں کے کھنڈر، بُدھ اور برہمن دیوتاؤں کی مورتیاں، اور ہندوستانی زبانوں اور ہندوستانی رسوم خط میں لکھے ہوئے بہت سے مسودے برآمد ہوئے ہیں۔ سر آرل نے لکھا ہے کہ ان دور افتادہ نوآبادیات پر ہندی تہذیب کا اس قدر گہرا اثر تھا کہ کھُدی ہوئی عمارات کے اندرونی حصوں کا جائزہ لینے سے اُن کو یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ قدیم ہندوستان کے کسی پنجابی شہر میں گھوم رہے ہیں۔ موجودہ ختن کے آس پاس بہت سے ہندوستانی جا کر آباد ہو گئے تھے۔ اور چوتھی صدی عیسوی میں تمام مشرقی ترکستان کاشغر سے لے کر چین کی سرحد تک ایک قسم کے بڑے ہندوستان کا جزو بن چکا تھا۔ اس علاقے کے شمال میں چار قابل الذکر سلطنتیں تھیں: بھروکا (اُچھ طرفان)، کوچی (تُھمارہ)، اگنی دیش (قرا شہر) اور رکاؤ چانگ (طرفان)۔ اور جنوب میں بھی چار: سیلا دیش (کاشغر)، کوکوکا (یارقند)، خوتامینا (ختن)، اور کلماڈا (شان شان)۔ ان میں اگنی دیش اور سیلا دیش بالکل ہندوستانی صوبوں کے نام معلوم ہوتے ہیں۔ کوچی کے شاہی خاندان کے چند ہندوستانی نام ملتے ہیں: سورن وکو، ہری دیو، سورن پُشپا، ہری پُشپا وغیرہ۔ ایسے ناموں کو چینی مورخین نے بہت کچھ بگاڑ دیا ہے۔ یہ بات قریب قریب یقینی ہے کہ ہندوستان سے آئے ہوئے لوگوں نے یہاں کی آبادی میں شادی بیاہ کئے اور تمدنی نقطۂ نظر سے اِن علاقوں کو پوری طرح تسخیر کر لیا۔ اس ہندِ کبیر کی تہذیب کا سب سے بڑا علمبردار کمار جیوا ہُوا ہے۔ کمارائن نامی ایک ہندوستانی آدمی یہاں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ کوچی کے بادشاہ پوشن کی بہن جیوا کو اُس سے محبت ہو گئی۔ ان کی شادی ہوئی اور ان کے لڑکے کا نام

ماں باپ کے ناموں کو ملا کر کمار اجیوا رکھا گیا۔ کمار اجیوا ایک نامور عالم ہوا جس نے ۲۰۰ سنسکرت کتابوں کا چینی زبان میں ترجمہ کیا۔ چینیوں کو مہایانی فلسفے سے اسی نے روشناس کرایا۔

چوتھی صدی عیسوی کے اواخر میں مشہور چینی سیاح فاہیان ان علاقوں سے ہوتا ہوا ہندوستان آیا۔ یہاں جو بدھ مذہب رائج تھا، اس کے حالات اس نے بہت تفصیل سے قلمبند کئے ہیں اور اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی عقاید و رسوم یہاں بجنسہٖ ہندوستان کی طرح تھے۔ ہندوستان کی رتھ یاترا کے نمونے پر یہاں بھی دیوتاؤں کے بتوں کا سالانہ جلوس نکالا جاتا تھا۔ ساتویں صدی عیسوی تک جب ہیون سانگ۔ ایک اور مشہور چینی سیاح۔ ادھر سے ہو کر گذرا، ان ممالک پر ہندوستانی تہذیب چھائی ہوئی تھی۔ یہاں سے جو بعض کتابیں برآمد ہوئی ہیں۔ اُن سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ ہندوستانی طریقہ علاج رائج تھا۔ یہاں کی عمارات میں گندھارا رسم فن کی گہری جھلک ملتی ہے اور جو چند تصاویر ملی ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد گپتا کے فنون کی روح یہاں بھی سرایت کر گئی تھی۔

جنوبی مشرقی ایشیا میں بھی چھوٹی بڑی بہت سی ہندوستانی نوآبادیات قائم ہوئیں۔ مشرق بعید کا یہ حصہ مصالحہ جات کی منافع بخش تجارت کے سبب سورن بھومی یا سونے کی نگری کہلاتا تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں ٹولیمی نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے مشرقی ساحل اور ملایا کے مجمع الجزایر و ایشیائے ہندی کے درمیان کافی تجارت تھی۔ بدھ مذہب کی پرانی کتابوں میں ان علاقوں کے تجارتی مرکزوں کے فہرست ملتی ہے اور ٹولیمی کے بیان سے ان کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ یہ بتانا بہت دشوار ہے کہ ان ممالک میں ہندوستانی حکومتیں کیسے قائم ہوئیں۔ اشوک اعظم کی وفات کے بعد موریہ حکومت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے راجہ خود مختار بن بیٹھے اور تخت و تاج کے امیدواروں میں باہمی جنگ و جدل شروع ہو گئی۔ ہر دو تین صدیوں کے بعد کسی بڑی سلطنت کے زوال کے وقت طوایف الملوکی کا یہی عمل دہرایا جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایسے مواقع پر مملکت کے ناکام اور مایوس امیدوار اور وطن کو خیرباد کہہ کر سونے کی نگری میں قسمت آزمائی کرنے چلے ہوں اور وہاں ہندوستانی تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالی ہو۔

ان نوآبادیات میں سب سے پرانی حکومت کمبوجا دیس (کمبوڈیا) کی تھی چینی تواریخ میں اس کا نام فوناآن درج ہے۔ اس کی ابتدا کے متعلق بہت سی روایات مشہور ہیں۔ لیکن کوئی بات تحقیقی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ پہلی یا دوسری صدی عیسوی میں ایک برہمن نے یہاں ایک چھوٹی سی ریاست قائم کی۔ کہتے ہیں کہ اس نے سب سے پہلے یہاں کی عورتوں کو کپڑے پہننا سکھایا۔ چھٹی صدی عیسوی میں کمبوجا دیس ایک زبردست سلطنت بن گئی اور یہاں کے راجاؤں نے ۹۰۰ برس تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کی۔ اپنے عروج کے زمانے میں کمبوڈیا کے علاوہ قریب قریب تمام چین کوچک، لاؤس، سیام اور برہما اور ملایا کے کچھ حصے اس حکومت میں شامل تھے۔ راجہ جے ورمن اول اور ثانی، یشو ورمن اور سوریہ ورمن یہاں کے مشہور حکمران ہوئے ہیں۔ ان علاقوں میں سنسکرت کے بہت سے پرانے کتبے ملے ہیں۔ جن سے اس نامور خاندان کے راجاؤں کے اکثر تفصیلی حالات معلوم ہوتے ہیں۔

کمبوجا دیس میں زیادہ تر شِوا کے ماننے والے تھے۔ لیکن بدھ مت اور وشنو مذہب کے پیروکاروں کا بھی اکثر ذکر آیا ہے۔ یہاں کے راجاؤں نے بڑی خوبصورت اور عظیم الشان عمارات تعمیر کرائیں ان میں سے انگکور واٹ کا شاندار مندر اب تک قائم ہے اور بجا طور سے اس کا شمار عجائبات عالم میں کیا جاتا ہے۔ دلآویز مجسموں سے مزین یہ مندر شِوا کی پوجا کے لئے بنا تھا۔ یہ عبادت گاہ چبوتروں کی تین وسیع منزلوں کے اوپر جن میں سے ہر اوپر والی منزل نیچے کی منزل کے مقابلے میں چھوٹی ہوتی گئی ہے، تعمیر کی گئی ہے۔ تمام منازل خوبصورت برجیوں اور میناروں سے مزین ہیں۔ تیسری اور آخری منزل پر ۸ مینارے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کی اونچائی ۱۸۰ فٹ ہے۔ مندر کا مرکزی مینار ۲۱۳ فٹ بلند ہے۔ اس کی چہار دیواری کی لمبائی (مشرق سے مغرب) ۲/۳ میل اور چوڑائی (شمال سے جنوب) ۱/۲ میل ہے۔ یہ چہار دیواری مختلف دلکش دروازوں سے آراستہ ہے۔ اور اس کے چاروں طرف ۷۰۰ فٹ چوڑی خندق ہے۔ جس کو پار کرنے کے لئے ایک ۳۶ فٹ چوڑا پتھر کا راستہ بنا ہے۔

اتنا اہتم بالشان اور اتنے زبردست پیمانے پر بنا ہوا مندر ہندوستان میں تو کیا دُنیا کے کسی حصّے میں ملنا مشکل ہے ۔

اس حکومت کی ایک اور قابلِ قدر یادگار انگکور تھام کا شہر ہے۔ اس کا اصلی نام یشودھر پور تھا اور اس کو راجہ یشو ورمن نے قایم کر کے اپنا دار الخلافہ بنایا تھا۔ اس کے بیچ میں بیون کا عالیشان مندر ہے۔ جو قریب قریب انگکور واٹ کے نمونے پر ہی طیار کیا گیا تھا۔ اس میں تقریباً ۵۰ منارے ہیں اور ہر منارے کے چاروں طرف مراقبے میں محو شوا کی شبیہ پتھر کو تراش کر بنائی گئی ہے۔

کمبوجا دیس کی حکومت کا زوال پندرھویں صدی عیسوی میں تھام کے حملہ آوروں کے ہاتھوں ہوا۔ اس کے بعد سے یہ ایک چھوٹی سی ریاست رہ گئی ہے جو اب بھی فرانسیسیوں کے زیرِ سایہ قایم ہے ۔

چین ہندی کی دوسری بڑی سلطنت چمپا میں قائم ہوئی۔ یہاں کا پہلا تاریخی بادشاہ سری مار تھا۔ جس کا زمانہ دوسری صدی عیسوی میں دھرم مہاراج سری بھدر ورمن نے اپنی مملکت کو کافی توسیع دی اور میسون میں شوا کا نامی مندر تعمیر کرایا۔ یہاں کے کچھ بادشاہ مثلاً جے پرمیشور ورما دیوا ایشور مورتی، رودر ورمن، ہری ورمن، مہاراج ادھیراج سری جے اندر ورمن، اور جے سینا ورمن بڑے اولوالعزم حکمراں تھے۔ ۔ ۔ ۱۳۰۰ برس کی شاندار حکومت کے بعد سولھویں صدی عیسوی میں چمپا کا شاہی خاندان منگول حملہ آوروں کے ہاتھوں ختم ہو گیا ۔

ہندوستانیوں کی نوآبادیات جنوبی برہما اور سیام میں بھی قایم ہوئیں تیسری صدی عیسوی میں سری کشیتر کی سلطنت جس کا دار الخلافہ موجودہ پروم کے قریب تھا۔ ایک طاقتور حکومت سمجھی جاتی تھی۔ سیام کی ہندوستانی ریاست کا نام دوارا وتی تھا ۔

مشرقی مجمع الجزائر میں کئی ہندوستانی حکومتوں کا عروج اور زوال ہوا۔ جزیرۂ بالی کے ہندو راجہ بہت باثروت تھے۔ سماترا میں سری وجے سلطنت چوتھی صدی عیسوی میں قایم ہوئی تھی لیکن نویں صدی میں جاوا کے سیلندر شہنشاہوں کے آگے ماند پڑ گئی۔ بورنیو میں ہندوستانی حکومت چوتھی صدی میں قایم ہوئی۔ وہاں سنسکرت کے چار کتبے برآمد ہوئے ہیں۔ جن میں بادشاہ مولا ورمن کے بیش قیمت عطیوں کا ذکر ہے ۔

لیکن سب سے زیادہ نامور ہندوستانی حکومتوں کا مرکز جزیرۂ جاوا میں تھا۔ یہاں آٹھویں صدی عیسوی میں سیلندر نامی شاہی خاندان نے ایک عالیشان سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ سیلندر شہنشاہوں نے تقریباً تمام مشرقی مجمع الجزائر کو جن میں جاوا، سماترا، بالی، بورنیو بھی شامل تھے تسخیر کیا۔ ان کی عظمت، ثروت، اور جاہ و جلال کا حال عرب تجار نے بہت تفصیل سے قلمبند کیا ہے۔ مہایانی بدھ مذہب کے پیرو ہونے کے سبب ان شہنشاہوں کے بنگال کے پالا راجاؤں سے بڑے دوستانہ تعلقات تھے مغل سلاطین اور کمبوجا دیس کے راجاؤں کی طرح ان بادشاہوں کو بھی فنِ تعمیر کا خاص شوق تھا۔ برابدر کا استوپ ان کی سب سے عظیم الشان یادگار ہے۔ انگکور واٹ کی طرح یہ بھی چبوتروں کی منازل پر تعمیر کیا گیا تھا اس میں نو منزلیں ہیں۔ انگکور واٹ کے نمونے پر ہر اوپر کی منزل نیچے کی منزل کے مقابلے میں چھوٹی ہوتی گئی ہے۔ نویں اور آخری منزل کے اوپر استوپ بنا ہے۔ تمام عمارت مہاتما بدھ کے مجسموں اور سنگ تراشی کے اعلیٰ نمونوں سے مزیّن ہے۔ یہ وسیع خوبصورت اور شاندار استوپ ہندوستان اور جاوا کے مخلوط فنونِ تعمیر اور سنگ تراشی کی نادر مثال ہے ۔

گیارھویں صدی میں سیلندر شہنشاہوں کی جنوبی ہند کے چولا راجاؤں سے جنگ چھڑ گئی اور اسی کے بعد سے ان کی حکومت کا زوال شروع ہو گیا ۔

مغربی جاوا کی ہندی حکومت کافی قدیم تھی چینی مورخین کا بیان ہے کہ یہاں کے راجا دیو ورمن نے ۱۳۲ء میں ایک سفیر چین بھیجا تھا۔ چھٹی صدی عیسوی کے چار کتبوں میں راجا پورنا ورمن اور اس کے متقدمین کا ذکر آیا ہے۔ آٹھویں صدی میں سیلندر شہنشاہوں نے اس پر قبضہ کر لیا لیکن سوڈیڑھ سو برس کے بعد ہی یہاں کے راجاؤں نے اپنی آزادی پھر سے حاصل کر لی اور اپنا دار الخلافہ مشرقی جاوا میں پہلے کدیری اور اس کے بعد سنگھا سری میں قایم کیا۔ تیرھویں صدی کے آخر میں راجا وجے نے مجاپاہت کو اپنا دار السلطنت بنایا اور ایک نئے شاہی خاندان کی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اس خاندان نے بڑا عروج حاصل کیا اور ۱۳۶۵ء میں ان کی مملکت میں تمام ملایا اور مشرقی مجمع الجزائر شامل تھے ۔

سیاسی طور پر ہندوستان کی محکوم نہ ہونے کے باوجود تہذیب و تمدن، مذہب اور معاشرہ، ادب اور زبان کے نقطۂ نظر سے ان

نوآبادیات کو مادری ملک کا ایک گوشہ کہا جا سکتا تھا۔ کمبوجا دیس، بورنیو، جاوا، سماٹرا کے کتبے نہایت اعلیٰ سنسکرت میں لکھے ہوئے ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سنسکرت ادب کا مطالعہ کس قدر وسیع اور عام تھا۔ ہندوستانی رسوم خط قریب قریب ہر جگہ رائج تھے۔ جاوا میں خاص طور پر سنسکرت کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ وہاں رامائن اور مہابھارت کی ہردلعزیزی کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُن کا قومی خاموش ناٹک 'واجنگ'، ابھی تک انہیں کتابوں پر مبنی ہے۔ چمپا سے لے کر جاوا تک زیادہ تر نام سنسکرت زبان ہی میں ملتے ہیں۔

مذہب میں اِن نوآبادیات نے ہندوستان کی پوری پوری تقلید کی۔ بورنیو اور مغربی جاوا کے کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج اور دربار شاہی پر برہمنی عقائد اور رسوم کا گہرا رنگ چھایا ہوا تھا۔ وشنو، برہما، شوا، گنیش، نندی اور دوسرے برہمنی دیوتاؤں کی مورتیاں ان نوآبادیات میں اکثر جگہ پائی گئی ہیں۔ وشنو اور شو کی عام نشانیاں مثلاً اول الذکر کا سنکھ، چکر، گرز، اور کمل اور موخرالذکر کا ترسول بھی برآمد ہوئے ہیں۔ کتبوں میں دریائے گنگا کی حُرمت کا کہیں کہیں ذکر آیا ہے۔ جاوا میں بدھ مذہب نے خوب ترقی کی۔ حالانکہ وہاں کی موجودہ آبادی زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ لیکن اب بھی وہ لوگ مہاتما بدھ کی بہت عزت اور وقعت کرتے ہیں۔ ایشیائے ہند میں ہندوستان کے سابق سفیر مسٹر پلئی نے وہاں کا ایک نہایت دلچسپ قصہ اس ضمن میں بیان کیا ہے۔ ایک جگہ انہوں نے دیکھا کہ مہاتما بدھ کی مورتی پر تازہ پھول چڑھے ہوئے ہیں۔ پاس کے چند گاؤں والوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ نذرِ عقیدت ان لوگوں کی طرف سے تھی۔ "لیکن تم لوگ تو مسلمان ہو" مسٹر پلئی نے حیرت سے کہا۔ "تب کیا ہوا" انہوں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "آج جمعہ جو ہے"۔

ان نوآبادیات کے سماجی حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ہندوستانی طرزِ معاشرت رائج تھا۔ مہینوں کی تقسیم اور ان کے نام، وزن اور تولنے کے آلات بالکل ہندوستانی طریقے پر تھے۔ ہماری ندیوں کے ناموں پر انہوں نے بھی چندر بھاگا اور گومتی نام رکھے۔ ایک مورخ نے یہاں کے ایک راجہ کے متعلق لکھا ہے: "وہ اپنے جسم پر خوشبو ملتا ہے، اونچی ٹوپی پہنتا ہے اور اس کے گلے میں جواہر کی مالا ہے۔ اس کا لباس ریشم کا ہے اور پیر میں چمڑے کا جوتا ہے۔ تھوڑی دُور کے لئے وہ گاڑی پر سوار ہو کر جاتا ہے اور لمبے فاصلے وہ ہاتھی پر طے کرتا ہے۔" وہاں کے دوسرے رسم و رواج کے متعلق تحریر کیا ہے: "میدان جنگ میں یہاں کے لوگ سنکھ پھونکتے ہیں اور ڈھول بجاتے ہیں۔ عورت کی شادی ہونے کے بعد وہ مرد کے خاندان کی فرد بن جاتی ہے۔ ان کے موسیقی کے آلات ستار، بانسری، گھونگرو اور ڈھول ہیں۔۔۔ وہ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں اور ان کی راکھ کو سنہری صراحی میں بند کر کے سمندر کے سپرد کر دیتے ہیں۔"

اس مختصر حال سے قدیم ہندوستان کی تہذیب و تمدن کی عظمت اور عالمگیر پسندیدگی کی ایک جھلک معلوم ہوتی ہے۔ بیشک صحیح کہا گیا ہے کہ قدیم ہند کی نوآبادیات کا بیان ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک سنہری لیکن بھلایا ہوا باب ہے۔ جس پر ہر ہندوستانی کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے۔

خوراک کے متعلق سردار پٹیل کا ارشاد

گذشتہ سنیچروار کو صنعت کے متعلق مرکزی مشاورتی کونسل کی سٹینڈنگ کمیٹی کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے آنریبل سردار پٹیل نائب وزیر اعظم نے اس عہد کو دہرایا۔ کہ ۱۹۵۱ء تک ہندوستان خوراک کے متعلق خودمکتفی بن جائیگا۔ آپ نے کہا مجھے یقین ہے۔ کہ صوبائی حکومتوں کاشتکاروں اور تقسیم کرنیوالی ایجنسیوں کے تعاون سے ہم خوراک کی موجودہ قلت کو ضرور دُور کر لینگے۔ اس کے ساتھ ہی قومی اقتصادیات کی خاطر خوراک کی فصلوں اور ان فصلوں جن سے نقد روپیہ حاصل ہوتا ہے دونوں کو ان کی اہمیت کے لحاظ سے مناسب جگہ دیکر اپنی زرعی اقتصادیات کو متوازن رکھنا چاہئے۔ روپیہ کی قیمت کم ہو جانے سے جو نازک صورت حالات پیدا ہوئی تھی اس سے مجھے یقین ہو گیا ہے۔ کہ ہمیں نہ صرف خوراک کے بارے میں ہی خودمکتفی بننا ہوگا۔ بلکہ ہمیں پٹ سن اور روئی جیسی قیمتی فصلوں کے بارے میں بھی خودمکتفی بننا ہوگا۔ کیونکہ یہ دونوں فصلیں نہ صرف ہماری سب سے زیادہ اہم صنعتوں کو تقویت پہنچاتی ہیں بلکہ ان سے بیش قیمت غیر ملکی سکہ تبادلہ بھی حاصل ہوتا ہے۔

شریف عنایت اللہ

اِتنی سی بات تھی

(انتساب اُن کنواری لڑکیوں اور مجرّد نوجوانوں کے نام جن کی جلد شادی ہونے والی ہے)

کردار — نعیم — شہلا — قمر — ناہید — اور شرفو

(ڈائیلاگ — ایک سازی ریکارڈ بجایا جائے — فیڈ آؤٹ — زور سے دریچے کی کانچ پھوٹنے کی آواز — شہلا پیپرویٹ اٹھاکر دریچے کی طرف پھینکتی ہے — وقفہ — پھر ایک زوردار آواز۔ اس بار گلدان دریچے کی طرف پھینکا جاتا ہے — قدموں کی چاپ — نعیم داخل ہوتا ہے)

نعیم۔ میں کہتا ہوں یہ آخر یہاں ہو کیا رہا ہے؟ غضب خدا کا شہلا ڈیر!

(مکالمہ ختم ہونے سے پہلے ہی دریچے کی کانچ پھر زور سے پھوٹتی ہے اس بار دوسرے گلدان کی باری آتی ہے۔ شہلا اپنے شوہر کو دیکھ کر اپنا غصہ دوسرے گلدان پر اتارتی ہے)

نعیم۔ اُف میرے اللہ۔ میں کہتا ہوں کیا پاگل ہوگئی ہو شہلا؟ یہ آخر آج گلدانوں پر کیوں غصہ اتارا جا رہا ہے؟ دریچے کے شیشوں کی بانتار میں بڑی طرح قلت ہے اور بیگم صاحبہ کو یہاں مذاق سوجھا ہے۔

شہلا۔ (غصے سے) گلدانوں پر غصہ نہ اتاروں تو کیا اُس موئی چڑیل کے سر پر اتاروں؟ غضب خدا کا۔ نہ حیا ہے اور نہ شرم۔ آج تک جو ہوتا رہا میں نے سینے پر سِل رکھ کر برداشت کیا۔ لیکن آخر صبر کی بھی حد ہوتی ہے۔ ایسی جوانی بھی آخر کس کام کی۔

نعیم۔ یہ آج کس کی جوانی کا ذکر ہو رہا ہے؟ میں کہتا ہوں شہلا یہ آج تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ تمہاری پہیلیاں تو آج تک میری سمجھ سے باہر ہیں مجھے تو حیرت ہے کہ تم نے اپنا غصہ اتارنے کا یہ اچھا طریقہ ڈھونڈھ نکالا۔ بازار میں شیشے ملتے ہی نہیں۔ اور بیگم صاحبہ بات بات پر اپنا غصہ ان بے بس شیشوں ہی پر اتارتی ہیں۔ اگر ماما سے غلطی ہوگئی ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تم یوں دریچے پر نشانہ بازی شروع کر دو۔

شہلا۔ جی — کس ماما میں اتنی ہمّت ہے کہ غلطی کرے میں تو اس دوسری چڑیل کو کوس رہی تھی جس نے میری مسرتوں پر ڈاکہ ڈالا ہے جس کی جوانی نے میرے گھر میں آگ لگائی ہے۔ خدا اُسے کتوں کی سی موت دے۔ خدا کرے کہ اس کی لاش میں کیڑے پڑیں، اُسے سانپ سونگھ جائے۔

نعیم۔ ارے توبہ!! — اب کچھ کہو گی بھی یا یوں ہی گالیاں دیئے جاؤگی؟ میں کہتا ہوں۔ یہ آخر کس کا مرثیہ پڑھا جا رہا ہے!

شہلا۔ آپ تو ایسے انجان بن رہے ہیں۔ جیسے آپ کو اس کی خبر ہی نہیں۔ یہ ساری آگ تو آپ کی چہیتی کی لگائی ہوئی ہے

نعیم۔ پھر تم نے پہیلیوں میں باتیں شروع کر دیں۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر ان معصوم گلدانوں نے کونسا گناہ کیا تھا کہ تم انہیں نیست و نابود کرنے پر یوں تل گئیں؟؟

شہلا۔ آپ صرف ان گلدانوں کے متعلق کیوں پوچھ رہے ہیں؟ میری ان آنکھوں کے متعلق کیوں نہیں پوچھتے جو آج دو مہینے سے دن اور رات آنسو بہاتی رہی ہیں؟ میرے اس دماغ کے متعلق کیوں نہیں پوچھتے۔ جو آج ہفتوں سے اپنے تاریک مستقبل پر غور کرتے کرتے تھک سا گیا ہے؟ میرے اس کمزور دل کے متعلق کیوں نہیں پوچھتے جس کے ہر گوشے میں آپ کی اُس چہیتی کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک

رہی ہے؟

نعیم۔ تم یہ آج "چہیتی چہیتی" کی کیا رٹ لگا رہی ہو شہلا؟ — آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟؟

شہلا۔ میں کہنا صرف یہ چاہتی ہوں۔ کہ آپ کی اُس چہیتی ناہید کی حرکتیں اب میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوگئی ہیں۔ اب تک وہ آپ کی محبوبہ بنی پھرتی رہی۔ پھر بھی میں خاموش رہی۔ لیکن آج اُس نے یہ گلدان بھیج کر میرے ذوق کا مذاق اُڑایا ہے۔ اُسے معلوم تھا مجھے گلدان کتنے پسند ہیں۔

نعیم۔ اوہ!! — اب سمجھا میں — تو محترمہ ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اپنی پسند کا ثبوت دے رہی تھیں؟ تم پڑھ لکھ کر بھی بیوقوف ہی رہیں شہلا۔

شہلا۔ جی ہاں۔ اس دُنیا میں عقلمند اور ذہین تو آپ کی ناہید ہی ہے۔ خدا اُسے غارت بھی تو نہیں کرتا۔ میرا بس چلے تو میں اُس کا مُنہ نوچ ڈالوں۔ چڑیل کی ہمت تو دیکھئے۔ سُنا ہے آج وہ نوکروں کے سامنے میری جھوٹی تعریفیں کر رہی تھی۔

نعیم۔ اُس کی شرافت کا اس سے بہتر ثبوت اور کیا مل سکتا ہے، شہلا! ۔ وہ تمہاری اتنی عزت کرتی ہے۔ اور تم اُس کا نام گالیوں کے سوائے ہرگز نہیں لیتیں۔ میں سوچ رہا ہوں کس قدر تضاد ہے تم دونوں کے کردار میں!!!

شہلا۔ (غصّے سے) دیکھئے۔ اب آپ اپنی حد سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ میں اتنی بُری تھی تو آخر آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی؟ میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی جو میں اس گھر میں آئی — (رونے لگتی ہیں) مجھے موت بھی تو نہیں آتی۔ جو اس ذلیل زندگی سے چھٹکارا مل جائے۔

نعیم۔ بس لگیں خود کو کوسنے؟! — میں کہتا ہوں شہلا — !!

شہلا۔ (بات کاٹ کر) خدارا "میں کہتا ہوں۔ میں کہتا ہوں" کی رٹ بند کیجئے۔ آج دو برس سے یہ سُنتے سُنتے میرے کان پک گئے۔ لیکن نہ آپ کا کہنا ہی بند ہوا۔ اور نہ آپ کے دل میں کبھی اس بدقسمت عورت کی محبت جاگی۔ (روتے ہوئے لگتی ہیں) وہ تو ہم ہی ہیں کہ مان نہ مان

میں تیرا مہمان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

نعیم۔ تم میری بھی سنوگی یا اپنی ہی کہے جاؤگی؟ معمولی معمولی سی باتوں پر یوں گھنٹوں چیخنا چلانا تمہیں زیب نہیں دیتا شہلا تمہیں ذرا تو اپنی عزت کا خیال رکھنا چاہیئے۔ آدھے گھنٹے سے تم یوں چیخ رہی ہو۔ شیشوں کے پھوٹنے کی آواز سارے محلّے میں گئی ہوگی۔ اور اب تک محلّے کا ہر گھر ہمارے اس نئے جھگڑے سے واقف ہوگیا ہوگا۔

شہلا۔ تو اس کی ذمّہ دار میں ہوں؟ آپ ہی نے تو ناہید کو سر چڑھا رکھا ہے۔ آج وہ میری غیر موجودگی میں یہاں آئی کل وہ میری موجودگی میں یہاں آئے گی۔ اور آپ کو اپنے ساتھ لے کر چل دے گی حد ہوگئی بے غیرتی کی لیکن میں اس کی بے حیائی کا رونا کیوں روؤں۔ یہاں اپنے کون سے کم ہیں۔ جہاں کسی حسینہ کو دیکھا بس لگے پگھلنے۔ فوراً ٹائی درست کی۔ بالوں پر ہاتھ پھیرا اور رومال سے مُنہ پونچھ کر جیب میں اسے ایک خاص زاویے پر رکھا تاکہ اس کی جھلک نظر آتی رہے۔

نعیم۔ دیکھو شہلا۔ اب تمہاری گفتگو کا رُخ میری طرف پلٹ رہا ہے جیسے لڑکیوں کو دیکھ کر میں پگھلنے لگتا ہوں یا اسمارٹ نوجوانوں کو دیکھ کر تم پگھلنے لگتی ہو؟؟ وہ بزرگوں نے کیا خوب کہا ہے۔ لوگوں کو اکثر دوسروں کی آنکھوں کا تنکا تو نظر آجاتا ہے لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا!!

شہلا۔ دیکھئے۔ اب آپ نے پھر مجھے چھیڑا۔ آپ نے کبھی مجھے کیا ناہید سمجھ رکھا ہے۔ اسمارٹ نوجوانوں کو دیکھ کر فدا ہوجانے کی عادت تو آپ کی اس چہیتی ہی کی ہے۔ میں بیچاری ایک سیدھی سادی ہندستانی بیوی ہوں جس کا بیشتر وقت گھر کی چار دیواری میں گذرتا ہے۔

نعیم۔ جی — کیا کہنے ہیں آپ کی سادگی کے — خدا کا شکر ادا کرو شہلا جو تمہیں مجھ جیسا شریف النفس شوہر ملا۔ اگر کسی اور سے شادی ہوئی ہوتی تو پھر آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوجاتا۔ خدا جانتا ہے میں کسی بھی غیر عورت کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا لیکن تمہارے اس وہمی دماغ کو کیا کیا جائے۔ وہ تو میری ہر حرکت کو بڑھا چڑھا کر تمہارے سامنے پیش کرتا ہے۔

شہلا۔ اب آپ میرے دماغ کو کیوں نہ کوسیں گے۔ وہ آپ کو آپ

کے اصلی روپ میں پیش کرتا ہے نا —— اُس روز نواب صاحب کی پارٹی میں بیگم خان نے اُس لیڈی ڈاکٹر کی بچی سے تعارف کرایا تو آپ کو اُس کی چڑیل کی سی صورت ایسی بھائی کہ مجھے بھلائے آپ گھنٹوں اُس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے۔

نعیم۔ حد ہو گئی غلط فہمی کی۔ تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے شہلا تم نے کیا فضول سی باتیں شروع کر دیں! آج چاند کی چودھویں تاریخ ہے میں دراصل کلب سے اسی لئے جلد لوٹ آیا۔ کہ گھنٹہ آدھا گھنٹہ تمہارے ساتھ گذاروں۔ لیکن یہاں کسے معلوم تھا۔ کہ بیگم صاحبہ یوں بھری بندوق بنی بیٹھی ہیں۔

شہلا۔ (غصے سے) میں بھری بندوق ہوں؟ اور آپ کی وہ چہیتی؟ —— لیکن ایک چہیتی ہو تو میں اُس کا نام لوں۔ یہاں تو پروانوں کی بھرمار ہے۔ جسے دیکھو میاں کے فن کا دیوانہ ہوا جا رہا ہے۔ شاید اقبال اور پریم چند کے فن کے بھی اتنے عاشق نہ ہوں گے جتنے ہمارے میاں کے ہیں۔ آج چاند کی چودھویں تاریخ ہے تو میں کیا کروں۔ جائیے اپنی اس ناہید کیا سیر کو

نعیم۔ اب تھوک بھی دو غصہ شہلا۔ یوں معمولی معمولی سی باتوں پر نہیں روٹھا کرتے ڈیر —— ہمیں دیکھو۔ تمہاری زیادتیوں کو بھلائے ہم ہمیشہ تمہارے دیوانے رہے ہیں۔ لیکن کیا ہمیں تمہاری رام کہانی نہیں معلوم؟؟ معلوم ہے۔ اچھی طرح معلوم ہے۔ لیکن ماضی کی نقاب کشائی سے کیا حاصل —— اسی لئے ہم خاموش ہیں۔

شہلا۔ (غصے سے) یہ میری رام کہانی کا کیا ذکر لے بیٹھے آپ؟ —— اب آپ تو میری زبان کھلوا کے رہیں گے۔ آپ تو ایسے بول رہے ہیں جیسے مجھے آپ کے معاشقوں کی خبر ہی نہیں —— اجی —— مجھے تو ساری داستانیں معلوم ہیں۔ وہ نجمہ قریشی والا واقعہ تو آپ کو یاد ہی ہوگا نا؟؟

نعیم۔ اور تمہیں وہ تمہارے یوسف بھائی والی داستان تو یاد ہی ہوگی نا! ارے وہی جن کی تصویر تم نے اپنے البم میں لگا رکھی ہے!!!

شہلا۔ اور آپ کو وہ کزن نرگس والی کہانی تو یاد ہی ہوگی؟ ارے وہی نرگس جس کے محبت نامے آپ نے اپنی الماری میں چھپا رکھے ہیں!!

نعیم۔ (غصے سے) تم میری الماری کی تلاشی لیا کرتی ہو شہلا؟

شہلا۔ اور آپ میرے البم کی تلاشی لیا کرتے ہیں؟ ہر حسین عورت کو دیکھ کر مضحکہ خیز حرکتیں کرتے آپ ہیں اور بدنام میں ہوتی ہوں۔

نعیم۔ اور تم جو نوجوانوں کو دیکھ کر فوراً اپنی ساڑھی ٹھیک کرنے لگتی ہو؟

شہلا۔ ہائے اللہ۔ کس قدر جھوٹ بولنے لگے ہیں آپ!! میں نے کس موئے نوجوان کو دیکھ کر اپنی ساڑھی ٹھیک کی؟؟

نعیم۔ اب انکار سے کوئی فائدہ نہیں شہلا میری نظریں بڑی تیز ہیں۔ ابھی کل ہی کا تو واقعہ ہے۔ کل شام شرفو نے قمر کے آنے کی اطلاع دی۔ تو تم نے فوراً اپنی ساڑھی درست کی اور آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر جلدی جلدی اپنے بال بنانے لگیں۔ اور پھر قمر کی موجودگی میں نہ جانے تمہاری ساڑھی کا پلو بار بار نیچے کیوں آ جاتا ہے۔

شہلا۔ اور آپ جیسے فرشتہ ہیں۔ میری سہیلیوں کی موجودگی میں جیسے آپ کبھی مضحکہ خیز حرکتیں نہیں کرتے!!!

نعیم۔ (غصے سے بات کاٹ کر) میں کہتا ہوں ——!!

شہلا۔ کیا کہیں گے آپ؟ جیسے میں اُس ناہید کی بچی سے واقف نہیں

نعیم۔ اور جیسے میں اُس قمر کے بچے سے واقف نہیں۔ اب تک میں خون کے گھونٹ پی کر خاموش رہا۔ لیکن اب مجھے زبان کھولنی ہی ہوگی۔ قمر تمہارا کلاس فیلو رہ چکا ہے۔ وہ اس گھر میں جس وقت چاہے آزادی سے آ جا سکتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں، کہ وہ تمہیں اپنا سمجھے۔ اگر اُسے تم سے محبت تھی۔ تو اُس نے تم سے کیوں نہ شادی کر لی؟

شہلا۔ اللہ —— آپ کتنے بے شرم بن گئے ہیں۔ مجھے آج معلوم ہوا خود غرض مرد کتنے حاسد ہوتے ہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ آپ اور ناہید میری سادگی کا بہت زیادہ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اگر مجھے پہلے ہی شک ہو جاتا تو میں اُس بے شرم کا منہ نہ نوچ لیتی؟؟

نعیم۔ یہ تم بار بار منہ نوچ لینے کی دھمکیاں کیوں دے رہی ہو شہلا منہ تو لڑاکو بلیاں نوچا کرتی ہیں مجھے تو فخر تھا کہ میری بیوی ایک معصوم عورت ہے۔

شہلا۔ (غصے سے) میں بلی ہوں؟؟؟ —— اور آپ؟؟

نعیم۔ ہاں ہاں کتا کہہ دو —— رک کیوں گئیں؟

شہلا۔ ہائے اللہ۔ کون کمبخت ایسی ذلیل باتیں سوچ بھی سکتا ہے

آپ میرے شوہر ہیں۔ میرے مجازی خدا ہیں۔

نعیم۔ اَب بند بھی کرو یہ بکواس (قدموں کی چاپ — کوئی اس طرف آرہا ہے) مجھے اَب زیادہ بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔

(دروازہ کھلنے کی آواز — بوڑھا ملازم شرفو داخل ہوتا ہے)

شرفو۔ (کھانس کر) معاف کیجیے گا سرکار — کھانا تیار ہے

نعیم۔ مجھے بھوک نہیں شرفو۔ تم میرا انتظار مت کرو شہلا۔ جاؤ کھانا کھالو — اور دیکھ شرفو تو ذرا پھاٹک کا خیال رکھنا۔ میرے لئے کوئی موٹر میں آئے تو فوراً مجھے اطلاع دینا۔

شرفو۔ بہت بہتر سرکار

شہلا۔ (انتہائی لہجے میں) اب اس وقت کون آرہا ہے آپ کے لئے؟؟

نعیم۔ (تھکے ہوئے لہجے میں) اُف میرے اللہ۔ پھر تمہارے ذہن نے کچوکے لگانے شروع کر دیئے!؟ اتنی دیر تک جھگڑنے کے بعد بھی تمہارا جی نہیں بھرا — کیوں بے شرفو۔ تو ابھی یہیں کھڑا ہے، میں نے تجھے پھاٹک پر جانے کے لئے کہا تھا نا؟

شرفو۔ (کھانس کر) جی صاحب۔ میں جا رہا ہوں وہیں — لیکن بات یہ ہے صاحب!! — بیگم صاحب؟؟

نعیم۔ ابے بیگم صاحب کے بچے!! — اب باتیں بنا رہا ہے تو؟ (گھڑی نو کا گجر سناتی ہے)

شہلا۔ (جلدی سے) تو سچ مچ بڑا باتونی ہو گیا ہے شرفو! جا یہاں سے۔ دیکھ نو بج گئے — مجھے معاف کرو نعیم۔ میں ذرا کپڑے بدل لوں — ارے تو یہیں کھڑا ہے شرفو؟ — جاتا کیوں نہیں؟؟

شرفو۔ (پریشان لہجے میں) جا تو رہا ہوں بیگم صاحب!! لیکن کیا میں انہیں بلا لاؤں؟ (شہلا کو خفا دیکھ کر) اچھا بس جاتا ہوں بیگم صاحب۔ (قدموں کی چاپ۔ وہ چلا جاتا ہے)

نعیم۔ (شک کے لہجے میں) یہ شرفو کسے بلانے جا رہا تھا؟ اور شہلا کو کھانے سے پہلے یہ یکایک تمہیں کپڑے بدلنے کی کیا سوجھی؟ یہ بار بار بے قراری سے گھڑی کی طرف کیوں دیکھا جا رہا ہے؟ مجھے تو آج دال میں کالا نظر آتا ہے۔

شہلا۔ آپ کو تو میری ہر بات بری لگتی ہے۔ اور بار بار آپ "دال میں کالا، دال میں کالا" کی کیا رٹ لگا رہے ہیں؟ کیا میں اندھی ہوں کیا مجھے دال میں کالا نظر نہیں آتا؟ — خلافِ معمول کلب سے جلد لوٹ آنا اور پھر اس بے قراری سے اپنے پراسرار دوست کا انتظار!!!

نعیم۔ دیکھو شہلا۔ مجھے اپنے دوست کے انتظار کا پورا حق ہے۔

شہلا۔ اور دیکھئے۔ مجھے بھی اپنی سہیلی کے انتظار کا پورا حق ہے۔

نعیم۔ تو تمہاری سہیلی آرہی ہیں۔ اس آدھی رات کو؟ کیا میں اُن کا نام پوچھ سکتا ہوں محترمہ؟

شہلا۔ کیا میں آپ کے پراسرار دوست کا نام پوچھ سکتی ہوں محترم؟

نعیم۔ (غصے سے) جاہل نہ بنو شہلا — میں تو آج جان کر ہی رہوں گا کہ تمہاری وہ پراسرار سہیلی کون ہے۔ (قدموں کی چاپ) تم پریشان میرا منہ کیا دیکھ رہی شہلا؟ جاؤ جلدی سے ساڑھی بدل لو!!! (دروازہ کھلنے کی آواز — شرفو داخل ہوتا ہے)

شرفو۔ معاف کیجیے گا بیگم صاحب — باغیچے کی سیر کو جایئے گا نہیں؟

نعیم۔ ابے بیگم صاحب کے بچے۔ پھر آ گیا تو یہاں؟ میں نے تجھے پھاٹک پر ٹھہرنے کو کہا تھا نا؟ — اور یہ آج تو پہیلیوں میں کیوں باتیں کر رہا ہے؟

شرفو۔ (پریشان لہجے میں) بات یہ ہے صاحب!! — آپ ہی بتایئے نا بیگم صاحب۔

شہلا۔ ہاں شرفو میں ہی بتاتی ہوں — سنیئے میں اپنے ایک دوست سے باغیچے میں مل رہی ہوں۔

نعیم۔ یہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ لیکن اُس خوش نصیب کا نام تو معلوم ہو جائے جس کے انتظار میں یوں بار بار ساڑھیاں بدلی جا رہی ہیں۔

شرفو۔ (جلدی سے) وہ اپنے قمر صاحب ہیں نا؟ —

نعیم۔ خوب!! تو حضرت قمر ہی ہیں — دیکھ لیا نا تم نے شہلا مرد کتنے چالاک ہوتے ہیں!!

شہلا۔ (طنزیہ لہجے میں) جی — کیا کہنے ہیں آپ کی غیب دانی کے — اور اگر اب میں یہ کہوں کہ آپ کے وہ پراسرار موٹر والے دوست محترمہ نا ہید ہیں — تو —؟؟؟

نعیم۔ (غصے سے) میں کہتا ہوں شہلا۔

شہلا۔ تو کیا آگیا نا چور آخر؛ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ چڑیل تمہارا پیچھا ہرگز نہیں چھوڑے گی۔ یوں چوری چھپے ملنے سے بھلا دل کو تسلی کاہے کو ہونے لگی۔

نعیم۔ شاید تم اپنا تجربہ بیان کر رہی ہو۔

شہلا۔ جی ہاں۔ میں اپنا تجربہ بیان کر رہی ہوں۔ آج تو میں مر کے رہوں گی۔ جو جی میں آئے گا — (ملازم سے) شرفو۔ تو جا کر قمر صاحب کو اطلاع دے کہ میں ابھی آرہی ہوں۔ اور دیکھ اگر ناہید آئے تو کہہ دینا کہ آئندہ سے وہ اس گھر میں جب جی چاہے آسکتی ہیں۔ میں کل میکے جا رہی ہوں۔

نعیم۔ میکے جا رہی ہو تو شوق سے جاؤ — تو میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے شرفو، چل — باغیچے میں — کہیں قمر صاحب تنہائی سے پریشان ہو کر چل نہ دیں

شرفو۔ وہ تنہا نہیں ہیں صاحب!!

نعیم۔ تنہا نہیں ہیں؟ — (طنزیہ لہجے میں) لو جی — اور سن لو — پروانوں میں اب کافی سے زیادہ اضافہ ہو رہا ہے

شہلا۔ آپ کو ایسی باتیں کرتے شرم نہیں آتی؟ پروانے ہوں گے آپ کے — یہاں کون پوچھتا ہے ہمیں؟

نعیم۔ کیوں رے شرفو — یہ قمر کے ساتھ کون ہے باغ میں؟

شرفو۔ ناہید بی بی ہیں صاحب۔

نعیم۔ (حیرت سے) ناہید؟؟؟

شہلا۔ (حیرت سے) قمر اور ناہید دونوں ہیں باغیچے میں؟؟

شرفو۔ ہاں بیگم صاحب — شاید دونوں صاحب یہاں آرہے ہیں۔

(قدموں کی چاپ — دروازہ کھلنے کی آواز — ناہید اور قمر داخل ہوتے ہیں)

ناہید۔ آداب بجا لاتی ہوں شہلا باجی — تسلیمات عرض نعیم بھائی!!

قمر۔ گڈ ایوننگ نعیم — واہ شہلا۔ تم نے خوب انتظار کروایا۔ میں شام سے کئی بار آچکا ہوں یہاں۔

شہلا۔ کیوں؟ — خیریت تو ہے قمر؟؟

قمر۔ سب خدا کا فضل ہے شہلا۔ بات در اصل یہ ہے کہ — میں — یعنی ناہید — بھئی ناہید!! تم ہی کہو نا؟؟

ناہید۔ (دھیمے لہجے میں — شرماکر) میں کیسے کہوں قمر — تم ہی کہو نا!

نعیم۔ بھئی آخر بات کیا ہے؟ آج جسے دیکھو وہ پہیلیاں بجھوا رہا ہے آخر بات کیا ہے ناہید؟ تم نے ٹیلیفون پر بھی مجھ سے پہیلیوں ہی میں باتیں کیں — اور تم نے یہ کیوں نہیں کہا کہ قمر بھی ساتھ ہوں گے؟

قمر۔ اب یہ کیا بتائیں گی نعیم! شرم سے تو ان کا منہ سرخ ہو گیا ہے۔ مجھ سے پوچھو بات در اصل یہ ہے کہ ہماری شادی کی بات چیت آج پکی ہو گئی ہے۔

نعیم۔ (حیرت سے) تمہاری شادی کی بات پکی ہو گئی ہے؟ (رک کر) یعنی قمر تمہاری شادی ناہید سے ہو رہی ہے؟ — بھئی — مجھے تو — مجھے تو —!! (وہ بے اختیار قہقہہ لگاتا ہے)

ناہید۔ (پریشان لہجے میں) آپ ہنس کیوں رہے ہیں نعیم بھائی؟ — یہ آخر بے موقع ہنسی کیسی؟؟

شہلا۔ مجھ سے پوچھو ناہید — آج انہوں نے زعفران کا کھیت دیکھا ہے!! (وہ بھی بے اختیار ہنستی ہے)

قمر۔ اور اب تم ہنسنے لگیں شہلا! — آخر بات کیا ہے؟؟

نعیم۔ (ہنستے ہوئے) بھئی ہمیں غلط نہ سمجھو۔ اس خبر سے ہمیں بڑی خوشی ہوئی ہے — اور در اصل بات صرف اتنی سی ہے کہ ہم دونوں نے آج زعفران کے کھیت دیکھے ہیں۔ — کیوں شہلا؟؟؟

(دونوں قہقہہ لگا کر ہنستے ہیں — گانگ — فیڈ آؤٹ)

پنڈت جواہر لال نہرو

کشمیر آرٹس ایمپوریم میں
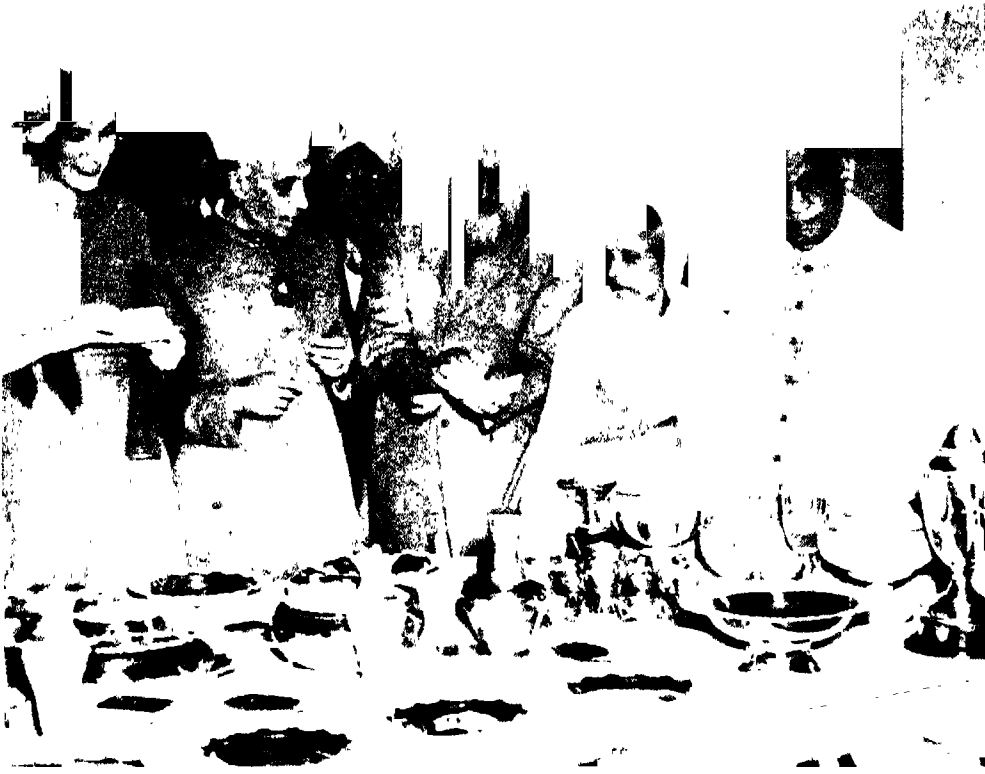
کشمیر کے وزیراعظم شیخ محمد عبداللہ نے ۱۸ نومبر کو کشمیر آرٹس امپوریم نئی دہلی میں پنڈت جواہر لال نہرو کے اعزاز میں ایک دعوت دی جس میں سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور دیگر وزرا اور سفارت خانوں کے نمائندے بھی شریک ہوئے

تصویر میں:- پنڈت جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، منی بہن پٹیل اور لیڈی مانی کے ہمراہ ایمپوریم میں چاندی کے برتن ملاحظہ فرما رہے ہیں۔

شیر کشمیر شیخ محمد عبدا
سردار پٹیل کے ہمراہ

قاھرہ میں ھندوستانی سفیر
مسٹر اے۔ اے۔ اے۔ فیضی
نے مصری پارلیمنٹ کے ایوان خاص
کے صدر کی خدمت میں ھندوستانی
چرخا پیش کیا۔ پاشائے موصوف نے
اس کی ساخت اور استعمال میں بڑی
دلچسپی کا اظہار کیا۔

دائیں طرف —

مسٹر فیضی چرخا پیش کر رہے ہیں۔

بائیں طرف —

پاشائے موصوف چرخا چلانے کا ڈھنگ سیکھ رہے ہیں۔

نیچے کی دونوں تصویروں میں پریس اٹاچی کی اہلیہ مسز جنسین چرخے کا استعمال عملی طور پر بتا رہی ہیں۔
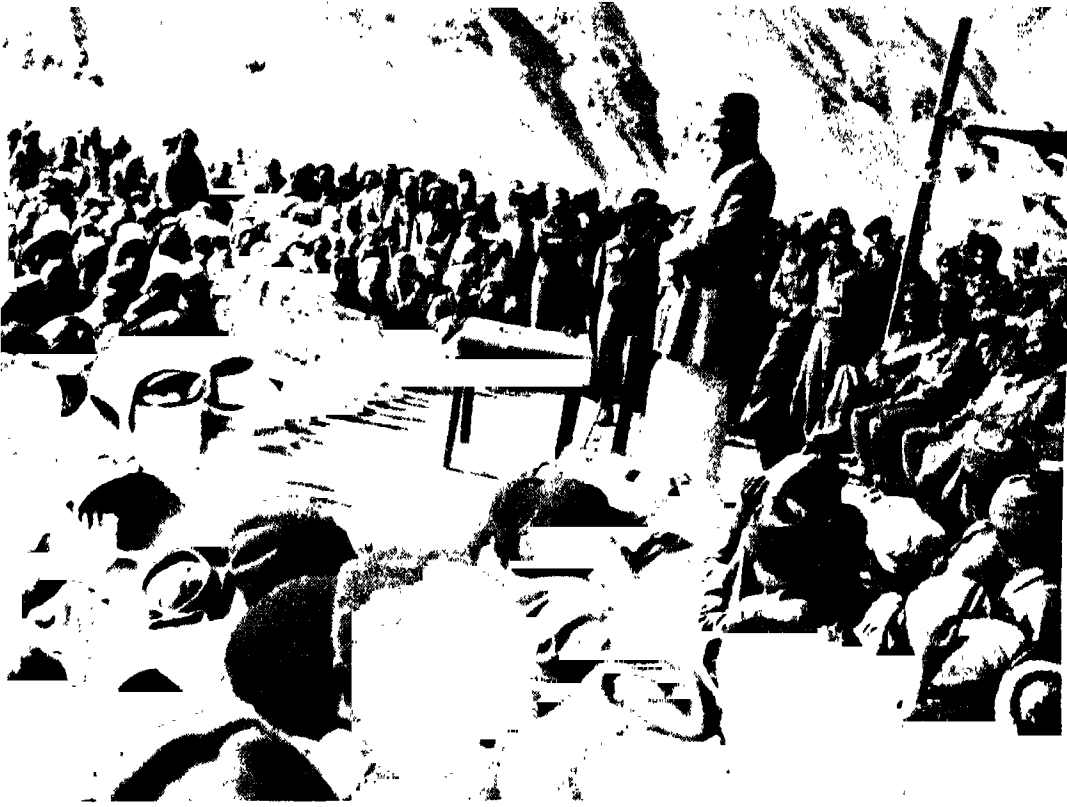
لداخ کرگل وادی میں

۱۱ نومبر ۱۹۴۹ء کو لداخ کرگل وادی میں اس دن کی یاد میں سالانہ جشن منایا گیا جب کہ ہندوستانی فوج نے لداخ کرگل وادی کو حملہ آوروں سے آزاد کرایا۔ اس موقعے پر پریڈ کے علاوہ کئی قسم کے کھیل اور تفریح کے پروگرام منعقد کئے گئے۔ اس تصویر میں بخشی غلام محمد فوجیوں اور شہریوں کے ایک مجمع سے خطاب کر رہے ہیں۔

لداخیوں کا وہ ہجوم جو یہ پروگرام دیکھنے کے لئے آیا۔

سکندر علی وجد

ایلورا

(اورنگ آباد دکن سے ۱۸ میل کے فاصلے پر دولت آباد کی پہاڑیوں میں تقریباً ۹ سو سال کی مدت میں (سنہ ۳۵۰ء تا ۱۲۰۰ء) ۳۴ غار تراشے گئے تھے۔ مذہب و تمدن کی اس پُرعظمت سنگین داستان میں پیکر تراشی کے بیسیوں بے مثل نمونے آج بھی محفوظ ہیں)

مَے خیال ہے سنگین آبگینوں میں
دِلوں کا سوز نہاں پتھروں کے سینوں میں
چھپائے نورِ ازل بُت ہیں آستینوں میں
حیات جذب ہے اِن بے شکن جبینوں میں
یہاں جو تیر کو فکرِ رسا نکلتی ہے
وفورِ شوق میں پربت کی سانس چلتی ہے

عیاں ہیں عرصۂ ہستی کے سب نشیب و فراز
ہُوئی ہے رُوئے حقیقت سے دُور گردِ مجاز
ملی جو ذوقِ عمل کو خیال کی پرواز
نشاطِ کار نے کر دی حیاتِ کار دراز
کمندِ گردشِ ایّام کے اسیر نہیں
نقوشِ دستِ عقیدت فنا پذیر نہیں

عظیم عزم تھے جانباز نقش کاروں کے
خزاں کی فکر نہ ارمان تھے بہاروں کے
دِلوں میں خواب تھے بیدار کوہساروں کے
نظر عقاب کی تیشے تھے برق پاروں کے
تصوّرات کے پیکر تراش ڈالے ہیں
دیئے وہ دِل جو ہمیشہ دھڑکنے والے ہیں

بنائی تیشہ وروں نے خیال کی دُنیا
کھلی ہُوئی ہے عروج و زوال کی دُنیا
جُنوں نواز جلال و جمال کی دُنیا
رہینِ محنتِ ماضی ہے حال کی دُنیا
نجوم ڈوب گئے جلوۂ سحر کے لئے
ہُوا ہے خونِ دل اس جنّتِ نظر کے لئے

نگار خانۂ عالم کا عکس یہ وادی
ہزار حشر بداماں خموش آبادی
ہُنروروں کو تھی عرضِ ہُنر کی آزادی
یہاں نہیں ہے کوئی نقش نقشِ فریادی
غلام مرضیٔ حالات حُسن کار نہیں
کمالِ فکر کے شہکار اشتہار نہیں

سکونِ رُوح اس آغوشِ کوہسار میں ہے
یہ زندہ خواب کسی چشمِ انتظار میں ہے
نظامِ شام و سحر دل کے اختیار میں ہے
زمانہ محو یہاں جستجوئے یار میں ہے
نگاہ ڈھونڈ رہی ہے نشاں نہیں ملتا
غبار سامنے ہے کارواں نہیں ملتا

صادقین صدیقی

ہندوستانی مُصوّری

غرض و غایت، معنوی خصوصیات اور تاریخی پس منظر

زمانۂ قدیم کے باشندوں کے رسم و رواج، تہذیب اور تمدن، مذہب اور عقائد سے ہم کو کس طرح واقفیت ہوئی۔ اس طویل سوال کا جواب نہایت مختصر ہے یعنی یہ صرف قدیم زمانے کے لوگوں کا فن تھا جس کے ذریعے سے اُن کے معیارِ زندگی، طرزِ معاشرت اور خیالات کو آنے والی نسلیں سمجھ سکیں۔ قدیم ہندوستان کا تمدن، دنیا کے قدیم ترین تمدنوں کی سب سے اگلی صف میں ہے اور ملک کی دیرینہ عظمت اور شان و شکوہ کا مکمل ثبوت ہے۔ عہدِ قدیم کی جو اشیاء اور یادگاریں آج برآمد ہو رہی ہیں، وہ اُس زمانے کے لوگوں کی صرف تاریخ ہی کا پتہ نہیں دے رہی ہیں بلکہ ان فنکارانہ صلاحیتوں کے تکمیل شدہ ہونے پر مُہرِ تصدیق بھی ثبت کر رہی ہیں۔

قدیم ہندوستان کے باشندے اونچے پہاڑوں کو پار اور وسیع سمندروں کو عبور کرتے ہوئے دور دراز ممالک میں گئے۔ اور وہاں کے باشندوں کو نہ صرف اپنے خیالات سے وابستہ کیا بلکہ اپنے تہذیب و تمدن کا ایک بہت بڑا حصہ بھی ان کو دیا۔ یہی وجہ ہے کہ تمام جنوب مشرقی ایشیا خصوصاً اور شمالی اور مغربی ایشیا کے ہندوستان سے نزدیک علاقے عموماً اُس عہد کی اکثر اُن اشیا سے بھرے ہوئے ہیں جن کو ہندوستانی فنون کا ایک عکس کہا جا سکتا ہے۔ جن کے ذریعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے قدیم باشندے ایک ایسی زندگی بسر کر رہے تھے جس میں حرکت تھی۔ اُن کی حکمتِ عملی جمود شکن تھی۔ اُنھوں نے اطراف کے تمام ممالک کو دولتِ فن سے مالا مال کر دیا تھا۔ فنِ عمارت اور فنِ سنگتراشی کے اکثر حیرت انگیز نمونے ان علاقوں میں دستیاب ہوتے ہیں۔

ہندوستانی مُصوّری کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ہندوستانی فن کی غرض و غایت کا مختصر جائزہ لیں۔ قدیم ہند کے تمام فنونِ لطیفہ کے پسِ پشت اُس عہد کے باشندوں کے مذہبی تصوّرات اور اعتقادات ہیں۔ جن کا نمایاں اثر ہم قدیم اور جدید دونوں ہی ہندوستانی فنون میں دیکھتے ہیں۔ مُصوّری، موسیقی، سنگتراشی وغیرہ پر ان تصوّرات اور اعتقادات کا گہرا اثر موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی فن کو ذہن نشین کرنے کے لئے ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ہندوستانی مذہب کو بھی سمجھیں کیونکہ دونوں میں ایک گہرا ربط ہے۔

آریہ لوگ بڑی بڑی قوتوں کی عبادت قربانیوں کے ذریعے سے کرتے تھے۔ اُن کے یہاں مندر اور مورت بنانا ممنوع تھا۔ برخلاف اس کے برہمنوں کے یہاں عبادت کا یہی طریقہ تھا۔ وہ بڑی بڑی قوّتوں کو انسانی شکل میں ڈھال کر عبادت کرتے تھے۔ اچھائی اور بُرائی کی قوّتوں کی عبادت کرنے کے لئے ان کے یہاں اصنام تراشنا عام تھا۔ ایک زمانے میں قدیم یونان میں بھی یہی رواج تھا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کی بڑی بڑی ذمہ دار کتابوں میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ دیوتاؤں کی شبیہہ بنانا روح کو بلند تر کرتا ہے اور دیوتاؤں کے ملک تک لے جاتا ہے۔

غرض ہندوستانی فن کے پسِ پشت یہی عقیدے کارفرما ہیں۔ جن کی نوعیّت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے مذہبی ماحول میں فن جس قدر بھی ترقی کرتا وہ کم تھا۔ کیونکہ اِسی کو اُس دَور کے انسان نے اپنی نجات کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا تھا۔ بُدھ مذہب کے رواج پانے کے بعد سے فنِ سنگتراشی نے جو کچھ حیرت انگیز ترقی کی اس کا اندازہ ہندوستانی فنِ عمارت سے ہو سکتا ہے۔ گوتم بُدھ کی شخصیت کی تصویر اور مورت بنانا

بہت زیادہ عام ہو گیا۔ اور یہی جذبہ ہندوستانی سنگتراشی اور مصوّری کی ترقی کرنے کا سنگِ بنیاد بن گیا۔

تاریخ

ہندوستانی مصوّری، ہندوستانی سنگتراشی کے مقابلے میں بہت غریب ہے۔ ہندوستان میں مٹّی اور پتھر سے مورتیں بنانا ایک مدّت نامعلوم سے جاری ہے۔ اور اُسی غیر معلوم مدت سے اب تک کی سنگتراشی میں ایک نہایت گہرا تسلسل پایا جاتا ہے۔ لیکن مصوّری میں یہ گہرا تسلسل مفقود ہے۔ جس کی متعدد مقامی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اُس زمانے کے لوگوں کے پاس مصوّری کا ساز و سامان اس قدر عام نہیں تھا جس قدر سنگتراشی کا تھا۔ دوسرے سنگتراشی کی طرف راغب ہونے کی وجہ اُن کا مذہب بھی تھا۔ دیوتاؤں کی شکل مورتوں میں آسانی سے ڈھالی جا سکتی تھی۔ اور اس کے دوش بدوش یہی مورت اُن لوگوں کو ہموار سطح پر بنی ہوئی تصویر کے مقابلے میں، اُن کی عبادت کے سلسلے میں زیادہ مطمئن بھی رکھ سکتی ہے۔ کیونکہ اس میں لمبائی، چوڑائی کے علاوہ موٹائی بھی ہوتی ہے۔ اور اس میں انسانی شکل کی شباہت بھی ہوتی ہے اسی وجہ سے اصنام تراشی کے فن کی بابت یہ کہا گیا ہے کہ یہ حقیقت سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے بہ نسبت فنِ مصوّری کے جس کی سطح ہموار ہوتی ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کا قدیم ماحول مصوّری کے لئے اتنا موزوں نہیں تھا جس قدر بت گری کے لئے موافق تھا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ قدیم ہندوستان میں مصوّری سراسر مفقود تھی۔ ان تمام امور کے باوجود ہندوستان کی قدیم مصوّری دنیا کے اور ممالک کی مصوّری کے روبرو ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور عزّت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ بدھ مذہب کے ابتدائی زمانے میں جس وقت گپت خاندان ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا، فنِ مصوّری کی جو کچھ ترقی اور پرورش ہوئی وہ اجنتا کے غاروں کو دیکھنے سے معلوم ہوتی ہے اس طرح اجنتا کے شاہکار، ہندوستانی فنِ مصوّری کے ایک بہت بڑے خلا کو پُر کر دیتے ہیں۔ اور آنے والے مصوّروں کے لئے مصوّری کے نئے دروازے کھولتے ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اجنتا کے غاروں کی تصویریں، ہندوستانی فنِ مصوّری کی سب سے پہلی چیزیں ہیں۔ درحقیقت ہندوستان میں فنِ مصوّری کا آغاز ان سے بہت پیشتر ہی ہو چکا تھا۔ جس کا کافی ذخیرہ ہم تک پہنچا بھی ہے اور باقی ماندہ یا تو ابھی انتظارِ تلاش میں موجود ہے یا وقت کے ہاتھوں پامال ہو چکا ہے۔

ہندوستانی فن کی تاریخی اعتبار سے حسب ذیل حصّوں میں بہ آسانی تقسیم کی جا سکتی ہے۔

نیولوتھک زمانہ جس کو تاریخ سے پیشتر کا بھی زمانہ مانا جاتا ہے اس کے بعد دریائے سندھ کی وادی کا تمدن جو ۳۰۰۰ قبلِ مسیح میں مہنجو دارو اور ہڑپا میں تھا۔ اس کے بعد موریہ عہد اور اس کے پیشتر کا زمانہ آتا ہے جس کا اختتام ۲۰۰ قبل مسیح میں ہوا اس کے بعد کشن اور اندھرا زمانے کا فن ہے جو پہلی اور تیسری صدی قبلِ مسیح میں جاری تھا۔ اور پھر گپتا عہد کے فن کا نمبر آتا ہے جو چوتھی صدی عیسوی سے چھٹی صدی عیسوی تک جاری رہا۔ گپتا عہد کے بعد قرونِ وسطیٰ کے فنّ نویں صدی عیسوی سے گیارھویں صدی عیسوی تک جاری رہے۔ اور پھر ان کی جگہ جدید فن نے لے لی۔

نیولوتھک عہد

ہندوستان میں مصوّری کا آغاز کب ہوا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب تاریخ نہیں دے سکتی۔ قدیم ترین زمانے کے مختلف شاہکار ملک کے عرض و طول میں دستیاب ہوئے ہیں۔ قدیم ترین عہد کے یہ تمام نمونے اُسی قسم کے ہیں جس طرح کے مغربی ایشیا اور یورپ وغیرہ میں بھی برآمد ہوئے ہیں۔ طرز و طور کے لحاظ سے دونوں مقامات سے برآمد ہونے والے یہ نمونے مشابہت رکھتے ہیں۔ ان کا پتہ جنوبی مشرقی ایشیا میں بھی ملتا ہے۔ قدیم ہسپانیہ اور قدیم ہند کے ان نمونوں میں ایک گہرا ربط ہے۔

شمالی اور وسطی ہندوستان کے بیشتر مقامات پر اُسی قدیم عہد کی تصاویر قدرتی غاروں میں سے برآمد ہوئی ہیں جن کو نیولوتھک عہد کا قرار دیا گیا ہے۔ ان کے نشانات ضلع مرزاپور، ہوشنگ آباد اور سنگھان پور میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوہ کیمور کے علاقے میں بھی ایسی تصویریں پائی گئی ہیں۔ قدیم ہندوستانی مصوّری کے ان

نمونوں میں مختلف قسم کے جانور دکھائے گئے ہیں۔ جن میں کے بعض موجود زمانے میں پائے بھی نہیں جاتے۔ ان تصویروں میں صرف جانور ہی نہیں ہیں بلکہ انسان بھی ہیں۔ ایک تصویر میں کسی جانور کا ایک آدمی بلم کے ذریعے سے شکار بھی کرتا ہوا دکھایا گیا ہے۔

مہنجی دارو اور ہڑپا

دریائے فرات اور اس کے معاون دجلے کا تمدن جس وقت اپنے عروج پر تھا عین اُسی زمانے میں دریائے سندھ اور اُس کے معاون ستلج پر دو اہم تمدنی مرکز مہنجی دارو اور ہڑپا نامی ترقی کر رہے تھے۔ یہاں کے باشندوں کے دیگر فنون کو نظر انداز کر کے یہاں اُن کے فنِ نقاشی کا مختصر حال بیان کیا جائے گا۔

مہنجی دارو اور ہڑپا کے تمدن کی جہاں اور بہت سی یادگاریں دستیاب ہوئی ہیں وہاں اُن لوگوں کے فنِ نقاشی کے بھی نادر نمونے دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں زیادہ تر جانوروں کی تصاویر شامل ہیں لیکن انسانی شبیہیں بھی برآمد ہوئی ہیں۔ جہاں تک ان لوگوں کے فنِ نقاشی کا تعلق ہے یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ نہایت ہنرمند تھے۔ جس کا ثبوت ہاتھی دانت کی وہ مہریں دیتی ہیں جن پر قسم قسم کے جانوروں کی تصویریں کندہ ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے نقش و نگار بھی ہیں۔ خالص فنِ مصوّری کے سلسلے میں یہاں سے برآمد ہونے والے برتنوں کو دیکھا جا سکتا ہے جن کی سیاہ یا سُرخ سطح پر سُرخ یا سیاہ نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ بعض برتنوں پر لکیر، مربع، مثلث اور دائروں کی مدد سے ایک خوشنما "ڈیزائن" بنا ہوا ہے۔ بعض پر جانوروں کی تصویریں ہیں اور بعض پر پھول بنائے گئے ہیں۔ جب دریائے سندھ کا یہ تمدن اور زیادہ وسیع ہوا اور بلوچستان تک پہنچا تو ان لوگوں کا ہنر اور زیادہ ترقی کر گیا

موریہ، سنگھا اور اندھرا عہد میں فنِ نقاشی نے حیرت انگیز حد تک ترقی کی۔ مورتیاں بنانا، مندروں پر طرح طرح کے نقش و نگار کندہ کرنا اُس عہد کے لوگوں کا محبوب ترین مشغلہ معلوم ہوتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ اُن لوگوں کو اس فن میں کس قدر مہارت حاصل تھی۔

لیکن اس عہد میں فنِ مصوّری کی وہ شان نہیں تھی۔ جو گپت عہد میں اِس فن کو حاصل ہوئی۔

اجنتا باغ اور بادامی

ہندوستانی مصوّری کی تاریخ میں گپت زمانہ سنہری زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ اِس زمانے کی مصوّری کے خاص خاص مرکز اجنتا، باغ اور بادامی ہیں۔ ان سب تصویروں میں داستان سرائی ہے اور مذہبی قصّوں کا تصاویر میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ان تصویروں کو دیکھنے سے صرف اُن لوگوں کے ہنرور ہونے ہی کا ثبوت نہیں ملتا۔ بلکہ یہ تصویریں اُن کے رسم و رواج کا بھی آئینہ ہیں۔

ہندوستانی فنِ تصویر میں سب سے زیادہ اہمیّت کی حامل یہی تصویریں ہیں جو اجنتا کی دیواروں پر بنائی گئی ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے باشندے تصویر نگاری میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ اگر ہم ان دلفریب تصاویر کو ہندوستانی مصوری کی روحِ رواں نہ کہیں تو یہ حقیقت سے انکار ہوگا۔ آج بھی ہماری مصوّری کا سرچشمہ یہی تصاویر ہیں۔ اور ہمارے موجودہ مصوّر انہیں سے "انسپائریشن" لیتے ہیں۔ درحقیقت یہ ہندوستانی مصوّری کا ایسا بڑا سرمایہ ہیں جن پر ملک ناز کر سکتا ہے۔

اجنتا اور باغ کی تمام تصاویر گپت عہد کی یادگاریں ہیں اجنتا میں متعدد غار ہیں جن کی دیواروں کو ان تصویروں سے مزیّن کیا گیا ہے۔ اجنتا کی تعمیر بیک وقت تسلسل کے ساتھ نہیں ہوئی بلکہ عیسائیت کی ابتدا سے شروع ہو کر ساتویں صدی عیسوی میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

ان تصویروں میں جو رنگ استعمال کئے گئے ہیں وہ معدنیات سے طیّار کئے گئے تھے۔ ان رنگوں میں چمک ہے۔ سبز، زرد، سُرخ سیاہ، نیلا اور کتھئی رنگ استعمال کیا گیا ہے۔ ایک حد تک قریب کی چیزوں کو بڑا اور دور کی چیزوں کو چھوٹا دکھانے کے اصول پر بھی عمل کیا گیا ہے۔ تاہم اِس اصول کو اس حد تک نہیں برتا گیا جس قدر قرونِ وسطیٰ کے مغربی مصوّروں نے اِس پر عمل کیا ہے۔

لیکن یہ واضح رہے کہ یہ قرونِ وسطیٰ کے مصوّروں کے شاہکاروں سے سیکڑوں سال پیشتر کی تخلیق ہے۔

گپت عہد میں ہندوستان کے طول و عرض میں بدھ مذہب پھیل چکا تھا۔ جس طرح بدھ مذہب سے پیشتر ہندوستانی فنکار اپنے مذہبی عقائد کو اپنا سب سے بڑا "انسپائریشن" بنائے رہے ہیں اسی طرح اس زمانے میں بھی جب ہندوستان میں بدھ مذہب کا دور دورہ تھا فنکاروں کا سب سے بڑا مقصد اپنے فن کے ذریعہ سے بدھ مت کی تبلیغ کرنا تھا۔ بدھ مذہب نے سنگتراشی پر جس قدر گہرا اثر ڈالا ہے اس کی مثالیں صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ایشیا کے متعدّد علاقوں میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اجنتا کی دیواروں پر جو تصاویر ہیں اُن کو بدھ مذہب کی تبلیغ اور پرچار کے سلسلے کی ایک کڑی ماننا حقیقت کے عین مطابق ہوگا۔ تمام تصاویر بدھ نظریات پر مبنی ہیں۔ گوتم بدھ کے حالاتِ زندگی کا تصاویر میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

اجنتا کے مصوّروں نے اپنے شاہکاروں میں عورت کو ایک خاص جگہ عنایت کی ہے۔ شکل و صورت کے لحاظ سے اجنتا میں عورتوں کی تصاویر عالمگیر شہرت کی مالک ہیں۔ زیادہ تر تصویریں عورتوں کی تصویروں پر مبنی ہیں۔ جن کو مختلف اشغال میں مصروف دکھایا گیا ہے۔ ان میں شہزادیاں بھی ہیں، اور کنیزیں بھی۔ جو کہیں آرائشِ حسن میں مصروف ہیں تو کہیں عالمِ رقص میں۔ کہیں گا رہی ہیں تو کہیں ان کے جلوس نکل رہے ہیں۔

باغ اور اجنتا کا بیشتر حصہ گپت عہدِ سلطنت کے زوال کے بعد تعمیر کیا گیا تھا۔ اس بات سے ہندوستان کے اُن قدیم باشندوں کی قدرِ فن کا اندازہ ہوتا ہے۔ گپت سلطنت تو ضرور زوال کر گئی لیکن گپت مصوّری ترقی کرتی رہی۔

اجنتا کے بعد

جین مذہب کے مقلدوں کی بنائی ہوئی اسی قسم کی تصاویر جنوبی ہند کے ایک مقام ستانا واسل میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ تدملائے پورم میں برہمنوں کے تخیلات سے وابستہ تصاویر ہیں۔ جو ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی کی یادگاریں ہیں۔ برہمنوں کے زمانے کی قدیم ترین تصویریں کیلاش ناتھ مندر کی دوسری منزل کے دروازے کی چھت پر اب تک باقی ہیں جو آٹھویں صدی میں بنائی گئی تھیں۔ اس سلسلے میں پانچویں صدی عیسوی کی اس مصوّری کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جو لنکا میں سگریا کے مقام پر اب تک موجود ہے۔ گیارھویں صدی میں ہندوستانی مصوّر تنجور کی دیواروں کو منقش کرتے رہے۔ آٹھویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک ہندوستانی مصوّری کا ابلورا میں سلسلہ جاری رہا۔ بارھویں صدی میں لنکا میں بدھ مذہب پر چلنے والے لنکا کے باشندوں نے پولن ناروا میں اس کے تسلسل کو جاری رکھا۔ اس کے بعد وجانگر کے زمانے میں مصوّری پروان چڑھتی رہی۔ تیرھویں صدی عیسوی سے لے کر سترھویں صدی عیسوی تک گجراتی مصوّری کا دور دورہ رہا۔ سولھویں صدی کے بعد سے راجپوت اور مغل مصوّری نے ہندوستانی مصوّری کی انیسویں صدی عیسوی تک نمائندگی کی اور جدید مصوّری کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

نویں صدی عیسوی کے مشرقی اسکول میں دھیمن اور بت پالو دو اہم ترین مصوّر تھے۔ اس اسکول کی توجہ صرف سنگتراشی ہی کی طرف نہیں بلکہ مصوری کی طرف بھی مبذول رہی تھی۔

پالا اسکول گیارھویں اور بارھویں صدی کا اہم ترین اسکول تھا۔ جس کی شہرت ممالکِ غیر میں بھی پہنچ چکی تھی۔ گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں صدی کی اکثر یادگاریں بنگال اور نیپال سے دستیاب ہوتی ہیں۔ تاڑ کے پتوں پر اکثر بدھ مذہب کے متعلق تحریریں ہیں جن کو لکڑی کی تختیوں کے ذریعے سے ڈھکا گیا ہے۔ لکڑی کے ان تختوں پر مصوّری کی گئی ہے۔ یہ تصویریں بعد میں آنے والی گجراتی تصویروں کے طرز و طور سے بہت مشابہت رکھتی ہیں۔ دوسری طرف برلنگھم [illegible] کے مصوّری کے شاہکاروں سے جو پاگن میں ہیں ملتی جلتی ہیں۔

بارھویں اور تیرھویں صدی میں ہندوستان کے مصوّر تاڑ کے بڑے بڑے پتوں پر اپنا شاہکار بنایا کرتے تھے۔ اس زمانے کی ان تاڑ پر بنی ہوئی تصویروں میں شکلیں کافی اچھی بنائی گئی ہیں۔ اور

باریک لکھار ناکیں اور لمبی لمبی آنکھیں ان تصویروں میں عام ہیں۔ تصویر میں شکل کے علاوہ دوسرے حصّوں کو سُرخ یا نیلے رنگ سے بھر دیا گیا ہے

اِن تمام مذکورۂ بالا اُمور سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ خیال کہ ہندوستانی مُصوّری ساتویں صدی عیسوی پر بالکل ختم ہو گئی اور اس کے بعد مغلوں کے آنے پر اس میں از سرِ نو جان ڈالی گئی۔ بالکل غلط ہے۔ ہندوستانی مُصوّری کا تسلسل کم سے کم تعمیر اجنتا کے بعد سے کبھی منقطع نہیں ہوا۔ عہدِ متوسط میں مُصوّری اعلے پیمانے پر جاری اور سنگتراشی کے دوش بدوش چلتی رہی۔

مُغل اور راجپوت مُصوّری

سولھویں صدی کے نصف سے سرزمین ہند پر ایک خاص مُصوّری کے طرز کا آغاز ہوتا ہے۔ جس کو راجپوت مُصوّری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی جائے پیدائش راجپوتانہ تھی۔ یہ مُصوّری اپنے زمانے میں ایک امتیازی شان رکھتی تھی۔ اس کو ایک حد تک گجراتی مُصوّری کا جانشین بھی کہا جا سکتا ہے۔

راجپوت مُصوّری پر ایرانی اور مُغل مُصوّری کا جو کچھ اثر پڑا ہے وہ دونوں کا مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ راجپوت مُصوّری میں ایک بڑی حد تک مغل عناصر پائے جاتے ہیں۔ اور چند ہی تصویریں ایسی ہوں گی جن پر مغل مُصوّری کا نمایاں اثر نہیں ملے گا۔ لیکن پھر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ راجپوت مُصوّری نے اپنی انفرادیت کا دامن چھوڑ دیا۔ مغل مُصوّری کا راجپوت مُصوّری پر وہی اثر پڑا جو چینی مُصوّری کا بہزاد کے زمانے میں ایرانی مُصوّری پر پڑا تھا۔ ایرانی مُصوّری نے چینی مُصوّری سے بہت کچھ حاصل کیا لیکن اپنے انداز و طرز کے رسم و رواج کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہوئی کہ ایرانی مُصوّری زندہ رہی۔ اور ترقی پذیر ہوئی۔

ایرانی، مغل اور راجپوت مُصوّری میں تکنیک کے لحاظ سے کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ یہ تینوں اسکول ایک ہی قسم کے قواعد و قوانین پر عمل پیرا ہے۔ مثلاً قریب اور دُور کی چیزوں کو برابر بنانا اپنی تصویروں میں صرف بالائی حصے کی ایک پٹی میں آسمان کا دکھانا رات اور دن میں کوئی نمایاں فرق نہ رکھنا، ان سب کے یہاں یکساں طور پر نظر آتا ہے۔

جب راجپوت یا مغل مُصوّر کسی منظر کو بناتا ہے تو اپنے مقام کو اس قدر بلندی پر فرض کر لیتا ہے کہ اُس کے منظر کی ایک ایک شے حدِ نظر میں آجائے۔ کوئی شے کسی شے کے پس پشت رہ کر نظر سے اوجھل نہ ہو جائے۔ اور ہر شے جو کچھ حقیقت رکھتی ہے اُسی کے مطابق بنائی جائے یعنی اگر کوئی انسان نزدیک کا بنایا اور کوئی درخت دور کا دکھایا ہے تو دونوں کو اُن جسمانی حیثیت کی نسبت سے برابر ہی بنائیں گے تاکہ دیکھنے والا دونوں چیزوں کی اصل حیثیت کو سمجھ لے۔

مضامین بھی زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ عام طور پر عشق و مُحبّت کے متعلق تصویریں ہر جگہ کی مُصوّری میں عام ہیں۔ اور یہ صفت ایرانی مغل اور راجپوت مُصوّری میں عام ہے۔ ناچتی اور گاتی ہوئی لڑکیاں بنانا ان تینوں اسکولوں کے مُصوّروں کا کام رہا ہے۔ اس کے علاوہ اپنے ملک کے حالات گزشتہ کی نقاشی کرنا اسکولوں کے مُصوّروں کا اہم ترین "انسپائریشن" رہ چکا ہے۔ ایرانی مُصوّروں نے شاہ نامے کو مُصوّر کیا۔ اِسی طرح راجپوت مُصوّروں نے رامائن اور مہابھارت کے متعدد واقعات کو جامۂ تصویر میں ملبوس کیا۔ گزشتہ دور کے مشہور واقعاتِ عشق و محبّت کو مُصوّر کرنا بھی ان مُصوّروں کا اہم مشغلہ رہا ہے۔ جس طرح ایرانی مُصوّروں کا خاص مضمون لیلیٰ مجنوں، شیریں اور خسرو کی تصاویر بنانا رہ چکا ہے اُسی طرح راجپوت مُصوّروں نے اکثر مقامات پر کرشن کو گوپیوں کے ساتھ کھیلتا ہوا دکھایا ہے۔ رادھا اور کرشن کی اکثر تصاویر میں رومانی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے دیگر راجپوت مُصوّری میں ناچنے گانے کے مناظر دکھلائے گئے ہیں۔ اور اس طرح موسیقی کا ماحول پیدا کر کے راگوں اور راگنیوں کو دکھایا گیا ہے۔

مذہب نے اِن تینوں مُصوّری کے اسکولوں پر گہرا اثر ڈالا ہے مذہب سے متعلق اکثر و بیشتر تصاویر راجپوت مُصوّری میں ملینگی۔ ایرانی مُصوّری میں بھی اسلام آنے سے بیشتر، انسانی اشکال کے بنانے کا رواج تھا لیکن اسلام آنے کے بعد انسانی اشکال کا بنانا مذہبی پیشواؤں نے ممنوع قرار دے دیا۔ جس کی بدولت ایرانی مُصوّروں کی توجہ دوسرے

مناظرِ قدرت کی طرف مبذول ہوگئی - اور اپنی مذہبی کتابوں کے پہلے ورق کو نہایت حسین اور دیدہ زیب نقش و نگار سے آراستہ و پیراستہ کرنے لگے - اور اس کام میں اُن کو ایک زبردست مہارت حاصل ہوگئی -

مغل مُصوّری، جو درحقیقت ایرانی مصوری کی ایک شاخ ہے اِس روش سے بے نیاز رہی - مغل مُصوّروں کا سب سے اہم بلکہ واحد کام صرف انسانی شکل کا بنانا تھا جس کے سلسلے میں وہ دوسری اشیاء کو بھی اپنی تصویریں دکھاتے تھے -

راجپوت مُصوّروں کے زیادہ تر کارنامے راجپوتانے کے اکثر محلوں کی دیواروں پر دیکھے جا سکتے ہیں - کیونکہ راجپوت مُصوّری کی ابتدا سے کافی زمانے کے بعد تک کاغذ بہت زیادہ عام نہیں تھا - اس لئے وہ لوگ دیواروں پر اپنے کارنامے دکھانے کے لئے مجبور تھے - اس کے علاوہ کپڑے پر تصویر بنانے کا بھی رواج تھا لیکن جیسے جیسے کاغذ ہندوستان میں آیا، اُنہوں نے کاغذ کا استعمال شروع کر دیا -

کنگرا اسکول

راجپوت مُصوّری کے تحت اگر کنگرا اسکول کی بیش بہا خدمات کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ سخت ناانصافی ہوگی - کیونکہ اِسی اسکول کے تحت راجپوت مُصوّری نے حیرت انگیز ترقی کی - اور جدت کی طرف قدم اُٹھایا - راجپوت مُصوّری کا یہ اسکول، اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف میں راجہ سمسار چند کی قیادت میں قائم ہوا - اس زمانے میں اس سے ملحق اور اسکول بھی موجود تھے - انیسویں صدی میں اس اسکول کا زوال ہوا - لیکن اس کی متعلقہ شاخیں بنگال اور اڑیسہ میں باقی رہیں -

راجپوت مُصوّری پر مغلیہ اثر کی وجہ

شہنشاہ اکبر جہاں اور فنون کا دلدادہ تھا وہاں فنِ مُصوّری کا بھی پرستار تھا - اس نے مُصوّری کی بڑی سرپرستی کی - بسا اوقات خود اپنی تصویر کھچوانے کے لئے مُصوّروں کے روبرو بیٹھا کرتا تھا - اس کے دربار میں سو سے زیادہ مصوّر تھے -

عہدِ اکبری میں ہندو اور مسلمانوں میں جو کچھ اتفاق اور اتحاد تھا وہ تاریخ ہند میں بے نظیر ہے - اس کے یہاں بغیر امتیازِ مذہب و ملّت فنکاروں کی بڑی عزت تھی - خاص طور سے راجپوتوں سے اُس کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ راجپوت مُصوّروں پر مغل مُصوّروں کا گہرا اثر پڑا -

راجپوت اور مغل مُصوّری میں مضامین کا فرق ہے - راجپوت مُصوّری کے لئے راگوں، راگنیوں کی بڑی اہمیت ہے - اور انہیں سے راجپوت مُصوّری کا پیدائشی تعلق ہے - برخلاف اِس کے مغل مُصوّری ایک خالص درباری فن کہی جا سکتی ہے - اہلِ دربار کی تصویریں بنانا مغل مُصوّری کا کام تھا - یا اہلِ دربار کی گزشتہ تاریخ سے متعلق تصاویر بنانا اُن کی مُصوّری کا محدود مضمون تھا مضمون کی نوعیت سے راجپوت مُصوّری کافی وسعت رکھتی ہے -

اکبر، جہانگیر اور شاہجہان، شہنشاہانِ مغلیہ میں مُصوّری کے سب سے زیادہ پرستاروں میں سے تھے - اِن کے زمانے میں مغل مُصوّری اپنے عروج کی منازل میں قدم رکھ چکی تھی - نیز جہانگیر اور شاہجہان کے زمانے میں مغل مُصوّری نے بڑی ترقی کی - لیکن اورنگ زیب کے زمانے میں مذہبیت اور تعصّب اور رجعت پسندی کی وجہ سے مغل مُصوّری کا زوال ہوگیا اور اس طرح زوال ہوا کہ مغل مُصوّری پھر نہ اُبھر سکی - اس کے بعد جس قدر بھی تصاویر بنائی گئیں اُن میں گزشتہ تصویروں کی سی خوبیاں نہ پیدا ہو سکیں -

افسوس یہ ہے کہ ہندوستان کے قدیم مُصوّروں کے حالاتِ زندگی سے ہم ناواقف ہیں - عہدِ مغلیہ کے خاص خاص مُصوّروں کے نام ضرور معلوم ہیں - شہنشاہِ اکبر کے دربار کا خاص مُصوّر عبدالصمّد تھا - جہانگیر کے عہدِ سلطنت میں ابوالحسن نام کا مُصوّر مخصوص درباری مُصوّر تھا - شاہ جہاں کے دربار کے تمام مُصوّروں میں سب سے اعلیٰ مُصوّر محمد فقیر اللہ خاں تھا - تمام درباری مُصوّر اِسی کے تحت کام کیا کرتے تھے - فقیر اللہ خاں ایک اور درباری مُصوّر میر ہاشم کے ساتھ کام کیا کرتا تھا - جو خاص طور پر انسانی تصاویر بنانے میں ماہر تھا -

جدید مُصوّری

جدید ہندوستانی مُصوّری، اختلاطِ مغرب و مشرق کا نتیجہ ہے - یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ

ہندوستانی مصوّروں نے اپنی قدیم روش اور اپنے قومی انداز کو قطعاً ترک کر دیا۔ کیونکہ کلکتے میں ابنندر ناتھ ٹیگور نے شانتی نکیتن کے ذریعے سے خالص مشرقی فنون کی پرورش کی۔ اس کے علاوہ مغربی مصوّری نے ہندوستانی مصوّری پر اچھا اثر ڈالا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستانی مصوّری میں از سرِ نو ایک تازہ روح پھونک دی گئی۔ اور اس سلسلے میں ٹیگور کے ساتھ ساتھ ہیول کا نام بھی قابلِ ذکر ہے۔

اب ہندوستانی مصوّری، وقت اور ماحول کے لحاظ سے بالکل صحیح راہ پر چل رہی ہے۔ موجودہ دنیا میں، صنعتی مصوّری ہر ملک کی ترقی، فلاح اور بہبود کا سب سے بڑا راز ہے۔ ہندوستان میں خاص مصوّری کے ساتھ ساتھ صنعتی مصوّری کے اکثر و بیشتر شہروں میں مغربی طرز پر ادارے بیسویں صدی میں قائم ہوئے جن کی زیرِ سرپرستی اچھے اچھے مصوّر پیدا ہو رہے ہیں اور ہندوستانی مصوّری وقت کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔

ہندوستانی مصوّری کی ترقی کا مدار تمام تر حکومت پر ہے۔ ملک میں مصوّری کی صلاحیت رکھنے والے لوگ موجود ہیں اگر اُن کو اُن کی صلاحیت کے مطابق تعلیم دی جائے تو وہ بہت آگے نکل سکتے ہیں اور ہندوستانی مصوّری کو اس قابل بنا سکتے ہیں کہ دورِ حاضر میں ممالکِ غیر کی مصوّری کے سامنے ہندوستانی مصوّری ایک ممتاز حیثیت کی حامل ہو جائے۔

ہندوستانی مصوری کا مقصد

صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام مشرقی ممالک کی مصوّری کی تاریخ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اس کا مقصد جمالِ در و بام نہیں، اس کی غرض انسان کی نظر کو لُبھانا نہیں بلکہ اور ہی کچھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم اور متوسط ہندوستان کے مصوّر اپنے شاہکاروں میں کسی شے کی شباہت کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ہندوستانی مصوّر کسی شے کو اس طرح نہیں بناتا جس طرح کہ وہ اُس کو دیکھتا ہے بلکہ اس طرح بناتا ہے جس طرح کہ وہ کسی شے کو محسوس کرتا ہے اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مصوّروں نے روح پر جسم کو ترجیح نہیں دی۔ کیونکہ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستانی مصوّر کا مقصد یہ ہے کہ وہ جس شے کو دیکھتا ہے اُس شے کی روح کو بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس شے کے اندرونی معنی کو بیان کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اس طور پر کسی تصویر کا مقصد یہ نہیں کہ وہ ایک شاہکار کی حیثیت اختیار کرے اور مادّی حیثیت میں اصل سے مل جائے۔ ہندوستانی مصوّر کا نصب العین کسی بات کو تعلیم دینا ہوتا ہے۔ حُسن کو ظاہر نہیں کیا جاتا بلکہ تصویر کے پردے میں پنہاں کر دیا جاتا ہے۔ اس نظریے کے باوجود ہندوستانی مصوّروں اور سنگتراشوں کے کارنامے ایک مادّی خوبصورتی رکھتے اور انتہائی دیدہ زیب بھی ہیں۔

مشرق کا مصوّر جب کسی منظر کی تصویر بنانی چاہتا ہے تو وہ اُس منظر پر نظر ڈال کر یہ نہیں سوچتا کہ کہاں درخت ہے، کہاں گھاس ہے، کہاں دریا ہیں، کہاں پہاڑ ہیں آسمان پر بادل کس طرح چھائے ہوئے ہیں۔ ہوا کس سمت درختوں کو جُھکا رہی ہے۔ بلکہ وہ اُس منظر کو دیکھ کر یہ کوشش کرتا ہے کہ اُس منظر کی روح کو سمجھے اور اُس میں چھپی ہوئی خوبصورتی کا سراغ لگائے۔ اور جب وہ کسی نتیجے پر پہنچ جاتا ہے اُس کے بعد اُس کی تصویر بنانی شروع کرتا ہے۔ جس میں منظر کے مادّی حُسن کو نظر انداز کر کے، منظر کے روحانی حُسن کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اِس نقطۂ نظر کے مطابق اُسی مصوّر کو اعلیٰ سمجھا جا سکتا ہے جو کسی شے کی روح کو تصویر میں ظاہر کرے۔ اس کے لئے یہ شرط نہیں کہ مصوّر اپنے کام میں بہت زیادہ مہارت رکھتا ہو، اس کے برش میں قوت ہو اور اُس کے رنگ اچھے ہوں بلکہ یہ شرط ہے کہ مصوّر ذہین ہو اور اعلیٰ خیالات کا حامل ہو۔ تاکہ کسی شے کی روح کو سمجھ سکے اور اس کے بعد اپنے احساس کے مطابق اس کو تصویر میں منتقل کر دے۔

یورپ اور ہندوستانی مصوری کا اختلاف واتحاد

اس کے برعکس مغربی مصوّر کا کچھ اور ہی نصب العین ہوتا ہے۔ یعنی جب وہ کسی شے

یا منظر کو دیکھتا ہے تو اُس کو بالکل اُسی طرح بنانے کی کوشش کرتا ہے ۔ اور اگر وہ نقل کو اصل سے ملا دیتا ہے تو اُس کا شاہکار کامیاب رہتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی مصوّر اشیاء یا مناظر کے ہر مادی پہلو پر عمیق نظر ڈالتا ہے اور اپنے کو زمان و مکان کی زنجیروں میں جکڑ لیتا ہے ۔ اگر رات کے وقت تصویر بناتا ہے تو اپنی تصویر میں رات کے وقت کا ہی سماں کھینچ دینے میں اُس کی کامیابی ہے ۔ قریب کی چیز بڑی اور دُور کی چیز چھوٹی بنانے کے اصول پر سختی سے عمل کرتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مشرق اور مغرب کی مصوّری کے درمیان ایک وسیع خلیج دیکھتے ہیں ۔ مشرق اور مغرب کے مصوّروں کا مشن ایک دوسرے کے برعکس ہے ۔ مغرب میں کسی شے کی مادّی شکل نہایت اہم ہے اور مشرق میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ۔ دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ مغرب میں مصوّری کا مقصد جمالِ در و بام ہے اور انسان کے ذوقِ نظر کو لُبھانا ہے ۔ برخلاف اس کے مشرق میں مصوّری کو ایک تعلیمی ذریعہ سمجھا جاتا ہے ۔ مذہبی عقاید کو عوام تک پہنچانا ہندوستانی مصوّری کا مقصدِ اوّلین رہ چکا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے قدیم مندر ملتے ہیں ان میں طرح طرح کی تصویریں بنی ہوئی ہیں ۔ تاکہ ان کے ذریعے سے عوام سبق حاصل کریں قدیم زمانے میں کیونکہ کوئی خط ایجاد نہیں ہوا تھا اس لئے کسی واقعے کا ریکارڈ محفوظ رکھنے کے لئے وہ لوگ اِس بات پر مجبور تھے کہ نقش و نگار کے ذریعے سے مقصد کو حاصل کریں ۔ اور غالباً مصوّری دنیا میں عالمِ وجود میں بھی اسی طرح آئی ہے ۔

ہندوستانی مصوّری کا جو کچھ مقصد اور مُدّعا ہے' اُس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ای۔ بی۔ ہیول اپنی ایک کتاب میں رقمطراز ہے

> "ہندوستانی مصوّری کے اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کی دلیل اِس امر سے مل سکتی ہے کہ ہندوستانی کا تشکار باوجود اِس بات کے کہ وہ مغربی نظروں میں جاہل ہے پھر بھی دُنیا کے باقی ماندہ کاشتکاروں کے مقابلے میں سب سے زیادہ تمدن یافتہ ہے"۔

اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندوستانی مصوّری نے اس کو مذہب اور معاشرت کی اتنی تعلیم دے دی ہے کہ وہ اپنے عقائد میں پکا رہ سکے اور یہی ہندوستانی مصوّری کی کامیابی کی محکم دلیل ہے ۔

ہندوستانی اور مغربی مصوّری میں اختلافات کے دوش بدوش اتفاقات بھی ہیں ۔ عہدِ وسطیٰ کے اکثر مغربی مصوّروں کے شاہکار مذہبی عقائد اور مذہبی روایات کے اُوپر مبنی ہیں ۔ جس طرح ہندوستانی مصوّر اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کی تصاویر اور مورتیں بناتے رہے ہیں اسی طرح یورپ میں بھی ایک زمانہ وہ تھا کہ وہاں کے مصوّر اپنی مذہبی روایات کی تصویر بنایا کرتے تھے لیکن زمان و مکان کی قیدوں سے آزاد ہو کر نہیں ۔ لہذا وہ بنیادی اختلافات جو مشرق اور مغرب کی مصوّری میں ہے اپنی جگہ مسلم ہے ۔

جس طرح ہندوستانی صناع اور حکمراں ارتباطِ باہمی سے اپنے مندر بناتے رہے ہیں اسی طرح عہدِ وسطیٰ کے مغربی مصوّروں صناعوں اور سنگتراشوں نے اپنے عبادت خانوں کو شان و شکوہ بخشنے میں اشتراکِ عمل اور مساوی شوق کا ثبوت دیا ہے ۔ اس سلسلے میں مائیکل انگلو اور ریفائل کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں ۔ پوپ جولیز دوم نے مائیکل انگلو کو ایک عبادت گاہ کی چھت میں مینا کاری کرنے کے لئے رُوم میں بلایا تھا ۔ اِس کام کو اُس نے اس قدر محنت اور جانفشانی سے انجام دیا کہ دنیا آج بھی محوِ حیرت ہے اور اُس کا یہ شاہکار انسانی کاریگری کی ایک نادر مثال ہے جس کو ایک معجزے کی حد تک پہنچا دیا گیا ہے' جس کو مصوّر نے چار سال کی محنت کے بعد لیٹ کر انجام دیا تھا ۔ اس میں انجیل کے مطابق تمام روایات بیشتر کو تصویر میں دکھایا گیا ہے ۔ کس طرح دنیا وجود میں آئی' کس طرح انسان کا کرۂ ارض پر نزول ہوا ۔ کس طرح نوح کا طوفان آیا وغیرہ اسی جذبے کے تحت بنائے گئے ہیں جس جذبے کے تحت ہندوستانی مصوّر رامائن اور مہابھارت کے قصوں کی تصویریں بناتے ہیں ۔

ہندوستانی مصوّری کی مغرب میں پسندیدگی

سالِ گزشتہ "رائل اکیڈمی آف آرٹ" کی طرف سے ہندوستانی فن کی نمائش ہوئی تھی ۔ جس نے ہندوستان کے ماضی کی تمدّنی عظمت کا ثبوت دیا تھا ۔ مغرب والوں کے لئے ہندوستانی مصوّری بالکل نئی چیز تھی لیکن اِس کے باوجود اُن لوگوں نے ہندوستانی مصوّری کی معنوی خصوصیات کا اندازہ کیا جس کا ثبوت

"آبزرور" کے ناقد فن کے قول سے ملتا ہے۔

"... ہندوستانی فن، حیرت انگیز حد تک اس دنیا کا فن معلوم ہوتا ہے ... اور جتنی جتنی ہماری نظر اُس کی خوبصورت شکلوں سے مانوس ہوتی جاتی ہے، ہم خوشی کے ساتھ زندگی کی اعلیٰ اور توانا محبت کا اس کی ہر شکل میں احساس کرتے ہیں"

خاتمہ

آخر میں اس حقیقت کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان ــــ طویل و عریض مُلک ــــ صبح تمدّن کے پہلے لمحے سے لے کر اب تک تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ اِس سرزمین پر نہ جانے کتنے انقلاب آئے، اور ان کے ساتھ ساتھ نہ جانے کتنی قومیں آئیں؟ کتنی نسلیں آئیں اور کتنے مذہب آئے؟ اور ان سب آنے والوں کے علوم و فنون میں خلط ملط ہوتے چلے گئے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ اِس ملک نے کتنے زمانوں کا فن دیکھا لیکن صبح تمدّن کے پہلے لمحے سے لے کر اس وقت تک جو بھی علم یا فن کشمیر سے لے کر راس کماری تک اور بلوچستان سے لے کر آسام تک اس سرزمین میں پروان چڑھا اُس کو ہم منطقی طور پر ہندوستانی فن کہنے کے لئے مجبور ہیں۔ خواہ وہ فن بحرِ اسود اور بحر کاسپین کے علاقوں سے آنے والے آریوں کے ہاتھوں پلا ہو، خواہ وہ فن شمال مغرب کے راستوں سے آنے والے مغلوں کے آغوشِ سلطنت میں پروان چڑھا ہو یا سات سمندر پار کر کے آنے والے سفید و سُرخ لوگوں کے زیرِ سایہ پھلا پھولا ہو۔ لیکن اس کو ہم ہر حالت میں ہندوستانی فن کہیں گے۔ کیونکہ جس قوم یا نسل کے لوگ یہاں آکر فن کاری کریں گے، وہ سرزمینِ ہند ہی سے "انسپاٹریشن (الہام) حاصل کریں گے، اُن کو ہندوستانی ماحول سے متاثر ہونا پڑے گا۔ اور ان کا فن ہندوستانی ماحول کی تصویر ہوگا۔

میتھیو آرنلڈ کا قول ہے "ادب ماحول کا آئینہ ہے" یہی کُلیہ مُصوّری پر بھی صادق آتا ہے۔ ہندوستان میں مُصوّری خواہ کسی کے ہاتھ سے انجام پائی ہو۔ لیکن ہر طرح کا جغرافیائی، تمدّنی، تہذیبی تعلق وہ ہندوستان سے رکھتی ہوگی تو اُس کو ہندوستانی مُصوّری کہنا پڑے گا۔ اور یہی اصول دیگر مذاہب پر بھی صادق آتا ہے۔

ہندو مُصوّری، جین مُصوّری، بدھ مُصوّری وغیرہ سب سرزمینِ ہند پر انجام پائی ہوئی کسی مُصوّری کو اس طرح منقسم نہیں کر سکتے۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہندو زمانے میں ہندوستانی مُصوّری یا بُدھ زمانے کی ہندوستانی مُصوّری۔ کیونکہ یہ سب ہندوستانی ماحول اور ہندوستانی باشندوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔

لہٰذا وہ مُصوّری جو کسی قوم سے وابستہ اور ایک ملک کے ماحول سے متاثر ہو اُس کو اُس قوم اور ملک کی ہی مُصوّری شمار کرنا حقیقت کے عین مطابق ہوگا۔ ان تمام باتوں کے علاوہ ہندوستانی مُصوّری میں ایک ایسی قوت موجود ہے کہ یہ دیگر مقامات کی مُصوّری کو اپنے اندر جذب کر لینے کے بعد بھی اپنی انفرادیت کو جانے نہیں دیتی۔ عیسائیت کی ابتدا کے بعد سے یہاں کتنی قومیں اور نسلیں آکر حکومت اور اپنے فنون سے ملک کو مالا مال کر چکیں۔ لیکن ہندوستانی مُصوّری اس کے باوجود کچھ سے کچھ نہیں ہو سکی بیسویں صدی عیسوی کی مُصوّری دیکھئے اور پہلی صدی عیسوی کی مُصوّری دیکھئے۔ دونوں میں ماحول اور وقت کا تو ضرور فرق نظر آئیگا لیکن اور کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ملیگا۔ موجودہ مُصوّری کا شجرۂ نسب بہت آسانی کے ساتھ انہیں فنکاروں سے جا کر مل جائیگا جو ہم کو اجنتا کی دیواروں پر دکھائی دیتے ہیں۔

کیشو گوپال نگم

پنڈت نہرو کا دورۂ امریکہ

امریکہ کے صدر ٹرومین کی دعوت پر ہمارے وزیر اعظم پنڈت جواہرلال نہرو ۱۱ اکتوبر کو امریکہ تشریف لے گئے۔ آپ کے ہمراہ آپ کی صاحبزادی شریمتی اندرا گاندھی بھی تھیں۔ صدر ٹرومین نے معزز مہمانوں کو لانے کیلئے اپنا ذاتی ہوائی جہاز "انڈی پنڈنس" پہلے ہی انگلینڈ بھیج دیا تھا جس وقت پنڈت نہرو واشنگٹن کے ہوائی اڈے پر اُترے تو اُن کا استقبال کرنے کیلئے صدر ٹرومین خود ہوائی اڈے پر تشریف فرما تھے۔ پنڈت نہرو کو گارڈ آف آنر پیش کیا گیا۔ اور ان کا اتنا شاندار استقبال کیا گیا جتنا آج تک کسی کا نہیں کیا گیا تھا۔ پنڈت نہرو پہلے شخص تھے جن کا عوام اور سرکار نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر سواگت کیا صدر ٹرومین نے پنڈت نہرو کا استقبال کرتے ہوئے کہا "آپ کا سواگت کرتے ہوئے مجھے بیحد خوشی ہو رہی ہے صرف اس لئے نہیں کہ آپ ایک آزاد ملک کے وزیر اعظم ہیں بلکہ آپ ایک آزاد اور عظیم قوم کے ہردلعزیز لیڈر ہیں"۔ پنڈت نہرو نے جوابی تقریر کرتے ہوئے کہا "اس عظیم الشان ملک میں آنے کا میرا پہلا موقعہ ہے یہ لمحات میری زندگی میں کافی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ یہاں آنے کی میری زبردست خواہش تھی۔ میرا ملک بہت جلد ایک آزاد جمہوریہ ہونے کا اعلان کر دیگا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے اس دورے سے مشرق اور مغرب کے تعلقات اور مضبوط ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کے زیادہ مواقع میسر ہونگے"۔ اس کے بعد پنڈت نہرو صدر ٹرومین کی ذاتی کار میں بلیر ہاؤس گئے جہاں اُنھیں ٹھہرایا گیا تھا۔ آپ کے ہمراہ آپ کی بہن شریمتی وجے لکشمی پنڈت بھی تھیں۔ بلیر ہاؤس وہ عمارت ہے جہاں صرف بڑے بڑے سرکاری مہمانوں کو ہی ٹھہرایا جاتا ہے۔

واشنگٹن میں پنڈت نہرو کے پروگرام کو دیکھتے ہوئے اُن کی عملی صلاحیت کی داد دینا پڑتی تھی۔ آپ نے امریکہ کی کانگریس میں جو تقریر کی اُس کی بہت تعریف کی گئی۔ اپنی تقریر میں پنڈت نہرو نے گاندھی جی کے اُصول کی پابندی اور صلح میں ہند کے اٹل وشواس پر زور دیا۔ واشنگٹن میں پنڈت نہرو جارج واشنگٹن کے مقبرے کی زیارت کو بھی گئے۔ آپ گمنام سپاہی کی قبر پر پھول چڑھانا بھی نہ بھولے۔ واشنگٹن سے پنڈت نہرو نیو یارک تشریف لے گئے۔

۱۶ اکتوبر کی صبح کو پنڈت نہرو امریکہ کے آنجہانی صدر روزویلٹ کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے جہاں صدر روزویلٹ کی اہلیہ نے اُن کا سواگت کیا۔ شریمتی روزویلٹ نے اُنھیں صدر موصوف کی سب چیزیں دکھائیں۔ پنڈت نہرو نے جس چیز میں سب سے زیادہ دلچسپی دکھائی وہ یکم جنوری ۱۹۴۲ء کی یو این او کا چارٹر تھا جس پر سب سے پہلے دستخط صدر روزویلٹ کے تھے۔

نیو یارک کے سٹی ہال میں پنڈت نہرو کا وہ شاندار استقبال کیا گیا جو قومی بہادروں اور معزز مہمانوں کیلئے ہی مخصوص ہے۔ نیو یارک میں پنڈت جی ہندوستان کے اُن ہمدردوں سے بھی ملے جو ہندوستان کی آزادی کیلئے امریکہ میں کام کرتے رہے ہیں۔ نیو یارک میں اپنے اعزاز میں دئے گئے ایک ڈنر کے موقعے پر پنڈت نہرو نے ہند اور امریکہ کے تعلقات پر زور دیا۔ نیو یارک سے ایکدن کیلئے پنڈت نہرو بوسٹن بھی گئے

کولمبیا یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو ڈاکٹر آف لا کی اعزازی سند دی گئی یہ شرف آج تک بہت کم شخصیتوں کو ہی حاصل ہوا ہے۔

۲۲ اکتوبر کی شام کو پنڈت نہرو کینیڈا گئے۔ ۲۲ اکتوبر کی رات اُنھوں نے امریکہ، کناڈا کے حدود پر واقع نیاگرا آبشار کے ساحل پر گذاری۔ کناڈا کے دارالخلافہ اوٹاوہ میں بھی پنڈت نہرو کا شاندار استقبال کیا گیا۔ کینیڈا میں پنڈت نہرو کینیڈا کے گورنر جنرل لارڈ الیگزینڈر کے مہمان رہے اور اُن کی قیام گاہ "رڈیو ہال" میں قیام فرمایا۔ اوٹاوہ میں پنڈت نہرو نے ایک پریس کانفرنس میں کھلے الفاظ میں اعلان کیا کہ ہندوستان کسی بھی سیاسی بلاک میں شامل ہونا نہیں چاہتا ہماری پالیسی ہر ملک کے ساتھ تعاون کی ہے کشمیر کے مسئلے کے بارے میں پنڈت نہرو نے کہا کہ عام رائے شماری سے پہلے وہاں سے پاکستانی فوجوں کا ہٹایا جانا ضروری ہے۔ اوٹاوہ میں پنڈت نہرو نے باہمی تجارت کو ترقی دینے کے بارے میں بھی بات چیت کی کینیڈا کے تاریخی دورے کے بعد ۲۶ اکتوبر کو پنڈت نہرو ہوائی جہاز کے ذریعے

شکاگو پہنچے جہاں کڑاکے کی سردی کے باوجود ہوائی اڈے پر ایک ہجوم موجود تھا۔ یہاں بھی سیاسی شاموں اور ملاقاتوں کا دور گرم رہا۔ ۲۶ اکتوبر کو اپنی ایک تقریر میں پنڈت نہرو نے کہا۔ جلد یا بہ دیر عالمگیر حکومت ضرور قائم ہونی چاہیئے ورنہ دُنیا کے لئے خودکشی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ پنڈت نہرو کی یہ مختصر تقریر شکاگو ریڈیو سے براڈکاسٹ کی گئی۔ شکاگو میں غیر ملکی کمیٹی اور شکاگو منڈل میں تقریر کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے کہا ہندوستان کسی کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بننا نہیں چاہتا۔ میں ہندوستان کیلئے بھیک کی صورت میں کوئی مدد مانگنے نہیں آیا۔ دُنیا کے طاقتور ملکوں کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اگر اُنھوں نے دوسرے ملکوں کو افلاس کی حالت میں تڑپنے دیا تو یہ ممالک ہی اُن کے زوال کا باعث بنیں گے۔ شکاگو یونیورسٹی میں پنڈت نہرو نے ایٹم بم کو ناکارہ بنانے والے آلات کو بھی دیکھا۔ اپنی ایک تقریر میں پنڈت نہرو نے کہا "مجھے ایٹم بم سے زیادہ خوف نہیں ہے۔ اگر دُنیا مہاتما گاندھی کے پیغام پر دھیان دے اور خوف کو چھوڑ دے تو آنے والے چند سالوں میں ایٹم بم کے استعمال کی بہت کم گنجائش ہے۔

ورجینیا کی قدرتی آرام گاہ ملفر اسپرنگ میں امریکہ کے وزیر دفاع مسٹر لوئی جانسن کے دو دن تک مہمان رہنے کے بعد پہلی نومبر کو پنڈت نہرو سان فرانسسکو تشریف لائے۔ اخبارات نے پہلے سے ہی اپنے خاص نمبر نکال کر پنڈت نہرو کے سواگت کی تیاری کر رکھی تھی۔ یہاں پنڈت نہرو نے اپنی ایک تقریر میں بتایا کہ ہندوستان کے عوام کا مجھ میں جو یقین اور پیار ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ میں سو زندگیوں میں بھی اُس کے قابل نہیں بن سکتا۔ سان فرانسسکو میں پریس کلب کی ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے کہا "ہندوستان اور پاکستان کے جتنے بھی جھگڑے ہیں اُن کا نپٹارا ہم گفت و شنید سے کرنے کو تیار ہیں لیکن پاکستان نے ابھی تک ہمارے صلح کے پیغام کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ پاکستان میں جنگ کا نعرہ بلند کیا جا رہا ہے"۔ آپ نے مشرق اور مغرب کے درمیان اپنے ثالث بننے کی خبروں کی بھی تردید کی۔

۲ نومبر کی رات کو ونکوور میں پنڈت نہرو نے ایک تقریر کی۔ آپ نے اپنی اس تقریر میں ہندوستان کی خارجی پالیسی اور ایشیا میں بیداری پر خاص طور سے روشنی ڈالی۔ کامن ویلتھ کا بھی ذکر کیا۔ ۵ نومبر کو پنڈت نہرو نیو جرسی میں پرنسٹن یونیورسٹی کو دیکھنے گئے۔ جہاں آپ نے عالمگیر شہرت کے مالک سائنس داں پروفیسر البرٹ انسٹائن سے اس کی قیام گاہ پر ملاقات کی۔ ۶ نومبر کو نیویارک میں پنڈت نہرو نے ایک تقریب میں امریکہ میں حبشیوں کے لیڈر مسٹر والٹر وائٹ اور دیگر حبشی لیڈروں سے ملاقات کی۔

۷ نومبر کی صبح کو پنڈت نہرو قریب ایک ماہ کے قیام کے بعد صدر ٹرومین کے انڈی پنڈنس ہوائی جہاز سے لندن تشریف لے آئے۔ وہاں آپ نے ایک پریس کانفرنس میں کہا "میرا خیال ہے کہ میرے دورۂ امریکہ سے امریکہ اور ہندوستان کے تعلقات ضرور استوار ہوں گے"۔

۸ نومبر کو پنڈت نہرو نے انگلینڈ کی کیبنٹ کے دو وزیروں سر سٹیفورڈ کرپس اور وزیر اعظم اٹیلی اور حزبِ مخالف کے لیڈر مسٹر ایڈن سے گفتگو کی اور انھیں اپنے دورے کے تاثرات سے آگاہ کیا۔ پنڈت نہرو نے ان اصحاب سے کیا باتیں کیں یہ ایک راز ہے لیکن باخبر حلقوں میں پنڈت نہرو کی مسٹر اٹیلی کے ساتھ گفتگو کو کافی اہمیت دی جا رہی ہے۔ ۹ نومبر کی صبح کو پنڈت نہرو نے انگلینڈ کے جرنلسٹوں سے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت تک باتیں کیں۔ اس کے بعد وہ شاہِ انگلینڈ سے ملنے بکنگھم محل چلے گئے۔ لندن میں پنڈت نہرو نے یورپ میں مقیم ہندوستانی سفیروں سے بھی ملاقات کی۔ ۱۰ نومبر کی رات کو لارڈ میئر نے پنڈت نہرو کے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی دی جس میں وزیر اعظم اٹیلی نے اعلان کیا کہ پنڈت نہرو کا دورۂ امریکہ ایک اہم واقعہ ہے۔ لندن میں بھی پنڈت نہرو کافی مشغول رہے اور اُنھوں نے کامن ویلتھ سے متعلق لارڈ پیتھک لارنس سے بھی گفت و شنید کی۔ ۱۲ نومبر کو ایک پریس کانفرنس میں پنڈت نہرو سے یورنیوا و تبت کے مستقبل سے لیکر امریکہ سے گیہوں خریدنے تک کے مسائل پر مختلف سوالات کئے گئے۔ ۱۳ نومبر کو پنڈت نہرو ہندوستان کیلئے روانہ ہوئے اور قاہرہ سے ہوتے ہوئے ۱۴ نومبر کو خیر و عافیت سے ہندوستان لوٹ آئے۔ اتفاق سے ۱۴ نومبر کو ہی ملک اپنے اس ہر دل عزیز لیڈر کی ساٹھویں سالگرہ منا رہا تھا۔ اس دن اس لمبے اور کامیاب دورے سے لوٹنے کی وجہ سے خوشی میں اور اضافہ ہو گیا۔

پنڈت نہرو کے دورے کی سب سے بڑی خوبی یہ رہی کہ اُنھوں نے سب جگہ ہندوستانی طالب علموں اور ہندوستانیوں کا دھیان رکھا۔ وہ جہاں کہیں بھی گئے۔ اپنی مصروفیات کے باوجود ہندوستانی طالب علموں سے ملنے کا وقت نکالتے رہے، اُنھوں نے امریکہ کے جدید کارخانوں اور زراعت کے سائنٹفک طریقوں کا بھی مطالعہ کیا تاکہ ہندوستان میں اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ راشٹرپتا باپو کا سندیش سُنانا تو اُن کے پروگرام کا ایک اہم جزو بنا رہا۔

اگرچہ کوئی سیاسی یا اقتصادی معاہدہ نہیں ہوا لیکن یہ مسلّم ہے کہ پنڈت نہرو کے اس دورے سے امریکہ اور ہندوستان نزدیک آ گئے ہیں۔

قمر رضوی

نیا سبق

بس اُس گلی میں ایک ہی کھانے کی دوکان تھی میلی کچیلی گندی میزیں ٹوٹی پھوٹی کرسیاں۔ دو مسکین صورت چھوکرے اور ایک نہایت بھدی صورت والا موٹا سا مالک، اور یہی چھنکتی سی دوکان تھی جس کی کچی پکی خمیری روٹیاں اور بدمزہ باسی سالن کھا کھا کر میں چھ سال سے جی رہا تھا۔ نہ صرف جی رہا تھا بلکہ دہیری رہگذر کے اس نشیب و فراز اپنی حیاتی کشمکش اور دوڑ دھوپ سے کچھ اس درجہ مانوس ہو چکا تھا کہ اس طویل مدت میں شاید ہی میں نے کبھی یہ سوچا ہو کہ میری زندگی غلیظ باسی سالن اور نمکین روٹیوں کی دلدل سے باہر بھی نکل سکتی ہے۔ شائد اس قسم کے خیالات چالیس روپیہ ماہوار پانے والے ایک چپیچڑے کلرک کے غیر حساس دماغ میں اس لئے پیدا نہ ہوں کہ وہ دنیا میں پیٹ بھرنے اور آفس کی رفو رجلوں کے سوا اپنے سامنے کوئی دوسرا مقصد حیات نہیں رکھتا۔ بھوک اور پیٹ کی تسکین دہی کے سوا ایک معمولی سا کلرک اور کچھ نہیں چاہتا۔ وہ کچھ چاہ نہیں سکتا۔ وہ کچھ سوچ بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ شام کے وقت جب دفتر کی موٹی موٹی فائلوں اور ضخیم رجسٹروں پر اپنی ساری ذہنی اور جسمانی استعداد نچوڑنے کے بعد میں پتلون کی پھٹی ہوئی جیبوں میں ہاتھ ڈالے گھر واپس ہوتا تو دماغ کی اُن تمام موٹی مہین حیاتی نسوں میں اتنی جان بھی باقی نہ رہتی کہ وہ کسی چیز کی معقولیت یا غیر معقولیت پر غور کرنے کے لئے میرا ساتھ دے سکیں۔ میں ایک تھکے ہارے سپاہی کی طرح اپنے اُدھڑے پلنگ پر لیٹا سگریٹ پیتا رہتا۔ دھوئیں کے چھلے سیلی دیواروں میں جذب ہوتے رہتے اور میری نظریں غیر ارادی طور پر ان کوڑھی دیواروں پر جمی ہوتی ان میں بے حد و بے حساب ستے نقوش تلاش کرتی رہتیں۔ اور پھر جوں جوں ان پر اندھیرے کا موٹا پردہ چھنے لگتا تو خمیری روٹیوں اور اُبلے ہوئے چاولوں کی بھوک بھی پیٹ میں جاگنے لگتی۔ اور میں ایک دم پلنگ چھوڑ کر کھڑا ہو جاتا۔

تو اس روز جب میں میلی میلی روٹیوں کے ٹکڑے حلق کے نیچے اُتار کر دوکان کے باہر نکلا تو ہلکا ہلکا ترشح ہو رہا تھا آسمان پر گہرے گہرے بادلوں کا دھواں چھایا ہوا تھا اور برفیلی ہوائیں بدن میں سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ رشوت کی ایک اٹھنی اور چار پیسے کرم خوردہ کوٹ کی جیب میں پڑے ہوئے تھے جن کی گرمی بدن کی ٹھنڈک میں تحلیل ہو کر دماغ پر ایک پُر کیف نشے کی طرح لہرا رہی تھی۔ اور اسی پُر کیف نشے پر مرکری تردی ایک گھٹیا قسم کی سگریٹ کے کش لگاتا ہوا میں حلوائی کی دوکان پر مٹھائی کے تھالوں کو للچائی نظروں سے دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ اگر اس رشوت والی اٹھنی میں سے چار آنے کی گلاب جامنیں یا تازی تازی امرتیاں خرید لی جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔ ہاں کیا مضائقہ؟ یہ رس میں ڈوبی ہوئی امرتیاں۔ یہ جگمگاتے ہوئے مٹھائیوں کے تھال۔ کم از کم چند لمحوں کے لئے تو اس ہیجانہ زندگی پر چھائے ہوئے حزن کے کثیف بادلوں سے نجات مل جائے گی اور بے اختیار میرا ہاتھ کوٹ کی جیب میں پہنچ گیا انگلیاں جیب میں پڑے ہوئے سکوں سے اُلجھنے لگیں — یہ اٹھنی — یہ پیسے — میں نے سوچا کاش انسان کی زندگی کا سکون ان حقیر سکوں کا محتاج نہ ہوتا۔

قبل اس کے کہ میں مٹھائی کی دوکان کی طرف بڑھوں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے جوتے کے اُدھڑے ہوئے تلوں سے یخ زدہ زمین کی ٹھنڈک چھری کی نوک کی طرح تلوؤں میں گھس رہی ہے۔ انگلیوں میں دبی ہوئی اٹھنی خود بخود چھٹ کر جیب میں رہ گئی۔ اس اثنا میں جوتے کے گھسے ہوئے تلوں، چٹختی ہوئی ایڑیوں اور پھٹے پنجے سے

بچوں کو نئی زندگی دے کر چند مہینے اور چلا سکتا ہوں۔ اکثر میرے دفتر کا ہیڈ کلرک مجھے ان جوتوں میں دیکھ کر اپنے قریب بیٹھے ہوئے چیف اکاؤنٹنٹ سے کہتا تھا۔

"ہونہرا۔ بیوی نیچے۔۔۔ پھر بھی کم بخت کو اتنی توفیق نہیں کہ ایک معمولی سا جوتا خرید کر پہن لے۔ جانے کب سے یہ مردہ چوہے کی لاش گھسیٹے پھر رہا ہے"۔

اور چیف اکاؤنٹنٹ اپنی تجربہ کار آنکھیں چمکا کر کہتا۔

"جانتے نہیں۔ رستم جی والے غلیٹ پر فلش کھیلتا ہے فلش۔ مجھ سے پوچھو ان جیسوں کے کرتوت"۔

اور میں یہ سب سُن کر سوچتا۔ کیا ایک چالیس روپے پانے والا تھرڈ کلاس انڈر گریجوایٹ اپنے شعور میں احساس کمتری کو پرورش کر کے جی سکتا ہے!

لوچو نے کے متعلق اس بدحواسی نے گلاب جامن کھانے کی ساری مسرت زائل کر دی اور میری مایوس نظریں از خود مٹھائی کے چکتے ہوئے تھالوں سے ہٹ گئیں۔ دوکان سے ذرا دُور کنکریوں اور بالو کے ایک ڈھیر پر درجنوں لنگڑے، لولے، اندھے اور اپاہج فقیر اپنی دن بھر کی کمائی ہوئی پونجی کو گانجے چرس کی چلم پر رکھ کر بُری طرح پھونک رہے تھے جیسے پھونک رہے تھے۔ بھیک مانگ رہے تھے۔ مگر خوش تھے۔ ان مجبوروں کی زندگی کی منزل کتنی ہموار، کتنی سیدھی اور کتنی پُرسکون تھی۔ دن نکلتے ہی یہ سارے دھنسی دھنسی آنکھوں والے مفلوج کیڑے کلبلا کر اُٹھتے اور سارا دن ہوٹل کے سامنے والے کوڑے کے ڈھیر پر بیٹھے "داتا بھیج" اور "مولا بھیج" کی صدائیں لگایا کرتے۔ اور "مولا" بھی کمال شفقت اور مہربانی سے وہ نعمت بھیجتا ہے۔ جو ان کی زندگی کا اہم ترین مقصد ہے ہوٹل کے جھوٹے ٹکڑے۔ جسے پاتے ہی وہ مریل کتّوں کی طرح اس پر بے تحاشا ٹوٹ پڑتے کھاتے اور پھر گلا پھاڑ پھاڑ کر روٹیاں مانگتے۔

جب میں اس گندی ٹولی کے قریب پہنچا تو ایک ہٹا کٹا چھوکرا بدن پر گودڑوں کا ڈھیر لپیٹے آگے بڑھا اور ٹہل ٹہل کر چیخنے لگا۔

"چالیس روٹیوں کا سوال ہے بابا۔ چالیس روٹیوں سے کم نہ کھاؤں گا بابا"۔

بھیک مانگنے کے اس نفسیاتی طرز سے میں پہلے ہی متاثر ہوا انسانی شعور "ایک روٹی" یا "ایک پیسے" کے سوالوں سے اس درجہ مربوط ہو چکا ہے کہ اب اس کی توجہ ایسے معمولی اور ذہنی آشنا سوالوں سے مبذول کرانا مشکل ہے۔ مگر چالیس روٹیوں کے اس بے باک تقاضے سے انسانی شعور میں ہر وقت تحریک پیدا کی جا سکتی ہے۔ اب اس اختراعی قابلیت کا ردِ عمل کیا ہوتا ہو گا یہ نہ جانتے ہوئے بھی میں نے اس کے دماغی تماش کی داد ضرور دی۔ ہندوستان میں ایسے نہ جانے کتنے ہوں گے جن کی ذہانت کا کوئی قدر دان نہیں۔ ایسے نہ جانے کتنے آبدار موتی ہوں گے جو محض کیچڑ میں دبے پڑے ہیں۔ میں نے سوچا۔ کیا ہی اچھا ہو اگر کوئی انھیں غلاظت سے باہر نکال لیتا۔

"چالیس روٹیاں کھا لو گے؟" میں یوں ہی پوچھ بیٹھا

"کھاؤں گا بابا۔۔۔ باندھوں گا نہیں"۔

میں نے سوچا کیا معلوم جو یہ لونڈا کسی دیو یا جن کی نسل سے ہو اور اس کے پیٹ میں ایک اچھی خاصی خندق بنی ہو۔ سُنتا ہوں آزادی کے بعد انسان کی بھوک میں اضافہ ہو جاتا ہے پھر اگر آزادی کے قبل بیس روٹیاں کھانے والا اب چالیس روٹیاں مانگتا ہے تو کون سا عیب ہے۔ ہوس ہی سہی۔۔۔ اور شاید اسی لئے حکومت مُلک کی غذائی حالت پر زیادہ فکر مند ہے کیونکہ آزادی کے بعد ہر شخص کی بھوک دو چند ہو گئی ہے۔ لیکن یہاں چالیس روٹیاں تو کیا دن بھر میں شاید چالیس ٹھیکرے بھی نہ ملتے ہوں۔ لیکن یہ ہٹے کٹے موٹے اور تندرست فقیر ضرور یہ دوگنی خوراک کھاتے ہوں گے۔

مجھے لڑکے کے پاس کھڑے دیکھ کر گیلی زمین پر بیٹھی ہوئی فلاکت زدہ روحوں میں ایک ارتعاش پیدا ہوا۔۔۔۔ ایک پوپلی بڑھیا نے "اللہ کے نام پر" اپنا سوکھا ہاتھ پھیلا دیا۔ ایک مجذوب سا لنگڑا گانجے کی ترنگ میں بیڑی مانگنے لگا۔ اور پچکی ناک والا جذامی بڈھا اپنی روٹیاں چھپا کر بولا۔ "بالو بھوکا ہوں"

میں اس بھوکی مخلوق کو چھوڑ کر جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ بارش رفتہ رفتہ تیز ہو رہی تھی۔ گلی کے موڑ پر مجھے ایک بہت پرانا اور بے تکلف دوست مل گیا۔ مجھے دیکھ کر فرطِ خوشی سے لپٹ گیا۔ اس کی اس

بے پناہ محبت اور انکسار سے مجھے حد درجہ ندامت اور تکلیف ہوئی دراصل اس وقت میں کچھ اور ہی بات کہنا چاہتا تھا کہ شاید ہی کوئی بھلا آدمی مجھے دیکھ کر خوش ہوتا۔ سر کے بڑے بڑے بال، بڑھی ہوئی حجامت پچکے ہوئے گال، پرانا سا پتلون، پھٹا ہوا جوتا۔ اور یہ سب ایسی چیزیں تھیں جنھیں دیکھنے کے بعد میرا خیال ہے اُسے ضرور میرے اُچکے یا آوارہ گرد مفلس ہونے کا دھوکا ہوا ہوگا۔

پھر میں اُسے اپنے کمرے میں لے آیا۔ وہی اُداس سا آسیب زدہ کمرہ۔ اُس کی بھیگی بھیگی سی دیواریں اور جابجا مکڑیوں کے جالے۔ جھنجھی ہوئی کڑیاں۔ کونے میں پڑے ہوئے بوسیدہ موزے، سگریٹ اور ماچس کی خالی ڈبیاں۔ اور ایک عجیب نامعلوم سا تعفن۔ پہلے تو وہ ٹھٹھک کر دروازے پر رُک گیا پھر سہمے سہمے قدموں سے اندر آیا میں نے اُسے بیٹھنے کے لئے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی دی اور خود اپنے پھٹے ہوئے لحاف پر بیٹھ گیا۔

"آج کل کیا کرتے ہو احمد؟" اُس نے لالٹین کی مُردہ سی روشنی میں کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے میری دُکھتی ہوئی رگ پکڑ لی ہو۔ جی میں آیا کہہ دوں ریلوے میں فائر مین ہوں۔ پھر سوچا کہ میونسپلٹی کی کوئی سڑیل سی نوکری بتا دوں۔ لیکن پھر خیال کیا کہ جھوٹ بولنے سے کیا نتیجہ مجھے صاف صاف کہہ دینا چاہئے کہ ایک دفتر میں معمولی سا اسٹینوگرافر ہوں۔ صبح سے لے کر شام تک دفتر کی دبیز فائلوں میں زندگی کی یہ اندھیاری حقیقتوں کو دیکھ دیکھ کر خدا کا شکر کرتا رہتا ہوں کہ پھر بھی وہ مجھے زندہ ہی رکھتا ہے۔

"بھائی آج کل تو انکم ٹیکس میں ہوں"

"اچھا!" شاید وہ لفظ انکم ٹیکس سے مرعوب ہو گیا تھا "انکم تو خوب ہوتی ہو گی یار؟"

اس پر ہم دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔ مجھے یہ ہنسی کھوکھلی معلوم ہوئی۔

"تم آج کل کیا کر رہے ہو نصیر؟" اب میری باری تھی۔

"سنٹرل انکم ٹیکس میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہوں۔ مہینہ میں چار پانچ سو کا حساب کتاب ہو جاتا ہے۔"

"چلو یار تم تو بہت عمدہ لائن میں نکل گئے۔" بے چارہ نثار ڈسٹرکٹ بورڈ کے دفتر میں جھک مار رہا ہے بطور راشننگ آفس میں افسروں کی جھڑکیاں سہہ رہا ہے۔ اور میں — بس مجھے بھی یونہی سمجھو کل ملا کر ستر روپیہ تنخواہ کے ملتے ہیں چالیس گھر میں بوڑھے ماں باپ اور بھائی بہنوں کا حق نکل جاتا ہے۔ بقیہ میں بیس ہوٹل والا مہینے کی پہلی تاریخ کو لے لیتا ہے چھ روپے کمرے کا کرایہ دے دیتا ہوں صرف چار روپے مجھے بچتے ہیں۔ صرف چار — بس یہی میرا جیب خرچ ہے اور اسی پر میری اُمیدوں اور تمناؤں کے بڑے بڑے اور عالیشان محلات تعمیر ہوتے ہیں جن کی نورانی بلندیوں میں کھو جانے کے بعد بعض اوقات اپنے گرد و پیش کے گھٹے ہوئے ماحول کو بالکل بھلا دیتا ہوں۔ اور گھنٹوں آنکھیں بند کئے اِن خیالی قلعوں کی سیر کرتا رہتا ہوں — ایسے بھی تسکین ہو جاتی ہے نصیر۔ ہاں یوں سمجھ لو کہ یہ چار روپے نہیں بلکہ چار پہیئے ہیں جن کے سہارے اپنی زندگی کی گاڑی ایک نامعلوم منزل کی طرف چلی جا رہی ہے اور نہ جانے کب تک چلتی رہے۔

نصیر بالکل چُپ چاپ مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں حد درجہ سنجیدگی اور رحم کے ملے جُلے آثار دیکھے۔ کیا یہ ترحم کے آثار میرے لئے تھے — میں آج تک نہ سمجھ سکا۔ پھر اس نے اپنی نظریں مجھ پر سے ہٹا لیں اور اپنی عینک درست کرنے لگا۔ میں بستر سے اُٹھتے ہوئے بولا۔

"نصیر تم بیٹھو میں ذرا تمہارے لئے سگریٹ لے آؤں۔"

"نہیں نہیں احمد — تکلیف مت کرو۔ سگریٹ میرے پاس ہے۔" اُس نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا "نصیر!" اور اس کے آگے میں کچھ نہ کہہ سکا۔ شاید یہی کہتا کہ غریب ہوں اس لئے تمہیں میری سگریٹ سے انکار ہے۔ لیکن اُس نے جیسے میری آنکھوں کی افسردگی پڑھ لی۔ سگریٹ کیس پھر اس نے کوٹ کی جیب میں ڈال دیا۔

میں نے ایک دکان سے ایک پیکٹ سگریٹ اور دو آنے کے پان خریدے۔ خوش ہوا کہ اس حرام کی اٹھنی کا بہترین مصرف نکل آیا۔ اور جب دوبارہ اپنے کمرے میں پہنچا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ کرسی خالی پڑی تھی۔

"نصیرا" میں نے پکارا۔
کوئی نہیں بولا — لالٹین کی چمنی میں کالک جمی ہوئی تھی۔ اور دھیمے دھیمے اُجیالے میں یکہ جیسے کانپ رہا تھا۔ میں نے پھر پکارا۔ اور کوئی آواز نہیں آئی۔

نصیر چلا گیا — میری بے چارگی کو دیکھ کر میری مفلس زندگی پر تھوک کر چلا گیا۔ مگر مجھے اپنے اس ذلیل وجود سے فرار کرنا نہ آیا — کبھی نہ آیا — لیکن آج کا سبق — میرا سر چکرانے لگا — کنپٹیوں کا خون جیسے ایک دم جم گیا — آنکھوں میں تیز بھڑکتے ہوئے شعلوں کی لپٹ دوڑنے لگی — یہ لپٹ — یہ شعلے — ان میں عزم مستقل کی روح جھلک رہی تھی

میں نے سگریٹ اور پیالا فرش پر پھینک کر جوتے سے مسل ڈالے اور ساتھ ہی اپنی بے حس اور منحوس زندگی کی روح کو بھی — میں نے عہد کیا کہ ایک ایسی دنیا بناؤں گا جہاں گلیوں میں سڑتے ہوئے نادار بھکاری نہ ہوں گے۔ رشوت کی اشتی نہ ہوگی۔ گندے ہوٹل ظالم بیکاری بھوک افلاس۔ اور بازاروں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجانے والے انسان نہ ہوں گے۔

جہاں مکمل چین ہوگا — ایک ابدی سکون!! لیکن وہ ہوگا کہاں؟

زرعی پیداوار بڑھانے کا مربوط منصوبہ

لکھنؤ میں کسانوں کی یونین کے سامنے شری جے رام داس دولت رام کی تقریر

لکھنؤ میں صوبہ کسان یونین کے پہلے اجلاس کا افتتاح شری جیرام داس دولت رام وزیر خوراک وزراعت نے کیا۔ آپ نے کہا ایک ایسی کسان یونین ہندوستان کو زیادہ طاقتور اور خوش حال بنانے میں بہت اہم حصہ لے سکتی ہے جس کا گاؤں کے ساتھ سرگرم ناتا ہو۔ ہماری قومی دولت کا منبع زمین کی پیداوار ہے۔ ہمارے ملک کی آبادی کا بہت بڑا حصہ زرعی پیداوار کرنے والے عوام ہیں۔ اسلئے انکی دولت ہمارے ملک کی طاقت اور خوشحالی کی بنیاد ہے۔ تمام دیگر ممالک میں جہاں کاشتکاری نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔ کسانوں کی غیر سرکاری انجمنوں نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ اسلئے مجھے اُمید ہے کہ یہ اجلاس صوبے کے تمام دیہات میں اس یونین کی مضبوط شاخیں قائم کرنے کی خاص کوشش کرے گا — تقسیم ملک کے بعد ملک کو زرعی پیداوار کی قلت دُور کرنے کے فوری مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ اگر قومی اقتصادیات کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنا ہو تو خوراک، روئی، پٹ سن، تمباکو اور دیگر ضروری زرعی اشیاء کی پیداوار بڑھانے کے لئے ایک مربوط منصوبہ تیار کرنا ہوگا۔ کیونکہ یہ تمام اشیاء لوگوں کے معیار زندگی کو بلند کرنے، صنعتوں کو خام مال مہیا کرنے اور غیر ملکی سکہ تبادلہ حاصل کرنے کے سلسلہ میں کارآمد ہوتی ہیں۔ اس قسم کے پروگرام پر عمل کرنے کے لئے ہمارے ملک میں پھیلی ہوئی کسان یونین ایک بیش قیمت ذریعہ ثابت ہوسکتی ہیں۔ امریکہ میں زراعت کی تمام تر ترقی کسان کمیٹیوں ہی کے بل پر ہوتی ہے — شری جیرام داس دولت رام نے مزید کہا کہ زرعی پیداوار بڑھانے کا مربوط پروگرام صرف وسیع پیمانہ پر کاشتکاری کرنے سے ہی کامیاب ہوسکتا ہے۔ ہمارے ملک میں بہت سی فصلوں کی فی ایکڑ پیداوار بہت سے دوسرے ملکوں کی پیداوار کا نصف یا ایک تہائی ہوتی ہے۔ ملک کی آبادی کے بڑھتے جانے اور خوراک، کپڑوں اور دیگر ضروریات زندگی کی مانگ میں اضافہ ہونے کی وجہ سے صرف مختلف فصلوں کے زیر کاشت رقبہ میں اضافہ کرنے سے ملک کی مشکل حل نہیں ہوگی۔ پیداوار کو بڑھانے کے لئے سب سے بڑا طریقہ تمام ضروری فصلوں کی کاشتکاری اور پیداوار میں اضافہ کرنا ہوگا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ یو۔ پی کی کسان یونین نے ہر قسم کے سیاسی اثر و رسوخ سے آزاد رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور یہ صرف زرعی ترقی کیلئے کام کریگی۔ مجھے یقین ہے کسان یونین اس عہد کی وجہ سے جاتی کاشتکاری کے ذریعہ زرعی پیداوار بڑھانے کے کام میں بہت اہم حصہ لے سکیگی۔ اور اس ملک کے عوام کو دولتمند بنا کر قوم کو طاقتور بنائے گی۔

اظہار ملیح آبادی

نظیر کی شاعری میں ہندو کلچر

بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ مسلمان اردو شعراء نے ہمیشہ رستم و سہراب قیس و لیلیٰ اور وامق و عذرا کی داستانیں دوہرائیں۔ وہ کبھی ہندوستانی کلچر سے متأثر نہ ہوئے۔ ہندوستان میں سیکڑوں برس رہنے کے بعد بھی وہ اپنے کو بدیسی سمجھتے رہے۔ جن دوستوں کو مسلمان اردو شعراء پر یہ اعتراض ہے میں اُن کے جواب میں اِس وقت نظیر اکبرآبادی کا کچھ کلام پیش کروں گا۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ مسلمان شعرائے اردو اُسی طرح ہندو کلچر سے متاثر تھے جس طرح ہندو شعرا ہوسکتے ہیں۔ اور اسی طرح ہندو شعرا بھی اسلامی کلچر سے متاثر نظر آتے ہیں۔ جو ہمارے گذشتہ اتحاد و یگانگت کا ایک درخشاں ثبوت ہے۔ اگر آپ امیر خسرو، عبدالرحیم خان خاناں اور دیگر مشہور شعراء کے کلام کا مطالعہ کریں تو وہاں آپ کو ہندو کلچر نہایت تابناکی سے نظر آئے گا۔ آج بھی اگر آپ ہندوستان کے کسی دیہات میں جائیں تو وہاں آپ کو اسلامی اور ہندو کلچر اس طرح مخلوط نظر آئے گا کہ آپ کو اُن میں امتیاز کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ہولی کے موقع پر مسلمان دیہاتی ہندوؤں کے ساتھ رنگ کھیلتے ہیں۔ اور محرم میں ہندو دیہاتی تعزیے رکھتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے ساتھ امام حسینؑ کا ماتم کرتے ہیں۔ اب آپ یہ سوچئے کہ اُن دیہاتیوں کو یہ مخلوط کلچر کس نے دیا ہے۔ وہ آپس میں اتنے متحد کیوں ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے تہواروں اور شادیوں میں کیوں شریک ہوتے ہیں۔ اُن کے رہنے سہنے کے طریقے کیوں ایک ہیں، وہ اپنے کو ہندو مسلمان کیوں نہیں سمجھتے؟ یہ صرف اس لئے کہ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوکر چوپال میں ڈھولک بجاکر گاتے ہیں تو اُن کے ہر گیت میں ہندو مسلمان اتحاد کا پیغام ہوتا ہے اور وہ گیت زیادہ تر امیر خسرو، خانخاناں، کبیر داس، یا میرا بائی کے ہوتے ہیں۔ اور یہ گیت وہ سیکڑوں برس سے گا رہے ہیں۔ اور آج یہ انہیں گیتوں کا اثر ہے کہ ان میں رواداری انسانیت محبت اور سادگی پائی جاتی ہے۔

ایک دفعہ میں ایک چوپال کی طرف سے گذر رہا تھا، دیہاتی ڈھولک پر گا رہے تھے۔ ع

تم رام کہو وہ رحیم کہیں دونوں کی غرض اللہ سے ہے

میں نے وہاں کھڑے ہوکر پورا گیت سنا۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ درحقیقت زندگی کی مسرتیں اِن دیہاتیوں کے پاس ہیں۔ درحقیقت میں یہ انسانیت پرست ہیں۔ ان کے دماغ میں نہ پالیسی ہے نہ مکر و فریب۔ ان کے دل چاند سے زیادہ صاف ہیں۔ اُن کی محدود دنیا میں سچی خوشی ہے۔ وہ مذہبی تعصب اور نسل و رنگ کے امتیاز سے بالاتر ہیں۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان دیہاتیوں میں یہ مخلوط کلچر کس نے پیدا کیا۔ بلاشبہ یہ سہرا ہمارے شعراء ہی کے سر ہے۔ اُنھوں نے مذہبی تعصب سے بلند ہوکر انسانیت کے بنیادوں کو دیکھا۔ اور ایسی چیزیں تخلیق کیں جن سے ہندو مسلمان قریب سے قریب تر ہوگئے۔ آج شہروں کی فضاؤں میں ہندو مسلمان امتیاز نظر آتا ہے۔ لیکن دیہات میں آج بھی وہی رنگ ہے۔ اور شاید ہمیشہ رہے گا۔ نظیر آگرے کا باشندہ تھا۔ اور اپنے کو ہندوستانی سمجھتا تھا۔ وہ بلاشبہ ہندوستان کا بہت بڑا شاعر تھا۔ اس نے دنیا کی ہر چیز کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا اور اپنے مشاہدات کو اس طرح نظم کیا کہ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کے کلام میں نئے نئے موضوع نظر آتے ہیں جن سے اُسکی وسعتِ نظری کا پتہ چلتا ہے۔ وہ زندگی کی انتہائی تلخ حقیقتوں کو ہنسی ہنسی میں کہہ جاتا ہے۔ وہ جس چیز سے متاثر ہوتا ہے اُس کا

انتہائی خوبصورتی سے نقشہ کھینچتا ہے۔ وہ جہاں "آدمی نامہ" اور "بنجارہ نامہ" لکھتا ہے اُسی کے ساتھ "کلجگی کا بچہ" اور "آگرے کی ککڑی" بھی قلمبند کرتا ہے۔ جہاں وہ حضرت علیؓ کی مدح لکھتا ہے وہاں اُس نے کنہیا جی کے جنم دن پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔

ہے ریت جنم کی یوں ہوتی جس گھر میں بالا ہوتا ہے
اُس منڈل میں ہر من بھیتر سکھ چین دو بالا ہوتا ہے
سب بات بتا کی بھول ہے جب بھولا بھالا ہوتا ہے
آنند مندیلی باجت ہیں نت بھون اُجالا ہوتا ہے

یوں نیک نچھتر لیتے ہیں اس دُنیا میں سنسار جنم
پر اُن کے اور ہی لچھن ہیں جب لیتے ہیں اوتار جنم

کنس اپنی طاقت پر مغرور ہے، ایک دن وہ اپنے دربار میں فخریہ کہتا ہے۔

اک بان لگا کر پربت کو چاہوں تو ابھی دوں پل میں گرا
اِس جا ویس کے بڑھ بل جتنے ہیں ہر کون جو مجھ سے ہوئے سوا

جب کنس نے یہ ڈینگ ماری تو ایک مرد عاقل سے نہ رہا گیا۔ وہ بول اٹھا۔

جو تیرا مارن ہارا ہے سو وہ بھی جنم اب لیوے گا
تو اپنے بل پر ہائے مورکھ اِس آن عبث جتکا رلیا
وہ تجھ کو مار گرا دے گا یوں جیسے بھنگا مار لیا

جب کنس نے یہ بات سنی تو مارے ڈر کے اُس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اپنی جان بچانے کی تدبیریں سوچنے لگا۔

یہ بات سُنی جب کنس نے واں تب سنکر اُسکے ہوش اُڑے
سب دُشمن کے بھیتر آن بھرا اور بول گرب کے بسرے

کنس نے کچھ سوچ کر اُس مرد عاقل سے پوچھا

کون اُس کے ماتا پتا ہو ویں جو پالیں اُسکو چاہت سے

اُس شخص نے جواب دیا

وہ برلا متھرا نگری میں اک روز جنم وہ پاوے گا
جب سیانا ہوگا تب تجھکو اک پل میں مار گرا دے گا

کنس یہ بات سن کر بہت گھبرایا، اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ آخر اُس نے کچھ سوچ کر نارد منی سے مشورہ اور دیوکی اور بسدیو کو ایک مندر میں نظر بند کر دیا۔

اس بات کو سن کر کنس بہت تب اپنے من میں گھبرایا
جب نارد منی اُس پاس گئے تب اُس نے اُن سے بھید کہا
تب نارد منی نے اُسکو بھی کچھ اور طرح سے سمجھایا
پھر کنس کو واں اس بات سوا کچھ اور نہ مانگ بن آیا
جو اپنی جان بچانے کا گر سوچ کے اُس نے پسند کیا
بلوا بسدیو اور دیوکی کو اک مندر بھیتر بند کیا

کنس نے مندر پر زبردست پہرہ بٹھوا دیا کہ پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا، اور ایک مدت دراز تک اُن کے وہاں جو بچہ پیدا ہوتا ظالم کنس اُسے جان سے مروا ڈالتا۔

ایک مدت تک اُن دونوں کا اُس مندر میں یہ حال رہا
جو بالک اُن کے گھر جنما سو مارا تا واچنڈال رہا

لیکن جسے بھگوان رکھے اُسے کون چکھے، آخر کنہیا جی نے اُسی قید کے اندر جنم لیا۔

پھر آیا واں اک وقت ایسا جو اپنی گرب میں من موہن
گوپال منوہر مرلی دھر سیکشن کشوال کیول من
گھنشیام مراری بنواری گردھاری سندر سام برن
پربھو ناتھ بہاری کان سکھدائی جگ کے دکھ بھجن
جب ساعت پرگٹ ہونے کی واں آئی مکٹ دھر باکی
اب آگے بات جنم کی ہے جے بولو کشن کنہیا کی

مندرجہ بالا نظم میں ہندی کے کس قدر شیریں الفاظ نظم کئے گئے ہیں جنھیں پڑھ کر روح وجد کرنے لگتی ہے۔ اب کرشن جی کا بالپن بھی ملاحظہ کیجئے۔

جب پاؤں چلنے لاگے بہاری نول کشور
ماکھن اُچکے ٹھہرے ملائی دہی کے چور
من ہاتھ دودھ سے بھرے کپڑے بھی شور بور
ڈالا تمام برج کی گلیوں میں اپنا شور
ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بال پن
کیا کیا کہوں میں کرشن کنہیا کا بال پن

تھے گھر جو گوالوں کے لگے گھر سے جا بجا
جس گھر کو خالی دیکھا اسی گھر میں جا پھرا
ماکھن، ملائی، دودھ جو پایا سو کھا لیا
کچھ کھایا، کچھ خراب کیا، کچھ گرا دیا
ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کشن کنہیا کا بالپن

کرشن جی کی چوری سے گوالنیں بہت تنگ آ گئی تھیں لیکن اُن کی دلی کیفیت یہ تھی۔

اُن کو تو دیکھ گوالنیں جی جان پاتی تھیں
گھر میں اسی بہانے سے اُن کو بلاتی تھیں
ظاہر میں اُن کے ہاتھ سے وہ غل مچاتی تھیں
پردے میں سب وہ کشن کے بلہاری جاتی تھیں
ایسا تھا بانسری کے بجیا کا بالپن
کیا کیا کہوں میں کشن کنہیا کا بالپن

کنہیا جی کی راس کا نقشہ ملاحظہ فرمایئے۔

ناچیں ہیں اس بہار سے بن ٹھن کے نندلال
سر پر مکٹ براجے ہے پوشاک تن پہ لال
ہنستے ہیں، چھیڑتے ہیں ہر اک کو دکھا کے گال
سکھیوں کے ساتھ دیکھ کے یہ کانہ جی کا حال
ہر آن گوپیوں کا یہی غلہ بلاس ہے
دیکھو بہاریں آج کنہیا کی راس ہے
ہنستی ہوئی جو پھرتی ہیں ساتھ اُن کے گوپیاں
ہے اُن میں رادھا ایسی کہ تاروں میں چندرما

کرتی ہیں کشن جی سے ہر اک آن آن بان
آپس میں اُن کے رمز و اشارات کرکے دھیان
ہر آن گوپیوں کا یہی حکم بلاس ہے
دیکھو بہاریں آج کنہیا کی راس ہے

آیئے، اب آپ کو نظیر کے ساتھ بلدیو جی کے میلے کی سیر کرائی جائے۔

کیا وہ دلبر کوئی نویلا ہے — ناتھ ہے اور کہیں وہ چیلا ہے
موتیا ہے، چنبیلی، بیلا ہے — بھیڑ، انبوہ ہے، اکیلا ہے
شہری، قصباتی اور گنوئیلا ہے — زر، اشرفی ہے، پیسہ دھیلا ہے
ایک کیا کیا وہ کھیل کھیلا ہے — بھیڑ ہے، خلقتوں کا ریلا ہے
رنگ ہے، روپ ہے، جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

سینکڑوں رنگ رنگ کی چھڑیاں — پھول گیندوں کے ہار کی لڑیاں
کہیں چھوٹیں انار پھلجھڑیاں — کہیں کھلتی ہیں دل کی پھلجھڑیاں
کہیں الفت سے انکھڑیاں لڑیاں — کہیں باہیں گلے میں ہیں پڑیاں
عیش و عشرت کی لڑ رہی دھڑیاں — دال موٹھیں ٹکوڑے اور بڑیاں
رنگ ہے، روپ ہے، جھمیلا ہے
زور بلدیو جی کا میلا ہے

نظیر کو جو ہند و کلچر سے عقیدت ہے، مندرجہ بالا نظموں کے اقتباسات سے آپ اس کا اندازہ بخوبی کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیوالی، دسہرے اور مہادیو جی کے بیاہ پر نظیر نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ مسلمان اردو شعرا کس طرح ہند و کلچر سے متاثر تھے۔ اس لیے کسی دوست کا یہ خیال ظاہر کرنا ٹھیک نہیں ہے کہ اردو شعرا کے وہاں ہند و کلچر کی جھلک نظر نہیں آتی۔

محمد حفیظ (سید)

مہاتما گاندھی کے تعلیمی نظریئے

(۱) بچوں سے محبت

دنیا کے بڑے بڑے بزرگوں کی طرح مہاتما گاندھی بھی بچوں سے محبت کرتے تھے۔ بالکل جس طرح جوزت مازینی حضرت یسوع مسیح اور پیغمبر اسلام کرتے تھے وہ ننھے ننھے معصوم بچوں کی صحبت میں رہنا پسند کرتے تھے۔ بچوں کے محب ہونے کے سبب سے وہ ہمہ وقت ان کی راحت کے نگراں رہتے اور انھیں خوش رکھنے کی ہر تدبیر کرتے تھے۔

جب وہ آخری مرتبہ گول میز کانفرنس کی شرکت کے موقعے پر انگلستان گئے تھے تو انھوں نے اپنی گراں بار مصروفیتوں میں ڈاکٹر مونٹسوری، ایم ڈی، ڈی لٹ، کی یہ دعوت بھی قبول کی تھی کہ اُن کے مدرسے کے بچوں کی ایک معاشری تقریب میں شریک ہوں۔

اس تقریب کے متعلق ڈاکٹر مونٹسوری کا بیان ہے کہ "مہاتما کے قیام لندن کے دوران میں میرے مدرسے کے بچوں نے ان کے استقبال کا جلسہ کیا، اور جب وہ فرش پر بیٹھے ہوئے سُوت کات رہے تھے تو وہ ادب اور خاموشی کے ساتھ ان کے گرد بیٹھے تھے، وہی نہیں، بلکہ جتنے بالغ عمر کے لوگ اس ناقابلِ فراموش استقبال میں موجود تھے، سب کے سب ساکت اور خاموش تھے۔ اس وقت سب کا صرف ایک جا ہونا ہی کافی تھا۔ اس کی ضرورت نہ تھی کہ رقص و سرود ہوتا یا تقریریں کی جاتیں۔

(۲) بچوں کا لحاظ

روحانی اقدار اور انسان کی جبلی الوہیت کے معتقد کی حیثیت سے وہ اس امر سے غافل نہ تھے کہ گو بچے معصوم اور کمزور ہیں۔ مگر قابلیت کی ایک ایسی لاانتہا قوت ان میں پوشیدہ ہے۔ جسے ان کو اپنی نفسی تعلیم اور آزاد عمل کے وسیلے سے اُبھارنا اور اُجاگر کرنا ہے۔

یہ ممکن ہے کہ جسمانی لحاظ سے بچہ کمزور اور بے بس ہو، لیکن روحانی لحاظ سے وہ والدین اور استادوں سے بھی زیادہ ترقی یافتہ ہو سکتا ہے۔

بعض بچے اپنی اس مضمر قابلیت کو چھوٹی سی عمر ہی میں نمایاں کر دیتے ہیں اس لئے ڈاکٹر مونٹسوری کی طرح مہاتما جی بھی ہمیں یہ ہدایت کر گئے ہیں کہ بچوں سے نہایت درجہ سمجھ بوجھ اور پیار کے ساتھ سلوک کرنا چاہیئے۔ اور نہ اُن سے بدسلوکی کرنا چاہیئے۔ نہ اُن کو حقیر سمجھنا چاہیئے۔ انھیں بدسلوکی یا بدتمیزی کا کم از کم اتنا احساس تو ضرور ہے جتنا بالغوں کو ہوتا ہے۔

(۳) والدین کی ذمہ داری

مہاتما جی کو ان فرائض اور ذمہ داریوں میں پوری اور صاف بصیرت حاصل تھی۔ جو والدین پر ان کے بچوں کی جانب سے عاید ہوتی ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انسان کا سب سے پہلا استاد ماں تھی۔ اور یہ کہ بچے کی زندگی میں سب چیزوں سے زیادہ اور گہرا اثر اس گھر کی فضا اور والدین کی مثال کا ہوتا ہے۔ اس موضوع پر ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

" اس موقعے پر والدین کی ذمہ داری کے موضوع پر بحث کرنے سے میرا مدعا یہ ہے کہ تہذیب و تمدن کی تاریخ کے عالم کو یہ معلوم ہو سکے کہ گھر کی تعلیم و تربیت اور مدرسے کی تعلیم میں کیا فرق ہے۔ اور یہ بھی اندازہ ہو سکے کہ والدین کے ان کی زندگیوں میں تبدیلیاں کر دینے سے بچوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔

(۴) گھر کے اثرات کی قیمت

مزید یہ کہ وہ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں (صفحہ ۲۴۶) اپنے بچوں کی تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"بہر حال میری رائے یہ ہے کہ اگر میں اس پر اصرار کرتا کہ انھیں کسی نہ کسی طرح پبلک مدرسوں ہی میں تعلیم دلائی جائے تو وہ اس تربیت سے محروم رہ جاتے جو صرف تجربے کے مدرسے میں یا والدین کے مسلسل تعلقات کے وسیلے سے حاصل ہو سکتی ہے۔"

فن تعلیم کا ہر تجربہ جو دلپذیر کرتا ہے، اس نقطۂ نظر سے بلا تامل اتفاق کرے گا جس پر مہاتما جی نے زور دیا ہے۔ ہند اور دوسرے ملکوں کے اکثر والدین اُن فرائض سے غفلت برتتے ہیں جو ان کے بچوں کی طرف سے ان پر عائد ہیں۔ اور مطلق نہیں سمجھتے کہ وہ اپنے بچوں کو گھر کی استانیوں اور مدرسے کے استادوں کی نگرانی میں رکھ کر اُن کو کس قدر بے اندازہ نقصان پہونچاتے ہیں۔ اسباب عیاں ہیں کہ یہ لوگ اُن کے بچوں کی اخلاقی اور ذہنی عاقبت میں اتنی دلچسپی نہیں رکھتے جتنی کہ والدین کو فطری طور پر ہوتی ہے۔ اسی طرح مہاتما جی کو یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ بچوں کو مشنریوں کے مدرسوں میں بھیجا جائے۔ جہاں وطنی اثر کی بہ نسبت اجنبی اثر غالب ہی رہتا ہے۔

(۵) تعلیم میں ایک معاشرتی مقصد ہے

مہاتما جی کی رائے تھی کہ "تعلیم وہ علم اور فن ہے جس سے بچے کے نشو ونما اور قوم کی ضروریات کے بیچ ایک رابطہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اور ملک کے نوجوانوں کو اس جسم کا ایک مناسب عضو بنایا جاتا ہے۔" وہ فرمایا کرتے تھے کہ "جو بچہ پیدا ہوتا ہے، وہ ماں باپ کی ملکیت یا خاندان کا سہارا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ پوری قوم کا سرمایہ ہوتا ہے، اور اس لئے یہ ایک فطری امر ہے کہ اس کی تربیت قومی ضروریات اور قومی نصب العین سے ہم آہنگ ہو۔" مختصر یہ کہ ان کا عقیدہ تھا کہ تعلیم میں ایک معاشرتی مقصد ہونا چاہیئے۔ آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ تعلیم محض ایک فرد کے منصوبے اور حوصلے کو پورا کرتی ہے۔ اور اس کی تشکیل ایسی نہیں ہے کہ وہ معاشرتی بہبودی کو ترقی دے سکے۔ آں جناب کی رائے تھی کہ تعلیم کی غرض یہ ہونا چاہیئے کہ وہ انسان کو اس قابل کر دے کہ وہ واضح طور پر دیکھ سکے، صاف طور پر تصور کر سکے، بلند پروازانہ طور پر آرزو کر سکے۔ سرعت کے ساتھ تدبر کر سکے، اور اپنے ملک کی خدمت کے لئے وفاداری کے ساتھ عمل کر سکے۔

یہ ہے تعلیم کا گاندھوی نصب العین۔ وہ ہر گھر کو ایک مدرسہ سمجھتے تھے اور ہر ماں باپ کو استاد۔

(۶) وردھا اسکیم

ان کی یہ قطعی رائے تھی کہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے ہند کی اقبال مندی اور عظمت کا مستقبل بڑی حد تک تعلیمات کی تجدید و اصلاح کی اس استوار بنیاد پر منحصر ہے جس میں ہند کے تمدنی ورثے اور اس کی حالیہ اہم ضروریات کی روشنی میں قائم کی گئی ہو۔ وہ سوال کیا کرتے تھے کہ "ہم اپنے جوانوں کو کس لئے تعلیم دیں؟ کیا یہ محض ایک مقابلے کی پیداوار کی غرض سے کیا جائے؟ یا صرف کفایت نفس کے لئے؟"

ملک کے نوجوانوں کو جو تربیت دی جائے وہ ایسی ہونا چاہیئے کہ وہ ان کی طبیعتوں میں گھریلو صنعتوں کی طرف رجحان پیدا کر دے۔ کیونکہ صرف اسی سے یہ کفایت نفس پھیلتے پھیلتے ہند کے دور ترین گوشوں میں، اس کے ضلعوں، تحصیلوں اور دیہاتوں تک میں پہونچ سکتی ہے۔ اسی قسم کی تعلیم وردھا اسکیم میں مدنظر ہے جس کے نصب العین کو ملک کے تمام ماہرین تعلیم اب تسلیم کرنے لگے ہیں۔

(۷) ادبی تعلیم

برسبیل تذکرہ یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ آزاد ہند میں بھی امتحان پاس کرنے کا شوق اسی دیوانگی کے ساتھ قائم ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ خالص ادبی تعلیم کا جذبہ اب بھی میدان پر قابض ہے۔ اور اب بھی استاد شاگرد اور والدین اسی طرح مفتون ہیں۔ نوجوانوں کے ذہنوں کا رجحان اب بھی بدستور یونیورسٹی کی تعلیم ہی کی طرف ہے۔ نہ کہ کسی صنعت و حرفت یا فنیات کی طرف، حالانکہ یہی وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعے وہ ایک معزز روزگار پا سکتے ہیں۔

(۸) اجنبی تہذیب

مہاتما جی کو اس پر زیادہ ولولہ نہ تھا کہ ہمارے ملک میں کسی اجنبی تہذیب یا اجنبی زبان کو رائج کیا جائے۔ وہ وقتی طور پر تو انگریزی کی افادیت کو تسلیم کرتے تھے۔ مگر ان کی خواہش تھی کہ ہندوستانی زبان میں اس طرح اضافہ کیا جائے، اور ایسی تشکیل کی جائے کہ وہ ہمارے ملک کی "بولی" بن سکے۔ اور مرکزی حکومت بھی اپنے شایان شان ادارہ پاسکے

اس زبان کو استعمال کرے۔

(۹) اخلاقی اور دینی تعلیم آں جناب کا عقیدہ تھا کہ ملک کے نوجوانوں کی تعلیم میں اخلاقی اور دینی تعلیم کا پایہ خوب مضبوط ہونا چاہیئے۔ اگر انھیں اس پر ایمان ہو۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ تمام مذہب اصلاً ایک ہی ہیں اور وہ خود اپنی روزمرہ کی زندگی میں، اُن دعاؤں پر عمل پیرا رہتے تھے جنھیں انھوں نے مختلف مذہبی کتابوں میں سے جمع کیا تھا۔

(۱۰) قومی وحدت ہم اپنی تہذیب کے اختلاط یا قومی وحدت کے موافق یا خلاف جو چاہیں کہیں مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب وقت آئے گا تو زمانہ خود بتا دے گا کہ مہاتما جی کے وہ بلند و شریف نصب العین جن کی وہ اپنی پُرحوادث زندگی میں برابر تلقین کرتے رہے۔ بالآخر تمام پیچیدگیوں کو حل کر دیں گے۔ اور اُن تمام رُکاوٹوں کو دور کر دیں گے۔ جو ہمیں متحد کر کے ایک بڑی قوم بنا دینے کی راہ میں حائل ہیں۔

(۱۰) عدمِ ضبط آج کل جبکہ پریشانی اور ابتری رائج ہے، اور ہمارے بچوں میں ضبطِ نفس اور حُسنِ خلق کا فقدان ہے اور جس کا تمام ہوشمند آدمیوں کو صحیح طور پر افسوس ہے۔ ہم اس سادی بدحالی کا اصلی سبب دریافت کرنے سے قاصر ہیں۔ ہم عموماً سارا الزام ان پر سرے نوجوانوں کے سر تھوپ دیتے ہیں اور یہ تفتیش نہیں کرتے کہ خود ہمارے دلوں کا کیا حال ہے۔ اور یہ نہیں دیکھتے کہ خود ہم اس امر کے ملزم ہیں کہ اپنے اُن عزیزوں کی طرف سے جو فرائض ہمارے ذمے ہیں وہ ہم ادا نہیں کرتے۔ اور ہم اُن کے سامنے حُسنِ خلق کی وہ عمدہ مثال پیش نہیں کرتے جس سے وہ اس قابل ہو جائیں کہ ہماری مثالی طرزِ زندگی کی نقل کر سکیں، اور یوں ہم اُن کی مدد کریں کہ وہ ایسی صحیح قسم کے اطوار اختیار کریں جو ایک راست کردار کے اہم عناصر ہیں۔

(۱۲) اچھا نمونہ چونکہ مہاتما گاندھی کو انسانی نفسیات میں صحیح بصیرت حاصل تھی۔ اس لئے انھوں نے اصلی سبب کا پتہ لگا کر ایسا علاج ڈھونڈھ نکالا ہے جس سے کسی ملک کا کوئی مبصر و ماہرِ تعلیم کسی طرح اختلاف رائے نہیں کر سکتا۔ ان کی کتاب "حق کی تلاش" کے صفحہ ۱۴۹ میں اُن کے گراں بہا الفاظ یہ ہیں۔

"یہ ممکن ہے کہ کوئی استاد جو اپنے شاگردوں سے میلوں دور رہتا ہو، اپنی طرزِ زندگی سے اُن کی روح پر اثر ڈالے۔ اگر میں خود جھوٹا ہوں تو میرے لئے یہ ایک فعلِ عبث ہوگا، کہ میں بچوں کو سچ بولنے کی تلقین کروں۔ کوئی بزدل استاد اپنے بچوں کو دلیر بنانے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اور جس شخص کے لئے ضبطِ نفس خود ہی ایک اجنبی چیز ہو وہ کبھی اپنے شاگردوں کو ضبطِ نفس نہیں سکھا سکتا۔ لہٰذا میں نے یہ رائے قائم کی جو لڑکے لڑکیاں میرے ساتھ رہتے ہیں اُن کے لئے مجھے خود ایک ابدی "سبق اشیا" بن جانا چاہیئے۔ یوں وہ لوگ خود میرے استاد ہو گئے۔ اور میں نے یہ سیکھ لیا کہ مجھے خود نیک بننا اور راست باز رہنا چاہیئے۔ خواہ وہ انھیں لوگوں کی خاطر سے ہو۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ تالستائی جاگیر میں جتنا کچھ میں نے اپنے اوپر ضبط کیا اور قابو رکھا وہ سب میرے انھیں الفاظ کی بدولت تھا۔"

(۱۳) تہذیبِ قلب تعلیم میں قلب ایک اہم چیز ہے۔ اور مہاتما جی نے اس کی طرف سے غفلت کرنے پر جو تنبیہہ کی ہے وہ بروقت ہے۔ انسان نے تہذیبِ قلب سے غفلت برتی ہے وہ اب اس قدر بے حس ہو گیا ہے کہ اپنے ہمسائے کے ساتھ امن و آشتی سے نہیں رہ سکتا۔ اس نے نیاگرا کی آبشار کو قابو کر لیا ہے۔ اس نے زمین ہوا اور پانی کو اپنے کام میں لگا لیا ہے۔ مگر اس چھوٹی سی نہر کا کیا حال ہے جو خود اس کے سینے میں جاری ہے۔ اور جسے دل کہتے ہیں؟

اگر انسان دل کے راز کو صحیح طور پر سمجھ سکتا، اس کی حرکت کو باقاعدہ بنا سکتا۔ اور اس کی قوت کی عقلمندی کے ساتھ رہنمائی کرتا، تو پھر دنیا میں نہ کوئی جنگ ہوتی، نہ کوئی دکھ ہوتا۔ وسیع تر الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ دنیا کا مسئلہ دل ہی کا مسئلہ ہے۔ وردھا کا بزرگ قلب کی تعلیم کے بارے میں صرف ایک اشارے اور ہدایت کے سوا اور کچھ نہیں کہتا کہ یہ کام استاد کی جیتی جاگتی

صحبت کے ہاتھوں انجام پا سکتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ استاد کی شخصیت بڑی چیز ہے۔ اس کی ہمدردی اور محبت شاگردوں کی زندگیوں میں ایک انقلابی اثر رکھتی ہے۔ لیکن وہ اور بھی زیادہ مفید مطلب ہو سکتا ہے۔ اگر اُسے تہذیب قلب کے طریقے معلوم ہوں۔

شاگردوں کے آپس میں مقابلے کی جو دھن ہوتی ہے اور جسے حالیہ نظام تعلیم اور بھی تیز تر کر دیتا ہے۔ اُسے ترک کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کی جگہ باہمی امداد کا زیادہ صحت مند اصول قائم کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم اپنے ایک کمزور بھائی کی مدد کرنے کا حق ادا کر سکے تو اُسے چاہیئے کہ اس حق کو اپنا خاص حق سمجھے۔

آرٹ اور موسیقی ہمارے نصاب تعلیم میں عموماً قطعاً مفقود ہوتا ہے۔ مگر یہ دونوں جذبات کی تربیت میں ایک اہم اثر رکھتے ہیں اور ہمارے مدرسوں میں ان کے لئے جگہ ہونا چاہیئے۔ موسیقی کے جلسوں راگ مالاؤں۔ اور ناٹکوں کا احیاء ہونا چاہیئے۔ ابتدائی درجوں میں پالتو جانوروں کی پرورش، جیسے طوطا، خرگوش، بکری اور اسی طرح پھولوں اور پودوں کی پرورش، اس باب میں معاون ہو سکتے ہیں۔ مہاتما جی کے خاص الفاظ یہ ہیں۔

تہذیب قلب کے بارے میں مجھے صرف ایک بات کہنی ہے۔ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ یہ چیز کتابوں کے ذریعے سکھائی جا سکتی ہے۔ یہ تو صرف اُستاد کی جیتی جاگتی صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر ابتدائی، بلکہ ثانوی مدرسوں میں اُستاد کون لوگ ہیں؟ کیا وہ صحیح عقیدے اور اخلاق کے مرد و زن ہیں؟ کیا اُنھوں نے خود تہذیب قلب کی تعلیم حاصل کی ہے۔ کیا اُن سے ذرا سی بھی امید قائم کی جا سکتی ہے کہ جو لڑکے لڑکیاں اُن کی نگرانی میں رکھے گئے ہیں۔ وہ لوگ اُن کے مستقل عناصر کی نگرانی کر سکتے ہیں۔ ابتدائی مدرسوں میں استادوں کے انتخاب کا جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، کیا وہ حسن اخلاق کے لئے ایک مؤثر رکاوٹ نہیں! کیا اُستادوں کو اتنی تنخواہ ملتی ہے کہ وہ گذارہ ہی کر سکیں؟ ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ ابتدائی مدارس کے استادوں کو ان کی حب وطنی کی بنا پر انتخاب نہیں کیا جاتا؛ بلکہ صرف وہی لوگ وہاں پہونچتے ہیں جن کو اور کوئی ملازمت نہیں ملتی "

(۱۴) سالم انسان کی تعلیم

سالم انسان کی تعلیم ایسا موضوع ہے جو زمانۂ حال کے ماہرین تعلیم کی توجہ کو جذب کر رہا ہے۔ اس بارے میں چونکہ مہاتما جی ہند کے قدیم مرتاض بزرگوں کے بنائے ہوئے تقویم انسانی کے مخلص معتقد ہیں۔ اسلئے اُنھوں نے بجا طور پر اس ضرورت پر زور دیا ہے کہ بچے کو اس کی ہستی کی ہر شان میں تربیت ہونا چاہیئے، یعنی جسمانی، ذہنی، اخلاقی اور روحانی۔ ذہنی تعلیم ہی سب کچھ نہیں ہوا کرتی۔ ہم افسوسناک طور پر اخلاقی اور روحانی تہذیب و تربیت سے غافل رہے ہیں۔ ہماری نشو و نما بالکل یک طرفہ ہوتی رہی ہے۔ ۱۵ ردسمبر ۱۹۳۰ء کے ہریجن میں مہاتما جی نے لکھا تھا کہ "انسان نہ تو محض عقل ہے نہ خالص جسم حیوانی ہے۔ نہ صرف دل یا روح ہے۔ ان تینوں کا ایک مناسب اور ہم آہنگ امتزاج ہی وہ چیز ہے جس کی ایک سالم انسان بنانے کے لئے ضرورت ہے۔ اور اسی میں تعلیم کا اقتصادی پہلو بھی مضمر ہے"۔

۱۵ نصاب کی کتابیں

ہمارے بچوں کے والدین اور اولیا ہند کے مختلف حصوں میں، خصوصاً صوبۂ مدراس اور صوبۂ متحدہ میں یہ شکایت کرتے رہے ہیں کہ بچوں کے نصاب کی کتابیں بار بار بدلی جاتی ہیں، اور یہ کہ چند خود غرض جماعتیں محض مصنف اور ناشرین کو مال جمع کرنے کی دھن میں نصابی کمیٹیوں سے فائدہ اُٹھا رہی ہیں۔ مہاتما جی نے ۹ ستمبر ۱۹۳۹ء کے ہریجن میں جو کچھ لکھا تھا وہ اس قابل ہے کہ ہمارے صوبوں کے تعلیم کے وزیر اور ناظم ان پر غور کریں اور ہندی قوم کے باپو نے جو قابل قدر تجویزیں پیش کی ہیں اُن پر جلد سے جلد عمل پیرا ہوں، فرمایا ہے:

" یہ ہر وقت کی بدلتی ہوئی نصابی کتابیں تعلیمی نقطۂ نظر سے کسی طرح ایک صحت مند طریق کار نہیں کہی جا سکتیں۔ اگر نصابی کتابیں تعلیم کا ذریعہ کہی جائیں تو استاد کی جیتی جاگتی باتوں کی کوئی قدر و قیمت نہ رہے گی۔ جو استاد نصابی کتابوں کے ذریعے تعلیم دیتا ہے وہ اپنے شاگردوں کو حقیقت کبھی نہیں سکھا سکتا۔ وہ خود بھی نصابی کتابوں کا بندہ ہو جاتا ہے۔ اور حقیقت پرستی کا کوئی موقعہ ہی نہیں پا سکتا۔ اس لئے ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ نصابی کتابیں جتنی بھی کم ہوں اتنا ہی اُستاد اور اسکے شاگرد کے حق میں بہتر ہے۔ نصابی کتابیں ایک سوداگری کی چیز بن گئی ہیں، جو مصنف اور ناشر تصنیف اور نشر کو مال جمع کرنے کا ایک ذریعہ بنالیتے ہیں۔ انھیں کو نصابی کتابوں کے بار بار تبدیل کرنے کی دھن ہوتی ہے۔ اکثر صورتوں میں استاد اور ممتحن لوگ خود ہی نصابی کتابوں کے مصنف ہوتے ہیں۔ ان کی کتابوں کے فروخت ہونے میں خود انہی کا فائدہ ہوتا ہے۔ پھر کتابوں کا انتخاب کرنے والی جماعت بھی فطری طور پر، ایسے ہی افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ یوں یہ گھن چکر پورا ہو جاتا ہے! والدین کے لئے ہر سال نئی کتابوں کے لئے روپیہ مہیا کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ بچوں کو اتنی اتنی کتابوں کے بوجھ اُٹھا کر لے جاتے ہوئے دیکھ کر بہت ترس آتا ہے۔ اس تمام نظام پر پوری طرح غور کرنے کی ضرورت ہے۔"

ضرورت ہے کہ ناجوازنیت کو بالکل ختم کیا جائے، اور اس مسئلے پر صرف طلبا کے لحاظ سے غور کیا جائے۔ ایسا کرنے پر ہی غالباً یہ معلوم ہوگا کہ نصابی کتابوں میں سے ۷۵ فی صدی اس قابل ہیں کہ اُنھیں ردی کے کوڑے میں ڈال دیا جائے۔ اگر میں اپنا طریق کار استعمال کرسکتا تو میں یہ کرتا کہ میں کتابوں کو استادوں کی مدد کے لئے رکھتا نہ کہ طلبا کی۔ ایسی نصابی کتابیں جو طلبا کے لئے بالکل ہی لازمی ہوں، ان کے لئے کئی برس تک جاری رہنا چاہئیں، تاکہ درمیانی درجے کے خاندان ان کا خرچ برداشت کرسکیں۔ اس سمت میں حکومت کے لئے سب سے پہلا قدم یہ ہوگا کہ وہ خود نصابی کتابوں پر قابض ہو کر ان کی طباعت اور اشاعت کا بندوبست کرے۔ اس سے ان کتابوں کی تعداد کی غیر ضروری کثرت کی خود بخود ہی روک تھام ہو جائے گی۔"

کھانڈ کی موجودہ قِلّت کی وجہ

شری این۔ ٹی۔ موں جائنٹ سکرٹری وزارت نے کھانڈ کی موجودہ قلّت کی وضاحت کرنیکے لئے مندرجہ ذیل حقائق بیان کئے ہیں: "گذشتہ برس دسمبر میں کارخانوں کے پاس ایک لاکھ پچہتر ہزار ٹن کھانڈ اگلے سال کیلئے باقی پڑی تھی۔ کارخانہ داروں سے مشورہ کرنے کے بعد حکومت ہند نے کھانڈ کا نرخ ساڑھے اٹھائیس روپیہ مقرر کیا۔ اور کارخانہ داروں نے اس نرخ کو قائم رکھنا منظور کرلیا۔ سال رواں میں کارخانوں نے قریباً دس لاکھ ٹن کھانڈ تیار کی۔ کل اسٹاک قریباً بارہ لاکھ ٹن تھا اور یہ مقدار ملک کی سال بھر کی ضروریات کے لئے کافی ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن منافع حاصل کرنے کے لئے سٹّہ بازی نے صورتِ حالات کو بدل دیا اور کھانڈ کی سپلائی کو جو مانگ کو بمشکل پورا کرنیکے قابل تھی، قلّت کی حالت میں تبدیل کردیا۔ اس برس جون کے مہینے تک صورت حالات نارمل تھی۔ انڈین شوگر سنڈیکیٹ نے کھانڈ کی اس سال کی پیداوار کا قریباً نوّے فیصدی حصہ فروخت کیلئے کھول دیا۔ ایک افواہ پھیل گئی کہ کھانڈ کی کافی بڑی مقدار پاکستان کو برآمد کی جائیگی۔ جولائی۔ اگست میں بیوپاریوں نے کارخانوں کو کھانڈ مہیا کرنیکے آرڈر دھڑا دھڑ دینے شروع کردیئے، اور کارخانوں نے نرخ بڑھانا شروع کردیا۔ حکومت ہند نے یہ جان کرکہ کارخانے اپنا تمام اسٹاک مہنگی قیمتوں پر فروخت کررہے ہیں، کھانڈ کے اسٹاک کو اپنے قبضے میں لینے کے احکامات جاری کئے۔ کھانڈ کے نرخوں کی تیزی کی حالت میں سنڈیکیٹ نے ملک کے مفاد کے منافی کارروائی کی۔ حکومت ہندوستان کے ساتھ معاہدہ پر عمل کرنیکی بجائے کارخانوں نے مہنگے داموں کھانڈ فروخت کرنی شروع کردی۔ اور سال کے شروع میں اُنھوں نے جو وعدہ حکومت سے کیا تھا اس کے مطابق کنٹرول پر پرچون کھانڈ فروخت کرنے کی دوکانیں بھی نہ کھولیں۔ ۲ ستمبر کو حکومت ہند نے سارے ہندوستان میں کھانڈ کے سٹاک روک لینے کے احکام جاری کئے۔ اسوقت کارخانوں کے پاس صرف ایک لاکھ بیس ہزار ٹن کھانڈ باقی رہ گئی تھی ——— ظاہر ہے کہ اس اسٹاک سے ملک کا مزید تین مہینے تک گزارہ چلنا ممکن نہ تھا۔ اسلئے صوبائی حکومتوں کو فوراً ہی مکمل اختیارات دئے گئے، کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں کھانڈ کے اسٹاک کو اپنے اپنے قبضہ میں لے لیں۔ یا صورتِ حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ایسی کارروائی کریں جو وہ مناسب سمجھیں۔ جب تک کھانڈ کی موجودہ پوزیشن میں بہتری نہ ہو جائے۔ کنٹرول ہٹانا سماج دشمن عناصر کے ہاتھوں میں کھیلنے کے مترادف ہوگا۔"

آجکل دہلی

خوراک کا مسئلہ

نیویارک میں امریکہ کے سمندر پار ممالک کے اخباری نمائندوں کے کلب نے پنڈت نہرو کے اعزاز میں دعوتِ لنچ دی۔ اس موقعے پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"آج ہندوستان کی سب سے بڑی ضرورت خوراک ہے چند سال کے اندر اندر ہم خوراک کے بارے میں خود مکتفی ہو جائیں گے۔ کیونکہ ہم نے بہت سی بڑی بڑی اسکیمیں شروع کر رکھی ہیں جن میں سے چند تو ٹینیسی ویلی پروجیکٹ سے بھی بڑی ہیں۔ لیکن ہماری فوری ضرورت ٹریکٹر مشینیں اور کیمیائی کھاد ہیں۔ ہم ان نرخوں پر خوراک حاصل کرنا چاہتے ہیں جو ہم ادا کرنے کے قابل ہیں۔ کیونکہ تمام اشیا کے نرخوں کا نظام گندم کے نرخ پر ہی منحصر ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ امریکہ اپنی فالتو گندم میں سے ہمیں کچھ حصہ دے۔ ہندوستان گندم کا ذخیرہ جمع کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ اشیاء کے نرخوں کو گھٹایا جا سکے۔ اس کے علاوہ ہمیں مشینوں اور ماہرین کی امداد بھی درکار ہے۔

امریکہ سے فالتو گندم

پنڈت نہرو کے اس اعلان سے کہ ہندوستان امریکہ کی فالتو گندم میں سے کچھ حصہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ برطانیہ کے ماہرین خوراک بہت متاثر ہوئے ہیں۔ گذشتہ کئی ماہ سے باخبر حلقوں کی طرف سے یہ خبر پھیلائی جا رہی تھی کہ غالباً ہندوستان بہت جلد امریکہ سے فوراً قیمت ادا کئے بغیر بہت بڑی مقدار اناج حاصل کرے گا۔ امریکہ بڑی آسانی سے اور درحقیقت اپنے فائدے کے لئے بڑی مقدار اناج کی ہندوستان کو دے سکتا ہے جسے ہندوستان میں افراطِ زر کی روک تھام کے لئے بیش قیمت طریقے پر استعمال کیا جا سکے گا۔ کیونکہ اناج کا کافی بڑا ذخیرہ جمع کر لینے کا اثر یہ ہوگا کہ ہندوستان کی منڈیوں پر اس کا سایہ پڑتا رہے گا اور اناج کے نرخ گھٹائے جا سکیں گے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ذخیرہ اندوزوں کو خوفزدہ کر دے گا وہ اپنے پاس چھپا ہوا اناج منڈی میں بیچ دیں گے

امریکہ میں اس برس اتنا زیادہ اناج پیدا ہوا ہے کہ اس سے پیشتر اتنا کبھی نہیں ہوا گندم کی اتنی فراوانی ہے کہ امریکہ آئیندہ فصل کی کاشت پر پابندی لگانے کی فکر کر رہا ہے۔ امریکن سرکاری افسروں نے تو یہ پیش گوئی کر رکھی ہے کہ کنٹرول نافذ کر دینے کے باوجود آئیندہ برس کی فصل گندم سالِ رواں کی طرح بہت زیادہ ہوگی۔ اگر ایسا ہوا۔ تو امریکہ کے لئے بڑی مشکل پیدا ہو جائے گی۔ اور اگر اس نے اپنی فالتو گندم کی بہت بڑی مقدار ہندوستان بھیجنے کا انتظام نہیں کیا۔ تو اس کی مشکلات لازماً بڑھ جائیں گی۔ امریکہ کی مکّی کی برآمد میں کمی ہو جانے سے حالات اور خراب ہو رہے ہیں۔ کیونکہ مکّی درآمد کرنے والے ممالک کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اور وہ اس کی قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ ادھر آسٹریلیا اور ارجنٹائنا کی گندم کی فصلیں بھی اس سال زیادہ ہیں۔ اور ان کو یہ فکر پریشان کر رہی ہے کہ وہ اپنے گندم کے لئے کون سی منڈی تلاش کریں۔ اگر آخری وقت پر گندم کی فصلوں کو کچھ نقصان بھی پہنچ جائے تو بھی دُنیا میں گندم کی سپلائی مانگ سے بہت ہی زیادہ بڑھ جائے گی۔

جاپان کا فیصلہ

جاپان کی وزارت بین الاقوامی تجارت نے اعلان کیا ہے۔ کہ وہ اس برس بہت زیادہ مقدار میں اناج ڈالر سکّے کے ممالک کی بجائے سٹرلنگ سکّہ والے اور دیگر ممالک سے برآمد کریں گے جن کو نقد ادا کرنے کے عوض جنس کے بدلے جنس سپلائی کریں گے۔ اب تک جاپان اپنے لئے اناج کا نوّے فی صدی حصہ صرف ڈالر سکّے کے ممالک سے درآمد کیا کرتا تھا۔

خوراک کے محاذ پر حالات کی رفتار

۲۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو ختم ہونے والے ہفتے کے دوران میں غیر ممالک سے حسب ذیل مقدار اناج ہندوستان میں

درآمد کیا گیا۔ گندم چودہ ہزار آٹھ سو ٹن۔ آٹا نو ہزار سات سو ٹن اور چاول ایک ہزار چھ سو ٹن۔

صوبوں اور ریاستوں میں صورت حال

پوربی پنجاب محکمہ زراعت نے فیصلہ کیا ہے کہ کاشتکاروں کو کنٹرول کے نرخوں پر زرعی اوزار فروخت کئے جائیں۔ یہ نرخ منڈی کے نرخوں سے بہت کم ہیں۔ اس محکمے نے ایک نئی قسم کے چاول ضلع گورداسپور میں کاشت کرنے کے لئے پیدا کئے ہیں پانچ برس کے تجربے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اس قسم کے چاول کاشت کرنے سے تین من چودہ سیر فی ایکڑ چاول پیدا ہوتے ہیں۔ حکومت پوربی پنجاب نے فیروزپور۔ لدھیانہ۔ حصار۔ رہتک۔ کرنال اور گڑگانواں کے اضلاع میں ۱۵ اکتوبر سے جوار اور باجرے کی خرید و فروخت اور نقل و حرکت ممنوع قرار دے دی ہے۔

یو۔پی جو کاشتکار آبپاشی کے لئے کنوئیں تعمیر کرنا چاہیں حکومت نے ان کو ۵۰۰ روپے فی کنواں امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے اور یہ امداد صرف ان کاشتکاروں کو دی جائے گی۔ جن کے پاس کم از کم پانچ ایکڑ اور زیادہ سے دس ایکڑ اراضی ہوگی۔ حکومت نے اس برس ساڑھے بیس ہزار اور آئندہ برس پچاس ہزار کنوئیں تعمیر کرانے کا تہیہ کیا ہے۔ یو۔پی کی حکومت نے کھانڈ کے کارخانوں میں جو کھانڈ کے ذخیرے روک رکھے تھے انہیں سے مزید ایک لاکھ لوتے ہزار من مازہ کھانڈ صوبے میں تقسیم کی اجازت دے دی ہے۔

بمبئی حکومت نے ۱۴ اکتوبر سے زیادہ کھانڈ بغیر پہلے سے اطلاع دیئے اپنے پاس جمع کرنا خلاف قانون قرار دے دیا ہے۔ بمبئی شہر میں سات آنے فی پونڈ سے زیادہ نرخ پر کھانڈ فروخت کرنا جرم قرار دیدیا ہے۔ فصلوں کو جنگلی جانوروں سے بچانے کیلئے دیہاتیوں کو بندوق کلب قائم کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ کاشتکاروں کو جنگلی جانوروں کا شکار کرنے کی تربیت دینے کے لئے کئی اضلاع میں شکاری عملہ مقرر کیا جا چکا ہے۔ حکومت ان کلبوں کو مالی امداد بھی دے گی۔

مغربی بنگال حکومت نے کلکتے کے صنعتی رقبوں میں کھانڈ کو راشن شدہ اشیا میں شامل کر دیا ہے۔

پیداوار میں دس لاکھ ٹن کا اضافہ

انٹرنیشنل بینک سے جو ایک کروڑ روپیہ کا قرضہ ملا اس کے نتیجہ میں حکومت ہند نے ملک میں خوراک کی پیداوار کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے جو منصوبہ تیار کیا ہے اب اس کی تفصیلات دستیاب ہو گئی ہیں۔

وزارت زراعت کے ایک افسر نے بتایا کہ آئندہ سات سال کے عرصہ میں ۳۰ لاکھ ایکڑ بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنا کر ۱۰ لاکھ ٹن سالانہ کے اضافہ کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ انٹرنیشنل بینک سے قرضہ حاصل کرنے کے باعث ہندوستان امریکہ سے ٹریکٹر اور دیگر لوازمات خریدنے کے لئے ڈالر حاصل کر سکے گا۔ اور غیر ڈالر والے علاقوں سے بھاری ہل۔ کارگاہ کے لئے مشینیں وغیرہ خرید سکے گا۔

جنوری سے مئی سنہ ۱۹۵۰ء تک کی فصل میں ۱۸۰ ٹریکٹروں کو کام پر لگائے جانے کی توقع ہے۔ اس میں سے زیادہ تعداد یعنی ۱۵۰ صوبہ متوسط اور برار میں کام کریں گے۔ اس کے بعد ۱۰۵ مدھیہ بھارت میں اور ۶۰ بھوپال اور باقی بندھیلکھنڈ میں استعمال کئے جائیں گے۔ اور ۳۰ ٹریکٹروں سے صوبہ متحدہ میں ترائی کے علاقہ کا جنگل صاف کرنے کا کام لیا جائے گا۔

امید ہے کہ انٹرنیشنل بینک کے قرضہ سے جو ۳۷۵ ٹریکٹر خریدے گئے ہیں وہ جنوری سے مئی سنہ ۱۹۵۱ء کے موسم میں کام کرنے لگیں گے اور اس طرح سے آئندہ ۵ سال میں ۴ لاکھ ۸۰ ہزار ایکڑ زمین سالانہ زیر کاشت آ جائے گی۔

رفتارِ زمانہ

۲۶ر نومبر کو ہند پارلیمنٹ میں آزاد ہندوستان کا نیا آئین منظور ہوگیا۔ اور آئین ساز اسمبلی کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اس پر اپنے دستخط ثبت کردیے۔ اس موقع پر ہاؤس میں جوش و خروش کے نہایت دل خوش کن مناظر دیکھنے میں آئے۔ "مہاتما گاندھی کی جے" اور بندے ماترم کے نعروں سے ایوان گونج اٹھا، اور جن من گن کا گیت گایا گیا۔ پنڈت نہرو کی تحریک پر پارلیمنٹ کے تمام ممبروں نے صاحبِ صدر سے ہاتھ ملائے۔ آئین کے قانون بن جانے کا اعلان کرتے ہوئے صاحبِ صدر نے ہاؤس کو مبارک باد دی۔ اور فرمایا کہ ہمارے لئے یہ نہایت خوشی اور فخر کا مقام ہے کہ مختلف مذاہب۔ فرقہ جات اور الگ الگ زبانوں کے بولنے والے ۳۴ کروڑ ہندوستانی ایک نظام کے تحت آگئے ہیں۔ آئین کی کچھ دفعات فی الفور نافذ کردی جائیں گی۔

نظام حیدرآباد نے ایک فرمان میں اعلان کیا ہے کہ ریاست حیدرآباد ہند یونین میں شامل ہوگئی ہے۔ فرمان میں کہا گیا ہے کہ یہ بات ریاست کے بہترین مفاد میں ہے اور در اصل سیاسی، اقتصادی اور جغرافیائی طور پر ہندوستان کا ہی ایک حصہ ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ریاست اور ہندوستان میں ایک مشترکہ آئینی رشتہ قائم کیا جائے۔ اس طرح حیدرآباد کے باشندے متحدہ اور جمہوری ہندوستان میں باعزت طور پر شریک ہوجائیں گے۔

پنڈت جواہرلال نہرو کے امریکہ سے واپس آنے پر ان کے تئیں تمام ہندوستانیوں کے دلوں میں جوشِ عقیدت امڈ پڑا۔ بمبئی کے ساحل پر اترتے ہی لاکھوں اشخاص نے ان کا پُر جوش سواگت کیا اور ایک عظیم الشان جلسے میں انھیں سونے کی بنی ہوئی اشوک کی لاٹ محبت کے تحفے کے طور پر پیش کی گئی۔

پنڈت نہرو کی امریکہ میں جو عزت افزائی کی گئی اس کے سلسلے میں صدر ٹرومین کو ایک خط تحریر کرتے ہوئے پنڈت جی نے امید ظاہر کی ہے کہ ان کے اس دورے سے امریکہ اور ہندوستان کے تعلقات مزید گہرے ہوجائیں گے۔ انھوں نے مزید لکھا ہے کہ جس طریقے پر امریکہ نواسیوں نے ان کا استقبال کیا ہے اس کا ہندوستانیوں کے دلوں پر گہرا اثر پڑا ہے۔ پردھان ٹرومین نے پنڈت جی کے اس خط کے جواب میں لکھا ہے کہ آپ کی امریکہ میں آمد نہ صرف میرے لیے بلکہ تمام امریکہ نواسیوں کے لئے خوشی کا باعث بنی ہے۔

ہند کی آئین ساز اسمبلی میں آئین کی تیسری خواندگی ختم ہونے پر وزیر قانون ڈاکٹر امبیدکر نے ایک تقریر کی جس میں انھوں نے کہا کہ ملک میں جو خامیاں اور برائیاں ہیں انھیں جلد از جلد دور کرنے کے لئے جد و جہد کی جائے۔ آپ نے اپیل کی ہر ہندوستانی آزادی کی حفاظت کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے کے لئے تیار رہے۔

اب آئین ساز اسمبلی کے اجلاس میں ۲۵ر جنوری ۱۹۵۰ء کو آزاد ہندوستان کے پہلے صدر کا انتخاب عمل میں لایا جائے گا۔ اور ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کو ہندوستان ایک آزاد ری پبلک بن جائے گا۔

مہاراجہ میسور نے اعلان کیا ہے کہ ریاست میسور کو ہند یونین میں شامل کردیا گیا ہے۔ اعلان میں بتایا گیا ہے کہ جو آئین ہند کی آئین ساز اسمبلی کی طرف سے نافذ کیا جائے گا۔ وہی آئین ریاست میں بھی لاگو ہوگا۔ ۱۵ر دسمبر کو میسور لیجسلیٹو کونسل اور نمائندہ اسمبلی دونوں کو ختم کردیا جائے گا۔

سکھ لیڈر گیانی کرتار سنگھ ایم ایل اے نے ایک علیحدہ سکھ صوبے کی پُر زور مخالفت کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ مطالبہ نہ صرف قومی اصولوں کے خلاف ہے بلکہ یہ سکھ پنتھ کے مفاد کے لئے بھی نقصان دہ ہے۔ پنجاب کی مزید تقسیم سکھوں کی پوزیشن کو بٹوارے کے بعد کی پوزیشن سے بھی بدتر بنا دیگی۔ ہندوستان ایسے جمہوری اور سیکولر ملک میں اس قسم کا مطالبہ سراسر لغو ہے۔

اٹلی میں ہندوستان کے سفیر دیوان رام لال ۲۰ نومبر کو رات کے ساڑھے تین بجے حرکت قلب کے بند ہونے سے انتقال کر گئے۔ دیوان صاحب سفیر مقرر ہونے سے پیشتر پوربی پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ اُن کی عمر ۶۲ سال تھی۔ روم میں اُن کی آخری رسوم فوجی اعزاز کے ساتھ ادا کی گئیں۔ اس موقع پر برطانیہ و روس کے سفیر اور اٹلی کے وزیر خارجہ موجود تھے۔ ہندوستان میں اُن کی وفات پر گہرے رنج کا اظہار کیا گیا۔

اس وقت دنیا کی تباہی کے لئے مختلف اقسام کے خوفناک جنگی ہتھیار اور ایٹم بم تیار کئے جا رہے ہیں۔ لیکن اس نازک دور میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو دنیا کو بچانے کی دوڑ دھوپ میں مصروف ہیں۔ سنسار کے ان گروہوں امن پسند لوگوں کی طرف سے مہاتما گاندھی جی کی پوتر بھومی و مہاکوی ٹیگور کے شانتی نکیتن میں دنیا بھر کے ۳۴ مختلف ممالک کے ۵۰ نمائندوں کا ایک اجلاس یکم دسمبر کو منعقد کیا جا رہا ہے جس کی بنیاد سچائی، اہنسا اور بنی نوع انسان کی برابری پر قائم کی جائے گی۔

انڈونیشیا کو مکمل طور پر آزادی ملنے کے بعد اب انڈونیشیا کے لیڈر حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے زور شور سے تیاریاں کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر حطا نے اس سلسلے میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ نئی بننے والی حکومت کا سب سے پہلا فرض امن قائم رکھنا اور قانون کا احترام کرانا ہوگا۔

قاہرہ میں عرب ممالک کے نمائندوں کا پندرہ روزہ اجلاس ختم ہو گیا ہے۔ اس اجلاس میں عراق کے نمائندے نے تحریک کی کہ باہر کے حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لئے متحدہ کمان کے ماتحت مشترکہ فوج رکھی جائے۔ مصر نے یہ قرارداد پیش کی کہ کسی ایک عرب ملک پر حملہ تمام عرب ممالک پر حملہ سمجھا جائے۔ اور سب عرب ممالک اس کے خلاف متحدہ کارروائی کریں۔

۲۲ نومبر کو آل انڈیا ہندی پریشد کے سمیلن میں بھاشن دیتے ہوئے بھارت سرکار کے منتری شری آر آر دیواکر نے کہا کہ ہندی کو راشٹریہ اور سرکاری بھاشا بنائے جانے کے بعد ہندی کے حامیوں پر بڑی ذمہ داری آ پڑی ہے۔ کوئی زبان لوگوں پر زبردستی نہیں ٹھونسی جا سکتی۔ ایک زبان کو اچھی اور دوسری کو بُری کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ میں تو یہی کہوں گا کہ ہم سب کو مل کر ہندی کو بھارت کی چودہ بھاشاؤں کے سہیوگ سے ایسی بھاشا بنا دیں کہ وہ تربینی کی طرح پوتر اور صاف ہو جائے۔ جو لوگ آج ہندی کے سوال کو لے کر جھگڑا کھڑا کرنا چاہتے ہیں یا کرتے ہیں وہ ہندی کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ میں اُن بھائیوں سے نویدن کروں گا کہ وہ اپنے ودروھوں کو ختم کر دیں یا انگریزی کی ایک کہاوت کے مطابق پُرانی باتوں کو بھول جائیں اور سب مل کر ملکی اور قومی بھاشا کے سچے سیوک بن جائیں۔

نیویارک کے مشہور اخبار نیویارک ٹائمز مورخہ ۲۶ ستمبر کی اشاعت میں کشمیر کے جھگڑے کے سمبندھ میں دور یورپ کے ایک مبصر مسٹر لارسن کا ایک خط چھپا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص سلامتی کونسل کے کشمیر کمیشن کی کارروائی کا مطالعہ کرتے تو اُسے معلوم ہو جائے گا کہ بھارت ہمیشہ سلامتی کونسل کے پرستاؤں کا پابند رہا اور وہ پاکستان کی چالوں اور اُس کی ناجائز پسندی کو سہن کرتا رہا۔ مسٹر لارسن مزید لکھتے ہیں کہ پاکستان نے جو کچھ کیا وہ جارحانہ کارروائی سے کم نہ تھا چنانچہ کشمیر کمیشن نے ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کے پرستاؤ میں ناطرف دار رائے شماری کے لئے کشمیر کو پاکستانی حملہ آوروں سے صاف کرنا ضروری قرار دیا۔ پاکستان بہت دیر تک اِس بات سے انکار کرتا رہا کہ کشمیر میں پاکستانی فوج موجود ہے لیکن آخرکار اُسے یہ بات ماننی ہی پڑی۔ مسٹر لارسن نے آخر میں اپنی اِس قطعی رائے کا اظہار کیا ہے کہ پاکستانی حملہ آوروں کو ہٹانے میں آنا کانی کرتے ہوئے پاکستان صریحاً ایک آزاد اور غیر جانبدار رائے شماری کو روک رہا ہے اور کشمیر میں جو شورش ہوئی اُس کے منصوبے کشمیر سے باہر کے پاکستانی نیتاؤں نے تیار کئے اور انہیں ترقی دی اور پاکستان اب بھی قابلِ اعتراض باتیں کر رہا ہے۔

ہندوستان کے طول و عرض میں بریگیڈیئر گھنیا لال اٹل آفیسر کمانڈنگ لکھنؤ ایریا کے اچانک سورگباش ہونے کی خبر نہایت رنج و افسوس کے ساتھ سنی گئی۔ پنڈت نہرو نے اُن کی وفات پر ایک سندیش کے دوران میں اشوک پرگٹ کرتے ہوئے کشمیر کے مورچے پر اُن کی بہادرانہ خدمات کو سراہا ہے۔

ہز ایکسیلینسی شری راجگوپال آچاریہ ہز ہائنس سلطان مسقط کے ساتھ
گورنمنٹ ہاؤس نئی دہلی میں ۔

Regd. No. D.--21.

Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi.
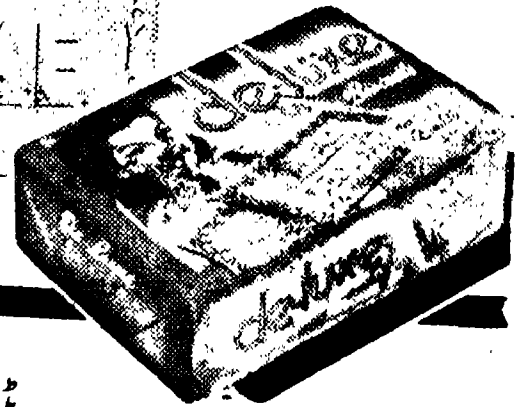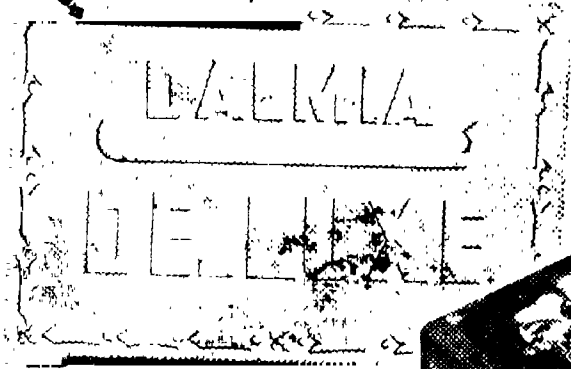
آج کل

جنوری سنہ ۱۹۵۰ء

آٹھ آنے
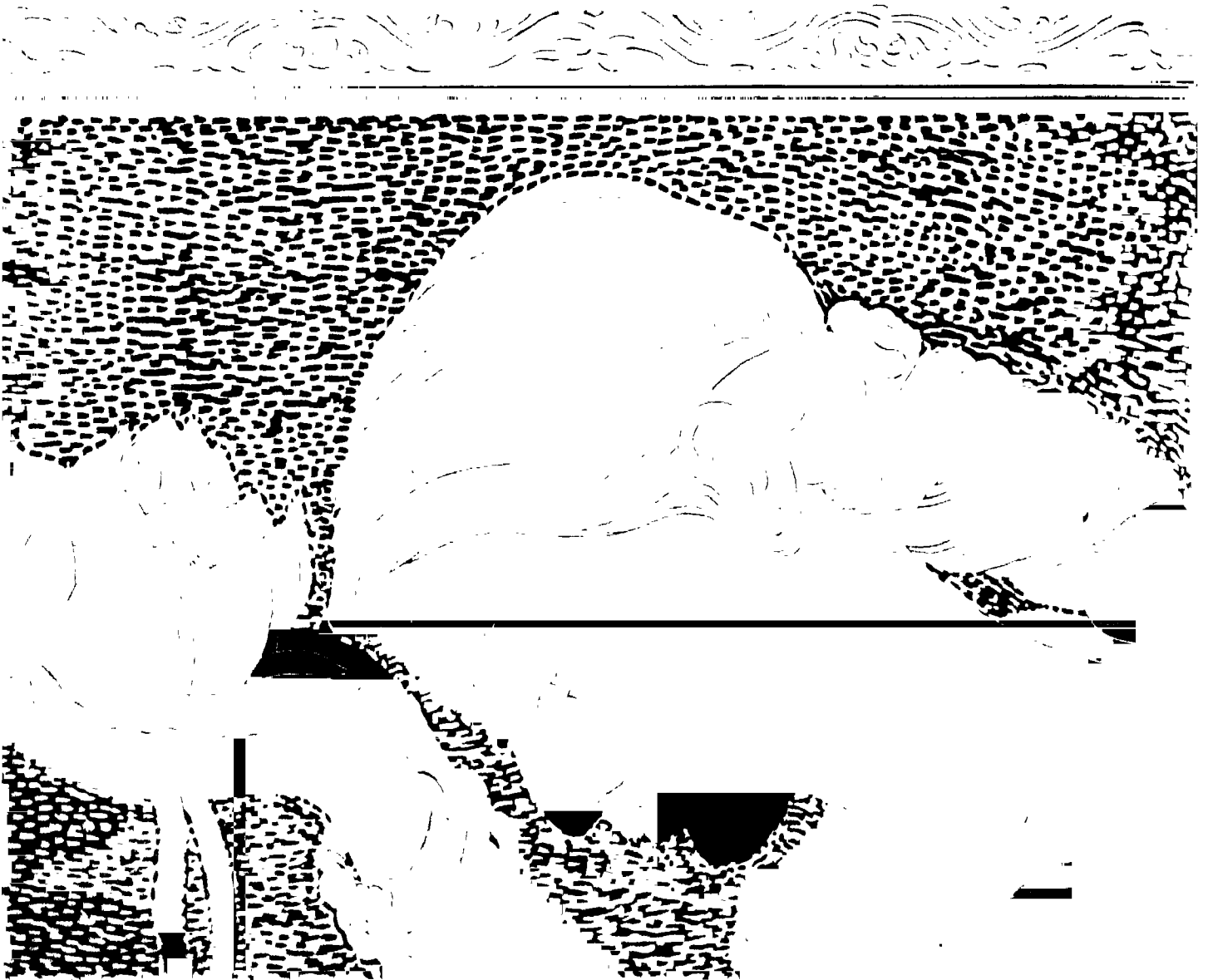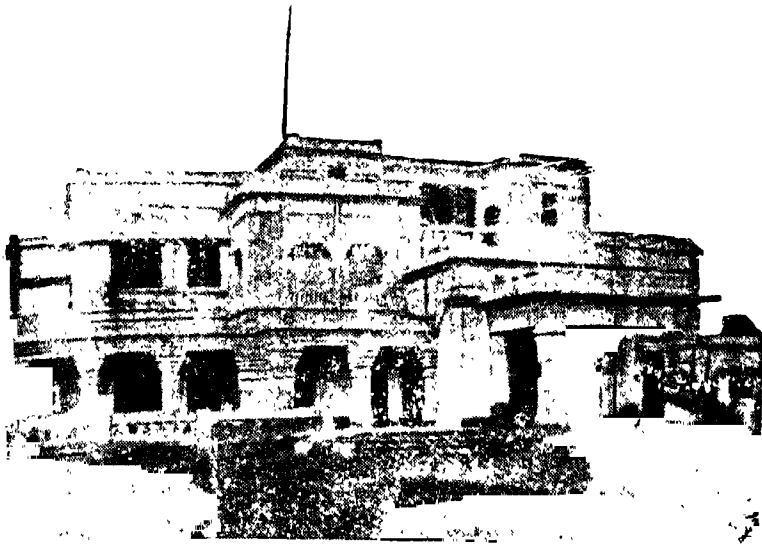
شانتی نکیتن

یہ تصویریں شانتی نکتین کے متعلق ہیں اوپر کی تصویر میں لڑکیاں بسنت کا تیوہار منا رہی ہیں۔ بائیں طرف اوپر گورودیو کے رہنے کا مکان ہے۔ وسط کی تصویر میں موسیقی کا ایک طالب علم وینا بجا رہا ہے۔ نیچے کی تصویر میں کشیدہ کاری کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

شانتی نکیتن کے متعلق ایک مختصر مضمون ۳۳ صفحے پر ملاحظہ فرمائیے۔

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آجکل

دہلی

ایڈیٹر۔ جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر۔ عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد
بلونت سنگھ

جلد ۸ ——— نمبر ۹
سالانہ چندہ ——— چھ روپے
فی پرچہ ——— آٹھ آنے

جنوری سنہ ۱۹۵۰ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

ترتیب

علی حماد عباسی

جدید ہندی ادب کی ایک جھلک

جدید ہندی ادب کا تصور ذہن میں لاتے ہی ہماری آنکھوں کے سامنے روشنی کے دو منارے ابھرتے ہیں، جن کی روشنی سے جدید ہندی ادب کی شاہراہوں پر اجالا پھیلا ہوا ہے۔ ان کو تعمیر ہوئے اگرچہ ایک طویل مدت گذر چکی ہے لیکن پہلے کی طرح ان کی عظمت اور اہمیت آج بھی جوان ہے۔ اس سے ہماری مراد جے شنکر پرشاد آنجہانی کی مشہور اور معرکۃ الآرا شاعرانہ تصنیف "کامایَنی" اور منشی پریم چند مرحوم کا عظیم اور لاجواب ناول "گئو دان" ہے۔

جے شنکر پرشاد جی کی "کامایَنی" کے متعلق بعض نقادوں کا خیال ہے کہ یہ ماضی، حال اور مستقبل کو روحانیت کے دھاگوں سے بنی ہوئی ایک ہی ڈور میں باندھنے کی کسی حد تک کامیاب کوشش ہے، اور جس کے لئے ان سے پہلے بھی ہندی کے کچھ دوسرے ادیبوں نے تھوڑی بہت کوشش کی تھی۔ پرشاد جی کی یہ تصنیف ہندی زبان کا ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے جس میں انھوں نے بڑی چابکدستی کے ساتھ اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ انسانی دل و دماغ کا انھوں نے بہت ہی گہرا اور وسیع مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے اس میں ان تمام سیاسی، سماجی، معاشرتی اور نفسیاتی سوالات کو حل کرنے کی کوشش کی ہے جو قدیم زمانے سے لے کر آج تک انسان کے دماغ کو پریشان کرتے آئے ہیں، اور آج بھی دنیا کے بسنے والوں کو انھیں سوالات کو اچھے سے اچھے طریقے پر حل کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ موت و حیات پر بھی ان کے خیالات بڑے گمبھیر اور معنی خیز ہیں اور اپنی نظریاتی بلندی کے لحاظ سے وہ قدیم ہندی فلسفے کی اونچی چوٹیوں کو چھوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہندی کے مشہور ناولسٹ الاچندر جوشی کا کہنا ہے کہ "کامایَنی" میں مہابھارت کی شان، کالیداس کی عظمت اور موجودہ دور کی حقیقت نگاری پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں یونانی ٹریجڈی کا گہرا رنگ، گوئٹے کا عظیم دماغ، ورڈس ورتھ کی عارفانہ دانش مندی، شیلی کا انقلابی اور ذہنی آدرش، کیٹس کا بلند پایہ جمالیاتی تصور، ٹینی سن کی خوشگوار غم پسندی، ڈی ایس لارنس اور ٹی ایس ایلیٹ کی نرم و نازک تجزیاتی رمزیت کا ایک حسین اور فن کارانہ امتزاج بھی ملتا ہے۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو "کامایَنی" جدید ہندی شاعری میں ایک بہت ہی اہم سنگ میل ہے۔ اگرچہ آج کل کے ادب کو خالص افادی اور سماجی نقطۂ نظر سے دیکھنے والے کچھ نقادوں نے پرشاد جی پر عینیت اور رہس واد (تصوف) کا الزام لگایا ہے جو کسی حد تک درست بھی ہے، لیکن اس بات کو مانتے ہوئے بھی ان کے عظیم شاہکار "کامایَنی" کا رتبہ کسی طرح بھی گھٹایا نہیں جا سکتا۔ جدید ہندی ادب پر ان کے اثرات اور احسانات دونوں ہی بہت زیادہ ہیں۔

منشی پریم چند کی آمد سے اردو ناول نگاری اور افسانہ نویسی نے جو زبردست کروٹ لی تھی اس سے تو اردو ادب سے تھوڑی سی بھی جانکاری رکھنے والے بخوبی واقف ہوں گے۔ ہندی ادب میں بھی ان کی آمد سے واقفیت اور جمہوریت کا آغاز ہوتا ہے۔ انھوں نے ماضی کے تمام ناول نگاروں کے جلائے ہوئے چراغوں کو بجھا کے موضوع اور ہیئت کے نئے چراغ روشن کئے اور اپنی کوششوں سے ہندی ناول نگاری کے فن کو معراج تک پہنچا دیا۔ اپنے فن کے بارے میں خود ان کا یہ کہنا ہے کہ "میں محض واقعے کے اظہار کے لئے نہیں لکھتا۔ میں اس میں کسی فلسفیانہ جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ ختم ہونے کے بعد میں خود اس کو پڑھتا ہوں۔ اگر اس میں کچھ ندرت، کچھ جدت، کچھ حقیقت

کی تازگی، کچھ حرکت پیدا کرنے کی قوت کا احساس پیدا ہوتا ہے تو میں اس کو کامیاب سمجھتا ہوں ورنہ سمجھتا ہوں کہ فیل ہو گیا۔" ان کا ناول "گئو دان" ہندی کے جدید افسانوی ادب میں بہت ہی بلند مقام رکھتا ہے۔ اس میں انھوں نے ہندوستان کی دیہاتی زندگی کی بڑی ہی فنکارانہ عکاسی کی ہے اور دوسرے ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں کو انھوں نے یہ ناول لکھ کر زندگی کو قریب سے دیکھنے، چھونے، پرکھنے اور برتنے کی سب سے پہلے دعوت دی ہے۔ چنانچہ اسی اولیت کی بنا پر منشی پریم چند بجائے خود ایک ادارہ ہیں اور آج کل ہندی کا ہر ناولسٹ ان سے کسی نہ کسی طور پر ضرور متاثر نظر آتا ہے۔ جوں جوں پڑھنے اور لکھنے والوں کا سماجی شعور بڑھتا جاتا ہے اور ان کے اندر سماجی ذمہ داری کا احساس بیدار ہوتا جاتا ہے۔ منشی پریم چند کا مرتبہ ہندی اور اردو ادب میں اور بلند ہوتا جاتا ہے۔

جدید ہندی ادب پر نظر ڈالتے ہی جو چیز اپنی طرف فوراً ہی متوجہ کر لیتی ہے وہ ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں کی بھرمار ہے۔ ہر مہینے پابندی کے ساتھ شائع ہونے والے رسالوں کے اوراق الٹنے پر ہم کو بہت سے لکھنے والوں کے نام زبانی یاد ہو جائیں گے۔ بازار میں کسی کتب فروش کی دوکان پر ہم چلے جائیں وہاں بہت ہی دیدہ زیب جلد پوشوں سے مزین ان گنت ناولوں اور افسانوں کے مجموعوں کا ایک انبار لگا ہوا ملے گا۔ لیکن اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ ان میں سے کتنی کتابوں نے افسانوی ادب میں کوئی معمولی سا بھی اضافہ کیا ہے تو جواب یقیناً "بہت زیادہ امید افزا نہیں ملے گا۔ بات اصل یہ ہے کہ ہندی میں بھی اسعد کی طرح ایم۔ اسلم اور رشید اختر زیادہ ہیں اور کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے سے عظیم فنکار کم۔ پھر بھی ہندی میں ایسے فنکار ضرور ہیں، اگرچہ تھوڑے ہی سہی، جن کی ادبی کاوشیں ہندی کے جدید افسانوی ادب کے لئے باعثِ ناز اور سرمایۂ افتخار ہیں۔

س سلسلے میں ہم سب سے پہلے اوپندر ناتھ اشک کا نام لینا
ہے۔ اگرچہ دن بدن ان کا نام ایک ڈرامہ نگار کی حیثیت سے زیادہ
رہا ہے کیونکہ تمام نقاد اس بات پر متفقہ طور پر متحد ہیں کہ ان کی
پورے طور پر ڈراموں ہی میں کھلتے ہیں۔ تاہم ان کے ناول اور

افسانے بھی طرز بیان، موضوع کے صحیح چناؤ اور واقعہ نگاری میں توازن کے ساتھ فنکارانہ رنگ آمیزی کی بنا پر خاص اہمیت کے مالک ہوتے ہیں انھوں نے موجودہ سماج کی جھوٹی قدروں اور برائیوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ بے نقاب کرکے اپنے بے پناہ طنز سے ان پر اتنے تیکھے اور زوردار تیر مارے ہیں کہ ان کے ادبی شہپاروں کو پڑھ کر پرانے خیال کے لوگ چیخ اٹھتے ہیں۔ ان کا طنز اتنا بے باک، ان کا نفسیاتی تجزیہ اتنا پر خلوص، ان کا مشاہدہ اتنا باریک ہے کہ اس کی مثال کسی دوسرے ادیب کے یہاں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ وہ منشی پریم چند کی طرح اردو ہندی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں اور ان کا شمار دونوں میں صف اوّل کے لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ ان کا پہلا ناول "ستاروں کے کھیل" اپنے موضوع اور فن کے لحاظ سے اچھوتا ہے۔ اس کی ہیروئن لتا کالج کی ایک ایسی لڑکی ہے جس کو اس کے والد نے پوری آزادی دے رکھی ہے، لیکن آزادی کی اس نعمت سے وہ خاطر خواہ فائدہ اٹھا نہیں پاتی۔ زندگی کے مسائل کو وہ ٹھیک طور پر سمجھ نہیں پاتی اور اچھے برے لوگوں کی تمیز کرنے میں اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس ناول میں اشک نے کالج کے اندر اور اس کے باہر کا ماحول پیش کیا ہے۔ یوں تو بظاہر لتا کالج کے اندرونی ماحول کی پروردہ ایک رومانی لڑکی ہے لیکن اس کی چہار دیواری سے باہر نکلنے پر وہ ایک سنجیدہ عورت میں تبدیل ہو جاتی ہے، پھر آہستہ آہستہ اس کے دل میں جنونِ شوق کی آگ مدھم پڑتی جاتی ہے، اور اس کا اصلی روپ نمودار ہوتا جاتا ہے، اور ناول کا ایک اہم کردار منی لال جو اپاہج تھا، اپنی جان دے کر لتا پر زندگی کی حقیقت کو روشن کر دیتا ہے۔ اور جس کی پاداش میں ناول کے اختتام پر لتا رانی کے ہاتھ کو امرت رائے کے ہاتھ میں تھما کر مر جاتی ہے اور کہانی کی یہی کامیاب تکمیل اشک کو بڑا فنکار بنا دیتی ہے۔ ان کا دوسرا ناول "گرتی دیواریں" جو ابھی حال ہی میں ہندی میں شائع ہوا ہے۔ اور اردو میں ابھی زیر طبع ہے، اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں میں ہندی کے سب سے اچھے ناول نگار ہیں۔ اس میں انھوں نے کرداروں کو براہِ راست زندگی سے لے کر، ان کے تخیلات، ان کے غم و نشاط، ان کے رہن سہن اور ان کی الجھنوں

کا ایک دلکش لیکن اصلیت سے مطابقت رکھنے والا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس میں بھی ان کی سب سے اہم اور امتیازی خصوصیت طنز نگاری نے اپنا پورا کام کیا ہے، اور جو ان کی تمام تصنیفات کا ضروری جزو ہے۔ ادب کی ترقی پسند تحریک نے ان کو درمیانی طبقے کے افراد کے مسائل کو سمجھنے اور ان کے کرداروں کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کرنے میں کافی مدد دی ہے۔

اشک کے بعد ہندی کے اچھے کتھا کاروں میں یشپال کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ان کا اپنے سماجی اور سیاسی نظریات کا دوسروں کے سامنے رکھنے کا ڈھنگ بہت ہی پیارا اور پرکشش ہے۔ اپنے خیالات کو کہانی کی صورت میں پیش کرکے وہ اپنی باتوں کو ہر پڑھنے والے سے بڑی آسانی کے ساتھ منوا لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ان کے بعض مشہور ناولوں کو صرف سیاسی تبلیغ کا آلۂ کار سمجھتے ہیں، لیکن ہمارے خیال میں یہ درست نہیں ہے۔ ان کے سب سے مشہور سیاسی ناول "دیش دروہی" (غدار) کا ہیرو "کاروبار دلِ ناداں" کا بھی ماہر ہے۔ اس طرح ان کا فن سیاسی سازشوں کا سب سے اچھا عکاس ہوتے ہوئے بھی کسی حد تک رومانی ہے۔

ادھر کچھ دنوں سے بھگوتی چرن ورما بھی ناول نگاری کے فن میں بڑے کامیاب تجربے کرنے لگے ہیں۔ اور دھیرے دھیرے لوگوں کی توجہ ان کی طرف منعطف ہوتی جا رہی ہے۔ ان کا پہلا ناول "چتر لیکھا" چھپتے ہی نئی پود کا مرکزِ نگاہ بن گیا۔ ان کا دوسرا ناول "تین برس" بھی عام طور پر پسند کیا گیا تھا۔ لیکن ان کے جدید ترین ناول "ٹیڑھے میڑھے راستے" میں ان کی فنی سوجھ بوجھ اور ذکاوت نے اپنا پورا رنگ دکھایا ہے۔ اس میں انھوں نے موجودہ دور کی تمام کلچرل اور سیاسی تحریکات کو ناول کے کینوس پر بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ اور غلامی کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی قوم کی آزادی کی جدوجہد اور اس میں ہونے والی مختلف سیاسی گروہوں کی نظریاتی آویزش کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ ان کی غیر جانبداری بہت ہی قابلِ تعریف ہے۔ "ٹیڑھے میڑھے راستے" بلاشبہ بھگوتی چرن ورما کا شاہکار ہے جس میں انھوں نے سیاست کے خشک موضوع کو اپنی قلمی سحر کاری سے رنگین اور دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ ناول لکھ کر انھوں نے ہندی میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ اور ہندی ادب کی ان سے بہت سی آیندہ توقعات وابستہ ہیں۔

ہندی جگت میں الاچندر جوشی اپنے فن کے اعتبار سے ایک منفرد شخصیت کے مالک ہیں۔ اب تک ان کے آدھے درجن سے زیادہ چھوٹے بڑے ناول منظرِ عام پر آ چکے ہیں جس میں "پریت اور چھایا" اور "پردے کی رانی" بہت ہی اہم ہیں۔ ان کو اپنے کرداروں کی نفسیاتی تحلیل میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ وہ خود اپنی تصنیفات پر "نفسیاتی ناول" کا لیبل لگاتے ہیں۔ جوشی کا پہلا ناول "سنیاسی" کتابی صورت میں ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔ حالانکہ اس کے کئی ابواب ہندی کے مشہور ماہانہ رسالہ "وشومتر" میں ۱۹۳۳ء میں قسط وار شائع ہو چکے تھے۔ یہ ناول آپ بیتی کی صورت میں ہے۔ اس کا ہیرو بورژوا طبقے کا ایک ذہین فرد ہے۔ زندگی کے تلخ تجربے اس کو بہت ہی پریشان کر دیتے ہیں۔ اور اسی پریشانی کے عالم میں وہ اپنی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی انانیت کے تار بکھیر ڈالتا ہے آخر میں اس کے تلخ تجربات ایک طرح کی آفاقیت سی اختیار کر لیتے ہیں۔ سنیاسی کے بارے میں جوشی کا ذاتی خیال ہے کہ "یہ نئی پود کا ایک شاندار اور کامیاب المیہ ہے جو نفسیاتی لحاظ سے درست نہیں ہے"۔ "پردے کی رانی" اور "پریت اور چھایا" میں ان کا نفسیاتی مطالعہ "سنیاسی" سے زیادہ گہرا ہے۔ ان کے حال ہی میں شائع شدہ ناول "نرواسن" میں ان کی ناول نگاری کی تکنیک نے کچھ اور آگے قدم بڑھایا ہے۔ اس سے پہلے شائع ہونے والے ناولوں میں کرداروں کی اندرونی دنیا کی عکاسی پر زیادہ زور دیا جاتا تھا، لیکن "نرواست" میں خارجی اثرات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ انہوں نے کچھ کہانیاں بھوت پریت کے متعلق بھی لکھی ہیں۔ اور اس بات کا دعویٰ بھی کیا ہے کہ ان کے کردار انسانوں کی زندگی سے لئے گئے ہیں جو کہ سچی ترقی پسندی ہے۔ اور ان کہانیوں کے ذریعے وہ انسان کے اندر ایک داخلی انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی مثال ان کے کارنامے "کھنڈر کی آتمائیں" سے دی جا سکتی ہے۔ ان کا یہ خیال کہاں تک حقائق پر نظر ڈالتا ہے، ہم اس کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتے، وقت خود اس کا فیصلہ کرے گا۔ کہ ان کا یہ موضوع کتنا پھس پھسا، کھوکھلا اور

بے معنی ہے۔ منشی پریم چند اور جوشی میں وہی رشتہ ہے جو انگریزی کے دو بڑے ڈرامہ نگار شیکسپیئر اور برنارڈ شا میں ہے۔ شا اپنے آگے شیکسپیئر کی عظمت کو "خاک بسر" سمجھتا ہے، اور ان کے ڈراموں کو خرافات سے کچھ زیادہ نہیں سمجھتا۔ بالکل اسی طرح جوشی بھی منشی پریم چند کی عظمت کے منکر ہیں۔ اور ان کے نزدیک پریم چند صرف "یادگار زمانہ" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہندی ادب پر ایک مضمون لکھتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ پریم چند اپنی زندگی ہی میں اس وقت اپنی "ادبی موت" مر چکے تھے۔ جب جنیندر کمار کا ناول "سونیتا" چھپا تھا۔ ان کی رائے میں پریم چند کی تمام تصنیفات ان کے سیاسی اور سماجی خیالات کے ہٹر یونگ ہیں۔ اور ان میں قوت متخیلہ اور دیہاتی زندگی کی "صحیح مصوری" کی سخت کمی ہے اور ان کے ناول اب وہی لوگ پڑھتے ہیں جن کو ڈگری لینے کے لئے امتحانات دینے ہوتے ہیں۔ یہ باتیں ایسی ہیں کہ ہر بامذاق اور صحیح العقل آدمی ان کو سن کر چونک اٹھے گا، اور جوشی صاحب کے حقیقت کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے بیکار ڈھنگ پر اظہارِ افسوس کرنے لگے گا۔ ہمارا ایک مشورہ تو ان کے لئے یہ ہے کہ اپنے ناولوں کے کرداروں کی تحلیل نفسی تو وہ بہت کر چکے، اب ذرا اپنی طرف بھی دھیان دیں کیونکہ ہر ماہر نفسیات سب سے پہلے اپنے نفس کو پرکھنا ضروری سمجھتا ہے۔ اگر وہ اپنی تحلیل نفسی کریں تو ان کو اپنی شخصیت کے آئینے میں احساس کمتری کی سیاہ پرچھائیاں ضرور نظر آئیں گی جو منشی پریم چند کی مسلّمہ اور مانی ہوئی عظمت کے انکار کا اصلی سبب ہیں۔

اوپندر ناتھ اشک، یشپال، بھگوتی چرن ورما اور الا چندر جوشی کے علاوہ ہندی کتھا کاروں میں آگییّے (مصنف "شیکھر")، بھگوتی پرشاد باجپئی (مصنف "دو بہنیں")، امرت لال ناگر، پہاڑی، ہنس راج رہبر (مصنف "دھرتی کی بیٹی")، دیویندر ستیارتھی (جو اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی لکھتے ہیں) کے نام خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ ہندی کے بہت سے شاعر بھی ڈرامے اور کہانیاں لکھتے ہیں، مثلاً "مہا دیوی ورما، پنت اور نرالا وغیرہ" لیکن ان کی شہرت صرف اس لئے ہے کہ ان پر ان کی شاعری کے سایے ہیں۔

یہ تھا ہندی کے جدید افسانوی ادب کا مختصر سا جائزہ۔ اب ہم جدید ہندی شاعری کے مختلف رجحانات پر آتے ہیں۔

یہ تو ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ جدید ہندی کے شعری ادب پر جے شنکر پرشاد جی کے احسانات اور اثرات بہت زیادہ ہیں۔ لیکن اس کھلی ہوئی حقیقت کو مانتے ہوئے بھی ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ان کی موت کے بعد ان کے رنگ میں شاعری کرنے کی کوشش تو ضرور ہوئی مگر صرف تین شاعروں کو چھوڑ کر کوئی بھی پرشاد جی کے تخیلات کی اڑان کو پا نہ سکا۔ ان تینوں شاعروں کے نام مہا دیوی ورما، سمترا نندن پنت اور سوریہ کانت ترپاٹھی "نرالا" ہیں۔ نرالا، پرشاد جی کے ہم عصر بھی رہ چکے ہیں۔ اور ان کی موت کے بعد اپنے بلند پایہ افکار سے ہندی ادب کو مالا مال کر رہے ہیں۔

سمترا نندن پنت کا دیوان "یوگانت" پرشاد جی کی موت کے فوراً ہی بعد شائع ہوا تھا جس نے چھایا وادی (رومانی) شاعری کو بہت ہی سخت چوٹ پہنچائی۔ "یوگانت" کے کچھ ہی دنوں بعد ان کے دو دیوان "گرامیہ" اور "یگ وانی" چھپے جن میں انھوں نے تخیلیت اور رومانیت کی حسین فنکاری کو ایک دم سے خیرباد کہہ دیا۔ اور بعض لوگوں کا تو یہ کہنا ہے کہ "یگ وانی" میں تھوڑا بہت ترقی پسندی کا بھی رنگ پایا جاتا ہے ادھر حال ہی میں ان کے دو نئے دیوان "سورن کرن" اور "سورن دھولی" (سورن یعنی سونا) منظر عام پر آئے ہیں۔ ان میں پنت نے اپنے قدیم چھایا وادی تصورات کو دہرانے کی کوشش تو نہیں کی ہے، البتہ ان دونوں دیوانوں (دواوین) کی اشاعت سے جدید ہندی شاعری ایک عظیم تبدیلی سے ضرور آگاہ ہو گئی ہے۔ اپنی نئی نظموں میں انھوں نے انسانی دماغ کے چھپے ہوئے بھیدوں کو پیش کیا ہے، جو جدید شاعری کے لئے ایک نیا زاویۂ نظر ہے۔

پنت کے علاوہ مہا دیوی ورما بھی جدید ہندی شاعری میں اپنا ایک خاص اور بلند مقام رکھتی ہیں۔ اور ان کے متعلق تو یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہندی میں مہا دیوی اتنی بڑی کوئی دوسری شاعرہ پیدا نہیں ہو سکی۔ اپنے تخیل کی عارفانہ پرواز، اپنے فکر کی گہرائی اور زندگی کی خوبصورت مصوری کے لحاظ سے ان کا وجود لاجواب ہے۔ شاعری کے علاوہ مصوری میں بھی ان کو اچھی خاصی دسترس حاصل ہے۔ ان کی بنائی ہوئی میرا بائی کی تصویر آرٹ کا بہت عمدہ نمونہ ہے اور ان کا

شاہکار بھی۔

جدید ہندی شاعروں کا ذکر کرتے وقت ہم میتھلی شرن گپت اور سیارام شرن گپت کو کسی طرح نظرانداز نہیں کر سکتے۔ ان دونوں بھائیوں کو شاعری شروع کئے ہوئے زمانہ ہوا، لیکن آج بھی ان کے یہاں موضوعات کی فراوانی میں کوئی کمی نہیں دکھائی نہیں پڑتی۔ میتھلی شرن جی کی شاعری میں کلاسکیت پائی جاتی ہے لیکن سیارام شرن جی کا انداز تفکر رومانی اور کافی حد تک ترقی پسندانہ ہے۔ اور دونوں اپنے فنی اعتقادات پر بہت ہی مضبوطی کے ساتھ کاربند ہیں۔

رام کمار ورما کی شاعری ان دنوں انحطاط کی طرف جھکتی جا رہی ہے اور وہ شاعری سے زیادہ ڈرامہ نگاری سے دلچسپی لینے لگے ہیں۔ لیکن نریندر شرما پہلے کی طرح آج بھی اپنے نازک اور شاعرانہ جذبات سے بھرپور کلام سے اپنے قارئین کے دلوں کو مسحور کر رہے ہیں۔ وہ صرف رومانی شاعر ہیں اور ان کے پریم رس سے بھیگے ہوئے شیریں نغمے بہت ہی زیادہ پسند کئے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ نوجوان شاعروں میں بچن بہت ہی مشہور ہیں۔ "مدھوشالا" اور "مدھوبالا" کا خالق بچن جب قومی اور بین الاقوامی واردات پر کچھ لکھتا ہے تو ہر شخص اس حقیقت کا معترف ہو جاتا ہے کہ جو شاعر "مٹی کا تن، مستی کا من، جیون میرا چھن بھر پرچے" کے قسم کی نظمیں لکھ سکتا ہے۔ وہ اپنے خارجی ماحول اور حادثات سے بے خبر نہیں ہے۔ انھوں نے خیام کی رباعیات کا ہندی میں ترجمہ بھی کیا ہے

اس سلسلے میں دنکر، جانکی ولبھ شاستری اور آرسی کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ شاستری اور آرسی خالص رومانی شاعر ہیں۔ اور صرف اپنے ہی دکھ، درد، پیار اور رومان کے متعلق لکھتے ہیں۔ البتہ دنکر کی شاعری بدلتی ہوئی تاریخ کا پوری طرح ساتھ دے رہی ہے۔ اس نے دنیا میں ہونے والی سیاسی، معاشی اور نظریاتی تبدیلیوں کو سمجھ کر ان کو اپنا لیا ہے۔ "کورکشیتر" اسی کا نتیجہ ہے جس میں نئے زمانے کی نئی روح کو بڑے رنگین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

جدید ہندی ادب میں ناول، افسانہ اور شاعری کی ترقی کو مدنظر رکھ کر جب ہم تنقید کی طرف نظر اٹھاتے ہیں تو ہمیں یہ جان کر افسوس ہوتا ہے کہ آج کل ہندی میں مہابیر پرشاد دویدی اور آچاریہ رام چندر شکلا کا سا ایک بھی نقاد موجود نہیں ہے۔ یوں تو تنقید کے موضوع پر شانتی پریہ دویدی، گریش، شیام سندر داس وغیرہ بھی لکھتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کے یہاں فہم و ادراک اور توازن کی سخت کمی ہے۔ البتہ ادھر کچھ دنوں سے ڈاکٹر رام ولاس شرما اور پرکاش چندر گپت کے تنقیدی مضامین اپنی سوجھ بوجھ اور نظریاتی توضیح کی بناء پر اپنی طرف لوگوں کی توجہ کھینچنے لگے ہیں۔ شائد آگے چل کر ان سے جدید ہندی ادب میں تنقید کا خلاء پُر ہو جائے۔

کھانڈ کی پیداوار میں اضافہ

پچھلے سال ہندوستان میں ۱۳۴ کارخانے کھانڈ تیار کرتے تھے۔ ان میں سے ۷۷ کارخانوں نے اب اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ ۱۹۴۸ء کی اس مدت میں ۵۶ کارخانے کام کرتے تھے۔ سب سے زیادہ کارخانے یو۔پی میں کام کر رہے ہیں۔ ان کی تعداد ۳۴ ہے۔ اس کے بعد بہار کے کارخانے ہیں جن کی تعداد ۱۲ ہے۔ اور پھر بمبئی اور دوسرے علاقوں کا درجہ ہے جہاں گیارہ کارخانے کام کر رہے ہیں۔

جوش ملسیانی

شکستِ نارَوا

ہر صاحبِ ذوق اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ شعر میں دلکشی حُسنِ بندش ہی کی مرہونِ منّت ہُوا کرتی ہے۔ مضمون خواہ کتنا ہی پاکیزہ اور کیسا ہی جاذبِ توجّہ ہو۔ جب تک اس کے بیان میں جامع بلیغ اور متناسب الفاظ تلاش نہیں کئے جاتے۔ اور اُن متناسب الفاظ میں حُسنِ ترتیب پر توجہ نہیں کی جاتی۔ مصرعوں کی ساخت میں مصوری۔ ترنم اور روانی کو مقدم نہیں سمجھا جاتا۔ الفاظ کی نشست اور اُن کے در و بست میں پوری احتیاط نہیں کی جاتی۔ اُس وقت تک وہ شعر کامیاب اور جاذبِ نظر نہیں ہو سکتا۔ ان لوازمِ فن میں سے کسی ایک کی فروگذاشت پر مضمون بھی مٹ کر رہ جاتا ہے اور شاعر کی محنت بھی مضحکہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اساتذہ نے حسنِ بندش پر خاص زور دیا ہے اور اچھے شعر کو بہت سی قطع و بُرید ہی کا نتیجہ مانا ہے۔ کسی نے یہ مصرع بالکل بجا کہا ہے۔ ؏

چست جب بندش نہ ہو لطفِ بیاں آتا نہیں

یوں تو ہر ایک بحر میں شاعر کا فرض ہے۔ کہ مصرعوں کو زیادہ سے زیادہ ہموار۔ زیادہ سے زیادہ چست۔ زیادہ سے زیادہ رواں اور بے تکلفانہ انداز میں مرتب کر کے حُسنِ بندش کا حق ادا کرے۔ ان میں ایسی ثقالت ہرگز پیدا نہ ہونے دے۔ جو اس کے کسی حصے کو غیر مترنم بنا رہی ہو۔ لیکن بعض بحریں ایسی بھی ہیں۔ کہ اُن میں الفاظ کی ترتیب اور در و بست کے لئے اور بھی محتاط ہونا لازم ہے۔ ان خاص بحروں میں حسنِ بندش کا تقاضا یہ ہے کہ مصرع کا ہر ایک نصف اپنے مفہوم کے لحاظ سے مکمل ہو اور اگر ہر جگہ ایسا نہ ہو سکے۔ تو کم سے کم اتنا ضرور ہو۔ کہ پہلے نصف کا آخری لفظ اپنے مفہوم کے لئے دوسرے نصف کا محتاج نہ رہے۔ مثلاً اس مصرع کو دیکھئے۔ ؏ اس معمورۂ دنیا میں گُل (زار ہیں اور ویرانے ہیں)

یہاں لفظ گلزار کا ایک حصہ (گُل) پہلے نصف میں رہ گیا ہے اور زار دوسرے نصف میں ہے۔ جو فُرقت زدہ سا اپنے ساتھی کے مُنہ کو تک رہا ہے۔ صرف وزن کا پورا کر دینا شاعر کا کمال نہیں ہوتا۔ مصرع کی روانی بھی تو اس کا خاص فرض ہے۔ یہ روانی حسنِ بندش اور الفاظ کے محل وقوع پر مبنی ہوتی ہے۔ مذکورۂ بالا مصرع ناقص بندش اور عجزِ طبیعت کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔ اس فروگذاشت پر جسے بارِ سماعت کہنا چاہئے ذوقِ صحیح یہی کہے گا۔ کہ مصرع کی ساخت مزید توجہ کی محتاج ہے تھوڑی سی توجہ سے یہ مصرع یوں ہو سکتا تھا۔ ؏

دنیا میں گلزار کہیں ہیں اور کہیں ویرانے ہیں

اس ترمیم سے یہ مصرع بہت چست ہو گیا ہے۔ حرفِ عطف (اور) کی جگہ "ار" بھی نہ کہنا پڑا۔ شروع کے دو لفظ بھی جن میں سے پہلا تو چنداں ضروری بھی نہ تھا۔ خارج ہو گئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اب ہر ایک نصف اپنے مفہوم میں مکمل ہے۔ اب پڑھنے والے یا گانے والے کی زبان گلزار کے پہلے حصے پر نہیں رُکتی۔ اس قسم کے سقم کو اہلِ فن شکستِ ناروا کہتے ہیں۔

اوپر لکھی ہوئی سطروں میں اگرچہ اس سقم کی تشریح کر دی گئی ہے۔ اور مثال سے بھی اسے واضح کر دیا ہے۔ مگر درحقیقت یہ سقم ذوقِ صحیح ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ اور وہی اس خامی کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ ورنہ وہ لوگ جو اس نعمت سے محروم ہیں۔ یا جنہیں اس نعمت کا وافر حصہ نہیں ملا۔ نہیں جان سکتے۔ کہ مصرع مذکور کی ساخت میں کیا خرابی ہے۔ شاعر کے کلام میں بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں۔ جہاں ذوقِ سلیم کا خاص امتحان ہوتا ہے۔ ان میں ایک مقام تو یہی ہے۔ جو ابھی بیان کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک دو مثالیں

اور بھی ملاحظہ فرمائیں۔

مترادف الفاظ کے استعمال میں بھی شاعر کو ذوقِ صحیح کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ مثلاً ع

لو آپ اپنے دام میں صیّاد آ گیا

یہاں دام کی جگہ جال کہیں۔ تو مصرع بے لطف ہو جاتا ہے۔ مگر اس بے لطفی کو عوام ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔ ذوقِ صحیح ہی اس بدذوقی کا اندازہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح یہ مصرع ع

جب نہ دیکھی قوتِ گفتار پوچھا حالِ دل

یہاں قوت کی جگہ طاقت کہنا لازم تھا۔ مگر ذوقِ سلیم اور وجدانِ صحیح کے سوا اس فرق کو اور کون سمجھ سکتا ہے۔ وہی یہ بتا سکتا ہے۔ کہ قوت کی جگہ یہاں طاقت کا استعمال کیوں برمحل ہے۔

الفاظ کی تقدیم و تاخیر میں بھی بعض دفعہ ایک دل چسپ نکتہ سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً اس مصرعے میں ع

گم ہو کے ہم نے پایا رستا تری گلی کا

ان الفاظ میں اگرچہ تقدیم و تاخیر موجود ہے اور شاعر کو آخری حد تک اس سے بچنا چاہئے۔ مگر اس مصرع میں اسے برقرار نہ رکھا جائے اور دوسرے نصف میں تیری گلی کا رستا کہا جائے۔ تو مصرع مٹ کر رہ جاتا ہے۔ حسنِ بندش کے یہ نکات گونگے کا گڑ ہیں۔ کھاؤ اور دل ہی دل میں اس کے مزے لو۔ یہی حال شکستِ ناروا کا ہے۔ اساتذہ چند خاص بحروں میں اس عیب سے بچنا لازم سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ نظیر اکبر آبادی بھی اس سے بچنے کے لئے محتاط نظر آتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی شاعرانہ روش میں بہت کچھ لاابالی ہیں بعض جگہ تو صحتِ لفظی کی پروا بھی نہیں کرتے۔ مثلاً اس مصرعے میں لفظ ذبح کو دیکھئے ع

بے جرم و خطا جس ظالم نے مظلوم ذبح کر ڈالا ہے

اس غیر محتاط روش کے باوجود ان کے یہ اشعار دیکھئے۔ مصرعوں میں شکست کا نشان تک نہیں ہے ؎

کیا شکر مصری قند گری کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے
کیا داکھ منقّہ سونٹھ مرچ کیا کیسر لونگ سپاری ہے

ایک اور بحر میں ان کے دو شعر سنئے ؎

تو اور کی تعریف کر تجھ کو ثنا خوانی ملے
کر مشکل آساں اور کی تجھ کو بھی آسانی ملے
تو اور کو مہمان کر تجھ کو بھی مہمانی ملے
روٹی کھلا روٹی ملے پانی پلا پانی ملے

تینوں مثالوں میں مصرعے کتنے بے ساختہ اور رواں ہیں۔ اُن دوستوں کے لئے جو ترقی پسند ہونے کے دعوے دار ہیں۔ یہ نکاتِ فن شاید بارِ خاطر ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ردیف چھوڑی۔ قافیہ چھوڑا۔ اس کے بعد مصرعوں کی مساوات چھوڑی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حُسنِ بندش کو بھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اس کی پروا کرنا بھی کارِ بے کاراں خیال کیا۔ اس لئے نکاتِ فن کی پروا کرنے والے اہلِ ذوق ہی اس مضمون میں مخاطب صحیح کے جا سکتے ہیں۔ تو مشقوں کے استفادہ کے لئے ان خاص بحروں کو بھی مع مثال بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ یہ مضمون اُن کے لئے تشنۂ بیان نہ رہے اور وہ جان سکیں کہ اس سقم کی مختلف صورتیں کیا ہیں۔ اور کہاں کہاں اس سے بچنے کی ضرورت ہے

۱۔ بحرِ رمل (خبن کے زحاف سے)

غالب۔ یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

امیر مینائی۔ یہ مزا تھا دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی
نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا

امیر خسرو۔ ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف
بہ امید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

عراقی۔ بہ زمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا برآمد
کہ مرا پلید کردی ازیں سجدۂ ریائی

غور کیجئے۔ ان مثالوں میں کسی شعر کا نصف اول ایسا نہیں جس کا کوئی لفظ دوسرے نصف کے الفاظ سے الجھا ہوا اور شکستِ ناروا کا سقم پیدا کرتا ہو۔ اب اس بحر میں معیوب مثالیں بھی دیکھئے جن میں مصرعوں کی روانی شکوہ سنج نظر آتی ہے اور ان کا ترنم بھی پریشان دکھائی دیتا ہے۔

ذوق۔ لبِ نازک اس کا کیوں کر کہو بارِ حرف اُٹھائے

کہ جو صدمۂ تبسم (سے بھی ہے کبود ہوتا)

یہاں دوسرے مصرع میں مجرور یعنی تبسم اپنے حرف جار سے الگ پایا جاتا ہے اگرچہ ذوق کے ہاں اس قسم کی مثالیں النادر کالمعدوم کا حکم رکھتی ہیں۔ مگر پھر بھی بندش کا سقم آخر سقم ہے۔

محروم ۔ مرے شوق نے بہلائے رہیں چمن میں اشک شبنم)
تو اسی سے اس کی رونق رہے اسی سے آبرو ہے)
〃 نظر آگیا کہ سرما (کا شباب ڈھل چکا ہے)
نظر آتی ورنہ برفِ (سرِ کوہ کیوں پگھلتی)

پہلے مصرع میں اجزائے فعل کے ٹکڑے کر دئے ہیں۔ یعنی بہلائے ایک نصف میں اور "ہیں" دوسرے نصف میں جا رہا۔ چوتھے مصرع میں مضاف مع اضافت پہلے نصف میں رہ گیا ہے اور مضاف الیہ دوسرے نصف میں تیسرے مصرع میں سرما (مضاف الیہ) پہلے نصف میں ہے اور مضاف الیہ مع حرف اضافت (کا شباب) دوسرے نصف میں ہے۔ دوسرا مصرع بھی اس سقم سے خالی نہیں۔ اس قسم کے مصرعوں کو بے تکلفی سے پڑھا جائے۔ تو ایسے مقامات صاف طور پر مخلِ نظر ہو جاتے ہیں۔ ذوق سلیم ان کو قبول نہیں کر سکتا ؎

جگر مرادآبادی ۔ مجھے چاکِ جیب و دامن (سے مناسبت نہیں کچھ)
یہ جنون ہی کو مبارک رہ و رسمِ عامیانہ

۲ ۔ بحرِ رجز سالم

ذوق ۔ پیکاں ترا الماس گوں مثہ سُرخ سوفاروں کے لیں
گویا لگا کہ پر اڑا نورِ سحر رنگِ شفق

نوح ناروی ۔ آنے کو آئے فصلِ گل جانے کو جائے ہر برس
ہم غم زدوں کے واسطے جیسے چمن ویسے قفس

نامعلوم ۔ دارم زلبِ نیرنگِ او دل چوں دہانِ تنگِ او
آہ از دلِ چوں سنگِ او وز ناز و خشم و جنگِ او

معیوب مثالیں ؎

سیماب ۔ شاعر کا نصب العین ہرگز ایک ہو سکتا نہیں
وہ رندِ اعظم ہے کہیں اور مصلحِ اعظم کہیں

یہاں ہرگز کے دو ٹکڑے کر دئے ہیں۔ ہر پہلے نصف میں رہ گیا ہے اور گز دوسرے نصف میں۔

سیماب ۔ مجذوب ہے تو ہے حقی (قت فاش اس کے جذب سے
سالک ہے وہ تو ہے چراغِ راہِ اربابِ یقیں)

یہ شعر بھی پہلے شعر کا ہم مشرب ہے

محروم ۔ اوصافِ دل کش سے زمانے کو مسخر کر لیا)
اور فتح دل کے ملک کو بے تیر و خنجر کر لیا

پہلے دو شعروں میں جو خرابی تھی وہی اس میں ہے

۳ ۔ بحرِ رجز (خبن کے زحاف سے)

قاآنی کا وہ مشہور قصیدہ جس کے قافئے چنار ہا۔ غبار ہا۔ شرار ہا۔ تتار ہا وغیرہ ہیں۔ اس بحر میں حُسنِ بندش ۔ الفاظ کی مصوری اور مصرعوں کی بے تکلفی کا شاہ کار ہے۔ اس بحر میں اردو کا یہ مصرع بھی مشہور ہے ع

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

اب معیوب مثالیں دیکھئے ؎

احسان دانش ۔ جنونِ عشق میں ہیں غرق تو یہ نوجوانیاں)
روش روش پہ چھڑ گئیں شباب کی کہانیاں

سیماب ۔ حریمِ دہر میں بطی (ف شمع سی جلی ہوئی)
صنم کدے میں اک شگوفۂ حسیں کھلا ہوا)

نظیر لودہانوی ۔ کسی کے دردِ عشق کو چھپاؤں دل میں کس طرح
جھلک رہا ہے آنسوؤں (میں سرخ رنگ کیا کروں)

فیض جھنجھانوی ۔ دلِ نشاطِ آگہی (میں مستئ شراب تھی)
رُخِ شگفتہ خاطری (پہ غازۂ شباب تھا)

یوسف ظفر ۔ میں اپنی زندگی کی لاش سے لپٹ کے گا چکا)
میں اپنی خواہشوں کی موت پر خوشی منا چکا)

قتیل شفائی ۔ یہ اور بات ہے کہ زند (گی بھنور کی نذر ہو گئی)
وگرنہ تم تو سب کو تی (ر مارتے چلے گئے)

ان مثالوں میں جو شکست موجود ہے۔ وہ فی الواقع وزن پورا کر دینے کے مترادف ہے۔ اور سنئے ؎

ضیا فتح آبادی ۔ پرندے خودی کے گی (ت گا رہے ہیں ہر طرف)
فضاؤں میں پھول کو پھڑ (پھڑا رہے ہیں ہر طرف)

ظفر ادیب ۔ تصورات کے جنو (ں میں ایسا کھو گیا ہوں میں)

نشو و نما ہی اُس سے اور نہ وہ ہے مجھ سے متصل
امد جیت — نشاں نہیں رہا کہیں رہی چشم بے قرار کا)
مٹا ہوا جہاں سے ہے نقش انتظار کا
فرحت کانپوری۔ نہ ہے وجودِ بال و پر خوشا حیات عنصری
میں اُڑ رہا ہوں مشتِ بار دل و پر سے کھیلتا ہوا)

۴۔ بحرِ رجز (خبن اور طے کے زحاف سے)

غالب — گفت بہ حکم حسرتی غالب خستہ ایں غزل
شاد بہ ہیچ مے شود طبع وفا سرشتِ ما
ریاض — ساقی تنگ دل بتا کیوں نہ وہ مجھ تک آسکا
لعل جڑے تھے ایسے کیا ساغر زر نگار میں
" چرخ کا جور مٹ گیا چرخ کا دور مٹ گیا
چرخ تو اور مٹ گیا پڑ کے مرے غبار میں

معیوب مثالیں سے

نہال سیوہاروی۔ آج کدھر وہ غرّۂ (مہر جہاں فروز ہے)
شوخی ذرہ ہائے خاک کہتی ہے ہم سے جنگ کر
" تو ہے جواں ترے لئے ننگ ہے اتباعِ پیر
تیز خرام! رہ بر رسست قدم سے جنگ کر

۵۔ بحرِ کامل سالم

ریاض — کوئی مست مے کدہ آگیا مئے بے خودی وہ پلا گیا
نہ صدائے نغمۂ و بربط نہ حرم سے شورِ اذاں اٹھا
داغ — یہ کہاں کہ بیٹھو ہزار میں تمہیں شرم آتی تھی چار میں
یہ تو وہی ہے ان کا ہے ماجرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
" چڑھے ذہن پر نہ زبان پر مرے چار حرفِ وصال جب
تو پھر آگے کہنے کا لطف کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
مومن — کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
نوح ناروی۔ ہمیں ضد جو ہے تو اسی سے ہے ہمیں کد جو ہے تو اسی سے ہے
اسی دل کی خاک اڑائیں گے کسی در کی خاک اڑائیں کیا
نامعلوم — بہ ہزار غنچہ دمیدہ ام بہ ہزار جلوہ چمیدہ ام
ثمر نہالِ حقیقتم چمن بہارِ خدائیم

معیوب مثالیں سے

اقبال — کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے (ہیں مری جبینِ نیاز میں)
ناجور — تمہیں جانِ فروز بنا کے جس نے جہاں فروز بنا دیا
وہ فروغِ بزمِ جمال کو دن ہے عشق نادرہ کار ہے)
" میں بہارِ عمر کو سوگوار (بہار) رنج کے گزار دوں)
تری یہ رضا ہے تو اس رضا پہ بہارِ عمر نثار ہے)

پہلے شعر کا دوسرا مصرع آسانی سے بدلا جا سکتا تھا۔ مثلاً اس طرح کہا جاتا۔ ع

وہ فروغِ بزمِ جمال تو ہی عشق نادرہ کار ہے

اسی طرح دوسرے شعر کا پہلا مصرع یوں ہو سکتا تھا۔ ع

میں بہارِ عمرِ عزیز کو غم و رنج ہی میں گزار دوں

۶۔ بحرِ منسرح (طے۔ کف اور وقف کے زحاف سے)

غالب — وہ بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا
نامعلوم — دیدۂ عبرت کشا قدرتِ حق را ببیں
شامتِ اعمالِ ما صورتِ نادر گرفت

معیوب مثال۔ صرف ایک مصرع کافی ہے۔ ع

دل کو مرے کھا رہا (ہے یہی غم رات دن)

۷۔ بحرِ ہزج (شتر کے زحاف سے)

غالب — ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
" ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

معیوب مثالیں سے

شعری — اک نگاہِ برہم کے ساتھ ساتھ رہتی ہے)
گردشیں زمانے کی چھین کر زمانے سے
شاد عارفی۔ تم سے ہے بڑی اب تک بن بیاہ بیٹھی ہے

دیکھتی ہے کہنے کی (رسم و راہ بیٹھی ہے)

نوٹ:- دوسرے مصرع میں اور باتوں کو چھوڑیئے۔ صرف شکست ہی کو دیکھئے۔

بحر ہزج (شتر اور قبض کے زحاف سے)

پھر مرے کریم نے گنج زر لٹا دیا
پھر چمن کے فرش کو عرش پر بٹھا دیا
پھر جہانِ آرزو دل ربا بنا دیا
پھر حریم ناز کو آئینہ دکھا دیا

معیوب مثال سے

اندرجیت - کیف کا سماں مری آنکھ میں سما گیا
خون اُبل گیا مرا جوش سر میں آ گیا

۸- بحر ہزج (قرب کے زحاف سے)

نامعلوم - کیوں کر مرے نالوں سے دل نرم ہو اس بت کا
پتھر میں کبھی پانی تاثیر نہیں کرتا

داغ - ساقی تری محفل میں چرچا ہی نہیں مے کا
اس سے تو یہ بہتر تھا کچھ ذکرِ خدا ہوتا

جلیل - زیبا یہ نہ تھا تم کو دل لے کے دغا کرنا
ان ہونٹوں سے کیا کہنا ان ہاتوں سے کیا کرنا

معیوب مثالیں سے

سیماب - انوارِ حقیقت کے تو عرش سے چُن لایا
عالم کو شناسائے (اسرار کیا تو نے)

مقبول حسین احمد پوری - وہ بادلوں کی یورش ہو جائے جو یُوں برہم
اور پھول جھڑیں تاروں (سے چاند ہنسے یکدم)

اندرجیت - خاموش زندگی ہستی (رکا ہوگا رباب اک دن)
موجوں کے تھپیڑے میں ٹوٹے گا حباب اک دن)

آفتاب - ڈرتا ہوں کہیں ساری (محفل نہ تڑپ جائے)
اک سچی محبت کی (تصویر دکھاتا ہوں)

۹- بحر مضارع (خرب کے زحاف سے)

امیر مینائی - آزاد رہ کے ہم نے دن عمر کے گزارے
دو چار دن سفر میں دو چار دن وطن میں

بےخود بدایونی - دل کو تو درد اُلفت ہے مایۂ مسرت
مشکل تو جان کی ہے صدمے تو جان پر ہیں

علی حزیں - اے وائے بر اسیرے کز یاد رفتہ باشد
در دام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد

" شادم کہ بر رقیباں دامن کشاں گزشتی
گو مشتِ خاکِ جانم بر باد رفتہ باشد

سودا - کونین تک تھی ملتی جس دل کی مجھ کو قیمت
قسمت کہ اک نگہ پر میں اس کو ٹال آیا

معیوب مثالیں سے

نخشب - ہر نوجواں کو پیر (صد سال کر دیا ہے)
سبزہ کو کیا چمن کو پامال کر دیا ہے

محروم - غدر و قتال و سازش (کے واسطے ہے موزوں)
قلب سیاہ اس کا ہے تیرگی میں شب گوں

ذوق - پابوس نقشِ پا سے (تیرے جو کنکری ہو)
جا کر فلک پہ اس کو تاروں سے برتری ہو

آفتاب - لرزاں تھا جس کے بچوں (کا نام سن کے عالم)
ہوتا تھا جن کے آگے شیروں کا ختم دم خم

اندرجیت - اے قوس تیرے دل کش (رہونے میں کیا گماں ہے)
تو پر تو جمالِ (خلاقِ دو جہاں ہے)

۱۰- بحر متقارب (المضاعف)

ذوق - تمنا نہیں ہے کہ امدادِ دل کو تپش کا صلہ ہو کہ خود قلق ہو
یہ حق ہے قاتل اگر حق ولائے یہ بسمل ترے پاؤں پر جان تک ہو

اس بحر میں معیوب مثال دستیاب نہیں ہوتی۔

۱۱- بحر متقارب (ثلم کے زحاف سے)

میر رضی - نتواں گزشتن آسان ازاں کو
گل تا بہ گردن گل تا بہ زانو

نامعلوم - شوقِ نظر کو بے تاب کر دو
دل کو جگر کو سیماب کر دو

معیوب مثال دست یاب نہیں ہوئی ۔

۱۲ - بحر متقارب المضاعف (قبض اور ثلم کے زحاف سے)

امیر مینائی ۔ شبیہ مدِ نظر ہے کس کی کہ کوئی پوری نہیں اترتی
مٹا دئے صانعِ ازل نے ہزاروں نقشے بنا بنا کر

نصیر دہلوی ۔ ہنسے ہے کوٹھے پہ یوسف اپنا میں زیرِ دیوار رو رہا ہوں
عزیزو دیکھو مری نظر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

معیوب مثالیں ؎

ذوق ۔ زمیں پہ نورِ قمر کے گرنے (سے صاف ظاہر روشنی ہے)
کہ ہیں جو روشن ضمیران کا (فروغ ان کی فروتنی ہے)

حالی ۔ جہاں میں حالی کسی پہ اپنے رسوا بھروسا نہ کیجئے گا)
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کو رسوا نہ کیجئے گا)

اقبال ۔ سفینۂ برگِ گل بنالے (گا قافلہ مورِ ناتواں کا)

سیماب ۔ تلاطمِ رنگ و بو میں کیف (نظر ہے اک پرشباب جوگن)
جو اپنے ماحول کی خموشی (میں زندگی بن کے چھا رہی ہے)

فیض جھنجھانوی ۔ تری نگاہِ کرم نے ہر اک (چمن کے آئین بدل دئے ہیں)
کبھی خموشی ثواب تھی اب (عذاب ہے گفتگو نہ کرنا)

" بیاں سے کیا خاک شدتِ سوزِ (غم کا اندازہ ہو سکے گا)
گزارشِ حال واقعی ہے مریض کا گفتگو نہ کرنا

جگن ناتھ آزاد ۔ دل و جگر کو کسی کی یاد (حسین نے بخشا ہے وہ سہارا)
کہ اب زمانے کا ہر ستم ہے دل و نظر کے لئے گوارا

نظیر لودیانوی ۔ وہ حکم رانی بھی کوئی شے ہے جو آبرو کھو کے ہاتھ آئے
شریف انساں کو ایسی تحری (کِ حریت سے خدا بچائے)

احسان دانش ۔ کیا ہے میں نے نیاز مندی (سے اک دلِ بے نیاز پیدا)
ضمیرِ فطرت میں میرے سوز (کلام سے ہے گداز پیدا)

علی سردار جعفری ۔ تری ادائیں ہیں کافرانہ نہ تیرے انداز دل ربانہ
تو ہی بتا دے کہاں سے آئیں رگے مجھ کو آداب عاشقانہ

نوٹ ۔ دل ربانہ سے قطع نظر کیجئے اور گے کی شکست کو دیکھئے

۱۳ - بحر متدارک (خبن کے زحاف سے)

اکبر ۔ نہ وہ آس رہی نہ امنگ رہی نہ وہ رندی و زہد کی جنگ رہی
سوئے قبلہ نگاہوں کے رُخ نہ رہے وہ دیر پہ نقش جبیں نہ رہے

ظفر ۔ نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہ رہا

اس بحر میں معیوب مثال نہیں ملی ۔

۱۴ - بحر متدارک (خبن اور قبض کے زحاف سے)

ذوق ۔ اس بحر میں کیا برجستہ غزل اے ذوق یہ تم نے لکھی ہے
ہاں وزن کو جس کے سُن کر شاداں روحِ خلیل و اخفش ہو

اکبر ۔ واعظ نے کہا یہ منبر پر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

بحر متقارب اور متدارک کی دو تین شاخیں اور بھی ایسی ہیں کہ ان میں بھی اس سقم سے بچنے کی ضرورت ہے ۔ مثلاً ؎

(ا) میر تقی ۔ اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

" اب کے بہت ہے شورِ بہاراں ہم کو مت زنجیر کرو
دل کی ہوس ٹک ہم بھی نکالیں دھومیں ہم کو مچانے دو

ذوق ۔ گاہ ہجومِ یاس میں ہے دل گاہ ہجومِ حسرت میں
ہے یہ مردِ سپاہی پیشہ پھرتا لشکر لشکر ہے

معیوب مثالیں ؎

میراجی ۔ یہ بھی رُت ہے مٹ جائے گی ہر رُت آنی جانی ہے
اتنی بات کہ دل بے چے (ن رہے جگ میں لاثانی ہے)

" پریم کتھا کا جادو سننے (والوں کے دل پر چھائے گا)
یہ تو بتاؤ کون سور (ما اب کے ہاتھ لگائے گا)

الطاف مشہدی ۔ ڈوب چلا اپنے اندھیارے (میں پچھم اجیارا)
یہ نکلی امرت شالہ سے زہریلی اک دھارا

(ب) نوح ناروی ۔ رنج خوشی کے عالم میں دیکھا سارے عالم کو
آدھی دنیا ہنستی ہے آدھی دنیا روتی ہے

ساغر ۔ آئی گھٹا جب ساون کی اک افسردہ بول اٹھا
جس میں دل کھل جاتے ہیں وہ برکھا کب ہوتی ہے

(ج) نصیر دہلوی ۔ بال پریشاں ہیں کاکل کے پیچ گلے میں ہیں بگڑی کے

یوں رکھتا ہے وہ متوالا سر پہ طرّہ ہار گلے میں

خلاصہ - اگرچہ شکستِ ناروا کی مختلف صورتیں اس مضمون میں درج کی ہوئی معیوب مثالوں سے ہر شخص مرتب کر سکتا ہے - مگر وہ منتشر صورت میں ہیں - اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے - کہ ان کو بطور فہرست ایک جگہ لکھ دیا جائے - اس سقم سے بچنے کے لئے جن خاص بحروں میں احتیاط کی ضرورت ہے - وہ بحریں تو اس مضمون کو پڑھ کر معلوم ہو جائیں گی اور اس سقم کی جو مختلف صورتیں ہیں - وہ اس فہرست کے ذریعے سے پیش نظر رہ سکیں گی - فہرست یہ ہے -

۱ - اردو کا مرکب اضافی ہو - تو پورا مرکب مصرعے کے نصف میں لانے کی کوشش لازم ہے - یہ نہ ہو کہ مصرعے کا نصفِ اول مضاف الیہ یا حرفِ اضافت پر ختم ہو - اور مضاف یا مضاف مع حرفِ اضافت دوسرے نصف میں جا رہے مضاف کا مع حرفِ اضافت دوسرے نصف میں آنا تو اس سقم کی قبیح صورت ہے -

۲ - فارسی کا مرکب اضافی ہو - تو مصرع اول کا نصف مضاف مع کسرہ پر ختم نہ ہو -

۳ - مرکب توصیفی ہو - تو مصرع کا نصفِ اول صرف موصوف یا فقط صفت پر ختم نہ کیا جائے - دونوں جزو ایک ہی نصف میں شامل ہوں - اگر یہ مرکب فارسی کا ہے - تو مصرع کا نصفِ اول موصوف مع کسرہ پر ختم نہ ہو -

۴ - اشارہ مشارٌ الیہ ہوں - تو مصرع کا نصفِ اول صرف حرفِ اشارہ پر ختم نہ ہو -

۵ - جار مجرور اردو میں ہو - تو نصفِ اول صرف مجرور پر اور فارسی میں ہو - تو صرف حرفِ جار پر ختم نہ ہو جائے -

۶ - عدد معدود ہوں - تو عدد نصفِ اول میں اور معدود نصفِ دوم میں نہ ہو -

۷ - مرکب عطفی اردو ہو - تو نصف اول کا آخری لفظ صرف معطوف نہ ہو - اور نہ وہ حرفِ عطف (اور) پر ختم کیا جائے - اگر یہ مرکب فارسی ہے تو وہ نصفِ اول معطوف یا معطوف مع حرفِ عطف پر ختم نہ ہوتا ہو -

۸ - دوسرے مرکبات مثلاً مستثنیٰ و مستثنیٰ منہ - ندا منادےٰ - بدل و مبدل منہ میں بھی یہی احتیاط لازم ہے -

۹ - اجزائے فعل کے ٹکڑوں میں سے کچھ حصہ پہلے نصف کے آخر میں اور کچھ حصہ دوسرے نصف کے شروع میں نہ لایا جائے مثلاً دیکھا ہے کا پہلا لفظ پہلے نصف کے آخر میں ہو اور ہے دوسرے نصف کے شروع میں -

۱۰ - ایک سالم لفظ کا کچھ حصہ نصفِ اول کے آخر میں ہو اور باقی حصہ نصف ثانی کے شروع میں - مثلاً دیوانہ کا دی ایک نصف میں اور وانہ دوسرے نصف میں -

۱۱ - فاعل نصفِ اول کے آخر میں اور اس کی علامت (نے) دوسرے نصف کے شروع میں -

۱۲ - مفعول نصف اول کے آخر میں اور اس کی علامت (کو) دوسرے نصف کے شروع میں -

نوٹ :- یوں تو یہ تمام صورتیں قبیح ہیں - مگر موخر الذکر چار صورتیں تو بہت ہی قباحت پیدا کرتی ہیں -

اگرچہ ہمارے نومشق یا اوسط درجے کی مشق رکھنے والے شعرا اس مضمون کو پڑھ کر گھبرا جائیں گے - مگر حسنِ بندش اور ذوقِ صحیح دونوں کا تقاضا یہی ہے - کہ مصرعوں میں حسن پیدا کرنے کے مقصد سے وہ اس پابندی کو خوشی سے قبول کریں - کیونکہ اس کے بغیر ان خاص بحروں میں کہے ہوئے مصرعے ہمیشہ بار سماعت رہیں گے -

اس مضمون میں دو تین مستند مشاہیر کی معیوب مثالیں بھی موجود ہیں - اگرچہ اس قسم کی مثالیں ان کے کلام بلاغت نظام میں شاذ و نادر ہیں - اور اُن کو پیش کرنا بھی گستاخانہ روش ہے - مگر اس مضمون کی بنیاد ہی ذوقِ سلیم اور وجدانِ صحیح پر ہے - اس لئے ان قابلِ احترام بزرگوں کی مستند حیثیت کا خیال چھوڑ کر ہمیں اپنے شک و شبہ کا جواب ذوقِ صحیح ہی سے لینا اور اسی کی شہادت کو قولِ فیصل سمجھنا لازم ہے کیونکہ بندش کی خامیوں اور مصرع کے حسن و قبح کو فنّی لحاظ سے صحیح طور پر جاننا اس کے بغیر دشوار ہے -

---

سید برکات احمد

امراؤ جان ادا پر ایک نظر

شعروں کے انتخاب سے شاید غالب کی رسوائی تو نہیں ہوئی۔ لیکن ہیرو اور ہیروئن کے انتخاب سے بعض ناول نویس ضرور رسوا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بقول ایک ناقد کے مرزا محمد ہادی امراؤ جان کے انتخاب سے رسوا ہو گئے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"آل احمد سرور نے فسانۂ آزاد پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ فسانۂ آزاد کی وجہ سے سرشار کا نام زندہ رہا اور سرشار کی وجہ سے اس کی دیگر تصانیف کا۔ لیکن میرے خیال میں یہ فقرہ جتنا امراؤ جان ادا پر صادق آتا ہے سرشار کے فسانۂ آزاد پر نہیں۔"

کچھ زمانے سے یہ رسم ہو گئی ہے کہ جو صاحب بھی ناول کے فن پر بحث کرتے ہیں، تبرک کے طور پر امراؤ جان کا نام ضرور لے لیتے ہیں۔ تبرک کی شیرینی سے کون کم بخت انکار کرے گا۔ لیکن تبرک کے دھوکے میں اگر کوئی بزرگ شکر کہنہ ہمراہ شاہتراہ چراشتہ عنایت فرما دیں تو آپ کو تصفیۂ خون کے باوجود شیرینی کے متعلق اپنی رائے بدلنی پڑے گی۔ امراؤ جان ادا بھی کچھ اسی قسم کا شربت زیادہ رس ہے۔ جس میں تبرک زیادہ اور شیرینی کم ہے۔

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے امراؤ جان ادا کو "نہایت اعلیٰ ناول" قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "سب سے بڑی صفت اس میں یہ ہے جو اردو کے بہت کم ناولوں میں پائی جاتی ہے کہ اس کا پلاٹ یعنی ترتیب قصہ نہایت باقاعدہ اور منظم اور اس کے کیرکٹر صاف واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ہم نے کسی ناول میں اتنی دلچسپی، اتنی کثرتِ واقعات اور فطرت انسانی کی اتنی صحیح تصویر نہیں دیکھی۔" تاریخ ادب اردو آج سے چھبیس سال قبل لکھی گئی تھی، اس وقت تک اردو ناول نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ اس لئے ڈاکٹر سکسینہ نے امراؤ جان کے متعلق اگر یہ رائے قائم کی تو انھوں نے کچھ زیادہ مبالغے سے کام نہیں لیا۔ لیکن کوئی صاحب اسے اب بھی ہر حیثیت سے "مکمل ناول" قرار دیں تو یہ ناول کے فن پر صریح ظلم ہوگا۔

ناول کی ہیروئن لکھنؤ کی ایک تعلیم یافتہ اور شستہ طوائف ہے جس کا اصلی نام امیرن ہے۔ یہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہے۔ کچھ بدمعاش اسے بچپن میں اغوا کر کے لکھنؤ کی ایک طوائف کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں۔ رقص و سرود کی تعلیم و تربیت کے بعد یہ لڑکی امراؤ جان ادا کے نام سے لکھنؤ کے "شیوۂ اہلِ نظر" کی آبرو سے کھیلتی ہے۔ بعد میں امراؤ جان نے کربلا کی زیارت سے مشرف ہو کر مرزا رسوا کو اپنی سوانح عمری لکھائی۔ اس طرح امیرن کا انجام بخیر ہوا۔ خدا نے جس طرح امیرن کے دن پھیرے اسی طرح ہمارے آپ کے دن بھی پھیرے۔

امراؤ جان اردو ادب کی پہلی طوائف نہیں۔ مولوی سجاد حسین کسمنڈوی کے ناول "نشتر" کو اگر ترجمہ قرار دیتے ہوئے نظر انداز بھی کر دیا جائے تو بھی مولوی نذیر احمد کی "ہریالی" سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں۔ ہر چند کہ نذیر احمد کے سب کردار بے جان ہوتے ہیں۔ پھر بھی "ہریالی" فسانۂ مبتلا کی جان ہے اور امراؤ جان سے اولیت کا شرف لے چکی ہے۔ فسانۂ مبتلا "ہریالی" کی داستان نہیں۔ مولوی نذیر احمد نے اسے اپنے دفتر نصیحت کے لئے ضروری سمجھا اس لئے جملۂ معترضہ کے طور پر ہریالی کا بھی ذکر آ گیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ جملۂ معترضہ آخر تک مبتلا کے ساتھ چپکا رہا۔ اس کے مقابلے میں مرزا رسوا نے خاص طور پر امراؤ جان کی سوانح لکھی ہے۔ اس حیثیت سے رسوا کے ناول کو ضرور اولیت کا درجہ حاصل ہے۔

ناول کے سرورق پر مرزا رسوا نے حسب ذیل شعر لکھا ہے۔

ہنس کے کہتا ہے مصور سے وہ غارتگر ہوش

جیسی صورت ہے مری ویسی ہی تصویر بھی ہو

آیئے دیکھیں رسوا کہاں تک اس مصوری میں کامیاب رہے ہیں۔

کرداری ناول میں سب سے اہم مقصد کردار کو نمایاں اور واضح کرنا ہوتا

ہے ہوا قصہ قصے کا ہر فرد اور سارا پلاٹ اسی ایک مقصد کے تحت ہوتا ہے۔ اگر ناول کا کوئی کیرکٹر۔ واقعہ یا سارا پلاٹ بذات خود دلچسپ ہونے کے باوجود ناول کے مرکزی کردار کو ابھارنے میں مدد نہ دے تو وہ نہ صرف بیکار ہے بلکہ اس کا شمار ایسے حشو و زوائد میں سے ہے جو کسی ناول نگار کے لئے بھی باعث فخر نہیں۔

رسوا نے ۲۰ صفحے کے اس ناول میں تین صفحے ماحول پیدا کرنے اور امراؤ جان ادا کو ایک شاعرہ اور صاحب ذوق طوائف کے طور پر تعارف کرانے میں صرف کئے ہیں۔ اس پہلے باب میں ایک مشاعرہ کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جس کے آخر میں ناظرین کا امراؤ جان سے نہایت بھونڈے طریقے سے تعارف کرایا جاتا ہے جہاں تک لکھنؤ کی لٹی ہوئی تہذیب اور آخری تمدن کی تصویر کشی کا تعلق ہے۔ یہ باب نہایت کامیاب ہے۔ مشاعرے کا نقشہ ملاحظہ کیجئے۔

"گرمیوں کے دن تھے۔ مہتابی پر دو گھڑی دن سے چھڑکاؤ ہوا تھا۔ تاکہ شام تک زمین سرد رہے۔ اسی پر دری بچھا کے اجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا تھا۔ کوری کوری صراحیاں پانی بھر کے کیوڑا ڈال کے منڈیر پر چنوا دی گئی تھیں۔ ان پر بالو کے آبخورے ڈھکے ہوئے تھے۔ برف کا انتظام علیحدہ کیا گیا تھا۔ کاغذی ہنڈیوں میں سفید پانوں کی سات سات گلوریاں سرخ صافی میں لپیٹ کر کیوڑے میں بسا کر رکھ دی گئی تھیں۔ ڈھکنیوں پر تھوڑا تھوڑا خوشبودار تمباکو رکھ دیا تھا۔ ڈیڑھ حقوں کے نیچوں میں پانی چھڑک چھڑک کر ہار لپیٹ دیئے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ اس سے روشنی کا انتظام زیادہ نہیں کرنا پڑا۔ صرف ایک سفید کنول دور سے کے لیے روشن کر دیا گیا تھا۔"

سارے ناول میں ایسے ٹکڑے جابجا ملتے ہیں۔ یہ ٹکڑے بجائے خود اس قدر کامیاب ہیں کہ پڑھنے والا ان کا اثر قبول کئے بغیر نہیں رہتا۔ لیکن ان سے امراؤ جان کا کردار ابھارنے میں مدد نہیں ملتی۔ بے شک ان ٹکڑوں کے ذریعے سے امراؤ جان ادا کے لکھنؤ کی کچھ جھلکیاں نظر آ جاتی ہیں۔ لیکن ان سے کسی کردار کو ابھارنے میں مدد نہیں ملتی۔ غضب یہ ہے کہ پہلے باب میں صرف چند فقرے یا ایک دو پارے ہی کام کے ہیں۔ باقی میں مشاعرے کی پوری غزلیں مع داد و تحسین درج ہیں۔ ظاہر ہے یہ سب غزلیں مرزا رسوا کا کلام ہیں۔ سچ پوچھئے تو یہ تین صفحے رسوا کی قادر الکلامی کا اشتہار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ شاعرانہ جھناسک کے مظاہروں سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ مختلف رنگوں کے شعر ملاحظہ کیجئے اور مرزا صاحب کی شاعری کی داد دیجئے۔

حیف ہے بنت العنب نہیں ملتی ماہ میں ایک شب نہیں ملتی

ہے یقیں وہ نہ آئیں گے پھر بھی کب نگہ سوئے در نہیں ہوتی
غلط انداز ہی سہی وہ نظر کیوں مرے حال پر نہیں ہوتی

زلف کی تعریف میں دفتر کے دفتر لکھ دیئے مو بمو حال پریشانی رقم ہوتا رہا

کبھی گالی سنا بیٹھے کبھی جوتا لگا بیٹھے حکومت کا مزا آئے اگر معشوق اجہل ہو

ہم اس نازک ادا کی شوخیوں پر جان دیتے ہیں ستم کے جس میں غمزے ہوں فرس کی جس میں چھل بل ہو

تین صفحے کی اس شاعرانہ جھناسک کے بعد دوسرے باب میں امیرن کے بھاگنے کا قصہ ہے۔ یہ سارا باب نہایت مخش اور غیر دلچسپ ہے۔ اگر آپ سارا ناول پڑھنا چاہیں تو آپ کو یہ حصہ بجانِ درویش ناکے طور پر پڑھنا ہوگا۔ لکھنؤ پہنچ کر امیرن ایک ایسی جگہ ٹھہرتی ہے جہاں ایک اور مصیبت کی ماری لڑکی رام دئی بھی برائے فروخت آئی ہے۔ چنانچہ دونوں لڑکیاں ایک ساتھ فروخت ہو جاتی ہیں۔ امیرن خانم کے وہاں جو لکھنؤ کی ایک مشہور نائکہ ہے۔ اور رام دئی ایک سلطان نواب کے ہاں۔ رنڈی بن جانے کے بعد امراؤ جان کی زندگی میں دو اہم شخص آتے ہیں۔ گوہر مرزا جس پر امراؤ جان عاشق ہیں۔ اور دوسرے نواب سلطان جو امراؤ جان سے محبت کرتے ہیں۔ گوہر مرزا اُن مردوں میں سے ہے جو ہمیشہ رنڈیوں کے ہاں رہتے ہیں۔ اور جن کی گذر بسر رنڈیوں کے رحم و کرم اور عنایات پر منحصر ہوتی ہے۔ اس شخص میں شروع سے آخر تک کوئی خوبی نہیں۔ رسوا نے سارے ناول میں کہیں بھی اسے کلمۂ خیر سے یاد نہیں کیا۔ پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ امراؤ جان گوہر مرزا پر کیوں مرتی ہیں۔ یہ ایک معمہ ہے نہ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ اس کے مقابلے میں نواب سلطان دل سے

امراؤ جان کے عاشق ہیں اور خود امراؤ جان بھی کہتی ہیں "واقعی سلطان صاحب کو مجھ سے اور مجھے ان سے محبت تھی، دونوں کے مذاق کچھ ایسے ملتے ہوئے تھے کہ اگر عمر بھر کا ساتھ ہوتا تو کبھی ملال نہ ہوتا" مگر سارے ناول میں مشکل سے تین چار صفحے بھی اس تعلق پر صرف نہیں کئے گئے۔

قسمت کی خوبی سے وہی رام دئی جو امیرن کے ساتھ فروخت ہوئی تھی سلطان صاحب کے ساتھ بیاہی جاتی ہے۔ اور بیگم بن کر رہتی ہے آخر میں جب امراؤ جان توبہ اور اصلاح کی طرف رجوع کر رہی ہیں اس وقت ان کی ملاقات دوبارہ سلطان اور بیگم سلطان سے ہوتی ہے۔ اس ملاقات میں امراؤ جان اور نواب سلطان دونوں شرافت اور گھریلو امن و خوشی کی خاطر گذشتہ تعلقات سے اغماض برتتے ہیں۔ اور رام دئی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے کہ دونوں میں کبھی تعلق رہا ہے۔

دراصل مرزا رسوا امراؤ جان ادا۔ نواب سلطان۔ رام دئی۔ اور گوہر مرزا کے ذریعے سے ایک نہایت کامیاب ناول لکھ سکتے تھے لیکن مرزا صاحب سے یہ کردار نبھ نہیں سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امراؤ جان کو گوہر مرزا میں جنسی کشش تو نظر آئی۔ لیکن جو جذبات مرد عورت کے تعلقات کو ماورایت بخشتے ہیں وہ امراؤ جان کو نواب سلطان میں ملتے ہیں۔ لیکن یہ سارا تجزیہ یا تو فی بطن الشاعر رہا یا خود مرزا رسوا بھی اپنی ہیروئن کی اس الجھن کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

گوہر مرزا اور نواب سلطان کی مدد سے یہ دکھایا جا سکتا تھا کہ ایک رنڈی جب صرف رنڈی ہو تو اس وقت اسے کن لوگوں میں جنسی کشش نظر آتی ہے۔ وہ لوگ جو روزانہ اپنی راتیں اس کے ہاں بسر کرتے ہیں۔ رنڈی کے جنسی تقاضوں کو آسودہ کرنے میں کیوں ناکام رہتے ہیں ظاہر ہے کہ انسان کے جنسی جذبات کا حیوانی پہلو ہی نہیں ہوتا۔ ان جذبات کا بھی ایک ایسا نفسیاتی پس منظر ہوتا ہے جو عام حیوانی وظائف سے روشن نہیں ہو سکتا۔ سلطان سے امراؤ جان کے تعلقات رنڈی کی اس بنیادی نسائیت پر روشنی ڈال سکتے تھے۔ جن سے کوئی رنڈی بھی خالی نہیں ہوتی۔ حسن و شباب کا سودا کرنے والی کوئی عورت بھی دن رات بازار میں بیٹھ کر اور جذبات کو فروخت کر کے بھی ان نازک احساسات سے اپنا دامن نہیں بچا سکتی جن سے قدرت نے عورت کا

خمیر اٹھایا ہے، ایک عورت جنسی جذبات کی آسودگی کے ساتھ ساتھ محبت اور حفاظت کی بھی طلبگار ہوتی ہے۔ اگر اسے یہ تینوں چیزیں ایک ہی شخص میں مل جائیں تو زندگی نہایت کامیاب ہوتی ہے۔ لیکن جب ایک مرد صرف حفاظت مہیا کر سکتا ہو اور دوسرا حفاظت نہیں بلکہ محبت کرتا ہو تو پھر کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ جو ہمارے آپ کے جیون کو نرک بناتی ہے۔ گوہر مرزا امراؤ جان کے جنسی تقاضوں کو تو پورا کرتا ہے لیکن وہ محبت سے ناآشنا ہے۔ نواب سلطان محبت کی گرمی سے امراؤ جان کے دل کو تو گرماتے ہیں لیکن وہ نکاح کر کے حفاظت کا یقین نہیں دلا سکتے۔ رنڈی کی ساری کشمکش حفاظت اور سلامتی کی جستجو کی داستان ہوتی ہے۔ اس کی ساری سیاہ کاریاں اسی مقصد کے لئے ہوتی ہیں تیزی سے گذرتا ہوا شباب اسے روز زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ لیکن بھوک، بڑھاپے اور ناچاری سے بچنے کے لئے ایک رنڈی جس قدر کوشش کرتی ہے اسی قدر اس کا سکون پاش پاش ہوتا ہے۔

مرزا رسوا کے ذہن میں اس تمام تجزیئے کے مدھم سے نقوش تو معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے ناول میں انہیں روشن نہیں کر سکے۔ انھوں نے کردار اور واقعات اسی ایک مقصد کو سامنے رکھ کر پیدا کئے ہیں۔ مگر وہ اس مواد سے امراؤ جان کا کردار تعمیر کرنے میں قطعاً ناکام رہے ہیں۔

مرزا رسوا نے اس ناول میں کردار۔ پلاٹ۔ اور واقعات کو اس طرح الجھایا ہے کہ قاری اور ناقد دونوں ایک گورکھ دھندے میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سکسینہ اس کے پلاٹ کو "باقاعدہ اور منظم" قرار دیتے ہیں لیکن ڈاکٹر ابواللیث ناول کے فن پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں "کرداری ناول کے لئے واضح اور متعین پلاٹ بالکل ضروری نہیں... ناول نگار کے ذہن میں قدرتی طور پر قصے کا کوئی مکمل پلاٹ نہیں ہوتا۔ بلکہ جیسے جیسے وہ آگے چلتا ہے پلاٹ خود بخود بنتا چلا جاتا ہے۔ اردو میں اس کی سب سے اچھی مثال مرزا ہادی رسوا کا ناول امراؤ جان ادا ہے۔" ڈاکٹر سکسینہ نے واقعاتی ناول کے طور پر اس کی تعریف کی۔ ڈاکٹر ابواللیث نے اسے کرداری ناول کے طور پر سراہا۔ لیکن حسین اعظمی کہتے ہیں۔ "ابھی تک رسوا کے تمام ناولوں کو معاشرتی ناولوں کا درجہ دیا گیا ہے۔ لیکن گہری نظر سے دیکھا جائے تو رسوا کے تمام ناول عموماً اور امراؤ جان خصوصاً ایک تاریخی حیثیت رکھتا

ہے۔ شررؔ تاریخی ناول نویس ہونے کے باوجود تاریخی ناول نویس نہیں۔ اس کے برخلاف رسوا کے کسی ناول کا قصہ تاریخی نہیں لیکن ان کے ہر ایک ناول کا پس منظر تاریخی ہے۔ اس حیثیت سے امراؤ جان ادا خاص حیثیت رکھتی ہے۔

شکر کیجیے ابھی تک کسی ناقد نے اس "واقعاتی" "کرداری"، "معاشرتی" اور "تاریخی" ناول کو جاسوسی ناول قرار نہیں دیا۔ اگر کوئی نیند گ اسے جاسوسی ناول کہنے لگیں تو ہم آپ ان کا بگاڑ بھی کیا سکتے ہیں۔

مرزا رسوا کو امراؤ جان کی کردار نگاری میں ہی ناکامی نہیں ہوئی۔ بلکہ جس پلاٹ کی اس قدر تعریف کی گئی ہے وہ بھی بے ربط اور بے جوڑ ہے بسم اللہ اور خورشید کا ذکر بے محل ہے۔ دونوں کا اصل پلاٹ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس سے رنڈیوں کی بود و باش پر ضرور روشنی پڑتی ہے لیکن ناول بے ربط واقعات کا تو نام نہیں۔ مرزا صاحب کو جو بات جہاں یاد آتی ہے وہیں اس کا تذکرہ کر دیتے ہیں۔ بسم اللہ کے عاشق چھٹن کا حال آخر میں یاد آیا۔ چنانچہ وہی سنا دیا۔ حالانکہ اس کی جگہ ناول میں بہت پہلے تھی۔ یہ نہ تو ناول کا طرز نگارش ہے۔ اور نہ سوانح عمری اس انداز پر لکھی جاتی ہے۔

مولوی عبدالماجد صاحب کہتے ہیں۔ رسوا کے قصے "پڑھتے جائیے۔ اور سبق حاصل کرتے جائیے۔ ادھر آپ افسانے کی لذت میں محو رہیں گے اور ادھر نصیحت کے گھونٹ بلا تکلف حلق سے اترتے چلے جائیں گے۔

آپ بھی ایک جرعہ ملاحظہ فرمائیے۔ مرزا رسوا کہتے ہیں:

"امراؤ جان میری زندگی کا ایک اصول ہے۔ نیک بخت عورت کو میں اپنی ماں کے برابر سمجھتا ہوں۔ خواہ وہ کسی قوم و ملت کی کیوں نہ ہو۔۔۔ مگر فیاض عورتوں کے فیض سے مستفید ہونا میرے نزدیک کوئی گناہ نہیں۔"

اگر مولوی عبدالماجد صاحب اسی کو نصیحت کا گھونٹ کہتے ہیں۔ تو "کار طفلاں تمام خواہد شد"۔

بہرحال مرزا رسوا کا یہ ناول اردو ناول کے بچپن سے تعلق رکھتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ان تمام عیوب کو اس زمانے کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھنا چاہیئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ناول کے بعض ٹکڑے یقیناً نہایت حسین ہیں۔ اگر ان کا تذکرہ نہ کیا جائے تو ظلم ہوگا ؏

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

ان تمام عیوب کے باوجود مرزا رسوا کو ایک ناکام ناول نگار نہیں کہا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ امراؤ جان کے ساتھ انصاف کا برتاؤ نہیں کر سکے مگر ایک طوائف کے سوانح نگار کو جو سطحی نقوش ابھارنے چاہیئیں ان میں رسوا خاصے کامیاب ہوئے ہیں۔ امراؤ جان کے پہلے مجرے کا حال سنیئے۔

"میرا سن کوئی چودہ برس کا تھا۔ اس زمانے میں بڑودے سے ایک بائی جی آئی ہوئی تھیں۔ تمام شہر میں ان کے گانے کی دھوم تھی۔ بڑے بڑے گویے کان پکڑتے تھے۔۔۔ مگر واہ خانم صاحب واقعی کیا رنگ دیکھتی تھیں۔ ان کے بعد مجھ کو کھڑا کر دیا۔ مجھے تو کیا تمیز تھی مگر سمجھ دار لوگ حیران تھے کہ خانم صاحب کیا کرتی ہیں۔ بھلا بائی جی کے سامنے اس چھوکری کا رنگ جمے گا۔ پہلے گت شروع ہوئی۔ اس میں محفل میری طرف مخاطب ہوئی۔ میری بھی اٹھتی جوانی تھی۔ صورت اچھی نہ تھی مگر اس وقت کی بھرتی چالاکی۔ الغرض

کچھ نہ پوچھو شباب کا عالم
کیا کہوں کچھ عجب زمانہ تھا

گت پر تھوڑی ہی دیر ناچی ہوں گی کہ خانم نے یہ غزل شروع کرا دی۔

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے — دیکھیے دیکھیے اک آن میں کیا ہوتا ہے

اس غزل کے شروع کرنے کے ساتھ ہی محفل تہ و بالا ہو گئی۔ اس کے بعد دوسرا مطلع ایک ذرا میں نے ہٹا کے جو گایا، اہل محفل جھومنے لگے۔

نالہ رکتا ہے تو سرگرم جفا ہوتا ہے — درد تھمتا ہے تو بے درد خفا ہوتا ہے

اور اس شعر نے تو قیامت ہی برپا کر دی۔

پھر نظر چھپتی ہے آنکھ جھکی جاتی ہے — دیکھیے دیکھیے پھر تیر خطا ہوتا ہے

اس شعر کا یہ حال تھا جس سے نظر ملا کے گایا نظر نہ اٹھا سکا۔"

اس سے پہلے آپ لکھنؤ کا ایک مشاعرہ دیکھ چکے ہیں۔ آیئے اجڑے لکھنؤ کی ایک رنڈی کا بالاخانہ بھی دیکھ لیجیے۔

نواڑ کے پلنگ ڈوریوں سے کسے ہوئے تھے۔ فرش پر ستھری

بچھی ہوئی تھی بڑے بڑے نقشی پاندان۔ خس دان۔ خاصدان۔
اگالدان قرینے سے رکھے ہوئے۔ دیواروں پر قلمی آئینے۔
عمدہ عمدہ تصویریں۔ چھت پر چھت گیریاں لگی ہوئی جس کے
درمیان ایک مختصر سا جھاڑ.... سر شام سے دو کنول روشن
ہو جاتے.... چاندی کی گڑ گڑی منہ سے لگی ہوئی۔ سامنے
پاندان کھلا ہوا ہے۔ ایک کو پان لگا کے دیتی جاتی ہیں چہلیں
ہوتی جاتی ہیں۔"

رسوا خالی باتوں کے طوطا مینا نہیں اڑاتے۔ بلکہ ایک ماہر فن کی طرح اپنے موضوع کی جزویات پر بھی نگاہ رکھتے ہیں۔ رنڈی پر لکھنے بیٹھے ہیں تو یہ نہیں کہ اس کے مجرے اور کوٹھے کی تفصیل دے کر رہ جائیں۔ بلکہ اس کی معمولی باتوں سے لے کر ساز سنگیت۔ رقص و سرود اور اس کی روزمرہ زندگی پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ خانم اور استادجی کی جھڑپ سے مرزا رسوا کی موسیقی کے بارے میں معلومات کا پتہ چلتا ہے۔

مرزا رسوا اگرچہ امراؤ جان کے سوانح نگار کی حیثیت سے یہ ناول لکھ رہے ہیں۔ لیکن شروع سے آخر تک ان کا برتاؤ امراؤ جان کے ساتھ ہمدردانہ نہیں۔ دوران گفتگو میں جو بھی چوٹ کرتے ہیں اس سے ان کی غیر شعوری حقارت اور نفرت کی غمازی ہوتی ہے۔ مرزا رسوا نے اگرچہ رنڈی کے روشن پہلو اجاگر اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ رنڈی خاندانی طور پر نہ تو بری ہوتی ہے اور نہ ہر رنڈی کو اس پیشے سے دلچسپی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ غیر شعوری طور پر رنڈی سے ہمدردی نہیں کر سکتے وہ اس کے دل کی الجھنوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ وہ رنڈی سے اسی قدر دور ہیں جتنا کہ ایک عام آدمی۔ ان کا تجزیہ سطحی ہے۔ اس میں گہرائی نہیں۔ اس کے مقابلے میں جب وہ عام شرفا کی تحلیل نفسی کرتے ہیں تو اس میں زیادہ کامیاب رہتے ہیں۔ چنانچہ وہ باب جس میں امراؤ جان کا اکبر علی کے گھر میں بیٹھنا دکھایا گیا ہے۔ تحلیل نفسی کا ایک کامیاب نمونہ ہے۔ ظاہر ہے کہ مرزا رسوا نے تجزیے کے متعلق فرائڈ اور ڈاکٹر جنگ کے نظریئے نہیں پڑھے تھے۔ اس لئے ہم ان سے ایسی توقعات رکھنے میں حق بجانب نہیں۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اس زمانے کے ناول میں جو خوبیاں تھیں وہ بھی اس میں مفقود ہیں۔ عہد وکٹوریہ کا ناول ایک خاص ٹائپ پیش کرنے میں کمال رکھتا ہے۔ اردو کا ناول بھی اس سے بلا واسطہ اور بالواسطہ اثر پذیر ہوا ہے۔ چنانچہ فسانۂ آزاد کے خوجی اور میاں آزاد تحلیل نفسی کے فقدان کے باوجود ہمیں نہیں بھولتے۔ یہی حال مرأۃ العروس کی ماما عظمت کا ہے لیکن رسوا کے اس ناول میں کوئی بھی ایسا کردار نہیں۔ جو ناول ختم ہو جانے کے بعد آپ کے ذہن میں محفوظ رہے۔

بہرحال یہ ناول آج سے تقریباً پچاس برس پہلے لکھا گیا تھا۔ اور جو لوگ ہماری ناول نویسی کے ارتقا کا مطالعہ کرنا چاہتے ہوں انھیں یہ ناول ضرور پڑھنا چاہیئے۔ ڈاکٹر سکسینہ۔ مولوی عبدالماجد اور ڈاکٹر ابواللیث نے اس کی جو تعریف کی ہے اس کا تو یہ مستحق نہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے پڑھا نہ جائے مرزا رسوا کا سا قابل آدمی جب ناول لکھے تو ناکامی کے باوجود اس میں ایسی خوبیاں ضرور ہوں گی جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

جلال ملیح آبادی

پیدا کریں

دوستو! اٹھو کہ اس ظلمت میں ضَو پیدا کریں — عصرِ نَو پیدا کریں تہذیبِ نَو پیدا کریں

جس کی ضَو سے جگمگا اٹھے ضمیرِ کائنات — قلبِ انساں میں محبت کی وہ لَو پیدا کریں

مخمور لکھنوی

تقاضا

یہ آنکھیں شرابی یہ عارض گلابی
یہ روشن جبیں اور یہ بُوئے کتابی
یہ کاکل کی لہریں سحابی سحابی
یہ شکل آفتابی یہ رُخ ماہتابی
چلا آ شتابی چلا آ شتابی

یہ پُر کیف شامیں یہ صبحیں سہانی
یہ فطرت کی پُر لطف رنگیں کہانی
ہر اک ذرّہ مست ہے نوجوانی
کہاں ہے کہاں ہے نگارِ شرابی
چلا آ شتابی چلا آ شتابی

یہ پُر لُطف موسم یہ بھینی ہوائیں
مہکتی مہکتی یہ دل کش فضائیں
مگر اپنے دل کو کسے ہم دکھائیں
کہ ہر ہر نفس ہے یہاں انقلابی
چلا آ شتابی چلا آ شتابی

گلستاں کا خاموش منظر ہے مَیں ہوں
لہکتا ہُوا سبزۂ تر ہے مَیں ہوں
خیالات کا ایک محشر ہے میں ہوں
پھر اِس پر یہ تاروں کی انوار تابی
چلا آ شتابی چلا آ شتابی

یہ صحنِ چمن اور یہ فصلِ بہاری
یہ چھٹکی ہوئی چاندنی پیاری پیاری
دلہن ہے گلستان کی اک ایک کیاری
یہ رنگین راتیں ہوائیں شہابی
چلا آ شتابی چلا آ شتابی

شرابِ محبّت سے مخمور ہو کر
مئے عشوہ و ناز سے چور ہو کر
اندھیرے میں شمعِ سرِ طور ہو کر
دکھا اپنے عارض گلابی گلابی
چلا آ شتابی چلا آ شتابی

شیخ محمد رضا الشبیبی

ہندوستان کی قومی تحریک سے سبق

عراق کے نامور سیاست داں اور وزیر ایوان نمائندگان کے ممبر شیخ محمد رضا الشبیبی نے اخبار "الاحد" کی ۹ نومبر کی اشاعت میں ایک مضمون "ہندوستان کی قومی تحریک سے سبق" کے زیرعنوان سپرد قلم کیا ہے۔ اس کا ایک مختصر سا اقتباس نیچے درج کیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے وزیراعظم پنڈت نہرو نے صدر ٹرومین کی دعوت پر امریکہ کا دورہ کیا جس کی صدائے بازگشت آپ فضائے عالم میں چھوڑ گئے ہیں۔ اس دورے نے دنیا میں ایک ہلچل پیدا کر دی ہے۔ اس دورے کے اہم پہلو یہ ہیں کہ پنڈت نہرو کا بہت شاندار استقبال کیا گیا۔ اور وزیراعظم نے جو تقریریں وہاں کی ہیں۔ وہ تاریخ کا رخ بدل دینے والی ہیں۔ دنیا بھر کے لوگوں نے ان تقریروں کو بڑی دلچسپی سے پڑھا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پنڈت نہرو کا دورہ بہت زیادہ کامیاب رہا۔ اور اس کی اہمیت امریکہ کا دورہ کرنے والے دنیا کے ممالک کے بہت سے دیگر لیڈروں کے مقابلے میں بہت ہی زیادہ ہے۔

ہندوستان نے اتنے تھوڑے زمانے میں ہی دنیا کی قوموں میں اتنی ممتاز حیثیت کیونکر حاصل کر لی ہے۔ کیا ہندوستان سے کل تک ایک غلام کا سا برتاؤ نہیں کیا جاتا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کے اس براعظم کی بیداری ہمارے لئے بہت سبق آموز ہے۔ ہم عراقی لوگوں نے دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں اور اس سے پہلے ہندوستانیوں کو اپنے برطانوی آقاؤں کے اشاروں پر ناچتے دیکھا ہے۔ ہمارے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہے۔ کہ ہندوستان اتنے قلیل زمانے میں ہی ایک آزاد خود مختار سلطنت کیسے بن گیا۔

ہندوستان کا آزادی حاصل کرنا دنیا بھر کے سب سے بڑے واقعات میں سے ایک ہے۔ لیکن اس امر سے بھی زیادہ اہمیت اس امر کی ہے کہ ہندوستانیوں نے نظم و نسق کو سنبھالنے میں کامیابی حاصل کی اور اپنے انتظامِ حکومت کو قابل تحسین طریقے پر چلایا ہے حکومت نے اب ہندوستان کے طول و عرض میں اپنا اقتدار مستحکم کر لیا ہے۔ بہت سی ریاستیں مرکزی نظم و نسق میں مدغم ہو چکی ہیں اور ملک ترقی کر رہا ہے انھوں نے اپنا نظام حکومت جدید ترین قسم کا جمہوری نظام بنا لیا ہے۔ اگر ہم یہ یاد رکھیں کہ جس وقت پنڈت نہرو نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ اس وقت ہندوستان اپنی تاریخ کے نازک ترین دور میں سے گذر رہا تھا۔ بدامنی اور گڑبڑ کی طاقتیں زوروں پر تھیں۔ تو ہم یہ محسوس کر سکیں گے۔ کہ ہندوستانی لیڈروں نے کتنی ہوشیاری اور مصیبت سے آنے والی تباہی کو روکا ہے۔

"راشٹر پتا" مہاتما گاندھی اور ان کے دست راست پنڈت نہرو کی عظمت کا تذکرہ کرنے کے بعد شیخ محمد رضا الشبیبی نے امریکہ میں پنڈت نہرو کی ان تقریروں کا حوالہ دیا ہے۔ جن میں انھوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ "ہندوستان مشرق و مغرب کے ہر قسم کے جھگڑوں میں غیر جانب دار رہے گا"۔ پنڈت نہرو نے یہ اعلان امریکہ کے دارالسلطنت میں بے شمار امریکیوں اور دیگر مغربی ممالک کے بہت سے لیڈروں کی موجودگی میں بلا خوف و رعایت کیا تھا۔ جن گمراہ لوگوں نے دونوں فریق کے درمیان جھگڑا ہونے کی صورت میں اپنے رویے کے بارے میں پیش از وقت خود بخود وضاحت کر رکھی ہے اور ان میں سے ایک یا دوسرے کا ساتھ دینے کا عہد کر رکھا ہے اُن کے لئے یہ اعلان ایک بیش قیمت درس کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہم نے دیکھا کہ مغرب کے سب سے بڑے پایہ تخت میں پنڈت نہرو نے کس قدر حیرت انگیز طور پر مشرق کی صفائی پیش کی ہے۔

اور ایشیا کی قومی تحریکوں پر بہتان تراشے جاتے ہیں۔ ان کو جھٹلایا جاتا ہے۔ پنڈت نہرو نے ایشیا میں بدامنی اور گڑبڑ کے واقعات کے لئے ان لوگوں کو ذمہ دار ٹھیرایا ہے جن کا نظامِ حکومت خراب ہے۔ اور اس خرابی کی وجہ یہ ہے کہ ان کے رہنما اپنے مسائل سے نپٹنے اور ان کا مقابلہ کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ آپ نے اس بات کی بھی تردید کی ہے کہ اس اظہار ناخوشی اور ان فسادات کا کسی دیگر تباہ کن تحریک سے کوئی تعلق ہے۔ یہ ایک ایسی بڑی حقیقت ہے جسے ہر انصاف پسند اور بے غرض شخص تسلیم کرتا ہے۔ پنڈت نہرو ان لوگوں میں سے ہیں جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس قسم کی تحریکوں کو سختی اور تشدد سے دبانے کی پالیسی کامیاب نہیں ہو سکتی اور ان لوگوں کے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے جن کے ہاتھ میں نظم و نسق ہوتا ہے۔ اس قسم کی تحریکوں کو روکنے، اصلاحات نافذ کرنے اور لوگوں کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے سوا دوسرا کوئی طریقہ کار نہیں ہو سکتا۔ یہ پیشنگوئی کرنا بہت مشکل ہے کہ ہندوستان اب اپنی سیاسی پیچیدگیوں کو سلجھانے کے بعد اپنے مجلسی مسائل کو حل کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوگا۔ عراق میں ہم بدقسمتی سے ان مسائل کو حل کرنے میں متواتر ناکام رہے ہیں۔

پنڈت نہرو اپنے ملک کی بیماریوں کے اسباب تلاش کرنے میں کامیاب رہے۔ آیا وہ ان کا علاج بھی مہیا کر سکیں گے یہ آئندہ دیکھا جائے گا۔ ہم اس بارے میں کوئی پیشگوئی کرنا نہیں چاہتے اور صرف یہی کہنے پر اکتفا کریں گے کہ ہمارے رہنماؤں کے برعکس ہندوستان کے لیڈر مخلص اور سرگرم ہیں۔ وہ کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے اور ان کے عوام اپنی منزلِ مقصود کی جانب آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

ہندوستان کے واقعات نے جو درس ہمیں دیا اس سے سب لوگوں کو استفادہ کرنا چاہیئے۔

جلال ملیح آبادی

اور انساں مرگیا

علم و حکمت، فہم اور دانش کی جویا ہے حیات
قطرہ قطرہ ہے صحیفہ، ذرّہ ذرّہ ہے کتاب
تجزیے کی ہے نظر میں آج ساری کائنات
تُل رہے ہیں ماہ و انجم نپ رہا ہے آفتاب —— اور انساں مرگیا

ابر تو ہے ابر، اُڑتی ہے ہمالہ سے بلند
تاب ناکی کا ہے شہرہ اور ضو کی دُھوم ہے
ڈالتی ہے زندگی عقدِ ثریا پر کمند
عصرِ نو کی دُھوم ہے، تہذیبِ نو کی دُھوم ہے —— اور انساں مرگیا

دل میں دُنیا کے، اجنتا کی ابھی یادیں بھی ہیں
فلسفی ہیں، شاعر و عالم ہیں فرزانے بھی ہیں
صنعتوں کا زور، حیرت ناک ایجادیں بھی ہیں
گلستاں ہیں، سیرگاہیں ہیں، شفاخانے بھی ہیں —— اور انساں مرگیا

اُونچی اونچی منزلیں ہیں کوہساروں سے بلند
پھینکتی ہے عقلِ انساں چاند تاروں پر کمند
کوہساروں سے بلند، ان ابر پاروں سے بلند
موت پر بھی زندگی ہو جائے شاید فتح مند —— اور انساں مرگیا

داغِ وحشت اپنی پیشانی سے اب دھونے کو ہے
علم کی ضو سے اندھیرے کی جبیں ہے تابناک
یہ سُنا ہے آدمی، فوق البشر ہونے کو ہے
زندگی پر آشکارا ہیں رموزِ قلبِ خاک —— اور انساں مرگیا

مشترک تہذیب کی وحدانیت کا شور ہے
علم کی اک آنچ سے وحشت کا لوہا جل گیا
ہر طرف انسانیت، انسانیت کا شور ہے
ایک آٹم بم گرایا، ہیروشیما جل گیا —— اور انساں مرگیا

سردار الہام

جدید شاعری اور تحتِ شعور

ادب جس کا ہم مطالعہ کرتے ہیں اپنے عہد کے رجحانات کا آئینہ ہوتا ہے یا یہ کہنا چاہیئے کہ کسی نسل کے جنسی رجحانات اور نظریات کے متعلق تحقیق کا ایک بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس عہد کے ادب کا مطالعہ کیا جائے۔

ان اقوال کی روشنی میں اگر ہم جدید شعراء کا مطالعہ کریں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہمارے دور کے بیشتر شعراء ایک خاص قسم کی ذہنی الجھن اور جنسی ناآسودگی کا شکار ہیں ن م راشد کہتا ہے "یہ الجھن شاید ہم سب میں ہے اور جو کفر کے جس شاعر میں نہیں وہ اپنے اردگرد کے سماجی' اقتصادی اور سیاسی انقلاب سے بے بہرہ ہے" یہ ممکن ہے اس نظریے کا ہر شخص پر اطلاق نہ ہو سکے تاہم اگر ہم فرائڈ کے ایک معتقد ژیونگ کے اس نظریہ کو مان لیا کہ اشتہائے جنس کی قوت زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور یہ جذبہ تحتِ شعور کی گہرائیوں سے مختلف روپ دھار کے ابھر آتا ہے جیسے خدمتِ خلق مذہبی عقیدت اور اشتہائے فن بھی اس کی مختلف صورتیں ہیں تو ان شعراء کا بھی اس کی زد سے بچ نکلنا محال ہے فیض کی نظم اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ شاعر اپنے اردگرد کی سماجی' اور سیاسی زبوں حالی کا شعور رکھتا ہے اور اس شدید احساس کے باوجود ایک جنسی جذبہ اسے اپنی علمیت' شعور اور منطق کی بلندی سے دھکیل دیتا ہے۔ "موضوع سخن" کے آخری مصرعوں میں بتاتا ہے کہ

یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضمون ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہئے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

ایک اور جگہ فیض کہتا ہے۔

ترا ہی عکس ہے ان اجنبی بہاروں میں   جو تیرے لب ترے بازو ترا کنار نہیں

داخلی احساسات اور شعوری یا غیر شعوری کیفیات ہی شاعری کی بناء یا محرک ہوتے ہیں۔ گو خارجی محرکات بھی شاعر کے ذہن پر اپنے تہیجی اثرات مترتب کرتے ہیں' لیکن ایسی صورت میں تاثر کی شدت' اثر پذیری کی پوری پوری صلاحیت اور خلوصِ اظہار کی اشد ضرورت ہوتی ہے داخلی احساسات' تعلیم و تربیت' عام سماجی حالات و روایات اور شاعر کی زندگی کے زیر اثر نشو و نما پاتے ہیں۔ شاعر کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے احساسات (خواہ شعوری طور پر بیدار ہوں یا غیر شعوری طور پر) اور ذہنی کیفیات کی عکاسی کرے اس سلسلے میں اپنے تاثرات سے فنی مطابقت پیدا کرنی ہوتی ہے۔ فنی مطابقت کے سلسلے میں یہاں فن کی روایتی قدریں' اسالیب' صوری اور معنوی اشکال سب کچھ زیر بحث آجاتے ہیں۔

جہاں تک روایتی اسالیب اور قدروں کا تعلق ہے اس سے میراجی نے شدید انحراف کیا ہے اور اپنی ایک الگ دنیا بسائی ہے۔ جو اس کے طرزِ نگارش کے نت نئے تجربوں پر مبنی ہے جس میں اس نے خود کو ہر جگہ ایک نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ یا راشد کے الفاظ میں "میراجی کی نظموں کی مثال ایک کپڑے کے تھان کی ہے جس سے ڈیزائنوں یا دھاریوں کی رنگا رنگی کے باوجود ایک ہی تاثر پیدا ہوتا ہے"۔ راشد کے بارے میں خود اس کی زبان سے سنیئے' "میں نے آزاد نظم سے شاعری میں خیالات کے آزاد تسلسل کے ساتھ ساتھ جامعیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے"۔ لیکن فیض نے اسلوب اور طرزِ نگارش میں کسی نئے تجربہ سے کام نہ لیا بلکہ وہ بڑی حد تک روایتی اسالیب ہی کا پابند رہا ہے۔ اس مضمون میں اسالیب کی بحث کسی قدر بے محل ضرور ہے لیکن یہ بتانا مقصود ہے کہ خیال کے آزاد تلازم یا تسلسل کے لئے میری رائے میں پابند نظموں کی بہ نسبت آزاد نظم میں زیادہ گنجائش ہے کہ ان جذبات' احساسات اور ذہنی کیفیات کا ذریعہ اظہار

بن سکے جو ہمارے دور کے خاص حالات کے تابع ہیں۔ نئی شاعری چونکہ نئے نفسی، ذہنی اور سماجی ماحول کی پیداوار ہے اس لئے پرانے سانچے اس کا زیادہ ساتھ نہیں دے سکتے۔

فرائڈ نے ہمارے تمام ذہنی امراض کا ذمہ دار ہمارے غلط معیارِ معاشرت کو قرار دیا ہے اور تحت شعور جو تمام ذہنی کیفیات کا سرچشمہ ہے خواہ اس کے محرکات اور ہیجانات کچھ ہی ہوں ایک انجانے طور پر کارفرما رہتا ہے اور ہماری زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ تحت شعور کے چیستان کو ژونگ نے کمپلیکس کا نام دیا ہے۔

یہاں ایک بات خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ اس نفسی تجزیے سے صرف ذہنی زندگی کا تجزیہ ہی ممکن ہے حقیقی زندگی کا نہیں جو بسا اوقات ذہنی زندگی سے مختلف بھی ہوتی ہے۔ فرائڈ اور اس کے معتقدین نے اس امر کی کافی وضاحت کی ہے کہ ہمارے لاشعور کی تہوں میں کئی ایسے جذبات اور خواہشیں دبی پڑی رہتی ہیں جنہیں بچپن میں نشو و نما پانے کے مواقع نہیں ملے یا وہ کچل دی گئیں جو آگے چل کر فنا نہیں ہوئیں بلکہ تا حیات مختلف روپ بھر کر ہم پر اثر ڈالتی ہیں اور بعض وقت تو ان کی کیفیات اور آثار میں اتنا شدید اور نمایاں فرق نمودار ہو جاتا ہے کہ ان کے صحیح خد و خال پہچاننے بھی مشکل ہیں۔ فیض نے رکاوٹوں اور سماجی بندھنوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

یہ ہر اک سمت پر اسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر ایک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ

موجودہ شاعری پر ابہام و اشاریت کا جو لیبل چڑھا ہے اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ یا تو یہ خواہشیں خود ان شعراء کے آگے عریاں طور پر نہیں آنے پاتیں جس کے باعث ان کے افکار میں الجھاؤ سا پیدا ہو جاتا ہے یا پھر وہ غیر شعوری طور پر ان سے خائف یا محجوب ہیں جس کے باعث صاف و صریح اظہار ممکن نہیں یا شعوری طور پر ان سے آگاہی اور ان کے تجزیہ کے باوصف چونکہ ان کے لب و لہجہ، اسالیب، طرزِ نگارش اور اندازِ بیان میں ایک نیا پن ہے اس لئے اپنی ذہنی کیفیات کی واضح عکاسی ان کے بس کی بات نہیں جس کی وجہ ان کی خامیٔ صلاحیت کی نیم پختگی یا بیان کی تشنگی نہیں بلکہ شاید زبان کی تنگ دامانی اور دوسری لسانی مشکلات ہوں۔

شہاب اشرف

قطعات

جا پپیہے تو کوک اور کہیں	رو پڑی رات درد کے مارے
دے اُٹھیں تو مری دبی آہیں	مضمحل اور ہو گئے تارے
زندگی کی اُداس راہوں میں	اک بھیانک خلا سا ہے ہر سُو
میرے ہمراہ ہے نہ جانے کیوں	آج بھی تیری سانس کی خوشبو
تیری پلکوں کے سائے میں لے دوست	کتنے پُر کیف دن گزارے ہیں
بکھرے بکھرے سے زیست کے گیسو	تو نے کس ناز سے سنوارے ہیں

مسئلۂ کشمیر

پاکستان کے سابقہ وزیر برائے معاملات کشمیر اور موجودہ گشتی سفیر مسٹر مشتاق احمد گورمانی نے قاہرہ کی ایک پریس کانفرنس میں جو دستی یادداشت شائع کی ہے اس سے تفصیلی طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مسئلہ کشمیر کے سلسلہ میں پاکستان اپنے جرم کو چھپانے کے لئے کیا کوششیں کر رہا ہے۔

جنوری ۱۹۴۸ء میں کشمیر سے متعلق جو بنیادی امور ہندوستان نے سلامتی کونسل میں پیش کئے تھے اور جنہیں پاکستان نے پہلے تو ماننے سے انکار کیا تھا لیکن بعد میں تسلیم کیا تھا ان کا اس یادداشت میں کوئی ذکر نہیں۔ سال گزشتہ اقوام متحدہ کے کمیشن برائے ہند و پاکستان نے اپنی پیرس رپورٹ میں ان میں سے کئی امور کو تسلیم کیا ہے وہ امور حسب ذیل ہیں:۔

اوّل۔ کشمیر پر قبائلیوں اور پاکستانیوں کا حملہ

پیرس رپورٹ کے صفحہ ۲۲ پیرا ۶۰ میں کمیشن نے صوبہ سرحد کے گورنر سر اے ڈنڈاس کا بیان درج کیا ہے یہ بیان کراچی میں ۲۱ جولائی کو دیا گیا تھا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ صوبہ سرحد میں قبائلیوں کو کشمیر جانے کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں انہیں پیٹرول دیا گیا اور ریل اور موٹر کے ذریعے نقل و حمل کی سہولت دی گئی۔ حکومت پاکستان کے سیکرٹری جنرل مسٹر محمد علی نے یہ بھی بتایا کہ اگر یہ پیٹرول نہ دیا جاتا تو یہ ایک طرح کی اقتصادی ناکہ بندی ہوتی اور حکومت پاکستان کے لئے اس کے نتائج خطرناک ہوتے۔ رپورٹ کے ۶۶ ویں پیرے میں سر ظفر اللہ نے بھی یہ امر تسلیم کیا ہے۔ پیراگراف نمبر ۱۱۹، ۱۲۰ اور ۱۲۳ میں کمیشن نے لکھا ہے:۔

"قبائلیوں نے پہاڑوں سے نکل کر جموں اور کشمیر کی ریاست پر دھاوا بولا۔ مشرقی جانب وہ اس کی جنوبی حد تک پہنچ گئے۔ وہ ریاست میں ملحقہ پاکستانی علاقے سے جنوب مغرب میں داخل ہوئے اور سرینگر کی بیرونی بستیوں تک پہنچ گئے۔"

"پاکستان کے لوگ جنگ کی خاطر جموں اور کشمیر میں داخل ہوئے۔"

"کمیشن کو امید ہے کہ وہ اپنے اختیارات کے ماتحت حکومت پاکستان کو اس بات پر راضی کریگا کہ وہ قبائلیوں اور پاکستانیوں کو اپنے اثر سے کام لے کر جموں اور کشمیر سے چلے جانے کے لئے کہے۔"

دوئم۔ جموں اور کشمیر میں پاکستانی فوجوں کی موجودگی اور سلامتی کی کونسل سے پاکستان کی ضمانت کے باوجود اس امر کا اخفا

کمیشن اپنی رپورٹ کے صفحہ ۵۹ پیراگراف ۱۲۲ و ۱۲۸ میں رقمطراز ہے:۔

"پاکستان کے وزیر خارجہ کے اس بیان نے کہ پاکستانی دستے جموں اور کشمیر کی ریاست میں داخل ہوئے ہیں اور بعد میں کمیشن کے سوال نامے کا جواب دیتے ہوئے ان کے اس اعتراف نے کہ آزاد کشمیر کی طرف سے لڑنے والی کئی فوجیں پاکستانی مجموعی کمان میں ہیں کمیشن کو ایک غیر متوقع اور نئی صورت حال سے دوچار کر دیا۔"

"سلامتی کی کونسل کے ریزولیوشن مورخہ ۱۷ جنوری کے مطابق حکومت پاکستان سے درخواست کی گئی تھی کہ اگر حالات میں کوئی اہم فرق تبدیلی ہو تو اس کی اطلاع سلامتی کونسل کو فوراً کر دی جائے۔ حکومت پاکستان نے اس

درخواست پر عمل کرنا منظور کر لیا تھا لیکن حکومت پاکستان نے سلامتی کی کونسل کو اس امر کی اطلاع نہیں دی کہ جموں اور کشمیر میں پاکستانی فوجیں موجود ہیں"۔

"پاکستان کے وزیر خارجہ سر محمد ظفر اللہ خاں کی رائے میں کشمیر میں پاکستانی فوجوں کی موجودگی کا مسئلہ بین الاقوامی ذمہ داریوں سے تعلق نہیں رکھتا کیونکہ پاکستان نے کشمیر میں عدم مداخلت کے سلسلہ میں کوئی ذمہ داری قبول نہیں کی تھی"۔ (صفحہ ۲۴ پیرا ۶۴)

سوئم۔ پاکستان نے کمیشن کی قرارداد مورخہ ۱۳ اگست نامنظور کر دی لیکن ہندوستان نے منظور کی۔

۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کو کمیشن نے ایک قرارداد پاس کی تاکہ حکومت ہائے ہند و پاکستان کو فوری متارکہ کے لئے راضی کیا جا سکے اور ان حالات کی اصلاح کی جا سکے جو امن عالم کے لئے باعث خطر ہیں ۲۰ اگست کو ہند کے وزیر اعظم نے ہند کی طرف سے اس ریزولیوشن کی منظوری کی اطلاع دی - ۲۵ اگست کو کمیشن کے چیئرمین نے اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا حکومت پاکستان کی طرف سے کمیشن کے ریزولیشن کا جواب پاکستان کے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں نے ۶ ستمبر کو بھیجا چیئرمین نے اس جواب کی رسید میں جو خط لکھا اس میں کہا گیا "کمیشن نے یہ بات نوٹ کی کہ آپ کی حکومت غیر مشروط طریقہ پر کمیشن کی تجاویز مندرجہ قرارداد مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء قبول نہیں کر سکتی"

چہارم۔ جب کمیشن ہند اور پاکستان سے گفت و شنید کر رہا تھا اس وقت اور یکم جنوری ۱۹۴۹ء کے بعد آزاد کشمیر کی فوجوں کی تربیت و اجتماع۔

حکومت پاکستان کو اس امر سے انکار ہے کہ آزاد کشمیر کی فوجوں میں ۵ جنوری ۱۹۴۹ء کے بعد اضافہ ہوا ہے۔
ان فوجوں کی از سر نو تنظیم کی گئی ہے منتخب عہدہ داروں اور پاکستانی فوج کے ان لوگوں کو جو کشمیر کے رہنے والے ہیں یونٹوں کی شکل دی گئی ہے - اس فوج کو پاکستانی فوج کے ہم پلہ سامان سے مسلح کیا گیا ہے - اور آزاد یونٹوں میں پاکستانی فوجوں کے افسروں کو مدغم کیا گیا ہے علیحدہ سگنل اور میڈیکل یونٹ قائم کئے گئے ہیں - متارکہ جنگ کے بعد گلگت اور سکردو میں ہوائی میدان بنائے گئے ہیں اس کی شہادت اس نام نہاد آزاد کشمیر حکومت کے صدر سردار ابراہیم کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو کی اور جس کی خبر پاکستان ٹائمز مورخہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۹ء میں چھپی ہے اس تقریر میں انہوں نے کہا تھا کہ متارکہ کے بعد نو مہینوں میں آزاد کشمیر حکومت نے اپنی فوجوں کو سو گنا بہتر بنا لیا ہے۔ حکومت ہند مسلسل اس بات پر زور دیتی رہی ہے کہ ریاست سے ہندوستانی فوجوں کو بلانے کے سلسلہ میں ریاست کے امن کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ۲۰ اگست ۱۹۴۸ء کو وزیر اعظم نے کمیشن کی توجہ اس طرف متوجہ کرائی اور اس کے بعد ۵ جنوری ۱۹۴۹ء والی قرارداد پر جس وقت غور ہو رہا تھا وزیر اعظم نے کہا "آزاد کشمیر کی فوجیں جنہیں پاکستان نے مسلح کیا ہے اور جو پاکستانی فوج کی کمان میں ہیں ان کی تعداد ہزاروں اور لاکھوں کے درمیان ہے ان دستوں کی موجودگی قرارداد مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کے حصہ دوئم پیرا اے ۳ کے مندرجہ علاقوں میں لام بندی ٹوٹنے کے بعد بھی اس علاقہ کے لئے خطرہ کا باعث ہوگی جو ہندوستانی اور ریاستی نظم و نسق کے ماتحت ہے ڈاکٹر لوزانو نے جواباً کہا "کمیشن کا یہ ارادہ ہے کہ ان فوجوں سے وسیع پیمانہ پر ہتھیار لئے جائیں" وزیر اعظم نے اس طرف توجہ مبذول کرائی کہ "لام شکنی ہتھیار لینے کے مترادف نہیں ہے اگر منتظم فوجوں کی لام شکنی کر دی جائے تو بھی اتنے بہت سے ہتھیار بند لوگوں کا ہونا جموں اور کشمیر کے ان حصوں میں امن و سلامتی کا موجب نہیں ہوگا جو ہندوستانی اور ریاستی فوجوں کے نظم و نسق میں ہیں یا جو قرارداد مورخہ ۱۳ اگست کے حصہ دوئم کے اے ۳ کے ماتحت آتے ہیں اور جو کہ پاکستان کے حامیوں کے سیاسی خیالات سے متفق نہیں ہیں۔ آزاد کشمیر کی فوجوں کی اتنی بڑی تعداد کی موجودگی میں وہاں کے باشندے جو مختلف سیاسی خیالات رکھتے ہیں داخل ہونے کی جرأت نہیں کریں گے اور اس طرح

ایک آزاد اور غیر جانبدار رائے شماری میں حصہ نہیں لے سکیں گے۔ اس تشریح کے پیش نظر ڈاکٹر لوزانو اس بات سے متفق ہوتے کہ "حملہ بڑے پیمانے پر ہتھیار لینا" کا یہی مطلب ہوگا کہ وہ کمیشن کے ارادے کی صحیح طور پر تشریح کرتا ہے"۔

ان حوالوں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ حکومت ہند نے جب ۵ رجنوری ۱۹۴۹ء کے ریزولیوشن کو قبول کیا تو وہ قطعی طور پر یہ سمجھتے تھے کہ ریاست کی یکجہتی اور ان حالات کی بحالی جن میں پناہ گزین آزاد علاقوں میں جا سکیں گے سمجھوتے کا ضروری عنصر ہیں حکومت ہند یہ نہیں سمجھتی تھی کہ آزاد فوجوں کی ۲۲ بٹالینوں سے سلامتی کو جو خطرہ ہے اسے اور ان کی لام تشکنی کے پروگرام اور ہندوستانی فوج کے بڑے حصے کے انخلا کے پروگرام کے باہمی تعلق کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

پنجم۔ جموں اور کشمیر میں ہندوستان کی پہل پر یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو متارکہ جنگ۔

جب گیارہ اگست والی قرارداد کی پاکستانی نامنظوری کے نتیجہ میں کمیشن نے نومبر ۱۹۴۸ء میں سمجھوتہ کی راہ تلاش کرنے کے لئے غیر رسمی گفت و شنید کی تجویز کی تو ہندوستان نے اسے مان لیا۔ ۱۱ر دسمبر کو پیرس میں کمیشن نے ہندوستان اور پاکستان کے نمایندوں کے سامنے کچھ تجاویز پیش کیں ۲۳ر دسمبر کو حکومت ہند نے انہیں مان لیا۔ پاکستان کی منظوری کی اطلاع ۲۵ر دسمبر کو دی گئی اس موقعہ پر کمیشن کی تجویزوں کے ۵ رجنوری والے ریزولیوشن میں الحاق سے ۴ دن قبل یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو ہندوستان نے متارکہ جنگ کے لئے پہل کی۔

ششم۔ نام نہاد آزاد کشمیر گورنمنٹ کو ہندوستان متحدہ اقوام کے کمیشن برائے ہند و پاکستان یا خود پاکستان نے بھی تسلیم نہیں کیا۔

"پاکستان کے وزیر خارجہ نے بتایا کہ آزاد کشمیر کو رسمی طور پر تسلیم کرنے کی درخواست فی الحقیقت تسلیم کرنے کے مترادف ہوگی اور کمیشن یہ نہیں کر سکتا وزیر خارجہ نے اس نقطۂ نگاہ کی معقولیت کو محسوس کیا خود حکومت پاکستان نے پیچیدگیوں کے پیش نظر آزاد تحریک کو قانونی طور پر منظور نہیں کیا ہے۔

ہفتم۔ اکتوبر نومبر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی طرف سے رائے شماری کی پیشکش کو حکومت پاکستان نے منظور کرنے سے انکار کر دیا اس نوعیت کی ایک تجویز جو شیخ عبداللہ نے کی تھی وہ بھی مسترد کر دی گئی۔

در اصل پاکستان نے نہیں بلکہ ہندوستان نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ بین الاقوامی نگرانی میں کشمیر کے عوام کی رائے معلوم کی جائے پہلی اور دوسری نومبر کی درمیانی شب کو جبکہ ہندوستانی دستے کشمیر بھیجے گئے تھے پنڈت جواہر لال نہرو نے ریاست کی حفاظت کا عہد کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ بعد میں اقوام متحدہ کی نگرانی میں رائے عامہ لی جائے گی۔ دوسرے دن ہند کے وزیر اعظم نے پاکستان کے وزیر اعظم کو ایک تار بھیجا جس میں یہ پیشکش دوہرائی گئی۔ ۴ر نومبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر لیاقت علی خان نے ایک تقریر نشر کرتے ہوئے یہ پیشکش مسترد کر دی۔ ۸ر نومبر ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے وزیر اعظم نے پاکستان کے وزیر اعظم کو ایک اور تار دیا اور یہ تجویز رکھی کہ ہند اور پاکستان کی حکومتیں مل کر مجلس اقوام متحدہ سے یہ درخواست کریں کہ وہ جلد از جلد کشمیر میں رائے عامہ معلوم کرے" اس اپیل کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔

مندرجہ بالا بیانات کے باوجود مشتاق احمد گورمانی یہ کہتے ہیں کہ "نومبر ۱۹۴۷ء میں حکومت پاکستان نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ پورا قضیۂ کشمیر فیصلے کے لئے اقوام متحدہ کے سامنے پیش کر دیا جائے لیکن ہندوستان کے وزیر اعظم نے یہ جواب دیا کہ متحدہ اقوام کی سلامتی کونسل اس مسئلہ میں ثالثی نہیں کر سکتی"۔

۸ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو شیخ محمد عبداللہ نے بھی ایسی ایک پیشکش کی۔ ۳۱ر اکتوبر کو شیخ محمد عبداللہ نے جموں اور کشمیر کی وزارت عامی کا قلمدان سنبھالا تو انہوں نے مسٹر جناح سے یہ درخواست کی کہ وہ مسئلہ الحاق کے سلسلہ میں ریاست کے عوام کی رائے لینے کے جمہوری اصول کو تسلیم کریں۔ شیخ عبداللہ نے مسٹر جناح سے حملہ آوروں کے انخلا کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنے کے لئے یہ کہا کہ اگر وہ چاہیں تو میں کراچی آنے کے

لئے تیار رہوں -

لیکن یہاں بھی صدائے برنخواست والا سلسلہ رہا -

ہشتم۔ حکمران کی خواہش کے باوجود ہندوستان کے ساتھ معاہدہ جاریہ نہ ہوا۔ سر محمد ظفر اللہ خاں نے سلامتی کونسل کے سامنے جو کچھ کہا اس کے برخلاف اب پاکستان معاہدہ جاریہ کے تحت دفاع امور خارجہ اور مواصلات پر اختیار کا مدعی ہے حالانکہ اس نوعیت کا دعوٰی مترادف ہے کشمیر کے پاکستان میں الحاق کے جس کا کمیشن نے یا حکومت پاکستان نے کبھی تذکرہ بھی نہیں کیا -

یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کی شکایت کے جواب میں معاہدہ جاریہ کی صحیح نوعیت بتانے کے باوجود حکومت پاکستان اب ایک ایسا دعوٰی پیش کر رہی ہے جو بدیہی طور پر غیر معقول ہے -

حقیقت یہ ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جموں اور کشمیر کے وزیر اعظم نے حکومت پاکستان سے بذریعہ تار یہ کہا کہ حکومت جموں اور کشمیر حکومت پاکستان سے ان تمام معاملات پر معاہدہ جاریہ کرنے پر تیار ہے جن پر برطانوی ہند کی حکومت سے اس وقت سمجھوتہ ہے تجویز یہ ہے کہ جب تک باقاعدہ طور سے سمجھوتے نہ ہوں - اس وقت تک موجودہ بندوبست کو ہی جاری رکھا جائے اس نوعیت کا ایک تار حکومت ہند کو بھی بھیجا گیا تھا۔ حکومت پاکستان نے یہ تجویز منظور کر لی لیکن حکومت ہند نے یہ جواب دیا کہ جموں اور کشمیر کی حکومت اپنے ایک نمایندہ کو دہلی بھیجے -

تار میں جس بندوبست کا مذکرہ کیا گیا تھا وہ کسٹم مواصلات ڈاک و تار شہری رسد اور ایسے ہی معاملات سے متعلق تھے۔ امور خارجہ یا دفاع کا کوئی ذکر نہ تھا حکومت پاکستان بھی یہی سمجھتی تھی چنانچہ دستاویز نمبر ۳ جو سر ظفر اللہ خاں نے اپنے ۱۵ جنوری والے مکتوب کے ساتھ سلامتی کونسل کے سامنے پیش کی تھی اس کے پیرے ۱۵ میں لکھا ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جموں اور کشمیر کی ریاست دوسری ریاستوں کی طرح کسی دوسری ڈومینین میں شامل ہونے یا نہ ہونے میں پوری طرح آزاد تھی۔ ریاست نے پاکستان کے ساتھ ایک معاہدہ جاریہ کیا جس کے مطابق ڈاک و تار کا انتظام پاکستان کو سونپا گیا کیونکہ ریاست کے تمام قدرتی راستے پاکستان میں ہیں اس لئے باہر سے تمام رسد پاکستان سے ہوتی ہوئی ریاست میں پہنچتی ہے"۔

سر ظفر اللہ خاں نے ۱۷ جنوری ۱۹۴۸ء کو سیکورٹی کونسل میں تقریر کرتے ہوئے اس نوعیت کی بات کی -

اگر پاکستان فی الحقیقت یہ سمجھتا تھا کہ تاروں کے اس تبادلہ کا مطلب ایک ایسا معاہدہ جاریہ ہے جو امور خارجہ اور دفاع پر حاوی ہے تو پھر یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان جموں اور کشمیر اور ہندوستان میں جن تاروں کا تبادلہ ہوا ان میں سے کسی ایک میں بھی اس امر کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔

نہم۔ معاہدہ جاریہ پر دستخطوں کے وقت تک مسٹر جناح اور لیگ رجعت پسند والیان ریاست کی جس میں والئی کشمیر بھی شامل ہیں عوام کے خلاف حمایت کرتے رہے -

اس وقت جب کہ پاکستان کے سامنے حکمران کی مرضی سند تھی ہندوستان یہ اصرار کر رہا تھا کہ کسی ریاست کا الحاق بھی خواہ وہ ہند کے ساتھ ہو یا پاکستان کے ساتھ عوام کی مرضی کے موافق ہونا چاہئے ۔ مشہور مقالہ نگار بزمی نے لاہور کے روزنامہ احسان میں حالات کا حسب ذیل جائزہ لیا ہے -

"۱۵ اگست کو انتقال اختیارات کے وقت کشمیر کی صورتِ حال یہ تھی کہ کانگریس کا براہ راست کشمیر کا سیاسی تحریک سے تعلق تھا اور مسلم لیگ بالکل الگ تھلگ الحاقِ ریاست کے الحاق کی حمایت کر رہی تھی کہ ان میں عوام کی مرضی کے خلاف ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا اختیار رہے -

"کشمیر کے ہندوستان سے الحاق کے متعلق مہاراجہ کے اس اعلان سے پاکستان کو بڑی حیرت ہوئی لیکن

قائد اعظم لیگ کو اس اصول کا پابند بنا چکے تھے کہ ریاستوں کا مستقبل طے کرنے کا اختیار والیانِ ریاست کو ہے اس لئے آئینی طور پر پاکستان اس معاملہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بعد پٹھان مجاہدین کے ریاست میں داخلہ سے حالات اور بھی پیچیدہ ہو گئی کیونکہ انہوں نے بغیر کسی نظریہ کے لوگوں کی لوٹ مار شروع کر دی۔

چونکہ کشمیری مہاراجہ کے خلاف مسلسل جد و جہد کر چکے ہیں اس لئے ان کے دلوں میں مہاراجہ سے نفرت ہو گئی ہے جب انہیں یہ محسوس ہوا کہ پاکستان مہاراجہ کے خلاف ان کی مدد کرنے کو تیار نہیں تو انہوں نے ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق قبول کر لیا وہاں انہیں اس امر کا یقین تھا کہ مہاراجہ کے خلاف انہیں کانگریس کی حمایت حاصل ہوگی"۔

مضمون کے آخر میں بزمی نے لکھا ہے کہ ہند یونین کو اتنی زبردست مدد مہاراجہ سے نہیں بلکہ شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس سے ملی ہے یہ کانفرنس ۱۹۳۰ء سے سیاسی میدان میں پیش پیش رہی ہے اور اس کے لیڈر عوام میں بہت زیادہ ہر دلعزیز ہیں اس کے باوجود لیگ نے شیخ عبداللہ سے سمجھوتہ کرنے کی بجائے باغیوں کی مدد پر بھروسہ کرنا زیادہ مناسب سمجھا حالانکہ انہیں نہ کشمیر میں کوئی حمایت حاصل ہے اور نہ کشمیری انہیں جانتے ہیں۔

دہم۔ جب پاکستان اور ریاست سے ملحقہ ہندوستانی علاقوں میں فرقہ وارانہ آگ بھڑک رہی تھی اس وقت ہندو سکھ اور مسلمان کشمیر میں داخل ہو رہے تھے اور ریاست میں ایک بھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا۔

۴ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو شیخ محمد عبداللہ نے سرینگر میں ایک بڑے جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "میں ہندوؤں اور سکھوں کو یقین دلاتا ہوں کہ جب تک میں زندہ ہوں ان کی جان اور عزت پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ کشمیر نے اس نازک موقعہ پر راہ ہدایت دکھائی ہے جبکہ چاروں طرف بھائی بھائی کو مار رہا تھا کشمیر نے اس موقعہ پر ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ بلند کیا۔ مہاتما گاندھی نے بھی ۲ر نومبر کو اپنی پرارتھنا سبھا میں اس بات کی تصدیق کی۔

یازدہم۔ حملہ آوروں کا دعوی تو یہ تھا کہ وہ کشمیر کو آزاد کرا رہے ہیں لیکن انہوں نے غیر مسلموں پر ہی نہیں بلکہ ریاست کے مسلمانوں اور غیر ملکی لوگوں پر بھی مظالم ڈھائے۔ قتل کیا آگ لگائی لوٹا اور اغوا کیا۔

جموں اور کشمیر کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ نے ۷ر نومبر کو ایک بیان دیا اس میں انہوں نے کہا کہ ان لوگوں نے جو اپنے آپ کو اسلام کا خادم کہتے ہیں ہماری زمینوں کو جلایا گھروں کو برباد کیا اور عورتوں کی عزت لوٹی اور سینکڑوں گاؤں کو تاخت و تاراج کیا ان لوگوں نے قرآن مجید کی بے عزتی کی مسجدوں کی بے حرمتی کی اور انہیں قحبہ خانوں میں تبدیل کر دیا تاکہ وہ اغوا شدہ عورتوں سے اپنی حیوانی خواہشوں کو پورا کر سکیں مجھے اپنے سکھ اور ہندو ہموطنوں سے بھی ہمدردی ہے کیونکہ انہیں بھی مظالم کا نشانہ بنایا گیا ہے مجھے مسیحی کونونیٹ سے بھی ہمدردی ہے کہ ان لوگوں کے ہاتھوں وہاں کے مکینوں کو بھی لوٹ مار کا نشانہ بننا پڑا۔

اس کے علاوہ ایک آنکھوں دیکھی شہادت بھی موجود ہے یہ بیان ۱۹ر نومبر ۱۹۴۷ء کو راولپنڈی (پاکستان) میں بارہ مولہ کانونیٹ کی قتل و غارت کے بعد دیا گیا تھا اس بیان میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح حملہ آوروں نے کرنل ڈائکس اور ان کی بیوی کو قتل کیا اور اس قتل کے بعد انہوں نے لوٹ مار کی پھر وہ ہسپتال کی طرف بڑھے جہاں انہوں نے مسٹر بریٹو کو بھی گولی مار دی۔ مدر سپیریر کو بھی نشانہ بنایا گیا راہبہ بھی گولی کا نشانہ بنیں اور اس کے بعد حملہ آور کلیسا کی طرف بڑھے جہاں انہوں نے ہر ایک صلیب کو توڑا اور ہر چیز کو لوٹا۔
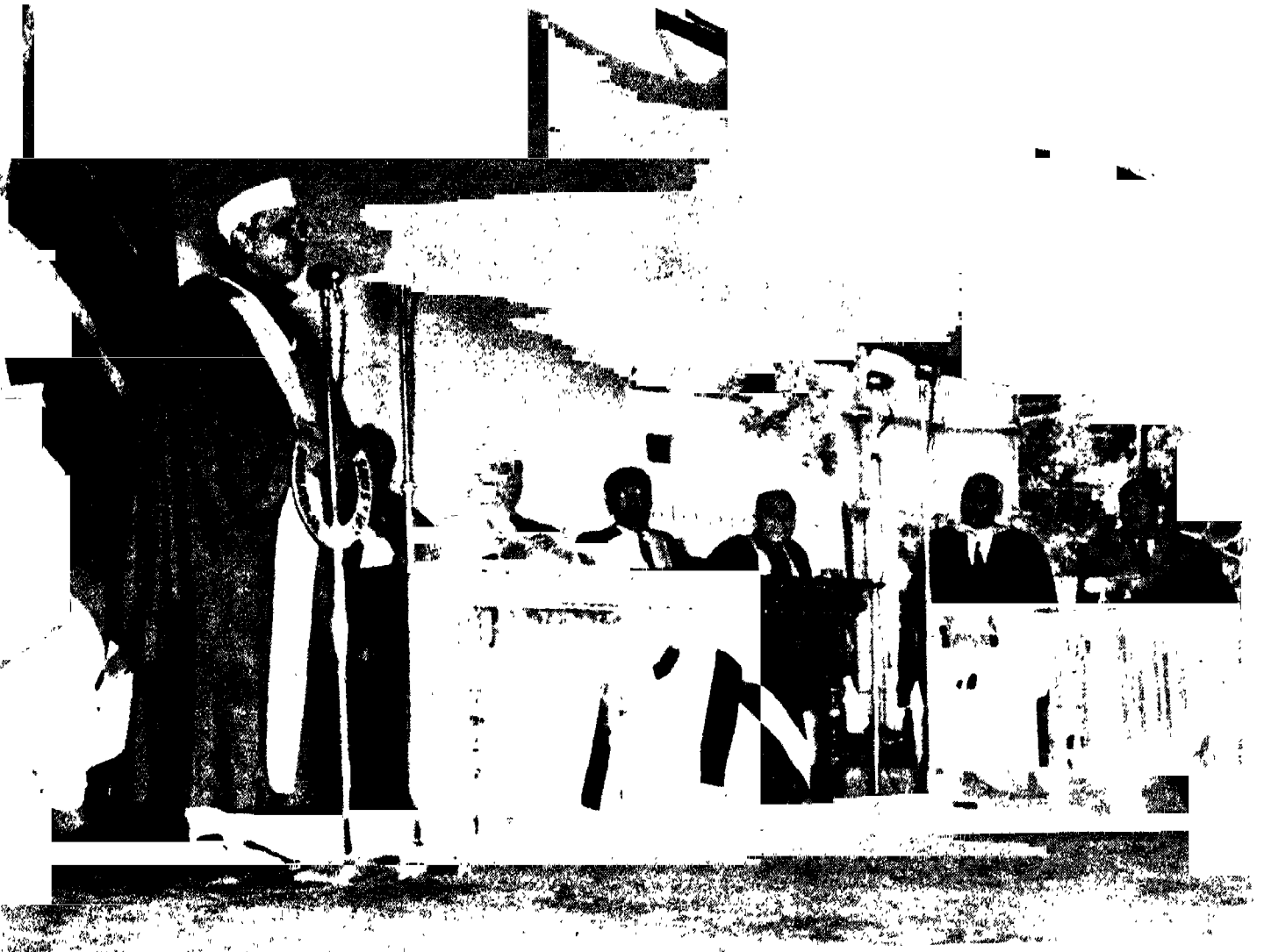
پنڈت نہرو انجنیرنگ یونیورسٹی رڑکی میں

۲۵ نومبر کو ہندوستان کی پہلی انجنیرنگ یونیورسٹی نے جس کی ابتدا محض ایک کالج سے ہوئی تھی اپنی زندگی کی ایک صدی ختم کی۔ اس صد سالہ جشن پر پنڈت جواہر لال نہرو نے طلبا میں ڈگریاں تقسیم کیں۔

تصویر میں:۔ پنڈت نہرو کنووکیشن ایڈریس پڑھ رہے ہیں۔ آپ کے دائیں طرف پنڈت گووند بلبھ پنت پردھان منتری یوپی اور بائیں طرف شری ایچ. پی. مودی گورنر یوپی اور دیگر معززین تشریف فرما ہیں۔

فرید آباد ۔ شرنارتھیوں کا نیا شہر
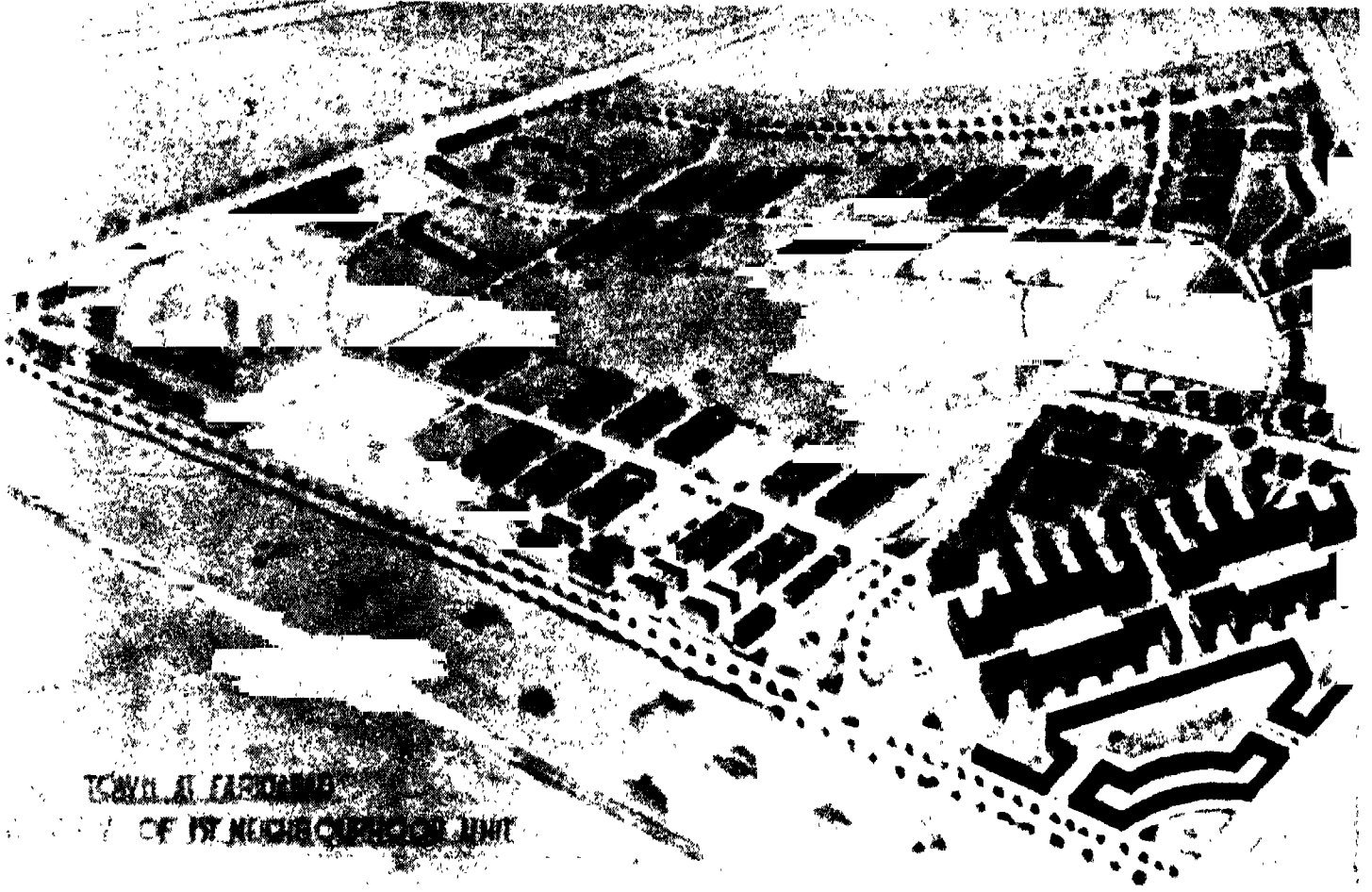
فریدآباد کا نقشہ

شرنارتھیوں کی سہولت کے لئے فریدآباد میں ٹیوب ویل کھودا جا رہا ہے۔

عرب کی سرائے نئی دہلی کے ٹریننگ سنٹر میں کام کرنے والے جاپانی کاریگر جن کی خدمات حکومت ہند کے بے گھر لوگوں کو بسانے کے محکمے نے کچھ مدت کیلئے حاصل کی ہیں۔ اس محکمے نے پچھلے دنوں جاپان سے چھوٹی چھوٹی صنعتوں اور دستکاریوں کیلئے ۵۰ مختلف قسم کی مشینیں خریدیں۔ یہ کاریگر ہندوستانیوں کو ان مشینوں کے چلانے کا کام سکھائیں گے اور صوبائی اور ریاستی سرکاروں کی طرف سے بھیجے گئے لوگوں کو ٹریننگ دیں گے۔ یہ اشخاص ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد دوسرے لوگوں کو ٹریننگ دیں گے اور ہندوستان کے مختلف حصوں میں گھریلو اور چھوٹی چھوٹی دستکاریاں قائم کریں گے۔

۱۹۵۸ء میں ہند کی سفیر
شریمتی وجے لکشمی
سٹاکٹن کے سکھ گوردوارہ
میں تشریف لے گئیں۔
یہ فوٹو اسی موقع پر لیا
گیا تھا۔

راجدھانی میں فلیگ ڈے

لیڈی والنٹیرز پردھان منتری
کے ہاتھ فلیگ بیچ رہی ہیں۔

شانتی نکیتن

ٹیگور نے ایک بار کہا تھا کہ جس چیز نے اُن کی توجہ شاعری سے فنِ تعلیم کی طرف منتقل کی اور اس صدی کے آغاز میں انھیں شانتی نکیتن میں ایک نیا اسکول جاری کرنے پر آمادہ کیا وہ تعلیم کا کوئی نیا نظریہ نہیں بلکہ اسکول کی تعلیم کے متعلق ان کی اپنی افسوسناک تجربے کی یاد تھی۔ لیکن اسکول کی تعلیم کے متعلق ٹیگور کا بچپن کا تجربہ بنیادی طور پر دوسرے بچوں سے کسی طرح مختلف نہ تھا۔ ہندوستان میں برٹش نے جو نظامِ تعلیم رائج کیا وہ کافی حد تک اس کے اپنے نظامِ تعلیم کا خاکہ تھا۔ یہ نظامِ تعلیم ہندوستان کی قومی فطرت کے لئے اجنبی تھا۔ لہٰذا اس کا بارآور ہونا ممکن نہیں تھا۔ ہمارے اسکولوں میں طوطے کی طرح ٹریننگ دی جاتی تھی۔ یہاں کی زندگی مصنوعی تھی اور سارا ماحول غیر ہمدردانہ تھا۔ ہمارے فوجی بارکوں سے مشابہ اسکول جن کی دیواریں سفیدی کے پلستر سے لپی ہوتی ہیں، انسان کے دل میں پرانے شفاخانوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو ان سے کچھ بہتر بھی نہیں ہیں۔ ٹیگور نے عہد کیا کہ وہ کم از کم اپنے بچوں کو اسکول کی اس پُر اذیت زندگی سے بچائے گا جس میں ایک خاص قسم کے ضبط پر زور دیا جاتا ہے۔ اور بچے کی انفرادیت کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ بس یہ ہے شانتی نکیتن کے آغاز و قیام کی مختصر تاریخ۔ یہ اسکول جدید ہندوستان کا مشہور ترین تعلیمی تجربہ ہے۔

اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ جب ٹیگور نے اپنے سکونتی اسکول کی بنیاد رکھنے کا جرأت مندانہ فیصلہ کیا تو اُس کی پشت پر ایک گہرا مقصد موجود تھا۔ اُسے اس بات سے بڑی کوفت ہوتی تھی کہ ہمارا نظامِ تعلیم ہمارے بچوں کی قومی خصوصیات کو زائل کر رہا ہے۔ لہٰذا اس کا دل روحانی طور پر ہمارے قدیم تپوبنوں کی یاد کے گرد گھومنے لگا۔ جن کو نہ تو سکول ہی کہا جا سکتا تھا اور نہ جدید معنوں میں عبادت گاہوں کا نام ہی دیا جا سکتا تھا۔ تپوبنوں میں طالب علم صرف گرامر اور منطق ہی نہیں پڑھتے تھے بلکہ وہ اپنے استاد کی ساری زندگی میں شرکت کرتے تھے۔ یہاں طالب علموں کا فطرت سے براہِ راست رابطہ ہوتا تھا، جو سب سے بڑی استاد ہے۔ اس استاد سے وہ زندگی کے اہم ترین سبق سیکھتے تھے۔ ٹیگور کو اس کا یقین تھا کہ اگر اس نئے اسکول کو کوئی اہم مقصد انجام دینا ہے تو اُسے صرف ایک نیا تعلیمی کارخانہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اُسے زندہ ذہنوں کا بے جان پنجرہ نہیں بننا چاہیئے۔ جہاں ان کو مصنوعی طور پر تیار شدہ خوراک بہم پہنچائی جاتی ہو۔ نیا اسکول کھلی ہوا میں ہونا چاہیئے۔ جہاں استاد اور طالب علم مل کر حق و صداقت کی طلب اور تمدن سے بہرہ مند ہونے کی آرزو پوری کر سکیں۔

شانتی نکیتن کا سکول آج سے ۴۹ سال پہلے قائم ہوا تھا۔ اس میں پانچ طالب علم تھے اور پانچ استاد۔ استادوں میں اسکول کا بانی بھی شامل تھا۔ اس اسکول کے لئے چند ہزار روپے کا سرمایہ فراہم کرنے کے لئے ٹیگور نے اپنا بنگلہ فروخت کر دیا جو پوری میں سمندر کے کنارے واقع تھا۔ اس کے علاوہ ٹیگور کو اپنی بیوی کے زیور بھی گروی رکھنا پڑے۔ یہ اسکول ٹیگور کے لئے ایک مالی بوجھ بن گیا کیونکہ قدیم ہندوستانی روایات کے مطابق یہاں طالب علموں سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ اور اُن کے رہن سہن کے اخراجات بھی گورو دیو خود برداشت کرتے تھے۔ اسکول کے قیام کے وقت ٹیگور اگرچہ بنگالی کا ممتاز شاعر بن چکا تھا لیکن اُسے اپنی کتابوں سے کچھ قابلِ ذکر آمدنی نہ ہوتی تھی۔ ٹیگور کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ وہ ماہانہ

الاؤنس تھا جو اس کے لئے خاندانی جائداد میں سے مقرر تھا۔ اسکول کی وجہ سے ہر سال قرض میں اضافہ ہونے لگا۔ یہ قرض ٹیگور نے اس آمدنی سے ادا کیا جو اسے پہلی جنگ عظیم کے دوران میں امریکہ کے دورے سے ہوئی۔ اس دورے میں ٹیگور نے امریکہ کے مختلف شہروں میں لکچر دئے تھے۔ ٹیگور کو نوبل پرائز سے جو روپیہ ملا اسے بھی اس نے اسکول کی بڑھتی ہوئی ضروریات پر صرف کر دیا۔

شانتی نکیتن کے آشرم کا ماحول آدرش ماحول ہے۔ آج یہ آشرم آپ اپنی ایک چھوٹی سی دُنیا ہے۔ ٹیگور کے والد دیوندر ناتھ ٹیگور جن کو ہندوستانی احتراماً مہرشی کہہ کر پکارتے تھے، سیر و سیاحت کے بڑے شوقین تھے۔ ایک مرتبہ پھرتے پھراتے ان کی نظر کلکتہ سے ایک سو میل پچھم میں ایک وسیع قطعۂ زمین پر پڑی جو کئی مربع میل میں پھیلا ہوا تھا۔ یہ آج سے ایک سو سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت یہ مشہور تھا کہ یہ جگہ ڈاکوؤں کی آماجگاہ ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جب وہاں پہلے پہل مکان بنائے گئے تو زمین کو چند انچ کھودنے کے بعد ہی انسانی ہڈیاں نمودار ہونے لگتی تھیں۔ یہاں چھت یارنی کے دو درختوں کے علاوہ نباتات کا بھی وجود نہیں تھا۔ ان درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر مہرشی خاموشی سے ایشور دھیان کیا کرتے تھے۔ یہ درخت اب بھی وہاں موجود ہیں۔ جیسے وہ آشرم کی حفاظت کرنے والے دو فرشتے ہوں۔ قدامت کی وجہ سے ان درختوں کی کمریں جھک گئی ہیں۔ اِس تنہا اور صحرا نما جگہ میں شاعر کے والد مہرشی دیویندر ناتھ ٹیگور نے اپنے لئے ایک دو منزلہ مکان بنایا، اور اس کا نام انہوں نے شانتی نکیتن رکھا۔ یعنی "امن کا مسکن"۔ موجودہ یونیورسٹی کا شہر اسی مکان کے گرد بنا ہے۔ قدیم مکان اب تک موجود ہے۔ اور دُور و نزدیک سے آنے والے لوگوں کے لئے مہمان گھر کا کام دیتا ہے۔

پہلے بیس سال شانتی نکیتن کا سکول ٹیگور کی ذاتی نگرانی میں چلا۔ لیکن ۱۹۲۱ء میں ٹیگور نے اس کا انتظام ایک پبلک ٹرسٹ کے حوالے کر دیا، اور اُسے وشو بھارتی کے نام سے ایک بین الاقوامی یونیورسٹی کی شکل دیدی۔ اس یونیورسٹی کا مقصد یہ تھا کہ انسانی ذہن سچائی کی مختلف شکلوں کو مختلف نقطہ ہائے نظر سے معلوم کرنے کی جو کوشش کرتا ہے اس کا مطالعہ کیا جائے۔ وشو بھارتی کا انتظامی کنٹرول گورنرز کی ایک کونسل کے سپرد ہے جن کو منتخب کیا جاتا ہے۔ کونسل کا صدر آچاریہ کہلاتا ہے۔ وشو بھارتی میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم مشترکہ ہے۔ اور بیشتر طالب علم یونیورسٹی میں ہی رہتے ہیں۔ یہ بے مثل یونیورسٹی جو گزشتہ پچاس سال کے عرصے میں ایک چھوٹے سے اسکول سے ترقی کر کے اپنی موجودہ حیثیت کو پہنچی ہے، آج اس بات کا دعویٰ کر سکتی ہے کہ اس میں مختلف شعبوں کی اعلیٰ ترین تعلیم کا انتظام ہے۔ اور اس کی لائبریری ملک کی بہترین لائبریریوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کا فن مصوری کا اسکول جسے کلا بھون کہا جاتا ہے ہندوستان بھر کے فنونِ لطیفہ کے اسکولوں میں سب سے زیادہ قومی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کے ڈائریکٹر مشہور مصور نند لال بوس ہیں۔ وشو بھارتی میں چینی اور تبتی علوم کے مطالعے کے لئے ایک علیحدہ کالج ہے۔ اس کالج کی ایک شاندار لائبریری ہے۔ جہاں ہندوستان اور چین کے عالموں کے گہرے تعاون سے ہندوستان کے ماضی کے متعلق اہم ریسرچ کی جا رہی ہے۔ یہاں کا رقص اور نغمہ کا اسکول یعنی سنگیت بھون ملک کی تمدنی زندگی میں ایک ممتاز جگہ رکھتا ہے۔ شانتی نکیتن میں تازہ ترین اضافہ یہ ہے کہ اس کے بانی کی زندگی اور اُس کے کام کے متعلق ریسرچ کرنے کے متعلق ریسرچ کرنے کے لئے ایک الگ شعبہ قائم کر دیا گیا ہے۔ یہاں صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ سمندر پار کے طالب علم بھی حصولِ تعلیم کے لئے آتے ہیں۔ اُن کا تعلق سماج کے مختلف درجوں سے ہوتا ہے۔ یہاں ذات، عقیدے، مذہب اور نسل کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا۔ یہاں کسی کو اس بنا پر کوئی رعائت نہیں ملتی کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دام دے سکتا ہے۔ مساوات کے اس ماحول میں ایک شہزادہ اور ایک عام آدمی ایک جیسا کھانا کھاتے ہیں۔ اور ایک ہی چھت کے نیچے بھائیوں کی طرح محبت سے رہتے ہیں۔

وشو بھارتی کو اب عام طور پر آشرم کہا جاتا ہے۔ یہاں کی زندگی اس کے روزِ قیام سے اس وقت تک انتہائی سادہ رہی ہے۔ ٹیگور نے غریبانہ زندگی کی مدح سرائی کبھی نہیں کی۔ لیکن ان کا یہ عقیدہ ضرور تھا کہ امیرانہ زندگی بسر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی مقابلتاً

غیرحقیقی دنیا میں رہے۔ غریبی بہت بڑا استاد ہے جس کے سبق زندگی کے لئے بہت مفید ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شانتی نکیتن میں طرزِ زندگی انتہائی سادہ ہے۔ جہاں تک اینٹ چونے کا سوال ہے، شانتی نکیتن کسی طرح بھی پُرشکوہ نہیں۔ تعلیم اب بھی درختوں کی چھاؤں میں کھلی ہوا میں ہوتی ہے۔ درخت یہاں ہر سال لگائے جاتے ہیں۔ جن کی فراوانی نے شانتی نکیتن کو باغوں کا شہر بنا دیا ہے۔

پڑھائی کا کام صبح کے ابتدائی گھنٹوں میں ہوتا ہے اور بلیک بورڈ کے علاوہ کسی جماعت کے پاس اور کوئی فرنیچر نہیں ہوتا۔ شاگرد اور استاد دوستوں کی طرح گھیرا باندھ کر پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ اور ہر ایک اپنی الگ مختصر سی چٹائی پر بیٹھتا ہے۔ ہر جماعت میں طالب علموں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ اور وہ سب ایک دوسرے کے پوری طرح واقف ہوتے ہیں۔ وشو بھارتی کے گنبد پر فخریہ طور پر لکھا ہوا ہے: "یہاں خود دُنیا کو اس کا حقیقی ٹھکانا اور سکون ملتا ہے"۔ یہ ایک مسرور گھرانا ہے۔ عالموں کی ایک جماعت جو علم اور سچائی کی تلاش میں مصروف ہے۔ شانتی نکیتن جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہے واقعی شانتی اور روشنی کا گھر ہے۔

بہار پرانت کی سرگرمیاں

"اگاؤ اور اناج" کی مہم "اگاؤ اور اناج" کے سلسلے میں ماہ اگست میں ۱۷۴ کنوئیں اور ۹۹ چھوٹے زراعتی تالاب کھودے گئے۔ ۲۴۴۲۳ کنوئیں اور [illegible] زراعتی تالاب زیرِ تعمیر ہیں۔ اس سال یعنی ۱۹۴۹-۵۰ء کے دوران میں ماہ اگست تک ۲۱۶۲ کنوئیں اور [illegible] زراعتی تالاب بنوائے گئے۔ یاد رہے کہ یہ تعداد اُن چھوٹے زراعتی تالابوں کے علاوہ ہے جن کی تکمیل محکمہ مال کی طرف سے کی گئی ہے۔

معدنیات صوبے میں جو معدنیات اس وقت تک دریافت ہوئی ہیں وہ اُس چھپی ہوئی قومی دولت کا ایک معمولی سا حصہ ہیں جو دھرتی کے پیٹ میں مدفون ہیں۔ ہند میں معدنیات کے متعلق ریسرچ کرنے والے محکمے جیالوجیکل سروے آف انڈیا پچھلے سال میں بہار کے خاص منتخب شدہ علاقوں میں ہی معدنیات دریافت کرنے کا کام انجام دیتا رہا ہے۔ اور حال ہی میں اس نے جھریا میں کنکر کا ایک بڑا ذخیرہ دریافت کیا ہے جو خام مال کے طور پر سیمنٹ بنانے کے کام میں بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ محکمۂ صنعت کے ڈائرکٹر اس کے متعلق رپورٹ کا بغور مطالعہ کر رہے ہیں۔ بہار گورنمنٹ نے اس سلسلے میں یہ محسوس کیا کہ اس قدر کم مدت میں اتنے بڑے معدنی ذخیروں کی ریسرچ کا کام اس محکمے کے لئے ممکن نہ ہو سکے گا۔ جب تک کہ جیالوجیکل سروے آف انڈیا کی ایک باقاعدہ اور با اختیار برانچ صوبے میں قائم نہ کی جائے۔ اس لئے صوبائی گورنمنٹ نے جیالوجیکل سروے آف انڈیا سے درخواست کی ہے کہ وہ پٹنے میں اپنا برانچ دفتر قائم کرے۔ توقع کی جاتی ہے کہ فسٹ گریڈ کے دو ماہرین ریسرچ کے ساتھ یہ برانچ بہت جلد اپنا کام شروع کر دے گی۔ بہار گورنمنٹ کو قوی امید ہے کہ وہ اس برانچ دفتر کی امداد سے معدنی ذرائع کو باقاعدہ طور پر دریافت کرنے کے لئے ایک موثر پروگرام مرتب کرے گی اور اس امر کی تفصیلات طے کرے گی کہ اس پروگرام کو برقرار رکھنے۔ ترقی دینے اور مفید بنانے کے لئے کون کون سے ذرائع استعمال میں لائے جائیں۔

اُن اختیارات کے تحت جو مائنز اینڈ منرلز ایکٹ ۱۹۴۸ء کی رُو سے اسے حاصل ہیں۔ مرکزی حکومت معدنیات کے کام کو سائنٹیفک طور پر بحال رکھنے اور اُسے زیادہ مفید بنانے کے لئے قواعد مرتب کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں مرکزی گورنمنٹ نے صوبائی سرکار کے سامنے یہ تجویز رکھی ہے کہ کان کنی کے کام کے لئے ایک علیحدہ محکمہ قائم کر دیا جائے جو اپنے قواعد خود ہی مرتب کرے۔ اور اس کام کو مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں لے لے۔ حکومت بہار اس نئے محکمے کو قائم کرنے کے سوال پر پوری طرح غور و خوض کر رہی ہے۔

نور جہاں جمالی

خُون

اللہ ۔۔! اس نے کتاب کو بک شیلف پر ٹپکتے ہوئے گہرا سانس لیا، اور اٹھ کر اس نے پنجوں پر وزن ڈال کر انگڑائی لی ۔ مگر اس کے باوجود اسے محسوس ہوا کمرہ کی ہر ایک چیز اداس ہے اسی کی طرح نڈھال مضمحل، چاروں طرف گہرا سکوت پھیلا ہوا تھا جیسے زندگی موت کے آغوش میں پڑی سسک رہی ہو ۔۔۔ پھر ہولے ہولے اس کے اندر بیزاری کا احساس گونجنے لگا، رگ رگ میں جلن سی ہونے لگی ۔ اس نے تھکی تھکی نگاہوں سے ماحول کا جائزہ لیا ۔

سامنے دیوار پر لٹکا ہوا سبز کلینڈر اونگ رہا تھا اور اس پر لکھے ہوئے "ان اللہ مع الصابرین" کے موٹے موٹے حروف آپس میں گتھم گتھا ہو کر نڈھال پڑے سسک رہے تھے ۔ سامنے میز پر رکھی ہوئی گھڑی شدت احساس سے کراہ رہی تھی "ٹک ٹک ٹک ۔ دریچے کے بازو میں لٹکی ہوئی تصویر میں مسکراتے ہوئے بھائی جان جیسے منہ بسور رہے تھے، اور بک شیلف پر بکھری ہوئی راشد الخیری کی مجلد کتابیں اپنی حالت زار پر آنسو بہا رہی تھیں، نیچے فرش پر بچھی ہوئی دری یوں معلوم ہو رہی تھی جیسے کسی مریض کے ماتھے پر ابھری ہوئی لکیریں ۔۔۔ خدایا! اس کے حلق سے آہ نکل گئی ۔۔۔

اچانک اسے محسوس ہوا اس کے اندر الاؤ جل رہا ہے، سینہ کے آس پاس اور جسم کی رگ رگ میں آتشیں سیال دوڑ رہا ہے ۔ اس کا جی چاہا زور سے چیخ مارے ۔۔ اس زور سے کہ سارا ماحول چونک پڑے ۔ ہڑبڑا کر، بوکھلا کر ہر چیز اس کی طرف دیکھے اور دیکھتی رہے مگر اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی ۔

وہ باہر آ گئی ۔۔ باہر باغ میں پہلے تو شام کے پھیلتے ہوئے دھندلکے کی وجہ سے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا مگر جب اس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے روش پر چلنا شروع کیا تو آپ ہی آپ اسے کمرے کی بہ نسبت یہاں ہر اک چیز بدلی ہوئی دکھائی دی، متحرک، جاندار روشن ۔۔ وہ ٹہلتی ہوئی جب بنگلے کے پچھواڑے سے ہو کر بارہ دری کے سامنے پہنچی تو آپ ہی آپ اس کے قدم رُک گئے، بارہ دری بند پڑی، مقفّل، تاریک، قبر کی طرح ویران ....

"۔۔۔" ایک انوکھا احساس اس کی شریانوں میں گرم گرم لاوے کی طرح کھولنے لگا ۔ اس نے بارہا اس لاوے کو اُگلنا چاہا مگر جیسے وہ آتش فشاں کی طرح پھٹنے کے لئے وقت کا منتظر کھڑا تھا آخ تھو ۔۔۔! اس نے بارہ دری کی طرف حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے تھوک دیا ۔۔۔ اور درختوں سے گرتے ہوئے سوکھے سوکھے پتے اس کے قدموں کے نیچے چرچرانے لگے، پھر آہستہ آہستہ افق کی نیلگوں وسعتوں میں چمکیلے ستاروں کی کافوری قندیلیں جھلملانے لگیں، رات کا سناٹا اُبھرنے لگا، اسے محسوس ہوا کانوں کی نوکیلوں میں، ہلکی ہلکی نمی جذب ہو رہی ہے اور تپتے ہوئے رخساروں پر ہوتے ہوئے میٹھی ٹھنڈک کی چادریں پھیل رہی ہیں جیسے خاموش اور نیم چمکیلی رات کا نور شبنم کے موتیوں میں ڈھل کر بارانِ رحمت کی طرح اس پر اس کے کانوں کی گرم گرم نوکیلوں اور تپتے ہوئے رخساروں پر برس رہا ہو ۔

سامنے بارہ دری میں تاریکی چھپی ہوئی تھی، مسلسل چار روز سے دروازے بند پڑے تھے مگر آج بھی ان سے طرح طرح کے مکسچروں، تیزابوں اور تیز قسم کے سینٹوں کی ملی جلی بو پھوٹ رہی تھی اس نے جھرجھری سی لی اور اُچک کر باغ کی حدِ فاصل پر بیٹھ گئی، جس سے ملی جُلی اونچی چٹان اس کی امی کی طرح اپنے فیصلہ پر

اٹل کھڑی تھی، بے حس، منجمد، چٹان کی دوسری طرف گہری کھائی تھی جس کے
متوازی ایک چوڑی سی پگڈنڈی سیدھی مانگ کی طرح دور تک چلی گئی تھی
یہ عمودی پگڈنڈی دراصل چراگاہ میں جانے والی گایوں، بھینسوں،
بیلوں اور بکریوں کی راہگذر تھی جس کے پاس ہی ایک جھیل نما گڈھا
بنا ہوا تھا جو سال میں پورے برس بہتے پانی سے لبریز رہتا تھا جس
کے غلیظ پانی میں بھینسیں غسل کرتیں، کیچڑ اچھالتیں اور زور زور
سے ڈکراتیں، بکریاں پانی پی کر چھنکاریں مارتیں، مینگنیاں کرتیں،
اور خاموش نڈھال سے بیل گردن جھکا کر غلیظ پانی کو سونگھتے اور ایک
جھٹکے سے گردن ہٹا لیتے — پھر آپ ہی آپ کچھ سوچ کر چپ چاپ
پانی پینے لگتے، چپڑ، چپڑ، چپڑ اور اسے محسوس ہوتا ہے خود اس کی
زندگی گندے و غلیظ پانیوں سے لبریز ایک جھیل نما گڈھے سے زیادہ
کچھ نہیں جس میں ہر روز صبح سے شام تک سیکڑوں بھینسیں کیچڑ
اچھالتی ہیں، بکریاں مینگنیں کرتی ہیں اور جس کے دہانے پر لاکھوں مچھر-
بن .... اس کے کان کے پاس مچھر بھنبنایا — اور ساتھ ہی اسے
محسوس ہوا ان مچھروں کی بھنبناہٹ سے فضا میں کیسی عجیب طلسماتی
کیفیت پھیل گئی ہے —

سفید سفید بھنگوں کی اونچی اونچی قطاریں گہرے دھندلکے میں
ابلتے ہوئے فواروں کی طرح نظر آرہی تھیں اور دور سے ایسا لگ رہا
تھا جیسے دھوئیں کی باریک سی لکیر دھرتی کی چھاتی سے پھوٹ کر
آکاش کی پہنائیوں میں سما گئی ہے ....

شن، شن، شائیں — خود اس کے اندر طویل تنہائیوں کا سناٹا
گونج بن کر منڈلانے لگے — اور وہ چپ چاپ بیٹھی رہی، خاموش، دم
سادھے سسکتی ہوئی شام، اور خاموش درختوں کے بے آواز کہرام میں گم

اچانک خاموشی کا طلسم ٹوٹ گیا، بارہ دری سے تیز الیں سینٹوں
اور آیوڈین کی ملی جلی بو کا ایک زور دار جھونکا آیا اور وہ چونک پڑی
پھر خود بخود اس کی نگاہیں بارہ دری پر جا کر رک گئیں —

"ہونہہ تو ...."

بارہ دری کے برآمدے کے اوپر بریکٹ میں جلتے ہوئے بلب کے
آس پاس سیکڑوں مچھروں کا ہجوم منڈلا رہا تھا — اور اس کے پاس
سرے والے دریچے میں شکیل خاموش کھڑا تھا — منجمد، بے حس و حرکت
دور سے ایسا لگ رہا تھا — جیسے فریم میں تصویر —

بڑی بڑی سرخ آنکھوں پر سنہری فریم والا چشمہ، چوڑی پیشانی
پر ابھری ہوئی لکیریں، بکھرے ہوئے گھنے بال، چہرے پر ہلکے ہلکے چیچک
کے داغ، سانولا رنگ، ابھرے ہوئے کلّے میں مبہم سا
ارتعاش، نوکدار مونچھیں — جیسے شکیل کا کلوز اپ اس کی
نگاہوں کی گرفت میں آ کر رک گیا — اور اس نے آنکھیں موندلیں..

اس روز وہ کس قدر خوش تھی یہ سن کر کہ ابا کے کسی قریبی دوست
کا لڑکا بھوپال آرہا ہے —

"وہ ڈاکٹر ہے —" انہوں نے کہا تھا —

"یہاں ملازم ہو کر آرہا ہے —" اسی نے پوچھا

"نہیں بھئی — ابھی اسی سال تو اس نے لکھنؤ سے ڈگری لی ہے
یہاں پریکٹس کریگا"

"تو آبا کب آئیں گے؟" — اس نے بڑی دلچسپی سے پوچھا —

یہی کوئی .... شاید اسی ہفتہ آجائے — پھر اس کی طرف غور
سے دیکھتے ہوئے بولے — لڑکا اچھا ہے — نمازی، پرہیزگار اور
.... اور ....

خیر اس نے بات کاٹی — مگر اس بچارے کے ٹھہرنے کے لئے
کونسی جگہ تجویز کی ہے آپ نے —"

"ہاں — یہی میں سوچ رہا ہوں — ویسے تو اس نے لکھا ہے کہ کوئی
چھوٹا موٹا مکان کرایہ پر مل جائے تو اچھا ہے مگر میں سوچتا ہوں لڑکا
جوان ہے، اور پھر ...."

اور وہ ہمیشہ کی طرح چپ چاپ اٹھ کر باہر آگئی، لیکن وہ بظاہر
کمرے سے دور برآمدے میں کھڑی تھی مگر اس کا شعور، احساس اور
سماعت مائیکروفون کی طرح اندر کمرے میں رکھے ہوئے تھے —

لڑکا واقعی بہت اچھا ہے — اب کی مرتبہ تم نے ضد کی تو....
ابا جان کہہ رہے تھے مگر ایکدم ان کی آواز مدھم پڑ گئی پھر تھوڑے سے توقف
کے بعد دونوں کی ملی جلی آواز گونج بن کر ابھری اور دوسرے لمحہ پھر

کی خلاؤں میں ڈوب گئی۔

جانے کیوں آج پھر اس کا دل اچھلنے لگا، اس کی آنکھوں میں آنسو دبے کی نمی چھلک پڑی، اس کا انگ انگ سوال بن کر رحم طلب نگاہوں سے آسمان کی طرح دیکھنے لگا — یونہی ہزارہوں مرتبہ اس کے ابا لڑکوں کی اچھائی کر چکے ہیں مگر ہر مرتبہ لڑکے میں کوئی نہ کوئی ایسا عیب ضرور نکل آیا کہ بچاری امی جان کو نہایت روکھے پن سے جواب دینا پڑا۔ ہاں اور کیا، خدا نہ کرے ان کی لڑکی فالتو تھوڑا ہی ہے، اور نہ خدانخواستہ کسی کے ساتھ بھاگ رہی ہے، جو بلا دیکھے بھالے کسی ننگے بچے کے پلے باندھ کر سر سے بلا ٹالی جائے — اور پھر یہ کہ جب ان کی شادی میں پورے شہر بھر کو دعوت دی گئی تھی تو نگوڑ ماری ان کی لڑکی کی شادی میں شہر کے شرفا بھی شریک نہ ہوں — اور یوں پورے بیس سال سے وہ بنگلے کی چاردیواری میں ایک بیکار چیز کی طرح پڑی ہوئی سڑ رہی تھی —

دن رات بہشتی زیور، قصص الانبیا، راشد الخیری کی کتابیں تھیں یا نوکروں کی نگہداشت، گھر کا حساب کتاب، بچوں کی نگرانی —

ویسے یہ بھی تھا کہ وہ بذاتِ خود ایسی خوبصورت نہیں تھی کہ کوئی دیکھتے ہی فریفتہ ہو جائے اور نہ ہی ایسی بے ڈول تھی کہ دیکھ کر منہ پھیرے، گذشتہ آٹھ سالوں میں جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اس نے یہی اندازہ لگایا کہ یقیناً اس میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جو لوگ اس کے بنگلے کے چکر لگانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان چکر لگانے والے نوجوانوں میں اکثر خوبصورت تھے، صحت مند تھے خوش پوش تھے، جو اس کو دیکھ کر آہیں بھرتے، مسکراتے، گنگناتے، سیگرٹوں پر سیگرٹیں پیتے، اور ہر روز نئے نئے سوٹ بدل کر آتے ان میں سے دو ایک تو کچھ اس کو .... مگر اس کو تو والدین کی عزت و ناموس، اپنے کردار کی بلندی کا نمایاں احساس تھا ورنہ اور کوئی ہوتی تو ابھی کی کب تک ....

"لعنت ہے —" اس نے ہمیشہ چکر لگانے والوں کی صورت پر تھوکا — کس قدر پست ہیں یہ لوگ — وہ سوچتی اور اسے ہمیشہ اپنی قوم کے نوجوانوں کی حالت زار پر رونا آ جاتا —

اللہ اللہ — ایک وہ مسلمان تھے کہ خواتین کی آواز سن کر اُلٹے پاؤں لوٹ جاتے تھے — عورتوں کے احترام میں قوم کی سربلندی سمجھتے تھے اور دنیا کی تمام عورتوں کو ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے پاکیزہ ناموں سے مخاطب کرتے ہوئے ان کی آنکھیں وفورِ تقدس سے جھک اُٹھتی تھیں ان کے چہروں پر نورانی شمعیں فروزاں ہو جاتی تھیں اور ایک یہ مسلمان ہیں کہ پرائی عورتوں کو ایسی حریص نگاہوں سے گھورتے ہیں — جیسے کچا چبا ڈالیں گے — مردود کہیں کے، کم بخت، کیسی شیطانی چمک ہوتی ہے ان کی آنکھوں میں، کیسی موہنی صورت بنا کر سامنے آتے ہیں کہ اچھے اچھے عابد و زاہد بھی لڑکھڑا جائیں توبہ!

واقعی کئی مرتبہ تو اس کا ایمان بھی لرز اُٹھا — اس کے جذبات بھی برانگیختہ ہو گئے مگر جہاں اس نے سورۂ یٰسین کا ورد شروع کیا اور بھاگے شیطانی وسوسے، ورنہ وہ تو اس کے شعور، ادراک اور احساس کے گوشے گوشے پر یوں حملہ آور ہوتے تھے کہ الاماں والحفیظ!

— اور اب یہ شکیل ہیں کہ مقابلہ پر ڈٹے ہوئے ہیں، ہر وقت اعصاب پر سوار رہتے ہیں داخل ہوتے ہیں تو پیشہ ور قاریوں کی طرح زور سے بسم اللہ پڑھتے ہوئے اور کرسی پر بیٹھتے ہیں تو اس طرح کہ سامنے کلینڈر پر لکھے ہوئے "ان اللہ مع الصابرین" کے الفاظ ان کی نگاہوں کی گرفت میں ہوتے ہیں جیسے ان میں کوئی مقناطیسی کشش ہو، پھر اچانک انہیں کمرہ کی حالت دیکھ کر الحمرا کے کھنڈر یاد آ جاتے ہیں۔ یا بیت المقدس کا کوئی معجزہ۔ پھر چونک پڑتے ہیں، نہایت مضحکہ خیز انداز انتہائی تعظیم سے سر جھکا کر مولویوں کی طرح شین، قاف کا صحیح تلفظ حلق سے ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

السلام علیکم — محترمہ

وعلیکم السلام — وہ جواب دیتی، مگر اس کا جی چاہتا صاف کہہ دے نکل جائیے میرے کمرے سے — جائیے، لیکن وہ دل پر جبر کر کے رہ جاتی اور گناہ کا شعوری احساس اس پر غالب آ جاتا —

کہئے — وہ کچھ اس طرح مخاطب ہوتے — جیسے ان کی آوازیں شہنائیوں کے سُر ہوں یا جیسے موسم بہار میں پھولوں سے لدی شاخیں جھوم رہی ہوں، مستِ الست، سراپا نغمہ، مکمل شعر، ان کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ ہوتی، اطوار میں وارفتگی، لہجہ میں غناتی ارتعاش

اور چہرے پر ایسی تمتماہٹ گویا رخساروں کے پیچھے بھٹی جل رہی ہو۔

اللہ — وہ پڑھتے پڑھتے بہک جاتی — لاحول ولا قوۃ — تقریباً سات مرتبہ لاحول پڑھنے کے باوجود اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا' قرآن شریف کی سطریں پھیل کر کیڑے مکوڑے بن جاتیں' الفاظ سمٹ کر نقطہ کی شکل اختیار کر لیتے اور سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو اس کے دل' دماغ اور ذہن کے کونے کونے پر خمار بن کر پھیل جاتی' شکیل' ان کا لہجہ ان کی آواز — ان کے ہونٹ' ان کی آنکھیں' ان کے بال ..... وہ بے بس ہو کر قرآن شریف بند کر دیتی اور حسرت بھری نظروں سے ماحول کا جائزہ لیتی'

"دیکھئے' میں نے آپ سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ آپ تنہا میرے کمرے میں مت آیا کیجئے مگر آپ —"

مگر کیوں —؟ وہ مجسم سوال بن جاتے'

"بس یونہی —" اس کی آواز میں ایک عجیب طرح کی تھرتھری ہوتی اور حلق میں گویا چبھنے لگتے — بُری بات ہے اگر کسی نے دیکھ لیا تو ....

تو کیا' آخر اس میں برائی کیا ہے — محبت کرنا تو جیسے ان کی عادت تھی'

اونہہ — وہ جھنجھلاتی — عجیب ہیں آپ بھی' اگر .... میرا مطلب ہے .... اس طرح — یعنی یوں .... یہ کہ —" اور آخرکار وہ ہکلا کر رہ جاتی۔

اور وہ یونہی مسکراتے رہتے' یونہی جیسے ان کی مسکراہٹ دوامی ہے' ان کا تبسم لازوال ہے۔

بھئی — خدا کے لئے — وہ اپنے سینہ کو دوپٹہ سے چھپاتی' بدن چراتی اور تول تول کر قدم رکھتی ہوئی باہر برآمدے میں آ کر کھڑی ہو جاتی'

"تو گویا —" جیسے وہ بُرا مان جاتے — آپ کو میرا آنا ناگوار گزرتا ہے' جی —"

اور لیجئے — وہ تڑپ اٹھتی

تو اور کیا —"

مگر میں نے یہ کب کہا کہ آپ کا آنا —

مگر اس کا تو یہی مطلب ہوا۔

ہو گا — وہ جھلا کر کہتی اور چپ چاپ باورچی خانہ کی طرف چل پڑتی — ہاں کوئی بات ہے —" وہ بڑبڑاتی مگر باورچی خانہ کی لہسن' پیاز' ادرک اور مسالوں کی ملی جُلی خوشبو سے اس کی طبیعت اور مکدّر ہو جاتی۔ اس کو اپنے اندر غیر معروف سے جذبات کا طوفان بل کھاتا ہوا محسوس ہوتا یا جیسے اندر ہی اندر کوئی جوالا مکھی گڑگڑا رہا ہو' یا دور کہیں کوئی جادوگر اپنی طلسماتی لکڑی گھما رہا ہو جس کے ذریعہ وہ اس کا دل' دماغ' شعور ہر ایک چیز بے قابو ہو رہی ہے دھیرے دھیرے نامعلوم انداز میں — ایک گونج گرج سنسناہٹ

کوئی نہیں — کوئی نہیں — تا حد نگاہ' افق کی بعیدی وسعتوں میں اندھیاروں کے سوا کچھ نہیں' اور یونہی' حیران' پریشان' ششدر وہ ساری رات بستر پر پڑی ہوئی کروٹیں بدلتی رہی' ایک لمحہ کے لئے بھی اس کو سکون نہیں ملا' ایک ساعت کے لئے بھی اس کے دل کی دھڑکن میں کمی نہیں ہوئی' یونہی ساری رات اس کی رگ رگ میں بکھری ہوئی گرم گرم ریت کے بے شمار ذرے اندر ہی اندر اس کی روح میں چبھتے رہے اور وہ ساری رات گندے اور غلیظ پانیوں سے لبریز جھیل نما گڑھے میں پڑی سڑتی رہی — اس روز اس نے محسوس کیا — دراصل یہ ظلمت کا طلسم لافانی ہے' اور تاریکیوں کے پردے اس قدر بوجھل ہیں کہ انہیں کوئی نہیں ہٹا سکتا' کوئی بھی نہیں' اور وہ یونہی ان پردوں کے پیچھے' ان ظلمتوں کے طوفان میں گھری ہوئی ایک ہی محور پہ گھومتی رہے گی — اور رات کے بعد جو دوسری رات آئے گی وہ اس سے زیادہ تاریک ہو گی' اس سے زیادہ بوجھل — اور وقت اپنی پوری رفتار کے ساتھ اڑا جا رہا تھا لیکن دن و رات کی سفید و سیاہ کیفیتوں کے باوجود اس کی حیثیت اپنی جگہ پر جوں کی توں قائم تھی' البتہ اس کے اندر' اس کے ذہن کی گہرائیوں میں اک تلخ اور زہریلا احساس آہستہ آہستہ جنم لے رہا تھا ابھر رہا تھا اور وہ اس عجیب سے تلخ تیز و تند احساس سے مقابلہ کر رہی تھی اپنی پوری مدافعانہ توں توں کے ساتھ' لیکن شاید زندگی میں پہلی مرتبہ خاندان کی عزت' ناموس کی حفاظت اور کردار کی بلندی کی مضبوط قلعہ بندیوں کے باوجود خواہ مخواہ اسے اپنی شکست کا شدید احساس ہو رہا تھا — حالانکہ اس مرتبہ بھی وہ وہی پرانا اور آزمودہ حربہ استعمال

کرد ہی تھی جس کے ردِ عمل میں اس نے زندگی کو اپنے ہاتھوں مقید کر لیا تھا۔ جبھی تو گداز، پرسوز اور مفید زندگی اس کے ہاتھوں سے نکل کر بھاگ رہی تھی، اب اسے فرسودہ قباؤں کی ضرورت نہیں تھی بلکہ... مگر وہ تھی کہ پورے جوش و خروش کے ساتھ، مذہب، خدا، رسول اور لاکھوں جھوٹی سچی حدیثوں کا زرہ بکتر پہن کر میدان کارزار میں ڈٹی ہوئی تھی۔

"کبھی آئینہ میں صورت دیکھی ہے آپ نے" شکیل نے اس کے جمے ہوئے بالوں کو بکھیر دیا — کتنے خوبصورت ہیں آپ کے بال — کتنے سیاہ، کتنے لانبے جیسے جاڑوں کی کالی راتیں ...."

"ہوں گے —" وہ اٹھ کر باہر جانے لگی۔

"ٹھیریے تو — وہ مجھے آپ سے ...." ان کے لہجہ میں ایک عجیب طرح کی التجا آمیز کپکپی تھی، آپ ہی آپ اس کے قدم رک گئے۔

"کہئے —؟" اس نے تنک کر کہا۔

"اب آپ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں — ذرا تشریف تو رکھئے۔" انھوں نے کرسی پیش کی۔

"جی نہیں — شکریہ! مجھے بھی کام ہے، کہئے —"

"وہ —" اور پھر ان کی آنکھوں میں وہی خطرناک سی چمک عود کر آئی، وہی التجا، شوق، امید اور حسرت اور اس کے تمام عزائم بید کی شاخ کی طرح لچک کر رہ گئے، اس کا تنفس اندر ہی اندر زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔ اور دل اس زور سے دھک دھک کرنے لگا جیسے دور کہیں کوئی بھاری موسل سے دھان کوٹ رہا ہو —" کہئے —؟

اس کی آواز میں پسپائی کی نرمی تھی اور مسحوری کا اظہار۔

وہ .... وہ .... شکیل بدستور اس کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے اس کو، اس کے بالوں کو، اس کی آنکھوں کو، اس کے جسم کو — پھر جیسے اپنی بکھری ہوئی قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کرتے ہوئے بولے — آپ سیدھی مانگ مت نکالا کیجئے —"

"کیوں —؟" اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"بس یونہی — کچھ اچھا نہیں لگتا —"

ایک لمحہ کے لئے فضا میں سکوت پھیل گیا، گہری خموشی، عمیق سناٹا، دونوں کے دل دھڑک رہے تھے، دونوں کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور دونوں خاموش کھڑے تھے۔

میں بہت دن سے یہ بات کہنا چاہتا تھا مگر ہمت نہیں ہوتی تھی، کہیں آپ .... میں سچ کہتا ہوں آپ کے بال بہت خوبصورت ہیں مگر آپ سیدھی مانگ نکال کر ان کی خوبصورتی کو فنا کر دیتی ہیں، آپ کو خود نہیں معلوم کہ آپ کے بال .... اگر آپ کو رنگین کپڑوں سے نفرت، چوڑیاں پہننا برا سمجھتی ہیں اور یہ کہ خوشبو سے آپ پہ بے خودی طاری ہو جاتی ہے تو ٹھیک ہے مگر بال — اف کتنے خوبصورت ہیں یہ ان کی خوبصورتی کو یوں برباد مت کیجئے —" وہ اس وقت بے انتہا جذباتی ہو رہے تھے۔

وہ دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھالے ان کی طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی بات نہیں، کچھ نہیں وہ اس لطیف خواہش سے بے نیاز ہے، جیسے آج تک اس نے دل کی دھڑکن کو محسوس نہیں کیا —

کیلبے ہودگی ہے یہ — یکایک اس نے تلخی سے کہا اور باورچی خانہ کی طرف چل دی مگر راستہ میں اسے محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے بہت سے سائے لہرا رہے ہیں — اور جیسے اس کی کوئی عزیز ترین ہستی اس سے جدا ہو گئی ہو ....

لاحول ولا قوۃ — آپ ہی آپ اس کی زبان سے لاحول کا طوفان پھوٹ بہا مگر اس کے باوجود اسے محسوس ہوا کوئی غیبی طاقت اس کے دل کو مٹھی میں لے کر زور سے مسل رہی ہے زور سے ....

شدت تکلیف سے وہ ساری رات تڑپتی رہی، ایک ساعت کے لئے بھی اس کو سکون نہیں ملا، وہ جاگتی رہی، کمرے میں ٹہلتی رہی، بستر پر کروٹیں بدلتی رہی، کتابوں کی ورق گردانی کرتی رہی، پانی کے گلاس پر گلاس پیتی رہی — اور جب اس نے اٹھ کر آئینہ میں اپنی صورت دیکھی، بالوں کا جائزہ لیا، سیدھی مانگ کو بغور دیکھا اور اپنے سفید لباس پر تنقیدی نگاہیں ڈالیں تو وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ سب غلط ہے، سب جھوٹ ہے، نہ اس کے بال خوبصورت ہیں نہ سیدھی مانگ بری لگتی ہے، رہا چوڑیوں کا معاملہ تو آجکل یوں بھی چوڑیوں کا رواج نہیں، اور رنگین کپڑے تو جاہل عورتیں پہنتی ہیں — اس کے علاوہ اسے بال بنا کر، کپڑے پہن کر اور چوڑیوں کو

کھنکا کرکرتا کیا ہے —

لیکن صبح نہانے کے بعد جب وہ نعت کا کوئی مصرع گنگناتے ہوئے چوٹی گوندھ کر آئینہ کے سامنے پہنچی تو اپنی صورت کو پہچان نہ سکی، دنگ رہ گئی، آج خلاف معمول سیدھی مانگ کے بجائے اس کے بال اُلٹے ہوئے تھے اور گلے میں گلابی شیفون کا دوپٹہ پڑا ہوا تھا —

ایں — اس نے چونک کر اپنے بال دیکھے اور مسکرا دی — پھر خود بخود اس کا رنگ فق ہو گیا دماغ میں کنکر کھڑکھڑانے لگے —

کیوں — ؟

کچھ نہیں — !

کچھ تو —

کچھ بھی نہیں —

تو پھر یہ تبدیلی کیونکر — ؟

خدایا وہ کٹی ہوئی شاخ کی طرح کرسی پر جا پڑی اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا، وہ تم پر حاوی ہو رہے ہیں، وہ تمہاری شرافت کا رنگ محل مسمار رہے ہیں، تم ان کے اشاروں پر ناچ رہی ہو — تم .... کمزور ہو، ناتواں ہو،

نہیں نہیں — وہ چلائی، خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو، خدا کے لئے — شکیل میں مجبور ہوں، میں کمزور ہوں — میرے اللہ میرے معبود۔

"اونہہ بے وقوف کہیں کی" آج پورے بیس سال کی سوئی ہوئی عورت انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی تھی — خدا کا شکر ادا کر کہ ایک خوبصورت اور رنگین مزاج لڑکا آپ ہی آپ تیری زندگی میں داخل ہو رہا ہے، نادان وہ زندگی ہی کیا جو رومان سے خالی ہو۔ وہ جوانی ہی کیا جو لطیف گناہوں اور رنگین لغزشوں سے پاک ہو۔ انہیں دیکھ جو ہمیشہ ہر روز نئے رومان لڑاتی ہیں۔ پھر بھی انہیں کوئی غم نہیں، کہاں کا ناموس، کیسی عزت، کہاں کی شرافت ... ایک تو ہے کہ خواہ مخواہ شرافت کی گلی سڑی لاش کو کاندھوں پہ اٹھائے پھر رہی ہے، اور تو .... تو سمجھتی ہے تیرا جسم پاک ہے، تیری روح معصوم ہے، تیرے خیلات .... تقدس کے بلند میناروں میں چمگادڑوں کی پھڑپھڑاہٹ کے سوا کچھ نہیں .... آج حقیقت کا گرم گرم لاوا پہاڑ کی سنگلاخ چھاتی کو چھوڑ کر بہنے کو ہے ....

جل اُٹھ .... مسکرا دے .... ایک ذرا ہمت سے کام لے، بُزدل ....

آج دو دن سے مسلسل وہ یہی سوچ رہی تھی — مگر قرآن شریف کی تلاوت کے باوجود اس کے ذہن کی گہرائیوں میں انتشار پھیل رہا تھا۔ اس کی قوت فیصلہ ماؤف پڑی ہوئی تھی اور دماغ جیسے کسی بھاری چٹان کے نیچے پسا جا رہا تھا ....

اور آج چار روز سے شکیل کی غیر حاضری بھی اسی لئے معنی خیز تھی، کیا واقعی شکیل کو اس سے محبت ہے محبت — ؟ اس کے آگے اس کا ذہن سوچنے سے پہلے جھنجھلا جاتا .... مگر ابھی اچانک بارہ دری کے دریچہ میں شکیل کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے سینے پر برف کی سل رکھ دی .... ٹھنڈک، خنکی، لذت، سکون ....

اس نے نگاہ اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا، مشرق کی بعیدی وسعتوں میں ٹھنڈی ٹھنڈی ملائم چمک کا ایک غبار سا ابل رہا تھا اور اس کے دیکھتے ہی دیکھتے شیشم و چڑبل کے سرسبز و شاداب درختوں کی سنہری کونپلوں میں سے گول گول سرخ سا چاند ابھرنے لگا — وہ مسحور ہو کر رہ گئی، پتھر کے بے حس مجسمہ کی طرح خاموش، ساکت و عابد — نہ مسرور نہ اداس — پراسرار چاند کی اولین کرنوں نقرئی شبنم میں نہائی ہوئی — وہ ہر اک چیز کو صاف دیکھ رہی تھی، برہنہ، عریاں، اس کا جی چاہا۔ بازو پھیلا کر پھڑپھڑائے۔ اور چکور کی طرح اڑتی ہوئی دور نکل جائے دُور ستاروں سے آگے چاند کے آگے اس کا سفر کبھی ختم نہ ہو، اس کی منزل کبھی نہ آئے۔

اس نے بازو کھول کر ایک طویل اور صحت مند انگڑائی لی اور اس کا جسم اک پُرسکون لذت میں ڈوب گیا — پھر وہ والہانہ انداز میں کھڑی ہو گئی، اس کے ہونٹوں پر اک مبہم سی مسکراہٹ کے تیور کانپ رہے تھے، اس کا دل ایک عجیب سی ٹھنڈی میٹھی دردناک لذت میں دھڑک رہا تھا وہ چل پڑی جیسے اسے یقین ہو کہ کوئی اس کا انتظار کر رہا ہے، بنگلے کے آس پاس شیشم، چڑبل اور شریفوں

کے درخت خاموش کھڑے تھے اُن کی سنہری کونپلوں اور سبز پتوں میں ایک انوکھی تابانی اور نرالی کیفیت ناچ رہی تھی — اور چاند آہستہ آہستہ اُبھر رہا تھا۔ اس کی بکھری ہوئی نیلگوں چاندنی میں ماحول کی ہر چیز اُجاگر ہو رہی تھی — یہ رات' اس کی زندگی میں پہلی رات تھی' انتہائی خوبصورت' انتہائی رنگین ....

باورچی خانہ کی طرف مڑنے کے بجائے آپ ہی آپ اس کے قدم بارہ دری کی طرف اٹھنے لگے مگر بارہ دری کے نزدیک پہنچ کر وہ اس طرح چونک پڑی جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو' دیوار کی اوٹ سے کر اس نے اِدھر اُدھر بغور دیکھا — ہونٹ بھینچے' سانس روکے اس اندر کی آہٹ کو سنا' مگر گہرے سکوت میں ڈوبی ہوئی مچھروں کی بھنبھناہٹ فضا میں گونج رہی تھی — اور دور کہیں کوئی مینڈک ٹرا رہا تھا ...

اس نے پورے احتیاط اور انتہائی ہمت کے بعد پنجوں کے بل اونچے ہوکر دریچہ کے شیشوں سے اندر کی طرف جھانکا ... شریفوں اور شیشم کے دھلے ہوئے سبز پتوں سے پھسلتی ہوئی نیلگوں چاندنی کمرے میں داخل ہو رہی تھی اور شکیل آرام کرسی پر نیم دراز سامنے میز پر رکھی ہوئی اس کی تصویر کو گھور رہا تھا — ٹکٹکی باندھے — قرطبے خودی میں اس کے ہونٹ بند تھے' اور ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح اس کے ماتھے پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں اور آنکھیں — خدایا — ان میں کیا نہیں تھا تجسس وحشت' غم اور حسرتیں ... بعد سے اس کے پیر زمین سے چپک گئے —

مگر میری تصویر ... کہاں سے آئی — اس کے دل میں ہیجان پھیل گیا' کہاں سے آئی — ؟؟

"تڑاخ — جیسے کوئی چیز ایک مہیب جھنکار کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گئی' دماغ ماؤف' ذہن معطل — شکیل — اور وہ — مثبت' منفی' منفی مثبت ...

اس عجیب سے شدید احساس کے ساتھ اس کی مردہ رگوں میں گرم گرم خون کی گردش تیز ہوگئی' اس نے کانپتے ہوئے پنجوں پر پورا وزن ڈال کر اس نے پھر جھانکا ...

شکیل کی آنکھیں بند تھیں — اچانک دو موٹے موٹے آنسو بند آنکھوں سے پھوٹے اور تمتماتے رخساروں پر ڈھلک گئے — خدایا — وہ آنسوؤں کے گرنے سے پیشتر ہی وہاں سے بھاگی'

اور صبح جب نوکرانی اس کو ناشتہ دینے آئی تو اس نے دیکھا — چھوٹی بی بی بے ہوش پڑی بڑبڑا رہی تھی — خون ...... خون ...... خون ...... جوانی کا خون' ارمانوں کا خون' انسانیت کا خون ....

تپ دق کا انسداد

ہندوستان کی انسداد تپ دق ایسو سی ایشن کے زیر اہتمام کلکتہ میں ۱۰ر جنوری ۱۹۵۰ء سے ۵ ارفروری ۱۹۵۰ء تک تپ دق کے علاج کے جدید طریقے سکھانے کے لئے ایک کورس جاری ہو رہا ہے۔ جس میں پوسٹ گریجویٹ شامل ہوسکیں گے۔ جس میں کلکتہ میں انسداد تپ دق کا کام کرنے والے اور ایسوسی ایشن مذکور کے ٹیکنیکل مینر لیکچر دیں گے۔

ایسوسی ایشن نے عام ڈاکٹروں کو انسداد تپ دق کے کام کے جدید طریقے سکھانے اور ان میں تپ دق کے خلاف مہم میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے اس کورس کا اہتمام کیا ہے۔ توقع ہے کہ سارے ہندوستان سے کافی عورت اور مرد طب پیشہ لوگ کلکتہ کے اس کورس میں شامل ہوں گے۔

شمس بریلوی

حکومتِ مصر اور تعلیمی اصلاحات

مشرقِ وسطیٰ کا بّرِ صغیر امریکہ ہمیشہ تہذیب سے دُور بربریت کی پرورش کرنے والا طبقہ ارض سمجھا جاتا رہا ہے' اسی برِ صغیر کا ایک ملک مصر ہے جو عہدِ عتیق سے آج تک تہذیب و تمدن کے صفحات پر اپنی تابانیوں کے زریں نقوش ثبت کرتا رہا ہے۔ عہد ماقبل تاریخ، عہدِ عتیق، عہدِ قدیم اور دورِ جدید غرضیکہ اس کے کسی دورِ تاریخی کا مطالعہ کیجئے آپ کو یہ سرزمین علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ نظر آئے گی

جس طرح عہدِ عتیق میں اس کی تہذیب و تمدن کی بلند حیثیت تمام ممالک عالم میں نمایاں تھی اسی طرح اس عصرِ تہذیب و ترقی میں بھی وہ اپنی اس روائتی سربلندی کو برقرار رکھنے کی فکر میں ہے اور ارتقائی مراحل و منازل طے کرنے میں مصروف ہے۔ قطع نظر ان عمرانی' معاشی اور معاشرتی ارتقا اور اصلاحات کے جو آزاد مصر کی مساعی روزافزوں کا نتیجہ ہیں' صرف علمی ترقی ہی کے لئے جو روزافزوں کوششیں کی جارہی ہیں حقیقتاً ہر طرح ستائش و آفریں کی مستحق ہیں!

برطانوی انتداب کا عہد بھی مصر کی تعلیمی ترقی کے نقطۂ نظر سے بالکل تاریکی میں ہے۔ اسی زمانے سے ملک کے عوام کو تعلیم یافتہ بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ تحتانی اور ثانوی تعلیم کے لئے مدارس جدید کا قیام' ممالک مغربی کے طرز پر مصری تعلیمات کو ڈھالنا' یہ وہ کوششیں ہیں جو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہونے کے باوجود بھی خواہانِ ملت کے مساعی سے ظہور میں آئیں۔

دوسری عالمگیر جنگ کا دور تہذیب عالم کا ایک بحرانی دور تھا اس زمانے میں مصری تعلیمات میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں ہوا اس لئے کہ مصری اپنی پوری قوت سے جنگ کے ان شعلوں کو بجھا رہے تھے جنہوں نے ان کے ملک کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ لیکن اس دوسری عالمگیر جنگ کے بادل چھٹتے ہی عمرانی تحریکات میں سب سے زیادہ نمایاں مصر کا نیا تعلیمی دور ہے! جو کسی پچھلی منصوبہ بندی کے تحت ۱۹۴۵ء سے عمل میں آیا ہے۔ اس منصوبہ بندی کے نفاذ کے ابتدائی دور کی عمومی تعلیم میں جو مصری عوام نے ترقی کی اس کے اعداد و شمار ہمارے سامنے موجود ہیں لیکن ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اب تک عمومی نظام تعلیم میں جو خامیاں تھیں ان کی اصلاح اسی منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے!

۱۹۴۷-۴۸ء کا سال مصر میں عمومی تعلیم کا انقلابی سال ہے۔ اس سال وزارت معارف نے پوری تندہی اور توجہ سے پچھلے نظام تعلیم کی تمام خامیوں کو دور کرکے مصری رعایا کے لئے ایک تعلیمی نظام مرتب کیا جو وہاں کے افراد کو لائق شہری اور دیہاتیوں کو مہذب مصری بنا سکے، اور عصرِ حاضر کی کشمکش حیات کے جانگسل مراحل پر ان کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہو سکے! اس نظام نو کے تحت ایسا طریقۂ عمل متعین کیا گیا جس کے ذریعے سے ملک کے تمام بچے جو اب تک اپنی معاشرتی اور معاشی پستی و بلندی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت دور تھے ایک ہی صف میں آکر کھڑے ہو جائیں اور ان کو مساویانہ انداز پر تعلیمی مواقع میسر آسکیں تاکہ ہر مصری ملک کی بڑھتی ہوئی عمرانی اور سیاسی ضروریات کو پورا کرنے کا اہل بن سکے اور ملک کو ممالک غیر یا ہمسایہ ملکوں کا سہارا نہ لینا پڑے اور مصری بچے خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر اس قابل بن سکیں کہ ملکی اعلیٰ مقاصد کے حصول میں سلطنت کے معین و مددگار بننے میں ان کو کبھی دشواری محسوس نہ ہو' اور ان میں ترقی پسند اقوام کے طویل تجربات سے بیش از بیش فائدہ اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔ اور وہ اقوام عالم کی جدید تحریکات سے کامل ہم آہنگی پیدا کرنے میں ناکام نہ رہیں۔

تعلیم کا یہ نظام تحتانی اور ثانوی تعلیم تک محدود کیا گیا ہے۔ اس کے تحت چھ سال سے چودہ سال کی عمر تک کے مصری بچے اپنے تعلیمی مقاصد کی تکمیل جدید منصوبہ بندی کے تحت کر سکتے ہیں! یہ مدت تعلیم مدریجی مراحل پر مشتمل ہے۔ یعنی اس مدت میں چند ایسی گروہ بندیاں کردی گئی ہیں جو انتظامیہ اعتبار سے سہولت پیدا کرسکیں اور ہر مدت متعلمین کے لئے ایک امتیازی نشان رکھتی ہو! ان منازل کو تحتانی وسطانی اور ثانوی تعلیم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تحتانی تعلیم (لوئر پرائمری اور پرائمری ایجوکیشن):—

یہ تعلیم چھ سال کی عمر کے بچوں سے شروع ہوتی ہے۔ اور بارہ سال کی عمر پر ختم ہو جاتی ہے، اس ابتدائی تعلیم کے نصاب میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ کنڈر گارٹن نصاب کے مدارس کی تعلیم اور ان تحتانی نصاب والے مدارس کی تعلیم میں اختتامی مرحلے پر کامل ہم آہنگی پیدا ہو جائے، اور دونوں میں اختتام پر کوئی امتیازی خصوصیت باقی نہ رہے۔ گویا دونوں طرز کے مدارس کے نصاب میں توازن اور یکسانی پیدا کردی گئی ہے۔ تحتانی تعلیم کا نصاب شہری اور دیہاتی مدارس کے طلبا اور طالبات کی ضرورتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے مرتب کیا گیا ہے تاکہ معاشی اور جنسی تعلیم میں کوئی دخل اندازی نہ کرسکے۔

ابتدائی اور پرائمری مدارس کے نصاب کا اجمالی خاکہ یہ ہے۔ اس نصاب میں جنس کی تفریق نہیں ہے دونوں کے لئے یکساں ہے۔

تحتانی مدارس کا نصاب تعلیم

مضامین	دینی تعلیم	عربی اور خوشنویسی	حساب	علم ہندسہ	تاریخ اور شہریت	جغرافیہ	مشاہدہ قدرت اور سائنس	حفظان صحت	ڈرائنگ	حرفتی تعلیم (جنس کے اعتبار سے)	جسمانی تربیت	میزان گھنٹہ
سال اول	۲	۱۲	۶	۰	۰	۰	۳	۰	۳	۳	۳	۳۲
سال دوم	۲	۱۲	۶	۰	۰		۳	۰	۳	۳	۳	۳۲
سال سوم	۴	۱۲	۶	۰	۰	۰	۳	۰	۳	۳	۳	۳۴
سال چہارم	۴	۱۲	۶	۰	-	۱	۳	۰	۳	۳	۳	۳۴
سال پنجم	۳	۱۲	۵	۱	۱	۱	۲	۱	۲	۸	۲	۳۸
سال ششم	۳	۱۲	۵	۱	۲	۱	۲	۱	۲	۸	۱	۳۸

لڑکوں کے مدارس میں دستکاری کی تعلیم میں ان کے مقامی ماحول کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور لڑکیوں کو امور خانہ داری سے بہرہ ور کیا جاتا ہے پانچویں

اور چھٹے سال میں شہری مدارس میں لڑکوں کو شہریت کی تعلیم خاص طور سے دی جاتی ہے تاکہ وہ اچھے شہری بن سکیں۔ اور دیہی مدارس میں بچوں کو دیہی صنعتیں خاص طور سے سکھائی جاتی ہیں۔ لڑکوں کے مدارس میں فنِ باغبانی بھی شامل ہے۔ لڑکیوں کو ایسے گھنٹوں میں امورِ خانہ داری کی تعلیم دی جاتی ہے۔

تحتانی اور وسطانی تعلیم کی قانونی حیثیت

ملک میں جو ابتدائی لازمی تعلیم کا قانون نافذ تھا اس میں اس نظامِ نو کے تحت بہت کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں بعض قوانین جن کا تعلق اصولِ تعلیم سے ہے وہ علی حالہٖ قائم ہیں۔ لیکن مندرجہ ذیل امور میں اکثر تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ہم ان کی صراحت ذیل میں کریں گے۔

(۱) پرائمری مدارس میں داخلے کی عمر کم سے کم ۷ سال ہے۔ ۱۰ سال تک کو ۷ سال سے ۹ سال تک کر دیا گیا ہے تاکہ بچے نسبتاً کم عمری ہی میں ان مدارس میں شریک ہو سکیں زائد سے زائد مدتِ عمرِ داخلہ کے لئے ۱۴ سال ہے۔ پندرہ سال کی عمر کا لڑکا یا لڑکی پرائمری مدارس میں داخل نہیں ہو سکتے

(۲) پرائمری تعلیم بالکل مفت دی جائے گی اس کے لئے کوئی معاوضہ (فیس) نہیں لیا جائے گا۔

(۳) ہر جماعت میں علمی مضامین کی تدریس کو زیادہ اہمیت دی جائے گی۔ عربی اور دوسری زبانوں کے امتحان زبانی (اورل) ہونے کے عوض ایک ضمنی پرچے کی صورت میں ہوں گے۔ ان کے علاوہ چند اور قوانین بھی اس پرائمری تعلیم سے متعلق وزارتِ تعلیمات کی سفارش پر مجلسِ قانون ساز کے زیرِ غور ہیں۔

ثانوی تعلیم

تعلیم کا یہ مرحلہ اور یہ منزل ہر متمدن اور مہذب ملک میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، قوم کی تعمیر صحیح معنوں میں انھیں افراد کے ہاتھوں سے ہوتی ہے جو اس مرحلے میں قدم رکھتے ہیں، اس لئے ان کے تعلیمیاتی قواعد کو بڑی دور اندیشی اور ہر طرح کی دور بینی کے ساتھ اعلیٰ تعلیمیافتہ اور مدبرینِ ملک کے ہاتھوں طیار کرایا جاتا ہے۔ چنانچہ حکومتِ مصر نے بھی پرائمری تعلیم کے نظامِ نو کے بعد ثانوی تعلیم کے قواعد کو بھی بڑی ژرف نگاہی سے از سرِ نو مرتب کیا اور مندرجہ ذیل تبدیلیاں کیں۔

۱۔ پہلے نصاب ثانوی کی مدت لڑکوں کے لئے پانچ سال اور لڑکیوں کے لئے چھ سال تھی۔ لیکن اس نظامِ نو میں اس جنسی تفریق کو دور کر کے دونوں کی مدت یکساں کر دی گئی تاکہ لڑکیاں بلاوجہ ایک سال کا خسارہ نہ اٹھائیں۔

۲۔ چونکہ ثانوی تعلیم کا مدعا تعلیمی تنوع اور متعلمین کی مخصوص صلاحیتوں کو ان کے میلانِ طبع کے مطابق ابھارنا اور ان کا تربیت کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے مصر کے ماہرینِ تعلیم نے اس مرحلے پر ایک خاص تدبر سے کام لیا۔ انہوں نے نصاب میں اور مدتِ تعلیم میں اس طرح تغیر و تبدل کیا کہ مختلف فنی مدارس کی مدتِ تعلیم کو ثانوی مدارس سے اس طرح منطبق کر دیا کہ دونوں میں کامل ہم آہنگی پیدا ہو گئی اولاً ثانوی مدارس کے فارغ التحصیل طلبا کو یہ موقع مل سکا کہ وہ فنی مدارس کے فارغ طلبا سے بالکل مساوی ہو گئے اور یہ موقع حاصل ہو گیا کہ مناسب عمر پر پہنچ کر اپنے موزوں طبع شعبۂ تعلیم کو منتخب کر سکیں۔ پہلے ایک ثانوی مدرسے کے فارغ التحصیل طالب علم کو ابتدائے فنی مدرسے کے نصاب کے مرحلے کو طے کرنا پڑتا تھا اور اس طرح اس کی عمر بہت ضائع ہوتی تھی اب یہ صورت نہیں رہی۔ ثانوی مدرسے کے جس دور سے اس نے فراغت حاصل کی ہے اس کے بعد کے مرحلے میں اگر وہ چاہے تو فنی مدرسے میں داخل ہو سکتا ہے۔

یہ مرحلہ ۱۴ سال کی عمر میں شروع ہوتا ہے۔ عمر کے اس مرحلے پر پہنچ کر طالب علم کو اختیار ہے کہ وہ اپنے حسبِ پسند تعلیم کا کوئی شعبہ، آرٹ، سائنس، انجینیرنگ وغیرہ انتخاب کرے۔

ثانوی تعلیم کی مدت دو حصوں پر منقسم ہے، پہلا مرحلہ دو سال کی مدت میں ختم ہوتا ہے، کامیاب ہونے والے طلبا اور طالبات کو سند دیجاتی ہے۔ ثانوی تعلیم کے دورِ اول میں یہ سات مضامین ہوتے ہیں۔

۱۔ دینیات۔

۲۔ جسمانی تعلیم۔

۳۔ عربی زبان اور ایک غیر ملکی زبان، ان زبانوں میں سے جو کسی ادارے میں پڑھائی جاتی ہوں (فرانسیسی، جرمنی، روسی، انگریزی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور اردو)

۴۔ عمرانی مضامین (شہریت، تاریخ۔ جغرافیہ)

۵۔ ریاضیات (حساب، الجبرا اور علم ہندسہ)
۶۔ عمومی سائینس۔
۷۔ حرفت (دستکاری، نقشہ کشی اور موسیقی لڑکوں کے لئے)۔
سوزن کاری، امور خانہ داری اور موسیقی لڑکیوں کے لئے

ثانوی تعلیم کا دوسرا دور مندرجہ ذیل مضامین پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ دور ثانی دو حصوں منقسم ہے۔ دور ثانی سال اول۔ دور ثانی سال دوم و سوم

ثانوی تعلیم کے دور دوم کا پہلا سال اور اس کا نصاب مندرجہ ذیل ہے۔

مضامین:- ۱۔ دینیات
۲۔ ملکی زبان اور دو غیر ملکی زبانیں ایک بہ حیثیت مضمون خاص اور دوسری بہ حیثیت ثانوی
۳۔ جسمانی تربیت
} یہ تینوں مضامین لازمی ہیں۔

اختیاری مضامین

۱۔ عمرانیات (شہریت۔ تاریخ۔ جغرافیہ)
۲۔ ریاضیات۔
۳۔ طبعیات (فزکس)
۴۔ فنی مضامین (نیس کے لحاظ سے۔ طالب علم کو اختیار ہے کہ وہ ان میں سے تین مضامین حسب مذاق پسند کرے۔ اس مرحلے میں گویا کل مضامین ۶ ہیں۔

ثانوی تعلیم کے دور ثانی کا آخری مرحلہ سال چہارم و پنجم

اس مرحلے میں تمام نصاب ادبی و علمی اور عمومی حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ ہر حصے میں شرکت سال اول کے مضامین اختیاری کی نوعیت کے ساتھ مقرون ہے۔ ہم اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے ثانوی تعلیم میں وظائف اور معافی فیس کی مراعات رکھی ہیں جو تقریباً ہمارے ملک کے مماثل ہیں۔ ثانوی مدارس میں داخلے کی عمر نئے طلبا کے لئے زیادہ سے زیادہ ۱۵ سال اور قدیم طلبا کے لئے ۱۲ سال ہے

لڑکیوں کی تعلیم:- یوں تو مصر میں ثانوی تعلیم میں مخلوط تعلیم کا طریقہ رائج ہے۔ مگر ۱۹۳۶ء کے آغاز میں لڑکیوں کی تعلیم اور استانیوں کی تربیت کے مشترکہ اعلیٰ ادارے کو پانچ شعبوں میں بالکل جداگانہ طرز پر تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جن میں وہ اپنی اپنی انفرادی صلاحیتوں کے مطابق تعلیم پا سکتی ہیں۔ یعنی ۱ امور خانہ داری، ۲ کشیدہ کاری اور سوزن کاری، ۳ فنون لطیفہ اور جسمانی تربیت، ۴ عوام کی خدمت اور نرسنگ، ۵ موسیقی۔ ان اداروں کا کورس تین سال کا ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی گریجویٹ طالبہ تدریس کی سند حاصل کرنا چاہے۔ تو مزید ایک سال کا اضافہ اس مدت میں کر دیا جاتا ہے جس میں اس کو نفسیات، اصول تعلیم اور دیگر طریقہ ہائے تعلیم مثلاً مانٹیسوری، کنڈر گارٹن وغیرہ سکھائے جاتے ہیں۔ موسیقی کے اداروں میں مزید دو سال کی ضرورت ہوتی ہے۔

فنی اور صنعتی تعلیم عمومی تعلیم کے ساتھ ساتھ فنی اور صنعتی تعلیم پر بھی نظر ثانی کی گئی، اور اس نصاب میں بھی ضروری ترمیمات کی گئیں، اور ان اداروں کو اس لائق بنا دیا گیا کہ یہاں کے فارغ التحصیل طلبا انجنیرنگ کے اعلیٰ ادارے میں بھی تعلیم حاصل کر سکیں۔ سب سے اہم اور قابل ذکر چیز یہ ہے کہ ابتدائی مدارس میں حکومت کی طرف سے مفت تعلیم کے ساتھ ساتھ مفت خوراک کا بھی انتظام ہے۔ ۴۸-۱۹۴۷ء میں مفت خوراک پانے والے طلبا کی تعداد ۸ لاکھ تھی۔ اور اب دوسرے تعلیمی سال میں یہ تعداد بڑھ کر ۱۰ لاکھ کے قریب پہنچ گئی ہے۔ یہ خرچ ہر سال حکومت کے میزانیہ میں شامل ہوتا ہے۔ پرائمری اسکولوں میں بھی بہت کم معاوضے پر یہ خوراک بہم پہنچائی جاتی ہے۔ دینی تعلیم کے اعلیٰ ادارہ جامعہ ازہر میں ہزاروں طلبا کو مفت خوراک دیئے جانے کا انتظام اور مصارف اس کے علاوہ ہیں۔

تعلیم کے اس فروغ کے پیش نظر چونکہ موجودہ مدارس ناکافی ہیں اس لئے گورنمنٹ نے دس لاکھ پاونڈ جدید مدارس کی تعمیر کے لئے منظور کئے ہیں۔ (اراضی سرکاری) ان مدارس میں سے بعض کا تعمیری کام عنقریب ختم ہو جائے گا۔ لیکن یہ سارا کام ۱۰ سال میں پایۂ تکمیل کو پہنچے گا۔

اساتذہ کی تربیت تربیت یافتہ اساتذہ کی روز افزوں ضرورت کے پیش نظر وزارت تعلیم نے اساتذہ کے مدارس تربیت میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔ اور داخلہ کی شرائط پہلے کے مقابلے میں کچھ نرم اور کم کر دی ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ اساتذہ کو وہاں تربیت کا

موقع مل سکے۔ ۴۷-۱۹۴۶ء میں اعلیٰ تربیتی مدرسے میں فرانسیسی زبان کو بھی ملکی مصالح کی بنا پر زیادہ فروغ دینے کی کوشش کی گئی۔

اساتذہ کی تربیت کے لئے مندرجہ ذیل مدارس قائم کئے گئے۔ ان میں تحتانی تعلیم کے لئے اساتذہ کو تربیت دی جاتی ہے۔

۱۔ اساتذہ کے لئے ایک ابتدائی ٹریننگ اسکول (ہمارے یہاں کے نارمل اسکول کے مماثل)

۲۔ استانیوں کے لئے دو ابتدائی ٹریننگ اسکول۔

۳۔ دیہاتی ٹریننگ اسکول (پبلک ٹریننگ اسکول کے مماثل)

دیہاتی زندگی کی صحیح تربیت کے لئے ایک ایسا ادارہ تعلیمی قائم کیا گیا ہے جہاں مویشیوں کی پرورش، ڈیری فارم، کتائی درزی وغیرہ کی تعلیم دی جائے گی۔ تاکہ یہاں کے تعلیم یافتہ طلبا کے ہاتھوں دیہات کی زندگی کو فروغ حاصل ہو سکے۔

لازمی تعلیم وزارت تعلیم یہ سعی کر رہی ہے۔ کہ تمام ملک کے بارہ برس سے اٹھارہ برس کے لڑکوں اور بارہ سے پندرہ برس کی لڑکیوں کی ناخواندگی دور کر دی جائے۔ اس سلسلے میں اس کو کامیابی بھی حاصل ہو رہی ہے۔ اگرچہ ابھی جبری تعلیم کے قانون کا نفاذ نہیں کیا گیا ہے مگر ایک عام تعلیمی ذوق پیدا ہو رہا ہے۔ اسی طرح تعلیم بالغان کی طرف بھی کافی توجہ کی جا رہی ہے۔ آئندہ توقع کی جا رہی ہے کہ مصر میں بھی لازمی تعلیم کا قانون نافذ ہو جائے گا۔ قیدیوں، کارخانہ کے مزدوروں کو پڑھانے کی طرف بھی توجہ کی جا رہی ہے۔ کارخانے کے مالکوں کو اس میدان میں امداد دینے کا بھی وعدہ کیا گیا ہے، اسی طرح ناخواندہ فوجیوں کو بھی جلد سے جلد خواندہ بنانے کی مہم جاری ہے غرضیکہ حکومت مصر اپنی پوری توجہ تعلیم کی ترویج و اشاعت پر صرف کر رہی ہے تاکہ مصر بھی اس دوڑ میں متمدن ممالک سے پیچھے نہ رہے اور ان کے دوش بدوش کھڑا ہو سکے۔ امید ہے کہ چند سال میں مصر اپنی جد و جہد سے اس تعلیمی بلندی پر پہنچ جائے گا۔ جہاں آج دوسرے ممالک پہنچ چکے ہیں۔ اور اس بربریت اور وحشت آباد سرزمین کو تمدن و تہذیب کی آبیاری سے مردم خیز بنا سکے گا۔

صدر جمہوریہ ہند کا نیا پرچم

۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کو جب جمہوریہ ہند کے صدر اپنا عہدہ سنبھالیں گے تو اس وقت توپوں کی سلامی کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ ہاؤس پر صدر کا نیا پرچم بھی لہرایا جائے گا۔ یہ پرچم ہندوستان کے ماضی اور تمدن کے نشانات کا حامل ہوگا۔

پرچم نیلے اور سرخ رنگ کی چار مستطیلوں پر مشتمل ہوگا۔ ہر رنگ مستطیلیں متقابل ہوں گی۔ اور اس پر حکومت ہند کا طغرا، ایک ہاتھی، ترازو اور کنول بنے ہوں گے۔ ان میں سے ہر ایک نشان مطلا و مذہب ہوگا۔ اور الگ الگ مستطیلوں میں ہوگا۔ طغرا جس میں اشوک کی ستون اور تین شیر دکھائے گئے ہیں۔ اور اس کے ساتھ کنول سارناتھ سے لئے گئے ہیں۔ گویا کہ یہ پہلی صدی قبل از مسیح کا نشان ہیں۔ پانچویں صدی عیسوی کے نشان کے طور پر اجنتا سے ہاتھی کا نشان لیا گیا ہے۔ سترھویں صدی عیسوی کا نشان لال قلعہ کی میزان ہے۔ اشوک کی ستون اتحاد مساوات اور اخوت کا علم بردار ہے۔ اجنتا کا ہاتھی صبر اور طاقت کا ترجمان ہے۔ میزان عدل و کفایت کی علامت ہے۔ اور کنول (پورن گھاٹ) خوش حالی اور فراوانی کا مظہر ہے۔

سمیع حسن نقوی

آزادی کے دِن

ہاتھ جو مارا تو چڑا میری مٹھی میں تھا

میں تیزی کو اسی طرح ہاتھ میں لئے صحن میں آگیا۔ بچوں میں شور مچ گیا جیسے امتحان کا نتیجہ آگیا ہو۔ سارا گھر "ہم لیں" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ ملک میں جشن آزادی منایا جا رہا تھا گھر میں غلامی پر قہقہے لگنے لگے۔ منّی بولیں "ہم لیں" چھنی نے کہا "ہمیں دیجئے" منّے جو بربھات پھیری سے ابھی ابھی لوٹ کر آئے تھے۔ اپنا دعویٰ الگ جتانے لگے۔ بیگم بولیں "اچھا ہوا موئے کا علاج ہی یہ تھا"۔ اماں بھی غریب سے جلی بیٹھی تھیں کہنے لگیں "ہرگز نہ چھوڑ نا موذی نے ستایا بھی بہت تھا"۔ ماما جو بے اولادی تھی۔ ٹانگ اڑانے لگی "اچھے میاں چھوڑ نا مت اسے میں پالوں گی"

میں بہت دنوں سے چڑے کو سزا دینے کی فکر میں تھا مگر وہ کسی طرح میرے قابو میں نہ آتا تھا۔ آج اُس نے بغیر کسی دشواری کے اپنے کو میرے حوالے کر دیا۔ آئینے کے سامنے اپنے حریف سے جنگ میں ایسا اُلجھا کہ اپنے گرد و پیش سے بالکل بے خبر ہو گیا۔ بچے شور مچاتے پھر رہے تھے، بیگم بیٹھی چھالیا کتر رہی تھیں، ماما چولھا جھونک رہی تھی اور چڑا آئینے کے سامنے ایک دوسرے چڑے سے لڑائی میں مصروف تھا۔ معاً مجھے مذاق سوجھا۔ چڑے کو گرفتار کرنے کے لئے نہ میں نے جال پھیلائے، نہ کوئی چال چلی۔ میں صرف اس طرح کھڑا ہو گیا کہ میرا عکس آئینہ میں چڑے کو نہ دکھائی دے سکے اور ہاتھ بڑھا کر چشم زدن میں چڑے کو پکڑ لیا۔ اب پکڑ لیا تو سوال پیدا ہوا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، کیا سزا دی جائے اور کس طرح۔

میرے پاس وقت بہت کم تھا اور مجھے جانے کی جلدی تھی۔ برسات کی خوشگوار صبح تھی۔ کئی دن کی مسلسل بارش کے بعد آج پہلی بار آسمان اتنا نکھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اور اندازہ ہوتا تھا کہ دن بھر مطلع صاف رہے گا۔ فضا پرسکون تھی۔ صبح بنارس کا لطف آ رہا تھا۔ ہر طرف رونق تھی۔ کائنات کا ذرہ ذرہ مسکراتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ شہر میں یوم آزادی منایا جا رہا تھا۔ اسکول کے بچوں کے جتھے "ہندوستان کی جے ہو، مہاتما گاندھی کی جے ہو" کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے ٹاؤن ہال کے جلسۂ عام میں شرکت کرنے کے لئے جا رہے تھے جہاں مجھے بھی تقریر کرنی تھی

کمزوری اور بے بسی کے عالم میں انسان عدم تشدد کا ہتھیار استعمال اور ستیہ گرہ کی پالیسی پر عمل کرتا ہے۔ وہ ہتھیار اور وہ پالیسی جس کے ذریعے سے ہندوستان نے آزادی حاصل کی۔ مگر چڑے نے انسان کی تقلید نہیں کی۔ اس نے آزاد ہونے کے لئے کئی بار پر پھڑ پھڑائے، اپنی ننھی منی چونچ سے میرے ہاتھ کو زخمی کرنے کی کوشش کی، میری ہتھیلی میں پنجے گڑو دیئے اور آزادی کے لئے بہتری جدوجہد کی مگر ناکام رہا۔ اس کی جدوجہد کا ردِ عمل مجھ پر یہ ہوا کہ میں نے اپنی گرفت کو اور زیادہ مضبوط کر لیا۔ مایوس ہو کر اس نے مجھے غور سے دیکھا جیسے اپنی شکست کا اعتراف کر رہا ہو۔ میں نے بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور اسے بتا دیا۔ "پیارے دوست! تم نے میرے ساتھ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے آج میری باری ہے"۔ چڑے کی گذشتہ زندگی، اس کی ناشائستہ حرکات اور برے طرز عمل کا نقشہ فوراً میری آنکھوں میں پھر گیا۔ مجھے ایک ایک کر کے اپنی تمام وہ تکلیفیں یاد آگئیں جو چڑے کے ہاتھوں مجھے پہنچی تھیں۔ ایک تصویر کے بعد دوسری سامنے آنے لگی جیسے خاموش فلم دیکھ رہے ہوں

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دیکھنا شروع کیا۔ چڑا اسنگار میز

کے بڑے آئینہ کے سامنے کھڑا ایک دوسرے چڑے کے ساتھ نبرد آزما ہے۔ دونوں میں ایسی شدید جنگ ہو رہی ہے کہ الاماں والحفیظ! ۔ چڑا اپنے حریف پر حملے پر حملہ بول رہا ہے۔ حریف ترکی بترکی جواب دے رہا ہے۔ چڑے نے داؤ کیا حریف نے جھٹ توڑ کر دیا۔ چڑا اس پر جھپٹا وہ چڑے پر۔ پھر دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد دونوں ایک دوسرے کو چھوڑ دم لینے کے لئے علیحدہ ہو گئے۔ لڑتے لڑتے تھک گئے تھے اور محنت کرکے سانس پھول گیا تھا۔ ایک ہانپا تو دوسرا بھی۔ چڑے کو اس پر تاؤ آگیا۔ کہ حریف میرا مذاق اُڑاتا ہے۔ جو میں کرتا ہوں۔ اس کی نقل کر رہا ہے ضرور یہ کوئی بہادر چڑا ہے۔ اس کا مقابلہ پھر کرنا چاہئے ادھوری لڑائی چھوڑ کر بھاگنا شرمناک ہے! اور اصول جنگ کے منافی۔ نعرہ تکبیر لگا کر ایک بار پھر حملہ آور ہوا۔ اب کی نئے داؤ چلے اور نئے ہتھکنڈے استعمال کئے۔ کبھی پر نوچنے کی کوشش کی، کبھی آنکھ پھوڑنے کی، کبھی سر زخمی کرنے کی، جب کوئی داؤ باقی نہ رہا تو تھک کر بیٹھ رہا حریف نے بھی یہی کیا؛

اس دوران میں چڑیا عرب عورتوں کی طرح برابر کھونٹی پر بیٹھی۔ بڑے جوش کے ساتھ اپنے شوہر کی ہمت بڑھاتی رہتی۔ بہادری اور جوش پیدا کرنے والے اشعار پڑھتی۔ اپنی زبان میں شوہر کی جواں مردی اور شمشیر زنی کی تعریف میں خوش الحانی اور ترنم کے ساتھ ایسے ایسے قصیدے پڑھتی کہ جریر اور فرزدق کی روح تڑپ اُٹھتی۔ کبھی کبھی جوش میں شوہر کے دوش بدوش لڑنے پر آمادہ ہو جاتی۔ اُدھر سے حریف کی بیوی بھی نکل آتی اور پھر دونوں میں وہ جوتی چلتی آہ وہ کوسنے دیئے جاتے ایسی ایسی گالیاں ایک دوسرے پر صرف کی جاتیں کہ شوہروں کو شرم آنے لگتی اور مجبوراً انہیں کہنا پڑتا "بیوی چلو۔ اب پھر لڑیں گے"۔

مجھے یاد ہے کہ بعض اوقات میں نے چڑیا چڑے کو سارا سارا دن اسی طرح مصروف کارزار دیکھا ہے۔ اکثر میں نے بڑے آئینے کو میدان جنگ بننے سے محفوظ رکھنے کی خاطر کوئی کپڑا یا بڑی تولیہ آئینہ پر ڈال دی لیکن اس قسم کی تمام تدبیریں ناکام رہتی تھیں۔ کیونکہ کسی کی بے پروائی سے یا ہوا کے جھونکے سے کپڑے یا تولیہ کا کوئی حصہ بھی ہٹ جاتا اور آئینہ کا ذرا سا گوشہ بھی خالی ہوتا تو چڑے اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتے۔ اور اپنے حریف سے کشتی شروع کر دیتے۔

جب میں اور بیگم زنانہ مکان کے ایک کمرے میں سوتے تھے۔ تو چڑے نے محض ہمیں چڑانے کی خاطر خاص ہماری چارپائیوں کے اوپر والی کڑی میں گھونسلا بنا رکھا تھا۔ چڑا تنہا نہ تھا۔ اس کی بیوی بھی تھی اور اسی گھونسلے میں ان کے بچے بھی ہوئے جو وہیں پلے بڑھے۔ مجھے وہ منظر کبھی نہ بھولے گا۔ جب اس کنبے نے ہمارے بستروں کو اپنی بیٹ سے سیاہ وسفید چھینٹ کا گنگا جمنی نمونہ بنا دیا تھا ہم میاں بی بی اور بچے روزانہ اُن کے مہتر کے فرائض انجام دیتے دیتے تھک گئے لیکن اُن میاں بی بی اور بچوں نے ہم پر ذرا رحم نہ کھایا۔ اور برابر بلا تنخواہ کام لیتے رہے۔ پھر آج مزدور نے ساہوکار کو دبوچ لیا۔ تو شکوہ کیا! ۔ چڑا کلبلایا اور میں نے قیدی کی گرفت کو اور مضبوط کر دیا۔

تنگ آکر ہمیں ایک دوسرے کمرے کو اپنا سونے کا کمرہ بنانا پڑا لیکن چڑیا چڑے کو بہرحال ہم سے ضد ٹھہری۔ انہوں نے بھی ہجرت کر لی اور معہ سامان ہمارے نئے کمرے میں منتقل ہو گئے چڑے نے فوراً اپنے کو شرنارتھیوں میں رجسٹر کرا لیا۔ تلاش مکان میں اسے کسٹوڈین کی امداد کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ پلنگ کے خاص اوپر والی کڑی میں اسے جگہ بھی مل گئی کونسی ایسی تدبیر تھی جو میں نے اسے اس کے ارادے سے باز رکھنے کے لئے استعمال نہ کی ہو۔ اس کے شہر بدر ہونے کا اعلان نہ کیا۔ اس کے داخلے پر پابندی نہ لگائی ہو۔ گرفتاری کا وارنٹ جاری نہ کرایا ہو اور ساتھ ہی گرفتار کرنے والے کو انعام دینے کا وعدہ نہ کیا ہو۔ لیکن اس قسم کی سیاسی پابندیاں اس کی روک تھام کرنے میں ناکام رہیں بلکہ اس کا اُلٹا اثر یہ ہُوا کہ اس کی جسارت میں اضافہ ہو گیا۔ وہ دیدہ دلیری سے کمرے میں آتا جاتا اور کھلم کھلا کمرے پر برابری کے قبضے کا دعویٰ کرتا تھا۔ جب اس طرح کام نہ چلا تو میں نے چاروں طرف پہرے لگا دیئے۔ کھڑکیاں بند کرا دیں۔ دروازوں پر "اندر آنا منع ہے" لکھوا دیا۔ اور روشندان پر "یہ عام راستہ نہیں ہے" کی تختی لگوا دی اور اطمینان سے پڑ کر سویا۔ رات کو آنکھ کھلی تو پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ چڑا کمرے میں موجود تھا۔

اگلے دن صبح کو اُٹھ کر میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا۔ کہ اپنے اردلی کو حکم سُنا دیا کہ آج ہی بلکہ ابھی ابھی اس کڑی پر اِدھر سے اُدھر تک کاغذ منڈھ دے تاکہ چڑے کو قیام کی جگہ ہی نہ مل سکے۔ شاخ ہی نہ ہوگی تو آشیانہ کہاں بنائے گا۔ اردلی بیچارے نے دن بھر بڑی کاوشوں سے کڑیوں پر کاغذ منڈھا۔ میری ہدایت کے مطابق اس کے گھونسلے میں گودڑ ٹھونسا۔ اس رات کو میں نے دیکھا کہ چڑا آرام نہ کر سکا۔ سردی کے موسم میں بیچارہ رات بھر بے چین رہا۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ دو چار ہی دن میں اس نے اور اس کی بیوی نے مل جل کر اپنی چونچوں اور پنجوں سے کاغذ پھاڑ ڈالا، گودڑ نکال کر پھینک دیا اور ہمارے بستروں پر کوڑے کا ڈھیر لگا کر اپنے گھونسلے پر اس طرح قبضہ کر لیا۔ جیسے شیواجی نے اپنے گھر پر کیا تھا۔

وہ نقشہ بھی میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا کہ میں نے آئینے کو صاف کیا اور اُدھر چڑیا چڑے نے مل کر اپنی بیٹ سے اسے تختۂ گل بنا دیا۔ ہماری سنگار میز اپنے بڑے آئینہ کے ساتھ ہمارے سونے کے کمرے میں رکھی رہتی ہے۔ چڑے کو خود بینی اور چڑیا کو بناؤ سنگار کا بڑا شوق ہے۔ اکثر یہ جوڑا بڑے آئینے کے چوکھٹے پر بیٹھتا ہے اور بیٹ کے ہار گوندھنا شروع کر دیتا ہے۔ آئینے پر بیٹ کے اتنے انبار لگ جاتے ہیں کہ صورت دکھائی دینی بند ہو جاتی ہے اور اگر روزانہ صاف نہ کرایا جائے تو آئینہ پتھر بن جاتا ہے۔ بیٹ کے کچھ ایسے نقش و نگار بن جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کسی کاریگر نے بڑے اہتمام کے ساتھ آئینے کو رشکِ چمن بنانے کی کوشش کی ہے۔

ایک آئینہ ہی کیا کوئی تصویر ایسی نہیں جس پر سہرے کی لڑیاں نہ لٹک رہی ہوں۔ ایک دن میرے ایک دوست کی تصویر کا چورا کر دیا۔ دونوں میاں بیویوں نے تصویر کو جھولا سمجھ کر پینگ بڑھانی شروع کر دی اور یک لخت چھوڑ کر چمپت ہو گئے۔ تصویر نیچے آ رہی۔ ایک چینی کی پیالی جو کارنس پر رکھی تھی توڑ دی اور پورا اسٹ بیکار کر دیا۔ سوٹ نیا دھل کر آیا تھا۔ پہننے کے لئے ہینگر پر لٹکایا چڑیا چڑے فوراً اپنے تصرف میں لے آئے اور بیٹ کے نقش و نگار سے چھاپ دیا۔ دفتر کا صندوقچہ بیٹ سے رنگا رہتا ہے۔ بک کے سفید جوتوں پر بیٹ کے نشانات موجود ہیں۔ کتابیں جو میز پر رکھ دی جاتی ہیں۔ نوسائیٹ کی رنگ برنگی تحریروں سے چھپ جاتی ہیں۔ کمرہ کیا ہے گویا چڑیا چڑے کا اکھاڑا ہے۔

جوں جوں میں نے سوچا نئی نئی باتیں یاد آ گئیں۔ اور غصہ بڑھتا گیا۔ اب جوشِ انتقام اپنے پورے عروج پر تھا۔ "شریر چڑے"! میں نے قیدی کو مخاطب کیا "تم نے پچھلے دنوں میری ایک تصویر کو چورا چورا کیا تھا۔ جو مجھے سب سے زیادہ عزیز تھی۔ میرے ایک دوست کی تصویر جو اب اس دنیا میں نہ تھا اور جس کی صرف یہی ایک یادگار رہ گئی تھی۔ کیا وجہ ہے۔ کہ آج تمہارا گلا نہ گھونٹ دیا جائے۔ آج تم میرے چنگل میں ہو میں بہت دنوں سے تمہاری تاک میں تھا۔ آج موقع ہے۔ کہ تمہاری تمام کارستانیوں کا ایک دفعہ ہی بدلہ لے لوں"۔ قیدی نے تکلیف سے اِدھر اُدھر گردن گھمائی۔ غالباً وہ کہنا چاہتا تھا "بے بس ہوں جو چاہیں کہیں، اور جو چاہیں کریں"۔

عالی ظرفی اور رحم انسان کے دو ممدوح صفات ہیں۔ میں اس وقت ان دونوں صفتوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مجھے چڑے پر رحم آنے لگا۔ میری خودداری نے ایک ننھے، بے بس اور معصوم پرندکی جان لینے سے انکار کر دیا۔ اِدھر جوشِ انتقام نے کروٹ بدلی۔ اور چڑے کے خلاف کڑی کارروائی کرنے کا تقاضا کیا۔ میں ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ رحم کہتا چھوڑ دو اور انتقام کہتا مار دو۔ اگرچہ دماغ کے ایوان میں اس وقت اکثریت میں انتقام کی جماعت تھی اور استصوابِ رائے کیا جاتا تو فیصلہ انتقام کے حق میں ہوتا لیکن میں نے بہرحال اس خاص معاملے میں رائے شماری کو مناسب نہیں سمجھا۔

دوسری طرف میں نے خیال کیا کہ آج دنیا آزادی کا جشن منا رہی ہے اور میں نے اس کمزور چڑے کو اپنے پنجے میں دبا رکھا ہے۔ مجھے اپنے وطن کی غلامی، بدیشیوں کے مظالم، اور مادرِ وطن کے سپوتوں کی قربانیاں یاد آ گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا دل معصوم قیدی کی طرف سے نرم ہونے لگا۔ بے شک چڑے نے مجھے اذیتیں پہنچائی تھیں۔ لیکن وہ تو سب وقتی تکلیفیں تھیں اور میں ــــ میں اس کی جان لینے پر

تلا ہوا تھا۔ جان لینے کے خیال سے مجھے شرم آنے لگی۔ ادھر بچوں کی ہٹ، بیگم کی ضد، اور ماما کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میں سمجھا جیسے قوت فیصلہ سلب ہو گئی۔ آخرکار ذہن کی عدالت نے اپنا فیصلہ سنا دیا ـــــ یہ فیصلہ چڑے کے حق میں تھا۔ میں نے اپنی گرفت کو ڈھیلا کر دیا۔ چڑا ـــــ پھر سے اڑ گیا اور اپنی چڑیا سے جا ملا جو دیوار پر بیٹھی اپنے پتی کا راستہ تک رہی تھی۔

بیگم بولیں، "یہ کیا کیا!"

منی نے کہا، "چک چک!! ہا ہا!!"

منے رونے لگے۔ ماما بولی، "واہ میاں واہ ایک ڈھا ہی کیوں تھا۔ جو چھوڑ دیا!" میں نے کہا، "بڑی بی اولاد کا شوق ہے تو کتے پالو۔ چڑا ننھی سی جان بھلا کیا تمہارے ذوق کی تسکین کرتا؟" میں جانتا تھا کہ میرے اس عمل سے گھر والے خوش نہ ہوں گے مگر میرا قلب مطمئن تھا کہ آزادی کے دن میں نے ایک غلام کو آزاد کیا۔

چڑیا چڑا اب بھی میرے کمرہ میں رہتے ہیں لیکن ان کی بھائیوں میں اب میں معصومیت کی جھلک پاتا ہوں۔ وہ میرے دوست ہو گئے ہیں اور مجھے اپنا سمجھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اس کمرے میں رہے۔ ان کا اس پر حق ہے۔ پھر میں انہیں نکالنے والا کون؟ اور اب تو میں اُن کا اتنا عادی ہو گیا ہوں کہ جس دن ان کی چیں چیں سنائی نہیں دیتی تو مجھے کمرہ بے رونق اور اداس نظر آتا ہے۔ چڑیا چڑا زندہ باد!

ہندوستان کی تجارت برآمد

اکتوبر ۱۹۴۹ء میں مشکل الحصول کرنسی کے علاقوں میں ہندوستان کی برآمد میں ستمبر کی نسبت ۳ کروڑ روپیہ کا اضافہ ہوا۔ روپیہ کی قیمت کم ہو جانے کے بعد اکتوبر پہلا مکمل مہینہ تھا۔ اکتوبر میں دراصل دس کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ کا مال برآمد ہوا۔ اس کے مقابلے میں ستمبر میں ۷ کروڑ ۸۰ لاکھ کا ہوا تھا۔ ان میں سے دو کروڑ کا اضافہ ڈالر کے علاقوں سے تعلق ہے بقیہ دوسرے مشکل الحصول کرنسی کے علاقوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ کا سامان برآمد کیا گیا تھا۔

اس سال اکتوبر میں گذشتہ ماہ کے مقابلے میں جن اجناس کی وجہ سے یہ اضافہ ہوا وہ حسب ذیل ہیں:

پٹ سن کا سامان	ایک کروڑ روپیہ		
خام پٹ سن	ساٹھ لاکھ روپیہ	کپاس	۴۵ لاکھ روپیہ
مصالحے	۴۰ لاکھ روپیہ	کاجو	تیس لاکھ روپیہ

کل برآمد میں اضافہ ہوا۔

اکتوبر میں ۴۳ کروڑ ۵۵ لاکھ روپیہ کا سامان برآمد کیا گیا تھا۔ ان میں ۷۰ لاکھ روپے کا ڈالر کے سودا شدہ کا وہ مال بھی شامل ہے جو گذشتہ مہینے کے اعداد و شمار میں نہیں دکھایا گیا تھا۔ ستمبر میں ۳۲ کروڑ ۴۴ لاکھ روپے کا سامان برآمد کیا گیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں ۴۳ کروڑ ۱۲ لاکھ روپے کا سامان برآمد کیا گیا تھا۔

اکتوبر ۱۹۴۹ء میں کل ممالک کو جو اہم مال برآمد کیا گیا اس کی فہرست مع قیمت کے حسب ذیل ہے۔ (بریکٹ کے اعداد اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ برآمد میں گذشتہ ماہ کی نسبت اضافہ یا تخفیف)

پٹ سن ذا کا سامان	(روپیہ لاکھوں میں)
پٹ سن کا سامان	٦٥٩ (— ۳)
خام پٹ سن	۱۹۵ (+ ۹۹)
کپاس اور اس کی روئی	۱۱۱ (+ ۵۳)
سوتی کپڑا	۴۰۳ (— ۸۵)
کھالیں اور خام چمڑا	۲۳. (— ۴۴)
کھالیں اور دباغت شدہ چمڑا	۸۳ (— ۱۵)
مونگ پھلی اور السی کا تیل	۲۳ (+ ۰۸)
مونگ پھلی اور السی	٦۷ (— ۳)
تمباکو	۱۲۷ (+ ۵۷)
چائے	۷۴۰ (+ ۱۰۰۳)
مسالے	۱۱۱ (— ۴۴)
ابرق	۲۴ (— ۱۱)
لاکھ	۵۱ (— ٦)
خام مینگنیز	۳۷ (— ۹)
پھل اور سبزیاں	٦۹ (— ۱۹)
متفرقات	۳۴۴ (— ۵۹)

اے۔ غنی

کشمیری رسم الخط

کشمیر برسوں غلام رہا۔ رُوح بھی وقفِ غیر رہی اور تن بھی گروِ غیر رہا۔ تلوار میان میں رہی۔ اگر نکلی بھی تو فقط آقا کے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے۔ قلم بیکار رہا، چلا تو مالک، بادشاہ اور رئیس کی مدح سرائی میں۔ انہی کی زبان میں۔ فخر اس بات کا رہا کہ تلوار اپنے ہی ساتھیوں کے سر آقاؤں کے قدموں پر ڈالتی رہی۔ اور قلم انہی کے اشاروں پر ناچتا رہا۔

صدیوں یہی حال رہا۔ مگر اس عجیب و تر دماغ قوم کی لچکدار ہستی طوفانوں کے ساتھ ہمکنار ہو کے بھی قائم رہی۔ زبان بے توجہی کا شکار رہی۔ اپنے پرائے مذاق اُڑاتے رہے۔ لیکن وہ مری نہیں، زندہ رہی۔ اور پھلتی پھولتی رہی۔ یہ دوسری زبانوں، مالکوں کی زبانوں سے۔ اپنے لئے نشو و نما کی غذا لیتی رہی۔ چیدہ چیدہ الفاظ اپناتی اور ظاہری اور معنوی وسعت پکڑتی رہی۔

مختلف تمدن کے لوگ کشمیریوں کے آقا رہے کشمیری زبان نے ان کی زبانوں کے امتزاج سے ایک حسین اور جامع ذخیرہ تیار کیا۔

اور آخر کار

غلامی کا بوجھ سر اور کندھوں سے سرکنے لگا۔ استحصال کے سیاہ بادلوں کے پیچھے سے جمہوریت کا آفتاب جلوہ دکھانے لگا۔ کشمیری کی توجہ اپنی مادری زبان کی طرف پھرنے لگی۔ اس میں ہزاروں شاعر پیدا ہوئے۔ لیکن اُن موتیوں کی طرح جو سمندر کے آغوش میں ہی پوشیدہ رہے ہوں، اور زمانے کے مخالف تھپیڑوں سے اُبھر نہ پائے ہوں۔ اُن کا کلام موجود ہے۔ نثار بہت تھوڑے پیدا ہوئے۔ کیونکہ زبان فارسی رسم الخط میں صحیح طور پر نہیں لکھی جا سکتی تھی۔

کشمیری زبان کا اپنا پرانا رسم الخط شاردا تھا۔ صدیوں اسی خط میں ہماری زبان پھلتی پھولتی رہی۔ فارسی کی یورش کی تاب اس میں نہ تھی۔ اسکے سامنے اُسے ہتھیار ڈال دینا پڑے۔ اور تقریباً سو سال سے شاردا خط ایک بُجھا ہوا چراغ ہے۔ اب اس خط میں لکھنے والے لے دے کے صرف چند براہمن رہ گئے ہیں۔

فارسی رسم الخط میں کشمیری زبان کی مختلف آوازوں کے لئے موزوں حروف نہیں تھے۔ لوگ کشمیری اسی میں لکھتے گئے۔ یہ خط بدل نہیں سکا۔ زباں داں مطلب نکالتے رہے۔ باہر کے لوگ یا تو رومن میں سیکھنے کی کوشش کرتے یا مضحکہ خیز تلفظ بنا بنا کے اس خط میں کشمیری پڑھتے۔

انگریز مشنریوں نے کشمیری زبان پر بہت احسان کیا۔ انھوں نے مغربی زباں دانوں کے نقطۂ نگاہ سے صرف و نحو اور بول چال کی کئی کتابیں لکھیں، اور بڑے پیمانے پر اُن کی اشاعت کی۔ یہ لوگ رومن میں تحریر لکھنے میں کافی حد تک کامیاب رہے۔ ان میں پادری ٹی، آر، ویڈ اور ڈاکٹر نیو کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ سر جارج گرایرسن نے بحیثیت ایک مستند زبان داں کے ایک اعلیٰ پائے کی ڈکشنری مُرتب کرکے اور صرف و نحو لکھ کے کشمیری زبان کو چار چاند لگا دیئے۔

ڈاکٹر مگومری کا نام کشمیری ادب میں ایک محسن کی حیثیت میں لیا جائیگا۔ آپ نے کشمیری زبان میں اتنی دستگاہ حاصل کی تھی کہ نظم میں کامیابی سے کئی کتابیں لکھ لیں جن میں زبان کی سادگی اور روانی کے علاوہ ایک خاص امتیازی شان رہی۔ وہ یہ کہ آپ نے پہلی بار مشرقی بحروں سے منہ موڑ کے اپنے یورپین انداز میں کشمیری نظم لکھی۔ آپ کی کتاب "کاشر گونج پوشہ مال" بچوں اور عورتوں میں بہت زیادہ مقبول ہوئی

ان کے علاوہ ہندوستان کے کئی ادیبوں نے فارسی رسم الخط میں اعراب کے اضافوں سے کشمیری لکھنے کی ناکام کوشش کی۔ یہی حال ہمارے یہاں کے بیسیوں ادیبوں اور شاعروں کی کاوشوں کا ہوا۔

اب عوامی حکومت کی خاص توجہ سے چار کشمیریوں پر مشتمل ایک سب کمیٹی کے سپرد رسم الخط کی تکمیل کا کام ہوگیا ہے۔ اور پہلی بار یہ خط ایسے سانچہ میں ڈھالا جا رہا ہے کہ ہر آواز حرف کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔ راقم کے علاوہ خواجہ غلام احمد عشائی۔ پروفیسر خوشحالی اور پروفیسر جیالال کول اس سب کمیٹی کے ممبر ہیں۔

ہم چاروں نے سالہا سال اپنی اپنی جگہ اس کام پر وقت صرف کیا لیکن اعراب کے بڑھانے کے بغیر اور کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ ایک جگہ پر اکٹھے ہو کے سوچنے سے اس بات پر اتفاق ہوا کہ اعراب کا اضافہ اس خط کو مکمل نہیں کرتا۔ بلکہ ہماری مشکلوں کو بڑھاتا ہے۔ آخر یہی طے پایا کہ نئی آوازوں کو حروف کا ہی جامہ پہنایا جائے۔ تاکہ مستقبل قریب میں اس زبان میں ٹائپ ہونے کی استعداد پیدا ہو سکے۔

اَ، آ، اِ، ای، اے، اُ، او ہم نے اُردو سے ہی قبول کئے۔
ان کے علاوہ ۂ جیسے اَنٛکھ = آنکھ، چھ۔ کٛار = کنواری۔ نٛار = بانہ میں ۂ جیسے دٕر = داڑھی ہٕس = مُنہ۔ کٕار = گردن۔ تٕار = فرصت دٕر = کھڑکی میں ۂ جیسے بٲ = میں کھاٮر = پھسلنا۔ کھاٮرٕ = زخم میں ٲ جیسے تاٮر = ٹھنڈی۔ ڈٲکٕس = ڈنڈا میں۔
اٖ جیسے اٖن = اندھا۔ گٕب = بھاری۔ نٕ = دینا۔ کٕس = کڑا میں۔
اٗ جیسے نوٗش = بہو۔ دوٗش = آہ۔ ھوٗڈ = روٹھنا میں حروف بڑھائے گئے۔

کشمیری میں ے اور ی کی مختلف صورتیں بھی آواز سے پیدا ہوتی ہیں۔ جن کو ہم نے مندرجۂ ذیل شکل میں دکھایا ہے۔
ۓ جیسے مۓ = مجھے۔ کۓ = کھاد۔ شۓ = چھ۔ ترۓ = تین میں اور ۍ جیسے دۍل = ماں، دبل = چھلکا۔ سیکھ = ریت میں۔

ۍ انگریزی Red کا تلفظ دیتا ہے۔
ی کی ایک اور صورت ہے مثلاً کھاسۍ = پیالیاں یعنی آدمی شکل ی ہٕسۍ = تھے۔

حروف تہجی میں بھی دو حروف کا اضافہ کرنا پڑا۔ وہ یہ کہ ژ اور ٹ کا۔ جیسے ژوٗر = چور ژٕم = کھال۔ ژاٹن = ریزہ اور کاٹ = پتھر۔ کاٹن = اندھی۔ ٹھاٹ = ڈھکن۔

ہم نے پورے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ خطِ نسخ کا ہی مروج ہو۔ کیونکہ اس میں نئی صورتیں اعراب اور حروف واضح طور پر دکھائے جا سکتے ہیں۔

سنسکرت عربی فارسی وغیرہ کے وہ الفاظ جو مذہب کے ساتھ کسی بھی طرح سے تعلق رکھتے ہوں، اپنی اصلی شکل میں لکھے جائیں۔ مثلاً بھگوان۔ بھجن، رحمٰن، رحیم، رزّاق، اگرچہ ھ، ح اور ق کشمیری زبان میں اپنا اصلی تلفظ نہیں رکھتے ہیں۔

ان کے علاوہ فارسی، عربی کے وہ الفاظ جو سالم بغیر کسی خاص تبدیلی کے کشمیری نے اپنائے ہیں، اپنی اصلی صورت میں ہی لکھے جائیں گے۔ مثلاً صاف۔ داغ، باغ، خان۔ غلط، خبر وغیرہ وغیرہ۔

انگریزی نے بھی کشمیری زبان کو کئی بہت دلپذیر اور مفید الفاظ عطا کئے ہیں۔ مثلاً گرین، ٹائم پیس، فیس، اپریشن۔

کشمیری قوم کی وسعتِ قلب کی طرح کشمیری زبان میں بھی وسعت ہے۔ جہاں اس نے سنسکرت، فارسی اور عربی کے الفاظ فراخ دلی سے اپنائے ہیں، وہاں انگریزی زبان کے الفاظ بھی بغیر جھجک کے قبول کئے ہیں۔ نہ اس زبان نے یہ پرواہ کی کہ فلاں لفظ ہندو دھرم کا ہے اور فلاں اسلام کا نمائندہ۔ اور نہ اس پر کان دھرے کہ فلاں لفظ سامراجیوں کی زبان کا ایلچی ہے۔ ایک زندہ زبان کی طرح کشمیری زبان نے ہر ایسے لفظ کو اپنے معنی دئے ہیں، یا اصل معنی کو اپنے اندر اس طرح سمویا ہے کہ غیر لفظ بالکل کشمیری معلوم ہوتا ہے۔

وہ دن قریب ہے جب اس حسین وادی کی حسین و شیریں زبان آبشاروں، لالہ زاروں کی ترجمان زبان نافۂ غزال کی طرح مہک اُٹھے گی۔

خوراک کا مسئلہ

دُنیا میں خوراک کی حالت

بین الاقوامی ادارۂ خوراک و زراعت کی کانفرنس کا اجلاس واشنگٹن میں ہو رہا ہے۔ اس اجلاس میں جو سالانہ رپورٹ پیش کی گئی ہے اس میں بتلایا گیا ہے کہ اگرچہ بعض ممالک میں خوراک کی پیداوار میں قدرے اضافہ ہوا ہے۔ لیکن دنیا کے قلت خوراک والے علاقوں میں ابھی تک خوراک کا توڑا ہے۔ جن ملکوں کے لوگوں کو بہت کافی خوراک میسر آئی تھی وہ آج اور بھی اچھی حالت میں ہیں۔ لیکن قلتِ خوراک والے علاقوں کے لوگ بد سے بدتر حالت میں ہیں۔ منطقہ معتدل اور خطوط سرطان اور جدی کے مابین واقعہ ممالک میں کھانڈ۔ روغنیات مچھلی۔ گوشت، پھلوں اور سبزیوں کی پیداوار بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لیکن دنیا کی آبادی کے تین چوتھائی حصہ کو اس اضافہ سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔ قلت خوراک والے علاقوں کے لوگ آج بھی اپنے باپ دادا کی طرح نیم فاقہ کش ہیں۔ خوراک کی بہم رسانی کی حالت قدرے بہتر ہو گئی ہے۔ کھانڈ کی کھپت میں بہت اضافہ ہوا۔ لیکن اس امر کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی کہ قلت اور بہتات والے ممالک کے مابین جو تفاوت پایا جاتا تھا وہ کم ہو رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اگر کوئی ملک ایک خاص حد تک دولت حاصل کر لیتا ہے تو پھر بغیر کسی خاص کوشش کے مزید دولت جمع کرتا جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی خوشحالی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

غربت کے خلاف جد و جہد میں دو بنیادی مسائل دنیا کی حکومتوں کو درپیش ہیں۔ اوّل ہنرمندانہ امداد کی ضرورت۔ اور دوم زرعی اشیا کی تجارت کو توسیع دینے کے لئے موجودہ پابندیوں کو دُور کرنا۔

اس اجلاس میں ہندوستانی وفد کے رہنما شری بی۔ آر سین ہیں جو واشنگٹن کے ہندوستانی وزارت خانہ میں وزیر مختار ہیں۔ وفد کے باقی ممبر مندرجہ ذیل اصحاب ہیں۔

شری آر۔ آر سکسینہ قونصل جنرل ہند مقیم نیویارک۔ شری۔ بی۔ کے نہرو۔ جو ہندوستان کی طرف سے بین الاقوامی بنک میں تعمیرات و ترقی کے لئے ہندوستان کے انتظامیہ ڈائرکٹر ہیں۔ شری۔ این۔ جی ابھینکر۔ خوراک اتاشی، اور شری ددیا ناتھن ہندوستانی سفارت خانہ واشنگٹن۔

صدر ٹرومین کی تقریر

کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے صدر ٹرومین نے پھر اس عہد کو دہرایا کہ دنیا کے سب ممالک میں خوراک کی بہتات پیدا کرنے کے لئے امریکہ امداد و تعاون کرے گا اور نظام عالم کو طاقتور اور مستحکم بنانے کے متعلق ہمارے مشترکہ مقصد کے لئے یہ تعاون سب سے بڑی امداد باہمی کی کوشش ہوگی۔ ادارہ خوراک و زراعت کا کام دو بڑے مسائل پر مرکوز ہے۔ اول یہ کہ زرعی اور خوراکی اشیا کی پیداوار کو بڑھایا جائے۔ دوم یہ کہ ایسا انتظام کیا جائے جس سے یہ اشیا ان لوگوں اور ملکوں تک پہنچ جائیں جنھیں ان کی ضرورت ہے۔

وزیراعظم ہند اور خوراک کا مسئلہ

دہلی میں ایک عام جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے وزیراعظم نے حکومت ہند کے اس فیصلہ کا اعادہ کیا کہ دو سال کے بعد خوراک کی درآمد ہرگز نہیں کی جائے گی۔ کیونکہ جو روپیہ خوراک کی درامد پر خرچ ہوتا ہے وہ قومی دولت کی تضییع ہے۔ آپ نے لوگوں سے اپیل کی کہ خوراک ضائع نہ کریں۔ کم اناج استعمال کریں۔ اور اس کے بدلے میں دیگر قسم کی خوراک کھائیں۔

بعد ازیں رڑکی میں ایک عام جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے کہا۔ ہندوستان کی خوراک کی قلت اس کی سب سے بڑی

کمزوری ہے۔ اگر لوگ اسے محسوس کرتے ہیں۔ تو انھیں بے حسی۔ کاہلی اور بے پروائی کو چھوڑ کر متحدہ سرگرمی سے کام کرنا چاہیئے۔ آپ نے لوگوں کو امریکہ کی مثال دی۔ جہاں لوگ پیداوار کو بڑھا کر اپنے ملک کو مالامال کر رہے ہیں۔

یو۔پی کسان مظاہرہ کے متعلق وزیراعظم کا ارشاد پنڈت نہرو نے یو۔پی قانون تنسیخ زمینداری کے خلاف کسانوں کے مظاہرہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوشلسٹ صرف مخالفت کرنے کی خاطر ہی اس کی مخالفت کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن سوشلزم ہو یا کوئی اور ازم لوگوں کو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے کام کرنا ہی پڑے گا زیادہ نعرے لگانے سے ان کا کوئی بھلا نہ ہوگا۔ مجھے توقع ہے کہ سوشلسٹ عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے جلد از جلد زمینداری منسوخ کرنے میں حکومت کی امداد کریں گے۔

خوراک کی پیداوار بڑھانے کے متعلق کانفرنس خوراک کی پیداوار بڑھانے کے منصوبوں پر غور کرنے کے لئے آج سے نئی دہلی میں ایک کانفرنس ہو رہی ہے۔ آنریبل وزیراعظم اس کا افتتاح کریں گے۔ اس کانفرنس میں صوبوں اور ریاستوں کے زرعی افسران شامل ہوں گے۔ اس کانفرنس میں سنہ ۱۹۴۹-۵۰ء کے دو برسوں میں خوراک کی پیداوار بڑھانے کے لئے صوبوں اور ریاستوں کے کوٹے مقرر کئے جائیں گے۔ علاوہ دیگر امور کے اس تجویز پر بھی غور کیا جائے گا کہ زرعی پیداوار بڑھانے کی راہ میں جو سب سے بڑی رکاوٹ یعنی زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی نجی ملکیت ہے۔ اسے کس طرح دور کیا جائے۔ کیونکہ نجی ملکیت کی چھوٹی چھوٹی اراضیات جدید طرز کے کاشتکاری طریقے اختیار کرنے میں مانع ہیں۔ اس لئے ان کی بجائے اقتصادی اغراض کے لئے بڑے بڑے قطعات اراضی کی بنانے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

کانفرنس اس بات پر غور کرے گی کہ کاشتکاروں کو کس طرح ترغیب دی جائے کہ وہ اس طریق کار پر کاربند ہونا منظور کریں۔ سی۔ پی اور برار۔ یو۔ پی۔ بھوپال اور مدھیہ بھارت میں حکومت ہند بھاری ٹریکٹروں کے ذریعہ غیر آباد زمینوں کو پھر سے آباد کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ بعض صوبائی حکومتوں نے بھی غیر آباد زمینوں میں پھر سے کھیتی باڑی کرنے کے پروگرام شروع کر رکھے ہیں۔ ان کی تفاصیل اس کانفرنس میں پیش کی جائیں گی اور صوبوں کو مطلوبہ مشینیں وغیرہ حاصل کرنے کے لئے جس امداد کی ضرورت ہوگی اس کی تفصیل بھی معلوم ہو جائے گی۔ کانفرنس اس موضوع پر بھی غور کرے گی کہ غیر آباد زمینوں کی آباد کاری اور مشینوں کے ذریعہ کھیتی باڑی کرنے کے لئے نجی افراد اور امداد باہمی کی انجمنیں جو ٹریکٹر حاصل کرنا چاہتی ہیں ان کی حوصلہ افزائی کس طرح کی جائے۔

ارجن ٹائن سے معاہدۂ گندم معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان اور ارجن ٹائن کے مابین ایک معاہدہ طے پایا ہے۔ جس کی رو سے پٹ سن کی اشیا کے بدلے میں ارجن ٹائن تین لاکھ نوّے ہزار ٹن گندم ہندوستان کو مہیا کرے گا۔ گندم اگلے برس کے ماہ اگست تک ہندوستان پہنچ جائے گی۔

صوبائی افسران محکمہ زراعت کی کانفرنس گذشتہ ہفتہ نئی دہلی میں صوبائی افسران محکمہ زراعت کی کانفرنس میں وزیراعظم نے اعلان کیا۔ "میں یہ امر بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ چاہے کچھ ہو۔ خواہ طوفان آئے یا بھونچال۔ ہم سنہ ۱۹۵۱ء کے بعد اناج کا ایک دانہ بھی غیر ممالک سے نہیں منگائیں گے۔" پنڈت نہرو نے کہا کہ "واقعات اور حالات نے ہمیں ایسا تہیہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کوئی ملک اپنے ذرائع یعنی کھیتوں اور کارخانوں کی پیداوار سے زیادہ خرچ کر کے زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستان کی حالت ایسی ہی رہی ہے۔ اور بہت زیادہ عرصہ سے اس قسم کی پالیسی کے شدید نتائج کی طرف سے غفلت کی جاتی رہی ہے۔ مگر ہمارا ملک دسمبر سنہ ۱۹۵۱ء تک خوراک کے بارے میں خود مکتفی بن جانے میں ناکام رہا تو بلاشبہ ہمیں اناج کی قلت تو ہوگی۔ لیکن ہم باہر کے ملکوں سے اناج کی درآمد ہرگز نہیں کریں گے۔" آخر میں پنڈت نہرو نے ایک بار پھر اس بات پر زور دیا کہ اگر خوراک کے بارے میں خود مکتفی

بنینے کے لئے ضروری نفسیاتی ماحول نہ صرف کسانوں میں ہی بلکہ ملک کے تمام لوگوں کے درمیان قائم کر دیا جائے تو ہم اپنا مقصد ۱۹۵۱ء ہی میں حاصل کر لیں گے۔ اس کے لئے ہمیں ضروری جوش اور اتحاد عمل پیدا کرنا پڑے گا۔

وزیر خوراک کا حوصلہ افزا بیان

اس کانفرنس میں ہندوستان کے وزیر خوراک وزراعت نے بتایا کہ اندھرا میں طوفان نے جو تباہی مچائی ہے۔ اس سے ۳۰ لاکھ ٹن چاول برباد ہو گیا ہے۔ اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس نقصان کو پورا کرنے کے لئے اگلے سال چاول کی درآمد میں کوئی اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ اس کے برعکس درآمد میں ٹھوس کمی کی جائے گی اندرونی قلت کو اندرونی ذرائع سے پورا کیا جائے گا۔ خوش قسمتی سے آسام میں چاول کی فصل سے بہت بڑی وافر پیداوار حاصل ہوتی ہے جس سے اندھرا کے نقصان کو پورا کیا جائے گا۔

ہند پارلیمنٹ میں خوراک کے مسئلہ پر وزیر اعظم کا تبصرہ

وزیر اعظم نے قومی معاملات کا جائزہ لیتے ہوئے پارلیمنٹ میں خوراک کے مسئلہ کا ذکر کیا۔ آپ نے کہا "ملک نے مجموعی طور پر تسلی بخش ترقی کی ہے۔ حکومت ہندوستان خوراک کے مسئلہ کو سب سے زیادہ اہم اور مقدم سمجھتی ہے۔ اگرچہ خوراک کے محاذ پر حالات کی رفتار اطمینان بخش طور پر ترقی کناں ہے۔ تو بھی حالات قابل اطمینان نہیں ہیں۔ کئی مقامات پر حادثے ہوئے ہیں۔ اندھرا میں طوفان نے نہ صرف انسانوں کو تباہ کیا ہے بلکہ اس علاقہ سے جو خوراک کی پیداوار ہونے کی توقع تھی اسے بھی بہت نقصان پہنچایا ہے۔ بایں ہمہ میں خوراک کمشنر کی رپورٹ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مجھے رتی بھر شبہ نہیں ہے کہ ۱۹۵۱ء کے بعد خوراک کی کوئی درآمد نہیں ہوگی۔

کھانڈ کی قلت کے متعلق وزیر اعظم کا ارشاد

ملک میں کچھ لوگوں کے پاس کھانڈ ہے۔ اور باقی لوگوں کو کھانڈ میسر نہیں ہے۔ یہ امر اس قدر باعث اضطراب نہیں ہے جس قدر یہ حقیقت کہ کھانڈ کی پوزیشن اتنی تیزی سے بگڑ گئی۔ اور اس خرابی کو روکا ہی نہ جا سکا۔ یہ واقعہ بہت اہم ہے اور ہم معلوم کر رہے ہیں کہ خاص طور پر اس کا ذمہ دار یا مجرم کون ہے۔

پارلیمنٹ میں کھانڈ کے نرخوں کے بارے میں جو سوال دریافت کئے گئے ان کا وزیر خوراک نے جو جواب دیا وہ مختصراً حسب ذیل ہے۔

کھانڈ کے نرخ اس افواہ کی وجہ سے بڑھتے چلے گئے کہ پاکستان اور دیگر مقامات کو بہت بڑی مقدار برآمد کرنے کی اجازت دی جائے گی بیوپاریوں نے نفع کمانے کی امید پر کھانڈ خریدنا شروع کر دیا تھا۔ نیز سنڈیکیٹ نے اس خبر کو اشاعت دی۔ کہ اس سال کی پیداوار کا بہت بڑا حصہ کارخانوں نے پیشتر ازیں فروخت کر دیا ہے۔ اس کے نتیجہ کے طور پر محسوس کیا گیا کہ سال کے باقی مہینوں میں کھانڈ کی قلت ہو جانے کا احتمال ہو گا۔ کیونکہ مانگ بہت بڑھ گئی ہے۔

لوگوں کو کم نرخوں پر کھانڈ مہیا کرنے کے لئے حکومت نے مندرجہ ذیل اقدامات کئے۔

(۱) کارخانوں کے سٹاک ضبط کر لئے گئے۔ اور صوبوں اور ریاستوں کو تقسیم کرنے کے لئے الاٹ کر دیئے گئے۔

(۲) صوبائی حکومتوں کو اختیار دیا گیا کہ اس جنس کی تجارت پر لائسنس نافذ کیا جائے۔ اور تمام سٹاک کو اپنے قبضہ میں لے کر اپنے زیر انتظام ذرائع کی معرفت تقسیم کیا جائے۔

(۳) کھانڈ کا سٹہ ممنوع قرار دیا جائے۔

(۴) صوبوں اور ریاستوں کی حکومتوں سے کہا گیا۔ کہ وہ آئندہ موسم میں پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے لئے تمام ممکن اقدامات کریں

اس وقت جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کے مطابق غیر ممالک میں کھانڈ کے نرخ مندرجہ ذیل ہیں۔ برازیل۔ اکتوبر سوا اکتیس روپے فی من۔ کیوبا۔ اکتوبر سولہ روپے پندرہ آنہ پانچ پائی فی من۔ جاوا اگست اکتوبر اکیس روپے آٹھ آنہ ۲ پائی۔ اگست میں ہندوستان میں کھانڈ کے نرخ چھتیس روپے دو آنہ فی من سے ساڑھے بیالیس روپے تک تھے۔ ستمبر۔ اکتوبر میں کئی جگہ بلا کنٹرول کھانڈ کے نرخ ۶۰ روپے فی من تک چڑھ گئے تھے

غیر ممالک سے کھانڈ درآمد کر کے ہندوستان میں کھانڈ کی قلت کو دور کرنے کی راہ میں سب سے بڑی مشکل غیر ملکی سکہ تبادلہ کی دستیابی ہے۔

خوراک کی پیداوار بڑھانے کی تجاویز حکومت ہند نے خوراک کی پیداوار بڑھانے کی جو تجاویز مرتب کر رکھی ہیں۔ اور جنھیں مرکز کی مالی امداد سے صوبے اور ریاستیں چلا رہی ہیں اُن میں مندرجہ ذیل تجاویز شامل ہیں۔ بنجر زمینوں کی آبادکاری۔ کنوئیں تالاب۔ نہریں۔ چھوٹے بند اور جھلاروں کے ذریعہ آبپاشی کرنے کی چھوٹی چھوٹی سکیمیں۔ بہتر بیجوں کی تقسیم۔ کیمیائی کھاد کی تقسیم۔ دیگر مرکب اور نباتاتی کھاد کی تقسیم۔ پودوں کا تحفظ اور دیگر متفرق تجاویز۔ زراعتی اغراض کے لئے لوہے اور فولاد کے خاص کوٹے تقسیم کرنا۔ کلدار کنوؤں کے ذریعہ آبپاشی کی جو تجاویز مرتب کی گئی ہیں اُن میں پٹیالہ اور پوربی پنجاب کی ریاستوں کی یونین کے علاقوں میں دو لاکھ روپیہ سرکار کی طرف سے قرضہ دینے کی سکیم بھی شامل ہے۔ اجمیر میرواڑے کے علاقے میں دو لاکھ تین ہزار روپیہ کسانوں کو بطور تقاوی قرضہ تقسیم کرنے کے لئے منظور کیا گیا ہے۔

ٹڈی دل کا انسداد ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں ہندوستان ٹڈی دل کی وبا سے محفوظ رہا۔ سنہ ۴۹-۱۹۴۸ء کے موسم سرما اور موسم بہار میں جیسلمیر کے علاقوں میں صحرائی ٹڈی دل کی گنتی بہت تھوڑی تھی۔ لیکن مئی کے دوسرے پندرھواڑے میں مغرب سے ٹڈی دل کی آمد سے ان کی گنتی میں اضافہ ہوا۔ اور ان کی آبادی ۲۰ ٹڈیاں فی مربع میل سے بڑھ کر ۸۰۰ ٹڈی فی مربع میل ہو گئی۔ جولائی اور اگست میں باہر سے ٹڈی دل کی آمد میں متواتر اضافہ ہوتا رہا۔ اور ۱۴ اگست کو بیکانیر میں لگو کے مقام پر ان کی گنتی ۱۹۲۰۰ فی مربع میل ہو چکی تھی۔ ان کو جمع کرنے سے پتہ چلا کہ یہ سب غیر ملکی نسل کی ہیں۔ راجپوتانہ میں موافقانہ بارش نے انھیں بڑھنے میں مدد دی۔ اور بیکانیر میں ۱۵۰ مربع میل کا علاقہ ٹڈی دل سے بھر گیا۔ ہندو پاکستان کی سرحد پر ٹڈی دل کی بہتات پائی گئی۔ یہ ٹڈی پاکستان کی سرحدی ریاست بہاولپور اور خیرپور میرس کے علاقوں سے آئی تھی۔ صورت حالات نازک ہو گئی۔ اس لئے وزارت خوراک نے پودوں کے تحفظ کے محکمے کا تمام عملہ اس کے انسداد پر لگا دیا۔ ان کو مزدوری سامان اور مشینیں مہیا کی گئیں۔ فوجی امداد بھی لی گئی۔ اور ٹڈیوں کو تباہ کرنے کا کام زور شور سے شروع کر دیا گیا۔ اس طرح ٹڈی دل کے حملہ کا خطرہ دور کیا گیا اس وقت حالت تسلی بخش طور پر بہتر ہے۔

ہندوستان میں درآمد ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو ختم ہونے والے ہفتے میں غیر ممالک سے بائیس ہزار چار سو ٹن گندم۔ آٹھ ہزار تین سو ٹن آٹا۔ اور پانچ ہزار نو سو ٹن چاول ہندوستان میں درآمد کیا گیا۔

یکم دسمبر ۱۹۴۹ء کو ختم ہونے والے ہفتے کے دوران میں غیر ممالک سے اُنیس ہزار ٹن گندم اور تیرہ سو ٹن سیمولینا ہندوستان میں درآمد کیا گیا۔

صوبے اور ریاستیں بہار۔ شری انوگرہ نارائن سنہا وزیر مالیات نے بہار اسمبلی میں ایک قلیل المہلت سوال کے جواب میں بتایا کہ حکومت بہار شروع سے ہی کھانڈ پر کنٹرول نافذ کرنے کے خلاف رہی ہے۔ لیکن جب حکومت ہند نے کنٹرول نافذ کر دیا تو ہمیں اسے تسلیم کرنا پڑا۔

پچھلے دنوں بہار میں خوراک کی پیداوار اور ترقی کے کمشنر نے خوراک کی صوبائی پیداوار بڑھانے کی مہم کی تفاصیل بیان کیں۔ صوبہ کی حکومت نے ایک سال کے دوران میں ساڑھے چھ ہزار بند وغیرہ باندھ کر آبپاشی کی چھوٹی چھوٹی سکیمیں جاری کرنے کا ارادہ کیا تھا ان میں سے اب تک چار ہزار چار سو چھیاسٹھ چھوٹے بند تیار ہو چکے ہیں۔ چار ہزار سطحی (جھلار) کنوئیں تعمیر کرنے کی تجویز میں سے تین ہزار چھ سو چھپن تیار ہو چکے ہیں۔ دو سو کنوئیں کھودنے کا پروگرام تھا ان میں سے ۱۱۴ کنوئیں کھودے جا چکے ہیں۔ سال بھر میں بند باندھ کر آبپاشی کرنے کی سکیموں سے کل ننانوے ہزار ایکڑ زمینوں کو سیراب کرنے کا تہیہ کیا گیا تھا۔ اس میں سے ۷۰ ہزار ایکڑ زمین میں آبپاشی کا انتظام کیا گیا ہے۔ سنہ ۱۹۵۰ء تک کل تیس ہزار ایکڑ غیر آباد زمینوں میں پھر سے کھیتی باڑی کرنے کا پروگرام تھا۔ جس میں سے اکیس ہزار ایکڑ زمین پھر سے کاشتکاری ہو چکی ہے۔

خوراک کے بارے میں لوگوں کو اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس کرانے کی غرض سے حکومت بمبئی نے دو حلف نامے مرتب کئے ہیں۔ کاشتکاروں اور غیر کاشتکاروں سے عام جلسوں اور

انعامات تقسیم کرنے کے جلسوں میں یہ حلف باقاعدہ طور پر اٹھوائے جائیں گے کاشتکار لوگ یہ حلف اٹھائیں گے۔ "کہ میں اس زمین میں جو میرے قبضہ میں ہے زیادہ سے زیادہ اناج پیدا کرنے کی انتہائی کوشش کرونگا میں عہد کرتا ہوں کہ میں اپنی اور اپنے کنبے کی ضروریات پیٹ اور دیگر نجی ضرورتوں کے لئے رکھ کر باقی تمام کا تمام فالتو اناج حکومت کے ہاتھ بیچ دوں گا۔"

غیر کاشتکار لوگوں سے یہ حلف اٹھوایا جائے گا۔ "کہ میں پوری کوشش کروں گا کہ اناج کے علاوہ دیگر قسم کی خوراک کا استعمال بڑھا کر اناج کی کھپت کو کم کروں گا۔ باورچیخانہ اور دسترخوان پر خوراک ضائع نہ ہونے دوں گا۔ میں عہد کرتا ہوں کہ میں اپنی بساط کے مطابق ہر قربانی دے کر خوراک کی پیداوار بڑھاؤں گا۔ میں اپنے صحن اور گملوں میں سبزیاں اور دیگر اناج وغیرہ کاشت کرکے خوراک کی پیداوار بڑھاؤنگا کاشتکاروں کو کھاد وغیرہ کی بہم رسانی میں امداد دے کر ملک میں خوراک کی پیداوار بڑھاؤں گا۔"

مدراس۔ چاول کاشت کرنے کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے جس سے بیج کا خرچ ۲۵ پونڈ فی ایکڑ کے حساب سے گھٹ جائے گا یعنی سارے صوبے کے ایک کروڑ ایکڑ دھان کے کھیتوں میں یہ طریقہ اختیار کرنے سے ایک لاکھ ٹن دھان کے بیج بچ جائیں گے۔

اڑیسہ۔ بجٹ ۴۷-۱۹۴۶ء سے ۴۹-۱۹۴۸ء تک کے تین برسوں میں اس صوبے میں خوراک کی پیداوار بڑھانے کی مہم کے نتیجے کے طور پر ہر برس بتدریج تیس ہزار دو سو ٹن۔ بارہ ہزار دو سو ٹن۔ اور سولہ ہزار دو سو ٹن زائد خوراک حاصل ہوتی رہی ہے۔

میسور۔ ریاست میں غلّہ کی فراہمی کے لئے حکومت نے مندرجہ ذیل نرخ مقرر کر دیئے ہیں۔ دھان درجہ اوّل دس روپے فی من پختہ۔ دھان میڈیم نو روپے فی من پختہ۔ جوار سات روپے دو آنہ فی من پختہ۔

پچھمی بنگال۔ ایک سرکاری اعلان میں بتایا گیا ہے کہ بیشتر اضلاع میں بارش فصلوں کے لئے موافق ہوئی۔ جس سے فی ایکڑ پیداوار پچھلے برس سے زیادہ ہوگی۔ پچھلے برس صاف کئے ہوئے چاول کی اوسط پیداوار فی ایکڑ آٹھ اعشاریہ ستر من تھی۔ اس برس بھی اوسط اندازہ نو اعشاریہ نناوے من فی ایکڑ ہونے کی توقع ہے۔

عورتوں کے لئے دستکاریوں کی تربیت

وزارت صنعت و رسد نے آل انڈیا انڈسٹریز بورڈ کی سفارشات کو قبول کرتے ہوئے جنوری ۱۹۵۰ء سے سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف کاٹیج انڈسٹریز میں عورت اساتذہ اور گھریلو دستکاریوں میں اعلیٰ ماہرین کی تربیت کی خاطر ایک شعبہ خواتین کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔

پہلے سال ادارہ میں دو سو امیدواروں کا داخلہ ہوگا۔ مرکزی۔ صوبائی اور ریاستی حکومتوں کی نامزد کی ہوئی عورتوں کے علاوہ تقریباً پچاس خواتین کو براہ راست داخل کیا جائے گا۔ اس کی کوئی فیس نہیں ہوگی۔

پچاس روپے ماہانہ کے کچھ وظائف براہ راست داخل ہونے والی مستحق طالبات کو دیئے جائیں گے۔ طالبات کو ہوسٹل میں سکونت بھی مہیا کی جائے گی۔ فی الحال آٹھ دستکاریوں میں تربیت دی جائے گی۔ اساتذہ کا کورس سال بھر پر مشتمل ہوگا۔ اور صرف ان امیدواروں کو داخل کیا جائے گا جنہوں نے کسی منظور شدہ ادارہ میں ان آٹھ دستکاریوں میں سے کسی دستکاری میں بنیادی تعلیم حاصل کر لی ہو۔ بہرحال اس چیز کا انتظام کیا گیا ہے کہ جن طالبات نے کسی دستکاری میں بنیادی تربیت حاصل نہ کی ہو انھیں سال بھر تک بنیادی تربیت دی جائے۔

تعلیم کے متعلق مزید تفصیلات آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی کاٹیج انڈسٹریز ڈائرکٹریٹ رام نگر ہاؤس۔ شاہ جہان روڈ نئی دہلی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

رفتارِ زمانہ

نیویارک میں نمائندہ پریس کے ساتھ ایک انٹرویو کے دوران میں ریاست جموں و کشمیر کے پردھان منتری شیخ محمد عبداللہ نے نہایت صاف الفاظ میں اعلان کیا کہ ریاست قانونی طور پر ہندیونین میں شامل ہو چکی ہے ریاست میں لوک مت لئے جانے کے سوال کا ذکر کرتے ہوئے شیخ صاحب نے کہا کہ ریاستی عوام کو اس بات کا موقع دیا جائے گا کہ وہ اس الحاق کی تصدیق کریں۔ لیکن استصواب رائے سے پیشتر یہ بات نہایت ضروری ہے کہ ریاست میں پُرامن حالات پیدا کئے جائیں۔ پاکستان پہلے تو یہی کہتا رہا کہ کشمیر میں اس کی فوجیں جنگ میں حصہ نہیں لے رہیں۔ لیکن جب کشمیر کمیشن کے ممبروں نے بچشم خود موقع پر آکر تمام حالات دیکھے تو حقیقت ظاہر ہو گئی۔ اور پاکستان کو کشمیر میں اپنی فوجوں کی موجودگی تسلیم کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اب سوال یہ ہے کہ پاکستان نے جارحانہ حملہ کیا یا نہیں۔ اگر کیا ہے تو اسے اپنی فوجیں وہاں سے ہٹا لینی چاہییں۔ جوں ہی ریاست میں جارحانہ حملے کا ڈر نہیں رہے گا۔ وہاں فوراً لوک مت کرایا جائے گا۔ ریاست میں ہند کی افواج کا ذکر کرتے ہوئے شیخ صاحب نے فرمایا کہ ہند کو قانونی حق حاصل ہے کہ وہ کشمیر میں اپنی فوجیں رکھے۔ اگر ریاست سے ہندوستانی فوجیں ہٹا لی گئیں تو پاکستان کی طرف سے حملے کا زبردست خطرہ ہے۔ اس لئے ریاست سے ہند کی فوجوں کو ہٹانے کا مطلب ریاست کی حفاظت کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہو گا۔

فرخ آباد میں یو۔ پی پولیٹکل کانفرنس کے چھتیسویں سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے ہندوستان کے نئے آئین کو ایک ایسی کامیابی قرار دیا جس پر سارا ہندوستان فخر کر سکتا ہے۔ آپ نے اس بات پر زور دیا کہ لوگوں کو زیادہ کام کر کے زیادہ دولت پیدا کرنی چاہیئے۔ اگر ٹھیک ڈھنگ کے ساتھ کام نہ کیا گیا تو یہ آئین محض ایک کاغذی آئین بن کر رہ جائے گا۔ آپ نے مزید فرمایا کہ چور بازاری اور رشوت ستانی کو ختم کرنے کے لئے گورنمنٹ کو عوام کے تعاون کی ضرورت ہے۔ بھارت کی ترقی و خوش حالی کے لئے ایمانداری اور سخت محنت کرنا لازمی ہے غیر ممالک کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے پنڈت جی نے کہا کہ غیر ملکوں میں آزاد ہندوستان کی کافی عزت ہے۔ اور کئی ممالک ہندوستان کے ساتھ سیاسی تعلقات قائم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ دراصل ہندوستان کی غیر ممالک میں یہ عزت افزائی مہاتما گاندھی کی رہنمائی کی بدولت ہے۔

متحدہ اقوام کی اسمبلی میں ہندوستانی پرتی ندھی منڈل کے لیڈر سر بی۔ این راؤ نے ایک بیان میں کہا ہے کہ ہندوستان کو اپنے اُن کارہائے نمایاں پر فخر ہے جو اس نے جنرل اسمبلی کے چوتھے اجلاس میں انجام دیے ہیں۔ آپ نے کہا کہ حفاظتی کونسل میں ۵۸ میں سے ۵۶ ووٹ لے کر چنے جانے کے علاوہ ہندوستان نے اسمبلی میں کئی قابل تعریف کام کئے ہیں۔ مثال کے طور پر اٹلی کی نوآبادیوں کے سوال پر اور جنوبی افریقہ کے نظام حکومت سے متعلقہ نکات کو بین الاقوامی کورٹ آف جسٹس کے سپرد کرنے کے معاملے کو سلجھانے میں ہندوستان کا بڑا ہاتھ تھا۔ شری راؤ نے مزید کہا کہ متحدہ اقوام کی اسمبلی میں بھارت کی پوزیشن مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس کی تجاویز کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ ہندوستان متحدہ اقوام کی اسمبلی سے ملحقہ کئی کمیٹیوں کا ممبر ہے۔ جن میں سے سب سے بڑی سکیورٹی کمیٹی کی رکنیت ہے۔ آخر میں ایٹمی کنٹرول کے سوال کا ذکر کرتے ہوئے سر بی۔ این راؤ نے کہا کہ اگرچہ بین الاقوامی لا کمیشن کی طرف سے ایٹمی ہتھیاروں کو غیر قانونی قرار دیے جانے کے متعلق بھارت کا پرستاو پاس نہیں ہو سکا۔ لیکن اس کے باوجود اس ریزولیشن کے پیش کئے جانے کے نتائج دوررس ہوں گے۔

ہند اور امریکہ کے باہمی دوستانہ تعلقات کو زیادہ وسیع کرنے کے لئے ۱۲ دسمبر کو دہلی کے یونیورسٹی ہال میں انڈین کونسل آف ورلڈ افیئرز اور امریکن کونسل آف دی انسٹی ٹیوٹ آف پیسفک ریلیشنز کے زیر اہتمام ایک انڈو امریکن کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔ امریکہ اور کینیڈا کے معزز و برگزیدہ اصحاب کی ایک بڑی تعداد واشنگٹن یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر اے۔ ایچ کامپٹن کے زیر قیادت اس کانفرنس میں موجود تھی۔ ہندوستان کے جو ڈیلی گیٹ اس کانفرنس میں شامل ہوئے ان میں پنڈت ہردے ناتھ کنزرو، مسٹر سی۔ پی۔ راما سوامی آئر اور شری سی۔ آر سری نواس بھی تھے۔ ڈاکٹر کامپٹن نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ دونوں ملکوں کو اپنے حفاظتی، اقتصادی، سیاسی اور سماجی مسائل اخلاقی نقطۂ نگاہ اور نہائت حوصلہ مندی سے انجام دینے چاہئیں۔ اور تمام حکومتوں کا منتہائے مقصود یہ ہونا چاہیئے کہ ضبط رکھنے والے اچھے مردوں اور عورتوں کے سماج کو قائم کریں۔ ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی نے کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اس کانفرنس کا مقصد ہندوستان اور امریکہ کے اقتصادی اور سیاسی تعلقات کو مضبوط کرنا ہے۔ ڈاکٹر کنزرو نے اس بات پر زور دیا کہ جہاں امریکہ یورپ کو کمیونزم سے بچانے کی کوشش کر رہا ہے وہاں اس کا یہ بھی فرض ہونا چاہیئے کہ وہ جنوب مشرقی ایشیا کے لوگوں کے معیار زندگی کو بلند کرنے میں امداد دے۔

ہندوستان میں ریلوے انجن تیار کرنے کے لئے ہند سرکار کی طرف سے لوکوموٹو مینوفیکچررز کمپنی لمیٹڈ انگلینڈ کے ساتھ ایک پانچ سالہ معاہدہ پر دستخط کئے گئے ہیں جس کے مطابق ۱۴ کروڑ روپے کی لاگت سے ہند سرکار نے ریلوے انجن بنانے کی جو سکیم تیار کی ہے اُسے یہ کمپنی ہر طرح کی ٹیکنیکل امداد دے گی۔ اندازہ ہے کہ انجن بنانے کی اس فیکٹری میں دس ہزار مزدور کام کریں گے۔

ایسوسی ایٹیڈ چیمبر آف کامرس کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے ہند سرکار کے وزیر خزانہ ڈاکٹر جان متھائی نے کہا کہ آنیوالے سال میں پچھلے سالوں کی نسبت تاجر طبقے میں بے چینی کم ہو جائے گی اور عنقریب ہی امید اور بھروسے کی سپرٹ مایوس کن ماحول کی جگہ لے لے گی۔ گورنمنٹ کے اخراجات میں اب کافی کمی واقع ہو چکی ہے۔ اس لئے اب لوگوں کو مستقبل کے متعلق زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہیئے

حضرت مجدد الف ثانی کا عرس سرہند شریف میں حسب سابق اس سال بھی منایا گیا۔ اس موقعے پر روضۂ شریف کی زیارت کے لئے ۶۵ پاکستانی مسلمانوں کی ایک جماعت بھی سرہند شریف پہنچی۔ اس قافلے میں افغانستان کے چار باشندے بھی شامل تھے۔ پٹیالہ اینڈ ایسٹ پنجاب سٹیٹس یونین کی حکومت نے اس موقعے پر نہائت اچھا انتظام کیا۔ ہندوستان کے مختلف حصوں آسام، کلکتہ، لکھنؤ دہلی، کشمیر وغیرہ سے بھی سینکڑوں مسلمان زیارت کے لئے آئے۔ کشمیر سے شیخ عبداللہ کی ساس اور ان کا لڑکا فاروق زائرین میں شامل تھے۔ مقامی لوگوں کی طرف سے زائرین کا شاندار استقبال کیا گیا۔ پاکستانی پارٹی کے لیڈر نے حکومت ہند کے انتظامات کی بہت تعریف کی۔ اور کہا کہ دوران سفر میں ان کے آرام کا ہر طرح خیال رکھا گیا۔ سب باتیں اس امر کا ثبوت ہیں کہ ہندوستان میں ہر فرقے کو پوری مذہبی آزادی ہے اور حکومت کو اس بات میں عوام کا پورا تعاون حاصل ہے۔

مدراس کے سابق ہوم منسٹر ڈاکٹر سبھرائن کو انڈونیشیا میں بھارت کا پہلا راج دوت مقرر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ان دنوں دہلی میں قیام پذیر ہیں۔ چند دنوں میں وہ مدراس سے ہوتے ہوئے ۲۷ دسمبر کو انڈونیشیا کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔

رنگون کی ایک اطلاع کے مطابق حکومت برما نے چین کی کمیونسٹ گورنمنٹ کو تسلیم کر لیا ہے۔ غیر کمیونسٹ ممالک میں سب سے پہلے برما نے ہی اس گورنمنٹ کو تسلیم کیا ہے۔

جوگجا کارٹا میں ڈاکٹر سکارنو کو انڈونیشیا کا سب سے پہلا پریذیڈنٹ منتخب کرنے کی رسم نہائت شان سے ادا کی گئی۔ حلف اٹھانے کی رسم سے قبل سب حاضرین انڈونیشیا کی جنگ آزادی کے شہیدوں کی یاد میں دو منٹ خاموش کھڑے رہے۔

شعرائے کرام سے! آج کل میں نظموں اور غزلوں کی اشاعت بہت حد تک کم کر دی گئی ہے۔ غیر طلبیدہ نظموں یا غزلوں کے سلسلے میں کوئی مراسلت نہیں کی جائے گی۔ ادارے کی درخواست پر ہی شعرائے کرام اپنا کلام ارسال فرمائیں۔ (ادارہ)
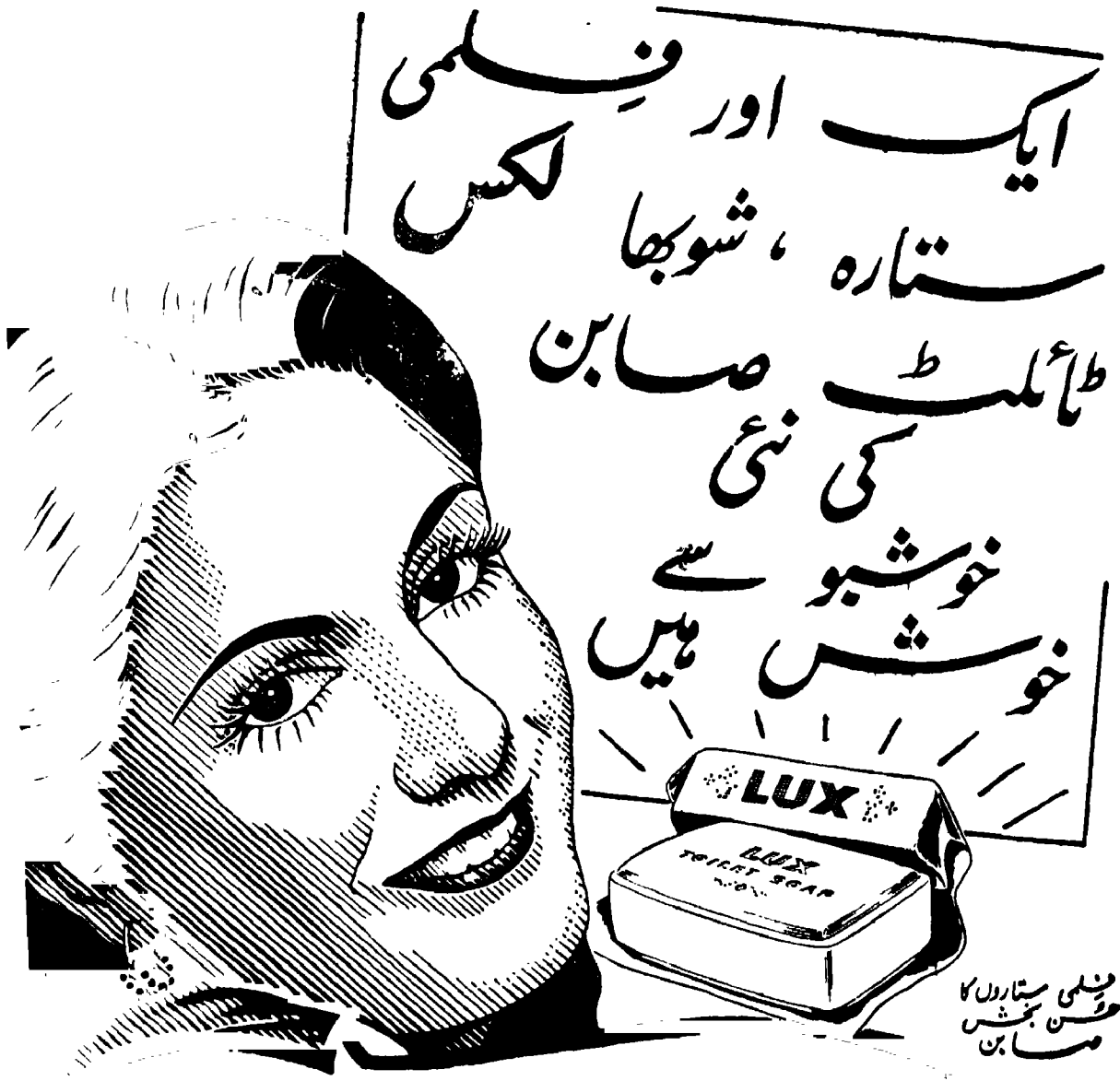
ایک اور فِلمی
لکس
ستارہ، شوبھا
ٹائلٹ صابن
کی نئی
خوشبو سے
خوش ہیں
LUX
LUX
TOILET SOAP
فلمی ستاروں کا
حسن بخش
صابن
"لکس ٹائلٹ صابن کی یہ
دلفریب نئی خوشبو
مجھے ازحد پسند ہے" آپ کہتی ہیں
LTS.

Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D.—21
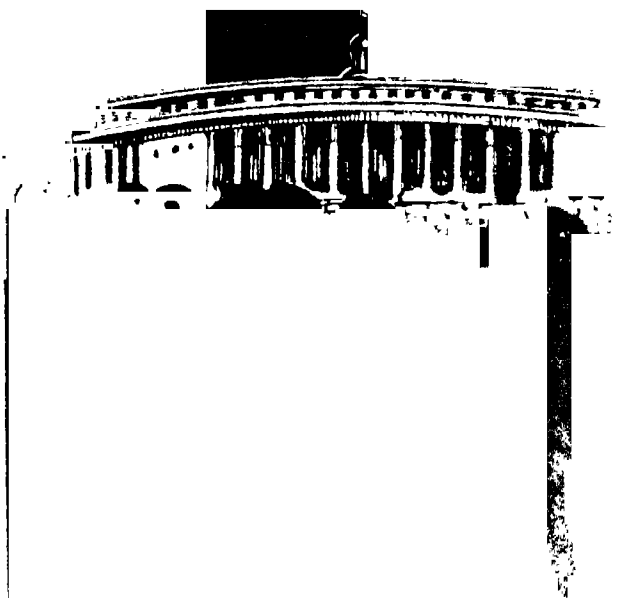
حسین نین تارا اپنی جِلد کو
دِلکش رکھنے کیلئے لکس ٹائلٹ صابن
کو ہی کیوں پسند کرتی ہے!
LUX
LUX TOILET SOAP
یہ حسین فلمی ستارہ کہتی ہے: "لکس ٹائلٹ صابن کے ذریعہ جِلد کی حفاظت کتنی آسان ہے۔ اسکی نرم بالائی دار جھاگ جِلد کو خوب صاف کر کے اسے نفیس و ملایم بنا دیتی ہے۔ اور پھر لکس ٹائلٹ صابن کی سحر آمیز خوشبو بھی مجھے بہت عزیز ہے۔ یہ کتنی فرحت بخش ہے!"
یہ سفید اور خالص صابن، جس کی خوشبو دِلکش ہے، آپ کی جِلد کو بھی دِلکش بنا رکھے گا
فِلمی ستاروں کا حُسن بخش صابن
LTS. 233-193 UD

اُردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر:- عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۸ —— نمبر ۱۰

سالانہ چندہ —— چھ روپے
فی پرچہ —— آٹھ آنے

فروری سنہ ۱۹۵۰ء

ترتیب

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

جوش ملیح آبادی

محرمِ بہار

ہزار شکر کہ ہوں محرمِ بہار ہنوز
چمن فروش و گہر ریز و نغمہ بار ہنوز

وفورِ عشق کی ہل چل کو مدتیں گزریں
ہجومِ عقل سے رہتا ہوں شرمسار ہنوز

وقارِ علم مسلط ہے اک زمانے سے
مگر جنوں کا مسلّم ہے اعتبار ہنوز

درِ دماغ پہ ہیں سجدہ ریزیاں، لیکن
صبا سے گونجنے لگتے ہیں دل کے تار ہنوز

صریرِ خامہ کی فرماں روائیاں ہیں، مگر
رباب و چنگ کا جاری ہے کاروبار ہنوز

خروشِ دیر ہے معنی بدوش و مالا مال
حدیثِ کعبہ نہیں حرفِ مایہ دار ہنوز

طرب کے قصر پہ غلطیدہ ہے تیغِ ایام
طلب کے خون میں رقصندہ ہیں شرار ہنوز

دیارِ عمر پہ چھائی ہوئی ہے خاموشی
دلِ وجود میں ہے شورِ آبشار ہنوز

رُخِ نشاط پہ چھایا ہوا ہے رنگِ جمود
رگِ حیات میں رقصاں ہے جوئبار ہنوز

ہزار شکر کہ مس ہو رہی ہے شہ رگ سے
کسی نظر کی کٹاری کی تیز دھار ہنوز

بہ جبرِ عقل کراہت کے ساتھ "دست بکار"
بہ جذبِ عشق خوشی سے ہوں "دل بیار" ہنوز

دل اب بھی زندہ ہے یہ پوچھ لو ستاروں سے
کہ دیکھتے ہیں مجھے اکثر اشک بار ہنوز

مری حیات، مرے وقت کے کلیجے میں
تپاں ہے وعدۂ فردا کا انتظار ہنوز

تلاشِ گل کا زمانہ گزر چکا، لیکن
گرہ کشا ہے تمنا کی نوکِ خار ہنوز

نفس کا دشنہ ہے بوئے گل و سمن اب تک
جگر کا تیر ہے صوتِ دف و ستار ہنوز

برس رہی ہے مرے خیمۂ تخیل پر
ترانہ سنجیٔ مرغانِ شاخسار ہنوز

کسی کے دستِ حنائی نے جن کو بخشا تھا
پڑے ہوئے ہیں گلے میں وہ تازہ ہار ہنوز

پکار دو یہ جوانانِ پیرِ فطرت میں
کہ ہوں دیارِ جوانی کا شہریار ہنوز

مری جناب میں ہیں سرنگوں نگار اب تک
مری جلو میں ہیں صف بستہ گل عذار ہنوز

مری حیات کے شانوں پر اس غبار میں بھی
مچل رہی ہے کوئی زلفِ مشک بار ہنوز

بہ زیرِ سایۂ موئے سفید و بختِ سیاہ
رواں ہے قافلۂ ابرِ سبزہ زار ہنوز

کبھی چمن، کبھی دریا، کبھی گہر، کبھی گل
مری نظر کو نہیں فرصتِ قرار ہنوز

خزاں کا دور ہے، پھر بھی مرے تعاقب میں
رواں ہیں جوشؔ رسولانِ صد بہار ہنوز

ہندوستان کا آئین

میری نظر میں

(۱)

ہز ایکسیلنسی سید آصف علی گورنر اڑیسہ

ہر آئین کا مقصد بہبود اور بہتری ہوتا ہے۔ ہر ایک قانون ناقص اور مضر طرز عمل کو روکنے اور صحیح طرز عمل کو ترویج دینے کے لئے بنایا جاتا ہے۔ یہ دوسرا امر ہے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ چونکہ اختلاف رائے کا امکان بدیہی ہے صدیوں کے تجربہ کا خلاصہ یہ قرار دیا گیا ہے کہ جمہور کی رائے فائق ہے۔ آزاد ہندوستان کے لئے جو جمہوری آئین تیار ہوا ہے اس کا بہترین پہلو یہ ہے کہ ہر بالغ کو رائے دہندگی کا حق حاصل ہے اور گاؤں کی پنچایت سے لے کر ہندوستان کی پارلیمنٹ یا راشٹریہ پنچایت تک انتخابات اسی جمہوری اصول کے مطابق ہونگے۔ یوں تو اس آئین کے اور بہت سے پہلو ہیں۔ مگر حقیقی معنوں میں بالغ رائے دہندگی اس کا سنگِ بنیاد ہے۔ جس نے واقعی طور پر راج کی باگ جمہور کے ہاتھ میں دے دی ہے۔

یہ امر جدا ہے کہ آیا آج بالغوں میں اس عظیم الشان قوت کے صحیح طریقہ پر استعمال کرنے کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں۔ یقیناً یہ کہنا دشوار ہے کہ اول مرحلہ پر اس قوت کا استعمال ہوگا مگر بظاہر اگر پہلی مرتبہ یہ تجربہ بہت کارگر نہ بھی ہو تو چنداں مضائقہ نہیں کیونکہ بالآخر اسی راہ سے گزرنا ہے اور اسی راہ سے بنی نوع انسان کی صحیح منزل مقصود تک پہنچنا ہے۔ عام انتخابات کا زمانہ بہت دور نہیں اور مجھے رہ رہ کے یہ خیال آتا ہے کہ جس قسم کی تیاری درکار ہے اس کی ابھی کہیں ابتدا بھی نظر نہیں آتی۔

اس سے بحث نہیں کہ کون کون انتخاب کے میدان میں اترتا ہے۔ سوال تو صرف اتنا ہے کہ پچھتر ہزار بالغ رائے دہندگان کا اگر ہر ایک حلقہ ہوا تو ہر رائے دہندہ تک پہنچنا' اسے حق رائے دہندگی کے صحیح استعمال سے آگاہ کرنا' اسے فہرست انتخاب کی نقل جس میں اس کا نام پتہ وغیرہ درج ہو پہنچانا' اور اس کو مقام انتخاب تک کھینچنا کوئی چھوٹا سا کام نہیں۔ ہر حلقہ میں سینکڑوں کام کرنے والوں اور پڑھے لکھے منشیوں اور کارکنوں کی ضرورت ہوگی۔ اور انتخاب کے کل مرحلوں کو پورا کرنا پڑیگا

یہ درست ہے کہ جو پارٹی برسر اقتدار ہوتی ہے اسے بہت سی سہولتیں میسر ہوتی ہیں۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ برسر اقتدار پارٹی کی عموماً مخالفت بھی شدید ہوتی ہے۔

کسی زمانہ میں دلی میں ایک لفظ بولا جاتا ہے "کھکیڑ" یعنی انتہائی دردسری اور الجھن اور انتخاب کی کھکیڑ سے بڑھ کر شاید ہی کوئی دوسری دردسری ہو۔ ہزاروں کے مزاج سے واسطہ پڑنا' ہزاروں کے گھروں کی کنڈی کھٹکھٹانا' ہزاروں کی ناز برداری کرنا' اور مہینوں پاؤں دوڑ ہی میں مبتلا رہنا۔ مگر یہ سب باتیں سہل ہو جائیں اگر رائے دہندگان اپنے حقوق اور اپنی صحیح ضرورتوں کو سمجھتے ہوں اور ملکی اور سیاسی مسائل سے ناواقف نہ ہوں۔ مزید براں اگر ان میں شخصی اور سماجی ضرورتوں میں درست امتیاز کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ مگر آج کی آب وہوا اور آج کے اس نقشہ میں جہاں کروڑوں انسان اپنی روزانہ زندگی کی الجھنوں میں پھنسے ہوئے ہوں اس صلاحیت کی توقع ذرہ دور دراز کا معاملہ ہے۔

بہر کیف اگر ملک کے رہبروں کو روزانہ نئی نئی آفتوں کا مقابلہ نہ پیش آئے تو سال بھر میں کافی کام کیا جا سکتا ہے اور خالی الذہن مالکان ملک کی تربیت کی جا سکتی ہے۔

اور مجھے امید رکھنی چاہیئے کہ یہ کام ناتمام نہ چھوڑا جائے گا۔

میں آئین کے اور پہلوؤں کو نظر انداز کرتا ہوں کیونکہ نہ اتنی فرصت مجھے ہے اور نہ اتنی گنجائش "آجکل" میں کہ میں اس مہم کو سر کرنے کی جرأت کروں۔

(۲)

مولینا حفظ الرحمٰن ممبر آئین ساز اسمبلی

ہماری مجلس دستور ساز نے سوا دو سال کی انتھک محنت اور کاوش کے بعد آزاد ہندوستان کے لئے جو دستور تیار کیا ہے وہ آج ہمارے سامنے ہے۔ ہمارا دیش جن حالات میں آزاد ہوا۔ اور پھر آزادی کے بعد جو نازک اور پیچیدہ حالات اچانک رونما ہوئے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ایسے حالات میں جمہوریت کی بنیادوں پر اس دستور کی ترتیب یقیناً ایک قابل قدر کارنامہ اور ترقی کی طرف ایک بڑی پیشقدمی ہے۔ مجھے اگرچہ بحیثیت رکن مجلس دستور ساز اس کی بعض دفعات اور نکات سے اختلاف رہا ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ بحیثیت مجموعی یہ دستور ہندوستان کے مستقبل کے لئے بہت امید افزا ہے۔ ساتھ ہی ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ کوئی دستور اپنی جگہ کتنا ہی بہتر دستور کیوں نہ ہو لیکن جب تک اس پر صحیح طریقوں سے عمل نہ کیا جائے اس کی خوبیاں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔ اس لئے آزاد ہندوستان میں اس دستور کے نفاذ کے بعد ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ ہم اپنے اندر وسعت نظر، فراخ حوصلگی، اور جذبات کی سچائی پیدا کریں، تاکہ ہندوستان کے تیس کروڑ باشندوں کو امن و خوشحالی کی زندگی نصیب ہو سکے اور سیکولر اسٹیٹ کا وہ نظریہ جو اس دستور کی روح ہے صحیح معنی میں کامیاب ہو۔

(۳)

سیّد سلطان احمد

اقلیت کا مسئلہ سیاست کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ یہ دنیا کی دو جنگوں کے لئے چنگاری کا کام دے چکا ہے۔ جب مغرب اپنے تمام لطیف سیاسی احساسات کے باوجود اقلیت کے مسئلے کو حل نہ کر سکا تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ غیر ملکی حکمرانوں کی اختلافات پیدا کرنے کی پالیسی کی وجہ سے ہندوستان آپس میں لڑنے والے فرقوں کا ایک افسوسناک اکھاڑہ بن گیا اور بالآخر ایک عظیم ملک جس کے باشندے انسانی تاریخ کی پاکیزہ ترین روایات کے وارث ہونے پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں دو خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔

بہرحال یورپ کے سیاستدانوں کو اس امر کا احساس ضرور تھا کہ اقلیت کا مسئلہ ایک اہم اور بڑا مسئلہ ہے۔ معاہدۂ ورسائی کی رو سے یورپ کو بلقانی ممالک میں بانٹ کر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی گئی یہ طریقہ اگرچہ غلط تھا لیکن اس کوشش سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ مسئلہ کو حل کرنے کی خواہش موجود تھی۔ اس کے علاوہ مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) کے زیر اہتمام اقلیتوں کو بین الاقوامی طور پر ضمانتیں دینے کا ایک چارٹر تیار کیا گیا۔ جسے لیگ میں شامل ہونے والی تمام ریاستوں نے منظور کیا۔ دوسری جنگ عظیم نے اٹلانٹک چارٹر کو جنم دیا۔ جس کی دفعہ تین کے ماتحت ہر قوم کو یہ لازمی حق حاصل ہے کہ وہ اپنی طرز معاشرت اور طریق حکومت کا خود فیصلہ کرے۔ اس کے بعد اقوام متحدہ کی انجمن نے جو نسلِ انسانی کی مشترکہ بقا کی اجتماعی جدوجہد کی نمائندہ ہے اس چارٹر کی تصدیق کر دی۔

گول میز کانفرنس کے وقت ہندوستان کی اقلیتوں کے سوال نے دنیا کی توجہ کو نمایاں طور پر اپنی طرف کھینچا۔ مہاتما گاندھی کی سرگرم کوششوں کے باوجود دوسری گول میز کانفرنس میں اقلیتوں کے سوال پر مناسب سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اس معاملے میں کانگریس کو جو مایوسی ہوئی اس کا ازالہ کرنے کے لئے اس نے چند سال بعد ایک تحریک جاری کی جو رابطۂ عوام کی تحریک کے نام سے مشہور ہے لیکن مسلم لیگ نے اسے اپنے لئے ایک چیلنج سمجھا اور ایک طویل خواب کے بعد یکایک جاگ اٹھی اور اس نے سرگرم تنظیمی کام شروع کر دیا۔ انتخابات میں مسلم لیگ کو وسیع پیمانے پر کامیابیاں ہوئیں۔ کچھ دیر بعد رقابت نے اقلیت اور اکثریت کے سوال کی شکل ترک کر دی اور ہندوستان کی سیاست کے میدان میں دو قوموں کا نظریہ نمودار ہوا۔ اس نظریے کو لیگ نے اپنے اجلاس لاہور میں سرکاری طور پر ایک

ریزولیوشن کی شکل میں پیش کیا۔ کئی سال کی باہمی نفرت اور بے دردانہ کشت وخون کے بعد اس نے قطعی شکل یہ اختیار کی کہ ملک ہند اور پاکستان میں تقسیم ہو گیا۔ اب یہ ایک طے شدہ مسئلہ اور تاریخ گزشتہ کا ایک واقعہ ہے۔ مستقبل کی تشکیل ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں دانشمندی سے ایسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں کہ دونوں ڈومینینوں اور ان کے عوام کے درمیان ہمسایوں جیسے خوشگوار تعلقات پیدا ہوں۔ ہمیں اس بات سے اجتناب کرنا چاہیئے کہ پرانی رقابتیں اور گزشتہ افسوسناک تلخیاں ازسرنو زندہ ہوں۔

اس حوصلہ افزا حقیقت کے پیش نظر کہ ہمارے نئے ودھان میں بنیادی حقوق کی شکل میں گارنٹیاں دے کر اقلیتوں کی خوددارانہ اور محفوظ حیثیت کا انتظام کر دیا گیا ہے ہم ہند میں بڑی آسانی سے ایک نئے باب کا افتتاح کر سکتے ہیں۔ بنیادی حقوق میں ایسے کئی ایک تحفظ کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا جس کا بین الاقوامی کنونشنوں میں شائبہ تک موجود ہو۔ ان بنیادی حقوق میں امریکہ، کینیڈا اور دکنی افریقہ کے جدید ترین ودھانوں اور چارٹروں کی تمام گارنٹیاں موجود ہیں۔

ہندوستان کا نیا ودھان کئی اعتبار سے ایک اہم اور قابل ستائش دستاویز ہے۔ یہ دستاویز اقلیتوں کے نقطۂ نگاہ سے بھی کچھ کم اہم نہیں۔ اس میں موجودہ دور کے بڑے بڑے ودھانوں کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس معاملے میں سوویٹ یونین کا ودھان ایک قدم آگے ہے اور اس میں علیٰحدگی کا حق بھی دیا گیا ہے لیکن یہ صرف کاغذی کارروائی ہے۔ سوویٹ یونین کا سیاسی بیورو ۱۶ یونٹوں میں سے کسی ایک کو اس امر کی اجازت بھی نہیں دے گا کہ وہ علیٰحدگی کی بات سوچ بھی سکیں۔ بہرحال ہندوستان میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہاں کسی اقلیت کو ایک سٹیٹ یا یونٹ کا درجہ حاصل نہیں۔ ایک فرد کی حیثیت سے اقلیتی طبقے کے ہر ایک ممبر کے لئے دروازہ کھلا ہے۔ کہ وہ چپ چاپ اس ڈومینین میں چلا جائے جس کے ساتھ وہ ذہنی طور پر وابستہ ہو۔ ہندوستان کی تقسیم دو قوموں کے نظریے کی بنیادوں پر ہوئی تھی اور تقسیم کے ساتھ ہی دو قوموں کے نظریے کو ختم ہو جانا چاہیئے۔ اگر دو قوموں کو اب بھی برقرار رہنا ہے تو ہند کو اس بھدے اور تباہ کارانہ انداز میں تقسیم کیوں کیا گیا تھا؟ اب ہندوستان میں ایک ہی قوم رہے گی اور اس کا ایک ہی جھنڈا ہو گا۔ پاکستان میں بھی یہی ہونا چاہیئے۔ میں اس بات کو دہراتا ہوں کہ اگر کوئی ہندوستانی مسلمان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ہندوستانی جھنڈے کا وفادار نہیں بن سکتا تو اسے چاہیئے کہ وہ اسی سرزمین پر چلا جائے جس سے اسے پیار ہو۔ لیکن یہ کام اسے کسی قسم کی گڑبڑ ڈالنے کی کوشش کے بغیر کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ایک نئی سٹیٹ جو امن قائم کرنے کی کوشش میں مصروف ہو اسے نہ تو غداری کی نگرانی کرنے کی مہلت ہے اور نہ اسے کچلنے میں وہ کوئی رحم دکھا سکتی ہے۔

نئے ودھان میں تمام شہریوں کے جو بنیادی حقوق تسلیم کئے گئے ہیں ان میں ہر بات شامل ہے۔ یہ اتنے ہمہ گیر ہیں کہ ان کی موجودگی میں مجالس آئین ساز میں مسلمانوں کے لئے نشستوں کی تخصیص بالکل بے سود اور غیر ضروری ہے۔ مشترکہ انتخاب کے رواج سے یہ ٹھوس فائدہ ہو گا کہ اس ذہنی تلخی کا خاتمہ ہو جائے گا جو سالہا سال تک فرقہ دارانہ طور پر ووٹ ڈالنے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ برطانیہ کے اخراج کے بعد یہ بالکل قدرتی اور مناسب ہے کہ فرقہ وارانہ سیاست کو بھی یہاں سے نکال دیا جائے۔ مسلمانوں کو فرقہ وارانہ غلط فہمیوں سے نجات دلانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ منٹو کی روایات کا نشان تک مٹا دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ مسلم ذہن دارالحرب کے مذہبی اوہام سے نجات حاصل کرے۔

مہاتما گاندھی نے مسلمانوں کے تحفظ اور ہندوؤں کے کفارے کے لئے جان دی۔ اگر ہندوستان کا مسلمان آج اپنے دل میں یہ محسوس نہیں کرتا کہ ان تحفظات کے علاوہ جو آئین میں موجود ہیں، مہاتما گاندھی کی لافانی سپرٹ بھی اس کی حفاظت کر رہی ہے وہ افلاسِ ایمانی کا افسوسناک حد تک گناہگار ہے۔ ہند کو اس لافانی پیغام پر کاربند رہنا چاہیئے جو ۳۰ جنوری کو ایک شہید کے خون سے رقم ہوا تھا۔ ہند کو اپنے ہندو اور مسلمان بچوں کے قلبی اتحاد سے اپنے آقا کی آخری خواہش کو پورا کرنا چاہیئے۔

نئے آئین کے امتیازی پہلو

(مسٹر ایس۔این کرجی جائینٹ سیکرٹری آئین ساز اسمبلی)

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو دنیا میں ایک نئی جمہوریہ کا قیام عمل میں آ رہا ہے ــــــ یہ وہ دن ہے جب بیس سال قبل ہندوستان کے عوام نے مہاتما گاندھی کی قیادت میں مکمل آزادی حاصل کرنے کا عزم کیا تھا چنانچہ ۲۶ جنوری کو ہی نئے آئین کے نفاذ کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔

نئے آئین کے تحت ہند ایک پورے اختیار والی عوامی جمہوریہ ہوگی۔ تمہید میں یہ غیر مبہم الفاظ میں کہا گیا ہے کہ انصاف، آزادی، برابری اور بھائی چارہ آئین کے مقاصد ہوں گے۔ آئین کا خاص پہلو یہ ہے کہ فیڈریشن ہونے کے باوجود اس کا مقصد یونین کے استحکام کے لئے تمام بنیادی معاملات میں یکسانیت رکھتا ہے۔ آئین کے تحت نظام عدالت، ضابطہ دیوانی و فوجداری اور کل ہند ملازمتوں کے بارے میں ایک سے قوانین ہوں گے۔ آئین کے تحت یونین اٹوٹ ہے اور کوئی بھی ریاست یونین سے نہ الگ ہو سکتی ہے اور نہ اپنا آئین مرتب کر سکتی ہے۔

فیڈریشن

ہندوستانی آئین اور فیڈرل آئینوں کی طرح سخت اور ناقابل ترمیم و توسیع نہیں ہے۔ اختیارات کی تقسیم وفاقی طرز کے آئینوں کا ایک ضروری پہلو ہوتا ہے، کیونکہ اس نظام کے تحت فیڈرل حکومت کی ریاستوں میں دخل دینا یا ریاستوں کا فیڈرل حکومت میں دخل آئین کی خلاف ورزی کے مترادف ہے، کیونکہ نظام عدالت آئین کی وضاحت کرنے میں آخری اختیار رکھتا ہے۔ ہند کے آئین میں آسٹریلوی آئین کی طرح ایسی دفعات درج ہیں جو صرف اس وقت تک نافذ العمل رہیں گی جب تک پارلیمنٹ قانون کے ذریعے سے ان کو رد نہ کرے۔ اس کے علاوہ پارلیمنٹ کو قریباً ۴۷ موضوع کے بارے میں قانون سازی کے متوازی اختیارات دیئے گئے ہیں، اور آئینوں کے برعکس نئے آئین میں ترمیم کرنے کی زیادہ سہولتیں دی گئی ہیں اور اس طرح آئین سختی اور رجعت پسندی سے پاک رہے گا۔

آئین کا ایک اور خاص پہلو یہ ہے کہ یہ حالات کے تقاضے کے مطابق وحدت پسند اور فیڈرل بھی ہو سکتا ہے۔ عام حالات میں حکومت فیڈرل طریقے سے کام کرے گی، لیکن جنگ یا دوسرے ہنگامی حالات میں پورا ملک ایک اکائی بن جائے گا۔

پارلیمانی طرز کی جمہوریت

نئے آئین کے تحت حالانکہ رئیس حکومت کو "پریذیڈنٹ" کہا جائے گا، لیکن حکومت کی بنیاد امریکی طرز کی نہیں بلکہ پارلیمانی طرز کی جمہوریت پر رکھی گئی ہے۔ اس طرح پریذیڈنٹ اپنے عاملانہ اختیار وزیروں کے مشورے سے استعمال کرے گا۔ یہ وزیر پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہوں گے، اور چونکہ پارلیمنٹ کے ارکان بالغ حق رائے دہندگی کی بنیاد پر منتخب ہوں گے اس لئے بالآخر عوام حکومت کے اقدام کے لئے ذمہ دار ہوں گے۔ پارلیمانی طرز کی ذمہ دار حکومت کا اصول اس تجربے کو پیش نظر رکھ کے تسلیم کیا گیا ہے جو متعدد برسوں تک ہندوستان کے صوبوں میں اس طرز کی حکومت رائج ہونے سے حاصل کیا گیا ہے۔

آئین میں ۳۹۵ دفعات اور آٹھ شیڈیول ہیں۔ بادی النظر میں آئین بہت طویل اور پر از تفصیلات معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ملک کی وسعت، آبادی کا تنوع اور مختلف مفادات کی حفاظت کی ضرورت کے پیش نظر آئین کا اس قدر جامع ہونا لازمی تھا۔

ہندوستانی ریاستوں کا مسئلہ

ہند ریاستوں کی یونین ہوگا اس میں ۲۸ ریاستیں اور جزائر انڈیمان اور نکوبار کے علاقے شامل ہوں گے۔ ان ریاستوں کو تین اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان کا ذکر پہلے شیڈیول کے حصہ الف، ب اور پ میں کیا گیا ہے۔

ان میں بالترتیب گورنروں کے صوبے، ہندوستانی ریاستیں اور چیف کمشنر کے صوبے شامل ہیں۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی آزادی کا ایکٹ نافذ ہونے کے بعد ہند میں ۹ گورنروں کے صوبے، ۵ چیف کمشنروں کے صوبے اور تقریباً ۵۰۰ ہندوستانی ریاستیں شامل تھیں۔ ہندوستانی ریاستوں کا رقبہ ہند ڈومینین کے کل رقبہ کے نصف کے برابر تھا، اور ان کی آبادی کل ۲۷ فی صدی تھی۔ ان جاگیردارانہ اور مطلق العنان ریاستوں کو سیاسی اور نظم و نسق کے اعتبار سے ہند یونین میں لے آنا ایک نہایت مشکل مسئلہ تھا، لیکن اس مسئلہ کو جس طرح بغیر کسی آویزش کے پرامن طور پر حل کیا گیا، اس کی مثال تاریخ میں مشکل سے مل سکتی ہے۔ صوبوں میں شامل کرنے اور ایک دوسرے سے ملنے کے بعد ۵۰۰ ہندوستانی ریاستوں کی تعداد کل ۱۷ رہ گئی۔ ان میں سے ۹ کا ذکر پہلے تیسرے شیڈیول کے حصہ ب میں کیا گیا ہے نئے آئین کے تحت ان کا درجہ قریباً قریباً انڈین یونین کے اور حصوں کے برابر ہے

شہریت

تمام ہند کے لئے ایک ہی شہریت ہوگی۔ دفعہ ۵ کے تحت ہر وہ شخص ہند کا باشندہ ہوگا جو ہند میں رہ رہا ہو اور مندرجہ ذیل شرائط میں سے ایک شرط کو پورا کرتا ہو۔

(۱) وہ شخص خود یا اس کے ماں باپ میں سے کوئی ہند کی سرزمین میں پیدا ہوا ہو۔ یا (۲) آئین کے نفاذ سے پہلے کم از کم ۵ سال سے ہند میں رہ رہا ہو۔ جو اشخاص پاکستان سے ہندوستان میں آئے ہیں اور جو ہندوستانی غیر ممالک میں رہ رہے ہیں ان کے لئے خاص دفعات مندرج ہیں۔

بنیادی حقوق

یہ حقوق دراصل اعلیٰ مقاصد کا ایک ایسا منشور ہے جو رائے عامہ کے اجتماع کے لئے ایک مرکز اور حکومت کی فرو گذاشت و افعال کی پرکھ کے لئے ایک کسوٹی ثابت ہوگا۔ ہند کے آئین کا یہ امتیازی پہلو ہے کہ دیگر ممالک کے برعکس بنیادی حقوق کا مفصل ذکر خود آئین میں کیا گیا ہے دوسرے ممالک کے تجربے کے پیش نظر آئین میں حکومت کو بنیادی حقوق پر پابندیاں عائد کرنے کا حق دیا گیا ہے۔
آئین میں جن بنیادی حقوق کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں۔

برابری کے حقوق۔ آزادی کے حقوق۔ نفع اندوزی کے خلاف حقوق۔ مذہب کی آزادی کے حقوق۔ تہذیبی اور تعلیمی حقوق۔ جائداد کے متعلق حقوق۔ دستوری چارہ جوئی کے بارے میں حقوق۔

چھوت چھات کی تنسیخ

دفعہ ۱۷ جس کے تحت چھوت چھات کو منسوخ کیا گیا ہے اور جس کے برتنے کو جرم قرار دیا گیا ہے۔ برابری کے حقوق کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ دفعہ ۱۹ کے تحت ہر باشندہ کو تقریر اور بیان کا حق۔ جمع ہونے اور انجمنیں بنانے کا حق۔ آزادی سے چلنے پھرنے اور رہنے کا حق۔ جائداد حاصل کرنے اس پر قبضہ رکھنے اور اسے علیحدہ کرنے کا حق۔ کسی پیشے کو اختیار کرنے یا کوئی کاروبار تجارت یا بیوپار کرنے کے حقوق دیئے گئے ہیں۔

ذاتی آزادی اور جائداد کا تحفظ

دفعہ ۲۱ کے ذریعہ ذاتی آزادی کی حفاظت کی گئی ہے۔ دفعہ ۲۲ کے تحت ہند کے باشندہ کی حکومت کے جبر کے خلاف حفاظت کی گئی ہے۔ اس دفعہ کے تحت کسی شخص کو بے قاعدہ طور پر قید یا غیر معین وقت کے لئے نظر بند نہیں کیا جا سکتا۔

دفعہ ۳۱ کے تحت کوئی شخص اپنی جائداد سے قانونی اختیار کے علاوہ بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔ کسی جائداد پر سرکاری کام کے لئے ایسے قانون کے تحت جو اس طرح کے قبضے یا حصول کی اجازت دیتا ہو قبضہ نہ کیا جائے گا۔ نہ اسے حاصل کیا جائے گا۔ جب تک اس قانون کے مطابق ایسے قبضے یا حصوں کا معاوضہ دینے کے متعلق انتظام نہ کیا گیا ہو اور ساتھ ہی یا تو معاوضے کی رقم مقرر نہ کر دی گئی ہو یا وہ اصول بیان نہ کر دیئے گئے ہوں اور وہ طریقہ طے نہ کر دیا ہو جس کے بموجب معاوضہ طے ہوگا۔

مملکتی پالیسی کی رہنمائی کے لئے اصول

آئین میں مملکتی پالیسی کی رہنمائی کے لئے اصول بھی درج ہیں۔ ان اصولوں کو کسی عدالت کے ذریعہ منوایا نہیں جا سکے گا، پھر بھی یہ حکومت کے لئے بنیادی ہیں اور مملکت کا فرض ہوگا کہ قانون بناتے وقت ان کا لحاظ کرے۔ یہ اصول دراصل اخلاقی معیار کی حیثیت رکھتے ہیں اور کوئی حکومت جو عوام کے سامنے جوابدہ ہو انہیں نظر انداز نہیں کر سکتی۔ ان اصولوں میں جو خاص اہمیت رکھتے ہیں وہ یہ ہیں۔ عوام کی بھلائی کے لئے وسیلے اختیار کرنا۔ شہریوں کو یکساں طور پر روزگار کے ایسے ذریعوں کا حق ہو جو ان کی ضرورتوں کے لئے کافی ہوں۔ بے روزگاروں، بوڑھوں، بیماروں اور معذور اشخاص کے لئے کام تعلیم

اور سرکاری امداد کے وسیلے اختیار کرنا۔ کام کرنے کے لئے منصفانہ حالات پیدا کئے جائیں اور زمانہ زچگی میں سرکاری امداد دی جائے۔ ۱۴ سال تک کے بچوں کے لئے مفت اور لازمی تعلیم دینے کے انتظام کئے جائیں منشیات پر پابندی کی جائے اور بین الاقوامی امن اور تحفظ کے لئے کوشش کی جائے۔

پریذیڈنٹ

ہند کے عاملانہ اختیار پریذیڈنٹ کو حاصل ہوں گے۔ پریذیڈنٹ کا چناؤ ایک انتخابی جماعت کرے گی جس میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے ممبر اور ریاستوں کی قانون ساز جماعتوں کے چنے ہوئے ممبر شامل ہوں گے۔ پریذیڈنٹ ۵ برس تک کام کرے گا۔ اس عرصے کے بعد وہ پھر منتخب کیا جا سکتا ہے۔ پریذیڈنٹ کو آئین کی خلاف ورزی کی بنا پر عہدہ سے ہٹایا جا سکتا ہے۔

نئے آئین کے تحت ایک وائس پریذیڈنٹ بھی ہوگا، اس کو مرکزی قانون ساز اسمبلی کے ارکان منتخب کریں گے۔ وائس پریذیڈنٹ بھی ۵ برس تک کام کرے گا۔

مرکز میں پارلیمانی طرز کی حکومت ہوگی۔ پریذیڈنٹ کی حیثیت وہی ہے جو برطانیہ کے آئین میں بادشاہ کی ہے۔ پریذیڈنٹ کو وزیروں کی کونسل مدد اور مشورہ دیا کرے گی۔ یہ کونسل ایوان عام کے سامنے جوابدہ ہوگی۔ وزیر اپنے عہدوں پر اس وقت تک رہیں گے جب تک کہ پریذیڈنٹ مناسب سمجھے۔ پریذیڈنٹ کو وزیروں کے مشورے پر چلنا ہوگا۔ پریذیڈنٹ اور وزیروں کے درمیان ویسے ہی تعلقات ہوں گے جو شاہ انگلستان اور ان کے وزیروں کے درمیان ہیں۔

پارلیمنٹ

یونین میں ایک پارلیمنٹ ہوگی جس میں پریذیڈنٹ اور دو ایوان ہوں گے۔ جن میں ایک ریاستوں کی کونسل اور ایک ایوان عام کہلائے گا۔ ریاستوں کی کونسل کے ۲۵۰ ممبر ہوں گے جن میں سے ۱۲ پریذیڈنٹ نامزد کرے گا اور باقی ممبر ریاستوں کے نمائندے ہوں گے۔ پریذیڈنٹ جن ممبروں کو نامزد کرے گا وہ ایسے ہوں گے جو ادب، سائنس اور سماجی خدمت جیسے فنون کے ماہر ہوں گے۔ جس ریاست میں قانون ساز اسمبلی ہوگی اس ریاست کے نمائندوں کو منتخب کئے ہوئے ممبر چنیں گے اور جہاں ریاست کی کوئی قانون ساز مجلس نہ ہو وہاں اس طریقہ پر بنائی جائے جسے پارلیمنٹ قانون کے ذریعہ تجویز کرے۔ ریاستوں کی کونسل مشترکہ ہو سکے گی لیکن اس کے ممبروں کی ایک تہائی تعداد دوسرے سال کے ختم ہونے پر ہٹ جایا کرے گی۔ ایوان عام میں ریاستی مسلمانوں کی آبادی کے نمائندے ہوں گے، ان کی تعداد ۵۰۰ سے زیادہ نہ ہوگی، اور ان کو بالغوں کے حق رائے دہندگی کی بنیاد پر رائے دینے والے براہ راست انتخاب کریں گے۔ ہر حلقے کے جو نمائندے ہوں گے ان کی تعداد اس طرح مقرر کی جائے گی کہ ساڑھے سات لاکھ باشندوں کا کم سے کم ایک نمائندہ ضرور ہو۔ اور ۵ لاکھ باشندوں کے لئے کسی طرح ایک سے زیادہ نمائندہ نہ ہو۔ ایوان عام کی میعاد ۵ برس ہوگی۔

قانون سازی کا ضابطہ

پارلیمنٹ کے ایوانوں کو بلانے یا ملتوی کرنے کا اختیار پریذیڈنٹ کو دیا گیا ہے، پریذیڈنٹ ایوان عام کو برخاست بھی کر سکتا ہے جہاں تک قانون سازی ضابطے کا تعلق ہے مالی بل کے علاوہ کوئی بل پارلیمنٹ کے ایوانوں میں سے کسی میں پہلی مرتبہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ مالی بل صرف ایوان عام میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ مالی بل کو ایوان عام میں منظور ہو جانے کے بعد ریاستوں کی کونسل میں بھیجا جائے گا تاکہ وہ اپنی تجویزیں پیش کر کے چودہ دن کے اندر اندر واپس کر دے۔ ایوان عام ریاستوں کی کونسل کی کسی بھی تجویز کو منظور نہ کرے تو سمجھا جائے گا کہ مالی بل دونوں ایوانوں میں بغیر ایسی ترمیموں میں سے کسی کے، جن کی سفارش ریاستوں کی کونسل نے کی تھی اس شکل میں منظور ہو گیا ہے جس میں وہ ایوان عام میں منظور ہوا تھا۔ مالی معاملات کے طریق کار میں ایک اہم تبدیلی کی گئی ہے۔ نئے آئین کے تحت ایوان عام میں جس خرچ کی منظوری دی گئی ہو اس کو پریذیڈنٹ کی تصدیق سے نہیں بلکہ صرف مین لانے کے قانون سے عمل میں لایا جائے گا اس کے علاوہ خرچ کی ضمنی کیفیت اور زائد مطالبوں کی منظوری کے لئے بھی دفعات درج ہیں۔

یونین کی عدالتیں

فیڈرل طرز کی حکومت میں نظام عدالت کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ عدالت ہی وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعہ مملکت کے مختلف شعبوں پر پابندی عائد کی جا سکتی ہے۔ ہند کی فیڈریشن کا نظام حکومت حالانکہ دو طرح کا ہے لیکن امریکہ کی طرح اس کا نظام عدالت دو طرح کا نہیں ہے بلکہ ہند کی تمام عدالتیں ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ سب سے بڑی عدالت سپریم

آئین ساز اسمبلی

ی ڈرافٹنگ کمیٹی کے ممبر

ڈاکٹر بی. آر. امبیدکار
چیرمین ڈرافٹنگ کمیٹی

شری گوپالا سوامی آئنگر

ڈرافٹنگ کمیٹی کے آئینی مشیر
شری بی این. راؤ

شری کے ایم منشی ←

شری ٹی ٹی کرشناچاری →

سر الادی
کرشنا سوامی ائر ←

شری محمد سعد اللہ →

کورٹ ہے۔ سپریم کورٹ کے ماتحت ہر ریاست میں کئی ہائی کورٹ ہیں۔ ہائی کورٹ کے نیچے سب آرڈی نیٹ کورٹ ہوں گے۔ سپریم کورٹ کے ہر ایک جج کو پریذیڈنٹ مقرر کرے گا اور وہ ۶۵ سال کی عمر تک اس عہدہ پر رہ سکتا ہے۔ سپریم کورٹ کا جج ہونے کے لئے اس شخص کو ہند کا شہری ہونا چاہیئے۔ وہ کم سے کم ۵ سال تک کسی ایک ہائی کورٹ کا جج رہ چکا ہو یا کم سے کم دس سال تک کسی ایک ہائی کورٹ کا ایڈوکیٹ رہ چکا ہو۔ سپریم کورٹ کا کوئی جج دونوں ایوانوں کی مشترکہ درخواست کے بغیر اپنے عہدے سے برطرف نہیں کیا جا سکے گا۔ اس درخواست کے لئے ایک ہی سیشن میں دونوں ایوانوں کے موجود اور رائے دینے والے ممبروں میں سے کم از کم دو تہائی کی تائید ضروری ہے اور اس درخواست میں جو کسی ثابت شدہ بد اعمالی یا نالائقی کی بنا پر اُسے برطرف کرنے کی خواہش کی گئی ہو۔ پنشن حاصل کرنے کے بعد سپریم کورٹ کا کوئی جج کسی بھی عدالت میں وکالت نہیں کر سکتا۔

آئین کے مرتب کرنے والوں نے یہ کوشش کی ہے کہ نظام عدالت پوری طرح سے آزاد رہے، کیونکہ فیڈرل طرز کی حکومت کامیابی سے چلنے کے لئے نظام عدالت کی آزادی اشد ضروری ہے۔

سپریم کورٹ کے اختیارات

ہند کے آئین کے تحت سپریم کورٹ کو وسیع اختیارات دیئے گئے ہیں۔ سپریم کورٹ کو خاص قسم کے مقدموں کی سماعت کا اختیار ہوگا اور یہ اختیار کسی دوسری عدالت کو نہیں ہوگا۔ مثلاً وہ مقدمے جو ہند سرکار اور ایک سے زیادہ ریاستوں کے درمیان ہوں۔ کسی ریاست کے ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل ہو سکیگی۔ جہاں تک دیوانی مقدموں کا تعلق ہے۔ سپریم کورٹ کی حد اختیار اتنی ہی وسیع ہوگی جتنی کہ اس آئین کے نفاذ سے قبل پریوی کونسل کی تھی۔ سپریم کورٹ کو آئین میں مندرج بنیادی حقوق کے تحفظ کے لئے خاص اختیارات دیئے گئے ہیں۔

ہائی کورٹ

ہائی کورٹ قریباً قریباً سپریم کورٹ کی طرح ہی کام کریں گے۔ ہائی کورٹ کے جج کو ۶۰ سال کی عمر میں پنشن ملے گی۔ ہائی کورٹ کی حد اختیار وہی ہوگی جو اس آئین کے نفاذ سے پہلے تھی۔ البتہ جو پابندیاں پہلے تھیں ان کو ہٹا دیا گیا ہے۔ اب ہائی کورٹ اس علاقے میں جس میں اپیل سننے کا حق ہوگا پروانہ اختیار خاص جاری کر سکتا ہے۔ ریونیو سے تعلق رکھنے والے معاملات پر بھی اب ہائی کورٹ کو اختیار دیئے گئے ہیں۔

ریاستیں

ان ریاستوں میں جن کا ذکر پہلے شیڈیول کے حصہ الف میں کیا گیا ہے، عاملانہ اختیار گورنر کو حاصل ہوں گے۔ گورنر کا تقرر پریذیڈنٹ کرے گا اور وہ ۵ برس تک اپنے عہدہ پر رہے گا۔ ان ریاستوں میں جن کا ذکر پہلے شیڈیول کے حصہ ب میں کیا گیا ہے عاملانہ اختیار راج پرمکھ کو حاصل ہوں گے۔ ان ریاستوں میں بھی پارلیمانی طرز کی حکومت ہوگی۔ یعنی گورنر یا راج پرمکھ وزیروں کی کونسل کے صلاح مشورے کے مطابق کام کرے گا۔ اور وزیروں کی کونسل ریاست کی قانون ساز اسمبلی کے ایوان عام کے سامنے جواب دہ ہوگی۔

ہر ایک ریاست میں قانون ساز جماعت ہوگی۔ جس میں گورنر یا راج پرمکھ اور بعض ریاستوں میں دو ایوان شامل ہوں گے۔ یہ ایوان قانون ساز اسمبلی اور قانون ساز کونسل کہلائیں گے۔ قانون ساز اسمبلی میں ۷۵۰۰۰ لوگوں کے لئے ایک سے زیادہ نمائندہ نہ ہوگا۔ اور قانون ساز اسمبلی میں ۵۰۰ سے زیادہ یا ۶۰ سے کم ممبر نہ ہوں گے۔ ریاست کی قانون ساز کونسل کے ممبروں کی پوری تعداد اس ریاست کی اسمبلی کے ممبروں کی کل تعداد کا ۲۵ فی صدی سے زیادہ نہ ہوگی، لیکن یہ تعداد کسی صورت میں بھی ۴۰ سے کم نہیں ہو سکتی۔ قانون ساز کونسل کو وزیروں کی کونسل کی طرح منتشر نہیں کیا جا سکتا۔ ریاستی قانون ساز جماعت کے ایک ایوان یا دونوں ایوانوں کے طریق کار کے لئے قانونی اور مالی معاملوں میں قریباً ویسی دفعات مندرج ہیں جیسی کہ یونین پارلیمنٹ کے ایوانوں کے لئے۔

چیف کمشنروں کے صوبے

ریاستوں کی تیسری قسم جن کا ذکر پہلے شیڈیول کے تیسرے حصہ میں کیا گیا ہے ان صوبوں سے ملتی ہے جن کو ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں چیف کمشنروں کے صوبے کہا جاتا تھا۔ ان ریاستوں پر مرکز چیف کمشنر یا لیفٹیننٹ گورنر کی وساطت سے حکومت کرے گا۔ انڈیمان اور نکوبار کے جزیروں کا نظم و نسق حسب معمول مرکز کے ہاتھوں میں ہوگا۔

پسماندہ طبقوں کے لئے تحفظ

آئین میں بعض پسماندہ علاقوں کے لئے جن کو جدولی (شیڈیولی) اور قبائلی علاقے کہا جاتا ہے خاص دفعات مندرج

ہیں۔ آئین کے پانچویں اور چھٹے شیڈیول میں ان علاقوں کے نظم و نسق کے بارے میں تفصیلات درج ہیں، ان تفصیلات کی بنیاد اس اصول پر رکھی گئی ہے کہ ان علاقوں کے ناظمین لوگوں کے ساتھ قریبی تعلقات رکھیں اور پورا تعاون کریں۔ یہاں یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ ایوانِ عام اور ریاستوں کی قانون ساز جماعتوں میں دلت جاتیوں شیڈیولی علاقوں اور اینگلو انڈین فرقے کے لوگوں کے لئے دس سال کے عرصے کے لئے نشستیں مخصوص رکھی گئی ہیں۔ ان لوگوں کو جو تحفظات دیئے گئے ہیں ان کے متعلق خاص خاص مدت کے بعد پریذیڈنٹ کو رپورٹ پیش کی جائے گی۔ آئین میں یہ بھی درج ہے کہ پریذیڈنٹ دس سال کے عرصے کے بعد ان کی حالت کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کرے۔ کمیشن کی رپورٹ حاصل کرنے کے بعد پریذیڈنٹ پارلیمنٹ کو مطلع کرے گا کہ اس نے اس سلسلے میں کیا اقدام کئے ہیں۔

یونین اور ریاستوں کا سمبندھ

قانون سازی کے مختلف موضوعات کی تین فہرستوں میں مفصل وضاحت کی گئی ہے۔ یہ فہرست یہ ہے۔ یونین فہرست۔ متوازی فہرست۔ ریاستی فہرست۔ یونین فہرست میں جن کا ذکر ہے ان کے متعلق صرف پارلیمنٹ قانون بنا سکتا ہے۔ ریاستی فہرست میں جن کا ذکر ہے ان کے متعلق صرف وہ ریاستیں قانون تیار کرسکتی ہیں جن کا ذکر پہلے شیڈیول کے حصہ الف اور ب میں کیا گیا ہے۔ اور متوازی فہرست میں جن کا ذکر ہے ان کے بارے میں پارلیمنٹ اور متعلقہ ریاستوں کی قانون ساز جماعت قانون بنا سکتے ہیں۔ پارلیمنٹ ان ریاستوں کے کسی بھی معاملے کے متعلق قانون بنا سکتا ہے (اور ان میں وہ موضوعات بھی درج ہیں جن کا ذکر ریاستی فہرست میں ہے) جن کا ذکر پہلے شیڈیول کے حصہ ب میں ہے۔ پارلیمنٹ کے اس اختیار کا اطلاق انڈیمان اور نکوبار کے جزائر پر بھی ہوتا ہے۔

قانون سازی کی فہرستیں

یونین فہرست میں ۹۷ موضوعات درج ہیں اور ان میں دفاع، ایٹمی قوت، امور خارجہ، شہریت، ریلیں، جہاز رانی، ہوا بازی، ڈاک اور تار، بینک اور انشورنس شامل ہے۔ ریاستی فہرست میں ۶۶ موضوعات درج ہیں اور ان میں امن عامہ، پولیس، لوکل گورنمنٹ، صحت عامہ، حفظانِ صحت، تعلیم، زراعت اور جنگلات شامل ہیں۔ متوازی فہرست میں ۴۷ موضوعات کا ذکر ہے اور ان میں قانون فوجداری، ضابطۂ فوجداری، اناج میں ملاوٹ، ٹریڈ یونین، مزدوروں کی بہتری، قیمتوں کا کنٹرول اور کارخانے شامل ہیں۔ کینیڈا کی طرح بچے ہوئے اختیار مرکز کو حاصل ہوں گے یعنی وہ تمام معاملات جن کا ذکر متوازی فہرست یا ریاستی فہرست میں نہ ہو ان کو یونین فہرست میں تصور کیا جائے گا۔

اسی طرح قومی ضرورت کے لئے ریاستی فہرست کے کسی معاملے کے متعلق پارلیمنٹ کو قانون بنانے کا اختیار ہے لیکن یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے اگر ریاستوں کی کونسل کے کم از کم دو تہائی موجود ممبروں کی رائے سے کسی ریزولیوشن کے ذریعہ یہ اعلان کیا ہو کہ قومی مفاد کی خاطر یہ ضروری یا مناسب ہے کہ پارلیمنٹ کسی ایسے معاملے کے لئے جس کو ریاستی فہرست کہا گیا ہے اور جس کا ذکر ریزولیوشن میں کر دیا گیا ہے، قانون بنائے تو پارلیمنٹ کو حق ہوگا کہ وہ ہند کی پوری سرزمین یا اس کے کسی حصے کے بارے میں جس کا تعلق اس معاملے سے ہو قانون بنائے۔

اگر کسی ریاست کے قانون کی کوئی دفعہ پارلیمنٹ کے کسی قانون کی کسی دفعہ کے خلاف ہو جس کو پارلیمنٹ بنانے کی مجاز ہے تو پارلیمنٹ کا بنایا ہوا قانون مانا جائے گا اور ریاست کا بنایا ہوا قانون اس کے خلاف ہونے کی حد تک بے اثر ہو جائے گا۔ لیکن اس کے برعکس جہاں کسی ریاست کی قانون ساز جماعت کے بنائے ہوئے قانون میں کوئی ایسی دفعہ ہو جو پارلیمنٹ کے کسی ایسے قانون کی دفعات کے خلاف ہو جو اس سے پہلے بنایا جا چکا ہو۔ یا کسی موجودہ قانون کے خلاف ہو جو اس معاملے کے متعلق ہو تو ریاست کی قانون ساز جماعت کا بنایا ہوا قانون ہی مانا جائے گا۔ بشرطیکہ یہ پریذیڈنٹ کے غور کے لئے اٹھا رکھا گیا ہو اور پریذیڈنٹ نے اسے منظور کر لیا ہو۔

یونین کے عاملانہ اختیارات ان تمام معاملات پر حاوی ہیں جن کے متعلق پارلیمنٹ قانون بنا سکتا ہے اور اسی طرح ریاست کے عاملانہ اختیار ان تمام معاملات پر ہیں جن کے متعلق ریاست کی قانون ساز جماعت قانون بنا سکتی ہے۔

مختلف محاصل کا انضمام

ہند میں بھی برطانیہ، کینیڈا اور آسٹریلیا کے طریق کار کی طرح یونین کے لئے اور ریاستوں کے لئے مختلف محاصل کا انضمام کیا جائیگا، یہ بالترتیب کانسالیڈیٹیڈ فنڈ آف انڈیا اور کانسالیڈیٹیڈ فنڈ آف سٹیٹ کہلایا جائیگا۔ پارلیمنٹ کا اقتدار اعلیٰ برقرار رکھنے کے لئے یہ قرار دیا گیا ہے کہ اس فنڈ میں سے کوئی رقم پارلیمنٹ یا ریاست کی قانون ساز جماعت کی قانونی منظوری کے بغیر صرف نہ کی جائے گی۔ اتفاقیہ ضروریات کے لئے یونین اور ریاستوں میں ہنگامی فنڈ بھی قائم کئے جائیں گے۔

یونین اور ریاستوں میں مالیہ تقسیم کرنے کا طریقہ قریباً قریباً وہی رہے گا جو ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت تھا۔ اس کے علاوہ قرار دیا گیا ہے کہ ایک مالیاتی کمیشن بنایا جائے۔ مندرجہ ذیل معاملات کے متعلق سفارشیں کرنا اس کمیشن کا فرض ہوگا۔

(الف) یونین اور ریاستوں کے درمیان ان ٹیکسوں کی خالص آمدنی کی تقسیم جس کو ان کے درمیان تقسیم کرنا ہے اور ریاستوں کے ان میں سے ہر ایک کے اپنے اپنے حصے کی تقسیم۔

(ب) وہ اصول جنہیں ہند کی آمدنی سے ریاستوں کو امدادی رقوم دینے میں برتنا ہو۔

(پ) کسی ایسے معاملے کی شرطوں پر عمل جاری رکھنا یا ان میں ترمیم کرنا جو یونین اور کسی ریاست کے درمیان کسی ایسے ٹیکس یا چونگی کے لگانے سے جمع کرنے اور تقسیم کرنے کے متعلق ہوا ہو جو ہند سرکار کی طرف سے اس ریاست میں وصول کیا جا سکتا ہے۔

تنقیح حسابات

پریذیڈنٹ ہند کا ایک آڈیٹر جنرل بھی مقرر کرے گا جو ہند سرکار یا ریاستی سرکار کے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کرے گا۔ آڈیٹر جنرل کو اپنے فرائض کی ادائیگی میں پوری پوری آزادی دینے کے لئے آئین میں خاص تحفظات رکھے گئے ہیں۔

سرکاری زبان

ہندی کو یونین کی سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ہر ریاست کو آزادی دی گئی ہے کہ وہ ہندی یا متعلقہ ریاست کی مروجہ زبانوں میں سے ایک یا ایک سے زیادہ زبان استعمال کرے۔ انگریزی زیادہ سے زیادہ پندرہ سال تک بدستور سرکاری زبان رہیگی۔

ہنگامی حالات کے لئے اختیارات

آئین نے پریذیڈنٹ کو اختیار دیا ہے کہ اگر اسے یہ یقین ہو کہ جنگ، حملہ یا اندرونی خلفشار کی وجہ سے ملک کی سلامتی کو خطرہ ہے اور سخت ہنگامی حالت پیدا ہو گئی ہے تو وہ ہنگامی صورت حال کا اعلان کر سکتا ہے۔ اس اعلان کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کو دو مہینے ختم ہونے سے پہلے پہلے منظور کرنا ہوگا ورنہ یہ اعلان یہ مدت ہونے کے بعد بے اثر ہو جائیگا۔ آئین کے تحت یونین پر یہ فرض عائد ہوگا کہ وہ ہر ریاست کو باہر کی جارحانہ کارروائی اور اندرونی فسادات سے بچائے اور یہ دیکھے کہ ریاست کی حکومت آئین کی دفعات کے مطابق چلائی جاتی ہے۔ گورنر یا راج پرمکھ کی اطلاع کے بعد اگر پریذیڈنٹ کو یہ یقین ہو جائے کہ ریاست میں حالات ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن میں ریاست کی حکومت اس آئین کے قاعدوں کے مطابق نہیں چلائی جا سکتی تو وہ اپنے حکم سے ریاستی سرکار کے سارے یا کوئی فرض یا سارے یا کوئی اختیار جو ریاست کی قانون ساز جماعت کو چھوڑ کر کسی با اختیار حاکم کو حاصل ہیں اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے۔ اس اعلان کے لئے دو مہینوں کے اندر اندر پارلیمنٹ کی منظوری ضروری ہے۔ یہ اعلان چھ مہینے تک نافذ رہ سکتا ہے، اس کے بعد پھر پارلیمنٹ کی منظوری ضروری ہوگی۔ یہ اعلان کسی صورت میں بھی ۳ سال سے زیادہ عرصے تک بااثر نہیں رہ سکتا۔ یونین کے مالی استحکام کے پیش نظر پریذیڈنٹ کسی ریاست کو خاص احکام دے سکتا ہے۔

آئین میں ترمیم

دوسرے ممالک کے آئینوں کے برعکس ہند کے آئین میں ترمیم کرنے کے لئے سیدھا سادا طریق کار تجویز کیا گیا ہے۔ صرف مندرجہ ذیل معاملوں کے سلسلے میں یہ قرار پایا ہے کہ ان سے متعلقہ دفعات میں ترمیم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ریاستوں کی کم سے کم نصف قانون ساز جماعتیں اس کی تصدیق کریں۔ معاملات یہ ہیں۔

سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ سے متعلقہ دفعات۔ مرکز اور ریاستوں میں قانون سازی کے اختیارات کی تقسیم سے متعلقہ دفعات۔ قانون سازی کی تین فہرستیں متعلقہ دفعات۔ پارلیمنٹ میں ریاستوں کی نمائندگی اور قانون میں ترمیم کے طریق کار سے متعلقہ دفعات۔

دیگر تمام دفعات میں پارلیمنٹ ہر ایوان کے دو تہائی ممبروں کے ووٹ سے ترمیم کر سکتا ہے۔

ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ اوپر آئین کا جو خاکہ پیش کیا گیا ہے وہ کسی بھی صورت میں جامع ہے۔ ہماری کوشش یہ رہی ہے کہ آئین کے بعض امتیازی پہلوؤں کو آپکے سامنے پیش کریں اس نئے آئین کے ذریعہ حقیقی جمہوریت کی داغ بیل ہی نہیں ڈالی گئی بلکہ اس پر صحیح طریقہ سے عمل درآمد کیا جائے تو قومی خوشحالی، اجتماعی فلاح و بہبود اور ملک کی یکجہتی کی شاندار عمارت بھی تعمیر ہو جائے گی۔

مہدی عباس حسینی

ہندوستان کا نیا دستور

تنقید و موازنہ

انسانی فطرت کی تعمیر میں ایک ایسے جذبے کا دخل ہے جو اسے مل جُل کر رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارا معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ اور معاشرہ کے وجود میں آنے کے بعد انسان اس کی بقا کے لئے سیاسی سماجی اور معاشی نظام بنانے پر مجبور ہوجاتا ہے تاکہ معاشرہ کا شیرازہ نہ بکھرنے پائے۔

ہر سیاسی نظام ایک دستور اساسی کا تابع ہوتا ہے۔ دستور کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ تحریر کردہ ہو۔ اگر یہ شرط لازم قرار پائے تو کہا جاسکتا ہے کہ انگلستان کے پاس کوئی دستور ہی نہیں۔ دراصل دستور محض ان (تحریر شدہ یا غیر تحریر شدہ) قوانین رسوم و رواج کا مجموعہ ہے جن کی رُو سے کسی ملک کا سیاسی نظام کام کرتا ہے۔ اگر دستور نہ ہو تو نراج ہوگا۔ اور نراج اس وقت مفید ہوسکتا ہے جب کہ انسان انسانیت کے معراج پر ہو۔ ورنہ انتشار اور بہیمیت کا دور دورہ ہوگا۔ اور آدم کی اولاد کا مقام تہذیب و ارتقا کی روشن بلندیوں پر نہ ہوگا۔ بلکہ تخریب و تنزل کی تاریک گھاٹیوں میں۔

قدیم و جدید کا سنگم ہندوستان کا نیا دستور انگریزی تعلیم اور ہندوستانی دماغ کی آمیزش کا ایک خوشگوار نتیجہ ہے۔ ہندوستان نے انگریزی ادب۔ انگریزی سیاست اور انگریزی اداروں ہی سے جمہوریت اور قوم پرستی کا سبق سیکھا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ دستور ساز کمیٹی نے دنیا کے دوسرے دستوروں کا مطالعہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر امبیدکر اور ان کے ساتھیوں نے یورپ۔ امریکہ۔ افریقہ۔ آسٹریلیا سبھی براعظموں کے دستوری چمنوں کی سیر کی ہے۔ اور خاص طور پر انگلینڈ۔ آئرلینڈ۔ امریکہ۔ کناڈا۔ آسٹریلیا جنوبی افریقہ۔ جرمنی اور روس کے تختہ ہائے گل سے گلچینی کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ان جدید ترین سیاسی افکار کو بھی کافی نہیں سمجھا۔ کیونکہ انھیں ہندوستان کی رگ رگ میں سموئی ہوئی پرانی سیاسی قدروں کا بھی احساس تھا۔ لہٰذا انھوں نے ہندوستان کے دستور کو ایک ایسا گلدستہ بنایا جس میں قدیم و جدید۔ مشرق و مغرب دونوں کا انتخاب ہے۔ انھوں نے اپنی مغربی تعلیم کو ذہنی مرعوبیت میں تبدیل نہیں ہونے دیا۔ اور اندھا دھند تقلید کے الزام سے اپنے دامن کو آلودہ نہیں کیا۔

ہر ملک کے مسائل جداگانہ ہوتے ہیں۔ اور کسی ملک کا دستور بڑی حد تک وہاں کے سیاسی، سماجی اور معاشی تصورات و حالات کا حامل و پرتو ہوتا ہے۔ پھر بھی بعض مسائل ایسے عالمگیر ہیں کہ وہ زمان و مکان سے بہت کم اثر انداز ہوتے ہیں۔ دنیا کے ہر ملک کو ان سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور ہر ملک نے اپنی صلاحیت اور ہمت کے مطابق ان کا حل تلاش کیا ہے۔ ایسی صورت میں عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ جو تجربات زیادہ سے زیادہ ملکوں کے لئے زیادہ سے زیادہ حالات میں مفید ثابت ہوچکے ہیں۔ انھیں اپنا لینا چاہیئے۔ جبھی تو دستور ساز کمیٹی نے خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدِرَ کے زریں اصول پر عمل کرتے ہوئے ہندوستان کو ایک وفاقی جمہوریہ قرار دیا ہے۔ جہاں پارلیمنٹری طرز پر (وزرا کے ذریعے سے) حکومت ہوگی۔

وفاقی خاکہ اور اس کے بیشتر تفصیلات کے لئے دستور ساز کمیٹی مروّجہ دستوروں کی مرہون منت ہے۔ لیکن اس کمیٹی نے عالی ہمتی سے کام لے کر ہندوستانی دستور میں چند ایسے ابواب بھی شامل کئے ہیں جو تاریخ دستور سازی میں ایک مستقل اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بنیادی حقوق اور حکومت کی پالیسی کے لئے ہدایتی اصول" نامی ابواب ایک انقلابی رجحان کا پتہ دیتے ہیں۔ جو ایسے ملک ہی میں پایا جاسکتا تھا جس نے جسمانی بندشوں کے ساتھ ساتھ ذہنی بندشیں بھی توڑ ڈالی ہوں۔ جسے اپنی نئی طاقت پر کامل اعتماد ہے۔ کیونکہ اس کا کلچر بہت قدیم ہے۔ اور اس نے مدت دراز تک اس وقت ساری دنیا کی رہبری کی ہے جب کہ مغرب کی موجودہ قومیں بربریت کے

چنگل سے رہا نہ ہوئی تھیں۔

اچھے دستور کے صفات سیاسیات کے ماہرین ایک اچھے دستور کے لئے چار صفات لازمی قرار دیتے ہیں۔ اول توضیح دوم جامعیت۔ سوم اختصار۔ چہارم لوچ اور لچک۔ ہندوستان کے موجودہ دستور میں توجیہ کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ جہاں بھی عبارت میں ابہام پیدا ہونے کا امکان ہوسکتا تھا وہاں باقاعدہ نوٹ دے کر مفہوم اور مطلب واضح کر دیا گیا ہے۔ یہ بات دنیا کے بہت کم دستوروں میں پائی جاتی ہے۔ اچھے دستور کی دوسری صفت بھی اس میں موجود ہے۔ یعنی یہ دستور جامع ہے۔ اس میں آٹھ ابواب۔ ۲۲ حصے اور ۳۹۵ دفعات ہیں۔ لیکن یہی خوبی تیسری صفت یعنی اختصار کے منافی ہے۔

مختصر دستور کی تعریف میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دستور جتنا مختصر ہوگا اتنی ہی اس میں ترمیم و تنسیخ کی گنجائش کم ہوگی۔ اور اسے پائیداری بھی حاصل ہوگی۔ رہی تفصیلات کی کمی تو اسے مجلس قانون ساز نئے قوانین سے پوری کرتی رہے گی لیکن مختصر دستور صرف ان ممالک کے لئے موزوں ہیں جہاں کے لوگ جمہوری طرز حکومت کے عادی ہوں جہاں عوام میں شہریت اور قومیت کا جذبہ بیدار ہو۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں عوام کی اکثریت مطلق جاہل ہے۔ اور صدیوں سے بادشاہوں۔ جاگیرداروں۔ زمینداروں اور سرمایہ داروں کے مظالم سے کچلی ہوئی ہے۔ یہ ضروری تھا کہ دستور اساسی عوام کے حقوق کی حفاظت کرے۔ اور حکومت اور رعایا کے تعلقات کو زیادہ سے زیادہ واضح کر دے تاکہ کسی فریق کو دوسرے پر زیادتی کرنے کا موقع نہ ملے۔ ایسی حالت میں اختصار مضر ثابت ہوتا نہ کہ مفید۔

ہندوستان کا موجودہ دستور لچکیلا بھی ہے۔ یعنی اس کی ترمیم آسانی سے ہوسکتی ہے۔ یہ مسئلہ بہت مدت تک سیاسی مفکرین کے زیر بحث رہا ہے کہ دستور کو سنگین (Rigid) ہونا چاہیئے۔ یا لچکیلا (Flexible) بعض کہتے ہیں دستور کو پتھر کی لکیر ہونا چاہیئے۔ اسے بچوں کا کھلونا نہ بننے دینا چاہیئے۔ کہ آئے دن بنتا اور ٹوٹتا رہے۔ لیکن اکثریت اس پر متفق ہے کہ دستور بدلنے والے قوم کے بہترین نمائندے اور رہبر ہوتے ہیں جب تک حالات کا شدید تقاضا یا کوئی اہم ضرورت نہ ہوگی۔ وہ دستور کو بدلنا چاہیں گے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ انھیں ترمیم کا اختیار حاصل ہو۔ ہند کے دستور میں اس مسئلے کا ایک نیا حل تلاش کیا گیا ہے۔ یعنی دفعات کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک تو وہ جن میں آسانی سے ترمیم ہوسکتی ہے۔ اور دوسرے وہ جن میں نسبتاً مشکل سے ترمیم ہوسکتی ہے۔ بیشتر دفعات کی ترمیم حسب ذیل طریقے سے عمل میں لائی جاسکتی ہے۔ مرکزی پارلیمنٹ کے کسی ایوان میں ترمیم کے لئے بل پیش کیا جا سکتا ہے جس کے لئے دونوں ایوانوں میں دو تہائی ووٹوں سے منظور ہونا ضروری ہے۔ اب اگر یہ دو تہائی ووٹ دونوں ایوانوں کے مجموعی ووٹوں میں اکثریت رکھتے ہیں تو ترمیم منظور ہو کر دستور کا ایک جزو بن جاتی ہے۔ لیکن بعض دفعات ایسے ہیں جن کے لئے صرف مرکز میں پاس ہونا کافی نہیں بلکہ ہر ریاست کی اسمبلی میں اسی طرح پاس ہونا ضروری ہے۔ ایسے دفعات حسب ذیل موضوعات سے متعلق ہیں۔

۱۔ مرکز اور ریاستوں کے قانون سازی کے اختیارات۔

۲۔ مرکز میں ریاستوں کی نمائندگی۔

۳۔ عدالتوں کے اختیارات۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستانی دستور میں اچھے دستور کے تین صفات یعنی توضیح۔ جامعیت اور لوچ موجود ہیں۔ رہا اختصار کا مسئلہ تو اس امر میں ہندوستان نے اپنے ضروریات سے مجبور ہوکر موجودہ معیار دستور سازی سے انحراف کیا ہے۔ گویا اس بات میں ہندوستان نے امریکی دستور کے اختصار کی پیروی نہیں کی بلکہ روسی دستور کی تفصیل کو حسن سمجھا ہے۔

مثالی پہلو اس دستور پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک مثالی اور ایک عملی۔ ظاہر ہے کہ مثال عمل کی محرک ہوتی ہے۔ لہٰذا آزادی ملنے کے قبل ہی دستور ساز اسمبلی نے ۲۲ر جنوری ۱۹۴۷ء کو پنڈت جواہرلال نہرو کی "تجویز مقاصد" پاس کی۔ اس تجویز میں واضح کر دیا گیا تھا کہ ہندوستان کی فرماں روائی یہاں کے عوام کے ہاتھوں میں ہے۔ نیز یہ کہ آزاد ہندوستان میں ہر فرد کو انصاف مساوات آزادیٔ مذہب اور آزادیٔ تحریر و تقریر کا حق ملے گا۔

عوام کی فرماں روائی اور رائے عامہ جمہوری حکومت کی بہترین

تعریف امریکی جمہوریت کے روحِ رواں ابراہم لنکن کے ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ وہ "حکومت عوام ۔ برائے عوام ۔ بذریعہ عوام" ہوتی ہے۔ ہندوستانی دستور کی تمہید مظہر ہے کہ یہ دستور ہند کے عوام نے اپنے آپ کو عطا کیا ہے ۔ لہذا حکومت عوام مسلّم ۔ دستور کے دو باب جو بنیادی حقوق اور حکومت کی پالیسی سے متعلق ہیں یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہندوستان میں حکومت برائے عوام ہوگی ۔ علاوہ بریں دستور نے ہر بالغ ہندوستانی کو ووٹ کا حق دے کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ حکومت بذریعہ عوام بھی ہوگی۔ اس لحاظ سے ہندی دستور ایک مثالی جمہوریت کی بنا ڈالتا ہے ۔

یوں تو روس کا دستور ببانگِ دہل اعلان کرتا ہے کہ روس کے محنت کش مزدور اور کسان وہاں کی طاقت کا سرچشمہ ہیں اور ہر اٹھارہ سال کے روسی کو ووٹ کا حق حاصل ہے۔ لیکن وہی دستور کسی سرمایہ دار ملال یا پجاری کو ووٹ کا حق نہیں دیتا ۔ اس کے مقابلے میں ہند میں آئرلینڈ کی طرح ہر اکیس سال کے مرد و عورت کو ووٹ کا حق حاصل ہے اس سلسلے میں یہ تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ فرانس۔ سوئزرلینڈ اور جنوبی افریقہ کی سی قدیم جمہوریتیں اور نو آبادیاں عورتوں کو ووٹ دینے کا اہل نہیں سمجھتیں ۔

اس دستور کے قبل ہندوستان میں ووٹر بننے کے لئے جائیداد ۔ آمدنی رتبہ خطاب اور تعلیم وغیرہ کی ایسی بندشیں لگی ہوئی تھیں کہ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کی رو سے صرف ۳ فی صدی اور ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی رو سے صرف دس فی صدی ہندوستانی ووٹ دے سکتے تھے ۔لیکن آج ہر بالغ ہندوستانی ووٹر ہے ۔ آج جہاں تک ووٹ دینے کا تعلق ہے۔ شاہ و گدا ۔ امیر و فقیر۔ عالم و عامی ۔ اعلیٰ و ادنیٰ سب کا فرق یک قلم مٹ گیا ہے ۔ آج محمود و ایاز ایک صف میں نظر آتے ہیں۔ صدیوں کا مظلوم کسان ہو یا اس کے سابق آقا زمیندار یا ساہوکار۔ مل مالک ہو یا مل مزدور سبھی یکساں طور پر ووٹ دینے کے اہل ہیں۔ اسی کو مساوات کہتے ہیں ۔

اس موقع پر جنوبی افریقہ کی حالتِ زار سامنے آجاتی ہے ۔ جہاں صرف یورپین قوم اور ان میں بھی صرف عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے ۔ اور نوّے فی صدی آبادی جو افریقی یا ایشیائی ہے ووٹ کے حق سے قطعی محروم ہے ۔

پنچایت کا احیاء

چونکہ ہندوستان کی نوّے فی صدی آبادی زراعت پیشہ ہے۔ لہذا اس عظیم الشان اکثریت کو سیاسی تعلیم دینے کے لئے ضروری تھا کہ اسے شروع ہی سے سیاسی اداروں کے چلانے کا تجربہ حاصل کرایا جائے ۔ اسی لئے نئے دستور میں پنچایتوں کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے ۔ اور ہندوستان کی آئندہ حکومت سے تاکید کی گئی ہے کہ وہ پنچایت کو مقامی حکومت کا ایک اہم عنصر بنالیں ۔

قدیم ہندوستان میں پنچایت معاشرے میں ایک اعلیٰ مرتبہ رکھتی تھی دراصل ہندوستان کی پنچایت اور یونان و روما کی شہری حکومتیں ہی موجودہ جمہوری نظام کی بانی ہیں۔ پرانی پنچایتیں اتنی با اختیار تھیں کہ وہی راجاؤں کا چناؤ کرتی تھیں ۔ اور مختلف پنچایتوں کے مجموعے ہی کا نام مملکت ۔ ریاست یا راج تھا ۔

بنیادی حقوق

ہر دستور میں شہریوں کے بنیادی حقوق کا تذکرہ اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ حکام جابرانہ رویہ نہ اختیار کر سکیں۔ ہندوستان کے علاوہ آئرلینڈ ۔ جرمنی اور روس کے دستوروں میں بھی شہریوں کے بنیادی حقوق گنائے گئے ہیں ۔ لیکن آئرلینڈ میں بہت کم حقوق کا تذکرہ ہے ۔ جرمنی میں مطلقیت کے عمل دخل کے بعد سے یہ حقوق بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں اور روسی دستور میں حقوق سے زائد فرائض کا تذکرہ ہے ۔ اس دستور کے مطابق روسیوں کو کام کرنے کا حق ہے۔ آرام کرنے کا حق ۔ بڑھاپے ۔ بیماری اور لاچاری میں امداد حاصل کرنے کا حق ہے ۔ مفت تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے ۔ آزادیٔ ضمیر حاصل ہے ۔ لیکن چرچ پر پابندیاں ہیں ۔ اور پادری ووٹ نہیں دے سکتے ۔ ہندوستانی دستور میں بنیادی حقوق چار قسم کے ہیں ۔ کچھ مساوات سے متعلق ہیں ۔ کچھ شخصی اور معاشی حقوق کا تذکرہ ہے ۔ کچھ مذہبی حقوق ملنے گئے ہیں۔ کچھ تعلیمی اور تمدنی حقوق گنائے گئے ہیں ۔ اور ان سب پر بالا عدالت عالیہ سے ان بنیادی حقوق کے منوانے کا حق ہے ۔

مساوات ۔ چھوت چھات کا خاتمہ

مساوات کے حقوق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کسی ہندوستانی کو مذہب ۔ قومیت ۔ نسل ، ورنگ یا جائے پیدائش کی بنا پر کسی حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا ۔ اس طرح چھوت چھات قانوناً ممنوع قرار

دے دی گئی اور ہندوستان نے ثابت کر دیا کہ محسنِ قوم مہاتما گاندھی کی تعلیمات اُس کے عقائد کا جزو بن گئے ہیں۔ چھوت چھات سے متعلق دفعہ میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ کسی شخص کو ذات پات، نسل و رنگ یا اور کسی ایسی بنا پر کسی دوکان، ہوٹل، یا عام تفریح گاہ میں داخل ہونے سے روکا نہیں جا سکتا۔ کسی شخص کو ایسے کنوئیں، تالاب، گھاٹ یا سڑک کے استعمال سے نہیں روکا جا سکتا جس کے بنوانے میں حکومت کا پیسہ لگا ہو۔ یا جو عامۃ الناس کے لئے وقف ہے۔ کاش دنیا کے وہ ممالک جو تہذیب کے علمبردار کہلاتے ہیں اس امر میں ہندوستان سے سبق لیں، اور یورپ، امریکہ اور افریقہ سے نسل و رنگ کا تعصب کافور ہو جائے۔

شخصی اور معاشی آزادی۔ اس کے علاوہ دستور میں ہر شخص کی ذاتی آزادی محفوظ ہے۔ جب تک کوئی فرد کسی قانون کی خلاف ورزی نہ کرے اُسے قید نہیں کیا جا سکتا۔ امریکہ کے برخلاف جہاں ریاستیں صرف اپنے شہریوں کے حقوق تسلیم کرتی ہے اور دوسری ریاست کے باشندوں کو اجنبی تصور کرتی ہیں، ہندوستان کی کسی ریاست کا کوئی باشندہ دوسری ریاست میں بھی یکساں حقوق رکھتا ہے۔ ہر شخص کو ہندوستان کے کسی گوشے میں کوئی پیشہ یا تجارت کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن بردہ فروشی، بیگار اور کارخانوں اور کانوں میں بچوں سے کام لینا ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔

مذہبی آزادی ہر شخص کو آزادی ہے کہ جو مذہب چاہے اختیار کرے۔ کوئی شخص کسی خاص مذہب کا پیرو ہونے کی وجہ سے حکومت کا کوئی عہدہ پانے سے روکا نہیں جا سکتا۔ مذہب والوں کو اپنے مذہبی اداروں کے انتظام کا حق ہوگا۔ سکھوں کو کرپان رکھنے کی اجازت ہوگی۔ حکومت کے اداروں میں یا جو ادارے حکومت سے امداد پاتے ہیں ان میں کسی شخص کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکے گا۔ حکومت کے تعلیمی اداروں سے مذہبی تعلیم و تبلیغ بالکل خارج کر دی گئی ہے۔

تعلیمی اور تمدنی حقوق۔ ہر شخص کو اپنی تعلیم حاصل کرنے اور اپنے تمدن کو برقرار رکھنے اور پھیلانے کا حق ہوگا اگر کوئی اقلیت اپنی زبان اور اپنا تمدن برقرار رکھنا چاہتی ہے تو حکومت اس پر کوئی دوسری زبان یا تمدن وارد نہیں کر سکتی۔ ہر اقلیت اس مقصد کے لئے اپنے تعلیمی اور تمدنی ادارے کھول سکتی ہے۔ کسی فرد کو مذہب، قومیت یا نسل و رنگ کی بنا پر حکومت کے کسی تعلیمی ادارے میں داخل ہونے سے روکا نہیں جا سکتا۔ بعض اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لئے جن میں قبائلی، جرائم پیشہ اور پسماندہ اقوام شامل ہیں۔ حکومت نے خاص افسران اقلیت مقرر کئے ہیں۔

اپیل کا حق ان حقوق کو حکومت کسی قانون سے معطل نہیں کر سکتی۔ بلکہ حکومت اگر بنیادی حقوق پر دست انداز ہوتی ہے تو شہری عدالت عالیہ سے اپیل کر کے اپنے حقوق منوا سکتا ہے۔ لہٰذا جب تک کہ یہ دستور نہ بدلا جائے اُس کے ان حقوق پر کوئی آنچ نہیں آ سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ مدنظر رہنا چاہیئے کہ دستور صدر کو اس کی اجازت دیتا ہے کہ کسی بہت نازک لمحے اور خاص حالت میں ایک آرڈیننس کے ذریعے سے ان حقوق کو باطل قرار دے دے۔

حکومت کی پالیسی کے لئے ہدایتی اصول۔ ہندوستانی دستور نے بنیادی حقوق پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے۔ بلکہ موجودہ اور آئندہ حکومتوں کے لئے چند اصول بنا دیئے ہیں۔ اس قسم کی کوئی چیز دنیا کے کسی دستور میں نہیں پائی جاتی۔ بات یہ ہے کہ دستور بننے کے بعد بھی لفظی الجھاوے۔ مطالب کے الٹ پھیر اور غلط فہمیوں کا امکان باقی رہتا ہے ایسی حالتوں میں مقنن تحریر کی نہیں بلکہ تحریر کی اسپرٹ اور روح کی پیروی کرتے ہیں۔ ہندوستانی دستور میں یہ باب دستور کی اسپرٹ کا مظہر ہے۔ یہ اصول کسی عدالت کے فیصلے سے منوائے نہیں جا سکتے پھر بھی موجودہ اور آئندہ حکومتیں حتی الامکان ان اصول کی پیروی کرتی رہیں گی۔ یہ اصول بتاتے ہیں کہ حکومت کو ایک ایسا معاشرہ بنانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ جس کے ہر ادارے میں سیاسی، سماجی اور معاشی انصاف کار فرما نظر آئے۔ اس سلسلے میں حکومت کو حسب ذیل امور خاص طور پر مدنظر رکھنا چاہئیں۔

۱۔ ہر مرد و عورت کو یکساں طور پر کسبِ معاش کا حق حاصل ہو۔ اگر عورت اور مرد برابر کا کام کریں تو برابر کی اجرت بھی پائیں۔

۲۔ قوم کی دولت حتی الامکان اس طرح تقسیم ہو کہ زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو فائدہ پہنچ سکے۔ دولت صرف چند آدمیوں میں اکٹھا نہ ہونا چاہیئے۔

۳۔ مزدوروں سے کوئی ایسا کام نہ لیا جائے جو ان کی طاقت اور بہت سے سال ان کی صحت کے لئے مضر ہو۔ مزدوری یکساں ملنا چاہیئے۔ بیماری، ضعیفی اور ناچاری میں مزدوروں کی امداد ہونا چاہیئے۔ بچوں اور ضعیفوں کو نامناسب کام نہ دیا جائے۔ اور بچوں اور نوجوانوں کے اخلاق کی حفاظت کی جائے۔

۴۔ دیہاتی پنچایتوں کو فروغ دیا جائے تاکہ وہ جلد از جلد لوکل گورنمنٹ کا ایک بااثر رکن بن کر کام کرنے لگیں۔

۵۔ حکومت کو کوشش کرنا چاہیئے کہ دس سال کی مدت میں چودہ برس تک بچوں کے لئے لازمی اور مفت تعلیم کا انتظام ہو جائے۔

۶۔ ہندوستان میں ایک یکساں قانون مالیات و تعزیرات ہو۔

۷۔ ہندوستان میں محکمۂ انصاف اور محکمۂ انتظام الگ الگ کر دیئے جائیں۔

۸۔ بین الاقوامی معاملات میں ہندوستان کو امن عالم کی تبلیغ کرنا چاہیئے مختلف ملکوں میں باعزت تعلقات بڑھانا چاہیئے۔ عالمی جھگڑوں کا فیصلہ جنگ کے عوض حکم کے ذریعے سے کرنا چاہیئے۔

یہ تھا ہندوستانی دستور کا مثالی حصہ۔ اس کے مطالعے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندوستان میں ایک غیر مذہبی حکومت کا قیام ہوگا۔ جو اپنے معاشی نظام میں سوشلزم سے نزدیک ہوتی چلی جائے گی۔ آیئے اب اس دستور کے دوسرے پہلوؤں پر نظر ڈالیں۔

وفاقی حکومت۔ ہندوستان کا نظامِ حکومت وفاقی ہے۔ گو اس کا نام وفاقِ ہند کے عوض انڈین یونین یا بھارت ہے۔

وفاقی حکومتیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جن میں مرکز ریاستوں کو کچھ اختیارات عطا کرتا ہے۔ اور بیشتر اپنے پاس رکھتا ہے۔ دوسرے وہ جن میں ریاستیں مرکز کو چند اختیارات سونپ دیتی ہیں اور بیشتر خود اپنے پاس رکھتی ہیں۔ ہندوستان کے دستور میں مرکز کی طاقت بہت زیادہ ہے مرکز ۹۷ موضوعات پر قانون بنا سکتا ہے، ریاستیں صرف ۶۶ موضوعات پر اس کے علاوہ ۴۷ موضوعات ایسے ہیں جن پر مرکز اور ریاست دونوں قانون بنا سکتے ہیں لیکن جہاں کہیں بھی ریاست اور مرکز کے قانون میں اختلاف ہوگا ریاست کا قانون باطل سمجھا جائے گا۔ اور مرکز کے قانون پر عمل درآمد ہوگا۔

اس کے علاوہ مرکز معمولی حالات میں بھی کسی ریاست کے لئے قانون بنا سکتا ہے۔ غیر معمولی حالات میں تو صدر آرڈیننس جاری کر سکتا ہے۔ ریاستی مجالس قانون ساز معطل ہو سکتی ہے۔ اور مرکزی پارلیمنٹ ریاستوں کے لئے قانون بنا سکتی ہے گویا ایسی حالتوں میں دستور نام کو وفاقی رہے گا لیکن حقیقت میں فرد یہ بن جائے گا۔

مرکز کو زیادہ اختیار دینا موجودہ جمہوریتیں اچھا نہیں خیال کرتیں۔ لیکن ہندوستانی حالات کا تقاضا ہے کہ مرکز میں زیادہ سے زیادہ طاقت ہونی چاہیئے تاکہ ملک کے ہر حصے میں یکساں طور پر ترقی ہو سکے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان کی صدیوں کی کمزوری کا سبب ایک واحد اور مضبوط مرکز کی کمی رہی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو انگریز تاجر سے تاجدار نہ بن جاتے۔ پھر آج کے ہندوستان میں افتراق کی قوتیں اپنا کام کر رہی ہیں۔ اگر مذہبی تعصب کو قابو میں کر لیا گیا ہے تو صوبہ جاتی تعصب کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا اور ہندوستان کسی حالت میں بھی اب اپنے مزید ٹکڑے نہیں ہونے دیگا۔

صدر۔ ہندوستان کا مرکز صدر، مجلس وزراء، پارلیمنٹ اور محکمۂ عدل پر مشتمل ہوگا۔ آجکل دنیا میں تین قسم کے حاکم اعلیٰ پائے جاتے ہیں۔ شاہ۔ صدر، اور آمر (ڈکٹیٹر) ہندوستان جب تک انگریزی شہنشاہی کا ایک مقبوضہ یا نوآبادی تھا یہاں کا حاکمِ اعلیٰ وائسرائے یا گورنر جنرل ہوا کرتا تھا۔ اب ۲۶ جنوری سنہ ۱۹۵۰ء سے یہاں کا حاکم اعلیٰ صدر کے لقب سے پکارا جائے گا۔ ہندوستان کے صدر کو مرکزی پارلیمنٹ اور تمام ریاستی مجالس قانون ساز مل کر انتخاب کریں گی۔

بیشتر جمہوریتوں کی طرح ہندوستان کا صدر بھی رسمی حاکم ہوگا۔ اصلی حاکم مجلس وزراء ہوگی جس کے مشورے سے وہ حکومت کرے گا۔ لیکن حکومت کا ہر کام صدر کے نام سے کیا جائے گا۔ صدر بری۔ بحری اور ہوائی طاقتوں کا سپہ سالار اعظم اور پانچ سال کے لئے منتخب ہوگا۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فرانس۔ جرمنی اور چیکوسلواکیہ کے صدر سات سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں اور امریکہ اور آئرلینڈ کے صدر صرف چار سال کے لئے۔ تو یہ خیال گزرتا ہے کہ ہندی دستور میں ایک بین بین راہ نکالی گئی ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ انگریزی وائسرائے اور گورنر جنرل بھی اسی مدت کے لئے مقرر ہوتے تھے۔

انگریزی عہد کا ایک اور اثر اب بھی صدر کے اختیارات میں نظر آتا ہے ۔ صدر خاص خاص حالتوں میں آرڈیننس جاری کر سکتا ہے ، ریاستوں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے ۔ اور بنیادی حقوق معطل کر سکتا ہے ۔ آخری حق جرمنی کے صدر کو بھی حاصل ہے ۔

اس سے ظاہر ہوا کہ ہندوستان کا صدر نہ تو امریکہ کے صدر کی طرح بہت زیادہ اختیارات کا حامل ہے اور نہ سوئٹزرلینڈ کے صدر کی طرح محض کابینہ کی صدارت کا حق رکھتا ہے ۔ پھر بھی دستور میں واضح کر دیا گیا ہے کہ ہندوستان پارلیمنٹری طرز حکومت کا پابند رہے گا ۔ اور صدر کو وہی حیثیت حاصل ہو گی جو انگلستان کے بادشاہ کو حاصل ہے ۔

ہندوستانی صدر کو معزول بھی کیا جا سکتا ہے ۔ اگر مرکزی پارلیمنٹ کی ⅔ اکثریت اس پر متفق ہو جائے کہ صدر نے دستور کی خلاف ورزی کی ہے ۔ تو صدر معزول سمجھا جائے گا اور دوسرے صدر کا انتخاب عمل میں آئے گا ۔

نائب صدر — صدر کی ناگہانی موت یا اُس کے معزول ہونے اور نئے صدر کے منتخب ہونے کے درمیانی زمانے میں نائب صدر صدارت کے فرائض انجام دے گا ۔ اور صدر کے اختیارات کا مالک ہو گا ۔ معمولی حالات میں وہ کونسل آف اسٹیٹ کا صدر ہو گا ۔ نائب صدر کا عہدہ امریکہ میں بھی پایا جاتا ہے ۔ چنانچہ امریکہ کے موجودہ صدر مسٹر ٹرومین مسٹر روزولٹ کے نائب صدر تھے ۔ اور اُن کے انتقال کے بعد صدر ہو گئے ۔

مجلس وزراء — صدر وزیر اعظم اور وزیر اعظم کے مشورے سے دوسرے وزراء کو مقرر کرے گا ۔ مجلس وزراء مجموعی طور پر پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ ہو گی ۔ اگر پارلیمنٹ نے وزارت پر عدم اعتماد کا اظہار کیا ۔ تو صدر وزارت سے استعفیٰ طلب کرے گا ۔

پارلیمنٹ — میں دو ایوان ہوں گے ۔ دو ایوانوں کی ضرورت کا مسئلہ بھی متنازع فیہ رہ چکا ہے ۔ جب امریکہ میں پہلے پہل وفاق قائم ہوا تو جیفرسن نے دوسرے ایوان کی تجویز پر اعتراض کیا کہ اس کی کیا ضرورت ہے ۔ واشنگٹن نے جو دو ایوانوں کا حامی تھا اس سے دریافت کیا کہ "آپ کافی کو تشتری میں کیوں انڈیلتے ہیں ؟" "ٹھنڈا کرنے کے لئے" جیفرسن نے جواب دیا ۔ "اسی طرح ہم قوانین کو سینیٹ (دوسرے ایوان) کی تشتری میں انڈیلتے ہیں" واشنگٹن نے سمجھایا "تاکہ ان میں ٹھنڈک آ سکے" ۔ ہند کی دستور ساز کمیٹی بھی وقتی جوش کی گرمی اور جلد بازی کے عواقب سے آگاہ تھی ۔ جب ہی اس نے دوسرا ایوان بھی مہیا کر دیا ہے ۔ تاکہ وہاں ٹھنڈے دل اور دماغ ہر قانون پر دوبارہ غور کر کے دیکھیں کہ وہ ملک کے لئے مضر تو نہیں ہے ۔

پارلیمنٹ کے پہلے ایوان کا نام دارالعوام ہے ۔ اس میں زیادہ سے زیادہ پانچسو ممبر ہوں گے ۔ جو سارے ہند سے بلا واسطہ چُنے جائیں گے ۔ اس ضمن میں یہ کوشش کی جائے گی کہ ہر ممبر کم از کم پانچ لاکھ یا زیادہ سے زیادہ سات لاکھ آدمیوں کا نمائندہ ہو ۔ (ریاستوں میں اسمبلی کا ہر ممبر پچھتر ہزار آدمیوں کا نمائندہ ہو گا ۔) ہندوستان کی آبادی اور یہاں کے حالات دیکھتے ہوئے یہ تناسب غیر مناسب نہیں کیونکہ امریکہ میں مرکزی دارالعوام کا ہر ممبر کوئی پونے تین لاکھ آدمیوں کا نمائندہ ہوتا ہے ۔

دوسرے ایوان کا نام کونسل آف اسٹیٹ ہو گا ۔ اس میں ۲۵۰ ممبر ہوں گے اور انتخاب بالواسطہ ہو گا ۔ یعنی اس کے ممبروں کو عام پبلک نہیں چُنے گی ۔ بلکہ ریاستوں کی مجالس قانون ساز کے ممبر چنیں گے ۔ ۲۵۰ میں سے بارہ ممبر صدر کے نامزد کردہ ہوں گے ۔ یہ نامزد کردہ ممبر علم و ادب ، سائنس ، فنون لطیفہ اور سماجی خدمت کے ماہرین ہوں گے ۔ آئرلینڈ کے دارالعوام میں ہر یونیورسٹی سے تین ممبر بھیجے جاتے ہیں ۔ لیکن وہ ممبر منتخب ہوتے ہیں نہ کہ نامزد ۔

دارالعوام کے ممبر کی عمر کم از کم پچیس برس ہونی چاہیئے ۔ اور کونسل کا ممبر کم از کم تیس برس کا ہونا چاہیئے ۔ اس کے علاوہ ملکیت ، اراضی یا تعلیم کی کوئی قید نہیں ۔ ہر ووٹر کسی ایوان کا ممبر ہو سکتا ہے ۔

دونوں ایوان قانون بنانے کے لئے پہل کر سکتے ہیں لیکن مالیاتی بل کی تحریک صرف دارالعوام میں ہو سکتی ہے ۔ دارالعوام کو اختیار ہے کہ وہ کونسل کی ترمیمات قبول یا مسترد کر دے ۔ اگر دارالعوام ایک بل کو دوبارہ پاس کر دے تو یہ سمجھا جائے گا کہ وہ بل کونسل نے بھی پاس کر دیا ہے ۔ اور پھر وہ بل صدر کے پاس دستخط کے لئے بھیج دیا جائے گا ۔ اگر صدر کوئی بل واپس کر دے تو دونوں ایوان اس پر غور کریں گے لیکن اگر پھر دونوں ایوانوں نے یہ بل پاس کر دیا تو صدر کو دستخط کرنا لازمی ہو جاتا ہے ۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کا صدر انگلستان کے بادشاہ کی سی حیثیت رکھتا ہے ۔ اور یہاں کی کونسل کو بھی تقریباً اتنے ہی اختیارات حاصل ہیں جتنے کہ ۱۹۱۱ء کے بعد انگلستان کے دارالامراء کو حاصل ہیں ۔ یعنی دونوں محض قوانین

پر نظر ثانی کرنے کے مجاز ہیں۔

محکمۂ انصاف

کسی وفاقی حکومت میں مرکزی محکمۂ انصاف کو بڑے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ امریکہ میں محکمۂ انصاف محکمۂ انتظام اور مجلس قانون ساز سے بالکل الگ حیثیت رکھتا ہے اور اس کے اختیارات پر کوئی پابندی نہیں۔ وہ اگر قانون کو غیر دستوری قرار دے دے تو امریکہ کی مجلس قانون ساز کو قانون بدلنا پڑے گا۔ اسی طرز پر ہندوستان میں بھی ایک عدالت عالیہ (سپریم کورٹ) ہوگی جس میں ایک چیف جسٹس اور کئی جج ہوں گے۔ چیف جسٹس کو صدر منتخب کرے گا۔ اور اس کے مشورے سے دوسرے جج مقرر ہوں گے۔ یہ جج ۶۵ برس کی عمر تک کام کریں گے ان کو بدلنا یا معزول کرنا آسان کام نہ ہوگا۔ کیونکہ جب دونوں ایوانوں کی اکثریت اور ووٹ دینے والوں کی ⅔ تعداد اس پر متفق ہوگی کہ کسی جج نے نااہلی یا نامناسب طرز عمل کا ثبوت دیا ہے اور صدر سے اس جج کو ہٹانے کی درخواست کرے گی تب کہیں جاکر صدر کسی جج کو برطرف کر سکتا ہے۔

عدالت عالیہ کے تین خاص کام ہوں گے۔

(۱) حکومت ہند اور ہندی ریاستوں کے درمیان تصفیہ کرنا

(۲) ہندی ریاستوں کے مابین مقدموں کا فیصلہ کرنا۔

(۳) ریاستوں کی عدالت عالیہ کی اپیل سننا۔ جب کہ کسی امر میں دستور کی وضاحت ضروری ہو۔

ہندوستانی دستور کی اہمیت

ہندوستان کی آبادی دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہے۔ لہذا اگر ہندوستان کے عوام آزاد، خوش حال اور امن پسند رہتے ہیں تو دنیا کی ⅕ آبادی کو آسائش و فراغت نصیب ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ہندوستان کے عوام مجبور و بدحال و رنجور رہتے ہیں تو دنیا کی ⅕ آبادی بے چین و بے کیف رہتی ہے۔ اس لئے ہندوستان کا دستور نہ صرف ہندوستان کے لئے بلکہ ساری دنیا کے لئے نہایت اہم ہے۔ کیونکہ امریکہ یا روس یا برطانیہ نہیں بلکہ ہندوستان کا دستور دنیا کے سب سے زیادہ آدمیوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستان کے جغرافیائی جائے وقوع کو جو مجازی اہمیت ہے وہ سب پر آشکار ہے۔ مزید براں اب ہندوستان کے علاوہ ایشیا میں کوئی بڑا ملک روس کے اثر کے باہر نہیں۔ لہذا دنیا کی ساری غیر کمیونسٹ قوموں کی نگاہیں اب ہندوستان کے دستور اور اس کے نظام حکومت پر لگی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستانی دستور حسب ذیل وجوہ کی بنا پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔

۱۔ ہندوستان ایک آزاد جمہوریہ بھی ہے اور دول مشترکہ کا ممبر بھی۔ تقریباً ایسی ہی حیثیت آئرلینڈ کی بھی ہے جو خودمختاری کا اعلان کرتا ہے لیکن جسے برطانیہ دول مشترکہ کا ممبر سمجھنے پر مُصِر ہے۔

۲۔ ہندوستان کا دستور دنیا کے تمام دستوروں سے زیادہ طویل ہے اور اس دستور میں بنیادی حقوق اور حکومت کی پالیسی کے اصول کی شمولیت نے آئندہ دستور سازوں کے لئے ایک نئی راہ کھول دی ہے۔

۳۔ ہندوستان کا دستور وفاقی دستوروں میں ایک مطلق مضبوط مرکز کی پہلی مثال پیش کرتا ہے۔ گویا اس امر میں یہ سوئٹزرلینڈ کے دستور کے بالکل برعکس ہے۔ جہاں ریاستیں (Cantons) ہی حاکم اول ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کا دستور وفاقی (Federal) کے ذریعہ (Unitary) بن جانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

۴۔ ہندوستان کا دستور نسل و رنگ کے اختلافات پر ایک کاری ضرب لگاتا ہے۔ اور عورت کی عظمت کا معترف ہے۔ (دنیا میں پہلے پہل ہندوستان ہی نے عورت کو وزارت، گورنری اور سفارت کے عہدوں پر مقرر کیا)۔

۵۔ مجموعی طور پر ہندوستان کا دستور ایک قابل قدر تحریر ہے جس میں آزادی اور مساوات کی اسپرٹ موجود ہے۔

لیکن دستور صرف بے جان حروف کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اس میں معنیٰ اور روح پھونکنے والے وہ افراد ہوتے ہیں جو اسے عمل میں لاتے ہیں۔ قانونی طور پر دستور میں کچھ بھی لکھا ہو ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ حقیقت میں ہندوستان کا نظام کیا بن جاتا ہے۔ دستور ساز کمیٹی کے صدر ڈاکٹر امبیدکر کا دعویٰ ہے "اگر نئے دستور کے تحت حالات بگڑ جائیں تو اس کا سبب یہ نہ ہوگا کہ ہمارا دستور خراب ہے بلکہ ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ انسان ہی خراب ہیں" ڈاکٹر امبیدکر کا یہ ارشاد ہندوستان کے عوام کو ایک چیلنج ہے۔ اگر کسی ملک میں جہالت، بے انصافی اور بدنظمی کا دور دورہ ہوگا تو اچھے سے اچھا دستور اسے تباہی اور ہلاکت سے بچا نہیں سکتا لیکن اگر کسی ملک کے عوام کے دل میں قوم و وطن کی بہبودی کی سچی لگن ہو اور وہ سمجھداری، ایثار، انصاف اور تنظیم سے کام کریں تو اس ملک کا مستقبل یقینی درخشاں ہوگا۔

دستور ساز کمیٹی اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو کر دنیا کے سامنے سرخ رو ہو چکی اب ہمارا آپ کا امتحان ہے۔

غلام احمد فرقت

انڈین یونین کی اقلیتیں

اس وقت دنیا میں شاید ہی کوئی ملک یا ریاست ایسی ہوگی جہاں اقلیتیں نہ ہوں۔ جہاں کے تمام باشندوں کا مذہب اور زبان ایک ہو۔ جہاں ملک کے سارے باشندوں کے رسم و رواج اور مجلسی آداب یکساں ہوں۔ انسانی تہذیب و تمدن، لباس اور معاشرت زبان اور عقائد جغرافیائی حالات سے ہمیشہ سے متاثر ہوئے ہیں۔ اور ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ ایک انگریز مفکر کا کہنا ہے کہ ہر پچاس میل کے رہنے والوں کے درمیان اور رسم و رواج میں کچھ نہ کچھ فرق ہو ہی جاتا ہے۔ لہٰذا ہندوستان کے سے وسیع برّ اعظم کے رہنے والوں میں بھی قومیت، زبان اور عقائد میں اختلافات ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔

جہاں تک قومیت اور قومی نظریات کا تعلق ہے اب تک دنیا نے دو نظریوں پر عمل کیا ہے، جب تک سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ دنیا خارجی نظریئے یعنی (Objective Theory) کی قائل تھی۔ اس نظریئے کے مطابق قوم انسانوں کے اس گروہ کو کہہ سکتے ہیں۔ جو نسل، زبان اور مذہب کے اعتبار سے ایک ہوں اور ایک ہی ملک میں رہتے ہوں۔ لیکن بیسویں صدی کے مہذب دور میں یہ نظریہ خود بخود باطل ہو گیا۔ کیونکہ اس ترقی یافتہ دور میں نسلوں کے خلط ملط کے باعث دنیا میں کوئی ملک بھی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اُس کے تمام باشندے ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے تمام افراد کے لئے ایک ہی زبان بولنا بھی ضروری نہیں۔ کیونکہ اس وقت دنیا میں شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جہاں کے تمام رہنے والوں کی زبان ایک ہو۔ اس کے علاوہ چونکہ اس مہذب دور میں انسان کے اخلاق و عادات، کردار اور مذہب پر علم کی صیقل ہو چکی ہے۔ اس لئے وہ بڑی حد تک مذہبی تعصبات اور تنگ نظری سے بالاتر ہو کر اپنے گرد و پیش دیکھنے کا عادی بن چکا ہے۔ ایسی صورت میں ایک سے زیادہ مذہب سے بھی انسانی برادری کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔ اور اس کے طرزِ معاشرت میں فرق نہیں پیدا ہوتا۔ اس کے ماسوا دَورِ حاضر کے سائنس نے چونکہ فاصلے کی دشواریوں کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ اس لئے ایک ہی قوم اور نسل کے لوگ دنیا کی مختلف ریاستوں اور حکومتوں کے مستقل شہری بن گئے ہیں۔ مثلاً عیسائی، مسلمان۔ یہودی، پارسی بودھ۔ آج دنیا میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خارجی نظریہ اب خود بخود غلط ثابت ہو گیا۔

دوسرا نظریہ جسے آج دنیا تسلیم کئے ہوئے ہے، داخلی نظریہ یا (Subject Theory) ہے، اور جس کے مطابق قوم کے لئے کسی ظاہری نشان کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اُس کا تعلق براہِ راست لوگوں کے خیالات، جذبات، احساسات سے ہوتا ہے۔ مذہب، زبان اور نسل کے اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی اگر انسانوں کے کسی گروہ، کسی جماعت یا کسی فرقے کے خیالات اور احساسات ایک سے ہوں۔ اُن میں باہمی تعاون کا جذبہ ہو۔ اُن کا مطمحِ نظر ایک ہو تو اُس گروہ کو ایک قوم کہہ سکتے ہیں۔ اس نظریئے کے مطابق قوم بنانے سے نہیں بنتی۔ بلکہ ان کے فطری رجحانات اُن کو ایک لڑی میں پرو دیتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ وہ تمام انسان ایک قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

انڈین یونین میں اس وقت پانچ گروہ ہیں، جن کا شمار اقلیتوں میں ہے مسلمان سکھ۔ عیسائی۔ پارسی اور اینگلو انڈین، ان میں

ابتدائی تین کی حیثیت مذہبی ہے۔ چوتھی میں مذہب کے ساتھ ساتھ نسل بھی شامل ہے۔ صرف پانچویں اقلیت اینگلو انڈین نسل، مذہب اور زبان تینوں خصوصیتوں کی حامل ہے۔

برطانوی حکومت کے قیام سے سیکڑوں سال قبل ان میں سے بیشتر اقلیتیں ہمارے دیس میں رہتی آئی ہیں۔ مگر برطانوی حکومت سے پہلے چونکہ ملک فرقہ وارانہ فسادات سے پاک تھا۔ اس لئے دیش کے رہنے والوں میں کبھی اقلیت اور اکثریت کا احساس ہی نہ پیدا ہوسکا۔

آٹھ سو برس تک ہندوستان پر مسلمانوں نے حکمرانی کی۔ مگر وہ یہاں کی تہذیب، یہاں کے ماحول اور یہاں کے باشندوں کے طرز معاشرت سے متاثر ہوکر ان میں گھل مل گئے۔ اس لئے مسلمانوں اور یہاں کے باشندوں میں کوئی تفریق باقی نہیں رہی۔ ان کے گھل مل جانے کی وجہ یہ تھی کہ ان کی کچھ باتیں یہاں والوں نے قبول کیں اور کچھ یہاں کے ماحول نے ان کی تہذیب پر اثر کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ مذہب کے نام پر عوام کے مختلف فرقوں میں باہمی ناچاقی اور بدمزگی پیدا ہوئی اور نہ انھوں نے یہاں کے باشندوں میں غلامی یا کمتری کا احساس پیدا ہونے دیا۔ مذہب اور زبان کبھی ایک دوسرے کے درمیان نفرت اور حقارت کا سبب نہیں بنے اور نہ اُن کو بننے کا موقع دیا گیا۔ بغاوتیں اور لڑائیاں مسلمانوں کے دورِ حکومت میں بھی ہوئیں۔ مگر ان لڑائیوں نے مذہبی فسادات کی شکل کبھی بھی اختیار نہیں کی۔ جو لڑائیاں ہوتی تھیں وہ راجاؤں راجاؤں میں۔ جاگیرداروں جاگیرداروں میں۔ نہ کہ ہندو اور مسلمانوں میں۔ اگر کسی مسلمان فرمانروا نے کسی ہندو راجہ پر حملہ کیا اور میدانِ کارزار گرم ہوا تو فریقین کے لشکر میں ہندو اور مسلمان دونوں فریقوں کے سپاہی ہوتے تھے۔ جو اپنی اپنی ریاست اور اُس کے حکمراں کی عزت کے لئے اپنا خون پانی ایک کر دیتے تھے۔ ہندوستان کی دَورِ مغل کی تاریخ ان واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اُن کو اس کی پرواہ نہ ہوتی تھی کہ ان کے عقائد کیا ہیں وہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ وجہ یہ تھی کہ راعی اور رعایا ایک دوسرے کے مذہبی، سماجی اور معاشرتی رسم و رواج کا پاس و لحاظ رکھتے تھے۔ اور ہر شخص کو مذہبی اور معاشرتی آزادی حاصل تھی۔ ہندوستان میں گروہ بندی اور مذہبی اختلافات پیدا کرانے کا ذمہ دار برطانوی دورِ حکومت تھا۔ برطانوی راج کے قیام کے بعد بھی ایک مدّت تک یہ میل جول، اتحاد و اتفاق کا جذبہ دیس کے رہنے والوں میں اُس وقت تک قائم رہا جب تک کہ انگریز ہندوستانیوں کی مذہبی ذہنیت سے پورے طور پر واقف نہیں ہو لیا۔ درحقیقت یہ احساس اس کو ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگِ آزادی کے بعد ہی پیدا ہوا۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء میں سب سے پہلے جب ایک مسلمان شہزادے کے جھنڈے کے لئے ہمارے دیس باسیوں نے برطانوی حکومت کے خلاف علم جنگ بلند کیا تو اس جنگ میں شریک ہونے والوں میں ہر ایک گروہ اور ہر طبقے کے لوگ شامل تھے جو دیس کی آزادی کو اپنی آزادی سمجھتے تھے۔ چنانچہ اگر ایک طرف جھانسی کی رانی لکشمی بائی اور نانا صاحب پیش پیش تھے تو دوسری طرف مسلمان علماء اور اکابر بھی برطانوی سنگینوں کے سامنے اپنے سینے تانے کھڑے تھے۔ اس پہلی جنگ میں شکست کے بعد جب دیس کے سورماؤں کو آزادیٔ وطن کے "جرم" میں تختۂ دار پر کھینچا گیا تو اُن مجاہدین میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ مگر اس جنگِ آزادی نے انگریزوں کے دلوں میں یہ احساس بھی پیدا کردیا کہ اگر ہندوستان کے رہنے والوں میں ایسا ہی اتحاد و اتفاق برقرار رہا تو ان کے قدم ہندوستان میں زیادہ مُدّت تک جم نہ سکیں گے۔ چنانچہ میل ملاپ کی اس شیرینی میں تلخی پیدا کرنے کے لئے انگریز نے اپنی پالیسی کا رُخ ہی بدل دیا۔ اور اس کے بعد جو پالیسی اختیار کی وہ درحقیقت دیسی ریاستوں کے لئے توپ و تفنگ سے کہیں زیادہ قاتل اور زہریلی تھی چنانچہ خفیہ طریقے پر ہندوستان کے رہنے والوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ ہندوستان کے نام نہاد پنڈتوں اور مصنوعی مولویوں کے ضمیروں کو روپیوں اور خطابوں کے ذریعے سے خرید خرید کر ملک کو مذہبی جنگ اور فرقہ پرستی کا میدان بنا دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ سنکھ اور اذان، باجہ اور مسجد۔ تعزیہ اور

چھپل کی آڑ میں مذہبی جذبات برانگیختہ کرکے جو آگ لگائی گئی وہ ۱۸۵۷ء کے بعد کی پیداوار ہے جس میں سیکڑوں اور ہزاروں بے گناہ انسان موت کے گھاٹ اتر گئے۔ ملک کے ان دو بڑے فرقوں کے مابین مذہبی اختلافات پیدا کرنے کے بعد دونوں کے اندر آپس کے فروعی اختلافات کو شدت دیکر مخالف جماعتیں اور گروہ پیدا کر دئے گئے۔ چنانچہ اچھوتوں اور ہندوؤں میں اختلاف ہشیعہ سنیوں میں اختلاف حنفیوں اور وہابیوں میں اختلاف برطانوی دور ہی کی پیداوار ہیں۔ ورنہ فروعی اختلافات کس قوم اور کس مذہب میں کیا نہیں تھے۔ مگر انھوں نے برطانوی دور سے پہلے تصادم اور خونریزی کی شکل کبھی نہیں اختیار کی تھی۔

۱۸۸۵ء کا سال بھی ہندوستان کی تاریخ میں ایک مبارک سال سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس سال انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی۔ اس کے قیام میں چونکہ مسٹر ہیوم۔ ویڈربرن۔ ہنری کاٹن ریمزے میکڈانلڈ کے سے انگریزوں کا ہاتھ تھا۔ اس لئے اس کا مقصد ہندوستانیوں میں محض سلف گورنمنٹ حاصل کرنے کے جذبے کو بیدار کرنا تھا۔ مگر بعد کو جب اس میں مسٹر گوکھلے۔ دادا بھائی نوروجی اور فیروزشاہ مہتہ جیسے "سرپھرے" بھی شامل ہو گئے اور لوکل سیلف گورنمنٹ کے جذبے نے آزادئ وطن کے جذبے کی "بھیانک" شکل اختیار کرلی تو اس کے بانی اپنے رفقار کے ساتھ رفتہ رفتہ اس سے کنارہ کش ہوکر اس سے بے رخی برتنے لگے۔ بعد میں اس بیرخی نے اچھی خاصی دشمنی کی شکل اختیار کرلی۔

اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی

۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد چونکہ انگریز ہندوستانیوں کے مزاج اور یہاں کے عوام کی ذہنیتوں سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ اس لئے اس نے اس قومی جماعت کو فرقہ وارانہ شکل دیکر چند مسلمان خطاب یافتوں اور جی حضوری قسم کے لوگوں سے انڈین نیشنل کانگریس کو ہندو جماعت مشہور کرکے مسلمانوں کو اس میں شامل ہونے سے روکنا شروع کیا۔ مگر جب اس کے بعد بھی اسکو اپنی دال گلتی نظر نہ آئی تو اس نے اس کے مقابلے میں فرقہ وارانہ اصول پر ایک جماعت مسلم لیگ کے نام سے کھڑی کرادی۔ اس جماعت کے باقاعدہ قیام میں آنے سے قبل ۱۸۸۹ء میں جب برطانوی پارلیمنٹ میں چارلس بریڈلا نے ہندوستان میں جمہوری نظام قائم کرنے کے لئے ایک قرارداد پیش کی تو مسٹر بیک نے ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے اس قرارداد کی مخالفت میں ایک تجویز بھیجی جس میں اس بات پر زور دیا کہ "ہندوستان میں جمہوری طرز حکومت ناقابل عمل ہے۔ کیونکہ یہاں ایک قوم نہیں۔"

دوسری طرف کانگریس کے اندر بھی جھگڑے چل رہے تھے۔ اسمیں دو جماعتیں تھیں۔ ایک آئین پسند جماعت، دوسری انتہا پسند۔ آئین پسندوں میں دادا بھائی نوروجی۔ مسٹر گوکھلے اور فیروزشاہ مہتہ تھے۔ جو آئینی حدود میں رہ کر ذمہ دار حکومت حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ انتہا پسندوں میں لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک۔ لالہ لاجپت رائے اور بپن چندر پال کے سے لوگ تھے۔ جو اپنی آئینی کارروائیوں کو ایک فضول چیز سمجھتے تھے۔ ان جماعتوں کے علاوہ بنگال میں ایک تیسری جماعت نوجوان بنگالیوں کی تھی۔ جو آزادئ وطن کے نشے میں اس درجہ سرشار تھے کہ انھوں نے برطانوی حکام کا قتل اور دہشت پسندی اپنا نصب العین بنا لیا تھا۔ بھگت سنگھ اشفاق اللہ خاں شہید۔ رام پرشاد اور آزاد۔ بعد میں اسی پارٹی کے رکن تھے۔ جن کو آزادئ وطن کے جرم میں پھانسیاں دی گئیں۔ یا گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء میں جب کانگریس کا اجلاس کلکتے میں ہوا اُس وقت کانگریس پر انتہا پسندوں کا قبضہ تھا۔ اس اجلاس میں کانگریس کے دونوں بازوؤں میں اختلافات اس منزل پر پہونچ گئے تھے کہ اگر دادا بھائی نوروجی بیچ میں پڑکر معاملات نہ سدھار دیتے تو کانگریس اسی وقت ختم ہو جاتی۔ اس اجلاس میں کانگریس نے جو تجاویز پاس کیں۔ اُن میں ایک تجویز ہندوستان میں برطانوی مال کے بائیکاٹ کی تھی۔ اور دوسری سودیشی اشیاء کو فروغ دینے کی۔ یہ پہلا سیاسی حربہ تھا، جسے محبان وطن نے برطانوی حکومت کے خلاف استعمال کیا۔ مگر اس اجلاس کے بعد دوسرے سال جب ۱۹۰۷ء میں کانگریس کا دوسرا

اجلاس سورت میں منعقد ہوا تو پچھلے اجلاس میں برطانوی مال کے بائیکاٹ کی تجویز کو اکثریت کی رائے سے واپس لے لیا گیا۔ اور کانگریس کی رکنیت کے قوانین میں آئین پسندوں نے ایسی ترمیمات پاس کرالیں کہ انتہا پسندوں کے لئے کانگریس کے دروازے بند ہوگئے۔ اسی کے ساتھ ساتھ آئین پسندوں نے درجۂ نوآبادیات کا حصول اپنا نصب العین قرار دیا۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ کانگریس کے آئین پسند لیڈروں کو حکومت کی بڑی حد تک تائید حاصل تھی۔ اوّل تو یہ وجہ تھی کہ حکومت انتہا پسندوں کے مقابلے میں انکو اپنی ڈھال بنانا چاہتی تھی۔ دوسرے اس آئینی جدوجہد میں حکومت کے لئے نال مٹول کرنے کے بہت سے مواقع تھے۔ اور تیسرے آئین پسند لیڈروں کے جو اثرات عوام پر تھے اُن سے اُس کو بالواسطہ عوام کو قابو میں رکھنے میں مدد مل رہی تھی اور ان سب سے بڑھ چڑھ کر اُن کو آپس میں الجھائے رکھا تھا۔ البتہ انتہا پسندوں کی طرف سے حکومت کو شدید خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ چنانچہ آئین پسندوں کو خوش کرنے کے لئے اس نے انتہا پسندوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ اس صورت سے ایک طرف تو عوام کے اُس طبقے میں جو انتہا پسندوں کا ہم خیال تھا آئین پسندوں کے خلاف جذبۂ منافرت بڑھ رہا تھا اور وہ سمجھ رہے تھے کہ آئین پسندوں کے اشارے پر انتہا پسندوں کی گرفتاریاں عمل میں آ رہی ہیں۔ دوسری طرف چونکہ انتہا پسندوں کے جیل میں ہونے کی وجہ سے آئین پسندوں کو کانگریس پر تسلط قائم ہونے میں مدد مل رہی تھی۔ اس لئے آئین پسندوں کا اعتماد بھی اس کو حاصل ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس تفرقہ انگیز پالیسی سے برطانوی سیاست داں ایک مدت تک ناجائز فائدہ اٹھاتے رہے۔ اس طرح انگریز اپنی دو دھاری تلوار سے محبانِ وطن کے ہر وار کی کاٹ کر رہا تھا۔

چنانچہ مسٹر تلک کو چھ سال کے لئے مانڈلے جلا وطن کر دیا گیا۔ لالہ لاجپت رائے کو بلا مقدمہ چلائے امریکہ چلتا کر دیا گیا۔ اور مسٹر پال کو چھ ماہ کی سزا دیدی گئی۔ اس کے بعد آئین پسند طبقے اور عوام کو مطمئن کرنے کے لئے مارلے منٹو اصلاحات نافذ کردیئے گئے، مگر چونکہ ان اصلاحات میں ہندوستانیوں کو کوئی اختیار نہیں دیا گیا تھا۔ اس لئے آئین پسند طبقہ بھی بعد میں ان اصلاحات کو غیر اطمینان بخش تصور کرنے لگا۔ انتہا پسند لیڈر چونکہ جیل میں تھے اس لئے ان اصلاحات سے ناخوش ہو کر دہشت پسندوں نے پستول اور بم چلانا شروع کر دیے۔ چنانچہ گورنر جنرل پر بم پھینکا گیا۔ اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ناسک کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

۱۹۱۳ء میں جب مسلم لیگ نے درجۂ نوآبادیات کو اپنا نصب العین قرار دیا تو چونکہ کانگریس کا آئین پسند طبقہ بھی اپنے اسی نصب العین کا اعلان کر چکا تھا۔ اس لئے یہ دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے قریب آگئیں۔ انگریز کو اگرچہ ان کا قریب آنا زیادہ پسند نہیں تھا۔ تاہم ابھی مذہبی اختلافات پیدا کرانے کے متعدد حربے اس کے ہاتھ میں باقی تھے۔

۱۹۱۶ء میں کانگریس کا ایک تاریخی اور ہنگامہ خیز اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں کانگریس کے دونوں طبقوں کے لیڈروں نے پوری تعداد میں شرکت کی۔ چنانچہ مہاتما جی۔ مسٹر تلک۔ پنڈت مدن موہن مالویہ۔ مسٹر جناح اور مسز اینی بسنٹ بھی اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ اسی زمانے میں مسلم لیگ کا اجلاس بھی منعقد ہوا۔ اور دونوں جماعتوں نے متحد ہو کر حکومت کے روبرو ایک مشترکہ تجویز پیش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو اور مسلمانوں کے مابین اس اتحاد سے ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں جان پڑگئی۔

پہلی جنگِ عظیم کے ختم ہونے کے بعد جب حکومتِ برطانیہ نے ہندوستانیوں سے جو وعدے کئے تھے اُن سے بے رُخی ظاہر کی تو ۶ر اپریل ۱۹۱۹ء کو مہاتما جی نے برت اور ہڑتال کا اعلان کیا۔ چنانچہ ملک کے طول و عرض میں عوام نے اس پر لبیک کہا اور اُس روز پورے ہندوستان میں کامل ہڑتال رہی۔ اس ہڑتال میں ہندو اور مسلمان سکھ اور عیسائی سب ہی شریک تھے۔ اسی روز دلی میں محبانِ وطن نے ایک جلوس نکالا جس میں پولیس اور اہلِ جلوس کے مابین تصادم کرا دیا گیا۔ اسی سلسلے میں امرتسر میں عوام نے مشتعل ہو کر دو برطانوی افسروں کو قتل کر دیا جس کے جواب میں جلیانوالہ باغ کا واقعۂ ہائلہ پیش آیا جس میں سینکڑوں ہندوستانی

جنرل ڈائر کی سفاکی کا شکار ہوگئے۔ اس کے بعد کی داستان ایک ایسی داستان ہے جس میں برطانوی حکومت نے مختلف عنوانات سے مسلمانوں کو کانگریس سے متنفر کرنے کی کوششیں کیں، اور ملک کے طول و عرض میں شدید فرقہ وارانہ فسادات کرائے۔ برطانوی ایجنٹوں کے ذریعے سے مسجدوں میں سوٗر اور مندروں میں گائیں کٹوا کر رکھوائی گئیں۔ مگر کانگریس نے تمام فرقوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے کی کوششیں جاری رکھیں اور اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے اُن کے مطالبات پر ہمدردی سے غور کیا۔ مثلاً پہلی جنگِ عظیم کے ختم ہونے پر جب سلطانِ ترکی کو دینی اور دنیوی خلیفہ ماننے کا سوال پیدا ہوا اور ہندوستانی مسلمان خلافت کے سوال پر اُٹھ کھڑے ہوئے تو باوجود اس کے کہ یہ مسئلہ خالص مسلمانوں کا تھا، گاندھی جی نے نہ صرف اُنھیں ستیہ گرہ اور عدم تشدد کا ہتھیار دیا بلکہ اس تحریک کے سب سے بڑے محرک بن گئے۔ چنانچہ اس تحریک کے سلسلے میں یہ ہتھیار بہت کامیاب ثابت ہوا۔

کانگریس چونکہ ہمیشہ سے ایک غیر فرقہ وارانہ اور قومی جماعت رہی ہے اور آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں ہر فرقے اور ہر طبقے کے لوگوں نے اس کا ہاتھ بٹایا ہے۔ اس لئے آزادی حاصل ہونے کے بعد آج بھی وہ اپنے مسلک پر قائم ہے۔ اور اپنے دامن کو مذہبی تعصبات سے بچائے ہوئے ہے۔ شروع سے اب تک اُس کے رہنما اس کا اعادہ کرتے رہے ہیں۔ کہ سیاست میں مذہب کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اُس نے اس بات کو بھی تسلیم کیا ہے اور قوم سے منوانے کی کوشش بھی کی ہے کہ جمہوری نظامِ حکومت کو مذہبی حکومت پر ہمیشہ سے فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو جب دوسو برس کی برطانوی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے اور ایک آگ اور خون کے سمندر کو عبور کرنے کے بعد کانگریسی رہنماؤں نے ملک کی زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو اُس نے ایک ایسی جمہوری حکومت ترتیب دی جس کی بنیاد عوام کی زبان، مذہب، نسل اور مفاد پر قائم ہے۔ اس کے ماسوا گذشتہ دوسو سال کی غلامی میں برطانیہ نے عوام کے مختلف طبقوں اور مذہبوں میں اختلافات پیدا کرنے کے جو نت نئے طریقے اختیار کئے تھے اُن سے ملک کو پاک کرکے فضا ہموار کرنے کے لئے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طریقوں سے کام لیا جا رہا ہے۔ کانگریسی زعماء کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ اقلیتوں کو یکجا اور ان میں اتحاد پیدا کرنے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ملک میں ایک ایسا جمہوری نظام قائم ہو جس کی بنیاد مخلوط انتخابات پر ہو جس میں ملک کے ہر رہنے والے کو بلاتخصیص مذہب و ملت اپنا پارٹ استعمال کرنے کا حق حاصل ہو تاکہ انتخابات کے بعد جو نمائندے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیں۔ انہیں اقلیت اور اکثریت دونوں گروہوں کے شہری حقوق محفوظ رہ سکیں۔ چنانچہ ہندوستان کے جدید مسودۂ قانون پر اگر آپ نظر ڈالیں گے تو آپ کو یہ چیز روزِ روشن کی طرح نظر آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ نظم و نسق کی ذمہ داری قبول کرتے ہی انھوں نے اعلان کیا کہ ہند یونین ایک ایسی مملکت ہے جس میں کسی گروہ یا فرقے کو خاص حقوقِ نیابت یا وافر رعایتیں نہیں ملیں گی۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو نے انڈین یونین کے پہلے وزیرِ اعظم کی حیثیت سے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ریڈیو سے ملک اور قوم کے سامنے جو تقریر کی اسمیں اقلیتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہم کسی مذہب سے تعلق نہیں رکھتے۔ ہم سب مادرِ وطن کے فرزند ہیں۔ ہم عملاً اور فعلاً تنگ دلی اور مذہبی جنون کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ کوئی قوم جس کے افراد تنگ دل یا کاہل ہوں بڑی نہیں بن سکتی۔"

اسی طرح نائب وزیرِ اعظم سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ۱۹۴۸ء میں بمبئی کارپوریشن کے پیش کردہ سپاسنامے کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"جب تک ہم برسرِ حکومت ہیں ہمیں حکومت کرنا ہے۔ اگر ہم تمام آبادی کے ساتھ بلالحاظ مذہب و ملت بطور ٹرسٹی کے ایسا نہیں کرسکے تو ہم اس جگہ کے قابل نہیں جہاں ہم اس وقت موجود ہیں۔"

ہند یونین کے وزیرِ اعظم اور نائب وزیرِ اعظم کے بیانات کی

روشنی میں اگر آپ آزاد ہندوستان کے دستور کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو دیس کے رہنماؤں کے قول اور فعل میں کوئی بُعد نظر نہیں آئیگا۔ چنانچہ اقلیتوں کی مذہبی، لسانی اور معاشرتی آزادی اور ان کے تحفظات کے سلسلے میں بھی آپ دیکھیں گے کہ اقلیتوں سے جو وعدے ہمارے رہنماؤں سے آزادی حاصل ہونے سے قبل کئے تھے ان کو کس طرح عملی جامہ پہنانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ سب سے پہلے آپ کو یہ دیکھنا ہوگا کہ حکومت کی ذمہ داری کے بعد جو عہدہ دار مقرر کئے گئے ہیں اُن میں اقلیتوں کی کس حد تک نمائندگی ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی کسی چھوٹی سے چھوٹی اقلیت کو شکایت کا موقع نہیں دیا گیا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انڈین یونین کی سب سے بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کے بارے میں جو غلط فہمیاں اور غلط اطلاعات بعض اخبارات میں آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں ان کو دُور کیا جائے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہی چیز قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان کے علاوہ دُنیا کا کوئی ایسا اسلامی ملک موجود نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی انڈین یونین میں بسنے والے مسلمانوں سے زیادہ ہو چنانچہ پاکستان بننے کے بعد انڈین یونین میں چار کروڑ بیس لاکھ مسلمان موجود ہیں۔ اس کے مقابلے میں ترکی میں مسلمانوں کی تعداد صرف ایک کروڑ ستر لاکھ ہے۔ مصر میں ایک کروڑ اٹھ لاکھ، ایران میں ایک کروڑ بیس لاکھ۔ افغانستان میں ایک کروڑ۔ عراق میں چونتیس لاکھ۔ سعودی عرب میں تیس لاکھ اور پاکستان میں ۵ کروڑ چھیاسی لاکھ۔

مذکورہ بالا اعداد اس چیز کی ضمانت ہیں کہ انڈین یونین میں مسلمانوں کی تعداد ترکی۔ ایران اور افغانستان کی مجموعی آبادی سے زائد ہے۔ اگر یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ حکومت کی طرف سے کوئی زیادتی ہوتی تو ظاہر ہے کہ وہ اتنی تعداد میں یہاں ہرگز نہ رہتے۔ اور پاکستان سے ہندوستان رہنے کے لئے نہ آتے رہتے۔ ان اعداد کو ذہن نشین کرنے کے بعد انڈین یونین کے عہدہ داروں میں اعلیٰ عہدوں پر مسلمانوں کی تعداد بھی ملاحظہ فرماتے چلئے۔ اس وقت مرکزی وزارت میں مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیم، اور مسٹر رفیع احمد قدوائی وزیر رسل و رسائل مسلمانوں کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ اسی طرح صوبائی حکومتوں کے عمّال کی فہرست میں بھی آپ کو کئی گورنر اور کئی مسلمان وزیر ملیں گے۔ چنانچہ سر اکبر حیدری (مرحوم) جن کا گذشتہ سے پیوستہ سال انتقال ہوا، آسام کے گورنر تھے۔ مسٹر آصف علی اڑیسہ کے گورنر ہیں۔ گورنروں کے علاوہ انڈین یونین کے مختلف صوبوں میں اس وقت چھ مسلم وزیر ہیں۔ مولوی عبدالمطالب موز مدار۔ اور مولوی محمد طیب اللہ آسام میں۔ ڈاکٹر سید محمود اور مسٹر عبدالقیوم انصاری بہار میں۔ حافظ محمد ابراہیم اور مسٹر اے۔ این شروانی یو۔ پی میں۔

اعلیٰ سیاسی ملازمتوں میں بھی دس عہدوں میں چھ عہدہ دار مسلمان ہیں۔ مسٹر فیضی مصر میں۔ مسٹر علی ظہیر ایران میں۔ مسٹر جی ایف ایچ۔ بی طیب جی بلجیم میں۔ مسٹر ایم، اے رؤف برما میں۔ مرزا رشید علی بیگ فرانسیسی ہند میں۔ اور مسٹر عبدالمجید خاں جدہ میں۔

پانچ ہائی کورٹ کے جج اور ایک چیف جج، اور فیڈرل کورٹ کے چار ججوں میں ایک جج مسلمان ہے۔ بمبئی ہائی کورٹ کے موجودہ چیف جج مسٹر ایم۔ سی چاگلہ مسلمان ہیں۔ اس کے ماسوا علی گڈھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین اور حکومت بمبئی کے تعلیمی مشیر مسٹر کے۔ جی سیدین ہیں۔ فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے موجودہ نائب صدر کے عہدے پر بھی ایک مسلمان فائز ہے۔

یہی حال فوج اور پولیس کی اعلیٰ ملازمتوں کا ہے۔ چنانچہ فوج میں مندرجۂ ذیل نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

بریگیڈیر انیس احمد خاں آر۔ آئی۔ اے۔ ایس۔ سی کمانڈر دہلی سب ایریا۔ بریگیڈیر عنایت حبیب اللہ کمانڈر شیلانگ سب ایریا اور بریگیڈیر شریف کمانڈر پٹھان کوٹ سب ایریا۔

مذکورہ بالا اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ انڈین یونین میں اونچے عہدوں پر کہیں بھی اختلافِ مذہب کی بنا پر مسلمانوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔

مسلم اقلیت کے علاوہ دوسری اقلیتوں سے بھی لوگوں کو

بڑے عہدے دیئے گئے ہیں ۔ چنانچہ سکھ ۔ پارسی ۔ عیسائی یا اینگلو انڈین اقلیتوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا ہے اور عہدوں کی تقسیم میں صحیح جمہوریت پسندی کو دخل ہے ۔ سکھوں میں وزیر دفاع کے عہدے پر سردار بلدیو سنگھ ہیں ۔ ان کے علاوہ بہت سے ممتاز فوجی عہدے سکھوں کو دیئے گئے ہیں ۔

اسی طرح عیسائی ، اینگلو انڈین ۔ پارسی اقلیتوں کے نمائندے آپ کو مختلف عہدوں پر ملیں گے ۔ چنانچہ مرکزی وزارت میں دو عیسائی ڈاکٹر جان متھائی اور راج کماری امرت کور بحیثیت وزیر شامل ہیں ۔ ایک عیسائی ڈاکٹر ایس ۔ سی مکرجی دستور ساز اسمبلی کے نائب صدر ہیں ۔ مسٹر سی ۔ ایچ ۔ بھابا جو ایک پارسی ہیں گذشتہ سے پیوستہ سال مرکزی اسمبلی کے ممبر تجارت رہ چکے ہیں ۔ مسٹر ایم ۔ آر مسانی برازیل میں بحیثیت ہندوستانی سفیر مقرر تھے ۔ سر مہاراج سنگھ جو ایک عیسائی ہیں بمبئی کے گورنر ہیں ۔ یو ۔ پی کے گورنر مسز سروجنی نائیڈو پارسی ہیں ۔ ہندوستانی عیسائیوں میں مسٹر جے ۔ ایم نکولس رائے اور ڈاکٹر ایس گورماتھم آسام اور مدراس میں وزیر ہیں ۔ اور ایک پارسی ڈاکٹر ایم ۔ ڈی ۔ ڈی گلڈر بمبئی میں وزیر ہیں ۔

ان اعداد و شمار کی روشنی میں آپ صحیح طور پر اندازہ کر سکیں گے کہ انڈین یونین نے اپنی ادنیٰ ترین اقلیتوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے ۔

اسی ضمن میں مذکورہ بالا اقلیتوں کے مذہبی ، سیاسی اور لسانی حقوق کے سلسلے میں انڈین یونین میں جو اقدامات عمل میں لائے جا رہے ہیں ان کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے تاکہ اقلیتوں کے مفاد ان کے املاک ان کے تعلیمی اداروں اور عبادت گاہوں کے لئے جو جو انتظامات کئے گئے ہیں ۔ ان کا بھی صحیح اندازہ ہو سکے ۔

ملک میں برطانوی دور کے دیرپا اثرات چونکہ ابھی تک عوام کے دل و دماغ سے زائل نہیں ہوئے ہیں ۔ اس لئے اُن تعصبات کو ختم کرنے کے لئے سب سے پہلا اور مستحسن قدم تو یہی ہے کہ جداگانہ انتخابات جنہیں محض ہندوستانیوں میں مذہبی اختلافات پیدا کرانے کی غرض سے رائج کیا گیا تھا ختم کر کے اس کی جگہ مخلوط انتخاب رائج کر دیا گیا ہے ۔ لیکن اس کو رائج کرنے میں بھی اقلیتوں کے مفاد کی خاطر کچھ شرطیں لگا دی گئی ہیں ۔ مثلاً مسلمانوں کی نشستیں محفوظ کرنے کے لئے سکشن ۳۰۵ میں درج ہے ۔

" اس قانون کے عمل میں آنے کے دس سال بعد تک صوبائی اسمبلیوں یا پارلیمنٹ میں ، اس قانون کی قرارداد کے زیرِ عمل مسلمانوں ، اچھوتوں ، قبیلوں یا ہندوستانی عیسائیوں کے لئے جو نشستیں مخصوص کی گئی ہیں وہ تبدیل نہیں کی جا سکیں گی ۔ اور مقررہ مدت کے بعد یہ قرارداد اس صورت میں ختم ہو جائے گی ۔ اگر قانون میں اس کے لئے کوئی ترمیم منظور نہ کی گئی "

یہ پیش بندی اس وجہ سے کی گئی ہے تاکہ کمزور اقلیتیں جو ابھی اپنے پیروں آپ کھڑے ہونے کی صلاحیتیں نہیں رکھتیں ۔ دس سال کی مدت میں اپنے میں اتنی توانائی پیدا کر لیں کہ اپنے پیروں آپ کھڑی ہو سکیں اور دوسروں کے سہارے کی دست نگر نہ رہیں ۔

دنیا کے تمام ممالک میں چونکہ ہندوستان میں مذہبیت کا ہمیشہ سے دور دورہ رہا ہے اس لئے یہاں کے ہر فرقے اور ہر مذہب کو اس کی مذہبی تعلیم میں آزادی دیتے ہوئے اس بات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ اس مذہبی آزادی سے ناجائز فائدہ نہ اُٹھایا جائے ۔ چنانچہ اس سلسلے میں تعلیمی درسگاہوں کے بارے میں جو قانون بنا ہے اس کے سکشن ۲۲ میں مندرجۂ ذیل باتوں کی تشریح کی گئی ہے ۔

(۱) درسگاہوں میں کسی مذہب کی اشاعت نہیں کی جائے گی ۔

(۲) یہ قانون اُن درسگاہوں پر حاوی نہیں ہوگا جن کا انتظام حکومت کے تحت ہو ۔ مگر اس کی بنیاد کسی خاص ٹرسٹ نے ڈالی ہو اور جو چاہتا ہو کہ وہاں خاص مذہبی تعلیم بھی دی جائے ۔

(۳) جن مدارس کو حکومت سے مدد ملتی ہو یا جو منظور شدہ ہوں ان میں مذہبی تعلیم یا مذہبی دعائیں جو وہاں پڑھائی جاتی ہوں ، ان میں کسی طالب علم کو حصہ لینے کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا ۔

(۴) کسی فرقے یا گروہ کو اپنے فرقے یا گروہ کے لوگوں کو کسی درسگاہ میں مقررہ اوقات کے بعد اپنی مذہبی تعلیم دینے سے روکا نہیں جا سکتا ۔

اسی طرح سکشن نمبر ۲۳ میں اقلیتوں کے مفاد اور حقوق کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ

(۱) ہندوستان کے کسی حصے کے اُس گروہ کو جس کی زبان طرز تحریر اور تمدن الگ ہو اس کو برقرار رکھنے کا حق حاصل ہوگا۔

(۲) مذہب، فرقے یا زبان کے لحاظ سے اقلیتوں کے کسی شخص کو قومی اسکولوں میں داخل کرنے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) مذہب، فرقے یا زبان کے لحاظ سے بنی ہوئی اقلیتوں کو حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنی اپنی پسند کے اسکول قائم کریں۔ اور حکومت کو امداد دیتے ہوئے ان کو اس بنا پر بند نہیں کرے گی کہ وہ مذہب، فرقے یا زبان کے لحاظ سے بنی ہوئی اقلیت کے زیر انتظام ہیں۔

اگست اور ستمبر ۱۹۴۷ء کا زمانہ مذہبی جنون کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں اقلیتوں کے جذبات کی قدر کرنے اور خاص طور پر مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کرنے میں رہبرانِ قوم اور انڈین یونین کے ارباب حل و عقد کو ایک آزمائش سے گذرنا پڑا۔ اور وہ اس میں کامیاب رہے۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو ہندوستان ایک جمہوریت بن رہا ہے۔ اُس روز جو نیا دستور نافذ ہو رہا ہے اُس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اقلیتوں کی ہر ممکن حفاظت اور بہبود کا ذمہ دار ہے۔

نئے آئین کی ترتیب

مجلس آئین ساز کے ارکان	۳۰۸
مجلس آئین ساز کا پہلا جلسہ	۹ دسمبر ۱۹۴۶ء
آئین کی منظوری کے لئے آخری نشست	۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء
آئین سازی میں جو وقت خرچ ہوا	۲ برس ۱۱ ماہ اٹھارہ دن
سیشنوں کی تعداد	۱۱
سیشن دیکھنے لئے آنے والوں کی تعداد	۵۳ ہزار
آئین ساز اسمبلی پر کل خرچ	۶۳۹۶۷۲۹ روپے
آئینی مشیر کے مرتبہ آئین کی دفعات و جدول	۲۴۳ دفعات اور ۱۳ جدول
ترتیب مسودہ پیش کردہ مسودہ کمیٹی	۳۱۵ دفعات ۸ جدول
جن قدر ترمیموں کا نوٹس دیا گیا ان کی کل تعداد	۷۶۳۵
جو ترمیمیں حقیقتاً پیش کی گئیں	۲۴۷۳
آئین کے آخری مسودے کی ترتیب	۳۹۵ دفعات اور ۸ جدول

دوسری اقوام کے متعلقہ اعداد و شمار برائے تقابل درج ذیل ہیں۔

یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ	چار ماہ	برائے سات دفعات
کینیڈا	دو سال ۵ ماہ	برائے ۱۴۷ دفعات
آسٹریلیا	۹ سال	برائے ۱۲۸ دفعات
جنوبی افریقہ	ایک سال	برائے ۱۵۳ دفعات

(ہندوستان دو سال گیارہ ماہ ۱۸ دن برائے ۳۹۵ دفعات و آٹھ جدول)

آئین ساز اسمبلی

دسمبر ۱۹۴۶ء سے نومبر ۱۹۴۹ء تک

کونسل چیمبر نئی دہلی، جہاں
آزاد ہندوستان کا آئین تیار ہوا

آئین ساز اسمبلی کے عارضی صدر
ڈاکٹر سچدا نند سنہا ایوان سے
خطاب کر رہے ہیں۔
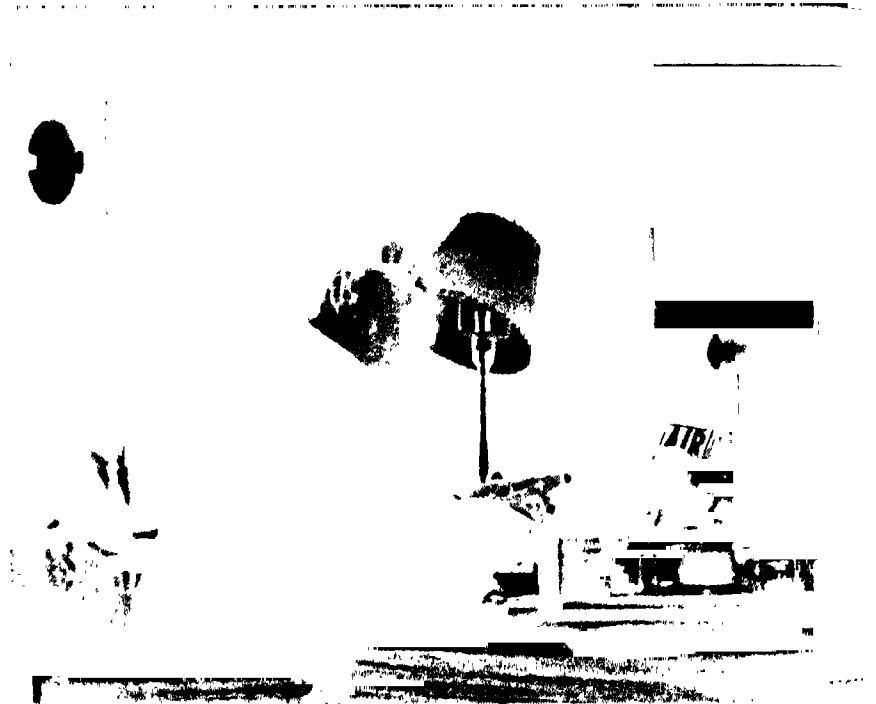
آئین ساز اسمبلی کے اجلاس کا ایک منظر

آئین ساز اسمبلی کا ایک اور رخ

آچاریہ کرپلانی تقریر
کر رہے ہیں۔
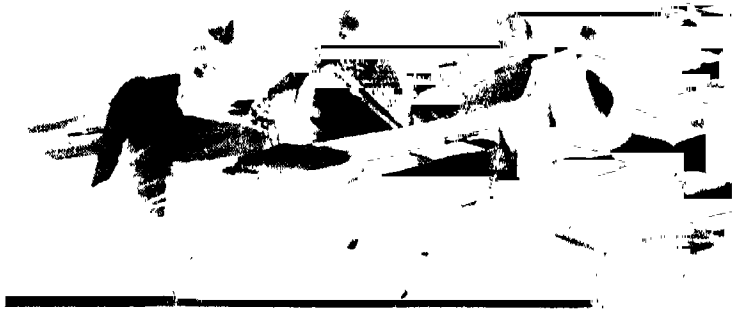
ایوان کا ایک اور پہلو۔ صوبوں اور ریاستوں کے
نمائندے آچاریہ کرپلانی کی تقریر سن رہے ہیں
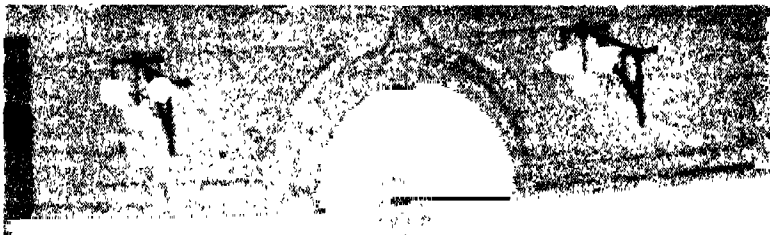
اوپر دائیں جانب ۔
شریمتی امو سوامی
ناتھن اور شری سی.
راجگوپال آچاریہ ۔

درمیان میں ۔
پنڈت نہرو، شری
آصف علی اور شری
ستیہ نارائن سنہا کے
ساتھ۔

نیچے ۔
آئین ساز اسمبلی میں
کشمیر کے نمائندے ۔

اوپر بائیں جانب ۔
شری کے. ایم. منشی

نیچے ۔
آئین ساز اسمبلی کے
بعض اور ممبر ۔

آئین ساز اسمبلی کے صدر
ڈاکٹر راجندر پرشاد

بھارت کے پردھان منتری
آئین کے مکمل ہو جانے پر
شری راجندر پرشاد کو
مبارک باد دے رہے ہیں

اسرار احمد آزاد

آئین ساز اسمبلی

ایک تاریخی جائزہ

موجودہ دہائی کے آغاز میں جب ہندوستان کے حریت خواہ رہنماؤں نے ملک کا آئین مرتب کرنے کے لئے کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی یعنی مجلس دستور ساز کے قیام کا مطالبہ شروع کیا تھا تو ایک محدود حلقۂ افراد کے علاوہ اس ملک کے عام باشندے اس امر کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اگر یہ مطالبہ حقیقت کی شکل میں تبدیل ہو گیا تو اس سے ہندوستان کی تقدیر بدل جائے گی لیکن آج جب کہ یہ مجلس قائم ہونے کے بعد اپنا کام بھی ختم کر چکی ہے ہر شخص الفاظ کے اس چھوٹے سے مجموعے کے حیرت انگیز اثرات کا معترف نظر آ رہا ہے۔

ترتیب آئین کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں مجلس دستور ساز کے قیام سے قبل دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی اس قسم کی مجالس قائم ہوتی رہی ہیں لیکن ہندوستان کی مجلس دستور ساز کو اس اعتبار سے ترتیب آئین کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت حاصل رہیگی کہ اول تو دوسری عالم گیر جنگ کے بعد ایشیا میں سب سے پہلے یہی مجلس دستور ساز قائم ہوئی اور دوسرے اس مجلس کو جن حالات میں اپنا کام انجام دینا اور جن پیچیدہ مسائل کو سلجھانا پڑا دنیا کا کوئی ملک ان کی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔

دوسری عالم گیر جنگ کے خاتمے پر جب بین الاقوامی حالات نے برطانوی ملوکیت کے لئے ہندوستان کو اپنے زیر تسلط رکھنا ناممکن بنا دیا تو ۹ ستمبر ۱۹۴۵ء کو پہلی مرتبہ لارڈ ویول نے مرکزی مجلس قانون ساز کے روبرو ہندوستان کے متعلق برطانوی حکومت کی حکمت کا اعلان کرتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ ـــ وہ ہندوستان کا آئین حکومت مرتب کرنے کے لئے مجلس آئین ساز کی تشکیل پر آمادہ ہے اور اس سلسلے میں برطانوی ہند اور ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں کی ایک ایسی مجلس مفاہمت مقرر کرے گی جو حصول مقصد کے لئے زیادہ سے زیادہ اتحاد عمل کے ذرائع دریافت اور متعین کر سکے ـــ اور اس کے بعد ۱۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر ایٹلی نے برطانوی پارلیمنٹ میں اس امر کا اعلان کیا کہ ہندوستان کے مسئلے کو طے کرنے کے لئے برطانوی کابینہ کے تین ارکین ـــ وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس، وزیر خزانہ سٹیفورڈ کرپس اور مسٹر اے ۔ وی ۔ الگزینڈر پر مشتمل ایک وفد ہندوستان جا رہا ہے۔

یہ وفد ۲۹ مارچ ۱۹۴۶ء کو کراچی پہنچا اور اس نے ۳ اپریل سے وائسرائے کی کونسل کے ارکین، صوبائی گورنروں اور وزرائے اعظم نیز کانگریس مسلم لیگ اور دوسری ممتاز عوامی جماعتوں کے نمائندوں سے ملاقات کر کے نہ صرف ان کے خیالات ہی معلوم کئے بلکہ کانگریس اور لیگ کے مابین مفاہمت کرنے کے لئے شملے میں ایک مشترکہ کانفرنس بھی منعقد کی لیکن چونکہ اسے اپنے اس مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی اس لئے اس نے ۱۶ مئی کو اپنا وہ فیصلہ صادر کر دیا جو 'کیبنٹ مشن پلان' کے نام سے مشہور ہے۔

وفد نے اپنی اس تجویز میں اس اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد کہ دستور ساز مجلس کو ملک کی بالغ آبادی کی رائے سے منتخب ہونا چاہئے ـــ اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ ـــ اس طرح اس مجلس کے قیام میں غیر معمولی تاخیر رونما ہوگی ـــ اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ ـــ صوبائی مجالس قانون ساز کو اس مجلس کے انتخاب کا ذریعہ بنا لیا جائے۔

اس سلسلے میں وفد نے یہ مشکلات بھی بیان کی ہیں کہ اول تو صوبائی مجالس قانون ساز میں ارکین کی تعداد صوبائی آبادی کے تناسب کے مطابق نہیں اور دوسرے چونکہ ان مجالس کو کمیونل ایوارڈ کی بنا پر قائم کیا گیا تھا اس لئے ان میں مختلف فرقوں کی اصل صوبائی آبادی کا تناسب بھی مفقود ہے ـــ اور ان دشواریوں پر غالب آنے کا یہ طریقہ تجویز کیا تھا کہ ـــ مجلس دستور ساز کے لئے دس لاکھ افراد پر

ایک نمائندے کے حساب سے ہر صوبہ کی آبادی کے تناسب کے مطابق اراکین مجلس کی تعداد مقرر کر دی جائے - اس تعداد کو فرقہ وارانہ تناسب آبادی کے اعتبار سے تقسیم کر دیا جائے اور ہر فرقے کے اراکین مجلس قانون ساز کو اس امر کا اختیار دیا جائے کہ وہ اپنے درمیان یا باہر سے سنگل ٹرانسفر ایبل ووٹ کے ذریعے سے اپنے نمائندوں کو منتخب کر دیں۔

وفد نے مسلم لیگ کے مطالبۂ تقسیم ہند کے فیصلے کو بھی اس مجلس کے فیصلے پر منحصر رکھا تھا لیکن یہاں اس کے بیان کی ضرورت نہیں البتہ ریاستوں کے متعلق یہ فیصلہ کیا تھا کہ — چونکہ ریاستوں اور برطانیہ کے مابین معاہدے تھے اس لئے اب جبکہ برطانیہ اس ملک سے اپنی حکومت اور قیادت کو ختم کر رہا ہے وہ ان معاہدات میں اپنی جگہ کسی تیسرے فریق کو نہیں دے سکتا اور ہندوستان سے برطانوی حکومت کے خاتمے کے بعد ہندوستانی ریاستیں اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں گی۔ وفد نے پورے ہندوستان کو تین گروہوں — اے بی سی — میں منقسم کر دیا تھا۔ اس نے مدراس، بمبئی، صوبۂ متحدہ، بہار، صوبہ متوسط اور اڑیسہ کو اے گروہ، پنجاب، صوبہ سرحد اور سندھ کو بی گروہ اور بنگال اور آسام کو سی گروہ میں رکھ کر یہ مشورہ دیا تھا کہ ان گروہوں کے نمایندوں کے انتخاب کے بعد مجلس دستور ساز کا اولین اجلاس منعقد کیا جائے جس میں صدر وغیرہ کے انتخاب ایسے ابتدائی امور کی تکمیل کر دی جائے۔ اس کے بعد ہر گروہ اپنے مسائل اور مرکز کے ساتھ اپنے روابط کا فیصلہ کرنے کے لئے اپنی جداگانہ مجالس دستور ساز کے اجلاس منعقد کرے اور اس کام کی تکمیل کے بعد پھر ہندوستان کے دستور کی ترتیب کا کام شروع کیا جائے۔ وفد نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ بعض مخصوص مسائل کے سلسلے میں ایک مجلس مشورہ بھی قائم کی جائے اور ترتیب دستور کے وقت ان مسائل کے متعلق اس مجلس کی سفارشات کو مد نظر رکھا جائے۔ ہندوستان کی مجلس دستور ساز اس تجویز کے مطابق قائم ہوئی تھی۔

اس مجلس میں مختلف صوبوں کی آبادی اور فرقہ وارانہ تناسب کے اعتبار سے مندرجۂ ذیل نقشہ کے مطابق اراکین منتخب کئے گئے تھے۔

گروہ	صوبہ	جنرل نشستوں کی تعداد	مسلم نشستوں کی تعداد	سکھ نشستوں کی تعداد	میزان
اے	مدراس	۴۵	۴	..	۴۹
	بمبئی	۱۹	۲	..	۲۱
	صوبہ متحدہ	۴۷	۸	..	۵۵
	بہار	۳۱	۵	..	۳۶
	صوبۂ متوسط	۱۶	۱	..	۱۷
	اڑیسہ	۹	..	..	۹
بی	پنجاب	۸	۱۶	۴	۲۸
	صوبہ سرحد	۰	۳	..	۳
	سندھ	۱	۳	..	۴
سی	بنگال	۲۷	۳۳	..	۶۰
	آسام	۷	۳	..	۱۰

ریاستیں	۹۳
دہلی - اجمیر مارواڑ اور کورگ	۳
میزان	۳۸۸

"کیبنٹ مشن پلان" کی دفعہ ۱۵ اور دفعہ ۱۹ مجلس دستور ساز کے مقاصد اور طریقۂ کار کے سلسلے میں بنیادی حیثیت رکھتی تھیں لیکن یہاں ان کا خلاصہ پیش کرنے کی گنجائش نہیں۔ البتہ یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مشن نے اپنی اس تجویز کو اس شرط کے ساتھ مشروط کر دیا تھا کہ اس پوری تجویز کو منظور کیا جائے۔ اور اگرچہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ۲۴ رمئی کو ایک طویل قرارداد میں اس تجویز کی خامیوں پر تبصرہ کیا تھا لیکن مستقبل کے متعلق بعض خوشگوار توقعات قائم کرتے کے بعد اس پر عمل کرنے کے لئے آمادہ بھی ہو گئی تھی۔ کانگریس کے مذکورۂ بالا اعلان کے بعد ۶ر جون کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا ایک اجلاس منعقد

کیا گیا اور اگرچہ اس اجلاس میں بھی اس تجویز پر شدید نکتہ چینی کی گئی لیکن مسٹر جناح کے مشورے پر اسے قبول کر لیا گیا۔

کیبنٹ مشن کی مذکورۂ بالا تجویز کو قبول کر لینے کے بعد اوّلین مرحلہ یہ تھا کہ عبوری دور کے لئے مرکز میں کانگریس اور لیگ کی مشترکہ وزارت قائم کی جائے اور فریقین اس امر پر رضامند بھی تھے لیکن چونکہ کانگریس ہمیشہ سے پورے ملک کی نمائندہ جماعت رہی ہے اس لئے وہ اپنی جانب سے اس مشترکہ وزارت میں جن لوگوں کو شامل کرنا چاہتی تھی ان میں قوم پرور مسلمان بھی شامل تھے۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کا نظریہ یہ تھا کہ کانگریس محض ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہے اس لئے اول تو اسے اپنی جانب سے مسلمانوں کو وزارت میں شامل نہیں کرنا چاہئے اور دوسرے اس وزارت میں کانگریس اور لیگ کو مساوی نمائندگی حاصل ہونی چاہئے لیکن کانگریس نے اس مطالبہ کو تسلیم نہیں کیا اور چونکہ ان حالات میں عبوری دور کے لئے مشترکہ وزارت کی تشکیل کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا اس لئے ۱۲ر جون کو کیبنٹ مشن اور وائسرائے نے پنڈت نہرو، مسٹر راجگوپال اچاریہ، ڈاکٹر راجندر پرشاد، سردار پٹیل، مسٹر ہری کشن مہتاب اور مسٹر جگجیون رام، مسٹر جناح، سر ناظم الدین، نوابزادہ لیاقت علی خاں، نواب اسمٰعیل خاں اور سردار عبدالرب نشتر، مسز سراین۔ پی انجینیر، ڈاکٹر جان متھائی اور سردار بلدیو سنگھ کو ذاتی حیثیت سے مرکزی کابینہ میں شمولیت کی دعوت دی مگر کانگریس نے اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن مجلس دستور ساز میں شرکت کے فیصلہ پر بدستور قائم رہیں اور اپنے فیصلے کی توثیق کے لئے جولائی کے پہلے ہفتے میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور مسلم لیگ نے اسے منظور کر لیا۔ لیکن چونکہ کانگریس کی شمولیت کے بغیر ملک میں کوئی نمائندہ وزارت قائم نہیں کی جا سکتی تھی اس لئے مشن نے جون کے آخری ہفتے میں لنڈن واپس جانے سے پہلے اس بات کا اعلان کیا کہ — ملک میں عبوری دور کے لئے مشترکہ حکومت قائم ہونے سے قبل حکام پر مشتمل ایک نگران حکومت قائم کی جائے گی۔

جولائی ۱۹۴۶ء کے پہلے ہفتہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ورکنگ کمیٹی کی قرارداد کی توثیق کر دی۔ بالفاظ دیگر اس نے اس بات کی اجازت تو دے دی کہ اس کے نمائندے مجلس دستور ساز میں شریک ہو سکتے ہیں لیکن عبوری دور کی مشترکہ حکومت میں شمولیت کی اجازت نہیں دی۔ اور اس کے بعد اسی ماہ کے آخری ہفتے میں آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل نے بھی اپنے اس فیصلے کو مسترد کر دیا جو اس نے کیبنٹ مشن پلان کو منظور کرنے کے سلسلے میں کیا تھا اور یہ فیصلہ کیا کہ اب وہ حصولِ پاکستان کے لئے براہ راست اقدام کرے گی۔

مسلم لیگ کی مذکورۂ بالا تجویز کے پیش نظر اگست کے دوسرے ہفتے میں لارڈ ویول نے کانگریس کے صدر پنڈت نہرو کو دوبارہ عبوری دور کی حکومت قائم کرنے کی دعوت دی اور اس سلسلے میں ۱۲ر اگست کو جو سرکاری اعلانیہ شائع ہوا کہ پنڈت نہرو وائسرائے سے ملنے کے لئے دہلی آ رہے ہیں ۱۳ر اگست کو پنڈت جی نے مسٹر جناح کو ایک خط لکھ کر عبوری دور کے لئے عارضی مشترکہ حکومت قائم کرنے میں انہیں اشتراک عمل کی دعوت دی اور ۱۵ر اگست کو بمبئی میں ان سے ملاقات کی۔ اور ۱۶ر اگست کو موصوف نے نمائندگان اخبارات کو جو بیان دیا اس سے معلوم ہوا کہ مسلم لیگ کے علاوہ ملک کی دوسری تمام جماعتیں اس معاملے میں کانگریس کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہیں۔ اس کے بعد پنڈت جی وائسرائے سے ملے اور تشکیل کابینہ کے سلسلے میں موصوف نے جو تجویز پیش کی وائسرائے نے اسے منظور کر لیا اور ۲۴ر اگست کو سرکاری طور پر اس بات کا اعلان کر دیا گیا کہ ۲ر ستمبر کو نہرو کابینہ قائم ہو جائے گی۔ اس کابینہ میں جن حضرات کی شرکت کا اعلان کیا گیا تھا ان میں تین مسلمان تھے اور یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس میں دو مسلمانوں کو اور شریک کیا جائے گا۔

تشکیل وزارت کے بعد وائسرائے نے ایک مرتبہ پھر مسلم لیگ کو کابینہ میں شرکت کی دعوت دی۔ ۱۵ر ستمبر کو مسٹر جناح دہلی آئے اور اکتوبر کے اواخر تک متعدد ملاقاتوں اور مراسلتوں کے بعد مسلم لیگ نے عبوری دور کی اس حکومت میں شرکت کر لی۔ اور اس طرح وہ ابتدائی شرط پوری ہو گئی جو کیبنٹ مشن پلان میں مجلس دستور ساز کے قیام کے لئے مقرر کی گئی تھی۔

کیبنٹ مشن نے اپنی تجویز میں ملک کو تین گروہوں میں منقسم کرنے کا جو مشورہ دیا تھا اور اس تمام عرصہ میں مسلم لیگ اور کانگریس اپنے اپنے نقطۂ نظر کے ماتحت اس کی توضیحات کرتی رہی تھیں چنانچہ مشترکہ

وزارت کے قیام کے بعد ان توضیحات پر اختلاف رائے شروع ہوا اور جب ۹ دسمبر ۱۹۴۶ء کو مجلس دستور ساز کا پہلا اجلاس منعقد کرنے کا اعلان کیا گیا تو مسٹر جناح نے اس کے مقاطعہ کی ہدایات جاری کر دیں۔ جن کے پیش نظر برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر اٹیلی نے پنڈت نہرو اور مسٹر جناح کو لندن آنے کی دعوت دی اور یہ حضرات اپنے اپنے رفقاء کار کے ساتھ ۳۰ نومبر کو لندن تشریف لے گئے۔ اور اس کے بعد ۶ دسمبر کو حکومت نے لندن سے جو بیان شائع کیا اگرچہ اس میں یقین کے ساتھ اس بات کا دعوےٰ نہیں کیا گیا تھا کہ مسلم لیگ مجلس دستور ساز میں شریک ہوگی لیکن اس امر کا اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ اس مسئلہ پر کانگریس اور لیگ کے درمیان سمجھوتہ ہو جائے گا۔

بہر حال ۹ دسمبر کو مجلس دستور ساز کا پہلا اجلاس منعقد ہوا اور صدر مجلس کے انتخاب نیز عملہ وغیرہ کے تقرر کے بعد جب تینوں گروہوں نے اپنی اپنی مجلس کا علیحدہ اجلاس منعقد کیا تو ہندوستان کی تقسیم کا فیصلہ ہو گیا اور اس کے بعد ہندوستان کی مجلس دستور ساز کے لئے محض اے گروہ منقسمہ بنگال اور آسام نیز ہندوستانی ریاستوں کے لئے آئین ریاست مرتب اور مدون کرنے کا کام باقی رہ گیا۔ اور اگرچہ اس مجلس کے اراکین پہلے ہی دن سے اپنے اس فرض کی انجام دہی میں مصروف ہو گئے لیکن حقیقتاً اس اہم کام کا آغاز اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد شروع ہوا۔

ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ برصغیر کی حیثیت رکھتا ہے اور جیسا کہ اس مجلس کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے دستور ہند پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا تھا اس ملک کی آبادی سوویٹ روس کی آبادی سے قطع نظر کرتے ہوئے باقی ماندہ یوروپ کی آبادی سے بھی دو لاکھ زیادہ ہے۔ یہاں اقلیتوں کا مسئلہ بھی کچھ کم پیچیدہ نہیں تھا۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ اس ملک کے لئے کسی دستور کی ترتیب کچھ آسان کام نہیں تھا لیکن اس مجلس نے اپنی ذمہ داریوں کو جس کامیابی کے ساتھ پورا کیا وہ یقیناً حیرت انگیز ہے۔

ہند کی مجلس دستور ساز نے اپنے پیش نظر کام کو تقریباً تین سال میں پورا کیا ہے اور اگر اس کی سرگرمیوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے اس کے لئے متعدد ضخیم جلدیں درکار ہوں گی لیکن مختصر طور پر اس طرح سمجھنا چاہیئے کہ سب سے پہلے اس نے سردار پٹیل کی زیر صدارت ریاستوں سے مصالحت کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی اور آئین کی تکمیل سے پہلے ہی اس کمیٹی نے تمام ہندوستانی ریاستوں کو برطانوی ہند کے مساوی بنا لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک جانب تو قرارداد مقاصد مرتب کی اور دوسری جانب مسٹر بی۔ این راؤ کو ان نکات کی ترتیب کا کام سپرد کیا جنہیں آئین سازی میں سنگ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ پھر اس نے قبائلی علاقوں اقلیتوں اور اسی قسم کے دوسرے اہم مسائل کے متعلق سفارشات مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی اور ۲۹ اگست ۱۹۴۷ء کو مسٹر امبیدکار مسٹر گوپال سوامی آئینگر، مسٹر اے۔ کرشنا سوامی آئر، مسٹر کے۔ ایم منشی سید محمد سعد اللہ اور مسٹر ٹی۔ ٹی کرشنام اچاری پر مشتمل وہ ڈرافٹنگ کمیٹی مقرر کی گئی جس نے اس آئین کا ابتدائی مسودہ تیار کیا۔

ہند کی مجلس دستور ساز نے کم و بیش تین سال کے عرصہ میں گیارہ اجلاس منعقد کئے اور بحیثیت مجموعی ان اجلاس میں ۱۶۵ دن صرف ہوئے۔ اس مجلس نے اپنے ابتدائی چھ اجلاس میں نہ صرف قرارداد مقاصد ہی کو منظور کیا بلکہ ان کمیٹیوں کی یادداشتوں اور سفارشات پر بھی غور کیا جو بنیادی حقوق، یونین کے دستور اور اختیارات، صوبائی آئین، اقلیتوں، شیڈیولڈ علاقوں اور شیڈیولڈ قبائل کے مسائل اور معاملات کو طے کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھیں۔ اور ان امور سے فراغت پانے کے بعد ڈرافٹنگ کمیٹی کے اس مسودہ دستور پر غور اور بحث کی جو ۳۱۵ دفعات اور ۱۳ ضمیموں پر مشتمل تھا اور اب جبکہ یہ دستور مکمل ہو چکا ہے یہ ۳۹۵ دفعات اور ۸ ضمیموں پر مشتمل ہے اور اس تین سال کے عرصہ میں مجلس دستور ساز پر ۲۲ نومبر ۱۹۴۹ء تک ۶۳۹۶۷۲۹ روپیہ صرف ہوا۔ مسودہ دستور میں مختلف اراکین کی جانب سے ۷۶۳۵ ترمیمات پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا لیکن ان میں سے ۲۴۷۳ ترمیمات پیش کی گئیں اور باقی ماندہ کو واپس لے لیا گیا اور اس مجلس کے گیارہ اجلاس کو دیکھنے کے لئے تقریباً ۵۳ ہزار افراد آئے اور ان تمام باتوں کے پیش نظر یہ دعوےٰ کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ یہ دستور ہر اعتبار سے ایک تاریخی حیثیت اور اہمیت رکھتا ہے

اس دستور پر غور و بحث کے دوران میں بنیادی حقوق ریاست کی زبان اور ہندوستان' اقلیتوں کے معاملات اور ریاست جموں اور کشمیر کے مستقبل نیز حقوق اور تحفظات کی دفعات پر طویل اور صبر آزما تقریریں اور بحثیں ہوئیں لیکن بیشتر مسودہ آئین اتفاق رائے سے منظور ہوا اور اس کی جن دفعات کو کثرت رائے سے منظور کیا گیا ان میں بھی اختلاف رائے کرنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔

ہمارے اس دستور حکومت کی بعض خصوصیات یہ ہیں کہ اس کے نفاذ کے بعد ملک میں غیر مذہبی جمہوری ریاست قائم ہو جائے گی اس ریاست کی مجلس قانون کے اراکین کی طرح صدر کو بھی ملک کی بالغ آبادی براہ راست اپنی رائے سے منتخب کرے گی۔ کابینہ مجلس قانون ساز کے روبرو جوابدہ ہوگا اور صدر کی حیثیت انگلستان کے بادشاہ جیسی ہوگی یعنی کوئی قانون اس کی منظوری کے بغیر قابل عمل تصور نہ کیا جائے گا لیکن وہ خاص حالات کے علاوہ کسی قانون کو مسترد بھی نہیں کرے گا مرکزی مجلس قانون ساز کے علاوہ بعض صوبائی مجالس قانون کو بھی ایوان زیریں اور ایوان بالا پر مشتمل رکھا گیا ہے لیکن برطانوی دارالعوام کی طرح ہمارے ملک میں بھی حقیقی اختیارات ایوان زیریں ہی کو حاصل ہوں گے' اس دستور میں بلا تفریق مذہب۔ ملت اور رنگ و نسل ہندوستان کے ہر شہری کو محنت اور ترقی کرنے کی ضمانت دی گئی ہے۔

خوراک کے محاذ پر صوبوں کی سرگرمیاں

آسام بیکار زمینوں میں خوراکی فصلوں کی کاشتکاری کی حوصلہ افزائی کے لئے حکومت آسام نے امداد باہمی کی انجمنوں اور لوگوں کے گروہوں کو دو سال کے لئے مالیہ کی پوری معافی دینے کا اعلان کیا ہے۔ یہ معافی صرف سرکاری زمینوں میں پھر سے کاشتکاری کرنے کے لئے دی جائے گی۔ اس کے بعد تین برسوں میں اگر کاشتکار ان زمینوں میں خوراکی فصلیں پیدا کرتے رہیں تو انہیں نصف مالیہ معاف کر دیا جائے گا یہ رعایت گھنے جنگل سے اٹی ہوئی زمینوں وغیرہ کے متعلق ہی دی جائیگی اور وہ شخص ہی اس رعایت کے حقدار ہوں گے۔ جو اپنی تمام فالتو پیداوار کے مطالبہ پر حکومت کے حوالہ کر دیں گے۔ ایسی تمام زمینوں کو سالانہ پٹہ پر دیا جائے گا۔ اگر کوئی پٹہ دار اس طرح حاصل کی ہوئی زمین کے ایک تہائی سے زیادہ حصہ کو بلا کاشت چھوڑ دے گا تو اس کا کل پٹہ منسوخ کر کے کسی دوسرے کاشتکار کو دے دیا جائے گا۔

پوربی پنجاب ایک سرکاری اعلان میں بتایا گیا ہے کہ شہری علاقوں کے کھانڈ کا کوٹا پانچ سے نو چھٹانک اور دیہاتی علاقوں کا تین سے پانچ چھٹانک فی کس کر دیا گیا ہے دیہاتی علاقوں میں شادیوں کے لئے کھانڈ کے خاص کوٹے کا وزن سات سیر سے ۲۲ سیر فی شادی کر دیا گیا ہے۔

حیدرآباد حکومت نے دھان۔ چاول۔ مکی۔ گندم۔ جو۔ جوار۔ باجرہ یا ان سے بنی ہوئی اشیا کے ماسوائے جو حکومت یا اس کے مقررہ کردہ افسروں کے کسی دوسرے شخص کو فروخت کرنے کی ممانعت کر دی ہے۔

مدراس مدراس کی صوبائی حکومت نے ایک پانچ سالہ سکیم جاری کی ہے جس کے ذریعے وسیع پیمانے پر بجلی پیدا کی جائے گی۔ یہ بجلی ایک ہزار دیہات کو مہیا کی جائے گی۔ اس سے پانی نکالنے کے مزید بارہ ہزار زرعی پمپ چلائے جائیں گے۔ حکومت مدراس کے ریونیو بورڈ نے یہ ہدایات جاری کی ہیں۔ کہ فراہمی غلہ کے متعلق حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ اناج کی فراہمی پر امن طور پر ہونی چاہئے۔ کاشتکاروں کو اور خاص کر چھوٹے کاشتکاروں کو کسی قسم کی پریشانی کا نشانہ نہ بنایا جائے۔ غلط اور ناجائز طریقے اختیار کرنے سے احتراز کیا جائے۔ مکانوں کی تلاشیاں اناج کے ذخیرہ کی تصدیق کے لئے اور نجی مکانوں میں زبردستی داخل ہونے کی حتے الامکان کوشش نہ کی جائے۔ اس اختیار کو خاص حالات میں ہی استعمال کیا جائے۔

رشید احمد صدیقی

ایک خط

جوش صاحب مکرم، آداب،

آپ کے اصرار اور اپنی سہل انگاری سے بالآخر اُکتا کر میں نے آپکے "آج کل" کے سالنامہ کو ڈھونڈھ نکالا۔ لیکن بجائے اس کے کہ آپ کی فرمائش کے احترام میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا، کچھ باتیں آپ ہی سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے میری اس حرکت سے متنبہ ہو کر آئندہ آپ مجھے اس سے بہتر سلوک کا مستحق سمجھیں۔

صفحہ ۵ پر ساغر نظامی کی نظم آہنگ تعمیر (فنکاروں کا کورس) ہے

صفحہ ۷ پر حسرت کی غزل ہے۔

صفحہ ۸ پر فراق گورکھپوری کا ترانہ ہے۔

صفحہ ۹ پر جگر مرادآبادی کی غزل (جگر پارے) ہے۔

صفحہ ۱۰ پر معین احسن جذبی کی نظم "میری شاعری اور نقاد" ہے۔

صفحہ ۱۲ پر روش صدیقی کی نظم ہے "نکہتوں کے آنچل میں"

صفحہ ۱۳ پر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی "ماہ و رسم" ہے۔

صفحہ ۱۴ پر شمیم کرمانی کی غزل ہے۔

صفحہ ۱۵ پر جعفر علی خاں اثر کی "نظم" ہے — اور

صفحات ۱۶ تا ۱۸ پر خود آپ کی نظم "جلو چل کے جنگل میں منگل منائیں" ہے۔

غالباً یہ نظمیں اپنے مصنفین کے شاہکار نہیں ہیں۔ آپ سب نے ان سے بہتر نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں یا لکھ سکتے ہیں۔ ان مصنفین نے آپس میں کوئی سمجھوتہ یا سازش بھی نہیں کر رکھی تھی کہ ایک یہ لکھے گا اور دوسرا وہ۔ ان میں بعض کسی مذہب و مسلک کے پیرو نہیں اور بعض کسی اور مذہب و مسلک کے پابند۔ بعض نئی چال کے ہیں بعض پرانی چال کے۔ بعض ان کے بین بین ہیں۔ زبان، موضوع، اسلوب، آہنگ، غرض شاعری کے جتنے رنگ ہیں جس نے جس طرح چاہا اختیار کیا ہے۔ ان میں ہر طرح کے نمونے ملیں گے۔ ایسے جن کو خواص سمجھیں، ایسے جن کو عوام پسند کریں اور ایسے بھی جن کو دونوں پسند کریں۔ کہیں بات نئی ہے، کہیں انداز نیا ہے۔ کہیں زبان کا جادو ہے، کہیں زبان کا منتر، کہیں اشارے کا معجزہ ہے، کہیں ابہام کا طلسم۔ کہیں موتی نکالے ہیں، کہیں پھول کھلائے ہیں۔ بات جھوٹ کہی، سچ کہی ہو، بے خودی میں کہی ہو، ہوشیاری میں کہی ہو۔ زمین کی کہی ہو، آسمان کی کہی ہو۔ تھوڑی کہی ہو، زیادہ کہی ہو۔ آج کی کہی ہو، کل کی کہی ہو۔ جو بھی کہی ہو، لیکن جو کہی وہ کام کر گئی۔

آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ گیرائی یہ گہرائی یہ بلندی یہ نزاکت یہ رعنائی یہ سادگی یہ سلامت یہ صلابت یہ توانائی آسمان سے اُتری، مذہب نے سکھائی، سیاست نے منوائی، دہر یا جادو نے پھیلائی؟ تو پھر یہ کہاں سے آئی اور کیوں آئی۔ لیکن قبل اس کے کہ کچھ اور کہا جائے۔ آپ زیر نظر اشعار کو ذہن میں تازہ کر لیں۔

ساغر نظامی کی نظم "آہنگ" (فن کاروں کا کورس) کے یہ دو بند ملاحظہ فرمایئے۔

زندگی خواب تھی اور خواب گراں ہی رہتی
زندگی راز تھی اور راز جہاں ہی رہتی
ایک ابہام تھی، ابہام نشاں ہی رہتی
زندگی رمز تھی اور رمز نہاں ہی رہتی
منکشف تجھ پہ کیا رمز جہاں کو ہم نے

تیری ہمت نے نہیں تیری شجاعت نے نہیں
تیری محنت نے نہیں تیری مشقت نے نہیں
تیری قدرت نے نہیں تیری سیاست نے نہیں
تیری دولت نے نہیں تیری حکومت نے نہیں
ہم نے فردوس بنایا ہے جہاں کو ہم نے!

شاعر فن کار یا شخص کا دعویٰ آپ نے سُن لیا۔ اس کا کارنامہ بھی آپ کے سامنے آگیا۔ اس کا تیور یا ترنگ بھی آپ نے دیکھ لی۔ اسکی صداقت بھی مان لی۔ وہ زمانے کے ساتھ ہے۔ زمانے سے پیچھے ہے یا اس کے آگے ہے۔ اُسے سوچتے رہیئے گا۔ اس کے بعد حسرت کی غزل ہے جس کے یہ چند اشعار سنیئے۔

برسرِ لطف ہے وہ جانِ جہاں آج کی رات
دیدنی ہے یہ مروّت کا سماں آج کی رات

بے کہے اُف یہ ہے روشن مرے دل کی خواہش
بے زبانی ہوئی جاتی ہے زباں آج کی رات

شوق کا شکوۂ رنگیں بھی نہ ہوگا شاید
حُسن کی خاطرِ نازک پہ گراں آج کی رات

التفات اُن کی نگاہوں کا ستم ہے حسرت
شکر بھی دل کی زباں پہ ہے فغاں آج کی رات

وہ لوگ آپ کے نزدیک کیسے ہیں اور کیا ہیں جو "آج کی رات" کے کیف و کرشمہ کو اس طرح محسوس کرتے ہیں جو ان اشعار میں بتائے گئے ہیں اور وہ شاعر کون اور کیسا ہے۔ جو ان کرشموں کو آب و رنگ دیکر ہم کو زندگی کی اُن کامرانیوں سے بہرہ مند کرتا ہے جو ہمارے دل و دماغ سے اوجھل تھیں۔ کتنے شاعر کیسا تمدن، کیسی زبان، کیسا مذاق یا شعور اور زندگی کی کیسی کیسی نیچ اونچ کیسے کیسے لوگوں پر کس کس طرح اور کتنے دنوں گذری ہوگی، جب کہیں "آج کی رات" اس غزل میں حسرت کے قبضے میں آئی ہوگی جس کے لطف کو انھوں نے ہم سب کے لئے ارزاں بنا دیا۔ احباب کہیں گے یہ عشق ورزی بورژوا قسم کی ہے اور اسے پھونک دینا چاہیئے یا یہ اب چلن سے خارج ہے۔ لیکن یہ بات بھی تو نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ زبان ہو شاعری ہو شاعر ہو۔ انہیں سے کسی کا کاروبار صرّافی کا کاروبار نہیں ہے کہ آپ اسے جب چاہیں شرحِ مبادلہ زر سے زیر و زبر کر دیں۔ یہ کوئی پیشہ بھی نہیں کہ آپ مزدوری اور معاوضے کا نرخ گھٹا بڑھا کر اس کی قدر و قیمت گھٹا بڑھا دیں۔ یہ تو زبان اور زندگی کے نکھرنے سنورنے سے آتی ہے۔ یہ نفسیات یا معاشیات کا ایسا مسئلہ نہیں ہے جتنا طبیعتوں کی نفاست اور شرافت کا۔

بے محل نہ ہوگا اگر میں ترتیب سے ہٹ کر یہاں جگر کی غزل کے کچھ اشعار لے لوں جن کا حوالہ اوپر دے چکا ہوں۔

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ

مجھے چاکِ جیب و دامن سے مناسبت نہیں کچھ
یہ جنوں ہی کو مبارک رہ و رسمِ عامیانہ

ترے عشق کی کرامت یہ اگر نہیں تو کیا ہے
کبھی بے ادب نہ گذرا مرے پاس سے زمانہ

مرے ہمصفیر بلبل میرا تیرا ساتھ ہی کیا
میں ضمیرِ دشت و دریا تو اسیرِ آشیانہ

ہیں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں جو ہے فرق مجھ میں تجھ میں
ترا درد دردِ تنہا مرا غم، غمِ زمانہ

غزل میں حسرت کا خوشگوار شائستہ اور منجا ہوا رنگ آپ نے دیکھ لیا ہے۔ اب جگر کو دیکھیئے جن کے بارے میں ایک عزیز نے حال ہی کے "آج کل" میں عجیب باتیں عجیب تر انداز میں لکھی ہیں۔ فرصت ہوئی تو کبھی ان پر بھی اظہار خیال کروں گا۔ حسرت ہی کی محفل میں جگر کی آواز سنئے۔ چاکِ جیب و دامن، جنوں، ہمصفیر بلبل، ضمیرِ دشت و دریا، اسیرِ آشیانہ، سب کے سب ان دلوں مردود ہیں یعنی روایتی، بدیسی، بورژوا اور معلوم نہیں اور کیا کیا لیکن یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ یہ الفاظ یہ فقرے، یہ علامتیں کہاں سے آئیں، کیوں آئیں، کیسے آئیں۔ ان کے پیچھے کیسے کیسے لوگوں کا علم و فضل، ذوق و شوق، ریاضت، نفاست اور شائستگی کتنی کڑی مدّت تک ہر آن و ہر لحظہ برسرِ کار رہی ہوگی۔ تب کہیں ان الفاظ اور فقروں میں جان آئی ہوگی اور ان میں وہ جہانِ معنی پیدا ہوا ہوگا۔ جہاں انسان کی فضیلت اور فرزانگی تقویت پاتی ہے اور آگے بڑھتی ہے۔ یہ علامات یا اصطلاحات بے شک روایتی ہیں۔ اِن میں روایت مضمر ہوتی ہی ہے۔ لیکن انکی اس کرامت کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہمارے نئے شعور اور نئے حوصلوں کا اس طور پر ساتھ دیتی ہیں جیسے انھیں کے لئے وضع ہوئی ہیں جس دن یہ سطور "آج کل" میں شائع ہو کر ناظرین تک

پہنچیں گی۔ اس دن تک زمانہ اور زندگی جہاں تک پہنچ چکی ہوگی۔ ایک روایتی غزل گو کا یہ کہنا

کبھی بے ادب نہ گذرا مرے پاس سے زمانہ

یا میں طیبرِ دشت و دریا تو اسیرِ آشیانہ

یا تیرا درد، دردِ تنہا، مرا غم غمِ زمانہ

غزل ہی نہیں انسانی عزائم کی برگزیدگی کا ثبوت ہوگا۔

جگر اور غزل کا کارنامہ آپ اوپر دیکھ آئے ہیں، اس کے بعد دیکھئے تو جگر اور غزل دونوں اپنی اپنی جگہ پر قائم بالذات ہیں مثلاً

تجھے اے جگر ہوا کیا کہ بہت دنوں سے پیارے
نہ بیانِ عشق و مستی نہ حدیثِ دلبرانہ

ایک دفعہ اور ترتیب سے ہٹ کر 'فراق' کے ترانے کو سامنے رکھئے۔ جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

جلوۂ شیشہ و جام چھا چھم موجِ مئے گلفام چا چم
قامتِ ساقی برقِ دمادم، اُن کا کہاں جواب
اُن کا کہاں جواب رے ساقی اُن کا کہاں جواب
ساقی سینوں میں آگ لگی ہے، کیسے بجھے یہ آگ
ساقی کیسے بجھے یہ آگ۔ بادہ بھی ہے کمیاب
بادہ بھی کمیاب رے ساقی بادہ بھی ہے کمیاب
مٹ مٹ کر دل سنور گئے ہیں اُجڑ اُجڑ کر نگر بسے ہیں
نام ہوئے ہیں کام بنے ہیں۔ کردے جہاں کو خراب
کردے جہاں کو خراب رے ساقی کردے جہاں کو خراب
دورِ تمدن لاکھوں بیتے کب انسانوں کو آئیگی
رندوں کی تہذیب —— پینے کے آداب
پینے کے ہیں آداب رے ساقی پینے کے ہیں آداب

فراق اردو ہندی انگریزی سب کے 'رازِ درونِ خانہ' سے واقف ہیں اور اُن پر اپنی مستقل رائے رکھتے ہیں۔ رائے ہی نہیں اپنی اجتہادی اصلاحوں کے سلسلے میں نیک نام بھی ہیں بدنام بھی۔ ہند وتخیل، ہندی زبان، ہندی لہجہ اور ہندی عروض کو اردو میں خوبی اور خوبصورتی سے سموتے ہیں۔ ان کے وہاں تخیل کی پرواز، تصور کی لذت یا لذت کا تصور اور فکر کی گہرائی ملتی ہے۔ زندگی اور زمانے سے ہمعنان رہتے ہیں۔ شاعری کے مقصد کو شاعری کے ٹکنک پر قربان نہیں کرتے جذبات کے اظہار یا مصوری میں کبھی کبھی بے جھجک ہونے میں بھی تامل نہیں کرتے جس پر اُن کے بعض معتقد دانتوں تلے انگلی دبا لیتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ اردو شاعری کے 'فارورڈ بلاک' میں کسی سے پیچھے نہیں۔

ان امور کو مدنظر رکھ کر ان کے مذکورہ صدر اشعار پر نظر ڈالیے۔ آپ کو ایک لفظ 'رے' بار بار آتا ملے گا۔ اسی محور پر نظم کا پورا محور گردش کرتا ہے۔ اس لفظ کے لطف کو وہ لوگ مشکل سے محسوس کریں گے جو پورب کی ہندی یا عوامی زبان کے رس سے آشنا نہیں ہیں۔ اس میں پورب کا مزاج اور مٹھاس ہے۔ وہ مزاج اور مٹھاس جو معلوم نہیں کتنے دنوں کی معلوم نہیں کتنی باتوں کی خمیر سے بنا ہے۔ یہ لفظ نہیں داستان ہے۔ یہ نغمہ جو ماضی کے دور کے بہت دُور کے دھندلکے سے برابر چلا آرہا ہے۔ بغیر اس خیال کے ہم ہماری زندگی یا ہماری شاعری ترقی پسند ہے یا رجعت پسند!

پھر ساقی سے تخاطب! ساقی کا تصور تمام تر فارسی ہے۔ فارسی اور اردو شاعری کی رامائن اور مہابھارتیں ساونت شاعر اور سورما سبھی ساقی کے سہارے جیتے جاگتے اور جگاتے ہیں۔ فراق نے اس پوری نظم میں ساقی کو وہ مقام دیا ہے۔ جہاں اردو اور ہندی کی فضا اور مزاج دونوں بڑی خوبصورتی سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ اس نظم میں ایسے اشعار بھی ہیں جہاں الفاظ اور آہنگ کی نمائش بعض کے نزدیک کی بھی غمازی کرتی ہے۔ پھر بھی ایسے اشعار نکل گئے ہیں جہاں شاعر کی بڑائی صریحی طور پر محسوس ہوتی ہے۔

اب سال نامے کی اپنی نظم کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

وہ گردوں پہ برنائیاں گنگنائیں کھلیں مستیاں شوخیاں چہچہائیں
جوانی کی انگڑائیاں رنگ لائیں وہ آئیں فضا پر مچلتی وہ آئیں
گمکتی گھمنڈتی گرجتی گھٹائیں
چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں
کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

ترانے ہیں نوخیزہ ساقی جواں ہے　　جنوں رقص میں ہے فسوں پرفشاں ہے

صراحی و مینک ہے سبو کہکشاں ہے　　گلابی میں ہے آگ سر پہ دھواں ہے

اٹھو چھائیں، لہرائیں دھومیں مچائیں

چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں!

کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

تلاطم میں ہے قلزم شادمانی　　صراحی کی آگ اور ساون کا پانی

رم و رقص باراں، مئے ارغوانی　　شراب و رباب و جمال و جوانی

اٹھو چھائیں ہنسیں، گن گنائیں

چلو چل کے جنگل میں منگل منائیں

کہ جنگل میں منگل منانے کے دن ہیں

اوپر کے اشعار میں آپ نے جس طرح دھومیں مچائی ہیں وہ شاعری کے اعتبار سے تو اتنی قابل اعتنا نہیں ہیں جتنی سر چکرا دینے اور وجد میں لانے والی آپ کی قدرت زبان و بیان کے اعتبار سے۔ زبان و بیان اور اظہار و ابلاغ پر آپ کو جو بے پایاں و بے پناہ قدرت حاصل ہے وہ نظم میں انیس اور نثر میں محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد کے بعد شاید ہی کسی ادیب کے حصے میں آئی ہو۔ آپ کو شاعری میں بڑا دھما کا اور بڑی ترنگ ہے۔ بقول قاضی جلال الدین مرحوم

کٹے ان کے رگ رگ میں اعصاب ہیں!

ایک لطیفہ سنئے، ایم، اے، او کالج (مسلم یونیورسٹی) میں میں دو سال تک قاضی صاحب مرحوم کا شاگرد رہا ہوں۔ قاضی صاحب کے لطائف و ظرائف سے آپ بھی غالباً ناواقف نہ ہوں گے۔ دعوت پر نظمیں بڑی مزے کی لکھتے تھے۔ ایک دعوت میں انواع اقسام کے کھانوں پر تبصرہ کیا گیا۔ اس نظم کا ایک شعر یاد رہ گیا جس کا دوسرا مصرعہ اوپر آیا ہے۔ شعر یہ تھا۔

مقوی بہت ہیں یہ شامی کباب

کٹے ان کے رگ رگ میں اعصاب ہیں

میرے دل میں اکثر یہ خیال آیا ہے کہ اللہ نے بڑی خیریت کی کہ آپ شاعر ہوئے اور اسی قسم کے دو ایک اور امراض آپ کو لاحق ہو گئے۔ ورنہ کم سے کم میرے تو آپ چھرا بھونک ہی دیتے۔ امکان اب بھی ہے۔ ایک کٹر قبائلی پٹھان اور کر ہی کیا سکتا ہے۔ یا تو آنکھ بند کرکے چھرا بھونک دے یا آنکھ بچائے اور ڈونبہ کھلائے۔

آپ سے متعلق بہت سی بے ضرورت اور بے تکی باتیں لکھ گیا۔ برا نہ مانئے گا۔ برا ماننے سے زندگی کم اور ذہن کند ہو جاتا ہے۔ میرا ذہن برا ماننے سے پہلے ہی کند تھا۔ میں نے اس کا برا نہ مانا۔ کند ذہن اور کسے کہتے ہیں۔

داستان طویل ہو گئی اور جو بات کہنی تھی وہ اب تک نہ کہہ سکا۔ اب میں ان شعراء کا کلام پیش نہ کروں گا جن کا حوالہ اوپر دے آیا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ وہ سارے گن جو اوپر گنائے گئے ہیں وہ کیا ہوئے۔ کیا وہ ایسے ہی تھے کہ ان کا انجام یہ ہوتا۔ ہندوستان اور صرف ہندوستان میں وجود میں آنے والی جس زبان نے ملک کو لسانی اتحاد و یگانگت کا پیغام دیا جس کے شعراء اور ادیبوں نے وطن کو محکومی سے نجات دلانے میں شاید سب سے زیادہ کوشش کی جس کی خدمات سے اب بھی زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور جس زبان میں ہندوستان کی تمام دوسری زبانوں سے کہیں زیادہ مختلف مذہب و ملت و مسلک کے پیرو، مسلم الثبوت شاعر اور ادیب ہوں، اس کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

جاں نثار اختر

غزل

سازِ بے مطرب و مضراب نظر آتے ہیں
پھر بھی نغمے ہیں کہ بیتاب نظر آتے ہیں

کیا گلستاں ہے کہ غنچے تو ہیں لب تشنہ و زرد
خار آسودہ و شاداب نظر آتے ہیں

وہی محفل ہے، وہی زینت محفل ہے مگر
کتنے بدلے ہوئے آداب نظر آتے ہیں

قافلہ آج یہ کس موڑ پہ آپہونچا ہے
راہ رو مضطر و بیتاب نظر آتے ہیں

آج کی دھوپ میں تپتے ہوئے کتنے ذرّے
کل کے خورشید جہانتاب نظر آتے ہیں

کل کرینگے یہی طغیان گل تر پیدا
آج جو آگ کے سیلاب نظر آتے ہیں

کل یہی خواب حقیقت میں بدل جائیں گے
آج جو خواب فقط خواب نظر آتے ہیں

بچ کے طوفان سے ساحل کی پناہیں کب تک
اب تو ساحل پہ بھی گرداب نظر آتے ہیں

کونسا مہرِ درخشاں ہے ابھرنے والا
آئینے دل کے شفق تاب نظر آتے ہیں

مسکراتے ہوئے فردا کے افق پر اختر
ایک کیا سیکڑوں مہتاب نظر آتے ہیں

پریم کمار جین

نعرۂ قوّت و حیات

اے ساربانِ وقت! نقیبِ بلند و پست
میری جلو میں محملِ کون و مکاں ہے آج

اس بے پناہ ذہن کی وسعت کے فیض سے
آفاق گیر حلقۂ وہم و گماں ہے آج

یہ کہکشاں نہیں ہے مری رہگذر ہے دوست
یہ رہگذر نہیں ہے مری، کہکشاں ہے آج

حور و قصور و واعظ و غلماں سے ہوشیار
جنت پہ عکسِ آتشِ رطلِ گراں ہے آج

ہے کون، روک دے جو یہ دیوانہ وار رقص
طوفاں بدوشِ موجۂ سیلِ رواں ہے آج

بہرِ نوازشِ دلِ گیتی و قلبِ ارض
انجم شکار مطربۂ آسماں ہے آج

جن سبز وادیوں میں خدا کا گزر نہیں
ان سبز وادیوں میں مرا کارواں ہے آج

دنیا پلٹ رہی ہے سوئے دورِ رقص و رنگ
پیرِ مغاں جواں ہی نہیں نوجواں ہے آج

ہے کون حکمرانیٔ کل میں مرا رقیب؟
صرف ایک خدا تھا کل — سو وہ عرش آشیاں ہے آج

اب کیا مجال آنکھ ملائیں حقیقتیں؟
افسانہ میں ہوں اور وہ افسانہ خواں ہے آج

ل احمد اکبرآبادی

تاریخ کا ایک بھولا ہوا ورق

یہ ایک خونِ آشام انسان کا ذکر ہے جسے تاریخ نے "شعلہ قلب" کہا ہے، نصیبہ در فاتح کہا ہے، اس کا ذکر ہے جو ساری دنیا کو تباہ و مسمار کر دینا چاہتا تھا۔ یا پھر یہ صنف عورت کا قصیدہ ہے اس کا جو انسان کی ماں ہے جو فاتح کل حیات کا دائم و مسلسل سرچشمہ ہے۔ یا پھر ظلم و سفا کی شکست اور راحت و محبت کی فتح کی داستان ہے۔

ہاتھی کے پاؤں تلے جو حالت دیمک کے گھروندے کی ہو جاتی ہے تیموری یلغار نے دنیا کی آبادیوں اور شہروں کی پچاس سال تک یہی حالت بنا رکھی تھی۔ اس کی فوجوں کے جرار لشکر نے دنیا کو روند ڈالا تھا جس طرف منہ اٹھ جاتا تھا سرخ خون کی ندیاں جاری ہو جاتی تھیں۔ اس فاتح عالم نے اپنی فتح و ظفر کی یادگاریں انسانی کھوپریوں کے منار بنا کر قائم کی تھیں۔ اس کی ہلاکت آفرینیوں نے موت کے فرشتے کو شرما دیا تھا۔ اسے معطل کر دیا اور مایوسی کی موت سے مار دیا تھا! یہ سب اس لئے تھا کہ وہ زندگی سے اپنی چاہیتے بیٹے جہانگیر کی موت کا بدلا لے!

جہانگیر کی موت نے جس دن سمرقند کے باشندوں کو سیہ پوش اور خاک بسر کیا اس دن سے لے کر اس دن تک جب اسرار میں موت کے فرشتے نے خود تیمور کو زیر کیا۔ اس تیس برس کی مدت میں کسی نے تیمور کو مسکراتے نہیں دیکھا۔ اس کے ہونٹ سل گئے تھے، گردن تن گئی تھی اور رحم و مروت کے لئے دل کے دروازے مقفل ہو گئے تھے!

گیت گائیے عورت، مادر انسان کے، اس تنہا قوت کے جس کے سامنے فرشتۂ موت سرنگوں ہو جاتا ہے! قصیدہ پڑھئے اس عورت کا اس ماں کا جس کی محبت کے سامنے ملک الموت کے قائم مقام سنگدل تیمور نے سر جھکا دیا!

خراسان کی وادی کمنی گل میں جس کو سمرقندی شاعروں نے وادیٔ گل نام دیا تھا، اس وادی میں جس پر گلاب کے بادل چھائے رہتے تھے جہاں یاسمینی خوشبو سے ہوائیں لدی رہتی تھیں۔ جس وادی میں محلوں اور مسجدوں کے نیلے گنبد و مینار سر بلند نظر آتے تھے۔ اس رنگین و معطر وادی میں تیموری حکم کے مطابق سلطان بایزید پر فتح پانے کا جشن منایا جا رہا ہے!

پندرہ ہزار خیموں کا پنکھے کی شکل پر کیمپ لگا ہوا ہے، ہر خیمہ لالے کی شکل کا ہے اور ہر خیمے پر بے شمار پرچم اور جھنڈیاں اڑ رہی ہیں۔ وادی کی معطر ہوائیں ان جھنڈیوں سے اٹھکھیلیاں کرتی گزر رہی ہیں۔ اس شہر خیام کے بالکل بیچ میں پانچویں تیمور گورگاں کا شاہنشہی خیمہ اس طرح کھڑا ہے جیسے گوپیوں کے جھنڈ میں کنہیا! شاہی خیمہ چوکور ہے اور ہر طرف سے سو قدم ہے۔ اس کی اونچائی تین تیترے کی ہے۔ ریشمی خیمہ نیلی اور پیلی دھاریوں کا ہے اور وسط خیمہ پر ایک نیلی ریشمی چھتری لگی ہے خیمے کے چاروں کونوں پر چاندی کے چار عقاب بیٹھے ہیں۔ اندر سے یہ خیمہ سونے کے بارہ کھمبوں پر کھڑا ہے اور ہر کھمبہ انسانی جسم کی موٹائی کا ہے۔

خیمے کے وسط میں اوپر کی نیلی چھتری کے ٹھیک نیچے پانچواں گورگاں شہنشاہ تیمور ایک مرصع تخت پر بیٹھا ہے۔ وہ ایک ریشمی عبا پہنے ہے جس پر پانچ سو شاہوار موتی ٹنکے ہیں۔ سر پر ایک سفید سموری اونچی ٹوپی ہے جس کی ٹوپی پر ایک لعل گراں بہا لٹکا ہوا ہے۔ حرکت کے ساتھ جب عقیق جھومتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ کسی کی خونی آنکھ دنیا کی آبادی کا جائزہ لے رہی ہے! شہنشاہ تیمور کی شکل کسی چوڑے پھل والے خنجر سے مشابہہ ہے جو بار بار خون میں ڈوب کر زنگ آلود ہو گیا ہو۔ اس کی چھوٹی آنکھوں کے اندر نظر کی تیزی ایسی ہے کہ کوئی بات بچ نہیں سکتی ہے۔ اس کی نگاہیں خنک ہیں جیسے زمرد کی ٹھنڈی جوت! کانوں میں لنکا کے عقیق کے بندے لٹک رہے ہیں

رنگت میں کنواریوں کے ہونٹوں کی رنگت کو شرماتے ہیں -

تخت کی سطوت و جبروت کے سامنے خوبصورت اور بیش قیمت ترکمانی قالینوں کے فرش پر شاہی جشن و ضیافت کی تمام نعمتیں چنی ہوئی ہیں اور سونے کے تین سو جگ اعلےٰ شرابوں سے لبریز رکھے ہیں ۔ شہنشاہ کی پشت پر موسیقی طراز و نغمہ ساز طائفے ہیں اور شاہی قدموں میں بڑے بڑے شاہ اور شہزادے، خاں اور امیر اور اعیان مملکت بیٹھے ہیں۔ شہنشاہ سے قریب ترین جو شخص بیٹھا ہے وہ شاعر کرمانی ہے جس کی بادہ نوشی ضرب المثل بن گئی ہے - کرمانی وہ شاعر ہے جس سے ایک مرتبہ تیمور نے سوال کیا کہ "میں فروخت ہوتا ہوں تو تم کیا قیمت لگاؤ گے" ؟ کرمانی نے جواب میں کہا کہ "پچیس عسکر" ؟ تیمور نے پلٹ کر کہا کہ اتنے کا تو میرا یہ پٹکا ہے! تو کرمانی بولا کہ "میں نے قیمت تو پٹکے ہی کی لگائی ہے - خود آپ کی قیمت تو دمڑی بھی نہیں ہے! کرمانی کا جواب اور تیمور جیسے شاہنشاہ کو اصل میں شاعر کا جواب تھا جو حق بات کرتا ہے اور بجز حق کے کسی دوسرے کا خوف نہیں کرتا - سچا شاعر صداقت پر اس لئے جان دیتا ہے کہ صداقت ہی حسن ہے! اور وہی خدا ہے! آج کئی صدیاں گزر جانے کے بعد تیمور اور کرمانی کے نام جب لئے جاتے ہیں تو جو شان اور تفاخر کرمانی کے نام میں ہے وہ تیمور کے نام میں نہیں -

جشن فتحمندی شروع ہو جاتا ہے اور سارے لشکر میں خیموں کے اندر و باہر سینکڑوں قسم کے کھیل تماشے، کھانا پینا غرض ہر ممکن صورت میں رنگ رلیاں منائی جانے لگی ہیں - آج ہر شخص آزاد ہے - سب برابر ہیں! عیش و مسرت کے اس محشرستان میں اچانک ایک چیخ کی آواز سنائی دیتی ہے، ایک دردناک چیخ کی! اس چیخ کی آواز تیمور گورگاں بھی سن لیتا ہے - اور چیخ کے اثر سے اس کا عیش کرکرا ہو جاتا ہے - وہ ایسی دردناک چیخ تھی جیسی مادۂ عقاب کی چیخ ہوتی ہے، ایسی چیخ جس میں کسی کی مجروح روح شامل ہو گئی ہو! ایسی روح کی پکار جس پر موت نے زخم لگایا ہو، جو زندوں کے کان میں پہنچکر بے رحم بن جاتی ہو! سلطان بایزید کے فتح کرنے والے تیمور نے دریافت کیا کہ یہ کون چیختا اور جشن ظفر مندی کو مکدر کرنا چاہتا ہے تو جواب ملا کہ ایک اجنبی عورت ہے، گرد سے اٹی ہوئی اور پھٹا لباس ہے! عربی زبان میں مطالبہ کر رہی ہے کہ وہ اقلیم سہ گانہ کے حکمراں تیمور کی حضوری چاہتی ہے!

اسے حاضر کیا جائے!

خراب و خستہ، برہنہ سر اور برہنہ پا جس کے منتشر بالوں نے اس کے سینے کی پردہ پوشی کر رکھی تھی، شاہ شاہان تیمور کے تخت جبروت کے سامنے لائی جاتی ہے یہ عورت اپنے ہات تیمور کے سامنے پھیلا دیتی ہے مگر اپنی جگہ مستحکم اور نڈر دکھائی دے رہی ہے - ہات دراز کرتے ہوئے سوال کرتی ہے :-

"کیا وہ تو ہے جس نے سلطان بایزید کو مفتوح کیا ہے" ؟

"ہاں وہ میں ہی ہوں جس نے بایزید کے علاوہ بہت سے بادشاہوں کو تابع فرماں بنایا ہے! اور ان فتوحات سے ابھی میرا جی بھرا نہیں ہے لیکن تو بتا تو کون ہے اور کیا چاہتی ہے" ؟

"تو نے جو کچھ بھی کیا ہو، مگر ہے ایک مرد! میں ایک عورت اور ماں ہوں تو موت کا حکم بردار ہے، میں حیات کی ہوں! تو نے مجھ پر ظلم کیا ہے، میں اس کی تلافی چاہتی ہوں! مجھ سے کہا گیا ہے کہ علی الاصول ہمارا انصاف ہی طاقت ہے! مجھے اس کا یقین نہیں لیکن چاہتی یہی ہوں کہ تو میرے ساتھ انصاف کرے کیونکہ میں ماں ہوں"!

تیمور سفاک ضرور تھا مگر زیرک و ہوشمند بھی تھا - اس نڈر عورت کے دلیرانہ انداز تخاطب نے تیمور کو سمجھا دیا کہ اس کے اندر وہ کونسی طاقت ہے جس نے اس کو اس قدر دلیر و بیباک بنا دیا ہے! تیمور نے اس عورت سے کہا :-

"بیٹھ جاؤ اور پھر بتاؤ کہ تمہارا مقصد کیا ہے، میں تمہاری سنونگا!

اجنبی عورت وہیں بیٹھ گئی جہاں تیموری دربار کے سب سے زیادہ مقرب بارگاہ بیٹھ سکتے تھے اور کہنا شروع کیا :-

"میں اطالیہ کے ایک مقام سکرنو کی رہنے والی اور ایک مچھیرے کی بیوہ ہوں - میرا ایک لڑکا تھا جسے عرب کے ڈاکو اس وقت پکڑ لے گئے جب وہ اپنے باپ کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے گیا ہوا تھا - اس وقت اس کی عمر چھ سال کی تھی - میرا بیٹا بہت پیارا، دنیا میں سب سے زیادہ پیارا بچہ ہے"-

"جیسا میرا جہانگیر تھا! تیمور نے بے تاب ہو کر دخل در معقولات کیا -

"وہ سب سے زیادہ حسین اور ذہین بچہ ہے۔ میں دنیا بھر میں ڈھونڈھتی پھر رہی ہوں۔ مجھے یہ پتہ چل گیا تھا کہ سلطان بایزید کے آدمیوں نے ان سمندری لٹیروں کو پکڑ لیا تھا۔ اب تم نے بایزید پر فتح پائی اور اس کی ہر چیز تمہارے قبضے میں آئی ہے تو میرا بچہ بھی تمہارے قبضے میں ہے۔ میں تم سے اپنا بچہ واپس لینے کو آئی ہوں"!

یہ سن کر شاہ دشہزادگان اور امراء و اعیان جو اپنے آپ کو نہایت عقلمند سمجھتے ہیں سب ہی ہنس دئے اور کہنے لگے پاگل ہے! البتہ ایک شاعر کرمانی اس کو بہت غور سے دیکھا کیا تھا اور دوسرا خود تیمور حیرت زدہ اس کی باتیں سنتا رہا تھا۔ یہ دونوں نہیں ہنسے۔ کرمانی نے ان درباریوں کو مخاطب کرکے کہا:۔

"سچ مچ وہ پاگل ہے، اتنی پاگل جتنی کہ ایک محبت کرنے والی ماں ہوسکتی ہے"! متوالے کرمانی نے ان ہوشمندوں کے چٹکی لی۔ پھر دشمن امن و امان تیمور نے سوال کیا:۔

"اجنبی عورت! اتنے دور دراز فاصلے سے جس میں سمندر، پہاڑ، جنگل اور ندیاں سب ہی پڑتے ہیں تو یہاں پہنچی کیسے؟ تو درندوں سے کیسے بچ آئی؟ اور درندوں سے بڑے درندے انسان نے تجھے کیسے سلامت آنے دیا؟ انسان اپنا بچاؤ ہتھیار سے کرسکتا اور اس وقت تک محفوظ رہ سکتا ہے جب تک اس کے ہاتھوں میں اس کے استعمال کی طاقت رہے۔ مگر تیرے پاس تو کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا لیکن تجھے کوئی بھی صدمہ نہیں پہنچا۔ تیری بات کا یقین میں اس وقت کروں گا جب تو مجھے قابل اطمینان طریق پر یہ سمجھا دے گی کہ تو بچ کیسے سکی"؟

گیت گائیے عورت کے جو ماں بنتی ہے، قصیدہ پڑھئے ماں کا جس کی محبت حدود سے نا آشنا ہے! جس کے سینے نے سارے عالم کو پرورش کیا ہے! زندگی کی ہر وہ چیز جو حسین ہے وہ سورج کی کرنوں اور ماں کے دودھ سے ملی ہے! اور انسان کا زندگی سے محبت کرنا اسی کا نتیجہ ہے! اس عورت نے تیمور کو اپنے سفر کی تفصیل سنانا شروع کیا:۔

"اس سفر میں مجھے ایک ہی سمندر پار کرنا پڑا جس میں بہت سے جزیرے ہیں اور مچھیروں کی کشتیاں آسانی سے مل جاتی ہیں
اور جو اپنے پیارے کی تلاش میں نکلتا ہے تو اس سے سمندر کی ہوائیں بھی موافقت کرتی ہیں۔ پھر جو پیدا اور بڑھا پلا ہی سمندر کے کنارے ہو ندیوں کو تیر کر پار کر لینا اسے مشکل نہیں معلوم ہوتا۔ رہے پہاڑ! تو انہیں تو میں نے دیکھا ہی نہیں"!

نشے میں مخمور، شاعر کرمانی نے خوش ہوکر کہا:۔

"محبت کرنے والوں کے لئے تو پہاڑ میدان بن جاتے ہیں"!

اس عورت نے اپنا بیان جاری رکھا:۔

"جنگل بے شک بہت پڑے! جنگلی سوروں اور ارنے بھینسوں سے بھی بھینٹا ہوا۔ شیروں سے صرف دو دفعہ ملاقات ہوئی جن کی آنکھیں بالکل ایسی تھیں جیسی تمہاری ہیں۔ پر دل تو درندوں کے بھی ہوتا ہے! میں نے ان سے اس طرح باتیں کیں جیسے اس وقت تم سے کر رہی ہوں اور جب میں نے انہیں بتایا کہ میں ایک ماں ہوں تو ان کو میری بات کا یقین ہوگیا۔ وہ ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہوئے رم گئے۔ انہیں میرے اوپر ترس آگیا تھا۔ تم جانتے نہیں، یہ درندے اپنے بچوں کو اتنا ہی پیار کرتے ہیں جتنا انسان کو ہوتا ہے! وہ اپنی آزادی اور اپنی جان کے لئے اس طرح جنگ کرتے ہیں جس طرح انسان کرتا ہے"! تیمور نے مداخلت کرکے اس کی تائید کی۔

"عورت تو بالکل ٹھیک کہتی ہے۔ جانور اکثر اوقات انسان سے زیادہ محبت کرتے اور زیادہ ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں"! اس عورت نے پھر کہنا شروع کیا اور بالکل بچوں کی طرح کہنے لگی۔ کیونکہ ہر ماں کی آتما بچہ ہی ہوتی ہے:۔

"آدمی بوڑھا ہوجائے تب بھی اپنی ماں کی نظر میں بچہ ہی رہتا ہے۔ اور ہر آدمی کی ایک ماں ضرور ہوتی ہے۔ ہر آدمی کسی ماں کا بچہ ضرور ہے! تم بھی تو ایک ماں ہی کے پیٹ سے پیدا ہوئے اور بوڑھے ہوکر بھی اس کی نظر میں بچہ ہو! تم خدا کے منکر ہوسکتے ہو پر ماں کا بیٹا ہونے سے انکار نہیں کرسکتے!

حق پرست اور حق گو کرمانی پھر بولا:۔

"تو سچ کہہ رہی ہے عورت! بڑی سچی بات۔ بیلوں کے ریوڑ میں بچھڑ پیدا نہیں ہوسکتا! سورج نہ چمکے تو ایک پھول بھی نہ کھلے گا! محبت کے بغیر مسرت ایک واہمہ ہے! عورت کے بغیر محبت کا وجود معدوم ہے!

اور ماں نہ ہو تو نہ شاعر پیدا ہوگا نہ حکیم' نہ ہیرو ہونگے نہ سورما"!

اس عورت نے بیتاب ہو کر کہا :-

"میرا بچہ مجھے دلوا دو! میں اس کی ماں ہوں اور وہ مجھے بہت پیارا ہے! سلام ان ماؤں پر جنہوں نے بودھ' کنفیوشش' رام اور کرشن کو جنم دیا - جنہوں نے موسےٰ' عیسےٰ اور محمد کو پیدا کیا' جن کے پیٹ سے ہومر' فردوسی' سعدی و خیام جیسے شاعر' ارسطو و افلاطون جیسے حکیم' سکندر' نوشیرواں و اشوک جیسے بادشاہ پیدا ہوئے! سارے مہاپرش اپنی ماؤں ہی کے بچے تھے' اپنی ماؤں کا دودھ پی کر ہی پلے! ان ماؤں کو صد ہزار سلام جنہوں نے نوع انسان کو نش جاتی کو ایسے مہاپرش نذر کئے! دنیا میں ہر وہ چیز جس پر دنیا فخر کر سکتی ہے ماں کا ہی عطیہ ہے!

اس اجنبی عورت کے بیان نے لنگڑے شیر' آبادیوں کے اجاڑنے والے تیمور گورگاں کو سوچ بچار میں ڈال دیا تھا' وہ فکر و خیال میں منہمک ہو گیا تھا! بڑی دیر تک چپ رہنے کے بعد اس نے اپنے مقربین کو مخاطب کیا :-

" میں تنگری قلی تیمور! میں خدائی خدمتگار تیمور تم سے وہ بات کہتا ہوں جو کبھی چاہئے - سالہا سال میں نے زندگی کو فنا کی گود میں پہنچایا' ایسی تباہی کی کہ پاؤں تلے کی زمین بھی چیخ اٹھی! بیس برس تک میں اپنے پیارے بیٹے جہانگیر کی موت کا بدلا لینے کے لئے دنیا کو تہ و بالا کرتا رہا تاکہ زندگی کے سورج ہی کو گل کر دوں! لوگ مجھ سے برسر جنگ ہوتے - اس لئے کہ اپنی سلطنتوں کو' اپنے شہروں کو بچائیں! لیکن کوئی بھی انسان کو بچانے کے لئے مجھ سے نہیں لڑا! اس لئے میں واقف نہ تھا کہ انسان اور انسانیت کوئی قابل قدر شے ہے! مجھ تیمور نے بایزید پر فتح پائی اور جب وہ زنجیر و سلاسل میں میرے سامنے پیش ہوا تو میں نے اس سے کہا تھا - بایزید! ملک اور انسان خدا کی نظر میں بے معنی الفاظ ہیں' بے وقعت چیزیں ہیں! ورنہ وہ ایسے لوگوں کے حوالے نہ کر دیتا جیسے ہم تم ہیں - ایک کانا دوسرا لنگڑا!

"میں تیمور' خدائی خدمتگار تم سے وہ بات کہتا ہوں جو مجھے کہنا چاہئے! ایک اجنبی عورت یہاں میرے سامنے بیٹھی ہے' کرداروں میں سے ایک عورت اس عورت نے میرے اندر ایک احساس کو زندگی دے دی ہے جس سے میں پہلے واقف نہ تھا! وہ مجھ سے رو در رو بے خوف و ہراس باتیں کرتی ہے اس نے میرے سامنے دست سوال نہیں بڑھایا بلکہ ایک مطالبہ پیش کیا ہے! میں اس عورت کے بے خوفی اور طاقت کے راز کو جانتا ہوں' وہ طاقت کا راز اس کی محبت ہے! اسے اپنے بچے سے محبت ہے اور اسے یقین ہے کہ اس کا یہ بچہ ہی شعلہ حیات' جیون چنگاری ہے جو آنے والی صدیوں میں زندگی کے شعلے کو روشن رکھے گا! کیا انبیا و اوتار بچے نہ تھے؟ سورما اور ہیرو نحیف و کمزور نہ تھے؟ آہ' جہانگیر! میری آنکھوں کی روشنی جہانگیر! شاید تو بھی اس تاریک کرۂ ارض کو روشن کرنے اس دنیا میں خوشی اور مسرت کا بیج بونے کے لئے ہی بھیجا گیا تھا مگر اس دنیا کو تیرے باپ تیمور نے خون سے آلودہ کر دیا"!

زمین کے پردے پر قوموں کی وبا' تیمور اتنا کہہ کر خموش ہو گیا خموش رہا اور پھر کہنے لگا :-

"میں' خدائی خدمتگار تم سے وہ بات کہتا ہوں جو مجھے کہنا چاہئے! تین سو گھوڑے سوار میری مملکت کے ہر گوشے میں دوڑ جائیں گے اور اس عورت کے بچے کو ڈھونڈ کر لائیں گے یہ عورت یہاں انتظار کرے گی اور اس کے ساتھ میں تیمور بھی انتظار کروں گا! جو سوار اس بچے کو لے کر آئے گا دولت اس کا مقسوم ہوگی! عورت' بتا میں نے ٹھیک کہا؟

اس عورت نے گردن کے جھٹکے سے بکھرے ہوئے بالوں اپنے چہرے پر سے ہٹا کر کہا :-

"بادشاہ! تو نے ٹھیک بات کہی"!

اس جواب پر خوفناک بڈھا' شہنشاہ تیمور کھڑا ہو گیا اور خمیدہ کمر ہو کر اس اجنبی عورت کی تعظیم بجا لایا - اس نظارے نے شاعر مسرت کرمانی کو بے حد مسرور کیا وہ فرط مسرت میں گانے لگا :-

"پھولوں کے گیتوں سے اور ستاروں کے نغموں سے حسین تر شے کونسی ہے؟

اس سوال کا جواب ہر آدمی دے سکتا ہے - وہ چیز محبت کا زمزمہ ہے!

بہار کے دنوں میں نصف النہار کے سورج کی شعاعوں سے زیادہ حسین چیز کونسی ہے؟

عاشق جواب دیتا ہے۔ وہ جسے میں چاہتا ہوں!
اُف! آدھی رات کے آسمان پر چمکتے تارے کتنے سُندر ہیں!
اور یوم بہار کا درخشاں سورج کیسا دلکش ہے!
لیکن میرے محبوب کی آنکھیں ستاروں سے زیادہ خوبصورت ہیں!
اس کی مسکراہٹ سورج کی کرنوں سے زیادہ روح افزا ہے!
ہاں، مگر سب سے زیادہ مدھر گیت، سب سے زیادہ دلکش نغمہ ابھی گایا جانے والا ہے۔
مادر گیتی پر ہر چیز کی ابتدا کا گیت! جادو طراز قلب کائنات کا نغمہ! اس کا نغمہ جسے ہم ماں پکارتے ہیں!
شہنشاہ تیمور نے اپنے محبوب شاعر کو مخاطب کیا:۔
کرمان! خدا نے اپنی نعمتوں کے بیان کے لئے تیری زبان، اپنی حکمتوں کے اعلان کے لئے تیرے ہونٹ منتخب کر کے غلطی نہیں کی!

محمود بادہ کرمان نے بتایا۔
"اس لئے کہ خدا خود سب سے بڑا شاعر ہے"!
اجنبی عورت مسکرا پڑی۔ سارے شاہ اور شہزادے، اعیان اور مقرب بھی مسکرا دئے۔ اب ان کی نظر اس اجنبی عورت پر پڑی تو وہ سب بھی اپنے آپ کو بچہ محسوس کرنے لگے!
اس بیان میں کوئی لفظ مبالغے کا نہیں، ہر لفظ حقیقت و صداقت کا اعلان ہے! کہ انسان کی ماں ایسا ہی سمجھتی ہے اس سے سوال کرو تو وہ یہی جواب دے گی!
بلا شبہ یہ بیان دوامی حقیقت کا بیان ہے! ہم موت سے زیادہ قوی ہیں! ہم جو دنیا کو ہمیشہ سے حکیم، شاعر اور ہیرو دیتے چلے آئے ہیں! ہم جو انسان کے اندر وہ بات پیدا کر دیتے ہیں جو اس کو ساتوں سے مالا مال کر دیتی ہے! (میکسم گورکی)

اشرف بھوپالی

آزاد انڈونیشیا

انڈونیشیا کی آزادی سے ایشیا اور یورپ میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ دنیا کی تمام امن و آزادی پسند قوموں نے انڈونیشی عوام کی آزادی پر اظہار اطمینان کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ متحدہ وفاقی انڈونیشیا کی تشکیل سے ایشیا کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ مدت دراز سے ایشیا یورپ کے نوآبادیاتی اقتدار کے پنجے میں پھنسا ہوا چلا آتا ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کو تو صرف دو سو سال ہی ہوئے تھے لیکن انڈونیشیا میں ڈچ اقتدار کی عمر اس سے سو سال زیادہ تھی۔ آج اگرچہ ملایا، ہند چینی، ویٹ نام، ہانگ کانگ اسی طرح یورپ کے محکوم ہیں جس طرح انڈونیشیا تھا۔ لیکن اس کی آزادی نے اس نوآبادیاتی اقتدار پر ایک ضرب کاری لگائی ہے اور اب یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ ایشیا میں یورپ کا سیاسی اقتدار صرف چند روز کا مہمان ہے۔ آزادی کی جو لہر انڈونیشیا سے اٹھی ہے وہ ہند چینی، ملایا اور ویٹ نام وغیرہ کو اس آہنی پنجہ سے نجات دلا کر رہے گی۔

مختصر جغرافیہ

انڈونیشیا کم و بیش تین ہزار جزیروں پر مشتمل ہے جن میں بڑے بڑے جاوا، سماٹرا، نیوگنی اور بورنیو ہیں۔ یہ جزیرے بحر ہند سے بحر الکاہل تک ایک ہزار میل تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جن کا مجموعی رقبہ ۷۵۳۰۰۰ مربع میل ہے۔ چونکہ یہ جزیرے خط استوا پر واقع ہیں اس لئے یہاں تمام سال موسم گرم رہتا ہے، لیکن بعض پہاڑی علاقوں میں درجہ حرارت کم ہو جاتا ہے۔ خط استوا پر واقع ہونے کے باعث تقریباً تمام سال بارش ہوتی رہتی ہے۔ اسی وجہ سے انڈونیشی جزائر اپنے جنگلات اور زمینی پیداوار کے لئے مشہور ہیں۔ چاول، مکئی اور ساگو یہاں کی خاص پیداواریں ہیں۔ ان کے علاوہ ربڑ اور ناریل وغیرہ بھی بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں آبادی کا اندازہ ۶ کروڑ سے زیادہ کیا گیا تھا، لیکن سنہ ۱۹۴۵ء کے اعداد و شمار کے مطابق کل انڈونیشیا کی آبادی ۷ کروڑ بیس لاکھ ہے جس میں سے صرف جاوا کی آبادی پانچ کروڑ ہے جو دنیا کا سب سے زیادہ آباد خطہ ہے۔ انڈونیشیا قدیم زمانہ سے مختلف قوموں کا مرکز رہا ہے۔ یورپ اور ایشیا کی مختلف قومیں انڈونیشیا منتقل ہوتی رہی ہیں، اور انھوں نے وہاں توطن اختیار کر لیا ہے مذہب کے لحاظ سے مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور سات کروڑ باشندوں میں سے چھ کروڑ مسلمان ہیں۔

مختصر تاریخ

بعض ماہرین کی رائے میں انڈونیشیا کی تاریخ ۵ لاکھ سال قبل شروع ہوتی ہے لیکن اس قدر قدیم زمانہ کے متعلق تفصیلات کا علم چونکہ ناممکن ہے اس لئے انڈونیشیا کی تاریخ تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع کی جاتی ہے جب کہ جنوبی چین کے صوبہ ینیان سے مقابلتاً ایک ترقی یافتہ قوم نقل مکانی کر کے جنوبی ہندوستان میں آکر آباد ہو گئی اور یہاں سے ملایا ہوتی ہوئی انڈونیشیا پہنچی چینی اور ہندوستانی کتابوں میں انڈونیشیا کا ذکر ملتا ہے اور یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ پہلی صدی عیسوی میں ہندوستان اور انڈونیشیا کے درمیان تجارتی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ اس زمانہ سے ساتویں صدی عیسوی تک ہندوستان کے ہندو باشندوں کی آمد و رفت انڈونیشیا میں رہی اور ان میں سے اکثر نے وہاں توطن اختیار کر لیا تھا۔ اس طرح انڈونیشیا کی تاریخ میں تمدنی ترقی کا پہلا زمانہ کہا جاتا ہے۔ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں بدھ مت پھیل گیا۔ اور گیارھویں صدی عیسوی میں وہاں ایک زبردست بدھ سلطنت قائم ہو گئی۔

سنہ ہجری کے ابتدائی سالوں سے عرب تاجروں کی آمد و رفت انڈونیشیا میں شروع ہو گئی تھی اور اسی وقت سے وہاں اسلام داخل

ہونے لگا تھا۔ پندرھویں صدی عیسوی میں انڈونیشیا میں ایک بڑی اسلامی سلطنت قائم ہو گئی۔ اس صدی سے وہاں مغربی قوموں کے قدم پہنچنا شروع ہوئے۔ سب سے پہلے پرتگالیوں نے سرزمین انڈونیشیا پر قدم رکھا (۱۵۱۱ء)۔ پہلے پہلے تو پرتگالیوں کا مقصد محض تجارت تھا، لیکن بہت جلد انھوں نے مقامی سیاست میں مداخلت شروع کر دی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں کے مسلمان حکمرانوں اور پرتگالیوں میں جنگ شروع ہو گئی جس نے انڈونیشیا سے پرتگالیوں کے اثرات کو ختم کر دیا۔ پرتگالیوں کے بعد اسپینی، فرانسیسی، ڈچ اور انگریزوں نے انڈونیشیا میں تجارت شروع کی۔ ڈچ ۱۵۹۲ء میں انڈونیشیا پہنچے اور بہت جلد انہوں نے وہاں ڈچ حکومت قائم کرنے کی حکمت عملی اختیار کر لی۔ جس کے نتیجے میں انڈونیشی مسلمان حکمرانوں اور ڈچوں میں جنگ شروع ہو گئی اٹھارھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی طاقت میں کمی کے باعث ڈچوں نے طاقت حاصل کرنا شروع کی۔ تمام مسلمان ریاستیں یکے بعد دیگرے ختم ہوتی چلی گئیں اور ڈچ اقتدار قائم ہوتا چلا گیا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ جس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہندوستان میں برطانوی حکومت کا آغاز ہوتا ہے، اسی طرح ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی سے انڈونیشیا میں ڈچ حکومت شروع ہوتی ہے۔

سیاسی جدوجہد انڈونیشیا میں ڈچ اقتدار سے آزاد ہونے کی جدوجہد اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب سے کہ وہاں مسلمانوں کا زوال ہوا تھا۔ ۱۸۲۵ء میں ایک شکست خوردہ مسلمان بادشاہ کے لڑکے عبدالمجید دیپا نے ڈچوں کے خلاف سیاسی جدوجہد کا آغاز کیا اور ان کو شدید نقصان پہنچا، لیکن یہ کوششیں طاقتور ڈچ سامراج کے مقابلے میں ناکام رہیں۔ ۱۸۷۳ء میں انڈونیشیا کی آخری مسلمان حکومت اور ڈچوں کے درمیان جنگ شروع ہوئی اور مسلمان لیڈر تنکو کی زیر قیادت انڈونیشی عوام نے ڈچوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا لیکن ۱۹۰۳ء میں مسلمان سلطان گرفتار ہو گیا، اس کے علاوہ انڈونیشیا کے مختلف حصوں میں گاہ بگاہ ڈچوں کے خلاف بغاوتیں ہوتی رہیں لیکن جدید لائنوں پر سیاسی پارٹی ۱۹۰۸ء میں عالم وجود میں آئی جس نے ۱۹۱۷ء میں مکمل آزادی کو اپنا مطمع نظر قرار دیا۔ ۱۹۱۹ء سے ٹریڈ یونین کی تحریک نے زور پکڑا اور کسانوں اور مزدوروں کی ایک زبردست جماعت قائم ہو گئی جس نے ڈچ سامراج کے خلاف اپنی جدوجہد کو جاری رکھا۔ نومبر ۱۹۲۶ء سے لیکر جنوری ۱۹۲۷ء تک ملک میں زبردست بغاوت ہوئی لیکن ڈچ حکومت بغاوت فرو کرنے میں کامیاب ہو گئی اور ساڑھے پانچ ہزار سے زیادہ انڈونیشی جیلوں میں بھر دیئے گئے ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ڈچ حکومت بتدریج انڈونیشی عوام کو جمہوریت کی طرف لانے لگی۔ ۱۹۲۷ء میں ایک نمائشی خود مختار پارلیمنٹ قائم کی گئی جس میں انڈونیشی اور یورپینوں دونوں کو نمائندگی کے حقوق دیئے گئے۔ اس کے باوجود قومی تحریک زور پکڑ گئی۔ گذشتہ جنگ عظیم میں جاپان نے انڈونیشیا پر قبضہ کر لیا۔ اس قبضہ کے دوران میں بھی اور اس کے خاتمے کے بعد بھی قومی سیاسی پارٹیاں بدستور ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں مصروف رہیں۔ ان میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

۱۔ مشومی۔ انڈونیشیا کے مسلمانوں کی مجلس شوریٰ۔
۲۔ انڈونیشی نیشنلسٹ پارٹی۔
۳۔ انڈونیشی سوشلسٹ پارٹی۔
۴۔ انڈونیشی کمیونسٹ پارٹی۔
۵۔ انڈونیشی اسلامی پارٹیوں کا وفاق۔
۶۔ انڈونیشی عیسائیوں کی کیتھولک اور پروٹسٹنٹ پارٹیاں۔
۷۔ انڈونیشی عوامی پارٹی۔

ان کے علاوہ نوجوان کانگریس۔ حزب اللہ۔ انڈونیشی طالب علموں کی جماعت۔ نیشنل یونین اور دوسری جماعتوں نے بھی سیاسی جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا۔ انڈونیشی خواتین کی بھی ایک زبردست جماعت جس کا مطمع سیاسی آزادی کے علاوہ عورتوں کی اصلاح اور فلاح و بہبود بھی تھا۔ سب سے آخر میں پرجوش مسلمانوں کی ایک دہشت پسند جماعت دارالاسلام کے نام سے قائم ہوئی جس نے اس وقت بھی ڈچ حکمرانوں کے خلاف گوریلا جنگ لڑی جب کہ انڈونیشیا اور ڈچ حکومت کے درمیان انتقال اقتدار کی گفت و شنید ہو رہی تھی۔

اعلان جمہوریہ اگست ۱۹۴۵ء میں مجلس شوریٰ کی طرف سے قیام جمہوریہ کا اعلان ہوا اور جوگجاکارتا کو دارالسلطنت مقرر کیا گیا۔ ابتدا میں جمہوریہ پر سوشلسٹ کا زیادہ اثر رہا، جس کے لیڈر سلطان شہریار، وزیر اعظم بھی رہ چکے ہیں۔ ۱۹۴۶ء میں ڈچ حکومت سے ایک معاہدہ ہوا جس کو لنگاجاتی

معاہدہ کہتے ہیں۔ اس معاہدہ کی حمایت اور مخالفت میں مجلس شوریٰ میں اختلافات پیدا ہو گئے اور بائیں بازو نے اس کی حمایت سے انکار کر کے بغاوت کر دی۔ یہ بغاوت کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کی متحدہ بغاوت کہی جاتی ہے، لیکن جلد ہی اس بغاوت کو فرو کر دیا گیا۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر سوئیکارنو کے حکم سے بائیں بازو کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۹ جنوری ۱۹۴۸ء کو اپن وائل سمجھوتہ ہوا۔ اور مجلس شوریٰ نے ڈاکٹر حتیٰ (موجودہ وزیر اعظم) کی حکومت کی ڈچ حکومت سے گفت و شنید میں تائید کی۔ لیکن سوشلسٹ لیڈر ڈاکٹر شریف الدین نے مایوس ہو کر جمہوری حکومت کے خلاف ایک محاذ بنایا، اور کمیونسٹوں کے تعاون سے ستمبر ۱۹۴۹ء میں بغاوت کر دی۔ لیکن تین ہفتہ کے اندر اندر اس بغاوت کو فرو کر دیا گیا۔

جمہوری حکومت کا خاتمہ

۱۸ دسمبر ۱۹۴۸ء کو ڈچ حکومت نے جمہوریہ کے دارالسلطنت جوگجاکارٹا پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ ڈاکٹر سوئیکارنو صدر اور ڈاکٹر حتیٰ وزیر اعظم اور دوسرے ممتاز لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہی وہ رسوائے عالم اقدام ہے جس کو پولیس ایکشن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ڈچ حکومت کے اس اقدام سے ایشیا اور یورپ کے امن پسند ممالک اور عوام میں ناراضگی کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی۔ ہندوستان، پاکستان اور لنکا نے اس کے خلاف سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے ڈچ ہوائی جہازوں کی اپنے علاقوں پر پرواز کی ممانعت کر دی۔

ہندوستان کی خدمات

ہندوستان نے انڈونیشیا کی آزادی کی جدوجہد میں بہت نمایاں حصّہ لیا۔ کئی اعتبار پر انڈین نیشنل کانگریس اور انڈونیشیا کی آزادی کی جدوجہد میں مماثلت اور مشابہت رہی ہے۔ کانگریسی لیڈروں نے ہمیشہ انڈونیشی عوام کی جدوجہد کی اخلاقی امداد کی۔ ۱۹۴۸ء میں انڈونیشی جمہوریہ کے خلاف ڈچ پولیس ایکشن کی نہ صرف ہندوستان کی حکومت کی طرف سے مذمت ہوئی بلکہ ڈچ ہوائی جہازوں کی ہندوستانی علاقہ پر پرواز کی ممانعت بھی کر دی گئی۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے انڈونیشی معاملہ کو نہ صرف اقوام متحدہ میں پیش کرا کے اس کی پوری تائید بلکہ دہلی میں اس سلسلے میں ایشیائی کانفرنس بھی طلب کی۔

اقوام متحدہ

انڈونیشیا کی آزادی کا مسئلہ اقوام متحدہ کے سامنے ہندوستان کی طرف سے پیش کیا گیا۔ مجلس تحفظ کے سامنے پنڈت نہرو نے جو قرارداد پیش کی اس میں مطالبہ کیا کہ ڈچ حکومت یکم جنوری ۱۹۵۰ء تک متحدہ انڈونیشیا کو مکمل اختیارات اور اقتدار منتقل کر دے۔ ۲۸ جنوری ۱۹۴۹ء کو مجلس تحفظ نے انڈونیشیا کے متعلق چار طاقتوں کی ایک قرارداد منظور کر لی جس میں انڈونیشی لیڈروں کی رہائی اور جوگجاکارٹا میں جمہوری حکومت کے از سر نو قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اسی قرارداد کی رو سے اقوام متحدہ کا ایک انڈونیشی کمیشن مقرر کیا گیا جس نے ڈچ حکومت اور جمہوری لیڈروں کے درمیان گفت و شنید کی نگرانی ہی نہیں بلکہ اس میں امداد کی۔

ایشیائی کانفرنس

دہلی میں پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک ایشیائی کانفرنس طلب کی جس میں ایشیا کے بیشتر ممالک نے شرکت کر کے ڈچ پولیس ایکشن کی مذمت کی اور ایک قرارداد کے ذریعہ پولیس ایکشن کو اقوام متحدہ کے چارٹر کی صریحی خلاف ورزی بتایا گیا۔ اور مجلس تحفظ سے پرامن سمجھوتہ کی کوششوں کی درخواست کی گئی۔

بٹاویہ کا معاہدہ

اقوام متحدہ کے کمیشن کی نگرانی میں جمہوری لیڈروں اور ڈچ حکومت میں گفت و شنید شروع ہوئی۔ ۷ مئی کو فریقین کے نمائندوں کی طرف سے اعلان ہوا کہ ابتدائی امور پر سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ انڈونیشی وفاق پسندوں نے اس گفت و شنید میں نمایاں حصّہ لیا۔ بٹاویہ کے معاہدے کے مطابق جمہوری لیڈروں کی رہائی عمل میں آئی۔ جوگجاکارٹا سے ڈچ فوجیں ہٹائی گئیں اور رسمی طور پر از سر نو جمہوری حکومت کا قیام عمل میں آیا۔

معاہدۂ ہیگ

۲۳ اگست ۱۹۴۹ء کو ہیگ میں انڈونیشیا اور ہالینڈ کے درمیان گول میز کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ انڈونیشیا کے جمہوری لیڈروں اور وفاق پسندوں نے اس گفت و شنید میں حصّہ لیا۔ یکم نومبر کو ہیگ میں نئی انڈونیشیا کی حکومت کا جدید دستور شائع ہوا۔ جس کو جمہوری لیڈروں اور وفاق پسندوں کی ایک مشترکہ کمیٹی نے مرتب کیا تھا اس معاہدہ کی رو سے ۲۷ دسمبر ۱۹۴۹ء کو متحدہ انڈونیشیا کی نئی حکومت کو اختیارات منتقل کرنا طے پایا۔ چنانچہ اس تاریخ کو انتقال اختیارات عمل میں آیا۔ ڈاکٹر سوئیکارنو پہلے صدر اور ڈاکٹر حتیٰ وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ بٹاویہ میں ڈچ گورنر جنرل کے محل میں ایک شاندار تقریب عمل میں آئی اور نئی متحدہ انڈونیشیا کی حکومت کا تمام دنیا نے خیر مقدم کیا۔

شری بال کرشن شرما نوین

شری ایس. نجلنگپا

آئین ساز اسمبلی کے بعض ممبر

قہقہوں کی دنیا میں

۴

سیٹھ رام ناتھ گوئینکا

ڈاکٹر پی سبھرائن
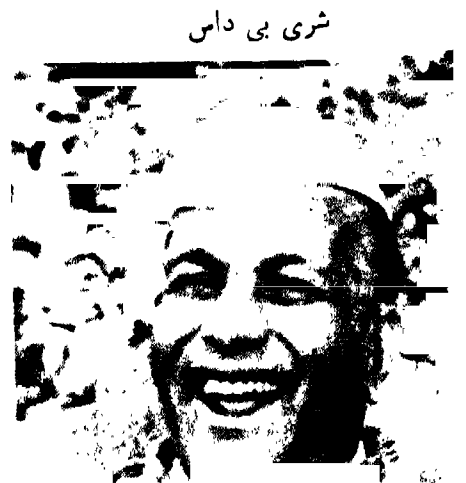
شری بی داس

بعض خواتین ممبر

شری مہاویر تیاگی

شریمتی پورنما بینرجی

نیچے بائیں طرف ۔
شریمتی درگا بائی

ابن الحسن فکر

شرلاک ہومز اور کونن ڈائل

جُرم پیشگی کی سب سے زیادہ دلچسپ پیداوار سراغ رسانی ہے۔ اگر جُرم نہ ہوتا تو سراغ رسانی کی ضرورت ہی کیا تھی! جُرم جوں جوں زیادہ پیچیدہ اور زیادہ ماہرانہ صورت اختیار کرتا گیا سراغ رسانی کا فن بھی زیادہ بیدار مغزی اور ہوشیاری کا طالب ہوتا گیا۔ الغرض جُرم اور تفتیشِ جُرم دونوں نے پہلو بہ پہلو چل کر ترقی کی منزلیں طے کیں۔ سائنس کی ایجادات نے دونوں کی مدد کی۔ دونوں نے ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ یہاں تک کہ اس جدید زمانے میں جرم اور سراغ رسانی کے درمیان ایک مقابلہ کی اسپرٹ، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے اور ایک دُوسرے کو شکست دینے کی کوشش جاری ہے۔ اب مجرم بھی سائنس داں ہے اور سراغ رساں بھی سائنس داں ہے۔ اور دونوں اس "گھوڑ دوڑ" میں پوری سرگرمی سے حصّہ لے رہے ہیں۔

لیکن جرم اور جُرم پیشگی نے ہم پر ایک احسان بھی کیا ہے۔ اس سے لٹریچر کو ایک نیا میدان ہاتھ آیا، اور دُنیا کے افسانوی ادب میں بہت بڑا اضافہ ہوُا۔ رفتہ رفتہ افسانہ نگاری کا وہ خاص شُعبہ جو سراغ رسانی سے متعلق ہے بہت ترقی کر گیا۔ لوگوں کو اس سے اتنی زیادہ دلچسپی ہوئی کہ عشق و محبّت کے پرانے افسانوں کی جگہ جاسوسی اور سراغ رسانی کے نئے افسانوں نے لے لی۔ یہ نہیں کہ عشق و محبت کی ابدی دلچسپیاں ختم ہو چکی ہیں اور لوگوں نے ان سے مُنہ پھیر لیا ہے۔ یہ تو کسی صورت میں بھی ممکن نہ تھا۔ فطرتِ انسانی کا تقاضا کبھی ختم نہیں ہو سکتا اور دلوں کی داستانیں کبھی اتنی پرانی نہیں ہو سکتیں کہ ان کی کشش اور لذّت آفرینی باقی نہ رہے ؎

یک قصّہ بیش نیست غمِ عشق واین عجب
وز ہر کسے کہ می شنوم نامکرّر است

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو مادی ذہنیتیں اس جدید تمدن کی خاص پیداوار ہیں، عشق کی دیوانگی و بیخودی کی بہ نسبت عقل کی فرزانگی و نکتہ رسی سے زیادہ قریبی رشتہ رکھتی ہیں، اور فرہاد و مجنوں سے زیادہ فیراڈے اور مارکونی سے ان کی طبیعت میل کھاتی ہے، وہ جاسوسی افسانوں کی شیدائی بن گئی ہیں۔ اگر ادب درحقیقت زمانے اور ماحول کی پیداوار ہے تو اس شعبۂ ناول نگاری کا وجود میں آنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ دوسری چیزوں کی طرح اس چیز میں بھی مشرق نے مغرب سے استفادہ کرنا چاہا۔ لیکن ہمارے ہندوستان کی جاسوسی کہانیوں میں تراجم و ماخوذات زیادہ ہیں اور تخلیق و اختراع بہت کم ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ جدید طرز کی سراغ رسانی کے افسانے پہلے انگلستان نے پیش کئے۔ لیکن خود انگلستان بلکہ پوری مغربی دُنیا میں کوئی جاسوسی افسانہ نگار سر آرتھر کونن ڈائل کے دماغ سے پیدا ہونے والے بے مثل اور حیرت انگیز افسانوی کردار "شرلاک ہومز" کا جواب نہیں پیش کر سکا۔ کسی تصنیف کا انتہائی کمال شاید یہی ہو سکتا ہے کہ لوگ مصنّف کی تخلیقی پیداوار کو یاد رکھنے اور سینے سے لگانے میں اس قدر محو ہو جائیں کہ مصنف کا نام ان کے حافظہ سے نکل جائے یا نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ کونن ڈائل کو بھی اپنی "مخلوق" شرلاک ہومز کی بدولت یہی انتہائی کامیابی و کامرانی حاصل ہوئی۔ اس "عجوبۂ روزگار کردار" کی عالمگیر مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ لوگ شرلاک ہومز ہی کو یاد رکھتے ہیں اور کونن ڈائل کو رفتہ رفتہ بھولے جا رہے ہیں۔ اس حقیقت کا احساس خود مصنّف کو اپنی زندگی میں ہو چکا تھا۔ اس کا دل اس صورتِ حال سے گلہ مند تھا کہ شرلاک ہومز کی شہرت، اس کی شہرت سے آگے بڑھی جا رہی ہے۔

زندگی کے ابتدائی سفر میں آرتھر کونن ڈائل ایک ڈاکٹر تھا۔ وہ اس پیشہ کے دوسرے جونیئر اور مبتدی لوگوں کی طرح اپنے غریبانہ کاروبار کو فروغ دینے کی جدوجہد میں مصروف رہا کرتا تھا لیکن دنیائے طبابت

کی آب وہوا اسے راس نہ آئی۔ اس نے ۱۸۸۶ء میں "شرلاک ہومز کی مہمات" کے نام سے سراغ رسانی کے افسانے لکھنے شروع کئے۔ پہلے افسانے کا شائع ہونا تھا کہ ساری دُنیا میں اس کی دھوم مچ گئی۔ اور افسانوی ادب اس درجہ متاثر ہوا کہ یکایک بے شمار قلم اسی کی لکیر پر چلنے لگے۔ وقت کے افسانہ نگاروں نے ہزاروں افسانے سراغ رسانی کے متعلق لکھ ڈالے۔ طرح طرح کے سراغ رساں پیدا کئے گئے۔ موٹے بھی، دبلے بھی، دراز قد بھی، پست قد بھی، عینکوں والے بھی اور غیر مسلح آنکھوں والے بھی۔ چالاک بھی اور بیباک بھی، مستعد بھی اور مجہول بھی، سرگرم عمل اور محنتی بھی، اور ایسے بھی جو اپنی آنکھیں بند کرکے لیٹ جائیں اور تمام رازوں کو معلوم اور چیستانوں کو حل کرلیں۔

انگریزی لٹریچر میں شیکسپیئر اور چارلس ڈکنس نے اور اردو افسانوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار نے بہت سے "غیر فانی" کرداروں کی تخلیق کی ہے۔ لیکن جاسوسی افسانہ نگاری ایک جدید چیز تھی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ کونن ڈائل کی راہ پر چل کر گذشتہ نصف صدی کی تمام تخلیقی و تصوراتی صلاحیتیں مل کر بھی سراغ رسانی کا ایک ایسا افسانوی کردار پیدا نہ کرسکیں جو شرلاک ہومز کے برابر ہو۔ یہ وہ دبلا پتلا جاسوس تھا جس کا چہرہ شاہین کا سا اور آنکھیں عقاب کی سی تھیں۔ اس کے منہ میں تمباکو کا پائپ اور جسم پر ایک فرسودہ "ڈریسنگ گاؤن" ہوتا تھا۔ اس کی نگاہیں کسی شخص کے کوٹ یا پتلون پر کوئی دھبہ یا پیوند دیکھ کر فوراً یہ معلوم کرلیتی تھیں کہ اس کا پیشہ کیا ہے!

شرلاک ہومز کو آرتھر کونن ڈائل کی رسائی فکر اور طرزِ تحریر نے ایک غیر فانی حیات عطا کردی۔ وہ ایک ایسا جاسوسی کردار ہے جو رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔ تاہم یہ کیسی تعجب کی بات ہے کہ شرلاک ہومز کا مصنف شرلاک ہومز کو وجود میں لانے کے بعد خود اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔ جان ڈکنسن کار نے "سر آرتھر کونن ڈائل کی سوانح عمری" کے نام سے جو دلچسپ کتاب شائع کی ہے، اس میں اس راز کا انکشاف کیا ہے کہ شرلاک ہومز کا خالق خود اپنی مخلوق کا دشمن ہوگیا۔ اس کو اسی شخصیت سے نفرت تھی جس نے اُسے عالمگیر شہرت کا مالک بنا دیا تھا۔

اس کا نفسیاتی سبب کیا تھا، یہ جاننے کے لئے کونن ڈائل کے پچھلے حالات پر ذرا سی نگاہ ڈالنی پڑے گی۔ وہ ایک ناکامیاب آرٹسٹ کا لڑکا تھا۔ اس کی ماں کو "ہیرالڈری" یعنی برطانی امراء کے خاندانی نشانات کے مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ اس نے کونن ڈائل کو بھی یہ علم سکھلایا۔ اور لڑکپن ہی میں کونن ڈائل کو مشہور گھرانوں کی علامتیں اور ان کے کتبوں اور ڈھالوں کے مخصوص نشانات اس طرح ازبر ہوگئے جیسے دوسرے لڑکے "پہاڑے" یاد کرتے ہیں۔ اس قدیم مگر بے نتیجہ علم سے کونن ڈائل کو یہ فائدہ پہنچا کہ اُسے تاریخ کی ورق گردانی کا شوق ہوگیا۔ اور کچھ دنوں میں اس نے بہت سی تاریخوں کا گہرا مطالعہ کرلیا۔

اسی کا یہ اثر تھا کہ جب کونن ڈائل نے تصنیف و تالیف کے لئے قلم اٹھایا تو اس نے تاریخ نگاری ہی کو اپنا اصلی مقصد بنایا۔ اس کو تاریخ دانی اور تاریخ نویسی سے ایک مستقل دلچسپی پیدا ہوچکی تھی۔ اس لئے کونن ڈائل کے جتنے تاریخی ناول ہیں وہ صرف کہانیاں یا سنسنی پیدا کرنے والے فرضی واقعات کے مجموعے نہیں ہیں، بلکہ متعلقہ عہد کی مکمل اور صحیح سماجی تاریخیں ہیں۔ ان کا ہر واقعہ مستند ہر تفصیل درست، ہر بات معیاری، اور ہر بیان غائر تاریخی معالعہ اور گہرے ریسرچ کی پیداوار ہے۔

لیکن پڑھنے والوں کا طبقہ ان کی تاریخی حیثیت کو نہ سمجھ سکا۔ ان کی ظاہر بین نگاہوں نے کونن ڈائل کے ناولوں کو قصے کہانیوں سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ اس پر کونن ڈائل کچھ بددل سا ہوگیا۔ اس پر مایوسی چھا گئی۔ اس کے دل میں یہ خلش جاگزیں ہوگئی کہ لوگوں نے اس کی تاریخی قابلیتوں کا اندازہ اور اعتراف نہیں کیا۔

یہ چبھن پہلے سے اس کے دل میں موجود ہی تھی کہ شرلاک ہومز نے سب سے بڑا خلجان پیدا کردیا۔ کونن ڈائل کا مزاج برہم اور برافروختہ ہوگیا۔ اگر کوئی مصنف اپنی تخلیق پر رشک و حسد کرسکتا ہے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کونن ڈائل، شرلاک ہومز کی غیر معمولی شہرت و مقبولیت کا حاسد ہوگیا۔ اور یہ صورتِ حال ہوئی کہ سے

میں اُسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے!

دو چار ہی تاریخی افسانوں کے بعد کونن ڈائل کو قارئین کی بدذوقی اور طبعی رجحان کا اندازہ ہوگیا۔ اس نے زمانے کی روش کو پہچان لیا۔ جرم پسند دماغوں کو سراغ رسانی کے افسانوں کی شکل میں سنسنی کی طلب تھی۔ اس نے جلد ہی "شرلاک ہومز کی مہمات" کے عنوان سے حیرت انگیز جاسوسی کہانیاں پیش کیں۔ افسانہ نگاری کی دُنیا میں ہلچل پڑگئی۔ پبلک نے اس

ناول کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور اس طرح کے مزید ناولوں کے لئے لوگوں کی "بھوک" اس قدر بڑھ گئی کہ پبلشروں نے کونن ڈائل پر شدید تقاضے شروع کئے۔ امریکہ کے تاجرانِ کتب نے اتنی بڑی بڑی رقمیں پیش کیں جو تصورات سے بھی بالاتر تھیں۔

کونن ڈائل کسی قدر ضدی مزاج کا آدمی تھا۔ اس نے بار بار انکار کیا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ شرلاک ہومز اس کی اعلیٰ تصنیفوں کی راہ میں رکاوٹ بن گیا ہے۔ جو معیاری تاریخی کتابیں وہ علمی دُنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا ان کا لکھنا قطعاً دشوار ہو گیا تھا۔ ناول پڑھنے والوں اور ناول بیچنے والوں کے مسلسل تقاضوں نے اس کے ناک میں دم کر رکھا تھا۔

اس لئے اس نے شرلاک ہومز سے نجات حاصل کرنے کے لئے ایک نئی ترکیب سوچی۔ شرلاک ہومز اب تک ایک جیتا جاگتا جاسوسی کردار تھا۔ لوگ چاہتے تھے کہ اس کی بے مثل سراغ رسانی کے مزید واقعات کونن ڈائل کے قلم سے لکھے جائیں۔ کونن ڈائل نے یہ کیا کہ اس کے افسانۂ زندگی کے چند مزید واقعات قلمبند کر کے اس کی زندگی ہی کا خاتمہ کر دیا۔ اسے سوئٹزرلینڈ کی سیر کرائی اور وہیں ایک بلند پہاڑ کی چوٹی سے گرا کر اس کو ملکِ عدم بھیج دیا۔ گویا کونن ڈائل نے اپنے ہاتھوں اس فرضی و افسانوی جاسوس کو ہلاک کر دیا۔ اسے قتل کر ڈالا کہ اس کا قابلِ رشک وجود ہی باقی نہ رہے!

"شرلاک ہومز کی مہمات" کے اس آخری باب کا شائع ہونا تھا کہ لوگوں میں کہرام مچ گیا۔ عوام نے کونن ڈائل کے خلاف احتجاج کی صدائیں بلند کیں۔ پبلشروں کی طرف سے غم و غصہ کے بے شمار خطوط آنے لگے۔ پڑھنے والوں نے مصنف پر گالیوں کی بوچھار کی۔ لندن کے نوجوانوں نے ماتمی جلوس نکالا۔ اور بہت سے لوگ آنجہانی شرلاک ہومز کی وفاتِ حسرت آیات پر اظہارِ تعزیت کے لئے اپنے بازو اور ہیٹ پر کالی پٹیاں باندھ کر کونن ڈائل کے پاس آنے لگے۔ آخرکار کونن ڈائل کو ان کے تقاضوں نے مجبور کر دیا۔ اور اُسے شرلاک ہومز کو کسی بہانے سے پھر زندہ کرنا پڑا۔ کونن ڈائل کا دل خوش نہ تھا، مگر اس پر چاروں طرف سے دولت کی اچھی خاصی بارش ہو گئی۔

اس مسئلہ پر طرح طرح کی خیال آرائیاں ہوئی ہیں کہ شرلاک ہومز کی اصل یا ماخذ کون تھا، اور اس عجوبۂ روزگار کردار کی شکل میں کس سراغ رساں کی تصویر پیش کی گئی ہے؟ ایک پسندیدہ نظریہ یہ ہے کہ ابتدائے عمر میں کونن ڈائل جس طبی یونیورسٹی میں تعلیم پا رہا تھا اسی کے پروفیسر ڈاکٹر جوزف بل کا نمونہ اس کے پیش نظر تھا۔ ڈاکٹر موصوف کی عادت یہ تھی کہ جب مریض شفاخانے میں لائے جاتے تھے تو ان پر سر سے پیر تک نگاہ ڈال کر وہ ان کے حالاتِ زندگی کے متعلق اپنے شاگردوں سے دلچسپ فقرے اکثر کہا کرتا تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ ایک مریض آیا۔ ڈاکٹر بل نے اسے دیکھتے ہی اپنے طلبا کو مخاطب کر کے کہا "یہ شخص ایک چپ دست موچی ہے۔ اپنا کام بائیں ہاتھ سے کرتا ہے"۔

طلبا اپنے استاد کی اس عجیب و غریب دریافت پر ہکا بکا سے ہو گئے۔ ڈاکٹر بل نے کہا "اسے غور سے دیکھو۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس کے پتلون کی دائیں مُہری سامنے کی طرف سے بہت گھسی ہوئی ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں موچی اپنا سندان رکھ کر اس پر چمڑا پیٹتا ہے۔ چونکہ پتلون کی دائیں مہری خراب ہو گئی ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ سندان پر چمڑا پیٹنے میں اپنا بایاں ہاتھ استعمال کرتا ہے"۔

یہ ایسے فقرے ہیں جو کسی شرلاک ہومز ہی جیسے سراغ رساں کی زبان پر زیب دے سکتے ہیں۔

لیکن کونن ڈائل کا سوانح نگار جان ڈکنسن کار اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ کانن ڈائل خود ہی شرلاک ہومز تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مصنف نے اپنی زندگی میں چند مرتبہ سراغ رسانی کا کام کیا تھا۔ اس کا ایک نمایاں کارنامہ ہے جسے لوگوں نے فراموش کر دیا ہے۔ ڈکنسن کار اس کی پوری تفصیل پیش کرتا ہے۔

اسٹافورڈ شائر کے ایک گاؤں گریٹ والی کے باشندوں کو ایک پُراسرار شخص نے بے نامی خطوط لکھ کر پریشان کر رکھا تھا۔ وہ شخص سنسان راتوں میں اس دیہات کے پھیرے بھی کرتا تھا اور گھوڑوں اور مویشیوں کو زخمی کر دیتا تھا۔ پولیس نے مقامی پادری کے لڑکے جارج کو اس جرم میں گرفتار کیا۔ اور مقدمہ چلا کر اسے قید خانے بھجوا دیا۔

جارج نے جیل سے کونن ڈائل کو خط لکھا۔ اور اس میں اپنی بے گناہی کا اظہار کیا۔ کونن ڈائل نے فوراً تحقیقات شروع کر دی۔ آخرکار اسے ماہرانہ طریقوں سے جو خود شرلاک ہومز کی تفتیشی سرگرمیاں

کے برابر تھے، کونن ڈائل نے جارج کی بے گناہی ثابت کردی اور اسے قید سے رہا کرادیا۔ جارج کی عیب دار آنکھوں پر پہلی نگاہ ڈالتے ہی کونن ڈائل نے فیصلہ کیا کہ ایسا شخص کبھی راتوں کو دیہات کے گلی کوچوں اور کھیتوں میں اِدھر اُدھر نہیں پھر سکتا۔ جارج کو ضعفِ بصر کی بیماری تھی اس کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑی ہوئی تھیں۔ جارج کے معائنہ کے بعد کونن ڈائل نے زخمی مویشیوں کا معائنہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ایسے زخم ایک مخصوص قسم کے حربے سے لگائے جا سکتے ہیں۔ اور یہ حربہ جارج کو کبھی دستیاب نہیں ہو سکتا۔

کونن ڈائل کی شہرت جس وقت پورے شباب پر تھی اسے اپنی ہر تحریر کا معاوضہ دس شلنگ فی لفظ کی شرح سے ملتا تھا۔ اس نے بہت سے ممالک، مثلاً امریکہ، سویڈن، افریقہ وغیرہ کی سیر و سیاحت کی۔ جس جگہ وہ پہنچتا تھا اس کے خیر مقدم کے لئے لوگوں کا اژدہام ہو جاتا تھا۔

اس نے پیشین گوئی کی تھی کہ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم میں جرمنی کی آبدوز تباہ کن کشتیاں کیسے کیسے ہنگامے برپا کریں گی، اور کس کس طرح فریقِ مخالف کی بربادی کا باعث ہونگی۔ اس کی باتیں حرف بحرف سچ ثابت ہوئیں اور عوام نے اسے اگر پیغمبر نہیں تو غیب داں کا رتبہ دے دیا۔ حکومت نے اسے "سر" کا خطاب عطا کیا، قریب تھا کہ وہ "لارڈ" بنا دیا جائے۔ اس کی دماغی قابلیت اتنی مسلّم ہو گئی کہ وزراء اعظم اس سے اہم معاملات پر مشورہ کرنے لگے۔

ساٹھ برس کی عمر میں کونن ڈائل نے تمام پچھلے مشاغل کو ترک کر دیا۔ اور فلسفہ روحانیت کی طرف رجوع ہو گیا۔ اب اسی کی تحقیق و تصدیق کو اس نے اپنا مقصدِ زندگی بنا لیا۔ اس وقت سے ۱۹۳۰ء یعنی اپنے سفرِ آخرت کے وقت تک اس نے جتنی تحریریں لکھیں ان کا تعلق صرف روحانی مسائل سے ہے۔ کونن ڈائل کو اپنی ساری عمر میں ایک مذہب یا مسلک کی بھی تلاش تھی۔ کئی سال تک اپنے دل کو ٹٹولنے اور گہری تحقیقات کرنے کے بعد اسے اس امر کا یقین ہو گیا کہ "روحانیت" میں اس نے حقیقت کو پا لیا ہے۔ اپنے عقیدے کی اشاعت کے دوران میں اس شخص کو جو اپنے وقت کا سب سے بڑا صاحبِ دماغ مصنف سمجھا جاتا تھا۔ لوگوں سے بہت سی گالیاں ملیں۔ مغرب کی "مادی" ذہنیت نے اسے پاگل اور دیوانہ قرار دیا۔ لیکن جب اس کی موت کا وقت آیا تو کونن ڈائل پوری روحانی مسرت کے ساتھ اس دُنیا سے چل بسا۔ شرلاک ہومز کا خالق اور بہت سے رازوں کا پتہ لگانے والا مصنف اس آخری عقیدے اور اعتماد کے ساتھ راہیٔ عدم ہوا کہ اس نے ہستی کے سب سے بڑے راز کا پتہ لگا لیا ہے۔

چاول کی فصل کے متعلق پہلا تخمینہ

وزارتِ زراعت کے شعبۂ اقتصادیات اور اعداد و شمار کے حساب کے مطابق ہندوستان بھر میں ۵۰-۱۹۴۹ء میں چاول کی فصل کا پہلا تخمینہ حسبِ ذیل ہے۔ رقبۂ زیرِ کاشت چھ کروڑ ۵ لاکھ ۶۳ ہزار ایکڑ یعنی پچھلے برس کے رقبۂ زیرِ کاشت سے چار اعشاریہ سات فیصدی زیادہ۔ ۴۹-۱۹۴۸ء میں رقبۂ زیرِ کاشت ۵ کروڑ اٹھاسی لاکھ ۷۲ ہزار ایکڑ تھا۔ کاشتکاری میں زیادہ اضافہ یو۔پی، آسام، بہار، پچھمی بنگال، سی۔پی اور برار اور مدراس میں ہوا ہے۔ یہ اضافہ اس لئے ہوا ہے کہ تخم ریزی کے وقت موسم موافق نہ تھا۔ نیز کسی حد تک اناج کی پیداوار بڑھانے کی کوششیں بھی رقبۂ زیرِ کاشت کو بڑھانے کے لئے ذمہ دار ہیں۔

یہ اندازہ عموماً اگست، ستمبر ۱۹۴۹ء تک کے عرصہ کے لئے ہے۔ مذکورہ بالا تخمینہ میں پہلی بار وندھیا پردیش، میسور، راجستھان، مدھیا بھارت اور ہماچل پردیش کے اعداد و شمار شامل کئے گئے ہیں۔

کشمیر کی جنگِ آزادی

قاہرہ میں شیخ محمد عبداللہ کی پریس کانفرنس

وزیراعظم کشمیر شیخ محمد عبداللہ امریکہ جاتے ہوئے ۱۲ دسمبر کو علی الصباح قاہرہ پہنچے۔ قاہرہ کے ہوائی اڈے پر انھوں نے ایک پریس کانفرنس میں تقریر کی۔ اس کانفرنس میں مصر کے ممتاز صحافیوں نے شرکت کی۔ مصر کی جنگِ آزادی کے ساتھ کشمیر کی جنگِ آزادی کا مقابلہ کرتے ہوئے انھوں نے کشمیر کے مسئلہ میں پاکستان کی مداخلت کے متعلق ایک بیان دیا۔

اخبار نویسوں کو جو انھوں نے بیان دیا اس کا پورا مضمون درج ذیل ہے: "عرصہ دراز سے کشمیر کے تعلقات مصر سے رہے ہیں اور مجھے مسرت ہے کہ مجھے قاہرہ میں ٹھہرنے کا موقعہ ملا ہے۔ حالانکہ یہ قیام بہت ہی قلیل عرصے کے لئے ہوگا۔ مصر نے زاغلول پاشا جیسے آزادی کے لئے لڑنے والے کی شخصیت میں ہمارے سامنے ایک مینارۂ نور پیش کیا ہے۔ کشمیر میں ہم نے اپنی آزادی حاصل کرنے کی جد و جہد میں ہمیشہ ان کی شخصیت کے تصور سے فیض اٹھایا۔ ہمیں اسی طرح خوش نصیبی سے آزادی اور حق کے لئے ایک اور لڑنے والے مہاتما گاندھی کی نیک خواہشات بھی حاصل رہی ہیں۔ مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ مصریوں کے سامنے کشمیر کی جنگِ آزادی کو کس رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ میں اپنے اس بیان میں مختصراً اس صورتِ حالات کی تصویر پیش کرنا چاہتا ہوں جو آجکل میرے ملک میں ہے اور جس کی خدمت کرنے کا موقع مجھے بحیثیت وزیرِ اعظم کے ملا ہے۔ ہم کشمیر میں اس نصب العین کے لئے لڑ رہے ہیں جس سے کشمیری، بلا امتیازِ فرقہ، اپنے ملک کے مالک ہو سکتے ہیں۔ ہم اس مقصد کے لئے قریباً گزشتہ بیس برس سے لڑ رہے ہیں۔ پاکستان ہمیں یہ مقصد حاصل کرنے سے باز رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ پاکستان یہ نہیں چاہتا کہ ہم اپنی تقدیر کے مالک خود بنیں اور دوم وہ یہ چاہتا ہے کہ چونکہ کشمیر میں اکثریت مسلمانوں کی ہے لہٰذا کشمیر کو پاکستان میں شامل ہونا چاہیئے۔

پاکستان کے پہلے مطالبے کو ہم قطعی طور پر مسترد کرتے ہیں۔ ہمیں اسی طرح اور اسی حد تک اپنی تقدیر کے مالک ہونے کا حق ہے جس طرح اور جس حد تک مصریوں کو ہے۔ دوسرے مطالبے کے سلسلے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اس اصول کو تسلیم کیا جائے کہ کشمیر کو پاکستان کے ساتھ محض اس لئے شامل ہونا چاہیئے کہ کشمیر میں اکثریت مسلمانوں کی ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندوستان میں جو آجکل ساڑھے تین کروڑ مسلمان ہیں اُن کو پاکستان جانا چاہیئے۔ لیکن ہندوستان میں رہنے والے مسلمان ایسی کوئی خواہش نہیں رکھتے اور اگر وہ خواہش بھی رکھتے ہوں تو پاکستان ان کو قبول کرنے کے بالکل ناقابل ہے۔

بیشتر ممالک کی طرح کشمیر اور ہندوستان نے غیر مذہبی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کیونکہ سیاست میں مذہب سے بالاتر ہونے کا اصول ہی اُن کی زندگی کی بنیاد ہے۔

یہاں مصر میں آپ نے ایک ایسی طاقتور حکومت کی بنیاد ڈالی ہے جس میں تمام فرقوں کے مصری باشندے ملک کی خوش حالی میں برابر کے شریک ہیں۔ ہم تو محض انھیں نقوشِ قدم پر چلتے ہیں جو آپ کے قائدِ اعظم زاغلول پاشا نے چھوڑے ہیں جنھوں نے غیر ملکی جوا اُتارنے کے لئے تمام مذاہب کو متحد کیا۔ کشمیر میں تیس لاکھ مسلمانوں کے علاوہ دس لاکھ غیر مسلم بھی ہیں۔ اگر ہم پاکستان کے اصولوں کو تسلیم کریں تو اس غیر مسلم اقلیت کا درجہ حقیر ہو جائے گا۔ اور ایسا کرنے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے۔ کیونکہ کشمیر میں غیر مسلموں کو بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو مسلمانوں کو۔

مجھے آپ کو یہ بتانا چاہیئے کہ ہم ہندوستان کی طرف کیوں مائل ہیں۔ اور ہم اس ملک کے ساتھ کیوں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ اوّل یہ کہ ہندوستان اور ہندوستان کے لیڈروں نے آزادی کی جد و جہد میں ہماری مدد کی۔ دوم ہندوستان میں غیر مذہبی اور جمہوری نظام کی وجہ سے ہر ایک اقلیت خوشی سے رہ سکتی ہے۔ آج بھی ملک کے تقسیم ہونے کے بعد ہندوستان

میں ساڑھے تین کروڑ مسلمان رہ رہے ہیں۔ جب کہ مغربی پاکستان میں قریباً ڈھائی کروڑ مسلمان رہ رہے ہیں۔ ہندوستان نے ہمیں مکمل خود اختیاری کا حق دیا ہے۔ اور ہم کسی طرح بھی اپنے ملک کو ترقی دے سکتے ہیں۔

کشمیر کے سلسلے میں جو نظریہ آپ تک پہنچایا گیا ہوگا وہ یہ ہے کہ پاکستان ہمیشہ سے جموں و کشمیر کی ریاست میں غیر جانبدارانہ رائے شماری کا خواہشمند ہے اور اس کے برعکس ہندوستان اس کی مخالفت کر رہا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے اور کوئی چیز صداقت سے بعیدتر نہیں ہوسکتی۔ ۱۹۴۷ء میں یعنی جب پاکستان نے ہم پر حملہ کیا اس سے تین سال پہلے نیشنل کانفرنس نے جس کی ممبرشپ جموں و کشمیر کی کل آبادی یعنی ۴۰ لاکھ میں سے ۲ لاکھ نوّے ہزار رجسٹرشدہ ممبروں پر مشتمل ہے۔ اور جس کا میں صدر ہوں ایک قرارداد منظور کی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ لوگوں کو حق ہونا چاہیئے کہ وہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ خود کریں۔ اس کے بعد جب ریاست ہندوستان کے ساتھ شامل ہوئی تو وزیر اعظم ہند پنڈت جواہرلال نہرو نے غیر مبہم الفاظ میں یہ کہا کہ شامل ہونے کے متعلق کشمیر کے لوگ، ریاست پر حملہ آوروں سے پاک ہونے کے بعد رائے شماری کے ذریعے خود آخری فیصلہ صادر کریں گے۔ ہم اور حکومت ہند دونوں جموں و کشمیر میں حملہ آوروں کے چلے جانے کے ساتھ ہی رائے شماری کروانے کے لئے تیار ہیں۔

اس وقت پاکستان کی باقاعدہ فوج نے جبراً ریاست کے بڑے بڑے حصوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ ہمیں اس وقت رائے شماری کیلئے نہیں کہا جانا چاہیئے، جبتک کہ ہمارے ملک کا ایک ایک انچ ہمیں واپس نہیں دیا جاتا ہے۔ تاکہ ہم ان کشمیری باشندوں کو پھر سے اُن کے گھروں میں بسائیں، جن کو ان علاقوں سے نکال دیا گیا ہے جن پر آج پاکستان کی فوج قابض ہے حقیقت یہ ہے کہ رائے شماری کے متعلق وقت کا تعین کرنا پاکستان کے ہاتھوں میں ہے کیونکہ جب وہ ان علاقوں سے نکل جائیں گے اور وہ علاقے پھر سے ہمارے قبضے میں آئیں گے۔ اسوقت ریاست میں رائے شماری ہوسکتی ہے۔ لیکن یہ بالکل قرین قیاس نہیں ہے کہ پاکستان رائے شماری کو تسلیم کریگا۔ وہ رائے شماری کی رَٹ محض دکھاوے کیلئے لگا رہے ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ اگر ریاست میں رائے شماری ہوئی تو اُنکے لئے لوگوں کا جواب نفی میں ہوگا یہی وجہ ہے کہ دو سال پہلے انھوں نے ہمارے ملک پر پوری خشونت کیساتھ حملہ کیا تاکہ وہ ہمارے ملک پر زبردستی قبضہ کرلیں۔

قضیۂ کشمیر کی ذمّہ داری

امریکہ کے مشہور اخبار "نیویارک ٹائمز" کی ۲۶ ستمبر کی اشاعت میں قضیۂ کشمیر کے متعلق مشرقِ بعید کے ایک مبصّر مسٹر لارسن کا ایک خط شائع ہوا جس میں کہا گیا ہے کہ

"اگر کوئی شخص اقوام متحدّہ کے کشمیر کمیشن کی روداد کا مطالعہ کرے تو اُسے یہ معلوم ہوجائے گا کہ ہندوستان ہمیشہ اقوام متحدّہ کی دریافتوں اور قراردادوں کا پابند رہا۔ اس کے لئے وہ پاکستان کی چالوں اور تاخیر پسندی کو حیرت انگیز طور پر برداشت کرتا رہا۔"

اقوام متحدّہ کی بہت سی قراردادوں میں تسلیم کیا گیا ہے کہ جھگڑے کی ابتدا پاکستان کی طرف سے شروع ہوئی اور پاکستان نے جو کچھ کیا وہ جارحانہ کارروائی سے کم نہ تھا۔ چنانچہ کشمیر کمیشن نے ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کے ریزولیوشن میں ناطرفدار رائے شماری کے لئے کشمیر کو پاکستانی حملہ آوروں سے صاف کرنا ضروری قرار دیا۔ پاکستان بہت دیر تک اس امر سے انکار کرتا رہا تھا کہ کشمیر میں پاکستانی فوج ہے۔ کشمیر کی سرزمین سے پاکستانی حملہ آوروں کو ہٹانے میں لیت و لعل کرتے ہوئے پاکستان صریحاً ایک آزاد اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کو روک رہا ہے۔ کشمیر میں جو شورش ہوئی اس کے منصوبے کشمیر سے باہر کے پاکستان کے رہنماؤں نے تیار کئے اور انھیں ترقی دی۔ پاکستان اب بھی شر انگیز باتیں کر رہا ہے۔ حال ہی میں ایک نامور پاکستانی ایف کے درانی نے پاکستان کے متعلق اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ وہ اس ہندوستان کو اسلام کیلئے فتح کرینگے جس کا ایک ایک انچ انکے باپ دادا نے اپنے خون سے خریدا تھا۔

رفتارِ زمانہ

نئی دہلی میں ہند کے پردھان منتری پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک پریس کانفرنس کے دوران میں دیش کے مختلف سیاسی و اقتصادی مسائل پر روشنی ڈالی۔ ہندوستان و پاکستان کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے پنڈت جی نے کہا کہ ہند امن قائم رکھنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ چنانچہ ہند سرکار نے حکومت پاکستان کو پہلے رسمی طور پر اور بعد ازاں سرکاری طور پر یہ تجویز پیش کی کہ دونوں حکومتیں ایک مشترکہ اعلان جاری کریں کہ وہ کسی حالت میں متنازعہ امور کو حل کرنے کے لئے ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائیں گی۔ اس سلسلے میں ہند سرکار نے پاکستان گورنمنٹ کو مشترکہ اعلان کا مسودہ بھی بھجوایا ہے لیکن ابھی تک اس کا کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ اعلان کے اس مسودے میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی ہے کہ متنازعہ معاملات کا حل ڈھونڈنے کے لئے باہمی بات چیت کا طریقہ اختیار کیا جائے اور اگر اس طرح نہ ہو سکے تو سمجھوتہ کرانے کے لئے ثالث مقرر کر لیا جائے۔ کشمیر کے جھگڑے کے سمبندھ میں ثالث مقرر کرنے کے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے پردھان منتری نے کہا کہ کشمیر کے سوال پر کسی کے ثالث بنانے کی تجویز منظور نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس کے ساتھ کشمیر کے چالیس لاکھ باشندوں کا مستقبل وابستہ ہے اور لاکھوں باشندوں کی قسمت کا فیصلہ کسی فردِ واحد کو نہیں سونپا جا سکتا چاہے وہ کتنی ہی بلند پوزیشن کا مالک کیوں نہ ہو۔ جنرل میکناٹن کی تجاویز کے سلسلے میں بھارت اور پاکستان نے جو ترامیم بھجوائی ہیں وہ ایک دوسرے سے بالکل متضاد ہیں اس لئے غالباً اب یہ معاملہ دوبارہ سیکیورٹی کونسل میں بھجوایا جائیگا۔ ملک کی آرتھک حالت کا ذکر کرتے ہوئے پنڈت جی نے کہا کہ اب حالات پہلے سے بہتر صورت اختیار کر رہے ہیں لیکن دیش واسیوں کا یہ پہلا فرض ہے کہ وہ زیادہ محنت کریں۔ خرچ کم کیا جائے اور بچت بڑھائی جائے۔

ہند نے چین کی کمیونسٹ گورنمنٹ کو تسلیم کر لیا ہے۔ پچھلے ماہ اکتوبر میں ہند سے اس حکومت کو تسلیم کئے جانے کی درخواست کی گئی تھی۔ اس درخواست کو اس لئے جلدی منظور کر لیا گیا ہے۔ کہ چین کا تمام علاقہ کمیونسٹوں کے کنٹرول میں آ چکا ہے جس کی راجدھانی پیکنگ ہے۔ کامن ویلتھ ممالک میں ہندوستان پہلا ملک ہے جس نے چین کی کمیونسٹ حکومت کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کئے ہیں اور ہند سرکار نے یہ قدم اٹھانے سے پہلے کامن ویلتھ دیشوں اور امریکہ کو اپنے ارادے سے مطلع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں مزید اطلاع ہے کہ برطانیہ اور پاکستان نے بھی اس حکومت کو تسلیم کر لیا ہے۔

۴۵۰ برس پرانی ریاست کوچ بہار کو جس کی عنانِ حکومت پچھلے ماہ ستمبر میں ہند سرکار نے سنبھال لی تھی۔ اب صوبۂ مغربی بنگال میں شامل کر دیا گیا ہے۔

یوگوسلاویہ میں امریکہ کے سفیر مسٹر ایلن نے پردھان ٹرومین کے ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کے ایک بیان کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ امریکی پالیسی یہ ہے کہ دباؤ کا مقابلہ کیا جائے۔ اگر روس نے یوگوسلاویہ پر کسی قسم کا دباؤ ڈالا تو امریکہ اس کی مزاحمت کرے گا۔

مصر کے نئے انتخابات میں نحاس پاشا کی وفد پارٹی کو نمایاں اکثریت حاصل ہو گئی ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ انتخابات میں وفد پارٹی کے ٹکٹ پر پہلی بار کھڑے ہونے والے نوجوانوں نے برسرِ اقتدار پارٹی کے وزراء تک کو شکست دی ہے۔

۴ جنوری ۱۹۵۰ء کو نئی دہلی میں ہند کے پردھان منتری پنڈت جواہر لال نہرو اور ہند میں افغانستان کے سفیر ہز ایکسیلنسی سردار نجیب اللہ خاں نے اپنی حکومتوں کی نمائندگی کرتے ہوئے دونوں دیشوں میں دوستی کے ایک معاہدے پر دستخط کئے۔

ریلوے بورڈ کی سالانہ رپورٹ کے مطابق ہند سرکار کو ہندوستان بھر کی ریلوں سے سال ۴۹-۱۹۴۸ء کے دوران میں ۱۹ کروڑ ۹۰ لاکھ روپے کا منافع حاصل ہوا۔

WHY TAKING RISK ?
آپ کیوں
خطرات مول لیتے ہیں
زندگی میں خطرات کا مقابلہ کرنا جواں مردی کا کام ہے لیکن
بلا وجہ خطرات مول لینا کسی کو زیبا نہیں دیتا خصوصاً ادویات کے ضمن میں اگر آپ
غیر مستند دواخانوں سے ادویات خریدتے ہیں تو جان بوجھ کر اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈالتے ہیں
ہمدرد دواخانہ کا نام ادویات کے بہترین ہونے کا ضامن ہے۔ اور
شباب آور
ہمدرد دواخانہ کی طاقت مردمی کی بہترین دوا ہے سردی کے صرف دو ماہ باقی ہیں ان دو ماہ میں آپ شباب آور
کے استعمال سے جسم میں نیا خون اور جوانی میں نئی اُمنگ پیدا کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کو کئی سال کسی اور دوا کی
ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ آج ہی اپنے مقامی ایجنٹ سے شباب آور کی ایک شیشی خرید لیجئے شباب آور استعمال کرنے
کا یہ بہترین موسم ہے قیمت فی شیشی پانچ روپے
جوانی قائم رکھنے کیلئے رسائل ہمدرد نوجوان اور ہمدرد شباب مفت طلب فرمائیے
ہمدرد دواخانہ وقف دہلی
Hamdard

مارچ ۱۹۵۸ء

آٹھ آنے

حسین نین تارا اپنی جلد کو
دلکش رکھنے کیلئے لکس ٹائلٹ صابن
کو ہی کیوں پسند کرتی ہے!
LUX
LUX TOILET SOAP
یہ حسین فلمی ستارہ
کہتی ہے "لکس ٹائلٹ
صابن کے ذریعہ جلد
کی حفاظت کتنی آسان ہے۔ اسکی نرم بالائی دار
جھاگ جلد کو خوب صاف کر کے اسے نفیس و ملایم
بنا دیتی ہے۔ اور پھر لکس ٹائلٹ صابن کی
سحر آمیز خوشبو بھی مجھے بہت عزیز ہے۔
یہ کتنی فرحت بخش ہے!"
یہ سفید اور خالص صابن، جس کی خوشبو
دلکش ہے، آپ کی جلد کو بھی
دلکش بنا رکھے گا
ستاروں کا
صابن
LTS. 233-193 UD

ترتیب

بچوں کا آج کل

اردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر:- جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹرز:- عرش ملسیانی

جگن ناتھ آزاد

جلد ۸ —— نمبر ۱۱

سالانہ چندہ —— چھ روپے

فی پرچہ —— آٹھ آنے

مارچ ۱۹۵۰ء

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

تیغ الہ آبادی

ایک زخمی تصوّر

یہ ترا عزمِ سفر، یہ مرے ہونٹوں پہ سکوت
اب تو کہنے کو نہ ہوگا کہ شکایت کی تھی
میں سمجھ لوں گا کہ میں نے کسی انساں کے عوض
ایک بے جان ستارے سے محبت کی تھی
اک دمکتے ہوئے پتھر کی جبیں چومی تھی
ایک تخیّل کی تصویر سے اُلفت کی تھی
میں نے سوچا تھا کہ آندھی میں چراغاں کر دوں
میں نے چاہا تھا کہ سیلاب کو انساں کر دوں

ولولے دوش پہ لائے تھے سمندر کا جلال — حوصلے ڈال رہے تھے مہ و انجم پہ کمند
عزم آغاز سے مخمور، جنوں سے سرشار — فکرِ انجام کے غرفے تھے بڑی دیر سے بند
میں سمجھتا تھا کہ یہ جذبۂ بے نام و نمود — شیشۂ ذہن سے نازک ہے تخیّل سے بلند

آج، ہر عزم نگوں ہے، کہ بکھرنا ہوگا
حوصلے سر بہ گریباں ہیں کہ اب کیا ہوگا؟

صرف لمحوں کی بدلتی ہوئی تصویر نہیں — "اجنبی"! تیرے تصوّر سے عبارت ہے حیات
تجھ سے وابستہ ہیں وہ کرب کی راتیں جن میں — حدّتِ غم سے سُلگتے رہے بے بس لمحات
ذہن کی لو سے اُلجھتا رہا گہرا کُہرا — جیسے گھنگھور اندھیرے میں برستی ہوئی رات

آج تو جس کے لئے غیر ہے بیگانہ ہے
اُس کا سینۂ ترے الطاف کا افسانہ ہے

یاد تو ہوگا تجھے بھی کہ سکوں کی خاطر — کون سا ساز تھا جس کو نہ سنبھالا میں نے
نغمہ و شعر کے سانچے میں بہ عنوانِ نشاط — کتنی محنت سے تری یاد کو ڈھالا میں نے
کتنے کھلتے ہوئے ہونٹوں کا تبسم لے کر — اپنے شہکار کا ہر نقش اُجالا میں نے

اب تو جب رات کو پچھلے کا سماں ہوتا ہے
اپنی آواز پہ رونے کا گماں ہوتا ہے
ایسی سنسان سڑک! ایسا گھنا سنّاٹا

کون جذبات کی موجوں میں اُتر سکتا ہے
لوگ کہتے ہیں کہ اُجڑی ہوئی آبادی سے
رات کے وقت گزرتے ہوئے ڈر لگتا ہے
مقبروں پہ نظر آتے ہیں بھیانک سائے
موڑ پر دل کے پُر اسرار کھنڈر پڑتا ہے
اس اندھیرے میں ستارے تو کہاں ملتے ہیں
ہاں — سلگتے ہوئے اشکوں کے نشاں ملتے ہیں

آج لیکن مری آنکھوں میں کوئی اشک نہیں — تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کا فسانہ بھی نہیں
تجھ سے چھُٹنے کا تصوّر ہے بھیانک لیکن — اس تصوّر میں کوئی آہِ شبانہ بھی نہیں
میری ویران نگاہیں — مرا بے جان سکوت — زیست کو ہیچ سمجھنے کا بہانہ بھی نہیں

لیکن اس زیست میں ہے زیست سے بیزاری بھی
زخمِ دل یوں تو ہے خوش رنگ، مگر کاری بھی

کے۔ ایم پانیکار

نیا آئین اور ہمارا فرض

نئے آئین کے متعلق سردار کے۔ ایم پانیکار نے یہ چند سطور ہمارے جمہوریت نمبر کے لئے عنایت فرمائی تھیں۔ افسوس کہ یہ اس وقت ملیں جب پرچہ پریس میں جا چکا تھا۔ ادارہ سردار موصوف کی اس عنایت کے لئے ان کا شکر گزار ہے اور امید رکھتا ہے کہ وہ آئندہ بھی اسی طرح کرم فرماتے رہیں گے۔ آپ کی ایک انگریزی نظم کا اردو ترجمہ آئندہ شمارے میں شائع کیا جائے گا۔ یہ بھی موصوف نے خاص طور پر آج کل کے لئے عنایت فرمائی ہے (ادارہ)

امریکہ کے صدر اعظم ابراہیم لنکن کی حال ہی کی حاصل شدہ ایک تقریر میں ذیل کی عبارت ملتی ہے :-

"میرے ہم وطنو اگر آپ کو کوئی ایسا نظریہ بتایا گیا ہے جو اعلان آزادی کے اونچے آدرشوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اگر آپ نے کوئی ایسی تجاویز سنی ہیں جو آزادی کی شان کو کم کر کے اس کی قدر و قیمت کو گھٹانے کا موجب بنتی ہیں تو میں آپ سے واپس آنے کی درخواست کروں گا۔ اور اس چشمے پر واپس آنے کے لئے جس کی موجیں انقلاب کے نزدیک مچلتی ہیں"۔

آج ہندوستان کے نئے آئین کے متعلق یہی اپیل ہند کے لوگوں سے کی جا سکتی ہے۔ متواتر تین سال تک نہایت سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کے بعد ہمیں ایک ایسا آئین میسر ہوا ہے جس کے ساتھ انصاف اور مساوات کے اصول کے علاوہ خیال تقریر اور مذہب کی آزادی بھی وابستہ ہے۔ ہم نے کافی غور و خوض اور جیران کُن طور پر اتفاق رائے سے اپنے سیاسی عقیدے کے اظہار کے لئے ایک غیر مذہبی جمہوری حکومت کا انتخاب کیا ہے۔ اس آئین میں ہم نے ایسے بنیادی حقوق مرتب کئے ہیں جن میں ہماری سماجی، اقتصادی و سیاسی آزادی کی ضمانت ہے۔ عورتوں کو درجۂ مساوات دیا گیا ہے اور غیر منصفانہ رسم و رواج کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اس آئین کے مطابق عملی طور پر زندگی بسر کرنا ہی ہمارا آدرش ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابھی نئے آئین کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی ہے کہ ہمیں ایسی آوازیں سنائی دے رہی ہیں جو غیر مذہبی جمہوریہ کے اصول کے خلاف ہیں۔ مرد اور عورت کی برابری کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہیں اور سماجی انصاف کی ابتدائی شرطوں کے خلاف آواز بلند کر رہی ہیں۔ جن نظریات کا ہمارے حقوق کے چارٹر سے تصادم ہوتا ہے اُن کی بھی چند اشخاص کی طرف سے تائید ہو رہی ہے۔

آج جب کہ ہم جمہوری حکومت کا اعلان کر رہے ہیں اور اس طرح ایک نئی زندگی میں داخل ہو رہے ہیں ہمیں ان نظریوں کو اپنے دل میں جگہ دینی چاہئے جن پر ہمارے آئین کی بنیاد ہے۔ خاص طور پر انصاف۔ مساوات۔ بھائی چارے کو جن سے ہماری غیر مذہبی حکومت اپنی بنیادی طاقت حاصل کرتی ہے۔ ہمیں اُن نقلی لیڈروں کے دھوکے میں نہیں آنا چاہئے جو ہمیں گمراہ کر کے ہمیں اس چشمے سے دور لے جانا چاہتے ہیں جس کے پاس انقلاب کی موجیں مچلتی ہیں۔

کشمیری لال ذاکر

زعفران کے پھول

میرا نام قادر جو ہے لیکن جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے لوگ مجھے قادرا کہہ کر ہی پکارتے ہیں۔ اس نے بھی مجھے پہلی بار قادرا ہی کہہ کر پکارا تھا۔ وہ جو میری طرح ہی ایک غریب مزدور کی بیٹی تھی جس کا نام زینی تھا اور جو پچیس سال تک زندگی کی اس کٹھن ڈگر پر میرے ساتھ چلتی رہی اور پھر اس کے ہاتھ میرے ہات سے چھوٹ گئے تھے۔ وہ راستے پر آگری تھی اور پھر کبھی نہ اٹھی تھی۔ میں پام پور کا رہنے والا ہوں۔ پام پور کشمیر میں ہے اور سری نگر سے صرف پندرہ میل کے فاصلے پر۔ اگر آپ بانیہال روڈ سے آئیں تو سری نگر کی حسین وادی میں داخل ہونے سے پہلے آپ اس قصبے میں سے گزریں گے۔ پہلے لوگ کوہالہ روڈ سے بھی آیا کرتے تھے لیکن اب راستے میں بارہ مولا کا بڑا سا قبرستان اتنا بھیانک منظر پیش کرتا ہے کہ لوگ اس طرف سے آتے ہوئے ڈرتے ہیں سکتے ہیں کہ رات کو جب ہر سمت اندھیرا چھا جاتا ہے اور سپیدہ کے درختوں میں سے ہوا سنسناتی ہوئی گزرتی ہے تو بہت سی خوفناک چیخیں سنی جاتی ہیں جو ہر اس راہ گیر کا تعاقب کرتی ہیں جو کشمیر کی حسین وادی سے شراب حسن کا آخری قطرہ تک چوس لینا چاہتے ہیں۔ اسی لئے سیاح اب اس راستے سے نہیں آتے اب وہ بانیہال روڈ ہی سے سفر کرتے ہیں اور پام پور سے ضرور گزرتے ہیں۔ اس کے گرد پھیلے ہوئے کھیتوں کو بھی دیکھتے ہیں جن میں زعفران پیدا ہوتی ہے۔ وہ سڑک کے کنارے پھیلے ہوئے قصبے کے قبرستان کے قریب سے بھی گزرتے ہیں جس میں نرگس اور سوسن کے پھول اس کثرت سے کھلے رہتے ہیں کہ ان پر ایک رنگین مخملیں سیج کا گمان ہوتا ہے۔ اس قبرستان میں زینی کی بھی قبر ہے۔ قبر اگرچہ اب شکستہ ہو چکی ہے لیکن مجھے اسے پہچاننے میں ذرہ بھر بھی دقت نہیں ہوتی۔ میں نے اسے رات کی طویل تنہائیوں میں بھی پہچانا ہے جب ہر طرف تاریکی کا دبیز پردہ چھا جاتا ہے۔ میں نے اسے موسم سرما کی ٹھٹھری ہوئی صبح میں بھی پہچانا ہے جب ہر طرف برف کی سفید تہ نشیب و فراز کو ایک کر دیتی ہے۔ میں نے اسے اس وقت بھی پہچانا ہے جب زعفران کے نیلے نیلے پھول کھلے ہوتے ہیں اور سامنے کی پہاڑیوں سے چودھویں کا چاند نکل کر آسمان میں تیر رہا ہوتا ہے اور سیاحوں کے جھنڈ کے جھنڈ کھیتوں میں اِدھر اُدھر گھومتے نظر آتے ہیں۔ کبھی باجے کی آوازیں اُبھر رہی ہوتی ہیں۔ کہیں کوئی کشمیری گیت فضا میں رس گھول رہا ہوتا ہے اور کہیں زعفران کا نیلا پھول کسی کے جوڑے میں ٹانکا جا رہا ہوتا ہے۔ ایسی ہی ایک سندر رات تھی جب ہم پھول چن رہے تھے۔ ہماری جھولیاں نازک پھولوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ہماری کمریں تھکن سے ٹوٹ رہی تھیں۔ اور ٹھیکہ دار کی کرخت آواز ساکن فضا میں گونج رہی تھی۔ جب سب پھول چننے والے بڈشاہ کے نعرے لگا رہے تھے اور عورتیں اپنی زندگی کی ساری گھٹن اور اپنے خوابوں کی ساری مٹھاس کو گیتوں میں سمو کر فضا کو بوجھل کر رہی تھیں تو زینی میرے قریب آئی۔ اس کی جھولی میں زعفران کے ان گنت پھول بھرے ہوئے تھے۔ اس کے دل میں ارمانوں کی کلیاں کھل رہی تھیں اور نیلے آسمان پر تاروں کے غنچے چٹکے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں کھیتوں کا سب سے خوبصورت پھول تھا۔ اس نے وہ پھول مجھے دیا۔ میری طرف مسکرا کر دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں جھک گئیں اور وہ بھاگ کر پھول چننے والی عورتوں کے جمگھٹ میں گم ہو گئی۔ صرف اس کی سریلی آواز کبھی کبھی اُبھر کر میرے کانوں میں گھل رہی تھی۔

ایک دن زینی دلھن بن کر میرے گھر میں آ گئی۔ کچی مٹی کا بنا ہوا میرا ایک چھوٹا سا گھر تھا، اس مٹی کا جس میں زعفران کے پھول

اُگتے ہیں لیکن میرے آنگن میں ایک بھی زعفران کا پھول نہ تھا۔ میرے گھر
کی دیواروں پر پھول کی ایک سوکھی ہوئی پنکھڑی بھی نظر نہ آتی تھی۔
میں سُرخ تلے سے کڑھی ہوئی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ میرے تن پر ریشمی فرن
تھا، بیٹھے کی پھڑپھڑاتی ہوئی شلوار تھی اور پاؤں میں نیا جوتا تھا۔ زینی
کی پوشاک مجھ سے کہیں اچھی تھی۔ اس کے پاس چاندی کے کچھ زیور بھی
تھے۔ وہ اس دن پہلی بار میرے گھر میں داخل ہو رہی تھی اور میں جھجک
رہا تھا۔ اُسے کہاں بٹھاؤں گا اور کیا کھلاؤں گا۔ وہ کہاں سوئے گی۔
اتنے اچھے کپڑے جو اُس کے باپ نے جانے کتنا روپیہ قرض لے کر سلوائے
تھے کہاں رکھے جائیں گے۔ میں اسی مخمصے میں تھا اور چھت پر ڈھول
اور طوطی کی آواز گونج رہی تھی۔ میرے دوست علی جو، رمضان کاکا اور
شیر علی سب خوش تھے۔ انہیں آج پلاؤ ملے گا۔ بتاشے ملیں گے۔ وہ خوشی
میں دف پر ایک کشمیری گیت گا رہے تھے جس میں ایک دولھا اپنی دلہن کو
زعفران کے پھولوں کی سیج پیش کرتا ہے اس کے گندھے ہوئے بالوں کو
کھول دیتا ہے اور پھر اسے چودھویں کے چاند کی طرف دیکھنے کو کہتا ہے
جس کے گرد کالی کالی بدلیاں رقص کر رہی ہوتی ہیں۔ میں بھی وہ گیت سن
رہا تھا، زینی بھی سن رہی تھی۔ پھر میں بھی خوش ہو گیا۔ میرا گھر بھی ان
لہروں میں بہہ گیا اور یوں ہماری مناہل زندگی کی پہلی رات گزر گئی۔
قہقہوں۔ گیتوں اور زعفران کے پھولوں کی اس وادی میں ایسا

ہی ہوتا ہے۔

زینی کے پہلا بچہ ہوا۔ اس کا نام میں نے علیا رکھا۔ زینی علیے کو
جنم دینے کے بعد بہت مدت تک بیمار رہی۔ جب وہ تندرست ہوئی تو
میں نے پیر کی قبر پر نیا غلاف چڑھایا۔ زینی کا فرن پھٹا ہوا تھا، میرے
کپڑے بوسیدہ ہو چکے تھے۔ بچے کے لئے گرم کپڑوں کی ضرورت تھی۔ سردی
قریب تھی لیکن زینی کو تو پیر نے ہی بچایا تھا، وہی برفیلی ہواؤں کے
تھپیڑوں میں ہم سب کو بچائے گا۔ اسی خیال سے میں نے نیا غلاف اس
کی قبر پر چڑھایا تھا، زینی نے وہاں دیا جلایا تھا اور علیے نے سجدہ کیا تھا
مجھے ہنسی آگئی تھی جب زینی نے علیے کو سجدہ کرنے وقت اُسے بالکل لٹا
ہی دیا تھا۔ میں اور زینی خوش تھے۔ ہم نے کانگڑیوں میں چنار کے
سوکھے ہوئے پتوں کی راکھ تاپ تاپ کر سردیاں گزار دی تھیں۔ پیر نے

ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دی تھی۔ ہم پٹڑی پر سو کر، دروازے بند کر کے
برف کے گرتے ہوئے مہیب تودوں میں بھی محفوظ رہتے تھے اور اب بہار آنے
والی تھی۔ زعفران کے کھیتوں میں جان پڑ گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے پودے
اُگے، بڑھے، پھیلے اور پھر ان میں پھول کھلنے لگے۔ علیا آٹھ ماہ کا تھا اور
زینی کی کوکھ میں ایک اور بچے کا ڈھانچہ مکمل ہو رہا تھا۔ میرے گھر میں
پھر سے بہار آنے والی تھی لیکن مجھے خوشی نہیں تھی۔ مجھے ایک دوسری ہی
سوچ تھی۔ اس سال کھیتوں میں پھول کون چُنے گا۔ مجھ اکیلے کی محنت
سے کیا ہوگا۔ زینی تو اُن دنوں کام کرنے کے ناقابل ہوگی اور پھر اسے علیے
کو بھی سنبھالنا ہوگا لیکن میری اس سوچ سے بہار تھوڑی ہی رُک سکتی تھی
بہار آگئی۔ زعفران کے پھول کھل اُٹھے۔ عورتوں اور مردوں کے گروہ
ان میں کام کرنے لگے اور ٹھیکہ دار کا جوان لڑکا گاؤں کی کنواری لڑکیوں
کو طرح طرح کے لالچ دینے لگا اور جب پھولوں کو سکھانے کا وقت آیا
تو زینی نے محمود کو جنم دیا۔ وہ پھر بیمار ہو گئی۔ پیر کا پہلا غلاف پھٹ گیا
تھا۔ اُسے دوسرے غلاف کی ضرورت تھی۔ میں نے اُس کے مقبرے پر
دوسرا غلاف چڑھایا اور زینی کو ایک بار پھر مرنے سے بچا لیا۔
میں نے زینی سے کئی بار کہا کہ وہ مجھے شہر میں جا کر کہیں مزدوری
کرنے دے لیکن اس نے نہ مانا۔ اُسے اکیلے رہنا پسند نہ تھا۔ میں کہیں نہیں
گیا اور زعفران کے ان کھیتوں ہی میں کام کرتا رہا اور پھر شریفا پیدا ہوا۔
پھر نصیرا، پھر گلا اور پھر کوئی بھی نہیں۔ گلا کی پیدائش کے بعد ہی زینی
مر گئی۔ اس بار پیر نے بھی میری کوئی مدد نہیں کی۔ ٹھیکہ دار کے لڑکے نے
گاؤں کی ایک لڑکی سے اپنے عشق کی تکمیل کی خوشی میں اُسے ایک سیاہ
رنگ کا ریشمی غلاف دیا تھا۔ اب اُسے میرا خیال کیوں ہوتا اور اُسے ہوا
بھی نہیں گلے کی پیدائش کو ابھی چالیس روز بھی نہ ہوئے تھے کہ زینی
مر گئی۔ میں نے اُسے ایک نہایت خوبصورت کفن میں سجایا، چاندی کے
سارے گہنے پہنائے۔ زعفران کے پھولوں سے چھپا دیا اور برستی ہوئی
آنکھوں سے اُسے قبرستان میں اس جگہ دفنایا جہاں سب سے زیادہ پھول
اُگے تھے۔ سب گاؤں والے لوٹ گئے لیکن میں وہاں ہی بیٹھا رہا۔ میں شام
تک وہیں بیٹھا رہا۔ جب سورج غروب ہو گیا اور آسمان پر تارے جھلملانے
لگے تو زینی کا بھائی قبرستان میں آیا۔ اس کے ساتھ علیا، محمود اور شریفا

تھے، اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اُن کے چہروں پر یتیمی کی دُھول جمی ہوئی تھی۔ میں نے انہیں اپنے سینے سے لپٹا لیا اور پھر زینی کو اُنہیں زعفران کے کھیتوں کے سپرد کرتے ہوئے جہاں سے اُسے میں نے پایا تھا میں گھر لوٹ آیا کئی روز تک میں مُردے کی طرح گھر میں پڑا رہا۔ کچی مٹی کا میرا گھر جیسے ایک قبر بن چکا تھا۔ آخر میں نے قبر کی ان دیواروں کو آہستہ آہستہ کریدنا شروع کیا۔ میرے اعضا میں زندگی کے آثار اُبھرنے لگے اور ایک دن میں دوبارہ زندہ ہو کر قبر سے باہر آ گیا۔ میں نے ماحول پر نظر دوڑائی۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ اندھیرا تھا، گھٹن تھی اور میرے سامنے میرے پانچ بچے کھڑے تھے میری اور زینی کی محبت کے نشان، زعفران کے ان کھیتوں کے سینے پر اُگے ہوئے پانچ پھول۔ مجھے انہیں اُن ہاتھوں سے بچانا تھا جو پھولوں کو کھلنے سے پہلے روند ڈالا کرتے ہیں۔

میں خوش تھا کہ میں نے انہیں بچا لیا تھا۔

اب وہ نازک پھول ایک مضبوط باڑھ میں بدل گئے تھے اور باڑھ کے اندر میں تھا، ایک شکستہ، خشک اور نڈھال درخت۔ اب انہیں اس درخت کی دیکھ بھال کرنا تھی۔ اپنے بوڑھے باپ کی خدمت کرنا تھی۔

علیا ہانجی بن گیا۔ محمود نے اخروٹ کی لکڑی پر بیل بوٹے بنانے کا کام سیکھنا شروع کر دیا۔ شریفا ایک سرکاری باغ میں مالی ہو گیا۔ نصیرا کو میں نے اپنے پاس ہی رکھا تاکہ وہ گھر کی دیکھ بھال کر سکے۔ علیا ایک کامیاب ہانجی ہو گیا اور اس نے ایک چھوٹا سا شکارہ بھی بنوا لیا۔ اس میں وہ صاحب لوگوں کو بٹھا کر جہلم اور ڈل کی سیر کراتا تھا اور نشاط اور شالامار باغ دکھاتا تھا۔ چودھویں کا چاند چمک رہا تھا اور وہ اپنے شکارہ میں آوارہ مزاج صاحبوں کو بٹھا کر ڈل کی سیر کر رہا تھا کہ اچانک تیز ہوا چلنے لگی۔ آسمان پر بادل چھا گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک خوفناک طوفان اُمڈ آیا۔ ہر طرف گہرا اندھیرا چھا گیا۔ اس نے چاہا کہ وہ کشتی کو کنارے پر لے جائے۔ لیکن ہوا کے تھپیڑے تُند تھے۔ اندھیرا گہرا تھا اور راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ کشتی الٹ گئی اور سب سیاح ڈوبنے لگے۔ وہ چاہتا تو تیر کر اپنی جان بچا سکتا تھا لیکن وہ اپنے مسافروں کو بچانے لگا اور اسی کوشش میں خود بھی ڈوب گیا۔ اُسی رات میں نے اس کے بیاہ کی بات پکی کی تھی۔

محمود، شریفا، نصیرا، سب اس کی موت پر روئے۔ کھیتوں میں اُگے زعفران کے پھولوں نے بھی آنسو بہائے۔ میں نے اس کی لاش کو اس طرح سجایا جیسے دولہا کو بیاہ کے لئے سجایا جاتا ہے جیسے علیے کو قبر میں نہیں دفنانا تھا اُسے سجا کر سسرال بھیجنا تھا۔ ہم نے اُسے زینی کے قریب دفنا دیا۔ اس کی قبر پر پھولوں کے انبار لگا دئے اور انہیں آنسوؤں سے تر کر دیا کہ وہ جلد نہ سُوکھ سکیں

علیا مر گیا۔ زعفران کا ایک پھول زعفران کے کھیتوں میں سما گیا۔

محمود نے دئے کی روشنی میں دن رات کام کر کے اپنی آنکھیں گنوا لیں۔ میں اُسے اپنی گرتی ہوئی صحت کا خیال رکھنے کو کہتا تو وہ ہنس دیتا اور اپنے فن کا کوئی نہایت ہی خوبصورت نمونہ میرے سامنے رکھ دیتا۔ اس کے چہرے پر ایک نور سا پھیل جاتا جیسے اچانک اسے کوئی عظیم روشنی نظر آ گئی ہو۔ پہلے علیا ہر ماہ کچھ نہ کچھ اُسے دیا کرتا تھا علیا مر گیا تو اس کی زندگی کو سینچنے والا چشمہ ہی سوکھ گیا۔ وہ روز بروز کمزور ہونے لگا۔ اسے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا اور آخر اس کے پھیپھڑے بھی خراب ہو گئے۔ موت اس کے قریب آتی گئی اور وہ اخروٹ کی لکڑی پر حسین وادی کے سندر نقوش بکھیرنے میں لگا رہا۔ اس نے فن کی خاطر اپنا سب کچھ لُٹا دیا۔ میں اُسے گھر لے آیا اور اس کی خدمت کرنے لگا اس سال پہلی بار کشمیر میں خوبصورت چیزوں کی نمائش ہو رہی تھی۔ وہ میز پر آنکھیں بند کئے بیٹھا رہتا اور کسی عظیم شاہکار کے خاکے طیار کرتا رہتا جو اُسے نمائش میں ایک لافانی مرتبہ دلائے گا۔ کبھی اُس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور کبھی آپ سے آپ مردہ سی ہنسی ہنسنے لگتا۔

ایک شام کو جب میرے کچے گھر میں مدھم سا دیا روشن تھا اور کھیتوں میں زعفران کے پھول مہک رہے تھے محمود نے خون تھوکا اور چند ہی لمحوں میں اتھاہ اندھیرے میں کھو گیا۔

میں نے اس کی لاش کو ایک خوبصورت ریشمی کفن میں لپیٹا جس پر پھول کڑھے ہوئے تھے۔ جس میں ویسے ہی خواب دفن تھے جیسے محمود دیکھا کرتا تھا۔ اُس کفن سے زعفران زاروں میں سسکتی ہوئی محنت اور بھوک اور احتیاج سے کراہتا ہوا ذہن ڈھکا ہوا تھا۔ اس میں ایک فن کار کی آخری پرچھائیں تھی جس نے ہمالہ کی کنواری چوٹیوں کی پاکیزگی

چشموں کی موسیقی، جنگلی پھولوں کی باس اور ہوا کی لہروں کو قید کرنا چاہا تھا۔ وہ قید نہ ہو سکے۔ وہ کبھی قید نہ ہوں گے اور محمود مر گیا، اس کے جانے کتنے ہی اور ساتھی مر گئے۔

محمود کو میں نے علیے کے قریب اس تابوت میں بند کر کے دفنایا جو اس نے میرے لئے بنایا تھا۔ اپنے بڈھے باپ کی محبت کو احترام اور عقیدت سے دفنانے کے لئے اس نے جانے کتنی ہی راتوں کے رتجگے اس پر قربان کئے تھے۔ میں گم صم کھڑا اس تابوت کو دیکھ رہا تھا جو میرے لئے بنا تھا جس میں میری لاش رکھی جانے والی تھی اور گاؤں والے اس کی لاش کو تابوت میں بند کر کے اب اسے وہاں لئے جا رہے تھے جہاں زینی اور علیا نرگس اور سوسن کے انبار لئے کر اس کے سواگت کو کھڑے تھے۔

محمود مر گیا۔ زعفران زاروں نے ایک اور پھول کچل ڈالا۔

شریفا پہاڑ کی تلہٹی میں ایک باغ میں کام کرتا تھا۔ اس نے وہاں سیب، ناشپاتی، زرد آلو، آلوچے، بادام، گلاس اور ملیبیل دوسرے پیڑ لگائے تھے۔ اس نے اس ویران جگہ کو جسے باغ کہہ کر اسے مالی کے کام پر لگایا گیا تھا اب سچ مچ ایک خوبصورت باغ میں بدل ڈالا تھا۔ جب سے وہ نوکر ہوا صرف تین بار مجھے ملنے آیا۔ پہلی بار علیے کی موت پر، دوسری بار محمود کی موت پر اور تیسری بار جب وہ خود بہت سخت بیمار ہو گیا تھا۔ وہ وہاں سے آ ہی نہ سکتا تھا کیونکہ جنگلی جانور سارے باغ کا تہس نہس کر جاتے تھے۔ وہ ان پودوں کی رکھوالی میں ہر لمحہ وہیں رہتا۔ وہ پودے جو اس نے خود اگائے تھے جنہیں اس نے خود سینچا تھا اور جس کے پھل وہ نہ کھا سکتا تھا۔ وہ پھل دنیا کے ہر ملک میں کسی نہ کسی شکل میں پہنچتے تھے۔ کشمیر کے باغوں کی تعریف ہوتی تھی جن میں ایسی چیزوں کی تخلیق کی صلاحیت تھی۔ لیکن شریفے کے لئے کسی کے پاس تعریف کے الفاظ نہ تھے۔ اور کشمیر میں سینکڑوں باغ تھے۔ ان میں ہزاروں شریفے کام کر رہے تھے۔ وہ درخت اگاتے تھے۔ ان کے پھول دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ پھولوں سے لدی ہوئی ٹہنیوں کو دیکھ کر وہ آنے والی فصل کے متعلق قیاس آرائیاں کرتے تھے جو پکنے سے پہلے ہی ان سے چھین لی جائے گی جس کے ارد گرد کانٹے دار تار لگا دیا جائے گا اور وہ اس کو چھو نہ سکیں گے۔

میں خود شریفے سے کئی بار ملنے گیا۔ میں جب بھی گیا اسے کام میں مصروف پایا۔ وہ جب کام سے فارغ ہو جاتا تو اس نیزے کے پھل کو پتھر پر رگڑ کر تیز کرنے لگتا جو جنگلی جانوروں کے مقابلے کے لئے اسے دیا گیا تھا اور جو اب کند ہوتا جا رہا تھا۔ ایک رات ایک بھوکے ریچھ نے زمین چھوتی ہوئی پھل دار ٹہنیوں کو اجاڑنا شروع کر دیا۔ پہلے تو شریفا دیکھتا رہا لیکن پھر اس سے یہ ظلم نہ سہا گیا۔ وہ اپنا کند نیزہ لے کر ریچھ پر جھپٹا اور ریچھ نے اسے چیر کر رکھ دیا۔ میں اسے روکتا رہا۔ دوسرے دن اس کا نچا ہوا ادھورا جسم لے کر میں پام پو چلا آیا اور اسے علیے اور محمود اور زینی کے قریب دفنا دیا۔ اس کی قبر پر میں نے پھول نہ بکھیرے کیونکہ اس کے زخمی جسم سے خون نے رس رس کر سفید کفن کو گلزار بنا ڈالا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مردہ پھول ایک دن ضرور کھلیں گے۔ اب نہیں تو اگلے برس، اس سے اگلے برس، اس سے بھی اگلے برس لیکن زعفران کے کھیتوں میں ایک دن لوٹ کر بہار آئے گی۔

اور پچھلے سال کشمیر کی اس حسین وادی میں لٹیروں کا ایک بہت بڑا گروہ یکایک داخل ہو گیا۔ وہ زعفران کے ان کھیتوں کو، پہاڑوں سے گرنے جھرنوں کو، تلہٹیوں میں پھیلے شاداب باغوں کو، ڈل میں کھلے کنول کے پھولوں کو اور جہلم میں تھرکتے بجروں کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتے تھے۔ وہ آگ اور گولے لے کر آئے۔ انہوں نے دہشت اور خوف پھیلایا انہوں نے لہلہاتی فصلوں کو اجاڑا، مکانوں کو گرایا اور اس حسین وادی میں بسنے والے بے گناہ لوگوں پر ظلم ڈھائے۔ وہ مزدور جنہوں نے ہمیشہ دوسروں کے لئے اپنی محنت بیچی تھی۔ وہ کسان جنہوں نے دوسروں کے لئے اپنے کھیتوں میں چاول اگائے تھے۔ وہ مالی جنہوں نے اوروں کے لئے رس دار پھل اگائے تھے، وہ مانجی جنہوں نے انہیں خوشنما کشتیوں میں کوڑھیوں اور مریضوں کو لاد کر ان خوشگوار ہواؤں میں گھمایا تھا، وہ کبڑے شال باف جنہوں نے کئی کئی روز تک سورج کی روشنی بھی نہ دیکھی تھی سب چلا اٹھے۔ وہ کشمیر کی اس حسین وادی میں کسی لٹیرے کو داخل نہ ہونے دیں گے۔ ان کے بھائی جن چیزوں کو اپنے ہاتھ میں لینے کیلئے اٹھارہ سال سے لڑ رہے تھے وہ کسی دوسرے کے ہاتھ

کیسے سونپی جاسکتی تھیں -

شکستہ حال مزدوروں، مفلس کسانوں اور بھوکے فن کاروں کا عظیم گروہ اپنی حسین وادی میں کھلے پھولوں کی حفاظت کے لئے لٹیروں کے بڑے بھاری ریلے سے ٹکرا گیا - ان میں نصیرا بھی شامل تھا - میرا چوتھا لڑکا نصیرا جو میری دیکھ بھال کے لئے اب تک میرے پاس تھا لٹیروں کو اپنی وادی سے باہر نکالنے کے لئے چلا گیا - لٹیرے تو نکل گئے لیکن وہ واپس نہ آیا - صرف ایک اطلاع آئی کہ وہ بہادری سے لڑتے ہوئے مارا گیا مجھے یہ خبر سن کر کوئی دکھ نہیں ہوا بلکہ خوشی ہوئی - میں نے سوچا کاش علیا، محمود اور شریفا بھی آج لٹیروں سے لڑتے ہوئے ہی مرتے - انہوں نے ڈونگے چلا کر، لکڑی پر کھدائی اور پھلوں کی رکھوالی کر کے ناحق اپنی جانیں گنوائی تھیں - آج ان کی زندگیوں کی ضرورت تھی ---- اور میں اپنے کاندھے پر ایک بیلچہ اٹھا کر قبرستان چلا گیا جو سڑک کے ایک کنارے نرگس اور سوسن کے پھولوں سے بھرا پڑا تھا - یہاں زینی اور اس کے تین بچے میری راہ دیکھ رہے تھے اور میں اب اُن کے پاس جا رہا تھا انہیں یہ کہنے کے لئے کہ نصیرا ایک مجاہد کی موت مرا ہے - اسی لئے تو ان کھیتوں میں زعفران کے پھول پہلے سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہے تھے - میرے ساتھ گلا بھی تھا، میرا آخری بچہ - اس کے ہاتھ میں وہ پھول تھا جو مجھے زینی نے کئی برس پہلے ایک چاندنی رات میں انہیں کھیتوں میں بطور یادگار دیا تھا اور خود آنکھیں جھکا کر واپس ہو گئی تھی اور اس کے گیت دیر تک میرے کانوں میں رس گھولتے رہے تھے - گلا اس سوکھے ہوئے پھول کی ٹوٹتی ہوئی پنکھڑیوں کو سنبھالے میرے ساتھ آ رہا تھا -

میں نے زینی، علیا، محمود اور شریفا کے قریب ہی ایک اور قبر کھودی میں نے اپنی مدد کے لئے کسی کو بھی نہیں بلایا - میں اکیلا ہی نصیرا کے لئے قبر کھودنے کے لئے آیا تھا جس کی لاش بارہ مولا کے کھیتوں میں گدھ نوچ رہے تھے - میں نے قبر کھودی اور ارد گرد کے کھیتوں سے جھولی میں پھول اکٹھا کر کے اس میں بھر دئے - قبر میں نصیرے کی لاش کی جگہ زعفران کے پھول تھے - مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی ان پھولوں کو چنتے ہوئے جیسے وہ کھیت میرے اپنے تھے - اُن میں کھلے ہوئے پھول میرے تھے، ان کی خوشبو اور مہک میری اپنی تھی - میں نے قبر میں مٹی ڈال دی - اُسے اوپر سے ہموار کیا اور اس تازہ کھودی ہوئی مٹی پر وہ سوکھا ہوا پھول رکھ دیا جو مجھے نصیرے کی ماں نے دیا تھا - جو اس کی محبت کی یادگار تھا ---- اور پھر ہوا اچانک تھم گئی، چاند پہاڑی کے پیچھے سے ابھر آیا اور تاروں نے اپنی نگاہیں ہم پر جما دیں -

میں اپنے زعفران زار میں بیٹھا تھا جس کے سارے پھول زمین میں دفن تھے پھر سے مہکنے کے لئے اور گلا ایک طرف کھڑا نصیرے کی قبر پر پڑے ہوئے پھول کو دیکھ رہا تھا -

---

ہندوستان میں سوڈیم سلفیٹ کی معیار بندی

گذشتہ عالمگیر جنگ کے زمانہ سے ہی ہندوستان میں سوڈیم نیپو سلفیٹ، سوڈیم سلفیٹ اور سوڈیم بائی سلفیٹ باقاعدہ اور کافی وسیع پیمانہ پر تیار کیا جاتا ہے - انڈین ٹیرف بورڈ نے ان کے متعلق تحقیقات کرنے کے بعد یہ سفارش کی ہے - کہ ان اشیا کے لئے نمونے معیار تیار کئے جائیں - انڈین سٹینڈرڈز انسٹی ٹیوشن کی شعبہ فائن کیمیکلز (آرگینک اور ان آرگینک) کمیٹی نے ان تینوں کے لئے تین ہندوستانی معیاری مسودے تیار کئے ہیں جن میں ان اشیا کی تجارتی فوٹوگرافی اور طبی درجہ بندی کے نمونے اور نقشے دیئے گئے ہیں معیاری نمونہ کا مقصد مندرجہ ذیل خصوصیات حاصل کرنا ہے - تیار شدہ مال کا خالص ہونا پانی میں حل نہ ہونے والے اجزا - لوہا - بھاری دھاتیں سنکھیا - اور ملاوٹ کی دیگر اشیا کی قابل برداشت مقدار کا تقرر ہر ایک معیار کے نمونے تیار کرنے اور مطلوبہ خصوصیات کے مطابق مال کی جانچ کرنے کے طریقے بھی مسودہ گوشواروں میں درج کئے گئے ہیں -

اس سلسلہ میں دلچسپی رکھنے والے انسٹی ٹیوشن کے ممبروں - کھپت کرنے والوں کارخانہ داروں - اور متعلقہ ماہرین کو یہ مسودے بھیجے جا رہے ہیں - ان کے بارے میں آرا ۱۵ اپریل ۱۹۵۰ء تک ڈائرکٹر انڈین سٹینڈرڈز انسٹی ٹیوشن بلاک ۱۱ - اولڈ سیکرٹریٹ دہلی نمبر ۲ کو بھیجی جائیں -

مہاتما گاندھی کی شہادت

یہ برازیل کی مشہور شاعرہ **Cecilia Meireles** کی نظم "مہاتما گاندھی کی شہادت" کا اردو ترجمہ ہے جو اُنہوں نے ریو ڈی جنیرو میں مہاتما گاندھی کی شہادت سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ اصل نظم پُرتگالی زبان میں لکھی گئی اور فروری ۱۹۴۸ء میں اس کا فرانسیسی ترجمہ شائع ہُوا۔ اس کا انگریزی ترجمہ حال ہی میں شائع ہُوا تھا۔ اس کا اُردو ترجمہ اسی سے پیش کیا جا رہا ہے (ظہور الحسن)

نیلی پریاں رُک گئیں اور ساتھ ہی ساتھ پَروالے گھوڑے بھی
اور مَیں نے اپنے روحانی خواب کے خوبصورت پھُول بھی پھینک دئے
اخبار کے صفحات چاروں طرف، ہوا میں کھلے پڑے ہیں —
"لوگوں کو دُعائیں دیتا ہُوا مار ڈالا گیا"

رات کی وسعت میں، میں نے ایک مغموم چیخ — طائروں کی سی ایک دردناک آواز سُنی
اور نیند سے اُٹھ کر مَیں نے وہ جگہ تلاش کی جو بہت دُور تھی اور سمجھ سے باہر
کیا یہ تم تھے جس نے خون کے چھوٹے سے اور آخری قطرے کے ساتھ ایسی کمزور آہ کھینچی تھی؟
کیا یہ تمہاری ہڈیاں تھیں جنہیں دن ڈھلتے وقت موت بانسوں کی سرسراہٹ کی سی کمزور آواز کے ساتھ چیرتے ہوئے نکل گئی تھی۔

ستیہ گرہ کے دن، جب ہر گھر میں چرخہ کاتا جاتا تھا......
جب بندے ماترم ریشم کے زردوز کپڑوں میں لپٹے ہُوئے چھوٹے سے ہارمونیم پر گایا جاتا تھا........
دارجلنگ کی چائے "ملاڈی" جس کی خوشبو گلاب کے سفید پھولوں کی مانند ہوتی ہے
اے سڑکو! کیا تم جانتی ہو کہ اس طرف، دنیا کے دوسرے حصّے میں کون مار ڈالا گیا؟
دُنیا کے سیاہ فام بچھو! تم یہ بھی نہیں جانتے کہ تم کو رونا چاہیئے!
ٹیگور! تم ان طیور کی طرح گاتے ہو جنہیں صبح کو دانہ کھلایا جاتا ہے
مگر ایسے بھوکے طیور بھی ہیں، جن کی کوئی آواز نہیں — !
اور شام کی ہوا، اخبار کی تلخ سرخیوں کو اِدھر اُدھر پھیلا رہی ہے — لوگ
چلے جا رہے ہیں!
وہ اُن کو بچّوں کی آنکھوں سے پڑھ رہے ہیں، جو کہانیاں پڑھا کرتے ہیں
— اور لوگ ساتھ ساتھ چلے جا رہے ہیں!
اور ہم سب ساتھ ہی ساتھ چلے جا رہے ہیں اور جو ہم میں سب سے زیادہ باریک نظر ہے۔ وہ اپنی رُوح اور اپنی نظر کے درمیان ایک کانٹا دیکھتا ہے
یہاں بھی پانچ بج رہے ہیں، اور میں تمہارا نام ہزاروں پیالیوں کے درمیان دیکھ رہی ہوں،
چائے سے اُٹھتی ہوئی ہلکی بھاپ کے درمیان جسے کوئی نہیں پیتا!

"یہ آدمی کیا چاہتا تھا؟" "یہ آدمی دُنیا میں آیا کس لئے؟
— میں اُس آسمانی کمہار کی بنائی ہوئی مٹی کی پیالی سے زیادہ کچھ نہیں
جب اُس کو میری ضرورت باقی نہ رہے گی، وہ مجھ کو ٹوٹنے کے لئے گرا دیگا!"

اس نے تم کو گرنے کے لئے چھوڑ دیا — بڑی بے ترتیبی سے!
مگر پھر بھی خون کا ایک قطرہ اندر رہ ہی گیا
تمہارا دل تو ابھی تک خشک نہ ہُوا تھا، بہادر دیوتا —
پاک الفاظ کے درمیان، سفید کپڑے کی تہہ میں، سب سے زیادہ کھلا ہُوا گلاب کا ایک چھوٹا سا پھُول، !

شام کی ہوا ہندوستان اور برازیل کے درمیان آتی ہے اور جاتی ہے مگر تھکتی نہیں
اور سب سے بڑھ کر میرے بھائیو! — عدم تشدّد!!

ٹگر سب کے پاس — ان کی جیبوں میں دُھوئیں چھوڑنے والے پستول ہیں
اور درحقیقت ایک تم ہی تھے جس کے پاس نہ پستول تھا نہ جیبیں، نہ جھوٹ
بالکل غیر مسلح، ماضی سے بے پروا اور فردا سے بے نیاز!

یہ ہوا تمہاری تمام زندگی اور میری زندگی کا بہترین حصہ لئے جا رہی ہے،
بغیر جھنڈے کے اور بغیر دو دلوں کے! اس ٹوٹی ہوئی دُنیا میں کچھ باقی
نہیں سوائے رُوح کے
ہند کی عورتیں آہ و بکا کی گٹھری بن کر جھک گئی ہیں
تمہاری چِتا جل رہی ہے۔ گنگا تم کو بہا کر بہت دُور لے جائے گی
مٹھی بھر خاک کو پانی لپک کے چُوم لے گا
اور پھر سورج پانی سے اُٹھا کر خدا کی ابدی امانت میں دے دیگا!

جن لوگوں کو تم نے دیکھا ہے، اُن کے بارے میں تم خدا سے کیا کہو گے؟
شاید ایک چھوٹی سی بکری ان سب سے افضل ٹھہرے گی۔

ہوا میں اخباروں کی سُرخیاں گُونج رہی ہیں، لوگ چل پھر رہے ہیں، لوگ
ناچ رہے ہیں
ابھی یہاں مینا بازار کا وقت ہے (اور ہر جگہ ہے)
دیوانہ پن کی باتیں اور حرص کی آوازیں مضبوط کمانوں کی طرح محیط ہیں
مجمع کا شور ہزاروں عمارتوں میں گونج رہا ہے!

فقیر اپنے قاتلوں کو دُعائیں دیتے ہُوئے، بغیر شور مچائے مر جاتے ہیں
امن کی آخری آواز آسمان کی خاموشی میں لوٹ جاتی ہے
میرے درخت کے پتے جھڑ رہے ہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تنہائی مجھ سے
ہم آغوش ہونے کو چلی آ رہی ہے
بادل آ رہے ہیں —— تیز چلنے والے جاں داروں کی طرح
ہوا بادلوں کو اکٹھا کر رہی ہے اور ہاتھیوں کی فوج کو آگے بڑھا رہی ہے
اڑ چلو اے لوگو! اس کمزور فقیر کی مدد کو، جو تم سے محبت رکھتا تھا!

میرے بازوؤں میں سچائی اور بہادری واپس چلی آ رہی ہے

میرے اور تمہارے دلوں کے درمیان وہ کون سا تار نغمہ زن تھا
کہ میرا خون اس لئے اثر پذیر ہو کہ تمہارا خون بہایا گیا!

یہ ہوا لوگوں کو ان گلیوں سے لئے جا رہی ہے جہاں وہ اپنا کام کرتے ہیں
اور اپنے جرم کرتے ہیں
یہ ہوا ان کی حیرت، ان کی کاوشِ فکر، ان کا غم اور ان کے قہقہے لئے
جا رہی ہے
یہ ہوا ان میں سے ہر ایک کو اس کی موزوں جگہ پر پھینک رہی ہے اور
اپنا قافلہ لئے جا رہی ہے
یہ ہوا تیزی کے ساتھ شعلوں کو بھڑکائے گی اور ہلکی ہلکی چنگاریوں کو
اُڑائے جائے گی
پھر وہاں اندھیرا ہوگا اور بہت زیادہ غم، آخر کار وہ آنسو بہہ نکلیں گے
جو تم نے امن کے بندھن میں یکجا کر کے روک رکھے تھے!

خدا تُم سے کہے گا "انسان بہت وحشی ہُوئے ہیں میرے بیٹے!
"ہم نے بہت صبر کیا۔ آؤ ہم ان کو چھوڑ دیں تاکہ وہ خلفشار
میں دوبارہ مبتلا ہو جائیں اور سمندر کھول اُٹھے۔
"تاکہ وہ جائیں اور پھر آئیں اور پھر جائیں اور آئیں،
"آؤ اور میرے نیلے محلوں سے گناہوں کی خوں ریز جنگ کا
مشاہدہ کرو
"اب ازل کی طرف لوٹ جانے کی ضرورت ہے! میں بھی اپنی آنکھیں
بند کر لوں گا
"اور اسی لئے میں نے حکم دیا تھا کہ تم تشدد سے چُور کر دئے جاؤ
"ابنِ نوعِ انسان ہے کہاں کہ تمہاری خدمت کی اس کو فرصت ہو،
"میرے ساتھ ہی تم اپنی آخری سانس بھی کھینچ لو — اس وقت کے
لئے جب ہم اپنی آنکھیں پھر کھولیں گے
"—— جب انسان ہمیں پکاریں گے!"

یہ ہوا خدا کے الفاظ، آگ کی ہزاروں زبانوں میں پھیلا رہی ہے
اور تمہاری ضعیف ہڈیوں کی راکھ کے ہزاروں پھولوں میں مہکتا تھا!

مارچ ۱۹۵۰ء

آجکل دہلی

راجندر ناتھ شیدا

اقبال کی ذہنی اُلجھن اور اس کے عناصرِ ترکیبی

آج تک اردو کے جن شاعروں نے زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق سنجیدگی سے غور کر کے قوم کے سامنے کوئی فلسفۂ حیات پیش کیا ہے۔ ان میں اقبال کا نام ہمیشہ سرِ فہرست رہے گا۔ اس میں شک نہیں کہ آرٹ اور لٹریچر کی ہر شاخ میں اظہار و ابلاغ کے محاسن پر ایک بڑی حد تک اس کی دلکشی اور تاثیر کا انحصار ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی فنکار عالمگیر حیات کے گوناگوں مسائل کا نظرِ غور سے مطالعہ کئے بغیر بلند مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا جمالیاتی تجربہ کا حیات سے بہت گہرا تعلق ہے، در اصل حیات ہی کے ایک پرتو کا نام جمال ہے اور یہ جمال عموماً سطحِ حیات پر مختلف سمتوں میں دوڑتی ہوئی لہروں کے آنچل میں رُو پوش ہوتا ہے۔

اقبال کے نظامِ فکر میں جو گہرائی اور ربط ہے وہ کسی سنجیدہ پڑھنے والے کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اگرچہ کبھی کبھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اپنے نظریات کے سلسلے میں انھوں نے ایشیا اور یورپ کے فلاسفے سے استفادہ کیا ہے لیکن ان کی نظم و نثر کی تمام تصنیفات پڑھنے سے یہ بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ اقبال کے عقیدے کے مطابق ان کے تمام بنیادی نظریات قرآن کے صحیح مطالعے کا نتیجہ ہیں۔ "اسرار و رموز" میں انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق اپنے اساسی نظریات بیان کرنے کے بعد حضرت محمدؐ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است | در بحرفم غیر قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن | ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا | بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا
گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام | با مسلماناں اگر حق گفتہ ام
دعۂ عمل پائندہ تر گرداں مرا | آبِ نیسانم گہر گرداں مرا

رومی کی مثنوی سے بھی جو اقبال کو اس قدر دلچسپی تھی اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ مثنوی کو قرآنی تعلیمات کی صحیح تعبیر تصور کرتے تھے۔ اور پھر اس کے متعلق تو پہلے ہی مشہور ہے

ہست قرآں در زبانِ پہلوی

چنانچہ اقبال بھی یہی سمجھتے تھے۔ اسی لئے تو کہتے تھے۔

زچشمِ مستِ رومی وام کردم | سرورے از مقامِ کبریائی

یہ خیالات اقبال کی تصانیف میں اس طرح بکھرے ہوئے ہیں کہ ان کے متعلق کسی مغالطے یا تردید کی گنجائش باقی نہیں رہی اور یوں بھی اقبال کے "ناقدوں" میں اسلام اور ان کی تعلیمات کو مترادف قرار دینے کا رواج عام ہے۔

اس حقیقت کو کسی منطق سے جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ قرآن کی بہت سی تفسیریں موجود ہیں۔ اور اس کی تعلیمات کی مختلف تعبیروں نے ظہورِ اسلام سے آج تک نہ جانے کتنے فرقے اور مکاتب پیدا کئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اپنے نقطۂ نظر کو غلط نہیں سمجھتا تھا۔ اور اکثر اوقات یہ اختلافات زندگی کے تصورات میں بعد المشرقین پیدا کر دیتے تھے۔ اختلافات کا یہ سلسلہ خود اقبال کے زمانے تک جاری رہا اس لئے تو انھوں نے کہا تھا۔

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ | ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است | چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است

ہمیں اسلامیات کے ماہر ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔ لیکن انسانی امور سے عام دلچسپی رکھنے والے انسان کی حیثیت سے کچھ شبہات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ قرآن کے ان مستند مفسرین کو تو جنھوں نے اسلام قرآن اور عربی کے ماحول میں زندگیاں بسر کیں اور جن کا خود علمائے کرام صدیوں سے احترام کرتے چلے آئے ہیں، قرآن فہمی کی سعادت سے محروم قرار دیا جائے، اور بیسویں صدی کے ایک ہندوستانی شاعر کا قرآن کی

صحیح تعلیمات اور اسپرٹ کی تہ تک پہنچنا تسلیم کر لیا جائے جب کہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اقبال اکثر فقہ کے مسائل خود مولانا سلیمان ندوی سے سمجھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اس کی شہادت کے طور پر مولانا کے نام ان کے دو خطوط کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ جو شیخ عطاء اللہ کے مرتبہ "اقبال نامہ" یعنی مجموعہ مکاتیب اقبال سے ماخوذ ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں

"اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے۔ اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں ان سے ایک ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ صورت میں اس کام کو آپ کے سوا کون کرے گا۔ میں نے ایک رسالہ اجتہاد پر لکھا تھا مگر چونکہ میرا دل بعض امور کے متعلق خود مطمئن نہیں اس واسطے اس کو اب تک شائع نہیں کیا آپ کو یاد ہوگا میں نے آپ سے بھی کئی امور کے متعلق استفسار کیا تھا:

اس خط میں غالباً حسب ذیل استفسار کی طرف اشارہ ہے۔

"آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ فقہا نے اجماع سے نص کی تخصیص جائز سمجھی ہے۔ ایسی تخصیص یا تعمیم کی مثال اگر کوئی ہو تو اس سے آگاہ فرمایئے۔

اس کے علاوہ یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہے کہ ایسی تخصیص یا تعمیم صرف اجماع صحابہ ہی کر سکتا ہے۔ یا علما و مجتہدین امت بھی کر سکتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کی تاریخ میں صحابہ کے بعد کوئی ایسی مثال ہو تو اس سے بھی آگاہ فرمایئے۔ یعنی یہ کہ کس مسئلے میں صحابہ یا علمائے امت نے نص کے حکم کی تخصیص یا تعمیم کر دی۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ تخصیص یا تعمیم حکم سے آپ کی کیا مراد ہے۔

۲۔ دیگر آپ کا ارشاد ہے کہ اگر صحابہ کا کوئی حکم نص کے خلاف ہو تو اس کو اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ کوئی ناسخ حکم ان کے علم میں ہوگا جو ہم تک روایۃً نہیں پہنچا۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کوئی حکم ایسا بھی ہے جو صحابہ نے نص قرآن کے خلاف نافذ کیا ہو۔ اور وہ کون سا حکم ہے؟

بہرکیف ہمارا مقصد کوئی مذہبی بحث چھیڑنا نہیں ہے۔ بلکہ یہ واضح کرنا ہے کہ اسلام اور اقبال کی تعلیمات کو بالکل ایک سمجھنا حقیقت کو سر کے بل کھڑا کرنے کے مترادف ہے۔ ایسا تاریخی ارتقا کے عام اصول کو نہ سمجھنے سے ہوتا ہے۔ اسلام ہی نہیں بلکہ ہر مذہب اپنے ماحول کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے نظریات اور تعلیمات میں سے کچھ میں مقامی رنگ ہوتا ہے۔ کچھ میں آفاقی۔ بعد کے علما اور مجتہدین جنھیں حالات بدل جانے کی وجہ سے خالص تصورات کے مقابلے میں اپنی زندگی اور اس کے ماحول و مسائل سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر مذاہب کی نئی تعبیروں کے ذریعے سے اپنی زندگی کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں انھیں کامیابی بھی ہو سکتی ہے۔ ناکامی بھی۔ اس کا انحصار علما کی بصیرت اور دوسری شرائط پر ہے۔ منجملہ اور وجوہ کے مفسرین اور فقہا میں اختلافات کی ایک بڑی وجہ یہ ہے۔

اقبال کے نظریات میں جو الجھنیں ملتی ہیں ان کے اسباب اور نوعیت سمجھنے کے لئے ہمیں ان کے سماجی اور ذہنی ماحول پر غور کرنا ہوگا۔ اقبال کا عرصۂ حیات ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء سے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء تک ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں کئی حیثیتوں سے انتہائی کشمکش اور ہیجان کا زمانہ ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے ہندوستانی حکمرانوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے درمیان طویل کشمکش کو ایک خاص منتہا پر پہنچا کر باقاعدہ برطانوی راج قائم کر دیا۔ یورپ کے مختلف ممالک میں نئی صنعتوں کی تیز رفتار نے درمیانی طبقے کی تعداد اور طاقت میں بے حد اضافہ کر کے اقتصادی اور سیاسی نظام کی باگیں اس کے ہاتھ میں دے دی تھیں۔ جاگیردارانہ نظام کے خلاف جدوجہد میں اس طبقے کا سب سے بڑا ہتھیار عقلیت تھی جو دوسری باتوں کی طرح جاگیرداری کے سب سے بڑے معاون، مذہب کے کھوکھلے اور غیر منصفانہ نظام فکر کو بے نقاب کرنے میں استعمال ہوئی اٹھارویں اور انیسویں صدی کے بہترین یورپین دماغوں کی مسلسل کاوش سے مذہب کے فلک پیما محلوں کی جڑیں ہل گئیں۔ مذہبی اصلاح کا کام ریفارمیشن کے زمانے میں ہو چکا تھا۔ اب انسان کے بلند حوصلے سماج کو نئی نہیوں پر قائم کرنے کے لئے بے قرار تھے۔ کیونکہ زندگی اس منزل ارتقا پر پہنچ چکی تھی جس کے بارے میں اقبال کے محبوب شاعر رومی نے کہا تھا۔

هر بنائے را کہ آبادان کنند　　اوّل آں بنیاد ویراں کنند

لہٰذا مارکس نے جو مذہب کو عوام کے حق میں افیون کہا کرتا تھا وہ کسی فلسفی شاعر کا نادر تخیل نہیں تھا۔ بلکہ ترقی پذیر انسانیت کے باطل شکن شعور کی پکار تھی۔

اس پس منظر میں ہمیں باقاعدہ برطانوی حکومت کے آغاز میں اپنے ملک کے حالات پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ ہندوستان میں ہزاروں

سال سے شخصی حکومتیں قائم تھیں اور اقتصادی زندگی تمام تر زراعت اور گھریلو صنعتوں پر مبنی تھی۔ ملک میں ناگزیر وجوہ سے اکثر مغربی ممالک کی طرح بڑی صنعتیں رونما نہیں ہو سکی تھیں۔ نئی حکومت کے قیام سے ہو سکتا تھا کہ قدیم جاگیرداری نظام ختم ہو کر صنعتی دور کا آغاز ہو۔ مگر سامراج کے مفادات اس کے خلاف تھے۔ راجاؤں۔ نوابوں اور جاگیرداروں کو ملک کی اقتصادی زندگی میں الجھائے رکھنے سے برطانیہ کو اقتصادی فائدے بھی تھے اور انتظامی بھی چنانچہ ایک طرف تو برطانوی سامراج نے زوال پذیر اور بے جان جاگیرداری کو تقریباً سو سال کی حیاتِ تازہ بخشی۔ اور دوسری طرف بڑی صنعت کی ترقی کی رفتار کو سست رکھا۔ خیالات اور جذبات ایک بڑی حد تک اقتصادی زندگی پر منحصر رہتے ہیں۔ صنعتی نظام میں ہم فطرتاً آگے کی طرف دیکھتے ہیں۔ اور جاگیردارانہ نظام میں پیچھے کی طرف۔ لہٰذا ہندوستان میں جس قسم کے معجون مرکب نظام نے جنم لیا اس میں شدید نظریاتی انتشار کا ہونا ضروری تھا۔ یہ انتشار وقت کے ساتھ ساتھ اور زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ اور آج بھی ساری قوم میں موجود ہے۔

جاگیرداری کی اس غیر فطری حیات نو نے ملک کو جو بڑے نقصانات پہنچائے ان میں سے ایک مذہبی ابر کو چھٹنے سے روکنا ہے۔ جو مدت دراز سے ہمارے ذہنوں پر چھایا ہوا ہے۔ راجاؤں۔ نوابوں۔ جاگیرداروں۔ اور زمینداروں کے پورے طبقے نے مذہبی روایات پر مہرِ دوام ثبت کرنے کی غرض سے تعلیمی اور دوسرے ایسے اداروں کو، جو مذہب کی بقائے دوام کے لئے کوشاں نظر آئے۔ دل کھول کر خیراتوں سے سرفراز فرمایا جس سے قومی زندگی میں نت نئی الجھنیں پیدا ہوتی گئیں۔ مگر وقت کے فطری تقاضوں کا بڑھتا ہوا طوفان اس قسم کی کمزور ریشمیں بندیوں سے نہیں رکتا۔ قوم نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ نوجوانوں کے دلوں میں دھرم اور ایمان کا نور پھیلانے والا چراغ اگر بجھا نہیں تو کم سے کم ٹمٹمانے ضرور لگا ہے۔

آیئے اب اقبال کی زندگی کے ابتدائی تیس سالوں پر بھی ایک عبوری نظر ڈال جائیں۔ یوں تو ان کی تعلیم و تربیت کا ماحول عام طور پر مذہبی تھا ہی مگر کچھ خاص اتفاقات نے ان کی ذہنی تربیت میں خاص طور پر مدد دی کہا جاتا ہے کہ ان کے والد شیخ نور محمد تصوف دوست بزرگ تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے رشوت کی تحریص سے بچنے کے لئے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر تجارت شروع کر دی تھی۔ پھر اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں وہ اپنے والد محترم کے مشہور دوست مولوی میر حسن کی زیر نگرانی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ اور ان کی صحبت سے مذہبی مسائل اور خصوصاً مثنوی مولانا روم میں بصیرت پیدا کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں ان کا سابقہ پروفیسر آرنلڈ سے پڑا جو اسلامیات کے مشہور مستشرق اور "تعلیمات اسلام" کے مصنف تھے۔

یورپ کے تعلیمی سفر میں بھی ایسے ہی واقعات پیش آئے۔ وہاں پہنچے تو "انجمن اسلام" ملی جسے بعد کو ان کے مشورے سے "پان اسلام سوسائٹی" کی صورت دی گئی۔ پھر تحقیق کے لئے بھی "فلسفۂ عجم" کا موضوع پسند فرمایا۔ جس کے سلسلے میں اسلامیات پر مختلف قسم کا لٹریچر پڑھنے کی ضرورت تھی۔

اگرچہ اعلیٰ تعلیم کے زمانے میں اقبال کا خاص مضمون فلسفہ رہا جس کے اثر سے انھیں آزاد فکر انسان ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن عام مذہبی ماحول اور مندرجہ بالا واقعات ان کے ذہن پر ایسا گہرا اثر ڈال چکے تھے کہ آئندہ ان کی فکر ہمیشہ کے لئے مذہب و ملت کی چہار دیواری میں بند ہو کر رہ گئی۔ اور ان کی ذہنی صلاحیتیں مسلمان نوجوانوں میں الحاد کے بڑھتے ہوئے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے مذہب کے فرسودہ عقائد کے حق میں توجیہی فضا پیدا کرنے میں صرف ہونے لگیں۔ اقبال کے ذہن میں دراصل یہ الجھن تھی جس نے ان کی نظر کو محدود کر کے ان کے کلام کی افادیت میں نمایاں کمی کر دی۔ یہ ذہنی الجھن پورے ہندوستانی سماج کی ذہنی الجھن تھی۔ جو ہر ممکن طریقے سے مذہب کے لئے وہ جگہ پیدا کرنے کے لئے پسپائی جنگ لڑ رہا تھا۔ جس سے تاریخ کی زبردست قوتوں نے انھیں ہٹا دیا تھا۔

اس گھبراہٹ کا اندازہ لگانے کے لئے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں ان کی فکری تعمیر کا بڑا حصہ اسی خوف کی بنیاد پر قائم ہے۔ اوپر سید سلیمان ندوی کے نام جس خط سے اقتباس پیش کیا گیا ہے۔ اس میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"مسلمانوں پر اس وقت (دماغی اعتبار سے) وہی زمانہ آرہا ہے جس کی ابتدا یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی۔ مگر چونکہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت راہ نما نہیں ہے اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں۔ نہ عامۃ المسلمین کو یہ معلوم ہے کہ اصلاح لوتھر نے مسیحیت کے لئے کیا کیا نتائج پیدا کئے۔ ... میں نے سنا ہے کہ الہانیا

کے مسلمانوں نے وضو اُڑا دیا۔ اور ممکن ہے نماز میں بھی کچھ ترمیم کی ہو۔ ترکی کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ مصر میں یہ تحریک جاری ہے۔ اور عنقریب ایران اور افغانستان میں بھی اس کا ظہور ہوگا۔"

اگرچہ مکاتیب کے مرتب نے اپنے فٹ نوٹوں میں ان خطروں میں سے کچھ کو قطعی بے بنیاد بتایا ہے۔ مگر اقبال کے ذہن پر خوفناک اندیشوں کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ وہ ان سے بچاؤ کی ہر ممکن صورت کا تجربہ کرنا چاہتے تھے۔ جن میں قومی تعلیم کو شدّت سے مذہبی رنگ دینا ہے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اپنے خطبہ "ملّتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" (خطباتِ اقبال" مرتبہ رضیہ فرحت بانو) میں فرماتے ہیں۔

"اگر موجودہ صورت حالات اور بیس سال تک قائم رہی تو وہ اسلامی روح جو قدیم اسلامی تہذیب کے چند علمبرداروں کے فرسودہ قالب میں ابھی تک زندہ ہے۔ ہماری جماعت کے جسم سے بالکل ہی نکل جائے گی۔۔۔ ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر ہماری قوم کے نوجوانوں کی تعلیمی اٹھان اسلامی نہیں ہے تو ہم اپنی قومیت کے پودے کو اسلام کے آبِ حیات سے نہیں سینچ رہے۔ اور اپنی جماعت میں پکّے مسلمانوں کا اضافہ نہیں کر رہے ہیں جو کسی اتحادی مرکز کے نہ ہونے کے باعث اپنی شخصیت کو کسی دن کھو بیٹھے گا۔ اور گردوپیش کی ان قوموں میں سے کسی ایک میں ضم ہو جائے گا جس میں اس کی بہ نسبت زیادہ قوت و جان ہوگی!"

تب ہی تو کہتے تھے

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم — ایک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم — کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نگن — لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

اقبال کو یہ معلوم نہیں تھا کہ انسانی معلومات کی تیز ترقی نے علم اور الحاد کو لازم و ملزوم بنا دیا ہے۔ آپ کچھ بھی کیجئے۔ اس سے مفر نہیں۔ کیونکہ اب کفر از کعبہ برخیزد والا معاملہ ہے۔

اقبال کے متعلق کچھ دوستوں کی رائے بہت دلچسپ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خود ان کی زندگی میں تنوع اور تضاد موجود ہے۔ اقبال انسان تھے۔ اس لئے ان کی شاعری میں تضاد کیوں نہ ہوتا؟ یہ سہل پسند لوگوں کا طریقہ فکر ہے جو غور کرنے کی زحمت سے بچنے کے لئے مبہم کلیات اور عمومیات میں پناہ تلاش کرتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو فراموش کرتے ہیں کہ پختہ ذہنی کا انحصار ہی اس پر ہے کہ زندگی کے تنوع اور تضاد پر غور کرکے صحیح اصول اور اسباب کا پتہ چلایا جائے۔ اس طرح پتہ چلانے والا جن نتائج پر آئے اُن میں کوئی تضاد نہیں ہونا چاہیئے۔ اقبال کی تصنیفات میں جو چیز بادی النظر میں تضاد محسوس ہوتی ہے اس کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ کسی ایسے شخص کی خامی ذہن کا نتیجہ ہے جو کافی غور نہ کرنے کی وجہ سے اصولِ حیات کے متعلق کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ زیادتی ہوگی۔ کم از کم ہم ایسے لوگوں سے متفق نہیں ہیں۔ یہ مانا کہ ان کی نظر محدود رہی۔ اور وہ ایک حد تک اپنے منظور مقاصد کو واقعات کی روشنی میں دیکھنے اور متوازن رائے قائم کرنے سے قاصر رہے (جس کی سب سے بڑی وجہ وہی ان کے ذہن کی مذہبی الجھن تھی)، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے واقعات کو سمجھنے کی پُرخلوص کوشش کی۔ اور زندگی کے متعلق اپنا ذاتی ردّعمل اور ایک خاص نظریہ پیش کیا۔ (جن معنوں میں کوئی بھی نظریہ ذاتی کہلا سکتا ہے)۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں کے آغاز میں عقلیت کے بڑھتے ہوئے احساس نے ہندوستان کے اُبھرتے ہوئے درمیانی طبقے پر گہرا اثر ڈالا۔ عقائد عقلیت کے آبِ رواں کی سطح پر خس و خاشاک کی مانند بہتے نظر آنے لگے۔ عقلیت کے یہ نقوش درمیانی طبقے پر نہیں بلکہ خود اس دور کے مذہبی مصلحین کے ذہنوں پر بھی نمایاں ہیں۔ اب مذاہب کو زندہ رکھنے کے لئے ایمان کی تلقین سے کام چلنا مشکل تھا۔ ضرورت تھی تو ان کے اصول کی عقلی توجیہ کی۔ چنانچہ مصلحینِ وقت مثلاً سرسید اور رشی دیانند نے اپنے مذاہب میں بدیہی طور پر خلافِ عقل باتوں کو خلافِ دین قرار دے کر یا تو ایسے اصول کو جن کی ان کی نظر میں توجیہ ممکن تھی۔ مذاہب کی حقیقت بتایا۔ ان بزرگوں نے ایک بات کا صاف اعلان کیا۔ اور وہ یہ کہ ہمارے مذاہب میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے عقل کی کسوٹی پر نہ کسا جا سکے۔

یورپ میں لوتھر اور دوسرے مصلحین کی تحریکات تقریباً ایسے ہی حالات میں وجود میں آئی تھیں۔ لیکن آخر کار یہ اصلاحی کوششیں بھی ترقی پسند عوام کی تشفی نہ کر سکیں اور مذہب کو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں عقلیت کے خلاف فیصلہ کن جنگیں لڑ کر آخر کار شکستیں کھانی پڑیں۔

اقبال ان تمام واقعات سے بخوبی واقف تھے۔ وہ ایسے فلسفی تھے جو اس جنگ میں ولائل کے ہتھیاروں کی زنگ آلودگی اور کہنگی کو اچھی طرح محسوس کرسکتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ اسلامی عروج کے ادوار میں تو افلاطونی اثرات نے رفتہ رفتہ مسلمان فلاسفہ کو اعتدال تک پہنچا دیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے کھلے میدان میں نبرد آزمائی کے عوض ایک قدیم قلعے کی آڑ سے مورچہ بندی پسند کی۔

اس مورچہ کی تفصیل خصوصاً ان کے مجموعہ خطبات "اسلامی نظریات کی تنظیم نو" کے پہلے دو خطبات "علم اور مذہبی تجربہ" اور "مذہبی تجربے کے انکشافات" میں ملے گی۔ ان کے عقیدے کے مطابق علم حاصل کرنے کا واحد ذریعہ عقل ہی نہیں ہے بلکہ ایک اور چیز بھی ہے جسے Intution یعنی "وجدان" یا "بصیرت" کہنا چاہیئے۔ اس کی شہادت کے طور پر انھوں نے تمام متصوفانہ ادب اور خصوصاً عرفی کا یہ مشہور شعر پیش کیا ہے۔

دنقش تشنہ لبی داں بعقل خوش مناز   دلت فریب گراز جلوۂ سراب نخورد

اقبال کی رائے میں عقل کے ذریعے سے مادی موجودات کے حقائق تو بے نقاب کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن بلند تر یا روحانی حقیقتوں کو سمجھنے کے لئے "عشق" کی ضرورت پڑتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ وہ اس خیال کو تو باربار دہراتے ہیں لیکن ایسے روحانی حقائق کی تفصیلات بیان نہیں کرتے جو مادی حیات کی پیداوار نہ ہوں۔ یا جنھیں عقل کے ذریعے سے نہ سمجھا گیا ہو۔ یا نہ سمجھا جاسکتا ہو۔ اس لئے اس پر کوئی تفصیلی بحث نہیں ہوسکتی۔ ہمیں عشقیہ بصیرت (Intutional Perception) کی جداگانہ حیثیت سے قطعی انکار ہے۔ ہماری نظر میں وہ چیز جسے اقبال چشم باطن یا اس قسم کے دوسرے ناموں سے پکارتے ہیں یا تو معمولی حواس انسانی کے وہ تاثرات ہیں جنھیں تمناؤں کی ناکامی نے لاشعور میں پھینک دیا ہے اور جنھیں ذہن خاص حالات میں عجیب و غریب شکل دے کر ہمارے شعور کے منظر پر دوڑانے لگتا ہے۔ اور یا وہ محض لاعلمی کی پیدا کردہ قیاسی حقیقتیں ہیں جو وقتاً فوقتاً ہمارے لاشعور سے جھانکتی رہتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ سائنس کا تعلق حواس سے ہے۔ لیکن حواس تمام تجربات انسانی پر حاوی ہوتے ہیں۔ اس لئے سائنس کے عمل کو محدود کرنا اور اس کے اوپر روحانیت یا کسی اور نام سے ایک فوق الفطرت قیاسی تجربے کو لادنا مجاز سے حقیقت کا سوانگ بھروانے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

زیر بحث مسئلے کے متعلق اقبال اس سے زیادہ کچھ نہیں کہتے:

"اس میں شک نہیں کہ سائنس کے نظریات قابل وثوق علم فراہم کرتے ہیں۔ کیونکہ انھیں جانچا جاسکتا ہے۔ اور ان کے ذریعے سے ہم قدرتی واقعات پر حاوی ہو سکتے ہیں۔ اور ان کے متعلق پیشگوئی کرسکتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم جسے سائنس کہتے ہیں وہ حقیقتاً کوئی واحد اور منظم صورت نہیں ہے۔ بلکہ ایک مجموعی تجربے کی ایسی جزویات پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے سے مناسبت رکھتے نظر نہیں آتے۔ قدرتی سائنس کا تعلق مادے۔ حیات اور دماغ سے ہے۔ لیکن جیسے ہی آپ یہ سوال کریں گے کہ مادہ، حیات اور دماغ میں باہمی کیا تعلق ہے۔ تو آپ کو ان کے متعلق سائنسوں کی جزویاتی حقیقت نظر آنے لگے گی۔ اور آپ یہ بھی محسوس کرنے لگیں گے کہ مجموعی حیثیت سے یہ سائنسیں آپ کے سوال کا جواب نہیں دے سکتیں۔۔۔ اس لئے مذہب کو جو حقیقت کل کا مطالبہ کرتا ہے۔ اور اس وجہ سے مرکزی حیثیت کا مستحق ہے۔ حقیقت کے جزویاتی نظریات سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں"

(اسلامی نظریات کی تنظیم نو (انگریزی) صفحہ ۴۲)

مذہب کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے یہ دلائل بہت دلچسپ ہیں اس بیان کی صحت کو دو واقعات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اول یہ کہ علم کی افزائش نے انسان کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی وسیع معلومات کو تین ہی نہیں بلکہ تین سے بہت زیادہ شاخوں میں منقسم کرے تاکہ ہر علم کے محقق اپنے علم کے حصص پر تحقیقات کرکے علم کے عام ذخیرے میں اضافہ کرتے رہیں۔ دوم یہ کہ ان جزوی معلومات سے استفادہ کرکے عہد حاضر کے فلسفی بھی موجودات اور زندگی کے متعلق کلیے اور اصول قائم کرتے ہیں۔ جنھیں ہر صورت سے مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی ایک مثال خود مارکس کی تصنیفات ہیں۔ جس نے نہ صرف حیات بلکہ تمام انسانی تاریخ کو ایک سائنس بتایا ہے۔ جو اپنے مخصوص اصول کے تحت منازل ارتقا طے کرتی ہے۔

اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا وجہ ہے کہ علم کے متعلق اقبال

کا تصور اتنا قدامت گزیدہ اور ناقص ہونے کے باوجود اس قدر مقبول عام ہے. تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ اقبال کے یہاں کچھ چیزیں بہت جاندار بھی ہیں. ہاں جہاں تک اس خاص ذہنی الجھن اور اس کی مقبولیت کا تعلق ہے، اقبال کو سمجھ کر پسند کرنے والے ابھی خود جاگیردارانہ حلقۂ فکر سے باہر نہیں نکلے ہیں. ان کے اور اقبال کے جذبات میں ایک طرح کی ہم آہنگی ہے. چنانچہ ان کے ذہن اقبال کی شاعری سے خوراک حاصل کرتے ہیں. آج بھی جو لوگ قدیم تہذیبی اثرات کی بھول بھلیاں سے باہر آگئے ہیں ان پر حقیقت واضح ہو چکی ہے. رہا آئندہ کے متعلق تو اب جب کہ خود جاگیردارانہ نظام آخری سانس لیتا نظر آرہا ہے اس کی قدروں کا مستقبل بھی معلوم ہے.

ابو النصیر السید احمد الحسینی

غرق شدہ جہاز

یورپ کی بعض کمپنیوں کے نمائندوں نے مصری حکومت سے درخواست کی کہ انھیں نپولین کے اس بیڑے کے نکالنے کی اجازت دی جائے جسے مصری سمندر میں غرق ہوئے ایک سو سال سے زیادہ عرصہ ہوا. یہ بیڑا جب کہ انگریز اور فرانسیسی برسرپیکار تھے، اور نپولین نے انگریزوں کے خلاف ٹیپو سلطان کی مدد کرنے کے لئے تمہیداً مصر پر حملہ کیا تھا، خلیج ابی قیر میں انگریزوں کے ساتھ جنگ میں غرق ہوا. نمائندوں کی شرطوں کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ برآمد ہوگا اس کا بیسواں حصہ حکومت مصر کی خدمت میں پیش کیا جائے گا. لیکن حکومت نے اپنا حصہ کم پاکر نمائندوں کو بیڑے کے نکالنے کی اجازت نہیں دی اور یہ کہہ دیا کہ کسی دوسرے وقت اس پر غور کیا جائے گا.

سو سال سے زیادہ کے غرق شدہ بیڑے کو نکالنے کی کوشش بیسویں صدی میں کوئی تعجب انگیز بات نہیں. بیسویں صدی کے لالچیوں نے سمندر کے غرق شدہ خزانوں کے نکالنے کے واسطے خاص آلات اور اوزار ایجاد کئے ہیں. چنانچہ جہاز بنانے والے کارخانوں نے اس کے لئے خاص کشتیاں طیار کی ہیں جن کا نام "سونے کا شکار کرنے والی کشتیاں" رکھا ہے ان کشتیوں میں ایسے آلات واوزار ہیں جو سمندر کی تہ کی ثروت کو بآسانی نکال سکیں.

سنہ ۱۹۲۲ء میں ایجپٹ نامی مال و دولت سے بھرا ہوا جہاز بندرگاہ برسٹ کے شمال میں جو فرانس کی مشہور بندرگاہوں میں سے ہے غرق ہوا تھا. انھیں کشتیوں کے ذریعے سے انگریزی، فرانسی اور سویڈش کمپنیوں نے جہاز مذکور کو نکالنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئیں. بالآخر ایک اطالوی کمپنی کامیاب ہو گئی. اور اس نے ۴۰۰۰ کیلوگرام سونا اور ۴۰۰۰۰ کیلوگرام چاندی، اور ۳۷ صندوق جن میں ۱۲۵۰۰۰ انگریزی گنیاں تھیں سمندر کی تہ سے نکالا. یہ ساری دولت مذکورہ بالا غرق شدہ جہاز میں تھی جو ۱۲۰ میٹر گہرائی میں تھا.

۱۷۹۹ء میں ایک جہاز ۳۰ لاکھ انگریزی گنیاں بندرگاہ ہامبرگ لے جا رہا تھا اس اثنا میں سخت آندھی اور طوفان آیا اور جہاز مال و دولت اور آدمیوں کے ساتھ ہالینڈ کے قرب و جوار میں غرق ہو گیا اور سمندر کی تہ میں مدت دراز تک انسانی دسترس سے پوشیدہ رہا یہاں تک کہ تہ کی خاک اور مٹی اس پر بارہ بارہ میٹر گہری جمع ہو گئی. ابھی چند سال کی بات ہے کہ جہاز "کریا تا" نامی نے اس غرق شدہ جہاز کی اس دولت کو جو ڈیڑھ سو سال سمندر کی تہ میں غرق رہی. باہر نکالا ہے.

شاید چند ہی سال گذرے ہوں گے کہ ہمارے کان اس خبر سے آشنا ہوئے تھے کہ اسپینی حکومت کی خانہ جنگی میں جو تجارتی جہاز غرق ہوئے تھے، اُن میں سے اسپینی وزارت حربیہ نے پے در پے کوشش کے بعد ۶۲ جہاز نکال لئے ہیں.

مسلسل ناکامی کبھی بھی انسانی کوششوں کے لئے ہمت شکن ثابت نہیں ہوئی. یہی وجہ ہے کہ لوگ اُس اسپینی بیڑے کی جستجو میں جو امریکا سے مدت دراز پہلے خزانہ لدا ہوا تھا اور پرتگال کے ساحل کے قریب غرق ہوا. ابھی تک مشغول نظر آتے ہیں. جہاز "برکن ہیڈ" کی جو ۱۸۵۲ء میں کیپ آف گڈ ہوپ کے قریب غرق ہوا، اور جس میں ایک کروڑ ڈالر کی قیمت کا سونا تھا. ابھی تک تلاش جاری ہے. کیپ ٹاؤن کے قرب و جوار میں اُس ہندوستانی مال و دولت کی جستجو جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے انگلستان بھیجا تھا اور رستے میں غرق ہو گیا تھا، ابھی تک جاری ہے. کہا جاتا ہے کہ یہ دولت ۹ صندوقوں پر مشتمل تھی جن میں بیش قیمت زمرد اور یاقوت تھے اور سونے کی ۲۷۰۰ اور چاندی کی ۱۴۵۰ اینٹیں تھیں.

اسی طرح اسکاٹ لینڈ کے ساحل سے چند میل کے فاصلے پر جو اسپین کے بادشاہ فلپ ثانی کا ۵۰ جہازوں کا بیڑا ۱۵۸۸ء میں غرق ہوا تھا اُن میں سے ایک میں خزانہ تھا جو ۶ کروڑ سونے کے سکوں پر مشتمل تھا. اس جہاز کی تلاش و جستجو ابھی تک جاری ہے. نپولین کے بیڑے کو غرق ہوئے ایک سو نوے سال ہوئے، اس لئے کہ ۱۷۹۸ء میں جب نپولین فرانس کے جنوبی ساحل سے بیڑا لے کر مصر پر حملہ کرنے روانہ ہوا تو انگریزی بحری قائد نیلسن اپنا بیڑا لے کر اس کی تلاش میں نکلا. یہاں تک کہ خلیج ابی قیر میں دونوں کا مقابلہ ہوا اور تین دن سخت معرکے دونوں کے درمیان ہوتے رہے آخر انگریزی بیڑا غالب آیا اور نپولین کے جہاز مع خزانوں کے غرق ہو گئے.

کیلاش ماہر

کشمیری زبان اور ادب

آرنلڈ کا قول ہے کہ شاعری زندگی کی تنقید کا دوسرا نام ہے۔ زندگی اور ادب ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ ہر وہ ادب جس میں فطرت انسان کی جھلک پنہاں ہوتی ہے صحیح معنی میں ادب کہلانے کا مستحق ہے۔ کسی قوم یا اس کی سماج کا اگر ہم کو صحیح جائزہ لینا ہے تو ہم کو لازم ہے کہ اس قوم کے ادب کا عمیق مطالعہ کریں۔ ادب اقوام کی سماجی زندگی کا آئینہ ہے۔ کشمیر کے متعلق بھی علمار کا یہی خیال ہے۔ کسی زمانے میں کوئی دو ہزار برس پہلے یہ پہاڑوں سے گھرا ہوا علاقہ تہذیب و تمدن کا مرکز تھا۔ علما نے کشمیری ادب کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے مگر اس سے کوئی قابل یقین مصالحہ فراہم نہ ہو سکا جس کی بنا پر ہم کو یہ کہنے سے گریز نہ ہوگا کہ ان کی کوششیں بے بنیاد رہیں۔ "راج ترنگنی" سے پہلے اور اس کے کافی مدت کے بعد تک یہاں کی تاریخ کا کوئی پتہ نہیں چلتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہو رہا تھا۔ پنجاب میں رانا رنجیت سنگھ کا دور دورہ تھا۔ اس کے بعد ہمارے سامنے کشمیر کا وہ دور آتا ہے جب سے یہاں مسلمانوں کے حملے شروع ہو گئے۔ حملے تو پہلے بھی ہوتے تھے مگر ہندوستان کے نقشے کی حالت بدل جانے سے ان حملوں کی اہمیت میں اور اضافہ ہو گیا۔

تاریخی حیثیت سے کشمیری زبان میں ادبیت کا رنگ "للہ صوید" کے زمانے سے شروع ہوا۔ "للہ صوید" اور "روپ بوانی" کے کلام میں ہم کو وہ تمام خوبیاں ملتی ہیں جو اردو زبان میں غالب اور اقبال کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ "للہ صوید" کی تاریخ پیدائش پر علماء میں بہت اختلاف ہے۔ ہم کو اس سے یہاں زیادہ بحث نہیں ہے بہرحال اتنی واقفیت ضروری ہے کہ اس کشمیری شاعر کا جنم چودھویں صدی کے لگ بھگ ہوا جب کہ ہندوستان میں علاؤالدین خلجی کی حکومت کا سکّہ رواں تھا۔ للہ صوید شاعر ہونے کے علاوہ فلسفی بھی تھا۔ فلسفے میں اس کا مقابلہ ہم جرمن فلسفی کانٹ اور یونانی فلسفی افلاطون سے کر سکتے ہیں۔ ان کی شاعری میں حب الوطنی مناظر قدرت اور عشق و محبت کے علاوہ کشمیری سماج کی بھی عکاسی ہے۔ زبان کے لحاظ سے صحیح معنی میں کشمیری کا آغاز "للہ صوید" ہی سے ہوتا ہے۔ ان کے کلام میں کشمیری بھاشا کے ٹھیٹ الفاظ کا استعمال اس طریقے سے ہوا ہے کہ ایک پہاڑی کھردری زبان میں بھی ہلکی سی چاشنی اور جاذبیت محسوس ہوتی ہے للہ صوید کے ہمعصروں میں شیخ نورالدین ولی کا نام بہت آسانی سے لیا جا سکتا ہے مگر نورالدین ولی کے کلام میں صوفیانہ رنگ غالب ہے جس سے ان کے شاعر ہونے کی دلیل کمزور ہو جاتی ہے۔ للہ صوید کے بعد کشمیری زبان میں نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں ہم کو روپ بوانی کا سا فنکار ملتا ہے جس نے اپنے کلام کی رنگینی سے زبان میں اور لوچ پیدا کر دیا۔ تیسرے دور میں مرزا کاک کا زمانہ آتا ہے۔ مرزا کاک کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ للہ صوید کے قالب میں روح پھونک دی گئی ہے۔

کشمیری زبان نے بہت سی کروٹیں بدلیں۔ انہیں انقلابات کی بدولت اس میں فارسی۔ ہندی۔ قبائلی اور پنجابی وغیرہ کے الفاظ داخل ہو گئے۔ ایک زبان جب دوسری زبان سے ہم آغوش ہوتی ہے تو اس کے اصلی روپ میں ضرور تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اسی ٹکراؤ میں اکثر زبانیں ختم ہو جایا کرتی ہیں اور ایک نئی زبان کا آغاز ہو جاتا ہے یہی حالت کشمیری زبان کی ہوئی۔ مختلف زبانوں کے میل ملاپ

ہے اس کے روپ میں دوسرے رنگ بھی کھلے۔ آج جو زبان ہمارے سامنے ہے وہ پرانی کشمیری سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ اب جو کچھ غزلیں، گیتیں اور دوہے پرانے صوفیوں اور مہاتماؤں کے ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں تو ضرور اصلی کشمیری کی جھلک دکھائی پڑتی ہے ورنہ اب عام طور سے شاعر کی زبان ملی جلی کشمیری ہے۔ اس سے یہاں بحث نہیں ہے کہ دونوں زبانوں میں فوقیت کس زبان کو حاصل ہے اور اس کا عوام پر کیا اثر پڑا بلکہ اصلی زبان کی بہت تلاش کرنے پر بھی کہیں کہیں اس کے نشانات مل جاتے ہیں جو ادب کی شاہراہ پر سنگ میل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

گریرسن (Grierson) کے نظریے سے اگر ہم اپنی زبانوں کا مطالعہ کریں تو پہلے ان کو دو حصوں میں منقسم کرنا ہوگا۔ اول تو وہ زبانیں جو شمالی آرین علاقوں میں بولی جاتی ہیں جن میں ہندی، بنگالی، اڑیا، گجراتی، مرہٹی اور کشمیری بہت مشہور ہیں دوسری قسم ان زبانوں کی ہے جو تامل کی نسل سے تعلق رکھتی ہیں۔ علمانے ہندوستان کی زبانوں اور مختلف بولیوں کی فہرست مرتب کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ "ٹیلے اور چوٹی" "پہاڑ اور پہاڑی" کے سامنے آتے ہی ان کے حوصلے پست ہوگئے۔ وہ یہ نہ معلوم کرسکے کہ ہم کس لفظ کو زبان کہیں اور کس کو بولی کی فہرست میں لائیں۔ ابوالفضل نے کشمیری بھاشا کی بہت تعریف لکھی ہے یہی نہیں بلکہ اس نے دیگر زبانوں پر کشمیری ادب کو فوقیت دی ہے۔ اس کی وجہ یہی بیان کی جاسکتی ہے کہ کشمیری زبان کی جاذبیت نے ابوالفضل کو اپنا گرویدہ کرلیا تھا مگر آج کی کشمیری زبان ہمارے سامنے پہلی جیسی نہیں ہے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ آج کشمیری بھاشا کے نام سے کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس کو ہم کشمیر کی اصلی زبان کے نام سے تعبیر کرسکیں۔ دردستان کا علاقہ جس کے ایک حصے کا نام کشمیر ہے وہاں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں دردستان میں کشمیر، چترال، کفرستان، گلگت وغیرہ شامل ہیں یہاں کی زبانوں کے نام بھی ہمارے کانوں کو اجنبی محسوس ہونگے۔ دردستان کے شمالی حصے میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ "کھائیجھ" بھاشا کی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ "داشیوری" "اوشکند" اور "واشگل" کے نام سے کچھ زبانیں چترال کے علاقے میں بولی جاتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کشمیر کا زبان کا زیادہ تر ادب حملہ آوروں کی نذر ہوگیا۔ پٹھانوں اور کشمیر کے اردگرد کے قبائلیوں کے متواتر حملوں سے کشمیری ادب کو بھاری ٹھیس پہنچی ورنہ ہمارے سامنے ایک ایسی میراث ہوتی جو ہماری ادبی تحریکوں کے لئے بہت کافی تھی۔

زبان کو ادب کی منزلوں تک پہنچانے میں جن لوگوں نے کشمیری بھاشا کا ساتھ دیا وہ چاہے فارسی رسم الخط کے ادیب ہوں یا دیوناگری کے ان کی کوششوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ سلطان زین العابدین ۱۴۲۰ء کے زمانے میں کشمیری زبان کا شاعر "پرکاش بھٹ" ملتا ہے۔ یہ دیوناگری رسم الخط میں اپنا کلام تحریر کرتا تھا۔ اس کی شاعری کے زیادہ تر حصے میں فرضی کہانیاں ہیں جن کا سچائی اور اصلیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً رامائن کی کتھا بہت پرانی ہے جس کی عظمت اور اہمیت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا۔ مگر پرکاش بھٹ نے کہا ہے کہ سیتا راون کی بیٹی تھی مگر ستاروں کی گردش کے سبب اس کی ماں نے اس کو ندی میں بہا دیا جس کو اتفاق سے راجا جنک نے اٹھا لیا اور اپنی بیٹی کی طرح پالا اور پرورش کیا۔" یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے صرف تخیل کی بنیادوں پر ایک نئی کہانی تراش لی۔ جس کا اصلیت سے کوئی تعلق نہیں ہے یہاں ہمارا مطلب پرکاش بھٹ کے کلام میں نقص نکالنا نہیں ہے بلکہ یہ دکھانا ہے کہ ماحول نے زبان ہی کو نہیں بلکہ شعراء کے علم و تخیل کو بھی پراگندہ کردیا۔ پرکاش بھٹ کے بعد ہمارے سامنے پرمانند نام کا ادیب آتا ہے جو کہ سرینگر کے اردگرد کے علاقے میں پیدا ہوا تھا اور ۱۸۷۲ء میں اس نے وفات پائی تھی۔ پرمانند نے کرشن بھگتی کو اپنا مرکز خیال بنایا اور اپنے مجموعۂ کلام کا نام "کرشن اوتار لیلا" رکھا۔ اس کے پڑھنے سے شاعر کے جذبۂ روحانیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ادبی حیثیت سے زبان خالص کشمیری ہے نہ زبان نہ تو سنسکرت آمیز ہے

اور نہ فارسی الفاظ کی بھرمار ہے ۔ البتہ کہیں کہیں پنجابی اور ہندی کے الفاظ ضرور آگئے ہیں ۔ اس کے علاوہ دوسرا کوئی کرشن راج ہمارے سامنے آتا ہے جس نے کرشن لیلا پر بہت سے گیت اور بھجن تصنیف کئے ہیں جن میں ادب کی تمام خوبیاں موجود ہی نہیں بلکہ کشمیری ادب میں کرشن بھگتی کے نام سے ایک نیا عنوان وجود میں آگیا ۔

اس سلسلے میں ان شعراء کا تذکرہ بھی ضروری ہے جنہوں نے فارسی رسم الخط میں اپنے خیالات کی باریکیوں سے کشمیری زبان میں ادبیت پیدا کر دی ہے ۔ یہ خیال غلط ہے کہ وہ بدیشی خیالات کو اپناتا ہے اور اپنی زبان میں اجنبی الفاظ کو دعوت دیتا ہے ۔ اگر انگلستان کا شاعر کبھی اردو میں شاعری کریگا تو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ گل و بلبل اور شمع و پروانہ ہی کے راگ الاپے بلکہ وہ اردو کی شاعری میں ہی مقامی رنگ (LOCAL COLOUR) بھر سکتا ہے اور زبان میں ادبیت پیدا کر سکتا ہے یہی بات کشمیری زبان پر بھی صادق آتی ہے ۔ چاہے کسی رسم الخط میں ہو زبان عوام کا سرمایہ ہے ۔ یہ اس سیال شے کے مانند ہے جو مختلف برتنوں میں مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہے ۔ فارسی رسم الخط میں محمود گامی کا نام بہت مشہور ہے انہوں نے فارسی اوزان پر کشمیری زبان میں شاعری کی اور عوام کو لیلیٰ اور مجنوں ۔ شیریں وفرہاد اور یوسف و زلیخا کی مشہور کہانیوں سے روشناس کیا ۔ ان کے کلام میں فارسی تشبیہات اور استعارات کا ضرور غلبہ ہے مگر مقامی رنگ سے دامن بچاتے ہوئے بھی وہ شاہراہ پر آگئے ۔ ان کے کلام سے کشمیری زبان کو ادب کا اچھا سرمایہ ملا ۔ اس کے بعد صفی الدین کی "وامق عذرا" کو عوام نے بہت پسند کیا ۔ زبان کے لحاظ سے اس میں خالص کشمیری زبان کا استعمال کیا گیا ہے ۔ تاہم پنجابی اور ہندی محاورات نے اور بھی چار چاند لگا دئے ہیں اس کے بعد ہم کو مہجور اور دیگر شعراء اور ادیبوں کے نام بھی ملتے ہیں جنہوں نے حتی الامکان اپنی کوششیں اسی لئے وقف کر دیں کہ زبان سادہ اور خیالات سے لدی ہوئی ہو ۔ یہی وہ کوششیں ہیں جن کی بدولت کشمیری زبان میں آج بھی ادبیت کی چاشنی پائی جاتی ہے ۔

آخر میں دَور جدید کے شعراء کو علیحدہ رکھتے ہوئے ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ سیاسی جد و جہد نے زبان کو مختلف گروہوں کا آلہ کار بنا رکھا ہے یہی سبب ہے کہ عاصی اور اسی قسم کے دیگر شعراء کے کلام میں ادبیت ضرور ہے ان کی آواز میں عوام کی آواز بھی شامل ہے مگر وہ ایک خاص حصول مقصد کے لئے ہے ۔ کاش یہ سب کوششیں بجا طور پر زبان کی ترقی کے لئے وقف کر دی جاتیں تو ہمارے سامنے ایک زبان ایسی پیش ہوتی جو ادب ۔ قومیت ۔ تخیل اور رومان سے معمور ہوتی ۔

مزدور کے اخراجات زندگی میں کمی

نومبر ۱۹۴۹ء میں خوراک کے زمرہ میں مچھلی اور شکر کی قیمتوں میں کمی کے باعث کوہاٹی کے مزدور طبقے کے اخراجات زندگی کا اشاریہ ۷ درجے کم ہو کر ۱۲۵ رہ گیا (بنیاد ۔ سنہ ۱۹۴۴ء = ۱۰۰)

سلچر کے مقام پر مدت زیر تبصرہ میں اشاریہ کا نمبر ایک درجہ کم ہو کر ۱۴۰ رہ گیا ۔ یہاں پر چاول اور مچھلی کی قیمتوں میں کمی ہوئی ۔ یہ کمی جزوی طور پر گڑ، جلانے کی لکڑی اور مٹی کے تیل کے بھاؤ میں گرانی کی وجہ سے ہوئی ۔

تن سوکیا میں اشاریہ کے نمبر میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور وہ بدستور ۱۵۰ رہا ۔ اگرچہ خوراک کی زمرہ میں آلو کی قیمت میں اضافہ ہوا لیکن کپڑے کے زمرہ میں ساڑھی اور قمیص کے کپڑے کے نرخ گرنے سے اس گرانی کا اثر زائل ہو گیا ۔

خواجہ جلیل احمد

عورت کا مفہوم

عورت کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اتنی قدیم جتنی کہ خود انسانیت کی تاریخ۔ لیکن موضوع کی اس قدامت کے باوجود ہنوز یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا ہے کہ وہ مرد کے لئے باعث رحمت ہے یا باعث زحمت۔ کہتے ہیں کہ حضرت حوا حضرت آدم کی بائیں پسلی کو چیر کر معرض وجود میں لائی گئیں اور اس طرح حضرت آدم کے دل کی دھڑکن کا علاج بنیں لیکن کچھ ہی مدت کے بعد خلاف مرضی الٰہی نہ صرف خود شجر ممنوع سے استفادہ کیا بلکہ آدم کو بھی شریک کیا اور نتیجے میں دونوں نے جنت سے جلاوطنی کی سزا بھگتی۔ عورت کی اسی مفروضہ یا حقیقی کمزوری کو قدما نے اپنی نفسیات کا اہم موضوع بنایا اور ایک طرف اگر عورت کو ناقص العقل کا خطاب ملا تو دوسری طرف وہ ہابیل اور قابیل کی باہمی جنگ کی "وجہ تنازعہ" قرار پائی۔

عورت کی حماقت کا یہ واقعہ صرف اہل اسلام ہی کی روایت نہیں ہے بلکہ عیسائی، یہودی اور دوسری اقوام و ملل بھی یہی یا اسی سے ملتے جلتے واقعے کی شہادت دیتے ہیں۔ چنانچہ تقریباً ہر الہامی کتاب اس واقعہ کی تفصیل سے بھری پڑی ہے۔ بعد میں اسی مذہبی روایت کا سہارا لے کر مؤرخین اور مصنّفین نے جن میں اکثریت مردوں کی تھی عورت پر وہ لعن طعن کی کہ توبہ ہی بھلی۔ ملٹن نے اپنے شاہکار سیمسن اگانسٹس (Samson Agonistes) میں سیمسن کی زبان سے عورت کے متعلق وہ زہر اگلوایا ہے جس کو سن کر شاید ہی کوئی سنجیدہ سے سنجیدہ لڑکی یا عورت منہ بنائے بغیر رہ سکے۔ کون سی ایسی گالی ہے جو اس غریب مخلوق کو نہیں دی گئی کون سی ایسی بدشگونی ہے جو اس سے وابستہ نہیں کی گئی؟ غرضکہ یہ مسئلہ یہاں تک پہنچا کہ صرف عورت ہونا گالی کے مترادف قرار پایا اور آج بھی سارے تہذیب کے دعووں کے باوجود کون مرد ایسا ہے جو "نسائیت" کے الزام پر آپے سے باہر نہ ہو جاتا ہو۔ صرف یہی نہیں عورت سے شدید نفرت ہی کے جذبے نے

ایام جاہلیت کے عربوں سے اپنی نوزائیدہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرایا۔ راجپوت ایک مدت تک لڑکی کے پیدا ہونے کو باعث ننگ سمجھتے رہے اور ایشور سے یہی پرارتھنا کرتے رہے کہ وہ ان کو لڑکی نہ دے۔ بعد میں حالات کچھ درست ضرور ہوئے لیکن اب بھی لڑکیوں کی شادی میں لڑکے کا تملک کے روپے کا تقاضا کرنا جہیز کی رسم اور دوسری اسی قسم کی مکروہ رسوم اسی قدیم جذبے کا پرتو ہیں۔

مذہب اسلام کو فی الواقعی یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے سب سے پہلے عورت کو انسان سمجھا اور مردوں کے مقابل لا بٹھایا لیکن یہ مساواتی نظریہ اسی وقت تک شرمندۂ عمل ہوتا رہا جب تک اسلام کے چشمے میں شفافی باقی رہی لیکن وقت کی روانی کے ساتھ ساتھ اس چشمے میں گدلا پن پیدا ہوتا گیا اور جہاں اسلامی معاشرے نے مختلف ممالک میں جا کر اور تبدیلیاں اختیار کیں وہاں عورت کے مرتبے پر بھی اثر پڑا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں دوسرے مذاہب کے زیر اثر جہاں اور رسوم قبیحہ اسلامی معاشرت میں داخل ہوئیں وہاں بیواؤں کی شادی بھی ممنوع قرار پائی اور اصولی طور پر نہ سہی عملی طور پر یقیناً مرد عورت کو اپنے سے کمتر سمجھنے لگا۔ یہ صورت کم و بیش انیسویں صدی کے آخر تک عام تھی لیکن بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے حالات رو بہ اصلاح ہونے شروع ہوئے اور اب سوائے انتہائی جاہل گھرانوں کے کوئی شخص جسے علم سے تھوڑا سا بھی لگاؤ ہے عورت کو "کمتر مخلوق" نہیں سمجھتا۔

اس تحریک آزادی نسواں میں مردوں کا خاصہ ہاتھ تھا لیکن دراصل عورت نے جو کچھ آزادی حاصل کی وہ اس کی اپنی سعی کی مرہون منت ہے۔

آج عورتیں مردوں سے اپنے حقوق مانگنے کے عوض یہ کہتی ہوئی سُنی جاسکتی ہیں کہ اپنے حقوق کا تحفظ خود ہمارا فرض ہے ہم کو کسی سے خیرات مانگنے کی کیا ضرورت اور اس طرح مردوں کی قدیم اجارہ داری کو شدید ٹھیس لگی۔ ملک کے شہر شہر قریے قریے میں زنانہ کلبوں، انجمنوں، پارٹیوں اور خود کل ہند انجمن خواتین کے قیام نے ایک طرف اس بیداری کا روشن ثبوت دیا تو دوسری طرف مردوں کے رہے سہے اقتدار کو بھی ختم کر دیا۔ خواتین کی یہ سعیٔ آزادی ان کو راہ راست کی طرف لے گئی ہو یا گمراہی کی طرف لیکن ان کی یہ کوشش یقیناً فطری ہے اور مردوں کی مستقل بدسلوکی کا ایک خوبصورت جواب [illegible] آخر کب تک کوئی غلامی برداشت کرے ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے چنانچہ اس کا ردعمل ہونا تھا ہوا اور خوب ہوا اور ابھی تک ہو رہا ہے۔

ہمارے ملک کی عورتیں بلاتفریق مذہب و ملت اس مسئلے میں اپنی مغربی بہنوں کے طریق عمل سے متاثر ہوئیں اور اس طرح تحریک کی خوبیاں اور برائیاں دونوں ہی کو اپنا لیا حالانکہ سلامت روی اور عقل مندی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ برائیوں کو چُن چُن کر علیحدہ کر دیتیں اور صرف خوبیوں کی پیروی پر اکتفا کرتیں۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا یا کرنا نہیں چاہا۔ بہرحال اچھائیاں اپنے جلو میں بہت سی برائیاں بھی گھسیٹ لائیں۔ یہ خرابیاں اتنی بدیہی ہیں کہ ہم ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے لیکن قدیم نظام نے عورت کو جو ہمارے معاشرے کی بقاء اور ارتقا کی دست راست ہے اس قدر مفلوج کر رکھا تھا (نظری طور پر نہ سہی عملی طور پر یقیناً ایسا تھا) کہ وہ ہماری سوشل مشینری کو چلانا تو درکنار اس کی راہ میں زبردست روڑا بن کر حائل ہو رہی تھی۔ اس میں بادی النظر میں عورتوں کا قصور معلوم ہوتا ہے لیکن اگر عصبیت سے کام نہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس کے ذمہ دار مرد تھے۔ وہ مرد جنہوں نے اُسے گھر کی چار دیواری میں محبوس کر رکھا تھا اور اتنی بھی اجازت نہیں دی تھی کہ وہ گھر کے باہر کی کھلی ہوا میں چند سانس لے سکے۔ اس کا نتیجہ ظاہر تھا وہ ایک تو فطرتاً دھان پان تھی دوسرے اس غیر فطری ماحول نے اس کو مزید خون کے آنسو رلائے اور وہ صنف ہستی پر بار بن کر رہ گئی (یہ حالت بیشتر درمیانی طبقے کی عورتوں کی ہے)

ایسی کمزور اور چوہے سے خوفزدہ ہونے والی لڑکیوں کی اب بھی ہندوستان میں کمی نہیں۔ میں نے شدّت سے محسوس کیا ہے کہ عورت کے ساتھ ظلم ہُوا بہت بڑا ظلم ایسا ظلم جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں مَیں نے بہت بڑے پیمانے پر تجربات تو نہیں کئے لیکن خاصی مُدت تک مشرقی یو۔پی کے بیشتر اضلاع کے دیسی اور قصباتی علاقوں میں پھر کر میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ عورت جس کی گود میں مستقبل کا انسان سانس لے رہا ہے۔ اپنی اس امانت کا بار اٹھانے کے ناقابل ہے۔ وہ جسمانی حیثیت سے اتنی کمزور، دماغی حیثیت سے اتنی بزدل اور روحانی حیثیت سے اتنی ناکارہ بنادی گئی ہے جس کا تصور ناممکن ہے۔ جسمانی کمزوری (جس کا باتفصیل ذکر آگے آئیگا) تو درکنار اس روحانیت کا تصور جس کا پرچار کرنے میں ہمارے مولوی اور پنڈت اپنے بیٹھتے ہوئے گلے کی آخری آواز بھی صرف کر ڈالتے ہیں، ہماری عورتوں سے کوسوں دُور ہے۔ مغربی خواتین کی رہائش اور طرز زندگی پر علمائے کرام اور پنڈتان محترم کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے، کہ وہ اپنی روح پر خوابیدگی طاری کر کے "بدن کو بیدار" کرتی ہے۔ بالکل صحیح سراسر درست لیکن آپ نے تو اپنی عورتوں کی روح اور بدن دونوں کو سلا دیا۔ میں ہر مولوی اور ہر پنڈت کو چیلنج دیتا ہوں۔ کہ وہ اس کا جواب دے کہ کیا بدن کی نشوونما کے بغیر روح میں کسی قسم کی بالیدگی پیدا ہو سکتی ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو کیا انھوں نے اپنی عورتوں کے بدن کی نشوونما کا ویسا ہی انتظام کر رکھا ہے۔ جیسا وہ اپنے بیٹوں یا لڑکوں کے لئے ضروری سمجھتے ہیں؟ اس کا جواب مولوی دے یا نہ دے حقیقت یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ ہماری طاق شکستہ الہامی کتابیں کہتی رہیں "عورت مرد دونوں کے لئے تحصیل علم ضروری ہے" پیشوایان دین کے اقوال و احادیث چیخ چیخ کر بتاتے رہے کہ "بے علم نتوان خدا را شناخت" یا "طالب علم کے قلم کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ مقدس ہے"[1] لیکن ہمارے

---

[1] یاد رکھئے کہ احادیث اور اقوال بزرگان دین میں کہیں بھی علم کے مسئلے میں عورت مرد کی تفریق نہیں کی گئی ہے۔

بزرگان دین، مسند اور گاؤ تکیوں پر دراز ان اقوال کی صداقت اور زبان و بیان کی لذت پر کچھ دیتے ہیں۔ اپنے خونیں لبوں سے اپنے سادہ لوح مریدوں کے گمراہ دلوں کو بہلاتے رہے۔ اور ان کی دین و دنیا دونوں خراب کرتے رہے۔ مولوی کی زبان کلام مجید اور اس کے مابعد الطبعیاتی پہلوؤں پر ہر سمت سے روشنی ڈالتی ہے۔ علم کی بھی فضیلتیں اور برکتیں بیان ہوتی ہیں لیکن اپنے گھر واپس جا کر بیوی پر بدستور مظالم توڑے گئے۔ لڑکیوں کو ہنوز کندۂ ناتراش رکھا جاتا رہا[1]۔

کہا جاتا ہے مشرق میں عورتیں گھر کی شہزادیاں[2] ہوتی ہیں یا ہوتی ہونگی۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ اگر شہزادیاں انہیں کو کہتے ہیں۔ تو پھر باندیاں کس کو کہتے ہوں گے۔ بہرحال بُرا تو ضرور معلوم ہوگا۔ لیکن ان شہزادیوں کے متعلق چند تجرباتی واقعات بھی سُن لیجئے۔

مشرقی یوپی کے ایک گاؤں میں جہاں متوسط اور متوسط سے نیچے درجے کے تین سو شرفا کی آبادی ہے اور جہاں غیر شرعی پردے کی قبیح رسم ہنوز باقی ہے پندرہ نوجوان لڑکیوں (شہزادیوں) میں سے سات، دق، سِل اور اسی قسم کے دوسرے موذی امراض کا پچھلے پانچ برس میں میرے دیکھتے دیکھتے شکار ہو گئیں۔ ایک شہزادی کی حالت طویل بیماری کے باعث ناقابل دید ہے اور یقین ہے کہ وہ بھی جانبر نہ ہوسکے گی۔ بقیہ سات لڑکیوں میں سے دو جو اپنی سخت جانی کے باعث زندہ ہیں درد سر، دل کی دھڑکن اور اسی قسم کی دوسری جسمانی اور اعصابی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ برخلاف اس کے انہیں خاندانوں کے بیس شہزادوں میں سے صرف ایک بدنصیب دق کا شکار ہوا وہ بھی اس طرح کہ انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران میں روپیہ کو صحت پر ترجیح دے کر دن رات دفتری کام کیا اور اس طرح دفتر کی زہریلی فضا میں اپنے پھیپھڑے خراب کر لئے۔ اب اللہ خدا یا ان تقلیدیا مشرق سے کوئی پوچھے کہ ان جوان مرگیوں کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے؟

عورت اور مرد کی ذہنی مساوات کے متعلق، موافق اور مخالف دونوں ہی اقسام کے مضامین اور کتابوں کی کمی نہیں ہے۔ نظریات کے الجھاؤ سے قطع نظر کہ جب ہم اُن نفسیاتی تجربات پر غور کرتے ہیں جو اس سلسلے میں کئے گئے ہیں۔ تو یہ چیز بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مرد کو ذہنی حیثیت سے عورت پر کسی طرح فوقیت حاصل نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ماحول کے محدود ہونے کے باعث عورتوں کی پسندیدگی کا معیار بالعموم مردوں سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ (مثلاً عورتوں کا نرسنگ، فنون لطیفہ، تعلیم اور امور خانہ داری وغیرہ میں غیر معمولی انہماک) لیکن اگر بنظر غور دیکھا جائے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں نے ہر شعبہ حیات میں، حتیٰ کہ انجینئرنگ، تیغ تعلیم، ہوا بازی، ریاضی اور دوسرے تمام خشک سائنسی مضامین میں جن کو مردوں کی ملکیت قرار دیا گیا تھا، اپنے کارنامے دکھائے ہیں۔ ایسے کارنامے جو مقابلتاً کسی طرح مردوں کی کوششوں سے کمتر نہیں ہیں۔ یورپین ممالک کو تو چھوڑیئے وہاں کی عورتیں تو زندگی کے ہر میدان میں مردوں کے دوش بدوش سرگرم عمل ہیں۔ خود مشرقی ممالک جن میں بالخصوص ترکی اور جاپان (آئندہ چل کر ہندوستان اور پاکستان بھی) شامل ہیں۔ عورتوں نے تجارت، صنعت و حرفت، ہوا بازی اور دوسرے محنت طلب کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔ تعلیمی حیثیت سے بھی عورتیں مردوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ میڈم کیوری[3] کا نام صفحات تاریخ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عورتوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دے گا۔ اسی طرح ہندوستان میں چاند سلطان، جھانسی کی رانی اور اسی قبیلے کی دوسری برگزیدہ خواتین، اس غلط دعوے کو کہ مرد ذہنی اور جسمانی حیثیت سے عورت پر فضیلت رکھتا ہے باطل ثابت کرتی رہیں گی۔ میرا خیال ہے کہ ایسی مثالوں کی مشرق و مغرب دونوں ہی جگہوں پر کمی نہیں جن میں عورتوں نے تصنیف تالیف اور مہارت تعلیم میں نہ صرف مردوں کا مقابلہ کیا ہے بلکہ اُن کو پیچھے چھوڑ گئی ہیں۔ علم طب اور نرسنگ میں تو عورتوں سے مقابلہ کرنا لاحاصل ہے کیونکہ ان علوم کی طرف عورتوں کا فطری رجحان مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح سیاست حکمت اور شعر و شاعری وغیرہ میں عورتوں کا درجہ مردوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس نظریے کے مخالفین زیادہ سے زیادہ اپنے دعوے کی دلیل میں

---

[1] یہ چشم دید واقعات ہیں۔ [2] براہ کرم اُن شہزادیوں کا خیال ذہن میں نہ لائیے گا جن کی نمونی کی تعداد ہندوستان میں ضرور بستی ہے۔

[3] زبردست سائنس دان اور ریڈیم کی موجد۔

یہ کہہ سکتے ہیں کہ عورتوں کی تعداد ان تمام شعبوں میں مردوں کے مقابلے میں بدرجہا کم ہے۔ لیکن وہ اس ناقابل تردید حقیقت کو فراموش کر رہے ہیں۔ کہ تعلیم یافتہ عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں بدرجہا کم ہے۔ میں نے بعض یونیورسٹیوں اور کالجوں کے سالانہ نتائج کو بغور دیکھا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تعداد کے تناسب سے کامیاب لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ ہے۔ اور یہ کہ ان لڑکیوں میں سے اکثر نے نہ صرف آرٹس کے مضامین میں درجہ اول حاصل کیا ہے بلکہ سائنس کے مشکل مضامین میں بھی ممتاز رہی ہیں۔ یہ تمام باتیں اس بات کا ثبوت ہیں۔ کہ عورتیں ذہنی حیثیت سے کسی طرح مردوں سے کم نہیں ہیں۔ جسمانی طاقت میں بھی اب لڑکیوں کا درجۂ کمتری ختم ہو رہا ہے۔ لیکن یہ کام آہستہ آہستہ ہوگا۔ کیونکہ ہزارہا سال سے صرف لڑکوں کے لئے جسمانی ورزشوں اور کھیلوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ اور لڑکیاں اس سے محروم رکھی گئی ہیں۔ جس کا حیوانیاتی نتیجہ یہ ہوا ہے۔ کہ وہ جسمانی حیثیت سے کمزور ہو گئی ہیں۔ لیکن اگر حالات کی اصلاح کی جائے اور ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ عورتوں کی جسمانی صحت کی طرف بھی اتنی ہی توجہ دی جائے جتنا مردوں کے لئے ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ کچھ مدت کے بعد لڑکیاں بھی اتنی ہی تندرست و توانا اور صحت مند نہ بن سکیں۔ جتنے کہ لڑکے ہوتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ عورت کے لئے نزاکت اور نسوانیت کا قیام بہت ضروری ہے کیونکہ اگر وہ جسمانی حیثیت سے پہلوان بن گئی تو پھر اس کی جنسی کشش جاتی رہے گی۔ یہ انتہائی لغو خیال ہے۔ صحت مندی، سڈول اور گٹھے ہوئے جسم کے ساتھ ساتھ عورت اپنی خوبصورتی قائم رکھ سکتی ہے بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ صحت مند ہو جانے کے بعد اس کی رعنائیوں میں اور اضافہ ہو جائے گا بے شک جنسی اعتبار سے عورت کی حیثیت مفعولی ہے۔ لیکن اس مفعولیت میں مجہولیت شامل نہیں ہے۔ مفعولیت کے ساتھ ساتھ اس کی فاعلیت اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ یوں بھی موجودہ تحقیقات نے نسائیت اور مردانگی کے مابین حائل ہونے والی دیواروں کو شکستہ کر دیا ہے۔ تجربات شاہد ہیں۔ کہ مردانگی صرف مردوں کا حصہ نہیں ہے اور اس طرح نسوانیت کچھ عورتوں ہی کی ملکیت نہیں ہے۔ ہمیں اپنی روزمرہ زندگی میں لاتعداد ایسے مرد ملتے ہیں۔ جن میں مردانگی سے زیادہ نسائیت پائی جاتی ہے اور اسی طرح ایسی عورتوں کی بھی کمی نہیں جو بعض مردوں سے زیادہ مردانگی رکھتی ہیں (صرف جسمانی ساخت کی بنا پر نسائیت اور مردانگی کی تعریف علیحدہ علیحدہ نہیں کی جا سکتی) لہٰذا یہ معیار بھی ختم ہو جاتا ہے اور عورت مرد کی مساوات بڑی حد تک ثابت ہو جاتی ہے۔

عورت کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کی معاشی اقتصادی بے بسی ہے۔ اصولی طور پر وہ ہندوستان میں امور خانہ داری کی ذمہ دار سمجھی جاتی ہے۔ اور اس کے بدلے میں مرد کا فرض ہوتا ہے کہ وہ اس کی کفالت کرے۔ نظری حیثیت سے یہ اصول بہت ہی سائنٹفک ہے۔ اور اس سے کاموں کی تقسیم بہت ہی مناسب طریقے پر ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ بالعموم مرد عورتوں کو ان کا حق نہیں دیتے ہمارے موجودہ نظام میں غالباً یہ فعل بے حیائی میں شمار کیا جاتا ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر پر نان نفقے کا دعویٰ کرے اور عدالتی چارہ جوئی میں اپنے تمام اندرونی تعلقات کو ججوں اور وکلاء کے سامنے طشت از بام کر دے۔ اور اگر بفرض محال چند نے ایسا کیا بھی تو سب عورتیں تو ایسا نہیں کر سکتیں۔ لہٰذا اس پابندی کو کہ عورت اقتصادی حیثیت سے مرد کی غلام رہے گی ہٹا دینا ہی مناسب ہے کیونکہ صرف اخلاقی بندش پر کسی خاص طبقے کی معاشی بقاء کا انحصار کر دینا اس کے ساتھ زیادتی کرتا ہے۔

ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس موجودہ دور ترقی میں بعض رجعت پسند افراد جو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ عورتوں کے متعلق نہایت رکیک سوقیانہ سطحی اور بدنما خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ فلاسفہ میں شوپن ہار، ادیبوں میں برنارڈ شا، سی۔ ای ایم جوڈ اور اسی قبیل کے دوسرے افراد کی رائیں عورت کے متعلق انتہائی سم آلود ہیں۔ ان لوگوں کی بین الاقوامی شہرت خواہ کتنی ہی مستند کیوں نہ ہو، عورتوں کے متعلق ان کے نظریات ان کی ذاتی جنسی الجھنوں اور ناخوشگوار تجربات پر مبنی ہونے کے باعث (میری دانست میں) ناقابل اعتبار تقلید ہیں۔ میں نے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو اس بحث میں شوپن ہار سی۔ ای ایم جوڈ وغیرہ کا حوالہ دیتے سنا ہے۔

لیکن ان لوگوں کی دلیلوں میں کوئی جان نہیں ہے۔ مثلاً شوپن ہار نے عورت کو انتہائی احمق، بزدل، خود غرض چھوٹے قد اور تنگ سینے کی مخلوق کہا ہے۔ اسی طرح شکسپیئر نے بھی "کمزوری تیرا نام عورت ہے" کہہ کر عورتوں کی توہین کی کوشش کی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان مشاہیر کا ردِ عمل اُن کے احساسِ کمتری پر منحصر ہے۔ صرف چند بُری مثالوں کی بنا پر ایک مخصوص طبقے کے گلے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لعنت کا طوق ڈال دینا کہاں کی عقلمندی اور انصاف ہے۔

گولڈ اسمتھ کہتا ہے "لڑکی اپنے ہمسن لڑکے سے زیادہ بردبار، حلیم اور مستقل مزاج ہوتی ہے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ ذہنی پختگی کے اعتبار سے لڑکی کی حیثیت لڑکوں سے بہتر ہوتی ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے اور ہمارے روزمرہ کے واقعات اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ لڑکا پچیس چھبیس برس کی عمر تک عہدِ طفولیت سے باہر نہیں ہوتا برخلاف اس کے لڑکیاں اٹھارہ اُنیس برس ہی کے سن سے بردباری، سنجیدگی اور متانت کا نمونہ بن جاتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ لڑکیوں میں جوانی کی شوخی، لڑکوں کے مقابلے میں کم ہوتی ہے۔ بلکہ یہ کہ دُنیا اور اس کے حقائق پر جتنی گہری نظر لڑکی کی ہوتی ہے۔ اسی سن کے لڑکوں میں نہیں ہوتی۔ علم نفسیات کے ماہرین جانتے ہیں کہ ذہنی اعتبار سے وہی بچہ نارمل (اوسط) کہلاتے کا مستحق ہے۔ جس کی طبعی اور ذہنی عُمر میں سر مو تفاوت نہ ہو لیکن اگر طبعی عمر کے مقابلے میں ذہنی عُمر کم ہے تو پھر وہ بچہ اوسط سے نیچے درجے میں شمار ہوتا ہے۔ طبعی عمر کے اعتبار سے لڑکیوں کی ذہنی عُمر بالعموم لڑکوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی سے آپ حقائق کا اندازہ لگا لیجئے۔ کہ کون ذہنی اعتبار سے بہتر ہے اور کون کمتر۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہمیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ سینکڑوں برس سے ہمارے سماجی نظام نے عورتوں اور مردوں کے لئے علٰحدہ علٰحدہ راستے متعین کر دیئے ہیں۔ نظریۂ وراثت کی رُو سے ان مخصوص پیشوں اور کاموں کا اثر عورت کی ذہنیت پر پڑنا لازمی ہے۔ لہٰذا وہ سخت جسمانی محنت کے کام کرنے کی اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی کہ مرد اور بعض حالات میں اُن مزدور پیشہ عورتوں کی جو کارخانوں میں جسمانی کام انجام دیتی ہیں، صحت جلد خراب ہو جاتی ہے بعض ماہرین نفسیات کا خیال ہے۔ کہ کارخانوں میں کام کرنے والوں کے مقابلے میں کام کرنے والی عورتیں بالعموم بیماریوں کا شکار رہتی ہیں اسی طرح جنون اور ذہنی علالتوں کی بڑی تعداد کارخانہ میں کام کرنے والی عورتوں ہی کی ہوتی ہے۔ ان تجربات سے یہ ماہرین یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔ کہ عورتیں طبعی اور جسمانی حیثیت سے صنعتی کاموں کے لئے ناموزوں ہیں ممکن ہے بصورتِ موجودہ یہ نتائج صحیح ہوں لیکن ہمیں اس عالمگیر حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ عورتوں کی موجودہ جسمانی طاقت صدیوں اور قرنوں کی آرام طلبی کا نتیجہ ہے اور یہ حالات اتنے دیرپا اور مستقل ہو گئے ہیں کہ ان کا پلک جھپکاتے دُور کرنا ناممکنات میں سے ہے۔

جیسا ہم کہہ چکے ہیں۔ عورتیں جسمانی اعتبار سے مردوں سے کمزور واقع ہوئی ہیں مثلاً ایک اوسط درجہ کی عورت کا قد اور وزن ایک اوسط درجے کے مرد سے چھوٹا ہوتا ہے۔ قد اور وزن کی یہ چھوٹائی اور کمی نشوونما کی کمی یا بیرونی حالات کے اثرات کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اندرونی طور پر عورتوں میں رگوں اور پٹھوں کا نظام بمقابلہ مردوں کے کمزور ہوتا ہے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جسمانی ساخت فطری ہے لیکن میرا خیال ہے مساعدت زمانہ سے اس جسمانی کمزوری کو ثانوی حیثیت حاصل ہو گئی ہے ورنہ ازمنہ ماضیہ میں عورت میں یہ مخصوص کیفیت مفقود تھی اور اب پھر جسمانی ورزشوں اور ذہنی تربیت کے ذریعے سے وہی قدیم درجہ حاصل کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ عورتیں ابھی جسمانی تربیت کی اتنی ہی کوشش کریں جتنا کہ ایک مرد کرتا ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی اور اس سے متعلقہ زنانہ کالجوں کی طالبات کی جسمانی ورزشوں کا معائنہ فرماتے وقت گورنر یو۔پی نے فرمایا کہ میں عورتوں کو عورت ہی کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ اُن کا مرد بننے کی کوشش کرنا مجھے پسند نہیں مجھے اُن کے اس نظریے سے اختلاف ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ذمہ دار اور پڑھا لکھا انسان اس جسمانی تربیت کو جسے وہ مردوں کے لئے باعثِ افتخار فرما دیتا ہے کس طرح عورتوں کے حق میں غیر مفید قرار دے سکتا ہے۔ طبعی قوانین اپنی جگہ پر اٹل ہوتے ہیں۔ اُن کی ہمہ گیری کے سیلاب میں جنسی تفریق پرکاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ ہم انسان اپنی اپنی جگہ پر اپنی

قابلیت کے زعم میں غیر فطری قوانین وضع کرتے ہیں۔ اور ظلم و تعدی کے سہارے اس کاغذ کی ناؤ کو تیرانے میں عارضی طور پر کامیاب بھی ہو سکتے ہیں لیکن فطرت ہماری اس کم نگاہی اور ناتجربہ کاری پر مسکراتی ہے۔ اور آخر کار ایک گردش چشم ہمارے خود ساختہ گھروندوں کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ یہی حال جنسی تفریق کا ہے۔ فطرت نے مرد عورت کو ایک دوسرے کی خاطر پیدا کیا۔ لیکن انسان نے ایک کو دوسرے کی ضد قرار دے کر دونوں کے مابین اختلافات کی ایک گہری خلیج قائم کر دی۔ لیکن کب تک آخر کار وہ دن آئے گا اور ضرور آئے گا۔ جب ہمارے بودے سوشل قوانین جو اس تفریق کا سبب ہیں۔ حرف غلط کی طرح صفحہ ہستی سے نابود ہو جائینگے اس کام کو ہماری آپ کی سعی نہیں۔ خود فطرت انجام دے گی صرف وقت اور موقع کا انتظار ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ کہ عورتوں اور مردوں میں مکمل جسمانی اور ذہنی مساوات، یکرنگی اور یکسانی پائی جاتی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ان کے مابین اختلافات ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ لیکن یہ انفرادی تفریق تو خود مردوں کے اندر بھی پائی جاتی ہے۔ کیا کوئی شخص مثلاً دو مرد بھی اس قسم کے پیش کر سکتا ہے۔ جو جسمانی اور ذہنی ساخت کے اعتبار سے بالکل یکساں ہوں؟

ذہنی تفریق کے متعلق بعض ماہرین کا خیال ہے کہ عورتوں میں جارحانہ قوت مردوں کے مقابلہ میں کم پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے ان کی قوت مقابلہ کم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ جسمانی معاملات میں یہ نظریہ درست ہو لیکن ذہنی مقابلے میں عورتیں کسی طرح مردوں سے کم نہیں ہیں جسمانی قوت کی کمی کے باعث بلاشبہ عورتیں قتل و خون اور غارت گری میں مردوں سے پیچھے ہیں۔ لیکن ذہنی ترقیات کے میدان میں (بشرطیکہ ان کو مناسب ماحول مہیا کیا جائے) وہ کسی سے کم نہیں ہیں۔ ہالنگ ورتھ اور مانٹیگ نامی ماہرین کے تجربات جو انہوں نے دو ہزار نوزائیدہ بچوں اور بچیوں پر کئے۔ اس نظریہ کی تردید کرتے ہیں۔ کہ عورتیں ذہنی طور پر مردوں سے کمتر ہوتی ہیں۔ اس لئے ذہنی دائرہ عمل میں وہ اگر مردوں سے سبقت نہیں لے جا سکتیں تو پیچھے بھی نہیں ہیں۔ جہاں تک شفقت پدری و مادری کا سوال ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ عورتیں زیادہ رقیق القلب ہونے کے باعث بچوں اور اولاد کی نگہداشت زیادہ بہتر طریقے پر انجام دے سکتی ہیں۔ اس لئے تیمارداری، نرسنگ اور اسی قسم کے دوسرے کاموں کو وہ زیادہ اچھی طرح کر سکتی ہیں۔

وہ اطباء اور ماہرین نفسیات جنہوں نے "جنون" پر تحقیقات کی ہے اس بات کے مقر ہیں کہ مرد عورتوں سے زیادہ پاگل خانوں کی زینت بنتے ہیں۔ اور اس نظریاتی بحث میں کیوں پڑیئے جا کر کسی بھی دن کسی سرکاری "پاگل خانہ" کے اعداد و شمار دیکھ لیجئے مردوں کی ایک کثیر تعداد مختلف ذہنی امراض میں مبتلا نظر آئے گی۔ یہ چیز یقیناً اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ عمومی حیثیت سے مردوں کی اکثریت (بمقابلہ عورتوں کے) ضعیف الدماغی کا شکار ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ مردوں اور عورتوں کے پاس جذباتی اور میلاناتی اختلافات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مثلاً مرد زیادہ خوش طبع، آزاد طبع، خود پسند اور بدمزاج ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے عورتیں زیادہ جذباتی، صابر، شرمیلی اور مذہبی ہوتی ہیں۔ لیکن یہ اختلافات مجموعی طور پر ان کی ذہنی اور میلاناتی مساوات پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ میرے خیال میں یہ تفریق عورتوں کے محدود دائرہ عمل کا نتیجہ ہے۔ اور ہمیں بے شمار مثالیں اس نظریہ کی مخالفت میں ملتی ہیں۔ یہ مثنیات ماحول کی پیداوار ہیں۔ اور اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ کہ جذباتیت شرمیلا پن اور ہمدردی وغیرہ کسی ایک فرقہ کی میراث نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف حالات کا نتیجہ ہیں۔ جو دونوں جنسوں کو علیحدہ علیحدہ رکھنے کے باعث پیدا ہوئے ہیں۔ عصمت چغتائی، ہاجرہ مسرور، صہبا بانو بیگم اور دوسری مشاہیر خواتین کی تحریرات کو دیکھ کر کون یہ کہنے کی ہمت کر سکتا ہے کہ مرد بے شرم ہوتا ہے اور شرم صرف عورتوں کے حصے میں آئی ہے۔ یاد رکھئے کوئی بھی نظریہ اس وقت تک کائناتی قانون کی حیثیت نہیں اختیار کر سکتا۔ جب تک ہمیں اس کی مخالفت میں مثالیں مل جاتی ہیں۔ مثلاً شرم کا مسئلہ لیجئے ہم کسی طرح اس نظریہ کو قطعیت کا درجہ نہیں دے سکتے کہ "عورتیں زیادہ شرمیلی ہوتی ہیں"۔ اگر بے شرمی کی مثال عورتوں میں اور شرمیلے پن کی مثال مردوں میں ملتی ہے۔ (جیسا کہ واقعہ ہے)

ان تمام متذکرہ بالا دلائل کی بناء پر ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور

ہیں کہ باوجود انفرادی اختلافات کے مردوں اور عورتوں کے مابین کوئی خاص بنیادی وجہ تفریق نہیں ہے۔ تھارن ڈائیک نامی مشہور ماہر نفسیات اپنی مشہور تصنیف "نفسیات تعلیم" (صفحہ ۳۴۵) میں انہیں نتائج کی طرف اشارہ کرتا ہے:۔

"عورتوں اور مردوں کے اختلافات کی خاص خصوصیت ان کی "کم تعدادی" ہے۔ ان دونوں جنسوں کے مابین اختلافات (ذہنی اور میلاناتی) ضرور ہیں۔ لیکن عملی حیثیت سے ہم ان کو نظرانداز کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ان معمولی اختلافات کی بنا پر عورتوں اور مردوں کو دو علٰحدہ فرقوں میں تقسیم کرنا اتنا ہی مناسب یا نامناسب ہے۔ جتنا کہ مردوں کو ان کی انفرادیت کی بنا پر طبقوں میں تقسیم کرنا۔ ہمارے سابقہ تعلیمی تجربات اس بات کے گواہ ہیں کہ لڑکیاں، اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم میں لڑکوں سے کسی طرح پیچھے نہیں ہیں۔ موجودہ تعلیمی تجربات بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ماہرین نفسیات کا بھی یہی کہنا ہے کہ عورتوں اور مردوں کی ذہنی مساوات اُن کے فطری عطیوں میں مساوات کا نتیجہ ہے۔ اس کا یہ سبب ہرگز نہیں ہے کہ عورتیں تعلیمی معاملات میں زیادہ محنت کر کے مردوں پر سبقت لے جاتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

میرا خیال ہے کہ ان حقائق کے پیش نظر ہم یہ نظریہ قائم کرتے ہیں۔ حق بجانب ہیں کہ عورت مرد کے لئے باعث زحمت تو کسی طرح نہیں کہی جا سکتی ہاں باعث رحمت ضرور ہے۔ لیکن اس سے بہتر نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ عورت مرد کے لئے نہ باعث رحمت ہے نہ زحمت بلکہ وہ انسانی گاڑی کے دو پہیوں میں سے ایک ہے۔ جس کی امداد کے بغیر کسی فطری نظام زندگی کا چلنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

آسام سے ریل کا رشتہ

آسام سے ریل کے رابطے کے لئے ۱۴۵ میل لمبے راستے کو مکمل کرنے میں رائل انڈین انجینیرز کے دستے نے بہت کام کیا ہے۔ یہ راستہ ۱۹ دسمبر ۱۹۴۹ء کو مال کی نقل وحرکت کے لئے کھول دیا گیا تھا اور اب ۲۶ جنوری سے اس راستے سے سیدھی مسافر گاڑیاں آنے جانے لگیں گی +

ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستانی یونین اور صوبہ آسام میں ریل کا کوئی براہ راست رابطہ نہیں رہا تھا کیونکہ درمیان میں مشرقی بنگال کا پاکستانی صوبہ پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ مغربی بنگال کے شمالی صوبے۔ دارجلنگ اور جلپائی گوڑی ناقابل رسائی ہو گئے۔ وہاں صرف مشرقی پاکستان کے رستے جایا جا سکتا تھا۔ دریں حالات آسام سے ریل کا رابطہ قائم کرنے کا مسئلہ ایک بہت اہم مسئلہ تھا اور اسے دوسرے مسئلوں پر ترجیح دی گئی۔

وزارت ریلوے نے بڑی تیزی سے سارے علاقے کا جائزہ لیا اور سفارش کی کہ تین علاقوں میں ریل بنائی جائے جس سے اودھ اور ترہٹ ریلوے کے میٹر گاج کے موجودہ راستوں اور آسام ریلوے کے متعلقہ علاقوں کو ملایا جائے۔ اور اس طرح اودھ ترہٹ ریلوے کے اسٹیشن کشن اور آسام ریلوے کے اسٹیشن امین گاؤں میں رابطہ پیدا کیا جائے۔

رائل انڈین انجینیرز نے اس منصوبے کو عملی شکل دینے کے لئے بڑی تیزی سے کام کیا۔ فوجی انجینیروں نے تیستا۔ تورسا اور دوسرے دریاؤں پر پل باندھنے کا کام کیا۔ فوج کے یہ انجینیر اکتوبر ۱۹۴۸ء سے برابر کام کر رہے تھے ۱۹۴۹ء کے موسم برسات میں بھی ان کا کام جاری رہا۔ اگرچہ کبھی کبھی غیر متوقع بارش کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہوئی۔ پھر بھی انہوں نے مقررہ کام کو تسلی بخش طور پر پورا کیا۔ انہوں نے ریلوے کو ملانے کے لئے بڑے بڑے پشتے اور دریاؤں کو قابو میں رکھنے کے لئے بڑے بڑے بند باندھے۔ انہوں نے ایک آدھ میل لمبا، ۵ فٹ اونچا پشتہ بھی تعمیر کیا اور ایک پہاڑی میں ۵۰ فٹ گہرا شگاف ڈالا! اندازہ ہے کہ ان یونٹوں نے کل .... مکعب فٹ کام کیا اور بیس ہزار گھنٹے تک ان کی مشینیں کام کرتی رہیں۔

آسام کی اس نئی ریل پر نو کروڑ تیس لاکھ روپیہ خرچ آیا ہے۔ بہار کے ضلع پورنیا میں چالیس میل چلکر نئی ریل مغربی بنگال کے اضلاع دارجلنگ اور جلپائی گوڑی میں ۸۰ میل۔ ریاست کوچ بہار میں پانچ میل اور آسام کے ضلع گولپارا میں بائیس میل چلی جاتی ہے۔ اس کے راستے کے لئے میٹر گاج سے کام لیا گیا ہے۔

ہندوستانی فوج کے انجینیروں نے اس مشکل کام کو جس خوبی سے نبھایا ہے۔ اس کی بہت تعریف ہوئی ہے۔ ہندوستانی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل کے ایم کیریاپا نے اس کام کی تعریف میں ایک پیغام بھیجا ہے۔

(ملک زادہ) منظور احمد

"موجودہ تنقید نگاری کی چھان بین"

"موجودہ تنقید نگاری کی چھان بین" کے عنوان سے ممتاز حسین کا ایک مقالہ جون ۱۹۴۹ء کے "پروین الہ آباد" میں شائع ہوا ہے جس میں فراق، مجنوں اور احتشام حسین کی تحریروں کے ان تضادات کو ایجا کر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو لائق مقالہ نگار کے خیال میں ترقی پسندی کے صحیح مفہوم کو مجروح کرتے ہیں۔ ممتاز حسین صاحب اگر دہی بزرگ ہیں جن کا میرا تعارف انجمن ترقی پسند مصنفین یو۔پی کی سالانہ کانفرنس (اپریل ۱۹۴۹ء) میں ہوا تھا اور جو اپنی خلوص اور علمی تقاریر کے باعث ڈاکٹر علیم اور ڈاکٹر رام بلاس شرما کی رپورٹ پر بحث کے سلسلے میں پورے مجمع پر چھا گئے تھے اور جو صوبہ بمبئی کے ترقی پسندوں کی "اگر مجروح سلطان پوری کو نظر انداز کر دیا جائے" واحد نمائندگی کر رہے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بذات خود کچھ الجھنوں کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں اور جیوں جیوں وہ اس گتھی کو سلجھانا چاہتے ہیں اس کی تہوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور بالآخر وہ عاجز آ کر اس الجھاوے کو ترقی پسند ناقدین کے سر تھوپ دیتے ہیں۔

فراق ماسے کی طہارت میں ویدانت کا آفاقی نغمہ شامل کرتے ہیں یا نہیں یا ان کا نظریۂ عشق ہمارے قدیم شعراء سے مختلف ہے یا نہیں میں اس بحث کو فی الحال نہیں چھیڑنا چاہتا اور نہ ہی اس مختصر سے مضمون میں احتشام حسین کی "خوش قسمتی یا بدقسمتی" کا زائچہ بنانے بیٹھا ہوں کہ "وہ ناقد پہلے ہیں اور افسانہ نگار و شاعر بعد میں"۔ اب سوال مجنوں گورکھپوری کا رہ جاتا ہے جن کے متعلق میں اس مضمون میں کچھ روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ مجنوں گورکھپوری کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ ان کی کتاب ادب اور زندگی ترقی پسند تحریک کا ایک سرحدی نشان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات صحیح ہو اور کسی حد تک درست بھی کہ ترقی پسندوں کے غول میں جب ہم اس سرحدی نشان سے آگے بڑھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجنوں بذات خود غبار راہ کے دھندلکوں میں گم ہو جاتے ہیں اور پھر مدت تک چند مضامین کے علاوہ جو وقتاً فوقتاً نگار اور دوسرے رسائل میں شائع ہوئے ان کا قلم بیکار پڑا رہتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ طویل خاموشی کیا معنی رکھتی ہے میرا مطلب اس جملے سے یہ نہیں ہے کہ وہ خود اپنے تضادات کے شکار ہو کر رہ گئے ہیں بلکہ میری مراد یہ ہے کہ ادھر گذشتہ چند سال کے اندر ان کے ادبی اکتسابات بہت کم رہے ہیں۔ حالانکہ ترقی پسند تحریک اس وقت جس نازک موڑ پر آ گئی ہے اس کا تقاضا یہی تھا کہ مجنوں کا قلم ایک بار پھر اپنی پوری روانی سے چلتا۔ ادھر سنا گیا ہے مجنوں "پردیسی" کا روپ بھر کر آجکل میں پھر انگڑائی لینے والے ہیں۔ لیکن اگر مستقبل اور حال کے اکتسابات کو یہ سمجھ کر چھوڑ دیا جائے کہ مجنوں مر چکے ہیں (انا للہ وانا الیہ راجعون) اور ان کا قلم ٹوٹ چکا ہے اور صرف ان کے گذشتہ کارناموں کا جائزہ لیا جائے تو ہم ہرگز ان نتائج پر نہیں پہنچتے جہاں ممتاز حسین صاحب نے ٹھوکر کھائی ہے۔ مجنوں کا یہ کہنا کہ زندگی ایک نامیاتی حقیقت ہے جو بڑھتی رہتی ہے اور بہتر سے بہتر ہوتی رہتی ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ زندگی میں کبھی منفی میلانات پیدا ہی نہیں ہوتے (جیسا کہ ممتاز صاحب نے سمجھا ہے) بلکہ میرے خیال میں اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کا اصل میلان آگے بڑھتا ہے۔ اور اس کا حقیقی مطالبہ ترقی کرتا ہے۔ گویا مثبت سے منفی اور منفی سے نیا مثبت وجود میں آتا ہے جو پہلے مثبت سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس بات کے شاہد ہیں قبائلی نظام سے سامنتی نظام اور سامنتی نظام سے صنعتی یا مہاجنی نظام کا پیدا ہونا اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ زمانہ ترقی کر رہا ہے۔ مجنوں نے خود اپنے مضمون "ادب کی جدلیاتی ماہیت" میں اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"مادہ حرکت کرتا ہے اور یہ حرکت جدلیاتی ہوتی ہے۔ یعنی ایک صورت خود اپنی تردید کرتی ہے اور اس تردید سے پھر نئی صورت پیدا ہوتی ہے جو پہلی صورت سے بہتر ہوتی ہے۔ گویا مثبت سے منفی اور منفی سے نیا مثبت وجود میں آتا ہے"۔ مجنوں یہ متفقہ رائے ہے کہ مجنوں ایک قاموسی علم کا مالک ہے اس نے Thalies (طالیس) سے لے کر اس وقت تک کے تمام حکماء کا مطالعہ کیا ہے۔ میں یہ کسی صورت میں ماننے کے لئے طیار نہیں کہ اس نے برگساں کے فلسفے کو جدلیات سے تعبیر کیا ہوگا اور نہ میری نظر سے ان کے تمام اکتسابات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ جملہ نظر سے گذرا کہ برگساں بھی جدلیات کا معلم ہے۔ رہا ہیگل اور مارکس کا سوال تو یہ واضح ہونا چاہیئے کہ جہاں تک جدلیات کا تعلق ہے ان دونوں کے نظرئے میں کوئی فرق نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مارکس کا فلسفہ ایک تاریخی ردّ عمل تھا" اس بڑھتی ہوئی تصوریت اور مادائیت کے خلاف جو ہم کو صرف ہوا میں تیرنا سکھا رہی تھی اور ہماری ٹھوس اور سنگین دنیا کو ابخرات میں تحلیل کر رہی تھی اس لئے مارکس نے مادہ پر اس قدر زور دیا اور اپنے نظرئیے کو مادیت کہنا ضروری سمجھا"۔ مجنوں کا یہ کہنا کہ "مارکس کے مدرسۂ فکر کو صرف جدلیت کہنا کافی ہوتا اگر ہیگل اور اس کے شاگرد اپنی تصوریت کو جدلیاتی تصوریت نہ کہہ چکے ہوتے"۔ بالکل درست ہے ہیگل اور اس کے تابعین کا یہ خیال تھا کہ مادّہ تصور کے تابع ہے اور شعور وجود متعین کرتا ہے اور دراصل مارکس نے اسی غیر فطری صورت حال کو درست کیا۔ کہ اصل حقیقت وجود ہے اور شعور وجود کے تابع ہے اور جیوں جیوں وجود ترقی کرتا اور سدھرتا جائے گا شعور بھی اسی نسبت سے رچتا اور منزل بہ منزل زیادہ مہذب ہوتا چلا جائے گا۔ ورنہ جہاں تک جدلیت کا بنیادی سوال ہے وہ دونوں کے وہاں یکساں ہے۔ اور ہیگل کے فلسفے پر مارکس کا فلسفہ ایک اضافہ ہے اور خود مارکس کے اصول کو مدِ نظر رکھ کر ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا کہ مارکسزم Marxism پر بھی اضافہ ہو سکتا ہے۔ مارکس نہ آخری پیغمبر ہے اور نہ مارکسزم آخری کتاب۔

مجنوں کے جمالیاتی نظرئیے کی ترتیب میں ہیگل اور کروچے کو دخل ہے یا نہیں میں فی الحال اس پر تفصیلی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ اوّل تو ایسا ہے نہیں اور اگر بالفرض محال اس کو تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ہیگل اور کروچے سے متاثر ہیں تو یہ کوئی ایسا جرم نہیں کہ ان راستوں کو جن پر مجنوں گامزن ہیں گمراہ کن اور متضاد کہا جائے۔ مجھے ممتاز حسین کا یہ جملہ پڑھ کر کہ "ادب اور زندگی کا نظریہ مارکسی منکرین کا اجارہ نہیں بن سکتا ہے" بڑا تعجب ہوا۔ ممتاز حسین کا ایک مقالہ نگار ۱۹۵۶ء کے انتقاد نمبر کے دوسرے حصے میں شائع ہوا ہے۔ جس کا عنوان "تنقید کا مارکسی نظریہ" ہے۔ اس کی چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

"..... ان چند سطور کو پیش کرنے سے محض اس غلط فہمی کو دور کرنا ہے کہ مارکسی تنقید کی محک پر ایک مارکسی ادیب ہی پورا اتر سکتا ہے یا یہ کہ مارکسی ناقد کسی غیر مارکسی کو بڑا شاعر یا ادیب نہیں سمجھتا۔ حقیقت بالکل مختلف ہے"۔ ممتاز حسین

سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے اندر یہ تضاد کیوں پیدا ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی "چھان بین" "انحطاط کی طرف مائل ہو۔ کہ صرف تین سال کے وقفے کے اندر ان پر "دروغ گو را حافظہ نباشد" کی مصداق صادق آتی ہے۔ اس موقعے پر میں اینگلز اور لینن کی ان سطروں کو دہرانا چاہتا ہوں جو انہوں نے بالزک Balzac اور ٹالسٹائی Tolstoy کے متعلق لکھی ہیں اور جن کا حوالہ ممتاز حسین نے خود اپنے نگار والے مضمون میں دیا ہے۔

اینگلز لکھتا ہے "بالزک سیاسی عقیدے میں شاہی کا از روئے قانون حامی ہے لیکن اس کی اعلیٰ تصانیف اس وقت کی اچھی سوسائٹی کے زوال کے مرثئے ہیں اس کی ہمدردی اس طبقے کے ساتھ ہے جو موت کی دستاویز پر اپنی مہر لگا چکا ہے۔ بایں ہمہ اس کے طنز اور زہرخند میں شدت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ وہ اسی طبقے کے مردوں اور عورتوں کا ذکر کرتا ہے جنھیں وہ سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہے یعنی شرفا اس طرح بالزک گویا مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی طبقاتی ہمدردی اور سیاسی تعصّبات کے خلاف قلم اٹھائے اور اس ضرورت کو محسوس کرے کہ اس کے محبوب شرفا اسی انجام کے مستحق ہیں۔ میں اس چیز کو حقیقت نگاری کی سب سے بڑی فتح سمجھتا ہوں"۔

لینن لکھتا ہے "ٹالسٹائی کی تعلیمات بلاشبہ Utopian اور

رجعت پسند ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ تعلیم اشتراکی نہیں ہے۔ اور نہ یہ کہ ان میں ناقدانہ عناصر نہیں ہیں۔ جو اس وقت کے آگے بڑھتے ہوئے طبقے کی تعلیم کے لئے مفید نہ ہوں۔ . . . . ٹالسٹائی نے روسی تواریخ کے اس اہم تجربے کو پیش کیا ہے جو ۱۸۶۱ء اور ۱۹۰۵ء کے درمیان واقع ہوا۔ ایک پیغمبر کی حیثیت سے جو انسانیت کی نجات کے لئے ایک نیا نسخہ لاتا ہے ٹالسٹائی مضحکہ انگیز ہے ـــــ ٹالسٹائی ایک بڑا آدمی ہے اس حیثیت سے کہ بورژوا انقلاب کی آمد پر اس نے بے شمار روسی کسانوں کے خیالات اور ذہنی تشکیل کا آئینہ پیش کیا ہے" (لینن)

حسب بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اینگلز اور لینن بالزک اور ٹالسٹائی کی ان چیزوں کو سراہتے ہیں جن کا کوئی پہلو ترقی پسند رجحانات کے لئے کار آمد اور مفید ہے تو مجنوں مے اگر کروچے اور ہیگل کی ان چیزوں کو اپنا لیا (حالانکہ ایسا نہیں) جو ہمارے لئے اچھی اور بہتر ہیں تو کوئی ہرج نہیں اس کے علاوہ مجنوں نے کبھی بھی کروچے کی جمالیات کو مکمل تسلیم نہیں کیا ہے۔ اور نہ اس کو ادب کے لئے توانا و تندرست بتایا ہے۔ ادب اور زندگی میں مجنوں نے نہایت صاف اور واضح الفاظ میں کروچے کی جمالیات کو ترقی پسند تحریک کے لئے مضر اور نقصان دہ قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"آج کل اٹلی کا مشہور فلسفی ماہر جمالیات کروچے اسی ماورائی نظریے کا علمبردار ہے۔ اس کے خیال میں حسن کاری یعنی آرٹ ایک وجدانی تجربہ ہے جو آپ اپنی غایت ہے۔ اور جس کو منطق و فلسفہ یا مذہب و اخلاق کے اصول سے نہیں جانچا جا سکتا۔ یہ جمالیاتی ماورائیت زندگی پر ایک غیر ارضی سطح سے نظر ڈالتی ہے اور ہر چیز کو حسین و جمیل بنا کر پیش کرتی ہے۔ جو زندگی میں کریہہ اور بری ہے، وہ جمالیات میں حسین اور اچھی ہو جاتی ہے۔ یہ خالص تخیلیت انسانی معاشرت کے لئے خطرات سے خالی نہیں۔ بدی کو نیکی، جھوٹ کو سچ، بدصورتی کو حسن، غم کو راحت بنانے کی عادت جب ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو بیماری ہو جاتی ہے اور انسان اس کے ہاتھوں کاہلی، تعیش اور مجہولیت کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ تخئیلیت نے اگر دنیائے واقعات سے منہ پھیر لیا تو وہ دنیائے انسانیت کی تہذیب و تحسین میں کوئی حصہ نہیں لے سکے گی۔ اور ایک قسم کا فالج یا جنون ہو کر رہ جائے گی۔ دنیا کو اس فالج یا جنون سے محفوظ رکھنا ہے۔" (مجنوں)

اس اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مجنوں کروچے کی جمالیات کو ادب کے لئے ضرر رساں تصور کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ممتاز حسین صاحب کو مغالطہ یوں ہوا کہ اب سے تقریباً اٹھارہ سال پہلے ایک مختصر سا کتابچہ تاریخ جمالیات کے عنوان سے مجنوں نے مرتب کیا تھا جس کا اختتام کروچے پر ہے۔ اٹھارہ سال پہلے اول تو ایک دوسری نسل تھی اور دوسرے یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مارکس کے مادی فلسفے کو اچھی طرح وضاحت کے ساتھ ادب اور فنون لطیفہ پر منطبق نہیں کیا جا سکا تھا۔ مجنوں کا یہ کہنا کہ آئندہ کا مذہب جمالیات ہوگا دراصل اس نظریے کا حامل ہے کہ جب انسانی زندگی مادی اور اقتصادی حالت سے فارغ ہو چکی ہوگی اسی وقت آرٹ عوام کی زندگی میں دخیل ہوگا۔ مجنوں کروچے کے صرف ایک کتاب کے قائل ہیں اور وہ یہ کہ اس نے جمالیاتی فکر و شعور کو ایک مستقل اور جامد کیفیت بنانے کے عوض ایک متحرک اور ترقی پذیر قوت مانا ہے۔ یعنی وہ بھی اس بارے میں ہیگل کا ہم خیال معلوم ہوتا ہے کہ فکر یا شعور نام ہے تواریخ کا ـــ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ ہیگل کے فلسفے کو تواریخ بتانا۔ یہاں تک تو کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ

The Leningrad Institute of Philosophy

نے مارکسی فلسفے کا جو نصاب مرتب کیا ہے اور جس کا انگریزی ترجمہ کتابی صورت میں Dr. John Louis اور A. C. Mosley نے کیا ہے۔ اس میں بھی کروچے کی تمام غلط اندیشیوں کے باوجود اس کا اتنا اکتساب تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ تجرید Abstractedness اور کلی اور عمومی تصور کو بے معنی سمجھتا ہے اور اس کا اصرار ہے کہ فلسفہ اور تواریخ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں اور یہ کہ زندگی ایک خود آگاہ قوت ہے۔

یہ بات ضرور ہے کہ قدیم ادب کا جائزہ لیتے ہوئے مجنوں نجی زندگی پر زیادہ زور دیتے ہیں لیکن اگر ہم نجی زندگی کا تجزیہ کریں تو یہ بات ہم پر واضح ہو جاتی ہے کہ خارجی اور غیر ذاتی قوتیں ہی انسان کی نجی زندگی کا رخ متعین کرتی ہیں۔ رالف فاکس Ralph Fox کا کہنا ہے کہ Man has a double history ایک نجی اور ایک سماجی۔ اس نے اپنی کتاب The Novel and the People کے ایک باب Marxism and Literature میں صاف صاف

لکھا ہے" ۔ ہر شخص ایک دوہری تاریخ رکھتا ہے اس لئے کہ وہ بیک وقت ایک نوع ہے یعنی اس کے پیچھے ایک اجتماعی تاریخ ہے اور وہ ایک فرد ہے جس کے پیچھے ایک شخصی تاریخ ہے" یہ سچ ہے کہ اگر تجزیے اور تحلیل سے کام لیا جائے تو یہ دونوں بالآخر ایک ہی قوت کے مظاہر ثابت ہوتے ہیں۔ مگر جب ان میں دوئی آگئی اور دو جداگانہ مظاہر ہو گئے تو دونوں میں اکثر تصادم اور پیکار لازمی اور فطری تقاضی معلوم ہوتا ہے۔ اب یہ فرد فرد پر منحصر ہے کہ اس تصادم یا پیکار کو کس طرح حل کرے اور زندگی کی نئی تشکیل میں اس کو بوجوہ احسن استعمال کرے۔ رالف فاکس ایسی شخصیت نہیں جس سے ہم تجاہل برت سکیں۔ اس لئے کرسٹوفر کاڈول کی طرح وہ بھی عمل کا قائل تھا اور اشتراکی جنگ میں محاذ پر جا کر شہید بھی ہوا۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ تخیل مادے کا محتاج ہے یا نہیں ہم جانتے ہیں کہ مادی قوتیں ہیئت اجتماعی میں زیادہ تر اقتصادی رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ مارکس نے کہیں بھی مذہب، فلسفے یا ادب کو براہ راست اور شعوری طور پر اقتصادیات کا نتیجہ نہیں بتاتا۔ اور نہ اس سے کسی طرح کی وابستگی ظاہر کرتا ہے۔ مارکس کا ہم خیال انیگلز جو اس کا شریک کار بھی تھا ہے۔ بلاخ J. Bloch کو ایک خط میں لکھتا ہے:۔ "تاریخ کے مادی تصور کے مطابق جو عنصر تواریخ کا رخ متعین کرتا ہے وہ اصلی مادی زندگی میں تخلیق اور تخلیق ثانی یعنی پیداوار اور پیداوار جدید ہے۔ اس سے زیادہ نہ مارکس نے کبھی دعویٰ کیا ہے نہ میں نے، اس لئے اگر کوئی اس کو توڑ مروڑ کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اقتصادی عنصر ہی اکیلا اور آخری محرک یا موثر عنصر ہے تو اصل دعویٰ کو ایک بے معنی خیالی عنصر کی صورت میں تبدیل کر دیتا ہے" اس لئے مجنوں کا یہ کہنا بجا اور درست ہے اور خود مارکس بھی اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ ہمارا جمالیاتی تجربہ ایک حد تک خود مختار ہے۔ یہ بھی جدلیات ہی کا کرشمہ ہے کہ اقتصادی غیر اقتصادی ہو کر آخر میں جمالیاتی ہو جائے اور اس طرح کہ پھر اس کی اصلی صورت کے نشان کہیں نظر نہ آئیں۔

ممتاز حسین کے خیال میں تاریخ مجنوں کے اس مقولے کا کہ عبوری دور میں تخلیقی ادب نہیں پیدا ہوتا ابطال کرتی ہے لیکن جب ہم تواریخ کی روشنی میں عبوری ادوار کا غائرانہ مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ممتاز صاحب کا یہ اعتراض بالکل غلط ہے۔ عبوری ادوار تنقیدی ادب کے لئے زیادہ موزوں ہوتے ہیں اور تخلیقی ادب کے لئے کم۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس میں استثنا کی گنجائش نہیں۔ گنجائش ضرور ہے مگر ان پر اشاذ کالمعدوم کی مصداق صادق آتی ہے۔ بورژوا انقلاب سے پہلے انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن کو لے لیجئے اور اس کی دو کتابوں کو بہ نظر کے 1.Paradise Lost 2.Paradise Regained

اگر آپ کے اندر تنقیدی بصیرت ہے تو آپ فوراً اس نکتے پر پہنچیں گے کہ اول الذکر کتاب جو ایک انقلابی چیخ ہے اور جس میں تخریبی جرائم پائے جانے میں زیادہ زوردار اور موثر ہے۔ برخلاف اس کے موخر الذکر کتاب جس میں ایک تعمیری پروگرام ہے اس کی لے دھیمی اور کمزور پڑ جاتی ہے۔ خود ہمارے ملک کے اندر اقبال اور ٹیگور کی شخصیتیں ایک عبوری دور کی پیداوار ہیں، لیکن من حیث الکل ان دونوں کی شاعری خالص جمالیاتی شاعری ہے جس کو ہم پناہ گزینی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ کہ بہ حیثیت ایک فنکار اقبال کے مراتب بہت زیادہ بلند ہوں لیکن جہاں تک ان کے تخلیقی پروگرام کا سوال ہے وہ واضح نہیں۔ برخلاف اس کے جہاں وہ تخریبی عناصر کا ذکر کرتے ہیں زیادہ واضح اور اجاگر نظر آتے ہیں۔ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ عبوری دور تخلیقی ادب کے لئے قطعی موزوں نہیں اور اگر ہے تو مستثنیات میں سے ہے گل و بلبل کے افسانے۔ پان اسلامی نظریہ، یہ دراصل قدامت پرستی اور فرار کی ایک گونج ہے جو اقبال کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اقبال اور ٹیگور دونوں کی شاعری اس کے عوض کہ وہ ہم کو ترقی کی راہوں پر چلنے کے لئے شمع ہدایت کا کام دے جمود اور تعطل میں ڈال دیتی ہے اور احمد علی کا یہ کہنا کہ ان دونوں کی شاعری قدامت پرستی کی معراج ہے بالکل درست اور صحیح ہے عبوری ادب انتشار کی طاقتوں کی عکاسی ضرور کرتا ہے لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں وہ تعمیری قوتوں کا ساتھ اس زور شور سے نہیں دیتا اور اگر دیتا ہے تو وہ مستثنیات میں سے ہے

ہر ترقی پسند اپنے آپ کو ماضی کے ادب کا بہترین وارث

سمجھتا ہے اور جہاں تک ماضی کے ادب کے تفریحی حصے کا سوال ہے اس کی اہمیت میرے خیال میں صرف مجنوں ہی نہیں بلکہ ہر عقل سلیم رکھنے والا انسان سمجھتا ہے ۔ لیکن اس تفریح سے میری مراد وہ تفریح ہے جو زندگی میں انبساط کی ایک لہر دوڑا دیتی ہے نہ کہ وہ تفریح جس سے زندگی میں انقباض پیدا ہو اور اس کا نکھار مسخ ہو جائے ۔ مارکس اور لینن نے فراغت کے لمحات میں جن تفریحی ادب کا مطالعہ کیا وہ ایسا ہی تھا جن سے ان کے قوی بالغ اور مہذب ہوتے تھے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ تفریح زندگی کا جزو لاینفک ہے، اور اس کا ہونا ضروری ہے۔

اس مختصر سے مضمون سے میری مراد نہ تو ممتاز صاحب پر بیجا نکتہ چینی کرنی ہے اور نہ میں مجنوں سے اس قدر مرعوب ہوں کہ ان کی خرابیاں بھی اچھائیاں نظر آتی ہیں۔ منشاء صرف یہ ہے کہ جب ممتاز صاحب کی سی بلند اور اہم ہستیاں موجودہ تنقید نگاری کی چھان بین کریں تو ذرا تامل، مطالعہ اور حق بینی سے کام لیں کیونکہ مستقبل کا مورخ ان نقادوں، ادیبوں اور شاعروں کی راہ دیکھ رہا ہے جو ہندوستان کے لینن اور ٹراٹسکی بننے والے ہیں۔

پرم ویر چکر اور مہا ویر چکر کے اعزازات

جمہوریہ ہند کا اعلیٰ ترین فوجی اعزاز پرم ویر چکر کماؤن رجمنٹ چوتھی بٹالین کے میجر سوم ناتھ شرما اور سکھ رجمنٹ کی پہلی بٹالین لانس نائک کرم سنگھ کو عطا کیا گیا ہے۔ میجر سوم ناتھ شرما کا اعزاز بعد از موت ہے۔

۳؍نومبر ۱۹۴۷ء کی صبح کو سری نگر اور اس کے ہوائی میدان کو جو خطرہ تھا اُسے دور کرنے کے لئے میجر شرما کے سپاہیوں نے چھ گھنٹہ تک نبرد آزمائی کی اور وہ کامیاب ہو گئے۔ میجر شرما کی رہنمائی ۔ دلیری اور ان کا دفاع اس قدر قابل تقلید تھا کہ ان کے سپاہی دشمن کے مقابلے میں سات اور ایک کی نسبت رکھنے کے باوجود ان کی حوصلہ افزائی کی بنا پر یہ لوگ کامیاب ہوئے ۔ میدانِ جنگ میں اگرچہ میجر شرما کا ایک ہاتھ پلاسٹر بند تھا ۔ پھر بھی انھوں نے جنگ کی گولہ باری میں پورا حصہ لیا ۔ ایک چھوٹا گولہ ان کے گولہ بارود میں گرنے کی وجہ سے سارا گولہ بارود بھک سے اڑ گیا اور اس طرح میجر شرما داد شجاعت دیتے ہوئے کام آئے ۔ انھوں نے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو جو آخری پیغام بھیجا تھا وہ یہ ہے۔

"میں ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹوں گا اور جب تک ایک بھی آدمی زندہ ہے اور ایک گولی بھی موجود ہے ۔ لڑتا رہوں گا"

۱۳؍اکتوبر ۱۹۴۸ء کو ٹیٹوال کے علاقے میں لانس نائک کرم سنگھ نے دشمن کے آٹھ حملوں کو روکا ۔ اعزاز نامہ میں لانس نائک کرم سنگھ کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے لئے حوصلہ اور ہمت کی کان تھے ۔ اور دشمن کے لئے موت کی طرح ہیبت ناک"

ان کے علاوہ دو سورماؤں کو مہاویر چکر کے فوجی اعزاز دیئے گئے ہیں ۔ ایک اعزاز بریگیڈیر محمد عثمان مرحوم کو ملا ہے ۔ جو ۴؍جولائی ۱۹۴۸ء کو اپنے دستوں کی کمان کرتے ہوئے دشمن کی توپوں کا شکار ہو گئے ۔ دوسرا اعزاز لفٹننٹ کرنل ڈی رنجیت رائے کو ملا ہے ۔ جو سری نگر کے نزدیک سکھ رجمنٹ کی پہلی بٹالین کی کمان کرتے ہوئے ۲۷؍اکتوبر ۱۹۴۷ء کو کام آئے۔

جے بھارت

۲۶ جنوری کی صبح کو ہمارے دیش کے پہلے پردھان باپو کی سمادھی پر عقیدت کے پھول چڑھائے گئے

۲۶ جنوری کا دن ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس دن آج ے بیس برس پہلے راوی کے کنارے کی گئی کامل آزادی کی پرتگیا کو ہندوستان کے لوگ آج تک دھراتے رہے ہیں۔ وہ خواب اب پورا ہو چکا ہے۔ علان جمہوریت کے لئے اس سے زیادہ وزوں اور کونسا دن ہو گا۔

یوم جمہوریت کا افتتاح ڈاکٹر راجندر پرشاد نے پوجا سے کیا

صدر جمہوریہ حلف وفاداری لے رہے ہیں۔ اس موقعے پر حاضرین میں شری چکرورتی راجگوپال آچاری اور مرکزی حکومت کے وزیروں کے علاوہ انڈونیشیا کے پردھان شری سوکارنو اور شریمتی سوکارنو بھی موجود تھے

جب پردھان کی سواری اروِن سٹیڈیم پہنچی تو فوجی بینڈ نے جن۔ گن۔ من۔ کا قومی ترانہ بجایا۔ تصویر میں حکومت کے ارکین کے علاوہ دوسرے ملکوں کے سفیر بھی نظر آ رہے ہیں۔

پردھان منتری پنڈت جواہرلال نہرو شری چکرورتی
راجگوپال آچاری کو پالم کے ہوائی اڈے
پر الوداع کہہ رہے ہیں

ریپبلک کے پردھان ڈاکٹر راجندر پرشاد سردار پٹیل
کو حلف وفاداری دلا رہے ہیں

ارون سٹیڈیم میں صدر جمہوریہ سلامی لے رہے ہیں

صدر جمہوریہ کے جلوس کا ایک منظر

جمہوریت کے اعلان کے دن بچوں کے میلے
کا ایک سین۔

۲۷ جنوری کی شام کو گورنمنٹ ھاؤس
میں ڈاکٹر راجندر پرشاد اور نام دھاری
سکھوں کے گورو مہاراج پرتاپ سنگھ

نئی دھلی کے انڈیا گیٹ پر روشنی کا نظارا

فراق گورکھپوری
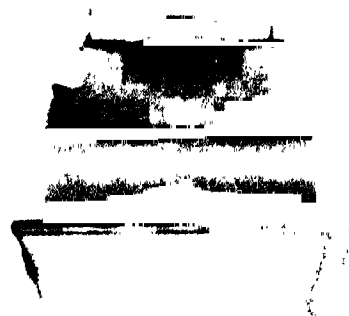
صدائے بازگشت

(طرزِ قدیم میں ایک غزل)

رات دن پلکوں تلے اشکوں کی لڑیاں دیکھیاں
جو دکھایاں تیری فرقت نے وہ گھڑیاں دیکھیاں

نے صبا، نے سایہ، سنگیں منزلیں، دور آسماں
راہگذارِ عشق میں کیا کیا نہ کڑیاں دیکھیاں

دل پھُنکے، لہرا کے سینوں سے دھواں اُٹھنے لگا
آگ برساتی ہوئی ساون کی جھڑیاں دیکھیاں

رسم و رہ کی بندشیں، تقدیر کی پابندیاں
زیست کے پاؤں میں زنجیریں جو پڑیاں دیکھیاں

گرد تک جن کی نہ پائیں ہم نفس حور و پری
صورتیں کیا کیا زمیں میں ہم نے گڑیاں دیکھیاں

رشکِ جنت تھے دلوں کے یہ خرابے ہائے ہائے
کیسی کیسی بستیاں بس کر اجڑیاں دیکھیاں

نور کے پُتلوں کی بھی دھڑکوں میں ہوتی ہے بسر
انجمن میں شمع کی سانسیں اُکھڑیاں دیکھیاں

چارہ گر بھی کیا کریں جز جرحِ غم بھی کیا کریں
سینوں میں زخمِ نہاں کی سب اُدھڑیاں دیکھیاں

نظروں نظروں میں بدلیاں یار کی نظریں فراق
باتوں باتوں میں بنی باتیں بگڑیاں دیکھیاں

عرش ملسیانی

رُوح کی آواز

محبت سوز بھی ہے ساز بھی ہے
خموشی بھی ہے یہ آواز بھی ہے

دلِ بیگانہ خو دُنیا میں تیرا
کوئی ہمدم کوئی ہمراز بھی ہے

خموشی پر بھروسہ کرنے والے
خموشی درد کی غماز بھی ہے

کبھی محتاج نے کا بھی نہیں یہ
کبھی نغمہ رہینِ ساز بھی ہے

کبھی تو دل ہے محوِ بے نیازی
کبھی طوفِ حریمِ ناز بھی ہے

نشیمن کے لئے بے تاب طائر
وہاں پابندِ پرواز بھی ہے

ترانہ ہائے سازِ زندگی میں
اک آوازِ شکستِ ساز بھی ہے

مری خاموشیٔ دل پر نہ جاؤ
اسی میں رُوح کی آواز بھی ہے

ہے معراجِ خرد بھی عرشِ اعظم
جنوں کا فرش پا انداز بھی ہے

بیتاب بریلوی

بعض مغربی محققینِ ہندیات کے کارنامے

یورپ کی تمام قوموں میں انگریزوں کو ہندوستان سے سب سے زیادہ لگاؤ رہا ہے۔ لیکن اس قدر قربت نصیب ہونے کے باوجود وہ ہمارے ماضی اور حال سے اتنے دور اور الگ تھلگ رہے ہیں کہ اُنھوں نے آج تک کوئی ایک بھی فاضلِ ہندیات پیدا نہیں کیا۔ اگر برطانوی مورخین کے کارناموں پر گہری نظر ڈالی جائے تو اس پیچھے والے فقدان کے اسباب بخوبی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی سیاسی مصلحت کوشی کے تحت ہماری تاریخ کو خوب مسخ کیا اور اس پر من مانا رنگ چڑھا کر آسمان کو زمین بنا ڈالا۔

انگریز مصنفوں نے ہمیشہ یہی کوشش کی ہے کہ جس طرح ممکن ہو ہمارے ماضی کو تاریکی کے گہرے پردوں میں روپوش رکھا جائے۔ یہ کام اُنھوں نے دو طریقوں سے کیا ہے۔ (۱) یہ کہ ہندوستان کو آریلو کا نژادِ بوم قرار دے کر اُنھیں مغربی حملہ آوروں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے اور دیگر مغربی مستشرقین کو مستند تاریخی روایات کے برخلاف اس اپنے نظریے کی تائید کے لئے بالواسطہ و بلاواسطہ ترغیب دی ہے۔ اور اس دعویِٔ باطل کی تائید میں جو لغو اور لچر دلائل پیش کئے یا کرائے ہیں اُن کا انحصار اُن گلی ظروف اور پتھر یا دھات کے اصنام وغیرہ کی ساخت پر ہے جو وسط ایشیا کی کھدائیوں کا ماحصل تھے۔

تاریخ شاہد ہے کہ بت پرستی کے محرک ہندوستانی بودھ مبلغ تھے۔ جو اپنے ساتھ صدہا بت افغانستان، ایران، عرب، عراق، مصر، تبت، چین، جاپان، لنکا اور بالی وغیرہ دور دراز مقامات میں لے گئے تھے۔ افغانستان میں تو بودھوں کے متعدد مذہبی در یافت ہو چکے ہیں۔ عرب وغیرہ میں جو بت ملے ہیں، اُن کے ہندی نژاد ہونے کی جا حظ کے سے محققین بھی شہادت دے چکے ہیں۔ علاوہ بریں مخصوص ساخت کے گلی ظروف کی برآمد و درآمد پر بھی کسی قسم کی کوئی پابندی عاید نہیں کی جا سکتی۔ دریں حالات عقلِ سلیم مغربی محققین کے "قولِ فیصل" کو قابلِ قبول قرار دینے سے قاصر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ مغرب نے اس حقیقت کو دانستہ پس پشت ڈال دیا ہے۔ کہ نہ صرف آریہ مبلغین اور تجار پیدائشِ مسیح سے صدہا سال پیشتر سے روم، مصر اور یونان تک پر چھائے ہوئے تھے۔ بلکہ مغرب کے اکثر شہرۂ آفاق علماء نے ہندوستانی دار العلوم میں برسوں تکمیلِ علم و فن کی تھی۔ البیرونی جو اپنے وطن میں بھی غیر ملکی مشہور تھا۔ ہیروڈوٹس جسے اہلِ مغرب اپنی لاعلمی اور ہٹ دھرمی سے آج تک دنیا کا اوّلین مورخ تسلیم کرتے چلے آتے ہیں۔ اور بقول آن فیلڈ مصنف تاریخ فلسفہ (جلد اوّل صفحہ ۶۵) فیثا غورث، آئیک ساغورث اور پیرا ہو وغیرہ ہندوستان آکر دولتِ علم سے مالا مال ہوئے اور ہندوستانی علماء کی بے پایاں داد و دہش سے نہال ہو کر اپنے وطن کے لئے مایۂ نازش و افتخار بنے ہیں۔

(۲) یہ کہ نہ صرف مفروضی دلیلوں سے آریائی ادب و ثقافت کی عمر گھٹانے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ اُن کی مقدس اور الہامی کتب کی بھی ہنسی اُڑائی اور ان میں سے بعض کا مآخذ مغرب میں تلاش کرنے کی بھی ناشکور جد وجہد میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔

جن علمائے مغرب نے اس سلسلے میں کچھ تھوڑا بہت کام کیا ہے اُن میں سے کوئی ایک بھی برطانوی نہیں ہے لیکن اس تحقیق کی آڑ میں بھی برطانیہ کا دماغ کار فرما ہے۔ اس راز کو سمجھنے کے لئے میکسمولر کے کارناموں کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا۔

میکسمولر اپنے زمانے میں مغرب کے سنسکرت کے پنڈتوں کا

سرتاج مانا جاتا تھا۔ وہ ڈارون کے نظریۂ ارتقا کو آیت حدیث سمجھتا تھا
اس کا عقیدہ تھا کہ رگوید کا زمانۂ تصنیف عیسیٰ سے بارہ سو برس پہلے
سے آگے نہیں جا سکتا۔ گویا اُس کی رائے میں تیرھویں صدی قبل مسیح
کے ہندوستانی اس قابل بھی نہیں تھے کہ گڈریوں کے سے بے معنی
گیت بھی گنگنا سکتے۔ مگر اس خوش فہم عالم نے اپنے اس دعوے کی
تائید میں کوئی ایک بھی دلیل پیش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔
اور اپنی رو میں بلا تکلف یہ بھی لکھ مارا ہے کہ اس کا کچھ حصّہ تو پُرانا ہے۔
اور کچھ عصر جدید کی ایزاد ہے بیکن سراسیمگی کے عالم میں یہ بھی
تسلیم کر لیا ہے کہ رگوید انسانی کتب خانے کی سب سے پُرانی
کتاب ہے۔

بہت تھوڑے لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ میکسمولر آکسفورڈ یونیورسٹی
میں بوڈن پروفیسر تھا۔ اور کرنل بوڈن ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم
کی حیثیت سے ہندوستان آیا تھا۔ کاروباری لوٹ کھسوٹ نے کمپنی
مذکور کو ملک گیری کی چاٹ لگا دی تھی۔ کرنل بوڈن نے محض اس
نیت سے بصرف کثیر آکسفورڈ یونیورسٹی میں یہ نئی جگہ قائم کی تھی کہ پادری
وغیرہ سنسکرت پڑھ کر سادہ لوح ہندوستانیوں کو اُن کے مذہب
سے گمراہ کر کے عیسائی بنا اور اس ترکیب سے برطانوی سامراج کی
بنیادیں مستحکم کر سکیں۔ ۱۸۶۸ء میں میکسمولر نے لارڈ آرگائیل کو جو
ان دنوں وزیر ہند کے عہدے پر فائز تھا ایک مکتوب روانہ کیا
تھا جس میں گویا اُس نے آپ اپنی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر
اب بھی ہندوستان میں عیسائیت کو فروغ نہ ہوا تو کون قصور وار
ٹھہرایا جائے گا؟ اس سے میکسمولر کی ذہنیت اور اس کے اقوال کی
حقیقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

میکسمولر کے نزدیک وید گڈریوں کے گیتوں کا مجموعہ ہیں لیکن
ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم اسی فاضل اجل کو یہ کہتے
سنتے ہیں کہ انسانیت کی تاریخ اور رسُوم وغیرہ کا وقوف حاصل
کرنے کے لئے ویدوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ غالبًا اس تبدیلی کی
وجہ یہ ہے کہ جب ناسادی سُوکت (नासदीय सूक्त) کا
صحیح مفہوم اُسے بتایا گیا، اور پیدائش عالم سے پیشتر دنیا کی حالت

اور تخلیق و تکوین کی علت غائی نیز اس کے مدارج کی تفصیل اس پر واضح
ہوئی اور اس تمام ناقابلِ تردید معلومات نے دنیائے سائنس کو ہیچ ثابت
دکھا کر انگشت بدنداں کر دیا تو وہ حقیقت کو بناوٹ کی اوٹ میں
چھپائے نہ رکھ سکا۔

سب جانتے ہیں کہ عیسائیوں کی انجیل کہاوتوں اور تاریخی حوالجات
سے مملو و معمور ہے۔ اس لئے علمائے مغرب کے نزدیک ویدوں میں
بھی اُن کا شامل ہونا ضروری تھا۔ انجیل اور اہل مصر کی مقدس کتاب
میں کشتی اور مچھلی کی کہانی مندرج ہے۔ انتہائی تلاش کے باوجود
میکڈانل کو یہ کہانی ویدوں میں کہیں نظر نہ آئی۔ پھر بھی اُس نے زبردستی
اتھروویدمیں اُسے ٹھونس ہی دیا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ ؛ —
یترنہ اوپر بھونشم (यस न यव य स हानम) کے نہ اور
او (न, याव) کر جوڑ کر ناؤ بنا ڈالا۔

"ڈارون ازم" کے مصنف ڈاکٹر والیس نے اپنی مشہور کتاب
"سماجی ماحول اور اخلاقی ارتقا" میں ویدوں کی فضیلت و برتری
کو تو تسلیم نہیں کیا مگر انھیں ملٹن اور ٹینی سن کی تصانیف کا ہم پلہ ضرور
قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ موازنہ قطعی غیر سائنسی ہے۔

اسی نوع کی ایک پُر مذاق کوشش یہ بھی ہے کہ جب ہمبولٹ
کے سے حق پسندوں نے دنیائے نظم میں گیتا کی فضیلت کا اعتراف
کر لیا تو معترض لے اُڑے کہ گیتا کا ماخذ انجیل ہے۔ حالانکہ گیتا انجیل
کی تدوین سے صدہا برس پیشتر کی تصنیف ہے۔ اس لئے یہ ضروری
ہوا کہ مہابھارت کے زمانے کو کھینچ کر قریب لے آیا جائے۔ گیتا کے
ایک مدراسی مترجم نے اپنے منظوم ترجمے کے مبسوط مقدمے میں اس
موضوع پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ ایک اور جرمن فاضل و ادیب
موسیس میٹرلنک نے ویدوں کو اس عہد کا سب سے پہلا مستند اور
بے عدیل نسخہ تسلیم کیا ہے جو عقلِ انسانی جس کا مبہم سا تصور کر سکی ہے۔

دنیائے مغرب کا فیصلہ ہے کہ چونکہ ماچ ترنگنی کے علاوہ سنسکرت
ادب کے ذخائر میں کوئی ایک بھی ایسی دستاویز دستیاب نہیں ہوتی،
جسے اہل مغرب کے نظریئے کے مطابق تاریخ سے منسوب کیا جا سکے۔
اس لئے ہند قدیم کے مصنفین بلاشبہ فن تاریخ نویسی سے نابلد محض تھے

مگر سوال یہ ہے کہ کیا تاریخ نویسی واقعی کوئی ایسا انوکھا فن ہے کہ جس قوم نے رامائن اور مہا بھارت وغیرہ کی سی عظیم الشان کتابوں کے مصنف پیدا کئے ہوں وہ کوئی معمولی وقائع نگار اور مورخ پیدا نہ کر سکے۔ پھر اہل مغرب نے سنسکرت کے ایسے کون سے ذخائر کھنگالے ہیں۔ جس کی بنا پر ان کے استدلال کو قابل پذیرائی قرار دیا جا سکے۔

بہر حال یہ طے ہے کہ آزاد ہندوستان کے کامیاب مورخ کو مغربی مستشرقین کی غلط تشنہ اور گمراہ کن تحقیق کا ازالہ کرنے کیلئے بہت کچھ کام کرنا ہے۔ اور اس بیل کا اُس وقت تک منڈھے چڑھنا ناممکن ہے جب تک کہ تمام موجودہ ذرائع سے استفادہ کے علاوہ چار دانگ عالم میں بکھرے ہوئے قدیم مسودات کی تلاش کر کے طلائی کو پورا کرنے کی سر توڑ کوشش نہ کی جائے

مغربی ماہرین شرقیات کی مختصر سی فہرست میں ڈاکٹر اسٹین کا نام جلی حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ اُس نے راج ترنگنی کے تبصرے میں سلوین لی وائی۔ ہاویل اور براؤن کی طرح ایک حد تک اپنا دامن تعصب و تنگ نظری کی عام بدعت سے بچائے رکھا ہے۔ دنیائے تحقیق میں اس کا پایہ یقیناً ان حضرات سے بہت بلند ہے بعض نقادوں نے اُسے ڈاکٹر گریرسن کے برابر جگہ دی ہے۔

ہر چند۔ ان حضرات کی کاوشیں ہر آئینہ قابل ستائش ہیں لیکن اُن کی غیر جانبداری محض ان کی حق پسندی ہی پر مبنی نہیں ہے سلوین لی وائی ایک فرنگی مورخ ہے۔ اُسے برطانوی سامراج سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ اُسے برطانوی افترا پردازیوں کی تہ میں ہی میں فرانسیسی ہندی مقبوضات کی خیریت نظر آتی تھی۔ ہاویل اور براؤن اپنے کام کی نوعیت کے اعتبار سے مصنف نہیں صرف مؤلف ٹھہرائے جاتے ہیں۔ جن کی کارگذاری اپنی قوم کو دنیا کے طعن و تشنیع سے محفوظ رکھنے کے لئے ہماری زندگی کے صرف ایک غیر سیاسی پہلو ہی کو اجاگر کرنے تک محدود ہے۔ اسٹین کا کارنامہ تو بارھویں صدی عیسوی ہی سے متعلق ہے۔ اس لئے نہ اس میں رنگ آمیزی کی گنجائش ہے اور نہ ضرورت ہی۔ پھر راج ترنگنی کے مترجموں میں آر۔ ایس۔ پنڈت کے سے قوم پرست ہندوستانی بھی شامل ہیں۔ البتہ ڈاکٹر موصوف کی

غیر جانبداری کی حقیقت کے انکشاف کے لئے اس کی سفید ہُن اور متعلقہ قبائل ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد کی تاریخ میں، سرحدی صوبے اور بلوچستان کی اثریاتی پڑتال از ۲؍جنوری ۱۹۱۵ء تا ۱۳؍مارچ ۱۹۱۶ء، ختن کے مدفون آثار قدیمہ اور ختن نامی تصانیف کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اسٹین ہنگری کے دارالخلافہ بوڈاپسٹ میں ۲۶؍نومبر ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوا، اور اس نے ویانا، لیپزگ، ٹیوبن زن اور آکسفورڈ میں دینیات کی تکمیل کی ۱۸۸۸ء میں وہ اورینٹل کالج لاہور کا پرنسپل اور پنجاب یونیورسٹی کا رجسٹرار مقرر ہوا۔ دس بارہ سال تک وہ اپنے فرصت کے اوقات میں کشمیر کی چھان بین کرتا رہا ۱۸۹۸ء میں اُسے برنر فیلڈ فورس کی معیت میں کشمیر جانے کا موقع ملا۔ اسی سال اُس نے اپنی ابتدائی تحقیقات کا مختصر سا خاکہ رپورٹ کی صورت میں پیش کیا۔ ۱۸۹۹ء میں وہ ہندوستانی تعلیمی وزارت کا رکن بنایا گیا۔ اور اسی سال مدرسہ کالج کلکتہ کا پرنسپل بنا کر بھیجا گیا کلکتے میں اُس نے بمشکل ایک سال گذارا ۱۹۰۰ء میں اُس کے میلان طبع کو تلاش و تحقیق کے لئے ترکستان میں ایک وسیع میدان مل گیا۔ ۱۹۰۴ء میں وہ سرحدی صوبے اور بلوچستان کے انسپکٹر جنرل آف ایجوکیشن اور آرکیولاجیکل سروے کے عہدۂ جلیلہ پر متمکن ہوا۔

کہتے ہیں کہ اسٹین دنیا کی متعدد زبانوں کا ماہر تھا۔ اور مختلف زبانوں میں اُس کی تصانیف موجود ہیں۔ اُس کے کارنامے کشمیر کی قدامت اور وسط ایشیا کے بھولے بسرے ماضی کو قعر گمنامی سے نکال کر روشنی میں لانے تک ہی محدود ہیں۔ تیرہ چودہ گھنٹے روزانہ کام کرنا اس کا معمول تھا حصول کامیابی کے لئے اُس نے کبھی دعائیں نہیں مانگیں۔ بلکہ ہمیشہ اپنی جان لڑائی۔

برکس کی طرح اس کا بھی عقیدہ تھا کہ راجپوتوں کی شاندار تاریخی داستانوں کے علاوہ ہندوستان میں اگر کوئی تاریخ لکھی گئی تو وہ کلہن کی راج ترنگنی ہی ہے جس میں حقیقی وقائع نگاری اور مورخانہ غیر جانبداری کی ایسی محیر العقول جھلک نمایاں ہے جو بارہویں صدی عیسوی میں یورپ میں بھی عنقا کا حکم رکھتی تھی۔ کلہن سے ایک صدی قبل البیرونی کو سنسکرت مصنفین سے شعوری

ضروریات کی تسکین کے لئے غیر ضروری لفظی گورکھ دھندوں کی تعمیر کی جو شکایت ہمیں کلہن کی راج ترنگنی میں اس کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا۔

اسٹین سے پہلے بھی راج ترنگنی کے کئی ترجمے اشاعت یاب ہوئے ہیں۔ لیکن کسی نہج انھیں جامع و مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ کلہن کا پہلا مغربی مترجم ٹرائر ہے۔ جو نپولین کی معرکہ آرائیوں میں شریک تھا۔ اور اپنے دوست ولیم نبلینک کے ہمراہ ۱۸۰۰ء میں مدراس آیا تھا۔ ۱۸۲۰ء میں وہ کلکتے میں جا بسا۔ ٹرائر فرانسیسی زبان کا مشہور مصنف تھا۔ ۱۸۶۰ء میں سو سال کی عمر میں اس نے اس دارفانی سے رحلت کی۔ ٹرائر کی طرح ایچ۔ ایچ ولسن نے بھی راج ترنگنی کے بعض حصص کا ترجمہ کیا۔ میکسمولر ولسن کا بڑا مداح تھا۔ اس نے اپنے خطوط میں اس کی بیحد تعریف کی ہے۔ ٹرائر اور ولسن کے تراجم راج ترنگنی کے چھ ابواب پر مشتمل ہیں۔ ۱۸۸۵ء میں بمبئی کے پروفیسر بوہلر نے جسے اسٹین نے اپنا استاد مان کر اپنے ترجمۂ راج ترنگنی کو اس کے نام سے معنون کیا ہے۔ متذکرہ بالا دونوں ترجموں سے کہیں بہتر ترجمہ پیش کیا۔ ۱۸۹۲ء میں اسٹین نے بمبئی میں راج ترنگنی کا مکمل سنسکرت متن شائع کیا۔ ۱۹۰۰ء میں اس نے گیارہ سو صفحات کی دو ضخیم جلدوں میں اس کا ترجمہ، اقتباسات اور تبصرہ شائع کرنے کا فخر حاصل کیا۔ اپنے ترجمہ میں اسٹین نے کلہن کے ایک پیش رو کشیمیندر کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اور کشمیر کا قدیم جغرافیہ بھی شرح و بسط کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ اس کی رائے میں راج ترنگنی ہر لحاظ سے اوویڈ کی "فاستی" کا جواب ہے۔

اب سے تقریباً دو ہزار تین سو سال پیشتر ہیروڈوٹس نے جس خطہ کو کیسپیریا سے تعبیر کیا تھا، تین سو برس پہلے ہیون سانگ نے اپنی سیاحت ہند کے پورے دو سال جہاں بسر کئے تھے۔ کلہن سے ایک صدی قبل البیرونی نے جہاں جنت کا سماں دیکھا تھا اور ۱۰۱۵ء میں جس سرزمین پر البیرونی کے آقا محمود غزنوی نے چڑھائی کی تھی، اسی کشمیر کے چپے چپے کو اسٹین نے متواتر تیرہ برس تک چھانا تھا۔ اس کی اس قدر رجحان بین کے باوجود بھی دنیا کو یہ پتہ نہ چل سکا کہ کلہن کی منظوم تاریخ راج ترنگنی کا ماخذ کیا ہے؟

اسٹین نے کلہن کے صرف دو پیشرؤوں کے نام لئے ہیں، اور ان دونوں کا اس سے نصف صدی پیشتر بقید حیات ہونا تسلیم کیا ہے۔ ان میں سے ایک کا نام بلہن ہے اور دوسرے کا کشیمیندر۔ دونوں بلند پایہ شاعر اور مورخ ہیں۔ وکرمانک دیو کرت بلہن کی مشہور تاریخی نظم ہے۔ برسوں کی آوارہ گردی کے بعد اسے دکن کے چالوکیہ راجاؤں کے دربار میں باریاب ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ کشیمیندر نے اپنی ایک نظم میں جھیل ڈل کی خوبصورتی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی شمالی پہاڑیوں پر جو مقام تری پورہ کے نام سے مشہور ہے، وہیں اس نے اپنی ایک طویل نظم کہی تھی۔

راج ترنگنی میں کلہن کے ایک ہمعصر منکھ کا بھی مذکور ہے جس نے عہد عتیق کی آٹھ صدیوں کو قوت گویائی عطا کی ہے۔ لیکن ان تمام سخنوروں پر کلہن کو فوقیت حاصل ہے۔ اور بحیثیت شاعر بھی وہ دنیا کے چند بڑے شعراء کی صف میں نمایاں جگہ پانے کا مستحق ہے۔

کلہن کا سنہ پیدائش ۱۱۰۰ء بتایا جاتا ہے۔ وہ چمپک کا ہونہار بیٹا تھا، جو مہاراجہ ہرش کا وزیر تھا۔ اس نے اُتکل، سسل اور جے سنگھ جیسے نابرادر تخت گیر راجاؤں کا زمانہ دیکھا تھا۔ وہ قوم کا برہمن اور متمول گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔

اسٹین نے راج ترنگنی کا سال تصنیف ۱۱۴۸ء قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کی تکمیل میں کلہن کے لڑکے جلہن کا بھی ہاتھ ہے۔ مگر اسٹین نے اس روایت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ راج ترنگنی میں کشمیر کے ۱۰۵ حکمرانوں کا حال مندرج ہے۔ ان کے علاوہ ۵۳ ایسے تاجداروں کا بھی مذکور ہے جن کے حالات جلباب خفا میں ہیں۔ کلہن کے بعد بھی کشمیر کی تاریخ لکھی جاتی رہی ہے۔ ان مورخین میں جون راج اور شری ور قابل ذکر ہستیاں ہیں۔ جون راج کو ڈاکٹر پٹرسن کی جانکاہی نے حیات دوام بخش دی ہے۔ راج ترنگنی کی دلچسپ کہانیاں تاریخی نقطۂ نگاہ سے نہایت شاندار ہیں لیکن ان کا تذکرہ دوسری صحبت کا محتاج ہے۔

جلیل احمد صدیقی

گھریلو صنعتوں کا مستقبل

جاپان کے متعلق مشہور ہے کہ وہاں کی چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتیں ہی ملک کی وسیع اقتصادی ترقی کی شہ رگ ہیں۔ ملک کے ہر گاؤں اور ہر قصبے میں طرح طرح کی چھوٹی صنعتیں قائم ہیں۔ جن کی وجہ سے ملک کے لاکھوں آدمی برسر روزگار ہیں۔ پچھلی صدیوں میں جب کہ یورپی ممالک بڑی بڑی فیکٹریاں اور کارخانے قائم کرنے میں محو تھے، جاپانیوں نے گھریلو صنعتوں کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھا اور اپنے دیہات کو ہی اقتصادی کاوشوں کا مرکز بنایا جس کی وجہ سے نہ صرف بڑی صنعتوں کا ہی ہاتھ بٹا بلکہ اُن ہلکی صنعتوں کی پیداوار ایک بڑی تعداد میں غیر ممالک میں بھی بھیجی جانے لگی، جاپان میں صرف ایک گاؤں میں ہی تقریباً ایک ہزار سے زیادہ فیکٹریاں ہیں جہاں ہاتھ سے کاغذ بنایا جاتا ہے۔ ان صنعتوں میں گھر کی عورتیں اور بچے تک اپنے بیکار اوقات میں مشغول رہتے ہیں۔ جنگ ختم ہونے کے بعد ۱۹۴۶ء میں جاپان کے ۴۴ فی صدی کسان زراعتی کاموں کے علاوہ ملک کی چھوٹی چھوٹی صنعتوں میں بھی لگے ہوئے تھے۔ اسی طرح ۱۹۳۰ء میں جاپان کے صنعتی مزدوروں کی تقریباً ۵۰ فی صدی تعداد ایسی گھریلو فیکٹریوں میں لگی ہوئی تھی جن میں کہ پانچ سے کم آدمی ایک جگہ کام کرتے ہیں۔ دوسرے ممالک میں کپڑا بنانے کی صنعت میں عام طور سے مزدوروں کا ایک عظیم اجتماع ہے۔ لیکن جاپان میں ۴۹ فی صدی کپڑا بنانے والے ایسی فیکٹریوں میں ملازم ہیں جن میں کہ دس سے کم آدمی کام کرتے ہیں۔ در حقیقت جاپان کی ساری صنعتی پیداوار کی جان اس کی گھریلو صنعتیں ہی ہیں۔ جاپان ہی پر منحصر نہیں۔ بلکہ دنیا کے ہر ترقی یافتہ ملک میں بڑی صنعتوں کے دوش بدوش چھوٹی دستکاریوں کو بھی ترقی دی جاتی ہے۔ تاکہ ملک کے معاشی نظام میں ایک قسم کا صحیح توازن قائم ہو سکے۔ جو صنعتی اقتدار کے لئے بے حد ضروری ہے۔ علاوہ ازیں ملک کے بیکاروں کو روزی بہم پہنچانے، دیہاتی زندگی کو بہتر بنانے اور مقامی خام اشیا کو صحیح استعمال میں لانے کے لئے بھی گھریلو صنعتوں کے قیام کی ضرورت ہوتی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ برطانیہ کے سے ملک میں بھی جہاں بڑی بڑی فیکٹریوں کا دور دورہ ہے، ابھی تک بہت سی چھوٹی چھوٹی صنعتیں سرسبز ہیں جو بڑی صنعتوں کے مخالف ہونے کے عوض ان کی معاون ہیں مثال کے طور پر شیفیلڈ میں چھچے اور کانٹے بنانے کی صنعت، وارکیسٹر میں دستانے اور ناٹنگھم میں بیل اور موزے بنانے کی دستکاریاں اب بھی زندہ ہیں۔ اور ان کا مال بڑی تعداد میں باہر بھیجا جاتا ہے اسی طرح جاپان میں سائیکلیں اور فاؤنٹین پن، سوئٹزرلینڈ میں گھڑیاں اور ٹائپ رائٹر، اور سیکسونی میں آلات موسیقی چھوٹی چھوٹی گھریلو فیکٹریوں ہی میں بنائے جاتے ہیں۔ جرمنی میں بھی ۱۹۳۳ء میں ملک کی ۹۲ فی صدی صنعتی پیداوار بیس آدمیوں سے کم کام کرنے والی فیکٹریوں میں تیار ہوتی تھی۔

ہندوستان کے اقتصادی نظام میں بھی گھریلو صنعتوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس اہمیت کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ صرف ہاتھ سے کپڑا بنانے کی صنعت ہی میں تقریباً ساٹھ لاکھ آدمی لگے ہوئے ہیں۔ جو کہ سالانہ آٹھ کروڑ روپے کا کپڑا بناتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری صنعتوں میں بھی ملک کے کروڑوں آدمی اپنی روزی کما رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی ملک کی وسیع آبادی اور کثیر ذرائع کے لحاظ سے ہماری گھریلو صنعتیں تسلی بخش نہیں ہیں۔ صحیح تنظیم اور عالی استحکام کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ ہماری یہ صنعتیں اب سے کئی گنا زیادہ آدمیوں کے لئے روزی نہ فراہم کر سکیں۔ اس کے علاوہ گھریلو صنعتوں کی ترقی میں ہمارے ملک کی ڈالر کی دشواریوں کا حل پوشیدہ ہے۔ آج ہندوستان کی اقتصادی مشکلات پر عبور حاصل کرنے کے لئے گھریلو دستکاروں کے پورے اشتراک کی ضرورت ہے چھوٹی چھوٹی صنعتوں کا قیام نہ صرف اس لئے ضروری ہے کہ ایک گم شدہ عظمت کو پھر حاصل کیا اور ان صنعتوں کی پیداوار کی خوبصورتی، آرٹ اور سبک پن کو قائم رکھا جائے بلکہ ان کے ذریعہ سے بے روزگاری کے مسئلے کو بڑی حد تک سلجھایا جا سکتا ہے اور اس طرح رہنے سہنے کا ایک اونچا معیار قائم ہو سکے گا۔ چھوٹی صنعتوں کی ترقی

اور مضبوطی ہمارے ملک کے صنعتی استحکام کے لئے لازمی امر ہے۔ درحقیقت گھریلو صنعتوں کی ترقی ہی ہماری موجودہ اقتصادی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ آج ڈالر کی کمی کی وجہ سے دنیا کا ہر ملک پریشان ہے۔ ہندوستان میں اس دقت کو دور کرنے کے لئے سب سے کارگر حل گھریلو صنعتوں کی ترقی ہے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد گھریلو صنعتوں کی پیداوار کے کافی تعداد میں باہر بھیجنے سے ڈالر پر اختیارات حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اور اس طرح ہندوستان کے Balance of overseas payments کی دشواریوں کو دور کیا جاسکتا ہے۔ نیز یہ کہ لاکھوں آدمی جو تبادلہ آبادی کی وجہ سے بے گھر ہوگئے ہیں ان کو پھر سے بسانے اور ان کی معاشی زندگی درست کرنے کے لئے گھریلو صنعتوں سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ ہندوستان کی بڑی صنعتوں میں زیادہ سے زیادہ ایک فی صدی لوگ برسر روزگار ہیں۔ ظاہر ہے کہ بڑی صنعتیں تمام لوگوں کو نہیں کھپا سکتیں اور موجودہ صورت میں ایسی صنعتوں کا قیام بھی بہت دشوار ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے چھوٹی چھوٹی صنعتوں کا قیام اور ان کی ترقی از حد ضروری ہے۔ اسی سے ہم اپنے ملک سے بیکاری کو دور کرسکتے ہیں۔ اور خاص طور سے دیہات کی معاشی اور سماجی زندگی میں ایک انقلاب پیدا ہوسکتا ہے۔ یو۔ پی اور دوسرے صوبوں میں زمینداری کے خاتمے نے اس ضرورت کو اور بھی شدید بنا دیا ہے۔ زمینداریاں ختم ہونے کے بعد لاکھوں آدمیوں کو شائستہ اور باعزت پیشوں کی ضرورت ہوگی جن کے ذریعے سے وہ اپنی روزی فراہم کرسکیں گے۔

ہماری زراعت کی گوناگوں خرابیوں اور کاشتکار کی زبوں حالی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اُسے سال کے ایک طویل حصے میں بیکاری سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایک فصل کے بونے اور کاٹنے کے درمیان جو وقفہ ہوتا ہے اس میں ہمارے کسان عام طور پر بیکار رہتے ہیں۔ اور کوئی ایسے معاون اور قائم مقام پیشے نہیں جن میں کہ وہ اپنے وقت کو کارآمد بنا سکیں۔ اگر ان کے دیہات اور قصبوں میں چھوٹی چھوٹی صنعتیں موجود ہوں تو وہ بآسانی زراعت سے فرصت پانے کے بعد ان میں کام کرسکتے ہیں۔ اس طرح گھریلو صنعتوں کا قیام زراعت کی خوش حالی کے لئے بھی معاون ہے۔ زراعتی ملکوں کا تو ذکر ہی کیا۔ بڑے بڑے صنعتی ملکوں میں بھی گھریلو صنعتوں کو ترقی دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر برطانیہ میں لنکاشائر کے قریب بہت سی گھریلو صنعتیں ہیں تاکہ بڑی فیکٹریوں کے ملازم وہاں کام ختم ہو جانے کے بعد ان میں کام کرسکیں۔ یقیناً دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان میں ایسے قائم مقام اور معاون پیشوں کی کہیں زیادہ ضرورت ہے۔

زمانۂ حال کے اشد ضروری وجوہ کے علاوہ ہندوستان کا اقتصادی نظام گھریلو صنعتوں کے پروان چڑھنے کے لئے بہت مناسب ہے۔ غالباً دنیا کے کسی ملک میں گھریلو صنعتوں کا مستقبل اتنا امید افزا نہیں۔ ہمارے ملک میں طرح طرح کی گھریلو صنعتوں کے لئے خام اشیا کی بڑی فراوانی ہے۔ ہر جگہ کی خام اشیا، سرمائے اور ہنر کی مدد سے بہت سی چھوٹی صنعتیں بآسانی قائم کی جاسکتی ہیں مثلاً تعداد چھوٹی صنعتیں ایسی ہیں جو کہ بآسانی گھروں پر بجلی کی مشینوں سے چلائی جاسکتی ہیں۔ علاوہ ان صنعتوں کے آئندہ یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سی بڑی صنعتوں کو بھی چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم کیا جاسکے۔ اس وقت یہ کوئی ضروری امر نہیں کہ صنعت سازی لازمی طور پر بڑے پیمانے ہی پر کی جائے۔ بلکہ یہ کہیں بہتر ہے کہ بڑی صنعتوں کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح ایک بڑی چیز کی پیداوار مجموعی طور پر کئی جگہ ہوسکتی ہے۔ اسی طرح فاؤنٹین پن۔ گھڑیاں۔ ٹائپ رائٹر۔ چاقو چھری۔ چمڑے کا سامان۔ بوتلیں۔ کاغذ اور ٹین کے ڈبے۔ کھلونے۔ چینی کے برتن۔ سائیکلیں۔ سینے کی مشین۔ بانس کا سامان۔ فرنیچر۔ تالے۔ بٹن اور بکسے۔ چوڑیاں۔ عطر و تیل۔ اور دوسری بہت سی چیزیں گھریلو طریقے پر طیار کی جاسکتی ہیں۔ حال ہی میں حکومت ہند کی طرف سے ایک مشن جاپان کی گھریلو صنعتوں کا معائنہ کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس مشن نے ہندوستان کے لئے چالیس چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے قیام کی رائے دی ہے۔ جن میں کہ سوئی اور پن بنانے سے لے کر بانس کا سامان بنانے اور غذائی اشیا کی صنعتیں تک ہیں۔ مشن کا خیال ہے کہ جاپان کے طرز پر ہندوستان میں گھریلو صنعتیں قائم کرنے سے بڑا فائدہ ہوسکتا ہے۔ مشن نے وہاں سو مختلف صنعتوں کا معائنہ کیا۔ جن میں سے بہت سی صنعتیں بآسانی ہندوستان میں شروع کی جاسکتی ہیں۔ جنگ سے تباہ ہونے کے بعد جاپان کی قومی زندگی کی از سر نو تعمیر کے لئے اس کی گھریلو صنعتیں ہی کام آئی ہیں۔ باوجودیکہ ایٹم کی وجہ سے ہیروشیما کی ساری زندگی تباہ و برباد ہو چکی تھی لیکن تھوڑے سے ہی زمانے میں اس شہر نے اپنی سوئی بنانے کی صنعت کو پھر سے جاری کر لیا ہے اور تقریباً دو سال سے ہندوستان کو سوئیاں بھیج رہا ہے۔ ہر سال تقریباً تین

کمرب تیں کی سو بیاں اس شہر سے باہر بھیجی جاتی ہیں۔

گھریلو صنعتوں کے کہنہ طریقوں میں ایک زبردست انقلاب کی ضرورت ہے یہ انقلاب اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہمارے دستکاروں کو مشینری کی عادت ڈالی جائے۔ کچھ تعلیم کی کمی کی وجہ سے کچھ روایات کے باعث ہمارے دستکار مشینری کے استعمال سے بے نیاز ہیں۔ اور اکثر موقعوں پر مشینری کے استعمال کی مخالفت بھی کی گئی ہے۔ یہ چیز حوصلہ شکن ہے۔ گھریلو صنعت کی پیداوار میں مضبوطی نفاست اور سبک پن پیدا کرنے کے لئے چھوٹی چھوٹی مشینوں کا استعمال ضروری ہے خوش قسمتی سے ایسی مشینیں دوسرے ملکوں میں بے انتہا کم قیمت پر دستیاب ہو سکتی ہیں۔ ان مشینوں کے استعمال کے بعد یہ ممکن ہے کہ ہمارے کاریگر اپنے تجربہ کی مدد سے اور اپنی ضرورتوں کے تحت ان میں اختراعات کر سکیں اور آگے چل کر یہ مشینیں ہمارے ملک ہی میں بنائی جانے لگیں حکومت ہند کے مشن نے صلاح دی ہے کہ مرکزی حکومت کی نگرانی میں ایک سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی بنا ڈالی جائے جس میں کہ باہر کے ملکوں سے حاصل کی ہوئی جدید جدید مشینوں پر ریسرچ اور معلومات کی جائیں۔ اور صوبائی حکومتوں، کاریگروں اور دلچسپی رکھنے والے عوام کو انھیں دیکھنے اور ان کے متعلق رائے زنی کرنے کی دعوت دی جائے تاکہ یہ مشینیں ان لوگوں میں عام ہو سکیں اور ان کے استعمال کا شوق پیدا ہو۔ مشن کا خیال ہے کہ ہر سال صرف جاپان سے ہی کم از کم پانچ لاکھ ڈالر کی مشینری ہندوستان میں منگانا چاہیئے۔ اس کے علاوہ صنعتی تعلیم عام کرنے کے لئے سائنس کے میوزیم سینما ریڈیو، مائیکروفون اور کتابوں اور رسالوں سے بڑی مدد ملے گی۔ جاپان کی چھوٹی صنعتوں کی ترقی ایک بڑی حد تک صنعتی تعلیم پر منحصر ہے اس ملک میں تعداد دو سو پولی ٹیکنک اور ایک درجن فنی تعلیم کے اسکول قائم ہیں جن کے ذریعے سے سارے ملک میں صنعتی تعلیم کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔

گھریلو دستکاریوں کی ترقی کے سلسلے میں سب سے اہم پہلو ان کی پیداوار کی باہر کے ملکوں کو برآمد ہے۔ کیونکہ جب تک ہم ان چھوٹی چھوٹی صنعتوں کی پیداوار کو کافی تعداد میں باہر نہیں بھیج سکتے اس وقت تک ان صنعتوں سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ ان کے سامانوں کو تھوڑی تعداد میں باہر بھی ملکوں میں بھیجے سے ہندوستان میں فنکار کی دستکاریوں پر عبور حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس چیز سے کسی کو انکار نہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی

کی حکومت نے پہلے ہندوستان کی مختلف دستکاریوں کا سامان نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ کے بازاروں میں بھی مشہور تھا۔ اور ہندوستان کی بیرونی تجارت کا بڑا حصہ ان دستکاریوں کی پیداوار ہی پر مشتمل تھا۔ اس زمانے میں ان کی ترقی کا سبب کچھ ہی رہا ہو لیکن اس میں وقت کے حکمرانوں کا بڑا حصہ تھا۔ ہوشیار اور ہنر مند صنعت گروں کو مالی امداد دینے کے علاوہ ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ بدیسی حکمرانوں کے ہاتھ میں باگ ڈور آتے ہی ان ہنرمندوں کی طرف سے نظر بدلی۔ اور ان کی ترقی کے تمام ذرائع بند کر دیئے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صنعتیں جن کی پیداوار ایک زمانے میں خوبصورتی اور اچھوتے پن کا نمونہ تھی ایک ایک کر کے ختم ہوتی گئیں اور جو باقی رہ گئیں لیکن کی حالت بھی کچھ بہتر نہیں رہی۔ بلاشبہ ہندوستان کے اقتصاد کی تاریخ میں یہ بات قابل افسوس ہے کہ محض حکمرانوں کی بے پروائی اور بے اعتنائی سے ملک کے معاشی نظام میں گھریلو صنعتوں کے لئے کوئی قابل قدر جگہ باقی نہیں رہی۔

ان تمام کوتاہیوں کے باوجود ہماری چھوٹی صنعتوں کی چیزیں آج کل بھی مغربی ممالک میں کافی پسند کی جاتی ہیں۔ قالین بنانے کی صنعت ہمارے ملک میں پندرھویں صدی سے قائم ہے۔ اس کا سب سے قدیم تذکرہ ابوالفضل کے "آئین اکبری" میں ملتا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صنعت مغلوں کے زمانے میں بھی اپنے شباب پر تھی۔ یہ قالین دنیا کے ہر حصے میں مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کی بنی ہوئی دریاں۔ ہاتھ کا بنا کپڑا۔ پیتل کے نقشی برتن۔ ہاتھی دانت کا سامان۔ آبنوس کے نقش و نگار اور سنگ مرمر کے مرقعے دنیا کے بازاروں میں پسندیدہ ہیں۔ حال ہی میں دوسرے ملکوں میں "جو صنعتی اقدام ہم بنا سکتے ہیں" کے سلسلے کی نمائشیں ہوئی ہیں ان میں باہر کے لوگوں نے ہماری گھریلو صنعتوں کی پیداوار میں بڑے ذوق و شوق کا اظہار کیا ہے

اس بات سے یہ امید ہے کہ بہت جلد ہم بھی جاپانیوں کی طرح کافی بڑی تعداد میں سامان گھریلو طور پر طیار کر کے باہر بھیج سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دیرینہ تمدن میں نفیس گھریلو دستکاریوں کا پس منظر تو موجود ہی ہے۔ بس ایک دفعہ اعجاز مسیحائی سے روح پھونکنے کی ضرورت ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہماری دستکاریاں پھر اسی طرح ممتاز نہ ہوں جیسے کہ پہلے تھیں اور وقت کو جو ہمارے ہنرمندوں کے ذوق اور نفاست

کی مثال پیش کریں۔ اور سب سے بڑھ کر ہماری اقتصادی مشکلات کا حل فراہم کر دیں۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اپنی گھریلو صنعتوں کا مال بڑی تعداد میں باہر بھیجنے کی امید رکھیں۔ بہت سی باتوں پر غور کرنا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے ضروری چیز معیار ہے۔ یعنی یہ کہ چیزیں مقدار اور صنعت کے لحاظ سے کسی ایک مقررہ معیار کے مطابق بنانا چاہئیں چیزوں کو معیار کے مطابق بنانے کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ اس سے بنانے اور استعمال کرنے والوں دونوں ہی کو سہولت ہو۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ گھریلو چیزوں کو بالکل فیکٹری کی بنی ہوئی چیزوں کی طرح یکساں کر دیا جائے۔ بہت سی گھریلو دستکاریوں میں اگر معیار کی بندشیں بہت سخت کر دی جائیں تو ان کی ساری جاذبیت ہی فنا ہو جائے۔ اور اچھوتے پن کے مشتاق ان چیزوں کا استعمال ترک کر دیں۔ مثال کے طور پر بڑھیا قسم کے قالین اور کپڑے۔ نقشین برتن۔ اور پتھر اور لکڑی کی چیزوں میں مطابقت کی پابندی کچھ سود مند نہیں۔ ان چیزوں کی پسندیدگی اور مقبولیت کے واسطے سب سے ضروری چیز ان کی انوکھی خوبصورتی ہے۔ اسی صنعت کی وجہ سے گھریلو دستکاریاں مشہور تھیں اور کاریگر خوشحال تھے۔

گھریلو صنعتوں کی پیداوار کو باہر کے ملکوں میں مقبول بنانے کے لئے کسی ایسی انجمن کے قیام کی ضرورت ہے جو کلیتہً بدیسی تجارت سے متعلق ہو۔ اور جس کی تمام تر کوشش اس بات پر صرف ہو کہ ان صنعتوں کا مال زیادہ سے زیادہ باہر بھیجا جائے۔ حکومت ہند کے مشن نے بھی اس قسم کی انجمن پر بڑا زور دیا ہے۔ مشن نے ایک سنٹرل فارن ٹریڈ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کی رائے دی ہے جو گھریلو صنعت سازوں سے براہ راست تعلق رکھے گا۔ تاکہ ان کو بدیسی خریداروں کی ضروریات کا اندازہ ہوتا رہے۔ اور وہ بلحاظ ضرورت اپنے سامانوں میں تبدیلی پیدا کرتے رہیں۔ مشن نے بڑے بڑے صنعتی مرکزوں میں ایسے مستقل میوزیم کھولنے کی بھی رائے دی ہے جہاں کہ قابل برآمد اشیاء دکھائی جا سکیں۔ اور جہاں غیر ممالک کے نمائندوں کو وقتاً فوقتاً دعوت دی جائے تاکہ وہ یہاں کی بنائی ہوئی چیزوں سے آگاہ رہ سکیں۔ اس کے علاوہ بدیسی ملکوں کے بڑے شہروں اور وہاں کے اچھے ہوٹلوں۔ یونیورسٹیوں اور صنعتی تعلیم گاہوں میں بھی اس قسم کے میوزیم کھولے جائیں جن کی نمائش خاص خاص موقعوں مثلاً کرسمس اور صنعتی میلوں پر کی جائے۔ ہندوستان کے سفارتخانوں میں بھی گھریلو صنعتوں کا سامان رکھنا ضروری ہے ان تمام تجویزوں کا مقصد اپنی دستکاریوں کو باہر کے ملکوں میں مقبول بنانا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں مختلف ملکوں میں جو صنعتی نمائشیں ہوئی ہیں ان کے ذریعے سے ہماری گھریلو صنعتوں کا مال مقبول ہو رہا ہے اور بہت سے ملکوں نے جن میں کناڈا قابل ذکر ہے بڑی تعداد میں اس قسم کا سامان منگانے کیلئے آرڈر بھی دیا ہے

تجارتی فصلوں کی ضرورتوں کی طرف خاص توجہ

نئی دہلی ۱۰ جنوری۔ جولائی ۱۹۴۹ء سے جون ۱۹۵۰ء کے سال میں امونیم سلفیٹ تقسیم کرتے ہوئے تجارتی فصلوں کی ضرورتوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اب تک جو مقدار مہیا ہوئی ہے اس کا ایک تہائی حصہ یعنی ۸۰ ہزار ٹن امونیم سلفیٹ چائے۔ کافی۔ پٹ سن اور کپاس کی فصلوں کے لئے دیا گیا ہے اس کی حسب ذیل تقسیم کی گئی ہے۔ چائے کی فصل کے لئے تیس ہزار ٹن۔ کافی کی فصل کے لئے پانچ ہزار ٹن۔ پٹ سن کے لئے پندرہ ہزار ٹن اور کپاس کے لئے دس ہزار ٹن۔ اس کے علاوہ جنوبی ہندوستان کی یونائٹڈ پلانٹرز ایسوسی ایشن کے لئے تین ہزار ٹن امونیم سلفیٹ دیا گیا ہے۔ کپاس کے لئے مزید امونیم سلفیٹ دینے پر غور ہو رہا ہے اس سلسلے میں حکومت ہند کو کپاس کی صنعت کی ساری ضرورتوں کی اطلاع مل جانے پر فیصلہ کیا جائے گا۔

پیداوار بڑھانے کی مہم کے لئے صوبائی اور ریاستی حکومتوں کے لئے قریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار ٹن امونیم سلفیٹ منظور کیا جا چکا ہے روپیہ کی قیمت گھٹ جانے سے ڈالر کے ممالک میں امونیم سلفیٹ کا بھاؤ زیادہ ہو گیا۔ اس لئے اس سال زمین کی زرخیزی بڑھانے والی شیا کی درآمد کو کم کرنا پڑا۔ چنانچہ صوبائی اور ریاستی حکومتوں کے مطالبے مکمل طور پر پورا نہ کیا جا سکے۔

اختر تاباں

یہ علی گڑھ ہے

ابھی علی گڑھ اسٹیشن آنے میں دیر تھی۔ میں نے اسباب ٹھیک کرنا شروع کر دیا۔ چہرے پر خوشی کے ساتھ ساتھ پریشانی کے آثار بھی نمایاں تھے جس کا اظہار حرکات و سکنات کی صورت میں ہو رہا تھا۔ چنانچہ بکس کھول کر لوٹا گلاس اس میں احتیاط کے ساتھ رکھ دیئے اور بستر بند میں اٹیچی کیس رکھ کے اُسے خوب کس کر باندھ دیا۔ اسٹیشن جیسے جیسے قریب آ رہا تھا دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ طوفان میل پر شک تھا کہ منزلِ مقصود پر پہونچاتا بھی ہے یا نہیں اور کچھ اس وجہ سے کہ ٹکٹ کہیں رکھ کر بھول گیا تھا باوجود دماغ پر زور ڈالنے کے کچھ یاد نہیں پڑتا تھا کہ کس جگہ ہے۔ البتہ اتنا یقین تھا کہ ٹکٹ لیا ہے اور نہ بھی یا تا کے نرخ پر یعنی کچھ روپے پندرہ آنے کا۔ ادھر سب سے زیادہ پریشانی یہ تھی کہ معلوم نہیں بیگم کا کیا حال ہے کیونکہ اُنھوں نے سونے میں سارے یو۔ پی کا ریکارڈ مات کر دیا تھا اور چنانچہ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں منزلِ مقصود پر اُتر گیا اور اُنھیں تار دے کر اگلے اسٹیشن پر بیدار کروایا۔ بی۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد ارادہ تھا کہ ایم۔ ایس۔ سی کروں چنانچہ اسی خیال سے معہ بیگم آیا تھا تاکہ وہ پکا پکا کر کھلائیں۔ اور میں کھا کھا کر پڑھوں۔ سسرال والوں نے اس بات کی مخالفت بھی کی اور یہاں تک زور ڈالا کہ یہ معاملہ ریفرینڈم کے ذریعے سے طے کیا جائے لیکن میں تو یہ جانتا ہوں کہ اگر اپنی چیز اپنے پاس رہے تو انسان ہر طرح کی بدگمانی سے محفوظ رہتا ہے ورنہ بصورت دیگر یو۔ این۔ او بھی کچھ نہیں کر سکتی۔

میں ابھی اسی ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ گاڑی کی رفتار میں کمی آنے لگی۔ جلدی جلدی دروازے کے سامنے سامان جمع کرنا شروع کر دیا تاکہ قلیوں کو زیادہ دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اتنے میں گاڑی ایک دھکے کے ساتھ رک گئی۔ لیکن ابھی میں گاڑی سے پوری طور پر اترا بھی نہ تھا یعنی ایک پاؤں فٹ بورڈ پر تھا اور دوسرا پلیٹ فارم پر کہ ایک صاحب جو کپڑوں سے خوش پوش اور کریم سے خوش رُو نظر آ رہے تھے۔ آ دھمکے۔ شیروانی سے معلوم ہوتا تھا کہ پہنی نہیں ہے بلکہ کسی نے آپ کو شیروانی میں مقفل کر دیا ہے۔ کالر کی چوڑائی سے گمان ہوتا تھا کہ ابھی ابھی زنجیر تڑا کر آئے ہیں۔ سر پر ایک لال ٹوپی منڈھی ہوئی۔ پاؤں میں موزہ، موزے پہ جوتا اور جوتے پہ پالش۔ ایک ہاتھ میں چھڑی اور دوسرے ہاتھ کی نازک کلائی پر جس کا بیمہ کرا لیتے تو بہتر تھا۔ تین انگل چوڑے پیٹے کی مدد سے ایک جنوبی بندھی ہوئی جو شاید طوفان نوح کے زمانے میں تو وقت بتلا سکتی ہو لیکن اب بالکل بیکار تھی۔ مونچھیں بالکل گاؤدم جو سائیکل کے سلوشن کی مدد سے نوکیلی کی گئی تھیں چلتے تو معلوم ہوتا کہ چوتھی کی دُلھن آنچل سنبھالے شرماتی اٹھلاتی چلی آ رہی ہے۔

میری طرف مخاطب ہو کے کہنے لگے "آئیڈنٹٹی کارڈ پلیز"۔

"جی"؟ میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔ انہوں نے اپنا جملہ دہرا دیا۔

میں نے دریافت کیا "کیوں صاحب! یہاں سے آگرہ قریب ہے کہ بریلی؟"

کہنے لگے "میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ اپنا کارڈ دکھلایئے"۔

عرض کیا "قبلہ آج اتوار کی وجہ سے پوسٹ آفس بند ہے۔ کل آپ ایک نہیں دو کارڈ لے لیجیے گا"۔

"اجی جناب میں آئیڈنٹٹی کارڈ مانگتا ہوں۔ آئیڈنٹٹی کارڈ۔ آپ اتنا بھی نہیں سمجھتے؟ کس ایئر میں پڑھتے ہیں؟"

"۱۹۴۹ء میں"۔

"نان سینس" وہ بگڑ کر بولے "آپ کالج میں پڑھتے ہیں؟"

"جی نہیں" میں نے واقعات کو طول دینا مناسب نہ سمجھا کیونکہ سگنل ہونے والا تھا اور بیگم کو بھی اُتارنا تھا۔

"اوہ معاف کیجئے گا" وہ ناخوشی کے بدلے مسکرانے لگے میری بزرگی

کرنے کے لئے جانے والے کو فوراً آواز دی۔ میں نے بھی موقع غنیمت جانا اور ان پر رعب جماتے ہوئے ڈانٹ کر کہا "کیوں صاحب! یہی آپ کی تہذیب ہے؟ کیا اسی طرح پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر چلائے پی جاتی ہے؟"

اب تو وہ بہت خفیف ہوئے۔ ہنستے ہنستے یکایک خوش الحانی کے ساتھ رونے لگے اور پھر ایک دم سے اچھلے اور گیٹ کے باہر۔ اس چرب میں کافی وقت لگ گیا۔ چنانچہ اترتے ہی زنانے ڈبہ کی طرف لپکا۔ دیکھا تو محترمہ سو رہی ہیں۔ اپنے نام کے حوالے سے انہیں آواز دی مگر وہ حوا کی بیٹی پھر بھی نہ چونکی۔ دوبارہ چلا کر کہا "بیگم آج تو اٹھ جاؤ۔ کل سے تمہیں جگانے کے لئے واٹلن اور پیانو کا انتظام کر دیا جائے گا۔" لیکن صاحب عورتیں کہیں اتنی جلدی خواب غفلت سے بیدار ہوتی ہیں؟ بجبوراً ایک اور صاحبہ کی مدد حاصل کرنا پڑی۔ جن کے متعلق یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ انہوں نے پوڈر پر کریم لگائی ہے یا کریم پر پوڈر۔ خدا خدا کر کے وہ گاڑی سے اتریں قلیوں نے ان کا چولھا چکی اتارا۔ ایک نہایت راز کی بات اس معاملے میں بتا دوں۔ عورتیں جب تک اپنے ہمراہ سل۔ بٹہ۔ چولھا۔ چکی۔ مٹی اناج اور ممنوعہ چیزیں لے کر نہیں چلتیں تب تک ان کو اطمینان ہی نہیں ہوتا کہ ہم نے سفر کیا ہے اور اگر بظاہر کوئی عورت ایسی چیزیں لے کر نہ بھی چلے تو یقین مانئے۔ اس کے بکس میں ضرور حیا کی ڈیپارٹمنٹ چھپا ہوگا۔ بیچاری اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہے۔

قلیوں نے پوری طرح سامان اپنے سر پر رکھا بھی نہ تھا کہ ایک لیڈی ٹکٹ کلکٹر صاحبہ نہ معلوم کہاں سے ٹپک پڑیں۔ بیوی کا نقاب الٹ کر کہنے لگیں "ٹکٹ پلیز" میں اس بے تکلفی پر بہت حیران ہوا۔ لیکن ان سے نہایت عاجزی کے ساتھ گڑگڑا کر کہا "اے ملکہ اپ رینڈ ڈاؤن! آپ کو بس ٹکٹ ہی تو چاہئے پھر آخر یہ نقاب الٹنے کی کیا ضرورت تھی؟"

فرمانے لگیں "شاید آپ کو نہیں معلوم۔ یہ علی گڑھ ہے۔ یہاں پردہ کرنے والوں کا دفعہ ۴۴۴ میں چالان کیا جاتا ہے"

"تو پھر اس خاکسار کے لئے برقع کا انتظام کرا دیا ہوتا؟"

"آرڈر از آرڈر۔ ٹکٹ دکھلائیے؟"

سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں کیونکہ کلکٹرنی صاحبہ بُری طرح پیچھے پڑی ہوئی تھیں۔ باوجود دماغ پر زور ڈالنے کے پتہ نہ چل سکا کہ ٹکٹ کہاں رکھ دیا ہے۔ زمانہ بھی بڑا نازک تھا۔ بلا ٹکٹ چلنے پر نہ صرف جرمانہ نہیں بلکہ جیل بھی۔ یہاں تو خیر جیل جانے سے ڈرتے نہیں کیونکہ

ع "عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں"

لیکن بیگم کی طرف سے بڑی فکر تھی۔ کون گوارا کر سکتا ہے کہ "چراغ خانہ" "شمع جیل" بنے۔ کتنے شرم کی بات تھی کہ عدالت میں جج صاحب پکاریں کہ "مسماۃ زہرہ زوجہ ــ؟ کوئی واہیات سا نام سوچ لیجئے ــ کو حاضر کیا جائے۔ اور اگر فرض کیجئے کہ زہرہ جیل میں بند کر دی جائے تو بس سمجھ لیجئے کہ سسرال کی خاطر مدارت، سالیوں کا مذاق، خسر کا پیار، ساس کا دلار، بیگم کی سہیلیوں کے چوچلے سب کا خاتمہ ہے۔ لیکن یہ سب کچھ تصورات کی دنیا تک محدود رہا۔ کیونکہ قبل اس کے کہ جیل خانے یا جرمانے کی نوبت آئے میں نے جوتے اتار کر دونوں ٹکٹ کلکٹرنی کو دے دیئے۔ خدا نے بھی کیسے مشکل موقع پر مدد کی۔ میرا یہ دستور رہا ہے کہ جیب کتروں کے ڈر سے روپئے اور ٹکٹ ہمیشہ جوتے کے اندر رکھ لیتا ہوں مگر نہ جانے کھلنے سے ٹکٹ دکھلانے کے عمل تک "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے" کی مصداق بنی رہیں۔

تانگہ عبدالخالق روڈ پر فراٹے بھرنے لگا۔ میں اپنے خیالات میں منہمک ہو گیا۔ اس وقت میں یہ سوچ کر رہا تھا ــ کالج کے نوے فی صدی طلباء کالج کی لڑکیوں سے بیزار ہوتے ہیں ــ کہتے ہیں۔ کہ ایسی لڑکیاں عشق کے لئے موزوں ہوتی ہیں۔ لیکن شادی کے لئے بیکار ــ سمجھ میں نہیں آتا، ان لڑکوں کی عقلوں پر پتھر کیوں پڑ گئے ہیں ــ خود سوچیں کہ اگر وہ ان سے شادی نہ کریں گے تو کیا جاہل گنوار ــ یا پھر گائے بھینس سے کریں گے ــ ارے بھائی شادی تم کرو، نسخہ ہم بتائے دیتے ہیں ــ اگر آپ بی۔ اے ہیں۔ تو ساٹھ روپئے کی نوکری تو کہیں گئی نہیں ــ بس چالیس کا ایک باورچی رکھ لو ــ اور ــ اور بیس میں دونوں میاں بیوی ــ؟

"حضور یہ یہاں کا گھنٹہ گھر ہے۔" میری تھیسس نامکمل رہ گئی۔ تانگے والے نے مجھے خیالات کی دنیا سے چونکا دیا۔ سڑک کے کنارے ایک فقیر بیٹھا گا رہا تھا۔ میں نے تانگہ رکوا کر اس کو پیسے دیئے۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر واپس کر دیئے "مائی باپ! یہ علی گڑھ ہے۔ ہم یہاں پیسے لینے تھوڑی بیٹھے ہیں۔ ہمارا کام تو راہ گیروں کو تازہ ترین فلمی گانے سنانا ہے"

تانگہ پھر چلنے لگا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے سے دو تین عورتیں ماتمی لباس پہنے چلی آ رہی ہیں۔ مجھے ان لوگوں پر ترس آ گیا۔ خصوصاً ایک لڑکی تو کافی کمسن تھی۔ آہ۔ سب کی سب نوعمر تھیں۔ نہ معلوم کس گناہ کی پاداش میں بیوگی کی لعنت ان کے سر تھوپی گئی تھی۔ ان کے تو ابھی کھیلنے کھانے کے دن تھے اور چین اور اطمینان سے سونے کی راتیں۔ انہیں پُر درد خیالات کی رو میں دل بے قابو ہو گیا۔ میں نے ترقی پسند ہونے کی حیثیت سے سب سے پہلے سماج کو پانچ چھ موٹی موٹی گالیاں دیں پھر سوسائٹی کے ان فرسودہ اصول کو "کہنہ ناسور" تصور کرتے ہوئے تہیہ کیا کہ مزدوروں کی بیواؤں کے لئے اپنی جان و مال وقف کر دوں۔ میں ابھی نوجوان ہوں میری رگوں میں گرم گرم خون دوڑ رہا ہے۔ مجھے اس دنیا میں انقلاب لانا ہے۔ کوشش کروں گا کہ وہ "بلڈلیس" قسم کا ہو لیکن اگر میرا بس نہ چلا تو دنیا بھر کا خون کر دوں گا۔ اپنے نام سے اپنا تخلص نکال دوں گا۔ اور چلا چلا کر کہوں گا کہ لوگو بیوہ کا نکاح ثانی کرو — بیوہ کی شادی تمہارا فرض اولین ہے۔ پہلے بیوہ کی شادی کرو۔ بعد میں "من کی جیت" کا میٹنی شو دیکھو — انقلاب زندہ باد — بیوہ کی شادی زندہ باد — باقی سب مردہ باد — فقط آپ کا خادم — ؟ ؟"

میں تانگے سے گرتے گرتے بچا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ تانگے والے نے دیکھ لیا ورنہ ان کمبخت نعروں نے میری جان ہی لے لی ہوتی۔ وہ میری اضطرابی کیفیت پہلے ہی سے تاڑ چکا تھا۔ چنانچہ اس نے نہایت ہمدردانہ طریقے سے پوچھا "کیا بات ہے بابو صاحب؟" "کچھ نہیں" میں بولا اور اپنی آنکھ سے آنسو پونچھنے لگا۔ بیوی بھی تاڑ گئی کہ معاملہ دال میں کچھ کالا سا ہے عورت ویسے بھی بڑی بدگمان ہوتی ہے۔ وہ جو ایک بات میرے دل میں خیال کے طور پر آئی تھی وہ میری بیوی کے دل میں یقین کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ آخر نہ رہا گیا اور پوچھ ہی لیا۔ "آخر روتے کیوں ہو؟ دھن دولت کی کمی نہیں۔ ماں باپ موجود ہیں۔ بیوی مل ہی گئی ہے۔ خدا نے چاہا تو دو ایک مہینے بعد ایک چاند سا لڑکا میری گود میں کھیلتا نظر آئے گا۔" سوچا کہ بات ٹال جاؤں لیکن دل نے کہا کہ زندگی کی سب سے بڑی رفیق سے کسی راز کا چھپانا تو پلید ہونے کا ثبوت ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کی طرف اشارہ کرتے کہا "بیگم! مجھ سے کسی کی بیوگی نہیں دیکھی جاتی۔"

تانگے والا بڑے زور سے ہنسا۔ میں نے وجہ دریافت کی تو بولا۔

"بابو جی! یہ تو کالج کی بی بی لوگ ہیں۔"

"کالج کی بی بی لوگ!" مجھے بے حد تعجب ہوا۔ "تو پھر یہ کالے برقعے کیوں پہنے ہیں؟"

"حضور! یہ تو یہاں کا پہناوا ہی ایسا ہے۔ اس کے بغیر تو یہ مدرسے کے اندر جا ہی نہیں سکتیں۔"

میں نے دیکھا کہ وہ لڑکیاں راہ گیروں کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہی تھیں لیکن جیسے ہی ہمارا تانگہ قریب سے گذرا ان لوگوں نے نقاب ڈال لئے اور ہمارے اور ان کے درمیان "دیوار چین" حائل ہو گئی۔ تانگے والے نے یہ بتایا کہ یہاں "اسلامی" پردہ رائج ہے یعنی نامحرموں سے پردہ۔ کالج کے تمام لڑکوں کا شمار نامحرموں میں ہے۔ بقیہ سب لوگ محرم تصور کئے جاتے ہیں۔ اور ان سے پردہ خلاف قانون ہے۔ میں نے دل میں سوچا "یہ علی گڑھ ہے۔" "اور یہ یہاں کا جدید ترین پنگھٹ ہے — زمرد محل — بالکل نئے طرز پر بنا ہے۔ اور مشین بھی بالکل نئی ہے۔"

"لیکن کھیل تو بہت پرانا چل رہا ہے! اس میں؟" میں نے سوال کیا۔

"جی ہاں! یہاں کے منیجر نے قسم کھائی ہے کہ جب تک تمام پرانے کھیل ایک مرتبہ اس میں نہ چلالے گا تب تک کوئی تازہ کھیل نہیں منگائے گا۔"

"بہت خوب"۔

تانگہ آگے بڑھ چکا تھا۔ تھوڑی دور جا کر ایک انگریز نظر پڑا۔ جو اپنے دو ایک ساتھیوں کے ساتھ ایک اونچے چبوترے پر بیٹھا تھا چبوترے کے چاروں طرف لاتعداد کتے کھڑے دُم ہلا رہے تھے۔ ایک شخص نہایت انہماک کے ساتھ اپنے پاس رکھی ہوئی سوکھی روٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر رہا تھا۔ ایک دوسرا آدمی اسی طرح چھیچھڑے کے ٹکڑے کاٹ رہا تھا جب دونوں نے اپنا اپنا کام ختم کر لیا تو انگریز اٹھا اور تھال سے دو بوٹی اور دو ٹکڑے اٹھا کر ہر کتے کو دینا شروع کر دیئے جسے تمام کتوں نے نہایت شکر گذاری کے ساتھ قبول کر لیا۔ تقسیم کے بعد جو کچھ بچا وہ چند اعلیٰ نسل کے کتوں نے بانٹ لیا۔ میں نے سوچا شائد آج انگریزوں کا کوئی تیوہار ہے جبھی کتوں کی پوری قوم کی اتنی خاطر مدارات ہو رہی ہے۔ لیکن تانگے والے نے بتایا کہ یہ روزانہ کا دستور ہے۔ اس انگریز کو کتے پالنے کا بے حد شوق

ہے۔ ہر سال نئے نئے کتے مختلف ممالک سے منگاتا ہے لیکن یہ
ہے بڑا کنجوس۔ جو گوشت کتوں کے لئے منگواتا ہے اس میں سے اپنے
لئے سب سے پہلے نکال لیتا ہے۔ تبھی تو بیچارے کتے بھوکے رہ
جاتے ہیں اور بہت کم ایسے ہیں جو تین چار سال سے زیادہ جیتے ہوں۔
تانگے والا مسلسل گفتگو کر رہا تھا۔ "یہاں پہ کتابوں کی ایک بہت
بڑی لائبریری بھی ہے جس میں ناول افسانے
ڈرامے پڑھنے کی سخت ممانعت ہے۔"

"یہ کیوں؟ —"

"تاکہ یہاں سے بڑے افسانہ نگار اور
ادیب پیدا ہو سکیں۔"

"—————؟"

یونیورسٹی کی عمارتیں نظر آنے لگیں
سامنے ہی دلشاد بازار تھا۔ جس
کے متعلق تانگے والے نے بتایا کہ یہاں
لڑکوں کی سہولت کی خاطر ہر
چیز کے دام دُگنے رکھے گئے ہیں۔ اور
پھر بہت سی عمارتیں نظر کے سامنے
سے گذرتی چلی گئیں —————

مسجد ——— سرسید ہال
——— آفتاب ہوسٹل
——— ڈاکخانہ ——— کیفے
ممتاز ہاؤس ——— باب اسحٰق
——— مارسن کورٹ ———؟؟؟؟
کہ یکایک تانگے والے کی غلطی سے
تانگہ ایک درخت سے ٹکرا گیا

——————— میں زمین
پر گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے
معلوم نہیں کیا ہوا۔ بہرحال جب میری
آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میری شریر تھی

بہن قدسیہ اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے میری ناک کان آنکھ برابر کرنے کی سعی
حاصل کرتے ہوئے چلا چلا کر مجھے جگا رہی ہے۔ خواب کا طلسم ٹوٹ چکا تھا
تانگے والا علی گڑھ کی پُر فریب خیالی جنت اپنی گاڑی میں رکھ کر کہیں
دُور ——— میرے تصورات کی دنیا سے بہت دُور جا چکا تھا۔ یوی کا
کوسوں پتہ نہ تھا اور میں پہلے کی طرح اب بھی بیچلر آف سائنس تھا۔

اثر رامپوری

عراق کے چند روز

حسن اتفاق سے جنوری ۱۹۳۱ء میں مجھے بکادسرکار سفر عراق کا موقع ملا۔ اور بغداد۔ کاظمین۔ سامرہ۔ کربلائے معلّےٰ اور نجف اشرف کے مقدس مزارات کی زیارت کے علاوہ بصرہ، کوفہ۔ حلّہ اور بابل کے آثار قدیمہ کے دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا سفر کی تفصیلات کا موقع نہیں۔ اس لئے چند مناظر پر اکتفا کرنا پڑا۔

عراق کے عام حالات پر اگر نظر کی جائے تو یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ مزارات کے تقدس، اہم تاریخی آثار اور بہترین آب وہوا کے لحاظ سے سیاحوں کے لئے ایک خاص نعمت ہے۔ جہاں نظر۔ دل۔ جوارح اور روح کی تر وتازگی کے کافی سامان مہیا ہیں۔

عراق کے کل مقامات میں سب سے زیادہ تاریخی خوش منظر اور جاذب دل شہر بغداد ہے۔ اور عراق کا عروس البلاد کہلانے کا یقینی مستحق ہے یہاں مسلم۔ یہود اور عیسائی آباد ہیں۔ تجارت یہود کے ہاتھ میں ہے۔ زراعت اور باغات مخصوص ذریعۂ آمدنی ہیں۔ برآمد اور درآمد زیادہ ہے۔ برطانیہ کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے سڑکوں۔ پلوں عمارتوں۔ ریلوے۔ آبپاشی کے انجنوں اور نہروں کی کثرت سے خاص فائدہ پہنچا ہے۔ عراق کے دو عظیم الشان دریا دجلہ اور فرات خاص طور سے مشہور ہیں جن میں جہاز رانی بھی ہوتی ہے۔ اور ان کی نہروں سے باغات اور زراعت کی آب پاشی میں خاص ترقی ہوئی ہے یہ عجیب بات ہے کہ فرات کے ساحلی قبیلے خاص طور پر جوشیلے اور جنگجو ہیں اور دجلہ کے ساحلی قبائل اکثر تعیش پسند ہیں۔

لباس میں عام عرب عمامے پر اگال باندھتے ہیں شیوخ ترکی ٹوپی پر زرد رنگ کی اور سادات سبز رنگ کی پٹی باندھتے ہیں جس کو لفہ کہا جاتا ہے سامرہ، کاظمین، کربلائے معلّےٰ نجف اشرف اور بغداد کے "باب الشیخ" میں اکثر اشخاص اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔ لیکن فارسی سے بخوبی کام نکلتا ہے۔ یہود صرف عربی بولتے ہیں۔ بصرہ اور بغداد میں انگریزی داں طبقہ انگریزی بولتا ہے

"بغداد" عراق کا پایۂ تخت ہے۔ اور عہد قدیم سے پایۂ تخت ہی چلا آتا ہے۔ تعلیم ترقی پر ہے۔ دس کالج ہیں۔ ایف۔ اے کے بعد طلبہ ہنر سیکھنے یا اعلیٰ تعلیم کی غرض سے یورپ جاتے ہیں۔ کل عراق میں بھنگیوں کا رواج نہیں ہے۔ گھر کی بالائی منزل پر بیت الخلا ہوتا ہے۔ اور نیچے کے بند کمرے میں جمع ہو کر ایک سال کے بعد کھاد کا کام دیتا ہے۔

مسلم عورتیں سیاہ رنگ کا نقاب اور برقع استعمال کرتی ہیں۔ اور عیسائی۔ یہود اور ارمنی عورتیں سب یورپین نیم عریاں لباس پہنتی ہیں۔ ملازمان اور طلبہ عام طور پر فوجی ٹوپی استعمال کرتے ہیں۔ اہل سنت کے مزارات اور مساجد کی اکثر عمارتیں سلطان عبدالحمید خاں سلطان ترکی کے عہد میں تعمیر ہوئی ہیں۔ جن پر ان کے نام کا طغرا موجود ہے۔ جھنڈے کا رنگ سبز سرخ سیاہ اور سفید ہے جس پر دو ستارے بھی ہیں۔ ان رنگوں کا ذکر اس شعر میں ہے

خُضْرٌ مَرَابِعُنَا حُمْرٌ مَوَاضِمُنَا
ہماری چراگاہیں سبز ہیں ہماری تلواریں سرخ ہیں

سُوْدٌ وَقَائِعُنَا بِیْضٌ صَحَائِفُنَا
ہماری لڑائیاں سیاہ ہیں ہماری تاریخیں روشن ہیں

شرفا کی دعوتوں میں کرسی میز اور دونوں کا رواج ہے نشست کا کمرہ علیحدہ ہوتا ہے۔ اور ہر شخص کے لئے علیحدہ گدا۔ گاؤ تکیہ۔ اور پینے کا حقہ یعنی شک ہوتا عراق سگریٹ جسے جیکارہ کہتے ہیں بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ کھانا سب ساتھ شروع کرتے ہیں۔ اور جو سیر ہوتا جاتا ہے وہ بغیر اجازت لئے اٹھ کر چلا جاتا ہے اور چلتے یا کافی پیتا ہے۔ گائے کے گوشت کا رواج نہیں ہے دنبہ اور بکری یا مرغ۔ تیتر اور لوے کا گوشت بکثرت کھایا جاتا ہے۔ جو ارزاں ملتا ہے۔ چٹخارے کے لئے ہندوستان کی مرچ میسر نہیں آتی۔ سیاہ مرچ اور نمک سے کام لینا پڑتا ہے۔ حجاموں کی دکانیں خوب آراستہ ہوتی ہیں۔ عام طور پر داڑھی منڈائی جاتی

ہے۔ لیکن ناخن کاٹنے کے لئے قینچی استعمال کرنا پڑتی ہے۔ ناخن گیر وہاں نہیں ہوتا دکانداہر چیز کی قیمت دس گنی بتاتے ہیں۔ اور سچائی کے لئے طرح طرح کی قسمیں کھا کر اپنی سچائی کا سکہ جمانا چاہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے باللہ۔ بجان شما اور سید خریدار ہوتو کہے گا۔ بجدیک۔

عراق میں گرمی اور سردی دونوں زیادہ ہوتی ہیں۔ مٹی میں اس قدر لیس ہے کہ چوتھی منزل کی کچی دیواریں بھی بارش میں نہیں گرتیں۔ امراگرمی کے زمانے میں بہت گہرے تہ خانوں میں بسر کرتے ہیں۔

آب و ہوا اتنی بہتر ہے کہ میں نے ایک مہینے تک مسلسل سفر میں رہنے کے باوجود جب کراچی آکر وزن کرایا تو آٹھ پونڈ کی ترقی ہوئی تھی۔

بغداد کے تین پل ہیں۔ جسر اعظمیہ جو امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار سے متصل ہے اور انہی کے نام سے کل محلہ اور یہ پل موسوم ہے۔ دوسرا جسر قدیم ہے تیسرا جدید۔ جس کو "ماڈ برج" سے موسوم کرتے ہیں۔

دجلہ اتنا گہرا اور تیز رو دریا ہے جس میں ستونوں کا کوئی پختہ پل طیار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے لوہے کی کشتیوں پر پل بنایا جاتا ہے۔ اور اتنا چوڑا ہوتا ہے کہ اس کے درمیان میں موٹریں اور گاڑیاں بخوبی چلتی ہیں اور دونوں طرف کے کناروں پر پیادہ پا لوگ سفر کرتے ہیں۔ البتہ جب کبھی دریا میں تموج ہوتا ہے تو پل بھی اتار چڑھاؤ کا ساتھ دے کر پیادہ پا چلنے والوں کو پریشان کر دیتا ہے۔ یعنی چند قدم چلے اور بیٹھ گئے پھر چلے اور پھر بیٹھ گئے۔

عجائب خانہ جسر قدیم کے بائیں طرف کی سڑک عجائب خانہ ہے جس میں بکثرت بت ہیں اس عجائب خانہ میں زیادہ تر نمرود کے عہد کے آثار موجود ہیں۔ سونے کے برتن۔ ۲۲۰۰ قبل مسیح کے سکے۔ اور بت وغیرہ ہیں۔ اور دو پتھر کے عظیم الشان بت ہیں جن کا چہرہ اور سر آدمی کا سا ہے لمبی ڈاڑھیاں اور سر پر جڑاؤ تاج ہے باقی جسم گھوڑے کا۔ یہ عجائب خانہ صبح دس بجے سے ۲ بجے تک کھلا رہتا ہے۔

طاق کسریٰ ۳ فروری ۱۹۳۱ء ۴ رمضان کو پچھلے دن میں ذریعہ موٹر بغداد سے مدائن روانہ ہوئے۔ جس کا فاصلہ بغداد سے ۳۰ میل ہے۔ مدائن کے قریب ہی طاق کسریٰ کی تاریخی عمارت نظر آتی ہے اس تک جو عمارت باقی ہے وہ نوشیروان عادل کے دربار کا ہال ہے۔ چونکہ شکست ریخت ہے اس لئے کم سے کم استعمال کیا گیا ہے۔ یہ ایک عظیم الشان ہال ہے۔

جس کی اونچائی تقریباً ۹۰ گز اور چوڑائی ۳۰ گز ہے۔ ڈاٹ کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ چودہ سو برس سے زیادہ مدت گذر جانے کے باوجود ابھی تک قائم ہے۔ صرف آگے کا کچھ حصہ گرا ہے۔ ہال کے دونوں طرف بھی سہ منزلہ منقش عمارتیں تھیں۔ لیکن ان میں سے دائیں طرف کی عمارت اور دروازہ گر چکا ہے۔ بائیں طرف کی ابھی تک باقی ہے جن کی چوڑائی ۹ گز کی ہے۔ موجودہ عمارت کے چاروں طرف گورنمنٹ نے پشتہ تعمیر کرا دیا ہے۔ تاکہ اس کو مزید نقصان نہ پہنچے۔ اس کی تعمیر میں جو اینٹیں استعمال ہوئی ہیں وہ ہندوستان کے چوکے سے کچھ ہی بڑی ہیں اس کی متعلقہ منہدم عمارتوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ جن کو کھود کر ۱۹۱۴ء میں برٹش گورنمنٹ نے خندقیں کھدوا کر مورچے قائم کئے تھے۔ جب ۶۳۶ء میں مسلمانوں نے مدائن فتح کیا ہے تو اس دربار ہال میں ایک قالیچہ ۳۰ گز لمبا اور ۳۰ گز چوڑا موجود تھا جس کو فرش بہار کہتے تھے۔ اس فرش پر زمرد یاقوت اور قسم قسم کے جواہرات کا سدا بہار باغ لگایا گیا تھا۔ اور ہیروں کی نہریں بنائی گئی تھیں۔ تاکہ موسم خزاں میں موسم بہار کا لطف آئے۔ جب اس فرش کو فوج پر تقسیم کیا گیا تو ایک ٹکڑے کے جواہرات کی قیمت بیس ہزار درہم ثابت ہوئی تھی۔

یہی وہ محل ہے جس کی دیوار کے محاذ میں ایک بڑھیا کا جھونپڑا آ گیا تھا۔ جب دیوار کو سیدھا کرنے کی غرض سے بڑھیا سے کہا گیا کہ تو اس جھونپڑے کو چھوڑ دے تاکہ اس کے عوض تیرے لئے ایک پختہ مکان علیحدہ تعمیر کرا دیا جائے۔ تو بڑھیا نے جواب دیا تھا کہ میں تو بادشاہ کی اتنی وسیع سلطنت پر کوئی رشک نہیں کرتی۔ لیکن بادشاہ مجھ بڑھیا کا ایک جھونپڑا بھی نہیں دیکھ سکتا۔ یہ سن کر نوشیروان نے حکم دیا کہ دیوار کو ٹیڑھا کر دو۔ اس کے مقابلے میں مجھے ایک بڑھیا کا دل آزردہ کرنا منظور نہیں۔ چنانچہ دیوار ٹیڑھی کر دی گئی۔ اور قلعہ تیار ہو گیا۔ جب بڑھیا کے دھوئیں سے قلعہ کی شفاف دیواریں کالی ہوئیں تو اس بدنمائی کو دور کرنے کی غرض سے بڑھیا سے خواہش کی گئی کہ وہ کھانا پکانے کی تکلیف گوارا نہ کیا کرے دونوں وقت شاہی خوان آیا کرے گا۔ جس سے وہ بخوبی سیر ہو سکے گی۔ بڑھیا نے یہ سن کر جواب دیا کہ مجھے بادشاہ کے مرغ اور پلاؤ سے اپنی چٹنی روٹی زیادہ پسند ہے جو بغیر کسی احسان کے ہے۔

اسی محل کے دروازے پر زنجیر لٹکتی رہتی تھی۔ تاکہ فریادی زنجیر ہلا کر براہ راست بادشاہ سے فریاد کر سکے۔ بلبل شیراز حضرت علامہ سعدی نے گلستان میں نوشیروان عادل کا اکثر ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

آں پیر لاشہ راکہ سپردند زیر خاک | خاکش چناں بخورد کزو استخواں نماند
زندہ است نام فرخ نوشیرواں بعدل | گرچہ بسے گذشت کہ نوشیرواں نماند

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

قاروں ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت | نوشیرواں نہ مرد کہ نام نکو گذاشت

سامرہ ۔ سامرہ کاظمین سے ۷۵ میل دور ہے۔ اس کی آبادی کے چاروں طرف فصیل ہے۔ دریائے دجلہ اس کے قریب ہی بہتا ہے۔ اس کے دوسرے کنارے پر زبیدہ خاتون ہارون الرشید (خلیفہ عباسی) کی بیگم کا محل ہے۔ ترکوں کے زمانے میں یہاں پہلے ترکی فوج کی چھاؤنی تھی۔ اس میں ایک مینار المعتصم باللہ کا تعمیر کردہ موجود ہے جو ایک منہدمہ جامع مسجد کا ہے۔ اس مینار کی سیڑھیاں باہر کی طرف ہیں۔ برخلاف قطب مینار دہلی کے جس کا زینہ اندر کی طرف ہے۔

بابل ۔ ۳۰ جنوری ۱۹۳۱ء کو نجف اشرف سے چفل اور حلے کے راستے بابلون گئے۔ کوفے سے حلہ ۳۰ میل ہے۔ عمارتیں انگریزی طرز کی خوشنما اور شاندار ہیں۔ باغات اور ہوٹل بکثرت ہیں۔ شہر کے برابر ہی نہر فرات بہہ رہی ہے۔ عراق میں بغداد اور بصرہ کے بعد یہ شہر سب سے خوشنما ہے۔ حلہ سے تین میل کے فاصلے پر تل نمرود ہے۔ جہاں حضرت ابراہیمؑ کو آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں ڈالا گیا تھا اور آپ صحیح و سالم نکل آئے تھے۔ اب یہاں کھنڈر ہیں۔ حلے سے چار میل آگے بخت نصر کے قلعہ کے کھنڈر ہیں۔ یہ عظیم الشان قلعہ اور شہر زمین میں دھنسا ہوا ٹیلوں کی شکل میں دور تک چلا گیا ہے۔ اکثر حصوں میں اہلِ فرنگ نے کھدائی کی ہے۔ جس میں سے ایک بت خانہ نکلا ہے اور اس کی دیواروں پر چمکدار مسالے کے چار پانچ ہرن بنے ہوئے ہیں۔ اس کے قریب ہی ایک کنواں اور باؤلی ہے۔ بت خانہ کے آخر میں شیر کا ایک سنگین مجسمہ ہے۔ جو ایک انسان کو کھانا چاہتا ہے۔ انسان کا سر شیر کے اگلے پاؤں کے درمیان۔ ایک ہاتھ انسان کا شیر کی پسلیوں کی برابر ہے۔ دونوں گھٹنوں پر شیر کا پیٹ ہے۔ آدمی کے پاؤں ہٹ کر گھٹنے کھڑے ہوگئے ہیں۔ شیر تقریباً ایک گز چوڑا اور چار گز لمبا ہے۔ ایک زینے کے اندر تہ خانہ ہے جس میں دھات کا دروازہ لگا ہوا ہے۔ اندر حمام کا حوض ہے۔ یہ عمارت پختہ اینٹوں کی ہے۔ جو شاید قبل مسیح کی ہے۔ بابلون کا عہد ۲۲۵۰ قبل مسیح کا ہے۔ ۱۸۹۹ء سے ۱۹۱۷ء تک اہل جرمنی نے کھدائی کرائی ہے۔ بخت نصر کے بت خانے کی گہرائی ٹیلے کی بالائی سطح سے ۲۰ گز نیچی ہوگی۔ مسالا سیاہ رنگ کا استعمال ہوا ہے۔ جو بہت پختہ ہے۔ ملکہ شکستہ مینار بھی ہے۔ ایک پتھر پر خط مسماری میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ جو پڑھا نہ جا سکا۔ اسی کے قریب مشہور تاریخی باغ موسوم بہ "باغ معلق" ہے۔ اور یہ محل بخت نصر کے نام سے موسوم ہے۔ الیگزینڈر بھی قریب ہی واقع ہے جیسی سلاطین کے نشانات بھی پائے جاتے ہیں۔ یہاں بکثرت سیاح آتے ہیں۔ ہمارے سامنے بھی ایک انگریز اور ایک میم سیر کر رہے تھے۔ عرب گائڈ انگریزی عربی اور فارسی میں سیاحوں کو حالات بتلاتے ہیں۔ اور ٹوٹی پھوٹی اردو بھی بول لیتے ہیں۔ یہاں سونے کے برتن اور کچھ سامان برآمد ہو کر یورپ بھیجا گیا ہے۔ اور پتھر کے مجسمے بکثرت بغداد کے عجائب خانہ میں موجود ہیں۔ کھدائی کا کام ابھی بہت کم حصے میں ہوا ہے۔ بہت زیادہ حصہ باقی ہے۔

بغداد کے جواہر ہوٹل کا تھیٹر ماڈ برج کے کنگرے پر دو کشی یہ ہوٹل ۔ میجسٹک ہوٹل اور ریور ہوٹل وغیرہ ہیں۔ یہ حصہ بے حد فرحت افزا ہے۔ ہوٹل کے ایک طرف سڑک اور دوسری طرف دریائے دجلہ کی لہریں جو شیشہ دار کھڑکیوں سے نظر آتی ہیں نہایت دل آویز معلوم ہوتی ہیں۔ خصوصاً چاندنی راتوں میں ان کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ نیو اسٹریٹ میں جواہر ہوٹل اچھا ہے۔ جس کا مالک ایک یہودی ہے۔

۲ فروری ۱۹۳۱ء کو میں اور میرے دو ساتھی جواہر ہوٹل میں شام کے وقت چائے پینے کی غرض سے گئے۔ اثنائے گفتگو میں معلوم ہوا کہ آج رات کو ۹ بجے یہاں تھیٹر بھی ہوگا۔ تھیٹر کا نام سن کر ہمیں بھی شوق ہوا کہ غیر ملک کا تھیٹر بھی دیکھیں۔ تاکہ ہندوستان کے تھیٹروں کا مقابلہ کیا جا سکے ہم نے منیجر سے معلوم کیا کہ کیا یہ تھیٹر ہم بھی دیکھ سکتے ہیں۔ جواب دیا کہ تین صورتوں میں۔ اگر ہوٹل میں قیام ہو۔ یا شراب خرید کر پی جائے۔ تو تھیٹر مفت دیکھا جا سکتا ہے۔ ورنہ بارہ آنہ فی کس دینا ہوں گے۔ چائے یا قہوہ پلایا جائے گا۔ ہم پہلی دو شرطیں سن کر مایوس ہو چکے تھے۔ لیکن تیسری شرط نے مردہ امید کو پھر زندہ کر دیا اور ہم نے فوراً رقم ادا کر دی۔

تھیٹر میں پہلے ایک طوائف نے اپنا ہنر دکھایا۔ اس کے بعد تدیجہ [illegible] نام ایک نوجوان رقاصہ آئی۔ یہ طوائف بیروت سے آئی ہے۔ اور تمام بغداد میں اس کے رقص کے کمال کا چرچا ہے۔ اس کے ساتھ چار سازندے تھے۔ ایک قانونچہ بجاتا تھا۔ یہ ساز مثلث ہوتا ہے۔ ایک گز لمبا اور اس میں ۶۰ تار ہوتے

میں دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے بجایا جاتا ہے۔ سننے سے معلوم ہوا کہ یہ ساز نغمہ اور تاثیر میں تمام سازوں کا سردار ہے۔ دوسرے کے پاس کمانچہ (بیلا) تیسرے کے پاس جھانجھ والا ایک دف جو تھے کے پاس ڈونگ (ایک طرف سے منڈھی ہوئی ڈھولک) تھی۔ تھیٹر میں کوئی ڈراما یا تمثیل پیش نہیں کی جاتی۔ بلکہ صرف گانا اور ناچ ہوتا ہے۔ ناچ میں بدن کے ہر حصے کو متحرک کیا جاتا ہے۔ آخر گانا شروع ہوا مصری۔ عراقی اور حجازی مختلف لحنوں میں گیت گائے گئے۔ طوائف کو چاروں سازندے اپنے ساز اور آواز سے ابتدائی مصرع کی تکرار میں امداد دیتے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ عربی لحن نے مجھ پر کیا اثر کیا۔ یوں تو میں نے انگریزی، ہندوستانی اور افغانی لحن بہت گانے سنے ہیں۔ لیکن عربی لحن نے سب کو ہیچ کر دیا۔ اور یہ امر واقع ہے۔ بربنائے طرفداری مذہبی نہیں۔ مجھے رقص سے نہ کبھی دلچسپی ہوئی نہ ہے۔ اس لئے میری توجہ تمامتر نغمہ تک محدود رہی۔ مدیحہ آتش کی رفتار رقص اتنی تیز تھی کہ سازندے اس کے پاؤں کی تھاپ کے ساتھ ساز کی آواز ہم آہنگ کرنے سے اکتا چکے تھے۔ سازندوں میں ایک کا نام عبدل تھا۔ جو سب سے اچھا گویا تھا۔ تماشائیوں سے پورا ہال کچھا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اور چاروں طرف شراب ارغوانی کا دور چل رہا تھا۔ ایک عرب کے سامنے جب شراب پیش کی گئی تو اس نے ہوٹل کے ملازم کو جو معقول جواب دیا وہ بھی لطف سے خالی نہیں۔ کہنے لگا "آما در رمضان حرام است" یہ کہ اس فقرے پر خود بھی قہقہہ مار کر ہنسا۔ سامنے ہی ایک ہندوستانی (پنجابی) نظر آئے۔ ہم نے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ لیکن اس وقت وہ بھی شغل میں تھے ہمارا اشارہ پاکر اس طرح گھبرا کر اٹھے کہ شراب کی بوتل گری اور ان کے ساتھ ہی لڑھکتی ہوئی ہمارے پاس تک آئی۔ افسوس کہ انھوں نے جس راز کو چھپانے کی کوشش کی تھی وہ ناکام رہی۔ ان کا نام جمیل تھا۔ انھوں نے ہی سازوں کے نام بتائے۔ اور انہی کے اشارے سے عبدل نے جو ان کا دوست تھا اردو کی ایک غزل بھی سنوائی۔ اردو غزل کی ابتدا میں تو ہمیں یہی محسوس ہوا کہ عربی کا کوئی گیت گایا جا رہا ہے۔ لیکن جب انھوں نے بغور سننے کی طرف توجہ دلائی تو بہت مشکل سے پتہ چلا کہ اس غزل کا ابتدائی مصرع یہ ہے ع

"مزہ دیتے ہیں کیا یار ترے بال گھونگر والے"

غرض تماشا دیکھا اور ایک پیالی کافی کی پی اور چیکارہ پیتے ہوئے قیام گاہ کو روانہ ہوئے۔

ہندوستان اور افغانستان کے مابین وائرلیس کا سلسلہ

تاروں کی شرح محصول

ہندوستان اور افغانستان میں براہ راست لاسلکی پیام رسانی قائم ہو جانے سے ہندوستان اور افغانستان میں پاکستان کے راستہ بری راستہ کا جو سرکٹ تھا اُسے بند کر دیا گیا ہے۔ ہندوستان اور افغانستان کے درمیان جو تار آئیں جائیں گے انھیں غیر ملکی تار تصور کیا جائے گا۔ ایسے تاروں کی فی لفظ شرح محصول حسب ذیل ہوگی۔

سرکاری یا نجی عام	دو آنے
سرکاری یا نجی ارجنٹ	ایک روپیہ دو آنے
سرکاری یا نجی کوڈ	ساڑھے پانچ آنے
پریس	ساڑھے چار آنے
موسمیات	ساڑھے چار آنے

خفیہ پیام رسانی کی اجازت صرف سرکاری تاروں میں ہوگی ملتوائی یا خط کی قسم کے تاروں کی اجازت نہیں ہوگی۔ تار بھیجنے والوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے تار پر "او۔ سی۔ ایس" لکھیں۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء

سالہا سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی کا قافلہ اپنی منزل مقصود پر پہنچا۔ اور ہندوستان میں عملی طور پر جنتا کا راج قائم ہو گیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان اپنے سیاہ و سفید کا آپ مالک تھا۔ اس کی زمام اختیار اس کے اپنے ہاتھ میں تھی، لیکن چونکہ ہندوستان نے اپنے لئے ڈومینین ممالک کا درجہ قبول کیا تھا اس لئے برطانوی کامن ویلتھ کے ممبر کی حیثیت میں اس کے ساتھ بادشاہ کا برائے نام تعلق بھی باقی تھا۔

۱۵ اگست سے پہلے ہی آئین ساز اسمبلی نے نئے ہندوستان کی بنیاد رکھنا شروع کر دی تھی۔ ۱۹۴۸ء میں آئین ساز اسمبلی اس فیصلے پر پہنچی کہ بادشاہ کے ساتھ ہندوستان کا تعلق ختم کر دیا جائے۔ اور ہندوستان کا آئینی حاکم اعلیٰ بادشاہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا گورنر جنرل نہ ہو بلکہ ہندوستانی جنتا کا منتخب کیا ہوا پریذیڈنٹ ہو اور ۲۶ جنوری کو جب کہ نیا آئین ہندوستان میں نافذ ہوا تو اس فیصلے نے عملی صورت اختیار کی اور ہندوستان نے متفقہ فیصلے سے اپنا پہلا پریذیڈنٹ منتخب کیا۔ آخری گورنر جنرل شری راج گوپال آچاریہ ریٹائر ہو کر مدراس تشریف لے گئے، اور اختیارات اور ذمہ داری کی عنان شری راجندر پرشاد نے سنبھالی۔

۲۶ جنوری کی صبح کو جب کہ تاریخ عالم کا یہ بہت بڑا واقعہ ظہور پذیر ہوا، ساری دنیا میں ایک مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس کا ساری دنیا میں کوئی دشمن نہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب ہندوستان میں خود مختار ری پبلک قائم ہونے کا اعلان ہوا روئے زمین پر مسرت کے شادیانے بجنے لگے دنیا کے کونے کونے میں جشن منائے گئے اور ہر گوشے سے شری راجندر پرشاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کے نام مبارک باد کے پیغامات آنے شروع ہو گئے۔

دنیا کے جن مشاہیر کی جانب سے ہمیں مبارک باد کے پیغام موصول ہوئے ان سب کے نام گنوانا تو بہت مشکل ہے، اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جس کے عوام اور جس کی حکومت نے ہمارے ساتھ اس جشن میں شریک ہو کر اپنی دلی محبت کا اظہار نہ کیا ہو۔

غیر ممالک میں ہندوستانی سفارت خانوں کے زیر اہتمام خاص جلاس منعقد ہوئے جن میں وہاں کے اکابر خاصی تعداد میں شریک ہوئے۔ کراچی میں ہمارے ہائی کمشنر شری سیتارام نے قومی جھنڈا لہرانے کی رسم ادا کی۔ اس موقعے پر پاکستان کے دیگر اکابر کے علاوہ آنریبل مسٹر لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان بھی شریک ہوئے۔ اسی طرح ماسکو میں ہندوستان کے سفیر شری رادھا کرشنن نے اس جشن مسرت کے موقعہ پر جو پارٹی دی اس میں دیگر روسی اکابر کے علاوہ روس کے وزیر خارجہ ایم واشنسکی بھی تشریف لائے اور انہوں نے ہندوستان کے متعلق اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

امریکہ سے پریذیڈنٹ ٹرومین اور برطانیہ سے مسٹر ایٹلی نے پیغامات تہنیت بھیجے۔ چیکوسلواکیہ کے وزیر اعظم نے پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک چٹھی میں لکھا:-

" ہندوستان میں ایک آزاد ری پبلک کے قیام پر جو ہندوستانی جنتا نے ایک طویل جدوجہد کے بعد حاصل کی ہے، میں آپ کو اپنی اور اہل چیکوسلواکیہ کی طرف سے شبھ کامنائیں بھیجتا ہوں۔ چیکوسلواکیہ کے لوگ اہل ہندوستان کی ساری جدوجہد آزادی کو بڑی توجہ سے دیکھتے رہے ہیں اور اب جب کہ آزادی حاصل ہو گئی ہے، ہماری تمنا یہی ہے کہ تمدنی اور

اقتصادی اعتبار سے ہندوستان روز بروز ترقی کرتا چلا جائے"
یونائیٹڈ نیشنز کے سیکرٹری جنرل نے لکھا۔
"ہندوستان میں آزاد ری پبلک کے قیام پر یونائیٹڈ نیشنز کی طرف سے ہدیۂ مبارک باد قبول فرمایئے"۔
یوگوسلاویہ کے وزیر اعظم مارشل ٹیٹو نے شری راجندر پرشاد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہندوستان میں آزاد اور خود مختار ری پبلک کے قیام پر ری پبلک آف یوگوسلاویہ کے لوگوں کی طرف سے میں آپ کو دلی مبارک باد دے رہا ہوں۔ میری صدق دلانہ خواہش ہے کہ ہندوستان کو روز افزوں خوشحالی اور ترقی نصیب ہو تاکہ ہندوستانی عوام دُنیا کے تمدن میں اضافہ کریں۔ اور دُنیا میں قیام امن کی کوششوں میں اپنا پورا حصّہ ادا کریں"۔

مشرق وسطیٰ کے ممالک سے شاہ ابن سعود کے مشیر مسٹر بشیر السعدی عرب لیگ میں یمن کے نمائندے السیّد علی المویدّ، ہز ہائینس سعید بن تیمور سلطان مسقط، مسٹر محمد صلاح الدین وزیر خارجہ مصر اور دیگر مشاہیر نے ہندوستان کے پریذیڈنٹ اور وزیر اعظم کو ہدیہ ہائے تبریک بھیجے۔

مشرق و مغرب کے ان نعرہ ہائے مبارک باد میں شری راجندر پرشاد نے ۲۶ رجنوری کو گورنمنٹ ہاؤس میں قدم رکھا۔ اور ۳۱ رجنوری کو آپ نے پریذیڈنٹ کی حیثیت میں پہلی بار پارلیمنٹ سے خطاب کیا۔ اس ایڈریس میں آپ نے کہا۔

"اس وقت قوم کو جرأت، باہمی تعاون اور سخت محنت کی ضرورت ہے۔ ہمارے سامنے ایک بڑا کام ہے اور ہم راشٹر پتا باپو کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہیں تو ہمیں اپنے مقاصد میں یقیناً کامیابی ہوگی"۔

آپ نے اعلان کیا کہ ہندوستان کا ساری دُنیا میں کوئی دشمن نہیں اور ہم تمام لوگوں کی جانب دوستی اور باہمی تعاون کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔

ملک میں اس عظیم تبدیلی کے موقع پر بعض لوگوں کا خیال تھا کہ پریذیڈنٹ اپنے ایڈریس میں کسی نئی تبدیل شدہ پالیسی کا اعلان کریں گے یہ توقع ایک قدرتی بات تھی۔ لیکن حکومت اس تبدیلی کو جس نے پرانے نظام کی جگہ ایک نیا نظام پیش کیا تھا۔ اتنی ہمواری کے ساتھ لانا چاہتی تھی۔ کہ نئے آئین کے نفاذ کے وقت حکومت کے ممبروں میں بھی کسی قسم کی تبدیلی نہ کی گئی بلکہ اس تبدیلی کو عملی صورت دینے کا کام انہیں کے سپرد کیا گیا۔ اور اگر نگاہِ غور سے دیکھا جائے تو مہاتما گاندھی کے ملک کی پالیسی کے متعلق اس سے زیادہ بہتر اعلان اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہندوستان دنیا کے کسی ملک یا کسی قوم کا دشمن نہیں۔ وہ ہر ملک کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھائے گا۔ اور دُنیا میں امن کی جڑوں کو مضبوط تر کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کرے گا۔

کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ کشمیر کے مستقبل فیصلہ کشمیری عوام کے ہاتھ میں ہے اور یہ وہ اصول ہے جس پر حکومت ہند پہلے دن سے کار فرما ہے۔

گھریلو معاملات کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ملک کے اقتصادیات کو زیادہ مضبوط اور زیادہ ٹھوس بنانے کی کوشش کی جائے گی اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ملک میں عنقریب ایک پلیننگ کمیشن مقرر کیا جائے گا۔ پاکستان سے آئے ہوئے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ انہیں ملک میں بسانے کے کام کو اور تیز کر دیا جائے گا۔ تاکہ یہ لوگ جلد از جلد ہندوستان کے لئے ایک ٹھوس سرمایہ بن سکیں۔

ج ۔ ن ۔ ا

نئی کتابیں

روشنی تیغ الٰہ آبادی کا یہ مجموعۂ کلام ایک نہایت پیاری نظم سے شروع ہوتا ہے جس کے مندرجۂ ذیل اشعار خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں

مری نوائے الم قہقہوں پہ ہنستی ہے
یہ طرزِ خاص غمِ عام لے کے آیا ہوں
وہ جس کے فیض سے سقراط کی جبیں ہو دمک
شرابِ کہنۂ خیام لے کے آیا ہوں
فرازِ طورِ محبت سے تیری خدمت میں
فروغِ سینۂ الہام لے کے آیا ہوں
سیاہ ابرِ نفس آندھیوں سے لڑ بھڑ کر
چراغِ لرزہ براندام لے کے آیا ہوں
نہیں ہے عرشِ معلّٰی بیان کا موضوع
میں فرشِ پاک کا پیغام لے کے آیا ہوں

یہ نظم گویا ایک طرح کی تمہید ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ کن افکار و خیالات کا حامل ہے اس تمہید کے علاوہ نثر میں بھی ایک پیش لفظ موجود ہے۔ جس میں تیغ صاحب لکھتے ہیں "میں ببانگِ دہل اعلان کرتا ہوں کہ میں گرامر یا عروض سے یکسر ناواقف ہوں" اس قسم کی باتیں ہم ایک مدت سے سنتے چلے آرہے ہیں اور اب جب کہ یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ شعر کہنے کے لئے گرامر یا علم عروض پر عبور حاصل کرنا کوئی لازمی امر نہیں ہے تو اس قسم کے ببانگِ دہل اعلان بے ضرورت ہو جاتے ہیں۔ آخر مولینا روم کتنی مدت پہلے یہ کہہ گئے ہیں کہ ع

من نہ دانم فاعلاتن فاعلات

اور اہلِ نظر جانتے ہیں کہ فاعلاتن فاعلات نہ جاننے کے باوجود مولینا روم نے دنیا کے شعری ادب میں کتنا بڑا اضافہ کیا ہے۔

لیکن عروض نہ جاننے کا مطلب یہ نہیں کہ شاعر کو کسی مصرع کے بے وزن یا باوزن ہونے کا احساس ہی نہ ہوسکے اور وہ اس اعلان کو اپنے لئے ایک لائسنس سمجھ لے۔ مولینا روم کے اعتراف کے باوجود ساری مثنوی میں کوئی خارج از بحر مصرع نظر نہیں آتا اور اگر تیغ صاحب اس اعلان کا سہارا لے کر یہ مصرع اپنے کلام میں شامل رکھنا چاہیں تو ہم اس اعلان اور اس اصرار کو ان کے ارتقا پذیر کلام کے لئے مضر سمجھیں گے

ع تو بڑے عزم کی ملکہ تھی مگر عورت تھی

اور ع فرد کی جشن جمعیت میں حقیقت کیا ہے

تیغ ایک ترقی پسند شاعر ہیں اور ہر ترقی پسند شاعر کی طرح زندگی اور اس کے مسائل پر پوری طرح غور و فکر کرنے کے بعد شعر کہتے ہیں آپ کا تقریباً سارا کلام انسانی مسائل کے بیان اور ان مسائل کے حل کے لئے وقف ہے اور اس دور کی صحیح معنوں میں عکاسی اور ترجمانی کرتا ہے جس میں سے اس وقت ہمارا سماج گزر رہا ہے۔

تیغ کا اندازِ بیان ابہام سے پاک ہے اور اس دور میں جب کہ زندگی کی الجھنیں روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہیں کسی فن کار کے لئے فن کو ابہام سے پاک رکھنا ایک بہت بڑی خوبی ہے۔ ان کے کلام میں ہمیں جگہ جگہ فکر و عمل کی تلقین نظر آتی ہے "کرن" اور ایسی ہی دوسری نظمیں اس جذبے کے اظہار کی حسین اور صحت مند صورتیں ہیں۔

جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے تیغ جوش اور فیض سے بہت حد تک متاثر نظر آتے ہیں اور صرف تیغ ہی پر کیا موقوف ہے ہمارے جدید اور جدید تر شعرا کو اقبال کے بعد اگر کسی شاعر نے متاثر کیا ہے تو وہ جوش اور فیض ہی ہیں "خود فروشی" "نغمے کی موت" اور "سناٹا" ایسی نظمیں ہیں

جن پر فیض کا اسلوب چھایا ہوا نظر آتا ہے "انسان پیدا ہو گیا" یہ رباعی

اے ماہ وشوں کی صدر واپس آجا
اے دخترِ نظم و نثر واپس آجا
ایسے میں کہ حشر ڈھا رہی ہے برسات
اے بنتِ سکون وجہ واپس آجا

اور مجموعے کی پہلی نظم میں جوش کا اسلوب اختیار کرنے کی کوشش جھلک رہی ہے
"غروبِ عظمت" کے عنوان سے آپ نے ایک نظم مسٹر جناح کی موت پر کہی ہے جس میں آپ لکھتے ہیں ؏

اے فاتح سمندر دکھسا. ہائے ہائے

ہم تیغ صاحب کی "غیر مانوس ترکیبوں" غیر مستعمل یا بالکل نئے الفاظ اور محاوروں میں "قطع و برید" کو پسند کرتے ہیں لیکن ان سے اتنی بڑی غلطی کی توقع نہیں کرتے اسی طرح ایک اور مصرع ہے ؏

اے اقلیت کے مونس و غمخوار ہائے ہائے

اگر تیغ صاحب ذرا احتیاط سے کام لیں تو ان خامیوں کو دور کرنا کچھ مشکل نہیں۔ ہم اس نظم پر کسی قسم کی نظریاتی بحث نہیں کرنا چاہتے لیکن تیغ صاحب سے اتنا ضرور کہیں گے کہ وہ وقت کی لمحہ بہ لمحہ ارتقا پذیر اقتدار کے پیش نظر اس نظم پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالیں اور اپنے مجموعے میں ایک بار پھر اس کا مقام تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

بحیثیت مجموعی اس مجموعۂ کلام میں ایک عالم گیر محبت کا درس دیا گیا ہے اور اس اعتبار سے یہ ایک قابل قدر کتاب ہے۔

ناشر مکتبۂ حیات نوا لہ آباد ۳۔ قیمت کتاب پر درج نہیں۔ کاغذ اچھا ہے کتابت طباعت گوارا اور جلد معمولی ہے۔

ثمرۂ باغبانی حصہ اول مصنف جناب ابوالاحسان نذیر احمد خاں کوکی خیل ملیح آبادی قیمت عہ

ملنے کا پتہ۔ نذیر برادرس ملیح آباد ہاؤس اصطبل چار باغ لکھنؤ

باغبانی کے موضوع پر اردو میں کتابیں قریب قریب نایاب ہیں اور نذیر احمد خاں صاحب نے یہ کتاب لکھ کر ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔ باغبانی ایک دلچسپ مشغلہ بھی ہے اور آمدنی کا ذریعہ بھی۔ اکثر لوگ یہ کام محض اس وجہ سے اختیار نہیں کر سکتے کہ انہیں اس کے متعلق صحیح قسم کی واقفیت حاصل نہیں ہو سکتی زیرِ نظر کتاب اسی مقصد کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے شروع میں باغبانی کے بعض اصطلاحات کی تشریح کی گئی ہے جس کے مطالعہ سے کتاب کو سمجھنے میں بہت آسانی رہتی ہے۔ اندازِ بیان صاف آسان اور دلچسپ ہے۔ کتاب $\frac{20\times30}{16}$ سائز کے ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اور اس لحاظ سے اس کی قیمت بھی کچھ زیادہ نہیں۔ کتاب کی افادیت ہر اعتبار سے مسلّمہ ہے۔

موصولات

جامِ نو	اختر انصاری اکبرآبادی
اُردو غزل	ڈاکٹر یوسف حسین خاں
اِنتظار	رمیش شرما
عورت مرد اور دُنیا	خلیق ابراہیم

رفتارِ زمانہ

جس شاندار ہی نہیں بلکہ بے نظیر طریقے پر ہندوستان کے کونے کونے میں پرجاتنتر دوس منایا گیا اُس سے ایک بار پھر یہ امر عیاں ہو جاتا ہے کہ بلا لحاظ مذہب و ملت ایک ایک ہندوستانی کے دل میں بھارت ماتا کے تئیں کتنا جذبۂ عقیدت ۔غیر ملکی غلامی سے آزاد ہونے پر کتنا فخر اور اپنی حکومت و راشٹرپتی کے لئے کتنی شردھا ہے ۔

بھارت کی راجدھانی میں تو یہ دن خاص طور پر دھوم دھام سے منایا گیا ۔ راشٹرپتی کا جلوس دیکھنے کے لئے نئی دہلی میں دس لاکھ اشخاص کا جمع ہو جانا دہلی کی تاریخ میں ایک ریکارڈ ہے ۔ رات کو دیپ مالا بھی نہایت دلکش منظر پیش کر رہی تھی ۔ تمام سرکاری اور پبلک مقامات پر چراغان کیا گیا ۔جگہ جگہ ترنگے جھنڈے لہرا رہے تھے اور مختلف لیڈروں کے نام پر شہر بھر میں دروازے بنے ہوئے تھے ۔اسی طرح دیش کے ہر حصے میں یہ دن نہایت جوش و خروش سے منایا گیا ۔

۲۶ رجنوری کو صبح دس بجکر ۲۰ منٹ پر ۳۱ توپوں کی سلامی کے بعد شری چکرورتی راجگوپال اچاریہ نے گورنمنٹ ہاؤس میں بھارت میں جمہوری راج قائم ہونے کا اعلان کیا ۔ اتہاس میں یہ پہلا موقعہ ہے جب یہ سارا دیش کشمیر سے کنیا کماری تک اور کاٹھیاواڑ کچھ سے کوکنڈا اور کامروپ تک ایک ہی آئین و نظام کے زیر تحت آگیا ہے اور یہ نیا جمہوری نظام ۳۲ کروڑ انسانوں کے سکھ دکھ کی ذمہ داری لے رہا ہے ۔

بھارت کے پردھان منتری پنڈت جواہر لال نہرو کو اپنی عمر کے ساٹھ سال پورے کرنے پر ۱۰۰۰ صفحات کی ایک مجلد کتاب بطور تحفہ پیش کی گئی ہے ۔ اس کتاب میں ۱۵۰ پرسدھ ودوانوں کے مضامین درج ہیں ۔ اس کتاب کی تیاری میں ۱۸ ماہ صرف ہوئے ۔ دو لاکھ روپیہ خرچ آیا اور یہ انگریزی اور ہندی ہر دو زبانوں میں ہے ۔

دہلی میں کل ہند صنعتی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے اُپ پردھان منتری سردار ولبھ بھائی پٹیل نے کہا کہ نمائش کا اصلی مقصد اپنے دیش کی صنعتوں کو فروغ دینا ہوا کرتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ ہمیں سوراج حاصل ہو گیا ہے لیکن وہ تب تک مکمل نہیں ہے جب تک ہم اپنی تمام ضروریات کو خود پورا نہیں کر لیتے ۔ اس وقت ہند اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے دوسروں کا دست نگر ہے ۔ ہمیں چاہیئے کہ اس کمی کو جلد از جلد پورا کریں ورنہ یہ سوراج ادھورا رہ جائے گا ۔ آخر میں آپ نے اپنے دیش واسیوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے ملک کی صنعتوں کو ترقی دینے کے لیئے سودیشی اشیا کا استعمال کریں ۔ تاکہ اپنے ملک کا سرمایہ باہر نہ جانے پائے ۔

مغربی بنگال اور بہار کی سرحد پر ری پبلک ڈے کے شبھ دن سورگیہ دیش بندھو چترنجن داس کی بیوہ شریمتی بسنتی دیوی نے ریلوے انجن بنانے کے ایک بڑے کارخانے کا ادگھاٹن کیا ۔ ہندوستان کو اقتصادی و صنعتی خود مختاری کی طرف لے جانے کے لئے ہند سرکار نے یہ ایک اہم قدم اٹھایا ہے اس کارخانے پر ۱۴ کروڑ روپے کی لاگت آئیگی اور ہندوستان کے محکمۂ ریلوے کی کل ضروریات یعنی ۱۲۰ انجن اور ۵۰ بوائلر بنانے کے کام کو یہ کارخانہ پورا کرے گا ۔

دہلی یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے انڈونیشیا کے پریذیڈنٹ ڈاکٹر سکارنو نے امید ظاہر کی کہ انڈونیشیا کی از سر نو تعمیر میں ہندوستان اس کی مدد کرے گا ۔ آپ نے کہا کہ بھارت اور انڈونیشیا کے صدیوں سے تمدنی تعلقات ہیں اور اب بھی انڈونیشیا کو آزادی دلوانے میں ہند نے اُس کی جو امداد کی ہے اس کے لئے انڈونیشیا کے عوام ہمیشہ ہندوستان کے احسان مند رہیں گے ۔

امریکہ میں ایٹم بم سے ہزار گنا طاقت رکھنے والا ایک خوفناک ہائیڈروجن بم ایجاد کیا گیا ہے ۔ اس بم کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ جس مقام پر یہ بم پھینکا جائے گا اس کے چاروں طرف ۱۰ میل تک کا علاقہ راکھ کا ڈھیر بن جائے گا ۔ اور ۳۰۰ مربع میل سے زاید علاقہ بالکل تباہ و برباد ہو جائے گا ۔

WHY
TAKING
RISK ?
آپ کیوں
خطرات مول لیتے ہیں
زندگی میں خطرات کا مقابلہ کرنا جوانمردی کا کام ہے لیکن
بلاوجہ خطرات مول لینا کسی کو زیبا نہیں دیتا خصوصاً ادویات کے ضمن میں اگر آپ
غیر مستند دواخانوں سے ادویات خریدتے ہیں تو جان بوجھ کر اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈالتے ہیں
ہمدرد دواخانہ کا نام ادویات کے بہترین ہونے کا ضامن ہے۔ اور
شباب آور
ہمدرد دواخانہ کی طاقت مردمی کی بہترین دوا ہے۔ سردی کے صرف دو ماہ باقی ہیں ان دو ماہ میں آپ شباب آور
کے استعمال سے جسم میں نیا خون اور جوانی میں نئی امنگ پیدا کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد آپ کو کسی حال کسی اور دوا کی
ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ آج ہی اپنے مقامی ایجنٹ سے شباب آور کی ایک شیشی خرید لیجئے شباب آور استعمال کرنے
کا یہ بہترین موسم ہے قیمت فی شیشی پانچ روپے
ہمدرد دواخانہ وقف دہلی
Hamdard
TRUST

"بچوں کا آج کل"

آزاد وطن

اظہار ملیح آبادی

اپنا وطن آزاد رے ساتھی
اپنا وطن آزاد
تخت ہے اپنا تاج ہے اپنا آج سے جنتا راج ہے اپنا
تن من دھن آزاد رے ساتھی
تن من دھن آزاد
اپنا وطن آزاد
وہ مہکیں آشا کی بیلیں آؤ ساتھی مل جل کھیلیں
باغ و چمن آزاد رے ساتھی
باغ و چمن آزاد
اپنا وطن آزاد
ناچیں کھیلیں اور مسکائیں دھرتی کو آکاش بنائیں
گنگ و جمن آزاد رے ساتھی
گنگ و جمن آزاد
اپنا وطن آزاد

خوشباش

راجن بابو

مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہمارا ملک آزاد ہوا تھا۔ لیکن آزاد ہونے کے باوجود انگلستان کے بادشاہ کے برائے نام ماتحت تھا۔ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو یہ برائے نام تعلق بھی ختم ہوگیا۔ اور ہمارا دیش ایک آزاد جمہوری حکومت بن گیا۔ جمہوری حکومت کو انگریزی میں ری پبلک اور ہندی میں گن راج کہتے ہیں۔

آزاد بھارت کے پہلے پریزیڈنٹ یا صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد جی مہاتما گاندھی کے سچے بھگتوں میں سے ہیں۔ دیش کے رہنے والے محبت میں آپ کو راجن بابو کے نام سے پکارتے ہیں۔ آؤ تمھیں راجن بابو کے جیون کی چند جھلکیاں دکھائیں۔

راجن بابو ۳ دسمبر ۱۸۸۴ء کو زیرہ دوئی ضلع سارن کے ایک کائستھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ یہ قصبہ صوبہ بہار میں واقع ہے۔

بچپن میں آپ کو کھیل کود کا بہت شوق تھا۔ لیکن تعلیم کا شوق بھی کم نہیں تھا۔ آپ بڑے ہونہار اور ذہین طالب علم تھے۔ آپ میٹرک۔ ایف۔ اے۔ بی۔ اے۔ اور ایم۔ ایل۔ تمام امتحانوں میں یونیورسٹی میں اوّل رہے۔ ایسی مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔

بچپن میں آپ خوب سوتے تھے۔ کئی بار شام کا کھانا کھانے سے پہلے ہی سو جاتے۔ اُن کی ماتا سوتے ہی میں اُن کو کھانا کھلا دیا کرتیں۔ صبح کو انھیں معلوم بھی نہ ہوتا کہ انھوں نے رات کو کیا کھایا تھا۔

اس زمانے کے رواج کے مطابق آپ کی شادی صرف ۱۳ برس کی چھوٹی عمر ہی میں ہوگئی تھی۔ کہتے ہیں کہ آپ پالکی ہی میں سو گئے تھے۔ اِدھر شادی کی رسمیں ادا ہو رہی تھیں، اُدھر آپ اونگھ رہے تھے۔

آپ کا حافظہ بہت ہی تیز تھا۔ آپ کی حیرت انگیز تعلیمی کامیابیوں کی یہ ایک خاص وجہ ہے۔ آپ نے یہ عہد کر لیا تھا کہ بدیشی کپڑے نہیں پہنوں گا۔ اور سرکاری نوکری نہیں کروں گا۔ آپ ولایت جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے

تھے۔ لیکن گھر والوں نے جانے نہیں دیا۔ ۱۹۰۹ء میں آپ
نے وکالت شروع کی۔ بہت جلد اس میدان میں بھی آپ
بہت کامیاب ثابت ہوئے۔

ایک مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں آپ ولایت
بھی گئے۔ اور وہاں آپ نے اپنی قابلیت کا بڑے قابل
انگریز وکیلوں پر سکہ جما دیا۔

آپ سادگی اور نیک نیتی میں تو اپنا جواب نہیں رکھتے
وی آنا کی ایک کانفرنس میں شریک ہوتے وقت بھی آپ
کے سر پر کشمیر کے بُنے ہوئے پٹو کی کھردری ٹوپی تھی۔ مصر
کے مینار دیکھتے وقت پرانی طرز کی اچکن اور پاجامہ پہن
رکھا تھا۔ فرانس کے مشہور ادیب رومن رولاں سے ملے تو
بدن پر وہی سادہ لباس تھا۔ ولایت سے واپس آکر آپ
نے اپنی خدمات دیش کے ارپن کر دیں۔ قومی یونیورسٹی کی
بنیاد رکھی اور خود اس کے پرنسپل بن گئے۔

راجن بابو بڑے اچھے مضمون نگار بھی ہیں۔ آپ کئی
کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ اڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ بہار
میں جب زلزلہ آیا تو آپ نے اپنے صوبے کے تباہ حال
لوگوں کی بہت سیوا کی تھی۔

پچاس برس کی عمر میں آپ کانگریس کے صدر بنے اور
ہندوستان بھر کا دورہ کرکے مہاراشٹر۔ پنجاب۔ تامل ناڈ
کیرالہ۔ کرناٹک۔ یو۔ پی۔ اندھرا اور صوبہ سرحد غرضیکہ
ہندوستان کے کونے کونے تک کانگریس کا پیغام
پہنچا کر لوگوں کے دلوں میں آزادی کی روح پھونکی۔

آپ اردو۔ ہندی۔ فارسی۔ بنگالی۔ گجراتی۔ بہاری
سنسکرت۔ انگریزی زبانیں جانتے ہیں۔

آپ مہاتما گاندھی کے پہلے ساتھیوں میں سے ہیں
اور ایک سچے ستیہ آگرہی ہیں۔ آپ کئی بار جیل گئے۔ آپ
کو بہار کا گاندھی اور دیش رتن بھی کہا جاتا ہے۔

نیا آئین بنانے کے لئے ملک نے جو اسمبلی چنی تھی آپ
اُس کے پردھان تھے۔ آپ کی سادہ دلی اور نرم مزاجی
کی وجہ سے سب ممبر آپ سے خوش تھے۔

چنانچہ بغیر کسی مقابلے کے آپ ہمارے آزاد
ملک کے پہلے صدر چنے گئے۔ ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء
کو دہلی میں لاکھوں آدمیوں نے آپ کا جلوس
دیکھا۔ آپ نے فوجوں کی سلامی لی۔ دہلی ان
دنوں دلھن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ رات کو اس
خوشی میں مختلف جگہوں پر روشنی کی گئی۔ بعض
مقامات تو بہت ہی قابلِ دید تھے۔

بچو! راجن بابو کی خوبیاں تم نے سن
لیں۔ اگر تم ان کے جیون سے سبق سیکھو
اور اسی راستے پر چلو تو تم میں سے بھی
راجن بابو ایسے نیک اور اونچے انسان پیدا ہو سکتے
ہیں۔ آج سے تم اس بات کا عہد کرو کہ اپنا جیون دیش سیوا
میں گذارو گے اور نیک عمل سے ایک مثال قائم کرو گے۔

حامد اللہ افسر

دُنیا کی سب سے قیمتی چیز

اب سے بہت پہلے سمندر کے کنارے ایک شہر تھا اُس کا نام تھا استور، یہ شہر بہت خوبصورت تھا، اور اس کے رہنے والے بہت خوش حال تھے، بات یہ تھی کہ وہ لوگ تجارت کرتے تھے۔ اُن کے جہاز دُور دُور کے ملکوں میں جاتے تھے، اور تجارت کر کے بہت بہت سا روپیہ وہاں سے لاتے تھے۔

استور کے سب سے بڑے سوداگر کا نام طومان تھا، اس کے پاس بہت روپیہ تھا اور اُسے اپنے مال پر اور اپنی دولت پر بڑا گھمنڈ تھا، ایک دن اُس نے اپنے سب سے بڑے جہاز کے کپتان کو بُلایا اور اُس سے کہا۔ "اب جو تم دُور دُور کے ملکوں سے واپس آؤ تو دُنیا کی سب سے قیمتی چیز اس جہاز میں بھر کر لانا۔"

کپتان سوچنے لگا کہ دُنیا کی سب سے قیمتی چیز کیا ہو سکتی ہے، جب اس کی سمجھ میں نہ آیا تو اُس نے طومان سے پوچھا، "میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا، کیا آپ سونا منگانا چاہتے ہیں یا ہیرے یا ریشم؟"

طومان بولا۔ "یہ میں خود نہیں جانتا کہ دُنیا کی سب سے قیمتی چیز کیا ہو سکتی ہے۔ تم جہان بھر میں جاتے ہو، جہان بھر کی چیزیں دیکھتے ہو، یہ تو تم ہی بتا سکتے ہو کہ دُنیا کی سب سے قیمتی چیز کیا ہے۔ میں استور کا سب سے بڑا آدمی ہوں، میں چاہتا ہوں کہ میرے پاس کوئی ایسی چیز ہو جو اور کسی کے پاس نہ ہو۔ اچھا اب تم جاؤ اور میرے لیئے دُنیا کی سب سے قیمتی چیز لاؤ۔"

کپتان اپنا جہاز لے کر چلا۔ جب کچھ دُور نکل گیا تو اُس نے اپنے ساتھیوں کو بُلایا اور طومان کا حکم انھیں سُنایا۔ اور اُن سے کہا "تم لوگ سوچ سمجھ کر مجھے بتاؤ"

کہ دُنیا کی سب سے قیمتی چیز کیا ہے؟'

ایک ساتھی بولا "سونا"۔

دوسرے نے کہا "نہیں ریشم"۔

تیسرے نے رائے دی "میرے نزدیک دُنیا کی سب سے قیمتی چیز ہیرا ہے"۔

کپتان ایک ایک کر کے سب سے پُوچھ رہا تھا، اور ہر ایک کی رائے الگ تھی۔ کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ۔

آخر ایک لڑکا جو جہاز کا مزدور تھا۔ بولا "کپتان صاحب میں جانتا ہوں کہ دُنیا کی سب سے قیمتی چیز کیا ہے؛ مجھے بُھوک نے یہ بات بتائی ہے کہ وہ چیز گیہوں ہے۔

اس لڑکے کی بات کپتان کے دل میں بیٹھ گئی، دُنیا میں گیہوں سے زیادہ قیمتی چیز کوئی نہیں ہو سکتی، اُس نے حکم دیا کہ جہاں کہیں اچھی قسم کا گیہوں ملے خرید لیا جائے۔

جب جہاز استور پہنچا تو وہ گیہوں سے بھرا ہوا تھا۔

(۲)

اب اُدھر کا حال سُنو، جب کپتان جہاز لے کر چلا گیا تو جہاز کے مالک طومان نے استور کے لوگوں سے کہنا شروع کیا "میں نے اپنے کپتان کو حکم دیا ہے کہ دنیا کی سب سے قیمتی چیز جہاز میں بھر کر لاؤ۔ وہ کوئی ایسی چیز لائے گا جو استور میں کسی کے پاس نہ ہوگی"۔

استور کے بسنے والے سوچتے تھے کہ آخر وہ کیا چیز ہوگی جو طومان کا کپتان لے کر آئے گا۔ پر اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا سب کو بڑا انتظار تھا کہ جہاز آئے تو پتہ چلے کہ دنیا کی سب سے قیمتی چیز کیا ہے۔

آخر خدا خدا کر کے جہاز آگیا۔ طومان نے کہا تم اتنی جلدی کیونکر آ گئے۔ میرے لئے کیا لائے۔ دنیا کی سب سے قیمتی چیز مجھے دکھاؤ"۔

کپتان نے جواب دیا "میں آپ کے لئے بہت اچھی قسم کا گیہوں لایا ہوں۔ سارا جہاز گیہوں سے بھرا ہوا ہے"۔

طومان غصہ میں بھر کر بولا "کیا گیہوں؟ بے وقوف کپتان میں نے تجھ سے دنیا کی سب سے قیمتی چیز لانے کے لئے کہا اور تو گیہوں جیسی معمولی چیز لے کر آیا ہے۔ گیہوں جو اس قدر عام چیز ہے کہ ہر گھر میں موجود ہے۔ لوگ سُنیں گے تو مجھ پر ہنسیں گے۔ جاؤ وہ سارا گیہوں جو تم لائے ہو سمندر میں پھینک دو"۔

کپتان نے کہا۔ گیہوں دنیا کی سب سے قیمتی چیز ہے۔ اسی لئے میں گیہوں بھر لایا۔ ممکن ہے ایک دن ایسا آجائے جب لاکھوں غریبوں کی طرح بھوک تجھے ستائے۔ اور تو کچھ کھانے کے لئے نہ پائے۔ اُس وقت تجھے گیہوں کی قدر معلوم ہوگی"۔

شہر کے غریب بھوکے لوگوں نے بھی طومان سے کہا کہ اس گیہوں کو سمندر میں نہ پھینکو مگر وہ ایک نہ مانا۔ اور سارا گیہوں سمندر میں اُلٹ دیا گیا۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس واقعہ کے دو چار روز بعد ہی سمندر میں بہت زور کا طوفان آیا اور طومان کے سارے جہاز ڈوب گئے۔ اسی طوفان میں پانی کی موجوں نے سمندر سے گیہوں نکال کر کنارے پر ڈال دیا۔

کچھ دن تک تو طومان کا کام چلتا رہا۔ آخر ہوتے ہوتے سارا روپیہ ختم ہو گیا۔ اور اس کے پاس کچھ نہ رہا۔ یہاں تک کہ فاقوں کی نوبت آ گئی۔

ایک روز بھوک کا ستایا ہوا طومان سمندر کے

کنارے پر جا پہنچا۔ دیکھتا کیا ہے کہ دُور تک سارا کنارا ہرا بھرا ہو رہا ہے۔ بات یہ تھی کہ طوفان کے جھکولوں نے جو گیہوں کنارے پر پھینک دیا تھا وہ پھوٹ نکلا۔ طومان بہت خوش ہوا۔ جو گیہوں اُس نے اپنی بے وقوفی سے سمندر میں پھینک دیا تھا وہ خدا کے حکم سے کنارے پر آ گیا۔ اور ایک ایک دانے سے لاکھوں دانے پیدا ہونے کا سامان ہو گیا۔ اب بھوک نے اُسے بتا دیا تھا کہ دُنیا میں کوئی چیز گیہوں سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔

وید پرکاش گوئل

سائنس کے کھیل

بچوں کا ٹیلیفون۔ بچو! ٹیلیفون تو تم نے ضرور دیکھا ہوگا۔ اور ٹیلیفون پر باتیں بھی کی ہوں گی۔ لو ہم آج تمھیں ایک انوکھا اور سستا ٹیلیفون تیار کرنے کی ترکیب بتاتے ہیں۔

دیا سلائی کے دو خالی بکس لو اور اُن کے اوپر کے حصے الگ کر دو۔ اندر کے حصوں میں ایک ایک سوراخ کر کے ایک لمبے سے دھاگے کے کنارے اُن میں گزار دو۔ اور کناروں پر چھوٹے چھوٹے تنکے باندھ دو۔ تاکہ دھاگہ بکسوں سے باہر نہ نکل سکے۔ ایسا کرنے کے بعد بکسوں کو اچھی طرح سے بند کر دو۔ بس ٹیلیفون تیار ہو گیا۔

اس ٹیلیفون کو کام میں لانے کا طریقہ یہ ہے کہ دو بچے کافی فاصلے پر کھڑے ہو جائیں اور دھاگے والا ایک ایک بکس اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ پہلے ایک بچہ اپنے بکس کو منہ سے لگا کر آہستہ سے بات کرے۔ اور دوسرا لڑکا اپنے بکس کو کان سے لگائے وہ اپنے دوست کی باتیں بالکل اصلی ٹیلیفون کی مانند سُن سکے گا اس کے بعد وہ بکس کو منہ سے لگا کر بات کرے اور سامنے کھڑا لڑکا کان سے لگا کر سُنے۔

کہو بچو! کتنا سستا اور اچھا ٹیلیفون تیار ہو گیا؟

کھلونوں کا ناچ۔ ایک بڑا سا لٹو بازار سے خرید لاؤ۔ اور اس کی کیل نکال کر اس کی جگہ مقناطیسی لوہے کی کیل لگا دو۔ بازار سے مقناطیسی لوہے والا لٹو بھی مل سکتا ہے۔ اب لوہے کی بہت پتلی چادر پر پنسل سے ننھے ننھے نقشے بنا کر قینچی سے کاٹ لو اور انھیں ایک ہموار میز یا زمین پر رکھ دو۔ اور اُن کے پاس اُس لٹو کو زور سے گھماؤ۔ کیل کے مقناطیسی اثر سے تمام کھلونے ایک ساتھ گھومنے لگیں گے۔ اور ایسا معلوم ہوگا گویا سب کھلونے ناچ رہے ہیں۔

ہندسوں کی تصویریں

(فاطمہ جاوید)

پیارے بچو! تمھیں ہندسوں کی تصویریں بنانا آتا ہے. تو ہم تمھیں اس کا طریقہ بتاتے ہیں۔ اگر تمھیں یہ طریقہ پسند آجائے تو اس بارے میں تم ایڈیٹر صاحب کو ضرور لکھنا تاکہ ہم اردو، ہندی، انگریزی، گجراتی اور بنگلہ زبان کے حرفوں کی تصویریں تمھارے لیے بھیجتے رہیں۔ تو اب تم نقطہ سے لے کر گیارہ کے ہندسے تک تصاویر دیکھو۔ اور انھیں بنانے کی مشق بھی کرو۔ لیکن اتنا یاد رکھنا کہ یہ ابھی ابتدائی خاکے ہیں اگر تم نے ان سے دلچسپی کا اظہار کیا تو پھر ہم سچ مچ کی تصویریں بنانے کا آسان طریقہ بھی بتلاتے رہیں گے۔

مریض ۔ ڈاکٹر صاحب آپ نے میری جان بچالی ہیں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں ۔

ڈاکٹر ۔ آپ کی جان تو خدا نے بچائی ہے ۔ میں کون ہوں جان بچانے والا ۔

مریض ۔ تو پھر آپ بل کی رقم کس لئے مانگ رہے ہیں ؟

مجسٹریٹ ۔ (ملزم سے) تمھیں بری کیا جاتا ہے ۔ تم پر جو چوری کا الزام لگایا گیا تھا ۔ ثابت نہیں ہو سکا ۔

ملزم ۔ تو حضور ! اب میں وہ چوری کی گھڑی مالک کو دے دوں یا اپنے پاس ہی رکھوں ؟

اُستاد ۔ تم نے آج تک سب سے لمبا لفظ کونسا پڑھا ہے ؟

شاگرد ۔ جناب "ربڑ"

اُستاد ۔ کیسے ؟

شاگرد ۔ ربڑ کو کھینچ کر جتنا لمبا چاہو کیا جا سکتا ہے ۔

تاریخ کا امتحان

اُستاد ۔ پیشوا کے دربار میں نانا فرنویس کا کیا بول رہا تھا ؟

موہن ۔ طوطی ۔

اُستاد ۔ شاباش بیٹھ جاؤ ۔

اُستاد ۔ احمد نگر کی لڑائی میں چاند بی بی کی فوج کے کیا اکھڑ گئے ؟

اسلم ۔ پاؤں ۔ اُستاد ۔ شاباش بیٹھ جاؤ ۔

اُستاد ۔ کشمیر میں ہندوستانی فوج کے سامنے قبائلی لٹیرے کیا دبا کر بھاگے

رحیم ۔ دُم ۔

اُستاد ۔ شاباش بیٹھ جاؤ ۔

اُستاد ۔ ۲۶ جنوری کو ہندوستان میں مکمل آزادی کا کیا

سوہن ۔ اعلان ۔

اُستاد ۔ شاباش بیٹھ جاؤ ۔
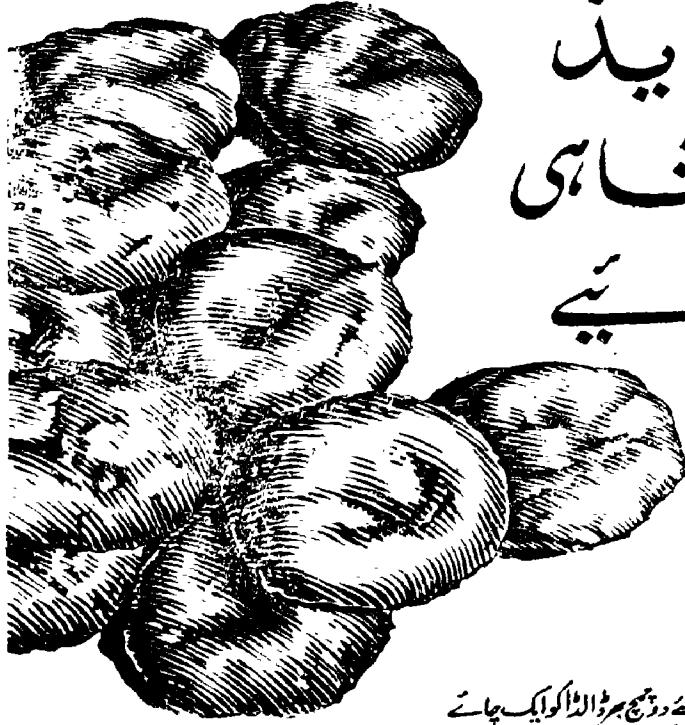
تین بالوشاہی بنانے کیلئے دو چمچ بھر ڈالڈا کو ایک چائے کی پیالی بھر میدے میں ملا کر گوندھئے، بعد ازاں اسکے چپٹے دائرے بنائیے اور بیچ میں خفیف سا گڑھا کر دیجئے۔ ڈالڈا کو خوب گرم کر کے آنچ سے اتار لیجئے اور بنائے ہوئے دائروں کو ابلتے ہوئے ڈالڈا میں سرخ کر تلئے۔ جب ڈالڈا ابلنا بند ہو جائے تو کڑھائی کو پھر آنچ پر چڑھا دیجئے! اسی طرح سے اتارتے چڑھاتے رہیے جب تک بالوشاہی چاروں طرف سُرخ نہ ہو جائے اور پھول نہ جائے۔ اسکے بعد انہیں نکال کر چھلنی پر رکھئے اور گاڑھی گرم چاشنی میں ڈبو کر ٹھنڈا کر لیجئے۔

ڈالڈا ایک خالص نباتی چکنائی ہونے سے یہ ایسے کھانوں کو پکانے کیلئے موزوں ہے جن کے لئے زیادہ وقت درکار ہے اور اسی بنا پر انہیں اچھی طرح سے پکا دیتا ہے۔

HVM. 119-172UD

Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No. D.—21
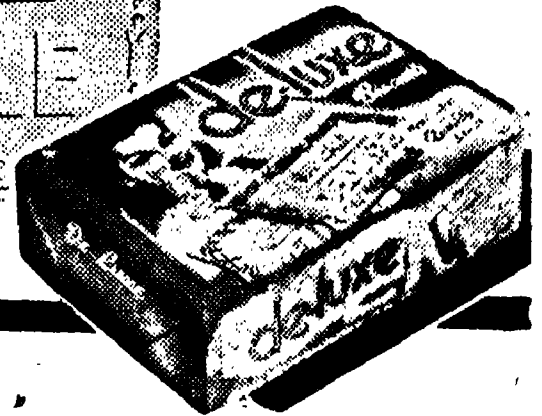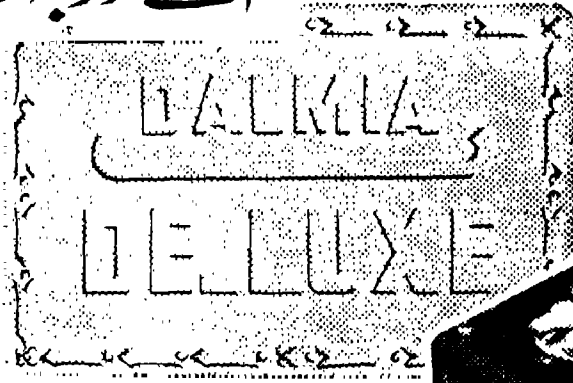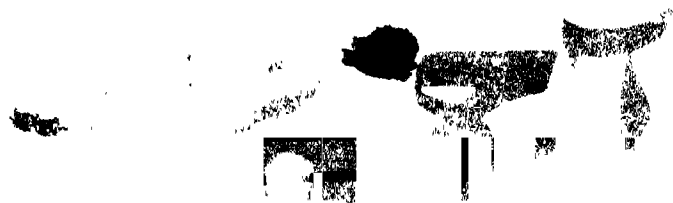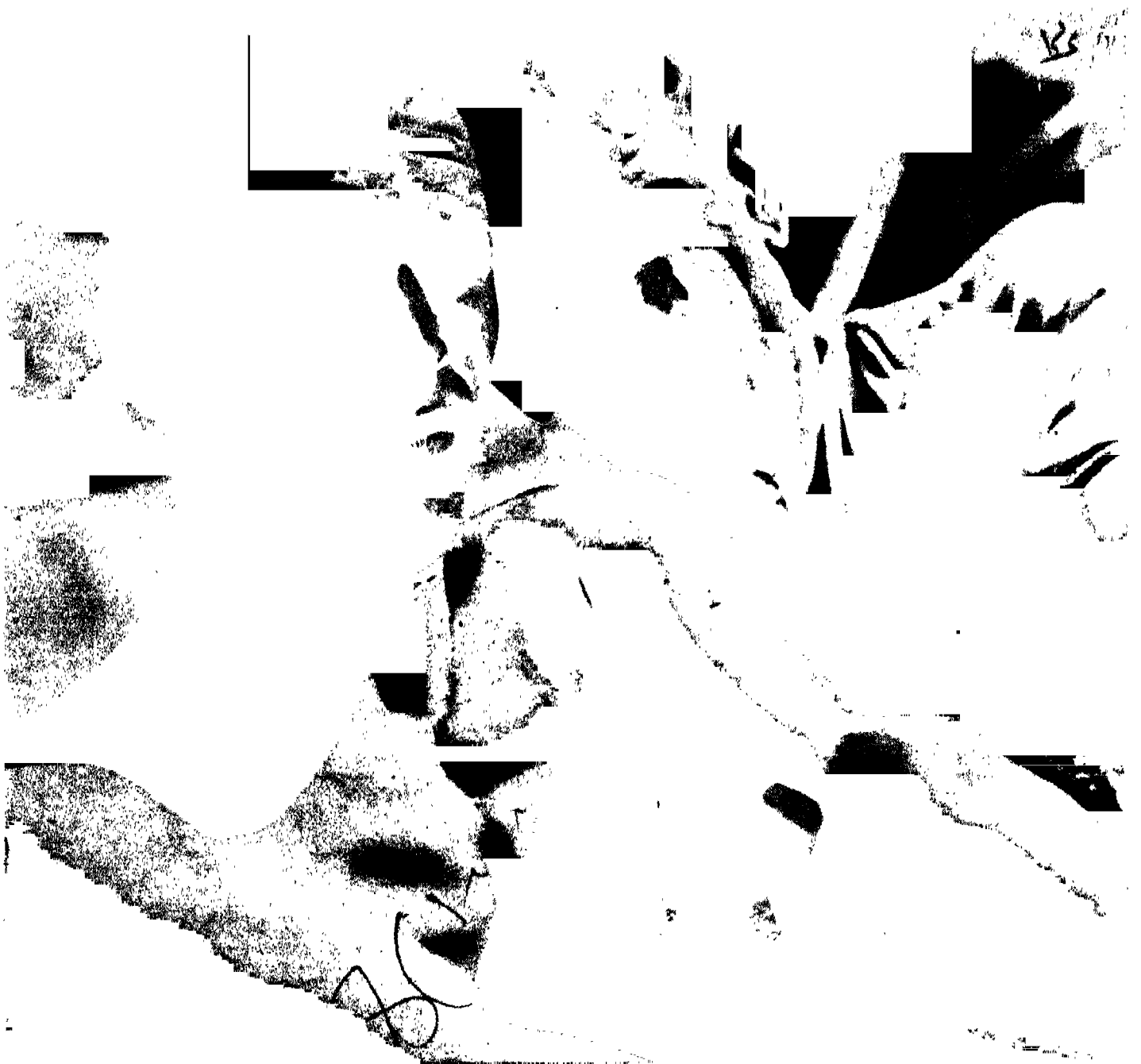
کیا آپ جانتے ہیں کہ
حسین الوکا دیوی
اپنی جلد کو دلکش رکھنے کیلئے
لکس ٹائلٹ صابن
کو ہی کیوں پسند کرتی ہے؟
آپ کہتی ہیں :-
"جلد کو ملائم اور دلکش رکھنے کا ایک آسان ذریعہ
لکس ٹائلٹ صابن کا روزانہ استعمال ہے۔ اور یہ میری جلد کو
خوبصورت و نفیس رکھتا ہے۔" یہ حسین فلمی ستارہ کہتی ہے "لکس ٹائلٹ صابن
کی سحر آمیز خوشبو سے مجھے نہایت پسند ہے۔"
LUX
یہ سفید اور خالص صابن،
جس کی خوشبو دلکش ہے،
آپ کی جلد کو بھی دلکش بنا رکھیگا!
LTS. 230-103.UD

اُردو کا مقبول عوام معتبر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ایڈیٹر: جوش ملیح آبادی

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عرش ملسیانی
جگن ناتھ آزاد

جلد ۸ —— نمبر ۱۲

سالانہ چندہ —— چھ روپے

فی پرچہ —— آٹھ آنے

جون ۱۹۵۰ء

ترتیب

بچوں کا آج کل

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

بسمل سعیدی

دو غزلیں

پاتے نہیں ہیں عیب کو بھی کم ہنر سے ہم
جب دیکھتے ہیں چشمِ حقیقت نگر سے ہم

اُن کے فریبِ لطف کے دن بھی گزر گئے
اب مطمئن ہیں اپنے غمِ معتبر سے ہم

کتنا بلند عشق کی غیرت نے کر دیا
جس دن سے گر گئے ہیں تمہاری نظر سے ہم

دو دن میں ہو گیا ہے یہ عالم کہ جس طرح
تیرے ہی اختیار میں ہوں عمر بھر سے ہم

خود جس قدر بلند ہیں اپنی نگاہ میں
اتنے نہ گر سکیں گے تمہاری نظر سے ہم

بیٹھیں تو کس اُمید پہ بیٹھے رہیں یہاں
اُٹھیں تو اُٹھ کے جائیں کہاں تیرے در سے ہم

دیکھیں گے کیا کسی کو اب اپنی نگاہ سے
خود کو بھی دیکھتے ہیں تمہاری نظر سے ہم

بسمل مسافرت کی یہ ساری مصیبتیں
پہلے ہی دل میں سوچ کے نکلے ہیں گھر سے ہم

کب سے اُلجھ رہے ہیں دمِ واپسیں سے ہم
دو اشک پونچھنے کو تری آستیں سے ہم

ہو گا تمہارا نام ہی عنوانِ ہر ورق
اوراقِ زندگی کو اُلٹ دیں کہیں سے ہم

سنگِ درِ عدو پہ ہماری جبیں نہیں
یہ سجدے کر رہے ہیں تمہاری جبیں سے ہم

دُہرائی جا سکے گی نہ اب داستانِ عشق
کچھ وہ کہیں سے بھول گئے ہیں کہیں سے ہم

بسمل حریمِ حسن میں ہیں کامیابِ شوق
جوشِ شباب و رنگِ رُخِ آتشیں سے ہم

عبادت بریلوی

حالی کے تنقیدی نظریات

حالی کی شخصیت کو اردو ادب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے اردو ادب کے مختلف شعبوں میں اپنے کارناموں سے اضافے کئے۔ شاعری میں ان کا پایہ مسلم ہے۔ اور ان میں ایک بڑے شاعر کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ سوانح نگاری ان کا خاص میدان ہے۔ اردو میں انہیں کے ہاتھوں اس فن کی ابتدا ہوئی۔ علمی مقالات لکھنے میں بھی وہ پیش پیش رہے ہیں۔ اور انہوں نے تنقید نگاری کی طرف بھی خصوصیت کے ساتھ توجہ کی ہے۔ چنانچہ وہ ایک بڑے نقاد بھی ہیں۔ انہوں نے صحیح معنوں میں اردو کو نظریاتی تنقید سے روشناس کیا۔ اور انہیں نظریات کی روشنی میں اردو کے مختلف اصناف کا صحیح اور صحت مند جائزہ لینے کی کوشش کی۔ اردو ادب کی ہر صنف پر ان کے تنقیدی نظریات کے اثرات بڑے گہرے اور ہمہ گیر ہیں۔

یوں تنقید پر ان کی مستقل کتاب مقدمۂ شعر و شاعری ہی ہے لیکن ان کی دوسری تصانیف میں بھی جگہ جگہ سے تنقیدی خیالات ملتے ہیں جن سے ان کے نظریات تنقید کی [illegible] ہے۔ یادگارِ غالب، حیاتِ سعدی اور حیاتِ جاوید اگرچہ سوانح عمریاں ہیں لیکن تنقیدی پہلو ان میں بھی موجود ہے۔ ان کے علاوہ ان کے کچھ مضامین اور تبصرے بھی ہیں جو مختلف رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے، اور جن کو انجمن ترقی اردو نے مقالات حالی کے نام سے شائع کردیا ہے۔ یہ مضامین اور تبصرے بھی ان کے تنقیدی نظریات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

حالی کے نظریات تنقید کا مطالعہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ وہ فنون لطیفہ کی اہمیت کے قائل ہیں ان کے نزدیک فنون لطیفہ اور شاعری بیکار چیزیں نہیں۔ جس طرح دوسرے فنون انسان کے لئے مادی اعتبار سے سکون کا باعث بنتے ہیں، اسی طرح شاعری بھی انسان کو سکون پہنچاتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کی تخلیق بھی دوسرے فنون کی تخلیق سے کچھ کم ضروری نہیں۔ حالی شاعری کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانی زندگی میں اس کا بھی ایک مقصد ہے۔ "بعض لوگ اس کا استعمال غلط طریقے پر کرتے ہیں لیکن جو باشعور لوگ اس عطیۂ الٰہی کو فطرت کے موافق کام میں لائیں گے، ممکن نہیں کہ اس کو سوسائٹی سے کچھ فائدہ نہ پہنچے۔"

ان خیالات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حالی شعر کی اچھائی اور برائی دونوں کے قائل ہیں۔ لیکن وہ چاہتے یہ ہیں کہ شعر کسی بلند مقصد اور اچھے کام کے لئے استعمال ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس کی افادیت کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک شاعر کے سامنے ایک بلند نصب العین کا ہونا ضروری ہے۔ اس طرح جہاں تک شاعری اور اس کے مقصد کا تعلق ہے، وہ افلاطون کے ہم نوا ہیں۔ چنانچہ شعر کا بیان کرتے ہوئے انہوں نے افلاطون کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن وہ افلاطون کی طرح شاعروں کو ریاست یا جمہوریہ سے باہر نکالنا نہیں چاہتے۔ بلکہ انہیں کسی خاص مقصد کے لئے زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اور یہ مقصد ہے شعر کے ذریعے سے سوسائٹی کو فائدہ پہنچانا۔ افلاطون خود بھی اس کا قائل ہے۔ اور اس کے نزدیک شاعری اس حد تک شاعری ہے جس حد تک اس سے کسی سماجی بہتری کی توقع ہو۔ ورنہ اس کے خیال میں وہ غیر ضروری اور مضر ہے۔ حالی بھی اس کے ہم نوا ہیں۔

شاعری کا مقصد حالی نے جذبات کا برانگیختہ کرنا قرار دیا ہے۔ جذبات کے برانگیختہ کرنے سے ان کا مقصد بنی نوع انسان کے دل میں ایک قسم کی جولانی اور امنگ کا پیدا کرنا ہے۔ تاکہ ان پر چھائے ہوئے ناامیدی کے بادل چھٹ سکیں۔ اور ان میں عمل کی صلاحیت بیدار ہو۔ حالی کا یہ نظریہ اپنے وقت کی آواز سے ہم آہنگ ہے۔ جس زمانے میں حالی نے اس کو پیش کیا ہے، اس وقت ہماری

ساری زندگی پر مُردنی چھائی ہوئی تھی ۔ سماج کے افراد کچھ کرنا تو درکنار کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتے تھے ۔ زندگی سے فرار اور بنیادی مسائل سے چشم پوشی کو انہوں نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔ حالی ان حالات سے متاثر ہوئے اور انہیں کے زیر اثر انہوں نے اپنے نظریات کی تشکیل کی ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاعری کے لئے جذبات میں ہیجان پیدا کرنے کو ضروری قرار دیتے ہیں ۔ انہیں خیالات کے زیر اثر انہوں نے شاعری کے اخلاقی پہلو پر بھی زور دیا ہے ۔ ان کے خیال میں "شعر اگرچہ براہ راست علم الاخلاق کی طرح تلقین اور تربیت نہیں کرتا لیکن از روئے انصاف اس کو اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں"۔ اس تنقیدی نظریے نے بھی اس زمانے کے حالات ہی کے زیر اثر تشکیل پائی ۔ اس زمانے میں سماجی زندگی کی انحطاطی کیفیت نے سماج کے افراد کو اخلاقی اعتبار سے پست کر دیا تھا چنانچہ ایسے زمانے میں شاعری کے متعلق اس قسم کے خیالات قائم کرنا نہایت ضروری بات تھی ۔ حالی نے اسی وجہ سے اس قسم کے خیالات پیش کئے ۔

حالی کے ان تنقیدی نظریات میں جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے افلاطون کا اثر غالب ہے ۔ حالی کو عربی میں اچھی دستگاہ حاصل تھی اور انہوں نے بہت کچھ اسی زبان سے حاصل کیا تھا ۔ افلاطون کے خیالات سے بھی وہ عربی ہی کے ذریعے سے روشناس ہوئے ہوں گے اگرچہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا لیکن قیاس سے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بہت ممکن ہے افلاطون کی تصانیف کے عربی ترجمے ان کے ہاتھ لگ گئے ہوں ۔ ایک زمانے میں عربوں نے مغربی مفکرین کے تراجم کی طرف خاص طور پر توجہ کی تھی ۔ "روما الکبریٰ کا عروج اور نشاۃ الثانیہ کے درمیان تک یورپ میں علم کا چرچا کم ہو گیا تھا ۔ اور عربوں نے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا ۔ چنانچہ عباسی دور میں بکثرت کتابوں کا براہ راست یونان اور اکثر کا سریانی ترجموں سے عربی میں ترجمہ کیا گیا" ۔ بہرحال حالی نے انہیں ترجموں سے استفادہ کیا ہوگا ۔ اس کا ثبوت خود ان کے تنقیدی نظریات سے ملتا ہے جن میں ادب و شعر کی افادیت اور اس کے اخلاقی پہلو پر انہوں نے کافی نور دیا ہے ۔

شاعری حالی کے خیال میں سوسائٹی کے تابع ہوتی ہے ۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ شاعری سوسائٹی سے متاثر ہوتی ہے ۔ اور ساتھ ہی ساتھ شاعری کا اثر سوسائٹی پر بھی پڑتا ہے ۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں ۔ حالی کا یہ نظریہ ادب میں بالکل نیا ہے ۔ اور اس کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ مغرب کے اثرات اور وہاں کے تنقیدی نظریات نے حالی کو اس قسم کے خیالات قائم کرنے کے لئے مجبور کیا ۔ اس بات کا پتہ چلنا مشکل ہے کہ وہ یورپ کے کس نقاد کے تنقیدی نظریات سے متاثر ہوئے کیونکہ ان کی تحریروں سے ان کی وضاحت پوری طرح نہیں ہوتی ۔ وہ صرف ملٹن اور مکالے کا تذکرہ کرتے ہیں ۔ وہ خود انگریزی نہیں جانتے تھے ۔ اس لئے یہ خیال ہوتا ہے کہ انہوں نے ممکن ہے ملٹن کے متعلق مکالے کا مضمون کسی سے پڑھوا کر سنا ہو ۔ بہرحال اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ یورپ کے صرف گنتی کے چند نقادوں سے واقف تھے ۔ وہاں کے نقادوں کے خیالات کا ان کو پوری طرح علم نہیں تھا ۔ اسی لئے انہوں نے اس سلسلے میں صرف سنی سنائی باتوں سے کام لیا لیکن چونکہ وہ بلا کے ذہین، طباع اور غور و فکر کے عادی تھے ۔ اس لئے وہ ان تنقیدی نظریات کو زیادہ آسانی کے ساتھ پیش کر سکے ۔ اس میں کچھ ان سماجی حالات کو بھی دخل ہے جو اس زمانے میں عام تھے اور جن کے جائزہ لینے کا صحیح شعور حالی کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھا ۔ ادب اس زمانے میں سوسائٹی پر خراب اثر ڈال رہا تھا ۔ اس میں پست خیالات اور چھچھورے جذبات و احساسات پیش کئے جاتے تھے ۔ جس کی وجہ سے سماجی زندگی زہریلی ہوتی جا رہی تھی ۔ ان حالات کو دیکھ کر حالی کو سماجی اصلاح کا خیال آیا اور وہ شاعری اور سماج کے تعلق اور اس کے مقصدی و افادی ہونے کے قائل ہو گئے ۔

شاعری کی ماہیت کے متعلق انہوں نے جو خیالات پیش کئے ہیں وہ بہت وسیع مطالعے کا نتیجہ نہیں ہیں ۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ صرف لارڈ مکالے کا قول نقل کرتے ہیں ۔ اس قول کو بھی انہوں نے شاید سُن لیا تھا ۔ مکالے کی ان دنوں بڑی شہرت تھی ۔ وہ ہندوستانیوں کی تعلیم کے سلسلے میں بہت مشہور ہو چکا تھا ۔ ہندوستانی اور خصوصاً مسلمان اس کی شخصیت کو بہت اہم سمجھتے تھے ۔ شاید حالی نے مکالے کا جو قول نقل

کیا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اس کے خیالات کو سامنے رکھ کر انہوں نے چند نتائج نکالے ہیں۔ اور خصوصیت کے ساتھ ملٹن کی شاعری کے متعلق اس کا مضمون اپنے سامنے رکھا ہے۔ جس میں اس نے شاعری اور تہذیب کی ترقی اس کے عناصر اس کی ماہیت اور پھر ان سب کی روشنی میں ملٹن کی شاعری پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔

حالی نے شعر کی تعریف کے سلسلے میں اگرچہ مکالے کا قول پیش کیا ہے لیکن وہ اس سے پوری طرح اتفاق نہیں کرتے۔ شعر کی تعریف کے سلسلے میں مکالے نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کی بنیاد ارسطو کے اس خیال پر رکھی ہے کہ شاعری ایک قسم کی نقالی ہے جو بڑی حد تک مصوری بت تراشی اور ڈراما سے مشابہ ہے۔ اس کے بعد وہ ان سب کا آپس میں مقابلہ کرتا ہے۔ حالی کا خیال ہے کہ "لارڈ مکالے نے جو کچھ شعر کی نسبت لکھا ہے گو اس کو شعر کی تعریف نہیں کہا جا سکتا لیکن شعر سے جو کچھ آج کل مراد لی جاتی ہے اس کے قریب قریب ذہن کو پہنچا دیتا ہے" اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ بڑی حد تک مکالے کے خیال سے متفق ہیں۔ مکالے شاعری کو نقالی سمجھتا ہے۔ حالی کے نزدیک بھی وہ ایک قسم کی نقالی ہے۔

مکالے کے علاوہ انہوں نے ایک اور محقق کا نظریہ بھی پیش کیا ہے لکھتے ہیں "۔ جو خیال ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعے سے اس لئے ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اس کو سن کر یا خوش یا متاثر ہو وہ شعر ہے خواہ وہ نظم میں ہو خواہ نثر میں"

خیال ان کے نزدیک اہم ہے چنانچہ وہ شعر کے لئے قافیہ ردیف اور وزن کا التزام بھی ضروری نہیں سمجھتے لیکن یہ بات ضرور مانتے ہیں کہ وزن سے شعر کا اثر بڑھ جاتا ہے۔ قافیہ ردیف اور وزن سے ان بیزاری کا سبب صرف یہ ہے کہ حالی شاعری کو قافیہ پیمائی بنانا نہیں چاہتے۔ خیال ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد یہ ظاہری خوبیاں آتی ہیں۔ وہ شعر کو قافیے اور وزن کا پابند کرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ وزن اور قافیے کو شعر کا پابند کرنا چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے نزدیک یہ دونوں چیزیں شعر کی ماہیت سے خارج ہیں۔ انہوں نے صاف صاف لکھا ہے۔ "کہ وزن اور قافیہ جس پر ہماری موجودہ شاعری کا مدار ہے اور جس کے سوا اس میں کوئی مخصوصیت ایسی نہیں پائی جاتی جس کے سبب سے شعر پر شعر کا اطلاق کیا جا سکے اور یہ دونوں شعر کی ماہیت سے خارج ہیں" ۔ ان کے نزدیک صرف عروض کا ماہر شاعر نہیں ہو سکتا۔ شاعر اور غیر شاعر میں یہی چیز مابہ الامتیاز ہے کہ شاعر معانی کا خیال رکھتا ہے اور غیر شاعر کے نزدیک قافیہ پیمائی شاعری کی معراج ہوتی ہے۔

اچھا شاعر ہونے کے لئے وہ تین شرطوں کو ضروری قرار دیتے ہیں

(۱) تخیل

(۲) کائنات کا مطالعہ

(۳) تفحص الفاظ

تخیل کی قوت خداداد ہوتی ہے۔ اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ شاعر کے لئے بہت ضروری ہے۔ تخیل کی تعریف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں "وہ ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربے اور مشاہدے کے ذریعے سے ذہن میں پہلے سے موجود ہوتا ہے یہ اس کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے۔ اور پھر اس کو الفاظ کے ایسے دلکش پیرائے میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر الگ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تعریف کولرج کی تعریف تخیل کی طرح جامع اور مانع نہیں۔ اور نہ حالی سے اس بات کی توقع کی جا سکتی تھی کیونکہ انہی نے کولرج یا دوسرے رومانی نقادوں کے تنقیدی خیالات کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اور اس سے قبل نہ اردو میں تخیل کی تعریف کی کوئی روایت موجود تھی۔ حالی نے اس کو پہلی دفعہ پیش کیا۔ اس لئے اس میں سطحیت یقیناً ہے لیکن اس کے باوجود تخیل کے متعلق ضروری باتیں ضرور ذہن نشین ہو جاتی ہیں۔ تخیل کے علاوہ کائنات کا مطالعہ بھی ان کے نزدیک ضروری ہے۔ لیکن کائنات کے مطالعے سے ان کا مقصد صرف مناظر فطرت یا نیچر کا مطالعہ ہی نہیں بلکہ فطرت انسانی اور نفسیات انسانی سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ شاعری میں اس پہلو کی اہمیت تو ظاہر ہی ہے حالی کا یہ خیال صحیح ہے کہ اگر اس کا خیال نہ رکھا جائے تو قوت متخیلہ بھی کام نہیں کر سکتی۔ تیسری خصوصیت الفاظ کا صحیح استعمال ہے کیونکہ اس کا خیال رکھے بغیر شاعر اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح پیش نہیں کر سکتا۔

حالی کی یہ تینوں شرطیں جو انہوں نے شاعری کے لئے ضروری قرار

دی ہیں۔ بہت اہم ہیں۔ اگرچہ تنقید بہت زیادہ آگے بڑھ چکی ہے۔ لیکن آج بھی انہیں خیالات پر زور دیا جا رہا ہے۔ الفاظ بدل گئے ہیں پیش کرنے کے طریقے میں نیا رنگ ہے اور نیا انداز اختیار کر لیا گیا ہے۔ لیکن بنیادی خیالات وہی رہے ہیں۔

شعر کی ضروری خوبیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے حالی، ملٹن کے خیالات پر اپنے نظریات کی بنیادیں رکھتے ہیں۔ ملٹن کے نزدیک شاعری میں سادگی سے الفاظ اور خیالات دونوں کی سادگی مراد ہے، تاکہ شعر میں پیش کئے ہوئے خیالات کو سمجھنے میں کسی طرح کی دقت نہ ہو۔ اصلیت سے ان کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے، اس کی کچھ اصلیت اور حقیقت ہو۔ یعنی اس میں واقفیت کا ہونا ضروری ہے۔ جوش سے وہ یہ مراد لیتے ہیں کہ شعر ایسے بے ساختہ اور مؤثر پیرائے میں بیان کیا جائے جس سے معلوم ہو کہ شاعر نے اپنے ارادے سے یہ مضمون نہیں باندھا بلکہ خود مضمون نے شاعر کو مجبور کر دیا ہے۔

حالی نے جو نقطۂ خیال اختیار کیا ہے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ملٹن کے نظریات اگر ان تک نہ بھی پہنچتے تب بھی وہ انہیں خصوصیات کو شاعری کے لئے ضروری قرار دیتے۔ کیونکہ ان کی ذہنی نشو و نما جس ماحول میں ہوئی۔ ماحول کے جو اثرات ان پر پڑے، اور ان کے شعور کی بیداری نے حالات کا جو اثر قبول کیا، ان سب کی وجہ سے یہ لازم تھا کہ وہ انہیں خصوصیات کو شاعری کے لئے ضروری قرار دیتے۔ اس وقت سماجی زندگی میں انحطاطی کیفیت پیدا ہو جانے کی وجہ سے شاعری مبالغہ آرائی اور دور از کار باتوں کا زور تھا۔ شاعر پیچیدہ اور دور از کار باتیں کرتے اور لوگ انہیں پسند کرتے تھے۔ اس لئے حالی نے ان کے مقابلے میں سادگی کو ضروری قرار دیا۔ اسی طرح شاعری میں اصلیت کے خیال کو ضروری قرار دینے کا باعث بھی اس زمانے کا ماحول تھا۔ اس زمانے میں شاعر ہوائی باتیں کرتے اور لوگ ان کو پسند کرتے تھے۔ حقیقت و واقعیت سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ حالی کو یہ بات پسند نہیں تھی۔ اسی وجہ سے انہوں نے اصلیت کو شاعری کے لئے ضروری قرار دیا۔ جوش کی خصوصیت کا خیال بھی اپنے وقت کی پیداوار ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں بہت سے شاعر بغیر محسوس کئے ہوئے شعر کہتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کی شاعری بے روح ہوتی تھی۔ حالی نے اس کو مناسب نہ سمجھا اور اس واسطے یہ ضروری قرار دیا کہ شاعر کے لئے شدت کے ساتھ محسوس کر کے شعر کہنا ضروری ہے۔

بہرحال ملٹن کی پیش کی ہوئی یہ تینوں خصوصیات جن کو حالی نے شعر کے لئے ضروری قرار دیا ہے، ایسی ہیں جو ہر زمانے کی شاعری کو اعلیٰ قسم کی شاعری بنا سکتی ہیں۔ اور جن سے کسی کو انکار کرنے کی جرأت نہیں۔

حالی نے اپنے ان نظریات تنقید پر بہت گہرائی اور تفصیل سے بحث نہیں کی ہے۔ پھر بھی وہ پہلے نقاد ہیں جنہوں نے اصول کی بحث کو چھیڑا۔ ان مباحث پر گہرائی اور تفصیل سے روشنی نہ ڈالنے کے وجوہ یہ ہیں۔ کہ اول تو ان کا میدان محدود تھا۔ وہ صرف اپنے دیوان کا مقدمہ لکھ رہے تھے۔ تنقید پر کوئی مستقل کتاب لکھنے کا خیال ان کے پیش نظر نہیں تھا۔ دوسرے مغرب کے انداز تنقید سے ان کو پوری واقفیت نہیں تھی۔ شاید اسی ناواقفیت ہی کی وجہ سے ان کی نظر صرف ملٹن اور مکالے ہی پر پڑتی تھی، ورنہ یورپ میں اس وقت تک ان سے کہیں بڑے نقاد پیدا ہو چکے تھے۔ انگلستان میں میتھو آرنلڈ کا زمانہ کم و بیش یہی زمانہ ہے۔ جرمنی میں ہرڈر اور لیسنگ وغیرہ بھی اسی زمانے میں موجود تھے۔ فرانس میں مادام ڈی اسٹیل، سینٹ بیو اور ٹین وغیرہ کی تنقیدی تحریریں اسی زمانے میں مقبول عام ہو رہی تھیں۔ اور ان سب کے خیالات و نظریات ہی پر موجودہ تنقید کی بنیادیں رکھی گئی ہیں۔ لیکن حالی کو ان سب کا کچھ علم نہیں تھا۔ پھر بھی حالی نے جو نظریات تنقید پیش کئے ہیں وہ بنیادی طور پر نئی تنقید کے نظریات سے مختلف نہیں ہیں۔ یہی ان کا سب سے بڑا کمال ہے۔

اپنے تنقیدی نظریات کی تشکیل میں حالی نے صرف مغرب کے خیالات ہی سے اثرات قبول نہیں کئے ہیں، بلکہ مشرقی نظریات تنقید سے بھی کام لیا ہے۔ چنانچہ وہ مشرقی تنقیدی نگاروں کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ شاعری کی تعریف کے سلسلے میں انہوں نے کئی عربی نقادوں اور شاعروں کے خیالات کو بھی پیش کیا ہے۔ لیکن جہاں کہیں ان کے خیالات سے اختلاف ہے، اس کی وضاحت بھی کر دی ہے۔ پہلے انہوں نے اصمعی کا قول نقل کیا ہے، جس کے نزدیک شعر وہ ہے کہ اس کے معنی لفظوں سے قبل

ذہن میں آجائیں۔ حالی کا خیال ہے کہ آمنی نے ملٹن کی تین شرطوں میں سے صرف ایک شرط یعنی سادگی کو ضروری قرار دیا ہے۔ خلیل ابن احمد صرف اس کو شعر سمجھتا ہے جس کو پڑھنے سے قبل اس کا قافیہ ذہن میں آجائے ظاہر ہے کہ شعر کی یہ تعریف حالی کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی۔ زہیر ابن ابی سلمی کے اس قول میں کہ سب سے بہتر شعر وہ ہے کہ جب پڑھا جائے تو لوگ کہہ اٹھیں کہ سچ ہے، حالی کو صرف وہ شرط نظر آتی ہے، جس کو ملٹن اصلیت سے تعبیر کرتا ہے اس سلسلے میں ابن رشیق کے قول کو وہ سب سے بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اچھا شعر وہ ہے کہ جب پڑھا جائے تو ہر شخص کو خیال ہو کہ میں ایسا کہہ سکتا ہوں لیکن جب کہنے کا ارادہ کرے تو بے بس ہو جائے۔ لیکن ملٹن اور ابن رشیق کے خیالات کا مقابلہ کرنے کے بعد حالی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں " ابن رشیق کی تعریف سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ عمدہ شعر کا سر انجام ہونا زیادہ تر حسن اتفاق پر موقوف ہے۔ شاعر کے قصد کو چنداں اس میں دخل نہیں۔ وہ شاعر کو عمدہ شعر کہنے کا طریقہ نہیں بتاتا۔ بلکہ یہ بتاتا ہے کہ شاعر کے کن سے شعر کو عمدہ شعر سمجھنا چاہئے۔ بخلاف ملٹن کے کہ اس کے بیان میں دونوں پہلو موجود ہیں۔ اس سے عمدہ شعر کی پہچان اور عمدہ شعر کہنے کے ارکان دونوں باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ ملٹن کی تینوں شرطیں ملحوظ رکھنے سے ہمیشہ ویسے ہی سہل ممتنع اشعار سر انجام ہوں گے، جن کا معیار ابن رشیق نے بتایا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ جو شاعر اس کی شرطوں کو ملحوظ رکھے گا۔ اس کے کلام میں جا بجا وہ بجلیاں کوندتی نظر آئیں گی۔" اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حالی ملٹن کے خیالات کو زیادہ جامع سمجھتے تھے اور انھوں نے سوچ سمجھ کر ان کو اپنایا تھا۔ بہر حال مغربی نظریات تنقید میں ان کو زیادہ جامعیت نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی نظریات تنقید سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود وہ مغربی نظریات تنقید کو اہمیت دیتے ہیں۔

حالی کے نظریات تنقید کو اردو میں بڑی اہمیت حاصل ہے ان میں مشرق و مغرب کے تنقیدی نظریات کا امتزاج موجود ہے۔ ان دونوں کو انھوں نے پیش کیا ہے۔ دونوں پر بحث کی ہے۔ دونوں کا مقابلہ بھی کیا ہے لیکن ترجیح انھوں نے مغربی نظریات تنقید ہی کو دی ہے کیونکہ ان نظریات میں انھیں زیادہ جامعیت نظر آتی ہے۔ ان کے یہ نظریات تنقید گہری سوچ کا نتیجہ ہیں۔ ان میں خلوص ہے۔ سچائی ہے۔ بے تکلفی ہے۔ تصنع اور بناوٹ سے یہ بالکل پاک ہیں۔ حالی نے جو صوری و معنوی دونوں پہلوؤں کو شعر کے لئے ضروری قرار دیا ہے، نیچرل شاعری کی اہمیت ظاہر کی ہے۔ شاعری اور سماج کے تعلق پر جو بحث کی ہے۔ شعر کے لئے جن عناصر کو ضروری قرار دیا ہے۔ شعر کی ماہیت اور اس کی ضروریات پر جو روشنی ڈالی ہے، ان سب سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ شعر کی صحیح اسپرٹ سے واقف تھے۔ ان کو اس کی اہمیت اور ضرورت کا صحیح اندازہ تھا۔ اور اس وجہ سے انھوں نے یہ اصول قائم کئے تاکہ ان کو صحیح طریقے سے سمجھا اور پرکھا جا سکے۔

اردو تنقید پر اگرچہ بہت سے اضافے ہو چکے ہیں۔ ترقی کی بیسیوں منزلیں طے کی جا چکی ہیں۔ لیکن جہاں تک نظریاتی تنقید کا تعلق ہے۔ حالی آج بھی منفرد نظر آتے ہیں۔ ان پر محض برائے نام اضافہ ہو سکا ہے۔ اس کے قائل تو کلیم الدین احمد تک ہیں جو اس قسم کے خیالات رکھنے کے باوجود کہ " حالی کے خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی، غور و فکر ناکافی، تمیز ادنیٰ، دماغ و شخصیت اوسط درجہ کی ہے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ "عصر حاضر میں جب انشا پرداز کا مطمع نظر حالی کی طرح محدود نہیں جب وہ بہترین مغربی کارناموں سے واقفیت رکھتے ہیں، اس کے باوجود کسی نے بھی مقدمہ شعر و شاعری سے بہتر تنقیدی کارنامہ پیش نہیں کیا"۔ اور کلیم صاحب کا اردو کے ایک نقاد کے بارے میں یہ کہہ دینا ظاہر ہے، بہت اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ ان کے خیال کے مطابق اردو میں تنقید کا وجود معشوق کی کمر کی طرح فرضی ہے۔

مختار الدین احمد آرزو

نوادرِ غالب

اس عنوان کے تحت غالب کی وہ تحریراتِ نظم و نثر جمع کی گئی ہیں جو اُن کے دیوان یا نثر کے مجموعوں میں شامل نہیں ہیں۔ یہ تحریریں قلیم کتابوں، شعراء کے تذکروں اور قلمی بیاضوں کے بطن میں دفن تھیں اور اب تک انھیں باہر نکال کر منظرِ عام پر نہیں لایا گیا تھا۔ یہاں جگہ کی قلت کی وجہ سے صرف چند چیزیں پیش کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

(۱) سب سے پہلے غالب کے تین اردو خطوط درج کئے گئے ہیں۔

خط (۱) قاضی نورالدین حسین فائق مؤلف مخزنِ شعراء کے نام ہے۔ یہ شعرائے گجرات کا مشہور تذکرہ ہے۔ اور انجمن ترقی اردو کی مساعی سے شائع ہو چکا ہے۔ تذکرے کا اصل نسخہ جس پر غالب کے ہاتھ کی تحریر اور اصلاحیں تھیں بمبئی میں موجود تھا لیکن اب مفقود ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۶۸ھ میں مکمل ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تکمیل کے ایک زمانے کے بعد مصنف نے یہ نسخہ غالب کے مطالعہ کے لئے بھیجا۔ اس لئے کہ غالب کی یہ تقریظ دوشنبہ ۲۶ جولائی ۱۸۵۲ء کی لکھی ہوئی ہے۔

(۲) اس خط کے مکتوب الیہ مارہرہ کے مشہور بزرگ صاحب عالم ہیں جن سے غالب کے بے حد تعلقات تھے۔ اور جن کا چودھری عبدالغفور سرور کے اکثر خطوں میں ذکر ہے۔ خود صاحبِ عالم کے نام غالب کے متعدد خطوط عودِ ہندی میں موجود ہیں۔ بظاہر اصغیر بلگرامی کی کتاب کے جس دیباچے کا عظیم آباد روانہ ہونے کا ذکر ہے اس سے مراد فیضِ صغیر رسالہ تذکیر و تانیث کا دیباچہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دیباچہ لکھ کر غالب نے مارہرہ بھیج دیا تھا۔ وہاں سے عظیم آباد کو روانہ ہوا۔ یہ دیباچہ فیضِ صغیر اشاعتِ اوّل اور عودِ ہندی میں موجود ہے۔ ایک اہم بات اس خط سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ۲۴ اگست ۱۸۶۲ء سے پہلے مجموعۂ نثرِ اردو مرتب ہو کر چھپنے کے لئے بھیج دیا گیا تھا۔ یہ نایاب خط جو آج تک کہیں شائع نہیں ہوا ہے پہلی بار معتقدانِ غالب کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ خط صاحب عالم مارہروی کی خود نوشت بیاض سے لیا گیا ہے جو ہمارے خاندانی کتب خانہ میں موجود ہے۔

(۳) یہ خط صوفی منیری کے نام کا ہے۔ ان کا نام منیرالدین حسین اور کنیت ابو محمد تھی۔ لیکن مشہور شاہ فرزند علی کے نام سے تھے۔ سلسلۂ فردوسیہ سے تعلق تھا۔ اور قصبۂ منیر (ضلع پٹنہ) کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے۔ صوفی تخلص کرتے تھے۔ اور غالب کے تلامذہ میں سے تھے۔ ان کی تصنیفاتِ نظم میں نوار الحمد کے علاوہ اور بھی کئی مثنویاں موجود ہیں۔ جن کے نسخے مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اور غالب کی اصلاح سے مزین خانقاہ اسلام پور (ضلع پٹنہ) کے کتاب خانے میں موجود ہیں۔

مثنوی نوار الحمد گیا (بہار) سے شائع ہو چکی ہے۔ اور مولوی مہیش پرشاد (بنارس) اس مثنوی پر ایک مضمون رسالہ ہندوستانی (الہ آباد) میں شائع کر چکے ہیں۔ موجودہ خط کے ابتدائی جملوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب صوفی کی کس قدر عزت کرتے تھے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ غالب نے صوفی کے کن اشعار کے متعلق کلام معجز نظام لکھا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ رائے مثنوی 'نوار الحمد' کے متعلق ہوگی جس کے بعض شعر غالب کو بے حد پسند آئے تھے۔ ایک شعر جس کا مصراع ثانی ہے 'ہے تو بندہ مگر اللہ اللہ' پر غالب نے دو صواد بنائے تھے۔ خط پر تاریخ تحریر صبح نہیں۔ لیکن '۷۱ برس کی عمر' سے خیال ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۲۷۱ھ کے لگ بھگ لکھا گیا ہوگا۔

(۴ و ۵) اردو کی یہ دونوں نثریں غالب کی ایک مختصر مگر کمیاب تصنیف 'رقعاتِ غالب' سے ماخوذ ہیں۔ یہ رسالہ مرزا نے میکلوڈ کی فرمائش پر مرتب کیا تھا۔ اس کا ایک خوش خط نسخہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے

کے پاس موجود ہے۔ جن پران کے خیال کے مطابق خود غالب کی تحریریں اور اصلاحیں ہیں۔ یہ نسخہ راقم کی نظر سے گذر چکا ہے۔ اس میں ترمیمیں اور حک و اصلاح کافی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسرے نسخے کا منقولہ نسخہ رہ چکا ہے۔ دیباچے کے بعض مقامات کرم خوردہ ہیں۔ وہاں پر نقطے دے دیئے گئے ہیں۔ رقعاتِ غالب میں جو دیباچے۔ لطیفے، مکتوبات اور اشعار درج ہیں۔ وہ سب معمولی سی ترمیم کے ساتھ دوسرے ماخذوں میں مل جاتے ہیں۔ دیباچے جنھیں ہم یہاں شائع کر رہے ہیں۔ کسی اور ماخذ میں نہیں ملتے۔

(۶) اُردو کا یہ نایاب مخمس بہادر شاہ ظفر کی ایک غزل پر تضمین ہے یہ 'دہلی اردو اخبار' کے تتمے مورخہ ۱۷ اپریل ۱۸۵۳ء مطابق ۷ رجب ۱۲۶۹ھ کی ایک اشاعت میں چھپا تھا۔ یہ مخمس بے حد نایاب ہے اور اس ماخذ کے علاوہ کسی دوسری جگہ اس کا پتا نہیں چلتا۔ دہلی اردو اخبار، محمد حسین آزاد دہلوی کے والد مولوی محمد باقر شائع کیا کرتے تھے۔ یہ اپنے عہد کا مقبول اخبار تھا۔ اس کی دوسری اشاعتوں میں غالب کے بعض فارسی قصائد بھی شائع ہوئے ہیں۔ مگر وہ سب مطبوعہ کلیات میں موجود ہیں۔

یہ غزل 'دیوانِ ظفر' (: ۲۸۶) میں موجود ہے لیکن اس میں متن میں بعض اختلافات ہیں۔ 'مات' کی جگہ 'طرح' ہے۔ اور یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ خدا جانے یہ مرزا کی اصلاح ہے یا بعد میں خود ظفر نے 'مات' کی جگہ 'طرح' بنا دیا ہے۔ ساتویں بند میں 'وصل کی شب' کی بجائے 'رات باقی ہے'۔ دسویں بند میں غالب کے مخمس میں آدھی حسرتیں تقریر' چھپ گیا ہے۔ یہاں دیوانِ ظفر (: ۲۶۹) کے مطابق الفاظ متن میں درج کئے گئے ہیں۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ مرزا اردو میں 'بے پیر' کے لفظ کا استعمال جائز نہیں سمجھتے تھے۔ نہ خود استعمال کرتے تھے۔ اور نہ اپنے تلامذہ کو استعمال کرنے دیتے تھے۔ اور مشاہیر شعراء سے قطع نظر خود دہلوی شعراء میں ان کے معاصرین میں ذوق اور ظفر کے یہاں اس لفظ کے استعمال کی مثالیں ملتی ہیں۔ یہاں بھی دسویں بند میں ظفر نے استعمال کیا ہے۔ اور مرزا اس سے واقف ہیں۔ اس مخمس کی نقل مع اختلافِ نسخ جناب امتیاز علی عرشی صاحب (رامپور) نے بھیجی ہے۔ ان کی اس عنایت کے ہم نہایت ممنون ہیں۔

(۸) اس میں ۱۶ متفرق اشعار ہیں۔ پہلے ۱۴ اشعار 'محمدۃ المنتخبہ' یعنی تذکرۂ سروری اعظم گڑھی اور شعر عیار الشعرا مرتبہ خوب چند ذکا میں منتخب ہیں۔ سرور دہلی کے رہنے والے تھے۔ اور غالب سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ ان کا تذکرہ تقریباً ۱۲۱۶ھ میں لکھا جانا شروع ہوا۔ اور تقریباً دس سال میں مرتب ہوا گو وہ اس کے بعد بھی اضافے کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں غالب کا ترجمہ درج ہے۔ یہی حال عیار الشعراء کا ہے۔ اس کا سالِ تالیف ۱۲۱۳ھ کے لگ بھگ معلوم ہوتا ہے کہ ذکا بھی مدت تک اپنے تذکرے میں اضافہ کرتے رہے۔ ورنہ غالب کا ترجمہ درج نہ ہو سکتا۔ یہ دونوں تذکرے وزارتِ ہند (لندن) کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ عیار الشعراء کا ایک نسخہ پٹنے میں موجود ہے لیکن اس میں غالباً یہ اشعار ہیں۔ ان اشعار کا ذکر اکرام صاحب کی کتاب غالب نامہ میں بھی ہے۔ لیکن ہم نے یہ ۱۶ اشعار رسالہ معیار (پٹنہ) کی ایک اشاعت سے لئے ہیں۔

(۱) مخدوم مکرم حضرت قاضی محمد نور الدین حسین خاں بہادر کی خدمت میں عرض ہے کہ برخوردار مرزا شہاب الدین خاں بہادر نے یہ اجزا مجھ کو دیئے۔ نظم سے بالکل میں نے قطع نظر کی۔ کامل صاحب کی یہ نثر جو آغاز میں ہے اس کو بھی نہیں دیکھا۔ صرف آپ کی نثر کو دیکھا۔ اور اس کو موافق حکم آپ کے بعض جا درست کر دیا۔ بعض موقع پر منشا اصلاح لکھ دیا ہے۔ مجھ کو یہ یارا نہیں کہ آپ کی نثر میں دخل کروں۔ بفحوائے الامر فوق الادب حکم بجا لایا ہوں۔ مرحبا۔ آفریں۔ بخدا خوب نثر لکھی ہے۔ اللہ سبحانہٗ آپ کو مدارجِ اعلیٰ کو پہنچا دے اور سلامت رکھے
مرقوم دوشنبہ جولائی ۱۸۶۲ء

خوشنودیٔ احباب کا طالب
غالب

(۲) حضرت صاحب قبلہ و کعبہ جناب صاحب عالم کو فقیر اسد اللہ کی بندگی دیباچے کا عظیم آباد کا روانہ ہونا معلوم ہوا۔ مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ لختِ جگر و نورِ بصر مولوی سید فرزند احمد کو وہ دیباچہ پسند آیا یا نہیں۔ بات رعشہ دار اور آنکھیں ضعیف البصر۔ حواس مساب ہیں۔ قصہ مختصر من کل الوجوہ وہاں غالب مغلوب ہیں۔ دو مہینے ہوئے کہ منشی ہرگوپال تفتہ بہ سواری ریل یہاں آئے۔ ایک شب رہے۔ صبح کو تشریف لے گئے۔ مخدوم زادہ شاہ عالم

کو سلام اور یہ پیام کہ بطلانِ حسنِ حافظہ کے سبب آپ کے اخوان کے نام بھول گیا ہوں۔ اون صاحبوں کی خدمت میں اور میاں برکات حسن صاحب اور چودھری عبدالغفور صاحب (کو) سلام پہنچائیں۔ اور یہ بھی لکھ دیں کہ مولوی غلام غوث خاں میر منشی نے آپ کا دیباچہ اور میرا مجموعۂ نثر مرتب کر کے ممتاز علی خاں (کو) بھیج دیا ہے۔ اب چھپوانے میں ان کو اختیار ہے۔

اسد - ۲۶ اگست ۱۸۶۶ء

(۳) زبدۂ اولادِ حضرت خیر الانام قبلہ و کعبہ مجموعۂ اہلِ اسلام حضرت پیر و مرشد عالی مقام کی خدمت میں فقیر غالب کی بندگی قبول ہو۔ اپنے ابوالآبا کے بوڑھے غلام کو آپ نے اتنا کیوں شرمایا کہ وہ بیچارہ شرم سے پانی پانی ہوا جاتا ہے۔ کافی تھا اور ان اشعار کا بھیج دینا اور حک و اصلاح کی اجازت دینی۔ میری مدح آپ کے غلاموں کو موجب ننگ و عار، اور میرے آبا و اجداد کو ذریعۂ عزّ و افتخار۔ حکم بجا لایا دو ایک جگہ املا کی صورت بدل گئی۔ کہیں مصرع کی جگہ مصرع لکھا گیا۔ بے علّہ تکلف و تملّق آپ کا کلام معجز نظام ہے۔ لفظ عمدہ۔ ترکیب اچھی۔ معنی بلند۔ فقیر اپنا حال زار لکھتا ہے۔ اکہتر برس کی عمر۔ پاؤں سے اپاہج۔ کانوں سے بہرا۔ دن رات پڑا رہتا ہوں۔ دو سطریں لکھیں۔ بدن تھرایا۔ حرف سوجھنے سے رہا۔ قوتیں ساقط۔ حواس مختل۔ غذا قلیل۔ بلکہ اقل ؎

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

ایامِ شباب میں کہ بحرِ طبع روانی پر تھا۔ جی میں آیا غزوات صاحب ذوالفقار لکھنا چاہیے۔ حمد و نعت و منقبت و ساقی نامہ و مغنی نامہ لکھا گیا، داستان طرازی کی توفیق نہ پائی۔ ناچار اس آٹھ سو نو سو شعر کو چھپوا لیا، اغلاط برہان قاطع از روئے انصاف نکالے، اور اس کا ایک رسالہ مرتب کیا۔ قاطع برہان اس کا اسم اور درفش کاویانی اس کا علم، ان دونوں رسائل نامطبوع کو ایک پارسل میں اور حضرت کے بھیجے اوراق بھی اس پارسل میں اور یہ خط جدا اگانہ ڈاک میں بھجوا دیا۔ اور توقع رکھتا ہوں کہ اس کی رسید روز ورود یا دوسرے دن لکھی جائے۔

(۴) دیباچہ رقعات غالب

یہ کتاب جو دو باب کی ہے حقیقت یہ اس کتاب کی ہے کہ پہلے باب میں دو دیباچے اور کئی لطیفے اور کئی مکتوب ہیں۔ اگر میرے لکھے ہوئے نہ ہوتے تو میں کہتا کہ بہت خوب ہیں۔ دوسرا باب اشعار کا ہے کہ وہ بھی کلام اسی خاکسار کا ہے۔ اگر کوئی خط اردو زبان میں لکھا جائے تو ان اشعار میں سے شعر محل و مقام کے مناسب درج کیا جائے۔ اور یہ مجموعہ نذر اس جناب رفعت مآب کے ہے جس سے عزت و توقیر فنانشل کمشنری پنجاب کے .... مناقب عالی شان علم و اہلِ علم کے قدردان .... یگانۂ روزگار جن کا مطیع و محکوم ہونا اہلِ ہند کو سرمایۂ عزّ و افتخار، والا پایہ۔ عالی رتبہ۔ معلیٰ القاب حضرت فلک رفعت میکلوڈ صاحب بہادر فنانشل کمشنر بہادر قلمرو پنجاب۔ پس یہ کتاب اگر ان کے حکم سے چھاپی جائے گی تو صاحبان تازہ وارد ولایت کے پڑھنے کے کام آئے گی۔ اس کتاب کا نذر کرنے والا جو اپنے نذر قبول ہونے کا طالب ہے۔ نصر اللہ بیگ خاں بہادر رئیس سون کا بھتیجا موسوم بہ اسد اللہ خاں المتخلص بہ غالب ہے۔ میرے چچا کی سرداری اور ریاست کا حال اور گورنمنٹ بہادر اعلیٰ سے خاص میری ملازمت اور نذر اور خلعت کی کیفیت گورنمنٹ اعلیٰ کے دفتر میں مرقوم ہے۔ اور میرے قصیدے کا جناب مستطاب لارڈ ڈالہوزی بہادر کے ذریعے سے وزیر اعظم کے پاس پہنچنا اور حضرت قدر قدرت شہنشاہ بحر و بر ملکہ معظم محتشم کے حضور پُر نور میں گذرنا از روئے مشاہدۂ خطوط آمد ولایت جو بہ سبیل ڈاک مجھ کو ولایت سے آئے ہیں۔ گورنمنٹ بہادر ہندوستان کو معلوم ہے۔ البتہ میں اس کا مستحق ہوں کہ کونسل پریذیڈنٹ گنا جاؤں اور اس علاقے سے ایک نیا نام اور نئی عزت پاؤں۔ اگر رتبہ بڑھایا نہ جائے قدیم عزت میں تو فرق نہ آئے۔ نظم :-

اے جہاں آفریں خدائے کریم صانعِ ہفت چرخ و ہفت اقلیم

نام میکلوڈ جن کا ہے مشہور یہ ہمیشہ بعیدِ نشاط و سرور

عمر و دولت سے شادمان رہیں

اور غالب پہ مہربان رہیں

(۵) خاتمہ رقعات غالب

خدا کا شکر بجا لاتا ہوں کہ یہ مجموعۂ مختصر تمام ہوا۔ اب خدا سے یہ دعا مانگتا ہوں کہ یہ تحریر میرے مربی اور محسن کے پسند آئے۔ تم نے جانا کہ میرے مربی محسن کون ہیں ؟ وہ کہ جن کی ہدایت کا شکر گذار اور اعنایات کا امیدوار ہوں۔ جب نام نامی اون کا دیباچہ کتاب میں مرقوم اور

عالم میں مشہور ہے تو بار بار حضرت کا نام لینا ادب سے دور ہے۔ مگر ان
خانے میں یہ شعر لکھ دینا ضرور ہے ۔

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

(۶) تضمین اردو

گھستے گھستے پاؤں میں زنجیر آدھی رہ گئی | مر گئے پر قبر کی تعمیر آدھی رہ گئی
سب ہی پڑھتا کاش کیوں تکبیر آدھی رہ گئی | کھنچ کے قاتل جب تری شمشیر آدھی رہ گئی

غم سے جانِ عاشقِ دلگیر آدھی رہ گئی

بیٹھ رہتا لے کے چشمِ پُر نم اس کے روبرو | کیوں کہا تو نے کہ کہیو اپنا غم اس کے روبرو
بات کرنے میں نکلتا ہے دم اس کے روبرو | کہہ سکے ساری حقیقت ہم نہ اس کے روبرو

ہم نشیں آدھی ہوئی تقریر آدھی رہ گئی

تو نے دیکھا مجھ پہ کیسی بن گئی اے رازدار | خوابِ بیداری پہ کب ہے آدمی کو اختیار
مثلِ نم آنکھوں کو سی دیتا جو ہوتا ہوشیار | کھینچتا نظارت کو جو ابھی تصویرِ یار

جاگ اٹھا جو کھینچی تصویر آدھی رہ گئی

غم نے جب گھیرا تو چاہا ہم نے یوں اے دل نواز | دیکھتے ہی اے ستمگر تیری چشمِ نیم باز

کی تھی پوری ہم نے جو تدبیر آدھی رہ گئی

اس بتِ مغرور کا کیا ہو کسی پر التفات | جس کے حسنِ روز افزوں کی یہ اک ادنیٰ ہے بات
ماہِ نو نکلے پہ گذری ہو نگی راتیں پانچ سات | اس رخِ روشن کے آگے ماہِ یک ہفتہ کی رات

تابشِ خورشید پر تنویر آدھی رہ گئی

تا مجھے پہنچائے کاوشِ بخت بد ہے گھات میں | ہاں فراوانی اگر کچھ ہے تو ہے آفات میں
جز غم و رنج و الم گھاٹا ہے ہر اک بات میں | کم نصیبی اس کو کہتے ہیں کہ میرے ہات میں

آتے ہی خاصیتِ اکسیر آدھی رہ گئی

سب یہ گوشہ کنارے ہے گلے لگ جا مرے | آدمی کو کیا بکا ہے گلے لگ جا مرے
سر سے گر چادر اُتارے ہے گلے لگ جا مرے | مانگ کیا بیٹھا سنوارے ہے گلے لگ جا مرے

وصل کی شب اے بتِ بے پیر آدھی رہ گئی

ناگہاں یاد آگئی ہے مجھکو یا رب کب کی بات | کچھ نہیں کہتا کسی سے سن رہا ہوں سب کی بات
کس لئے تجھ سے چھپاؤں ہاں وہ پوری شب کی بات | نامہ بر جلدی میں تیری وہ جو تھی مطلب کی بات

خط میں آدھی ہو گئی تحریر آدھی رہ گئی

ہو تجلی برق کی مستور میں ہے یہ بھی غضب | ہاں مجھ کھٹکی تو ہوئی زحمت بینش حرب
شام سے آتے تو کیا اچھی گذرتی رات سب | پاس میرے وہ جو آئے بھی تو بعد از نصف شب

نکلی آدھی حسرت اے تقدیر آدھی رہ گئی

تم جو فرماتے ہو دیکھ اے غالبِ آشفتہ سر | ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے گیا کیوں اس کے گھر
جان کی پائی اماں باتیں یہ سب سچ ہیں مگر | دل سے کی ساری خرابی لے گیا مجھ کو ظفر

واں کے جانے میں مری توقیر آدھی رہ گئی

(۷) متفرقات

دیکھتا ہوں اُسے تھی جس کی تمنا مجھ کو | آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو
شمشیرِ صاف یار جو زہراب دادہ ہو | وہ خطِ سبز ہے کہ بہ رخسارِ سادہ ہو
ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے | یہ رنگِ زرد ہے چمنِ زعفراں مجھے
دیکھ وہ برقِ تبسم بس کہ دل بیتاب ہے | دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے
کھول کر دروازۂ میخانہ بولا مے فروش | اب شکستِ توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے
محفلِ شمع عذاراں میں جو آجاتا ہوں | شمع ساں میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں
ہوتی ہے جادۂ رہ رشتۂ گوہر ہر گام | جس گذرگاہ میں میں آبلہ پا جاتا ہوں
سرگراں مجھ سے سبک روکے نہ رہنے سے رہو | کہ بیک جنبشِ لب مثلِ صدا جاتا ہوں
اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے | رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لئے اسد | ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے
نیازِ عشق خرمن سوز اسباب ہوس بہتر | جو ہو جائے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر
یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط | کی تصور نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط
ماہِ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے | عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے
جگر کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کی ہے ستاں پیدا | دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا
زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے | ایسے ہنستے کو رُلایا ہے کہ جی جانے ہے

صبا لگا وہ طمانچہ طرف سے بلبل کی
کہ روئے غنچۂ گل سوئے آشیاں پھر جائے

رشید حسن خان*

ادب کے نئے تقاضے

دنیا میں جتنی بھی ترقی یافتہ زبانیں ہیں اگر ان کا جائزہ لیا جائے تو ان میں صدہا الفاظ دوسری زبانوں کے ملیں گے۔ جو یا تو بجنسہٖ مستعمل ہیں یا ہلکے سے تغیر سے جزوِ زبان بن گئے ہیں۔ اب ان کا شمار اسی زبان کے الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ ان پر وہی قواعد و ضوابط عائد ہوتے ہیں جو اسی زبان سے متعلق الفاظ پر جاری ہیں۔ جب بھی دوسری زبان کا کوئی لفظ کسی زبان میں کثرتِ استعمال یا ضرورت کے باعث شامل ہو جاتا ہے تو پھر اس میں کوئی وجہ مغائرت و تباین باقی نہیں رہتی، اور نہ اس کے ساتھ کوئی نشانِ امتیازی برتا جاتا ہے۔

ایسا ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور جب تک کہ ارتقاءِ السنہ، ایجاداتِ نَو اور مختلف تہذیبوں کے باہمی اتصال و امتزاج کا سلسلہ باقی ہے ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

اردو کی سب سے بڑی خوبی اس کی صلاحیت انجذاب و تاثیر ہے۔ یعنی اس نے بڑی فراخدلی و وسعت سے دوسری زبانوں کے الفاظ و محاورات کو خوش آمدید کہا۔ اور ان کو بایں انداز جذب کر لیا کہ کہیں بھی بے جوڑ و انمل ہونے کا شبہ نہیں ہوتا۔ ایسا اس لئے اور بھی ہوا کہ اس کی تاسیس ہی عناصرِ غیر محدود سے ہوئی تھی اور جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ نیز دوسری بڑی وجہ اس ہمہ رشتگی کے قائم رہنے کی اس کے اندر "مترادفات" کی کمی ہے جس کا تدارک اس کے سوا اور کسی طرح ممکن ہی نہیں تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے یہ کمی دور ہو جائے۔ اسی بنا پر مرکب جملے مثل "دائم الحدت"، "سیع البسط" وغیرہ کے، دوسری زبانوں کے اسمائے ذات وغیرہ مہیا کیے گئے اور جن کا سلسلہ آج تک قائم ہے۔

اگر کوئی شخص اس کے تمام سرمائے کا تجزیہ کر کے ہر زبان کے الفاظ اسی زبان کو واپس کر دے تو پھر اس کے پاس کورے کاغذ کے سوا اور کچھ نہیں بچے گا۔

اسی لیے جو الفاظ آج اردو میں مستعمل ہیں وہ اب اس کے اپنے ہیں اور آئندہ بھی وہ تمام الفاظ جو کہ ایجادات، ضروریات، یا اپنی لچک و صلاحیت کی بنا پر آئیں گے اردو ہی کے شمار کیے جائیں گے۔ اگر ہم ان اصولوں کو تسلیم کر لیں تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ ایسے تمام الفاظ و محاورات کو ایک ہی قاعدے کے تحت مستعمل ہونا چاہیئے۔

ابتدا میں اردو کی صرف و نحو اور نثر و نظم کے "بیانیہ ضابطے" مرتب نہیں ہوئے بغیر کسی تدوین و ترتیب کے اس کی شیرینی اور گھلاوٹ سے متاثر ہو کر نثر کے لیے کمتر اور نظم کے لیے بیشتر اس کو اپنایا گیا چونکہ فارسی کا مذاق عام تھا اور ہر شخص بلا استثناء اس سے سرشار۔ لہٰذا اسی نئے پر اس کو بھی قیاس کر لیا گیا۔ اس کے بعد فارسی کا مذاق کم ہونا شروع ہوا۔ اب اس میں لفظی تراش خراش کی ابتدا ہوئی، بیان کے ضابطے معین ہونا شروع ہوئے لیکن نظم ہی کی حد تک۔ اس لیے کہ اس زمانے تک نظم ہی حاصل کل تھی۔

چونکہ یہ تمام ضابطہ ساز و زبان آفریں حضرات فارسی و عربی کے ماہر عالم تھے اور دوسری زبانوں سے بے بہرہ اور چونکہ اردو کی ابتدا بھی فارسی ہی کے رنگِ تغزل کی عکاسی پر قائم ہوئی تھی اس بنا پر انہیں زبانوں کے اصول و فروع کو اپنا لیا گیا۔ یا کہیں ہلکی سی ترمیم و تنسیخ کر دی گئی۔ چونکہ اس زمانے تک نہ ادب اتنا ترقی یافتہ تھا اور نہ ہماری معاشرت ہی میں آج کی طرح مختلف الوان و اقدار کا ظہور تھا اور نہ اتنے پہلو در پہلو و تہہ در تہہ اضافے ہوئے تھے لہٰذا وہ ضابطے مدت تک چلتے رہے۔ ان بزرگوں کے بعد جتنے بھی ان کے جانشین و غاشیہ بردار آتے گئے وہ اسی امانت مقدس کو سینہ بسینہ منتقل کرتے رہے۔ اس حفاظت و اہتمام کے ساتھ کہ دنیا کی ترقی کے انعکاسات اس پر نہ پڑ سکیں۔ یہی نہیں بلکہ جہاں تک ہو سکا

مزید حفاظت کے خیال سے نئی نئی پابندیوں کی دیواریں کھڑی کرتے رہے۔
یہاں تک کہ زبان و ادب نے ترقی کی، انقلابات و حوادث آئے، صدہا تبدیلیاں ہوئیں، دوسری زبانوں کے ادب کا گہرا اثر قبول کیا گیا۔ لیکن اردو ادب کے روایتی اجارہ دار اس میں کسی تبدیلی پر طیار نہیں ہوئے بلکہ اس کے برعکس پابندیوں کا اضافہ کرتے رہے۔ کسی نے فتوے دیا کہ تلک واجب الترک ہے تو کسی نے یاں اور واں کو خارج از ادب قرار دیا، غرضیکہ عجیب عجیب قلابازیاں کھائی گئیں اور آج بھی جبکہ ان کے ہاتھ اس سرمائے کو سینوں سے مسلسل و متواتر لگائے رہنے کی بنا پر کانپنے لگے ہیں وہ اس کی لایعنی گرانباری کو سبک کرنے پر طیار نہیں اور آج جب کہ ہر زبان میں اس کی ارتقاء کے لئے گوناگوں اضافے ہو رہے ہیں یہ اس میں ذرا سی بھی تبدیلی کے روادار نہیں، خواہ انجام کچھ ہو۔
جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ کسی زبان میں بھی غیر زبان کے جو الفاظ گھل مل گئے ہیں وہ اس زبان کے اپنے سمجھے جاتے ہیں اور ان پر اسی زبان کے قواعد کے مطابق عمل کیا جاتا ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں اردو سے زیادہ مستعار الفاظ نہیں کیونکہ اس کی بنیاد ہی اشتراکیت پر رکھی گئی تھی، لہذا وہ تمام الفاظ جو غیر زبانوں کے اس میں رائج ہیں ایک ہی صف میں آنا چاہئیں لیکن "کرامات اساتذہ" کی بنا پر ایسا نہیں ہوا اور اس سلسلے میں عجیب و غریب قوانین نافذ ہیں۔ ان میں سے آج کی صحبت میں صرف چار تعلقوں کے متعلق کچھ کہوں گا۔

(۱) اضافت غیر اعتباری (۲) عطف غیر اعتباری (۳) اعلانِ نون بعطف و اضافت (۴) تراکیب غیر معتبر۔

ان نشاناتِ اربعہ پر دو طریقوں سے گفتگو ہو سکتی ہے ایک تو اصولی یعنی کسی اصول کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے۔ اور یہی طریقہ بھی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ لوگ جن کے دماغ جدید تصورات سے بے بہرہ ہیں یا جو اپنی قوت فہم و استدراک کو نذر تقلید "سمعنا و اطعنا" کر چکے ہیں اور جو ترقی پسندی کا نام سن کر اس شخص کو بے طرح گھورتے ہیں جس طرح کہ کسی واقف اسرار نا اہل کو مزاروں کے مجاور گھورتے ہیں، اصول سے خواہ وہ کتنا ہی ٹھوس اور اٹل کیوں نہ ہو مطمئن نہیں ہوتے جب تک کہ ان کے سامنے فرمودۂ اساتذہ کو نہ پیش کیا جائے۔ لہذا دوسرا طریقہ محض ان حضرات کی تسلی خاطر کے لئے مثالیں استعمال کرنا ہے میں ان ہر دو طریقوں کو بیک وقت دبیک

ساتھ لے کر چلوں گا تا کہ دو دراز کار درازئ داستان نہ ہو۔
اُردو کی ساخت و اساس میں تین زبانوں کو خاص طور پر دخل ہے فارسی، ہندی، عربی، دوسری زبانوں کے بھی بہت سے الفاظ ضمنی طور پر داخل ہو گئے۔ یہاں تک کہ ضروریات کی بنا پر قریب قریب ہر زبان کے الفاظ موجود ہیں، اور وہ اب اردو ہی کے کہے جاتے ہیں چقی، بیگم، قرقی بولتے وقت یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم ترکی زبان کے الفاظ بول رہے ہیں یا کمرہ، گلاس بولتے وقت اطالوی زبان کا خیال نہیں آتا۔ ان سیدھی سی بات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وہ تمام الفاظ جو ہمارے یہاں تحریر و تقریر میں آتے ہیں اور جن کو نظم و نثر میں صاحبانِ اعتبار استعمال کرتے ہیں اردو ہی کے الفاظ ہیں یہی وجہ تھی کہ جب تعشق مرحوم کو ہمدم کے قافیہ میں بیگم پر ٹوکا گیا کہ یہ لفظ ترکی الاصل ہے اور غم کے قافیہ میں آ سکتا ہے بفتح کاف جائز نہیں تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ بھائی! جب ترکی میں جائیں گے تو بیگم بول لیں گے ابھی تو ہندوستان میں ہیں اور یہاں بالفتح ہی مستعمل ہے۔
اس کے بعد جب ہم اپنے یہاں یہ قاعدہ دیکھتے ہیں کہ فارسی، عربی الفاظ کی ہندی یا کسی دیگر زبان کے لفظ کے ساتھ اضافت و عطف جائز نہیں تو تعجب ہوتا ہے۔ اگر فارسی و عربی کے اہل زبان اپنے یہاں یہ قاعدہ رکھتے تو ٹھیک بھی تھا۔ لیکن اُردو میں جس کا خمیر ہی ان سے طیار ہوا ہے یہ پابندی بے جوڑ سی بات ہے۔
اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ فارسی و عربی الفاظ کی باہم اضافت جائز ہے حالانکہ دونوں زبانوں کا طریقۂ اضافت مختلف ہے۔ نیز عربی کے دو الفاظ میں بھی فارسی طریقۂ اضافت برتا جاتا ہے مثلاً نشانِ منزل، ندائے غیب وغیرہ اصول الحکومت یا ندا ءالغیاب نہیں کہا جاتا جس کی وجہ یہ تھی کہ جب عربی میں یہ استعمال ہوں گے تو اس کے ضابطے عائد ہوں گے اور جب دوسری زبان میں استعمال ہوں گے تو اس زبان کے اور اس وقت یہ لفظ اسی زبان کے سمجھے جائیں گے۔ اس سے بھی زیادہ عجیب تر بات یہ ہے کہ جن دیگر زبانوں کے الفاظ سے ہم اضافت ناجائز قرار دیتے ہیں ان بانوں کے کچھ اسمائے ذات سے اضافت جائز رکھتے ہیں سمت کاشی، جانب متھرا، موج گنگا، بچۂ برہمن وغیرہ خوب دل کھول کر استعمال کرتے ہیں، اور یہی نہیں بلکہ وہ تمام الفاظ

جو خواہ اسم ذات ہو یا اسم صفت، اگر ان کا مترادف موجود نہیں تو پھر ان میں اضافت جائز قرار دیتے ہیں۔ اور اس کو سب صحیح مان لیتے ہیں۔ لیکن اگر اس لایعنی پابندی کو بالکل ہی ختم کر دیا جائے تو ادب پر کونسا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا۔ آخر موسم برشگال اور موسم برسات اور موسم ساون میں کیا فرق ہے بلکہ ایک اعتبار سے تو ثانی الذکر عمدہ ہے کہ اول الذکر کے مقابلہ میں عام فہم، سبک اور رواں تر ہے ایسی ہی اگر بجائے پس پردہ پس چلمن کہا جائے تو کیا عدم تناسب ہے بلکہ اول الذکر صوتی اعتبار سے کسی حد تک گراں گزرتا ہے بہ نسبت ثانی کے۔ اسی طرح اگر بجائے روز بروز دن بدن بجائے نزاکت و صلاحیت کے لچک و صلاحیت اور مرغ و آہو کے ساتھ ساتھ مرغ و ہرن بھی لکھا جائے تو کیا ثقالت و غرابت ہے۔ بالکل بے معنی سی بات ہے کہ ایک قید مجہول عائد کی جائے ایک بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ ہندی وغیرہ کے الفاظ میں عطف و اضافت کانوں کو ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ فارسی و عربی کے صدہا غریب الاستعمال الفاظ و مرکبات جب اس طرح استعمال ہوتے ہیں تو ان میں کسی بھی غرابت کا خیال نہیں پیدا ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ذہن میں کوئی مفروضہ کلیہ جاگزیں رہتا ہے اس وقت تک اس کے برخلاف کوئی بات صحیح معلوم نہیں ہوتی آج اگر ان چیزوں کا استعمال شروع ہو جائے تو کچھ دنوں کے بعد کسی کو یہ شکایت نہیں رہیگی۔

آج انگریزی کے صدہا الفاظ مستعمل ہیں اور اس طرح کہ ان کو چھوڑا نہیں جا سکتا اور نہ ان سب کے اتنے ہی جامع مترادفات آ سکتے ہیں تو اب کیا وہ سب اچھوت ہی رہیں گے۔ اگر کوئی شخص شہنشاہ ساقی کہکشاں وغیرہ کے مرادفات وضع کرے تو صاف چیز ہے کہ الفاظ کتنے ہی فلک رتبہ کیوں نہ بن جائیں لیکن ان کا مفہوم اس تاثر و جامعیت کے ساتھ نہیں آ سکتا اور وہ ایجاد منہ چڑانے کے مرادف ہوگی۔ اسی طرح اگر بجائے کلکٹر، اشیشن ماسٹر، ساون، سیکرٹری وغیرہ کے دوسرے الفاظ وضع کرے تو محض آ رہی ہی رہیگی۔ ہاں اگر عربی و فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں کے تمام الفاظ خارج کئے جا سکتے ہوں تو پھر ٹھیک ہے۔

عطف و اضافت کا یہ "اونچی ذات" والا قاعدہ مطلق ختم کر دینے کے قابل ہے۔ آخر اس پابندی سے ادب میں کونسی ترقی یا تحفظ کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اگر کسی نے موسم ساون لکھ دیا تو ادب پر کونسا حملہ یا اس کے لئے کونسا خطرہ پیدا ہو گیا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے الفاظ سے ہماری زبان وسیع ہوتی ہے جتنے زیادہ ہم معنی الفاظ و مرکبات ہوں گے اتنا ہی اچھا ہے۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ جس فارسی و عربی کی تقلید میں یہ "بندوبست" کی گئی ہے اس فارسی و عربی میں یہ قیود نہیں ملتیں۔ مثلاً عربی میں عبرانی کے بہت سے الفاظ ہیں لیکن ان میں عطف بھی ہوتا ہے اور اضافت بھی، ایسی ہی اگر فارسی والے ابتداء میں عربی کے ساتھ اس طرح کی تقسیم اجنابی برتتے تو آج فارسی اتنی ترقی شدہ نہیں ہو سکتی تھی۔ آج فارسی میں آدھے الفاظ عربی کے مستعمل ہیں اور عربی تو علیحدہ خود ہندی کے صدہا الفاظ رائج ہیں جن میں بے تکلف عطف و اضافت ہوتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے۔

نہ دراں مجدہ جز حسد زندہ ‏ ‏ ‏ ‏ نہ دراں دیدہ قطرۂ پانی ‏ ‏ (حکیم سنائی)

منہ بر وعدۂ تنبولیاں دل ‏ ‏ ‏ ‏ کہ جز خوردن ارزنے نیست حاصل ‏ ‏ (ابوطالب کلیم)

ز حسن شستۂ دہوبی چہ گویم ‏ ‏ ‏ ‏ اذان بے پردہ محبوبی چہ گویم ‏ ‏ (ابوطالب کلیم)

از بنارس نہ روم معبد عام است ایں جا

ہر برہمن بچۂ لچھمن و رام است ایں جا ‏ ‏ (علی حزیں)

ز التفات بادشاہ و پنڈت روغن زماں

گشت ابراہیم سر لشکر خلیل اللہ خاں ‏ ‏ {ابراہیم خلیل اللہ خاں سپہ سالار تانا شاہ والی حیدرآباد}

ز چوکھنڈیش سایہ بر آفتاب ‏ ‏ ساقی نامہ ظہوری صفحہ ۹۹ در صفت فیل

("چوکھنڈ" معنی عماری یعنی عمارت چہار کھنڈ)

بود است بنجرے چو دل عاشقاں خراب

یک چند در فشردن آں بے فشردہ ایم ‏ ‏ (مرزا سعید)

(بنجر زمین افتادہ ناقابل زراعت)

نثر کے چند نمونے دیکھئے۔

"قلعہ اند خل سڑک محفوظ است" ‏ ‏ (حاشیہ ساقی نامہ ظہوری صفحہ ۱۰۹)

"چوب خشک کہٹوا" "پشت دو ٹکے بانس" ‏ ‏ "رقعات عالمگیر لائن صفحہ ۲۹"

رضائی بوٹے دار　　　　"رقعات چھمی نرائن" صفحہ ۵۰

"محمل آرائے بہنگی" (کہاروں کی سامان اٹھانے والی لکڑی)۔ " صفحہ ۵۰

"بردوش کہاراں" " درمجلۂ پال" (آموں کے بیان میں) رقعات چھمی نرائن صفحہ ۵۰

اس کے علاوہ "رقعاتِ عالمگیری" "تزکِ جہانگیری" "سفرنامہ شاہ قاچار"
وغیرہ میں بکثرت ایسے مرکبات ملتے ہیں۔ اب اردو کی کچھ مثالیں دیکھیے۔ اگر کوئی شخص تفحص کرے تو صدہا اسی قسم کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ باوجود اساتذۂ کرام کی قید و بند کے زبان کے فطری نشوونما کے ماتحت یہ چیزیں ہمیشہ ٹوٹتی رہی ہیں۔ ان مثالوں کے بعد اب کون کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کی عطف و اضافت غلط ہے۔ مثالیں مستند اہل قلم کی دی گئی ہیں تاکہ غیر مستند ہونے کا تصور بھی نہ ہو سکے۔ دیکھیے جب ہمارے ایسے اہل قلم نے یہ پابندی نہیں کی یا ان سے نہ ہو سکی تو اب اس دور میں جب کہ زبان و ادب میں نت نئی ترقیاں اور اضافے ہو رہے ہیں ان کا قائم رکھنا حماقت ہوگا اور اس کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے کسی شخص سے کہا جائے کہ وہ بجائے ریل یا موٹر دہلی سے لاہور کا سفر اونٹ یا بیل گاڑی پر کرے۔ ملاحظہ ہو۔

پی کے بیراگ کی اداسی سوں
دل بھی بیراگی و اداسی ہے　　(ولی دکنی)

ہاتف بگفت مصرعۂ سال بناۓ آں
باب امام باڑۂ سلطانِ خاص و عام　　(ناسخ)

کسی کی محرم آب رواں کی یاد آئی
حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا　　(آتش)

(محرم مفہوم مستعملہ کے لحاظ سے خالص ہندی نژاد ہے)

جب تک صدف میں قطرۂ نیساں گہر بنے
تا سنگ آبیاری پارس سے زر بنے　　(امیر مینائی)

نام رکھا ہے نمائش کا ترقی و رفارم
تم اس انداز کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز (حکیمت نظم پھول بالا)

مرغولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں　　(اکبر)

شوقِ لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو
آشنا وڈھایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو　　(اکبر)

قرابت راجگانِ ہند سے اکبر نے جب چاہی
کہ یہ رشتہ عروسِ کشور آرائی کا زیور تھا　　(شبلی)

سدا اگاؤں در گاؤں نوبت بہ نوبت
پڑے پھرتے ہیں کرتے تحصیلِ دولت　　(حالی)

یہی جھیکنا کو مکو گہر بہ گہر ہے
یہی کو ٹھکانا نہ بیٹی کو بر ہے　　(حالی)

لڑکے استاد کی گھڑکی کو نہیں مانتے کچھ
بدمعاش اہلِ پولس کو نہیں گردانتے کچھ　　حالی

درد قومی کے اس معالج نے
یعنی سیکرٹری کالج نے　　(سجاد حیدر یلدرم خیالستان)

(دیکھیے یہاں مضاف مضاف الیہ دونوں انگریزی کے ہیں)

سینے ادھر ایسے کہ نہیں جو پر رفل بھی
کان ان کے وہ نازک کہ گراں میری غزل بھی　　(اکبر)

تھے معزز شخص لیکن ان کی لائف کیا کہوں
گفتنی درجِ گزٹ باقی جو ہے ناگفتنی　　(اکبر)

محاورات کو بدلیں براہِ ریل جناب
ٹکٹ بدست کہیں اب بجائے پا بہ رکاب　　(اکبر)

ادھر خیال نہیں مصلحانِ نیشن کا
کہ فرطِ ضعف نہیں وقت آپریشن کا　　(اکبر)

مال سپردِ آنجناب، جان سپردِ ڈاکٹر
عقل سپردِ ماسٹر، روح سپردِ ڈارون　　(اکبر)

روز و شب یہ کام ہی ہے لیڈرانِ قوم کا
دیکھتے ہیں ہو گیا کیا اور آگے ہوگا کیا　　(رشید احمد علی)

یہ خیال رہے کہ یہ تمام مثالیں مستندین کی ہیں ورنہ موجودہ دور میں تو اس قسم کی عمومیت عام ہے۔

ایسے ہی عطف و اضافت میں اعلانِ نون کا سوال ہے۔ عجیب مضحکہ خیز پابندی ہے گفتگو میں شرمندۂ احسان، حافظ قرآن وغیرہ تمام الفاظ باعلانِ نون استعمال ہوتے ہیں نیز مفردات نظم میں اعلانِ نون کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں اور ان میں کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا

مثال کے طور پر دیکھئے۔

کہل گیا آپ ہی آپ کچھ قائم — کیا بلا اس جوان پر آئی (قائم)

بس ہو یا رب یہ امتحان کہیں
یا نکل جائے اب یہ جان کہیں (میراثر)

جوبن، جان، امتحان سب باعلان نون آئے ہیں لیکن صحیح ہیں۔ امتحان اور قصداً امتحان دونوں باعلان نون پڑھئے دونوں میں کوئی بھی صوتی فرق نہیں ملے گا پھر آخر امتحان تو باعلان جائز اور قصداً امتحان غلط، یہ پابندی تو اتنی بے اصول اور بے تکی ہے کہ جس کی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔ ان خرافات و ہذیانات سے سوائے تنگ دامانی و گرانباری اور کیا حاصل ہے؟ ادب ان چیزوں سے ترقی نہیں کرتا۔ اب کچھ مثالیں سنئے۔

اے خالِ رخِ یار تجھے ٹھیک بناتا
پر چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر (شاہ نصیر)

تھا لو بہا میں جیش پہ اس لب کے سامنے
سب مول تیرا لعلِ بدخشاں رہ گیا (ذوق)

ہو سکے آسودہ دامن پاکدامن کس طرح
اے زلیخا چھوڑ دامن یوسفِ کنعان کا (ذوق)

آنکھ تو لڑ گئی پر کوئی بھی اس دل کے سوا
فوجِ مژگاں کے نہ مونھ پر سرِ میدان چڑھا (ذوق)

دشوار ہے رتبہ کو پیغمبر کے پہونچنا
ہے موسیٰ عمران بھی ہارون مرے آگے (مصحفی)

آج آتا ہے شوخِ غارت گر
دین و ایمان کا خدا حافظ (صفیر بلگرامی)

قتلِ انسان ہمیشہ سے ہے عادت تیری
سیکڑوں چڑھ گئے سولی پہ بدولت تیری (حالی)

جن و انسان کی حیات ہے تو
مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو (حالی)

گاندھی ہی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا
باطل کو حق سے دست و گریبان کر دیا (مولانا ظفر علی)

شیخ اور برہمن میں بڑھایا وہ اتحاد (مولانا ظفر علی خاں)
گویا انہیں دو قالب و یکجان کر دیا (نظم گاندھی بادلی کے جلسے)

اس سلسلے میں ان اساتذۂ محترم کی ایک دلچسپ بات کا تذکرہ بھی شنیدنی ہے۔ مثلاً ان کے نزدیک بارِ احساں کا نون ظاہر نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر یہی احسان خود بھی مضاف ہے تو پھر جائز ہو جائے گا مثلاً بارِ احسانِ اغیار۔ کوئی پوچھے کہ قبلہ!! یہ بات کیا ہوئی۔ مضاف الیہ کا نون بہر شکل ظاہر ہو ہی گیا۔ اس کا کوئی جواب نہیں ہو گا۔ حالانکہ انہیں کے قاعدے کے بموجب ایسی اضافت بھی ممنوع ہونا چاہیئے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ میں نے بارہا ان مسائل پر اصولی گفتگو کرنی چاہی لیکن جو صرف مقتدین کی حد تک تھے انہوں نے تو یہ کہہ کر منھ پھیر لیا کہ "بڑے آپ قابل بنتے ہیں!! استاد لوگ بیوقوف نہیں تھے"۔ ان غریبوں کی رسائی اس سے آگے تھی ہی نہیں۔ کیونکہ یہ تو عقائدِ مذہب کی طرح آنکھیں بند کر کے اقوالِ اساتذہ پر ایمان رکھتے ہیں اور گفتۂ استاد کو آیت و حدیث سے کم نہیں سمجھتے۔ اور اگر کسی استاد سے عرض کی تو وہ کوئی بات بنانے کے عوض ملامت کرنے یا اپنے بزرگوں کا حوالہ دینے پر اتر آئے۔ اب اگر ان کو دوسرے بزرگوں کا حوالہ دیا گیا تو سر کھجاتے ہوئے بولے۔ بھائی یہ چند مثالیں شاذ کے حکم میں آتی ہیں، یہ دیکھو اکثر کیا طرز ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہہ دے کہ صاحب! ادب کا اکثر حصہ ہی خرافات پر ہے تو بس پھر دو گھنٹے تک تمام "دیسی و بدیسی الفاظ فصاحت و بلاغت" استعمال کرتے رہیں گے۔

اسی طرح تراکیبِ ہند کا سوال ہے۔ فارسی میں اسم فاعل ترکیبی کا قاعدۂ اصلی یہ ہے کہ امر کے اوّل کوئی اسم لاکر بنا لیتے ہیں لیکن کبھی کبھی دو اسموں سے ہی یہ کام لے لیا جاتا ہے اور اس کو غلط نہیں سمجھا جاتا مثلاً شیر شکار، دل خوش وغیرہ۔ اس لئے کہ ایسے تصرفات سے زبان میں درحقیقت ترقی ہوا کرتی ہے اور اس کی رنگا رنگی میں اضافہ ہوتا ہے لیکن ہمارے یہاں اس کو کفر سمجھتے ہیں وہ اسم تو علیحدہ رہے اگر فعل عربی و فارسی کا ہے اور اسم ہندی وغیرہ کا تو اسے غلط کہیں گے۔ اور اس کے استعمال کرنے والے کو جاہل۔ حالانکہ اصولی اعتبار سے یہ تراکیب بالکل صحیح ہیں۔

یہاں بھی ایک دلچسپ بات قابلِ ذکر ہے۔ فارسی، عربی، ہندی وغیرہ کے الفاظ کی جمع ان لوگوں کے اصول کے مطابق نہیں زبانوں کے قواعد کے بموجب ہونی چاہیئے لیکن ایسا نہیں ہے۔ فارسی و عربی کی جمع ہندی طریقوں پر اور ہندی و انگریزی کی جمع فارسی و عربی اوزان پر بنائیں گے اور اسے صحیح سمجھتے ہیں مثلاً

راجہ	کی جمع	راجگان	بقاعدہ فارسی
پرگنہ	" "	پرگنات	" عربی
غزال	" "	غزالوں	" ہندی
تعطیل	" "	تعطیلوں	" "
موٹر	" "	موٹریں / موٹروں	" "

تو جب اردو یہی اُردو جس کی رگ رگ مستعار الفاظ سے بنی ہے اس میں تمام الفاظ خواہ کسی زبان کے ہوں بولے جاتے ہیں۔ لکھے جاتے ہیں۔ ان کی جمع بنائی جاتی ہے اور اس میں کسی زبان کی گریمر کا لحاظ نہیں رکھا جاتا بلکہ جس طرح بولنے میں آسانی ہوئی اسی طرح عمل کر لیا تو باہمی ترکیب میں کیا نقصان ہو سکتا ہے اور کیا وجہ اجتناب و احتراز۔

مثلاً کچہری، ڈاک خانہ دو لفظ ہیں۔ ان کو چھوڑ کر اگر عقل دار یا فہم دار، دار الامر خانہ یا دار الترسیل بولا جائے تو یقیناً اجنبیت کا احساس ہوگا۔ اسی طرح لاچار۔ لاپروا، لاپتہ وغیرہ میں کہا جاتا ہے کہ ناچار، بے پروا، بے پتہ بولنا چاہیئے لیکن آخر ان الفاظ میں بجائے خود کیا برائی ہے جب راجہ کی جمع راجگان بن سکتی ہے اور راجگانِ ہند لکھا جا سکتا ہے تو ان الفاظ بیچاروں نے کیا قصور کیا ہے کہ گردن زدنی ہیں۔ خود فارسی والے تو بڑی فراخدلی سے ہندی الفاظ استعمال کرتے ہیں جس کی کچھ مثالیں اضافت کے بیان میں آپ پڑھ چکے، لیکن ہم جو اس کے ہزاروں الفاظ اپنائے بیٹھے ہیں ان سے گریزاں ہیں قبل اس کے کہ اردو کی اس قسم کی مثالیں دوں دو مثالیں فارسی کی اور سنیئے اور صرف ایک ہی کتاب کے ایک ہی صفحہ سے۔

"جوانی دیوانی گویند" وقائع عالمگیری صفحہ ۵۰

"ایں محض پاجی گری است" صفحہ ۵۰

اب اردو کی کچھ مثالیں سنیئے اور فیصلہ کیجیئے کہ جب ہمارے اہلِ قلم اس قسم کی ترکیبات بے تکان استعمال کرتے ہیں تو ہم کو کیوں تامل ہونا چاہیئے

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا (ذوق)

(دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد صفحہ ۵۹)

سخت جانی سے ہوں لاچار وگرنہ مجھ سے
نہ تو خنجر کو ہے انکار نہ تلوار کو رنج (ذوق)

(دیوانِ ذوق مرتبہ آزاد صفحہ ۹۶)

سورج کی شکل خوف سے بدرنگ ہو گئی
روپوش اس کے پرتوے سے دھوپ ہو گئی (مرزا دبیر)

(دیکھیئے یہاں دونوں اسمائے ہندی سے اسم فاعل ترکیبی بنا ہے)

"یہ فسانہ نہایت عجلت اور لاپروائی کے ساتھ لکھا گیا" (چکبست)

(مضامین چکبست صفحہ ۴۵)

"تیر ایک ہوا چاک سرسراہٹ سے اس کی طرف گیا" (سجاد حیدر یلدرم)

(خیالستان صفحہ ۴۸)

(دیکھیئے یہاں بھی دونوں اسماء سے اسم فاعل بنا ہے اور یہ عمدہ ترین ترکیب ہے)

"آخر لاچار گھر چھوڑ باہر آ بیٹھے" (مرزا فرحت اللہ بیگ)

(مضامین فرحت حصہ اول صفحہ ۵۱)

"تو مجھے لاچار نام تبدیل کرنا پڑا" (مرزا فرحت اللہ بیگ)

(مضامین فرحت حصہ اول صفحہ ۱۴۷)

"میری لاپروائی، ریل میں چوری کے خطرات" (مرزا فرحت اللہ بیگ)

(مضامین فرحت حصہ اول صفحہ ۵۰)

"ایسا لاپروا بے نیاز کی قدرت سے با نیاز" (رجب علی بیگ سرور)

(فسانۂ عجائب صفحہ ۱۷)

اس کے علاوہ بہت سے الفاظ ایسے ہمارے یہاں مستعمل ہیں جو کہ ادنیٰ تغیر سے اپنا لئے گئے ہیں۔ اب ان میں اضافت بھی ہوتی ہے اور عطف بھی مثلاً سوئیٹ کو سویت۔ تال سے تالاب بنایا گیا جس کو کہ فارسی میں آبگیر اور عربی میں غدیر کہتے ہیں اور اب یہ عموماً مستعمل ہے۔ بنگ درحقیقت ہندی لفظ ہے۔ جنگل کو معرّب کیا ہے، اور اب وہ بے تکلف مستعمل ہے۔ مثالیں دیکھیئے۔

لازم ہے یہاں خطۂ زمینِ سویت

"دو چار برس میں ہو کر دس بیس برس میں" (حسرت موہانی)

نام گرچاہتا ہے فیض کے اسباب بنا
پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا (ذوق)

ذوق زیبا ہے جو ہو ریش سفید شیخ پر
وسمہ آب بنگ سے مہندی سے گلرنگ سے (ذوق)

یہ الفاظ اپنے ہندی الاصل ہونے کا صاف اظہار کرتے ہیں۔

یہ تمام مثالیں مستندین کی ہیں۔ اصولیات و شواہد کی روشنی میں اب یہ کہنا کہاں تک صحیح ہوگا کہ "نہیں صاحب یہ باتیں تو ہم کبھی بھی نہ مانیں گے۔"

آج ہمیں ادب کو اتنی ترقی دینا ہے کہ اسے دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مقابل میں ہم آہنگی و گرانباری کے ساتھ پیش کر سکیں۔ اس کے لئے کچھ اضافے کرنا ہوں گے۔ دوسری زبانوں کا ترقی پسند انداز آپ کے سامنے ہے اپنے ادب کے مزاج، ماحول اور اس کی ہیئت ترکیبی کا لحاظ رکھتے ہوئے اس میں اضافے کیجئے اور نئی راہیں پیدا کیجئے۔ یاد رکھئے کہ صرف افسانہ ہائے کہن کو دہراتے رہنے کا وقت نہیں مگر آپ اسی محدود سرمایہ پر اکتفا کریں گے جو آپ کے متقدمین ورثے میں چھوڑ گئے ہیں تو آپ جانشینی کا صحیح فرض ادا نہیں کر سکیں گے

غلط ترقی پسندی سے جس طرح ہم کو محتاط رہنا چاہیئے اسی طرح غلط قدامت پرستی سے بھی محترز و مجتنب رہنا ہوگا جس طرح ہمارا یہ فرض ہے کہ جدتوں، ندرتوں اور رفعتوں کو اپنائیں، ان کو ادب میں سموئیں، ہر پہلو پر نظر ڈالیں اور اس کو مکمل کریں، ہر خلا پر نظر رکھیں اور اسے پُر کریں اسی طرح ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ قدامت کی ان فرسودہ و پامال قدروں کو بھی یکسر بدل دیں جو آج تک غلط اشارات کا کام دے رہی ہیں۔ اور ان کے عوض صحیح نشانات و خطوط تیار کریں۔ ادب میں اتنی ہمہ گیری پیدا کریں کہ وہ حاوی ہو ہر پہلوئے حیات و ہر منظر کائنات پر۔ اس کے اندر حیات کو اس طرح جگہ دیں کہ وہ بیک وقت فطرت کے راز ہائے سربستہ کا آئینہ دار ہو اور حیات کے ہر دم بدلنے والے پہلوؤں کا عکاس، اس میں تنقید حیات بھی ہو اور ہمہ دانی فطرت بھی جس میں زندگی اپنی ساری ہماہمی کے ساتھ، فطرت اپنی تمام برنائی و بوقلمونی کے ساتھ، امکانات اپنی جملہ لطیف و قہرمانی طاقتوں کے ساتھ نظر آسکے۔ یہی ہماری منزل ہے۔

آخر میں چند الفاظ اپنے محترم بزرگوں سے بھی کہتا ہوں۔

زبان و بیان کی اصلاح جدید کی طرف آپ کو جلد از جلد متوجہ ہونا چاہیئے، اس لئے کہ یہ آپ کا فرض ہے اور منصب بھی، ورنہ بصورت دیگر خود یہ چیزیں پیدا ہو جائیں گی اس وقت جہاں کچھ اچھے پہلو پیدا ہوں گے وہاں کچھ غلط بھی جن کی کہ ابتدا ہو چکی ہے اس لئے کہ انتہا پسندانہ ردعمل ہمیشہ مصلحت سے رو گرداں ہوا کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد زبان و ادب کی ساری دہائیاں بے کار ہوں گی اور "جانشینی و سرپنچی" کے سارے اعزازات باد ہوا۔

وقت کی ضرورت ہے کہ نئے الفاظ، دوسری زبانوں کے اثر سے پیدا شدہ محاورات و تراکیب جدید اسلوب و تصورات، پر کوشش کر کے فراخدلانہ فیصلے کئے جائیں۔ تاکہ زبان و ادب میں وسعت بھی ہو اور پڑھے لکھے افراد کو خود اجتہاد نہ کرنا پڑے۔

جب کوئی صحیح چیز سامنے ہوگی تو خواہ مخواہ غلطی کو کوئی نہیں اپنائے گا ورنہ اگر متشکک رہ کر صرف "فتوے" ہی دینے پر اکتفا کیا گیا تو یہ دور کے ڈھول سہانے ہو کر رہ جائیں گے۔

اسرار احمد آزاد

عرب لیگ

دوسری عالمگیر جنگ کے دوران میں مدبرینِ عالم پر یہ حقیقت بالکل واضح ہو گئی تھی کہ اگر اس جنگ کے جمہوری فریق کو فتح و نصرت حاصل ہوئی تو اس کے نتیجے کے طور پر اول تو دنیا کے محکوم اور نیم محکوم ممالک کے باشندوں میں آزادی حاصل کرنے کا ایک زبردست جذبہ پیدا ہو جائے گا۔ اور دوسرے دنیا کے مختلف حصوں اور خطوں پر بعض طاقتوں کے جو مخصوص اثرات قائم ہیں ان میں زبردست تبدیلیاں رونما ہوں گی۔

چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج ایشیا کے متعدد محکوم اور نیم محکوم ممالک کو آزادی اور خود مختاری حاصل ہو چکی ہے۔ بعض ممالک ان نعمتوں کو حاصل کرنے کی جد و جہد میں مصروف ہیں۔ براعظم افریقہ اور ایشیا میں قوموں کے توازن بدلتے جا رہے ہیں اور مشرقِ وسطیٰ میں بقائے اثر اور قیامِ اقتدار کی کشمکش پوری قوت کے ساتھ جاری ہے۔

مشرقِ وسطیٰ کی اہمیت اور خصوصیت

اس سلسلے میں میں نے مشرقِ وسطیٰ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا ہے کہ میرے موضوعِ بحث عرب لیگ کا تعلق اسی خطۂ ارض کے ساتھ ہے۔ لیکن جب تک ہمیں دنیا کے اس حصے کی بعض اہم خصوصیات، ان کی بدولت پیدا شدہ پیچیدگیوں اور آج کی بین الاقوامی سیاست میں اس خطۂ ارض کے حقیقی مقام کے متعلق کم از کم بنیادی معلومات حاصل نہ ہو جائیں خود عرب لیگ کی خصوصیت اور کردار کا صحیح اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

مشرقِ وسطیٰ کے ممالک —— مصر، شرق اردن، یمن، فلسطین، شام، لبنان، عراق اور سعودی عرب —— اگرچہ زراعت اور صنعت و حرفت کے اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتے لیکن یہ حیثیت بھی ہی ان ممالک میں تیل کے زبردست ذخائر موجود ہیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس تیل کی تعداد کسی طرح بھی چار ارب من سے کم نہیں اور اگرچہ یہاں تیل برآمد کرنے کا کام دوسری عالمگیر جنگ کے آغاز سے کچھ پہلے شروع کیا گیا تھا لیکن ۱۹۴۶ء کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور جنوبی امریکہ کو چھوڑ کر یہ علاقہ تیل کی برآمد کا سب سے بڑا علاقہ بن گیا تھا۔

تیل کی برآمد کے اعتبار سے اس خطۂ ارض کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۹ء میں یہاں سے تیل کے ۳۳۵ بیرل برآمد کی گئی تھیں لیکن ۱۹۴۷ء میں ان کی تعداد دس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ اس سلسلے میں ایک برطانوی اخبار "ٹریبیون پریس سروس" نے لکھا ہے کہ —— ۱۹۳۶ء میں اینگلو ایرانین آئل کمپنی کا منافع ۷۰ لاکھ پونڈ تھا مگر ۱۹۴۸ء میں یہ منافع ۲ کروڑ ۴۰ لاکھ پونڈ ہو گیا تھا اور اسی طرح اسی زمانے میں پانچ امریکی کمپنیوں کا خالص منافع ۱۸ کروڑ ۱۰ لاکھ ڈالر سے بڑھ کر ۸۸ کروڑ ۴۰ لاکھ ڈالر تک پہنچ گیا تھا۔

پھر اسی قدر نہیں بلکہ اول تو اس خطۂ ارض کا محلِ وقوع ایسا ہے۔ جہاں سے مشرق پر قیامِ اقتدار کے تمام تر ذرائع کو نہایت آسانی کے ساتھ حرکت میں لایا جا سکتا ہے۔ اور دوسرے صنعت و حرفت کے فقدان کے باعث ان ممالک میں دوسرے ملک اپنا تجارتی سامان فروخت کر کے بہت زیادہ نفع کماتے ہیں۔ چنانچہ اسی سلسلے میں کچھ مدت پہلے لندن کے مشہور اخبار "اکانومسٹ" نے لکھا تھا کہ —— پچھلے دنوں تک ان ممالک کی اقتصادیات میں کھجور اور اونٹ کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا ——

اس کے ساتھ ہی یہاں اس بات کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہئے کہ دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے تک یہ خطۂ ارض برطانیہ کے زیرِ اثر تھا اور یہاں کے تیل نیز تجارت پر اسے پورا پورا اختیار حاصل تھا لیکن اول تو ۱۹۳۳ء میں نجد اور حجاز کے حکمران امیر ابن سعود کے ساتھ چالیس سال کے لئے ان کی مملکت سے تیل نکالنے کا ایک معاہدہ کر لیا تھا اور دوسرے دوسری

عالم گیر جنگ کی ضرورتوں نے برطانیہ کو اس امر پر مجبور کر دیا تھا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو بھی اس خطۂ ارض میں آنے کی اجازت دے چونکہ آج موخر الذکر دنیا کا متمول ترین ملک ہے اور وہ جنگ کی بدولت شکستہ حال اور تباہ ہو جانے والے ممالک کی مالی امداد بھی کر رہا ہے۔ اس لئے جنگ ختم ہو جانے کے باوجود مشرق وسطیٰ میں اس کا اثر نہ صرف موجود ہی ہے بلکہ اس میں اضافہ بھی ہو رہا ہے۔

مختصر یہ کہ اس خطۂ ارض کی یہی وہ خصوصیات ہیں۔ جن کی بدولت آج اسے بین الاقوامی سیاست میں ایک اہم مقام حاصل ہو گیا ہے لیکن چونکہ مشرق وسطیٰ کے ان ممالک میں سے بیشتر کے روبرو خود اپنی کوئی داخلی اور خارجی حکمت عملی موجود نہیں اور ان ممالک کے برسر اقتدار گروہ یا افراد ان بیرونی طاقتوں کی حکمت عملی کو پیش نظر رکھتے ہیں جو سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے ان پر اثر انداز ہیں۔ اس لئے یہ ممالک بہت سی داخلی اور خارجی پیچیدگیوں میں مبتلا ہیں۔ اور فلسطین کے مسئلے کی پیچیدگی، ریاست اسرائیل کا قیام، شام میں مسلسل انقلابات، یمن اور برطانیہ کا تنازعہ نیز شرق اردن اور لبنان کے تجارتی تعلقات کا انقطاع وغیرہ ان ریاستوں کی مذکورہ بالا حکمت عملی یا پھر کسی حکمت عملی کے فقدان ہی کے لازمی نتائج ہیں۔

عرب لیگ

جہاں تک عرب لیگ کا تعلق ہے اس کی مختصر تاریخ تو یہ ہے کہ اس جماعت کو مارچ ۱۹۴۵ء میں مصر، شام، لبنان، عراق اور شرق اردن کے نمائندوں نے قاہرہ میں اپنے ایک جلسۂ مشورہ کے فیصلے کے بعد قائم کیا تھا اور اس وقت اس کے مقاصد عرب ممالک کو مغربی اقوام کی محکومیت سے نجات دلانا، باہمی تنازعات کو باہمی گفت و شنید سے طے کرنا، تجارتی اور اقتصادی امور میں ایک دوسرے کی مدد کرنا اور عرب ممالک سے تعلق رکھنے والے مسائل اور معاملات میں مشترکہ حکمت عملی اختیار کرنا قرار پائے تھے ——— اور اگرچہ ابتدائی جلسہ مشورہ میں صرف مذکورہ بالا ممالک ہی نے شرکت کی تھی۔ اور عرب لیگ کا سنگ بنیاد بھی انہیں ممالک نے رکھا تھا لیکن کچھ مدت کے بعد اس میں سعودی عرب اور یمن بھی شریک ہو گئے تھے اور یہ بات بھی قرار پائی تھی کہ فلسطین کی آزادی کے بعد جو اس وقت مجلس اقوام کے فیصلے کے مطابق برطانیہ کے زیر حکم بردار تھا اسے بھی لیگ کا رکن بنا لیا جائے گا ——— لیکن چونکہ فلسطین سے برطانوی انتداب کے خاتمے کے بعد وہاں یہود کی نئی ریاست "اسرائیل" قائم ہو گئی ہے۔ اس لئے اگرچہ یہ ملک عرب لیگ کا رکن نہیں بن سکا۔ مگر عرب لیگ کے حالیہ اجلاس میں جو قاہرہ میں منعقد ہوا تھا فلسطین کی اس عرب حکومت کو جس کا صدر مقام غزہ ہے شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔

سطور بالا میں اس بات کی جانب اشارہ کیا جا چکا ہے کہ آج مشرق وسطیٰ میں دو قوتوں یعنی برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے اثرات کام کر رہے ہیں۔ اور جیسا کہ دنیا کی تمام تجارت پیشہ اقوام کا قاعدہ ہے۔ ان دونوں ملکوں کے مابین بھی اس خطۂ ارض میں تجارتی کشمکش جاری ہے اور جہاں تک حالات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے عرب لیگ بھی اس کشمکش سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی اس میں شک نہیں کہ عرب لیگ کے قیام کے وقت مشرق وسطیٰ کے اس حصے میں برطانیہ کا اثر قائم تھا۔ اور چونکہ فلسطین کے متعلق اس کا رویہ عربوں کے موافق ہوتا جا رہا تھا۔ اس لئے اس زمانے میں عرب لیگ بھی عموماً برطانیہ کی مؤید تصور کی جاتی تھی لیکن ایک جانب تو اسرائیل کے قیام کے سلسلے میں برطانوی حکمت عملی کی ناکامی اور دوسری طرف ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے روز افزوں سیاسی اور اقتصادی اثر کی بدولت اب عرب لیگ پر بھی برطانیہ کا وہ اثر باقی نہیں رہا جو ابتدا میں قائم تھا اور آج جس طرح مشرق وسطیٰ کے تمام ممالک بیرونی اثرات کے اعتبار سے دو حصوں میں منقسم نظر آتے ہیں۔ اسی طرح عرب لیگ میں بھی یہ تقسیم موجود ہے۔

عرب لیگ کی حیثیت

۱۹۴۵ء میں جب عرب لیگ کا قیام عمل میں آیا تھا تو بعض ذمہ دار سیاسی حلقوں میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ ——— مشرق وسطیٰ کی عرب ریاستوں کا یہ اتحاد دراصل عالم گیر اتحاد اسلامی کے سلسلے کا ایک مضبوط حلقہ ہے اور اگرچہ اس کی ابتدا محض عرب ریاستوں کی جانب سے کی گئی ہے لیکن آہستہ آہستہ ترکی ایران اور افغانستان بھی اس میں شریک ہو

جائیں گے ——— لیکن اوّل تو اس خیال کی تردید سب سے پہلے ۱۹۴۳ء میں اس وقت ہو گئی تھی جب عرب لیگ کی طرف سے اس بات کا اعلان کیا گیا تھا کہ لیگ میں غیر عرب ریاستوں کی شرکت کی کوئی گنجائش موجود نہیں اور دوسرے "اسرائیل" کے سلسلے میں لیگ کے اراکین کا جو طرز عمل رہا ہے وہ اس بات کا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے کہ عرب لیگ مذہبی تصورات پر مبنی نہیں بلکہ ایک سیاسی گروہ ہے اور اس گروہ کا دائرہ عمل بھی صرف عرب ریاستوں ہی تک محدود ہے۔

جہاں تک عرب لیگ کے ماضی اور مستقبل کا تعلق ہے یہ بات بیان کر دینے میں کوئی مضائقہ معلوم نہیں ہوتا کہ ۱۹۴۵ء سے اس وقت تک اپنے پیش نظر مقاصد کے اعتبار سے اسے کوئی نمایاں اور قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ اس میں شریک ممالک بدستور مغرب کی مختلف طاقتوں کے زیر اثر ہیں۔ ان کے مابین اختلافات موجود ہیں۔ اور لیگ ان کی اقتصادی، معاشی اور سیاسی آزادی اور خود مختاری کی راہ میں ایک قدم بھی آگے بڑھانے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ جس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اس میں شریک ممالک کے مفاد ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اور وہ خود ان مقاصد کے تعین پر قادر نہیں اور اگر مستقبل میں بھی یہی صورت حالات باقی رہی تو جہاں تک مشرق وسطی کی فلاح و بہبود کا تعلق ہے ہمیں عرب لیگ کے ساتھ کوئی توقع وابستہ نہیں کرنی چاہئے۔

مختصر یہ کہ عرب لیگ صرف مشرق وسطی کی عرب ریاستوں کی ایک تقریباً سرکاری جماعت ہے۔ جس کی تشکیل مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ حکمران طبقوں کی سیاسی ضرورتوں کے تحت کی گئی ہے اور چونکہ یہ ضرورتیں بھی مختلف ہیں اس لئے خود عرب لیگ بھی ان سے متاثر ہے اور یہی وجہ ہے کہ پانچ سال کی مدت گذر جانے کے باوجود اس کی وجہ سے عرب ریاستوں کو کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہو سکا۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اگر کسی زمانے میں یہ جماعت غیر ملکی اثرات سے پاک اور اقتدار سے آزاد ہو سکی تو مشرق وسطی میں بین الاقوامی سیاست کا موجودہ کاروبار بدل جائے گا۔ اور اگر آج بھی اس خطہ ارض کو بین الاقوامی سیاست میں ایک اہم مقام حاصل ہے لیکن اس صورت میں اسے جو اہمیت اور حیثیت حاصل ہوگی وہ محکومانہ نہیں بلکہ مساویانہ ہوگی۔

راجندر راجن

کتھا کلی

وُہ دن بھر کا کام ختم کر کے گھر کی طرف روانہ ہوتا تھا تو فضا دُھندلی ہو جاتی تھی۔ باہر قدم رکھتے ہی اُسے جھرجھری سی آتی تھی۔ سرد ہوا اُس کے بھاری مفلر کے سوراخوں میں سے چھن چھن کر اُس کی گردن میں سوئیاں چبھونے لگتی تھی۔ وُہ کوٹ کے دونوں کالر کانوں تک اُٹھا لیتا تھا اور اسی حالت میں تانگوں، موٹروں اور سائیکلوں کی زد سے بچتا بچاتا وہ ایک میل تک چلتا تھا۔ یہی اُس کی روزانہ سیر تھی۔ مگر روز چلنے پر بھی وہ اکثر بیمار ہی رہتا۔ بیمار جسم کے دماغ میں بھی زندگی کم ہی رہ جاتی ہے۔ چنانچہ اُس کا مجبور دماغ ہر وقت کسی نہ کسی سوچ میں کھویا رہتا خواہ مخواہ کے آلام اکثر اُس کے گرد گھیرا ڈالے رہتے تھے لیکن تخیل اُسے حسین ماضی واپس دلا سکتا تھا، حال کی تلخیوں سے بے خبر بنا سکتا تھا، مستقبل سے بے نیاز کر سکتا تھا۔ غرض کہ تخیل ہی اُس کی زندگی کا عطیہ تھا۔ مگر نیلا ——— اُس کی رفیقِ حیات اٹھارہ برس کے طویل زمانے میں بھی اُس کے تخیل کی اہمیت کو نہ جان سکی۔

جب پران ناتھ نے زندگی کے اس دور میں قدم رکھا تھا تو اُسے یقین کامل تھا کہ اُس کی زندگی سدھر جائے گی۔ اُس کی جذباتی طبیعت نیلا کے حُسن میں جنت ڈھونڈ نکالے گی۔ شادی کے دن خوشی کے مارے اُس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے تھے معلوم ہوتا تھا اُسے رجھانے کے لئے خود قدرت نے دُلہن کا رُوپ دھار رکھا ہے اور جب اُس نے دُلہن کا گھونگٹ میں چھپا ہوا مکھڑا دیکھا تو اُس کا دماغ بے ساختہ کئی شعر کہہ گیا۔ وہ سوچنے لگا یقیناً اب وہ فرہاد بیگم کو بھول جائے گا بلکہ آج تک موہنی کے دھوکے میں رہنا اُس کی بہت بڑی بھول تھی۔ درحقیقت وہ ایک جُرم تھا۔ سماج کا، مذہب کا اور قدرت کا لیکن قدرت کس قدر شفیق ہے کہ اُس نے اُسے سزا کے عوض کفارے کا موقع دیا۔

نیلا نے گھونگٹ نیچے سرکا لیا ——— چاند بادلوں میں گھر گیا۔ پران ناتھ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گھونگٹ اُٹھایا۔ دولہن لاج کے مارے سمٹی جا رہی تھی۔ اُس کے نرم نرم رُخسار پر سیاہ کاگل مچل رہا تھی۔ پران ناتھ پر مدہوشی طاری ہو گئی۔ وُہ گنگنانے لگا ؎

لٹ اُلجھی سُلجھا جا بالم - ہاتھوں میں مورے مہندی رچی ہے

دُلہن زیر لب مُسکرائی اور پران ناتھ اُس کی مُسکراہٹ میں کھو گیا۔ آج تک اس نے موہنی اور اُسی نمرے کی چالاک اور بے باک عورتیں دیکھی تھیں۔ اس لحاظ سے بھی یہ باحیا نازنین اس کے لئے ایک نئی چیز تھی۔ نئی دلکشی، نئی جاذبیت کی حامل۔ وُہ خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اُن کی جوان آنکھوں میں ایک معصوم شرارت چمکی۔ اُس نے نیلا کے سر سے پلو سرکا کر کاندھوں پر گرا دیا۔ ہو سکتا ہے یہ اُس کے تخیل کی پختہ کاری ہو مگر اُسے یاد ہے کہ اُس وقت نیلا کے گرد ایک روشنی کا ہالہ دکھائی دے رہا تھا۔

ہاں! اُسے کتھا کلی ناچ سے بہت اُنس تھا۔ اور موہنی کتھا کلی ادا بھی خوب کرتی تھی۔ مگر اب تو کتھا کلی ناچ بھی نیلا کی ایک مسکراہٹ کے مقابلے ہیچ نظر آتا تھا۔ ناچنا موہنی کا پیشہ ہے۔ وہ کسی کی خوشی کے لئے نہیں اکتساب زر کے لئے ناچتی ہے۔ مگر مُسکرانا نیلا کا پیشہ نہیں۔ وہ اکتساب زر کے لئے نہیں، محض ناتھ کی خوشی کے لئے مسکراتی ہے۔ پھول سا کومل بدن جسے اُس نے تمام عمر لاج کے آنچل میں چھپائے رکھا تھا۔ آج محبت کے جذبے اُس کے ارپن کر رہی تھی۔ پران ناتھ کو عورت کی فطرت کی بلندی کا احساس ہو رہا تھا۔ اُس نے سوچا عورت محض ایثار ہے۔ عورت محبت کا سرچشمہ ہے اور وُہ عورت ہے کہاں۔ اطہر ہندوستان کے گھر گھر کی مالک ہندوستانی ہیں۔ یقیناً عورت کی شخصیت کا جو تصور ازل سے قدرت نے باندھا تھا جس مقصد کے لئے خدا نے نسائیت کو عورت عطا فرمائی تھی۔ وُہ [illegible] ہندوستانی عورت آج تک نبھا رہی ہے۔ مُنیا اُوگی ہے۔ [illegible] آج تک نبھا

جا رہا۔ اس نے جذبات سے گلوگیر لہجے میں کہا: "لیلا قدرت نے مجھے تمہارے رُوپ میں جنت بخشی ہے۔ میں تمہاری پوجا کروں گا۔" چنانچہ ایک مدت تک وُہ محبت میں گم رہا۔

مرحوم والد کی جائداد قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ اور اِس جنتِ ارضی کی جاذبیتوں اور دلکشیوں کو برقرار رکھنے کے لئے روپے کی ضرورت تھی۔ روپیہ! ایک نہ بھول سکنے والی حقیقت جس کے بغیر شاید دیوتا بھی بھینٹ قبول نہیں کرتے ہیں۔

پران ناتھ گھبرایا نہیں۔ اُس نے ہمت نہیں ہاری وُہ مسکراتا ہوا تلاشِ معاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اور ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ حتّٰے کہ شاید وُہ مزدوری سے بھی گریز نہ کرتا۔ خیر ایک معمولی سے دفتر میں اُسے ملازمت مل گئی۔ زندگی کا سہارا ہو گیا۔ اسی دوران میں اُس کی بوڑھی ماں بھی چل بسی گھر کے کام کاج کی تمام ذمہ داری اُس کی آسمانی حُور پر آ پڑی۔ جب وُہ اپنے ملائم حنائی ہاتھوں سے برتن صاف کرتی۔ تو پران کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور زندگی کی مشکلات اُسے کئی خطرناک ترغیبیں دے جاتیں —— وقت گذرتا گیا۔ اور لیلا کا پاؤں بھاری ہو جانے کی وجہ سے اس کا جسم کمزور ہو گیا۔ لیکن پیٹ کی بھٹی کو ایندھن مہیا کرنے کے لئے بیچاری کو صبح سے شام تک کولہو کے بیل کی طرح جتتے رہنا پڑتا۔ پھول سا مکھڑا مُرجھا گیا۔ اُس کے نرم نرم رخساروں پر غم کی پرچھائیاں دکھائی دینے لگیں حنائی انگلیوں کی پوروں میں گندے برتنوں کی کالکھ سما گئی۔ جسم بیڈول ہو گیا۔ دلکشی مفقود ہو گئی۔ آسمان کی حُور زمین کی عورت میں تبدیل ہو گئی۔

بہرنوع ان کے ہاں ایک چندرمکھی بیٹی پیدا ہوئی۔ پہلا بچہ لاڈلا ہوتا ہے اس لئے کملا کی پرورش بھی بڑے ناز و نعمت سے کی گئی۔ اور اب —— اب تو وُہ بھی جوان ہو چکی ہے۔ بلکہ کسی اور پران ناتھ کی دُلہن بنائے جانے کے قابل ہے۔ ایک زمانہ تھا جب وُہ ننھی منی بچی تھی۔ تب پران ناتھ کو کتنا چاؤ تھا۔ کہ کب کملا بڑی ہو۔ کتابیں پڑھے۔ اچھے اچھے کپڑوں کی فرمائش کرے بات بات پر روٹھ جایا کرے۔ اور وُہ دونوں اُسے منایا کریں۔ مگر اب جبکہ وُہ جوان ہو چکی تھی۔ اس کی جوانی ہی پران ناتھ کی فکر کا باعث بن رہی تھی۔ اُس کے تراشیدہ نقوش۔ اُس کا متناسب جسم۔ اُس کے گلابی رُخسار دیکھ کر پران ناتھ کی نظریں زمین میں گڑ جاتیں۔ وُہ دفتر سے بھی جان بوجھ کر

دیر سے لوٹتا تاکہ اُس کی بیوی کو کملا کے متعلق گفتگو کرنے کا موقعہ ہی نہ ملے۔ بس کبوتر کی طرح پران ناتھ کملا کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا اور حتّے الامکان اُس سے گفتگو کرنے سے بھی گریز کرتا۔ دانستہ یا نادانستہ اُس کے دماغ میں یہ خیال گھر کر چکا تھا۔ کہ اُس نے ایک ناقابلِ تلافی بھول کی ہے جس کا نتیجہ ہے کملا۔ اگر وُہ دلہن کے سحر انگیز حُسن سے مرعُوب نہ ہو جاتا۔ اور موہنی کی کتھا کلی میں ہی کھویا رہتا۔ تو آج اُسے ان پریشانیوں، ان دقّتوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اُس نے سوچا سماج، بیاہ، شادی سب ڈھونگ ہیں۔ دُنیا کی واحد سچائی ہے موہنی۔ موہنی کی محفل میں زندگی کی رنگینیوں کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ مگر تہذیب و تمدّن کے قوانین میں جکڑی ہوئی سماج کی ان نام نہاد جنتوں میں زندگی کی گردن پر کُند چھُری چلائی جاتی ہے۔ اُس وقت اس مجبُور انسان کے تھکے ہوئے دماغ میں ایک باغیانہ خیال نے سر اُٹھایا۔ کیوں نہ وُہ اپنی کملا کو موہنی بنا دے۔ دُوسری "لیلا" بننے سے بچا لے۔ کیوں نہ کسی پران ناتھ کو بے فکر زندگی بسر کرنے دے۔ لیکن دُوسرے ہی لمحے اُس کے تخیّل نے دیکھا۔ کہ سماج کے ان گنت ہاتھ اُس پر اُنگلیاں اُٹھا رہے ہیں۔ طعنے پھٹکاریں، گالیاں، پتھر نہیں کملا کو لیلا دیوی ہی بننا ہوگا۔ یہ اُس کا پیدائشی حق ہے۔ اُس کے کمزور دماغ کے تنتے ہوئے تار خود بخود ڈھیلے پڑ گئے۔ اُس نے سر جھکا لیا۔ سرد ہوا بھاری مفلر کے باریک سُوراخوں سے چھن چھن کر اُس کی گردن میں سوئیاں چبھونے لگی۔

چند بچے جو کھیل کُود کے بعد گھر پلٹ رہے تھے۔ بڑی بے احتیاطی سے اُس کے پاس سے گذر گئے۔ بچپن کی یاد بے فکریوں اور دلچسپیوں کے نقوش ذہن میں اُبھر آئے۔ اور ایک خواہش —— بچوں میں بچہ بن کر مل جانے کی —— برق رفتاری سے اُس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ مگر جاگر کی بھاری ٹوپی اور بغل میں دبی ہوئی دفتر کی فائلیں اس کی ان طفلانہ خواہشات کا مضحکہ اڑا رہی تھیں۔ جب وُہ خود بچہ تھا تو وُہ اور اس کے ہمجولی بابو ہونا باعثِ فخر خیال کرتے تھے۔ بلکہ اُس ماحول کا نصب العین ہی بابوگیری تھی۔ مائیں جب اپنے منّوں کو اچھے کپڑے پہنائیں تو فخریہ کہا کرتیں۔ آج تو میرا لال بالکل بابو بنا ہُوا ہے۔ چنانچہ پران ناتھ اور اس کے ساتھی اپنے ننھے کانوں میں پنسلیں دبا کر اور آنکھوں پر تنکوں کے چشمے لگا کر یہ شوق پورا کیا کرتے تھے۔ مگر آج۔ کاش! کوئی دکھ

اس کی پنسل اور چشمہ لے لے اور بچپن کی بے فکری اسے بخش دے۔

وُہ انہیں خیالات کے بہاؤ میں بہتا چلا جا رہا تھا کہ ایک ہلکے آسمانی رنگ کی شیورلیٹ دُھند میں تیرتی ہُوئی اُس کے قریب سے گذر گئی۔ اُسے یُوں جان پڑا جیسے موہنی موٹر میں بیٹھی تھی مگر وُہ سرے ہی لمحے موٹر جا چکی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اس کا یہ خیال بھی پامال ہو چکا تھا۔ کیونکہ بھلا موہنی اب کہاں اور اگر ہُوئی بھی تو زمانے کے تغیرات نے اُسے کتنا بدل ڈالا ہوگا۔ شاید پہچانی بھی نہ جائے۔

تھوڑی دُور شہر کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ اب وُہ گھر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ بس اگلے چوراہے سے مُڑکر دائیں ہاتھ گلی میں اُس کی منزل مقصُود تھی۔ کاش اُس کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوتا۔ دُنیا میں اُس کا کوئی نہ ہوتا۔ وُہ ایک اجنبی کی طرح کھلی اور روشن سڑکوں پر آوارہ گھومتا پھرتا۔ ہنستا۔ کھیلتا۔ دِلکش خواہشات کی تکمیل میں اپنی تمام تر قوتیں صرف کر دیتا۔ اُس وقت اُس کی فلک بھری نگاہوں کے سامنے ایک خانہ بدوش قافلے کا تصوّر کھچ گیا وُہ قافلہ جو منزل سے ناآشنائے محض ہو جسے مستقل ملکیت کا خیال پریشان نہ کرے۔ جہاں حُسن ہو، موسیقی ہو۔ اور مسرت ہو، وُہ اپنی خیالات میں مستغرق اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ لیلا نے رسوئی میں سے ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ اور بے اختیار ایک سرد آہ اُس کے ہونٹوں پہ پھڑک گئی۔ کملا خوشی سے ناچتی ہُوئی اُس کے پاس آئی " پاپا۔ پاپا۔ سُنو۔ اتوار کو موسی آ رہی ہیں۔ اور مُنہوں نے لکھا ہے۔ کہ وُہ میرے لئے ایک نہایت عمدہ ساڑھی لائیں گی۔ تم تو چوڑیاں بھی نہیں لے دیتے پاپا۔ ذرا سی چیز ہے کانچ کی چوڑیاں اور مانگتے مانگتے میرا مُنہ بھی ٹیڑھا ہو گیا"

کملا کے چہرے پر مصنوعی غصّے کے آثار نمایاں تھے۔ جیسے کوئی ایکٹریس رُوٹھنے کے پارٹ کا ریہرسل کر رہی ہو۔ دراصل آج وُہ حقیقی طور پر رُوٹھنے کی صلاحیت بھی نہ رکھتی تھی۔ مُوسی کی آمد کی خبر اُس کے تمام دُوسرے جذبات پر غالب آ گئی تھی۔ اور یہ بناوٹی غصّہ تو محض خوشی میں اضافہ کرنے کے لئے بتا گیا تھا۔ بابُو پران ناتھ بھی اس بات کو تاڑ گئے۔ نفسیاتِ انسانی بھی کچھ عجیب سی ہیں۔ جہاں آدمی بڑے سے بڑے واقعات سے بے نیازی برت سکتا ہے۔ وہاں بسا اوقات ایک معمولی سا واقعہ بھی اُس کی دُنیا میں [illegible] پیدا کر دیتا ہے۔ پران ناتھ کے دل میں یک بارگی محبت کے اس پاک جذبے کے لئے احترام کا سمندر اُمڈ آیا۔ اور اُس کے دماغ نے ایک بار پھر فیصلہ کیا کہ نفس دھوکا ہے۔ محبت کا اصل رُوپ اس کا روحانی پہلو ہے اُس نے اپنا چشمہ اُتارا اور نگاہیں اپنی نیک دُختر کے چہرے پر گاڑ دیں۔

لیلا نے اپنے کانوں سے سُنا کہ اس کے پتی کملا کے لئے گونا گوں چوڑیاں لانے کا وعدہ کر رہے تھے۔ اُن کا بھی تو جی چاہتا ہے۔ کہ اپنے بچوں کو خوش رکھیں۔ اُن کی من بھاتی چیزیں اُنہیں لا دیں۔ اُن کی فرمائش کو پُورا کریں۔ مگر عدیم الفرصتی اور تنگ دستی روک دیتی ہیں۔ بہرحال اب تو وُہ کل ہی چوڑیاں خرید لائیں گے۔ جھلملاتی رنگا رنگ چوڑیاں جن کو دیکھ کر اُن کی کملا کا چہرہ قوس و قزح بن جائے گا۔ وُہ خوشی سے پھُولا نہ سمائے گی۔ اُس کا معصوم دل اپنے پتا کی اس بخشش پر جھوم جائے گا۔ ناچ اُٹھے گا۔ کتنا لطف ہوگا۔ اس پاکیزہ خوشی میں۔ اور پران ناتھ سوچ رہا تھا۔ کہ یہ اُس کی کم ظرفی تھی۔ جو آج تک وُہ اس لذّت سے محرُوم رہا۔

منو نے خوب دیکھا کہ پاپا آج ضرورت سے زیادہ مہربان ہیں۔ تو اُس نے سوچا کیوں نہ وُہ بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے۔ چنانچہ اُس نے جیب سے ایک اشتہار نکال کر پاپا کو دیا۔ اور پُر امید نظروں سے اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ دیر تو مہر بلب خاموش رہا۔ پھر ٹکٹ کے لئے پیسوں کا تقاضا شروع کر دیا۔ " پاپا بہت اچھا ڈانس ہے " وہ کیا نام ہے۔ ہاں کتھا کلی ناچ۔ موہنی کا ڈانس۔ بس کل سے شروع ہے۔ آج میں دیکھ بھی آیا ہوں۔ بلی جی چوک والے سفید ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہیں۔ ایسا ستار بج رہا تھا کہ بس ـــــ "

موہنی کا ناچ ـــ کتھا کلی۔ پران ناتھ کی معصوم دُنیا اس شریر لڑکی نے آن کی آن میں درہم برہم کر دی۔ اُس کے خیالات میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ اُس کا دماغ غیر ارادی طور پر موہنی کی رٹ لگانے لگا۔ اس نے دھیان ہٹانے کی غرض سے کملا سے چوڑیوں کے رنگوں کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ مگر لیلا جلد ہی بھانپ گئی۔ کہ وُہ کملا کی باتوں کی طرف متوجہ نہیں ـــــ ہزار مخالفت کے باوجود پران ناتھ کے دل میں ایک خواہش تقویت پکڑ رہی تھی۔ اس [illegible] نے رائے دی کہ وُہ سماج کے اس کمزور بندھن کو توڑ کر [illegible] اُس کے ضمیر نے اجازت نہیں دی۔ لہٰذا وُہ مجرموں کی طرح [illegible] اپنے کمرے میں گھُسا اور بستر پہ

شیر کشمیر جنوبی ہند میں

گزشتہ دنوں شیر کشمیر شیخ محمد عبداللہ وزیراعظم جموں و کشمیر نے جنوبی ہند کا دورہ کیا اور مسئلہ کشمیر کے متعلق جنوبی ہند کے لوگوں کو آگاہ کیا۔ اس تصویر میں آپ مدراس کے ایک جلسے میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں

شیر کشمیر مدراس کارپوریشن کے میئر اور کمشنر کے ساتھ۔ کارپوریشن کی طرف سے آپ کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا گیا۔

جمعیۃ العلما (مدراس) کی طرف سے سے شیر کشمیر کا خیر مقدم

مینا میکم نے ہوائی اڈے پر شیر کشمیر کا استقبال۔ آپ یہاں تامل ناڈ کانفرنس کا افتتاح کرنے کے لئے تشریف لائے۔

نیشنل فزیکل لیبارٹری نئی دہلی

اس موضوع پر پروفیسر کنہیا لال ناقب کا مقالہ صفحہ ۵۲ پر ملاحظہ فرمائیے -

ڈاکٹر رادھا کرشنن

آپ کے متعلق منشی ششور پرشاد کا مقالہ صفحہ ۲۳ پر ملاحظہ کیجئے -
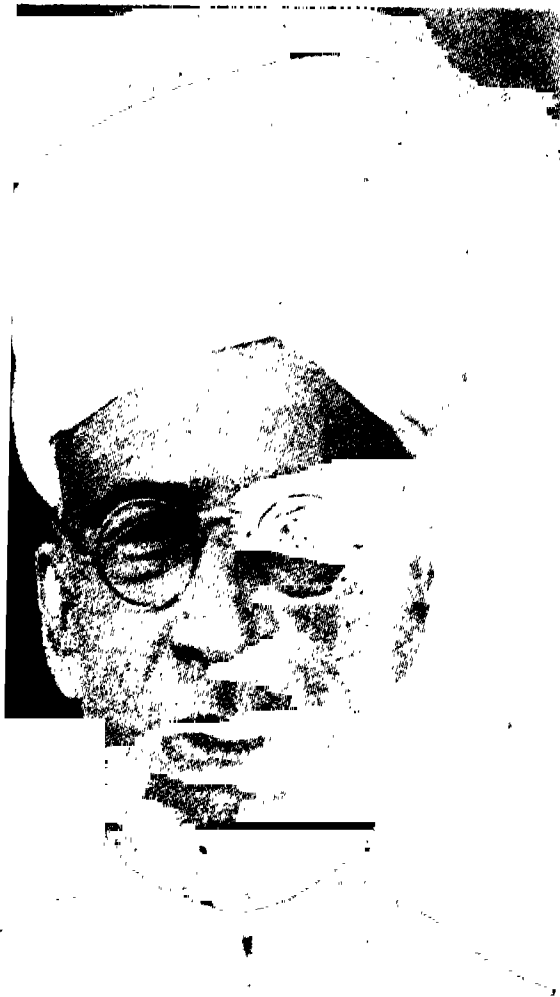
شری بھگوان سہائے کی مجسمہ سازی کے نمونے

اوپر گاندھی جی

نیچے - شری بھگوان سہائے کا ایک ملازم

آپ کی مجسمہ سازی کے متعلق مسٹر اے نمار کا ایک مختصر مقالہ اسی شمارے میں شائع ہو رہا ہے -

بیگم لیاقت علی خان اور شریمتی اندرا گاندھی

پنڈت نہرو کراچی میں

گورنرجنرل پاکستان
پنڈت نہرو کو
خوش آمدید کہہ
رہے ہیں

خان لیاقت علی خان اور ان کی بیگم پنڈت نہرو
اور شریمتی اندرا گاندھی کا استقبال کر رہی ہیں ۔
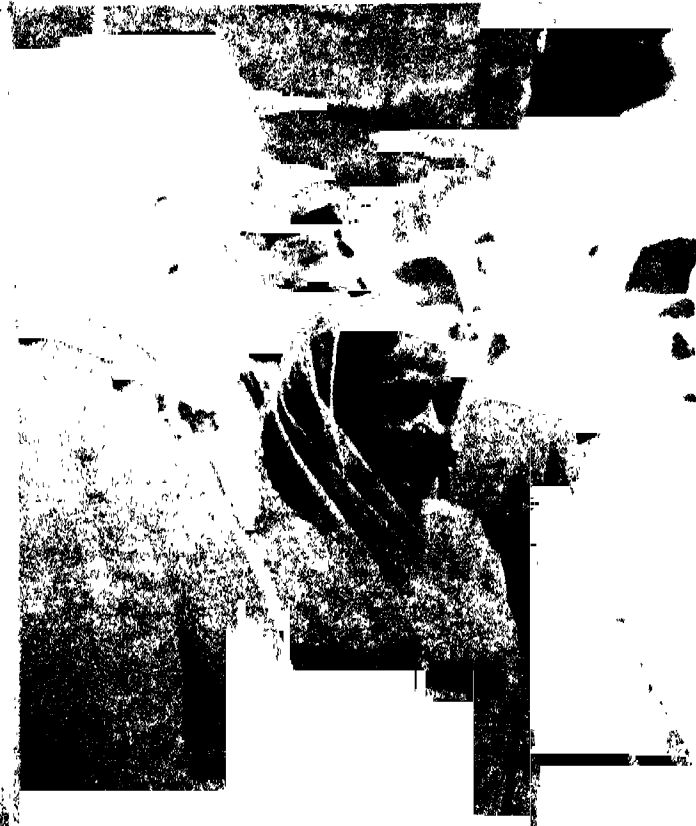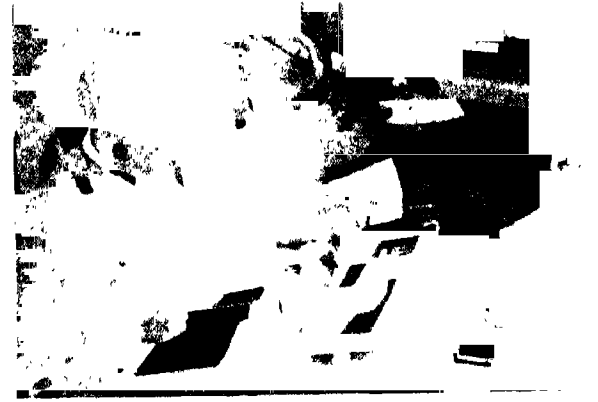
ہوابازی کے ٹریننگ اسکول (جودھپور) میں
ہوابازوں کی کلاس کا ایک منظر

اڑتے ہوئے کلاس روم کی اندرونی تصویر۔
یہاں طلبا کو عملی تعلیم دی جاتی ہے۔

جدید قسم کا ڈکوٹا جو اڑتے ہوئے کلاس روم
کا کام دیتا ہے۔

دراز ہوگیا۔ اُس کا خیال تھا کہ اب وہ گرم بستر سے نکلکر باہر کی خنک فضا میں جانے کی جرأت نہ کرے گا اور اس کے باغی دل کی مجرمانہ خواہش راہ نہ پاکر خود بخود دب جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اُس کے مضطرب دماغ کے تار تن گئے۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا گویا اب تھوڑی سی کشش بھی اُن کو توڑ دے گی۔ اور اُس کا سازِ ہستی ہمیشہ کیلئے بے آواز ہوکر رہ جائے گا۔

گھر سے نکل کر پران ناتھ نے ایک بار چھندوں کی طرح چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر جگمگاتے ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔ اُس وقت اُسے اپنے تاریک گھر کا اندھیرا اور بھی بھیانک دکھائی دینے لگا۔ شوقِ دید نے اُس کے قدموں میں بجلی کی رفتار پیدا کردی۔ اُس کے گنگا جمنی بال ہوا میں اٹھکیلیاں کرنے لگے ———— آخر روشن اور متبسم ہوٹل آگیا۔ اُس نے جھجکتے ہوئے ہوٹل کے ملازم کو بلایا۔ اور اُس کی ہتھیلی پر چاندی کے چند سکّے بھی رکھدیئے ملازم نے اپنے مخصوص پیشہ ورانہ انداز میں اُسے سلام کیا۔ اور پل بھر میں وہ موہنی کے روبرو کھڑا تھا۔ محفل جمی ہوئی تھی۔ چند نوجوان منڈلا رہے تھے۔ اور وہ بصد ناز آنکھیں مٹکا مٹکا اور مُسکرا مُسکرا کر گا رہی تھی۔

پران ناتھ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ہائیں اٹھارہ برس کا طویل عرصہ زمانہ موہنی کے چہرے پر غم و فکر کا ایک خط بھی نقش نہ کرسکا۔ نہیں یہ ناممکن ہے۔ یہ موہنی نہیں ہوسکتی۔ غالباً یہ موہنی کی "کملا" ہے جسے اُس نے اپنا مقدّس کام سونپ دیا ہے۔ مگر اُس کی پھٹی پھٹی آنکھیں موہنی کے لب، رخسار، پیشانی سب کو پہچان رہی تھیں۔ آخر اُس کے لب ہلے۔

"بائی جی کیا سچ مچ آپ موہنی ہیں" محفل کے رنگ پر بدنما چھینٹے پڑے موہنی نے حقارت سے اُس کی طرف دیکھا۔ اور پھر پیشانی پر بل ڈال کر منہ پھیر لیا۔ ایک دل پھینک نے جب بائی جی کے یہ تیور دیکھے تو شراب کا پیالہ پران ناتھ کے مُنہ پر دے مارا۔

"بڈھے کھوسٹ تمہیں یہاں آنے کی دعوت کس نے دی۔ یہ شباب کا اکھاڑا ہے۔ جاؤ یہاں سے" اور سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ مگر ہنسی اور غازے کی تہوں تلے اُس نے مغرور رقاصہ کے چہرے پر تھکاوٹ اور ذلت کے گہرے خطوط دیکھ لئے۔ اُسکا تصور اُسے روحانیت کے آسمانوں پہ لے اُڑا۔ شوجی مہاراج پاربتی کو سمجھا رہے تھے۔

"گوری جب سنسار میں پاپ مایا کے روپ میں پرویش کرے گا وہی زمانہ کلجگ کے نام سے پکارا جائیگا" ——— پاپ کلجگ، شراب، مفلسی.... اُس کا دماغ چکرانے لگا۔ موہنی کے غازے میں اُسے اپنی وفاشعار بیوی کے آنسو دکھائی دینے لگے۔ اس نے سوچا یہ لوگ سوسائٹی، مذہب، فطرت سب کے مجرم ہیں مگر مایا کا ملمع اُن کے جرائم کی پردہ داری کر رہا ہے۔ اور وہ اُن کریہہ قہقہوں سے گھبرا کر بھاگ نکلا۔ اُس کے قدم اب بھی برق رفتاری سے اٹھ رہے تھے اشتیاق اب بھی دامن گیر تھا۔ وہ اب جلد از جلد اپنی گوری، اپنی بھولی بھالی پاربتی کے پاؤں پر گر کر اپنے گناہ بخشوانا چاہتا تھا۔ اُسنے مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ اپنی چھوٹی سی دُنیا کو خوشی کی دولت سے مالا مال کردے گا۔ وہ خوشی جو شو جی مہاراج کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ وہ خوشی، وہ مسرت، وہ اطمینان اور وہ دوڑا دوڑا ایک دوکان پر جا پہنچا۔ دوکاندار دکان بڑھا رہا تھا۔ مگر پران ناتھ نے اس کی چنداں پرواہ نہیں کی۔ اُس نے مختلف رنگوں کی بہت سی چوڑیاں خریدیں اور انہیں عقیدت کے پھولوں کی طرح سینے سے لگا کر گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ جب اُس نے اپنی جنت میں قدم رکھا۔ تو منو سو چکا تھا۔ اس کی اداس گوری اپنی نیک دختر کے سرہانے بیٹھی اُسے سُلا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ اُسے یوں جان پڑا۔ گویا لیلا عروسی لباس پہنے دُلہن بنی بیٹھی ہے اور کملا وہ بیچاری تو ابھی بچّی ہے۔ ننھی سی بچّی۔ اُس نے لپک کر اپنی بیٹی کو گودی میں لے لیا۔ اور دیوانہ وار اُس کی ننھی مُنّی کلائیوں میں تمام چوڑیاں پہنا دیں۔ کملا حیرت سے اپنے پاپا کا مُنہ تک رہی تھی تمام معاملہ اُس کی فہم سے بالا تھا۔ لیلا نے فرطِ محبت سے بیٹی کی چوڑیاں چوم لیں۔ اور مارے خوشی کے اُس کی آنکھوں سے ساون برس پڑا۔

نہرو لیاقت سمجھوتہ

تقسیم سے پہلے ہندوستان کے سیاست دانوں کا یہ خیال تھا کہ ملک کی تقسیم تمام فرقہ دارانہ مسائل کو حل کر دے گی اور دونوں ملکوں میں لوگ امن و سکون سے زندگی بسر کر سکیں گے لیکن بد قسمتی سے ایسا نہیں ہو سکا۔ ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ ہی کیا کم تھا کہ سال رواں کے شروع میں پھر مشرقی پاکستان سے اقلیتوں نے بھاگنا شروع کر دیا اور بھارت اور پاکستان کی پُر امن فضا ایک بار پھر مکدر ہو گئی۔

یہ صورتِ حال بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں کے امن پسند اور صحیح الدماغ لوگوں کے لئے ناقابل برداشت تھی اور جہاں کہیں بھی امن پسند لوگ موجود تھے انہوں نے اس صورت حال کو ختم کرنے اور ایک پائدار اور مستقل امن کی بنیاد رکھنے کے لئے شدت سے اپنی آواز بلند کی۔ چنانچہ بھارت کے پردھان منتری پنڈت جواہر لال نہرو کی دعوت پر پاکستان کے وزیر اعظم خاں لیاقت علی خاں اپریل کو دہلی تشریف لائے اور سات دن کی بات چیت اور بحث مباحثہ کے بعد دونوں لیڈروں نے ایک ایسے معاہدے پر دستخط کئے جسے دونوں ملکوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور جس کے متعلق تقریباً ہر گوشے سے اس خیال کا اظہار کیا گیا کہ اگر دونوں ممالک صدق دل سے اس معاہدے پر عمل کریں تو بھارت اور پاکستان کے درمیان ایک مستقل دوستی کی بنیاد قائم ہو سکتی ہے۔ اس معاہدہ کی جس کے ذریعے سے لاکھوں بلکہ کروڑوں اشخاص کے مستقبل کو محفوظ اور روشن بنانے کی کوشش کی گئی ہے بعض اہم دفعات یہ ہیں:-

۱- بھارت سرکار اور حکومت پاکستان باضابطہ عہد کرتی ہیں کہ دونوں حکومتیں اپنی عملداری بھر میں اقلیتوں کے لئے مذہب کے فرق کے بغیر قانون اور اخلاق کے تابع برابر کے شہری حقوق، جان مال، کلچر اور ذاتی عزت کے بارے میں پورے اطمینان سے ہر ملک کے اندر چلنے پھرنے اور پیشہ، تحریر تقریر اور عبادت کی آزادی کے لئے پوری حفاظت کریں گی۔ اقلیتوں کو اپنے ملک کی عام زندگی میں حصہ لینے سیاسی یا کسی اور عہدہ حاصل کرنے یا ملک کے فوجی یا سول محکموں میں ملازمت کے لئے برابر کے مواقع میسر ہونگے۔ دونوں حکومتیں اعلان کرتی ہیں کہ اکثریت والے فرقے کے ساتھ حقوق کی حیثیت بنیادی ہے اور وہ ان پر مؤثر طور پر عمل درآمد کریں گی بھارت کے پردھان منتری نے اس بات کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے کہ بھارت کے قانون میں اقلیتوں کے تمام حقوق کی گارنٹی کر دی گئی ہے۔

۲- کسی نکاسی کی غیر منقولہ جائداد کے حق ملکیت یا حق قبضہ پر کوئی اثر نہیں پڑیگا۔ اگر اس کی غیر موجودگی میں ایسی جائداد پر کوئی قبضہ کر لے تو یہ جائداد اصلی مالک کو واپس دلائی جائیگی بشرطیکہ وہ ۳۱ دسمبر ۱۹۵۰ء تک واپس آجائے۔ اگر نکاسی کاشتکار خود کاشت مالک ہو تو اس کو ۳۱ دسمبر ۱۹۵۰ء سے پہلے واپس آنے کی صورت میں زمین واپس دی جائے گی۔ ایسے لوگوں کے سلسلہ میں جن کے متعلق حکومت یہ فیصلہ کرے۔ کہ ان کی غیر منقولہ جائداد انہیں واپس نہیں دی جا سکتی۔ یہ معاملہ اقلیتوں سے متعلق کمیشن کو صلاح و مشورے کے لئے سپرد کیا جائے گا۔

۳- دونوں سرکاریں اپنے اپنے علاقوں میں جان اور مال پر حملہ کرنے والے تمام مجرموں یا کسی اور طرح کا جرم کرنے والوں کو سزا دیں گی۔ جہاں روک تھام کے لئے ضروری ہوگا اجتماعی جرمانے کئے جائیں گے۔

۴- دونوں سرکاریں اپنے اپنے علاقوں میں لٹی ہوئی جائداد کی واپسی کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گی۔

۵ - دونوں سرکاریں جبری تبدیلی مذہب کو تسلیم نہیں کریں گی فرقہ وارانہ فساد کے دنوں میں تبدیلئے مذہب کو جبری تبدیلئے مذہب مانا جائے گا - جن لوگوں کے متعلق یہ معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے کسی کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا تھا انہیں سزائیں دی جائینگی -

۶ - دونوں سرکاریں اپنے اپنے علاقوں میں فوراً ایک جانچ پڑتال کمیشن قائم کریں گی - یہ کمیشن حال کے فسادات کے اسباب اور ان کے پھیلاؤ کے متعلق جانچ پڑتال کریں گے - اپنی رپورٹ میں وہ یہ بھی بتائیں گے کہ آیندہ ایسے فسادات کی روک تھام کے لئے کیا تدبیریں کی جائیں - ہائیکورٹ کا ایک جج اس کمیشن کا صدر ہوگا اور ایسے لوگ اس کے ممبر ہوں گے - جن کی شرکت سے اقلیت میں بھروسہ اور اطمینان پیدا ہو -

۷ - دونوں سرکاریں اپنی عملداری میں کسی ایسے پراپگنڈے کی اجازت نہیں دیں گی جو عملداری کی علاقائی ایکتا کے خلاف ہو یا جس کا مقصد دونوں کو لڑائی پر اکسانا ہو - اور جو شخص یا ادارہ ایسے پراپگنڈے کا مجرم ثابت ہوگا اس کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی -

۸ - دونوں سرکاروں نے اعتماد بحال کرنے کی خاطر تاکہ شرنارتھی اپنے اپنے گھروں کو واپس جا سکیں یہ فیصلہ کیا ہے کہ (۱) دونوں سرکاروں کا ایک ایک وزیر ضروری مدت کے لئے فساد زدہ علاقوں میں تعین کیا جائے - (۲) پوربی بنگال، پچھمی بنگال اور آسام کی وزارتوں میں اقلیتی فرقہ کا ایک ایک نمائندہ شامل کیا جائے -

۹ - اس معاہدے کے عمل درآمد میں امداد دینے کی خاطر دونوں سرکاروں نے دفعہ ۸ میں مندرجہ وزیروں کے تقرر کے علاوہ پوربی بنگال، پچھمی بنگال اور آسام میں ہر ایک صوبہ کے لئے الگ الگ اقلیتی کمیشن مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے - پوربی بنگال اور پچھمی بنگال میں دسمبر ۱۹۴۸ء کے معاہدے کے تحت جو صوبائی اقلیتی بورڈ مقرر کئے گئے تھے اب ان کی بجائے مذکورہ بالا اقلیتی کمیشن کام کریں گے -

اقلیتی کمیشن کے فرائض یہ ہوں گے - یہ اقلیتی کمیشن صوبائی یا ریاستی حکومتوں کو سفارشات پیش کریں گے اور ان کی نقول مرکزی وزیروں کو بھیجی جائیں گی - دونوں سرکاریں اور ریاستی اور صوبائی سرکاریں عام طور پر ان سفارشات پر عمل کریں گی جو ان سے متعلق ہوں گی - بشرطیکہ ان سفارشات کی حمایت دونوں مرکزی وزیروں کی طرف سے ہو - دونوں مرکزی وزیروں میں اگر اختلاف رائے ہو تو معاملہ بھارت اور پاکستان کے پردھان منتریوں کو پیش کیا جائے گا - جو یا تو خود اس کا فیصلہ کریں گے یا اس کے فیصلے کے لئے مطلوبہ ایجنسی یا ضابطہ مقرر کریں گے -

اس معاہدہ کو جسے بھارت اور پاکستان میں اقلیتوں کی خوشحالی امن اور پرسکون زندگی کا چارٹر کہا جا سکتا ہے - بھارت اور پاکستان کے علاوہ باہر کے ملکوں نے بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے - اب ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں ملکوں کے عوام نیک نیتی سے اس پر عمل کریں تاکہ بھارت اور پاکستان میں جو دوستانہ فضا پیدا ہوئی ہے کہ وہ ایک مستقل اور پائندہ صورت اختیار کر سکے -

جس دن اس معاہدہ کو بھارت پارلیمنٹ نے منظوری دی بھارت کے پردھان منتری نے قوم کے نام ایک نشری پیغام دیتے ہوئے کہا -

ہمارے زیادہ تر عوام اور غیر ملکوں نے اس سمجھوتے کا سواگت کیا ہے - کچھ دوستوں نے اس پر نکتہ چینی کی ہے اور اس کے نتائج کے متعلق شک کا اظہار کیا ہے میں اس نکتہ چینی اور شک کو سمجھتا ہوں اور ان سے کہوں گا کہ وہ واقعات کی رفتار کو دیکھ کر ہی اس سمجھوتے پر نکتہ چینی کریں اور سوچیں کہ موجودہ حالات میں اس الجھن کا دوسرا حل کیا ہو سکتا تھا - مجھے یقین ہے کہ یہ سمجھوتہ اچھا ہے اور اس سے بنگال کے مصیبت زدوں کو جلد ہی کچھ سہارا ملے گا - مجھے یہ بھی وشواس ہے کہ صحیح راستے کی طرف بڑھنے کا یہ ابتدائی قدم بن سکتا ہے ہم نئی سمت کی طرف آگے بڑھے ہیں - اگرچہ ہمارا راستہ پرخطر اور مشکل ہے لیکن یہ درست منزل کی طرف اشارہ کر رہا ہے - ہمیں اس راستے پر چلنا ہوگا تاکہ ہم اندھیرے جنگل سے نکل کر باہر سورج کی روشنی میں پہنچ سکیں -

اسی طرح پاکستان کے وزیر اعظم نے پاکستانیوں کے نام ایک نشری

تقریر میں اس سمجھوتے کا ذکر کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا -
ہمیں یہ بات نہ بھولنا چاہئیے کہ فرقہ دارانہ جھگڑے اور مہذب تمدن اور ترقی پسندانہ طریقہ زندگی دو متضاد چیزیں ہیں - یہ بنی نوع انسان کو حیوانوں کی سطح پر لے آتی ہیں اور انسانوں کے دل میں اونچے ارادوں کی جگہ مایوسی اور شکست خوردگی کا بیج بو دیتی ہیں - یہ فراخ دلی اور وسیع القلبی کی جگہ نفرت اور بغض کی پرورش کرتی ہیں -
موجودہ معاہدہ پنڈت جواہر لال نہرو اور میرے درمیان بڑے محتاط سوچ بچار اور دوستانہ ماحول میں ایک دوسرے کے نظریات کو سمجھنے کے بعد مکمل ہوا ہے - پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ بات چیت کرنے کے بعد مجھے اس امر کا اطمینان ہے کہ وہ اقلیتوں کے جان، مال اور تمدن کی پوری حفاظت کریں گے مجھے یہ بھی امید ہے کہ پنڈت جی کو بھی اس امر کے متعلق اطمینان ہے کہ میں بھی اس سلسلے میں پاکستان میں اقلیتوں کے جان، مال اور تمدن کی پوری طرح حفاظت کروں گا -
ان حالات میں امید کی جاتی ہے کہ بھارت اور پاکستان کے عوام پنڈت نہرو اور خان لیاقت علی خان کے الفاظ کو مستقل طور پر اپنے دل میں جگہ دیں گے اور ان پر صدق دلی سے عمل کرتے جائیں گے - تاکہ بھارت اور پاکستان اپنا وقت اور طاقت باہمی جھگڑوں میں ضائع کرنے کے عوض انہیں تعمیری کاموں میں صرف کریں اور ترقی کی راہ پر گامزن رہیں

اُمید کی جھلک

(بھارت پاکستان سمجھوتے کے متعلق مختلف تقریروں کے اقتباسات)

سر سلطان احمد - پٹنہ

نہرو لیاقت معاہدہ ایک تاریخی دستاویز ہے - یہ معاہدہ اس وقت معرض وجود میں آیا جب دونوں ملکوں میں سمجھوتے کی کوئی امید باقی نہیں رہ گئی تھی - اس معاہدے پر دونوں ملکوں کے پردھان منتری مبارک باد کے مستحق ہیں کیونکہ یہ وہ کارنامہ ہے جس کے نتائج بہت دور تک جا سکتے ہیں - اس معاہدے پر ایک نظر ڈالنے سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فقط دونوں بنگالوں کے مسائل کو حل کرنے کی ایک مخلصانہ کوشش ہے لیکن جس خوشگوار اور دوستانہ ماحول میں یہ معاہدہ پایہ تکمیل تک پہنچا ہے اس کے پیش نظر آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ معاہدہ دونوں ملکوں کے باہمی مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک مستقل سمجھوتے کا پیش خیمہ ثابت ہوگا - مجھے یقین ہے کہ اس مستقل سمجھوتے کے لئے بہت جلد دونوں ملکوں میں بات چیت شروع ہو جائے گی -

آنریبل اے کے انصاری وزیر پبلک ورکس بہار :- ۲۰ اپریل

ہمارے راشٹر پتا مہاتما گاندھی کی آتما کو اس سمجھوتے سے بڑی شانتی ملے گی کیونکہ اس سے وہ خواب پورا ہوگا جس کے لئے انہیں اپنی جان تک قربان کر دینا پڑی - اس سمجھوتے کے ذریعے ہم نے گاندھی جی کے راستے پر چل کر آگے کی طرف پہلا قدم اٹھایا ہے -

مسٹر لطیف الرحمن ممبر بہار اسمبلی :- ۱۹ اپریل

معاہدے نے نہ صرف ہند و پاکستان کی اقلیتوں کو اطمینان کی زندگی بخشی ہے بلکہ دونوں ممالک کے چالیس کروڑ انسانوں کے لئے ترقی اور سلامتی کا راستہ کھول دیا ہے - پنڈت نہرو اور مسٹر لیاقت علی خان نے تدبر سے کام لے کر دونوں ملکوں کی تاریخ کا رخ بدل دیا ہے - مہاتما گاندھی کا ملک اپنے سپوتوں سے توقع رکھتا ہے کہ وہ ان کے اعلیٰ نظریے کو عملی جامہ پہنائیں گے -

پروفیسر عبدالحمید خان سابق قونصل جدہ - ۲۱ اپریل

نہرو لیاقت معاہدہ گاندھی جی کے اصول کی شاندار فتح ہے - پنڈت جواہر لال نہرو نے سنتھ گرہ کی روایات کو شاندار طریقہ پر قائم رکھا ہے - موجودہ حالات میں اس سے بہتر حل کا تصور ناممکن ہے - کسی مسئلے کا حل جنگ سے نہیں ہو سکتا ہے -

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

منظر لکھنوی

ڈاکٹر رادھا کرشنن

ڈاکٹر رادھا کرشنن فلسفہ و دینیات کے ستون اعظم ہیں۔ دور حاضر کے تمام مشرقی اور مغربی فلسفہ میں آپ کا رتبہ بے حد بلند ہے۔ اپنے طویل اور گہرے مطالعے کے جو نتائج آپ نے دنیا اور خاص طور پر مغربی فلسفہ دانوں کے سامنے پیش کئے ہیں ان سے نہ صرف ڈاکٹر رادھا کرشنن کے ذاتی وقار میں بدرجۂ اتم اضافہ ہوا ہے بلکہ موصوف کی ان فلسفیانہ موشگافیوں سے عام طور پر ہندوستان کی کلچرل (ثقافتی) زندگی کی نمایندگی بھی ہوتی ہے اور اس طرح اس کا شاندار ماضی اپنی مکمل آب و تاب کے ساتھ حال کے آئینے میں منعکس ہو رہا ہے۔

جولائی ۱۹۴۹ء سے ڈاکٹر رادھا کرشنن حکومت روس میں ہندوستانی سفیر کے اہم فرائض انجام دے رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایک فلسفہ دان اور مفکر اور پھر ڈاکٹر رادھا کرشنن کی حیثیت کے فلسفہ دان اور مفکر کے لئے اس سیاسی تقرر کے سلسلے میں اپنی رضامندی کا دینا نہ جانے کتنی ذہنی قربانیوں کا نتیجہ ہوگا۔

ہمارے سامنے جو عظیم شخصیتیں آج مذہب کی نمایندگی کر رہی ہیں ان میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کی شخصیت سب سے زیادہ اہم ہے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن کا جنم ہندو قوم میں ہوا اور مذہبی ماحول میں آپ نے ہندو فلسفے کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ دنیا کے دوسرے مذاہب سے آپ نے کبھی بے اعتنائی نہیں کی۔ آپ کسی واحد مذہب کے علمبردار نہیں۔ ہندو مذہب کے سب سے زیادہ مقتدر مفسر ہونے کے باوجود آپ نے دنیا کے قریب قریب ہر مذہب کی اسپرٹ کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

ہندو مذہب اور فلسفے کے متعلق ڈاکٹر کرشنن کی تشریحات ارباب مذہب کے گروہ میں نہایت واضح اور قابل قبول قرار دی جا چکی ہیں۔

ہندو مذہب اور فلسفے کی ترجمانی میں اتنی زیادہ کامیابی اس وسعت خیال اور کشادگی نظر کا نتیجہ ہے جو ڈاکٹر کرشنن کو زمانۂ قدیم کے رشیوں منیوں، سنتوں اور مہاتماؤں سے ورثے میں حاصل ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مذہب و فلسفہ کی ترجمانی کے باوجود ڈاکٹر کرشنن نے کبھی ہندو مذہب یا کسی خاص واحد مذہب کی حمایت میں ایک حرف بھی زبان سے نہیں نکالا۔

پچھلی جنگ عظیم کے دوران میں ڈاکٹر کرشنن نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ اس جنگ عظیم کے بعد جو نیا نظام دنیا میں قائم ہوگا اس کی تہ میں ایک گہری روحانی تحریک کام کرے گی اسی تحریک کے زیر اثر امن و اتحاد دوبارہ قائم ہوگا اور اس طرح بنی نوع انسان کو سکون و فارغ البالی کی نعمتیں حاصل ہوں گی۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن کا پیغام اسی آواز کی بازگشت ہے جو قدیم ہندوستانی رشیوں یا حضرت عیسیٰ مہاتما گوتم بدھ جلال الدین رومی کبیر اور گورو نانک نے اٹھائی تھی ان بزرگوں نے اپنے زمانے کے حالات گرد و پیش کے مطابق طریق عمل اختیار کیا تھا۔

قریب قریب دنیا کے ہر ملک نے ڈاکٹر رادھا کرشنن کے کمالات کا اعتراف کیا ہے۔ یورپ والے آپ کے بہت احسان مند ہیں آپ کی معرکہ آرا تصانیف کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور نہ جانے کتنی زبانوں میں ان کا ترجمہ بھی کیا جا چکا ہے۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن کا پورا نام سروا پلی رادھا کرشنن ہے آپ جنوبی ہند کے اس خطے میں جسے تیلگو دیش کہتے ہیں بمقام ترتانی پیدا ہوئے۔ ستمبر ۱۸۸۸ء کی پانچویں تاریخ کو مشرقی فلسفے کے آسمان پر یہ آفتاب عالم تاب طلوع ہوا۔ سلسلۂ تعلیم جاری ہونے پر آپ نے

ویلور کے وورہیس کالج اور مدراس کے کرسچین کالج کے معلموں سے تربیت پائی حتیٰ کہ ۱۹۰۹ء میں آپ نے ایم اے پاس کر لیا۔ آپ کا سبجکٹ فلسفہ ہی تھا۔ ایم اے کی ڈگری ملتے ہی آپ مدراس کے پریزیڈنسی کالج کے اسٹاف میں شامل ہو گئے اور یہ سلسلہ ۱۹۱۷ء تک جاری رہا فلسفیانہ موشگافیوں میں آپ کا انہماک قابل رشک تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد آپ کو امتیازی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس کے بعد آپ راج مہندری کے آرٹس کالج میں فلسفے کے لیکچرار مقرر ہو گئے وہاں ایک ہی سال کام کیا تھا کہ میسور یونیورسٹی کی نظر انتخاب آپ پر پڑی چنانچہ آپ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۱ء تک اسی یونیورسٹی سے منسلک رہے۔ یہاں رہ کر آپ نے دو نہایت اہم کتابیں تصنیف فرمائیں ایک کتاب ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی جس کا نام تھا فلاسفی آف رابندر ناتھ ٹیگور۔ دوسری کتاب ۱۹۲۰ء میں چھپی اس کا نام تھا "دی ریین آف ریلیجن ان کنٹمپوری فلاسفی" اس دوسری کتاب میں ڈم آدرش وادیا معیاریت مطلق کے نقطۂ نظر سے مغربی فلسفہ کے متعلق اتنی قابلیت کے ساتھ ان تمام رائج الوقت اصول کے مطابق بحث کی گئی ہے کہ اپنی اس تصنیف کی بدولت ڈاکٹر کرشنن کا نام فلسفہ دانوں میں کافی مشہور ہو گیا۔

ابھی ڈاکٹر کرشنن کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی کہ اس زمانے میں کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر آسوتوش مکرجی نے آپ کو اپنے پاس بلا لیا اور بادشاہ جارج پنجم کی پروفیسر شپ کی کرسی عنایت فرمائی۔

سر آسوتوش کے حکم کی تعمیل میں رادھا کرشنن ۱۹۲۱ء میں کلکتے چلے گئے اور مسلسل بیس سال تک وہاں انہوں نے اس عہدے کے فرائض انجام دیتے۔ اس دوران میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے لئے ڈاکٹر کرشنن کو یونیورسٹی کی اجازت سے باہر بھی جانا پڑا۔ کچھ مدت تک آپ اکسفورڈ کے مانچسٹر کالج میں پروفیسر آف کمپریٹو ریلیجن رہے اور کچھ زمانے تک والٹیر میں اندھرا یونیورسٹی کے وائس چانسلر۔ اس کے بعد جب دوسری مرتبہ آپ کو اکسفورڈ جانا پڑا تو مشرقی مذاہب و دینیات کی تعلیم آپ کے سپرد کی گئی۔

آپ کلکتہ یونیورسٹی میں جن دنوں درس و تدریس میں مصروف تھے انہیں دنوں آپ کی وہ معرکہ آرا تصنیف شائع ہوئی جو انڈین فلاسفی کے نام سے موسوم ہے۔ اپنے اس عدیم المثال کارنامے کے ذریعے سے آپ نے ویدوں اپنشدوں اور بھگوت گیتا کی توضیح فرمائی ہے اس میں جینیوں کے نظریوں پر بھی روشنی ڈالی ہے اور بدھوں کے عقائد کا بھی جائزہ لیا ہے یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی اور دوسری بار ۱۹۲۹ء میں۔ اس کتاب کی دوسری جلد پہلی مرتبہ ۱۹۲۷ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۳۱ء میں چھپی۔

۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر کرشنن پھر آکسفورڈ تشریف لے گئے اس مرتبہ آپ کے لکچروں کا موضوع تھا "زندگی کے متعلق ہندوؤں کا نظریہ۔ اس تصنیف کی اشاعت پہلی مرتبہ ۱۹۲۷ء میں ہوئی۔ اس کے بعد اس کے کئی اور بھی ایڈیشن نکلے۔ اس تصنیف میں ڈاکٹر کرشنن نے ہندو دھرم کے متعلق معقولاتی نقطہ نظر سے بحث کی ہے اور عام طور پر اس کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

۱۹۲۶ء میں جب پہلی مرتبہ مغربی عالموں کی ملاقات ڈاکٹر کرشنن سے ہوئی تو وہ آپ کے علمی تبحر۔ آپ کے طریقۂ استدلال و توضیح سے بے حد متاثر ہوئے ڈاکٹر کرشنن انگریزی زبان کے بہترین مقرّروں میں بھی ہے۔ آپ نہایت وضاحت کے ساتھ بلا تکان تقریر کرتے چلے جاتے ہیں آپ کا لب و لہجہ اتنا مترنم اور صحیح ہوتا ہے کہ آپ کی تقریر سن کر انگلستان کے ماہران تقریر بھی انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں انگریزی زبان پر ڈاکٹر کرشنن کو جو حاکمانہ قدرت ہے۔ اس کی داد سر فرانسس ینگ ہسبنڈ نے بھی دی ہے اور جب ڈاکٹر کرشنن نے مہاتما گوتم بدھ پر آکسفورڈ یونیورسٹی میں اپنی عالمانہ اور فصیح و بلیغ تقریر فرمائی تو سر فرانسس کو یہ تسلیم کرنا پڑا

ڈاکٹر رادھا کرشنن ایک دبلے پتلے اور دراز قد انسان ہیں چہرے سے پھرتی ٹپکتی ہے۔ آپ کی بھوری بھوری آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک پائی جاتی ہے۔

۱۹۲۹ء میں جب ڈاکٹر کرشنن کو یونیورسٹی کے لئے طلب کیا گیا تو ۲۲ر اکتوبر کو آپ نے اپنا لکچر عطا کیا۔ اس مرتبہ وطن سے اتنی دور جانے میں آپ کو خود بھی دشواری پیش آئی اور آپ سے زیادہ آپ کے گھر والوں کو بھی

آپ کا ۲۲ اکتوبر والا یہ لکچر اور اس کے ساتھ ہی سات کئی اور لکچر ۱۹۳۳ء میں ایسٹ اینڈ ویسٹ کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ اسی زمانے میں ایک اور لکچروں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا جس کا موضوع تھا زندگی کے متعلق ایک معیاری نظریہ۔

اندھرا یونیورسٹی کی وائس چانسلری کا عہدہ ڈاکٹر کرشنن کو ۱۹۳۱ء میں سفر یورپ سے واپسی کے بعد ملا تھا۔ ۵ سال تک آپ نے اس عہدے کے فرائض انجام دئیے۔ ۱۹۳۱ء ہی میں آپ بین الاقوامی انجمن کی اس کمیٹی کے لئے نامزد کئے گئے جو اشتراک ذہنی کے لئے قائم کی گئی تھی۔ اس کمیٹی میں آپ ۸ سال تک رہے ہر سال آپ کو اس کمیٹی میں شرکت کرنے کے لئے جنیوا جانا پڑتا تھا۔

۱۹۳۶ء میں آپ پھر آکسفورڈ گئے۔ اب آپ اندھرا یونیورسٹی سے علیحدہ ہو کر کلکتہ یونیورسٹی جا چکے تھے اس زمانے میں بھی کبھی آپ کو آکسفورڈ میں رہنا پڑتا اور کبھی کلکتے میں پروفیسروں کے فرائض انجام دینے پڑتے ۱۹۳۹ء میں جب دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی تو پھر آپ انگلستان نہ جا سکے۔ ۱۹۳۶ء ہی میں پنڈت مدن موہن مالوی نے بنارس یونیورسٹی کی وائس چانسلری کا عہدہ ڈاکٹر کرشنن کی خدمت میں پیش کیا۔ اگرچہ مشاہرہ بہت معقول تھا مگر ڈاکٹر کرشنن بلا معاوضہ کام کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

۱۹۳۹ء میں آپ کی ایک اور تصنیف شائع ہوئی جس کا نام تھا ایسٹرن ریلیجن اینڈ ویسٹرن تھاٹ۔ اس تصنیف کے ذریعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اسپنڈوں کی حیرت انگیز تعلیم کا اثر یورپ میں فیثا غورث اور افلاطون کے زمانے سے لے کر آج تک پڑتا رہا ہے

ڈاکٹر رادھا کرشنن برطانوی اکاڈمی کے شریک بھی رہ چکے ہیں یہ اعزاز پہلی مرتبہ ایک ہندوستانی کو حاصل ہوا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں ڈاکٹر کرشنن نے گاندھی جی کے متعلق دنیا کے تمام مشاہیر کے بیش بہا خیالات کا ایک مجموعہ کتابی صورت میں شائع کیا۔ مجموعہ مہاتما گاندھی کی خدمت میں ان کی (۷۰ ویں) سالگرہ کے موقع پر پیش کیا گیا تھا۔ اسی سال ڈاکٹر کرشنن کو لکچروں کے ایک سلسلے میں جنوبی افریقہ جانا پڑا جہاں مہاتما گاندھی کی عملی زندگی کا ابتدائی حصہ بسر ہوا تھا۔

۱۹۴۱ء میں جب ڈاکٹر کرشنن بنارس یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے آپ کو مہاراجہ بڑودہ کی قائم کی ہوئی سر سیاجی راؤ کی یادگاری کرسی خطاب قبول کی۔ اسی لئے آپ کلکتہ یونیورسٹی سے علیحدہ ہو گئے اگرچہ آپ کو اس یونیورسٹی سے خاص انس ہو گیا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں ڈاکٹر کرشنن کو کملا لکچر کے سلسلے میں تقریریں کرنی پڑیں کبھی کلکتے میں کبھی بنارس میں۔ ان لکچروں میں ڈاکٹر کرشنن نے مہاتما گاندھی اور اہنسا کے حق میں اتنی جرأت اور دلیری کے ساتھ آواز اٹھائی کہ ایک مرتبہ کلکتے میں مخالفوں نے آپ کی تقریر کے دوران میں شور و شر مچا کر طوفان بدتمیزی برپا کر دیا مگر اس سے ڈاکٹر کرشنن کے مستحکم عقیدوں میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ ڈاکٹر کرشنن کی اور بھی کئی قابل ذکر تصانیف ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں دی ریلیجن وی نیڈ (جس مذہب کی ہمیں ضرورت ہے) شائع ہوئی۔ ۱۹۲۹ء میں کلکی یا تہذیب کا مستقبل کے نام سے ایک اور کتاب چھپی۔ آپ کا ایک مضمون انسائکلو پیڈیا برٹینکا کے چودھویں ایڈیشن کے لئے ہندوستانی فلسفے کے متعلق حاصل کیا گیا اس کے علاوہ ہندو مذہب نیز دیگر مذاہب کے بارے میں جو متعدد مضامین ڈاکٹر کرشنن نے وقتاً فوقتاً تحریر فرمائے ہیں ان کا بھی ایک مجموعہ ہارٹ آف ہندوستان کے نام سے شائع ہوا ایک اور مجموعہ بھی فریڈم اینڈ کلچر کے نام سے چھپا ہے اس میں آپ کی وہ تمام تقریریں ہیں جو آپ نے مختلف یونیورسٹیوں کے کانوکیشن کے مواقع پر فرمائی تھیں

مئی ۱۹۴۴ء میں ڈاکٹر کرشنن لکچروں کے ایک سلسلے کے لئے چین تشریف لے گئے۔ وہاں سے دو ہفتے کے بعد آئے انڈیا اینڈ چائنا، ریلیجن اینڈ سوسائٹی، ایجوکیشن، پالیٹکس اینڈ وار، بھگوت گیتا اور آرٹیکل آف انڈین فلاسفی آپ کی دوسری تصانیف ہیں۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی آزادی کے بعد قومی حکومت ڈاکٹر کرشنن کی خدمات سے مستفید ہوئے بغیر کیونکر رہ سکتی تھی چنانچہ طریقہ تعلیم کے متعلق تحقیقاتی کمیشن کا صدر ڈاکٹر کرشنن ہی مقرر کیا گیا۔ آپ اس کمیشن کی صدارت کے فرائض انجام دے ہی رہے تھے کہ حکومت نے آپ کو روس میں ہندوستان کی سفارت کے لئے منتخب کر لیا۔ اس سے پہلے ۱۹۴۶ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک آپ یونیسکو میں ہندوستانی نمائندوں کے لیڈر تھے اور اس کے انتظامیہ بورڈ کے صدر منتخب بھی رہ چکے ہیں۔

ظفر حسین خان

آج کل کی زندگی اور فلسفہ

رائے عامہ میں جس قدر غریب فلسفی بدنام ہے شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ ناکارہ، مردم بیزار، سرپھرا، بے اَکل، خیالی دُنیا کا باشندہ، کاروبارِ سے بیگانہ، گھر گھسنا، وحشت زدہ، کتاب کا کیڑا، مراقی، غرضکہ طعن و تشنیع کے ترکش کا کونسا تیر ہے جو اسکی جانب پھینکا نہ جاتا ہو۔

اصل یہ ہے کہ قصور فلسفہ کا نہیں بلکہ طبیعت کی اُفتاد کا ہے۔ بعض طبیعتیں ازل سے تنہائی پسند، دیر آشنا، گوشہ گیر اور غیر ملنسار ہوتی ہیں۔ فلسفہ مفت میں بدنام ہے۔ یہ لوگ ادیب ہوتے تو شاعر ہو جاتے کاروباری ہوتے تو اونچی اونچی اسکیمیں بناتے۔

غمِ دل اگر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

پھر یہ بھی ہے کہ فلسفہ ہے ثقیل غذا، جسے ہضم ہوگئی یا رس ہوگیا۔ اور جسے ہضم نہ ہوئی وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ افلاطون۔ دیوجانس کلبی کو "پاگل سقراط" کہا کرتا تھا۔ یعنی سقراط اگر پاگل ہوتا تو وہ اس فلسفہ کی تعلیم دینے لگتا، جس کا دیوجانس کلبی حامی تھا۔ اس میں ایک لطیف پہلو اپنے اُستاد کی تعریف کا یہ بھی تھا، کہ سقراط جیسا بلند خیال، قعرِ جنون میں گر کر بھی فلسفی ہی رہتا۔ مگر دیوجانس کا سا۔

اس معاملہ میں فلسفہ ویسا ہی ہے جیسا تصوف جو "اسرارِ حق" کا بارِ امانت اُٹھا لے گیا وہ سالک ہوگیا ورنہ مجذوب بن گیا۔ لیکن تصوف کا جذب اور فلسفے کی وارفتگی نقلِ دماغ سے پھر بھی بہت بلند چیز ہے، جو سرور و جذب سے آشنا ہیں وہ آوازۂ منصور کی یاد تازہ کرنے میں اب بھی اپنا سر دُھنتے رہتے ہیں۔

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

فلسفے سے بیزاری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ لوگ اس کو مشکل موضوعِ بحث سمجھ کر، کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔ لیکن انگلستان کے مشہور فلسفی برٹ رینڈ رسل نے اپنی تاریخ فلسفہ میں جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے مشہور رومانی شاعر بائرن کو فلسفیوں کی صفِ اوّل میں کھڑا کرکے ادب اور فلسفے کا فرق مٹا دیا۔ رسل نے دیگر فلاسفہ کے ساتھ اپنی کتاب میں بائرن پر ایک مستقل باب باندھا ہے۔

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ فلسفہ ناولوں اور نظموں کا پیرایہ بھی اختیار کرسکتا ہے۔ ہم پر بھی فرانس کے مشہور ڈراما نویس مولیر کے اُس کیرکٹر کی طرح حیرت طاری ہو جانا چاہیے جو یہ معلوم کرکے کہ نثر اُسی کو کہتے ہیں جو ساری عمر وہ بولتا رہا ہے ششدر رہ گیا تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے فلسفی ایسے بھی ہیں جن کا طرزِ بیان نہایت شگفتہ اور دور از کار منطقی موشگافیوں سے پاک ہے، مثلاً جرمنی کا شوپن ہاویر جس کا اسٹائل نہایت ادیبانہ اور تمثیلی ہے۔ فرانس کا برگساں بڑے پائے کا ادیب ہے۔ قدما میں افلاطون نے تو اپنے سارے فلسفے کو ڈراما ہی بنا دیا ہے۔ یعنی مکالموں کی شکل میں لکھا ہے۔ جن سب کا مخصوص اداکار سقراط ہے۔ سب سے بڑھ چڑھ کر نیطشے ہے جس کا بیان بالکل اسی طرح خطیبانہ ہے جیسا کہ ہمارے مولانا ابوالکلام آزاد کا۔ حالانکہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مولانا عالمِ دین ہیں اور نیطشے نداف دین و مذہب۔ اپنے مقالوں میں اُس نے عیسویت کی وہ روئی دھنکی ہے کہ پناہ بخدا، اور جلوہ کنانِ محراب و منبر کی خلوتی کارستانیوں کا وہ پول کھولا ہے کہ باید و شاید۔

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

اس کو سوء اتفاق کہیے یا شامتِ اعمال۔ راقم الحروف، جرمن

جہان کی متداول کتابوں پر عبور کرنے کے بعد، جب کوئی فلسفے کی کتاب پڑھنے کے قابل ہوا تو سب سے پہلے نیٹشے کی "یہ قول زرتشت" ہاتھ میں آئی۔ اس سے قبل اس وقت تک میں نے نیٹشے کو انگریزی ترجمے میں بھی بالاستیعاب نہیں پڑھا تھا۔ میری معلومات فلسفے کی تاریخوں یا نیٹشے پر تنقیدی کتابوں اور مضامین تک محدود تھی۔ پڑھ کر ہوش اڑ گئے۔ بیان کا وہ طلسم کہ انسان مبہوت ہو جائے۔ اور ساری منطق کو بھول کر ہر بات مانتا چلا جائے۔ دلنشین چست فقرے۔ رنگین عبارت، بیباک نکتہ چینی۔ لطیف استعارہ۔ کہ انسان وجد کرنے لگے۔ ہمارے غالب بھی شاید نیٹشے کے ہم خیال تھے۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

وہائٹ ہڈ کا سا ماہر ریاضی و سائنس فلسفی جس کا منطقی استدلال اوڑھنا بچھونا ہونا چاہئے تھا، کہتا ہے "فلسفیانہ تحریروں میں استدلال پر زور کم دینا چاہئے۔ ساری کوشش یہ ہونا چاہئے کہ بنیادی حقائق کی ہدایت خواہ وہ اُن کی ماہیت کے متعلق ہو اور خواہ اُن کے علائق کے باب میں ہو کسی طرح آشکار اور نمایاں ہو جائے۔"

("موڈس آف تھاٹ" ص ۶۶-۶۷)

مالے عامہ جتنی فلسفے کی مذمت کرتی ہے، اُتنا ہی سائنس کے گن گاتی ہے۔ سائنس ہماری ترقی کا راز ہے۔ موٹر کار، ریل، تار برقی، ہوائی جہاز، بجلی کی روشنی، ریڈیو اور دشمن پر قابو پانے کے لئے ایٹم بم۔ اور مانند و جن ہم سب سائنس کے دم سے ہیں۔ فلسفہ کس مرض کی دوا ہے، ایجادات سے تو اس کا دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس کا تعلق تو محض فہم اور چیزوں کی حقیقت سمجھنے سے ہے۔ اور اس پر بھی اکابر فلسفہ کا قول ہے کہ ہم نے بس یہ سمجھا کہ کچھ نہیں سمجھے۔"

فلسفی را ز حقیقت نتوانست کشود
گشت راز دگر آں راز کہ افشا می کرد

چنانچہ نشأۃ جدیدہ کی نظر میں مادی قدروں کے علاوہ جن کا مرکز پیٹ اور جیب ہے دوسری قدریں بیکار ہیں۔ سائنس کی بدولت ہم سات سمندر پار والوں سے باتیں کر سکتے ہیں۔ ریڈیو میں لندن کے گھنٹہ گھر تک جن کی آواز سن سکتے ہیں۔ ٹیلی وژن سٹ میں آواز کے ساتھ دوسرے ملکوں کے لوگوں کی صورت بھی دیکھ سکتے ہیں۔ سینما میں ناچ گانا تصویروں کے سپرد ہو چکا ہے۔ ایکسرے نے جسم کے اندر دریچے کھول دیئے ہیں۔ بجلی سے فصلیں پکائی جاتی ہیں۔ ربڑ سے سڑکیں بنائی جا سکتی ہیں۔ ہوائی جہاز میں آج دہلی بیٹھے تو کل لندن پہونچ گئے۔ غرضیکہ میکانکی زندگی ہم پر اس قدر چھا گئی ہے کہ اس کے عوض کہ مشین ہمارے ہاتھ میں ہو، ہم مشین کے ہاتھ میں ہیں۔ ہم پیدل نہیں چلتے۔ دو قدم بھی جانا ہو تو موٹر درکار ہے۔ ہم زینے پر چڑھنے کے بدلے لفٹ پر چڑھتے ہیں۔ آپس میں گفتگو کے عوض ریڈیو سنتے ہیں۔ خود گانے بجانے کے بدلے ریکارڈ بجاتے ہیں۔ انگلستان کی مشہور فلسفی جوڈ نے اپنے امریکہ کے سفر کا ایک لطیفہ نقل کیا ہے۔ اُن کے میزبان نے فخر یہ ایک مشین دکھائی جو تاش تقسیم کر دیتی تھی۔ جوڈ نے کیا خوب جواب دیا: کاش آپ نے ایسی مشین بھی ایجاد کر لی ہوتی جو آپ کے عوض تاش کی بازی کھیل بھی دیتی! لیکن مشین زدہ میزبان جوڈ کی اس لطیف چوٹ کو محسوس بھی نہ کر سکے۔

مشین کے استعمال کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہم دیگر مفید کاموں کے لئے وقت بچا سکتے ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ جو وقت اس طرح بچتا ہے، وہ کس طرح صرف کیا جاتا ہے؟ کھیل کود میں یا سیر و شکار میں۔ جوڈ ہی نے کہیں لکھا ہے "مجھے ایک ہندوستانی عارف کی بات کبھی نہ بھولے گی۔ اُس نے مجھ سے کہا "تم لوگ ہواؤں میں پرندوں کی طرح اُڑ سکتے ہو۔ سمندر میں مچھلیوں کی طرح تیر سکتے ہو۔ لیکن یہ نہیں جانتے کہ زمین پر کس طرح چلنا چاہئے۔" صدیاں گذریں شیخ سعدی نے بھی ہم سے یہی پوچھا تھا۔

تو کارِ زمیں را نکو ساختی؟
کہ با آسماں نیز پرداختی!

ہندوستان کی فضا پر نظر ڈالئے تو یونان کا وہ زمانہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ جب سقراط نے فلسفے کو آسمان سے زمین پر لانے اور حیاتِ انسانی کی اعلیٰ قدروں کو سربلند کرانے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ آج ہندوستان، افلاس، بے روزگاری، سیاہ بازاری، نفسا نفسی کا شکار ہے۔ تقسیم ہند کے قبل مذہب کے فرقہ وارانہ آویزشوں نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ مذہبوں کے نزدیک انسانی خون کی کچھ قیمت نہیں رہی۔ اخلاقی قدریں جو ہمیشہ انسانیت کا زیور سمجھی گئی ہیں۔ عامۃ الناس اس سے عاری ہیں۔ انہیں احساس کمتری

شکست خوردہ ذہنیت خوف وہراس، اُمید وبیم کے عالم میں ہیں۔ ابن عامہ سے مراد وہ ذہنی کیفیت امن ہے جس میں سب شریک ہوں؟ یہ عام نہیں اور جب تک ملّتیں اس سے مستفید نہ ہوں امن عامہ کا تصوّر خواب وخیال ہے۔ دولِ عالم کی سیاسی کشمکش ہر آن اعلانِ جنگ کی خبر دیتی ہیں۔ مذہب یورپ سے کبھی کا شہر بدر ہو چکا، دو عالمگیر جنگیں اس کا ثبوت ہیں۔ ہر حکومت نشۂ قوت میں اس قدر بدمست ہے کہ کہیں پیر رکھتی ہے اور کہیں پڑتا ہے۔

بیکن نے ذہن کے اس عدم توازن کے متعلق اپنی کتاب "طرزِ جدید" جو تاریخ فلسفہ میں ہمیشہ ایک معرکۃ الآرا کتاب رہے گی۔ نہایت دلنشین بحث کی ہے۔ انسان کے دماغ کو ایک بُت خانہ تصوّر کرکے یہ بتایا ہے کہ اس کے اندر طرح طرح کے بُت سجے ہوتے ہیں۔ کہیں فرسودہ رسم ورواج و لایعنی عقائد کے بُت، کہیں خاندانی روایات اور عادات وخصائل کے بت، کہیں محض الفاظ کے بُت، ایسے الفاظ جن کا اطلاق کسی حقیقت پر نہیں ہوتا، اسم بے مسمّیٰ، یہ بت بیکن کے نزدیک سب سے زیادہ خطرناک ہیں، کہیں غلط نظریوں اور بے بنیاد خیالات کے بُت ہیں فلسفی کا سب سے پہلا فرض بیکن کے کہنے کے مطابق یہ ہے کہ ان چاروں قسموں کے بتوں سے نجات حاصل کرے، پھر آگے قدم بڑھائے۔

چوبیس گھنٹوں میں چند لمحے ایسے بھی ہونا چاہئیں کہ جب انسان اپنے گردوپیش کے حالات اور مسائلِ حیات پر ٹھنڈے دل سے فکر کرے۔ اگر ہم اپنے عقائد وخیالات کا جائزہ لیں اور ناقابلِ قبول عقائد کو فہرست سے کاٹتے جائیں تو شاید گنے چنے چند اصول رہ جائیں گے جن پر ازسرِ نو محکم و پائیدار عقائد وخیالات کی عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے۔

کتنے الفاظ ہیں جو شب وروز ہماری زبان پر جاری ہیں لیکن چونکہ ہم اُن کے فلسفیانہ پس منظر سے ناواقف ہیں۔ اس لئے وہ ہمارے لئے چند آوازوں اور دھندلے سے نقش ماضی کے سوا کچھ نہیں۔ حق وحقیقت ماہیت، خیر وشر نیکی، اخلاق و اقدار، کون ومکان، زمان وغیرہ کیا مبادیِ فلسفہ سے واقف ہوئے بغیر ہم ان الفاظ کے معنی صحیح صحیح سمجھ سکتے ہیں؟

اس ضمن میں فلسفے کی چند شاخوں کو بیان کرکے ہم آپ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ انسان کو اپنی روزمرّہ زندگی میں ان کا علم ہونا ضروری ہے یا نہیں! ذرا غور فرمائیے۔

فلسفے کی سب سے پہلی شاخ علمیات یا "نظریۂ علم" ہے جس سے ہم کو عقل کے حدود اور عقل کے صحیح استعمال کے اصول معلوم ہوتے ہیں منطق کو اسی کی ایک شاخ سمجھئے۔ ذہن کو مغالطات کے فریب سے بچانا۔ ہر شعبۂ حیات میں کامیابی کی کنجی ہے۔ وکالت، صحافت وخطابت وغیرہ میں تو منطق جس قدر مفید ہے ظاہر ہے معمولی کاروبارِ زندگی میں بھی ترتیبِ خیال اور استقامتِ رائے ناگزیر قدریں ہیں جن کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔ علمیات کی دوسری شاخ نفسیات ہے جس کا علم روزمرہ کی زندگی میں اور بھی ضروری ہے۔ نفسیات کا جاننے والا ہی صحیح اندازہ کرسکتا ہے کہ کسی بات کے کہنے یا کرنے کا کسی موقع پر کیا اثر ہوگا۔ بعض ماہرینِ فن کے خیال میں تو یہ سب سے زیادہ کارآمد علم ہے۔ اور اس کا جاننے والا وہی کام کرسکتا ہے جو ساحر سحر سے کرتا ہے۔ چنانچہ دوسروں پر اثر ڈالنے کے گر کے علاوہ یہ علم امراض کے علاج میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ہپناٹزم اسی کا ایک باب ہے۔

دوسری شاخ کونیات ہے تخلیقِ عالم کا کیا منشا ہے۔ انسان کا اس کے اندر کونسا مقام ہے۔ اور کیا مقصدِ حیات ہے مقصدِ حیات کے عملی پہلو جاننے کے لئے ہر شخص پر فلسفۂ اخلاق یا اخلاقیات اور فلسفۂ جمال یا جمالیات کا مطالعہ فرض ہے تاکہ نیکی اور بدی، خوبصورتی اور بدصورتی کے معیار معلوم ہوں بعض فلسفی "عملی فلسفہ" کی ایک جداگانہ شاخ قائم کرکے اخلاقیات وجمالیات کو اس کے تحت رکھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں فلسفے کا ہر شعبہ عملی پہلو رکھتا ہے۔ اور اس لئے "عملی فلسفے" کی جداگانہ قسم قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

فلسفے کی تیسری قسم وجودیات (Ontology) ہے۔ اس شعبے میں ماہیت اشیا سے بحث ہوتی ہے۔ اس شعبے نے فلسفے کو بدنام کر رکھا ہے لیکن اس کا جاننا نہ صرف اسلئے ضروری ہے کہ فلسفے کی تصویر کا ایک رُخ یہ بھی ہے۔ اور جب تک اس پر نظر نہ ہو فلسفے کی مکمل تصویر آنکھ کے پیشِ نظر نہیں ہوسکتی، بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اصل نقل کا فلسفیانہ امتیاز کامیاب زندگی کے لئے ضروری ہے۔ غالب کی تنبیہ اسی جانب ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

فلسفے کے مبتدی کو چند سبقوں کے بعد ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ سائنس فلسفے کا حریف نہیں بلکہ وہ حواسِ خمسہ کا قائم مقام ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سائنس کے آلات کی مدد سے حواس کی قوت لاکھوں گنی ہو جاتی ہے۔ برہنہ آنکھ ایک محدود فاصلے تک دیکھ سکتی ہے لیکن خوردبین کی مدد سے لاکھوں میل کی خبر لاتی ہے۔ تالاب میں ہم مچھلیاں تیرتے دیکھ سکتے ہیں۔ مگر اس کے ایک قطرے کے اندر حیات کا پتہ خوردبین سے چلتا ہے جس کے نیچے آکر قطرہ تالاب کے برابر معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور چھوٹی چھوٹی جانیں جنھیں برہنہ آنکھ نہیں دیکھ سکتی تھی، مچھلیوں بلکہ مگرمچھ کے جثے کے برابر قطرے میں تیرتی، ڈوبتی، اچھلتی نظر آتی ہیں۔

الحاصل جس طرح حواسِ خمسہ سے فلسفے کو کچا مال بہم پہونچتا تھا جسکو وہ ساخت و پرداخت کے بعد مصنوعات کی شکل میں بازارِ علم میں لاتا تھا اسی طرح سائنس فلسفے کے لئے خام اجناس فراہم کرتی ہے۔ اور فلسفہ انکو آب و تاب دے کر مکمل اشیاء کی شکل میں پیش کرتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کپاس ضروری چیز نہیں۔ لیکن اس سے بنا ہوا کپڑا ابھی کبھی لباس کبھی بستر کبھی رومال اور کبھی تولیا کی شکل میں ہم ہر وقت استعمال کرتے ہیں برہنہ آنکھ سے آپ نے زید، بکر، خالد کو دیکھا۔ فلسفے نے ان سب کو "انسان" کے تصور میں یکجا کیا، اور پھر اس سے "انسانیت" کو اخذ کیا۔ سائنس نے فزیالوجی (علم افعال الاعضاء) کے مشاہدات فراہم کئے۔ فلسفے نے ان پر نفسیات کی عمارت کھڑی کی۔ سائنس کی دوسری شاخ انتھراپالوجی (بشریات) وحشی انسان سے لے کر متمدن انسان کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ فلسفے نے عمرانیات، اخلاقیات، سیاسیات کی داغ بیل ڈالی۔

ہماری آج کل کی زندگی جن خرابیوں سے چور چور ہے اور جو اولین فرصت میں فلسفیانہ نظر کی محتاج ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(ا) ہماری زندگی ترتیب و اصول سے محروم ہے۔ جس کے مظہر دو ہیں۔

(۱) ہمارے اعمال (۲) ہمارے خیالات۔

(۱) ہمارے اعمال میں کوئی ترتیب نہیں جس وقت جو کام چاہا کر لیا۔ جتنی دیر جو کام چاہا کیا چاہے نہ غرض سمجھ کر ٹھیک ٹھیک انجام دیا۔ اور چاہے بگاڑ ڈالا، دی نہ چاہا، ایفائے وعدہ کیا اور چاہے نہیں کیا۔ ویسے ہم بہت مشین پرست ہیں۔ لیکن اگر کسی مشین سے بے اعتنائی برتتے ہیں تو وہ کھڑی ہی ہیں۔

(۲) خیالات کے الجھاؤ کو لیجئے تو کیا عقائد۔ کیا خاندانی روایات۔ کیا حالات حاضرہ۔ سب کے متعلق ہماری رایوں کا ایک جنگل ہے جسمیں طرح طرح کے خود رو درخت کھڑے ہیں۔ اور ایک کو دوسرے سے کوئی علاقہ، کوئی ربط، کوئی واسطہ نہیں۔ جن درختوں کو کبھی کا ایندھن بن جانا چاہیئے تھا وہ بھی سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ اور جن کی شاخیں کٹ جانا چاہیئے تھیں وہ بھی اپنی شاخیں دوسرے درختوں کی شاخوں سے ملائے قائم ہیں۔

(ب) سائنس کی ایجادات نے جو آسانیاں ہم کو بہم پہونچائی ہیں ہم ان سے فائدہ اٹھانے کے عوض اُن کے غلام ہو گئے ہیں مشینوں کے استعمال سے ہم وقت اسلئے بچاتے ہیں کہ اس کو دل بھر کے ضائع کریں۔ ایٹم بم۔ ہائیڈروجن بم اسلئے ایجاد کئے ہیں کہ ہماری حکومتوں کو بنی نوع انسان کے ہلاک کرنے میں آسانی ہو۔ اور ہم حکومتوں کی خوشنودی حاصل کرکے خوب روپیہ دلیں۔

(ص) ہر حکومت اپنے آپ کو گویا نظام شمسی کا آفتاب سمجھ بیٹھی ہے اور چاہتی ہے کہ دوسری حکومتیں اس کے چاروں طرف گردش کریں۔ ہر حکومت کو اپنی ریاست و فرمانروائی عزیز ہے۔ اور اس میں کسی غیر کا دخل گوارا نہیں۔ زبان سے ایک عالمگیر حکومت کا قیام سب چاہتے ہیں۔ مگر دل سے کوئی قائل نہیں۔ اسی وجہ سے آج تک یہ خیال قوت سے فعل میں نہ آسکا۔ قومی بجٹوں کا بیشتر حصہ جس کو عوام کی بہبود پہ صرف ہونا چاہیئے تھا۔ اسلحوں کی آرائش اور فوج کی افزائش پر خرچ ہوتا ہے۔ چنانچہ بیروزگاری افلاس جرائم۔ امراض روز بہ روز ترقی پر ہیں۔ باہمی رقابتوں کی بدولت انسانی خون کی وہ ارزانی ہے جو کبھی نہیں تھی۔ کہنے کو ہم حامل تہذیب و علم برادر تمدن ہیں لیکن اعمال میں وحشت، درندگی، بربریت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ سائنس نے ان حکومتوں کی لونڈی بن جانا قبول کر لیا ہے۔ مگر فلسفے کا سر جو اعلیٰ قدروں کا حامل ہے، بدستور اونچا ہے۔

بدام و دانہ نگیرند مرغِ دانا را

ان تمام امراض کا واحد علاج اگر کہیں مل سکتا ہے تو وہ فلسفہ ہے۔

(۲) اعمال کے اعلیٰ معیار قائم کرنا اخلاقیات میں مضمر ہیں۔ اچھائی اور برائی کا صحیح علم ہو جانے کے بعد جو فلسفے کی تحصیل کے بعد ہی ممکن ہے۔ برائی سے نفرت اور گھن آنے لگتی ہے۔ جیتی مکھی جان بوجھ کر کوئی نہیں نگلتا۔ خیالات کے جنگل کی صفائی اور چمن بندی کا کام محض منطق کے ہاتھوں انجام پا سکتا ہے۔ دن میں دس منٹ ہی اس کام کے لئے نکالئے اور ذرا غور و فکر کی عادت ڈالئے۔ پھر دیکھئے کہ آپ کے ذہن پر کس قدر صیقل ہو جاتی ہے اور ترتیب مقدمات، ہر قضیہ کا معنوی پہلو سمجھنے اور تعریف و تجزیے کا ملکہ پیدا ہو جانے کے بعد دیکھئے کہ آپ کی رائے میں کس قدر اصابت اور خیال میں کس قدر اصابت اور خیال میں کس قدر استقامت پیدا ہو جاتی ہے جو آج کل کی زندگی میں کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔

(ب) مشین کے تسلط سے برے نتائج جو آج کل پیدا ہو رہے ہیں۔ ان سے اگر ہم کو کوئی شے بچا سکتی ہے تو وہ فلسفے کی تعلیم ہے۔ سائنس کا معراج کمال مشینوں کو ایجاد کر دینا تھا۔ فلسفے کا کام زندگی کی اعلیٰ قدروں کو ہمارے سامنے رکھ کر ہر چیز کے صحیح استعمال کا سبق دینا ہے۔ ایٹم بم ہلاکت کی ایجاد ہے تو توازنِ حیات میں فرق آتا ہے۔ لہٰذا فلسفہ اس قبیل کی ایجادات سے کبھی متفق نہیں ہو سکتا۔ اسلئے اس کا مآل کار توازنِ حیات پیدا کرنا ہے۔

ایک ایسی عالمگیر حکومت کا قیام جو دنیا کی کل حکومتوں پر حاوی ہو، دراصل ایک فلسفیانہ خیال ہے اور جب تک فلسفے کی تعلیم حیاتِ انسانی کی اعلیٰ قدروں کو عام نہ کر دے، اس پر عمل دشوار ہے۔ حکومتوں کا یہ خیال صریح منطقی مغالطہ ہے۔ کہ سیاست و فرمانروائی کا وہ خود مستقر ہیں۔ اصل میں یہ سیاست عوام کا حق ہے۔ حکومتوں کی فرمانروائی عارضی اضافی اور عوام کے عطیے سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ فیصلہ عوام کے ہاتھ میں ہے۔ مگر یہ لازمی ہے کہ جو حکومتیں نقضِ امن پہ تلی ہوئی ہیں اُن کو برطرف کرکے صلح پسند حکومتیں قائم کریں اور عالمگیر حکومت کے فوائد کی اشاعت کریں۔ اور سب یکجہت ہو کر ایک عالمگیر حکومت قائم کریں جس کے قائم ہونے کے بعد آزاد انفرادی حکومتوں کا ڈنک مستقل طور پر ٹوٹ جائے گا۔ ہر جنگ کے بعد کتنی عورتیں بیوہ۔ کتنے بچے یتیم۔ کتنے گھر برباد ہوتے ہیں۔ اور پھر ہر جنگ کے بعد گرانی، بیروزگاری اور طرح طرح کی وباؤں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جنگ کی ان مصیبتوں سے بچنے کے لئے جو جنگجو حکومتیں ہر دسویں پندرھویں برس انسان کے سر پر توڑتی رہتی ہیں واحد ذریعہ عالمگیر حکومت کا قیام ہے جو فلسفۂ امن کی اشاعت سے حاصل ہو سکتا ہے۔

تالیفِ قلب سیاسی مکاری کا سب سے کارگر حربہ ہے۔ حکومتیں لیڈران کو طرح طرح کے لالچ دے کر عوام کو اپنا ہم خیال بنائے رکھتی ہیں۔ اور اس پردۂ التفات میں عوام کو مٹا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتی رہتی ہیں۔ اگر کسی کو احساس ہوا تو اول تو سرکاری پروپگنڈے کے شور میں کون اس کی آواز سنتا ہے۔ ورنہ وہ آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دی جاتی ہے حضرت جوش ملیح آبادی نے اسی فلسفیانہ نکتے کی جانب اشارہ کیا ہے۔

سمجھے گا اُس کا درد کون شورشِ کائنات میں
تو نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں

ہماری آج کل کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ اعلانِ آزادی ہے۔ اور ہر شہری کا فرض ہے کہ دستورِ جمہوریت کا بغور مطالعہ کرے۔ آئندہ کسی صحبت میں بشرطِ فرصت ہم اس مسئلے پر فلسفیانہ نظر ڈالیں گے۔ اس سے ضمناً یہ بھی معلوم ہوگا کہ کسی موضوع کے فلسفیانہ اور معمولی مطالعے میں کیا فرق ہے۔ اور کتنے گوشے ایسے ہو سکتے ہیں۔ جہاں فلسفیانہ نظر پہونچ سکتی ہے لیکن بادی النظر میں وہ نظرانداز ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ معنوی حیثیت سے کل موضوع کو صحیح صحیح سمجھنے کے لئے اُن کا پارٹ نہایت اہم ہے۔

ذِکر و فِکر

فراق گورکھپوری: ـــــــ

شادمانی کرے نہ شاد مجھے   اپنے غم پر ہے اعتماد مجھے
جب وہ عالم ہیں عشق کی جاگیر   کیوں ہو فکرِ کم و زیاد مجھے
جانیں کیا منزلیں ہیں قسمت میں   دشت کہتا ہے خیرباد مجھے
جیسے چھپ جائے کوند کر بجلی   آئی تیری وفا کی یاد مجھے
کیوں حیاتِ دو روزہ کرتی ہے   گاہ ناشاد گاہ شاد مجھے
فقط ایمان تم پہ رکھتا ہوں   تم کہو گے خوش اعتقاد مجھے
ہاں نہ ہو بے نمازیوں میں کمی   مل رہے گی مری مراد مجھے
کچھ تو ٹھنڈک پڑے کلیجے میں   چاہیئے حسنِ شعلہ زاد مجھے
خوش گلہ ہوں کسی سے خلوت میں   خامشی دے رہی ہے داد مجھے
جانے کیا دھیان آگیا ہے آج   تم نہ ایسے میں آؤ یاد مجھے
حسن کی نرمیوں نے لو دے دی   مسکرانا ترا ہے یاد مجھے
موت کچھ خاص کام ہو تو بتا   زندگی کر رہی ہے یاد مجھے

اب میں اُس کارزار میں ہوں فراق
ہے جہاں ہر نفس جہاد مجھے

ابر احسنی گنوری: ـــــــ

گریز میں ربط کا یہ پہلو جدا بھی ہے اور جدا نہیں ہے
نظر کی دُنیا پڑی ہے ویراں خیال سے ماورا نہیں ہے
تمہیں نہ جب مقصدِ جبیں ہو تو کعبہ کیا شے ہے بتکدہ کیا
یہاں بھی سجدہ روا نہیں ہے وہاں بھی سجدہ روا نہیں ہے
ابھی نظر اُن کو ڈھونڈتی ہے گل و سمن کی کثافتوں میں
ابھی نظر کس طرح وہ آئیں ابھی نظر پارسا نہیں ہے
وفا پرستوں سے کوئی پوچھے معانیِ احترامِ اُلفت
لہو نظر سے ٹپک رہا ہے لبوں پہ آہ و بکا نہیں ہے
چمن میں گل برق میں شرارے، دلوں میں داغ، آسماں پہ تارے
کہاں کہاں ہو کے وہ نہ گزرے کہاں کہاں نقشِ پا نہیں ہے
کہاں گمان و یقیں کی راہیں مجھے نہ گمراہ آ کے کر دیں
کبھی گماں وہ جدا ہے مجھ سے کبھی یقیں وہ جدا نہیں ہے

اختر انصاری اکبرآبادی: ـــــــ

میری نگاہِ شوق ہے جلوۂ حسرتِ خموش
دل کو بھی غم بنا دیا ہائے رے دل کے غم کا جوش
اُن کا نقاب اُٹھ گیا جلوۂ تابناک سے
حسن ہے مائلِ کرم عشق کو جب نہیں ہے ہوش
شام کی دل فریبیاں جام و سبو میں غرق تھیں
آہ یہ صبحِ انجمن ورہم ہے تمنائے و نوش
آپ کا نقشِ پا ہے اب ہوشِ جبین و سر نہیں
یاد ہے وہ بھی عہد جب سر تھا مرا وبالِ دوش
اخترِ پاک باز بھی مست ہے کیف و رنگ میں
بزم میں وہ نگاہ ہے کیف طراز و مے فروش

وائی گلسار

بگڑے ہوئے بچّوں کے مشکلات

متعدد علوم کی طرح علمِ نفسیات بھی مطالعے کے مخصوص شعبوں کو فروغ دے رہا ہے۔ ان میں سے ایک بچّوں کے نفسیات سے متعلق ہے یہاں ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی مخصوص شعبے کے عیوب یا محاسن کی فہرست مرتب کی جائے بلکہ نفسیات میں مخصوص کا لفظ صرف اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے کہ فلاں بات پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور فلاں پر کم۔ نفسیات شعور کے مکمل اور جامع مطالعے کا نام ہے اور اس کی مختلف اشکال اور حصے ایک دوسرے سے گندھے ہوئے ہیں۔ اور کافی حد تک ان کا انحصار ایک دوسرے پر ہے۔ اس مضمون میں ہم بچّوں سے متعلق امور پر بحث کرتے ہوئے عمر کے اس حصے کو خاص طور پر دھیان میں رکھیں گے جو پیدائش سے لے کر ۱۴ سال تک ہوتا ہے۔ اس مدت کو اگر ایک بار پھر چند ضروری گروپوں میں تقسیم کر دیا جائے تو مطلب اور بھی واضح ہو جائے گا۔

۱۔ پیدائش سے چھ برس کی عمر تک

۲۔ اوائل عمر، سات سے دس یا گیارہ برس کی عمر تک۔

۳۔ لڑکپن بارہ سے چودہ برس کی عمر تک۔

نمبر ا کے دو جزو اور بنائے جا سکتے ہیں:- (۱) ۳ برس تک زمانۂ شیر خوارگی (۲) چار سے سات برس تک بچپن۔

اس طرح پیدائش سے لے کر لڑکپن کی مدّت کی تقسیم یوں ہو گی:-

۱۔ پیدائش سے لے کر تین برس تک کی مدّت۔

۲۔ چار سے سات برس تک کی مدّت۔

۳۔ آٹھ سے گیارہ برس تک کی مدّت۔

۴۔ بارہ سے چودہ برس تک۔

جیسٹالٹ سائیکالوجی اور تحلیل نفسی کی ترقی نے زمانۂ شیر خوارگی اور بچپن کا تجزیہ کرنے میں بہت مدد دی ہے۔ اس کے علاوہ نفسیات کی دیگر شاخوں نے بھی بچے کے مزاج کا تجزیہ کرنے کے بہت سے راستے کھولے ہیں۔ علاوہ ازیں علوم حیوانیات، نفسیاتِ معاشرہ۔ علوم الامراض نے بھی بہت سی باتوں کو واضح کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں بہت سے طریقوں کا کام لیا گیا ہے۔ ان میں مختلف تجربات اور سوال ناموں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بچے کے ذہن کا تجزیہ کرنے میں ان تمام طریقوں کو اگرچہ بہت دخل ہے۔ لیکن نتائج کے اعتبار سے کوئی طریقہ مکمل اور آخری نہیں سمجھا گیا۔ مختلف حالات میں ان تمام باتوں کو مجموعی صورت سے سامنے رکھنا بہت ضروری ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ بچے کے ذہن کے بارے میں معلومات بخوبی فراہم ہو سکیں۔

تحلیلِ نفسی کے اثرات

اس حصے میں ہم صرف تحلیلِ نفسی اور جیسٹالٹ سائیکالوجی کے بارے میں ہی گفتگو کریں گے۔ میری بیول سیلس نے ۱۹۳۲ء میں بچوں کے نفسیات کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی۔ اس میں مصنف نے بچّوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا تجزیہ کرنے کے بعد نتائج مرتب کئے تھے۔ یہ نتائج درج ذیل ہیں:-

(۱) بچے کو عمر کے ابتدائی دور میں محبت کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی اس کے جسم کو حفاظت کی، اور جہاں اس پیار اور محبت کا فقدان ہوتا ہے بڑے خطرناک نتائج ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ بعض بچوں میں بُری عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور بعض بچے چڑچڑے اور بدمزاج ہو جاتے ہیں۔ انتہائی شریر ہو جانا بھی مریضانہ کیفیت ہوتی ہے۔ والدین کی موت یا اُنکے باہمی تنازعات کو بھی بچے کی شخصیت میں خاصہ دخل ہوتا ہے۔ برٹ کی تحقیقات کے مطابق غلط قسم کے گھریلو نظام اور بچوں کی بری عادات کی مشترک شرح ۶۹ ہے اور ایک ہی کنبے میں تعلقات کی خرابی کی ۳۳٪ ایسے گھروں کے بچے اپنے فائدے کے لئے ماں باپ کو ایک دوسرے سے لڑانے کا باعث بھی بن جاتے ہیں۔ والدین کے تنازعات کا عکس بچے کی شخصیت میں نظر آ سکتا ہے۔

اور علاج کرنے سے پہلے ان کو سمجھنا ضروری ہے۔

میریا مانٹیسری نے اپنی کتاب "بچپن کے راز" میں اس عمر کے مطالعے پر پوری توجہ مبذول کرنے پر زور دیا اور اس مطالعے کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اس عمر میں بچے کی اہم ترین ضرورت صحیح قسم کا پیار ہے اور جہاں اس کا فقدان ہے ذہنی خلفشار کا اظہار بچے کے انتہائی شریر ہو جانے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بچے میں ذہنی کھچاؤ اور ہر شے کے بارے میں یاس سی محسوس کرنے کا سا انداز آجاتا ہے۔ بچے کی روح چیختی ہے اور وہ اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے۔

۲۔ تحلیل نفسی نے ایک اور خطرے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ والدین بچوں کو توقعات کے بوجھ تلے دبا دیتے ہیں۔ بہت سے بچوں کی شخصیتیں اس طرح فنا ہو کر رہ جاتی ہیں۔ شعوری طور پر بچے کو ایک بہت بڑی شے کی طرف لپکنے پر مجبور کرنے سے بہت برے اثرات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اپنی عمر اور فہم کے اعتبار سے کسی اونچے آدرش کو نہ پا سکنے کی صورت میں بچے کم گو، مکار اور دغاباز بن جاتے ہیں۔ بعض والدین اپنے بچوں سے کچھ اس قسم کی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں جن کی بنیاد تو ان کی شخصیت میں موجود ہوتی ہے لیکن عمر کے اس حصے میں یہ توقعات ان پر ایک بوجھ بن جاتی ہیں۔ مجموعی طور پر غور کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس سلسلے کی دوسری کڑیاں خود بخود سامنے آ سکتی ہیں۔ شرط یہ ہے کہ تمام باتوں کو ان کے فطری تسلسل میں دیکھا جائے۔ والدین کے مسخ شدہ تصورات کی ایک واضح مثال ہندوستانی گھروں میں ملتی ہے۔ یہاں شروع ہی سے بچوں کو بھاری بھرکم تصورات اور توقعات کے بوجھ تلے دبا دیا جاتا ہے۔ ان کی نیت یہ ہوتی ہے کہ بچہ ہاتھ پاؤں نکالنے سے پہلے ہی مسلم آدمی کا روپ بھرے۔ اس کا انجام ایک ایسی کامیڈی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جس کا انجام انتہائی المناک ہے۔ بچہ ماں باپ سے بچنے لگتا ہے۔ اور اس میں سرکشی اور بغاوت سر اٹھانے لگتی ہے۔ اس کا علاج صرف ایک ہی صورت میں ہو سکتا ہے کہ والدین بچے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اپنی توقعات کا دامن صرف اس حد تک پھیلائیں جس حد تک بچے کی عمر اجازت دیتی ہے۔ انہیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ بچے کی شخصیت میں بڑے سے بڑے آدرش کی بنیادیں موجود ہوتی ہیں۔ ضرورت صرف صبر کی ہے۔

ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار کی خرابیاں

(۳) بچے کے ساتھ ضرورت سے زیادہ لاڈ چاؤ کرنا، اس کی جائز و ناجائز تعریف کرنا اور چومنا چاٹنا بھی اس کے لئے نقصان دہ ہیں۔ اس کا تجربہ ہوتا ہے کہ نئے بچے کی پیدائش پر اس کے بڑے بہن بھائی اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے طفلانہ تصوّرات کو بغیر کسی خوف و خطر کے عملی روپ میں دیکھنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ دیہات میں بچے والدین کے ساتھ بیٹھ کر حقہ پیتے اکثر دیکھے گئے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ باپ حقہ پی کر چلم بچے کی طرف بڑھا دیتا ہے اور وہ بڑے "سلیقے" اور انہماک سے چند کش لگا لیتا ہے۔ دھیرے دھیرے بچہ ایک ایسی عادت اپنا لیتا ہے جو نہ صرف اس کی صحت کے لئے مضر رساں ہے بلکہ اور بھی برائیوں کے لئے راستہ کھول دیتی ہے۔

(۴) یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض والدین ازدواجی ناکامی کے ردِ عمل کے طور پر اپنا تمام لاڈ پیار بچے پر نچھاور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ والدین کے مسخ شدہ لاڈ پیار کے پس منظر میں ناکام جنسی زندگی کارفرما ہوتی ہے۔ یا یوں بھی ہوتا ہے کہ والدین انتہائی نیک اور سادہ ہوتے ہیں۔ بعض میں اکلوتا بچہ ہونے سے اور بعض میں طویل مدّت اور ان تھک کوششوں کے بعد بچے کی پیدائش سے اس قسم کی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔

علاوہ ازیں مذکورہ بالا وجوہ کی وجہ والدین کے باہمی تنازعات اور مزاج کی برہمی بھی ہو سکتی ہے۔ ان سب کا علاج یہی ہے کہ والدین کافی ضبط سے کام لیں۔ ایسی شادیوں سے جن کا مقصد محض بچے پیدا کرنا ہو احتراز کرنا چاہیئے۔ اور نظر ملتے ہی گرفتار محبت ہونے سے بھی بچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ لیکن جب یہ مشکلات پیدا ہو جائیں تو بہترین طریقہ یہی ہے کہ کسی ماہر نفسیات سے مشورہ کیا جائے اور کسی متعلقہ ہسپتال سے ہدایات حاصل کی جائیں۔ اس کام کے لیے تربیت یافتہ اور خوش خلق ماہران کی ضرورت ہے۔ ان آدمیوں اور عورتوں میں تحمل اور باریک بینی کا ہونا ضروری ہے کیونکہ ان کا رول اس پادری کا سا ہے جو ہاتھ اٹھا کر انسانوں کی بہبود کے لئے دعا کرتا ہے۔

(۵) اس پیراگراف میں جن برائیوں کا ذکر کیا جائے گا ان کا تعلق بھی والدین ہی سے ہے۔ بعض والدین بچوں سے یکساں محبت نہیں کرتے۔ کسی سے بہت زیادہ اور کسی سے بہت کم، اس طرح مختلف بھائی بہنوں میں حسد اور رقابت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ پلوٹھی کے بچے کو خوب چوما چاٹا جاتا ہے۔ ہندوستانی گھروں میں سب سے بڑے لڑکے کو بڑی عزت

انصاف سے دیکھا جاتا ہے۔ والدین اپنی تمام تر ہمدردی، پیار اور محبت اسی پر نثار کرتے ہیں۔ اور وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی حیثیت دوسرے بچوں کی نسبت برتر ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے اس حق کا ناجائز استعمال شروع کر دیتا ہے بعض اوقات والدین صرف اسی بچے کو پیار کرنے لگتے ہیں جو پڑھائی لکھائی میں ہوشیار ہوتا ہے نسبتاً کم ذہن بچوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ماہرین نفسیات تحقیقات کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ صرف پڑھائی لکھائی میں ہوشیار ہونے ہی سے بچے کی قابلیت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا لیکن ہم لوگ بچے کو صرف ایک ہی معیار پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض اوقات گھر میں نئے بچے کی پیدائش سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ماں باپ نو وارد پر لاڈ پیار کی بارش شروع کر دیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے بچے چڑنے لگتے ہیں۔ اور ماں باپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لئے گھر یا سکول میں شرارتیں کرنے لگتے ہیں۔ اس کا علاج بڑا سادہ ہے۔ والدین کو بچوں کے ساتھ یکساں سلوک کرنا چاہیئے اور ضبط سے کام لینا چاہیئے۔ ان حالات میں کسی ماہر نفسیات سے صلاح مشورہ کرنے کی بھی شدید ضرورت ہے۔

والدین کے جنسی تعلقات اور بچہ

آخر میں والدین کی ایک ایسی عادت کی طرف ہم اشارہ کریں گے جو عام گھروں میں پائی جاتی ہے بعض والدین بظاہر سوئے ہوئے بچوں کی موجودگی میں جنسی فعل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے کم سنی ہی میں عورت اور مرد کے جنسی تعلقات کی بھول بھلیاں میں کھو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ غیر شعوری طور پر ہوتا ہے۔ والدین یہ سمجھتے ہیں کہ بچے سوئے ہوئے ہیں اور بچے ایسے وقت میں چوکس رہنا اور سارے سلسلے کو دیکھتے رہنا سیکھ جاتے ہیں۔ اور پھر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ رات کے واقعات کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔ والدین کی طرف سے خاطر خواہ جواب نہ ملنے اور ہر بات کے چھپائے رکھنے سے بچوں میں جانوروں کے اختلاط کا نظارہ کرنے کی بے ہودہ عادت جنم لیتی ہے۔ اور وہ سستی قسم کی جنسی کتب میں اپنے سوالات کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔

ہم نے بچوں کی پیچیدگیوں کی صرف چند وجوہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ فرض کرنا غلط ہے کہ دو تین یا چار برس کا بچہ اردگرد کی اشیاء، والدین اور ماحول سے [illegible] ہر وقت ان سے متاثر ہوتا ہے۔ یہاں جیسٹالٹ سائیکالوجی ایک بار پھر ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ بچہ ماحول سے مسلسل متاثر ہوتا ہے۔ اس کے انداز میں تسلسل ہوتا ہے۔ اور مختلف چیزوں میں رشتہ قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی پرورش کے دوران میں ہر لمحہ اس کی شخصیت میں ایک نوع کا مکمل پن موجود ہوتا ہے جس کو کمہار نے سنوارنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مکمل پن بچے کی حیات اور تخیل ہی کا ایک روپ ہے۔ اور اس کی اہمیت اتنی ہی ہے جتنی کسی خوبصورت چیز کی آنکھ کے لئے۔ بچے میں تو دوسروں کی بہ نسبت تخیل کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ کرشینسٹائنر نے میونچ کے ایک سکول کے ۵۸... طلبا کی ...۳ تصاویر اور خاکے کے ملاحظہ کرنے کے بعد جو نتائج مرتب کئے ہیں وہ یہ ہیں۔ بچہ باریک لکیروں کو بخوبی پیش نہیں کر سکتا۔ اور اس کے لئے تخیل کی مدد سے تصاویر بنانا آسان ہے۔ قدرتی مظاہر کی تصویریں بنانا اس کے لئے مشکل ہے۔

مکمل پن کا احساس

بچوں میں مکمل پن کا شعور خاص اپنا ہوتا ہے۔ میریا مونٹیسری کے الفاظ میں بچہ تخلیق کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس کے پاس ایک ایسی قوت ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ مادی دنیا کو دیکھ کر ایک خیالی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ تخیل اس خیالی دنیا کی تعمیر میں بہت مدد دیتا ہے۔ پلیگٹ نے بچے کی ذہنی اٹھان کی تقسیم اس طرح کی ہے۔

۱۔ بچہ جس قسم کی خواہش محسوس کرتا ہے وہ اس کے لئے حقیقت ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ دو یا تین برس کی عمر تک رہتا ہے۔

۲۔ سات یا آٹھ برس کی عمر تک نمبر ۱۔ قسم کی دو یا دو سے زیادہ لہریں چلتی ہیں۔

۳۔ گیارہ بارہ برس کی عمر سے بچے اپنی خیالی دنیاؤں کو درجہ وار تقسیم کرنا شروع کر دیتا ہے۔

اس کے بعد بچہ سوچنے کی قوت اور منطقی دلائل کی مدد سے اس تقسیم کو مکمل کر دیتا ہے یہاں جیسٹالٹ سائیکالوجی کے مختلف زاویوں کے متعلق کسی بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ چونکہ پیدائش ہی سے بچے کی شخصیت میں تخیل کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے ماحول سے مواد حاصل کرتا ہے۔ اور چونکہ عمر کے ساتھ ساتھ وہ اپنے تخیل کی مدد سے حاصل کئے ہوئے اثرات کو ایک مجموعی شکل میں دیکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہم یہ بات بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ ماحول

جو بچے کو بگاڑنے یا اس کو پیچیدہ بنانے کا باعث ہوتا ہے۔ بچے کی ذہنی اور مادی حدود سے دُور کر دیا جائے یا اس میں نمایاں تبدیلیاں کی جائیں۔ یہاں والدین کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ پیچیدہ بچوں اور ماحول کے اثرات کے متعلق مسٹر ایچ۔ بیرسٹر اور مسٹر ایم بارٹون نے "جائلڈ گائڈینس کلائنک" کیمبرج میں تحقیقات کے بعد برٹش جرنل آف سائیکالوجی کے شمارہ ۱۹۴۴ء میں ایک مقالہ شائع کیا۔ مختلف علامات کو ان اصحاب نے چار حصّوں میں تقسیم کیا۔

۱۔ بری عادتیں، مثلاً چوری کرنا، جھوٹ بولنا اور شرارتیں کرنا۔

۲۔ بدمزاج اور بے قابو بچے۔ ان کی طبیعت میں غصّہ بہت ہوتا ہے، اور والدین کے قابو میں نہیں آتے۔

۳ زود حسی، ہر وقت سہمے رہنا۔ بے چین رہنا، غم زدہ رہنا، ہکلانا، جنسی تکلیفات وغیرہ

۴۔ پچھڑے ہوئے بچے، ایسے بچوں میں ذہنی یک جہتی کا نقصان ہوتا ہے اس کے عوض وہ کند ذہن اور مفلس ہوتے ہیں اور ان میں چڑچڑا پن ہوتا ہے، ماہرین مذکورہ نے کل ۱۱۳ بچوں کے تجربات کئے۔ ان میں سے ۲۷ گروپ نمبر ۱ میں، ۳۱ نمبر ۲ میں اور ۳۴ نمبر ۴ میں آئے۔ یہ گروپ درج ذیل گھروں کی مختلف اقسام سے متعلق

۱۔ جہاں حالات میں ضرورت سے زیادہ "ہم آہنگی" ہوتی ہے۔

۲۔ جہاں حالات اس کے برعکس ہوتے ہیں۔

۳۔ جہاں والدین میں سے ایک کی موت ہو چکی ہو۔

۴۔ جہاں کوئی چیز ٹھکانے سے نہ ہو اور مکمل طور پر افراتفری کا عالم ہو۔

تحقیقات سے یہ نتیجہ بھی نکلا ہے کہ علامات والدین کی طرف سے بچوں پر زیادہ دباؤ ہونے، ضبط کی کمی، کنبے کے افراد کی تعداد اور ایک ہی کنبے کے بچوں کی باہمی رقابت وغیرہ امور سے متعلق ہیں۔

حسب ذیل نتائج مرتب کئے گئے

۱۔ عمر کا نازک ترین حصہ دس یا گیارہ برس کی عمر کا درمیانی وقفہ ہوتا ہے۔ عادات زیادہ تر دس سے تیرہ برس تک کی عمر میں بگڑتی ہیں۔ ۲۷ میں سے ۲۱ بچے اسی گروپ میں آتے ہیں

۲۔ اعصابی علامات کا تعلق گھروں کی قسم نمبر ۱ سے ہے۔ عادات کا بگڑنا گھریلو بدنظمیوں اور دیگر تنازعات سے متعلق ہے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ گھروں کی قسم نمبر ۱ سے جو بچے علاج کے لئے آئیں گے ان کی پیچیدگیوں کی وجہ والدین کا بھرپور حفاظتی جذبہ بھی ہو سکتا ہے۔ محبت کی کمی بھی انہیں علامات کی حامل ہے۔ نمبر ۱ قسم کے گھروں میں اس کے مظہر اعصابی علامات ہیں اور نمبر ۳ قسم کے گھروں میں اس کے مظہر چوری وغیرہ کی عادات ہیں

۳۔ بعض بچے اپنے اکلوتے پن کی وجہ سے بگڑ جاتے ہیں۔ ایسے بچوں کی سب سے بڑی تعداد ۳ قسم کے گھروں میں پائی جاتی ہے۔ اس کے فوراً بعد ہی ۲ قسم کے گھروں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے بچوں کی تعداد ۱ قسم کے گھروں میں بہت کم ہے۔

۴۔ ۷۶ فی صدی بچوں میں غلط یا مناسب طریقے پر ذہنی نظم نہیں ہوتا ۱ قسم کے گھروں میں علامات عصبی کمزوری اور زود حسی ہیں اور ۳ قسم کے گھروں میں شرارتیں کرنے کا جذبہ اور بُری عادتیں۔

اس مختصر سے مضمون میں ان سب نتائج اور ان کی وجوہ کو پوری تفصیل سے زیر بحث نہیں لایا جا سکتا۔ لیکن یہ نتائج ہمارے تجزیے کو کافی واضح کر دیتے ہیں۔ اور چونکہ بچے کی شخصیت کے بگڑنے یا بننے میں ماحول کو کافی دخل ہے۔ اور اس کا اثر بھی مجموعی اور بھرپور قسم کا ہے اس لئے گھریلو اصلاحات اور متعلقہ ہسپتال کھولنے کا مشورہ دینے سے کہیں بہتر ہے کہ لوگوں کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ پیچیدہ بچے پیدائش ہی سے پیچیدہ نہیں ہوتے بلکہ حالات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ جس حد تک ہم ان حالات پر قابو پا سکیں گے، اسی حد تک ہم بچوں کی پیچیدگیوں سے نجات پا لیں گے اور یہ سب کچھ کس طرح ہو سکتا ہے یہ ہم نے اوپر بتانے کی کوشش کی ہے۔

اسناتھ ودیالنکار

جاپان کا حال اور مستقبل

جرمنی اور جاپان دونوں ممالک کی ترقی اور زوال کا معاملہ ایک ہی ساتھ ہوا۔ انیسویں صدی کے درمیانی حصے میں شہنشاہی کی نیند سے جاگے اور صنعتی انقلاب کے زمانے کے زبردست قوم پرستانہ جذبات سے متاثر ہوکر امید سے بھرپور اور اپنے آپ پر بھروسا رکھنے والی بین الاقوامی سیاست کی اسٹیج پر آئے۔ دونوں کو اپنی قومی بہادری، جنگی قابلیت اور انتظامی صلاحیت پر بہت زیادہ بھروسا تھا۔ وہ اکثر دُنیا پر حکومت کرنے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ پچھلی صدی میں دیکھتے ہی دیکھتے اِن دونوں دیشوں نے حیرت ناک ترقی کی یہاں تک کہ اُن کا شمار اوّل درجے کی طاقتوں میں ہونے لگا۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ چند لمحوں کے اندر ہی یہ سب کچھ وقوع پذیر ہوگیا ہے۔ دُنیا دفعتہً حیران ہوکر دیکھتی رہ گئی۔

لیکن اِن دونوں کا زوال بھی عبرت ناک ہے۔ ۱۹۱۴ء میں جرمنی طاقت کے نشے میں چور ہوکر فتح یابی کے لئے آگے بڑھا۔ اِس کوشش میں وہ بُری طرح ناکام ہُوا اور شکست کھاکر پِچھڑ گیا اس کے بعد وہ ایک بار پھر سنبھل کر اُٹھا اس بار وہ انتقام کا جذبہ دل میں لئے ہوئے مصمم ارادے کے ساتھ آندھی کی طرح اُٹھا اور بگولے کی طرح سارے یورپ پر چھا گیا۔ تمام دنیا پر اُس کی دھاک بیٹھ گئی۔ لیکن ساری دُنیا کو مخالف بنا کر تنہا کھڑے رہنا کوئی خالہ جی کا گھر نہ تھا جاپان نے بھی اُس کی پیروی کی۔ کم سے کم مشرق بعید پر تو وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتا تھا۔ اس نے اپنی طاقت کے زور سے مشرق بعید کو اپنی غلامی کے حلقے میں [illegible] لیکن وہ خود ہی تباہ ہوگیا۔ آج جاپان کی طاقت چکنا چور ہو چکی ہے۔ یہاں [illegible] کہ اُس کی خودداری کو بھی کچل دیا گیا ہے [illegible] بیچارگی کے عالم میں امریکہ کے [illegible] ہے۔

[illegible]

کے [illegible]

خود دوسروں کے گناہوں کا شکار ہے۔ آج وہ مجرم کی نہیں بلکہ فریادی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یکم ستمبر ۱۹۴۵ء یعنی تقریباً چار سال سے اُس پر امریکن کمانڈر جنرل میکارتھر کی حکومت ہے۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو وہاں کا بادشاہ اور حکومت سب اُس کی خوشنودی کے منتظر رہتے ہیں۔ وہ آج جاپان کا "سب کچھ" ہے۔

پچھلی آدھی صدی کا مغرور اور متکبر جاپان آج پاؤں کی خاک سے بھی حقیر ہوکر امریکن جنرل کے آگے سربسجود ہے۔ ہتھیار ڈالتے وقت یا اُس کے بعد گذشتہ چار برسوں میں جاپان کو قابو میں رکھنے کے لئے امریکن افسروں کو معمولی سی تکلیف بھی نہیں اُٹھانی پڑی۔ جاپانی جس فرمانبرداری سے اپنے بادشاہ کے احکام کو بجا لاتے تھے۔ اُسی مزاج کے مطابق وہ امریکن افسروں کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ اُن کے دل میں کیا ہے۔ اِس کے متعلق کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ اُن کے دل میں اپنے موجودہ حاکموں کی طرف سے کوئی نفرت ہے بھی یہ کوئی نہیں بتا سکتا کیونکہ جاپانی اپنی قسمت کی کسی کے آگے شکایت تو کیا اُس کا ذکر بھی نہیں کرتے۔ شاید یک رنگوں کی طرح وہ جو کچھ سامنے آتا ہے اُسے جھیلتے چلے جاتے ہیں۔ کیا کبھی وہ اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ سوچتے بھی ہیں؟

اس فرمانبرداری کی وجہ کچھ لوگ یہ بتاتے ہیں کہ جاپانیوں کو اپنے بادشاہ سے اتنی عقیدت ہے کہ انہوں نے جب امریکی افسروں کو اپنا حاکم مان لیا تو انہیں بھی اپنے بادشاہ ہی کی طرح عزت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ لیکن جن لوگوں کو اُن کی صحیح پوزیشن کا علم ہے وہ بتلاتے ہیں کہ جنگ میں شکست کے بعد جاپان کے بادشاہ کی ساری توقیر ختم ہوگئی ہے۔ اگر امریکن حکام کسی خیال کے پیشِ نظر اُس کی حفاظت نہ کرتے اور اُس کے [illegible] بلندی [illegible] تو جاپانی نہ صرف [illegible]

[illegible]

بات چیت میں کئی جاپانی اب اپنے بادشاہ کا مذاق اُڑانے سے بھی نہیں جھجکتے ابھی کچھ دن ہوئے جاپان کے منتری منڈل نے اُس سے اِس امر کی جواب طلبی کی تھی کہ وہ اپنے آپ کو نجی بات چیت میں سارے جاپان کا بادشاہ کیوں ظاہر کرتا ہے۔ حالانکہ اُس کی پوزیشن اب ایک آئینی حکمران کی ہے۔ اور اُس کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں۔ اگر امریکن اُسے پھانسی پر لٹکا دیتے تو جاپانی اُسے مُدت تک دیوتا مان کر پوجتے۔ امریکن حکام اُسے دیوتاؤں کی گدی پر پھر سے بٹھانا نہیں بلکہ اُس سے اُتارنا چاہتے تھے۔ اور بہت ممکن ہے کہ اِسی کارن اُسے زندہ رہنے دیا گیا ہو۔ اُنہیں اپنے اِس مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی۔ جاپان کی پُرانی روایات سے ہمدردی رکھنے والے بائیں بازو کے لوگوں کی طاقت کو ایک جگہ پر لانے کے لئے یہ قدم مفید بھی تھا۔

کئی اشخاص کی رائے ہے کہ ایٹم بم نے جاپانیوں کو اِس قدر حیرت زدہ بنا دیا ہے اور وہ امریکن لوگوں کی اِس شیطانی قوت سے اِس قدر خوف زدہ ہوئے ہیں۔ کہ اب بلا ہچکچاہٹ اُن کے آگے سرِ تسلیم خم کئے جا رہے ہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ ایٹم بم سے جاپانیوں پر ایک خوف سا چھا گیا تھا لیکن ایسا نہیں جیسا کہ اکثر سمجھا جاتا ہے۔ جاپانی موت سے نہیں ڈرتے اور موت کو بالکل ایک معمولی سی چیز خیال کرتے ہیں۔ اِس بات میں بھی شک ہے کہ اگر ہیروشیما اور ناگاساکی میں ایٹم بم نہ گرتے تو جاپانی بھی ہتھیار ڈالنے کو تیار نہ ہوتے۔ دراصل جاپانی لیڈر ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ بہت پہلے کر چکے تھے۔ وہ تو اس کے لئے کوئی موزوں موقعہ یا بہانہ تلاش کر رہے تھے۔

کچھ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ آج کے جاپان کو کسی کی رہنمائی حاصل نہیں اور یہی اُس کی بے بسی کی اصلی وجہ ہے۔ جاپان کی لیڈرشپ اُونچے طبقے کے لوگوں کے ہاتھ میں بہت مُدت سے رہی ہے۔ اُس طبقے کی طاقت اب ٹوٹ چکی ہے۔ اور اُس کا جو اثر زائل ہو چکا ہے وہ پھر واپس نہیں آ سکتا۔ اِس اثر کے ختم ہو جانے سے جاپان کا کوئی لیڈر نہیں رہا۔ اِس لئے جو بھی افسر کوئی حکم دے دیتا ہے جاپانی اُس پر عمل کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ احکام پر غور کرنے کی عادت جاپانیوں میں پہلے بھی کبھی نہیں تھی۔ احکام ماننے کے لئے ہوتے ہیں۔ وہ نکتہ چینی کا موضوع نہیں بنتے۔

آج کا جاپان جتنا پُر اسرار اپنے آشناؤں اور دوسروں کو اُس کے متعلق شک ہوتا ہے لیکن عام طور پر اُنہیں کسی جاپانی سے کوئی شکایت نہیں۔ ایک جاپانی آج اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچتا ہے۔ یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔

امریکہ کی پالیسی یہ ہے کہ جاپان کو رشیا کا کارخانہ اور کمیونزم کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک قلعہ بنا دیا جائے۔ شروع ہی سے امریکہ کی جاپان کے متعلق پالیسی کا یہی مقصد رہا ہے۔

جنگ کے خاتمے کے بعد جاپان کی حکومت اتحادی ملکوں کے کمانڈر انچیف کے سپرد کی گئی جنرل میکارتھر کو مشورہ دینے کے لئے ایک مشاورتی کونسل بنا دی گئی۔ واشنگٹن میں گیارہ ملکوں کا ایک کمیشن پالیسی قائم کرنے کی غرض سے اس میں امریکہ، انگلینڈ، فرانس، چین، ہالینڈ، کینیڈا، نیوزی لینڈ، سیام اور فلپائن کے نمائندے ہیں۔ گیارہ دیشوں کی یہ کمیٹی پالیسی مرتب کرنے کے معاملات میں صرف مشورہ دے سکتی ہے۔ کچھ مُدت پیشتر امریکن پریزیڈنٹ نے کمانڈر انچیف کو ایک چٹھی لکھتے ہوئے اِس امر کو واضح کیا کہ جہاں اس کمیٹی کے مشورے سے کمانڈر انچیف کو اختلاف ہو وہاں امریکن روایات کے مطابق عمل ہوگا۔ جس کے مطابق میدانِ جنگ میں کمانڈر انچیف کو پورا اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ گورنمنٹ سے موصول شدہ احکام کے مطالب اپنی سمجھ کے مطابق اخذ کرے۔ اِس لئے جہاں پالیسی کا اختلاف ہو۔ وہاں امریکن گورنمنٹ کے احکام کو فوقیت حاصل ہوگی۔ اِس بات کو صاف کرنے کے بعد اِس امر کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ جاپان پر امریکہ کو ہی پورا اختیار حاصل ہے۔

جاپان پر قبضہ کر لینے کے بعد امریکہ کے لئے سب سے پہلی اُلجھن یہ تھی کہ شاہی خاندان کی دیرینہ طاقت کو ختم کیا جائے۔ جاپان میں موجودہ زمانے کے اصول کے مطابق جمہوریت کی بنیاد رکھی جائے اور جاپان کی فوجی طاقت قائم رکھنے والوں نے دوسروں پر حکومت کرنے کے جو خیالات عوام میں بھرے تھے۔ اُنہیں جاپانیوں کے دماغ سے نکالا جائے۔ جمہوریت کے لئے پریم پیدا کرنے کا سب سے پہلا اور کامیاب طریقہ یہ تھا کہ جاپان کا طریقہ حکومت کو جمہوری اصول کے مطابق بنایا جائے۔ اِس کے لئے جاپان کی گورنمنٹ سے ایک آئین تیار کروایا گیا۔ نومبر ۱۹۴۶ء میں بادشاہ نے اُس کا اعلان کیا اور ۳ مئی ۱۹۴۷ء کو اُس پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ اِس آئین کو تیار کرانے سے جنرل میکارتھر نے ذاتی طور پر دلچسپی لی اور کچھ لوگوں کا تو خیال ہے کہ دستور کا سارے کا سارا مسودہ امریکن پالیٹیکل کے دفتر میں تیار ہوا اور جاپان کی سرکار نے آنکھیں بند کر کے اُس پر دستخط کر دیئے۔

آئین کی بعض اہم دفعات پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ انگریزی عبارت کا جاپانی زبان میں کمزور ترجمہ ہے۔ اس آئین کے مطابق بادشاہ کی پوزیشن انگلینڈ کے بادشاہ کی طرح ایک آئینی حکمران کی سی ہے۔ دوسری بہت سی باتیں بھی امریکی آئین کے عوض انگلستان کے ودھان سے زیادہ ملتی جلتی ہیں۔ انتخابات میں بالغوں کو ووٹ کا حق دیا گیا ہے۔

جنرل میک آرتھر نے جنتا پر سے بہت سی پابندیاں اٹھا دیں۔ تقریر کرنے، جلسے منعقد کرنے اور مزدوروں کی سبھائیں بنانے کی جتنی آزادی عوام کو حاصل ہوئی اتنی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۶۵۰۰۰۰۰ مزدور ۳۵۰۰۰ یونینوں میں منقسم ہو گئے جب کہ پیشتر ازیں صرف ۴۲۰۰۰۰ مزدور کل ۹۷۵ یونینوں میں منسلک تھے۔ کسانوں کو بھی رعایتیں دی گئیں اور ایک حکم کے ذریعے سے اس رواج کو ختم کر دیا گیا کہ کوئی زمین کا مالک زمین سے دور رہ کر بھی اس کا حقدار بنا رہے۔ جنگ سے پیشتر دو تہائی ہل جوتنے والے صرف کسان تھے۔ جو زمین کے مالک نہیں تھے۔ اب زیادہ تر کسان ہی زمین کے مالک بنا دیئے گئے اور اس امر پر بھی شرط عائد کر دی گئی کہ کوئی شخص زیادہ سے زیادہ کتنی زمین پر قابض رہ سکتا ہے۔

پہلے انتخابات میں ۱۴۸ سوشلسٹ، ۱۴۰ لبرل، ۱۰۶ جمہوریت پسند اور صرف ۴ کمیونسٹ چنے گئے۔ یکم دسمبر کو پھر الیکشن ہوا جس میں ۱۵۳ لبرل، ۱۱ سوشلسٹ، ۹۰ جمہوریت پسند اور ۴ کمیونسٹ منتخب ہو کر آئے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ ان انتخابات سے جاپانیوں کے سیاسی جذبات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ جاپان سے اتحادی فوجی قبضہ اٹھ جانے کے بعد وہاں کے عوام کی ذہنی کیفیت کیا ہوگی۔ اس کے بارے میں ٹھیک طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جاپانی ابھی سیاسیات کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ ان کے غور و فکر کا مرکز زیادہ تر اقتصادیات سے وابستہ ہے۔ جاپان کا آئندہ مستقبل کافی تاریک دکھائی دیتا ہے اور موجودہ حالات میں بھی اُسے سخت اقتصادی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

جنگ کے بعد سے اس کی آبادی میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ اور اب وہ ساڑھے آٹھ کروڑ کے لگ بھگ پہنچ گئی ہے۔ ہر سال آبادی میں ۱۵ لاکھ کا اضافہ ہوتا ہے اور اگر اسی رفتار سے آبادی بڑھتی گئی تو اندازہ لگایا جاتا ہے کہ سنہ ۱۹۶۰ء میں دس کروڑ تک پہنچ جائے گی۔ آبادی میں زیادتی کی ایک وجہ یہ بھی کہ جنگ کے دنوں اور اس سے پہلے سارے ایشیا میں جو جاپانی پھیلے ہوئے تھے اور جو کافی بڑے عہدوں پر کام کرنے کے علاوہ کئی کارخانوں، کمپنیوں اور زمینوں کے مالک تھے وہ سب جاپان بھیج دیئے گئے ہیں۔ اُن کی تعداد بھی پچاس لاکھ سے زائد ہوگی۔

اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کو کام مہیا کرنا اور روٹی، کپڑا بہم پہنچانا جاپان کے لئے ایک بڑا مسئلہ چلا آ رہا تھا اور اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے لئے یہی دلیل وہ اکثر دیا کرتا تھا کہ اس کے پاس اپنے عوام کے لئے کافی جگہ نہیں ہے۔ اس لئے اسے نوآبادیوں کی ضرورت ہے۔ جاپان کی کل زمین کے صرف ۱۶ فی صدی حصے میں کاشت ہوتی ہے۔ باقی ساری زمین جنگلوں اور پہاڑوں سے گھری پڑی ہے۔ اور وہ بہت کم کاشت کے لئے قابلِ استعمال ہے۔ اس لئے جاپان کا گذارہ زیادہ تر تجارت و صنعت پر تھا۔ جاپان ایشیا کے ہمسائے ممالک سے خوراک اور کچا مال خریدتا تھا اور اپنے کارخانوں میں اس سے سامان طیار کر کے غیر ممالک میں بھیجتا اور اس طرح خریدے ہوئے مال کی قیمت ادا کرتا تھا۔

انگلینڈ کی طرح اپنی خوراک کے لئے وہ دوسروں کا محتاج ہے۔ اس کے علاوہ اپنی کپڑے کی ملوں کے لئے اسے روئی اور دیگر صنعتوں کے لئے بھی کوئلہ، لوہا، پیتل وغیرہ باہر سے منگوانا پڑتا ہے۔ اس کے پاس کافی نمک بھی نہیں جس کی وجہ سے دوائیں وغیرہ طیار کرنے میں اُسے مشکل پیش آتی ہے۔ ایلومینیم کے لئے بکسائٹ نہیں۔ کاغذ بنانے کے لئے کافی مقدار میں اچھی لکڑی نہیں۔ زراعت کے لئے کھاد نہیں۔ یہ سب چیزیں پہلے بھی اُسے باہر ہی سے منگوانا پڑتی تھیں۔

جب جاپان نے اپنی مملکت بڑھانے کا کام ہاتھ میں لیا تو اس کی یہی اسکیم تھی کہ ایشیا کے دیشوں کی پیداوار یعنی کچا مال اس کے ہاتھ آ جانے سے ایک ایسا اقتصادی ڈھانچہ کھڑا ہو جائے گا جس کے مطابق وہ اپنی ہی مملکت سے کچا مال لے کر اس کے عوض طیار شدہ چیزیں دیگا اور اس طرح اقتصادی نقطۂ نظر سے ایک ایسا علاقہ اس کے اثر میں آ جائے گا جس سے وہ اپنی ضروریات خود پیدا کرنے کا کفیل

ہوجائے گا لیکن اپنی سلطنت کو وسیع کرتے کرتے وہ نہ صرف اپنی منڈیاں کھو بیٹھا بلکہ جن مقامات سے وہ کچا مال خریدتا تھا وہاں سے بھی اب کچھ مال حاصل نہیں ہو سکا ہے۔ جاپان کا کپڑا بھارت اور امریکہ کے ملکوں کو جاتا تھا لیکن اُن دیشوں نے اب اپنے آپ کو کپڑے کی ضرورت سے بے نیاز کر لیا ہے۔ بھارت کو جاپان کی طرح اب روئی کی ضرورت ہے۔ کپڑے کی نہیں۔ غالباً اِن سے اب اُس کی تجارت بند ہو چکی ہے۔ اور وہ اب براہ راست امریکہ سے تجارت کرتا ہے۔ چین جاپان کو روئی مہیا کرتا تھا مگر وہ کمیونسٹوں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ دراصل چین کا کچا مال ہی جاپان اور امریکہ کی باہمی رقابت کا بڑا کارن تھا۔ کوریا بھی جاپان کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کی حالت بہت کمزور ہے۔ اُن کی پیداوار جنگ اور اُس کے بعد کی مدّت میں بہت گر گئی ہے۔ اس لئے اُن کے پاس اتنا فالتو مال نہیں ہے۔ جو وہ جاپان سے لے کر اُس کی قیمت چکا سکیں۔ خاص طور پر جب کہ آج جاپانی ڈالر کے علاقے میں شامل ہے۔ لوہا جاپان کو شمالی چین سے ملتا تھا۔ جس کی برآمد بند ہو جانے سے جاپان میں لوہے اور فولاد کی صنعت کا مستقبل زیادہ شاندار نہیں رہا۔

لیکن جیسا کہ اُوپر کہا جا چکا ہے۔ امریکہ جاپان کو ایشیا کا کارخانہ بنانا چاہتا ہے۔ جنگ سے قبل جاپان کی تجارت کو تین حصّوں میں بانٹا گیا تھا۔ ایک حصّہ جاپان کی فوجی ضروریات کو پورا کرتا تھا۔ دُوسرا حصّہ اُن ممالک کے لئے مال طیار کرتا تھا۔ جو جاپان کو کچا مال سپلائی کرتے تھے۔ تیسرا حصّہ وُہ سامان طیار کرتا تھا۔ جس کے ذریعے سے جاپان ودیشی کرنسی حاصل کرتا تھا۔ فوجی وِبھاگ کا کام ختم ہو گیا اور مستقبل قریب میں اُس کے شروع ہونے کے کوئی آثار نہیں۔ جاپان کے نئے آئین میں اُس سے یہ اعلان کروا دیا گیا ہے۔ کہ جاپان جنگ کے ذریعے سے کسی جھگڑے کا فیصلہ کرانے اور فوج رکھنے کے حق سے دست بردار ہوتا ہے۔ بقیہ دو صیغہ جات کی تجارتی پوزیشن کا ذکر بھی اُوپر کیا جا چکا ہے۔ ایسی حالت میں نہ صرف بے کاری بڑھ رہی ہے۔ بلکہ قیمتوں کے بڑھ جانے کے کارن زندگی کے روزمرّہ کے اخراجات بھی زیادہ ہو گئے ہیں۔ کرنسی کے پھیلاؤ کا مسئلہ بھی پیچیدہ ہو گیا ہے۔ جنگ کے خاتمے پر جہاں کرنسی کی تعداد ۳۰ بلین میں جاپانی سکہ (ین) تھی۔ وہاں ۱۹۴۸ء کے آخر میں یہ تعداد ۳۵۰ بلین ین تک جا پہنچی۔ شہروں اور دیہات میں چور بازاری خوب زوروں پر تھی۔ حکومت بے بس تھی۔ اُس کے کئے کچھ نہ ہوتا تھا۔ کھیتی باڑی اور تجارت سے لوگوں کی مانگ پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اِس پر بھی نئی مشینیں لگانے کے بدلے کئی اچھے اچھے کارخانوں کی پُرانی مشینیں اُکھاڑی جا رہی تھیں۔ شہروں میں راشن تھا لیکن سرکار کسانوں سے کافی مقدار میں راشن اکٹھا نہ کر سکتی تھی۔ اناج جمع کرنے کا انتظام نہایت ناقص تھا۔ اس لئے لوگوں کو راشن دینے کی ذمہ داری پوری نہیں ہو رہی تھی۔

امریکن گورنمنٹ نے آغاز میں یہ ذمّہ داری تو لی کہ جاپان کو خوراک باہر سے لا کر دی جائے۔ لیکن کچا مال نہ ملنے سے کارخانے بند کرنے پڑے۔ کام نہ ملنے سے لوگوں میں کام کرنے کی شکتی کم ہو رہی تھی۔ جنگ کے بعد سے ۱۹۴۸ء تک امریکہ نے کم و بیش ۰۰ کروڑ ڈالر کی خوراک اور دوسرا مال باہر سے لا کر جاپان کو دیا لیکن یہ بالکل ناکافی تھا۔ جنگ کے آخر میں کچّے مال کے جتنے ذخیرے جاپان کے پاس تھے۔ وُہ سب چور بازار میں چلے گئے۔ ۱۹۴۸ء کے آخر تک جاپان کی پیداوار ۳۶-۱۹۳۰ء کی پیداوار کے پچپن فی صدی سے زیادہ نہ تھی۔ جنگ کے فوراً بعد تو وہ صرف ۳ فی صدی رہ گئی تھی۔

شمالی چین پر کمیونسٹوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد امریکہ کی آنکھیں کھلیں۔ اب تک وہ جاپان کو ایک سابق رقیب کی نظر سے دیکھتا رہا تھا اور اُس کی سب کوششیں اِس غرض کے پیش نظر تھیں کہ جاپان مستقبل میں اُس کے لئے خطرہ ثابت نہ ہو اور نہ وہ چین اور جنوب مشرقی ایشیا میں امریکہ کے ساتھ صنعتی، تجارتی اور اُس کے بعد فوجی مقابلے کے لئے میدان میں آسکے۔ امریکہ کو یہ خواہش تھا کہ چین میں کومنگ تانگ کی پارٹی اُس کی سہایتا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اور چین میں جب تک اُس کا اثر ہے۔ اٹلانٹک کے رستے میں اُس کی پوزیشن محفوظ ہے۔ چین کے ہاتھ سے نکل جانے پر اب وہ جاپان میں ہی اپنی پوزیشن کو مضبوط بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ جاپان کے متعلق اُس کی پالیسی میں ایک دم تبدیلی آگئی ہے۔ کارخانوں سے مشینوں کا اُکھاڑنا بند کر دیا گیا اور وہاں کی صنعتوں کو حوصلہ افزائی کر کے جاپان کو جتنے جلد ممکن ہو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔ جاپان کو ایشیا کا اقتصادی سہارا بنانے کا جو خواب شہنشاہیت پسندوں نے ایک وقت دیکھا تھا وہ اب امریکہ کو عملی طور پر دکھائی دے رہا ہے۔ جس

طرح مغربی جرمنی کو پھر سے تمام ساز و سامان سے لیس کر کے جلدی اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کا جتن ہو رہا ہے۔ تاکہ وہ کمیونزم اور مغربی طاقتوں کے درمیان دیوار کا کام دے سکے۔ اسی طرح مشرق میں جاپان کو کمیونزم کے خلاف ڈھال کے طور پر استعمال کرنے کا خیال کیا جا رہا ہے۔

۱۹۴۷ء کے لئے امریکن کانگرس نے خاص رقم دینی منظور کی۔ جس سے جاپان کو ضروری سامان پہنچایا جائے۔ خوراک کے علاوہ کپڑے کی صنعت کے لئے ضروری اشیاء۔ تیل، کوئلہ اور دوائیاں اُسے لا کر دی گئیں۔ ان سب کی قیمت چکانے کے لئے ضروری تھا کہ جاپان کی تجارت درآمد بڑھائی جائے اور یہ تبھی ممکن تھا جب ملک میں مختلف چیزوں کے استعمال پر پابندی لگا دی جائے۔ حکومت جاپان جب بار بار کہنے پر بھی اس بات کو عمل میں نہ لا سکی تو اتحادی کمانڈر انچیف نے یہ محکمہ جاپانی گورنمنٹ سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ خود احکام جاری کئے اور اس سکیم کے تحت خرچ کم کئے گئے۔ ٹیکس اکٹھا کرنے کے لئے قوانین میں تبدیلی کی گئی اور ٹیکسوں سے آمدنی بڑھائی گئی۔ جو لوگ ٹیکس سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ انہیں سخت سزائیں دی گئیں۔ نئی نئی اسکیمیں عمل میں لائی گئیں۔ قیمتوں پر کنٹرول رکھنے کے لئے تنخواہوں میں اضافہ کرنے پر پابندی لگائی گئی۔ اناج اکٹھا کرنے کے انتظامات کو بھی سخت کیا گیا ۱۹۴۹ء کی پہلی ششماہی میں ایک خاص کمیشن مقرر کیا گیا جس کا مقصد آرتھک معاملات میں حکومت کو مشورہ دینا تھا۔ کرنسی کی قیمت مقرر کرنے کے لئے اپریل ۱۹۴۹ء میں ڈالر کی قیمت ۳۶۰ ین مقرر کی گئی۔ اس سال پہلی بار بجٹ متوازن ہو سکا کرنسی کے تناسب کا پھیلاؤ حصہ کم ہو گیا قیمتیں بھی کچھ گھٹ گئیں۔

ان سب باتوں کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ اپریل ۱۹۴۹ء میں صنعتی پیداوار ۳۲-۱۹۳۰ء کی پیداوار کا ۷۲ فی صدی ہو گئی۔ کوئلہ اب ۳۲ لاکھ ٹن ماہوار پیدا ہو رہا ہے۔ جو ۱۹۴۶ء میں صرف ۱۷ لاکھ ٹن پیدا ہوتا تھا۔ فولاد ۲۳۵۰۰۰ ٹن ماہوار پیدا ہونے لگا ہے۔ جو ۱۹۴۶ء میں ۴۴۰۰۰ ٹن پیدا ہوتا تھا۔ سوتی دھاگے کی پیداوار ۱۹۴۶ء میں ایک کروڑ پونڈ تھی۔ اب ۱۹۴۹ء میں تین کروڑ پونڈ ماہوار ہے۔ بجلی کی پیداوار بھی بڑھی ہے۔ جاپان کی تجارت درآمد میں بھی اضافہ ہوا ہے ۱۹۴۶ء میں برآمد صرف ۱۰ کروڑ ڈالر تھی۔ ۱۹۴۸ء میں ساڑھے ستر کروڑ ۱۹۴۹ء میں ۵۸ کروڑ اور ۱۹۴۹ء کی پہلی ششماہی میں وہ ۱۹۴۶ء کی ساری درآمد سے بڑھ گئی ہے۔

لیکن جاپان اس اقتصادی ترقی کے لئے پورے طور پر امریکہ کا محتاج ہے۔ امریکہ ہر سال زیادہ سے زیادہ روپیہ اس پر خرچ کر رہا ہے۔ ۳۰ جون ۱۹۴۶ء تک امریکہ نے جاپان کو ۹ کروڑ ۴۰ لاکھ ڈالر کی مدد دی ۱۹۴۷ء میں ۴۰ کروڑ ۲۰ لاکھ اور ۱۹۴۸ء میں ۴۲ کروڑ ۳۰ لاکھ ڈالر کی۔

یہ ساری رقم جاپان کو واپس کرنی ہے۔ جاپان پر فوجی قبضہ رکھنے کے لئے جو خرچ امریکہ کر رہا ہے۔ اُس کا ادا کرنا بھی جاپان ہی کے ذمے ہوگا۔ یہ خرچ ہر برس قریباً دس کروڑ ڈالر آتا ہے۔ جو امداد دی جا رہی ہے۔ اُس میں امریکہ سے آیا ہوا خوراک کا سامان۔ روئی اور دوسرا کچا مال ہے۔ قدرتی طور پر امریکہ کی قیمتیں ڈالر میں ہونے کی وجہ سے زیادہ ہیں۔ جاپان کا مال امریکہ کو نہیں بلکہ دوسرے ممالک کو جاتا ہے جہاں سے ڈالر نہیں ملتے۔ امریکہ میں اس درآمد کا صرف ۲۵ فی صدی حصہ جاتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ جاپان پر روز بروز قرضے کا بوجھ تو بڑھ رہا ہے۔ لیکن قرضہ چکانے کی طاقت نہیں بڑھ رہی۔

جاپان کی اس اقتصادی حالت کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے۔ کہ وہ خوراک اور کچے مال کے لئے پورے طور پر امریکہ کا محتاج ہے اپنے ہمسائے ممالک سے اُس وقت تک اُس کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا جب تک اُس پر امریکہ قابض ہے۔ چین اور شمالی کوریا کے دروازے کمیونسٹ اثر کی وجہ سے اُس پر بند ہیں۔ نہ امریکہ اُن دیشوں کے ساتھ جاپان کو تعلق بڑھانے کی اجازت دے گا۔ اور نہ روس اُن قوموں کو امریکہ کے اشارے پر ناچنے والے ملک کے ساتھ ملنے کی چھٹی دے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ جب جاپان امریکہ سے مہنگی خوراک اور مہنگا کچا مال خریدے گا تو قدرتی طور پر اُس کے طیار شدہ مال کی قیمتیں بھی مہنگی ہوں گی۔ اس طرح وہ اپنے مزدوروں کو بھوکا مارنے والی اجرتوں پر رکھے گا اور اُن کے معیار زندگی کو بہت گھٹیا بنا دے گا لیکن ایشیا کا آج بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کیا محنت کرنے والی جنتا کے معیار زندگی کو پست رکھ کر کوئی ملک کمیونزم سے بچ سکتا ہے۔

اناج جاپان کو دینے کے لئے منچوریا کے پاس فالتو اناج ہے۔ یہ اناج پہلے بھی جاپان کے ہی کام آتا تھا۔ چین کے پاس کافی روئی ہے۔ سویابین بہت بڑی مقدار میں چین کے پاس پڑی ہے۔ جو خوراک کے علاوہ تیل چارے اور کھاد کے لئے بہت مفید ہے۔ چین کے شمال مشرقی علاقے میں لوہے اور کوئلے کی کانیں بکثرت ہیں۔ ابھی ان سارے ذخیروں کو استعمال کرنے کی چین میں شکتی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ قدرتی اقتصادی تعلقات کب تک قائم رہیں گے۔ اور اگر انہیں ٹوٹا رہنے دیا جائے تو کیا جاپان کا آرتھک ڈھانچہ صرف امریکہ کی امداد کے سہارے کھڑا کیا جا سکے گا اور اگر ایسا ہوگا تو کیا جاپان کو امریکہ کی دائمی سیاسی اور اقتصادی غلامی قبول کرنی ہوگی۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ جب جاپان کے سیاست دان اس قابل ہوں گے کہ وہ اپنے دیش کی قسمت کا فیصلہ خود کر سکیں گے تب وہ اس سوال پر کس نظر سے غور کریں گے۔ اور تب وہ اپنے آرتھک اور راج نیتک مستقبل سے متعلق کیا رائے قائم کریں گے ایک بات تو صاف ہے کہ ڈنڈے کے زور سے کسی قوم کی وفاداری کو نہیں جیتا جا سکتا جاپان کے ساتھ ابھی اتحادی قوموں کا مستقل عہد نامہ نہیں ہوا۔ اس سوال کا اب تک فیصلہ ہو جانا چاہیے تھا لیکن امریکہ اور برطانیہ ابھی تک اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ وہ کس طرح کا سمجھوتہ کریں۔ کولمبو کانفرنس میں جب یہ سوال سامنے آیا تو فیصلہ کیا گیا کہ کامن ویلتھ کے تمام ہائی کمشنر لنڈن میں اکٹھا ہوں اور اس موضوع پر سوچ بچار کرکے اپنی رپورٹ پیش کریں۔ واشنگٹن میں اس سوال پر سول اور فوجی افسروں میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے سول حکام اس سوال کو سیاسی پہلو سے دیکھتے ہیں اور وہ مغرب میں جرمنی کی طرح جاپان کو ایک طاقتور قوم کا روپ دے کر روس کے خلاف قائم شدہ محاذ میں اسے کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ طاقتور جرمنی اور طاقتور جاپان روس کو دو طرف میں لڑنے پر مجبور کر سکیں گے۔ جاپان کے فوجی و ہوائی اڈے بھی امریکہ کے کام آ سکیں گے۔

امریکہ کے فوجی افسر اس سوال پر دوسرے نقطہ نگاہ سے غور کرتے ہیں۔ کون جانتا ہے جاپان کی جمہوری حکومت پر کب کس پارٹی کا قبضہ ہو جائے مشرقی یورپ خاص کر چیکوسلاوکیہ کی مثال سامنے موجود ہے۔ یونان اور اٹلی بھی ڈانواں ڈول ہیں۔ اگرچہ جاپان میں کمیونسٹوں کا زور بڑھ گیا تو یہ صاف ظاہر ہے کہ شاہی خاندان کے فوجی افسروں اور سرمایہ داروں کی طاقت کمزور ہو جانے کی وجہ سے جاپان کا بایاں بازو اس قدر مضبوط نہیں ہوگا کہ کمیونزم کے پھیلاؤ کو روک سکے ایسی حالت میں جاپان میں امریکہ کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ امریکہ کا فوجی محکمہ جاپان کے فوجی اڈوں کو چھوڑ کر اپنی مکمل حفاظتی اسکیم کو کمزور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ وہ ابھی عہد نامے کو ملتوی ہی رکھنا چاہتا ہے۔ اور کم از کم روسی اڈوں کو امریکن فوج کے قبضے میں ہی رکھنا چاہتا ہے۔ جنرل میکارتھر بھی جاپان سے جلدی ہٹنے کے خواہش مند نظر نہیں آتے۔ لیکن یہ حالت بھی کب تک رہ سکے گی۔ امریکہ کے لوگ زیادہ مدت تک اپنے ٹیکسوں کا باہر کے ممالک میں استعمال برداشت نہیں کر سکتے جو کم از کم ابھی تو کرنا ہی پڑ رہا ہے۔ بعد میں اس کی وصول یابی کی امید ہو تب بھی اس کا بوجھ کوئی کب تک برداشت کرے۔ دوسری طرف جاپان کی جنتا کب تک چپ سادھے رہے گی۔ جبکہ اس کے آس پاس سب طرف سے نہ صرف کمیونزم کا طوفان امڈ رہا ہے بلکہ ایشیا کا کونہ کونہ قومی آزادی کی پکار کو وصلہ مندی سے استقلال کر رہا ہے۔

کے ایل ثاقب

نیشنل فزیکل لیبارٹری

امپیریل ایگریکلچرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے عین قریب، ہل سائیڈ روڈ پر نیشنل فزیکل لیبارٹری کی جاذب نظر اور رنگا رنگ عمارت اگرچہ حال ہی میں پایۂ تکمیل تک پہنچی ہے۔ مگر ارتقائی لحاظ سے ایک مسلسل تاریخ کی آئینہ دار ہے۔

درحقیقت یہ نیشنل فزیکل لیبارٹری اس سلسلے کی دوسری اہم کڑی ہے۔ جس میں ذیل کی گیارہ کڑیاں ہوں گی:-

۱۔ نیشنل کیمیکل لیبارٹری۔ پونا
۲۔ نیشنل فزیکل لیبارٹری ۔ نیو دہلی
۳۔ نیشنل میٹالرجیکل لیبارٹری۔ جمشید پور
۴۔ سنٹرل فوڈ ٹیکنولاجیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ میسور۔
۵۔ سنٹرل فیول ریسرچ انسٹی ٹیوٹ دھنباد۔
۶۔ سنٹرل ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ لکھنو۔
۷۔ سنٹرل گلاس اینڈ سیرےمک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ کلکتہ
۸۔ سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ رڑکی۔
۹۔ سنٹرل لیدر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ مدراس۔
۱۰۔ سنٹرل الیکٹروکیمیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ کرے کوڈی
۱۱۔ سنٹرل روڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ دہلی

ان میں سے پہلی دو لیباریٹریاں تو معرض تعمیر میں آچکی ہیں۔ چند نے دیگر عمارات میں اپنا اپنا کام جاری کر دیا ہے۔ مگر چند ابھی پردۂ ظہور پہ آنے کو بیتاب ہیں۔

تاریخ جنگ عالمگیر اوّل (۱۹۱۸-۱۹۱۴ء) سے پہلے ہندوستان میں صنعتی کھوج اس قدر مقبول نہیں تھی۔ اس وقت یا تو امپیریل کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ۔ زراعتی کھوج میں مصروف تھی یا [illegible] ریسرچ فنڈ، طبی کاموں سے دلچسپی لے رہا تھا۔ ان دو کے علاوہ ملک بھر میں صنعتی کھوج کے کام کی طرف کہیں بھی توجہ نہیں کی جا رہی تھی۔

جنگِ ہذا کے بعد، ۱۹۱۹ء میں، انڈین انڈسٹریل سروسز کمیٹی نے گورنمنٹ کے سامنے کیمیکل سروسز کمیٹی کے قیام کی تجویز پیش کی مگر جب کیمیکل سروسز کمیٹی مقرر کی گئی تو اس کمیٹی نے آل انڈیا کیمیکل سروسز کے تقرر کی سفارش کی۔ جس کا کام ہندوستان بھر کے صوبجات میں سائنس کے کھوج کے کام کو مزید ترقی دینا تھا۔ گورنمنٹ نے، کسی وجہ سے، کمیٹی کی اس سفارش کو تو قبول نہیں کیا، لیکن اس کھوج کی اہمیت کو ضرور تسلیم کر لیا۔ اس موضوع پر اکثر مشاورتی جلسے ہوتے رہے۔ حتےٰ کہ جب ۱۹۲۵ء میں صوبائی گورنمنٹوں سے ایک ریسرچ ایجنسی کے قیام کے متعلق اظہارِ خیال کرنے کو کہا گیا۔ تو اتفاقِ رائے اس اقدام کے حق میں پایا گیا۔ لیکن شومئی قسمت سے بجٹ کی مشکلات رستے میں حائل ہو کر رہ گئیں!

کوئی پانچ چھ سال بعد، یعنی ۱۹۳۴ء میں، انڈسٹریل ریسرچ بیورو اس غرض سے قائم کیا گیا۔ کہ وہ ہندوستان میں صنعتی کھوج کے کام کے لئے ایک مرکزی سنٹر کا کام دے سکے۔ جہاں ہندوستان اور دیگر ممالک کے کھوج کے نتائج بآسانی مہیا ہو سکیں۔ اور اس لائن میں مزید ترقی ہو سکے۔ ایک مرکزی ریسرچ لیبارٹری کی بڑھتی ہوئی اہمیت بہت زیادہ محسوس کی جانے لگی، اور یہ حالت، ۱۹۳۴ء کے کئی سال بعد تک، جاری رہی۔ لیکن کوئی عملی قدم اس جانب اٹھایا نہ جا سکا۔

لیکن جب ستمبر ۱۹۳۹ء میں جنگ عالمگیر ثانی چھڑ گئی تو یکایک یہ محسوس کیا گیا کہ جنگی امداد کی غرض سے، ہندوستان کے لئے صنعتی کھوج کے کاموں میں بیش از بیش حصہ لینا ضروری ہے۔ چنانچہ،

سنہ۱۹۴۰ء میں، انڈسٹریل ریسرچ بیوریو کے کام کو تو معرضِ التوا میں ڈال دیا گیا۔ اور اس کے عوض بورڈ آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ قائم کردیا گیا۔ اس بورڈ کے قیام کا اصلی مقصد گورنمنٹ کو سامانِ جنگ حاصل اور پیدا کرنے کے متعلق مشورے پیش کرنا تھا۔ اس بورڈ کے علاوہ گورنمنٹ نے، سنہ۱۹۴۱ء میں، ایک اور انڈسٹریل ریسرچ یوٹلائیزیشن کمیٹی قائم کردی۔ جس کی غایت متذکرہ بالا بورڈ کے پیدا کردہ مصنوعات کو تجارتی ترقی دینا تھا۔

۱۴ نومبر سنہ۱۹۴۱ء کو لیجسلیٹو اسمبلی نے کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے قیام کی منظوری دے دی۔ اور ساتھ ساتھ دس لاکھ روپیہ سالانہ کی گرانٹ کا بھی وعدہ کیا۔ اس کونسل کا پروگرام بہت طویل اور ہمہ گیر تھا۔

جیسا کہ ظاہر ہے، یہ تمام تحاریک موجودہ نیشنل (قومی) گورنمنٹ کے قیام سے پہلے کی تھیں۔ آزادی کی کروٹ نے کھوج کے حق میں بھی "سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ" کا کام دیا!

اگرچہ سنہ۱۹۴۷ء سے آج تک ملک کے سامنے دیگر کئی زیادہ اہم مسائل درپیش رہے ہیں۔ تاہم یہ امر عین خوشی کا موجب ہے کہ ہمارے رہنماؤں نے اس جانب تمام تر توجہ کی۔ اور اس کا بیّن ثبوت یہ ہے۔ کہ سائنٹیفک ریسرچ کا پورٹ فولیو قلمدانِ آنریبل وزیر اعظم ہندوستان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اور وہ خود بہ نفسِ نفیس کونسل ہذا کے پردھان بھی ہیں۔ اور مسٹر شاما پرشاد مکرجی وزیر صنعت و رسد اس کونسل کے اُپ پردھان ہیں۔

پنڈت جواہر لعل نہرو کی ذاتی رہنمائی میں یہ کھوج کا محکمہ امیدوں سے کہیں زیادہ مفید نتائج برآمد کر رہا ہے۔ اس وقت تک ہندوستان کو محض ایک زراعتی ملک ہی تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ مگر وہ دن دُور نہیں جب ہم صنعتی کھوج اور ترقی کی وجہ سے، اس لحاظ سے بھی، دیگر ممالک کے شانہ بشانہ کھڑے ہو سکیں۔

نظام! کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ۔ رجسٹریشن آف سوسائٹیز ایکٹ (۲۱) آف سنہ۱۸۶۰ء کے ماتحت رجسٹر شدہ جماعت ہے۔ اور اس کے اکثر خرچہ جات کا کفیل سرکاری بجٹ ہے۔ کونسل ہذا کا کاروبار (۱) بورڈ آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ اور (۲) انڈسٹریل لائیزان کمیٹی (جو انڈسٹریل ریسرچ یوٹلائیزیشن کمیٹی کی جگہ قائم کی گئی ہے)، کے مشوروں سے سرانجام پاتا ہے۔

(۱) بورڈ آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ ۲۳ ممبروں پر مشتمل ہے۔ بورڈ ہذا کے صدر بھارت تنتر (انڈین ری پبلک) کے وزیر اعظم ہیں۔ اور وزیر صنعت و رسد بحیثیت عہدہ اس کے نائب صدر ہیں۔ دیگر ممبروں میں سے ۹ تو ملک کے معتقد سائنسدان۔ ۶ اہم سرکاری افسران متعلقہ صنعتی کھوج، اور باقی ۶ ہندوستانی مشہور صنعتوں کے ناخدا ہیں۔

(۲) انڈسٹریل لائیزان کمیٹی کے ۱۶ ممبران ہیں۔ اس کے پردھان وزیر صنعت و رسد ہیں۔

ان ہر دو کمیٹیوں کا عینی مقصد کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے انتظام میں امداد دینا اور رائے پیش کرنا ہے۔ جس سے ملک میں کھوج کا کام بحسن وخوبی جاری رہ سکے۔

ایٹم (پرمانو شکتی) بورڈ آف ریسرچ۔ جنوری سنہ۱۹۴۶ء میں قائم کیا گیا تھا۔ جس کا مقصد پرمانو شکتی کی کھوج وغیرہ کرنا ہے۔ جنوبی ہندوستان میں کچھ اس قسم کے سامان برآمد ہوئے ہیں۔ جو پرمانو شکتی کی تخلیق میں ممد ثابت ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ معلوم ہوا ہے۔ کہ آئندہ سال تک، ہمارے ملک میں، بورڈ ہذا کی کھوج کے اثمار بطور احسن نظر آنے لگیں گے۔

بورڈ آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے پروگرام کی تکمیل چند چھوٹی چھوٹی ریسرچ کمیٹیوں کی معرفت ہوتی رہتی ہے ان کمیٹیوں کے ممبران خاص خاص شعبوں میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اور اپنے قیمتی مشوروں سے بورڈ کی رہنمائی بھی کرتے رہتے ہیں ان کمیٹیوں کے سامنے اپنے مخصوص پروگرام بھی رہتے ہیں۔ ان کمیٹیوں کی تعداد ۴۲ ہے۔ ہر ایک کمیٹی اپنی اپنی مخصوص لائن میں اپنے کمالات پیش کرتی رہتی ہے تیل، چمڑہ، دھاتیں، شیشہ، بجلی، ایندھن، پلاسٹک، معدنیات، بناسپتی، عمارتی سامان، ریڈیو، اوزان،

ادویات، رنگ، روغن وغیرہ وغیرہ کے متعلق کھوج، جس کے باعث ان تمام اشیاء کی پیداوار میں ترقی اور تبدیلی ہو سکے اور ملک کی صنعت و دولت میں اضافہ ہو سکے، ان کمیٹیوں کے کل پروگرام میں شامل ہے۔

کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے تحت تمام قسم کی کھوج کا اہتمام لیباریٹریوں میں ہی ہوتا ہے۔ ۱۹۴۲ء میں کونسل کے قیام کے وقت ۱۹۴۲ء کی تمام سرکاری لیباریٹریاں کونسل ہذا کے ڈائرکٹر کے تحت تبدیل کر دی گئیں۔ لیکن جنگ جاپان کے باعث، ہوائی حملوں کے احتمال سے، ان سب کو دہلی میں منتقل کرنا پڑا۔ جو کچھ مدت تک، دہلی یونیورسٹی کی لیباریٹریوں کے ساتھ مل کر کام کرتی رہیں۔

ان لیباریٹریوں کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) کیمیکل۔ (۲) فزیکل۔

جو ایک ہی ڈائرکٹر کے تحت کام کرتی ہیں۔ البتہ ہر ایک لیباریٹری کا ایک کارکن ایکٹنگ ڈائرکٹر علیحدہ ہوتا ہے۔ جو کونسل کے ڈائرکٹر کا ہاتھ بٹاتا رہتا ہے۔

ماہنامہ کونسل ہذا ہر مہینے اپنا ایک ماہنامہ شائع کرتی ہے جس میں سائنٹیفک ریسرچ کے متعلق کار آمد معلومات پیش کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ صنعتی اصطلاحات کے متعلق ایک لغات بھی زیر ترتیب ہیں۔ ان ہر دو صحافتی شعبوں کا کام ایک مختلف بورڈ سے متعلق ہے۔

ستمبر ۱۹۴۲ء میں ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر نے (جو کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے ڈائرکٹر۔ اور محکمہ کھوج کی روح رواں ہیں) سنٹرل ریسرچ لیباریٹری کے قیام کی تجویز گورنمنٹ کے سامنے پیش کی یہ لیباریٹری بالآخر دو حصوں (کیمیکل اور فزیکل) میں تقسیم ہو سکتی تھی۔ ۱۹۴۳ء میں یہ کام پلاننگ کمیٹی کے سپرد ہوا جس نے اپنا کام ۱۹۴۴ء میں ختم کر لیا۔ اس کی رپورٹ ۱۹۴۶ء میں شائع ہو گئی۔

چنانچہ:-

(۱) نیشنل کیمیکل لیباریٹری۔ پونا کا سنگ بنیاد ۶ اپریل ۱۹۴۷ء کو مسٹر کھیر وزیر اعظم بمبئی نے رکھا۔ اور پوجیہ راجا جی نے رسم ہذا کی صدارت فرمائی۔

مسعود حسین (ٹھاکر)

غزل

ہم نے تو آرزو کو بھی بے مدعا کیا
یعنی کہ دل کے درد کو حسن نوا کیا

اے کاش تیرا حسن ہی اصل حیات ہو
تیری نظر سے ہم نے حقیقت کو وا کیا

پھر بازگشت کی کوئی صورت نکل سکے
یوں تو ترے بغیر بھی یہ دل جیا کیا

اس رہ گزر سے اب نہ گزرے گا اے ندیم
مجھ میں نے کہہ دیا تھا مگر اس نے کیا کیا

میں اس سے سرخوشی میں وہی بات کہہ گیا
کتنا برا کیا ارے! کتنا برا کیا

کیا کیا جتن کئے نہ محبت میں اے ندیم
کیا پوچھتے ہو کیا نہ کیا اور کیا کیا

مسعود تم کو موت نہ آئے گی عشق میں
قرض حیات اس لئے تم نے سوا ادا کیا

ٹاٹا آرگنائزیشن نے اس موقعہ پر ۸۰۳۰۰۰ روپیہ اور گورنمنٹ آف انڈیا نے پچیس لاکھ روپیہ، عمارت فنڈ کے واسطے کونسل ہذا کے حوالے کیا۔ عمارت کا کام فروری ۱۹۴۸ء میں شروع ہوا۔

مارچ ۱۹۴۹ء میں، نامکمل عمارت میں، کھوج کا کام شروع کر دیا گیا۔ ۳ جنوری ۱۹۵۰ء کو پنڈت جواہر لال نہرو نے اس لیباریٹری کا افتتاح کیا۔

(۲) نیشنل فزیکل لیباریٹری دہلی، کا سنگ بنیاد پنڈت جواہر لال نہرو نے، ۴ جنوری ۱۹۴۷ء کو اپنے ہاتھ سے رکھا۔

اس کی تعمیر کا کام فروری ۱۹۴۸ء میں شروع ہوا۔

۲۱ جنوری ۱۹۵۰ء کو سردار ولبھ بھائی پٹیل نے رسم افتتاح فرمائی جس کی صدارت شری راجا جی نے فرمائی۔

اے کمار

ایک ماہر سنگتراش

قومی نقطۂ نگاہ سے آرٹ کے متعلق اصلیت کی تحقیق کے باب میں جو بھی تحریک جاری ہوئی، ہندوستان اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا۔ اگرچہ اس لامتناہی تحقیق کے حق میں سب سے زبردست آواز مصنفین اور مصوّرین کی طرف سے بلند کی گئی لیکن سنگتراش حضرات نے بھی اس فن کے ارتقا کے لئے اپنے مخصوص طریقوں سے کافی جدوجہد کی ہے۔

یہ امر بحث طلب ہے کہ شعر و شاعری کی طرح سنگتراشی بھی قدرت کا ایک عطیہ ہے یا اسے سیکھا جا سکتا ہے لیکن اُترپردیش کے چیف سیکرٹری شری بھگوان سہائے آئی سی ایس نے سنگ مرمر اور چکنی مٹی کے مجسمے بنا کر اس امر کا ثبوت بہم پہنچا دیا ہے کہ مجسمہ سازی ایک ایسا ہنر ہے۔ جس کو سیکھنے کے لئے اگرچہ ہمت، صبر و استقلال کی ضرورت ہے لیکن مشق کرنے سے ہر شخص اس کام میں مہارت حاصل کر سکتا ہے۔ شری بھگوان سہائے یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ وُہ اس فن کے ماہر ہیں۔ بلکہ اُنہوں نے تو نہایت انکسار کے ساتھ یہ امر واضح کیا ہے کہ غیر ارادی طور پر محض عقیدت کے جذبے سے متاثر ہو کر اُنہوں نے راشٹرپتا کے مجسمے کو بنانا شروع کیا تھا اور جب یہ مجسمہ بن کر تیار ہو گیا تو حیران کن طور پر وہ ایک اچھے سے اچھے فن کار کے بنائے ہوئے مجسمے کا مقابلہ کر سکتا تھا شری سہائے کی یہ کوشش ایک وجدانہ کیفیت کا حامل ہونے کے علاوہ استقلال پسندی کا پہلو بھی لئے ہوئے ہے

بالکل اس قسم کا نقطۂ نگاہ غیر محدود ہے اور شاعرانہ تخیل کے مطابق ایک فن کار اتنی بلندی تک پہنچ جاتا ہے کہ اُسے پتھر میں بھی اصلیت کا عکس نظر آتا ہے۔ مہاتما گاندھی کے مجسمے میں معصومیت کی وہی جھلک صاف طور پر عیاں ہے جو پرارتھنا سبھا میں نظر آتی تھی چنانچہ اس بات کی تصدیق وہ لاکھوں اشخاص کریں گے جنہیں گاندھی جی کی پرارتھنا سبھا میں شامل ہونے کا فخر حاصل ہوا ہے۔

شری بھگوان سہائے کے کہنے کے مطابق ایک زبردست احساس فلسفیانہ منطق سے پیدا نہیں کیا جا سکتا بلکہ انسانی زندگی کے وسیع تجربے، اس کے غم زدہ اور دردناک واقعات، اخلاق کی بلندی اور پاکیزگی کے اچھے جذبات کو مجسمے کی صورت ہی میں سجایا جاتا ہے اور یہی تو بہترین کہا جا سکتا ہے۔ بنی نوع انسان کی تاریک اور اچھے اخلاق کی حالت اور رذالت اور جہالت و تشدد کے جذبات کے مابین انفرادی اور مجموعی طور پر ایک مسلسل جدوجہد ہے کیونکہ انسانیت سے الگ کر کے سہائی نہیں اس لئے ایک فن کار انسان کے جذبۂ انسانی کو مکمل طور پر خوبصورت سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ مستقل طور پر انسانوں کی مختلف نسلوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہو۔

جو لوگ ہندوستان میں مجسمہ سازی کے زوال کے متعلق افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ یقیناً شری بھگوان سہائے کے اس شاہکار کو دیکھ کر اپنی رائے بدلنے پر مجبور ہوں گے جنہوں نے بھارتی مجسمہ سازی کے لازوال کمال کو عملی شکل دے کر اس کی قدیم فضیلت کو وقت کے تھپیڑوں سے بچا کر محفوظ کر دیا ہے۔

نئی کتابیں اور رسالے

کتابیں

جامِ نو۔ حضرت اختر اکبر آبادی کی تضمینوں کا مجموعہ۔ پبلشر ادارہ نفسیات پوسٹ بکس نمبر ۵۴۴ کراچی۔

تضمین ایک مشکل فن ہے۔ صرف اسلوب اور اندازِ بیان کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ فکر و تخیل کے اعتبار سے بھی تضمین کرنے والے شاعر کو اس شاعر کے ساتھ پرواز کرنا پڑتی ہے۔ جس کے کلام پر تضمین کی جا رہی ہو۔ اگر دس شعرا کی غزلوں پر تضمین کرنا مقصود ہو تو دس مختلف انداز سے اسالیب اختیار کرنا پڑیں گے۔ محض لفظی داؤ پیچ سے تضمین کے معاملے میں کام چلا لینا ممکن نہیں۔ اور جامِ نو کا اوّل سے آخر تک مطالعہ کرنے کے بعد ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت اختر انصاری اکبر آبادی اس مشکل فن یا نہایت مشکل سے بہت کامیابی کے ساتھ عہدہ بر آ ہوئے ہیں۔

جہاں تضمین زیرِ بحث ہو وہاں اس نظم یا غزل پر بحث کرنا جس پر تضمین کی گئی ہو غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ اس میں تو صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ تضمین کرنے والا شاعر اس فن میں کس طرح کامیاب ہوا ہے۔ اور ہم نے دیکھا ہے۔ کہ حضرت اختر نے جوش۔ جگر۔ اقبال۔ حسرت اور حفیظ کی نظموں اور غزلوں کی تضمین کرتے ہوئے بڑی کامیابی سے انہیں شعرا کا اسلوب اختیار کیا ہے اور نہایت برجستہ اور بے ساختہ مصرعے لگائے ہیں۔ اختر کے مصرعے کہیں بھی اکھڑے اکھڑے نظر نہیں آتے اور اندازِ بیان کی شگفتگی کہیں مجروح نہیں ہوئی بلکہ اسلوب۔ مطالب اور ربطِ کلام پر نظر رکھتے ہوئے نہایت بے تکلفانہ انداز سے پیوند لگائے ہیں اور یہ تضمین کی بہت بڑی خوبی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

کانٹے۔ یہ جناب جگناداس اختر ایڈیٹر "تیج" کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اختر صاحب ہمارے ملک کے ان مشہور ترین اخبار نویسوں میں سے ہیں۔ جو جرنلزم کو محض ایک پیشہ نہیں بلکہ ایک مشن سمجھتے ہیں۔ آپ کے افسانوں کا یہ مجموعہ جو آپ نے شیخ محمد عبداللہ وزیر اعظم جموں و کشمیر کے نام پر معنون کیا ہے۔ اصلاحی افسانوں پر مشتمل ہے۔ تقریباً ہر افسانے میں سماج کے کسی نہ کسی مرض کی تشخیص اور اس کا علاج موجود ہے۔ اور موجودہ حالات میں یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ ہمارا سماج ایسے افادی انسانوں کی ضرورت کس شدّت سے محسوس کر رہا ہے۔

دیباچہ بال کرشن مضطر نے لکھا ہے جس میں انہوں نے اختر کی افسانہ نگاری کا سیر حاصل تجزیہ کیا ہے۔ کتاب مجلد ہے ضخامت ایک سو ساٹھ صفحات قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ناشر الائیڈ پبلشرز موری گیٹ دہلی۔

اہم معلومات۔ مرتب غوث انصاری ناشر ادارہ پبلشرز فرنگی محل لکھنؤ۔ یہ کتاب تاریخی۔ جغرافیائی اور سیاسی معلومات پر مشتمل ہے اور بقول سید احتشام حسین "یہ کتاب نہ صرف ابتدائی درجے کے طلبا کے لئے مفید ہوگی بلکہ عام معلومات سے دلچسپی رکھنے والے شہری بھی اس سے فائدہ اٹھائیں گے"۔

رسالے

بانو قرآن نمبر مرتبہ زینب ، انور۔ قیمت چار روپے ملنے کا پتہ۔ ماہنامہ "بانو" دہلی۔

بانو دہلی کا ایک مشہور رسالہ ہے۔ زیرِ نظر شمارہ اس کا قرآن نمبر ہے۔ جو ۴۰۸ صفحات پر شائع ہوا ہے لکھنے والوں میں متعدد نامور فن کاروں کے نام نظر آتے ہیں۔ اس ضخامت اور مواد کے پیش نظر قیمت کچھ زیادہ نہیں۔ مذہب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی اور افادیت سے خالی نہ ہوگا۔

موصولات۔ آستانہ (ماہانہ) دہلی۔ ایوان (ماہانہ) حیدرآباد دکن
کامیاب (ماہانہ) لاہور۔ پنچایت (ہفتہ وار) جالندھر

رفتارِ زمانہ

بھارت کے نائب وزیر اعظم مسٹر سردار ولبھ بھائی پٹیل نے کلکتہ میں کانگریسیوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بھارت سرکار نے یہ پکا ارادہ کر لیا ہے کہ نہرو لیاقت سمجھوتے کو پوری طرح کامیاب بنایا جائے۔ آپ نے تمام کانگریسیوں سے اپیل کی کہ وہ اس باب میں اپنی حکومت سے ہر ممکن طریقے سے تعاون کریں۔ ہمیں اس بات کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے کہ پاکستان اس پیکٹ پر عمل کرتا ہے یا نہیں ہمیں تو اپنے فرض کو تن دہی سے انجام دینا چاہیئے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے اس سلسلے میں وہ بھی اتنا ہی مخلص ہے جتنی کہ بھارت سرکار۔

بھارت اور پاکستان کے لیڈروں اور اخبارات کی طرف سے نہرو لیاقت سمجھوتے کی تائید و حمایت اور دونوں ممالک کی جنتا میں تعاون کی سپرٹ کا فوری ردِ عمل یہ ہوا ہے کہ مشرقی بنگال اور مغربی بنگال ہی نہیں بلکہ بھارت اور پاکستان بھر کی اقلیتوں میں بھروسے بھروسے اور اعتماد کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے اس کا تازہ ثبوت یہ ہے کہ دونوں دیشوں سے اقلیتوں کی آمد و رفت میں نمایاں کمی واقع ہو گئی ہے۔ کلکتہ سے جو سپیشل گاڑیاں مسلمانوں کو مشرقی بنگال لے جانے کے لئے مہیا کی تھیں وہ منسوخ کر دی گئی ہیں کیونکہ مغربی بنگال کے مسلمانوں نے پاکستان جانے کے عوض اپنے گھروں کو واپس جانا شروع کر دیا ہے۔ اسی طرح گوہاٹی سے بھی اطلاع موصول ہوئی ہے کہ آسام سے مسلمانوں کا نکاس بالکل بند ہو گیا ہے۔ اُدھر مشرقی بنگال سے بھی اسی طرح کی امید افزا خبریں موصول ہو رہی ہیں۔ اور پنڈت نہرو نے ۹ اپریل ۱۹۵۰ء کو بھارت پارلیمنٹ میں تالیوں کے درمیان یہ اعلان کیا ہے کہ مشرقی پاکستان سے ہر روز مغربی بنگال میں آنے والے ہندوؤں کی تعداد بیس ہزار سے کم ہو کر نو دس ہزار رہ گئی ہے اس سے صاف عیاں ہے کہ گیارہ دنوں کے اندر ہی اندر ہمارے سمجھوتے کا نہایت تسلی بخش نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ دونوں ممالک کے سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ سمجھوتے کی یہ ابتدا نہایت خوشگوار ہے اور اس نیک فال کا اثر بھارت اور پاکستان کے دوسرے متنازعہ مسائل پر بھی خوشگوار پڑے گا۔

آل جموں کشمیر نیشنل کانفرنس کے خاص اجلاس میں ۴۰ ڈیلی گیٹوں کی موجودگی میں ریاست کے وزیر مالیات پنڈت گردھاری لال نے ۱۹۵۰ء کے لئے ریاست کا بجٹ پیش کرتے ہوئے آمدنی کا تخمینہ ...۴۲۴۴۳۳ اور خرچ کا تخمینہ ...۴۲۹۸ بتایا۔ اس طرح کل گھاٹا ...۴۹۵ کا رہے گا۔ وزیر موصوف نے نعرہ ہائے تحسین کے درمیان اعلان کیا کہ جب سے کشمیر میں قومی حکومت کا قیام عمل میں آیا ہے ریاست کے میزانیے میں گھاٹے کی رقم بتدریج کم ہوتی جا رہی ہے اور یہ ایک کروڑ تینتیس لاکھ سے کم ہو کر پانچ لاکھ رہ گئی ہے۔ آپ نے یہ بھی اعلان کیا کہ گھاٹے کو پورا کرنے کے لئے کوئی نیا ٹیکس عائد نہیں کیا جائے گا۔ اسی اجلاس میں ہوم منسٹر مسٹر غلام محمد بخشی نے اعلان کیا کہ ریاست میں ضروری اشیائے زندگی کی کوئی کمی نہیں ہے۔ بخشی صاحب نے کہا اس وقت حکومت کے پاس ۵۰ لاکھ گز فالتو کپڑا موجود ہے۔ کانفرنس میں ایک قرارداد بھی منظور کی گئی جس میں اس امر کا اعادہ کیا گیا کہ کشمیر کے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق ریاست جموں و کشمیر کے چالیس لاکھ باشندوں کے علاوہ کسی اور شخص یا جماعت کو حاصل نہیں۔

اجمیر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ شریف کی زیارت کرنے کے لئے ایک سو سے زائد مسلمانوں کا جتھہ پاکستان سے اجمیر شریف پہنچ گیا ہے۔ اس قافلے میں پاکستان کے تمام حصوں کے زائرین شامل ہیں۔ زائرین کے آرام اور ان کی خاطر و مدارت میں بھارت سرکار اور پبلک نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ زائرین نے اپنے آپ کو ایک ایسی فضا میں پایا جو فرقہ وارانہ آلودگی سے قطعاً پاک تھی۔

بھارت کے مختلف صوبوں میں زراعتی پیداوار کو ترقی دینے کا کام خوب سرگرمی سے جاری ہے۔ بھارت سرکار نے رُوئی کی پیداوار کو بڑھانے کے لئے جو اسکیم تیار کی تھی۔ اُتر پردیش میں اُس پر پوری طرح عمل ہو رہا ہے اس سلسلے میں معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۵۰ء میں رُوئی کی کاشت ...۱۱۶ ایکڑ

سے بڑھاکر ۲۵۰۰۰ ایکڑ کر دی جائے گی۔ اس سے روئی کی پیداوار میں ۰۰۰ ۲ گانٹھوں کی زیادتی کی امید کی جاتی ہے۔ قلم لگاکر روئی کی قسم میں سدھار کرنے کی ایک اسکیم پر بھی صوبے میں عمل کیا جا رہا ہے۔ اس طرح سے جہاں اتر پردیش میں روئی کی پیداوار میں زیادتی ہوگی وہاں روئی کی قسم بھی پہلے سے اچھی اور بڑھیا ہوگی۔ اس کے علاوہ ۲۵۰۰ ایکڑ زمین کو قابلِ کاشت بنایا جا رہا ہے۔ صرف اتر پردیش ہی نہیں بلکہ ہندوستان بھر کے تمام صوبوں اور ریاستوں میں پیداوار بڑھانے کی کوششوں کو دیگر تمام مسائل پر فوقیت دی جا رہی ہے۔ کوئیں کھدوانے اور کاشت کے وسائل کو بہتر بنانے کے لئے بھی کوشش کی جا رہی ہے۔ مدھیہ بھارت، مدراس، میسور، مغربی بنگال اور بہار میں ہزاروں ایکڑ فالتو زمین کو کاشت کے قابل بنایا جا رہا ہے۔

بھارت پارلیمنٹ میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ پنڈت ٹھاکر داس بھارگو کے بناسپتی تیل کے متعلق غیر سرکاری بل کو ۳۱ اگست ۱۹۵۰ء تک رائے عامہ کے لئے مشتہر کیا جائے۔ اس بل پر تقریر کرتے ہوئے پنڈت بھارگو نے کہا کہ جب تک بناسپتی تیل کا جمانا بند نہیں کیا جاتا تب تک اصلی گھی میں ملاوٹ رک نہیں سکتی۔ اس لئے جنتا کی صحت کو قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس ناقص شے کو قطعی ختم کر دیا جائے۔

متحدہ اقوام کی حفاظتی کونسل نے بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر کے جھگڑے کا فیصلہ کرنے کے لئے سر اوون ڈکسن کو مدھیست مقرر کیا ہے۔ مسٹر ڈکسن آسٹریلیا کی ہائی کورٹ کے جج ہیں جس کی حیثیت بھارت کی سپریم کورٹ کے برابر ہے۔ اس سے قبل آپ امریکہ میں آسٹریلیا کی نمائندگی بھی کر چکے ہیں۔ سر اوون ڈکسن پہلے لیک سکسیس جائیں گے اور وہاں سے جلد کشمیر آکر اپنا کام شروع کر دیں گے۔ آپ کو بھارت اور پاکستان دونوں نے مدھیست یعنی میڈی ایٹر تسلیم کر لیا ہے۔

ہانگ کانگ کی ایک اطلاع کے مطابق چینی کمیونسٹ فوجوں نے ہانگ کانگ کی سرحدی حد سے دو میل سے کم فاصلے پر [illegible] میں لنٹو جزیرے پر قبضہ کر لیا ہے۔ کمیونسٹوں کی [illegible] ۲۰۰۰ [illegible] کے ساتھ صبح [illegible] شروع کر دی گئی تھی۔

ماسکو ریڈیو نے اعلان کیا ہے کہ افغانستان کا ایک تجارتی وفد وزیر زراعت مسٹر امیر الدین خاں کی سرکردگی میں ماسکو پہنچ گیا ہے۔ یہ وفد افغانستان اور روس کے درمیان تجارتی سمجھوتے کے لئے بات چیت کرے گا۔

انڈونیشیا کے وزیر اعظم ڈاکٹر محمد عطا نے متحدہ اقوام کی کونسل کے جنرل سیکرٹری مسٹر لائی سے درخواست کی ہے کہ انڈونیشیا کو بھی متحدہ اقوام کا ممبر تسلیم کیا جائے۔

قاہرہ میں سات ملکوں کی متحدہ عرب لیگ کی سیاسی کونسل نے اتفاق رائے سے ایک سمجھوتہ منظور کیا ہے۔ سیاسی حلقے اس سمجھوتے کو کافی اہمیت دے رہے ہیں۔ اس سمجھوتے میں ایک دفعہ اس مطلب کی ہے کہ لیگ کا جو بھی رکن اس سمجھوتے سے انحراف کرے گا اس پر سیاسی اور اقتصادی پابندیاں عائد کر دی جائیں گی۔ اس سیاسی کونسل نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ کوئی بھی ملک اسرائیل سے براہ راست بات چیت نہ کرے۔ عرب کے واقف کار حلقوں کا کہنا ہے کہ یہ نیا سیاسی اور اقتصادی سمجھوتہ عرب ممالک کا متحدہ حفاظتی پیکٹ ہے۔ اگر کسی عرب ملک پر کوئی دوسرا دیش حملہ آور ہو تو سارے ممالک مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔ اس سیاسی کونسل میں جارڈن کے علاوہ سب عرب ممالک کے نمائندے موجود تھے۔

برطانوی پارلیمنٹ میں نئے سال کا بجٹ پیش کرتے ہوئے وزیر خزانہ سر سٹیفورڈ کرپس نے ۱۹۵۰ء کے میزانیہ کا اندازہ ۳۔ ارب ۸۹ کروڑ ۸۰ لاکھ پونڈ بتایا۔ ٹیکس کی نئی تجاویز سے آمدنی میں سات کروڑ ۴۰ لاکھ پونڈ کا مزید اضافہ ہوگا۔ تمام اخراجات نکال کر آئندہ سال میں سات کروڑ پونڈ کا خسارہ رہے گا۔ ٹیکس میں کوئی خاص تبدیلیاں نہیں کی گئیں۔ پونڈ کی قیمت میں جو کمی پچھلے سال کی گئی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے سر سٹیفورڈ نے کہا کہ پونڈ کی قیمت کم کرنے سے ہمیں امید سے زیادہ فائدہ حاصل ہوا ہے۔ وزیر خزانہ نے یہ بھی اعلان کیا کہ تھوڑی آمدنی والے لوگوں کے ٹیکس میں معمولی کمی کی گئی ہے یعنی انکم ٹیکس کی شرح بالترتیب ۳ شلنگ اور ۶ شلنگ سے گھٹا کر دو شلنگ چھ پنس اور پانچ شلنگ کر دیا گیا ہے۔

بھارت اور افغانستان کے بیچ حال ہی میں ایک تجارتی معاہدہ ہوا ہے۔ بھارت کی طرف سے اس معاہدے پر افغانستان میں بھارت کے سفیر ونگ کمانڈر روپ چند نے دستخط کئے اور افغانستان کی جانب سے قومی اقتصادیات کے وزیر مسٹر عبد المجید نے دستخط کئے۔ اس معاہدے پر عمل درآمد دستخط ہو جانے کے دو ماہ بعد ہوگا اور یہ تین سال تک نافذ العمل رہے گا۔

(صفحہ ۴۸ سے آگے)

بھارت اور پاکستان کی نجات اسی میں ہے کہ دونوں کے مابین حقیقی تعلقات قائم ہوں۔ ۱۹۰۵ء تک ہندوستان کی رہنمائی کا سہرا بنگال کے سر رہا ہے۔ اب پھر ایک بار یہ فخر کسی فرزند بنگال ہی کو حاصل ہوگا کہ وہ باقی بھارت اور پاکستان میں مفاہمتی کی اسپرٹ پیدا کر کے دونوں ملکوں کے مستقبل کو ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد پر ایک نئے دور میں داخل کرنے کا فخر حاصل کرے۔

ڈاکٹر آر۔ ... سماجی کارکن کلکتہ ——— ۱۰ اپریل

ہند و پاکستان سمجھوتے سے بے شک ایک آغاز ہوا ہے لیکن دنیا میں کوئی سمجھوتہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک لوگوں میں نیک خواہشات اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا جذبہ موجود نہ ہو۔ وزیر اعظم پاکستان نے کہا ہے کہ موجودہ زمانے میں کوئی بھی ملک غیر مذہبی اور جمہوری اصول کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ اس اعلان پر پورا عمل کیا جائے گا۔ اگر آج گاندھی جی زندہ ہوتے تو وہ بھی ہم سے اس بات کی توقع رکھتے۔

اعجاز حسین — پروفیسر الہ آباد یونیورسٹی

بھارت اور پاکستان کے پردھان منتری ایک ایسا سمجھوتہ طے کرنے میں کامیاب ہوئے جس نے سارے ملک میں خوشی کی لہر دوڑا دی ہے۔ یہ سمجھوتہ صرف گورنمنٹ کے بل بوتے پر نہیں چل سکتا۔ اگر جنتا ساتھ نہیں دیگی تو وہ ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس سمجھوتے کے پیچھے اور اس کی کامیابی میں صرف ہندوستان اور پاکستان ہی کی بہتری نہیں ہے بلکہ اس ساری انسانیت کی بھلائی کا راز چھپا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں بنگال کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں بھی شاید سب سے زیادہ بنگال ہی کا ہاتھ رہا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کو تمام مصیبتوں سے چھٹکارا دلانے میں بھی بنگال ہی کا ہاتھ ہوگا۔

محمود احمد ہنر — ایڈیٹر نیا ہند — الہ آباد — ۲ اپریل

اس سمجھوتے سے بد اعتمادی کی فضا بہت حد تک دور ہو چکی ہے۔ ہم پنڈت نہرو اور ... گاندھی جی کا خواب پورا کر سکتے ہیں کہ بھارت اور پاکستان میں امن ... [illegible]

ہندوستانی سائنسدان

سر سی۔ وی۔ رمن۔ سر سی۔ وی۔ رمن اُن لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے سب سے پہلے ایکسرے پر چھان بین کی۔ ان کو بہت سے اعزازات ملے ہیں اُن میں فرینکلن میڈل قابلِ ذکر ہے۔ سائنس کے شعبے میں یہ امریکہ کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔

ایک بار پنڈت جواہرلال نہرو نے انھیں آزاد ہند کے سب سے پہلے قومی ریسرچ پروفیسر کے لقب سے یاد کیا تھا۔

ڈاکٹر سر کے۔ ایس کرشنن۔ آپ سائنس کے مشہور ماہر ہیں جنھیں پچھلے سال کی انڈین سائنس کا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا تھا۔ رائل سوسائٹی نے ان کی خدمات کی قدر افزائی کرتے ہوئے سنہ ۱۹[illegible]ء میں اُنھیں اپنا فیلو مقرر کر لیا۔ آپ کئی سائنسی اداروں اور اکاڈمیوں کے ممبر ہیں۔

ڈاکٹر ہومی جے بھابھا۔ ڈاکٹر صاحب سائنس کے میدان میں بہت بڑی شہرت کے مالک ہیں۔ آپ آج کل صنعتی چھان بین کے سلسلے میں ٹاٹا کمپنی کے ڈائرکٹر اور پروفیسر ہیں۔ انھوں نے شعاعوں اور جوہری قوت کے متعلق چھان بین کی ہے۔ ہند سرکار نے ایٹمی قوت کا جو بورڈ قائم کیا ہے، ڈاکٹر صاحب اس کے بھی صدر ہیں۔

ڈاکٹر پیارا سنگھ گل۔ ہمارے ایک اور جواں سال سائنس دان ڈاکٹر پیارا سنگھ گل ہیں۔ انھوں نے بھی کائناتی شعاعوں کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب امریکن فزیکل سوسائٹی کے رکن ہیں۔ اور دنیا کے سائنسی رسالوں میں عموماً اُن کا ذکر ہوتا رہتا ہے۔

ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر۔ سائنس کی ایک شاخ علمِ کیمیا میں سر شانتی سروپ بھٹناگر کا نام خاص طور پر نمایاں ہے۔ آپ نے پٹرول کے صرفے کے متعلق بڑی قابلِ قدر تحقیقات کی ایک تیل کی کمپنی نے اُن کی تحقیقات سے فائدہ اُٹھایا۔ اور اس کے عوض چار لاکھ روپیہ اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ رقم پنجاب یونیورسٹی کو ایک ریسرچ وظیفے کیلئے عطا کر دی۔

سیدہ امین

گنوریا اور کوّا

ایک ستی گنوریا اور ایک کوّا۔ دونوں میں بڑی دوستی ستی۔ آپس میں مل کر ان دونوں نے ایک روز طے کیا کہ جب گنوریا کے انڈے بچے ہوں گے تو انھیں کوا کھائیگا اور جب کوّے کے ہوں گے تو گنوریا۔

گنوریا کی خوش قسمتی کہ پہلے کوّے کے بچے ہوئے۔ گنوریا اس کے پاس گئی، اور نہایت اطمینان سے کوّے کے بچوں کو چٹ کر گئی۔ بڑے انتظار کے بعد اب کوّے کی باری آئی۔ اور کالے میاں خوش خوش گنوریا کے پاس پہنچے۔ اور زبان چٹخارتے ہوئے بولے۔ کیوں بی گنوریا! اب میری باری آئی ہے۔ گنوریا ستی بڑی چالاک۔ اس نے کہا ہاں ہاں یہ تو تمہارا حق ہے۔ خوشی سے تم میرے بچوں کو کھا سکتے ہو۔ لیکن بھئی ایک بات ہے۔ وہ یہ کہ تمہاری چونچ میں پاخانہ لگا ہے۔ میرے بچوں کو کھانے سے پہلے جاؤ اسے دھل کر صاف کر آؤ۔ کوّے نے کہا بہت اچھا۔

تیزی سے اُڑتا ہوا کوّا ندی کے پاس پہنچا اور اس سے کہا، ندی لم۔ ندی لم، ندی لم، کیا بنارسی کوّا، ندی نے کہا۔

دے پنلا، دھو ٹھورلا، کھائے چن من کا انڈا بچہ کوّے نے کہا۔

ندی نے کہا، جاؤ بھرکا (آب خورہ) لے آؤ، اور اس میں پانی بھر کر دھو لو۔

کوّا اُڑتا ہوا آبخورے کی تلاش میں کمہار کے پاس گیا، اور اس سے کہا۔

کمرم، کمرم، کمرم (کمہار، کمہار، کمہار) کمہار نے کہا، کیا بنارسی کوّے۔

کوّے نے کہا، گڑھ بھرکا، بھر پنلا (پانی بھر) دھو ٹھورلا (چونچ دھونے کے لئے) کھائے چن من کا انڈا بچہ۔ کمہار نے کہا بھئی یہ تو میرا پیشہ ہی ہے۔ میں بنانے کو طیار ہوں۔ لیکن میاں کوّے اس وقت میرے پاس مٹی نہیں۔ جاؤ کہیں سے مٹی لاؤ، میں بنائے دیتا ہوں۔

کوّا اُڑتا ہوا مٹی کے پاس گیا اور اس سے کہا، مٹی لم، مٹی لم، مٹی لم، کیا بنارسی کوّا، مٹی نے کہا، دے ’’(مٹی) گڑھ بھرکا، بھر پنلا، دھو ٹھورلا، کھائے چن من کا انڈا بچہ، کوّے نے کہا۔

[illegible] ی نے جواب دیا، جاؤ کوئی چیز کھودنے کی لاؤ، اور کھود کر لے جاؤ۔

کوّا وہاں سے اُڑا اور گائے کے پاس پہنچا، اور اُس سے یوں مخاطب ہوا،

گیلم گیلم گیلم، کیا بنارسی کوّا، گائے نے کہا۔ دے سنگا،

۱؎ گنوریا۔ چھوٹی چڑیا

(سینگھ) کمن (کھودنا) مٹلا، گڑھ بھرکا، بھرپٹلا، دھوشورلا، کھائے چن من کا انڈا بچہ۔ کوّے نے کہا۔

گائے نے جواب دیا، کہ تم سے تو ٹوٹے گی نہیں، جاؤ ایک کتا بلا کر لے آؤ۔ وہ آکر تمہارا کام کر دے گا۔

اب کوا کتے کے پاس گیا اور اُس سے کہا۔ کتلم کتلم کتلم، کیا بنارسی کوا، کتے نے کہا۔ کوّے نے کہا، توڑ سنگھلا کمن مٹلا، گڑھ بھرکا، بھرپٹلا، دھوشورلا، کھائے چن من کا انڈا بچہ۔ کتے نے کہا، جاؤ دودھ لے آؤ۔ میں کمزور ہوں، پی کر ذرا طاقتور ہو جاؤں تو چل کر توڑ دوں۔

اُڑتا ہوا کوّا گائے کے پاس پھر پہنچا۔ اور اس سے کہا، گیلم گیلم گیلم، کیا بنارسی کوا، گائے نے کہا۔ دے دودھلا، پی کتلا، توڑ سنگھلا، کمن مٹلا، گڑھ بھرکا، بھرپٹلا، دھوشورلا، کھائے چن من کا انڈا بچہ۔ کوّے نے کہا۔

گائے نے جواب دیا۔ جاؤ گھاس لے آؤ۔ کھائیں تو دودھ دیں۔

کوا شادوناشا اُڑتا ہوا گھاس کے پاس پہنچا، اور اس سے کہا، گھسلم گھسلم گھسلم، کیا بنارسی کوا۔ گھاس نے جواب دیا۔ کوّے نے کہا۔ دے گھسلا، کھائے گتلا (گائے) دے دودھلا، پی کتلا، توڑ سنگھلا، کمن مٹلا، گڑھ بھرکا، بھرپٹلا دھوشورلا، کھائے چن من کا انڈا بچہ۔ گھاس نے کہا جاؤ کھرپا (گھاس کھودنے کا ہتھیار) لے آؤ۔ اور کھود کرلے جاؤ۔

اُڑتا ہوا کوا لوہار کے پاس گیا، اور اس سے کہا، لوہرم، لوہرم، لوہرم، کیا بنارسی کوا۔ لوہار نے کہا، دے کھرپا، کر گھسلا، کھائے گتلا، دے دودھلا، پی کتلا، توڑ سنگھلا، کمن مٹلا، گڑھ بھرکا، بھرپٹلا، دھوشورلا، کھائے چن من کا انڈا بچہ۔ کوّے نے کہا۔

لوہار نے اس سے بڑی ہمدردی ظاہر کی اور پوچھا کہ کیسا کھرپا لوگے لال یا کالا، کوّے نے کہا کہ ہم لال لیں گے۔ لوہار نے کھرپا بنا کر اُسے خوب آگ میں گرم کیا، اور جب بالکل سُرخ ہو گیا تو اُس نے کوّے سے پوچھا کہ تم اسے کس طرح لے جاؤ گے۔

کوّے نے کہا اگر پر پر لوں تو پر جل جائے۔ ٹھور (چونچ) میں لوں تو ٹھور جل جائے۔ پیر میں پکڑوں تو پیر جل جائے۔ بہتر ہے کہ ہماری پیٹھ پر رکھ دو۔ اسے لے کر ہم اُڑ جائیں گے۔ لوہار نے جلتا ہوا سُرخ کھرپا کوّے کی پیٹھ پر رکھ دیا۔ رکھتے ہی کالے میاں بھسم ہو گئے۔

بہت دن جب ہو گئے اور کوّے میاں واپس نہیں آئے تو گنوریا اپنے بچوں کو لے کر اُڑ گئی۔
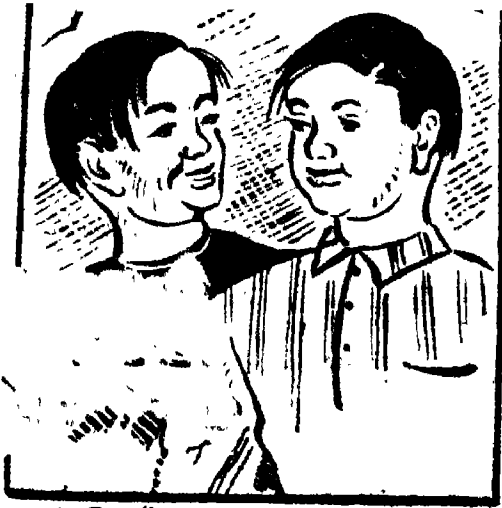
کیا تم جانتے ہو؟

بھارت میں اس وقت جو نوٹ جاری ہیں اُن میں زیادہ سے زیادہ قیمتی نوٹ سو روپے کا ہے۔

(۲) نیلا۔ لال اور پیلا یہ تین بنیادی رنگ ہیں۔

(۳) دُنیا کا سب سے بڑا ہیرا جسے کلینن کہتے ہیں، جنوبی افریقہ کی ریاست پریٹوریا میں ۱۹۰۵ء میں ملا تھا۔

(۴) بھارت کا مشہور کوہِ نور ہیرا جو گولکنڈے میں برآمد ہوا تھا۔ پہلے مغل بادشاہوں کے پاس رہا اور ۱۸۴۹ء میں انگلستان کی ملکہ وکٹوریا کو بطور تحفہ دیا گیا۔ آج کل یہ انگلینڈ کی ملکہ کے تاج میں جڑا ہوا ہے۔

(۵) لندن (انگلستان) نیویارک (شمالی امریکہ) ٹوکیو (جاپان) برلن (جرمنی) اور شکاگو (شمالی امریکہ) یہ دُنیا کے سب سے بڑے پانچ شہر ہیں۔

(۶) گرین لینڈ (جو شمالی امریکہ کے شمال میں ہے) دُنیا کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔

(۷) مسسی پی مسوری دُنیا کا سب سے بڑا دریا ہے

(۸) سُورج طلوع اور غروب نہیں ہوتا۔ زمین کے گھومنے کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔

(۹) بجلی کے بلب کو مشہور سائنس دان ایڈیسن نے ایجاد کیا تھا۔

(۱۰) کشمیر کی جھیل وُلر دُنیا میں سب سے گہری جھیل ہے۔

(۱۱) جانوروں میں سب سے تیز رفتار چیتا ہے۔

(۱۲) انڈین نیشنل کانگرس کو ۱۸۸۵ء میں ایک انگریز مسٹر اے۔ او ہیوم نے قائم کیا تھا۔ اور اس کا پہلا اجلاس بمبئی میں ہوا تھا۔

(۱۳) بمبئی کو ہندوستان کا دروازہ کہتے ہیں۔

(۱۴) آگرہ اُتر پردیش کا ایک مشہور شہر ہے۔ مگر تاج محل کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔

(۱۵) ہندوستان میں چھوٹے بڑے ۲۷۰۳ شہر اور ۵۸۹۲ گاؤں ہیں۔

(۱۶) ہندوستان کا سب سے بڑا شہر کلکتہ ہے۔

(۱۷) ہندوستان میں ریلوے لائن کی کل لمبائی ۳۴۵۶۵ میل ہے۔

(۱۸) دنیا کی سب سے بڑی دیوار چین کی دیوار ہے جو پندرہ سو میل سے زیادہ لمبی ہے۔

(۱۹) لندن دُنیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔

(۲۰) کلکتہ۔ جودھ پور۔ دہلی اور بمبئی ہندوستان کے بڑے ہوائی اڈے ہیں۔

(۲۱) امریکہ کے واٹرمین نامی شخص نے ۱۸۸۴ء میں سب سے پہلے فاؤنٹن پین ایجاد کیا تھا۔

ہنسنا سیکھو

دیوکی نندن ناتھ

تم کہو گے بھلا یہ بھی کوئی سیکھنے کی بات ہے۔ بڑے بوڑھو سے سنتے چلے آئے ہیں کہ ہنسنا گانا اور رونا کسے نہیں آتا۔ اور تو اور چھ ماہ کا بچہ بھی بھوکا ہو تو رو رو کر سارے گھر کو سر پر اٹھا لیتا ہے۔ ماں کی گود میں کھیل رہا ہو تو اسکی قلقاریوں سے مسرت کے پھول جھڑتے ہیں۔ پنگوڑے میں جھول رہا ہو تو اپنی بے معنی لیکن دل کو لبھا لینے والی راگنی چھیڑ دیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ شاعر بچوں کو زمین کے فرشتے کہتے ہیں۔ پیارے بچو! تمھیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ آج دنیا میں ایسے آدمیوں کی کمی نہیں جنھیں ہنسنا نہیں آتا۔ ان کی پیشانی پر ہر وقت شکنیں پڑی رہتی ہیں اور وہ ذرا ذرا سی بات پر لڑنے کو طیار ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ خود بھی نہیں ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنستے نہیں دیکھ سکتے۔ گویا ان کی نظر میں ہنسنا بھی ایک جرم ہے۔ آؤ میں تمہاری ملاقات کچھ ایسے بچوں سے کراؤں جو ہر وقت روتی صورت بنائے پھرتے ہیں۔ سامنے کے مکان میں جو وکیل صاحب رہتے ہیں اُن کا لڑکا ونود ذرا ذرا سی بات پر رونے لگتا ہے۔ مزاج کے چڑچڑے پن کے سبب اُس کی صحت بھی خراب رہتی ہے۔ ہر سال سردیوں میں اسے نمونیہ ہو جاتا ہے۔ ملیریا کے دنوں میں سوکھ کر کانٹا ہو جاتا ہے۔ کھانسی اور زکام تو کبھی اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔ بیچارے وکیل صاحب اُسے ہر طرح کا آرام پہونچاتے ہیں۔ لیکن یہ ہے کہ ہنسی بھول کر بھی اُس کے لبوں پر نہیں آتی۔ دال میں مرچیں ذرا زیادہ پڑ گئیں تو رو رو کر آنکھیں لال کر لیں۔ سکول میں ماسٹر نے کچھ ڈانٹ دیا تو رو رو کر خود کو ہلکان کر لیا۔ غرض یہاں تک کہ اگر گھر میں بھی کوئی اُسے کسی بات پر ٹوک دے تو گھنٹوں پڑا آنسو بہائے۔ گلی کے بچے اُسے "روتی صورت" کہتے ہیں۔ شام کو جب گلی بھر کے بچے کبڈی یا گیند بلا کھیلتے اور اپنے قہقہوں سے فضا کو لالہ زار بنا دیتے ہیں تو یہ بدنصیب بچہ اپنے گھر میں پڑا آنسو بہاتا رہتا ہے۔ اسی طرح کا ایک اور بچہ میرا بھانجا مہیش ہے۔ جسے میں اکثر فلاسفر کہہ کر پکارتا ہوں۔ کیونکہ دس سال کی عمر میں ہی وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگا ہے۔ جب اُس کے ہم عمر لڑکے کھیلتے کودتے یا شور و غل مچاتے ہیں تو یہ ننھا فلاسفر دور کھڑا حقارت سے مسکراتا ہے۔ دیوالی کے دن جب دوست اُسے بلانے آئے تو وہ ناک بھوں چڑھا کر بولا، "ہوں بھلا بازار بھی کوئی سیر کی جگہ ہے؟" تیسری قسم ان بچوں کی ہے جن کا بچپن غریبی میں کٹتا ہے۔ یا جو چھوٹی سی عمر میں یتیم ہو جاتے ہیں۔ ان کے بچپن کی تکلیفیں زندگی بھر کیلئے

اُن کی عادتیں بدل دیتی ہیں۔ ایسے بچے چھوٹی عمر سے ہی سوچ
بچار کے عادی ہوتے ہیں۔ اُن میں شوخی نام کو بھی نہیں
ہوتی۔ اُن کی صحت بھی عموماً خراب رہتی ہے۔

آج کل کے بڑے ڈاکٹروں نے یہ بات ثابت کر دی
ہے کہ ہنسنا صحت کے لئے ایک بہت مفید چیز ہے۔ کیونکہ
ہنسنے سے پھیپھڑوں کی ورزش ہوتی ہے۔ تازہ خون
تیزی سے گردش کرتا ہے، اور بہت بڑی مقدار میں
آکسیجن سانس کے راستے جسم میں جا کر خون کو صاف
کر دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہنسنا صحت کو برقرار
رکھنے کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اچھی غذائیں۔
مزے کی بات تو یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا خرچ نہیں
ہوتا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ اگر کوئی ہنسنے میں بھی کنجوسی سے
کام لے تو اسے کیا کہا جائے؟ ہر وقت اُداس رہنا یا
بات بات میں چڑ جانا بہت بُری عادتیں ہیں۔ جو بچے
ضرورت سے زیادہ سنجیدہ یا غمگین رہتے ہیں، اُنکی
صحت ہمیشہ خراب رہتی ہے۔ وہ بچہ ہی کیا ہے جس میں
شوخی نہیں۔ شرارت نہیں۔ لڑنے جھگڑنے اور کودنے
پھاندنے کی عادت نہیں۔ یورپ اور امریکہ میں ساٹھ
سال کے بوڑھے بھی کرکٹ کھیلتے ہیں۔ سنیما اور تھیئٹر جاتے
ہیں۔ اور جوانوں کے ساتھ ساتھ کھیل تماشوں میں
حصہ لیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بوڑھے تو کیا جوان
بھی کھیلوں سے دُور بھاگتے ہیں۔ یہاں زندہ دل اور
ہنس مکھ آدمی کو زیادہ پسند نہیں کیا جاتا۔ البتہ وہ
شخص جو ہر وقت دُنیا کے دُکھڑے روتا ہے یا سوُرگ
نرک کے قصے چھیڑے رہے، لوگوں کی نظر میں قابلِ عزت
ہے۔ پیارے بچو! آج سے یہ غلط خیال اپنے دل سے
بالکل نکال دو کہ ہنسنا اور کھیلنا غیر ضروری چیزیں ہیں۔
میری نصیحت ہے کہ ہنسو، ہر وقت ہنسو، ہنس ہنس کر کام
کرو، ہنس ہنس کر کھیلو۔ ہنسنے والوں سے مصیبتیں اور مشکلیں
بھی دُور رہتی ہیں۔ دریا کی لہریں ہر وقت ہلکے ہلکے قہقہے
لگاتی ہیں۔ صبح کے وقت درخت ٹھنڈی ہوا میں جھوم
جھوم کر شوخ بچوں کی طرح سیٹیاں بجاتے ہیں۔ تم بھی ہر وقت
مسکراتے رہو۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

زندگی زندہ دلی کا ہے نام   مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

والدین کا فرض ہے کہ ہر ممکن طریقے سے اپنے بچوں کو ہنسنے
کھیلنے کا عادی بنائیں۔ "رونی صورت" اور "فلاسفر" قسم کے
بچے زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان کے والدین کا
فرض ہے کہ اپنے بچوں کو کسی ڈاکٹر یا ماہر نفسیات کو دکھائیں۔
تاکہ اُداسی اور شکست کے خیالات ننھے دماغوں میں
پرورش نہ پا سکیں۔ آج ہماری زندگی کے مسائل اتنے پیچیدہ
ہو گئے ہیں کہ صرف بہادر اور زندہ دل انسان ہی اُن کا
مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ایک بہادر انسان وہی ہے جو مصیبتوں
کے سامنے بھی ہنستا رہے۔

پیارے بچو! آج سے یہ سمجھ لو کہ رونا اور اُداسی
بزدلی کی نشانیاں ہیں۔ خوب ہنسو۔ کرکٹ۔ ہاکی۔ فٹ بال
اور دوسرے کھیلوں میں حصہ لو۔ اسکول میں بھی ہر وقت
چست اور بشاش رہو۔ فرصت کے وقت مزیدار کہانیاں
اور چٹکلے پڑھو۔ سوچ بچار اور سوُرگ نرک کے مسائل
سلجھانے کا کام بڑے بوڑھوں کے لئے ہی چھوڑ دو۔

ہنسو اور ہنساؤ

بھگوت سروپ گوئل

سُورج

پیارے بچّو! تم ہر روز صبح سُورج کو پورب میں نکلتا اور شام کو پچھم میں چھپتا دیکھتے ہو۔ تم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ سورج کتنی ضروری چیز ہے۔ اگر سورج نہ ہوتا تو دنیا ہی نہ ہوتی۔ نہ انسان ہوتے۔ اور نہ حیوان۔ نہ درخت ہوتے ورنہ پودے اور پھول پھل۔ سردی ایسی غضب کی ہوتی اور اندھیرا اس بلا کا ہوتا کہ فرشتے بھی کانپ اُٹھتے۔ سورج کی وجہ سے ہی دُنیا قائم ہے۔ کتنی ضروری ہے یہ چیز۔ تم نے ضرور اس کے بارے میں زیادہ جاننے کی کوشش کی ہوگی۔ آؤ آج ہم تمھیں اسی کا عجیب و غریب حال سنائیں۔

سورج کی جسامت کو ہی دیکھو ویسے تو ایک چھوٹی سی فٹ بال معلوم ہوتا ہے۔ لیکن دراصل یہ اتنا بڑا ہے کہ شاید تمھیں گمان بھی نہ ہوسکے۔ دیکھنا چونک نہ جانا سورج ہماری اس زمین سے جسے کہ ہم بہت بڑی سمجھتے ہیں تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ زمین بیچاری کی تو حیثیت ہی کیا ہے اگر تمام اجرام فلکی کی جسامت کو جمع کر لو جو کہ اس کے گرد گھومتے ہیں تب بھی سُورج کی برابری نہیں ہوسکتی۔ ان سب کی جسامت کے مجموعے سے بھی سُورج کی جسامت ۷۰۰ گنا زیادہ ہے۔ زمین کے گرد سمندری سفر کرنے میں تین سال لگتے ہیں۔ لیکن سُورج کے گرد سفر کرنے میں تین سو سال لگیں گے۔

تم پوچھوگے تب یہ اتنا چھوٹا کیوں دکھائی دیتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ ہم سے بہت ہی دُور ہے۔ سو دو سو میل دُور نہیں، لاکھ دو لاکھ میل دور نہیں بلکہ کروڑوں میل دُور۔ زمین سے سُورج کا صحیح فاصلہ ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ اتنے دُور ہونے کی وجہ سے ہی یہ ہمیں چھوٹا سا دکھائی دیتا ہے۔

سورج کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں پر چیزیں زیادہ تیزی سے گرتی ہیں۔ زمین پر گرنے والی چیز پہلے سیکنڈ میں تقریباً ½۱۶ فٹ چلتی ہے۔ لیکن سورج کی طرف گرنے والی چیز پہلے سیکنڈ میں ½۴۴۰ فٹ چلتی ہے۔

ایک اور مزے کی بات یہ ہے کہ سورج پر چیزوں کا وزن بہت بڑھ جاتا ہے۔ اگر انسانی جسم کو سورج پر لیجایا جائے تو وہاں جاکر اس کا وزن قریب قریب ۵۰ من ہوجائے گا۔ یعنی ہاتھی کے وزن کے برابر۔ اگر تمہارا وزن ایک من ہے اور سورج پر تمھیں تولا جائے تو تمہارا وزن لگ بھگ ۲۸ من ہوگا۔

آؤ تمھیں سُورج کی حرارت کی تیزی بھی بتائیں۔ اگر سورج کے گرد برف کی تہ لگا دیں تو سورج کی گرمی ایک منٹ میں تقریباً ۹۳ فٹ موٹی تہ کو پگھلا دے گی یعنی ایک دن میں تقریباً ½۱۵ میل موٹی تہ کو پانی میں بدل دے گی۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ سُورج کو بجھانے کے لئے برف کے پانی کی ندی جس کا قطر ۲٫۵ میل ہو سورج کی سطح پر ۲۱۰۰۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے پھینکنے کی ضرورت ہوگی۔

بھارت کی آبادی

مردم شماری کے افسرِ اعلیٰ نے اندازہ لگایا ہے کہ یکم مارچ ۱۹۵۱ء کو بھارت کی آبادی ۳۵ کروڑ سے بھی بڑھ جائے گی۔ مختلف صوبوں اور ریاستوں کی آبادی کا موجودہ اندازہ حسب ذیل ہے۔

نام صوبہ	آبادی
آسام	۸۵۱۰۰۰۰
بہار	۳۹۴۲۰۰۰۰
بمبئی	۳۲۶۸۰۰۰۰
مدھیہ پردیش	۲۰۹۲۰۰۰۰
مدراس	۵۴۲۹۰۰۰۰
اڑیسہ	۱۴۴۱۰۰۰۰
پنجاب	۱۲۶۱۰۰۰۰
اتر پردیش	۶۱۶۲۰۰۰۰
مغربی بنگال	۲۴۳۲۰۰۰۰
حیدرآباد	۱۷۶۹۰۰۰۰
جموں و کشمیر	۴۳۷۰۰۰۰
مدھیہ بھارت	۷۸۷۰۰۰۰
میسور	۸۰۸۰۰۰۰
پیپسو یونین	۳۳۲۰۰۰۰
راجستھان	۱۴۶۹۰۰۰۰
سوراشٹر	۳۹۶۰۰۰۰
ٹراونکور کوچین	۸۵۸۰۰۰۰
اجمیر	۷۳۰۰۰۰
بھوپال	۸۵۰۰۰۰
بلاسپور	۱۳۰۰۰۰
کورگ	۱۷۰۰۰۰
دہلی	۱۵۱۰۰۰۰
ہماچل پردیش	۱۰۸۰۰۰۰
کچھ	۵۵۰۰۰۰
منی پور	۵۴۰۰۰۰
تری پورہ	۵۸۰۰۰۰
وندھیا پردیش	۳۸۸۰۰۰۰

قہقہے

باپ۔ کیا تم اس بار بھی فیل ہو گئے ہو؟
بیٹا۔ ابّا جان! اس بار تو میں نے میدان مار لیا ہے۔ میں فیل ہونے والے لڑکوں میں اوّل آیا ہوں۔
باپ۔ شاباش بیٹا! مجھے تم سے بہت امیدیں ہیں۔

ڈاکٹر۔ کہیے آج آپ کی طبیعت کیسی ہے؟
مریض۔ پہلے سے بہت اچھی۔ صرف سانس رُک رُک کر آتا ہے۔
ڈاکٹر۔ فکر نہ کیجیے۔ جس طرح پیٹ کا درد بند ہو گیا ہے دو ایک دن میں سانس بھی بند ہو جائے گا۔

پولیس مین۔ دیکھو! تم نے فرش پر تھوک دیا ہے۔ کیا دیوار پر یہ نوٹس نہیں پڑھا "یہاں تھوکنا منع ہے"۔
دیہاتی۔ لیکن میں نے نہ تو دیوار پر تھوکا ہے اور نہ نوٹس بورڈ پر۔

ڈالڈا

میں تلی ہوئی مصالحہ دار بڑی مرچوں سے اپنے کھانے کو قوت بخش بنائیے!

بڑی مرچوں میں معدنیات اور وٹامن رہتے ہیں جو کہ اچھی صحت کے لئے لازمی ہیں۔ انہیں اس طریقہ سے بنائیے۔ پہلے انہیں تھوڑا سا جوش دیجئے۔ پھر ان کی ڈنٹھلیں توڑ کر بیج نکال لیجئے۔ بعد ازاں ان میں تلے ہوئے کترے پیاز، اُبلے مٹر اور گاجر یا اُبلے کٹے ہوئے انڈے۔ اُبلے کچلے ہوئے آلو یا اُبلا ہوا قیمہ کترا ہوا اور سبز دھنیہ، رائی، نمک اور نیبو کا رس بھریئے۔ پتلی تیلیوں سے ڈنٹھلوں کو جوڑ دیجئے۔ اب ڈالڈا کو ایک توے پر گرم کریئے۔ اس میں یہ بڑی مرچیں اچھی طرح سے تل لیجئے۔

ڈالڈا ایک خالص نباتاتی چکنائی ہونے سے یہ ایسے کھانوں کو تلنے کے لئے موزوں ہے جنکے لئے زیادہ وقت درکار ہے اور اسی بنا پر انہیں اچھی طرح سے پکا دیتا ہے۔

کیا قیمتی غذا زیادہ صحت بخش ہوتی ہے؟

مفت صلاح کیلئے آج ہی لکھئے — یا بوقت ضرورت!

دی ڈالڈا ایڈوائیزری سروس

پوسٹ بکس نمبر ۳۵۳، بمبئی ۱

KYM. 118-172 UD

Printed and published by the
Publications Division, Ministry of Information & Broadcasting,
Govt. of India, Old Secretariat, Delhi.

Regd. No D.—21